عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

# جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام




- نکاح میں شرط اور مشروط مہر فقہ اسلامی کی روشنی میں
- جبری شادی کا مسئلہ اور احکام
- شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا




زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم


تاثرات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم


دارُالاشاعت

اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

# جدید فقہی مباحث

## مع تقاریظ علمائے کرام

جلد 6

نکاح میں شرط اور مشروط مہر فقہ اسلامی کی روشنی میں
جبری شادی کا مسئلہ اور احکام
شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ
مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم
شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دار الاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

ہمارے اس ایڈیشن میں 80 میں سے تقریباً 58 مباحث پہلی مرتبہ صرف پاکستان میں طبع ہوئے ہیں۔ ہم اسلامی فقہ اکیڈمی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے تمام مسودات وکمپوزنگ بذریعہ ای میل مرحمت فرمائے۔ جزاك الله

باہتمام: خلیل اشرف عثمانی

طبع اول: نومبر 2017ء

تعداد: 500

طباعت: عابد پرنٹنگ پریس غریب آباد کراچی



﴿........ملنے کے پتے........﴾

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
مکتبہ معارف القرآن جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم اردو بازار کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔انار کلی لاہور و اردو بازار کراچی
مسٹر بکس جناح سپر مارکیٹ اسلام آباد
دارالاخلاص صدف پلازہ محلہ جنگی پشاور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

﴿انگلینڈ میں ملنے کے پتے﴾

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

﴿امریکہ میں ملنے کے پتے﴾

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

# فہرست مضامین سلسلہ جدید فقہی مباحث

## نکاح میں شرط عائد کرنا

## شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح ۳۹۵



تمت

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# عرض ناشر

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے دارالاشاعت کراچی کو پاکستان میں 1949ء سے تمام موضوعات پر اسلامی کتب کی طباعت اور اشاعت کی سعادت حاصل رہی ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل، تمام بزرگوں کی دعاؤں اور اکابر کی خدمات کا ثمرہ ہے، اسی محنت ولگن اور جذبے سے یہ خدمت تیسری نسل یعنی موجودہ ذمہ داران بھی کر رہی ہے اور اب چوتھی نسل کے نمائندے بھی ماشاء اللہ اس کام میں شریک ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو مکمل اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے جو کمی کوتاہی اس میں رہ جاتی ہے اس پر معاف فرمائے۔ (آمین)

تمام قارئین جو ماشاء اللہ ذی علم حضرات ہیں ان کے تعاون اور دعاؤں سے ہی یہ کام انجام پا سکا ان سب حضرات سے بھی دونوں جہاں میں کامیابی کی دعا کی درخواست ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ ''سلسلہ جدید فقہی مباحث'' کا موجودہ ایڈیشن جو بڑے سائز کی 26 جلدوں میں طبع ہوئی ہے اس میں تقریباً 70 مختلف مستقل موضوعات پر کتب جو ہندوستان میں قائم ادارہ ''اسلامی فقہ اکیڈمی'' کی طویل کوششوں سے وجود میں آئیں، فقہ اکیڈمی کے سرپرست حضرات مدظلہم کی بصیرت اور کوششوں سے بڑے بڑے نامور اکابر علماء کے مقالے ان جدید فقہی موضوعات پر جمع ہو کر علمی تحقیقات کرنے والوں کے لیے بڑا زبردست ذخیرہ جمع کر دیا ہے، جسے نامور اکابر ملت نے بڑی خدمت قرار دیا ہے، آئندہ صفحات میں ان بزرگوں کی تقاریظ شامل ہیں۔

ہمارے اس ایڈیشن سے قبل اس کتاب کا تقریباً چوتھائی سے بھی کم حصہ طبع ہوا تھا، جس کا معیار بھی مناسب نہ تھا اور اس کی دستیابی بھی مستقل نہ ہونے کی وجہ سے اہلِ علم پریشان رہتے تھے، ضرورت تھی کہ نہ صرف معیار بہتر ہو اور مستقل فراہمی بھی رہے۔ ''منتظمین اسلامی فقہ اکیڈمی دہلی انڈیا'' کی خواہش تھی کہ پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ ہو جو ان کے مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو اور مکمل اشاعت بھی کر سکتا ہو، تاکہ اس علمی ذخیرہ کی پاکستان میں اشاعت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے۔

اس مقصد کے لیے تقریباً اب سے سات سال قبل انہوں نے دارالاشاعت کراچی کو تحریری اجازت مرحمت فرما دی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے اس میں تساہل یا کوتاہی کی گئی تو وہ کسی اور ناشر کو خدمات سونپ دیں گے۔ ارادے کے باوجود بعض مصالح اور حکمتوں کے سبب اسلامی فقہ اکیڈمی سے اپنے عذر کو واضح کر دیا گیا اور اس کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔

2015ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے سابقہ داعیہ کے ایک صاحب علم نے پیغام دیا کہ پاکستان میں اس کتاب کی مکمل اور مستقل اشاعت نہ ہونے کے سبب وہ پھر چاہتے ہیں کہ اس کا کوئی مستقل انتظام ان کے مطلوبہ معیار ومقاصد کے مطابق ہو جائے بہرحال! پھر دوبارہ ایک مفصل تحریری اجازت نامہ ان حضرات نے پاکستان کے لیے ہمیں جاری فرمایا اور تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ کمپیوٹر کمپوزنگ یا جس شکل میں بھی یہ ذخیرہ تھا انہوں نے مذکورہ صاحب علم صاحب کے ذریعے ہمیں فراہم کیا، ان دو سالوں میں طویل محنت واخراجات کر کے اب اسے طبع کرنے کے لیے تیار کر لیا گیا ہے۔ اب پاکستان میں اس ذخیرہ کی اشاعت کے حقوق

قانونی طور پر بھی دارالاشاعت کراچی ہی کے پاس ہیں، تقریباً 22 کتب اس میں سے پہلے شائع ہوئی تھیں، ان کے علاوہ تمام ذخیرہ پہلی مرتبہ طبع ہوکر آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ ذخیرہ پہلے انڈیا میں شائع نہیں ہوا تھا۔

ہم نے اپنے اس جدید ایڈیشن میں ترتیب یا جن دیگر خصوصیات سے اسے مزین کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱......اسلامی فقہ اکیڈمی کی طرف سے پرانے شائع شدہ نسخوں میں کسی بھی بحث کے نتیجے میں جمع ہونے والے مقالے شائع کردیے جاتے تھے، پھر بعد میں ان میں یہ اضافہ کیا گیا کافی جگہ اکیڈمی نے ان بحثوں کے نتیجے میں جو فیصلہ کیا اس کا اضافہ اس موجودہ نسخے میں شامل ہے۔

۲......پورے علمی ذخیرے کو ازسرنو بڑے سائز میں کمپوزوسیٹنگ سے آراستہ کیا گیا ہے بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے بات ادھوری رہ گئی ہے تو قدیم نسخوں اور اصل مسودے میں بھی اسی طرح نامکمل ہے۔

۳......پورے علمی ذخیرے کی نئی ترتیب یا جلد بندی اس طریقہ پر کی گئی ہے کہ ممکنہ طور پر ایک جیسے موضوعات پر مباحث ایک جلد میں آجائیں، پہلے طبع شدہ نسخے میں یہ صورت نہ تھی۔ مثلاً اسلامی بینکنگ کے عنوان سے ایک موضوع چوتھی جلد میں ہے تو اسی عنوان سے دوسرا موضوع ۱۳ رنمبر جلد میں ہے، اب یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک جیسے موضوع ایک ہی جلد میں آجائیں۔

۴......ممکن ہے کہ استفادہ کرنے والے حضرات کو ایسا محسوس ہو کہ کمپوزنگ بہت جلی نہیں ہے اسے ذرا بڑا بھی رکھا جاسکتا تھا لیکن اس سے مجموعہ کے صفحات اور جلدوں میں بہت اضافہ ہورہا تھا اور اس کی قیمت بھی قارئین پر ایک بوجھ ہوتی۔ مزید یہ کہ گزشتہ طبع شدہ نسخوں کا قلم بھی تقریباً اس جیسا ہی تھا۔

۵......بحمدللہ! اب ''سلسلۂ جدید فقہی مباحث'' کا سائز بھی دیگر فقہی کتب کی طرز پر ہوگیا، کاغذ، طباعت اور جلد سازی کا معیار بھی بہت نمایاں اور بہتر ہوگیا۔

۶......اس ذخیرہ کی قیمت بھی بازار میں دستیاب کتب کے مقابلے میں معیار وغیرہ کو دیکھتے ہوئے بہت مناسب رکھی گئی ہے۔

امید ہے کہ اہل علم حضرات، یونیورسٹیاں، لائبریریاں، اس علمی ذخیرے کی پذیرائی کریں گی اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ درخواست اور دعا ہے کہ ہماری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں اور دنیا وآخرت دونوں کے لیے نافع بنادیں (آمین)

والسلام

خلیل اشرف عثمانی

مدیر کتب خانہ دارالاشاعت

اردو بازار کراچی

8/7/2017

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# چند تاثرات برائے اسلامی فقہ اکیڈمی ہند

## حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ العالی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

''اسلامک فقہ اکیڈمی ہند'' ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں...... بالخصوص علماء اور دینی غیرت وفکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری وفکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ وصحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں۔

## مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی

صدر دارالعلوم کراچی پاکستان

''مجھے بے انتہا مسرت بھی اور کسی قدر حسرت بھی، مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علمائے کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم کو اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظم اور بڑے پیمانے پر یہ کام شروع نہ کر سکے...... فقہ اکیڈمی نے بڑا اہل قدم اٹھایا ہے، مدت سے اس کا انتظار تھا۔

# تقدیم

## شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

نائب رئیس مجمع الفقہ الاسلامی جدہ

بمناسبت خطبۂ صدارت چوتھے فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۹۲ء حیدرآباد (دکن)

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى: اما بعد!

میرے لیے یہ بات بہت بڑے اعزاز اور خوشی و مسرت اور یادگار کی حیثیت رکھتی ہے کہ اللہ جل جلالہ کے فضل و کرم سے مجھے اس عظیم الشان علمی ادارے کے چوتھے فقہی مذاکرہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں اپنے محترم بزرگ جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم کا اور اس اسلامک فقہ اکیڈمی کے تمام منتظمین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس محفل میں شرکت کا موقع عنایت فرمایا اور نہ صرف ایک سامع اور شریک کی حیثیت میں بلکہ اس افتتاحی اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری بھی مجھ ناچیز کو سونپی۔ اس سے پہلے اگرچہ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال مجھے دعوت موصول ہوتی رہی لیکن میں اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے حاضر خدمت نہ ہوسکا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے، لیکن میں ان کو ایک فقیہ، ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے۔ آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم وفضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کر کے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے اس اکیڈمی کو قائم کر کے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کے اس کارنامے کو قبول فرمائے اور اس کے اغراض و مقاصد کو اپنی رضا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر اس اکیڈمی کے اغراض و مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس اکیڈمی کا قیام جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کی تعمیل ہے۔ وہ ارشاد معجم طبرانی میں ایک روایت میں ہے جسے علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ!

"اذا جاء نا امر ليس فيه أمر و لا نهي فما ذا تأمرنا فيه"

یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال آجائے، ایسا قضیہ سامنے آجائے جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو تو اس صورت حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں، ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ حضرت نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"شاوروا الفقهاء العابدين ولا تمضوا فيه برای خاص"

کہ ایسے موقع پر فقہاء عابدین سے مشورہ کرو اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو، محض انفرادی فتویٰ کو، محض انفادی رائے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی بجائے فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس مشورہ کے نتیجہ میں جس مقام پر پہنچو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سمجھو۔

یہ ہے وہ ارشاد جس کے ذریعہ نبی کریم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام نت نئے مسائل کا حل ہمارے لیے تجویز فرمایا اور وہ یہ کہ آخری وقت میں جب کہ اجتہاد مطلق کا تصور تقریباً مفقود ہو گیا ہے، اس دور میں نئے مسائل کو حل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ فقہاء عابدین

کو جمع کیا جائے۔مگر اس میں نبی کریم ﷺ نے دو صفتیں بیان فرمائی: ایک یہ کہ جن لوگوں کو جمع کیا جائے وہ تفقہ فی الدین رکھنے والے ہوں، دین کی صحیح سمجھ رکھنے والے ہوں۔ دین کے مزاج و مذاق کو اچھی طرح محفوظ کرنے والے ہوں، اور دوسری قید یہ لگادی کہ وہ فقہاء محض فلسفی قسم کے نہ ہوں، جو نظریاتی طور پر فقیہ ہوں، نظریاتی طور پر اسلام کے احکام کو جانتے ہوں، جو محض علم رکھتے ہوں، لیکن اس علم پر خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس علم کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہ ہوں، اور اس علم کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود نہ بنایا ہو، تو ایسے فقہاء سے مشورہ کرنے کا کوئی حاصل نہیں، اس لیے کہ دین، یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو اپنالے، اس کے حکم بیان کردے اور پھر بھی اس کا ماہر کہلائے، بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے۔ جب تک اس پر عمل صحیح طور پر نہیں ہوگا، اس وقت تک دین کی صحیح سمجھ حاصل نہیں ہوسکتی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ یہ بات فرمایا کرتے تھے:

”کہ اگر میر اعلم بمعنی جان لینا کوئی کمال کی بات ہوتی تو شاید ابلیس سے بڑا صاحب کمال اس کائنات میں کوئی نہ ہوتا۔“

اس لیے کہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے صرف جان لینے کا، علم حاصل کر لینے کا، تو ابلیس کو علم بہت بڑا حاصل تھا، بہت کچھ علم اس کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اور عقل کے اعتبار سے بھی آپ دیکھیں تو عقل، خالص عقل، جو وحی کی رہنمائی سے آزاد ہو، اس عقل کے اعتبار سے اس نے جو دلیل پیش کی، سجدہ نہ کرنے کی، کہ اے اللہ! تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھ کو آگ سے پیدا کیا، تو میں افضل ہوں، اس لیے کہ آگ افضل ہے مٹی کے مقابلے میں، تو اگر عقل کو وحی کی رہنمائی سے آزاد کر دیا جائے تو خالص عقل کی بنیاد پر اس کی دلیل کا توڑ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس سارے عقل اور اس سارے علم کے باوجود وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نکالا گیا، اس لیے کہ وہ علم نرا علم تھا، دانستن کے معنی میں اس پر عمل نہیں تھا۔ اس کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہیں تھا، آپ کو معلوم ہے کہ آج ہمارے اس دور میں جتنے مستشرقین ہیں، اگر آپ ان کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں تو ان میں اسلامی کتابوں کے ڈھیر ملیں گے۔ اتنی کتابوں کے حوالے ملیں گے کہ بسا اوقات ہمارے عالم دین اتنی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ لیکن سارا علم اور ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد اس علم کا اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکے کہ ایمان کی دولت حاصل کر لیتے۔ یہودی کے یہودی، عیسائی کے عیسائی رہے۔ تو معلوم ہوا کہ صرف فقہ کا عالم ہو جانا کافی نہیں، اور صرف فقہ کے عالم ہو جانے سے وہ مقام حاصل نہیں ہو جاتا جو نبی کریم ﷺ نے نئے مسائل کو حل کرنے کے لیے تجویز فرمایا بلکہ قید لگادی کہ فقہاء کے ساتھ عابدین ہونے چاہیے، عبادت گزار ہونے چاہیے۔ یہ حدیث میں نے اس وجہ سے سنائی کہ آج کثرت سے یہ آواز بلند ہوتا رہتا ہے، مختلف حلقوں کی طرف سے کہ صاحب دین کی تفہیم اور دین کی تعبیر کا حق صرف علماء ہی کو کیوں حاصل ہے۔ ہر مسلمان بہ حیثیت ایک مسلمان وہ دین کی تفہیم و تشریح کیوں نہیں کرسکتا۔ ہر آدمی کھڑا ہو کر بہ آواز بلند کہتا ہے کہ میں قرآن کریم سے احکام شرعیہ کا استنباط کرسکتا ہوں۔ یہ دین کی تفہیم و تعبیر کا سارا حق اٹھا کر علماء کی جھولی میں کیوں ڈال دیا گیا۔ علماء کی اجارہ داری کیوں قائم کردی گئی۔

تو جواب دیا نبی کریم ﷺ نے کہ یہ تشریح و تعبیر کا حق صرف فقہاء عابدین کو حاصل ہے، صرف فقہاء کو بھی نہیں بلکہ فقہاء عابدین کو، اس کے سوا کوئی قرآن و سنت کے احکام کی صحیح تفسیر و تشریح نہیں کرسکتا۔

یہ عجیب واقعہ ہے کہ دنیا کے ہر علم و فن میں کوئی ذمہ دارانہ بات کہنے کے لیے ساری دنیا میں یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ اس فن کا اس نے علم حاصل کیا ہو، اس کی ڈگری حاصل کی ہو، کوئی شخص آج تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو کہتا ہو کہ انگریزی جانتا ہوں، میڈیکل سائنس کی کتابیں مطالعہ کر کے میں علاج کرسکتا ہوں، اگر میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر، محض مطالعہ کر کے ڈکشنریوں کے ذریعہ اس کے ترجمے دیکھ کر آدمی علاج کرنا شروع کر دے تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے اور کوئی خدمت انسانیت کی وہ انجام نہیں دے سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دین کے اندر بھی یہ راستہ رکھا ہے کہ جب کتاب بھیجی تو نبی کریم ﷺ کو ساتھ بھیجا تا کہ آپ اس کی تعلیم دیں، اس کی تربیت دیں، اس کے معانی سکھائیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے سالہا سال کی محنت کر کے قرآن کریم کی ایک سورۃ سرکار دو عالم ﷺ سے پڑھی۔ اس لیے یہ نعرہ جو لگایا جاتا ہے کہ ہر شخص قرآن و سنت کے بارے میں جو چاہے کہہ سکتا ہے اس کا جواب اس مکمل حدیث کے اندر موجود ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا مجمع الفقہ الاسلامی اسی حدیث کی

تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حدیث پر عمل کرنے کا صحیح نور، اس کی صحیح برکت اور اس کا صحیح فائدہ مجمع کو عطا فرمائے۔

جیسا کہ مجھ سے پہلے کئی حضرات اس پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ اس مجمع (اکیڈمی) کے قیام کا اصل مقصد ان نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے جو اس امت مسلمہ کو درپیش ہیں اور کوئی شک نہیں کہ علماء کے نقطۂ نظر سے یہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے کہ علماء باہم سر جوڑ کر ان مسائل کا حل امت مسلمہ کے سامنے پیش کریں جو آج امت مسلمہ کے لیے چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ وقت کا بہت بڑا تقاضہ ہے کہ علماء یہ کام کریں تو مجھے چند وہ جملے بھی یاد آتے ہیں جو بسا اوقات مختلف حلقوں کی طرف سے بار بار اٹھائے جاتے ہیں کہ علماء کو وقت کے تقاضے کے پیچھے چلنا چاہیے۔ علماء کو وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے۔ یہ جملہ جس اجمال کے ساتھ بولا جاتا ہے اس کا صحیح مطلب بھی ہوسکتا ہے اور غلط مطلب بھی ہوسکتا ہے وقت کے تقاضہ کا مفہوم بسا اوقات لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ مغرب میں جو ہوا چل کر آوے، مغرب سے جو فکر، جو فلسفہ جو نظریہ، جو طرز عمل ہمارے ملکوں میں درآمد ہو گیا، بجائے اس کے کہ اس کو بدلا جائے، اس کے بجائے اسلام کو بدل کر اس کے مطابق کیا جائے، اسے وقت کا تقاضہ قرار دیا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ سود، ربوا کا چلن ہوا تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ صاحب اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان سود کو جوں کا توں قبول کرلیں ...... ایک زمانہ آیا کہ اشتراکیت اور سوشلزم کا ڈنکا بجا، اور انہوں نے دنیا کے اندر اپنے نظریات کو پھیلانا شروع کیا، دنیا کے مختلف ملکوں اور سلطنتوں میں ان کا نظام رائج ہوا۔ اس کا شور شرابہ ہوا تو اس کے نتیجہ میں ایک جماعت نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ سوشلزم کو، اشتراکیت کو اسلام کے مطابق ڈھال دیا جائے وقت کا تقاضہ یہ ہے۔ غرض جو نئی وبا مغرب سے درآمد ہوا اسلام کو اس کے مطابق بنانے اور اس کو اسلام کے اندر داخل کرنے کے لیے وقت کے تقاضہ کا عنوان استعمال کرلیا جاتا ہے۔

لیکن یہ مجمع الفقہ الاسلامی درحقیقت ایسے وقت کے نام نہاد تقاضوں کے پیچھے نہ ہے اور نہ ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ ...... یہاں وقت کے تقاضوں سے مراد یہ ہے کہ بے شمار مسائل آپ کی زندگی کے اندر سے پیش آگئے ہیں کہ ہمیں ان کا صریح حکم کتاب اللہ میں یا سنت رسول اللہ ﷺ میں یا فقہاء کرام کے کلام میں نہیں ملتا، جسے آپ اصلاحی اعتبار سے اجتہاد فی المسائل کہہ سکتے ہیں۔ تو اجتہاد فی المسائل کے ذریعہ ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور وسعت نظر کے ساتھ کیا جائے۔ پورے اسلامی مزاج کے ساتھ کیا جائے، اس کے اندر کسی اجنبی نظریہ اور فلسفہ سے مرعوب ہو کر نہیں، بلکہ حقیقی اسلامی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا حل اسلامی اصولوں کے دائرہ میں رہ کر تلاش کیا جائے اس سے باہر نہ جایا جائے، یہ ہے اس مجمع (اکیڈمی) کا اصل مقصد اور اسی لیے اس میں الحمد للہ مختلف الخیال، مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے موجود ہیں اور پچھلے دنوں جو تحقیقات سامنے آئی ہیں اللہ کے فضل و کرم سے ان میں ان بنیادی اصولوں کا لحاظ نظر آتا ہے۔ امید ہے کہ یہ اکیڈمی ان راستوں پر چلے گی، تو انشاء اللہ اس امت کے لیے بہترین مسائل کا حل پیش کرے گی ...... لیکن میں آخر میں اس سلسلہ کے ایک اہم نکتہ کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، بلکہ توجہ دلانا تو بے ادبی کی بات ہوگی۔ سارے حضرات اکابر علماء ہیں۔ محض تذکیر اور تکرار کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ چوں کہ ہم ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں مغرب کا سیاسی اور فکری تسلط قائم ہے۔ سیاسی اور فکری سیاسی اعتبار سے پوری دنیا کے اوپر مغرب مسلط ہے۔ فکری اعتبار سے بھی مغرب کے افکار اور ان کے نظریات و فلسفے مسلط ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" جس کے پاس ہتھیار، جس کے پاس قوت ہو تو لوگوں کو بات بھی اسی کی سمجھ میں آتی ہے اور جلدی سے سینے میں اتر جاتی ہے۔ تو اس واسطے مغرب نے جو افکار ہمارے یہاں پھیلا دیئے اور صدیوں کی محنت کے بعد پھیلائے۔ ہمارے نظام تعلیم کے اندر وہ افکار پھیلا دیئے۔ ان کی موجودگی میں اس بات کا بڑا قوی اندیشہ ہے کہ بعض ایسی چیزوں کو وقت کی ضرورت قرار دیا جائے جو درحقیقت وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ محض مغرب کے پروپیگنڈہ نے اسے وقت کی ضرورت قرار دے دیا۔ یہ وقت کی ضرورت ایک ایسا مجمل لفظ ہے جس کے اندر بہت کچھ سما سکتا ہے اس لیے وقت کی ضرورت کے ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے ان کی دو دھاریں اپنے ذہن میں رکھنی ضروری ہے۔ یہ دو دھاریں ہتھیار ہیں، اس سے امت مسلمہ کے مسائل بھی حل ہوسکتے ہیں اور اس سے امت مسلمہ کا کام

بھی تمام ہوسکتا ہے۔ اس لیے ہم جب وقت کی ضرورت کا لفظ استعمال کریں تو یہ بات ہمارے ذہن میں ہونی چاہیے کہ محض پروپیگنڈہ کے شور وشغب سے مرعوب ہو کر ہم یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ یہ بھی وقت کی ضرورت ہے۔ بلکہ ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے اپنے اصول، ہمارے اپنے قواعد کے لحاظ سے یہ ضرورت ہے یا نہیں؟

اسی ضمن میں یہ سوال بہ کثرت اٹھتا ہے کہ کیا ان مسائل کو طے کرتے وقت کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کرنی چاہیے یا مختلف فقہی مذاہب کو سامنے رکھ کر اور اس میں جو ضرورت کے مطابق معلوم ہو اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔

میں خاص طور پر آپ حضرات سے باادب عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خاص طور پر اس دور میں معاملات کے شعبہ میں چوں کہ معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں، بے شمار مسائل سامنے آ گئے ہیں، لہٰذا اگر یہ شخص حنفی مذہب کا پیروکار ہے اور وہ کسی ضرورت کی وجہ سے، عموم بلویٰ کی خاطر، وہ مسائل وقت کو حل کرنے کی خاطر دوسرے کسی امام کے قول کو اختیار کر لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ جائز ہے اور نہ صرف جائز ہے بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو باضابطہ یہ وصیت فرمائی تھی کہ اس دور میں جب کہ معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں، اگر آئمہ اربعہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی بھی فقہی مذہب میں کوئی گنجائش مل جائے تو اس دور کے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنی چاہیے۔

لیکن اس میں ادق ترین جو نکتہ ہے جو بسا اوقات افراط و تفریط کا شکار ہو کر فراموش ہو جاتا ہے وہ یہ کہ مختلف مذاہب میں سے علوم بلویٰ کی خاطر کوئی قول اختیار کر لینا اور بات ہے اور اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر مذاہب کو گڈمڈ کرنا بالکل جدا شئے ہے یعنی اگر کوئی شخص اس بنیاد پر کہ میری خواہش نفسانی میرے مفاد ایک مذہب سے پورے ہو رہے ہیں دوسرے سے پورے نہیں ہو رہے ہیں تو اس بنیاد پر اگر وہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تو اس کی کسی کے نزدیک اجازت نہیں، یہ اتباعِ ہویٰ ہے۔ یہ خواہشات نفسانی کی اتباع ہے۔ اس کو تشہی کہا گیا ہے، یہ شہوت پرستی ہے، یہ خواہش پرستی ہے، محض اپنے ذاتی فائدہ یا ذاتی سہولت کی خاطر ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا ہے اس کی مثال آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

آج جب کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یہ عام رجحان پیدا ہوا۔ پورے عالم اسلام میں خاص طور پر عرب ممالک میں یہ رجحان بہت پیدا ہوا کہ ان معاملات کو حل کرنے کے لیے مختلف مذاہب سے رہنمائی حاصل کی جائے اور کسی ایک مذہب کی اتباع نہ کی جائے۔ جب یہ لے آگے بڑھی تو اس نے بعض اوقات یہ صورت اختیار کر لی کہ محض ضرورت کی خاطر نہیں، بلکہ محض ذاتی مفاد، ذاتی سہولت کی خاطر "جمع بین المذاہب" اور "تلفیق بین المذاہب" کا راستہ اختیار کر لیا...... اتباع ہویٰ کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ فتاویٰ کے اندر لکھتے ہیں:

> "اگر کوئی شخص ذاتی خواہش کی خاطر دوسرے مذہب کو اختیار کرتا ہے تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔"

حالانکہ علامہ ابن تیمیہ تقلید کے سخت مخالف ہیں۔ اتباعِ ہویٰ کو وہ بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ اس کی چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔

ایک صاحب سے میری ایک بار ملاقات ہوئی میں اور وہ دونوں سفر پر تھے اور دونوں سفر کے عالم میں مقیم تھے۔ ہفتہ دس دن ایک جگہ ٹھہرنا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ "جمع بین الصلوٰتین" کر رہے ہیں۔ دو نمازوں کو جمع کر رہے ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے۔ امام احمد بن حنبل کے نزدیک جائز ہے، امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمع حقیقی جائز نہیں ہے۔ جمع صوری کو جائز کہتے ہیں۔ تو وہ جمع کر رہے تھے، انہوں نے امام شافعیؒ کے قول پر عمل کیا ہوگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ ہفتہ بھر مقیم رہے اور جمع بین الصلوٰتین کرتے رہے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے شافعی مسلک کو لے لیا تاکہ دو نمازوں کو جمع کرنے کی گنجائش مل جائے، میں نے عرض کیا کہ شافعی مسلک یہ بھی ہے کہ چار دن سے زیادہ ان کے یہاں قصر نہیں ہوسکتی۔ ان کے نزدیک مدتِ قصر صرف چار دن ہے۔ تو چار دن سے زیادہ مدتِ سفر نہیں ہوتی اور آپ تو ہفتہ بھر سے مقیم ہیں۔ تو کہنے لگے کہ میں نے اس معاملہ میں حنفی مسلک کو لے لیا۔ تو میں نے پوچھا کہ کیا آپ دلائل کے نقطۂ نظر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے اور اس معاملہ میں شافعیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے۔ کہنے لگے کہ دلیل کے اعتبار سے تو میں نہیں سمجھتا لیکن میں نے دیکھا کہ یہ

میرے لیے زیادہ سوٹ کرتا ہے تو اس واسطے میں نے اس میں حنفی کا مسلک لے لیا اور اس میں شافعی کا مسلک لے لیا...... تو میری گزارش یہ ہے کہ محض ذاتی سہولت اور ذاتی مفاد، ذاتی راحت کے پیش نظر ایک مسئلہ میں ایک قول کو لے لینا اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے قول کو لے لینا، یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے دین کا حلیہ بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس واسطے کہ ہر مذہب میں جو قول اختیار کیا گیا اس کے کچھ شرائط ہیں اس کے کچھ حدود ہیں۔ آپ نے ان شرائط کو مدنظر نہیں رکھا چھوڑ دیا اور ان شرائط کو مدنظر رکھے بغیر اور اس طرح سے "تلفیق بین المذاهب" کا سلسلہ شروع کردیا تو اس کا نتیجہ سوائے اتباع ہویٰ کے اور کچھ نہیں ہوسکتا، اس لیے میری گزارش یہ ہے کہ بے شک دوسرے مذاہب خاص طور پر معاملات کے اندر دوسرے مذاہب سے لے لینے کی گنجائش ہے لیکن یہ اس وقت جب کہ واقعی کوئی ضرورت داعی ہو اور واقعۃً اس سے مسلمانوں کے کسی اجتماعی مسئلہ کا حل نکالنا مقصود ہو اور اس کا مقصد اتباع ہویٰ، تشہی اور ذاتی منفعت کو حاصل کرنا نہ ہو، اس صورت میں اس کی گنجائش ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ علماء کا مجمع ہے، ان کے سامنے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ اس لیے میں نے تذکیراور تکراراً عرض کردی کہ جب ہم کسی ایک جانب جھکیں تو ایسا نہ ہو کہ دوسری جانب کا خیال ہمارے دل سے اوجھل ہو...... یہ کام بڑا نازک ہے، یہ پل صراط ہے۔ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں اس کا خیال رکھنا ہے کہ وقت کی ضروریات پوری ہوں، مسلمانوں کے مسائل حل ہوں اور دوسری طرف اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ آپ مغرب کے اس جھوٹے پروپیگنڈے سے مرعوب نہ ہوں جو ہر نئی وبا کو وقت کی ضرورت کہہ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس واسطے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم اس کام کو انجام دیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس شریعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ یہ آنے والے ہر بڑے سے بڑے مسئلہ کا حل رکھتی ہے اور جب یہ تصور آپ کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیں گے تو ان شاء اللہ امت کے مسائل حل ہوں گے ...... جیسا کہ مجھ سے پہلے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مدظلہم نے فرمایا کہ عالم کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ یہ حرام ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اگر کسی چیز کو حرام کہا ہے اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے تو اس کا متبادل حلال طریقہ بھی بتائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جب حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی کہ بادشاہ نے خواب دیکھا ہے کہ:

"انی اری سبع بقرات سمان یاکلھن سبع عجاف"۔

جب یہ پوچھا تو یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے لیکن اس قحط سے بچنے کا راستہ پہلے بتادیا:

"تزرعون سبع سنین دابا... فما حصدتم فذروہ فی سنبله..."

تعبیر تو بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے اور پہلے قحط سے بچنے کا یہ راستہ بتایا کہ سات سال تک خوب جم کر زراعت کرو، اور خوشہ کے اندر گیہوں کو چھوڑ دو۔ تو بچنے کا طریقہ پہلے بتادیا اور خواب کی تعبیر بعد میں بتائی...... تو عالم کا کام محض حرام قرار دے کر ختم نہیں ہوجاتا، بلکہ متبادل راستہ بتانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ اکیڈمی درحقیقت اسی لیے قائم کی گئی ہے۔ اس کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے علوم وفنون کے ماہرین کی بھی ضرورت ہوگی۔ متبادل طریقوں کے سمجھنے اور اس کے تعین کے لیے وہ طریقے تجویز کئے جاسکیں جو قابل عمل ہیں۔

الحمدللہ! دیکھتا ہوں کہ مجمع الفقہ الاسلامی نے اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے دیگر علوم وفنون کے ماہرین سے بھی استفادہ کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے اس اکیڈمی کو اپنے مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائے، قدم قدم پر اس کی نصرت ودستگیری فرمائے، اس کے راستے کی دشواریوں کو دور فرمائے اور دین کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں اخیر میں ایک بار پھر اس کانفرنس کے منتظمین کا اور تمام حاضرین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گزارشات کو غور وتوجہ کے ساتھ سنا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

# اشتراط فی النکاح

(نکاح میں شرط اور مشروط مہر فقہ اسلامی کی روشنی میں)
ازدواجی زندگی کی مشکلات اور ان کے حل کی ایک کوشش

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیرِ سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارُالاشاعت
اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

# ابتدائیہ

انسانی سماج یوں تو مختلف رشتوں اور ناطوں سے مرکب ہے، مگر ان تمام رشتوں کا سرچشمہ نکاح ہے، نکاح کے ذریعہ ازدواجی رشتہ کی تشکیل ہوتی ہے، پھر شوہر و بیوی ہی ماں باپ بنتے ہیں اور یہی رشتہ پھلتے پھیلتے ایک پورے خاندان کو وجود میں لاتا ہے، اس لئے خاندانی نظام میں استحکام اور خوشگواری کا اصل راز زوجین کے درمیان بہتر تعلقات، ایک دوسرے کے حقوق کی بہتر طور پر ادائیگی اور باہمی ایثار و محبت ہے، قرآن مجید نے اسی کیفیت کو ''معاشرت بالمعروف'' سے تعبیر کیا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حسن سلوک اور بہتر رویہ محبت کی دین ہے اور محبت دستور و قانون سے زیادہ جذبات کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہے، اسی لئے خطبۂ نکاح میں بار بار ''تقویٰ'' کی تلقین کی گئی ہے کہ اگر کوئی دل خدا کے خوف سے عاری اور دوسرے فریق کی محبت سے خالی ہو تو قانون کی تلوار کا اس پر اثر انداز ہونا دشوار ہے، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انسان جو دلوں کی آواز کو سن اور قلوب کے حال پڑھ نہیں سکتا، ممکن حد تک اپنی اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے کچھ احکام و قوانین کو سہارا بنانے پر مجبور ہے، یہی وجہ ہے کہ عبادات کے بعد خاندانی زندگی کے احکام قرآن و حدیث میں جس تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں شاید کسی اور شعبۂ زندگی کی جزئیات پر اس تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، پھر ان اصول و جزئیات کی روشنی میں فقہاء نے اسلام کا ایک مکمل و مربوط اور متوازن معاشرتی نظام مرتب کیا ہے، جن کو قدیم فقہاء ''مناکحات'' یا ''عقد معاوضہ غیر مالی'' کہا کرتے تھے اور آج ان کو ''احوال شخصیہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ معاشرتی قوانین آج بھی سب سے مکمل، فطرت سے ہم آہنگ اور متوازن سماجی قوانین ہیں، حالانکہ اخلاقی انحطاط، اسلامی تعلیمات سے دوری، غیر مسلم سماج سے تاثر اور اسلام کے نظام عدل و قضاء سے محرومی و مجبوری کے باعث ہمارے موجودہ حالات ان فقہاء کے عہد سے بہت کچھ مختلف ہیں، پھر بھی امت کو ان مجتہدین امت کا احسان مند اور شکر گزار ہونا چاہئے کہ ان بدلے ہوئے حالات میں بھی ہمارا فقہی ذخیرہ ہماری رہنمائی کرتا ہے اور قانون شریعت کے دائرہ میں ہماری مشکلات اور دشواریوں کا حل نکلتا ہے، اسی پس منظر میں مورخہ ۲۲۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو اسلامک اکیڈمی (انڈیا) نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے احاطہ میں اس کے شعبہ دینیات کے تعاون سے ''اشتراط فی النکاح'' کے عنوان سے سمینار منعقد کیا تھا۔

(۱) سوالنامہ:

(۲) خلاصۂ جوابات:......اس میں ہر سوال سے متعلق جوابات کا خلاصہ ہے۔

(۳) عرض مسئلہ:......اس میں ہر زیر بحث مسئلہ سے متعلق تمام مقالہ نگاروں کے نقطۂ نظر اور دلائل کو سامنے رکھ کر عارض نے کسی رائے کو ترجیح دی ہے اور وجوہ ترجیح پیش کی ہے۔

(۴) مقالات:......اس میں زیر بحث موضوع سے متعلق تفصیلی مقالات ہیں۔

(۵) مختصر تحریریں:......اس میں ان مسائل سے متعلق مختصر جوابات ہیں جو اکیڈمی کو موصول ہوئے ہیں۔

(۶) اقتباسات:......اس میں زیادہ تر طلبۂ تخصص فی الفقہ کے مقالات کے خلاصہ یا اس کا کچھ حصہ شریک کیا گیا ہے۔

(۷) تجاویز:......آخر میں ان مسائل سے متعلق وہ تجاویز ہیں جن کو سمینار کے شرکاء نے بہ اتفاق رائے طے کیا ہے۔

اس کی وضاحت مناسب محسوس ہوتی ہے کہ مجلہ کی ضخامت کو معتدل اور مناسب رکھنے کی غرض سے اس بار مقالات پر نظر ثانی کی گئی ہے، جن مقالہ نگاروں کے یہاں ایک ہی بات تکرار کے ساتھ آ گئی تھی، ان میں مکررات حذف کردئے گئے ہیں، جہاں زیادہ پھیلاؤ اور طول کلام تھا، حالانکہ مختصر عبارت سے بات پوری ہوجاتی تھی، وہاں کسی قدر اختصار کردیا گیا ہے، بعض مقامات پر طویل عربی عبارتیں حذف کرکے ان کا ترجمہ مع حوالہ باقی رکھا گیا ہے، بعض طلبۂ تخصص کے مقالے مختصر اور جامع تھے، ان کو مکمل شریک اشاعت رکھا گیا ہے اور بقیہ مقالات میں ان کا خلاصہ یا ان کے اقتباسات شریک اشاعت ہیں۔

از راہ سہولت اس مجلہ کی کتابت بھی کمپیوٹر پر کی گئی ہے، اس سے پہلے ضرورت وحاجت سے متعلق مقالات بھی اسی طرح شائع کئے گئے تھے، اس سے ضخامت کو کم کرنے میں بھی مدد ملتی ہے اور کام بھی نسبتاً جلد ہوجاتا ہے، پروف ریڈنگ پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے، اس کے باوجود اطمینان نہیں کہ اغلاط بالکل نہ ہوں، اس سلسلہ میں قارئین سے عفوخواہ ہوں، کمپیوٹر کی کتابت میں حواشی کا نیچے درج کرنا دشوار ہوتا ہے اور مقالہ کے اختتام پر تمام حوالہ جات کو جمع کرنا قارئین کے لئے دشواری کا باعث ہوتا ہے، اس لئے عبارت ہی میں قوسین میں حوالہ جات درج کئے گئے ہیں۔

یہ مجلّات خالص علمی وفقہی موضوع پر ہیں اور اپنے موضوع پر ایک بہترین علمی کلید اور دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ علماء وقانون داں اور دانشور حضرات ہی کے لئے زیادہ باعث دلچسپی ہوسکتا ہے، مدارس وجامعات کے لئے بھی یہ ایک عظیم الشان تحفہ ہے، اگر ادارے، لائبریریاں اور اہل علم ودانش تھوڑی سی توجہ کریں اور ان مجلّات کو خریدنے کا اہتمام کریں تو بڑی آسانی سے یہ فروخت ہوجائیں اور اکیڈمی کو مالی زیرباری سے نجات ملے، امید ہے کہ ہمارے محسنین اس طرف خصوصی توجہ فرمائیں گے۔

وباللہ التوفیق

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

(سکریٹری جنرل)



# پیش لفظ

انسان کو زندگی گزارنے کے لئے جیسے روٹی، کپڑے اور مکان کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح خاندان بھی اس کی ایک اہم ضرورت ہے، خاندان کے بغیر زندگی قید تنہائی سے کم نہیں ہے، کیونکہ انسان کو زندگی کے ہر مرحلہ میں خاندان کا تعاون درکار ہے، خاندان کی شرکت کے بغیر اس کی خوشی نامکمل ہوتی ہے اور خاندان کی رفاقت اور اس کی دلداری نہ ہو تو معمولی سا غم بھی اس کے لئے جاں گسل بن جاتا ہے، اسی لئے اسلام میں خاندانی نظام کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اللہ تعالی نے اس کا بطور احسان کے ذکر فرمایا ہے:

"إنا جعلنا كم شعوبا وقبائل لتعارفوا".

چنانچہ ہر شادی شدہ انسان کے ساتھ خاندان کی تین شاخیں ہوتی ہیں: ددھیال، ننہیال اور سسرال۔ خاندان کے یہ تینوں حصے نکاح ہی کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں، ددھیال، اور ننہیال والدین کے نکاح سے اور سسرال خود اپنے نکاح سے، اسی لئے اسلام میں نکاح کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور قرآن مجید میں نکاح سے متعلق بعض احکام جس وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں نماز روزہ وغیرہ کے احکام پر بھی اتنی تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ نکاح کی بنیاد پر عائد ہونے والے حقوق وفرائض کو بھی قرآن وحدیث میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور فقہاء نے اپنے اجتہاد کے ذریعہ اس کو مزید واضح فرمایا ہے، تاہم چونکہ اس رشتے کی بنیاد اللہ کے خوف، زوجین کے درمیان باہمی محبت اور ایک دوسرے کے لئے جذبہ ایثار پر ہے، اسی لئے بعض امور کی قصداً تحدید وتعیین اور اس میں کسی خاص پہلو کو لازم قرار دینے سے گریز کیا گیا ہے، لیکن بعض اوقات دوسرے فریق کی جانب سے زیادتی کو روکنے کے لئے ایک گونہ تحدید کی ضرورت پڑ جاتی ہے، ایسی تحدیدات اگر فریقین کے درمیان وعدہ وشرط کے درجہ میں طے کر دی جائیں اور وہ احکام شریعت کے خلاف نہ ہوں تو معتبر ہوتی ہیں۔ نکاح میں معاملہ کا ایک فریق۔ شوہر۔ جسمانی اعتبار سے بھی طاقتور ہوتا ہے اور مالی وسائل بھی اس کے پاس زیادہ ہوتے ہیں، نیز اسے طلاق کا اختیار بھی دیا گیا ہے، اس لئے بعض دفعہ عورتیں ضرورت محسوس کرتی ہیں کہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے ایسی شرطیں عقد نکاح میں شامل کریں جو ان کو امکانی زیادتی سے بچا سکے، نیز سوال یہ ہے کہ اس طرح کی شرطیں معتبر ہوں گی یا نہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ کوئی بھی ایسی شرط جو شریعت کے مقرر کئے ہوئے حقوق وفرائض کو مؤکد کرتی ہو معتبر ہوگی، کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے معاملہ کا حصہ ہے، اسی طرح جو شرطیں شریعت کے مقرر کئے ہوئے بنیادی اصولوں کے خلاف اور ان سے متصادم ہوں، ان کا اعتبار نہیں ہوگا، کیونکہ جس بات کی صراحت نص میں موجود ہو یا جس پر امت کا اجماع ہو گیا ہو وہ اجتہاد یا غور مکرر کا محل نہیں ہے۔ کچھ ایسی شرطیں بھی ہو سکتی ہیں جن کی کتاب وسنت میں مثبت یا منفی طور پر صراحت نہیں ہے، یہی اصل میں غور وفکر کا محل ہیں، بالخصوص ہندوستان جیسے ملکوں میں جہاں اسلامی حکومت اور نظام عدل موجود نہیں ہے، سماجی ظلم وزیادتی کو روکنے میں اس سے مدد لی جا سکتی ہے، مثلاً اگر کوئی عورت شرط عائد کر دے کہ اس کی موجودگی میں شوہر دوسرے نکاح کا مجاز نہیں ہوگا، یا مثلاً شوہر اسے اس کے شہر یا اس کے ملک سے باہر نہیں لے جائے گا، تو اس سے ایسے مردوں کی زیادتی کو روکا جا سکتا ہے جو کسی سنجیدہ جذبہ کے تحت دوسری شادی نہیں کرتے، بلکہ انتقامی جذبہ کے تحت دوسری شادی کرتے ہیں یا جس سے اندیشہ ہو کہ وہ اپنی بیوی کو ایسے دور دراز علاقہ میں رکھنے کی کوشش کرے گا، جہاں اس کی جان ومال اور عزت وآبرو کو خطرہ ہے۔ اسی طرح اگر بیوی نے مہر کو دو الگ حالتوں کے ساتھ مشروط کر دیا مثلاً یہ کہ اگر تم نے میرے موجودگی میں دوسرا نکاح کیا تو میرا مہر ایک لاکھ روپے ہوگا ورنہ پچیس ہزار ہوگا، تو اس طرح ایسے شوہر کو ایک حد تک لگام دی جا سکتی ہے جو کسی معقول وجہ کے بغیر دوسری

شادی کرنا چاہتا ہو۔

شرط ہی سے متعلق ایک مسئلہ ''تفویض طلاق'' کا ہے، اگر کسی عورت نے اس شرط پر نکاح یا کہ مطلقاً یا بعض خاص صورتوں میں اسے اپنے آپ پر طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوگا تو کیا یہ شرط معتبر ہوگی؟ تاکہ شوہر کے ظلم وزیادتی کی صورت میں وہ عدالتوں کے چکر لگائے اور عدالتی پیروی کے کثیر اخراجات سے دوچار ہوئے بغیر خود اپنے مسئلہ کو حل کرلے؟ ان مسائل میں فقہاء کے درمیان کسی قدر اختلاف رائے ہے، تفویض طلاق حنفیہ کے نزدیک معتبر ہے، مہر کے مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کی رائیں مختلف ہیں اور نکاح سے متعلق عائد کی جانے والی ایسی شرطیں جن کی قرآن وحدیث میں نہ نفی کی گئی ہے اور نہ اثبات۔ امام احمدؒ اور بعض دیگر فقہاء کے نزدیک دیانتاً اور قضاءً معتبر ہوں گی۔

اسی پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے آٹھویں فقہی سمینار منعقدہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بتاریخ ۲۲ / تا ۲۴ / اکتوبر ۱۹۹۵ء میں اس موضوع پر بھی بحث کیا تھا کہ کیا موجودہ حالات میں تفویض طلاق کے اصول سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، صاحبین کے مسلک کے مطابق مہر مشروط قابل اعتبار ہے اور کیا نکاح میں لگائی جانے والی شرطوں کو معتبر مانا جائے گا؟ ان مسائل پر کافی گفتگو ہوئی، خاصا مناقشہ ہوا اور اخیر میں جو بات طے پائی وہ فیصلہ کے عنوان سے اس مجموعہ میں موجود ہے۔

میرا خیال ہے کہ برصغیر میں پہلی بار اس موضوع پر اتنی تفصیل سے لکھا گیا، غور کیا گیا اور کافی بحث وتمحیص کے بعد ایک متوازن اور ضرورت سے ہم آہنگ فیصلہ کیا گیا، چنانچہ یہ مجموعہ اسی موضوع سے متعلق مقالات ومناقشات کا مجموعہ ہے، اس میں پہلا باب تمہیدی امور کا ہے، دوسرے باب میں تفصیلی مقالات ہیں، تیسرے باب میں مختصر تحریریں ہیں، چوتھے باب میں اشتراط فی النکاح، تفویض طلاق اور اشتراط فی المہر سے متعلق ان مقالات کے اقتباسات شامل کئے گئے ہیں جو طلبہ عزیز نے لکھے تھے اور اب ان میں سے زیادہ تر حضرات تدریس وافتاء کی مسند کو رونق بخش رہے ہیں، پانچواں باب سمینار کے مناقشہ پر مشتمل ہے۔

اکیڈمی نے ہمیشہ سے سماجی مسائل کو خصوصی اہمیت دی ہے، اور ایسے موضوعات کو اٹھایا ہے جو ازدواجی زندگی کی دشواریوں کو حل کرنے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں، یہ بھی ان میں سے ایک ہے، اور اپنے اثرات ونتائج کے اعتبار سے دوررس نتائج کا حامل ہے۔ یوں تو اس تحریر سے عام مسلمانوں اور اصحاب ذوق کو بھی فائدہ پہنچے گا، لیکن خاص کر ارباب افتاء اور قانون دانوں کے لئے یہ نہایت اہم ہے اور بعض سماجی دشواریوں کا بہترین حل ہے۔ یہ مجموعہ اس سے پہلے بھی شائع ہو چکا ہے، اب دوبارہ اکیڈمی کے شعبہ علمی کے رفقاء مولانا امتیاز احمد قاسمی اور مولانا محمد ہارون رشید ندوی نے بڑی توجہ سے اس کی ترتیب اور ایڈیٹنگ کا کام کیا ہے، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو قبول عطا فرمائے اور اکیڈمی کا علمی سفر تیز گامی کے ساتھ جاری رہے۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(جنرل سکریٹری)

۲/ جون ۲۰۰۹ء

۸/ جمادی الاخری ۱۴۳۰ھ

☆☆☆

سوالنامہ:

# نکاح میں شرط اور مشروط مہر فقہ اسلامی کی روشنی میں

نکاح مرد اور عورت کے درمیان انجام پانے والا قابل احترام عقد ہے جس سے عائلی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، نکاح کے ذریعہ دو اجنبی مرد و عورت ایک ساتھ مودت و محبت اور اعتماد کی فضا میں زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتے ہیں، اسلام رشتۂ نکاح کو پائیدار اور مستحکم دیکھنا چاہتا ہے، اسی لئے اس نے نکاح کے ساتھ ایسی شرطیں عائد کی ہیں جن کے نتیجے میں رشتۂ نکاح دائمی رفاقت کی شکل اختیار کرلے اور میاں بیوی کے عائلی حقوق کا پورا تحفظ ہو سکے۔

نکاح کے نتیجہ میں میاں بیوی دونوں پر کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور دونوں کو کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں، ان حقوق و فرائض کو شریعت نے کلیۃً فریقین کی رضامندی پر نہیں چھوڑا ہے کہ وہ دونوں عقد نکاح کرتے وقت اپنے حقوق و فرائض جس طرح چاہیں طے کرلیں، بلکہ مقاصد نکاح کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور دونوں کی فطرت و صلاحیت کو مدنظر رکھ کر دونوں کے کچھ حقوق و فرائض اللہ تعالیٰ نے خود متعین فرما دئے جن میں فریقین باہمی رضامندی سے بھی رد و بدل نہیں کرسکتے، اسلامی شریعت کی طرف سے میاں بیوی کے بعض بنیادی حقوق و فرائض کی تعیین اسی لئے کردی گئی ہے تاکہ مضبوط فریق کمزور فریق کا استحصال نہ کرسکے، اور فریق ثانی کی کمزوری اور مجبوری دیکھ کر نکاح کے وقت اپنی من پسند شرطیں عائد کرکے اپنے فرائض سے گریز کی راہ نہ اپنائے، اس پس منظر میں ہمارے فقہاء نے کتاب و سنت کی روشنی میں شرائط نکاح پر بحث کی ہے۔

عقد نکاح کے ساتھ عائد کردہ شرطوں کو ہم تین قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

(۱) ایسی شرائط جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی نئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ خود عقد نکاح سے جو ذمہ داری کسی فریق پر عائد ہوتی ہو، اسی کو شرط کی صورت میں عقد نکاح کے وقت ذکر کردیا گیا ہو، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا۔

(۲) نکاح کے وقت کسی فریق کا ایسی کوئی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، مثلاً شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان و نفقہ اس کے ذمہ نہیں ہوگا۔

(۳) نکاح کے وقت کسی فریق کا کوئی ایسی شرط عائد کرنا جو (۱) اور (۲) میں سے کسی کے دائرہ میں نہیں آتی ہے، اس کے نتیجے میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل نہیں ہوتا ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل ہوتا اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی یا ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہ ہوتی، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہ کرے گا یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا۔

او پر ذکر کردہ تینوں قسم کی شرائط کے بارے میں شریعت کا حکم مع دلائل مطلوب ہے۔

الف۔ دوسری قسم کی شرط لگانا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ ایسی شرط لگانے سے عقد نکاح پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے، نکاح منعقد ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر منعقد ہوتا ہے تو کیا اس شرط کی پابندی متعلقہ فریق کے لئے ضروری ہے؟

ب۔ تیسری قسم کی شرائط کا کیا حکم ہے؟ یہ شرطیں لازم الایفاء ہیں یا نہیں، ان سے عقد نکاح کی صحت پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

ج۔ نکاح کے وقت اگر عورت یہ شرط لگائے کہ اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا یا فلاں فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، اگر شوہر اس شرط کو تسلیم کرتا ہے تو اس شرط کی شرعاً کیا حیثیت ہے، کیا اس کی وجہ سے عورت کو طلاق کا اختیار شوہر کو باقی رہتا ہے یا نہیں؟

نکاح میں شرط کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ عقد نکاح سے پہلے شرائط طے ہوجائیں اور اس تحریر پر طرفین کی دستخط ہوجائے۔

۲۔ عقد نکاح میں ہی ان شرائط کا ذکر کیا جائے، ایجاب مشروط ہو یا ایجاب مطلق ہو اور قبول مشروط ہو۔

۳۔ عقد نکاح کے بعد مابین طرفین کوئی شرائط نامہ تحریر کیا جائے۔

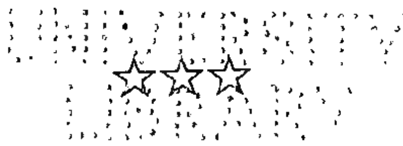
ہر سہ صورتوں کے کیا احکام ہوں گے اور شرعاً ان میں کیا پابندیاں ہوں گی؟ اس تفویض و اختیار کے ساتھ مزید احتیاط کے لئے کیا قیدیں بڑھائی جاسکتی ہیں جو کہ جانبین کے لئے مفید ہوں اور بے جا استعمال کا سد باب کریں۔

مسئلہ کا ایک پہلو اور اہم ہے کہ شریعت نے طلاق کا اختیار شوہر کے ہاتھ میں رکھا ہے، تفویض کے نتیجہ میں یہ اختیار عورت کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، کیا اس سے مصالح شرع کے ضائع ہونے کا اندیشہ تو نہیں؟ تو کیا مصالح کی حفاظت کے لئے اس تفویض کے ساتھ مزید احتیاط کے لئے کچھ قیدیں بڑھائی جاسکتی ہیں جو کہ مفید مقصد ہوں اور بے جا تصرف کا سد باب کریں۔

طلاق ایک ناپسندیدہ چیز ہے اور ساتھ ہی بعض ناگزیر حالات میں ایک ضرورت بھی، لیکن اس کے غلط اور بے جا استعمال سے بڑی خرابیاں پیدا ہورہی ہیں جن سے مرد و عورت اور خاندان سب ہی متاثر ہوتے ہیں، لہٰذا طلاق کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے اگر عقد نکاح کے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کا مہر بیس ہزار اور اگر اس نے طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار ہے، کیا اس طرح مہر طے کرنا جائز اور معتبر ہوگا اور دونوں شکلوں میں مہر مسمی لازم ہوگا، اس طرح مہر طے کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شوہر مہر کی خطیر رقم سے بچنے کے لئے ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا غیر مشروع اقدام نہ کرے، اس سوال کو حل کرنے میں فقہ کے اس مشہور مسئلہ سے مدد لی جاسکتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر نکاح کے وقت اس طرح مہر طے ہو کہ شوہر بیوی کو اس کے آبائی وطن سے باہر نہیں لے گیا تو مہر ایک ہزار ہوگا اور اگر بیوی کو اس کے آبائی وطن سے باہر لے گیا تو اس کا مہر دو ہزار ہوگا، اس مسئلہ میں صاحبین کے نزدیک دونوں شرطیں درست قرار پاتی ہیں، اور ہر دو صورت میں متعین کردہ مہر (مہر مسمی) لازم ہوتا ہے، اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک جس مہر کا پہلے ذکر کیا گیا ہے اس کا تسمیہ صحیح قرار پاتا ہے اور پہلی شرط پائی جانے کی صورت میں متعین کردہ مہر (مہر مسمی) لازم ہوتا ہے اور دوسری صورت میں ذکر کردہ مہر کا اعتبار نہیں ہوتا، بلکہ دوسری شرط پائی جانے کی صورت میں مہر مثل لازم ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ مہر مسمی سے متجاوز نہ ہو، تعیین مہر کے اس طرح کے چند دوسرے مسائل بھی فقہ میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے چند کا حوالہ سوالنامہ کے ساتھ ہم رشتہ ہے، کیا فقہ میں مذکور ان مسائل کے پیش نظر تسمیہ مہر کی وہ صورت درست نہیں قرار دی جاسکتی، اور کیا طلاق کے واقعات کو روکنے کے لئے اس مسئلہ میں صاحبین کے قول کو فتویٰ کے لئے اختیار کیا جاسکتا ہے؟

سوال ۲۔ اگر نکاح کرتے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس عورت کا مہر تیس ہزار ہوگا، اور اگر اس کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر پندرہ ہزار ہوگا، تو ایسی صورت میں شریعت کے نزدیک دونوں شرطیں معتبر اور لازم العمل ہوں گی یا نہیں؟

سوال ۳۔ آج کل عورتوں میں بھی ہر طرح کی اعلیٰ تعلیم کا رواج ہوتا جارہا ہے، اور تعلیم کے بعد بہت سی عورتیں مختلف ملازمتوں سے وابستہ ہوجاتی ہیں، یا وابستہ ہونے کی جدوجہد میں لگی ہوتی ہیں، ایسی عورتیں اگر نکاح کے وقت اپنے ہونے والے شوہر سے یہ شرط لگاتی ہیں کہ شوہر انھیں ملازمت کرنے سے نہیں روکے گا اور اس شرط کو ہونے والا شوہر عقد نکاح کے وقت قبول کرتا ہے تو اس شرط کی شرعاً کیا حیثیت ہوگی، شوہر کے لئے اس شرط کی پابندی ضروری ہوگی یا نہیں، اور اگر شوہر اس شرط کو قبول کرنے کے باوجود عورت کو سلسلہ ملازمت ختم کرنے کا حکم دیتا ہے یا نئی ملازمت کرنے سے روکتا ہے تو عورت کے لئے شوہر کے اس حکم کی تعمیل ضروری ہوگی یا نہیں۔



# حوالہ جات

''إذا تزوجها على ألف إن لم تكن له امرأة وعلى ألفين إن كانت له امرأة أو على ألف إن لم يخرجها من البلدة۔ وعلى ألفين إن أخرجها فالنكاح جائز، والمعتبر فى المهر الشرط الأول إن وفى به فلها المسمى على ذلك الشرط۔ وإن لم يف فلها مهر المثل لا ينقص من الأقل ولا يزاد على الأكثر. وقال أبو يوسف ومحمد: الشرطان جائزان وفى الهداية: وقال زفر رحمه الله: الشرطان جميعا فاسدان ويكون لها مهر مثلها لا ينقص على الألف ولا يزاد على ألفين۔ إذا تزوج امرأة على ألف، ان كانت قبيحة وعلى ألفين إن كانت جميلة. فإن كانت جميلة فلها ألفان وإن كانت قبيحة فلها ألف. وهذا بلا خلاف. والفرق أن فى مسئلة الإخراج دخلت المخاطرة فى التسمية الثانية فإنها لا تدرى أن الزوج يخرجها أو لا يخرجها. فى مسئلة القبح والجمال لا مخاطرة أصلا. فإن المرأة على صفة واحدة لكن الزوج لا يعرف وجهالته لا توجب بالخطر''

(الفتاوىٰ التاتار خانية۔ كتاب النكاح۔ ۳۔۱۰۲،۱۰۱)

كذا فى (بدائع الصنائع ۲۔۲۸۳ دارالكتب العلمية بيروت،كذ فى الفتاوىٰ الهندية۳۰۹،۳۰۷ دارالفكرو كذا فى البحرالرائق۔ صفحة ۱۶۲،۱۵۹؍۲ المكتبه المساجدية۔ كوئٹه۔ پاكستان)

كذا فى (الدر المختار مع رد المحتار ۳۔۱۲۳،۱۲۲ دارالفكر

المبسوط للسرخسى۵۔۹۱،۹۰ دارالفكر

الهداية مع فتح القدير ۳۔۲۲۲،۲۲۱ احياء التراث العربي۔ بيروت)



## اکیڈمی کا فیصلہ:

# نکاح میں شرط اور مشروط مہر فقہ اسلامی کی روشنی میں

۱۔ نکاح میں اگر ایسی شرطیں لگائی جائیں جو نکاح سے واجب ہونے والی ذمہ داریوں اور حقوق ہی کو موکد کرتی ہوں تو وہ معتبر ہیں، اور ان کو پورا کرنا واجب ہے

۲۔ نکاح کے وقت ایسی شرائط عائد کرنا جو عقد نکاح کے تقاضوں کے خلاف ہیں، یا شریعت نے ان سے منع کیا ہو غیر معتبر ہیں، جیسے شوہر کا نفقہ نہ دینے کی شرط لگانا، یا جہیز و تلک کی شرط لگانا۔

۳۔ نکاح کے وقت ایسی باتوں کی شرط لگائی جائے کہ شریعت نے ان کو لازم و واجب قرار دیا ہے اور نہ ان سے منع کیا ہے، تو ایسی شرطوں کو پورا کرنا واجب ہے۔



# ایک عملی قدم

اشتراط فی النکاح کے موضوع پر بحث کے نتیجہ میں اکیڈمی نے مسلم سماجی حالات و مسائل، ملک بھر کے شرعی دار القضاء میں دائر اور فیصل ہوئے مقدمات، نیز سرکاری عدالتوں میں پیش مسلمانوں کے کیسیز کے تناظر میں ایک تفصیلی نکاح نامہ تجویز کرکے تمام مکاتب فکر کے علماء و اصحاب افتاء، نیز ماہرین قانون کے غور و خوض کے لئے جاری کیا اور بھیجا، جس پر ملک کے مختلف حصوں سے ۱۰۰ اہم علماء نے اپنی رائے ظاہر کی اور نکاح نامہ میں درج مختلف دفعات اور شرائط کے علاوہ تفویض حق طلاق کے معاملہ پر اصول فقہیہ کے دائرہ میں گرانقدر آراء پیش کیں، جس میں اس جہت میں اقدام کی ضرورت کا اعتراف بھی شامل ہے، کیونکہ وہ قرآنی تصور، خاندان اور طریقہ عدل فی المعاملات کے مطابق ہے۔

علماء کے تمام جوابات کو مدنظر رکھتے ہوئے اکیڈمی نے دوبارہ اس مسئلہ سے متعلق ایک جامع واضح تحریر اور منضبط نکاح نامہ علماء کی خدمت میں ارسال کیا، جسے استفادہ کے لئے درج کیا جارہا ہے، ہندوستان کے موجودہ حالات نیز مسلمانوں میں علاقائی و تہذیبی و سماجی درجات کے تفاوت کے پس منظر میں منضبط نکاح نامہ کے نتیجہ خیز و مفید تر ثابت ہونے کی توقع ہے۔

(ادارہ)



# ازدواجی زندگی کی مشکلات اور ان کے حل کی ایک کوشش

ایک بیوی کے موجود رہتے ہوئے دوسری خاتون سے نکاح کرنا شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ ہر دو بیویوں کے درمیان ناانصافی کا خطرہ نہ ہو، اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ شوہر دو بیویوں کے ساتھ برابر برتاؤ کر سکے گا تو اسے ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرنا چاہئے۔

''فَإِنْ خِفْتُمْ أَنْ لاَّ تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً'' (سورہ نساء:۳)

اور نص قرآنی کی رو سے یہ بات قطعاً جائز نہیں کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو کالمعلقہ چھوڑ دے کہ اسے نہ شوہر والی کہا جاسکے اور نہ مطلقہ یا بیوہ۔

''فَلاَ تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ'' (سورہ نساء:۱۲۹)

آج عام طور پر جب میاں بیوی کے تعلقات معتدل اور نارمل ہوں، دوسرا نکاح نہیں کیا جاتا، بلکہ جب پہلی بیوی سے تعلقات بگڑتے ہیں تو عام طور پر اسے اس کے میکے بیٹھا دیا جاتا ہے، یا پھر اس پر کوئی الزام یا تہمت لگائی جاتی ہے، اس کا کھانا خرچہ بند کر دیا جاتا ہے اور دوسری طرف شوہر دوسری کسی عورت کو بیاہ کر لے آتا ہے، نہ وہ پہلی بیوی کو طلاق دیتا ہے، نہ اس کے حقوق ادا کرتا ہے، بلکہ بسا اوقات اپنی پہلی بیوی سے پیدا ہونے والے بچوں کو بھی اس بیوی کے ذمہ چھوڑ دیتا ہے، ان کے اخراجات بھی ادا کرنے کی بات نہیں سوچتا ہے، جو لوگ عام سماج کے حالات پر نظر رکھتے ہیں اور اس طرح روزمرہ پیش آنے والے واقعات سے خوب باخبر ہیں، ظاہر ہے کہ نکاح ثانی شرعاً اجازت کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے فائدہ اٹھا کر اللہ کی کمزور مخلوق پر ظلم وستم روا رکھا جائے۔

کچھ تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جو نکاح ثانی کے بندھے ٹکے انداز پر پہلی بیوی کو خرچ تو دے دیتے ہیں، لیکن اس کو بحیثیت شوہر جو محبت دینی چاہئے، یا اس کے ساتھ جس طرح رہائش کرنی چاہئے، اس سے بالکل گریز کرتے ہیں، اس طرح شرعی اجازت کا ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور ہوس کے بندے اجازت پر عمل کرتے ہیں اور اللہ کے حکم عدل سے گریز کرتے ہیں، یعنی اللہ کے احکام میں کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ سے انکار کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس صورت حال کی اصلاح ضروری ہے

دوسری طرف یہ بھی واقعہ ہے کہ نکاح ثانی کی اجازت بہت بڑی حکمت پر مبنی ہے، بہت سے فتنوں کے دروازوں کو بند کرتی ہے اور بہت سے معاشی ومعاشرتی اور نفسیاتی حالات ایسے ہیں، جن میں نکاح ثانی ضروری ہوتا ہے، نکاح ثانی کے بعض اسباب تو ظاہر ہیں جو عام لوگوں کی سمجھ میں بھی آسکتے ہیں، مثلاً عورت کا جنون مطبق میں مبتلا ہونا، یا کسی مرض مزمن کا شکار ہونا جس کی وجہ سے وہ فرائض زوجیت ادا کرنے کے لائق نہ ہو، لیکن بعض ایسے اسباب بھی ہو سکتے ہیں جو عام لوگوں کی نظروں سے مخفی ہوں، لیکن شوہر اسے محسوس کرتا ہو، بعض اوقات سماجی اور معاشی حالات کا بھی تقاضا ہوتا ہے، اور بعض علاقوں میں کچھ عرصہ پہلے تک ایسے بڑے کسان جن کی جائداد اور پیداوار کا سنبھالنا مشکل کام ہوتا تھا، وہ ایک سے زائد نکاح کرتے اور اس طرح گھر کے نظام کو بہتر طور پر چلانے کے لئے انہیں ایک سے زائد بیویوں کی ضرورت ہوتی، بعض اوقات ہنگامی حالات میں مردوں کی تعداد کا کم ہو جانا بھی معدود خواتین کے ساتھ نکاح کا باعث بنتا ہے، بعض اوقات ایک مرد اپنی جنسی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک سے زائد قانونی شادی کر کے اپنے کو گناہ سے بچاتا ہے۔

ہندوستان کے موجودہ معاشرہ میں چند مستثنیات کو چھوڑ کر یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ نکاح ثانی کے بعد ہر دو بیویوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو پاتا ہے، بلکہ ظلم کا ارتکاب ہوتا ہے۔

مذکور الصدر صورت حال کا اگر جائزہ لیا جائے تو نکاح ثانی کی اجازت کو منسوخ کرنا اس حکمت شرعی کو ترک کر دینا ہوگا جو شارع کی نظر میں اس جواز کے لئے رہا ہے، دوسری طرف اس جواز کے ناجائز استعمال سے جو معاشرہ میں ظلم وفساد برپا ہورہا ہے اُس کا بھی ازالہ ضروری ہے، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس طرح کی ازدواجی الجھنوں کو دور کرنے کے لئے ایک کابین نامہ کی تجویز رکھی تھی، اب جو حالات پورے ملک میں ہیں ان کو دو نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے، ایک تو مغربی تہذیب اور جدید افکار کے نتیجہ میں نکاح کو ایک ایسا رشتہ بنانے کی کوشش ہے کہ جس میں عورت ہر حیثیت سے خود مختار ہو، یہ آزادیٔ نسواں کے ان نعروں کا نتیجہ ہے جو یوروپ میں خاندان کا شیرازہ منتشر کر چکے ہیں اور جنسی اباحیت کے راستہ پر مغربی تہذیب کو ڈال دیا ہے، ہمارے یہاں کا بھی بزعم خود دانشور طبقہ شعوری یا غیر شعوری طور پر نظر وفکر اور تنقید کے بغیر اس نظریہ پر ایمان لے آیا ہے، اس لئے وہ حقوق اور حدود کے ان شرعی قوانین سے گریز کرنا چاہتا ہے جن سے ایک اچھا خاندان نشوونما پا سکتا ہے، اور جس میں زوجین کی خلقی کیفیات اور ان کے فطری فرائض کو سامنے رکھتے ہوئے شریعت نے ہر دو کے لئے کچھ حدود مقرر کئے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے کچھ حدود لازم کئے ہیں، اور پھر قانون کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کو خاص اہمیت دی گئی ہے، نیز ہمہ تن تقویٰ کی تعلیم دی گئی ہے، خاص کر اس لئے کہ زوجین کے تعلقات امانت اور باہمی اعتماد پر مبنی ہیں اور یہ رشتہ اس حد تک نجی ہے کہ اس پر قانون کی دخل اندازی کا کم سے کم امکان رہتا ہے، اسی لئے خطبۂ نکاح میں جو آیتیں پڑھی جاتی ہیں ان میں چار دفعہ تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے کہ ظاہر و باطن اور جلوت وخلوت ہر جگہ کے احوال پر اللہ علیم وخبیر کی نظر ہے۔

لیکن اگر ایسے لوگوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی اس سچائی کو مان کر چلنا پڑے گا کہ تقویٰ کے فقدان اور قانون کے بے جا استعمال کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں کئی الجھنیں کھڑی ہو جاتی ہیں، خاندان بکھر جاتا ہے، بچوں کی صحیح تربیت نہیں ہو پاتی، اور معاشرہ میں ظلم وبے انصافی کے پھیل جانے کی وجہ سے کئی طرح کے بگاڑ پیدا ہو جاتے ہیں، سرسری نظر میں اس طرح کے مسائل مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) پہلی بیوی کے رہتے ہوئے دوسری شادی کر لینا اور پہلی بیوی کو حقوق سے محروم رکھنا یا ہر دو بیویوں کے درمیان تعلقات میں برابری نہیں برتنا۔

(۲) طلاق جو ناپسندیدہ عمل ہے اور ضرورتاً مشروع کیا گیا ہے اس کا بے محل یا بے جا استعمال اس طرح کہ طلاق جس کا استعمال بہت غور وفکر اور اصلاح حال کی ساری کوششوں کے ناکام ہونے کے بعد ہونا چاہئے تھا، محض وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر، بغیر غور وفکر اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

(۳) ہندوستانی معاشرہ میں طلاق کا صحیح شرعی طریقہ معروف نہیں رہا اور بیک مجلس تین طلاق دیدی جاتی ہے، نہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ عورت حالت طہر میں ہے یا حیض میں، اور سارے احکام شرعی کو نظر انداز کر کے طلاق دیدی جاتی ہے، یہ طریقہ قطعی طور پر ناپسندیدہ اور فتنے پیدا کرتا ہے۔

(۴) طلاق کے بعد یا تو بچے ماں سے چھین لئے جاتے ہیں، یا پھر بچوں کی کفالت سے غفلت برتی جاتی ہے۔

(۵) مختلف ترکیبیں استعمال کر کے عورت کو مجبور کیا جاتا ہے کہ مہر معاف کر دے، بلکہ اوپر سے کچھ رقم دیکر شوہر سے طلاق حاصل کرے، اس کے سامان جہیز واپس نہیں کئے جاتے اور اسے بے عزتی سمجھا جاتا ہے، جو ہدایا اور تحائف اسے ملتے ہیں انسے بھی ضبط کر لیا جاتا ہے، اور عورت ایسے جبر کا شکار ہوتی ہے کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر علیحدگی قبول کرتی ہے، ظاہر ہے کہ شرع اسلامی اس طرح کے جبر کو سند جواز نہیں دے سکتی اور ''إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم'' (سورہ نساء: ۲۹) یعنی انتقال ملک کے لئے تراضی طرفین ضروری ہے اور اسی رضا پر ممکن ہے کہ کوئی قانونی حکم لگایا جا سکے، لیکن کوئی مال مال طیب نہیں ہو سکتا اگر رضاء قلبی نہ ہو، جب تک حقیقی رضامندی کے ساتھ عورت اپنے کسی حق سے دست بردار نہ ہو جائے، یا مرد کو کچھ نہ دے شوہر کے لئے وہ جائز وحلال نہیں فإن طبن لكم عن شي منه نفسا فكلوه هنيئا مريئا۔ (سورۂ نساء: ۴)

(۶) بعض اوقات شوہر اس طرح لاپتہ ہو جاتا ہے کہ اسکے مرنے جینے کی کچھ خبر نہیں رہتی۔

بعض اوقات اس کی زندگی کا پتہ تو رہتا ہے اور کبھی کبھی اس کے وجود کی خبر لگ جاتی ہے لیکن وہ کہاں ہے کیا کر رہا ہے اس کا پتہ نہیں چلتا اور وہ اپنے اہل وعیال سے بالکل غافل رہتا ہے۔

(۶) بعض اوقات شوہر اپنی جابرانہ حیثیت استعمال کرتے ہوئے نہ بیوی کے حقوق ادا کرتا ہے اور نہ اسے طلاق دیکر علیحدہ ہی کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا کوئی اور نقشہ بنائے اور عام طور پر انتقاماً اسے کالمعلقہ رکھتا ہے کہ نہ اسے بیوہ کہا جاسکتا ہے اور نہ شوہر والی کہا جاسکتا ہے

یہ اور اس طرح کے کئی سماجی مسائل ہیں جنہیں معاشرہ کی کڑوی اور تلخ حقیقتیں کہا جاسکتا ہے، قضاء شرعی کا مضبوط نظام بلاشبہ اس طرح کے مسائل کو حل کرنے میں بہت حد تک معاون ثابت ہوسکتا ہے، لیکن ہندوستان میں ابھی یہ نظام پورے ملک کے پیمانہ پر مستحکم نہیں ہوا ہے اور جہاں ہے بھی وہاں کئی طرح کی قانونی مشکلات پیدا ہوتی رہتی ہیں

ان حالات میں اگر نکاح میں چند شرائط لگائی جاسکیں تو مشروط نکاح نامہ بہت ساری پیچیدگیوں کے سلجھانے میں مدد دے سکتا ہے، شرائط نکاح کے باب میں ظاہر ہے کہ وہ شرائط جو مقتضاء عقد کے خلاف ہوں معتبر نہیں ہوں گی، لیکن نظر فقہی یہ کہتی ہے کہ نکاح کے ذریعہ حاصل ہونے والے حقوق اور ان حقوق کی عدم ادائیگی کی صورت میں پیدا ہونے والے ظلم کو رفع کرنے کے لئے جو شرائط لگائی جائیں گی وہ مقتضاء عقد کے خلاف نہیں ہوں گی، یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے بعض ایسی شرطوں کی اجازت دی ہے جن میں عورت کو ضرر سے محفوظ رکھا جاسکے

مثلاً فقہ حنفی کی صراحت کے مطابق مہر مسمی دو ہونا اور شرائط کے پورا کرنے کی صورت میں کم تر مہر مسمی، اور شرائط کی خلاف ورزی کی صورت میں وہ مہر مسمی جو مہر مثل سے زائد ہوگا واجب ہونا، فرق صرف اتنا ہے کہ صاحبین ہر دو متعین (مسمی) مہر کو ہر دو حالتوں میں واجب الادا قرار دیتے ہیں، امام ابوحنیفہؒ پہلے ذکر کئے ہوئے مہر کو مسمی قرار دیتے ہیں اور دوسری صورت میں مہر مثل کے وجوب کے قائل ہیں، یہ ساری بحثیں مقالات میں آچکی ہیں جن کے یہاں ذکر کی ضرورت نہیں ہے، مسئلہ پر اس طرح غور کرنا ہے کہ نکاح ثانی کی چھوٹ شریعت کے عدل کو مجروح کرتی ہے اور غالب حالات میں عورت ظلم کا شکار ہوتی ہے، اسی طرح بے محابا طلاق، عورت کو کالمعلقہ چھوڑ دینا نہ طلاق دینا اور نہ حقوق ادا کرنا عورت کے ساتھ ظلم ہے اور سماج میں اس طرح کی باتوں کا پیش آنا اب شاذ و نادر نہیں رہا ہے۔

ان حالات میں اور مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں منسلک نکاح نامہ کا مطالعہ کیا جائے اور اس کو قطعی صورت دیدی جائے، جو احکام شرع کے مطابق ہو، جس میں مصالح شرع کی رعایت اور ممکن حد تک قانون کے بے جا استعمال سے پیدا ہونے والے اثرات سے تحفظ بھی ہو اور وہ معاشرہ کو صحیح خطوط پر قائم کرنے کا ذریعہ بنے۔



## تلخیص مقالات:

# نکاح میں شرط اور مشروط مہر فقہ اسلامی کی روشنی میں

مولانا ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی

۱۔ عقد نکاح کی وجہ سے جو حقوق وفرائض اور ذمہ داریاں لازم آتی ہیں، انہیں کو مؤکد کرنے والی شرائط بالاتفاق معتبر ہیں، اور فریقین پر ان کا ایفا واجب ہے، کیونکہ یہ بجائے خود نکاح کے مقاصد میں داخل ہیں اور شریعت نے ان کو واجب قرار دیا ہے۔

۲۔ دوسری صورت، یعنی بوقت نکاح ایسی شرائط عائد کرنا جو عقد نکاح کے تقاضوں کے خلاف ہوں، مثلاً شوہر کا یہ شرط لگانا کہ عورت کا نفقہ اس کے ذمہ نہ ہوگا، یا جو شرائط شرعاً منہی عنہ ہوں، مثلاً پہلی بیوی کو طلاق دینے کی شرط لگانا، یہ شروط فاسدہ کہلائیں گی، اور عقد نکاح تو صحیح ہوگا لیکن شرائط باطل ولغو ہو جائیں گی۔

''الصلح الذی یحرم الحلال کمصالحة الزوجة للزوج علی أن لا یطلقها أو لا یتزوج علیها أولا یبیت عند ضرتها والذی یحلل الحرام کأن یصالحه علی وطی أمة لا یحل له وطؤها أو أكل مال لا یحل به أو نحو ذالك''

(بذل المجہود ۱۵-۲۲۷)

حدیث میں آیا ہے:

''الصلح جائز بین المسلمین. زاد أحمد إلا صلحا حرم حلالا وأحل حراما''۔

اس رائے پر تمام مقالہ نگار حضرات کا اتفاق ہے۔

## ۳۔ اضافی شرط لگانا:

تیسری قسم کی شرط اگر لگائی جائے تو نکاح بالاتفاق درست ہے، ایفاء شرط کا مسئلہ قدیم سے اختلافی ہے، حنفیہ شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک ایسی شرطوں کا ایفاء مرد کے ذمہ لازم نہیں ہے، اس کے برخلاف حنابلہ کے نزدیک مطلق ایفاء شرط شوہر پر لازم وضروری ہے، عدم ایفاء کی صورت میں عورت کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا۔

''ما یلزم الوفاء به وهو ما یعود إلیها نفعه وفائدته مثل أن یشترط لها أن لا یخرجها من دارها. فهذا یلزم الوفاء لها فإن لم یفعل فلها فسخ النكاح'' (المغنی ۷-۱۷)

## قائلین کی دلیلیں:

(۱) ''یأیها الذین آمنوا أوفوا بالعقود'' (سورۂ مائدہ:۱)

اور وہ تمام آیتیں جو ایفاء عہد پر دلالت کرتی ہیں۔

(۲) ''عن عقبة بن عامر أن رسول الله ﷺ قال: أحق الشروط أن یوفی به ما استحللتم به الفروج''۔

(۳) ''المسلمون علی شروطهم''۔

(۴) ''وروی الأثرم باسناده أن رجلا تزوج امرأة وشرط لها دارها ثم أراد نقلها فخاصموه إلی عمر بن الخطاب فقال لها شرطها''۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ عقود ومعاملات اور شروط میں اصل صحت ہے، لہٰذا شوہر کے ذمہ عائد کردہ شرائط کی پابندی ضروری ہوگی (القواعد النورانیہ ۲۱۹)۔

## مانعین کی دلیلیں

شافعیہ، حنفیہ اور مالکیہ جن کے نزدیک ایفاء شروط ضروری نہیں، درج ذیل دلائل پیش کرتے ہیں:

۱۔ ''كل شرط ليس في كتاب الله فهو باطل وإن كان مائة شرط''۔

۲۔ ''المسلمون على شروطهم إلا شرطا أحل حراما أو حرم حلالا''۔

مذکورہ شرطیں حلال ومباح کو حرام قرار دیتی ہیں، جیسے دوسری شادی کرنا، بیوی کے ساتھ سفر کرنا حلال ومباح ہے، لیکن مشروط صورت میں حرام ہوجاتے ہیں۔

فریقین کے دلائل کا جائزہ لیتے ہوئے مقالہ نگار حضرات میں چند حنابلہ کے قول پر فتویٰ کے حق میں ہیں جن میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب، مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب، مولانا زبیر احمد قاسمی صاحب، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی صاحب، مولانا نذر توحید صاحب، مولانا محمد عمران صاحب، مولانا ریاست علی قاسمی صاحب وغیرہ ہیں اور بیشتر حضرات دلائل ومصالح کے اعتبار سے جمہور فقہاء (حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ) کی رائے کو زیادہ قوی بتاتے ہیں۔

## تفویض طلاق کا مسئلہ

تفویض طلاق کے جواز پر مولانا شمس پیرزادہ صاحب کے علاوہ تمام مقالہ نگار حضرات کا اتفاق ہے، نیز اس بات پر بھی سبھوں کا اتفاق ہے کہ تفویض طلاق کے بعد اس سے رجوع کا اختیار شوہر کو باقی نہیں رہتا ہے، تفویض کی تفصیلات پر تمام حضرات نے بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔

نکاح میں شرط کی جن تین شقوں کا سوالنامہ میں ذکر کیا گیا ہے، تقریباً تمام حضرات نے شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے چند شرائط کے ساتھ تینوں صورتوں کے جواز کی رائے دی ہے جو بالاختصار درج ذیل ہے:

۱۔ نکاح کے پہلے تفویض طلاق میں ضروری ہے کہ تفویض طلاق کی نسبت نکاح کی جانب ہو۔

۲۔ نکاح کے وقت تفویض طلاق میں ضروری ہے کہ ایجاب عورت کی طرف سے ہو۔

۳۔ نکاح کے بعد تفویض طلاق کی درستگی کے لئے کوئی شرط نہیں ہے۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا شہباز عالم ندوی اور مولانا اسرار الحق صاحب نے تفویض طلاق قبل النکاح کی صورت کے جواز سے اختلاف کیا ہے، تفویض طلاق کی عملی صورت طے کرنے کے سلسلے میں متعدد حضرات نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تفویض طلاق کی شرط وصورت کی بابت ''الحیلۃ الناجزۃ'' میں آنے والی تفصیل پر اعتماد کیا جائے، کیونکہ وہ محقق ہونے کے ساتھ اہل نظر علماء کی ایک اجتماعی کاوش بھی ہے۔

تفویض واختیار کے ساتھ مزید قیدیں بڑھانے کے سلسلہ میں بھی مقالہ نگار حضرات کی رائے صنف نازک کی زود رنجی، سریع الانفعالی، نفسیاتی بے اعتدالی اور ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے بہتر یہ ہے کہ براہ راست طلاق کا اختیار انہیں نہ دیا جائے، بلکہ خاص شرائط کے ساتھ دیا جائے، تاکہ بوقت ضرورت ظالم شوہر سے نجات کی راہ بھی کھلی رہے اور عورت مطلق العنان بھی نہ بن سکے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے عورت کے بجائے دار القضاء کو حق طلاق تفویض کئے جانے کو مستحسن سمجھا ہے۔

جناب شمس پیرزادہ صاحب کی رائے میں آیت تخییر کو تفویض طلاق پر محمول کیا جانا درست نہیں ہے، انھوں نے اپنی رائے کی تائید میں قرآن وحدیث کے متعدد دلائل نقل کئے ہیں۔

## طلاق اور عقد ثانی کے ساتھ مشروط مہر کی زائد مقدار

مقالہ نگار حضرات مسئلہ ہذا میں دو طرح کی رائے رکھتے ہیں، کچھ حضرات نے صاحبین کے قول کو وقت کی ضرورت اور قابل ترجیح قرار دیا ہے، اگرچہ اس رائے کے اپنانے والوں میں سے بعض حضرات اسے مسئلہ کا پورا حل نہیں سمجھتے ہیں، اور بعض دیگر حضرات مہر کی زیادتی کو تین طلاق کی شرط کے ساتھ مربوط کرنے کی تلقین کرتے ہیں، تاکہ تین طلاق کے رواج پر قدغن لگے اور نسبتاً مہر کے خوف سے طلاق کا ناروا اقدام نہ ہو۔

(مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا عبید اللہ اسعدی، مولانا اختر امام عادل، مفتی جنید عالم قاسمی ندوی، مولانا نذر توحید مظاہری، مولانا ریاست علی قاسمی صاحبان وغیرہ)۔

دوسری رائے یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کا قول ہی اختیار کیا جائے گا، ان حضرات کا استدلال ہے کہ ضرورت اگر تسلیم بھی کر لی جائے تب بھی صاحبین کے مسلک کو اختیار کرنا بے سود ہے اور خلاف عقل ونقل ہے، کیونکہ کثرت مہر سے مقصود محض شوہر کے لئے استعمال طلاق کو دشوار بنانا ہے، جبکہ یہ نظریہ شرعا مردود ہے، کیونکہ یہ تغییر مشروع کے مرادف ہے، نیز عقلاً بھی یہ تدبیر غیر مفید، بلکہ مضر ہے، کیونکہ بسااوقات طلاق دینے کی واقعی ضرورت پیش آتی ہے اور مہر کی زیادتی کی وجہ سے شوہر طلاق نہیں دیتا اور ظلم پر ظلم کرتا رہتا ہے۔

(مفتی محمد زید مظاہری، مولانا آل مصطفیٰ مصباحی، مولانا عبد القیوم پالنپوری، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا نسیم الدین قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی صاحبان وغیرہ)

مفتی جنید عالم صاحب ندوی نے طلاق اور عقد ثانی دونوں میں فرق کیا ہے، موصوف کی رائے میں طلاق کے ساتھ مشروط مہر کی دو مقدار کے مسئلہ میں تو صاحبین کی رائے اختیار کرنا مناسب ہے، لیکن عقد ثانی کے ساتھ مشروط مہر کی دو مقدار کے مسئلہ میں امام صاحب کی رائے اختیار کی جائے گی۔

## طلاق کے بے جا استعمال پر پابندی کی صورتیں:

بعض حضرات اس سلسلہ میں اس بات کے قائل ہیں کہ شوہر سے اقرار کرایا جائے کہ بلاقصور عورت کو طلاق دے تو بطور متعہ مطلقہ بیوی کو ایک مخصوص رقم دینی ہوگی (مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی صاحب)

بلاقصور طلاق دینے پر تادیبی سزا مقرر کی جائے گی، مثلاً چھ ماہ قید با مشقت کی مسلم پرسنل لا بورڈ سفارش کرے۔

## نکاح بشرط ملازمت

۱۔ ایک رائے یہ ہے کہ اگر شرعی پردہ وحیاء کی رعایت رکھی جائے اور شرعی حدود میں رہ کر انجام دیا جائے تو عورت کے لئے ملازمت کی شرط لگانا درست ہے۔

(مولانا ریاست علی قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا ممتاز عالم مصباحی صاحبان)

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ عورت کی بنیادی ذمہ داری گھر اور بچوں کی نگہداشت ہے، ملازمت تقاضائے نکاح میں رکاوٹ بنتی ہے، نیز ملازمت سے جو حصول رقم مقصود ہے وہ نکاح کے بعد شوہر کی ذمہ داری سے حاصل ہو جاتا ہے، اس لئے عورت کو ملازمت کی حاجت نہیں ہے اور ایسی شرط لگانا غلط وباطل ہے۔

(مولانا انیس الرحمن قاسمی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا نذر توحید مظاہری، مولانا عبید اللہ اسعدی، مولانا محمد ابوبکر، مولانا محمد زید مظاہری، مولانا زبیر احمد قاسمی، مفتی جنید عالم، مولانا ظفر الاسلام اعظمی، مولانا نور الحق رحمانی، مولانا آل مصطفیٰ صاحبان وغیرہ)۔



# عرض مسئلہ:

## نکاح میں شرط اور مشروط مہر کا مسئلہ

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی [1]

اشتراط فی النکاح کے سوالنامہ میں تفویض طلاق کے علاوہ دو اہم سوالات زیر بحث ہیں، اور دونوں ہی سوالات اس تناظر میں قائم کئے ہیں کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں شریعت کے بعض احکام اور رخصتوں کے غلط استعمال کی وجہ سے بعض ایسے مفاسد پیدا ہو رہے ہیں جو سراسر منشاء شریعت کے مغائر ہیں، اور اکثر اوقات ان کی سرحدیں جور وتعدی سے جا ملتی ہیں، اس لئے ان دونوں مسائل پر ہم رشتہ بحث آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہے۔

ان مسائل پر کل اکیاون (۵۱) جوابات موصول ہوئے ان میں سے (۲۸) جوابات علماء ارباب افتاء کے ہیں اور ان کے نام اس طرح ہیں:

مولانا آل مصطفی مصباحی، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا اقبال احمد کانپوری، مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا مصلح الدین قاسمی، مفتی عبدالرحمن پالنپوری، مولانا عبدالقیوم پالن پوری، مولانا ابوالحسن صاحب، مولانا ابوسفیان صاحب، مولانا عبدالجلیل قاسمی، مولانا حبیب اللہ قاسمی، مولانا شاہین جمالی، مولانا زبیر احمد قاسمی، جناب شمس پیرزادہ، مولانا عبیداللہ اسعدی، مولانا ظفرالاسلام اعظمی، ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی، مولانا محمد رفیق فلاحی، مولانا محمد مصطفی ندوی، مولانا ولی اللہ قاسمی، مفتی محمد زید، مولانا اختر امام عادل، مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا اخلاق الرحمن، مولانا فضل الرحمن رشادی، مولانا محمد انظر سبیلی اور راقم الحروف خالد سیف اللہ رحمانی، نیز اسلامک فقہ اکیڈمی، امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد اور دار العلوم حیدرآباد کے تخصص فی الفقہ کے ۲۳ عزیز طلبہ نے بھی بڑی کاوش کے ساتھ مقالات سپرد قلم کئے ہیں۔

نکاح میں شرط کے سلسلہ میں تمام مقالہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ ایسی شرطیں جو انہی حقوق وواجبات کو مؤکد کرتی ہوں جو شرعا نکاح سے ثابت ہیں، معتبر ہیں، اس پر بھی اتفاق ہے کہ ایسی شرطیں جو صحت نکاح کی شرطوں میں سے کسی شرط کے ساقط ہونے یا نکاح کے لازمی احکام میں سے کسی حکم میں تغیر وتبدل کو مستلزم ہوں معتبر نہیں، البتہ ایسی شرطوں کے باوجود بھی نکاح منعقد ہوجاتا ہے، سوائے اس کے کہ نکاح متعہ یا نکاح موقت کی صورت پیدا ہوجائے، اس پر بھی اتفاق ہے کہ ایسی اضافی شرطیں جن میں عورت کا فائدہ ہو، اور شریعت نے نہ ان کو واجب قرار دیا ہو اور نہ ان سے منع کیا ہو، نکاح کے درست ہونے میں مانع نہیں ہیں، نکاح ایسی شرطوں کے ساتھ بھی منعقد ہوجائے گا، البتہ اختلاف اس امر پر ہے کہ اگر نکاح کے وقت مرد نے یہ شرط قبول کر لی اور بعد میں اس کو پورا نہ کیا تو اس کا اثر کیا مرتب ہوگا؟

جمہور فقہاء کے یہاں ایسی شرطیں لازم الایفاء نہیں، اور کہا جاتا ہے کہ حنابلہ کے نزدیک لازم الایفاء ہیں تو اس مسئلہ میں ترجیح کس رائے کو ہے؟ مولانا عبیداللہ اسعدی، مولانا ولی اللہ قاسمی، مولانا محمد مصطفی ندوی اور راقم سطور خالد سیف اللہ رحمانی نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں حنابلہ کی رائے اختیار کی جاسکتی ہے، کیونکہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے، اور دلائل دونوں ہی طرف خاصے قوی ہیں جن کا تفصیلی تذکرہ اس وقت موجب طوالت ہوگا، اس کے علاوہ بقیہ حضرات نے جمہور ہی کی رائے کو ترجیح دی ہے اور اس کو دلائل اور اصول افتاء دونوں اعتبار سے راجح سمجھا ہے۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے، بعض حضرات نے حنفیہ کے یہاں بھی ایفاء شرط کو لازم قرار دیا ہے جبکہ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حنفیہ کے یہاں شرط واجب الایفاء نہیں ہے، عام طور پر لوگوں نے لکھا ہے کہ حنابلہ کے یہاں یہ اور اس قسم کی شرطیں واجب الایفاء ہیں دوسروں کے یہاں واجب الایفاء نہیں ہیں، لیکن اگر فقہاء کی نقول پر نظر غائر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سمجھنا کہ حنفیہ کے یہاں ایفاء شرط مطلقا واجب نہیں، صحیح نہیں

[1] ناظم المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد

ہے، بلکہ ہمارے نزدیک یہ شرط عام طور پر عہود ومواعید کے حکم میں ہے اور حنفیہ کے یہاں یہ ہے کہ وعدے دیانتاً واجب الایفاء ہوتے ہیں، قضاءً واجب الایفاء نہیں ہوتے، اسی لئے امام ابوبکر جصاص رازی "یا ایھا الذین آمنوا اوفوا بالعقود" (سورۃ مائدہ:۱) کے ذیل میں شرائط کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وھو عموم فی ایجاب الوفاء بجمیع مایشترط الإنسان علی نفسه مالم تقم دلالة تخصصه" (احکام القرآن ۳۔ ۲۸۶)

(وہ عام ہے ان تمام چیزوں کو واجب قرار دینے میں جو انسان اپنے آپ پر مشروط کرلے جب تک کہ کوئی دلیل تخصیص نہ آجائے)۔

علامہ عینی نے حنفیہ کا نقطۂ نظر اس طرح نقل کیا ہے:

"یؤمر الزوج بتقوی اللّٰہ والوفاء بالشروط ویحکم بذلك حکما" (عمدۃ القاری ۲۔ ۱۳۰)

(شوہر کو تقوی اور ایفاء شرط کا حکم دیا جائے گا اور اس بارے میں قطعی حکم دیا جائے گا)۔

مولانا انور شاہ صاحب نے اشتراط فی النکاح میں حنفیہ کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"والشروط التی لا تنافی النکاح جائزة وتوفی دیانة ولا تلزم قضاء" (العرف الشذی ۱۔ ۲۱۶)

(جو شرطیں منافی نکاح نہیں ہیں وہ جائز ہیں، دیانۃً ان کو پورا کرنا واجب ہے، قضاءً واجب نہیں)۔

اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ حنابلہ کے نزدیک بعینہٖ شرط کی تکمیل واجب ہے، حنبلی کتب فقہ کے معروف عالم فرماتے ہیں:

"ولا یجب الوفاء بھا بل یسن" (الاقناع ۳۔ ۱۹۰)

(اس شرط کی تکمیل واجب نہیں، بلکہ مسنون ہے)۔

اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ اگر شوہر اس شرط کو پورا نہ کرے تو اس کا اثر کیا مرتب ہوگا؟ حنفیہ کے نزدیک مہر مقررہ کے بجائے مہر مثل، یعنی عورت کے خاندان میں مروجہ مہر کی مقدار اگر مقررہ مہر سے زیادہ ہو تو وہ واجب ہوگا، اور حنابلہ کے نزدیک عورت کو مطالبۂ تفریق کا حق ہوگا۔

اب اس وضاحت کے بعد یہ عرض ہے کہ دلائل فریقین کے قوی ہیں اور دور صحابہ میں بھی اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے، اس لئے مسئلہ دلائل کی قوت وضعف کا نہیں اور نہ ہمارا یہ مقام ہے کہ ایسے مسائل میں محاکمہ کی جسارت کی جائے، مسئلہ صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں مصالح کا تقاضا کیا ہے؟ اور جن حضرات نے اس مسئلہ میں حنبلی مکتبۂ فکر کی رائے کو قابل قبول سمجھا ہے، ان کا منشاء بھی دراصل یہی ہے، لیکن غور کیا جائے تو یہ مسئلہ کا حقیقی حل نہیں ہے، مرد اگر شرعی حدود وقیود کی رعایت کے بغیر دوسرا نکاح کرتا ہے، تو جو شخص بیویوں کے حقوق کی ادائیگی اور ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان عدل کے حکم میں خدا سے بے خوف اور آخرت کی جوابدہی کے احساس سے عاری ہے اس کے بارے میں یہ توقع رکھنا کہ بیوی کی علاحدگی کا خوف اس کو جادۂ مستقیم پر قائم رکھے گا، بہ ظاہر بے سود نظر آتا ہے، اور عورت کو اتنا سا حق فقہ حنفی کے دائرہ میں رہتے ہوئے "تفویض طلاق" کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے۔

اس لئے مشروط نکاح کی بجائے "مشروط مہر" کے مسئلہ پر غور کرنا چاہئے، امام ابوحنیفہ کی رائے میں نکاح کے لئے جو پہلا مہر مقرر ہو وہی "مہر" شرط کے ساتھ مہر کی جو دوسری مقدار مقرر کی جائے وہ معتبر نہیں، لہٰذا اگر شوہر نے شرط پوری کی تو پہلا مہر واجب ہوگا اور شرط پوری نہیں کی اور "مہر مثل" کی مقدار اس سے زیادہ ہے تو مہر مثل واجب ہوگا، یہی رائے مالکیہ اور شوافع کی بھی ہے، صاحبین کے نزدیک مہر کی دونوں ہی مقدار معتبر ہے، مثلاً اگر مہر اس طرح مقرر ہو کہ اگر مرد نے اس عورت کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کیا تو مہر دس ہزار ہوگا، دوسرا نکاح کیا تو بیس ہزار ہوگا، تو اسی تفصیل کے مطابق دس اور بیس ہزار روپے بطور مہر واجب ہوں گے، حنابلہ کی یہی رائے ہے۔

سمینار کے مقالہ نگاروں میں کل تینتیس (۳۳) حضرات نے صاحبین کے قول کو ترجیح دی ہے، ان میں سے کچھ اسماء یہ ہیں:

مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا عبدالجلیل قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ولی اللہ قاسمی، مولانا رفیق بن آدم، مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا اخلاق الرحمن، مولانا حبیب اللہ قاسمی، مولانا فضل الرحمن رشادی، ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی اور خالد سیف اللہ رحمانی۔

جبکہ سترہ (۱۷) حضرات نے امام ابوحنیفہ کی رائے کو ترجیح دی ہے، ان میں سے کچھ اسماء یہ ہیں: مفتی محمد زید مظاہری، مولانا زبیر احمد قاسمی، جناب شمس پیرزادہ، مولانا محمد مصطفی ندوی، مولانا عبدالقیوم پالن پوری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محفوظ الرحمن، مولانا آل مصطفی مصباحی، مولانا اقبال احمد، مولانا عبدالرحمن، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی اور مولانا عبیداللہ اسعدی، عام طور پر مقالہ نگاروں نے اس مسئلہ پر دونوں نقطہ نظر کے دلائل پر زیادہ تفصیلی گفتگو نہیں کی ہے، اور خود ان علماء ومؤلفین نے بھی اس مسئلہ پر اختصار ہی کی راہ اختیار کی ہے جو اس اختلاف رائے کے ناقل وراوی ہیں،۔ اس حقیر کا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں اس مسئلہ میں صاحبین کی رائے پر فتوی دیا جانا مناسب ہے، اور اس سلسلہ میں درج ذیل امور کو ملحوظ رکھا جانا چاہئے:

(۱) ہندوستان کے موجودہ حالات یہ ہیں کہ جہالت وناخواندگی، احکام شریعت سے ناآگہی، اسلامی مزاج ومذاق سے محرومی، نظام قضاء کا فقدان اور دوسری ہم وطن اقوام کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کی بعض سماجی رسوم سے تاثر، ایسی حقیقتیں ہیں جن کا اعتراف نہ کرنا ریت میں منہ چھپانے کے مترادف ہوگا، حالانکہ مسلمانوں میں تعدد ازدواج کا رواج ہندوستان میں خود ہندوؤں سے بھی کم ہے، اسی طرح طلاق کا استعمال بھی، باوجود بہت سے سماجی مفاسد کے غالباً اب بھی مسلم سماج میں بہت زیادہ نہیں، لیکن اس طرح کے جتنے کچھ واقعات سامنے آتے ہیں اگر ان کا سروے کیا جائے تو شاید اس کا نتیجہ یہی نکلے کہ ۸۰ فیصد طلاق کے واقعات بے جا ہوتے ہیں اور اسی تناسب سے دوسرا نکاح کسی سنجیدہ ومتین فیصلہ کے تحت نہیں، بلکہ وقتی ردعمل کے تحت کیا جاتا ہے۔

اور دوسرے نکاح کے لئے سہارا تو شریعت کا لیا جاتا ہے، لیکن اس کے بعد اسلام کے اصول عدل کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا، اس سے ہمارے سماجی ڈھانچہ کو نقصان پہنچا ہے وہ تو اپنی جگہ ہے، دوسری اقوام کے درمیان جو جگ ہنسائی ہوتی ہے اور شریعت مطہرہ پر جو چوٹیں کسی جاتی ہیں ان کا باعث بھی بالواسطہ ہم ہی بنتے ہیں، ان حالات میں تعیین مہر کی یہ صورت ایک حد تک مشکلات کا مداوا بن سکتی ہے اور ضرورت کے مواقع پر ایک فقہی رائے سے دوسری رائے کی طرف عدول ضعف دلیل کے باوجود درست ہے۔

شامی کا بیان ہے:

"قلت: لكن هذا في غير موضع الضرورة فقد ذكر في حيض البحر في بحث ألوان الدماء أقوالا ضعيفة ثم قال: وفي المعراج عن فخر الأئمة لو أفتى مفت بشئي من هذه الأقوال في مواضع الضرورة طلبا للتيسير كان حسنا. وكذا قول أبي يوسف في المني إذا خرج بعد فتور الشهوة لا يجب به االغسل. ضعيف. وأجازوا العمل به للمسافر أو الضيف الذي خاف الريبة كما سيأتي في محله وذلك من مواضع الضرورة (ردالمحتار ۱۔۵۱)

(میں کہتا ہوں کہ یہ ایسے مواقع پر ہے جہاں ضرورت درپیش نہ ہو، چنانچہ "بحر" کے "باب الحیض" میں خون حیض کے رنگوں کی بابت چند ضعیف اقوال صاحب بحر نے نقل کیا ہے، پھر کہا ہے کہ "معراج" میں فخر الائمہ سے منقول ہے کہ اگر مفتی مواقع ضرورت میں ان اقوال میں سے کسی پر ازراہ سہولت فتوی دے تو بہتر ہوگا، اسی طرح کہ شہوت کے بعد منی نکلنے سے امام ابویوسف کے نزدیک غسل واجب نہ ہونا ضعیف قول ہے، لیکن مشائخ نے مسافر اور تہمت سے خائف مہمان کے لئے اس پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے، جیسا کہ اپنی جگہ آئے گا، اور یہ مواقع ضرورت میں ہے)۔

اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں کہ مشائخ نے بہت سے مواقع پر دلائل کی قوت کے مقابلہ ایسی رائے کو اختیار کیا ہے جس میں امت کے لئے سہولت زیادہ ہو، علامہ شامی نے ایک مسئلہ میں بمقابلہ امام صاحب کے صاحبین کی رائے پر فتوی نقل کیا ہے، پھر مختلف اہل علم سے نقل کیا ہے کہ دلیل امام صاحب کی زیادہ قوی ہے، مگر ازراہ آسانی فتوی صاحبین کی رائے پر ہے، لکھاہے:

''وظاهره ترجيح التيسير على قوة الدليل'' (ردالمحتار ۴۔۲۱)

جو گویا افتاء کے لئے ایک قاعدہ کا درجہ رکھتا ہے، اسی لئے مشائخ نے جن مسائل میں ایک سے زیادہ اقوال نقل کر کے یہ وضاحت نہ کی ہو کہ کون ساقول صحیح وراجح اور مفتیٰ بہ ہے؟ ان میں ایک وجہ ترجیح یہ بھی ہے کہ جس قول میں امت کے لئے آسانی وسہولت زیادہ ہو وہ راجح ہوگا۔

علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

''فإن قلت: قد يكون أقوالا بلا ترجيح وقد يختلفون في الصحيح قلت: يعمل بمثل ما عملوا من اعتبار تغير العرف وأحوال الناس وما هو الأرفق وما ظهر عليه التعامل وما قوى وجهه'' (الدر المختار علی ھامش الرد ۱۔۵۲)

• اگر تم کہو کہ مشائخ بلا ترجیح اقوال نقل کرتے ہیں اور قول صحیح کی بابت بھی خلاف رائے رکھتے ہیں، میں کہوں گا کہ مشائخ کے طریقے کے مطابق عمل کیا جائے، یعنی عرف، لوگوں کے حالات، ان کے لئے آسان تر، لوگوں کے تعامل کے مطابق اور دلیل سے قوی قول پر عمل کیا جائے گا۔

فقہاء حنفیہ کے یہاں ایسی جزئیات بہ کثرت موجود ہیں جن میں امت کے لئے سہولت وآسانی کی غرض سے بہ مقابلہ امام صاحب کے صاحبین یا ان میں سے ایک کی رائے کو ترجیح دی گئی ہے، مثلاً:

امام ابوحنیفہ کے نزدیک روٹی کو نہ وزن سے قرض لیا اور دیا جاسکتا ہے اور نہ عدد کے اعتبار سے، لیکن امام محمد کے نزدیک دونوں طرح قرض لین دین کی گنجائش ہے اور اسی پر فتویٰ ہے (ردالمحتار ج ۲/۲۰۸)۔

درخت پر لگا ہوا تیار پھل اس شرط کے ساتھ خرید کیا کہ ابھی یہ درخت پر لگا رہے، تو اس شرط کی وجہ سے امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ بیع فاسد ہوجائے گی، امام محمد کے نزدیک اس شرط کے باوجود درست ہوجائے گی اور فتویٰ اسی پر ہے (الدرالمختار ۲/۲۳)۔

بیع باطل کے ذریعہ خریدار نے کوئی چیز حاصل کی اور اس کے پاس وہ چیز ضائع ہوگئی تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک خریدار اس کا ضامن نہ ہوگا، صاحبین کے نزدیک ضامن ہوگا اور اسی پر فتویٰ ہے (ردالمحتار ۲/۱۱۸)۔

ریشم کے کیڑے اور انڈے کی خرید وفروخت امام صاحب کے یہاں جائز نہیں اور یہی رائے امام ابویوسف کی بھی ہے، امام محمد کے یہاں جائز ہے اور اسی پر فتویٰ ہے (الدرالمختار ۴/۱۱۲)

مباشرت فاحشہ امام ابوحنیفہ اور ابویوسف کے نزدیک موجب وضو ہے، امام محمد کے یہاں موجب وضو نہیں اور اسی پر فتویٰ ہے (فتاویٰ تاتار خانیہ ۱/۴۴)۔

تداوی بالحرام امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے یہاں جائز نہیں ہے، امام ابویوسف کے نزدیک جائز ہے اور اسی پر فتویٰ ہے (ردالمحتار ۶/۳۲۱)۔

(۲) بعض اوقات صاحبین کی رائے کو قوت دلیل کی بنا پر ترجیح دی جاتی ہے، مثلاً:

امام ابوحنیفہ کے نزدیک مغرب کا وقت شفق ابیض کے ڈوبنے تک ہے، اور صاحبین کے نزدیک شفق احمر کے ڈوبنے تک، اور فتویٰ بقول شارح ''وقایہ'' کے صاحبین کے قول پر ہے (فتاویٰ ہندیہ ۱/۵۱)۔

سجدۂ شکر امام ابوحنیفہ کے نزدیک ثابت نہیں، اس لئے مکروہ ہے، امام ابویوسف ومحمد کے نزدیک مستحب وباعث ثواب ہے اور فتویٰ اسی پر ہے (فتاویٰ ہندیہ ۱/۳۶۔۱۳۵)

امام ابوحنیفہ کے نزدیک ۳۰ سے زیادہ ۴۰ سے کم گائیں ہوں تو ۳۰ سے زائد جانور میں بھی اسی لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی جس کو فقہ کی اصطلاح میں ''عفو'' کہتے ہیں، صاحبین کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور اسی پر فتویٰ ہے (ردالمحتار ۲/۲۸۰)۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک جہاں زکوٰۃ میں بکری واجب ہو، وہاں چھ ماہ کا دنبہ کافی نہ ہوگا، صاحبین کے نزدیک کافی ہوجائے گا اور اسی پر فتویٰ ہے،

کیونکہ یہ قول امام ابن ہمام ''الدلیل جنۃ'' (رد المحتار ۲ / ۲۸۲)۔

عدت اگر درمیان ماہ سے شروع ہو تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک ۹۰ دن عدت کے گزارنے ہوں گے، صاحبین کے نزدیک درمیان کے دونوں ماہ چاند کے حساب سے ہوں گے اور ابتدائی مہینہ ۳۰ دن کے حساب سے بعد کو پورا کیا جائے گا اور فتویٰ اسی پر ہے (البحر الرائق ۳ / ۲۴۱)۔

(۳) اسی سے قریب تر بات یہ ہے کہ اگر امام صاحب کے قول کے مقابلہ صاحبین کے قول میں زیادہ احتیاط ہو تو ایسے مواقع پر بھی صاحبین کے قول کو ترجیح دی جاتی ہے، مثلاً:

اگر ٹھنڈا پانی مضر ہو اور گرم پانی سے غسل کرنے میں مضرت کا اندیشہ نہ ہو پھر بھی امام ابوحنیفہ کے نزدیک گرم پانی سے غسل کے بجائے تیمم پر اکتفا کرنا جائز ہے، جبکہ صاحبین کے نزدیک گرم پانی سے غسل کرنا واجب ہے اور از راہ احتیاط اسی پر فتویٰ ہے (فتاوی ہندیہ ۱ / ۴۹)۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک بعض تفصیلات کے ساتھ نبیذ کا پینا اور اس سے وضو کرنا جائز ہے اور کپڑے میں لگ جائے تو قباحت نہیں، امام محمد کے نزدیک نہ اس کا پینا جائز ہے، نہ اس سے وضو کرنا اور کپڑے میں لگ جائے تو دھونا واجب ہے، اور از راہ احتیاط فتویٰ امام محمد کے قول پر ہے (تاتار خانیہ ۱ / ۲۲۵)۔

امام صاحب کے نزدیک کراہت و گناہ کے ساتھ یہ جائز ہے کہ مسلمان غیر مسلم کو شراب فروخت کرنے کا حکم دے اور وہ اس قیمت کو استعمال کر سکتا ہے، صاحبین کے نزدیک جائز نہیں اور فقہاء نے اسی کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے: "ھو الأظھر" (الدر المختار ۴ / ۱۳۵)۔

قبول نکاح کی بابت اختلاف ہو جائے، عورت کہے میں نے رد کر دیا تھا، مرد کہے کہ اس نے سکوت اختیار کیا تھا اور گواہان موجود نہ ہوں تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک بغیر قسم کھلائے ہوئے عورت کا قول معتبر ہوگا، صاحبین کے نزدیک عورت سے حلف لیا جائے گا اور اسی پر فتویٰ ہے (رد المحتار للفتویٰ قولھما۔ مجمع الانہر، ۱ / ۲۵۵)۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک مقتدی امام کے ساتھ تکبیر تحریمہ کہے گا، صاحبین کے نزدیک امام کے تحریمہ باندھنے کے بعد، اور فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے (فتاوی ہندیہ ۱ / ۶۸)۔

یہ مثالیں بہ طور نمونہ اور بے تکلف معمولی تتبع سے لکھی ہیں، اگر ان مسائل کا احاطہ کیا جائے جن میں صاحبین کے قول پر فتویٰ ہے تو شاید کئی جلدیں مطلوب ہوں، ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ضرورت و مصلحت، قوت دلیل اور احتیاط کی بنا پر بہت سے مواقع پر صاحبین کے قول کو ترجیح دی گئی ہے، یہ حقیر صاحب ''سراجیہ'' کے اس قول سے غافل نہیں ہے:

''ثم الفتویٰ علی الإطلاق علی قول أبي حنیفة ثم بقول صاحبیه ثم بقول أبي یوسف ثم بقول محمد بن الحسن ثم بقول زفر بن الهذیل ثم بقول حسن بن زیاد'' (السراجیة ۱۵۷)۔

(فتویٰ مطلقاً امام ابوحنیفہ کے قول پر ہے، اس کے بعد صاحبین پھر امام ابو یوسف، پھر امام محمد پھر امام زفر اور اس کے بعد امام حسن بن زیاد کے قول پر ہوگا)۔

گو سراج الدین اودی نے امام صاحب کے مقابلہ صاحبین کے قول کو علی الاطلاق راجح قرار دیا ہے، مگر راجح وہی قول معلوم ہوتا ہے جس کو انھوں نے صیغۂ تضعیف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

قیل: إذا کان أبو حنیفة بجانب وصاحباه فی جانب المفتی بالخیار (حوالہ سابق)۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اگر ایک طرف امام ابوحنیفہ ہوں اور دوسری طرف صاحبین، تو مفتی کو اختیار ہے۔

اسی کو حاوی قدسی نے ترجیح دیا ہے، کیونکہ جب قضاء وشہادت کے ابواب میں امام ابو یوسف، ذوی الارحام کے مسائل میں امام محمد اور سترہ

مسائل میں تنہا امام زفر کا قول افتاء کے لئے راجح شمار کیا گیا ہے (ردالمحتار ار ۹۴) تو صاحبین کے قول پر فتوی کا ممنوع ہونا نا قابل فہم ہے۔

اس موقع پر شامی کی یہ بات بھی قابل توجہ ہے:

إذا حکم الحنفی بما ذھب إلیه أبو یوسف أو محمد أو نحوھما من أصحاب الإمام فلیس حکما بخلافه فقد أفاد أن أقوال أصحاب الإمام غیر خارجة من مذھبه فقد نقلوا منھم أنھم ماقالوا قولا إلا وھو مروی عن الإمام (ردالمحتار ۳ـ ۳۷۳)

(حنفی قاضی اگر امام ابو یوسف، یا امام محمد یا امام صاحب میں سے کسی کی رائے پر فیصلہ کرے تو یہ امام ابوحنیفہ کے خلاف فیصلہ متصور نہ ہوگا، ان سے منقول ہے کہ یہ حضرات جو بھی کہتے ہیں وہ امام صاحب سے بھی مروی ہوتا ہے)۔

اسی لئے جو فقہی نظائر اوپر ذکر کئے گئے، ان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مشائخ کی عمومی روش یہی ہے کہ سہولت ومصلحت، قوت دلیل اور ورع واحتیاط کے پیش نظر بعض اوقات صاحبین کے قول کو ترجیح دی جاتی ہے، زیر بحث مسئلہ میں یہ تینوں باتیں جمع ہیں: جیسا کہ مذکور ہوا، دلائل کے اعتبار سے بھی صاحبین کی رائے کی طرف میلان ہوتا ہے، موجودہ حالات میں یہ سماجی مصلحت سے بھی زیادہ ہم آہنگ ہے اور قرآن مجید کے حکم: "أوفوا بالعقود" (سورۂ مائدہ:۱) اور حدیث: "أحق الشروط ما استحللتم به الفروج" (بخاری ۱/ ۳۷۶) کی رو سے شرط کے مطابق اثر مرتب ہونے میں احتیاط اور نصوص کا پاس ولحاظ بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے، پھر فقہا کا یہ قاعدہ: "إعمال الکلام أولی من إھماله" (مکلف کے کلام کو نتیجہ خیز بنانا اس کو بے نتیجہ قرار دینے سے بہتر ہے) بھی یہی تقاضا کرتا ہے، اس لئے یہ بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ اس مسئلہ میں صاحبین کے قول کو ترجیح حاصل ہے۔

البتہ جیسے طلاق دینے اور مناسب صلاحیت کے فقدان کے باوجود دوسرا نکاح کرنے میں سماجی بگاڑ ہے، اسی طرح طلاق ونکاح ثانی کے ساتھ مہر کی ایسی کثیر مقدار کو مشروط کر دینے میں بھی مفاسد کا اندیشہ ہے جس میں کوئی قید وبند نہ ہو، ایسی صورت میں خطرہ یہ ہے کہ مرد طلاق تو نہ دے گا اور دوسرا نکاح تو نہ کرے گا، مگر وہ عورت پر ظلم وجور کا دروازہ کھول دے گا اور اپنی آتش انتقام کو سرد کرے گا، اس لئے مناسب ہے کہ مہر اس طرح مقرر کیا جائے کہ مثلاً، زینب کا مہر دس ہزار ہوگا، اور اگر قاضی شریعت سے اجازت لئے بغیر زینب کو طلاق دے گا یا اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح کرے گا تو مہر پچاس ہزار ہوگا، اس طرح جہاں مہر کی کثیر مقدار مرد کو نامناسب عمل سے باز رکھ سکے گی، وہیں قاضی شریعت نے اجازت کی قید اس کے لئے واقعی ضرورت کے موقع پر طلاق اور نکاح ثانی کے حق سے استفادہ کا دروازہ بھی وا رکھے گی۔



عرض مسئلہ:

# طلاق اور عقد ثانی کے ساتھ مشروط اضافہ مہر

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی

طلاق اور عقد ثانی کے ساتھ مشروط اضافۂ مہر کے سلسلہ میں مقالات کی روشنی میں عرض مسئلہ کی ذمہ داری مجھ کو دی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں ۵۴ مقالات اور ایک مقالہ کی تلخیص وصول ہوئی، ایک مقالہ پھلواری شریف میں ملا، ان میں تلخیص اور دو مقالوں کے مقالہ نگار حضرات کے اسماء گرامی مجھے معلوم نہ ہوسکے، ان مقالہ نگار حضرات نے اپنے اپنے مقالہ میں طلاق یا عقد ثانی کی صورت میں اضافۂ مہر کو غلط قرار دیا ہے۔

جناب مولانا مصلح الدین احمد صاحب نے اس مسئلہ پر کلام نہیں کیا ہے، جناب مولانا ابوالحسن علی صاحب نے اپنے مقالہ میں ان دونوں مسئلوں پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، لیکن اپنی رائے نہیں دی، بلکہ ارباب حل وعقد کے فیصلہ پر چھوڑ دیا، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی صاحب نے طلاق کی صورت میں اضافۂ مہر پر گفتگو نہیں کی ہے، بلکہ کثرت طلاق کو روکنے کی تدبیر ذکر کی ہے، نکاح ثانی پر پابندی لگانے کے لئے مہر کے تفاوت کو غیر معتبر قرار دیا ہے، لیکن کوئی دلیل نہیں دی ہے، جناب شمس پیرزادہ صاحب نے طلاق یا عقد ثانی کی صورت میں مہر میں اضافہ کو جرمانہ قرار دیا ہے اور اسی لئے انھوں نے اس کو غلط کہا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے شام کے قوانین کی ایک دفعہ اور شیخ عبدالوہاب خلاف کی رائے ذکر کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر بلا وجہ شرعی بیوی کو طلاق دیتا ہے اور قاضی کے نزدیک ثابت ہوجائے تو قاضی نفقہ عدت کے علاوہ ایک رقم یکمشت یا ماہانہ بیوی کو شوہر سے دلوا سکتا ہے اور اس طرح کا مصری عدالت کا ایک فیصلہ بھی نقل کیا ہے۔

اگر موصوف اس کو جرمانہ تصور کرنے پر اصرار نہ کریں، بلکہ اس طرح سوچیں کہ مرد کو عورت سے حق استمتاع جو حاصل ہوتا ہے اس کا معاوضہ عورت مہر کی شکل میں شوہر سے وصول پاتی ہے، عورت اپنی سہولت کے پیش نظر اس معاوضہ کی مقدار میں کم وبیش کرنے کی حقدار ہوتی ہے، یعنی اس کو حق ہے کہ وہ کم مقدار مہر پر نکاح کرے یا زیادہ مہر کا مطالبہ کرے، اب اگر عورت کو زندگی بھر شوہر کی رفاقت حاصل رہتی ہے، اور اس میں اس کے لئے بہت سی پریشانیوں سے نجات بھی ہے، تو ممکن ہے کہ مہر کی کم مقدار پر بھی وہ شوہر کو حق استمتاع دینے پر راضی ہوجائے، لیکن شوہر نے اس کی رفاقت سے انکار کردیا اور عورت کو حاصل شدہ ساری سہولتیں یکسر ختم ہوگئیں تو بھی عورت اسی کم مقدار پر راضی رہے، ضروری نہیں ہے، اس لئے وہ اپنی سہولتوں کی کمی وزیادتی کی صورت میں اپنے مہر میں زیادتی یا کمی کی شرط عائد کرتی ہے تو اس کو جرمانہ قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

خود موصوف نے اس سے اتفاق کیا ہے کہ بے جا طلاق کی صورت میں عورت کو نفقہ عدت کے علاوہ بھی رقم دلائی جائے، ظاہر ہے کہ اس اضافہ رقم کو مہر میں اضافہ کہا جائے یا نفقہ کا نام دیا جائے ایک ہی بات ہے، اسی طرح ایک عورت اپنے شوہر کی تمام تر توجہات کی تنہا مرکز ہوتی ہے، ایسی حالت میں وہ کم مقدار مہر پر بھی نکاح کرسکتی ہے، اگر شوہر نے دوسری شادی کی، جو جرم نہیں ہے، بلکہ شریعت نے اس کو اس کا حق دیا ہے، لیکن عورت کے حق میں تو بہر حال تنصیف ہوجاتی ہے، اب وہ شوہر کی پوری توجہ کی تنہا مستحق نہیں رہ جاتی، ایسی حالت میں اگر وہ زیادہ مہر کی شرط لگاتی ہے تو اس کو جرمانہ قرار دینا مناسب نہیں لگتا۔

مفتی محمد زید مظاہری، مفتی اقبال احمد کانپوری اور مولانا زبیر احمد قاسمی صاحب نے طلاق کی صورت میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کو اختیار کیا ہے، مفتی زید مظاہری اور مفتی اقبال احمد صاحب نے صراحۃً عقد ثانی کا ذکر نہیں کیا ہے، اور مولانا زبیر احمد قاسمی نے عقد ثانی کی صورت میں اختلاف ائمہ کا ذکر کیا ہے، اپنی رائے نہیں دی ہے،، خیال ہوتا ہے کہ عقد ثانی کی صورت میں بھی ان حضرات کے نزدیک امام صاحب کا قول ہی قابل عمل ہے۔

مفتی نسیم احمد قاسمی نے عقد ثانی کی صورت میں امام صاحب کے قول کو راجح قرار دیا ہے، اور طلاق کی صورت کو ذکر نہیں کیا ہے، غالباً ان کے

نزدیک بھی طلاق کی صورت میں امام صاحب کا قول ہی راجح ہے۔

مفتی محمد زید مظاہری نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر کلام کیا ہے، اور کہا ہے کہ امام صاحب کی دلیل قوی بھی ہے، اور فقہاء نے اس کو ترجیح بھی دی ہے، اس لئے اس سے عدول کی گنجائش نہیں، انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ ضرورت کی وجہ سے صاحبین کے قول کو اختیار کیا جاسکتا تھا، لیکن بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ صاحبین کے قول کو اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ صاحبین کا مسئلہ اختیار کرنے کو خلاف عقل نقل کہا ہے، اور لکھا ہے کہ اس مسلک کو اختیار کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مہر کی کثرت کی وجہ سے شوہر طلاق نہ دے سکے، اور یہ نظریہ کہ مہر اس قدر زیادہ کردو کہ شوہر طلاق دینے کی ہمت نہ کرسکے شرعاً بھی مردود ہے، اور عقلاً بھی، پھر حضرت تھانوی اور حضرت گنگوہی کی عبارتوں سے اس کی قباحت کو بڑی وضاحت سے ذکر کیا ہے، پھر آخر میں مولانا موصوف نے ایک مناسب حیلہ اور مفید تدبیر عالمگیری کے حوالہ سے نقل کیا ہے، کہ عورت نکاح کے وقت یہ شرط عائد کرے کہ شوہر اس کو طلاق نہ دے اور اس کے رہتے ہوئے کسی دوسری سے نکاح نہ کرے، اگر اس شرط کے خلاف کرے گا تو مہر مسمیٰ کے بجائے مہر مثل لازم ہوگا، اور مہر مثل کو متعین کردے کہ مہر مثل اتنا ہوگا، جو شوہر پر ثقیل ہوگا اور شوہر اس کا اقرار بھی کرلے، مفتی صاحب نے طلاق کی صورت میں زیادتی مہر کو شرعاً وعقلاً مردود کہتے ہوئے تفصیل کے ساتھ جن قباحتوں کو ذکر کیا ہے، ان کے اس مجوزہ حیلہ میں ساری قباحتیں اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ موجود ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ مہر مسمیٰ کثیر ہو یا مہر مثل مقرر کیا جائے، نتیجہ کے اعتبار سے دونوں میں فرق کیا رہ جائے گا؟

سات حضرات علماء نے دونوں صورتوں میں امام صاحب کے قول کو راجح قرار دیا ہے۔

(۱) مولانا عاقل خاں قاسمی (۲) مولانا محمد مصطفی ندوی (۳) مولانا آل مصطفی مصباحی (۴) مولانا محفوظ الرحمن (۵) مولانا عبدالرحمن قاسمی پالن پوری (۶) مولانا عبدالقیوم پالن پوری (۷) مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی (۸) مولانا عبدالرحمن قاسمی پالن پوری کے مقالہ پر مولانا محمد حنیف کمال پوری اور مولانا عمران خاں نے تصدیقی دستخط کئے ہیں، مولانا موصوف صولی طور پر کثرت طلاق کو روکنے کے لئے مہر کی مقدار میں اضافہ سے اتفاق رکھتے ہیں، البتہ ان کا خیال ہے کہ اس کے لئے امام صاحب کے قول سے عدول کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ امام صاحب کے نزدیک جس شرط کو پہلے ذکر کیا جائے وہ معتبر اور جو بعد میں مذکور ہو فاسد ہے، اس لئے مہر اس طرح طے کیا جائے گا کہ اگر شوہر بیوی کو طلاق دے گا تو مہر پچاس ہزار روپئے ہوگا، اور اگر طلاق نہیں دے گا تو مہر دس ہزار ہوگا، اس صورت میں اگر شوہر طلاق دے گا، یعنی پہلی شرط پوری کرے گا تو پچاس ہزار مہر لازم ہوگا، اگر طلاق نہیں دے گا تو مہر مثل دے گا، یہی رائے مولانا عبدالقیوم پالن پوری کی بھی ہے۔

لیکن مولانا محمد یوسف خاں قاسمی نے "بحر" کی عبارت نقل کر کے اور مفتی محمد زید مظاہری نے بحر اور فتح القدیر کی عبارتیں نقل کر کے واضح کردیا ہے کہ امام صاحب کے نزدیک شرط کے معتبر اور غیر معتبر ہونے میں تقدیم وتاخیر کو کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ اصل وجہ تنجیز وتعلیق ہے، نہ کہ تقدیم وتاخیر، یعنی جو شرط منجز ہوگی وہ صحیح ہوگی اور جو معلق ہوگی وہ فاسد ہوگی، چاہے جو پہلے یا بعد میں ہو۔

اس تفصیل کے بعد میرا خیال ہے کہ دونوں حضرات اضافہ مہر کے لئے صاحبین کا قول اختیار کرنے کی رائے دیں گے۔

مولانا شاہین جمالی نے طلاق دینے کی صورت میں مہر مثل کو لازم قرار دیا ہے، البتہ مولانا موصوف نے طلاق کی صورت میں بطور متعہ ایک کثیر رقم شوہر کے ذمہ لازم کرنے سے پہلے اتفاق کیا ہے، میں پھر عرض کروں گا کہ رقم کثیر کی مقدار نفقہ کی صورت میں ہو یا مہر مثل کی صورت میں ہو، یا متعہ کی صورت میں ہو یا مہر مسمیٰ کی صورت میں ہو، نتیجہ کے اعتبار سے ان سب میں کوئی فرق نہیں ہے۔

مولانا نے بے جا طلاق کی صورت میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذریعہ حکومت سے شوہر کو ایک سال یا چھ ماہ قید بامشقت کی سزا دلوانے کی رائے دی ہے۔

غالباً مولانا کو یہ علم ضرور ہوگا کہ سرکاری عدالت سے ایک عورت کے لئے حصول انصاف آسان نہیں ہے، اور پھر اس میں بیجا طلاق کے ساتھ بجا طلاق کی صورتیں بھی زد میں آئیں گی، اور حکومت کے لئے مسلم پرسنل لا بورڈ میں مداخلت کی راہ ہموار ہوگی وہ ظاہر ہے، اس لئے مولانا کی اس تجویز

سے اتفاق کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔

مولانا محمد حاذق قاسمی، مولانا ظفر الاسلام اعظمی اور مولانا نور القاسمی نے طلاق کی صورت میں صاحبین کے قول کو ترجیح دی ہے، مولانا حاذق قاسمی اور مولانا ظفر الاسلام اعظمی نے عقد ثانی کے سلسلہ میں کوئی رائے نہیں دی ہے، مولانا محمد نور القاسمی نے عقد ثانی کا تذکرہ نہیں کیا ہے، خیال ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک عقد ثانی میں بھی صاحبین کا قول راجح ہے، سات حضرات نے طلاق کی صورت میں صاحبین کے قول کو ترجیح دی ہے اور عقد ثانی کی صورت میں امام صاحب کے قول کو راجح کہا ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) مولانا عبد القادر قاسمی (۲) مولانا معین الدین قاسمی (۳) مولانا محمد یوسف خاں قاسمی (۴) مولانا ابوسفیان مفتاحی (۵) مولانا محمد رفیق بن آدم (۶) مولانا محمد نعیم اختر قاسمی (۷) اور مولانا عبید اللہ الاسعدی، مولانا اسعدی نے طلاق کی صورت میں صاحبین کے قول کو بہ ضرورت اختیار کرنے کی گنجائش کا اعتراف کیا ہے، لیکن ابھی ان کو ضرورت سمجھ میں نہیں آئی ہے۔

مولانا نعیم اختر نے عقد ثانی کرنے یا نہ کرنے کی صورت میں مہر میں اضافہ یا کمی کو غلط قرار دیا ہے، دونوں صورتوں میں مہر مثل واجب کیا ہے، اگر ان کی یہ اپنی رائے ہوتی تو مضائقہ نہیں تھا، لیکن انھوں نے اس قول کو علامہ نووی کے حوالہ سے امام صاحب کی طرف منسوب کیا ہے، حالانکہ جو عبارت انھوں نے ذکر کی ہے اس کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں ہے، بہتر ہوتا کہ مولانا موصوف امام صاحب کے قول کے لئے علماء حنفیہ اور فقہ حنفی کی کتابوں کی طرف رجوع کرتے، امام صاحب کے نزدیک دونوں شرطیں فاسد نہیں ہیں، صرف وہ شرط فاسد ہے جو معلق ہو اور اسی صورت میں مہر مسمی کے بجائے مہر مثل لازم ہوتا ہے، شرط منجز میں ان کے نزدیک بھی مہر مسمی ہی لازم ہے۔

۲۸ حضرات نے دونوں مسئلوں میں صاحبین کے قول کو اختیار کرنے کی رائے دی ہے، اور ''رسم المفتی'' اور شامی کے حوالوں سے ضرورت کی بنیاد پر صاحبین کا قول اختیار کرنے کو مناسب قرار دیا ہے، جن میں سے چند نام یہ ہیں:

۱۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، ۲۔ مولانا عتیق احمد قاسمی، ۳۔ مفتی حبیب اللہ قاسمی، ۴۔ مولانا اختر امام عادل، ۵۔ مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی، ۶۔ مولانا قدرت اللہ باقوی، ۷۔ مولانا اخلاق الرحمن ارریاوی، ۸۔ مولانا ولی اللہ قاسمی، ۹۔ مولانا فضل الرحمن رشادی، راقم الحروف عبد الجلیل قاسمی۔



عرض مسئلہ:

# تفویض طلاق قبل النکاح

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی [1]

تفویض طلاق بوقت نکاح وبعد از نکاح کے جواز پر تمام مقالہ نگاروں نے اتفاق ظاہر کیا ہے، البتہ قبل النکاح کی صورت میں تفویض کے جواز سے میں نے اور میرے ہم خیال تین مقالہ نگاروں نے، باقی سب حضرات کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔

اسمائے مجوزین اوران کے دلائل کے جوابات حسب ذیل ہیں:

(۱) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے قبل النکاح "کابین نامہ" لکھوانے کے جواز پر "خلاصۃ الفتاویٰ" کی عبارت سے استدلال کیا ہے:

"لوقال الزوج تزوجتك على أن أمرك بيدك بعد التزوج فقبلت المرأة صار الأمر بيدها" (خلاصة الفتاوى ۲۔۲۹)

جواب: اس میں "تزوجتک" کا صیغہ متکلم "ک" خطاب کے ساتھ صاف بتارہا ہے کہ یہ صورت عقد نکاح کے وقت کی ہے، چنانچہ مفتی محمد زید مظاہری نے "عالمگیری کتاب الحیل" (۳۹۶/۶) کے مضمون کی عبارت کو بوقت نکاح پر محمول کیا ہے، (دیکھئے: ان کا مقالہ ص ۱۳)۔

(۲) مولانا عتیق احمد قاسمی نے تفویض قبل النکاح کے جواز پر (أحکام الشرعیۃ بأحوال الشخصیۃ ۳۲۶) کی عبارت: "والتفويض يصح قبل الزوج ويصح عند انشائه ويصح بعده عند الحنفية وذلك لأنه تعليق وتعليق الطلاق قبل الزواج جائز" سے حجت قائم کی ہے۔

جواب: لیکن تفویض کو تعلیق قرار دینا خلاف اصل ہے، تفویض کی اصل تملیک ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں معنی تعلیق بھی ہے، اور شوہر ملک نکاح سے پہلے خود طلاق دینے کا مجاز نہیں تو وہ دوسرے کو طلاق سپرد کرنے کا مجاز کیوں کر ہوسکتا ہے۔

نیز زیر بحث مسئلہ تفویض طلاق کا ہے نہ کہ تعلیق طلاق کا، لہٰذا دلیل اصل مسئلہ سے متعلق نہیں رہی، مزید گفتگو آگے آرہی ہے۔

(۳) اکثر فاضل مقالہ نگاروں نے قبل النکاح تفویض طلاق کے جواز پر استدلال حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے رسالہ "الحیلۃ الناجزۃ" کی عبارت سے کیا ہے اور حضرت تھانویؒ نے اس کے جواز پر استدلال: "لما في تنوير الأبصار باب التعليق وشرطه الملك أو الإضافة كأن نكحتك فأنت طالق. وفي العالمكيرية الفصل الثالث من كتاب الشروط والثاني تعليق التفويض بالشرط" سے کیا ہے۔

جواب: لیکن اول تو اس حوالہ میں "إن نكحتك" کا جملہ خود اضافت ملک نکاح کو بوقت نکاح ظاہر کررہا ہے، دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ دراصل طلاق مضاف الی ملک النکاح کا ہے، نہ کہ تفویض طلاق لیاقت ونسبت ملک کے معتبر ہونے کا، چنانچہ اضافت الی ملک النکاح کے اصول کے مطابق قبل النکاح طلاق کی صحت پر فقہاء معتبرین کی کوئی صریح عبارت موجود نہیں ہے۔

(الف) تفویض طلاق کے باب میں کتب فقہ میں جو مسائل مذکور ہیں وہ سب بعد النکاح تفویض سے متعلق ہیں۔

(ب) ملا علی قاری، صاحب "ہدایہ" اور ابن الہمام رحمہم اللہ وغیرہم نے تفویض طلاق کو دلیل قیاس کے برخلاف دلیل استحسان سے ثابت مان کر جن آثار صحابہ سے استدلال کیا ہے وہ سب آثار عند النکاح یا بعد النکاح تفویض طلاق کے جواز پر دلالت کرتے ہیں۔

(ج) خود بخاری (۷۹۰/۲) میں آیت تخییر کے سلسلے کی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہؓ سے یہ ارشاد: "إني ذاكر لك أمرا فلا عليك أن لا تعجلي حتى تسأمري أبويك" اگر تفویض طلاق کے معنی میں ہو (جب کہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے) تب بھی اس واقعہ کا بعد النکاح ہونا معلوم ہے۔

(د) اور تخییر کی مختلف المعنیٰ آیت کا نزول بھی قطعی طور پر ازواج مطہرات کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں داخل ہوچکنے کے بعد ہوا ہے۔

اس طرح قرآن وحدیث اور آثار صحابہ میں قبل النکاح تفویض طلاق کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے، رہ گئی یہ بات کہ اضافت الی ملک النکاح کے اصول کو

[1] شیخ الحدیث مدرسہ امداد الاسلام، میرٹھ

تفویض طلاق میں کیوں استعمال نہیں کیا جاسکتا؟ جبکہ طلاق وعتاق اور دیگر معاملات میں فقہاء نے استعمال کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث مرفوع میں ارشاد نبوی ہے:

''لا نذر لابن آدم فیما لا یملك ولا عتق فیما لایملك ولا طلاق فیما لا یملك'' (سنن الترمذی ۱-۱۴۱ باب لا طلاق قبل النکاح) وفی الباب عن علی ومعاذ وجابر وابن عباس وعائشة حدیث عبداللّٰه بن عمرو حدیث حسن صحیح. وهو أحسن شئی ما روی فی هذا الباب وهو قول أکثر أهل العلم من أصحاب النبی ﷺ وغیرهم. وقال القاری: وهو متمسك الشافعی وبه یقول أحمد (مرقات ۶-۵۸۲)

اس حدیث کا عموم قبل النکاح طلاق کو غیر معتبر قرار دے رہا ہے تو مجوزین کے مطابق تفویض کا بھی یہی حکم ہونا چاہئے، اس کے بالمقابل اضافت ملک سے ملک کے ثبوت پر چند صحابہ وتابعین کے آثار ہیں، صحیح مرفوع حدیث نہیں ہے، پھر ان آثار کے برعکس ابن حجر نے جمہور علماء کا مسلک نقل کیا ہے، اور امام بخاری نے ''لاطلاق قبل النکاح'' پر ۲۳ صحابہ وتابعین کے نام اپنی تائید میں گنوائے ہیں، علامہ کرمانی نے اس مسلک کو لگ بھگ اجماعی قرار دیا ہے۔

''مقصوده من تعداد هولاء الجماعة الثلثة والعشرون من الفقهاء والأفاضل الإشعار بأنه یکاد أن یکون إجماعا علی أنه لا تطلق قبل النکاح'' (حاشیہ بخاری ۲-۷۹۳)

خود حنفیہ کے یہاں اسی مذکورہ حدیث کے پہلے ''جزء حلال لانذر لابن آدم فیمالایملک'' میں اضافی ملکیت کا اعتبار نہیں ہے۔

چنانچہ ملاعلی قاری اس کی شرح میں لکھتے ہیں: ''أی لا صحة له فلو قال: لله تعالی علی أن أعتق هذا العبد ولم یکن ملکه وقت النذر لم یصح النذر. فلو ملکه بعد هذا لم یعتق علیه کذا ذکره بعض الشراح من علمائنا'' (مرقات المفاتیح ۶-۳۸۵)

تو پھر تفویض طلاق میں قبل النکاح اضافت الی النکاح کو کیوں معتبر مانا جائے؟

(س) میری رائے میں طلاق اور تفویض میں ایک واضح فرق موجود ہے جو حکم کی یکسانیت میں مانع ہے اور وہ یہ ہے کہ حق طلاق بہ نص قرآن صرف شوہر کو خدا کی طرف سے عطا کردہ ہے ''الذی بیده عقدة النکاح'' (البقرۃ: ۲۳۷) عورت کو (حق طلاق دینا) خدا کو منظور نہیں، ورنہ وہ خود دیتا، ایسی حالت میں شوہر کا اپنی طرف سے عورت کو یہ حق منتقل کرنا حکم منصوص کے خلاف بھی ہے، قلب موضوع بھی ہے، اور منجانب اللہ شوہر کو حق تفویض نہ ملنے کے سبب یہ حق ضعیف بھی ہے، جبکہ خود شوہر کا طلاق دینا خدا کے حکم سے حق قوی ہے اور قوی اور ضعیف کا ایک حکم نہیں ہوسکتا۔

(ط) اس مسئلہ میں دو فاضل مقالہ نگار جناب مولانا شہباز عالم ندوی اور مولانا سید اسرار الحق فاضل سبیلی میرے مکمل ہم خیال ہیں، ان دونوں حضرات نے قبل النکاح تفویض کے عدم جواز پر علامہ عبدالرحمن جزیری کی اس صریح عبارت سے استدلال کیا ہے:

''فإذا اشترطت هذه الشروط خارج العقد فإنها لا یعمل بها'' (الفقه علی المذاهب الاربعة ۲-۸۹)

(ع) مولانا عبیداللہ اسعدی نے تفویض طلاق کو سرے سے قرآن وحدیث اور مصالح شرعیہ کے خلاف قرار دیا ہے، اور اس کو متقدمین فقہاء کا بیان کردہ جزئی مسئلہ بتایا ہے جس کو قاعدہ کلیہ نہیں بنایا جاسکتا، اسی ضمن میں ''کابین نامہ'' لکھوانے پر نکیر کی ہے جس سے ایک گونہ میرے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

(ف) تفویض طلاق کا اصل مقصد عورت کو شوہر کے ضرر متحقق سے بچانا ہے اور ضرر کا تحقق وقت نکاح تک شوہر کی شخصیت، اس کی سیرت وعادت اور اس کے رجحانات فکر کا مشاہدہ ومطالعہ اور اس کی مزاجی کیفیت کی چھان بین کر کے ہوسکتا ہے، لیکن وقت نکاح سے قبل ضرر زوج کا خدشہ محض وہمی اور فرضی ہے، بلکہ قبل از نکاح اس کو ظالم وجابر مان لینا اور ''کابین نامہ'' لکھوانا شدید قسم کی بدگمانی ہے جس کا کوئی جواز نہیں، پس تفویض قبل النکاح کا بھی کوئی جواز نہیں۔

البتہ بوقت نکاح تفویض طلاق کا جواز (حالانکہ یہ بھی قبل از حصول ملک نکاح ہے) اس بناء پر ہوسکتا ہے کہ تفویض کا ملک نکاح کے ساتھ زمانی قرب واتصال ہے اور وہ انشاء نکاح کے ساتھ ساتھ پائی جارہی ہے، جبکہ قبل النکاح تفویض میں تفویض اور ملک نکاح کے حصول کے درمیان فاصلہ حائل ہے، اور ملک نکاح کا حصول بوقت تفویض موہوم امید کے درجہ میں ہے اور تحقق سے دور ہے، لہٰذا دونوں حالتوں کا حکم یکساں نہیں ہوسکتا، قریب بہ تحقق ملک میں ملک کا اعتبار کیا جاسکتا ہے اور موہوم ملک میں ملک کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔



# نکاح میں تفویض طلاق اور مشروط مہر کا مسئلہ

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی [1]

یہ مذہبی خوش اعتقادی نہیں، بلکہ ایک روشن حقیقت اور زندہ پائندہ واقعہ ہے کہ اسلام کا قانون ازدواج جس درجہ معتدل، متوازن اور فطرت انسانی سے ہم آہنگ اور سماجی مصالح کی کسوٹی پر کامل و مکمل ہے، وہ بجائے خود اسلام کا معجزہ اور اس کی حقانیت کی روشن دلیل ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا سرچشمہ مخلوق کا ناقص و نا تمام علم نہیں، بلکہ یہ خالق کائنات اور رب العالمین کا عطا فرمودہ ہے، جو انسانیت کی ضروریات اور مصالح سے خود ان سے بھی زیادہ واقف و آگاہ اور علیم و خبیر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مشرق و مغرب کا نہ کوئی مذہب اور مذہبی گروہ ہے اور نہ انسانوں کا بہ طور خود وضع کیا ہوا قانون، جس نے اسلام کے نظام معاشرت سے استفادہ نہ کیا ہو اور اس خرمن کی خوشہ چینی سے بے نیاز ہو، ایک سماجی ضرورت کے طور پر بہ درجہ مجبوری طلاق کی گنجائش، نظام میراث، عورت کے لئے جائداد میں مالکانہ حقوق کا تصور، مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے لئے دوسرے نکاح کی اجازت اور اس طرح کے بہت سے احکام ہیں جن کو آج تمام ہی وضعی قوانین نے تسلیم کیا ہے، یہ اسلام ہی کے معاشرتی نظام کی دین ہے۔

مگر افسوس کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں احکام شریعت سے ناواقفیت و نا آگہی، دوسری اقوام کی بعض ایسی روایات و رواجات سے تاثر، جو سراسر اسلامی تعلیمات اور انصاف کے عمومی تقاضوں کے خلاف ہے، اور شریعت کی جانب سے دیئے گئے بعض حقوق کا غلط استعمال اور خدا ناترسی کے نتیجہ میں ان لوگوں کو شریعت اسلامی کے خلاف منہ کھولنے کا موقع مل رہا ہے جن کو مسلمانوں کا مذہبی اور تہذیبی تشخص کسی طور پر گوارہ نہیں، اور علماء کے لئے بھی یہ بات لمحۂ فکریہ ہوگئی ہے کہ وہ حدود شریعت میں رہتے ہوئے ایسی تدبیریں اختیار کریں کہ قانون کے غلط استعمال کا سد باب ہو سکے، نکاح کے ساتھ بعض شرطوں کو ہم رشتہ کرنے کے مسئلہ پر بھی اسی پس منظر میں غور کرنا چاہئے۔

۱۔ نکاح میں لگائی جانے والی شرطیں بنیادی طور پر تین طرح کی ہیں:

## پہلی شرط:

ایسی شرطیں جو انہی حقوق و فرائض کو مؤکد کرتی ہوں جن کو شریعت نے نکاح کی وجہ سے لازمی طور پر واجب قرار دیا ہے، جیسے شوہر کا بیوی کو نفقہ ادا کرنا، اس کے ساتھ احکام شریعت کے مطابق بھلے طور پر زندگی بسر کرنا، بیوی کا معروف میں شوہر کی نافرمانی نہ کرنا اور شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نہ جانا وغیرہ۔

ایسی شرطیں بالاتفاق معتبر ہیں اور فریقین پر ان کا ایفاء واجب ہے، کیونکہ یہ بجائے خود نکاح کے مقاصد میں ہیں اور شریعت نے ان کو واجب قرار دیا ہے، نکاح کے وقت شرط کے طور پر ان کا تذکرہ محض احکام شریعت پر عمل اور اپنے اپنے فرائض و واجبات کی ادائیگی کے عہد کی تجدید و توثیق ہے (فتح الباری ۹ر۲۱۷)۔

## دوسری شرط:

ایسی شرطیں جو نکاح سے متعلق شریعت کے وجوبی احکام سے متصادم ہوں، حافظ ابن رشد کے الفاظ میں جو نکاح صحیح ہونے کی شرطوں میں سے کسی شرط کو ساقط کر دیتی ہوں یا نکاح کے واجب احکام میں سے کسی حکم میں تغیر و تبدیلی کو مستلزم ہوں (بدایۃ المجتہد ۲ر۵۹)، جیسے: یہ شرط کہ بیوی کا مہر نہیں ہوگا، یا یہ کہ شوہر کے ذمہ اس کا نفقہ نہیں ہوگا، یا عورت کی طرف سے شرط کہ شوہر اس سے مقاربت نہیں کرے گا، یا یہ کہ اس کو سوکن کے حصہ میں سے بھی اضافی حصہ دے گا، من جملہ انہیں شرائط کے یہ ہے کہ شوہر، عورت اور اس کے اہل خاندان سے کوئی مالی مطالبہ کرے (المغنی ۷ر۷۲)۔

[1] سکریٹری جنرل اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، مؤسس و ناظم "المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد"

ایسی شرطیں بالاتفاق نامعتبر ہیں، امام بخاری نے ایسی شرطوں کی ممانعت پر مستقل عنوان قائم فرمایا ہے: "باب الشروط التی لا تحل فی النکاح" ان شرطوں کا بیان جو نکاح میں حلال نہیں ہیں) (بخاری مع الفتح ۹/۲۱۹)۔

پھر اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول پیش کیا ہے: "کوئی خاتون اپنی دینی بہن یعنی سوکن کو طلاق دینے کی شرط نہ لگائے" اس کے بعد حضرت ابوہریرہ کی روایت ذکر کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عورت کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنی سوکن کی طلاق کا مطالبہ کرے تاکہ اس کے حصہ کی بھی حقدار ہوجائے، کیونکہ جو اور جتنا اس کے لئے مقدر ہے وہ تو اسے مل کر ہی رہے گا (حوالہ سابق)۔

اگر اس طرح کی شرطیں لگادی جائیں تو نکاح پر بالاتفاق ان کا کوئی اثر نہیں ہوگا، نکاح منعقد ہوجائے گا اور شرطیں لغو و بے اثر ہوجائیں گی (بدایۃ المجتہد ۲/۵۹، فتح الباری ۹/۸۱۲)۔

## تیسری شرط

یہ وہ شرطیں ہیں جن سے عورت کو نفع پہنچتا ہو اور شریعت نے نہ ان کو واجب قرار دیا ہو اور نہ ان سے منع کیا ہو، گویا ان شرطوں کو مان کر مرد اپنے بعض ایسے حقوق سے دستبردار ہوجاتا ہے، جن سے دستبردار ہونے کا اس کو اختیار ہے، مثلاً: عورت کا یہ شرط لگانا کہ وہ اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا، یا یہ کہ اس کو اس کے میکہ میں رکھے گا، یا یہ کہ اس کو اس کے شہر سے باہر نہیں لے جائے گا، وغیرہ (المغنی ۷/۱۷)۔

ایسی شرطوں کے ساتھ نکاح کیا جائے تو نکاح منعقد ہوجائے گا، اس پر اتفاق ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ شرطیں معتبر ہوں گی اور ان کی تکمیل واجب ہوگی یا نہیں؟ اور سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین میں مثبتین اور منکرین دونوں کی قابل لحاظ تعداد ہے۔

## منکرین اور ان کے دلائل:

جو لوگ ایسی شرطوں کو بھی نامعتبر خیال کرتے ہیں، ان میں صحابہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام نامی ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبۃ ۴/۲۰۰)، نیز یہی رائے سعید بن المسیب، حسن بصری، شعبی، طاؤس، (مصنف بن ابی شیبہ ۴/۲۰۰، من قال لیس لہا شرط الخ)، ابراہیم نخعی، ابن شہاب زہری، عطا، ایاس بن معاویہ اور ہشام بن ہبیرہ (مصنف عبدالرزاق ۶/۲۳۰)، ابن سیرین اور سفیان ثوری (شرح السنۃ للبغوی ۹/۵۵) کی ہے، ائمہ اربعہ میں امام ابوحنیفہ، امام مالک (بدایۃ المجتہد ۲/۵۹) اور امام شافعی (شرح مہذب ۱۶/۲۵۰) کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے، فقہاء مالکیہ ایسی شرطوں کو مکروہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرد کے لئے ان کا ایفاء کرنا واجب تو نہیں ہے، لیکن مستحب ہے (حاشیۃ صاوی علی الشرح الصغیر ۲/۳۸۵) ان حضرات کے دلائل حسب ذیل ہیں:

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کل شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل" (جو شرط کتاب اللہ میں نہیں ہے وہ باطل ہے) (بخاری ۱/۳۷۷ کتاب الشروط) اور ظاہر ہے کہ نکاح کے ساتھ اس قسم کی شرطیں کتاب اللہ میں مذکور نہیں ہیں۔

(۲) ارشاد نبوی ہے: "المسلمون علی شروطھم إلا شرطا أحل حراما أو حرم حلالا" (یعنی مسلمانوں کے حقوق و واجبات طے شدہ شرطوں کے مطابق ہوں گے، سوائے ایسی شرط کے جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کرتی ہو) شوہر کے لئے جب شریعت نے دوسرے نکاح کی اور جہاں رہے وہاں بیوی کو رکھنے کی اجازت دی ہے تو اب کسی شرط کے ذریعہ مرد کا اس حق سے محروم ہوجانا حلال کو حرام کر لینے کے مترادف ہے۔

(۳) ایسی شرطیں تقاضۂ عقد کے خلاف ہیں (شرح مہذب ۱۶/۲۵۰، فقہ السنۃ ۲/۵۲ للسید سابق)۔

(۴) ایک خاتون جن سے شوہر نے مکان دینے کا وعدہ کیا تھا، جب ان کی بابت حضرت علیؓ سے دریافت کیا گیا تو فرمایا: اللہ کی شرط بیوی کی شرط سے مقدم ہے، "شرط اللہ قبل شرطھا" (مصنف ابن ابی شیبۃ ۲/۲۰۰)۔

## مثبتین اور ان کے دلائل

جن حضرات کے نزدیک ایسی شرطیں معتبر ہیں اور شوہر پر ان کو پورا کرنا واجب ہے، ان کی فہرست بھی خاصی طویل ہے، صحابہ میں حضرت عمر (مصنف عبدالرزاق ۶/۲۲۷) اور عمرو بن العاص (مصنف عبدالرزاق ۶/۲۲۸) کا یہی نقطۂ نظر تھا، بعد کے اہل علم میں قاضی شریح، ابوالشعثاء (حوالہ سابق ۶/۲۲۴) اوزاعی کے بعد

باب الشروط فی النکاح)، حضرت عمر بن عبدالعزیز (مصنف ابن ابی شیبہ ۴؍۲۰۰)، اسحاق (ترمذی ار۲۱۴ باب الشرط عند النکاح) اوزاعی، ابن شبرمہ (بدایۃ المجتہد ۲؍۵۹) کا یہی قول ہے، علامہ بغوی نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی طرف بھی اس کی نسبت کی ہے (شرح السنۃ ۹؍۵۴)، اکثر محدثین کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے، امام بخاری نے اپنے ''ترجمۃ الباب'' میں حضرت عمرؓ کے اس قول کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے جو اس قسم کی شرطوں کے معتبر ہونے کی بابت ہے (بخاری باب الشروط فی النکاح) اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسی گروہ کے ساتھ ہیں، یہی حال امام ابوداؤد کا ہے (ابوداؤد مع عون المعبود ۶؍۱۷۶ باب فی الرجل یشترط لہا دارا)، ائمہ مجتہدین میں یہی رائے امام احمد بن حنبل کی ہے (المغنی ۷۔۷۱)۔

ان حضرات کے دلائل اس طرح ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "یایها الذین آمنوا أوفوا بالعقود" (سورۂ مائدہ:۱) (اے ایمان والو: وعدوں کو پورا کرو)۔

ابوبکر جصاص رازی نے اس آیت کے ذیل میں حضرت عبداللہ بن عباس، مجاہد، ابن جریج، ابوعبیدہ اور متعدد لوگوں سے نقل کیا ہے کہ ''عقود'' سے مراد ''عہود'' یعنی معاہدات اور وعدے ہیں (احکام القرآن ۳؍۲۸۳، ۲۸۴)، ظاہر ہے کہ نکاح کے وقت طے پانے والی جائز شرطیں بھی ''عہد'' کے قبیل سے ہیں، خود امام جصاص نے آگے چل کر لکھا ہے:

"و كذلك كل شرط شرطه إنسان على نفسه فى شئي يعمله فى المستقبل فهو عقد" (احکام القرآن ۳؍۲۸۵) (مستقبل میں کئے جانے والے افعال کی بابت اپنے آپ پر انسان جو بھی شرط عائد کرلے وہ ''عقد'' ہے)۔

پھر آگے اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ اس آیت کا تقاضا کیا ہے؟ فرماتے ہیں:

"وهو عموم فى إيجاب الوفاء بجميع ما يشترط الإنسان على نفسه مالم تقم دلالة تخصصه" (احکام القرآن ۳؍۲۸۶) (انسان اپنے آپ پر جو شرطیں منظور کرلے، یہ آیت ان تمام کی بابت ایفاء اور تکمیل کو واجب قرار دیتی ہے، سوائے اس کے کہ کوئی ایسی دلیل موجود ہو جو اس میں تخصیص کا تقاضا کرتی ہو)

اسی طرح کا مضمون قرآن مجید نے دوسری جگہ اس طرح ارشاد فرمایا ہے: "وأوفوا بعهد الله" (النحل ۹۱) (اللہ کے عہد کو پورا کرو)۔

مفسر قرطبی اس کے ذیل میں لکھتے ہیں: "لفظ عام لجميع ما يعقد باللسان ويلتزمه الإنسان من بيع أو صلة أو مواثقة فى أمر موافق للديانة" (الجامع لأحکام القرآن ۱۰؍۱۶۹)۔ (عقد ان تمام باتوں کو عام ہے جو زبان سے طے کی جائے اور جسے انسان اپنے اوپر لازم کرلے، خرید و فروخت ہو یا صلہ رحمی یا کسی بھی ایسے معاملہ میں معاہدہ جو دین کے موافق ہو)۔

۲۔ حضرت عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''أحق ما أوفيتم من الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج" (بخاری مع الفتح ۹؍۲۱۷، مسلم ار۴۵۵، ابوداؤد ار۲۹۱، ترمذی ار۲۱۲، نسائی ۲؍۸۷، ابن ماجۃ ار۴۰، الفاظ بخاری کے ہیں)۔ (سب سے زیادہ قابل ایفاء شرطیں وہ ہیں جن کے ذریعہ سے تم عصمتوں کو حلال کرتے ہو)۔

عام طور پر محدثین نے اس سے اسی قسم کی شرطیں سمجھی ہیں، بخاری و ابوداؤد کا نقطۂ نظر گزر چکا ہے، ابن ابی شیبہ نے پہلے وہ روایات و آثار نقل کئے ہیں جن سے شرطوں کا معتبر ہونا معلوم ہوتا ہے، اور سب سے پہلے حضرت عمر کا یہ اثر ذکر کیا ہے، پھر ان کا ذکر کیا جو ایسی شرطوں کو نامعتبر تصور کرتے ہیں اور ابتداء حضرت علیؓ کے قول سے کی ہے اور حضرتؓ عقبہ بن عامر کی اس روایت کو پہلے گروہ کے ساتھ ذکر کیا ہے (مصنف ۲۔۲۲۰۔۱۹۹)۔

(۳) عبدالرحمن بن غنم کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر تھا، حضرت عمرؓ کے پاس ایک مقدمہ آیا، جس میں شوہر بیوی کے درمیان یہ شرط طے شدہ تھی کہ شوہر اس کو اس کے میکہ ہی میں رکھے گا (أن لا يخرجها من دارها) حضرت عمر نے فرمایا کہ شرط پوری کی جائے، اس کے شوہر نے کہا کہ اگر اس طرح کا فیصلہ ہو تو عورت جب بھی شوہر سے علیحدہ ہونا چاہے گی علیحدہ ہوجائے گی، حضرت عمر نے فرمایا: "المسلمون عند ما شارطتهم عند مقاطع حدودهم" (مصنف عبدالرزاق ۲؍۲۲۷)، ابن ابی شیبہ نے اس کو مختصراً (مصنف ۴؍۲۰۰) اور بخاری نے تعلیقاً نقل کیا ہے۔ (بخاری مع الفتح ۹؍۲۱۷)

(۴) یہی رائے متعدد صحابہ، یعنی عمر کے علاوہ سعد بن ابی وقاص، معاویہ اور عمرو بن العاص کی بھی ہے (المغنی ۷؍۷۱)، نیز حضرت عمر کا فیصلہ اس وقت ہوا ہے جب صحابہ کی بڑی تعداد مدینہ میں فروکش تھی اور کسی کا اس فیصلہ میں اختلاف کرنا منقول نہیں ہے۔

(۵) یہ ایسی شرطیں ہیں جو مقاصد نکاح میں تو مانع نہیں ہیں اور اس سے ایک جائز مقصد ومنفعت متعلق ہے، جیسے مہر کی زیادتی یا اپنے ملک کے بجائے کسی اور ملک کے سکہ میں مہر کی تعیین، تو انہیں امور کی طرح ان شرطوں کو بھی لازم ہونا چاہئے (حوالہ سابق)۔

## فریقین کے دلائل پر ایک نظر

ہر چند کہ فریقین نے اپنے اپنے موقف پر ان مختلف دلائل سے استدلال کیا ہے، لیکن اصل استدلال دونوں ہی فریقوں کا حدیث نبوی ہے، ائمہ ثلاثہ نے اس حدیث کے عموم کو ملحوظ رکھا ہے: "كل شرط ليس في كتاب الله فهو باطل ولو كان مائة شرط" (بخاری ۱/ ۶۵ باب التقاضی والملازمۃ فی المسجد) (جو شرط کتاب اللہ میں نہ ہو وہ باطل ہے گو وہ سو شرطیں ہوں)۔

اور حنابلہ نے نکاح سے متعلق اس خصوصی ارشاد کو پیش نظر رکھا ہے: "أحق الشروط أن يوفى به ما استحللتم به الفروج" (سب سے بڑھ کر وہ شرط قابل ایفاء ہے جس کے ذریعہ تم عصمت حلال کرتے ہو)۔

حافظ ابن رشد بلند پایہ فقہاء مالکیہ میں ہیں اور منصف مزاج بھی ہیں، مگر ان کا رجحان حنابلہ کی طرف ہے، فرماتے ہیں: والحديثان صحيحان أخرجهما البخاري ومسلم إلا أن المشهور عند الأصوليين القضاء بالخصوص على العموم وهو لزوم الشرط وهو ظاهر ما وقع في "العتبية" وإن كان المشهور خلاف ذلك" (بدایۃ المجتہد ۲/ ۵۹)۔

(دونوں حدیثیں صحیح ہیں، جن کی بخاری ومسلم نے تخریج کی ہے، لیکن علماء اصول کے نزدیک یہ بات معروف ہے کہ خاص کے ذریعہ عام کی تخصیص کی جائے گی، اور زیر بحث مسئلہ میں خصوص یہی ہے کہ شرط کی تکمیل لازمی ہو 'عتبیہ'' (فقہ مالکی کی ایک اہم کتاب) میں جو کہا گیا ہے اس سے بھی یہی ظاہر ہے، گو قول مشہور اس کے خلاف ہے)۔

موجودہ دور کے اہل تحقیق علماء میں متعدد لوگ ہیں جو اس مسئلہ میں حنابلہ کے نقطۂ نظر کے مؤید ہیں، ان میں شیخ مصطفی احمد الزرقاء (المدخل الفقہی العام ۱/ ۴۸۲) شیخ سید سابق (فقہ السنۃ) اور ڈاکٹر وہبہ زحیلی (الفقہ اسلامی وادلتہ ۷/ ۶۰) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، شام کے موجودہ عائلی قوانین میں بھی اسی پر عمل ہے اور یاد آتا ہے کہ ۱۹۷۵ء میں مصر کی پارلیمنٹ نے بھی علماء ازہر کی تائید سے اسی قسم کا قانون بنایا تھا جو اس وقت ہندوستان میں اخبارات کا موضوع بن گیا تھا۔

واقعہ ہے کہ شرائط ومعاہدات کے معاملہ میں اسلام کے عمومی مزاج ومذاق، خصوصیت سے نکاح کے بارے میں طے شدہ شرائط کی ایفاء وپابندی کی ہدایت، پھر حضرت عمر کا بحیثیت خلیفہ فیصلہ اور بہ ظاہر اس پر صحابہ کا سکوت، نیز اسی قسم کا قاضی شریح کا فیصلہ اور متعدد صحابہ سے اس رائے سے اتفاق وہ امور ہیں جن سے حنابلہ کا مسلک نسبۃً زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے، حدیث میں نکاح کے وقت متعینہ شرطوں کو وفا کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے، جمہور کا خیال ہے کہ اس سے کوئی اضافی شرط مراد نہیں ہے، بلکہ نکاح کی بناء پر عائد ہونے والے فرائض وواجبات کی تاکید مقصود ہے، لیکن حدیث کے الفاظ میں بہ ظاہر اس پر کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ کتب حدیث میں اس کا کوئی ایسا پس منظر ہی منقول ہے جس کی وجہ سے اس کی یہ مراد متعین کی جاسکے، چنانچہ ائمہ ثلاثہ کے مقلدین میں سے بھی جن لوگوں نے معروضی انداز پر اس حدیث میں غور کیا ہے، انھوں نے حنابلہ کے نقطۂ نظر کو حدیث سے زیادہ قریب محسوس کیا ہے، ابن رشد کی صراحت اوپر مذکور ہو چکی ہے، شوافع میں ابن دقیق العید کا جو پایہ علمی ہے، اس سے حدیث وفقہ کے کوچہ کا کون رہ گزر ناواقف ہوگا، انھوں نے جمہور کی طرف سے حدیث کی اس تشریح پر بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے، حافظ ابن حجر کہتے ہیں:

''جو شرطیں خود ہی مقتضیات عقد میں سے ہیں، انہیں کو اس حدیث کا مصداق قرار دینے پر ابن دقیق العید کو اشکال ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب ان امور کے واجب قرار دئے جانے میں ان شرطوں کو لگانا موثر نہیں ہے تو پھر ان شرطوں کے لگانے پر حکم کو مشروط ومعلق کرنے کی کوئی حاجت نہیں حدیث کا سیاق بھی اس سے مختلف بات کا متقاضی ہے، کیونکہ ''احق الشروط'' کی تعبیر ظاہر کرتی ہے کہ بعض شرطیں قابل ایفاء ہیں اور بعض زیادہ قابل ایفاء ہیں اور جو شرطیں واجبات عقد میں سے ہیں وہ لازم الایفاء ہونے میں برابر ہیں'' (فتح الباری ۹/ ۲۱۸)۔

"کل شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل" (کتاب اللہ میں جو شرط نہ ہو وہ باطل ہے) کس قسم کی شرطیں مراد ہیں؟ ان کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے جس کے پس منظر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت بریرہ نامی ایک باندی حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، ان کے مالکان نے ان کو مکاتب بنادیا تھا، (مکاتب سے مراد ایسا غلام یا باندی ہے جس سے مالک نے کہہ دیا ہو کہ تم اتنی رقم ادا کردو تو تم آزاد ہو جاؤ گے، آزاد شدہ غلام اور باندی پر آزاد کرنے والوں کو حق ولاء حاصل ہوتا ہے، اس کی وجہ سے بعض صورتوں میں ایک دوسرے سے حق میراث حاصل ہوتا)، انھوں نے ام المومنین سے درخواست کی کہ بدل کتابت کی ادائے گی میں ان کی مدد کی جائے، ام المومنین نے فرمایا کہ اس کے بجائے میں چاہوں گی کہ تم کو تمہارے مالکان سے خریدلوں اور خود آزاد کرلوں، اس طرح تمہارا ولاء مجھے حاصل ہو، مالکان نے کہا کہ ہم فروخت تو کردیں اور ام المومنین آزاد کرلیں، مگر حق ولاء ہمارے لئے محفوظ رہے گا، ظاہر ہے ان کی یہ بات شریعت کی روح کے خلاف تھی، شریعت میں "نسب" کی طرح "ولاء" کو بھی ایک فطری علاقہ اور ناقابل تبدیل حق قرار دیا گیا ہے، جیسے زید کا بیٹا معاہدہ کے ذریعہ سے عمرو کا بیٹا نہیں بن سکتا، اسی طرح جس کو زید نے آزاد کیا، وہ کسی معاہدہ اور شرط کی بناء پر عمرو کا مولی نہیں ہوسکتا۔

ان کے اس نامعقول مطالبہ اور شرط پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برہمی ظاہر فرمائی اور ارشاد ہوا:

"مابال أقوام يشترطون شروطا ليس في كتاب الله، من اشترط شرطا ليس في كتاب الله فليس له. وإن اشترط مأة مرة" (بخاری ۱-۶۵ باب ذکر البیع والشراء علی المنبر فی المسجد)

(کچھ لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں، جو شخص ایسی شرط لگائے کہ وہ کتاب اللہ میں موجود نہ ہو اس کا کوئی اعتبار نہیں، گو ایک سو شرطیں لگادے)۔

اس واقعاتی پس منظر سے صاف ظاہر ہے کہ "لیس فی کتاب اللہ" سے ایسی شرط مراد ہے جو شرعا اس معاملہ کی روح و مقصد اور بنیادی مزاج ہی کے مغائر ہو، جیسے نکاح میں زن وشو میں سے کسی ایک سے جنسی تعلقات میں تعاون سے انکار کی شرط، شوہر کی جانب سے نفقہ نہ دینے کی شرط، مہر کے انکار کی شرط، یہ سب نکاح کے اساسی واجبات میں سے ہیں، ایک نکاح کے بعد دوسرا نکاح یا عورت کی جائے سکونت کا مسئلہ نکاح کے لوازم میں سے نہیں ہے۔

اس قسم کی شرطوں کو "تحریم حلال" سے بھی تعبیر کرنا دشوار ہے، حلال سے بھی ایسے ہی مباحات مراد ہیں جو عقد کے لوازم میں سے ہوں، جیسے: وطی کا حق شوہر یا بیوی کو مباح ہی ہے۔ فریق دوم کے مطالبہ کے بغیر واجب نہیں، یہی حال عورت کے حق نفقہ کا ہے، رہ گئے وہ حقوق جو معاملہ کے لوازم میں نہ ہوں اور مباحات کے قبیل سے ہوں، ان میں کسی فریق کا بذریعہ معاہدہ اپنے حق سے دستبردار ہو جانا تحریم حلال نہیں، غور کیجئے کہ طلاق اصولی طور پر مرد کا حق ہے، اور وہ تنہا اس کے استعمال کرنے کا حق دار ہے، بیوی اپنے طور پر علاحدگی کا فیصلہ نہیں کرسکتی، لیکن فقہاء نے "تفویض طلاق" کی صورت میں اس کی گنجائش رکھی ہے کہ وہ اپنے اختیار کا حصہ گویا بیوی کو منتقل کردے۔

"تحریم حلال" کے اس مفہوم کو اس پس منظر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے نکاح میں اس طرح شرطوں کو معتبر اور واجب الایفاء قرار دیا ہے اور یہی حضرت عمر ہیں جنھوں نے اسلام کے قانون عدل کی بابت حضرت ابوموسی اشعری کے نام اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا ہے:

"الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا أحل حراما أو حرم حلالا" (ابوداؤد عن ابی ہریرۃ والترمذی وابن ماجۃ عن عمرو بن عوف۔ نصب الرایۃ ۴-۱۱۲ کتاب الصلح)

(مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے سوائے ایسی صلح کے جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کرنے کا باعث بنے)۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ اس بات سے بے خبر تھے اور نہ غافل، کہ تحلیل حرام اور تحریم حلال پر مبنی صلح و معاہدہ جائز نہیں، لیکن وہ اس طرح کی شرائط کو تحریم حلال کا مصداق ہی نہ جانتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی شرطوں کا مقصد معاملہ کے کمزور فریق کا اپنے لئے تحفظ حاصل کر لینا ہوتا ہے، خرید وفرخت کے معاملہ میں رہن اور کفالت کی گنجائش رکھی گئی ہے، یہ قول ابن قدامہ کے یہ بھی اسی قسم کی شرطوں میں ہے (المغنی ۷ر۷۱)، معاملات دراصل معاہدات پر مبنی ہیں اور جو معاہدہ ہو اس پر فریقین کا عمل کرنا واجب ہے، سوائے اس کے کہ اس سے شریعت کے کسی صریح حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہو، شریعت کے مزاج ومذاق کے رمز شناس خاص شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

"الأصل في العقود رضى المتعاقدين ونتيجتها هو ما أوجباه على أنفسهما بالتعاقد" (فتاویٰ ابن تیمیہ ۲۲۹/۳) (معاملات میں اصل فریقین کی رضامندی ہے اور اس کا ثمرہ ونتیجہ اس چیز کا واجب ہونا ہے جو معاملہ کے ذریعہ دونوں نے اپنے اوپر واجب کیا ہے)۔

یہ تو اس مسئلہ سے متعلق ایک فقہی اور استدلالی بحث تھی اور اس چیز پر بہت کچھ بحث ونظر کی گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن اصل قابل فکر بات یہ ہے کہ ہندوستان میں جہالت وناخواندگی، احکام شریعت سے ناآگہی، ہمارے سماج کی اسلامی مزاج ومذاق سے محرومی اور دوسری ہم وطن اقوام کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کی بعض سماجی اقدار سے تاثر ایسی حقیقتیں ہیں، جن کا اعتراف نہ کرنا ریت میں منہ چھپانے کے مترادف ہوگا، حالانکہ مسلمانوں میں تعدد ازدواج کا رواج ہندوستان میں خود ہندوؤں سے بھی کم ہے، اسی طرح طلاق کا استعمال بھی۔ باوجود بہت سے سماجی مناسد کے غالباً اب بھی مسلم سماج میں بہت نہیں، لیکن اس طرح کے جتنے کچھ واقعات سامنے آتے ہیں اگر ان کا سروے کیا جائے تو شاید اس کا نتیجہ یہی نکلے کہ ۸۰ فیصد طلاق کے واقعات بے جا ہوتے ہیں اور اسی تناسب سے دوسرا نکاح کسی سنجیدہ ومتین فیصلہ کے تحت نہیں، بلکہ وقتی ردعمل کے تحت کیا جاتا ہے، اور دوسرے نکاح کے لئے سہارا تو شریعت کا لیا جاتا ہے لیکن اس کے بعد اسلام کے اصول عدل کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا، اس سے ہمارے سماجی ڈھانچہ کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ تو اپنی جگہ، دوسرے اقوام کے درمیان جو جگ ہنسائی ہوتی ہے اور شریعت مطہرہ پر جو چوٹیں کسی جاتی ہیں، ان کا باعث بھی بالواسطہ ہم ہی بنتے ہیں۔

ان اوقات میں دل چاہتا ہے کہ ایسے خدانا ترسوں اور عاقبت نااندیشوں کے لئے ہم درہ فاروقی کا نظم نہیں کر سکتے تو کم سے کم ممکن حد تک کوئی ایسی قید وبند شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے لگائیں کہ اس قسم کی مظلوم عورتوں کے لئے کوئی راہ نجات نکل آئے، اور ایک حد تک ہم اس مسئلہ میں امام احمد بن حنبل کے نقطۂ نظر سے فائدہ اٹھا کر اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں، فقہ حنبلی میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر عورت نکاح کے وقت یہ شرط لگادے کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا، پھر بھی وہ دوسرا عقد کرلے تو وہ اپنا نکاح فسخ کرا سکتی ہے (المغنی ۷ر۷۱)۔

ازراہ احتیاط اس میں شرط کو مزید مقید کیا جاسکتا ہے، مثلاً یہ کہ جب تک دار القضاء طبی اور معاشی اعتبار سے اس شخص کو دوسرے نکاح کے حقوق ادا کرنے کے لائق اور دوسرے نکاح کا واقعی ضرورت مند تصور نہ کرے، اس وقت تک وہ دوسرا نکاح نہیں کر سکے گا وغیرہ، حالانکہ راقم الحروف کا خیال ہے کہ تقلید ایک ضرورت ہے اور فی زمانہ ہوس اور نفسیات کو لگام دینے کے لئے تقلید شخصی "سفینۂ نجات" کا درجہ رکھتی ہے، لیکن ایسے حساس مسائل میں فقہ کی مکتبی پابندیوں سے کسی قدر پرے اٹھ کر احکام شریعت کے وسیع تر تناظر میں غور وفکر کی ضرورت ہے، تاکہ ہم اس ملک میں قانون شریعت کا تحفظ کر سکیں۔

☆☆☆

# تفویض طلاق کا مسئلہ

۲۔ عورت کو حق طلاق سپرد کرنا فقہ کی اصطلاح میں ''تفویض طلاق'' کہلاتا ہے، شرعاً اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ شوہر کسی اور شخص سے کہے کہ وہ اس کی بیوی کو طلاق دیدے، لیکن فرق یہ ہے کہ پہلی صورت ''تملیک طلاق'' کی ہے اور دوسری صورت ''توکیل طلاق'' کی، پہلی صورت میں شوہر رجوع نہیں کرسکتا ہے اور دوسری صورت میں رجوع کرسکتا ہے، شوہر دیا ہوا حق واپس نہیں لے سکتا، اس بارے میں علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

''إنه لازم من جانب الزوج حتى لايملك الرجوع عنه ولا نهي المرأة عما جعل إليها ولا فسخ ذلك لأنه ملكها الطلاق ومن ملك غيره شيئا زالت ولايته من الملك ولا يملك إبطاله بالرجوع والنهي والفسخ (بدائع الصنائع ۳-۱۱۳)

## دوسری صورت

دوسری صورت کہ ایجاب وقبول ہی میں تفویض طلاق کردیا جائے درست ہے، البتہ ضروری ہے کہ ایجاب عورت کی طرف سے ہو اور تفویض طلاق سے مشروط ہو اور مرد اس کو قبول کرلے، اگر مرد کی طرف سے ایجاب ہو اور وہ ایجاب کے ساتھ تفویض طلاق کرے اور عورت قبول کرے، تو اس کا اعتبار نہیں، ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ہے:

''اسی پر یہ مسئلہ ہے کہ اگر عورت سے اس شرط پر نکاح کرے کہ اس پر طلاق واقع ہوجائے یا اس شرط پر کہ اسے طلاق کا اختیار حاصل ہو جب بھی چاہے اپنے اوپر طلاق واقع کرلے، تو طلاق واقع نہیں ہوگی اور اختیار عورت کو حاصل نہ ہوگا، ہاں اگر ابتداء عورت کی طرف سے ہوئی اور اس نے کہا کہ میں نے اس شرط پر نکاح کیا کہ مجھ پر طلاق واقع ہوجائے یا یہ کہ مجھے اختیار حاصل ہو، جب چاہوں اپنے آپ پر طلاق واقع کرلوں اور شوہر کہے کہ میں نے قبول کیا تو طلاق واقع ہوجائے گی اور اختیار بیوی کو حاصل ہوجائے گا'' (خلاصۃ الفتاوی ۲/۲۹)۔

''خلاصہ'' ہی کے حوالہ سے اس کو ابن نجیم نے (البحر الرائق ۳/۳۱۸) اور ابن نجیم کے حوالہ سے علامہ شامی نے بھی اس کو نقل کیا ہے (رد المحتار ۲/۴۸۵) ''فتاویٰ بزازیہ'' میں بھی تفویض طلاق کی اسی صورت کو کسی قدر قیود وحدود کی پابندی کے ساتھ اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

''عورت کو اندیشہ ہو کہ نکاح ہوگیا تو نکاح کے بعد شوہر اس کو طلاق نہیں سونپے گا تو اسے یوں کہنا چاہئے: میں نے تم سے اتنے مہر کے عوض اس شرط پر نکاح کیا کہ اختیار طلاق مجھے حاصل ہوگا، جب بھی تم مجھ کو بے قصور مارو یا میری موجودگی میں دوسرا نکاح کرلو یا باندی لاؤ یا مجھ سے ایک سال تک غائب رہو، ایسی صورت میں جب میں چاہوں گی اپنے اوپر طلاق بائن واقع کرلوں گی'' (فتاوی بزازیہ ۴/۲۳۴)۔

''یہ شوہر کی جانب سے لازم ہے، چنانچہ وہ اس سے رجوع کرنے کا حق نہیں رکھتا اور نہ عورت کو دئے گئے حق سے باز رکھنے یا اس کو ختم کرنے کا اختیار ہی رکھتا ہے، کیونکہ اس نے عورت کو طلاق کا مالک بنادیا ہے اور جو کسی چیز کا دوسرے کو مالک بنادے اب اس مملوکہ شئی سے اس کا حق تصرف ختم ہوچکا ہے، لہٰذا وہ رجوع کرکے منع کرکے اور فسخ کرکے اس حق کو باطل کرنے کا اختیار نہیں رکھتا''۔

## بیوی کو تفویض طلاق

تفویض طلاق کی پہلی صورت کہ نکاح سے پہلے ہی تفویض پر معاہدہ طے ہوجائے اور کابین نامہ بر فریقین کے دستخط ہوجائیں، بھی درست ہے، ایسی صورت میں ضروری ہے کہ تفویض میں نکاح کرنے کی شرط ذکر کردی جائے، مثلاً یوں کہے: ''اگر میں نے تم سے نکاح کیا اور فلاں فلاں بات میری طرف سے پائی گئیں تو تم کو اپنے آپ پر ایک طلاق بائن واقع کرنے کا حق حاصل ہوگا'' چنانچہ ہدایہ میں ہے:

''ولا تصح إضافة الطلاق إلا أن يكون الحالف مالكا أو يضيف إلى ملكه لأن الجزاء لابد أن

يكون ظاهرا ليكون مخيفا فيتحقق معنى اليمين وهو القوة والظهور بأحدى هذين والإضافة إلى سبب الملك منزلة الإضافة إليه لأنه ظاهر عند سببه'' (ہدایہ ۲/۳۸۵)

(طلاق کی نسبت عورت کی طرف درست نہیں، سوائے اس کے کہ مشروط طلاق دینے والا اس پر ملکیت نکاح رکھتا ہو یا ملکیت نکاح ہی کی طرف نسبت کرے، اس لئے کہ جزا کا ظاہر ہونا ضروری ہے تا کہ یہ چیزیں عورت کے لئے باعث خوف ہوسکیں اور یمین کا معنی متحقق ہو سکے جو قوت وظہور ہے، اور یہ انہیں دو میں سے ایک طریقہ سے ہوسکتا ہے، کیونکہ سبب ملکیت کی طرف نسبت خود ملکیت کی طرف نسبت کرنے کے درجہ میں ہے، اس لئے کہ سبب کے پائے جانے کے وقت خود اس کا پایا جانا ظاہر ہے)۔

پس جیسے مشروط طلاق کے لئے نکاح کی طرف نسبت ضروری ہے، ورنہ کلام غیر مؤثر ہوگا، اسی طرح تفویض طلاق کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ نکاح کے ساتھ مشروط ہو، قبل نکاح، نکاح پر مشروط تفویض طلاق کا بعد از نکاح مؤثر ہونا علامہ عبدالرشید طاہر بخاری کی اس عبارت سے بھی اخذ کیا جاسکتا ہے:

''ولو قال الزوج تزوجتك على أنك طالق بعد التزوج أوعلى أن أمرك بيدك بعد التزوج فقبلت المرأة صار الأمر بيدها'' (خلاصۃ الفتاوی ۲-۲۹)

(اگر شوہر نے کہا: میں نے تجھ سے اس شرط پر نکاح کیا کہ شادی کے بعد تم پر طلاق واقع ہوجائے، یا یہ کہ نکاح کے بعد اختیار تمہارے ہاتھ میں ہوگا اور عورت قبول کرلے تو عورت کو اختیار حاصل ہوجائے گا)۔

## تیسری صورت

تیسری صورت، کہ نکاح کے بعد طرفین تفویض طلاق کے معاہدہ نامہ پر دستخط کردیں جائز ہے، چاہے اس معاہدہ میں شوہر کی طرف سے پہل ہو یا بیوی کی طرف سے، دونوں ہی صورتیں درست ہیں، یوں تو نکاح کے وقت ہی تفویض طلاق کے موضوع پر گفتگو سماج کے موجودہ مزاج کے تحت گراں محسوس ہوگی، لیکن اگر اس طرح نکاح نامے طبع کرالئے جائیں اور مطبوعہ فارم پر کرکے ہی عقد کا رواج ہوجائے، جیسا کہ دکن کے علاقوں میں مروج ہے اور اس فارم میں پہلے سے اس طرح تحریر موجود ہو تو لوگ بتدریج اس کے عادی ہوجائیں گے، اور اس طرح نکاح کا ریکارڈ بھی محفوظ رہے گا، جس کی وجہ سے ثبوت نکاح، ثبوت نسب اور مقدار مہر وغیرہ کی بابت کم سے کم نزاع پیدا ہوگی۔

تفویض طلاق کی ان دونوں صورتوں میں شرائط نامہ کی تحریر میں ایسے الفاظ کا استعمال کرنا ہوگا جو تفویض میں عموم کو بتاتا ہو، مثلاً یہ کہ ''میں اپنی زوجہ فلاں بنت فلاں کو اختیار دیتا ہوں کہ متذکرہ بالا شرائط میں سے کسی کی عدم تکمیل جب بھی دار القضاء میں ثابت ہوجائے تو وہ اپنے آپ پر طلاق بائن واقع کرلے''، یہ ''جب بھی'' کا لفظ عربی زبان کے ''متی ما'' کا ہم معنیٰ ہے اور ایسے الفاظ شرط کے ساتھ تفویض طلاق میں عورت حین نکاح اپنے حق کو استعمال کرنے کی مجاز ہوتی ہے۔ کاسانی کے الفاظ میں:

''فإن أطلق الوقت بأن قال: أمرك بيدك إذا شئت أو متى شئت أو حيثما شئت فلها الخيار في المجلس وغير المجلس ولا يتقيد بالمجلس حتى لو ردت الأمر لم يكن رد'' (بدائع الصنائع ۳-۱۱۵)

(اگر وقت کو مطلق رکھا اور یوں کہا: تم جب چاہو یا جہاں چاہو تمہارا معاملہ تمہارے اختیار میں ہوگا، تو اس مجلس میں بھی اختیار حاصل رہے گا اور اس کے بعد بھی مجلس کے ساتھ اس کا اختیار مقید نہیں رہے گا، یہاں تک کہ اگر وہ خود اختیار کو رد بھی کردے تو رد نہیں ہوگا)۔

تفویض طلاق میں طلاق بائن کی صراحت بھی ضروری ہے، تین طلاقوں کا ذکر ہرگز مناسب نہیں کہ خلاف سنت اور معصیت ہے، مطلق طلاق کافی نہیں کہ اس سے طلاق رجعی واقع ہوگی اور مرد کو یک طرفہ رجوع کا حق باقی رہے گا، تو یہ ایک ہاتھ سے عورت کو پروانہ خلاصی دینے اور دوسرے ہاتھ سے واپس لے لینے کے مترادف ہوگا۔

چونکہ طلاق ایک نازک مسئلہ ہے اور عورتوں کے لئے اس کا بے قید اختیار دینا کسی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتا، مردوں ہی کی طرف سے طلاق کے بے جا استعمال نے جب یہ کچھ ستم ڈھایا ہوا ہے تو عورتوں کو اس کی بے قید اجازت کیا کچھ مفاسد پیدا نہیں کرے گی؟ اس لئے ضروری محسوس ہوتا کہ تفویض طلاق م

کی طرف سے ظلم وزیادتی اور دارالقضاء یا کچھ صالحین کی طرف سے حق مفوضہ کے استعمال کی اجازت سے مشروط کردیا جائے۔

اگر متعدد اشخاص کی اجازت اور رضامندی سے طلاق کو مشروط کردیا جائے تو ان کی رضامندی اور عورت کے پیش کئے ہوئے عذر کی معقولیت سے اتفاق کر لینے کے بعد ہی وہ اپنے آپ پر طلاق واقع کرسکتی ہے، چنانچہ ''فتاویٰ قاضی خاں'' میں ہے:

''رجل جعل أمر امرأته بيد رجلين لا ينفرد أحدهما بالطلاق (الخانية ۱۔۶۲۳)

(کوئی شخص اپنی بیوی کے معاملہ کو دو اشخاص کے اختیار میں کردے تو دونوں میں سے ایک کو تنہا طلاق واقع کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا)۔

## دارالقضاء کو تفویض:

خیال ہوتا ہے کہ تفویض طلاق کی ایسی صورت اختیار کرنی بہتر ہے جس میں حق طلاق دارالقضاء یا محکمۂ شرعیہ کو دیا گیا ہو، بیوی کے علاوہ دوسروں کو طلاق کا اختیار دینا بنیادی طور پر تو ''توکیل'' ہے اور وکالت کبھی بھی واپس لی جاسکتی ہے، لیکن اگر کسی تیسرے شخص کی چاہت ومشیئت پر طلاق کے استعمال کو موقوف کردیا جائے تو یہ ''توکیل'' کی بجائے ''تفویض'' ہے (الخانیۃ ۱ر ۵۲۴)، اب شوہر اس اختیار کو واپس نہیں لے سکتا، ''فتاویٰ بزازیہ'' میں ہے:

''لو قال لأجنبي: طلاقها بيدك أو طلقها إن شئت كقوله أمرها بيدك يقتصر ولا يملك الرجعة'' (بدائع الصنائع ۳۔۲۲۴)

(اگر اجنبی شخص سے کہا کہ عورت کا حق طلاق تمہارے ہاتھ میں ہے، یا یہ کہے کہ اگر ''تم چاہو تو طلاق دے دو'' تو یہ ''تمہارا معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے'' کہنے کی طرح ہے کہ اس میں اختیار مجلس میں محدود رہے گا اور شوہر کو اس سے رجوع کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا)۔

اور ''سراجیہ'' میں ہے: "لو قال لأجنبي: "طلقها إن شئت ثم عزله لا يصح" (السراجیۃ ر ۴۴) (اجنبی شخص سے اپنی بیوی کی بابت کہے کہ اگر چاہو تو اسے طلاق دے دو، پھر اس کو اختیار سے معزول کردے تو درست نہیں)۔

''فتاویٰ بزازیہ'' میں اختیار طلاق کو اسی مجلس تک محدود مانا گیا ہے کہ شرط کے لئے جو الفاظ استعمال کیا گیا ہے وہ عموم کو نہیں بتاتا ہے، اگر ''اگر تو چاہے'' کی بجائے ''جب بھی چاہے'' کہا جائے تو پھر بعد از مجلس بھی اختیار باقی رہے گا۔

پس اگر کچھ شرطوں کے ساتھ دارالقضاء کو حق طلاق تفویض کیا جائے اور یہ وسعت برتی جائے کہ عورت قاضی شریعت کے پاس ثبوت شرعی کے ذریعہ ان شرائط میں کوتاہی ثابت کردے، یا دوسرے قرائن کی بنا پر قاضی کو عورت کے بیان کی صداقت پر اطمینان ہوجائے تو وہ عورت کو طلاق بائن دے سکتا ہے۔ تو شاید یہ زیادہ بہتر صورت ہو۔

## ۳، ۴۔ دو حالتوں کے ساتھ مشروط مہر کی مقدار:

طلاق اور نکاح ثانی کی صورت میں مہر کی مقدار میں اضافہ کا مسئلہ ایک ہی نوعیت کا ہے کہ دونوں حالتوں کے ساتھ مشروط مہر کی دو مقدار متعین کی جائے اور اس شرط میں عورت کا فائدہ ہو تو کیا حکم ہوگا؟ شرطیں معتبر ہوں گی یا نہیں؟..... فقہاء کی رائیں اس سلسلہ میں مختلف ہیں: مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک ایسی صورت میں مہر مثل واجب ہوگا۔

''وإن تزوجها على ألف إن لم يخرجها من بلدها وعلى ألفين إن أخرجها فالمهر فاسد ويجب لها مهر مثلها (شرح المهذب ۱۶۔۲۳۷)

(اگر ایک ہزار مہر پر نکاح کیا بشرطیکہ شہر سے باہر نہ لے جائے، اور دو ہزار مہر پر بشرطیکہ شہر سے باہر لے جائے تو مہر فاسد ہے اور مہر مثل واجب ہوگا)۔

امام احمد بن حنبل سے منقول ہے کہ دونوں تعیین معتبر ہوں گی، ابن قدامہ کا بیان ہے:

''اگر کہے: ایک ہزار پر تجھ سے نکاح کیا بشرطیکہ تجھ کو تمہارے میکہ سے باہر نہ لے جاؤں یا اس شرط پر کہ میری دوسری بیوی موجود نہ ہو اور دو ہزار مہر پر اگر تم کو میکہ سے باہر لے جاؤں یا یہ کہ میری کوئی اور بیوی ہو، ان دونوں صورتوں کی بابت امام احمد کی صراحت موجود ہے کہ تعیین مہر اس طرح درست ہے)۔

آگے ابن قدامہ نے اس سلسلہ میں حنابلہ سے ایک اور روایت بھی نقل کی ہے مگر ترجیح اسی کو دیا ہے۔

## امام ابوحنیفہ اور صاحبین کا نقطۂ نظر:

جہاں تک حنفیہ کی رائے ہے تو اس سلسلہ میں امام صاحب اور صاحبین کا وہی اختلاف ہے جو سوالنامہ میں مذکور ہے، فقہاء نے اس ذیل میں کئی مسائل نقل کئے ہیں جو باہم مماثل اور متقارب ہیں، لیکن ان کے احکام میں فرق کیا گیا ہے، یہاں ان کا تذکرہ مناسب ہوگا۔

ایک شخص نے نکاح کے وقت کہا کہ اگر منکوحہ خوبصورت ہو تو مہر دو ہزار اور بدصورت ہو تو ایک ہزار، تو فتویٰ اس پر ہے کہ دونوں شرطیں معتبر ہوں گی۔

ایک شخص نے نکاح کے وقت کہا کہ اگر منکوحہ خاندانی طور پر آزاد رہی ہو تو مہر دو ہزار اور خاندانی طور پر غلام تھی گو اب آزاد ہے تو مہر ایک ہزار، تو اس صورت میں بھی فتویٰ اسی پر ہے کہ دونوں شرطیں معتبر ہیں۔

ان دونوں صورتوں کی بابت ابن سماعہ نے امام محمد سے وہی اختلاف نقل کیا جو ذیل کی صورت میں ہے، لیکن محققین نے ابن سماعہ کی نقل کو قبول نہیں کیا ہے اور ان کو امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے درمیان متفق علیہ مانا ہے۔

انھیں دو صورتوں کا حکم اس وقت بھی ہے جب نکاح کے وقت اس طرح مہر مقرر کیا جائے کہ اگر ناکح کی کوئی اور بیوی بھی موجود ہو تو دو ہزار، کوئی اور بیوی نہ ہو تو ایک ہزار۔ اب بھی دونوں شرطیں معتبر ہیں۔

ایک شخص نے نکاح کے وقت کہا کہ اگر میں تمہاری موجودگی میں دوسرا نکاح کروں، یا کہا کہ تمہیں تمہارے شہر سے باہر لے جاؤں تو مہر دو ہزار ورنہ ایک ہزار ہوگا، اس صورت میں امام ابوحنیفہ کے ہاں مہر مقررہ ایک ہزار ہوگا، اگر اس نے دوسرا نکاح نہ کیا تو ایک ہزار مہر ہوگا۔ دوسرا نکاح کرلیا تو دو ہزار اور مہر مثل میں سے جو کم ہو وہ واجب ہوگا، صاحبین کے نزدیک دونوں شرطیں معتبر ہوں گی۔

اوپر جو متفق علیہ صورتیں مذکور ہوئی ہیں، ان کی بابت نقول مختلف ہیں، تاہم راجح و مختار قول وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا (البحر الرائق ۳/۱۶۲، الدر المختار ورد المحتار ۲/۳۴۶، فتاویٰ ہندیہ ۱/۳۰۸، ۳۰۹، خلاصۃ الفتاویٰ ۲/۳۷)۔

ان دونوں صورتوں میں فرق کی جو وجہ بتائی گئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خوبصورت اور بدصورت ہونا ایک قابل مشاہدہ بات ہے، نکاح کے وقت کسی اور بیوی کی موجودگی و عدم موجودگی یا اس کا خاندانی طور پر آزاد ہونا یا غلام ہونا ان امور میں سے ہے جو پہلے سے واقع شدہ ہے اور آئندہ مرد کا دوسرا نکاح کرنا یا نہیں کرنا اور اس کو شہر سے باہر لے جانا یا نہیں لے جانا، مستقبل سے متعلق ہے، پس پہلی صورتوں میں ''خطر'' یا تو موجود نہیں ہے یا خفیف ہے اور دوسری صورت میں ''خطر'' قوی ہے، دوسرے یہ کہ پہلی صورتوں میں نزاع کا اندیشہ نہیں ہے یا کم ہے، جب کہ اس دوسری صورت میں آئندہ نزاع پیدا ہونے کا اندیشہ قوی ہے (البحر الرائق ۳/۱۶۳ ورد المحتار ۲/۳۴۶)۔

دراصل امام صاحب کا خیال ہے کہ ایک ہزار مہر متعین ہے اور چونکہ مشروط واقعہ کا پیش آنا یقینی نہیں ہے، اس لئے دو ہزار مہر مجہول ہے، صاحبین کا خیال ہے کہ شرط اور اس شرط سے ہم رشتہ مقدار مہر دونوں معروف و متعین اور واضح و غیر مبہم ہے، اس لئے نہ جہالت ہے اور نہ مستقبل میں نزاع کا اندیشہ ہے، واقعہ ہے کہ عملاً اس طرح کے معاملات میں نزاع پیدا نہیں ہوتا، اصول افتاء میں دونوں طرح کی رائیں موجود ہیں، یہ بھی کہ امام صاحب کے قول کو بہر حال صاحبین کے قول پر ترجیح دی جائے گی، اور یہ بھی کہ مفتی کو دونوں میں سے کسی بھی قول کے اختیار کرنے کی گنجائش ہے، ''فتاویٰ سراجیہ'' میں ہے:

''ثم الفتویٰ علی الإطلاق علی قول أبی حنیفة ثم بقول صاحبیه ثم بقول أبی یوسف ثم بقول محمد بن الحسن ثم بقول زفر بن الهذیل ثم بقول حسن بن زیاد، وقیل: إذا کان أبو حنیفة بجانب وصاحبا فی جانبه فالمفتی بالخیار والأول أصح'' (السراجیة ۱۵۷)

(فتویٰ مطلقاً امام ابوحنیفہ، پھر صاحبین، اس کے بعد امام ابویوسف، پھر امام محمد، پھر بالترتیب امام زفر اور حسن بن زیاد کے قول پر ہوگا، بعض حضرات کا خیال ہے کہ اگر ایک طرف امام ابوحنیفہ اور دوسری طرف صاحبین ہوں تو مفتی کو اختیار ہوگا، پہلا قول زیادہ درست ہے)۔

گو علامہ سراج الدین اودی نے امام صاحب کے قول کے مقابلہ صاحبین کے قول پر فتویٰ کے غیر درست ہونے کو ترجیح دی ہے، لیکن عملاً ایسے سیکڑوں

مسائل ہیں جن میں صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا گیا ہے، اس لئے حاوی قدسی وغیرہ کی بات زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے کہ قوت دلیل کی بناء پر صاحبین کے قول کو بھی ترجیح دی جاسکتی ہے، جب قضاء وشہادت کے ابواب میں امام ابو یوسف، ذوی الارحام کے مسائل میں امام محمد اور ۱۷ مسائل میں تنہا امام زفر کا قول افتاء کے لئے راجح شمار کیا گیا ہے (رد المحتار ۱؍۹۴) تو صاحبین کے قول پر افتاء کا ممنوع ہونا نا قابل فہم ہے، حالانکہ یہ بھی معلوم ہے کہ اہل تحقیق کا خیال ہے کہ عام طور پر صاحبین کی رائے بھی امام صاحب ہی کے کسی قول پر مبنی ہوتی ہے۔

دوسرے: مشائخ نے ان دونوں اقوال کو نقل کر کے یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ کونسا قول صحیح وراجح اور مفتیٰ بہ ہے؟ اور ایسے احکام میں ترجیح کا اصول کیا ہے؟ اس بابت علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

''فإن قلت قد يحكون أقوالا بلا ترجيح وقد يختلفون في الصحيح. قلت يعمل بمثل ما عملوا من اعتبار تغير العرف وأحوال الناس وما هو الأرفق وما ظهر عليه التعامل وما قوي وجهه (الدر المختار على هامش الرد ۱؍۵۲)

(اگر تم کہو کہ مشائخ بلا ترجیح مختلف اقوال نقل کرتے ہیں اور قول صحیح کی بابت بھی اختلاف رائے رکھتے ہیں، میں کہوں گا کہ مشائخ کے طریقہ کے مطابق عمل کیا جائے، یعنی عرف، لوگوں کے حالات، ان کے لئے آسان تر، لوگوں کے تعامل کے مطابق اور دلیل کے اعتبار سے قوی قول پر عمل کیا جائے)۔

تیسرے: مواقع ضرورت میں قول ضعیف پر بھی فتویٰ کی گنجائش ہے، علامہ شامی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ ''قول ضعیف پر فتویٰ کی گنجائش نہیں'' لکھتے ہیں:

''قلت: لكن هذا في غير موضع الضرورة فقد ذكر في حيض البحر في بحث ألوان الدما أقوالا ضعيفة ثم قال وفي المعراج عن فخر الأئمة لو أفتى مفتي بشئي من هذه الأقوال في مواضع الضرورة طلبا للتيسير كان حسناً. وكذا قول أبي يوسف في المني إذا خرج بعد فتور الشهوة لا يجب عليه الغسل ضعيف. وأجازوا العمل به للمسافر أو الضعيف الذي خاف الريبة كما سيأتي في محله وذلك من مواضع الضرورة''

(میں کہتا ہوں کہ یہ ایسے مواقع پر ہے جہاں ضرورت درپیش نہ ہو، چنانچہ ''بحر'' کے باب الحیض میں خون حیض کے رنگوں کی بابت چند اقوال صاحب بحر نے نقل کیا ہے، پھر کہا ہے کہ ''معراج'' میں فخر الائمہ سے منقول ہے کہ اگر مفتی مواقع ضرورت میں ان اقوال میں سے کسی پر از راہ سہولت فتویٰ دے تو بہتر ہوگا، اسی طرح کسر شہوت کے بعد منی نکلنے سے امام ابو یوسف کے نزدیک غسل کا واجب نہ ہونا ضعیف قول ہے، لیکن مشائخ نے مسافر اور تہمت سے خائف مہمان کیلئے اس پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے جیسا کہ اپنی جگہ آئے گا، اور یہ مواقع ضرورت میں ہے)۔

ہر چند کہ افتاء کی بابت اس اصول کا اتنی صراحت ووضاحت کے ساتھ غالباً کسی اور نے ذکر نہیں کیا ہے، لیکن عملاً فقہ کی اکثر متداول کتب میں اس کے شواہد موجود ہیں، اب مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ ضرورت جیسے شخصی وانفرادی ہوتی ہے، اسی طرح اجتماعی اور سماجی بھی ہوتی ہے، اس وقت طلاق اور سنجیدہ ومتین فیصلہ کے بجائے محض موجودہ بیوی سے انتقام کے جذبہ کے تحت دوسرے نکاح پر مناسب حد تک روک لگانا ایک سماجی اور معاشرتی ضرورت ہے۔ اس لئے یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ ان مسائل میں حضرات صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا جائے کہ اس سے سماجی اصلاح اور معاشرتی ناانصافی کے سدباب کی توقع کی جاسکتی ہے۔

## ۵۔ عورت کی طرف سے ملازمت کی شرط

خاندانی زندگی کے بارے میں اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ کسب معاش، خاندان کی کفالت اور گھر سے باہر کی ذمہ داریوں کی تکمیل مرد کے ذمہ ہے اور بچوں کی پرورش وتربیت اور امور خانہ داری کی انجام دہی عورتوں کے ذمہ، یہ عورتوں پر اسلام کا بڑا احسان اور اس کی فطرت وطبیعت کی رعایت ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے: ''وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ'' (سورہ احزاب: ۳۳) اس لئے جو ملازمتیں شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ کی جاسکتی ہیں، خواتین کے لئے ضرورت ومجبوری کے بغیر ایسی ملازمتیں بھی مناسب نہیں، پھر بیویوں کا نفقہ شوہر پر واجب اسی لئے رکھا گیا ہے کہ وہ اس کے اور اس کے بال بچوں کی پرورش وتربیت کے لئے محبوس اور گھری ہوئی ہے (ہدایہ ۲؍۴۱۷، باب النفقۃ)، اور اس نے سارا وقت اسی فریضہ مادری کی ادائیگی کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

عورت کا اپنے آپ کو گھر سے باہر کی ایسی مصروفیت سے فارغ رکھنا، جو مرد کے ''حق حبس'' کو متاثر کرتی ہو، واجب ہے، یہاں تک کہ فقہاء نے لکھا ہے:

"وإذا أرادت المرأة أن تخرج إلى مجلس العلم بغير إذن الزوج لم يكن لها ذلك" (الخانية على هامش الهندية ۱۔ ۴۴۳)

(عورت شوہر کی اجازت کے بغیر علمی مجالس میں جانا چاہے تو اس کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں)۔

اور علامہ حصکفی کا بیان ہے:

"شوہر کو حق ہے کہ بیوی کو دھاگے کاتنے اور ایسے ہر کام سے روکے، گو وہ اجنبی شخص کے لئے تبرعاً انجام دے، گو وہ "دایہ" ہو یا غسالہ ہو، کیونکہ شوہر کا حق فرض کفایہ پر مقدم ہے، اسی طرح وہ مجلس علم میں جانے سے بھی روک سکتا ہے، سوائے اس کے وہ کسی ایسے پیش آمدہ مسئلہ کی بابت ہو جس کو شوہر دریافت نہیں کررہا ہو" (الدر المختار علی ہامش الرد ۲ر ۶۶۵)۔

اس لئے عورت کے لئے ملازمت کی شرط مقصد نکاح کے مغائر محسوس ہوتی ہے اور ایسی شرط کو غیر معتبر ہونا چاہئے، اگر مرد نے قبول بھی کرلیا تو بعد میں عورت کو ترک ملازمت کا حکم دے سکتا ہے، البتہ اگر کوئی شخص بے روزگار ہو یا عورت کا نفقہ ادا نہ کرتا ہو اور تعنت کی راہ اختیار کرر کھی ہو، مجبور ہو کر عورت نے کوئی ایسی ملازمت کرلی ہو جو شرعاً جائز ہے تو قاضی تجربات و حالات کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا کہ یا ایک دفعہ عورت کو ملازمت سے روک دیا جائے یا پہلے اندازہ قائم کیا جائے کہ مرد اپنے مطالبہ میں واقعی سنجیدہ ہے یا بیوی کو مزید مشقت میں ڈالنے کی غرض سے ایک حکم شرعی کا سہارا لے کر محض اپنی مقصد براری کرنا چاہتا ہے۔

# خلاصہ جوابات

۱۔ الف۔ ایسی شرطیں جو انہیں حقوق وفرائض کو مؤکد کرتی ہوں جو نکاح کی وجہ سے عائد ہوتی ہیں، معتبر وجائز ہیں۔

ب۔ ایسی شرطیں جو صحت نکاح کی شرطوں میں سے کسی شرط کے ساقط ہونے یا نکاح کے لازمی احکام میں سے کسی حکم میں تغیر وتبدل کو مستلزم ہوں معتبر نہیں، البتہ ایسی شرطوں کے باوجود بھی نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔

ج۔ ایسی شرطیں جن سے عورت کو نفع پہنچتا ہو اور شریعت نے نہ ان کو واجب قرار دیا اور نہ ان سے منع کیا ہو، ان کے معتبر ہونے میں اختلاف ہے، حنفیہ کے یہاں ایسی شرطیں معتبر نہیں ہیں، البتہ حنابلہ کے یہاں معتبر ہیں اور حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، سعد بن ابی وقاص، عمرو بن عاص اور معاویہ بن ابی سفیان (رضی اللہ عنہم) کی بھی یہی رائے ہے، اور موجودہ حالات میں اسی قول پر فتویٰ دیا جانا مناسب ہے۔

۲۔ تفویض طلاق کی تینوں ہی صورتیں جائز ہیں، البتہ:

الف۔ نکاح سے پہلے تفویض میں ضروری ہے کہ تفویض طلاق کی نسبت نکاح کی طرف ہو۔

ب۔ نکاح کے وقت تفویض میں ضروری ہے کہ عورت کی طرف سے پہل ہو۔

ج۔ نکاح کے بعد تفویض میں یہ دونوں شرطیں نہیں ہیں، البتہ ان کا قبول کرنا یا نہیں کرنا، مرد کے اختیار میں ہے۔

تفویض کی بہتر صورت یہ ہے کہ عورت کی بجائے دار القضاء کو حق طلاق تفویض کر دیا جائے۔

۳۔۴۔ دو حالتوں کے ساتھ مہر کی دو مقدار کو مشروط کرنا صاحبین کے نزدیک جائز ہے اور موجودہ حالات میں اسی کے مطابق فتویٰ دیا جانا مناسب ہے۔

۵۔ حق حبس مرد کا ویسا ہی حق ہے جیسے نفقہ عورت کا حق ہے، اس لئے عورت کی طرف سے ملازمت کی شرط معتبر نہیں، ہاں اگر نکاح کے بعد مرد کے نفقہ ادا نہ کرنے کی وجہ سے عورت نے کوئی جائز ملازمت کی، شوہر اس کو ترک کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے اور بیوی کو مستقبل میں شوہر کی جانب سے پھر عدم ادیگی کا اندیشہ ہے تو اب قاضی کی صوابدید پر ہے کہ حالات کا جائزہ لے کر مناسب فیصلہ کرے۔



# مشروط نکاح کے شرائط وضوابط

مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی [1]

عقد نکاح کے ساتھ عائد کردہ شرائط کو سوالنامہ میں تین قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ ایسی شرائط جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی نئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی بلکہ خود عقد نکاح سے جو ذمہ داری کسی فریق پر عائد ہوتی ہو اسی کو شرط کی صورت میں عقد نکاح کے وقت ذکر کردیا گیا ہو، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ ایسی شرطیں قابل بحث نہیں ہیں، عقد نکاح کا لازمی تقاضا ہونے کی وجہ سے ان کی پابندی اور ان پر عمل درآمد ضروری ہے، خواہ عقد کے وقت شرط کی صورت میں ان کا ذکر کیا جائے یا نہیں، ان شرطوں کے لازم الایفاء ہونے پر سلف میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۲۔ نکاح کے وقت کسی فریق کا کوئی ایسی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، مثلاً شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان ونفقہ اس کے ذمہ نہیں ہوگا۔

اس طرح کی شرط لگانے سے عقد نکاح باطل نہیں ہوگا، بلکہ شرط ہی باطل اور ناقابل اعتبار ہوگی، ہاں اگر ایک محدود مدت تک کے لئے نکاح کی شرط لگائی جائے جسے نکاح متعہ یا نکاح موقت کہا جاتا ہے تو جمہور فقہاء کے نزدیک نکاح ہی نہیں ہوگا، اصل معرکۃ الآراء سوالنامہ میں ذکر کردہ تیسری قسم کی شرطیں ہیں، سوالنامہ کے الفاظ میں ان کا حاصل یہ ہے:

۳۔ نکاح کے وقت کسی فریق کا کوئی ایسی شرط عائد کرنا جو (۱، ۲) میں سے کسی کے دائرے میں نہیں آتی ہے، اس کے نتیجے میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہ ہوتا اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی یا ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہ ہوتی، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہ کرے گا یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا۔

نکاح اور دوسرے عقود میں شرائط عائد کرنے کے تعلق سے فقہاء اسلام میں مختلف رجحان پائے جاتے ہیں، فقہاء ظاہریہ (ابن حزم وغیرہ) کا مسلک یہ ہے کہ عقد نکاح وغیرہ میں وہی شرط لگائی جاسکتی ہے جس کی اجازت نص سے ثابت ہو، ان حضرات کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عقود شرعیہ (بیع، نکاح، اجارہ وغیرہ) کی طرح ان کے اثرات بھی شارع کی طرف سے مقرر ہیں، ان عقود میں اپنی طرف سے شرائط عائد کرنے سے ان کے اثرات میں خلل اندازی ہوتی ہے اور ان عقود کے مقاصد متاثر ہوسکتے ہیں، لہٰذا عقد نکاح وغیرہ میں ایسی شرط کی گنجائش ہے جس کا جواز نص سے ثابت ہے۔

اس کے برخلاف دوسرا موقف فقہاء حنابلہ کا ہے، ان حضرات کے نزدیک عقد نکاح میں میاں بیوی اپنی من پسند شرطیں عائد کرسکتے ہیں، اور عقد نکاح کے اثرات میں تبدیلی لاسکتے ہیں، ہاں اتنی بات کا خیال ضروری ہے کہ یہ شرطیں نکاح کے مقاصد اور اس کے لازمی تقاضوں کو مجروح نہ کرنے والی ہوں، عقد نکاح اور دوسرے عقود میں وہ شرط لگائی نہیں جاسکتی جس کی ممانعت نصوص وآثار میں صراحتاً کردی گئی ہو، مثلاً کسی عورت کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ مرد اپنی پہلی بیوی کو طلاق دیدے، غرضیکہ حنابلہ کے نزدیک ان شرائط میں اصل اباحت ہے، کسی شرط کو اسی وقت غیر معتبر کہا جاسکتا ہے، جبکہ وہ عقد کے مقصد اور لازمی تقاضوں کو مجروح کرتی ہو، یا نصوص وآثار میں صراحتاً اس شرط کی ممانعت ہو۔

ظاہریہ اور حنابلہ کے دو متضاد مسالک کے درمیان جمہور فقہاء (حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ) کا مسلک ہے، ان حضرات کے نزدیک شرط لگانے کے معاملہ میں نہ

[1] ☆ استاذ فقہ اسلامی ندوۃ العلماء لکھنؤ وسکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، بانی وموسس "المعہد الشریعۃ" لکھنؤ

تو ظاہریہ کی طرح بے انتہا تنگی ہے، نہ حنابلہ کی طرح غیر معمولی وسعت۔

جمہور فقہاء کے نزدیک ہر وہ شرط لغو اور غیر معتبر ہے جو تقاضۂ عقد میں شامل نہ ہو اور نہ ہی عقد کے کسی تقاضے کو پختہ کرنے والی ہو، اس کے ایفاء کے واجب ہونے پر نصوص و آثار یا عرف کے قبیل کی کوئی دلیل موجود نہ ہو، اس طرح کی ہر شرط جمہور فقہاء کے نزدیک غیر معتبر ہے، لیکن اس شرط کی بنا پر عقد نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

ائمہ اربعہ میں سے امام احمد بن حنبل بہت متوسع ہیں، وہ صرف انہیں شرائط کو غیر معتبر کہتے ہیں جن سے عقد نکاح کے لازمی تقاضے اور اثرات مجروح ہوتے ہوں، یا جن کے بارے میں شریعت نے صراحتاً ممانعت کی ہو، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ شوہر اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے، حنفیہ و شافعیہ کے نزدیک وہی شرطیں معتبر ہیں جو عقد نکاح کے تقاضوں کے مطابق ہوں، ان کے حق میں کوئی دلیل شرعی (مثلاً نص یا قیاس یا عرف) موجود ہو، مالکیہ اور مشہور قول کے اعتبار سے حنفیہ و شافعیہ کے ساتھ ہیں اور ان کا غیر مشہور قول امام احمد بن حنبل کے مطابق ہے، امام احمد بن حنبل اور ائمہ ثلاثہ کا اختلاف دراصل ان شرطوں کے بارے میں ہے جن کی صحت یا عدم صحت کسی خاص دلیل سے ثابت نہ ہو، ایسی شرطوں کو جمہور فقہاء غیر لازم اور ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک ان شرطوں کا ایفاء لازم نہیں ہے اور ان کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں دوسرے فریق کو نکاح فسخ کرنے یا عدالتی چارہ جوئی کا کوئی اختیار نہ ہوگا، اس کے برخلاف امام احمد بن حنبل کے نزدیک یہ شرطیں لازم عمل ہوں گی، اور اگر عورت کی طرف سے یہ شرطیں عائد کی گئیں تھیں اور شوہر نے ان شرطوں کی خلاف ورزی کی تو عورت کو فسخ نکاح کا اختیار ہوگا۔

امام احمد بن حنبل اور ائمہ ثلاثہ کے اختلاف کی مزید وضاحت ان مثالوں سے ہو سکتی ہے جنہیں فقہاء نے اس بحث میں ذکر کیا ہے، چند اختلافی شرطوں کا نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ عقد نکاح میں عورت نے یہ شرط لگائی کہ شوہر اس کے نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کرے گا۔

۲۔ عورت کی طرف سے نکاح میں یہ شرط لگائی گئی کہ شوہر اسے اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کہیں اور نہیں لے جائے گا۔

۳۔ عورت نے نکاح کے وقت یہ شرط عائد کی کہ شوہر اپنی پہلی بیوی کو طلاق دیدے۔

ان میں سے تیسری شرط کے بارے میں حنابلہ کے یہاں دو قول ملتے ہیں، صحیح اور راجح قول یہ ہے کہ عورت کی طرف سے یہ شرط عائد کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر یہ شرط لگائی گئی تو شوہر کے لئے لازم العمل نہیں، کیونکہ حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سوتن کو طلاق کا مطالبہ کرنے سے منع فرمایا، اس لئے راجح قول کے اعتبار سے حنابلہ کے نزدیک بھی یہ شرط فاسد ہے، ہاں ابتدائی دو شرطوں کے بارے میں امام احمد بن حنبل اور ائمہ ثلاثہ کا اختلاف منقول ہے، امام احمد ان دونوں شرطوں کو لازم العمل قرار دیتے ہیں اور شوہر کی جانب سے ان کی خلاف ورزی کی صورت میں عورت کو فسخ نکاح کا اختیار دیتے ہیں، جبکہ ائمہ ثلاثہ ابتدائی دو شرطوں کو بھی لغو اور ناقابل اعتبار گردانتے ہیں، اور شوہر کے ذمہ ان کی پابندی لازم نہیں کرتے۔

اس سلسلہ میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ امام مالک بھی اپنے غیر مشہور قول میں زیر بحث شرطوں کو لازم العمل قرار دیتے ہیں، اور اپنے مشہور قول کے اعتبار سے ان شرطوں کو غیر لازم کہتے ہیں، اگرچہ وہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے ہمنوا ہیں، لیکن اس طرح کی شرطیں عائد کرنے کو ناپسند کرنے کے باوجود ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ایسی شرط لگادی گئی اور میاں بیوی نے اپنے نکاح کے وقت اسے تسلیم کرلیا تو اس شرط کا پورا کرنا مستحب اور مستحسن ہے۔

زیر بحث شرطوں کے بارے میں صحابہ و تابعین اور فقہاء مجتہدین کے اختلاف احادیث کی بنیاد پر ہیں، جو حضرات ان شرطوں کو لازم العمل قرار دیتے ہیں ان کا استدلال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درج ذیل حدیث سے ہے، جو "صحیح بخاری" اور حدیث کی دوسری معتبر کتابوں میں مروی ہے:

"عن عقبة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: أحق ما أوفيتم من الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج"

(حضرت عقبہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے زیادہ پورا کئے جانے کے لائق وہ شرطیں ہیں جن کے ذریعہ تم نے شرمگاہوں کو حلال کیا)۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے امام خطابی لکھتے ہیں: نکاح کی شرطیں مختلف قسم کی ہیں، بعض شرطوں کا پورا کرنا بالاتفاق سب کے نزدیک واجب ہے، یہ وہ شرطیں ہیں جن کا خود اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، مثلاً بیوی کو دستور کے مطابق نکاح میں رکھنا، اس کے حقوق ادا کرنا یا اچھے طریقے سے اسے چھوڑنا (إمساك بمعروف أو تسريح بإحسان) بعض حضرات نے مذکورہ حدیث کو اس قسم کی شرط پر محمول کیا ہے، کچھ شرطیں وہ ہیں جن کے پورا نہ کئے جانے پر اتفاق ہے، مثلاً کسی عورت کا یہ شرط عائد کرنا کہ شوہر اپنی پہلی بیوی کو طلاق دیدے اور کچھ شرطوں کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ شوہر اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا، یا شوہر اس کو اس کے گھر سے منتقل کر کے اپنے گھر نہیں لے جائے گا۔

اس کی ہم معنیٰ حدیث کی شرح کرتے ہوئے امام نووی لکھتے ہیں:

''امام شافعی اور اکثر علماء فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا محمل وہ شرطیں ہیں مقتضاء نکاح کی منافی نہ ہوں، بلکہ نکاح کے تقاضوں اور مقاصد میں سے ہوں، مثلاً حسن سلوک کی شرط لگانا دستور کے مطابق لباس، رہائش گاہ، نان ونفقہ مہیا کرنے کی شرط لگانا کہ شوہر بیوی کے کسی حق کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرے گا، ایسی شرط جو تقاضائے نکاح کے خلاف ہو، مثلاً یہ شرط لگانا کہ شوہر اس کے لئے باری مقرر نہیں کرے گا، اس کی موجودگی میں کسی باندی سے تعلقات زن وشوئی قائم نہیں کرے گا، بیوی پر خرچ نہیں کرے گا اسے لے کر سفر نہیں کرے گا، اس طرح کی شرطوں کا پورا کرنا واجب نہیں ہے، بلکہ شرط لغو ہو جائے گی اور نکاح مہر مثل کے بدلہ میں صحیح ہو جائے گا، کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''ہر وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہ ہو وہ باطل ہے''، امام احمد اور ایک جماعت کے نزدیک شرط کا مطلقاً پورا کیا جانا واجب ہے "إن أحق الشروط بالوفاء"... والی حدیث کی بنا پر امام ترمذی نے حدیث "إن أحق الشروط أن يوفى بها ما استحللتم بها الفروج" کی روایت کرنے کے بعد لکھا ہے: صحابہ کرام میں سے بعض اہل علم کا اسی پر عمل ہے، انھیں میں سے حضرت عمر بن الخطاب بھی ہیں، انھوں نے فرمایا کہ اگر کسی مرد نے عورت سے نکاح کرتے وقت یہ شرط منظور کی ہے کہ عورت کو اس کے شہر سے نکال کر نہیں لے جائے گا تو اسے عورت کو نکال کر لے جانے کا حق نہیں ہے، بعض اہل علم کا قول یہی ہے، حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''اللہ کی شرط عورت کی شرط سے پہلے ہے، گویا حضرت علیؓ کی رائے میں عورت کی طرف سے نکال کر نہ لے جانے کی شرط لگانے کے باوجود شوہر کے لئے جائز ہے کہ بیوی کو اس کے شہر سے نکال کر لے جائے، بعض اہل علم نے اس کو اختیار کیا ہے، سفیان ثوری اور بعض اہل کوفہ کا یہی قول ہے''۔

مذکورہ بالا حدیث امام احمد بن حنبل اور ان تمام لوگوں کی سب سے مضبوط دلیل ہے جو شرائط نکاح قبول کرنے میں متوسع ہیں، ان حضرات کے نزدیک حدیث بالا کی روشنی میں نکاح کی وہ تمام شرطیں صحیح اور لازم العمل ہیں جن کی نصوص میں صراحتاً ممانعت نہ کی گئی ہو، اور ان سے نکاح کے لازمی تقاضے مجروح نہ ہوتے ہوں۔

جو حضرات فقہاء نکاح اور دوسرے عقود کی شرطوں کو بہت محدود دائرے میں قبول کرنے کا رجحان رکھتے ہیں وہ حضرات بھی استدلال میں احادیث نبویہ پیش کرتے ہیں، اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو فرامین پیش کئے جاتے ہیں۔

"كل شرط ليس في كتاب الله فهو باطل وإن كان مائة شرط" (ہر وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہ ہو باطل ہے اگرچہ وہ سو شرطیں ہوں)۔

زیر بحث شرطیں چونکہ کتاب اللہ میں نہیں ہیں اور نہ عقد نکاح کا لازمی تقاضا ہیں، لہٰذا حدیث بالا کے اعتبار سے باطل اور ناجائز ہوں گی۔

دوسری حدیث یہ ہے:

"المسلمون على شروطهم إلا شرطاً أحل حراماً أو حرم حلالاً" (مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہوں گے سوائے اس شرط کے جو حرام کو حلال قرار دے یا حلال کو حرام قرار دے)۔

ظاہر ہے کہ اس حدیث میں حقیقی تحلیل وتحریم مراد نہیں ہے، ایک مسلمان حالت ایمان میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیسے کر سکتا ہے، اور اگر کرے تو مسلمان کہاں باقی رہے گا، تحریم کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اس شرط کی بنا پر ایک حلال چیز پر پابندی ہو جائے اور اس کی بنا پر خواہش کے باوجود ایک فریق ایک جائز کام نہ کر سکے، زیر بحث شرطوں میں اس مفہوم کے اعتبار سے تحریم حلال (حلال کو حرام کرنا) موجود ہے، مثلاً اگر ایک عورت سے کسی مرد کا نکاح ہوتا

ہے تو اس عورت کے نکاح میں ہوتے ہوئے مرد دوسرا اور تیسرا نکاح کرسکتا ہے، لیکن اگر عورت نے اس شرط کے ساتھ نکاح کیا کہ شوہر اس کی موجودگی میں کسی دوسری عورت سے نکاح نہ کرے اور شرعاً یہ شرط لازم العمل قرار دیدی گئی تو شوہر پر دوسرا نکاح کرنے کے سلسلے میں پابندی عائد ہوگئی اور اسے ایک حلال کام سے روک دیا گیا، ضرورت اور خواہش کے باوجود وہ دوسرا نکاح نہیں کرسکتا، اور اگر دوسرا نکاح کرے تو پہلی بیوی سے ہاتھ دھوئے۔

زیر بحث شرطوں کو باطل قرار دینے والے جمہور فقہاء کا ایک استدلال یہ بھی ہے کہ شریعت اسلامی نے عقود و معاملات کے احکام واثرات متعین کردیئے ہیں، ان کے احکام واثرات کی حد بندی فریقین پر نہیں چھوڑی ہے، عقود و معاملات کے شرعی احکام واثرات اور ان کے لازمی تقاضوں سے تجاوز کرکے فریقین کی طرف سے شرائط عائد کرنا ان عقود و معاملات کی شرعی ساخت پر اثر انداز ہوگی، ان عقود کے شرعی مقاصد متاثر اور مجروح ہوں گے، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ شوہر اسے اس کے آبائی وطن میں رکھے گا، وہاں سے منتقل کرکے کہیں اور نہیں لے جائے گا، بادی النظر میں ایک بے ضرر سی شرط معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو مقاصد و مصالح نکاح پر اس شرط کے برے اثرات پڑتے ہیں، مثلاً بیوی کے وطن میں شوہر کو رزق کے ذرائع حاصل نہ ہوسکے، اس لئے وہ مجبور ہوا کہ حصول رزق کے لئے کسی اور شہر میں قیام کرے، تلاش رزق میں اس کا قیام عورت کے وطن سے دور رہے اور خواہش کے باوجود وہ اپنی بیوی بچوں کو اپنے ساتھ نہیں لے جاپائے گا، اس کے نتیجے میں میاں بیوی دونوں کی زندگی ناآسودہ گذرے گی، بچوں کی نگہداشت اور تعلیم وتربیت کے مسائل پیدا ہوں گے، عائلی زندگی متزلزل ہوکر رہ جائے گی، خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کی شرطیں بہ ظاہر بے ضرر ہونے کے باوجود اپنے نتائج کے اعتبار سے نکاح کے مقاصد و مصالح کو مجروح کرتی ہیں، اس لئے شرعاً ان شرطوں کا اعتبار نہیں ہے۔

اسلامی شریعت کی منشاء یہ ہے کہ نکاح کرنے سے قبل ایک دوسرے کے بارے میں پورا اطمینان کرلیا جائے، نکاح طے کرنے میں نامناسب جلد بازی کرنے کے بجائے ہر طرح معلومات اور اطمینان حاصل کرلینے کے بعد اللہ کے نام پر نکاح کا فیصلہ کیا جائے، نکاح کے وقت بے اعتمادی اور بے اطمینانی کا ماحول نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ رشتۂ نکاح محبت اور اعتماد کی فضا ہی میں بارآور ہوسکتا ہے، نکاح کے وقت ہی سے شرائط بازی اعتماد واطمینان کی فضا کو مجروح کرتی ہے۔

مسئلہ زیر بحث میں دلائل و مصالح کے اعتبار سے جمہور فقہاء (حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ) کی بات زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے، عقد نکاح کے وقت اگر عورت یہ شرط لگائے کہ اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا یا فلاں فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا اور شوہر اس شرط کو تسلیم کرلے، فقہ اسلامی کی اصطلاح میں یہ تفویض طلاق ہے، ظاہریہ کے علاوہ باقی تمام فقہاء تفویض طلاق کو درست اور نافذ قرار دیتے ہیں، شوہر کو جس طرح خود طلاق دینے کا اختیار ہے، اسی طرح اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ طلاق واقع کرنے کا اختیار مشروط یا غیر مشروط طور پر بیوی کو یا کسی تیسرے شخص کو تفویض کرے، تفویض طلاق کے جواز پر جمہور فقہاء نے آیت تخییر کے علاوہ صحابہ کرام کے بہت سے آثار سے بھی استدلال کیا ہے۔

اصولی طور پر تفویض طلاق کی درستگی پر اتفاق کے باوجود اس کی تفصیلات اور متعلقہ مسائل میں فقہاء اسلام کے درمیان کافی اختلافات ہیں، فقہاء حنفیہ کے نزدیک تفویض طلاق کے بعد شوہر کو اس سے رجوع کا اختیار نہیں ہے، حنفیہ کے نزدیک خاص شرائط اور تفصیلات کے ساتھ تفویض طلاق کا عمل نکاح سے پہلے بھی ہوسکتا ہے، عقد نکاح کے دوران اور نکاح کے بعد بھی۔

فقہ حنفی کے مسائل و تفصیلات کے اعتبار سے تفویض طلاق کی حکیمانہ اور فقیہانہ تطبیق وتشریح حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے "الحیلة الناجزة للحلیلة العاجزة" میں کی ہے، تفویض طلاق کے مسائل کی روشنی میں مختلف "کابین نامے" مرتب کرکے حضرت تھانویؒ نے مردوں کے اس طرح کے مظالم کا سدباب کرنا چاہا ہے کہ بہت سے مرد بیویوں پر ظلم وزیادتی کرتے ہیں یا ان کا نان ونفقہ ادا نہیں کرتے، بال بچوں سے بے فکر ہوکر پردیس چلے جاتے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق ادا کرنے اور ان پر ظلم وزیادتی کرنے کے باوجود انہیں طلاق دینے یا ان سے خلع کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتے، اگر نکاح کے وقت "کابین نامہ" کی شکل میں تفویض طلاق کرالی جائے تو عورت "کابین نامہ" کی شرائط کی خلاف ورزی کی صورت میں اپنے اوپر طلاق واقع کرکے رہائی حاصل کرسکتی ہے، حضرت تھانویؒ نے مختلف کابین ناموں کا جو متن تحریر فرمایا ہے اس میں پوری دانشمندی کے ساتھ احتیاطوں کو ملحوظ رکھا ہے، اس بات کو مدنظر رکھا ہے کہ مردوں کے مظالم کا سدباب بھی ہوجائے اور عورت کے ہاتھ میں طلاق کا اختیار آنے سے جن مفاسد کا اندیشہ ہے، ان پر بھی روک لگ سکے۔

اشتراط فی النکاح کے سوالنامہ میں دو سوالات عقد نکاح میں دو شرطوں کے ساتھ دو مہروں کو وابستہ کرنے کے بارے میں ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر عقد نکاح کے وقت مہر اس طرح طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق نہ دی تو اس کا مہر دس ہزار، اور اگر طلاق دی تو عورت کا مہر بیس ہزار، یا اس طرح طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کیا تو مہر پندرہ ہزار اور اگر دوسرا نکاح کیا تو بیس ہزار۔

فقہاء اسلام نے اس طرح مہر طے کرنے پر بحث کی ہے، صاحبین نے دونوں شرطوں اور دونوں مہروں کو درست قرار دیا ہے اور جو شرط پائی جائے گی اس کے اعتبار سے مہر کی ادائیگی ہوگی، امام احمد بن حنبل کا بھی یہی مسلک ہے۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک جو مہر پہلے ذکر کیا گیا ہے اس کی تعیین درست ہوگی، اگر پہلی شرط پائی گئی تو مہر مسمیٰ واجب ہوگا، اور اگر دوسری شرط پائی گئی تو مہر مثل لازم ہوگا، بشرطیکہ وہ مہر مسمیٰ سے زائد نہ ہو، لیکن خود امام ابوحنیفہ نے دو شرطوں سے دو مہروں کے وابستہ کرنے کی بعض صورتوں کو جائز اور نافذ قرار دیا ہے، مثلاً اگر اس طرح مہر طے ہو کہ اگر عورت حسین ہو تو اس کا مہر دس ہزار اور اگر بدصورت ہو تو اس کا مہر پانچ ہزار، اس صورت میں امام ابوحنیفہ بھی دونوں شرطوں اور دونوں مہروں کو درست قرار دیتے ہیں، ان دونوں مسائل میں امام ابوحنیفہ نے کس بنیاد پر فرق کیا ہے اس پر کتب فقہ حنفی میں تفصیلی بحث اور رد وقدح ملتی ہے۔

میرے خیال میں زیر بحث مسئلہ میں صاحبین کا قول اختیار کرنا مناسب ہے، صاحبین کا قول نہایت واضح اور سہل ہے، اس کا اختیار کرنا مفتی اور مستفتی دونوں کے لئے سہولت کا موجب ہے، لیکن اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ طلاق اور عدم طلاق والے مسئلہ میں اگر طلاق کے ساتھ مہر کی ایسی بڑی مقدار وابستہ کردی گئی جس کی ادائیگی شوہر کے لئے ناممکن ہو تو دوسرے مفاسد پیدا ہوں گے، طلاق کے ناپسندیدہ ہونے کے باوجود شریعت اسلامی نے جن مصالح سے طلاق کو مشروع کیا ہے ان مصالح پر زد پڑے گی، طلاق کے ناگزیر ضرورت بن جانے کے باوجود لمبے مہر کے خوف سے لوگ طلاق کا اقدام نہیں کریں گے اور ناپسندیدہ بیویوں سے گلوخلاصی کے لئے وحشیانہ اقدامات کر گذریں گے، جیسا کہ ہندو سماج میں ہو رہا ہے۔

پھر اصل مفاسد نفس طلاق سے نہیں، بلکہ بیک وقت تین طلاق سے پیدا ہوتے ہیں، اگر شوہر سنت کے مطابق ایک وقت میں ایک طلاق پر اکتفا کرتا ہے تو دونوں کے درمیان ملاپ کی راہیں کھلی ہوئی ہیں، اس لئے مہر کی زیادتی تین طلاق کی شرط کے ساتھ مربوط کی جانی چاہئے تاکہ تین طلاق کے رواج پر قدغن لگے اور نسبتاً زیادہ مہر کے خوف سے تین طلاق کا ناروا اقدام نہ کیا جائے۔

سوالنامہ اشتراط فی النکاح کے آخری سوال کا جواب یہ ہے کہ ایسی شرط شرعاً ناقابل اعتبار ہوگی، جمہور فقہاء کے نزدیک یہ شرط شرائط فاسدہ کے زمرہ میں آتی ہے، صرف اتنی بات نہیں ہے کہ یہ شرط نکاح کے لازمی تقاضوں میں شامل نہیں اور نہ انھیں پختہ کرنے والی ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ یہ شرط عقد نکاح کے ایک لازمی تقاضا کے خلاف ہے، نکاح کے بعد اسلامی شریعت بیوی کے ضروری اخراجات شوہر کے ذمہ لازم کردیتی ہے، خواہ شوہر مالدار ہو یا غریب اور شوہر کو یہ حق دیتی ہے کہ اس کی بیوی اس کی اجازت کے بغیر (بعض استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر) اس کے گھر سے باہر نہ جائے، اسلام نے مرد اور عورت کے مزاج اور صلاحیت کا خیال کرتے ہوئے دونوں کے کام تقسیم کردیئے ہیں، گھر کے باہر کا کام خصوصاً تلاش معاش مرد کے ذمہ رکھا ہے، اور اندرون خانہ کی ذمہ داری عورت پر رکھی ہے، گھر کا داخلی نظم ونسق، چھوٹے بچے بچیوں کی نگہداشت وغیرہ، بیوی کے فرائض میں داخل ہے، ظاہر ہے کہ گھر کے باہر مستقل ملازمت کے ساتھ عورت شوہر اور بچوں کے تئیں اپنی خانگی ذمہ داریاں پوری نہیں کرسکتی، ملازمت کرنا بہت سے بہت اس کے لئے جائز عمل کہا جاسکتا ہے اور گھر کی دیکھ بھال بچوں کی نگہداشت، پرورش اس کے واجبات میں شامل ہے، مباح اور واجب میں جب بھی ٹکراؤ ہوگا تو واجب کو ترجیح ہوگی۔

عورت کی طرف سے ملازمت کی شرط شوہر کے حق حبس کو کالعدم کردیتی ہے اور حق حبس نکاح سے پیدا ہونے والا ایک لازمی حق ہے، لہٰذا اس کو باطل کرنے والی شرط خود باطل ہوگی، یہ شرط اسی طرح ناقابل اعتبار ہوگی جس طرح یہ شرط غیر معتبر ہوتی ہے کہ شوہر کو میرے کہیں آنے جانے پر کوئی اعتراض کرنے کا حق نہ ہوگا۔

☆☆☆

# نکاح میں شرائط اور ان کے احکامات

مولانا مصلح الدین احمد بڑودوی القاسمی

نکاح میں شرائط سے مراد یہ ہے کہ زوجین میں سے کسی کا ایسی شرط لگانا جس کے لئے کوئی غرض یا منفعت وابستہ ہو، اس سلسلہ میں ایسی شروط مراد ہیں جو ایجاب یا قبول کے ساتھ مقرون و متصل ہوں، یعنی ایجاب اس طرح متحقق ہو کہ اس کے ساتھ کوئی شرط لگی ہوئی ہو، وہ ایجاب مراد نہیں جو کسی شرط پر معلق ہو، کیونکہ معلق بالشرط ایجاب کا وجود و تحقق، شرط سے قبل ممکن نہیں۔

''الشروط فى الزواج هى مايشترطه أحدالزوجين على الآخر مماله فيه غرض ويراد به الشروطه المقترنة بالإيجاب أو القبول أى أن الايجاب يحصل و لكن يصاحبه شرط من الشروط'' (الفقہ الاسلامی ۵۳)

یعنی نکاح میں زوجین میں سے کسی کا دوسرے پر ایسی شرط لگانا جس کے ساتھ شرط لگانے والے کی غرض اور منفعت متعلق ہو، اور اس سے وہ شرائط مراد ہیں جو ایجاب یا قبول کے ساتھ مقرون ہو، بایں طور کہ مشروط ایجاب صادر ہو، "وهذا بخلاف حالة الإيجاب المعلق بشرط. فإن الإيجاب لا وجود له قبل الشرط" (الفقہ الاسلامی ۷/۳۵)۔

اور یہ صورت اس ایجاب کے برخلاف ہے جو معلق بالشرط صادر ہو، کیونکہ شرط کے تحقق سے پہلے ایجاب کا وجود ممکن ہی نہیں۔

## شروط فی النکاح کے سلسلہ میں حنفیہ کا مذہب:

زوجین میں سے کوئی ایسی شرط لگاتا ہے جو شرط صحیح ہو، شرط صحیح سے ایسی شرط مراد ہے جو مقتضاء عقد کے مناسب ہو اور احکام شرعیہ کے منافی نہ ہو، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ خاوند اپنے گھر والوں سے یا اپنی سوکن سے الگ کسی علیحدہ مکان میں اس کی رہائش کا انتظام کرے، یا کسی دور دراز جگہ کے سفر میں اس کو اس کی مرضی کے خلاف نہ لے جائے گا وغیرہ) تو ایسی شرط کو پورا کرنا اور اس کا لحاظ رکھنا شرعاً واجب و لازم ہے۔

اور اسی حکم میں وہ شروط بھی داخل ہیں جو شرعاً مامور بہ ہوں، جیسے کہ عورت کا یہ شرط لگانا کہ خاوند میرے ساتھ اچھا سلوک کرے گا، مجھے خلاف شرع امور پر مجبور نہ کرے گا وغیرہ۔

اگر کسی شخص نے کسی عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ اس کی طلاق کا معاملہ اسی عورت کے قبضہ و اختیار میں ہوگا، تو یہ شرط لگانا صحیح ہے اور فقہاء حنفیہ نے اس کو شروط صحیحہ میں سے قرار دیا ہے، لیکن اگر کسی شخص نے عورت کے باپ کو مخاطب کر کے یوں کہے: ''تو اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے اس شرط پر کردے کہ اس کا امر طلاق تیرے اختیار میں ہوگا'' تو اس صورت میں باپ کے اختیار میں امر طلاق نہ ہوگا، کیونکہ یہ تفویض قبل النکاح ہے۔

زوجین میں سے کوئی ایسی شرط لگاتا ہے جو شرعاً فاسد ہے۔ شرط فاسد سے وہ شرط مراد ہے جو عقد نکاح کے مقتضاء کے خلاف ہو یا احکام شرعیہ کے منافی ہو، شروط فاسدہ کا حکم یہ ہے کہ شروط فاسدہ کی وجہ سے نکاح باطل نہیں ہوتا بلکہ صرف شرط ہی باطل ہو جاتی ہے، اس کو پورا کرنا ضروری نہیں، البتہ نکاح صحیح ہو جاتا ہے، نکاح اور معاوضات مالیہ کا باہمی فرق یہ ہے کہ شروط کی وجہ سے معاوضات مالیہ (بیع وغیرہ) فاسد ہو جاتے ہیں اور نکاح فاسد نہیں ہوتا۔

زوجین میں سے کوئی ایسی شرط لگاتا ہے جو شرعاً ممنوع ہے، تو ایسی شرط لگانا ناجائز ہے اور اس کو پورا کرنا ضروری نہیں، مثلاً کسی عورت نے یہ شرط لگائی کہ تجھے میری سوکن کو طلاق دینا پڑے گا، تو ایسی شرط لگانا، نیز اس کو پورا کرنا ممنوع ہیں، حدیث میں ہے: "لا يحل لامراة تسأل طلاق ضرتها" (کسی عورت کو جائز نہیں کہ وہ خاوند سے اپنی سوکن کی طلاق کا مطالبہ کرے) (درمختار ۲/۴۰۰، تبیین الحقائق ۲/۱۴۹، فتح القدیر ۳/۱۰۷، بدائع الصنائع)۔

والخلاصة أن الفقهاء اتفقوا على صحة الشروط التى تلائم العقد وعلى بطلان الشروط التى تنافى المقصو۔

من الزواج أو تخالف أحكام الشريعة واتفق الحنفية والمالكية والحنابلة على صحة الشروط التي يكون فيها تحقيق وصف مرغوب فيه أوخلو المرأة من عيب لا يثبت الخيار في فسخ الزوج'' (الفقه الإسلامی ۶۰،۵۹)

شروط نکاح کے سلسلہ میں مذاہب اربعہ کی مفصل و مدلل تشریح کے بعد پوری بحث کے خلاصہ کے طور پر درج بالا عبارت مذکور ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ فقہاء نے ان شرائط کی صحت پر اتفاق کیا ہے جو عقد نکاح کے مناسب ہوں، اور وہ شرائط جو نکاح کی غرض وغایت یا احکام شرعیہ کے منافی ہوں، ان کے باطل و غیر معتبر ہونے پر بھی اتفاق کیا ہے، اسی طرح حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ نے ان شرائط کے صحیح ہونے پر بھی اتفاق کیا ہے، جن میں کسی پسندیدہ وصف کی تحقیق ہو، یا کسی ایسے عیب سے پاک وصاف ہونا مطلوب ہو جس میں خاوند کو فسخ نکاح کا اختیار نہیں ملتا۔

لیکن وہ شرائط جو مقتضاء عقد نکاح کے خلاف ہوں، مگر عقد نکاح کے احکام سے کسی حکم شرعی کے خلاف نہ ہوں اور نہ ان عاقدین میں سے کسی کا نفع ہو، مثلاً یہ شرط لگائی کہ خاوند اس پر اور کسی عورت سے نکاح نہ کرے گا یا اسے سفر میں اپنے ساتھ نہیں لے جائے گا یا اس کو اس کے گھر یا شہر وغیرہ سے باہر نہیں نکالے گا وغیرہ تو ایسی شرائط کا حکم ائمہ اربعہ کے یہاں درج ذیل ہے:

حنفیہ کے نزدیک اس قسم کی شرطیں لغو قرار پائیں گی اور عقد نکاح صحیح ہو جائے گا، حنابلہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کی شرائط صحیح ہیں اور ان کا پورا کرنا لازم اور ضروری ہے، مالکیہ کے نزدیک اس قسم کی شرطیں مکروہ ہیں جن کو پورا کرنا لازم نہیں، البتہ مستحب ہے، شافعیہ کے نزدیک یہ شرطیں باطل ہیں اور عقد نکاح صحیح ہے (الفقہ الاسلامی ۶۰،۵۹/۷)۔

## توکیل وتفویض طلاق کی بحث:

اس بحث کا تعلق طلاق کی دونوں قسموں، صریحی وکنائی کے ساتھ ہے، کیونکہ خاوند کی جانب سے بیوی یا اس کے علاوہ اور کسی شخص کو طلاق واقع کرنے کا اختیار دینا طلاق کے استعمال کئے جانے والے الفاظ صریحہ کے ساتھ ہوگا، جیسے "طلقی نفسك" تو اپنے آپ کو طلاق دیدے، یا کنایہ اور اشارہ کے الفاظ کے ساتھ ہوگا جیسے "امرك بيدك" تیرا معاملہ تیرے قبضہ واختیار میں ہے۔

خاوند جس طرح بذات خود طلاق دے سکتا ہے، اسی طرح وہ طلاق واقع کرنے میں کسی کو اپنا نائب بھی بنا سکتا ہے، بیوی کو حق طلاق سپرد کرنا باجماع امت ثابت ہے، آیت کریمہ: يايها النبي قل لأزواجك إن كنتن تردن الحيوة الدنيا " (سورہ احزاب: ۲۸) کے نزول کے بعض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کو اپنے ساتھ قیام و مفارقت کے درمیان اختیار دیا تھا، پس اگر ازواج مطہرات کا اختیار مفارقت نہ ہوتا تو یہ تخییر بے معنی و بے اثر ہو کر رہ جاتی۔

تین قسم کے الفاظ سے تفویض طلاق ہوتی ہے: امر بالید، تخییر اور مشیئت، ان تینوں الفاظ میں سے ہر ایک لفظ تملیک وتخییر مراۃ کا فائدہ دیتا ہے، یعنی ہر ایک لفظ کی بناء پر بیوی اپنے او پر طلاق واقع کرنے کی مالک ہو جاتی ہے، اور خاوند کے ساتھ رہنے اور اپنے کو اس سے جدا کر لینے ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک بات کو پسند کرنے کا اس کو حق حاصل ہو جاتا ہے۔

امر بالید: یعنی خاوند کا اپنی بیوی سے کہنا کہ ''أمرک بیدک'' تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے، ایسا کہنے کی بنا پر دو شرطوں کے ساتھ طلاق واقع کرنے کا حق بیوی کے قبضہ واختیار میں آجاتا ہے۔

شرط اول: خاوند کا بہ نیت طلاق یہ لفظ کہنا: کیونکہ یہ لفظ طلاق کے الفاظ میں سے ہے، لہذا بغیر نیت طلاق یہ لفظ کہنے سے طلاق واقع نہ ہوگی۔

شرط ثانی: عورت کو اس کا علم ہونا کہ خاوند نے میرا معاملہ طلاق میرے ہاتھ میں دیدیا ہے، چنانچہ جب تک کہ بیوی اس لفظ کو سن نہ لے یا کسی کے ذریعہ اس کو خبر نہ پہنچے وہاں تک معاملہ طلاق اس کے اختیار میں نہیں آئے گا۔

تخییر: یعنی خاوند کا بیوی سے ''اختاری'' کہنا، یعنی تجھے میرے ساتھ رہنے اور مجھ سے جدا ہو جانے ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک بات کو پسند کرنے کا اختیار ہے، دو باتوں کے علاوہ میں تخییر اور امر بالید کا حکم یکساں ہے، باہمی فرق والے دو امر یہ ہیں:

(۱) امرك بيدك (تمہارا معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے) کہنے میں تین طلاق کی نیت صحیح ہے اور "اختاری" اس لفظ میں تین طلاق کی نیت صحیح نہیں، اسی وجہ سے تین طلاق کی نیت سے یہ لفظ کہے تب بھی ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔

(۲) "اختاری" میں لفظ نفس کا ذکر خاوند کے کلام میں یا عورت کے جواب میں لازم وضروری ہے، بایں طور کہ خاوند یوں کہے کہ "اختاری نفسك" اور اس کے جواب میں عورت کہے: "اخترت"، یا خاوند بیوی سے کہے: "اختاری" اور اس کے جواب میں عورت کہے: "اخترت نفسی" یا زوجین میں سے کسی کے کلام میں ذکر طلاق ضروری ہے، یا ایسے لفظ کا ذکر ضروری ہے جو طلاق پر دلالت کرتا ہو، مثلاً خاوند کے کلام تخییر کا لفظ مکرر ہو جیسے یوں کہے: "اختاری اختاری" یا دونوں میں سے کسی کے کلام میں لفظ "الاختیار" کا ذکر ہو، جیسے خاوند یوں کہے: "اختاری اختیارۃ" اور اس کے جواب میں بیوی کہے: "اخترت اختیارۃ"۔

مشیئت: یعنی خاوند اپنی بیوی سے یوں کہے "أنت طالق إن شئت" اگر تو چاہے تو تجھے طلاق ہے، مشیئت اور تخییر کا ایک ہی حکم ہے، کیونکہ دونوں لفظ تملیک طلاق ہیں۔

مشیئت اور تخییر کا باہمی فرق یہ ہے کہ مشیئت والی صورت میں طلاق رجعی واقع ہوگی، کیونکہ لفظ صریح کے ساتھ تفویض طلاق ہوئی ہے اور تخییر والی صورت میں طلاق بائن واقع ہوگی، کیونکہ یہ الفاظ کنایہ میں سے ہے۔

خاوند کا "طلقی نفسك" کہنا، یعنی اپنے آپ کو طلاق دیدے، فقہاء کے نزدیک تملیک ہے، خواہ اس کو مشیئت کے ساتھ مقید کیا ہو یا نہ کیا ہو اور اس لفظ کا اثر "أنت طالق إن شئت" کی طرح مجلس تک ہی محدود رہے گا، تبدیل مجلس کے بعد بیوی کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔

## توکیل بالطلاق کا حکم

وکیل بالطلاق اپنے موکل کی رائے کے مطابق عمل کرنے کا مقید ومکلف ہے، اگر وکیل بالطلاق اپنے موکل کی رائے سے تجاوز یا انحراف کرتا ہے تو اس کا تصرف موکل کی اجازت پر موقوف رہے گا، اگر موکل اجازت دے گا تو نافذ ہوگا، ورنہ رد ہو جائے گا، اگر توکیل بالطلاق کسی معین زمانہ کے ساتھ مقید نہ ہو تو وکیل بالطلاق جب جی چاہے تب موکل کی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے، اور موکل اپنے وکیل بالطلاق کو جب چاہے تب معزول بھی کر سکتا ہے۔

وکیل بالطلاق کی حیثیت معبر وسفیر محض کی ہوتی ہے، لہٰذا حقوق طلاق (مہر مؤجل کی ادائیگی، متعہ یا نفقہ عدت وغیرہ) کا مطالبہ وکیل سے درست نہ ہوگا، بلکہ براہ راست خاوند سے حقوق طلاق کا مطالبہ ہوگا۔

## زوجہ یا غیر زوجہ کو تفویض بالطلاق کا حکم

خاوند کے حق میں تفویض لازم ہے، بایں طور کہ تفویض طلاق کے بعد خاوند اس سے رجوع نہیں کر سکتا اور عورت کو اس سپرد کردہ حق کے استعمال سے روک بھی نہیں سکتا اور اس کو فسخ بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ خاوند نے تفویض کے ذریعہ بیوی وغیرہ کو طلاق کا مالک بنا دیا اور کسی غیر کو مالک بنا دینے کے بعد اس کی ولایت اس کی ملکیت سے زائل ہو جاتی ہے، لہٰذا رجوع، منع وفسخ کے ذریعہ ابطال کا مالک نہ ہوگا، نیز رجوع کا حق اس لئے بھی نہیں ہے کہ خاوند کے حق میں تفویض کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایقاع طلاق کو بیوی کی مشیئت پر معلق کر رہا ہے، اور تعلیق، یمین کے حکم میں ہوا کرتی ہے اور ایمان میں ان کے صدور کے بعد حق رجوع ممکن نہیں رہتا۔

مگر بیوی کے حق میں تفویض لازم نہیں، چنانچہ اس کو صراحتاً یا دلالتاً اس تفویض کو رد کر دینے کا حق حاصل ہوگا، کیونکہ امر بالید تخییر ہے، یعنی عورت کو خاوند کے ساتھ رہنے نہ رہنے میں سے ایک امر کو پسند کرنے کا اختیار ہے اور اختیار ولزوم باہم منافی ہیں۔

مفوضہ عورت کو صرف ایک مرتبہ اختیار کا حق ہے، کیونکہ خاوند کا بیوی سے "أمرك بيدك" کہنا تکرار کا مقتضی نہیں، مگر یہ مقتضی تکرار لفظ اس کے ساتھ شامل کر دیا جائے مثلاً بیوی سے یوں کہے: "أمرك بيدك كلما شئت" جب جب تیرا جی چاہے تب تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے، اس صورت میں معاملہ اس کے ہاتھ میں آجائے گا جب جب اس کا جی چاہے۔

عورت ایک مجلس میں اپنے اوپر ایک ہی طلاق واقع کر سکتی ہے، لہٰذا تین مجلسوں میں تین طلاق واقع کرنے سے وہ بائنہ ہو جائے گی، کیونکہ لفظ "کلما" تکرار افعال کا مقتضی، لہٰذا تکرار مشیئت کے وقت تکرار تملیک کا بھی مقتضی ہوگا۔

## تفویض طلاق اور اس کے احکام

حنفیہ کے یہاں انشاء عقد نکاح کے مقارن ہوکر یا عقد نکاح کے بعد زوجیت برقرار رہنے کے زمانہ میں تفویض طلاق صحیح ہے۔

حنفیہ کے یہاں تفویض مقارن عقد کے صحیح ہونے کے لئے زوجہ یا وکیل زوجہ کی جانب سے ایجاب مشروط کا صادر ہونا لازم وضروری ہے، مثلاً عورت کسی مرد سے یوں کہے: "تزوجتك على أن الطلاق بيدي أو متى شئت اور كلما شئت" یعنی میں نے تجھ سے اس شرط پر نکاح کیا کہ طلاق کا معاملہ میرے ہاتھ میں رہے گا، یا طلاق کا معاملہ میرے زیر اختیار رہے گا، جس وقت میں چاہوں، یا جب جب میں چاہوں، اور مرد نے اس کو قبول کرلیا، یعنی عورت کی جانب سے ایجاب مشروط ہے اور مرد اس مشروط ایجاب کو قبول کرلیتا ہے تو یہ تفویض شرعاً معتبر اور صحیح قرار پائے گی۔

لیکن اگر مرد کی جانب سے ایجاب کا صدور ہوا اور مرد نے عورت سے یوں کہا "تطلقين نفسك متى شئت" میں نے تجھ سے اس شرط پر نکاح کیا تو جب چاہے اپنے اوپر طلاق واقع کرلے، اور عورت نے اس ایجاب کو قبول کرلیا تو اس صورت میں نکاح تو شرعاً معتبر اور صحیح ہوگا، مگر یہ تفویض نہ ہوگی، کیونکہ مرد نے عقد نکاح کی تکمیل سے پہلے عورت کو ایقاع طلاق کا مالک بنایا ہے، حالانکہ تکمیل عقد نکاح سے قبل خود خاوند کو طلاق دینے کا حق حاصل نہیں ہوتا اور کوئی شخص کسی کو کسی شئی کا مالک نہیں بنا سکتا جو خود اس کی ملکیت میں نہ ہو، جب عورت کے ایجاب مشروط اور مرد کے قبول سے تفویض بوقت عقد صحیح ہوجائے اور اس تفویض میں کسی معین زمانہ کی کوئی قید نہ ہو، مثلاً عورت نے ایجاب کے طور پر یوں کہا کہ "تزوجتك على أن طلاقي بيدي" میں نے تجھ سے اس شرط پر نکاح کیا کہ میرا معاملہ طلاق میرے ہاتھ میں رہے گا اور مرد نے "قبلت" (میں نے قبول کیا) کہہ کر اس ایجاب کو قبول کرلیا تو اس صورت میں عورت کا اختیار طلاق مجلس انشاء عقد نکاح تک محدود رہے گا، بایں معنی کہ مجلس نکاح کے ختم ہونے کے بعد عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق نہ رہے گا۔

## طلاق مع التفویض میں خاوند کا حق طلاق

تفویض بمعنی تملیک ہونے کی وجہ سے توکیل کے مشابہ ہے، لہٰذا اپنی بیوی کو تفویض طلاق کے بعد بھی خاوند کو طلاق دینے کا حق باقی رہے گا، جیسے کہ توکیل کے بعد موکل کو بذات خود موکل فیہ میں حق تصرف باقی رہتا ہے۔

## توکیل وتفویض کا باہمی فرق

توکیل وتفویض دونوں میں خاوند کا حق ایقاع طلاق ساقط وسلب نہیں ہوتا، اس کے باوجود دونوں میں درج ذیل وجوہ فرق ہیں:

(۱) ایک مرتبہ تفویض صادر وصحیح ہوجانے کے بعد خاوند اس تفویض سے رجوع نہیں کرسکتا، لیکن موکل فیہ میں وکیل کے تصرف سے پہلے موکل رجوع کرسکتا ہے، یعنی وکیل کی وکالت منسوخ کرسکتا ہے۔

(۲) تفویض کے اندر مفوض الیہ اپنی مشیئت واختیار سے عمل کرسکتا ہے، لیکن توکیل میں وکیل اپنی مرضی ومشیئت سے نہیں، بلکہ موکل کی مرضی ومشیئت کے مطابق عمل کرتا ہے، کیونکہ وکیل کا ممثل اور نائب شمار کیا جاتا ہے۔

(۳) تفویض مطلق، مجلس تفویض تک مخصوص ومقید ہوا کرتی ہے، بخلاف توکیل بالطلاق کے، کیونکہ وکالت کے مطلق ہونے کی صورت میں وکیل بالطلاق مجلس میں، نیز مجلس ختم ہونے کے بعد بھی طلاق دے سکتا ہے۔

(۴) جنون زوج: یعنی خاوند کے پاگل ہوجانے سے تفویض باطل نہیں ہوتی، کیونکہ تفویض تعلیق کے حکم میں ہوا کرتی ہے، لیکن توکیل بالطلاق خاوند کے پاگل ہوجانے کی وجہ سے باطل ہوجاتی ہے، کیونکہ جنون کی وجہ سے خاوند میں اہلیت باقی نہیں رہتی اور وکیل وموکل میں سے کسی کے اندر اہلیت ختم ہوجانے سے توکیل خود بخود باطل ہوجاتی ہے (عنایۃ بہامش فتح القدیر ۳۔۱۰۰، ردالمحتار ۲۔۶۵۳)

☆☆☆

# مشروط نکاح کی شرعی حیثیت

مولانا قاری ظفر الاسلام اعظمی

## شرط اول:

عقد نکاح کے تشکیل پانے کی شرطوں میں سے ایک اہم شرط نان ونفقہ بھی ہے جسے خداوند قدوس نے مختلف مقامات پر بیان فرمایا ہے۔

(۱) ''اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ'' (سورۂ نساء: ۳۴)

(مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بناء اللہ نے ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں کچھ فطری خصوصیات کی وجہ سے ترجیح دی ہے اور اسی بناء پر نان ونفقہ کی ذمہ داری مردوں پر ہے)

''وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ'' (سورۂ بقرہ: ۲۳۳) (بچے کے باپ کو دستور کے مطابق اپنی عورتوں کو کھانا کپڑا دینا ہوگا)۔

''عَلَي الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَي الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ'' (سورۂ بقرہ: ۲۳۶) (مالدار پر اس کی استطاعت کے مطابق اور غریب پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے)۔

حکیم بن معاویہ قشیری فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ سے پوچھا: "یا رسول الله ماحق زوجة أحدنا عليه؛ قال: أن تطعمها إذا طعمت وتكسوها إذا اكتسيت ولاتضرب الوجه" (المحلی لابن حزم ۵۰۱/۹)۔

ایک دوسری روایت جابر بن عبداللہ سے اس طرح پر ہے:

''عن جابر بن عبدالله أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال فى خطبته فى غرفة: فاتقوا الله فى النساء فإنكم أخذتموهن بأمان الله واستحللتم فروجهن بكلمة الله تعالى ولكم عليهن أن لايوطئن فرشكم أحدا تكرهونه فإن فعلن ذالك فاضربوهن غير مبرح ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف'' (المحلی ۹۔۵۱۰)

قاضی خاں لکھتے ہیں:

''فتجب على الرجل نفقة امرأته المسلمة والذمية والفقيرة والغنية دخل بها أولم يدخل'' (فتاوی قاضی خاں ۱۔۱۹۴)

نیز حضور اکرم کے ارشاد: "من استطاع منكم الباءة" میں استطاعت سے مراد استطاعت النکاح ہے (فتاوی ابن تیمیہ ۳۲۔۶)

علامہ ابن رشد قرطبی تحریر فرماتے ہیں: "فأما النفقة فاتقوا على وجوبها" (بدایۃ المجتہد ۵۸/۲)

خلاصہ کلام: نفقہ مرد پر واجب ہے بشرطیکہ نکاح صحیح ہو، نکاح فاسد میں نفقہ واجب نہیں ہوتا (دیکھئے: درمختار مع الرد ۵۷۲/۳)۔

بہر حال نفقہ مقتضاء عقد سے ہے اور عقد نکاح ہی سے یہ مفہوم ہو رہا ہے، اس لئے عورت کی یہ شرط بے کار ہے، علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: "وجهه أن ذالك الشرط وعدمه سواء. لأن ذلك هو الواجب عليه بنفس العقد سواء شرطه اولا" (رد المحتار ۵۸۶/۳)۔

## شرط ثانی

حضرت امام ابوحنیفہ نے شرائط کی دو قسمیں کی ہیں:

(۱) وہ جو مقارن للعقد ہو۔

(۲) وہ جو معلق بالشرط ہو سوائے چند صورتوں کے، دونوں کے احکام تقریبا یکساں ہیں، حضرت امام احمد بن حنبل کے نزدیک دونوں کے حکم میں کوئی فرق نہیں، خواہ یہ شرطیں صلب عقد میں لگادی گئی ہوں، یا پہلے سے زوجین کے درمیان طے پاچکی ہوں، حضرت امام مالک کے نزدیک دونوں کے احکامات میں تفصیل ہے، مگر بیشتر صورتوں کے احکام میں موافقت ہے، حضرت امام شافعی کے نزدیک اگر نکاح کو شروط پر معلق رکھا تو یہ نکاح فاسد ہوگا بعض صورتوں میں جواز کا بھی قول ہے اور شرط مقارن للعقد میں تفصیل ہے، اب ہر ایک امام کے اقوال اور ان کے احکام بالتفصیل پیش ہیں:

عقد نکاح کے وقت شرائط کے سلسلہ میں حضرت امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ وہ شرطیں اگر مقتضاء عقد سے نہ ہوں تو ایسی صورت میں شرط باطل ہوگی اور نکاح صحیح ہوگا اور اگر مقتضاء عقد سے ہو تو یہ شرط اصل عقد کے مفہوم میں داخل ہونے کی وجہ سے نافذ ہوجائے گی (فتاوی لابن تیمیہ ۳۲ / ۱۰۸)۔

حضرت امام احمد بن حنبل کا مذہب اور ان کا حکم یہ ہے:

۱۔ وہ شرائط صحیحہ جن سے نکاح صحیح ہوجاتا ہے۔

۲۔ وہ شرائط فاسدہ جن سے نکاح فاسد ہوجاتا ہے۔

۳۔ وہ شرائط جن سے تو صحیح ہوجاتا ہے مگر شرط باطل ہوجاتی ہے۔

سوال میں دی گئی شرط امام احمد بن حنبل کے مسلک کے مطابق قسم ثالث میں داخل ہے، جس کی بنیاد پر نکاح تو صحیح ہوجائے گا اور شرط باطل ہوجائے گی (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۴ / ۸۷، ۸۸)

علامہ ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں:

”ویصح النکاح مع المھر ومع نفی المھر وھو الروایۃ الثانیۃ عن أحمد اختار ھا کثیر من أصحابہ“ (فتاوی ابن تیمیہ ۳۲-۱۵۸)

یہی رائے علامہ ابن قدامہ حنبلی کی ہے (المغنی لابن قدامہ ۷ / ۴۵۰)۔

حضرت امام مالک کے نزدیک شروط فی النکاح کی چار صورتیں ہیں:

(۱) تعلیق علی الشرط، اس کا حکم یہ ہے کہ شرط کے پائے جانے کے بعد مشروط کا وجود ہوگا، اسی لئے آگے لکھتے ہیں: ”لم یضر“

(۲) ”أن یشترط شرطا مقارنا للعقد مفسدا لہ“ اس کا حکم یہ ہے کہ ان شروط فاسدہ میں سے کوئی شرط دخول سے پہلے پائی گئی تو نکاح فسخ ہوگا اور اگر بعد الدخول پائی جائے تو نکاح منعقد ہوجائے گا

(۳) ”أن یشترط شروطا لا تناقض العقد“ اس سے نکاح تو صحیح ہوجائے گا، مگر اس طرح کی شرطوں کا لگانا مکروہ ہے۔

(۴) ”شروط یجب الوفاء بھا ویکون لھما خیار فسخ العقد“ یعنی وہ شرائط جن کا پورا کرنا واجب ہے اور دونوں کو عقد فسخ کرنے کا اختیار ہے۔

حضرت امام شافعی کے نزدیک شرائط فی النکاح کی تفصیل ”الفقہ علی المذاہب الاربعہ“ (۴ / ۸۹) میں موجود ہے۔

لہذا صورت مسئولہ میں دی گئی یہ شرط شرط فاسد ہے جس کی بابت ائمہ اربعہ کی تفصیل یوں ہے: حضرت امام ابوحنیفہ اور حضرت امام احمد بن حنبل کے نزدیک شروط فاسدہ باطل ہوں گی اور نکاح صحیح ہوجائے گا (المغنی لابن قدامہ ۸ / ۲۲) اور حضرت امام مالک کے نزدیک دخول کا اعتبار ہوگا، اس لئے کہ اگر کوئی شرط دخول سے پہلے پائی گئی تو نکاح فسخ ہوجائے گا اور بعد الدخول منعقد ہوجائے گا، اور مہر ونفقہ وغیرہ دینا ہوگا (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۲ / ۸۸)۔

حضرت امام شافعی کے نزدیک شروط فاسدہ کی بعض صورتیں، یعنی نکاح مع المهر المحرم ومع نفی المهر صحیح ہیں، نان ونفقہ کی نفی کو بھی اسی میں شامل کرلیا جائے گا، جیسا کہ ابن قدامہ حنبلی کی درج شدہ عبارت سے بھی معلوم ہوگیا ہوگا، باقی صورتوں میں بھی باطل ہے، نیز امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے (فتاوی لابن تیمیہ ٢/٣/١٥٨) "فتاوی خانیہ" میں مذکور ہے: "وإذا تزوجها علی أن لا مهر لها صح النکاح ووجب لها مهر المثل وفیه خلاف لمالك" (٣/٨٢) امام مالک کی دلیل یہ ہے کہ مہر ایک شرعی حق ہے جو شوہروں پر واجب ہے، نیز عورت کی شرافت کا اظہار ہے "إبانة لشرف المحل" (ہدایہ ٢/٣٠٤)، لیکن اگر دخول وعدم دخول کی شرط لگائی جائے جیسا کہ "کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ" کی عبارت سے مالکی مذہب معلوم ہوچکا ہے تو امام مالک کے یہاں بھی بعد الدخول نکاح صحیح ہوجائے گا، اور فیہ خلاف المالک کا اطلاق ختم ہوجائے گا، اس مفہوم کی وضاحت اس عبارت سے بھی ہورہی ہے "وحکی عن مالك انه ان کان بعد الدخول ثبت النکاح وان کان قبله فسخ" (المغنی لابن قدامہ ٨/٢٢)۔

علامہ ابن حزم کی رائے ہے کہ مہر فاسد یا شرط فاسد پر کیا ہوا نکاح قابل فسخ ہے، لیکن اگر مہر فاسد یا شرط فاسد اس وقت لگائی گئی، جبکہ نکاح صحیح ہوچکا تھا تو ایسی صورت میں یہ بعد والی شرط قابل فسخ ہوگی اور نکاح صحیح ہوکر شوہر پر مہر مثل لازم ہوگا، الا یہ کہ زوجین مہر مثل سے کم یا زیادہ پر راضی ہوجائیں اور ساری شرطیں باطل ہوجائیں گی، آگے اسی صفحہ پر اس کی دلیل حضور کا ارشاد:

"کل شرط لیس فی کتاب الله فهو باطل" اور "من عمل عملا لیس علیه أمرنا فهو رد" پیش فرمائی۔

نیز علامہ شامی فرماتے ہیں:

"ما لو شرط شرطا فاسدا کما لو تزوجته علی أن لا یطأها فإنه یصح النکاح ویفسد الشرط" (رد المحتار ٣/١٣١)۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

"نکاح میں ایسی چیز کو مہر قرار دینا جو مال نہ ہو شرط فاسد ہے اور یہ نکاح کو باطل نہیں کرتی بخلاف بیع کے، کیونکہ دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ بیع میں فساد، ربا کی وجہ سے ہے اور نکاح میں ربا نہیں، اس لئے نکاح میں یہ شرط باطل ہوگی اور عقد صحیح ہوگا" (بدائع الصنائع ٢/٢٧٧)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شرط فاسد کے ساتھ کیا ہوا نکاح ائمہ اربعہ کے نزدیک صحیح ہے اور شرائط کے سلسلہ میں ائمہ کی آراء اس طرح پر ہیں: حنفیہ کے نزدیک شرط فاسد مقارن للعقد منافی مقتضاء عقد باطل ہے، حنابلہ کے نزدیک بھی یہی حکم ہے، مالکیہ کے نزدیک وہ شرط لغو ہوگی (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ٤/٨٨)، امام شافعی کے نزدیک یہ شرط صحیح ہوگی (بدائع الصنائع ٢/٢٧٧)، اس کی تائید اسی فصل کے (ص ٢٧٨) کی عبارت سے بھی ہورہی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن تیمیہ نے ائمہ کے اسی اختلاف کی طرف اپنی اس عبارت: "ثم هل یصح إذا أحضأ الشرط الفاسد بعد ذالك؟ فیه نزاع" سے اشارہ کیا ہے (فتاوی ابن تیمیہ ٢/٣/١٥٧) بہرحال مذکورہ شرط پر کیا ہوا نکاح صحیح ہے اور شرط باطل ہے، شوہر کو نفقہ دینا ہوگا، جس وقت نفقہ کا وجوب ہوجائے، کیونکہ نفقہ کا وجوب اس وقت ہوتا ہے جب عورت پر شوہر قابض ومتصرف ہوجائے (البحر الرائق ٤/٣/١٧)، نیز دیکھئے: قاضی خاں (١/١٩٤)

## شرط ثالث:

امام احمد بن حنبل کے نزدیک اس طرح کی شرطیں صحیح ہیں اور ان کا ایفاء لازم ہے، اگر شوہر نے اسے پورا نہ کیا تو عورت کو فسخ کا حق حاصل ہوگا (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ٤/٨٧)، امام مالک کے نزدیک اس طرح کی شرط مکروہ ہے، لیکن اس کا ایفاء مندوب ہے، نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ٤/٨٧، ٨٨)۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک شرط صحیح ہے اور عدم ایفاء کی صورت میں نکاح تو صحیح ہوجائے گا، مگر مہر مثل دینا ہوگا جو مہر مسمی سے متجاوز نہ ہو (ہدایہ ٢/٣٠٩) صاحب "فتح القدیر" نے "ہدایہ" کی عبارت نقل فرمانے کے بعد تحریر کیا ہے کہ پہلی صورت میں مسمی ملے گا، اس لئے کہ جس چیز کو مہر بنایا گیا تھا وہ مہر بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، چونکہ شرط کے اتمام کی وجہ سے عورت کی رضامندی ہوگئی، اس لئے عورت کو مہر کامل ملے گا اور دوسری صورت میں چونکہ اس کی موجودگی میں دوسری عورت سے شادی، نیز اس کا اخراج من البلد، یعنی دونوں شرطیں مفقود ہوگئیں، اس لئے عورت کی رضامندی نہیں ہوئی اور اسے اب مہر مثل ملے گا جو مہر مسمی سے متجاوز نہ ہو، "فتاوی تاتارخانیہ" کی عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

علامہ کاسانی امام شافعی کا مسلک بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”وعنده تصح التسمية؛ لأنه يجوز أخذ العوض عن الطلاق والقصاص وكذلك إذا تزوجها على أن لايخرجها من بلدها أوعلى أن لا يتزوج عليها“ (بدائع الصنائع ۲۔ ۲۷۸)

امام شافعی کے مسلک کے مطابق مذکورہ شرط ہی کو مہر بنایا جاسکتا ہے، ان کے مسلک میں بہ نسبت دیگر ائمہ کے توسیع زیادہ ہے، لہذا مسئولہ شرط بدرجہ اولی صحیح ہوگی، جس کا اہتمام ضروری ہوگا، علامہ ابن حزم کی رائے کے مطابق یہ شرط فاسد ہے اور نکاح قابل فسخ ہے (المحلی لابن حزم ۹/ ۴۹۱)، برخلاف اس کے علامہ ابن تیمیہ سے اس طرح کی شرطوں کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ یہ شرطیں صحیح ہیں، عورت کو عدم ایفاء کی صورت میں حق فسخ حاصل ہے جیسا کہ حنابلہ کا مسلک بھی یہی ہے (فتاوی ابن تیمیہ ۳۲/ ۱۶۴)۔

خلاصہ کلام: ان شرطوں کے لگانے سے صحت نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، ان کا ایفاء ضروری ہے، عدم ایفاء کی صورت میں حنفیہ کے نزدیک مہر مثل جو مہر مسمی سے زائد نہ ہو لازم ہوگا، حنابلہ وشافعیہ کے نزدیک حق فسخ حاصل ہوگا، نیز امام مالک کے مذہب میں ”مذاہب الاربعۃ“ میں دیے گئے مالکی مسلک کے مطابق عورت کو حق فسخ حاصل ہوگا۔

(ج) اس طرح کی صورتیں تفویض طلاق کے نام سے فقہاء کے نزدیک موسوم ہیں، سوال کردہ تینوں شرطیں صحیح ہیں، مگر پہلی اور دوسری صورت کے صحیح ومعتبر ہونے کی ایک شرط ہے جسے ”الحیلۃ الناجزۃ“ میں (ص ۴۴ تا ۴۶) پر نقل کیا گیا ہے، اس کے الفاظ بعینہ درج ذیل ہیں:

پہلی صورت کی شرط یہ ہے کہ اس میں نکاح کی طرف اضافت ونسبت موجود ہو، مثلا یہ لکھا جائے کہ اگر میں فلاں بنت فلاں کے ساتھ نکاح کروں اور پھر شرائط مندرجہ اقرار نامہ ہذا سے کسی شرط کے خلاف کروں تو مسماۃ مذکورہ کو اختیار ہوگا کہ اسی وقت یا پھر کسی وقت چاہے تو اپنے اوپر طلاق بائن واقع کرکے اس نکاح سے الگ ہوجائے، اگر اس میں اضافت الی النکاح نہ لکھی گئی تو یہ اقرار نامہ محض بے کار ہوگا اور اس کی رو سے عورت کو کسی قسم کا اختیار نہ ہوگا، جیسا کہ ”درمختار (۲/ ۲۴) پر مرقوم ہے۔

صورت ثانیہ کی صحت کی شرط یہ ہے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو، یعنی اولا خود عورت (یا اس کا ولی یا وکیل یا قاضی نکاح خواں) عقد نکاح کے وقت یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو یا مسماۃ فلاں بنت فلاں کو تیرے نکاح میں اس شرط پر دیدیا کہ اگر تم نے یہ کام کیا یا وہ کام کیا (جتنا شرطیں لگانا مقصود ہوں سب کو ذکر کردیا جائے) تو اپنے معاملہ کا اختیار میرے (یا مسماۃ موصوفہ کے) ہاتھ میں ہوگا، یعنی شرائط مذکورہ میں سے کسی ایک شرط کی خلاف ورزی پر بھی اختیار ہوگا کہ اسی وقت یا پھر کسی وقت چاہوں (چاہے) تو اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر اس نکاح سے الگ کرسکوں گی (یا کرسکے گی) اس کے جواب میں مرد ناکح یوں کہے کہ میں نے قبول کرلیا، اس پر عورت کو اختیار ہوگا کہ جب وہ اپنے اوپر شرائط کے خلاف ظلم ومصیبت کو دیکھے تو اپنے آپ کو طلاق بائن دے کر اس شوہر کے نکاح سے نکل جائے، یعنی اس طرح کہہ دے کہ میں اپنے اوپر طلاق بائن واقع کرتی ہوں، قاضی خاں تحریر فرماتے ہیں:

”وإن ابتدأت المرأة فقالت زوجت نفسي منك على أني طالق أوعلى أن يكون الأمر بيدي أطلق نفسي كلما شئت فقال الزوج قبلت جاز النكاح ويقع الطلاق وكان الأمر بيدها“ (فتاوی قاضی خاں ۱۔ ۱۵۵)، صاحب البحر الرائق کی بھی یہی رائے ہے (البحر الرائق ۳۔ ۳۱۸)

خلاصہ کلام: اس صورت کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ ایجاب عورت کی طرف سے ہو اور اگر ایجاب مرد کی جانب سے ہو اور لڑکی والے قبول کے ساتھ تفویض طلاق کی شرط لگادیں تو نکاح بلا کسی شرط کے صحیح ہوجائے گا اور شرط بالکل بے کار ہوجائے گی۔

ابتداء عورت کی جانب سے ہوگی تو یہ تفویض بعد النکاح ہوجائے گی، کیونکہ جب شوہر نے عورت کے کلام کے بعد ”قبلت“ کہا تو گویا یہ جواب متضمن ہوا اس شرط کے اعادہ کو جو سوال میں موجود ہے، پس گویا شوہر نے یوں کہا کہ میں نے قبول کیا اس شرط پر کہ تو مطلقہ ہے، یا میں نے قبول کیا اس شرط پر کہ طلاق کا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے، لہذا مفوض بعد النکاح کے قبیل سے ہوگیا۔

دوسری صورت میں جب ابتداء شوہر کی جانب سے ہوگی تو طلاق اور تفویض دونوں قبل النکاح پائی گئی جو صحیح نہیں۔

تیسری صورت، یعنی عقد نکاح کے بعد مابین طرفین کوئی شرائط نامہ تحریر کیا جائے یہ شکل بھی جائز ہے، مگر جب نکاح ہو چکا اور شرائط نامہ بعد میں تحریر کیا جارہا ہے تو اب اس شرط کا ایفاء شوہر کی رضامندی پر منحصر ہے۔

چونکہ عورتوں میں قوت تحمل کی کمی ہے، اس لئے ممکن ہے کہ طلاق کا وقوع تفویض طلاق کی صورت میں بکثرت ہو جائے، اس سے بچنے کی ایک ''تدبیر الحیلۃ الناجزۃ'' (۲۹/) پر مرقوم ہے۔

شوہر کو تفویض طلاق کے بعد اس سے رجوع کرنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ اب تو طلاق کی مالک عورت ہوگئی (درمختار ۲/۲۶)۔

جبکہ عورت کو اس کے آبائی وطن سے باہر لے جانا اور نہ لے جانا زیادہ وقلت مہر کا باعث بن سکتا ہے، جیسا کہ فقہاء کے اقوال موجود ہیں تو وقوع طلاق و عدم طلاق کی شرط پر مہر میں کمی و زیادتی کو بدرجہ اولی سبب بنایا جاسکتا ہے، اس لئے صاحبین کے مسلک پر فتوی دیا جاسکتا ہے۔

جواب (۲) نکاح صحیح ہے، ایفاء کی صورت میں مہر مسمی لازم ہوگا اور عدم ایفاء کی صورت میں مہر مثل (جو تیس ہزار سے زیادہ اور پندرہ ہزار سے کم نہ ہو) لازم ہوگا، یہی حضرت امام ابوحنیفہ کا مسلک ہے، صاحبین کے نزدیک دونوں شرطیں صحیح ہیں اور ہر دو صورت میں مہر مسمی لازم ہوگا، جیسا کہ علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں (بدائع الصنائع ۲/۲۸۵)۔

جواب (۳) یہ شرط مقتضاء عقد سے نہیں، اس لئے باطل ہوگی اور نکاح صحیح ہوگا (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۴/۸۵)، اس شرط کے ابطال کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عورتوں کی ملازمت سے جو مفاسد پیدا ہو رہے ہیں وہ کسی پر مخفی نہیں، ایسی عورتیں اپنے کو خود مختار سمجھنے لگتی ہیں، نیز شوہر کی ماتحتی سے مستثنی، اسی کے ساتھ مرد کی قوامیت پر بھی زبردست حرف آتا ہے، جیسا کہ آئے دن کا مشاہدہ ہے۔

☆☆☆

# نکاح میں شرطوں کا مسئلہ

مولانا ابوسفیان مفتاحی[1]

سوال (۱): بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا۔

شوہر کے ذمہ بیوی کا نفقہ واجب ہے، اس پر علماء کا اجماع ہے (فتح القدیر ۲ / ۱۹۳)، جب کتاب وسنت اور اجماع کی روشنی میں یہ بات ثابت ہے کہ بیوی کا نفقہ شوہر پر اس کی اپنی حیثیت کے اعتبار سے واجب ہے اور واجب ولازم کرنے والے اللہ رب العزت اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور اجماع بھی ساتھ ہے تو اب بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا، بلا وجہ ہے، جب شریعت نے خود عورت کی رعایت ملحوظ رکھی ہے اور نکاح کے صحیح ہو جانے کے بعد خود نفقہ شوہر کے ذمہ لازم ہو جاتا ہے تو اس کی یہ شرط بے معنی ہے۔

(۲) شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان ونفقہ اس کے ذمہ نہیں ہوگا۔

علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

''ولو امتنع عن الإنفاق عليها مع اليسر لم يفرق و يبيع الحاكم ماله و يصرفه في نفقتها فإن لم يجد ماله يحبسه متى ينفق عليها ولا يفسخ'' (فتح القدير ۲۔۲۰۳، البحر الرائق ۲۔۲۰۲، العيني ثم الهدايه ۲۔۳۶۶)

(اگر شوہر مالدار ہوتے ہوئے اور قدرت کے باوجود اپنی بیوی کے نفقہ سے انکار کرے تو دونوں میں تفریق نہیں کی جائے گی اور حاکم شوہر کے مال کو بیچ کر اس کی بیوی کے نفقہ میں خرچ کرے گا، اگر حاکم مال نہ پا سکے تو شوہر کو قید کر دے گا حتی کہ وہ بیوی کا نفقہ دے اور نکاح فسخ نہ ہوگا)۔

اس سے ثابت ہوا کہ شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان ونفقہ اس کے ذمہ نہیں ہوگا یہ شرط فاسد ہے، لہذا اس شرط کے لگانے سے نفقہ نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ رب العزت اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق یہ بیوی کا شوہر پر لازمی حق ہے تو شریعت کے لازم کردہ حق کے سلسلے میں بندہ کو یہ حق نہیں ہے کہ یہ کہہ دے کہ اس کے ذمہ نہیں ہوگا، بلکہ نفقہ کا معاملہ تو ایسا ہے کہ نکاح کے صحیح ہو جانے کے بعد ہی شوہر کے ذمہ واجب ہو جاتا ہے، اس سلسلہ میں فقہاء کرام نے تصریحات کے لئے دیکھئے: (عنایہ علی ہامش الفتح ۲ / ۱۹۳ ردالمحتار ۲ / ۲۴۶، الکفایہ فی ذیل الفتح ۲ / ۱۹۳)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نکاح صحیح ہو جانے کے بعد سے ہی شوہر کے ذمہ عورت کا نفقہ واجب ہو جاتا ہے، تو اب شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان ونفقہ اس کے ذمہ واجب نہیں ہوگا، شرط فاسد ہے، اس شرط کے لگانے سے عورت کا نفقہ ساقط نہیں ہوگا اور نہ ہی ہو سکتا ہے، بلکہ اس کے ذمہ واجب ولازم رہے گا، اور عقد منعقد ہو جائے گا اور منعقد ہونے کے بعد یہ شرط ساقط وغیر معتبر ہوگی اور عورت کو نان ونفقہ دینا ضروری رہے گا۔

عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا۔

اللہ رب العزت نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت دی ہے چنانچہ ارشاد ہے: "فانكحوا ما طاب لكم من النساء مثنى و ثلاث و رباع" (سورہ نساء: ۳) (پس شادی کرو ان عورتوں سے جو حلال ہوں اور تمہیں پسند ہوں دو دو، تین تین، چار چار)۔

غرض یہ ہے کہ مرد کے لئے ایک عورت سے زائد چار عورتوں تک نکاح کرنا یہ شریعت کی اجازت ورخصت ہے، اس میں مرد مختار ہے، اپنا حال بہتر جانتا ہے تو جس میں خیر ہو وہ پہلو اختیار کر سکتا ہے، لہذا ایک عورت کی موجودگی میں دوسری عورت سے نکاح کے لئے پہلی بیوی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے، اس کی

[1] شیخ الحدیث مفتاح العلوم، مئو۔

اجازت کے بغیر دوسری شادی کر سکتا ہے۔

(الف) عورت کا یہ شرط لگانا کہ اس کو اس کے آبائی وطن میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا؟

نفقہ کی طرح شوہر کے ذمہ اپنی عورت کے لئے سکنی اور مکان و گھر دینا بھی واجب ہے، اس سلسلے میں شوہر کو اختیار ہے کہ جہاں چاہے رکھے، اپنے آبائی وطن میں ہی رکھے یا سسرال یعنی عورت کے آبائی وطن میں رکھے یا ان کے سوا جہاں رکھنا مناسب سمجھے رکھ سکتا ہے، اس سلسلے میں ارشاد باری ہے: "لا تخرجوھن من بیوتھن" (سورہ طلاق:۱) (نہ نکالو ان کو ان کے گھروں سے)، اس میں لفظ "بیوتھن" میں مکانات کو ان عورتوں کے بیوت فرما کر اس طرف اشارہ کیا کہ جب تک ان کا حق سکونت مرد کے ذمہ ہے، اس گھر میں اس کا حق ہے، اس میں سکونت کو بحال رکھنا کوئی احسان نہیں بلکہ ادائے واجب ہے، بیوی کے حقوق میں سے ایک حق سکنی بھی ہے، اس آیت نے بتلا دیا کہ یہ حق صرف طلاق دے دینے سے نہیں ختم ہو جاتا، بلکہ ایام عدت تک عورت کو اسی جگہ رہنے کا حق ہے، اور ان کا گھر سے نکال دینا عدت پوری ہونے سے پہلے ظلم و حرام ہے، اسی طرح ان کے لئے خود کو ان کے گھروں سے نکل جانا بھی حرام ہے، اگرچہ شوہر اس کی اجازت دیدے، کیونکہ ایام عدت اسی مکان میں گذارنا جو من جانب اللہ معتدہ پر لازم ہے (معارف القرآن ۸ر ۱۵۲)۔

فقہاء کرام نے بھی صراحت کی ہے: "تجب ھی والکسوۃ والسکنی علی الزوج" (ہدایہ ۲ر ۲۱۷، عنایۃ ۲ر ۱۹۳، وقایہ ۲ر ۱۲۹) (روٹی، کپڑا اور مکان بیوی کے لئے شوہر کے ذمے واجب ہے اور اس کا لازمی حق ہے)، نکاح صحیح ہو جانے کے بعد شوہر کا اپنی عورت کی رخصتی کرانا شوہر کا حق ہے تو جب رخصتی کرانا شوہر کا حق ہوا تو رخصتی کرا کر جہاں مناسب سمجھے رکھ سکتا ہے۔

الدر مختار میں ہے: "و كذا تجب لها السكنى في بيت خال من أهله و أهلها" (الدر المختار مع الرد ۲ر ۶۶۲) (شوہر پر عورت کے لئے واجب ہے اس کو رکھنا ایسے گھر میں جو شوہر اور عورت دونوں کے لوگوں سے خالی ہو)، مطلب یہ ہے کہ ایسا گھر دینا واجب ہے جس میں نہ شوہر کے لوگوں کی شرکت ہو اور نہ عورت کے لوگوں کی، بلکہ وہ گھر عورت ہی کے لئے مخصوص ہو، علامہ شامی لکھتے ہیں:

"قالوا للزوج أن يسكن حيث أحب ولكن بين جيران صالحين" (رد المحتار ۲ر ۶۶۳) (مشائخ نے کہا ہے کہ شوہر کے لئے جائز ہے کہ اپنی بیوی کو جہاں چاہے رکھے، لیکن صالح پڑوسیوں کے درمیان رکھنا بہتر ہے)۔

علامہ شامی نے بات بالکل صاف کر دی کہ شوہر جہاں چاہے اپنی بیوی کو رکھ سکتا ہے، پس نکاح صحیح ہو جانے کے بعد شوہر جہاں بھی مناسب سمجھے اپنی بیوی کو رکھ سکتا ہے، لہذا عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد بیوی کو اس کے آبائی وطن میں ہی رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا، شرط فاسد ہے، لازم الایفاء نہیں ہے، اس شرط کے پورا نہ کرنے سے عقد نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

(ا) عقد نکاح کے وقت عورت کا یہ شرط لگانا کہ اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، یا فلاں فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، اور شوہر اس شرط کو تسلیم کرتا ہے۔

عقد نکاح سے پہلے یہ شرائط طے کی گئی ہوں اور اس تحریر پر طرفین کے دستخط ہو جائیں تو شرعاً وہ شرط درست ہے، اس کی وجہ سے عورت کو طلاق کا اختیار ہوگا "نكحها على أن أمرها بيدها صح" (دیکھئے: درمختار ۲ر ۲۸۵) (مرد نے کسی عورت سے نکاح کیا اس عورت کی طرف سے اس شرط پر کہ طلاق واقع کرنے کا حق اس کے قبضہ میں رہے گا درست ہے)۔

اس کی شرح میں علامہ شامی لکھتے ہیں: "مقيد بما إذا ابتدأت المرأة فقالت زوجت نفسي منك على أن أمري بيدي أطلق نفسي كلما أريد أو على أني طالق، فقال الزوج: قبلت" (۲ر ۲۸۵)۔

(مسئلہ اس قید کے ساتھ مقید ہے کہ عورت ابتداً کہے کہ میں نے اپنی شادی آپ سے کرا دی اس شرط پر کہ مجھ کو طلاق واقع کرنے کا حق میرے قبضہ میں ہوگا، میں جب چاہوں گی اپنے کو طلاق دے دوں گی، یا اس شرط پر کہ میں مطلقہ ہو جاؤں گی اور شوہر نے اس عورت کی شرط کو منظور اور قبول کر لیا تو نکاح صحیح ہے اور اس کی وجہ سے عورت کو طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا)۔

خلاصہ یہ ہے کہ عقد کے وقت عورت کا شرط لگانا کہ اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا اور اس تحریر پر طرفین کے دستخط ہو جائیں تو شرعاً درست ہے۔

## تفویض میں کچھ قیدیں بڑھانا:

چونکہ فطرتاً عورت ناقص العقل ہے اور صحیح رائے قائم کرنے سے قاصر ہے، بنابریں تفویض طلاق کے نتیجے میں مصالح شرع کے ضائع ہونے کا خطرہ غالب ہے، خصوصاً موجودہ دور میں وہ خطرہ مزید بڑھ جاتا ہے لہذا ان حالات کے پیش نظر اس تفویض مطلق کے ساتھ مزید احتیاط کے لئے کچھ قیدیں بڑھائی جاسکتی ہیں، مثلاً شوہر ظالم ہو یا نان ونفقہ بلا وجہ ادا نہیں کرتا، نہ کپڑے کا نظم کرتا ہے، نہ مکان وگھر کا، جو شوہر پر فرض ہے اور عورت قاضی کے دربار میں دعوی کرے، قاضی دونوں کو طلب کرے اگر عورت کا دعوی ثابت ہوجائے تو اس عورت کو حق تفویض اختیار کرنے کی اجازت دے دے گا۔

لیکن یہ قیدیں مفید مقصد ہوں اور بے جا تصرف کا سد باب کرنے والی ہوں، ورنہ پھر عورتیں شتر بے مہار کی طرح آزاد ہوکر اور حاکم مطلق ہوکر کبھی بھی یہ کسی شوہر کو خاطر میں نہیں لاسکتیں، اور ان قیدوں کا اضافہ سیلۂ اور سدباب کے لئے ہونا چاہئے۔

طلاق اصلاً حلال ہوتے ہوئے اللہ کے نزدیک مبغوض و ناپسندیدہ ہے، جیسا کہ سیدنا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: "أبغض الحلال إلى الله الطلاق" (رواہ ابوداؤد)، لیکن چونکہ اصلاً حلال ہے بنابریں شریعت نے ناگزیر حالات میں اس کے استعمال کی اجازت مرحمت فرمائی ہے، چنانچہ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ہے: "یایها النبی إذا طلقتم النساء فطلقوهن لعدتهن" (سورۂ طلاق:۱) (اے نبی علیہ السلام! لوگوں سے کہہ دیجئے کہ جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کو ان کی عدت پر طلاق دو)۔

لیکن طلاق کے بے جا استعمال سے معاشرہ میں بڑی خرابیاں پیدا ہورہی ہیں یہاں تک کہ بعد میں شرمندگی آنے پر سوائے حلالہ کے کوئی صورت نظر نہیں آتی، تو نفس کے واسطے راہ حق سے ہٹ کر زناکاری میں مبتلا ہونے کو بخوشی گوارہ کرلیتا ہے اور ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دیتا ہے، یہ ایک شئی جائز کے بے جا استعمال کی نحوست کا نتیجہ ہے، جس کا مشاہدہ ہمارے معاشرے میں بکثرت ہے۔

بنابریں ایک مجلس میں تین طلاق دینا جو غیر مشروع ہے اور حرام ہے، گو تینوں طلاق باجماع امت واقع ہوجائے گی، اس فعل حرام کا بکثرت اقدام ہورہا ہے، لہٰذا طلاق کے غلط استعمال کو سیلۂ فتنہ کا دروازہ بند کرنے کے لئے اگر عقد نکاح کے وقت اس طرح مہر طے کی جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کا مہر بیس ہزار روپئے اور اگر طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار روپئے ہوگا، اس طرح مہر طے کرنا جائز ہوگا اور دونوں صورتوں میں مہر متعین ادا کرنا لازم ہوگا۔

اور اس غلط اقدام کی کثرت کو روکنے کے لئے صاحبین کے قول کو فتوی کے لئے اختیار کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ اگر کسی نے اس شرط پر نکاح کیا کہ اگر عورت بدصورت ہوگی تو مہر ایک ہزار اور اگر خوبصورت ہوگی تو دو ہزار ہوگا، یہ دونوں شرطیں بہ اتفاق ائمہ ثلاثہ صحیح ہیں اور ان دونوں صورتوں میں متعین مہر بہ اعتبار شرط شوہر کے ذمہ لازم ہوگا، "درمختار" میں ہے:

"لو تزوجها على ألف إن كانت قبيحة و على ألفين إن كانت جميلة فإنه يصح الشرطان اتفاقا في الأصح" (الدر المختار ۲۔ ۳۴۶)

لیکن یہ یاد رہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینا بیک زبان گو حرام ہے، مگر تینوں طلاق واقع ہوجائیں گی اور عورت حرام ہوجائے گی۔

سوال (۲) نکاح کرتے وقت اس طرح مہر طے کرنا کہ اگر شوہر نے پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری سے نکاح کرے گا تو اس عورت کا مہر تیس ہزار ہوگا، ورنہ پندرہ ہزار، تو ایسی صورت میں اگر شوہر شرط پوری کرے، یعنی دوسری شادی نہ کرے تو مہر پندرہ ہزار دینا لازم ہوگا اور اگر شرط پوری نہ کی یعنی دوسری سے شادی کرے تو تیس ہزار مہر دینے کی شرط معتبر ولازم العمل نہ ہوگی بلکہ ایسی صورت میں مہر مثل دینا لازم ہوگا۔

سوال (۳) عورت کی ملازمت اور شوہر کا اس کو اس سے منع کرنا:

عورت کے نکاح کے وقت اپنے ہونے والے شوہر سے یہ شرط لگانا کہ شوہر انہیں لگی ہوئی ملازمت سے نہیں روکے گا یا اگر آئندہ انہیں کوئی مناسب ملازمت ملے تو شوہر انہیں کرنے سے نہیں روکے گا اور اس شرط کو عقد کے وقت شوہر قبول کرتا ہے، چونکہ شرعاً روٹی، کپڑا اور مکان دینے کی ذمہ داری شوہر کے ذمہ لازم ہے، اس ذمہ داری کی ادائیگی سے نہ تو سبکدوش ہوسکتا ہے اور نہ انکار کرسکتا ہے، اگر شوہر محتاج وغریب ہے تب قاضی عورت سے کہے گا کہ شوہر کے نام پر قرض لو اور اس قرض کے ادا کرنے کی ذمہ داری شوہر کے سر ہوگی، اور اگر بالفرض یہ صورت بھی ممکن نہ ہو تو قاضی بین الزوجین تفریق کرسکتا ہے اور دوسرے مرد سے

اس کی شادی کرا سکتا ہے اور یہ صورت ناممکن ہے کہ کوئی مرد قادر علی النفقہ مل ہی نہیں سکتا، لہذا عدم قدرت کا مطلقاً وہم نہ ہونا چاہئے۔

جب صورت یہ ہے تو شوہر عورت کو ملازمت سے روک سکتا ہے، عورت کا یہ شرط لگانا فاسد ہے اور شوہر کے لئے عقد نکاح کے وقت شرط کو قبول کرنے کے باوجود بھی منع کرنے کا حق ہے، اس کے لئے اس شرط کی پابندی ضروری نہیں، عورت کے لئے شوہر کے اس حکم کی تعمیل ضروری ہوگی، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''عن البحر أن له منعها من الغزل وكل عمل ولو قابلة ومغسلة ...وانت خبير بأنه إذا كان له منعها من ذالك عصته وخرجت بلا إذنه كانت ناشزة مادامت خارجة وإن لم يمنعها لم تكن ناشزة'' (رد المحتار ۲۔ ۶۴۷)

(شوہر کے لئے جائز ہے کہ بیوی کو دھاگا بٹنے سے اور ہر کام سے روک دے اگر دایہ گیری اور میت کو غسل دینے کا کام کرتی ہو تو اس سے بھی روک سکتا ہے، اس کے بعد علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ جب شوہر کے لئے اپنی بیوی کو ان سب چیزوں سے روک دینا جائز ہے تو اگر شوہر کے روکنے کے باوجود شوہر کی نافرمانی کرے اور بغیر شوہر کی اجازت کے نکل کر چلی جائے تو وہ عورت ناشزہ و نافرمان ہوگی جب تک باہر ہے اور اگر شوہر نے روکا نہیں ہے تو ناشزہ نہ ہوگی۔)

اگر منع کرنے سے مانتی نہیں تو ناشزہ ہو کر شوہر کے ذمہ سے اس کا نفقہ ساقط ہو جائے گا۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''بلکہ شوہر کے لئے جائز ہے کہ اپنی بیوی کو ان تمام کاموں سے منع کر دے جو کمائی کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں، کیونکہ بیوی کمائی کرنے سے بے نیاز ہے، کیونکہ شوہر پر بیوی کی کفالت واجب و لازم ہے۔

نیز شوہر کے لئے جائز ہے کہ اپنی بیوی کو روک دے ہر ایسے کام کرنے سے جس سے شوہر کے حق کا کم کرنا (مثلاً خدمت، جماع اور اس کے دواعی واسباب) یا شوہر کو ضرر (مثلاً شوہر پر غلبہ شہوت اتنا شدید ہو کہ عورت سے جماع نہ کرنے میں زنا میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ) یا عورت کا شوہر کے گھر سے نکلنا لازم آتا ہے (رد المحتار ۲/ ۶۶۵ اور اس کے بعد کے صفحات)۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: اور وہ کام یا عمل جس میں شوہر کا کچھ بھی ضرر نقصان نہیں ہے تو شوہر کا اپنی بیوی کو ایسے کام سے روکنا بلا وجہ ہے، خصوصاً شوہر گھر پر نہ ہو، سفر میں گیا ہوا ہو (مراد اس طرح کے کام سے مثلاً گھریلو کام کاج جیسے گھر میں سلائی مشین یا پاور لوم ہو تو کپڑوں کی سلائی کرنا اور لوم چلانا وغیرہ)، کیونکہ عورت کو اس کے گھر میں بلا کام کے چھوڑے رکھنا نفس اور شیطان کے وسوسے کی دعوت دینا ہے کہ بے کار بیٹھی ہوئی نفسانی اور شیطانی خیالات کے سمندر میں غوطہ لگاتی رہے گی جس سے اس کی صحت متاثر ہوگی، اور بے کار بیٹھک اور کام سے کاہل ہو جائے گی، یا اجنبیوں اور پڑوسیوں کے ساتھ لایعنی اور واہیات قصہ کہانیوں میں مشغول ہو کر اپنے کو بالکل معطل کر دے گی، جیسا کہ یہی مشاہدہ ہے، لہذا عورت خود سے اندرون خانہ کام کاج کرتی ہے تو کرنے دینا چاہئے، چھڑانا نہیں چاہئے کہ اس میں اس کے لئے ضرر ہے۔

☆☆☆

# مقتضائے عقد کے منافی شرائط

مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی [1]

## شرط صحیح کی تعریف

شرط صحیح جمہور علماء وفقہاء کے نزدیک وہ شرط ہے جو مقتضاء عقد کا جزء ہو مثلاً ایسے مکان کی شرط لگائی جائے جو میاں بیوی دونوں کے لائق ہو، یا مقتضاء عقد کے لئے موکد ہو جیسے مہر کے لئے کفیل کی شرط لگادی جائے کہ مہر کی ادائیگی کی ذمہ داری مثلاً لڑکے کے والد لے لیں، یا فلاں شخص اس کا ذمہ دار بن جائے، یا اس کی ادائیگی کے وجوب پر کوئی دلیل یعنی کوئی نص یا عرف موجود ہو، مثلاً عورت یہ شرط لگادے کہ مہر کا کچھ جزو شوہر فوراً ادا کرے، یہ سب شرط صحیح ہیں (احوال الشخصیہ ر۱۵۹)۔

## شرط فاسد کی تعریف

شروط صحیحہ کے خلاف جو شرط ہے وہ شرط فاسد ہے، یعنی ایسی شرط جو نہ تو مقتضیات عقد میں سے ہے، نہ مقتضاء عقد کے لئے موکد ہے اور نہ ہی اس کی ادائیگی کے وجوب پر کوئی دلیل قائم ہے وہ شرط فاسد ہے، جمہور فقہاء اور علماء کے نزدیک شرط فاسد کی یہی تعریف کی گئی ہے۔

علامہ ابن الہمام شرح فتح القدیر میں شرط فاسد کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"هو اشتراط ما ليس مقتضى العقد" (یعنی ایسی چیز کی شرط لگانا جو عقد کا مقتضاء نہ ہو شرط فاسد ہے) (شرح فتح القدیر، فصل فی المحرمات ۳ر۲۵۰)

اسی طرح کوئی ایسی شرط لگانا جو مقتضیات عقد کے خلاف ہو شرط فاسد ہے، مثلاً یہ شرط لگادی جائے کہ کسی کو بھی ایک دوسرے سے انتفاع کا حق نہیں ہوگا، یا ان دونوں کے درمیان وراثت جاری نہیں ہوگی، یا بیوی کا مہر واجب نہیں ہوگا، یا بیوی شوہر کو مکان دے یا کچھ روپے دے، یا نکاح کسی متعین مدت کے لئے ہو، اس طرح کی شرطیں مقتضیات عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے فاسد ہیں، صاحب ھدایہ نے جہاں پر نکاح موقت کا حکم بیان کرتے ہوئے امام زفر کا قول صحت نکاح کا نقل کیا ہے، وہیں پر صاحب "عنایہ" نے امام زفر کے قول کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"لأن التوقيت شرط فاسد لكونه مخالفا لمقتضى عقد النكاح والنكاح لا يبطل بالشروط الفاسدة" (عنایہ علی ھامش الھدایہ ۳۔۲۴۹)

## شرط فاسد کا حکم اور صحت نکاح پر اس کا اثر

تقریباً سبھی کتب فقہ معتبرہ اور متداولہ میں یہ صراحت موجود ہے کہ نکاح شرط فاسد سے باطل نہیں ہوتا ہے، اگر نکاح شرط فاسد کے ساتھ کیا گیا تو شرط کا اعتبار نہیں ہوگا، البتہ اگر نکاح کو کسی شرط پر معلق کیا تو نکاح منعقد نہیں ہوگا، مثلاً کسی شخص نے ایجاب کے بعد یہ کہا کہ میں نے قبول کیا اگر میرے والد چاہیں یا میرا لڑکا آجائے تو اس صورت میں نکاح ہی صحیح نہیں ہوگا (دیکھئے: الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۲ر۲۹۵)۔

## کس طرح کی شرط پورا کرنا ضروری ہے اور کس طرح کی نہیں؟

جو شرطیں عقد نکاح میں لگائی جاتی ہیں ان کی کیا حیثیت ہے؟ اور صحت نکاح پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے؟ ان کو پورا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اس پر بہت ہی اچھی بحث علامہ ابن قدامہ حنبلی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "المغنی" میں کی ہے، انہوں نے تمام شرطوں کو تین قسموں میں تقسیم کرتے ہوئے ہر ایک کا حکم علیحدہ علیحدہ

[1] ☆ صدر مفتی امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

بیان کیا ہے، ان تینوں قسموں اوران کے احکام کو مختصراً ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ بعض وہ شرائط جو خود بھی باطل ہیں اور ان سے نکاح بھی باطل ہوجاتا ہے، مثلاً نکاح میں وقت کی تعیین وتحدید کی شرط یعنی بوقت نکاح ایجاب یا قبول میں یہ شرط لگادی جائے کہ اتنے مہینے یا اتنے سال کے لئے نکاح ہورہا ہے جیسا کہ نکاح متعہ یا نکاح موقت میں ہوتا ہے یا نکاح کو کسی شرط پر معلق کیا، مثلاً یہ کہا کہ میں نے تم سے نکاح کیا اگر میری ماں راضی ہوجائے، یا فلاں شخص راضی ہوجائے، یا نکاح میں خیار کی شرط لگادی جائے، خواہ دونوں کے لئے یہ شرط ہو یا ان میں سے کسی ایک کے لئے یہ سب شرطیں خود بھی باطل ہیں اور ان سے نکاح بھی باطل ہوجاتا ہے، "فهذه شروط باطلة في نفسها ويبطل بها النكاح"۔

۲۔ بعض وہ شرطیں ہیں جو مقتضیات عقد نکاح کے خلاف ہیں مثلاً شوہر نے یہ شرط لگادی کہ بیوی کا مہر اس پر نہیں ہوگا، یا اس کا نفقہ نہیں دے گا یا اگر مہر دیدیا ہے تو اس کی واپسی کی شرط لگادی، یا یہ شرط لگادی کہ دوسری بیویوں کی باری سے کم یا زیادہ اس کو دے گا، یا یہ شرط لگادی کہ شوہر اس سے وطی نہیں کرے گا، یا وہ عزل کرے گا، یہ اور اس طرح کی دیگر شرطیں شرعاً باطل ہیں، اس طرح کی شرطوں کے باطل ہونے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں: ایک تو یہ ہے کہ یہ مقتضیات عقد کے خلاف ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ عقد سے واجب ہونے والے حقوق عقد کے منعقد ہونے سے قبل ہی ساقط ہو جارہے ہیں۔

البتہ ان شرطوں کی وجہ سے نکاح باطل نہیں ہوگا بلکہ صحیح ومنعقد ہوگا، اس لئے کہ شرائط صحت نکاح میں سے نکاح کا شروط فاسدہ سے خالی ہونا نہیں ہے، بلکہ یہ امر زائد ہے جس کی وجہ سے نکاح کی صحت پر اثر نہیں پڑے گا۔

۳۔ بعض وہ شرطیں ہیں جو نہ مقتضیات عقد نکاح میں سے ہیں اور نہ ہی مقتضیات عقد کے خلاف ہیں، نہ مقتضیات عقد کے لئے موکد ہیں اور نہ ہی ان کے جواز پر کوئی دلیل قائم ہے، البتہ ان کا فائدہ عورت کو پہنچتا ہے جو غیر مشروط نکاح کی شکل میں نہیں پہنچتا، مثلاً عورت یہ شرط لگائے کہ شوہر اس کو اس کے گھر یا اس کے شہر سے باہر نہیں لے جائے گا یا اس کو سفر میں نہیں لے جائے گا، یا اس کی زوجیت میں رہتے ہوئے دوسری عورت سے نکاح نہیں کرے گا، یہ اور اس طرح کی شرطوں کو پورا کرنا امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور بعض صحابہ، تابعین کے نزدیک اس طرح کی شرطیں فاسد ہیں ان کا اعتبار نہیں ہے۔

علامہ ابن قدامہ نے دونوں طرف کے دلائل بھی پیش کئے ہیں اور دلائل پر نقد وجرح بھی کیا ہے، پوری تفصیل کے لئے دیکھئے (المغنی لابن قدامہ ۶؍ ۵۴۸ تا ۵۵۱)۔

پہلی دونوں صورتوں میں تو اتفاق ہے، پہلی صورت میں بالاتفاق شرط بھی باطل اور نکاح بھی باطل، اور دوسری صورت میں نکاح صحیح اور شرط باطل، البتہ تیسری صورت میں اختلاف ہے، امام احمد بن حنبل اس شرط کے صحیح بلکہ اس کی ادائیگی کے وجوب کے قائل ہیں، اور امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی بلکہ جمہور اس کو فاسد قرار دیتے ہیں، دلائل تو دونوں جانب ہیں اور کتابوں میں ہر ایک کے دلائل پر نقد وجرح بھی موجود ہے جس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے، جمہور کی رائے دلائل کی روشنی میں اصول عام کے تحت راجح معلوم ہوتی ہے اور عموماً عمل بھی جمہور ہی کے قول کے مطابق ہے اور اس پر عمل بھی آسان ہے، اس لئے کہ اگر بیوی نے بوقت نکاح یہ شرط لگادی کہ شوہر سفر پر نہیں لے جاسکتا ہے اور شوہر لکھنو یا بمبئی یا سعودیہ عربیہ میں ملازمت کرتا ہے، سال دو سال پر گھر آتا ہے، شرط کے مطابق بیوی کو اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا ہے، تو پھر دونوں کی ازدواجی زندگی خوشگوار کیسے رہ سکتی ہے؟ اور مقاصد نکاح کیسے پورے ہوسکتے ہیں؟

استاذ محمد مصطفی شلبی نے "احکام الاسرۃ فی الاسلام" میں امام صاحب کے مذہب کو راجح قرار دیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ مصر میں بھی اسی مذہب پر عمل جاری ہے (۱۵۵)۔

امام محمد ابوزہرہ نے بھی "الاحوال الشخصیہ" میں امام صاحب کے قول کو راجح قرار دیا ہے (دیکھئے: الاحوال الشخصیہ ؍ ۱۶۱، ۱۶۲)۔

کس طرح کی شرط کو پورا کرنا واجب ہے اور کس طرح کی شرط باطل ہے، اس کا پورا کرنا واجب نہیں ہے، اس سلسلہ میں دکتور وہبہ الزحیلی نے "الفقہ الاسلامی وادلتہ" میں مذاہب کی تفصیل بیان کی ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ؍ ۵۴)۔

اس مختصر سی تمہیدی بحث کے بعد اب اصل سوالات کے جوابات دیئے جارہے ہیں، نکاح میں شرطیں لگائی جاتی ہیں ان کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں، ان تینوں کے علیحدہ علیحدہ احکام درج کئے جاتے ہیں:

## نفس عقد نکاح سے واجب ہونے والی ذمہ داری کو شرط کی صورت میں ذکر کرنے کا حکم

### پہلی صورت:

ان شرائط کی ہے جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی نت نئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے بلکہ خود عقد نکاح سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو شرط کی صورت میں بوقت عقد نکاح ذکر کردیا گیا، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا، یا اس کے ساتھ حسن معاشرت یا مہر کی شرط لگانا، تو چونکہ خود نفس عقد نکاح ہی سے یہ چیزیں واجب ہیں شرط لگانے سے ان کو وجوب نہیں ہوا، بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ شرط لگا کر ان حقوق کو مزید موکد کردیا، اس لئے ان شرائط کا پورا کرنا شرعاً واجب ہے، اس طرح کی شرطیں، شروط صحیحہ کے ذیل میں آتی ہیں (دیکھئے: احکام الاسرۃ فی الاسلام ۱۰۴ تا ۱۵۵)۔

### مقتضاء عقد نکاح کے خلاف لگائی گئی شرط کا حکم:

دوسری صورت یہ ہے کہ نکاح کے وقت کوئی فریق ایسی شرط لگادے جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، مثلاً شوہر کا یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں ہوگا، یا وہ بیوی کے ساتھ حسن معاشرت نہیں کرے گا، یا دونوں یہ شرط لگادیں کہ دونوں میں سے جس کا بھی انتقال پہلے ہو جائے دوسرا اس کے ترکہ کا وارث نہیں ہوگا، یا شوہر اس کے ساتھ وطی نہیں کرے گا یہ اور اس طرح کی جو شرطیں لگائی جائیں ان کا حکم یہ ہے کہ چونکہ یہ مقتضاء عقد کے خلاف ہیں، نیز ان کے ذریعہ عقد نکاح سے واجب ہونے والے حقوق عقد کے منعقد ہونے سے قبل ہی ساقط ہو جارہے ہیں، اس لئے اس طرح کی شرطیں شرعاً باطل ہیں، ان پر عمل صحیح نہیں ہے، جیسا کہ علامہ ابن قدامہ نے المغنی (۶/ ۵۵۰) میں لکھا ہے:

البتہ نکاح صحیح ہوگا، ان شروط کی وجہ سے نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۲/ ۲۹۵، نیز دیکھئے: عنایہ ۳/ ۳۵۹، احکام الاسرۃ فی الاسلام/ ۱۵۵ وغیرہ)۔

### نئی ذمہ داری سے متعلق لگائی گئی شرط کا حکم

تیسری صورت یہ ہے کہ نکاح کے وقت کوئی فریق ایسی شرط عائد کرے جو نمبر (۱) اور (۲) کے دائرہ میں نہیں آتی ہے، یعنی نہ تو مقتضاء عقد کے موافق ہے اور نہ ہی اس کے مخالف، بلکہ اس کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہیں ہوتا، اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی یا ذمہ داری حاصل ہوتی ہے، جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہیں ہوتی، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا، یا بیوی کو اسکے آبائی وطن میں ہی رکھے گا، یا عورت یہ شرط لگادے کہ مہر کی ادائیگی کے لئے شوہر کے والدین یا اس کے فلاں رشتہ دار کفیل بن جائیں، یا اس کا یہ شرط لگانا کہ مہر کا اتنا حصہ فوراً ادا کرنا ہوگا، یہ اور اس طرح کی شرطیں جو (۱) اور (۲) کے ذیل میں نہیں آتی ہیں، ان کا حکم یہ ہے کہ امام احمد بن حنبل کے قول کے مطابق اس طرح کی تمام شرطیں جائز ہیں اور ان کا پورا کرنا واجب ہے، البتہ ایسی شرط لگانا جس کی ممانعت صراحۃً کتاب وسنت میں موجود ہے صحیح نہیں ہے، جمہور علماء وفقہاء خصوصاً حنفیہ کے نزدیک ان میں سے وہ شرطیں جائز اور ان کا پورا کرنا واجب ہے، جو مقتضاء عقد کے لئے موکد ہیں، مثلاً مہر یا نفقہ کی ادائیگی کے لئے موکد ہے، یا عرفاً ثابت ہو، جیسے مہر کے کسی حصہ کو بطور مہر معجل ادا کرنے کی شرط، یہ سب شرط صحیح کی تعریف میں داخل ہیں (دیکھئے: احکام الاسرۃ فی الاسلام/ ۱۵۵)۔

البتہ وہ شرطیں جن سے حلال کو حرام یا حرام کو حلال قرار دینا، یا کسی امر مشروع سے ممانعت لازم آئے، یا جن سے متعلق کتاب وسنت میں کوئی صراحت موجود نہ ہو وہ صحیح نہیں ہیں، اور ان کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ بعض صورتوں میں پورا کرنا جائز نہیں ہے۔

ایک عورت کی زوجیت میں رہتے ہوئے دوسری عورت سے نکاح کرنا شرعاً جائز ہے، اسی طرح عورت کو اس کے گھر سے نکال کر دوسری جگہ لے جانا یا سفر میں اپنے ساتھ لے جانا بھی جائز ومشروع ہے، عورت کا یہ شرط لگانا کہ شوہر اسکی زوجیت میں رہتے ہوئے دوسری عورت سے نکاح نہیں کرے گا یا اس کو اس کے آبائی وطن سے باہر نہیں لے جائے گا، یہ امر مشروع سے روکنا ہے لہٰذا یہ شرط فاسد ہے، اس کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے، شوہر اس کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے (دیکھئے: عنایہ علی ہامش فتح القدیر ۳/ ۳۵۰ باب المہر)۔

امام احمد بن حنبل کے نزدیک اس طرح کی شرط صحیح ودرست ہے اور اس کا پورا کرنا شوہر پر ضروری ہے، البتہ جمہور کا قول راجح اور عمل کے اعتبار سے سہل ہے

## تفویض طلاق

اس ضمن میں یہ بحث آتی ہے کہ عقد نکاح کے وقت اگر عورت یہ شرط لگائے کہ اسے اپنے او پر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، یا فلاں فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا اور شوہر اس شرط کو تسلیم کرتا ہے تو اس شرط کی شرعا کیا حیثیت ہے؟ کیا اس کی وجہ سے عورت کو طلاق کا اختیار ہوگا؟ اور کیا شوہر اپنے اس حق طلاق کو تفویض کرنے کے بعد اس کو ختم کرنا چاہے تو کرسکتا ہے یا نہیں؟ کیا شوہر کو شرعا اس کا اختیار ہوگا؟

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ طلاق دینے کا اختیار شرعا شوہر کو ہے نہ کہ عورت کو اور صاحب حق کو یہ اختیار ہے کہ اپنے حق کا استعمال خود کرے یا کسی کو نائب یا وکیل بنا کر اس کے ذریعہ کرائے، یا کسی کو اپنا حق سپرد کر دے اور وہ اس کو استعمال میں لائے، شوہر کو بھی شرعا یہ اختیار ہے کہ حق طلاق کو خود استعمال کرے یا کسی کو اپنا نائب و وکیل بنادے اور اس کو طلاق دینے کا اختیار دیدے، نائب و وکیل کو اختیار ملنے کے بعد طلاق دیدنے کا حق ہے اور ان کی طرف سے اختیار کے مطابق دی گئی طلاق بھی واقع ہوگی، اسی طرح شوہر اگر اپنا حق طلاق بیوی کو تفویض کر دے خواہ اپنی طرف سے از خود تفویض کرے، یا بیوی کے شرط لگانے پر اس کو قبول کر کے تفویض صحیح ہوگی اور بیوی کو طلاق دینے کا اختیار ہوگا، اور حق طلاق تفویض کرنے کے بعد شوہر کو اس سے رجوع کا اختیار نہیں ہوگا اگر شوہر اس کو ختم کرنا چاہے تو بھی ختم نہیں کرسکتا، جیسا کہ (''المبسوط للسرخسی'' ۳/۲۲۱ طبع دار الفکر) میں ہے۔

علامہ کاسانی نے ''بدائع الصنائع'' میں اس سلسلہ میں اچھی بحث کی ہے، علامہ کاسانی لکھتے ہیں کہ شوہر جب حق طلاق تفویض کر دیتا ہے تو شوہر کی طرف سے تفویض لازم ہو جاتی ہے، اس کو حق سے رجوع، عورت کو منع کرنے یا اس کو ختم کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا ہے، اس کی وجہ یہ بیان کی ہے:

(الف) جس طرح کوئی شخص کسی کو اپنی کسی چیز کا مالک بنادے تو وہ شخص مالک ہو جاتا ہے اور اصل مالک کو رجوع کا اختیار باقی نہیں رہتا، اسی طرح جب شوہر نے اپنے حق طلاق کا مالک بیوی کو بنادیا تو بیوی طلاق کی مالکہ ہوگئی شوہر کو رجوع یا اس کو ختم کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔

(ب) طلاق کے وجود کے بعد رجعت ممکن نہیں، اسی طرح جب تفویض طلاق کے ذریعہ شوہر نے طلاق کا اختیار بیوی کو دیدیا تو اب اس سے رجوع اور اس کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے۔

(ج) تفویض طلاق میں درحقیقت طلاق کو عورت کی مشیت پر معلق کرنا ہے جو تعلیق طلاق کے مفہوم میں ہے، اور طلاق کو کسی چیز پر معلق کرنے کے بعد اپنے کلام سے رجوع اور تعلیق کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ تعلیق طلاق یمین کے معنی میں ہے اور یمین میں رجوع نہیں ہوسکتا ہے (دیکھئے: بدائع الصنائع ۲/ ۱۸۲۲)

## طلاق دینے کی صورت میں مہر کی زیادتی کی شرط

نکاح میں شرائط کے ذیل میں ایک مسئلہ یہ آتا ہے کہ اگر بوقت نکاح مہر اس طرح طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کا مہر بیس ہزار اور اگر اس نے طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار ہوگا، یا اس طرح طے پائے کہ اگر طلاق نہ دی تو دس ہزار اور اگر طلاق دی تو بیس ہزار اور تین طلاق دی تو مہر تیس ہزار ہوگا۔

تو کیا اس طرح مہر طے کرنا جائز اور معتبر ہوگا اور دونوں شکلوں میں مہر مسمی لازم ہوگا؟

اس مسئلہ میں میرا خیال یہ ہے کہ اس طرح مہر طے کرنا جائز اور معتبر ہوگا اور دونوں شکلوں میں مہر مسمی لازم ہوگا، اس لئے کہ:

۱۔ طلاق ایک ناپسندیدہ عمل ہے جس کی اجازت ناگزیر حالات میں ہے، مختلف مراحل (اس کی تفصیل کتاب وسنت میں بھی موجود ہے) سے گذرنے کے بعد بھی نباہ کی کوئی صورت نہ ہو تو ایک طلاق دینے کی اجازت ہے، اور وہ بھی اس طہر میں جس میں ہم بستری نہ کی ہو ہمارے اس زمانہ میں چونکہ لڑکوں کی شادی آسانی وسہولت سے ہو جاتی ہے، لڑکیاں آسانی سے مل جاتی ہیں، لیکن لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بڑا کٹھن اور دشوار گزار ہوتا ہے، جہیز کی لعنت نے مسئلہ کو بہت ہی سنگین بنادیا ہے ان حالات میں شوہر پر کوئی ایسی پابندی جس کے نتیجہ میں وہ طلاق دینے سے گریز کرے، فقہ سے قریب اور مقاصد شرع سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ نیز کتب فقہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر کی مشروعیت کا مقصد بھی طلاق کے بیجا استعمال سے بچنا ہے، یعنی شریعت نے مہر کو اس لئے مشروع کیا

ہے تاکہ شوہر تھوڑی سی بات پر طلاق نہ دیدے، اگر مہر واجب نہ ہو تو شوہر تھوڑی سی ناراضگی کی صورت میں بھی رشتہ کو ختم کردے گا علامہ کاسانی بدائع الصنائع میں اس کی مشروعیت کی حکمت پر بحث کی ہے۔(دیکھئے: بدائع الصنائع ۲؍۲۲۴)

جب مہر کی مشروعیت کا مقصد طلاق کے بیجا استعمال سے بچنا ہے تو بوقت نکاح یہ شرط لگانا کہ طلاق دینے کی صورت میں شوہر پر مہر بیس ہزار اور طلاق نہ دینے کی صورت میں دس ہزار ہوگا شرعا درست ہونا چاہئے۔

۳۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے فقہ کے اس مشہور جزئیہ سے بھی مدد لی جاسکتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر بوقت نکاح مہر اس طرح طے پایا کہ اگر شوہر بیوی کو اس کے آبائی وطن سے باہر لے گیا تو مہر دو ہزار اور اگر باہر نہیں لے گیا تو مہر ایک ہزار ہوگا، اس مسئلہ میں امام صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اگر شوہر نے شرط پوری کردی تو مہر ایک ہزار ہوگا اور اگر شرط پوری نہ کی تو مہر مثل لازم ہوگا، امام زفر فرماتے ہیں کہ دونوں شرطیں فاسد ہیں اور دونوں صورتوں میں مہر مثل لازم ہوگا جو ایک ہزار سے کم اور دو ہزار سے زائد نہ ہو، اور امام ابو یوسف اور امام محمد فرماتے ہیں کہ دونوں شرطیں صحیح و درست ہیں، دونوں صورتوں میں مہر مسمی لازم ہوگا۔(دیکھئے: ہدایہ علی ھامش فتح القدیر ۳؍۳۵۹، ۳۵۱ باب المہر)

اس مسئلہ میں اصول افتاء کی رو سے اگر صاحبین کے قول پر فتوی دیا جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ حالات اور ضرورت کے پیش نظر صاحبین کے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے اور صاحبین کے قول پر عمل کرنا امام صاحب ہی کے قول پر سمجھا جائے گا کتنے مسائل ہیں جن میں صاحبین نے حالات وضرورت اور اپنے زمانہ کے عرف وعادت کی بنیاد پر امام صاحب کے قول کے خلاف فتوی دیا ہے، اور متاخرین فقہاء نے صاحبین کے قول کو راجح اور مفتی بہ قرار دیا ہے، انہیں مسائل میں سے مساقات ومزارعت، دلالی کی اجرت اور حمام میں اجرت پر غسل کر جائز ہونا ہے۔

اس زمانہ میں، جبکہ تین طلاق کی کثرت ہے، شراب اور تاڑی کے نشہ میں طلاق دینا عام ہے، طلاق کے بعد عورت مظلوم بن کر در در کی ٹھوکریں کھاتی رہتی ہے اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی بے سہارا ہوجاتے ہیں، ان حالات میں تین طلاق کے انسداد کے لئے اگر صاحبین کے قول کو اختیار کرتے ہوئے مذکورہ دونوں شرطوں کو جائز اور واجب العمل قرار دیا جائے تو یہ جائز اور مقاصد شرع کے موافق ہوگا۔

## دوسری عورت سے نکاح کی صورت میں زیادتی مہر کی شرط

البتہ اگر بوقت نکاح اس طرح مہر طے پائے کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس عورت کا مہر تیس ہزار ہوگا، اور اگر دوسری عورت نے نکاح نہیں کیا تو مہر پندرہ ہزار ہوگا، اس طرح کی شرط میرے خیال میں درست نہیں ہے اور شرط کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے، اگر اس طرح مہر طے پایا تو شرط پوری کرنے کی صورت میں مہر مسمی اور شرط پوری نہ کرنے کی صورت میں مہر مثل لازم آئے گا، جو پندرہ ہزار سے کم اور تیس ہزار سے زائد نہ ہو، اس لئے کہ اس طرح کی شرط مقتضاء عقد کے خلاف ہے، اور درحقیقت امر مشروع سے روکنا ہے جو شرط فاسد ہے اور اس سے قبل بیان کیا جاچکا ہے کہ شرط فاسد باطل ہوجاتی ہے، البتہ نکاح صحیح ہوتا ہے، نیز نہ تو مہر کی مشروعیت کا مقصد نکاح ثانی سے روکنا ہے اور نہ ہی اس مسئلہ میں صاحبین کے قول پر عمل کی ضرورت ہے، اس لئے کہ ہندوستان کے عرف میں دوسری شادی کرنا ہی معیوب ہے، اس شرط کو جائز قرار دے کر اس کی شناعت وقباحت میں مزید اضافہ کردینا ہے۔

## ملازمت سے روکنے کی شرط

شوہر کو بیوی پر یہ حق ہے کہ اس کے گھر میں رہے اور گھر کے نظم کو سنبھالے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے یہ صراحت کردی ہے کہ اپنی بیوی کو ہر اس عمل سے روک سکتا ہے جس کے کرنے سے شوہر کے حقوق کی تنقیص ہورہی ہو یا اس کو ضرر و نقصان پہنچ رہا ہو یا اس عمل کے لئے شوہر کے گھر سے نکلنا پڑے (دیکھئے: رد المحتار باب النفقات ۲؍۶۶۵)۔

شوہر کے گھر سے نکلنے اور ملازمت سے نہ روکنے کی شرط مقتضاء عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے شرط فاسد ہے، لہذا بوقت نکاح اس طرح کی شرط لگانے اور شوہر کے قبول کرنے کے بعد بھی شوہر اپنی بیوی کو ملازمت سے روک سکتا ہے، بلکہ اگر ملازمت کے لئے گھر سے باہر جانے میں بے پردگی ہوتی ہو، غیر محرم سے بلاحجاب بات کرنی پڑتی ہو، شریعت کا قانون ٹوٹ رہا ہو تو شوہر پر ضروری ہے کہ اس طرح کی ملازمت سے بیوی کو روکے۔

خاص طور سے اس زمانہ میں ملازمت کی اجازت دینے میں فتنہ کا اندیشہ زیادہ ہے، اس کے لئے بے حجاب جانا اور غیر محرم سے بے حجاب پوری آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنا عام ہے۔

صاحب ''مبسوط'' نے ''المبسوط للسرخسی'' میں عورتوں کے نقصانات کو بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ عورتیں کمانے سے عاجز ہیں، اس لئے ان کا نفقہ شوہر یا والد یا دیگر رشتہ داروں پر ہے، عورتوں کو کمانے کی اجازت دینے کے سلسلے میں انہوں نے بہت ہی سخت بات لکھی ہے:

''عجز ظاهر عن الاكتساب وفي أمرها بالاكتساب فتنة فإن المراة إذا أمرت بالاكتساب اكتسبت بفرجها''

(المبسوط للسرخسی ۵۔۱۸۵)

البتہ اگر پردہ کا سخت نظم ہو، پردہ کے ساتھ جائیں اور پردہ کے ساتھ پڑھائیں، بالغ لڑکوں کو نہ پڑھانا ہو یا ایسا کام نہ ہو جس میں غیر محرم سے بے حجاب بات کرنی پڑتی ہو تو اس صورت میں شوہر اگر چاہے تو ملازمت کی اجازت دے سکتا ہے۔

☆☆☆

# نکاح میں مفید شرطیں لگانے کا حکم

مولانا شمس پیرزادہ

نکاح زوجین کے درمیان ایک پختہ عہد ہے، جس کو قرآن نے میثاق غلیظ سے تعبیر کیا ہے۔

"وأخذن منكم ميثاقا غليظا" (سورہ نساء: ۲۱) (اور وہ (بیویاں) تم سے ایک پختہ عہد لے چکی ہے)۔

یہ عہد نہایت اہم ہے، کیونکہ اس کے ساتھ حقوق اور ذمہ داریاں وابستہ ہیں، اسی طرح شارع نے نکاح میں عظیم مصلحتوں کو پیش نظر رکھا ہے، مثلاً یہ مصلحت کہ زوجین کے درمیان مودت کے تعلقات ہوں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جبکہ ایک فریق دوسرے فریق کا استحصال نہ کرے یعنی اس پر ناجائز دباؤ نہ ڈالے اور اس سے جبراً کوئی بات نہ منوائے۔

شریعت نے مرد کو اختیارات دیئے ہیں تا کہ وہ اپنی ذمہ داریاں بحسن وخوبی ادا کرے اور گھر کا نظم قائم رکھے، اگر وہ ان اختیارات کو آمرانہ (Arbiterary) طریقہ پر استعمال کرتا ہے تو یہ شریعت کے منشاء کے بالکل خلاف ہے، آمرانہ طریقہ پر استعمال کرنے سے مراد من مانے طریقہ پر استعمال کرنا ہے اور یہ عورت کے حق میں بڑی زیادتی ہے، اگر مرد ان اختیارات کو معروف طریقہ پر اپنی صوابدید کے مطابق استعمال کرے تو ازدواجی زندگی میں تلخیاں پیدا نہیں ہوں گی، اور اگر ہو جائیں تو ان کی ذمہ دار عورت ہی قرار پائے گی۔

مہر کو لازم قرار دیا گیا ہے تا کہ ازدواجی تعلقات کا آغاز مرد کی طرف سے خلوص ومحبت کے ہدیہ کے ساتھ ہو، نیز معاہدہ نکاح کی تقویت کا باعث بنے۔

ایک سے زائد نکاح کی اجازت اخلاقی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے لئے دی گئی ہے، اور اس لئے بھی دی گئی ہے تا کہ ہنگامی طور پر جو معاشرتی مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان کو حل کرنے میں معاون ہو، لیکن یہ اجازت عدل کی شرط کے ساتھ مشروط ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں اصل حکم یک زوجگی ہی کا ہے۔

شریعت نے مرد کو طلاق کا اختیار دے کر عورت کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی ہے، بلکہ ازدواجی زندگی کو جذباتی فیصلوں سے بچانے کا ممکن حد تک سامان کیا ہے اور مرد کی زیادتی کی صورت میں عورت کے لئے خلاصی کی راہ بھی رکھی ہے۔

اسلام نے ازدواجی مسائل کے حل کے لئے پُر پیچ طریقہ اختیار کرنے سے گریز کیا ہے اور گھر کے مسائل کو گھر ہی میں حل کرنے کے لئے مناسب طریقے رائج کئے ہیں اور ضروری ہدایات دی ہیں۔

نکاح کے ان مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان شرائط پر گفتگو کرنا ہے، جن سے نکاح کو مشروط کر دیا گیا ہو، یہ شرائط تین قسم کی ہو سکتی ہیں:

(۱) ایسی شرائط جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی نئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ خود عقد نکاح سے جو ذمہ داری کسی فریق پر عائد ہوتی ہو، اس کو شرط کی صورت میں عقد کے وقت ذکر کر دیا جائے، مثلاً بیوی کی طرف سے یہ شرط کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا، ایسی شرط تحصیل حاصل ہے اور اس کا نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، جو ذمہ داری شریعت نے مرد پر عائد کی ہے، اس کو پورا کرنے کا بہر حال وہ پابند ہے۔

(۲) نکاح کے وقت کسی فریق کا ایسی کوئی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے عائد ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو مثلاً شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط عائد کرنا کہ بیوی کا نان ونفقہ اس کے ذمہ نہیں ہوگا، شرعاً ایسی شرط باطل ہے مگر نکاح منعقد ہو جاتا ہے اور اس کا کوئی اثر عقد نکاح پر مرتب نہیں ہوتا ہے، حدیث میں آتا ہے:

''نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن تشترط المراة طلاق أختها'' (بخاری کتاب الشروط) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اس بات سے کہ کوئی عورت اپنی بہن کی طلاق کی شرط رکھے)۔

اجنبی عورت اس شرط پر نکاح نہ کرے کہ شوہر اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دے، کنیز کے آزاد کر دینے والے کو جو حق ولاء حاصل ہوتا ہے، اس کے خلاف

جب ایک معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

''الولاء لمن أعتق وإن اشترطوا مائة شرط'' (بخاری کتاب الشروط)۔
(حق ولاء اس کا ہے جس نے کنیز کو آزاد کیا، خواہ اس کا مالک سو شرطیں لگائے)۔

اس سے یہ اصولی بات واضح ہوتی ہے کہ معاملات کے دو فریقوں کے درمیان شریعت نے جس کے جو حقوق مقرر کئے ہیں اگر ان میں سے کسی حق کے خلاف ایک فریق شرط عائد کرتا ہے تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، لہٰذا نکاح کے معاملہ میں بھی اگر ایک فریق ایسی شرط عائد کرتا ہے، جو دوسرے فریق کے اس حق پر اثر انداز ہوتی ہے تو وہ کالعدم ہی سمجھی جائے گی اور نکاح منعقد ہو جائے گا۔

(۳) نکاح کے وقت کسی فریق کا کوئی ایسی شرط عائد کرنا جو (۱) اور (۲) میں سے کسی کے دائرہ میں نہیں آتی اور جس کے نتیجے میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہیں ہوتا اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی یا ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہ ہوتی، مثلاً عورت کا یہ شرط عائد کرنا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا، یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا، اس مسئلہ پر سلف کے درمیان اختلاف ہے، ''مغنی'' میں ہے:

''نکاح کی شرطوں کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ جس کو پورا کرنا لازم ہے، اور وہ ہے ایسی شرط جو منفعت اور فائدہ کی موجب ہو، مثلاً یہ شرط کہ شوہر بیوی کو اپنے گھر یا اپنے شہر سے باہر نہیں لے جائے گا، یا اس کو ساتھ لے کر سفر نہیں کرے گا، یا اس کی موجودگی میں دوسری بیوی سے نکاح نہیں کرے گا، اور نہ لونڈی رکھے گا، ایسی شرط کا پورا کرنا لازم ہے اگر اسے پورا نہ کرے تو عورت کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہے، یہ قول حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص، معاویہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، اور شریح، عمر بن عبدالعزیز، جابر بن زید، طاؤس، اوزاعی اور اسحاق کا بھی یہی قول ہے، البتہ زہری، قتادہ، ہشام ابن عروہ، مالک، لیث، ثوری، شافعی، ابن المنذر اور اصحاب الرائے نے اسے باطل قرار دیا ہے، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس صورت میں عقد ہو جاتا ہے لیکن مہر فاسد قرار پاتا ہے اور عورت کے لئے مہر مثل لازم آتا ہے، ان حضرات کا استدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہے کہ ہر وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہیں ہے وہ باطل ہے، اگرچہ ایسی شرطیں سو ہوں، اور یہ شرط کتاب الٰہی میں نہیں ہے، کیونکہ شریعت اس کی متقاضی نہیں ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے: ''مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں الا یہ کہ کوئی شرط ایسی ہو جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دیتی ہو''، اور یہ شرط حلال کو حرام ٹھہراتی ہے، یعنی دوسری بیوی، لونڈی اور سفر کی حلت کو حرمت میں بدل دیتی ہے، اور اس لئے بھی کہ ایسی شرط عائد کرنے میں نہ عقد کی مصلحت ہے اور نہ اس کا تقاضا ہے اور نہ ہی وہ مروجہ اور نافذ العمل طور طریقوں پر مبنی ہے، اس لئے ایسی شرط فاسد ہے اور یہ ایسا ہی ہے، جیسے عورت یہ شرط لگائے کہ وہ اپنے کو شوہر کے حوالہ نہیں کرے گی''۔
(المغنی ۶/۵۴۸)

جو علماء ایسی شرائط کے جواز کے قائل ہیں، ان کا سب سے بڑا استدلال اس حدیث سے ہے جس میں فرمایا گیا ہے: ''أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج'' (بخاری کتاب الشروط) (وہ شرائط پورے کئے جانے کی سب سے زیادہ مستحق ہیں جن کے ذریعہ تم نے عورتوں کو اپنے لئے حلال کرلیا ہے)۔

لیکن حدیث کے الفاظ: ''ما استحللتم به الفروج'' (جن کے ذریعہ تم نے فروج کو حلال کرلیا ہے) اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ شروط سے مراد شریعت کی عائد کردہ وہ شرطیں ہیں جن کو قبول کر کے وہ نکاح کے بندھن میں بندھ جاتا ہے، مثلاً مہر، نفقہ، حقوق کی ادائیگی، حسن معاشرت وغیرہ، ''فتح الباری'' میں ہے:

''خطابی کہتے ہیں کہ نکاح کی شرطیں مختلف ہیں، بعض وہ ہیں جن کو پورا کرنے پر سب کا اتفاق ہے اور وہ ہیں اللہ کے دئے ہوئے احکام، مثلاً معروف طریقہ پر عورت کو رکھنا یا خوبصورتی کے ساتھ اسے رخصت کرنا اور بعض حضرات نے اس حدیث کو اسی پر محمول کیا ہے'' (فتح الباری ۹/۱۷۹)۔

حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری'' میں ایک حدیث نقل کی ہے جو عورت کی اس شرط کو کہ وہ اس مرد کے بعد دوسرا نکاح نہیں کرے گی، ناجائز قرار دیتی ہے، لکھتے ہیں:

''طبرانی نے ''الصغیر'' میں ایک حدیث نقل کی ہے، جس کی اسناد حسن، حضرت جابر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ام مبشر بنت براء بن معرور کو نکاح کا پیغام دیا تو اس نے کہا: میری شرط اپنے شوہر کے لئے یہ ہے کہ میں اس کے بعد نکاح نہیں کروں گی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: درست نہیں ہے'' (فتح

الباری ۹/۱۷۹)۔

اسی پر اس شرط کو قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جو دوسرے نکاح کے بارے میں عورت کی طرف سے مرد پر عائد کی جائے۔

حافظ ابن حجر نے امام شافعی کے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ایسی شرط جو نکاح کے مقتضی (مقصد) کے منافی ہو، مثلاً یہ کہ اس کے لئے شب باشی کی باری مقرر نہیں کرے گا، یا یہ کہ اس کی موجودگی میں لونڈی نہیں رکھے گا، یا اس کا نفقہ ادا نہیں کرے گا تو اس قسم کی شرطوں کو پورا کرنا واجب نہیں ہے" (فتح الباری ۹/۱۷۹)۔

اس لئے ایسی شرطیں جو نکاح کے مقتضی کے خلاف ہوں اور جن سے شریعت کے عطا کردہ حقوق متاثر ہوتے ہوں، ان کو نہ جائز کہا جاسکتا ہے اور نہ ان کو پورا کرنا واجب قرار پاتا ہے، البتہ بعض ایسی شرطیں ہوسکتی ہیں جو نکاح کے مقتضی کے خلاف بھی نہ ہوں اور جن کا مقصد کسی فریق کو تکلیف اور پریشانی میں مبتلا ہونے سے بچانا یا اس کے لئے اطمینان بخش زندگی گذارنے کا سامان کرنا ہے، مثلاً عورت کی طرف سے یہ شرط کہ مرد ملک سے باہر ملازمت کے لئے نہیں جائے گا، یا عورت کے لئے علیحدہ فلیٹ کا انتظام کرے گا، یا اس کے لئے خادمہ رکھے گا تو ان شرطوں کو پورا کرنا اتفاقاً ضروری ہے، اگر نہیں کرے گا تو عہد کی خلاف ورزی کا گناہ لازم آئے گا اور عورت کو اختیار ہوگا کہ وہ مرد سے طلاق کا مطالبہ کرے اور اسے پورا نہ کرنے کی صورت میں عدالت سے نکاح فسخ کرالے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد ہے:

"مقاطع الحقوق عند الشروط" (البخاری ۹/۱۷۸) (شروط کی پابندی حقوق کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے)۔

## تفویض طلاق:

تفویض طلاق کی تشریح ڈاکٹر تنزیل الرحمن نے "مجموعہ قوانین اسلام" میں اس طرح کی ہے:

"تفویض طلاق (Delegation of the power of divorce) کے معنی ہیں: طلاق دینے کا اختیار اپنی زوجہ کے سپرد کرنا، چنانچہ عورت کا مرد سے نکاح کے وقت یہ شرط طے کرنا کہ وہ طلاق کی مختار ہے، شرعاً صحیح ہے، اسی طرح شوہر کا اپنی زوجہ کو قیام نکاح کے دوران حق طلاق تفویض کرنا بھی جائز ہے، ملک شام کے عائلی قانون کے تحت بھی شوہر کا یہ اختیار تسلیم کیا گیا ہے۔

اگر زوجہ نے بوقت نکاح شوہر سے حق طلاق حاصل کرلیا ہو یا وہ نکاح کے بعد اس حق کی مالک بن گئی ہو تو وہ اس حق کو استعمال کرکے خود کو طلاق دے کر رشتہ زوجیت قطع کرسکتی ہے اور اس طلاق کا اسی طرح اعتبار کیا جائے گا جیسے کہ شوہر نے زوجہ کو وہ طلاق خود دی ہو۔

تفویض طلاق کے بعد شوہر زوجہ کے اس حق کو فسخ نہیں کرسکتا، کیونکہ تفویض کے بعد زوجہ اس اختیار کی بنفسہ مالک ہوجاتی، خواہ اس حق کو استعمال کرے یا نہ کرے اور جب چاہے کرے، البتہ اگر تفویض طلاق معین مدت کے لئے ہو اور وہ مدت گزر جائے تو عورت کا حق باطل اور بے اثر ہوجائے گا۔

لیکن شوہر کے اپنی زوجہ کو حق طلاق تفویض کرنے کی صورت میں خود اس کا حق طلاق ساقط نہیں ہوگا، چنانچہ اگر شوہر نے اپنی زوجہ کو حق طلاق تفویض کردیا اور پھر خود اس کو طلاق بائن دے دی تو عورت کا اختیار باطل اور غیر نافذ ہوجائے گا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تفویض سے ملکیت کیونکر پیدا ہوئی؟ اور اگر ملکیت عورت کو حاصل ہوگئی تو پھر مرد کا حق طلاق کیونکر باقی رہا؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ تفویض طلاق دراصل خیار طلاق ہے اور خیار دینا ایک فعل کے کرنے یا نہ کرنے کا مالک بنانا ہوتا ہے، کیونکہ مخیر (جس کو اختیار دیا گیا) اس فعل میں اپنی رائے سے تصرف کرتا ہے، لہذا اگر شوہر اپنی زوجہ کو خیار طلاق تفویض کرتا ہے تو گویا وہ اپنی زوجہ کو یہ اختیار دیتا ہے کہ خود کو طلاق دے کر اس مرد کے رشتہ زوجیت سے علیحدہ کرسکتی ہے، اور ایسی صورت میں ظاہر کہ عورت مالکہ ہوکر (متصرف) ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ مرد کی اس ملکیت میں عورت بھی تصرف کرسکتی ہے جو اس مرد کے علاوہ ہے نہ کہ بجائے (مجموعہ قوانین اسلام مطبوعہ پاکستان ۲/ ۲۹۲، ۲۹۳)۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے بھی اس مسئلہ کی وضاحت کی گئی ہے۔

"الحیلۃ الناجزۃ" (مؤلفہ مولانا اشرف علی تھانوی ودیگر علماء) میں تفویض طلاق کو فقہ حنفی کی روشنی میں جائز قرار دیا گیا ہے اور کابین نامہ کے لئے نمونہ بھی

پیش کردیا گیا ہے۔

## ضروری اقتباسات

''اس قسم کا'' کابین نامہ'' لکھوانا (جس میں طلاق کا اختیار عورت کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہو) اور بوقت ضرورت اس سے کام لینا شرعاً جائز ہے اور اس اختیار دینے کو تفویض طلاق کہتے ہیں، اس کی تینوں صورتیں جائز ہیں، چاہے نکاح سے پیشتر لکھوالیا جائے، چاہے عین وقت عقد میں زبان سے کہلوالیا جائے، چاہے بعد میں لکھوایا جائے'' (الحیلۃ الناجزۃ ۳۰، ۳۱)۔

حضرت تھانویؒ نے یہ وضاحت بھی کردی ہے:

''شوہر کو تفویض طلاق کے بعد اس تفویض سے رجوع کرنے کا حق نہیں رہتا، بلکہ تفویض طلاق کے بعد عورت طلاق کی مالک ہوجاتی ہے'' (الحیلۃ الناجزہ ۳۷)۔

اور'' ہدایہ'' میں ہے:

''اگر شوہر نے بیوی سے کہا، جب چاہو اپنے کو طلاق دے دو تو اس کو اختیار ہے کہ اس مجلس میں یا اس کے بعد اپنے کو طلاق دیدے'' (ہدایہ ۱۹۶)۔

علماء اور فقہاء کی یہ تصریحات تفویض طلاق کو جائز قرار دیتی ہیں، لیکن تحقیقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کی کوئی قوی دلیل ہمیں نہیں ملتی، درحقیقت قرآن وسنت میں اس کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے اور جس آیت سے اس کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے، اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی، بنائے استدلال آیت تخییر ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

''یاایها النبی قل لازواجك إن كنتن تردن الحیوة الدنیا وزینتها فتعالین أمتعكن وأسرحكن سراحا جمیلاً'' (سورہ احزاب ۲۸)۔

(اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو، اگر تم دنیا کی زندگی، اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ متاع (دنیوی) دے دلا کر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کردوں)۔

فقہاء نے اس تخییر کو تفویض طلاق پر محمول کیا ہے، یعنی اس صورت میں عورت کو یہ اختیار حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے اوپر طلاق نافذ کرلے، جبکہ اس آیت میں اس کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے، آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ اپنی ازواج سے معلوم کرلیں کہ وہ دنیا کی زیب وزینت چاہتی ہیں یا اللہ اور اس کے رسول کو، اگر دنیا کی زیب وزینت چاہتی ہیں تو خوبصورتی کے ساتھ ان کو رخصت کردیا جائے، یعنی ان کی یہ مرضی معلوم ہونے کے بعد آپ انہیں طلاق دے دیں، اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ اگر آپ کی ازواج دنیا کی زینت چاہتیں تو طلاق خود بخود واقع ہوجاتی، آیت میں طلاق کا کوئی لفظ استعمال نہیں ہوا ہے اور اس کے یہ الفاظ'' اسرحکن سراحا جمیلا'' میں خوبصورتی کے ساتھ رخصت کردوں'' صاف بتارہے ہیں کہ آپ کے جدا کرنے سے وہ جدا ہوجائیں، لہٰذا اس تخییر (اختیار) کو تفویض طلاق پر محمول کرنا صحیح نہیں۔

چنانچہ ابن حجر'' فتح الباری'' میں لکھتے ہیں:

''لیکن آیت تخییر کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ محض تخییر سے طلاق کا اختیار حاصل نہیں ہوتا بلکہ شوہر کے طلاق دینے ہی سے طلاق واقع ہوسکتی ہے، کیونکہ آیت میں فرمایا گیا ہے، آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر رخصت کردوں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ازواج کے اس فیصلہ کے بعد (کہ وہ دنیا کی زینت کو ترجیح دیتی ہیں) انہیں رخصت کردیا جائے، اور الفاظ کی دلالت مفہوم کی دلالت پر مقدم ہے'' (فتح الباری ۹ / ۳۰۳)۔

لہٰذا تفویض طلاق کا جواز آیت تخییر سے ثابت نہیں ہوتا،

قرآن نے طلاق کا اختیار مرد ہی کو دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

''الذی بیده عقدة النكاح'' (سورہ بقرۃ ۲۳۷) (مرد جس کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے)۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نکاح کی گرہ کھولنا، یعنی طلاق کو جائز قرار دیا گیا ہے، وہاں اس اس اندیشہ کا اظہار بھی کیا گیا ہے:

"چونکہ عورت ناقص العقل ہے، اس لئے طلاق کو مطلقاً اس کے ہاتھ میں دے دینا خطرہ سے خالی نہیں" (الحیلۃ الناجزۃ ۳۲)۔

اور اس خطرہ سے بچنے کی صورت یہ پیش کی گئی ہے کہ کابین نامہ میں دس اشخاص کے نام پیش کئے جائیں جن میں کم از کم دو آدمی تسلیم کرلیں کہ عورت کو مرد کی طرف سے شدید تکلیف پہنچ رہی ہے، اگر دو آدمی عورت کی بات صحیح تسلیم کرلیں اور تین آدمی اس کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کریں تو کیا صورت ہوگی، یہ دو آدمی صرف عورت کی بات سنیں گے یا مرد کی بھی، اگر صرف عورت کی بات سنیں گے تو یہ ایک طرفہ فیصلہ ہوگا اور اگر مرد کی بھی سنیں گے تو متضاد بیانات کی صورت میں گواہ وغیرہ کی ضرورت ہوگی، مطلب یہ ہے کہ پھر یہ مسئلہ دار القضاء کا بن جاتا ہے، اور اس صورت میں یہ شرط بے معنیٰ ہو کر رہ جاتی ہے۔

علاوہ ازیں، ہماری نگاہ اس پہلو پر بھی ہونی چاہئے کہ موجودہ دور میں جو مسلمان اسلام کے عائلی قوانین سے مطمئن نہیں ہیں اور ان میں ترمیم کے درپے ہیں یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ نکاح کے موقع پر ایک "کابین نامہ" تیار کیا جائے جس میں مرد عورت کو یہ پیشگی اختیار دے کہ فلاں اور فلاں صورت میں عورت خود اپنے اوپر طلاق واقع کرسکتی ہے، تفویض طلاق کے اس حیلہ کو اختیار کر کے وہ مرد و زن میں مساوات کا اصول قائم کرنا چاہتے ہیں، اس لئے اس کی ہرگز تائید نہیں کی جاسکتی۔

نکاح کا موقع مرد اور عورت کے درمیان خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کا ہوتا ہے اور تعلقات اسی صورت میں خوشگوار ہو سکتے ہیں، جبکہ باہمی اعتماد کی فضا ہو، ایسے موقع پر ناچاقی اور طلاق کا تصور ہی مرد اور عورت دونوں کی نفسیات پر برا اثر ڈالنے والا ہے اور جب عورت کی طرف سے شرائط کی بات آئے گی تو مرد بھی اپنی شرطیں پیش کرے گا، اس طرح دونوں کے ذہن پر اس کے خراب اثرات پڑیں گے، دراصل کابین نامہ کا تصور ہی باہمی اعتماد کو ٹھیس پہنچاتا ہے اور ان مصالح سے کسی طرح مناسبت نہیں رکھتا جو نکاح میں ملحوظ رکھے گئے ہیں۔

اگر متقدمین نے تفویض طلاق کی اجازت دی تھی تو اس کی حیثیت ایک فقہی جزئیہ کی تھی، جس سے اس وقت کے حالات میں کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا تھا، لیکن اس کو ایک کلیہ کی شکل دے کر موجودہ حالات میں اس کی عام اجازت دینا، کسی طرح صحیح نہیں، اسلام میں عزل کی اجازت ایک جزئیہ کی حیثیت سے موجود ہے، تو کیا اس کو ایک کلیہ کی شکل دے کر برتھ کنٹرول اور فیملی پلاننگ جیسے منصوبے بنانے اور لوگوں کو اس کی ترغیب دینے کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟ اگر نہیں تو تفویض طلاق کے بارے میں بھی ایک فقہی جزئیہ کو کلیہ کی شکل دینے اور کابین نامہ میں اسے درج کرانے کی ترغیب لوگوں کو نہیں دی جاسکتی۔

## طلاق کی صورت میں مہر میں زیادتی کی شرط:

اگر عقد نکاح کے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کا مہر بیس ہزار اور اس نے طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار ہے تو اس طرح مہر طے کرنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ طریقہ اس معروف طریقے کے خلاف ہے جو قرآن وسنت سے ثابت ہے، اور جس پر صحابہ کرام عمل پیرا رہے ہیں، یہ گویا جرمانہ کی صورت ہے اور جرمانہ اس صورت میں تو صریح ظلم ہوگا، جبکہ مرد نے عورت کی زیادتیوں سے تنگ آکر اسے طلاق دی ہو، رہا ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا غیر مشروع اقدام تو جب یہ اقدام غیر مشروع ہے تو بیک وقت تین طلاقوں کا واقع ہونا بھی غیر مشروع ہے، لہذا اس تکلف کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی جو مذکورہ صورت میں بیان کی گئی ہے۔

امام بخاری نے "کتاب الشرائط" میں باب باندھا ہے "الشروط في المهر عند عقد النكاح" (نکاح کے وقت مہر میں شرطیں رکھنا) لیکن ان شرطوں سے مراد معروف شرطیں ہیں، مثلاً یہ کہ مہر کس شکل میں ادا کیا جائے گا اور کب، نہ یہ کہ مہر میں کسی شرط کی بنا پر کمی بیشی کی جائے گی۔

قرآن نے عورتوں کا مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔

"واتوا النساء صدقاتهن نحلة" (سورۂ نساء: ۴) (عورتوں کو ان کے مہر خوشدلی سے عطیہ کے طور پر دو)۔

اور مہر میں جرمانہ کی صورت میں خوش دلی کے ساتھ عطیہ کے طور پر اسے دینے کی صورت برقرار نہیں رہتی، اس لئے مہر کی زیادتی کی شرط صحیح نہیں۔

حنفی مسلک میں بھی امام زفر نے ان دونوں شرطوں کو فاسد کہا ہے جس میں عورت کا مہر اس کی سکونت کو برقرار رکھنے کی صورت میں ایک ہزار اور باہر لے جانے کی صورت میں دو ہزار طے کردیا گیا ہو (ہدایہ ۱/ ۱۶۳)۔

ہماری سوسائٹی میں طلاق کا جو بے جا استعمال ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا تو صحیح نہ ہوگا، جس سے نفس طلاق پر قدغن عائد ہوتی

ہو یا طلاق کو قطع نظر اس بات کے کہ ضروری تھی یا نہیں، جرم قرار دے کر شوہر پر جرمانہ عائد کرتی ہو، البتہ اگر عدالت یا دار القضاء عورت کے بیان سے مطمئن ہو کہ شوہر نے اس کو ناحق طلاق دی ہے تو اس پر مطلقہ کے لئے مکان مہیا کرنے یا ایک مدت تک مزید نفقہ ادا کرنے کی ذمہ داری ڈالی جاسکتی ہے، کیونکہ موجودہ حالات میں کوئی مناسب تدبیر اختیار کرنا ضروری ہوگیا ہے، اس سلسلہ میں سوریہ (شام) کے قانون ازدواج سے مدد لی جاسکتی ہے جس میں طلاق تعسف کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے:

"دفعہ (۱۱۷)...... اگر مرد بیوی کو طلاق دے اور قاضی پر واضح ہو جائے کہ شوہر نے کسی معقول وجہ کے بغیر طلاق دی ہے جس میں وہ زیادتی کا مرتکب ہوا ہے اور جس کی وجہ سے بیوی کو تنگی اور فاقہ سے دوچار ہونا پڑے گا تو قاضی کے لئے جائز ہوگا کہ وہ حالت اور جس درجہ کی زیادتی ہوئی، اس کی مناسبت سے عورت کو معاوضہ دینے کا شوہر کو حکم دے جو اس حیثیت کی عورتوں کے ایک سال کے نفقہ سے زیادہ نہ ہو علاوہ عدت کے نفقہ کے، اور قاضی کو اختیار ہے کہ وہ حسب تقاضاء حال اس معاوضہ کو یک مشت یا ماہانہ ادا کرنے کا حکم دے" (قانون الأحوال الشخصیہ فی الجمہوریۃ السوریہ ر ۳۲، اس موضوع پر بین الاقوامی قانون جاننے کے لئے دیکھئے: الاحوال الشخصیہ للدکتور احمد الغندور ر ۳۵۴، ۳۵۷)۔

## دوسری عورت سے نکاح کی صورت میں مہر میں اضافہ:

اگر نکاح کرتے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس عورت کا مہر تیس ہزار ہوگا اور اگر اس کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس عورت کا مہر پندرہ ہزار ہوگا، تو ایسی صورت میں شریعت کے نزدیک دونوں شرطیں معتبر اور لازم العمل ہوں گی یا نہیں؟

دونوں شرطیں شرعاً نہ معتبر ہوں گی اور نہ واجب العمل، کیونکہ دوسرا نکاح کرنا ہر حال میں جرم نہیں ہے کہ شوہر اس کا جرمانہ لازماً ادا کرے، قرآن نے دوسری بیوی کرنے کی مشروط اجازت دی ہے اور اگر اس شرط کو پورا کرتا ہے تو وہ اپنی پہلی بیوی کو جرمانہ کیوں ادا کرے؟ مہر میں اس قسم کی شرطوں سے وہ مصالح فوت ہو جاتے ہیں جو سوال (۱) کے جواب میں اوپر بیان کئے گئے۔

## عورت کو ملازمت سے نہ روکنے کی شرط:

عورت اگر نکاح کے وقت یہ شرط پیش کرتی ہے کہ شوہر اسے لگی ہوئی ملازمت سے نہیں روکے گا یا اگر آئندہ اسے کوئی مناسب ملازمت ملے تو اسے اس ملازمت سے نہیں روکے گا اور اس شرط کو شوہر عقد نکاح کے وقت قبول کرتا ہے تو اس شرط کی شرعاً کیا حیثیت ہوگی؟

موجودہ دور میں ملت کے مصالح اس بات کے متقاضی ہیں کہ عورتوں سے تعلیمی وطبی خدمات، نیز دوسری ایسی خدمات جو عورتوں کے لئے مخصوص ہوں، عورتوں ہی سے لی جائیں، نیز انفرادی حالات بھی ایسے ہوسکتے ہیں کہ عورت ملازمت کرتے ہوئے اپنی گھریلو ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے کوئی مناسب انتظام کرسکتی ہے۔

لہٰذا ملازمت کی شرط کو اگر شوہر نے قبول کرلیا ہے تو اس کی پابندی اس کے لئے ضروری ہے، الا یہ کہ ملازمت میں شرعی حدود کا لحاظ نہ کیا جاسکے یا شوہر کو یا بچوں کو تکلیف پہنچتی ہو تو ایسی صورت میں شرط کی پابندی ضروری نہیں۔

اگر شوہر اس شرط کو قبول کرنے کے باوجود عورت کو سلسلۂ ملازمت ختم کرنے کا حکم دیتا ہے، یا نئی ملازمت کرنے سے روکتا ہے تو وہ اپنا معاملہ قاضی کے سامنے پیش کرسکتی ہے اور قاضی مناسب حال حکم دے سکتا ہے۔

## کیا اشتراط فی النکاح شریعت میں پسندیدہ ہے؟:

نکاح میں شرطیں عائد کرنا، شرعاً کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے جس کی لوگوں کو ترغیب دی جائے، کیونکہ نہیں کہا جاسکتا کہ جس شرط کو شوہر نے قبول کرلیا ہے، اس کو شوہر نباہ سکے گا، اور حالات اس میں مانع نہیں ہوں گے، اگر حالات مساعد نہیں ہوئے تو دونوں کے درمیان نزاع پیدا ہو جائے گا، اس لئے امام مالک نے شروط کو مکروہ (ناپسندیدہ) کہا ہے۔

"شرطیں...... بالعموم ...... امام مالکؒ کے نزدیک مکروہ (ناپسندیدہ) ہیں، اور منقول ہے کہ وہ لوگوں کو شرطوں کے ساتھ نکاح کرنے سے منع کرتے تھے"

(الأحوال الشخصیہ للدکتور احمد الغندور ۲۹۷)۔

موجودہ معاشرہ میں عورتوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہو رہا ہے جو اسلام انہیں دینا چاہتا ہے، ان کے حقوق بری طرح متاثر ہو رہے ہیں، خاندان کا جہاں قدیم ڈھانچہ ہے، وہاں عام طور سے انہیں گھٹن کی زندگی گزارنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے اور جہاں عورتیں مغربی تہذیب میں رنگی ہوئی ہیں، وہاں وہ نہ شوہر کو خاطر میں لاتی ہیں اور نہ شرعی حدود کا لحاظ کرتی ہیں، لہٰذا معاشرہ میں عائلی زندگی سے متعلق جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ان کا حل اشتراط فی النکاح یا کابین نامہ نہیں ہے، بلکہ ایسی تدابیر کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے جو ایک طرف ان میں اللہ کے حضور جوابدہی کا احساس ابھارے، ان میں ایک دوسرے کے حقوق وفرائض کا شعور پیدا کرے، اور ناچاقی بالعموم جن وجوہ سے پیدا ہوتی ہے، ان سے بچنے کی صورتیں تجویز کرے، علاوہ ازیں قضاء شرعی کا ممکن حد تک انتظام کیا جائے اور جن عورتوں کو ناحق طلاق (طلاق تعسف) دینے کی بناء پر ضرر پہنچ رہا ہو، ان کو ان شوہروں سے مناسب معاوضہ (Compensation) دلوانے کا عدالت اور قاضی کو اختیار دیا جائے، جس کے لئے ایکٹ بنانے کی سفارش کی جائے، اس قسم کی ٹھوس تدابیر اختیار کئے بغیر نہ معاشرتی اصلاح کا کام مؤثر طریقہ پر انجام پا سکتا ہے اور نہ عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کیا جا سکتا ہے۔



# نکاح میں شرائط، اقسام اور احکام

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی

## شرائط کی قسمیں اور ان کے احکام

شرائط اور احکام کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

(۱) عقد نکاح سے شوہر کے ذمہ بیوی کا نان ونفقہ شرعاً واجب ہوجاتا ہے، جب عورت شوہر کے حق زوجیت کی ادائیگی کے لئے اس کے زیر کنٹرول ہو، اس صورت میں بوقت نکاح اگر اسقاط نفقہ کی شرط شوہر عائد کرے، یا بیوی پابندی نفقہ کی شرط شوہر پر لگائے تو ایسی شرط کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، اور نان ونفقہ کی ادائیگی ہر حال میں شوہر کے ذمہ لازم ہوگی۔

(۲) شوہر کا ایسی ذمہ داری سے گریز کرنا جو شرعاً اس پر عائد ہوتی ہے، مثلاً نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ وہ بیوی کے نان ونفقہ کا ذمہ دار نہیں ہوگا، بالکل باطل ہے، اور اگر بیوی نے اس کی منظوری بھی دیدی ہو تب بھی شوہر پر نفقہ زوجہ کی ادائیگی لازم ہوگی، شرط کی پابندی ضروری نہیں ہوگی، اور نکاح بہر حال صحیح ہوگا، کیونکہ شرط فاسد سے نکاح فاسد نہیں ہوتا، "النکاح لا یبطل بالشروط الفاسدۃ" (حاشیہ ہدایہ ۲/ ۳۲۷)۔

قاضی خاں لکھتے ہیں:

"کسی شخص نے عورت سے ایک ہزار روپیہ مہر پر نکاح کیا، بایں شرط کہ وہ عورت کا نفقہ نہیں دے گا، اور عورت کا مہر مثل ایک سو روپیہ ہو تب بھی عورت کو ایک ہزار روپیہ مہر اور نان ونفقہ ملے گا"۔

(۳) نکاح کے وقت کسی فریق کا ایسی شرط لگانا جو مذکورہ دو صورتوں کے ذیل میں نہ آتی ہو، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ شوہر اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا، شرعاً ایک جائز شرط ہے، اور شرعاً "غیر لازمی ذمہ داری" کے تحت داخل ہے، لیکن فریقین کی منظوری کے بعد بہ اختیار خود لازم الایفاء شرط ہے تاہم اگر شوہر اس قسم کی شرط پوری نہ کرے تو اس سے صحت نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اور وفائے شرط کی صورت میں حسب شرط حکم لگایا جائے گا لیکن اگر ایسی شرط پوری نہ کی گئی، تو اس جیسی عورت کے لئے جتنا مہر مناسب ہوتا ہوا تنا (مہر مثل) شوہر کے ذمہ لازم ہوگا۔

"فتاویٰ قاضی خاں" میں ہے:

کسی شخص نے عورت سے نکاح دو ایسی چیزوں پر کیا جن میں سے ایک مال ہو اور دوسری چیز مال نہ ہو، لیکن اس میں عورت کا نفع ہو، مثلاً یہ شرط کہ ہونے والا شوہر اس کی سوکن کو طلاق دیدے، یا یہ شرط کہ شوہر اس کو شہر سے باہر نہیں لے جائے گا، یا اس جیسی کوئی اور شرط ہو تو اگر شوہر شرط پوری نہ کرے تو اسے عورت کو مہر مثل دینا ہوگا (فتاویٰ قاضی خاں ۱/ ۱۷۶)۔

(۴) عقد نکاح کے وقت اگر عورت یہ شرط لگائے کہ اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، اور شوہر اس شرط کو تسلیم کرلے، تو عورت اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کی حقدار ہوگی، اور یہ صورت "تفویض طلاق" کے ذیل میں آئے گی، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شوہر اپنے حق طلاق کو عورت کے حوالے کردے اور اسے طلاق دینے یا نہ دینے میں بہ اختیار اور مالک بنادے۔

## کیا تفویض طلاق واپس لی جاسکتی ہے؟:

تفویض طلاق چونکہ تملیک کی ایک قسم ہے توکیل نہیں ہے، اس لئے شرط کی منظوری کے بعد شوہر کو تفویض طلاق ختم کرنے یا واپس لینے کا اختیار نہیں ہوگا۔

حضرت مولانا احسن نانوتوی تحریر فرماتے ہیں:

''ولا یصح رجوع الزوج عن التفویض، لأنه تملیك لا توکیل'' (کنز الدقائق ۱۲۲)

(شوہر کا تفویض طلاق کو واپس لینا صحیح نہیں ہے، کیونکہ تفویض تملیک (مالک بنادینا) ہے، توکیل (نمائندہ یا ایجنٹ بنانے) کے معنیٰ میں نہیں)۔

مولانا نانوتوی ''کنز الدقائق'' کے متن ''ولا یملک الرجوع'' کی تشریح کرتے ہوئے مزید وضاحت فرماتے ہیں:

شوہر تفویض طلاق سے رجوع کرنے کا مالک نہیں ہوسکتا، خواہ یہ تفویض کے تینوں الفاظ میں سے کسی ایک کے ذریعہ واقع ہو جیسے (۱) تجھے اختیار ہے، (۲) تیرا معاملہ تیرے ہاتھ ہے (۳) خود کو طلاق دے لے، اس لئے کہ تفویض میں تعلیق کے معنیٰ بھی موجود ہیں (یعنی شوہر، عورت کے اختیار پر طلاق کو معلق کرتا ہے) اور بہ اعتبار تملیک عورت کو طلاق دینے کا اختیار مجلس تک ہی محدود رہے گا، اور باعتبار تعلیق اس تفویض سے رجوع صحیح نہیں، نیز عورت کو اس حق سے معزول کرنا اور رد کرنا بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ تعلیق تصرف لازم (حسب منشاء اختیار کا استعمال) ہے، لہٰذا رجوع درست نہیں (کنوز الحقائق حاشیہ کنز الدقائق ر ۱۲۴)۔

## تفویض طلاق کی مدت:

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ عورت کا اختیار طلاق ''تفویض مطلق'' میں مجلس تفویض تک ہی محدود رہے گا، اور تبدیلی مجلس یا تبدیلی مجلس پر دلالت کرنے والے افعال سے یہ اختیار باقی نہ رہے گا، البتہ ''تفویض موقت'' میں اختیار طلاق وقت مقرر تک حسب شرط باقی رہے گا۔

## شرائط کب معتبر ہوں گی:

رہی یہ بات کہ نکاح بشرط تفویض طلاق، یا دیگر شرائط متعلقہ بالنکاح کس وقت معتبر ہوں گی؟ اس کی ممکنہ تین صورتیں ہیں:

۱۔ عقد نکاح سے پہلے شرائط طے ہوجائیں اور طرفین منظوری دیدیں یا اس تحریر پر دستخط کردیں۔

۲۔ عقد نکاح میں ان شرائط کا ذکر کیا جائے، ایجاب مشروط ہو یا ایجاب مطلق ہو، قبول مشروط ہو۔

۳۔ عقد نکاح کے بعد طرفین میں کوئی شرائط نامہ تحریر کیا جائے اور اس پر دستخط کردیا جائے۔

اس سلسلے میں فقہاء کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شرائط کی نوعیت کے اعتبار سے ان کے احکام میں فرق ہوگا۔

(الف) جن شرائط میں عورت کا نفع ہو اور وہ فعل زوج سے متعلق ہوں تو وہ مذکورہ تینوں صورتوں میں معتبر ہوں گی، جیسے شہر یا آبائی وطن سے عورت کو باہر نہ جانے کی شرط۔

(ب) ایسی شرائط جو لازمی ذمہ داری سے گریز کے ہم معنی ہوں، جیسے عدم نفقہ، یا عدم مہر، یا عدم میراث کی شرطیں، تو یہ تینوں صورتوں میں باطل ہوں گی، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''من اشترط شرطا لیس فی کتاب اللہ فھو باطل، وإن اشترط مأة شرط، وشرط اللہ أحق وأوفق'' (بخاری ۱-۲۸۹)

(جو شخص ایسی شرط لگائے گا جو کتاب اللہ میں نہ ہو تو وہ باطل ہے، اگرچہ ایک سو شرطیں لگائے، اور اللہ کی شرط کو پورا کرنا زیادہ ضروری اور مناسب ہے)۔

(ج) ایسی شرائط جو ملک نکاح کے ثبوت پر موقوف ہوں، اور تقاضائے عقد نکاح کے خلاف ہوں جیسے طلاق، یا تفویض کی شرط، تو اس کا اعتبار صرف بعد النکاح ہوسکتا ہے قبل النکاح یا بوقت نکاح ایسی شرطیں کالعدم ہوں گی، خواہ ایجاب مشروط ہو اور قبول مطلق ہو، یا ایجاب مطلق ہو اور قبول مشروط ہو، لیکن اس معاملہ کی ایک صورت ایسی ہے جس سے بظاہر ایسی شرط کا قبل النکاح معتبر ہونا معلوم ہوتا ہے، حالانکہ درحقیقت یہ بعد النکاح ہی معتبر ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ عند النکاح عورت کی طرف سے ایجاب مشروط ہو اور شوہر قبول نکاح کرتے ہوئے اس شرط کو منظور کرے، تو یہ شرط بھی اس لئے معتبر ہوگی کہ اس کی منظوری فی الواقع بعد النکاح ہو رہی ہے ''فتاوی قاضی خاں'' میں فصل فی النکاح علی الشرط کے ذیل میں اس مسئلہ کی تفصیل اس طرح نقل کی گئی ہے:

''ایک شخص نے کسی عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ اس کو طلاق ہے، یا اس شرط پر کیا کہ طلاق کے بارے میں طلاق کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہوگا، تو امام محمدؒ نے ''الجامع'' میں فرمایا کہ نکاح تو جائز ہوجائے گا لیکن طلاق باطل ہوگی اور عورت کے ہاتھ میں طلاق کا اختیار نہیں رہے گا۔

اور فتاوی میں حسن بن زیاد سے مروی ہے کہ جب کسی عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ دس دن کے اندر اس کو طلاق ہے یا اس شرط پر نکاح کیا کہ اس کو دس دنوں کے بعد طلاق دینے کا اختیار ہے تو نکاح جائز ہے اور طلاق باطل ہے اور عورت طلاق دینے کے اختیار کی مالک نہیں ہوگی۔

اور فقیہ ابواللیث نے فرمایا کہ یہ حکم اس وقت ہے جب شوہر نے شرط کی شروعات کی ہو اور یوں کہا ہو کہ میں نے تجھ سے نکاح اس شرط پر کیا کہ تجھے طلاق ہے .... اور اگر عورت نے اپنی طرف سے شرط کی ابتداء کی ہو اور یوں کہا ہو کہ "میں نے اپنا نکاح تجھ سے کر دیا اس شرط پر کہ مجھے طلاق ہے، یا اس شرط پر کہ طلاق کا اختیار میرے ہاتھ میں ہوگا، میں جب چاہوں خود کو طلاق دے ڈالوں" اور شوہر نے اس کے جواب میں کہا کہ میں نے قبول کیا تو نکاح جائز ہے اور طلاق واقع ہو جائے گی، اور عورت کو طلاق دینے کا اختیار حاصل ہوگا۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ جب شرط کی ابتداء شوہر کی طرف سے ہو تو طلاق اور اختیار طلاق کی سپردگی دونوں قبل النکاح ہوئی، لہذا طلاق اور تفویض کی شرط صحیح نہیں ہوئی۔

اور جب شرط کی ابتداء عورت کی جانب سے ہو تو تفویض بعد النکاح ہوگی (بنابریں تفویض صحیح ہوئی) اس کی وجہ یہ ہے کہ جب شوہر نے عوت کے کلام کے بعد قبلت کہا، اور قاعدہ یہ ہے کہ جواب میں مذکور چیز کا اعادہ شامل ہوتا ہے، تو گویا یہ کلام ایسا ہو گیا جیسے شوہر نے کہا ہو کہ میں نے قبول کیا اس شرط پر کہ تجھے طلاق ہے، یا طلاق کا اختیار تیرے ہاتھ میں ہے تو اس صورت میں نکاح کی منظوری پہلے ہوئی اور شوہر اختیار طلاق کو عورت کے سپرد کرنے والا بعد النکاح قرار پایا" (فتاوی قاضی خاں ۱/ ۱۵۵)۔

## تفویض طلاق اور احتیاطی قیود:

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ شوہر کو قبل النکاح یا بوقت نکاح تفویض طلاق کا حق حاصل نہیں ہے، وہ بعد النکاح ہی اپنا حق طلاق عورت کو سونپ سکتا ہے، مگر اس صورت میں بھی عورت کی ذات سے سخت اندیشہ ہے کہ مصالح شرعیہ ضائع ہو جائیں، کیونکہ عورت فطری طور پر جذباتی ہوتی ہے اور طلاق کا اختیار حاصل کرنے کے بعد ذرا سی بات پر وہ رشتہ نکاح کو توڑ سکتی ہے، جیسا کہ یورپ کی عورتوں میں جنہیں قانوناً حق طلاق حاصل ہے، ۶۰ فیصد عورتوں کا شادی کے تین چار مہینوں کے بعد ہی شوہر سے علیحدگی اختیار کر لینے کا رواج عام ہے اور اس سے ۳۸ فیصد بچوں میں ماں باپ کی مشترکہ شفقت و تربیت سے محرومی کے سبب خطرناک جرائم کے ارتکاب کا رجحان اور معاشی تنگی اور اخلاقی مسائل کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے، موجودہ صورت حال کے پیش نظر مناسب یہی ہے کہ تفویض طلاق کے دروازہ کو بند کر دیا جائے اور تفویض طلاق کے ساتھ احتیاطی قیود کے اضافے کی کوئی راہ نہ ڈھونڈی جائے، ورنہ اندیشہ ہے کہ احتیاطی قیود کے بطن سے ایسی مفسرتیں پھوٹ پڑیں، جو مصالح نکاح کو ضائع کر دیں اور سد باب مشکل ہو جائے۔

## مقدار مہر میں اضافہ کی شرط:

رہ گیا یہ مسئلہ کہ شوہر کو طلاق کے بے جا استعمال سے روکنے کے لئے بوقت نکاح مہر کی تعیین مشروط طریقے پر کی جائے، مثلاً یہ شرط لگائی جائے کہ اگر شوہر تمام عمر طلاق نہ دے تو مہر پانچ ہزار اور اگر طلاق دے تو پندرہ ہزار تو یہ صورت میری نظر میں شرط باطل کی قبیل سے ہے، اس لئے کہ اس شرط کا مقصد شوہر کا طلاق دینے کے اختیار شرعی سے روکنا ہے جو منصوص طور پر اس کو حاصل ہے، لہذا ایسی شرط "من اشترط شرطا لیس فی کتاب اللہ فھو باطل" کے ذیل میں آتی ہے جو باطل اور غیر معتبر ہے، لہذا بصورت طلاق پندرہ ہزار کی ادائیگی شوہر پر لازم نہیں ہوگی، بلکہ مہر مثل دینا ہوگا، اس کے علاوہ یہ بھی واقعہ ہے کہ فریقین کے درمیان مزاج کی ناہمواری یا خود شوہر یا بیوی کی کسی ناقابل برداشت حرکت کے سبب طلاق ناگزیر ہو جاتی ہے، ایسی حالت میں شوہر پر بطور مہر بڑی رقم کی ادائیگی کی شرط لگانا ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟

## دو مشروط مقدار مہر:

رہ گئی اشتراط فی النکاح کی یہ صورت کہ شوہر نے بوقت عقد نکاح دو مہروں کا ذکر کیا اور دونوں کو کسی اور شرط پر معلق کیا، مثلاً اس نے کہا: میری کوئی دوسری بیوی نہ ہو تو ایک ہزار روپیہ مہر اور اگر کوئی اور بیوی ہو تو دو ہزار مہر یا یوں کہا کہ اس کو وطن سے نہ نکالے تو ایک ہزار اور نکالے تو دو ہزار، اس مسئلہ میں اگرچہ بعض نے دونوں شرطوں کو جائز رکھا ہے، اور حسب شرط مہر کو لازم قرار دیا ہے لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک شرط ثانی جائز نہیں ہے، پس یہ شرط پوری نہ کرنے پر مہر مثل دینا ہوگا،

کیونکہ شرط معلق کا وجود بوقت عقد نا معلوم اور مجہول ہے اور امام زفر کے یہاں دونوں شرطیں ناجائز ہیں، کیونکہ ملک بضع کے بالمقابل دو بدلوں کا ذکر علی سبیل البدلیہ کیا گیا ہے، لہذا دونوں نامعلوم اور مجہول ہو گئے، پس مہر مثل لازم ہے، امام شافعی کا بھی یہی مذہب ہے اور وہ اس شکل میں مہر مثل کو واجب قرار دیتے ہیں، اور امام مالک ان شرطوں پر سرے سے نکاح کو ہی فاسد کہتے ہیں اور حنابلہ بھی شرط پوری نہ کرنے پر فساد نکاح کا حکم لگاتے ہیں (دیکھئے: کنوز الحقائق ۱۰۵/۱) اور اسی جیسی دوسری شرط، مثلاً اگر عورت بدصورت ہو تو ایک ہزار مہر اور خوبصورت ہو تو دو ہزار مہر، کی صورت میں اگر چہ دونوں شرطوں کے جواز کو بلا خلاف نقل کیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں بھی امام صاحب اور صاحبین کے درمیان اختلاف ہی ان کے اصول کے مطابق صحیح معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ (قاضی خاں ۱۵۵/۱، زیلعی اور صاحب نہر الفائق) کے کلام سے ظاہر ہے اور علامہ شامی نے بھی یہ تفصیلات ذکر کی ہے (رد المحتار ۳۴۸/۲) اور ابن الہمام نے تو بالکل صاف صاف یہ فرمایا ہے: "اور زیادہ بہتر یہی ہے کہ خوبصورتی وبدصورتی والے مسئلہ میں صاحبین اور امام ابوحنیفہ کے درمیان اختلاف کو ثابت مانا جائے چونکہ نوادر ابن سماعہ میں امام محمد سے اس مسئلہ میں اختلاف صراحتاً منقول ہے" (فتح القدیر ۳۶۰/۲)۔

اس کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ امام صاحب کے قول کے خلاف اصحاب فتاوی نے کوئی فتوی صادر نہیں کیا، لہذا ترجیح انہیں کے قول کو حاصل ہوگی اور اس مختلف فیہ مسئلہ کو مندرجہ ذیل مسئلہ کے لئے نظیر نہیں بنایا جائے گا۔

## طلاق اور عدم طلاق کی شرط پر مخصوص مہر:

بوقت عقد نکاح یہ شرط لگانا کہ اگر شوہر عورت کو طلاق دے تو مہر بیس ہزار روپیہ اور شوہر طلاق نہ دے تو دس ہزار روپیہ اور شرط کو جائز قرار دینا اور حسب شرط مہر کو لازم قرار دینا نہایت ہی مشکل ہے، پھر یہ مسئلہ چونکہ دونوں تسمیہ کو طلاق پر معلق کرنے کی شرط سے تعلق رکھتا ہے جب کہ شرعاً شوہر کو طلاق دینے یا نہ دینے کا حق برابر درجہ میں حاصل ہے، لہذا بڑی رقم کے دباؤ سے اس کو اس حق سے دست بردار کرنے کے لئے شرط لگانا میرے نزدیک شرط باطل ہے، لہذا شوہر طلاق دیدے تو مہر مثل لازم ہوگا نہ کہ مشروط رقم، برخلاف مذکورہ بالا صورت کے کہ اس میں شرط کا تعلق عورت کی منفعت اور شوہر کے حسن ومعاشرت سے ہے اور اس میں شوہر کے کسی شرعی حق کو متاثر نہیں کیا گیا ہے، پھر بھی اس میں امام اعظم کے نزدیک عدم وفاء شرط کی صورت میں مہر مثل لازم ہے تو زیر بحث مسئلہ میں جب اس کا حق متاثر ہوتا ہے بدرجہ اولی مہر مثل لازم ہوگا۔

## طلاق کے بے جا استعمال پر پابندی کی صورتیں:

میں سمجھتا ہوں کہ شوہر کو طلاق کے بے جا استعمال سے روکنے کے لئے بوقت نکاح کسی ایسے معاہدہ کا پابند کیا جائے جس کے مطابق اگر وہ عورت کو جلد بلا قصور طلاق دیدے تو بطور متعہ ایک خطیر رقم کی ادائیگی اس کے ذمہ لازم قرار دی جائے، یہ صورت غالباً اذوق بالقرآن بھی ہوگی جیسا کہ ارشاد باری ہے:

"وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ" (سورہ بقرہ: ۲۴۱)

(اور طلاق شدہ عورتوں کے لئے معروف طریقہ پر متعہ دینا پرہیز گاروں پر لازم ہے)۔

اگر چہ حسب تصریحات فقہاء متعہ کی یہ صورت صرف مستحب درجہ میں ہے تاہم معاہدہ کے بعد اس کا لازم الوفاء ہونا ارشاد نبوی کے عین موافق ہوگا۔

"أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج" (فتح القدیر ۳۔ ۴۵۹)

(شرطوں کا حق ہے کہ ان کو پورا کرو جس کے ذریعہ تم نے شرمگاہ کو حلال بنایا ہے)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بلا قصور عورت کو طلاق دینے پر شوہر کے لئے کوئی تادیبی سزا مقرر کی جائے، جیسا کہ حضرت عمر تین طلاق بیک وقت دینے والے پر درے لگایا کرتے تھے، اگر چہ ہندوستان کے حالات کے پیش نظر تادیبی سزا پر عمل کسی آزاد ادارہ یا اصطلاحی انجمنوں کے لئے سخت مشکل ہے، لیکن مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم سے دو طلاق دینے پر قانوناً ایک سال یا چھ مہینے قید بامشقت کی سزا دلانے کی سفارش حکومت ہند سے کی جاسکتی ہے۔

## نکاح ثانی کرنے اور نہ کرنے پر کم وبیش مہر کی شرط:

اگر نکاح کرتے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس عورت کا مہر تیس ہزار ہوگا اور اگر دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر پندرہ ہزار ہوگا۔

تو اس مسئلہ میں بھی ''نکاح کیا تو تیس ہزار'' والی شرط غیر معتبر اور غیر لازم العمل ہے، اگر شوہر نے دوسرا نکاح کرلیا تب بھی اس پر مہر مثل ہی لازم ہوگا، کیونکہ اصحاب فتاوی نے صاحبین کے قول پر فتوی نہیں دیا ہے، اور یہ چونکہ مسئلہ بھی مذکورہ بالا مسئلہ کی نظیر ہے، لہذا یہ بھی مابین الامام والصاحبین مختلف فیہ رہے گا اور امام صاحب کے ہی قول پر فتوی دیا جائے گا، جیسا کہ مذکورہ مسئلہ میں ارباب فتاوی نے دیا ہے۔

## نکاح بشرط ملازمت:

اگر نکاح کے وقت عورت اپنے ہونے والے شوہر سے یہ شرط لگائے کہ شوہر انہیں لگی ہوئی ملازمت سے نہیں روکے گا، یا اگر آئندہ اس کو کوئی مناسب ملازمت مل جائے تو شوہر ملازمت کرنے سے نہیں روکے گا، اور شوہر اس شرط کو قبول کرتا ہے تو اس مسئلہ میں شرعی حکم یہ ہے کہ چونکہ عورت شادی کے بعد بحق شوہر محبوس ہوتی ہے، اور قرآن حکیم کے مطابق شوہر حاکم اور بیوی محکوم ہے، لہذا شرط منظور کرنے کے باوجود شوہر اپنی بیوی کو لگی ہوئی ملازمت سے دست بردار کرنے کا حق دار ہے اور نئی ملازمت کے کرنے سے روک سکتا ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ جب شوہر کے ذمہ بیوی کا نان ونفقہ شرعاً واجب ہے تو بیوی کو ملازمت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پھر آج کل کے دور فتنہ میں جبکہ ملازمت دینے والے اداروں میں بے پردگی اور جاہلہ فیشن عام ہے اور ملازم مرد وعورت کا اختلاط ترقی کی علامت سمجھا جاتا ہے، عورت خود بے پردہ نہ ہو تو نیکر دھاری بے پردہ مردوں کا سامنا تو بہرحال کرنا ہی پڑتا ہے، ان اداروں کا ایسا ہی حال ہے کہ جیسے فقہاء متقدمین کے زمانے میں حمام کا حال تھا جسے پبلک باتھ روم کہنا چاہئے اور ان حماموں میں بلا اجازت شوہر عورت کے آنے پر پابندی عائد کی گئی ہے۔

حماموں میں عورتوں کا جانا اس وقت مباح ہے جب اس میں کوئی آدمی بے پردہ نہ ہو، اور اس بناء پر عورتوں کو ان میں جانے سے روکنے پر کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ پتہ ہے کہ اکثر عورتیں وہاں بے پردہ ہوتی ہیں جو خود عورتوں کو ملازمت پر جانے کے لئے شرعی طور پر اس بات کی پابندی کرنی ہوگی کہ وہ زیب وزینت ترک کرکے ایسے لباس وپوشاک میں جائیں جو مردوں کے لئے جاذب نظر نہ ہو (فتح القدیر ۳۳۶/۲)۔

اور رسومات جاہلیت سے مزاج آشنا ادارے اس کو برداشت نہیں کرسکتے، اس لئے ترک ملازمت ہی مناسب ہے، البتہ اگر کسی گرل اسکول میں ملازمت ہو جہاں سارا نظام عورتوں کے ہاتھ میں ہو یا کوئی مدرسۃ البنات ہو، جہاں مردوں کے داخلہ پر پابندی ہو اور آنے جانے میں بے پردگی کے فتنے سے بچاؤ کا اہتمام ہو، تو ایسی صورت میں قبول شرط کے بعد شوہر کو ملازمت سے روکنے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔



# عقدِ زواج میں اضافی شرط

مولانا محمد مصطفی عبدالقدوس ندوی[1]

نکاح کے وقت کسی فریق کا کوئی ایسی شرط لگانا جس کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہے، جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہیں ہوتا اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی یا ذمہ داری عائد ہوتی ہے، جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہیں ہوتی، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا، یا بیوی کو اس کے آبائی وطن سے باہر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا۔

نکاح بالاتفاق درست ہے، اختلاف ایفاء شرط کے لازم ہونے اور نہ ہونے میں ہے، حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک مرد کے ذمہ شرط پوری کرنا واجب نہیں ہے (اسی کے قائل امام زہری، قتادہ، ہشام بن عروہ، لیث، ثوری اور ابن المنذر ہیں (المجموع شرح المہذب ۱۶ / ۳۴۷، تحفۃ الفقہاء ۱/ ۱۳۵، التاتارخانیہ ۳/ ۱۰۰، المدونۃ الکبری ۲/ ۱۶۱، المغنی ۷/ ۲۱۲)۔

البتہ مالکیہ ایک شرط کا اضافہ کرتے ہوئے کہ یہ حکم اس وقت ہے کہ جب اس شرط کے ساتھ یمین طلاق یا عتق شامل نہ ہو، ورنہ شوہر کے ذمہ ایفاء شرط ضروری ہے اور اگر شوہر مشروط کو بروئے کار نہیں لاتا ہے یا شرط کے خلاف عمل کرتا ہے تو عورت کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا (المغنی ۷/ ۱۷، بدایۃ المجتہد ۲/ ۵۹، القواعد النورانیہ الفقہیہ / ۲۱۲)۔

واجب الایفاء شرط اسے کہتے ہیں، جس کا فائدہ عورت کو پہنچے، جیسے عورت یہ شرط لگائے کہ اس کو مرد اپنے آبائی وطن سے باہر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا، تو شوہر کے ذمہ ایسی شرط کو بروئے کار لانا ضروری ہے اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو عورت کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا۔

اسی طرح حضرت عمر، سعد بن ابی وقاص، معاویہ، عمر بن العاص سے مروی ہے، یہی قول شریح عمر بن عبدالعزیز جابر بن زید، طاؤس، اوزاعی اور اسحاق کا بھی ہے (المغنی ۷/ ۱۷، بدایۃ المجتہد ۲/ ۹۵، القواعد النورانیۃ الفقہیہ / ۲۱۲، ۲۲۹)۔

## قائلین کے دلائل

حنابلہ اور دیگر علماء جو واجب الایفاء کے قائل ہیں، ان کی دلیلیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ ''یا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا أَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' (سورہ مائدۃ: ۱)

اسی طرح وہ تمام آیتیں اور احادیث استدلال میں پیش کرتے ہیں، جو ایفاء عہد پر دلالت کرتی ہیں (دیکھئے: القواعد النورانیۃ الفقہیہ / ۲۱۴، ۲۱۹)۔

۲۔ ''عن عقبة بن عامر أن رسول الله ﷺ قال: أحق الشروط أن یوفی به ما استحللتم به الفروج'' (مسلم باب الوفاء بالشروط فی النکاح ۱/ ۴۵۵)

(حضرت عقبہ بن عامر سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شرطیں سب سے زیادہ قابل ایفاء ہیں وہ یہ ہیں جن کے ذریعہ تمہارے لئے شرمگاہیں حلال ہو جاتی ہیں)۔

۳۔ ''المسلمون علی شروطهم'' (البیہقی کتاب الوقف باب الصدقۃ علی ما شرط الواقف ۶/ ۱۶۶)

(مسلمان اپنی شرطوں پر قائم رہتا ہے)۔

[1] استاذ المعہد العالی الاسلامی، حیدر آباد

۴۔ ''روی عبد الرزاق عن عبد الرحمن بن غنم قال: شهدت عمر بن الخطاب واختصم عليه فی امرأة شرط لها زوجها أن لا يخرجها من دارها فقال عمر لها شرطها'' (المصنف عبد الرزاق ''باب الشروط فی النکاح'' ۶۔۲۲۷)

(امام عبدالرزاق نے عبدالرحمن بن غنم کے واسطے سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں حضرت عمر بن خطاب کے پاس موجود تھا، ان کے پاس ایک عورت کے متعلق مقدمہ آیا کہ اس کے شوہر نے (عقد نکاح کے وقت) شرط لگائی کہ اسے اس کے آبائی وطن سے باہر نہیں لے جائے گا، حضرت عمر نے فرمایا: عورت کے لئے سکونت شرط کے مطابق ہے)۔

۵۔ علامہ ابن قدامہ اپنے مذہب کی نمائندگی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس وجہ سے کہ اس شرط میں عورت کا فائدہ ہے، مقصد نکاح کے لئے حارج بھی نہیں ہے، لہذا یہ شرط لازم ہوگی، جس طرح عورت مرد پر زیادتی مہر کی شرط لگائے، یا مروجہ سکہ کے علاوہ مہر کو مشروط کرے (المغنی ۷/۷۱)۔

۶۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ عقود، معاملات اور شروط میں اصل صحت ہے، لہذا شوہر کے ذمہ عائد کردہ شرائط کی پابندی ضروری ہوگی۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

''جب جنس وعدہ پورا کرنا اور ایفاء عہد کا حکم دیا گیا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اصل عقود وشروط کا صحیح ہونا ہے، صحیح ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس کا اثر ظاہر ہو، اور عقد کا مقصد ایفاء شرط ہے، کیونکہ شارع کا عہد و پیمان کے مقصد کو بروئے کار لانے کا حکم دینا دلیل اس بات کی ہے کہ اس میں اصل اباحت اور درستگی ہے (القواعد النورانیہ الفقہیہ / ۲۱۹)۔

## مانعین کے دلائل

شافعیہ، حنفیہ اور جو حضرات شرط کو پورا کرنا ضروری قرار نہیں دیتے ہیں ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ ''ماكان من شرط ليس فی كتاب الله فهو باطل وإن كان مأة شرط'' (البیہقی عن عائشة کتاب الشرکة ''باب الشرط فی الشرکة وغیرها'' ۷۔۷۹)

(وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہ ہو وہ باطل ہے، گرچہ سو ہی شرطیں کیوں نہ ہو)۔

اور مذکورہ شرط کتاب اللہ میں نہیں ہے، اس لئے یہ مقتضائے عقد کے خلاف ہے۔

۲۔ ''المسلمون علی شروطهم إلا شرطا أحل حراما أو حرم حلالا'' (المصدر السابق عن کثیر بن عبدالله المزنی عن ابیه عن جده ۷۔۷۹)

(مسلمان شرائط کے پابند ہیں، مگر ایسی شرط جو حرام کو حلال قرار دے، یا حلال کو حرام بتائے)۔

مذکورہ شرطیں حلال ومباح کو حرام قرار دیتی ہیں، جیسے دوسری شادی کرنا، بیوی کے ساتھ سفر کرنا حلال ومباح ہے، لیکن مشروط کی صورت میں حرام ہوجاتا ہے۔ (تبیین الحقائق ۲/ ۱۴۹)

۳۔ ''ابوبکر بزاز محمد بن عبدالرحمن سلمانی اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں، وہ ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگ اپنے ان شرائط کے پابند ہیں، جو حق کے موافق ہو''۔

اس حدیث کی سند میں ایک راوی ضعیف ہیں، لیکن مختلف طریقوں سے مروی ہے، جن میں بعض بعض کے لئے باعث تقویت ہے (القواعد النورانیہ الفقہیہ / ۲۲۰ طبع بیروت)۔

۴۔ اور چونکہ اس طرح کی شرطیں نہ مصلحت نکاح میں سے ہیں اور نہ مقاصد عقد اور اس کے مقتضیات میں سے ہیں۔

## ترجیح:

حاصل کلام یہ ہے کہ دونوں فریق کا استدلال صحیح ہے، لیکن اصولی طور پر حنابلہ کے قول کو ترجیح حاصل ہوتی ہے، کیونکہ شافعیہ وحنفیہ کا استدلال عام ہے اور حنابلہ کا مستدل خاص ہے۔

۱۔ ۲۔ ۳۔ اب ہم قائلین کی دلیلوں کا جائزہ لیتے ہیں، ان کا مستدل وہ تمام آیتیں ہیں، جن میں مطلق ایفاء عہد کا ذکر ہے، حدیث پاک: "المسلمون علی شروطهم"، "أحق الشروط أن یوفی به الخ" اس طرح دیگر احادیث مقید ہیں، جب ایسی شرطیں ہوں جو حلال کو حلال ہی قرار دیتی ہوں تو کیا انہیں بروئے کار لانا ضروری ہے؟ اس سلسلہ میں یہ مذکورہ احادیث خاموش ہیں، دوسری حدیث میں اس طرف واضح الفاظ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا:

"مسلمان اپنے عہد و میثاق کے پابند ہیں، ہاں اگر ایسی شرط و پیمان ہو جو حرام کو حلال، یا حلال کو حرام قرار دیتی ہو تو اس کے پابند نہیں ہیں"۔

امام نووی حنابلہ کے مستدل احادیث کا محمل امام شافعی اور دوسرے علماء کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"احق الشروط......" والی کے بارے میں امام شافعی اور اکثر دیگر علماء فرماتے ہیں کہ یہ محمول ہے ان شرائط پر جو تقاضۂ عقد نکاح کے منافی نہ ہو، بلکہ مقاصد نکاح اور مقتضیات عقد میں سے ہو، جیسے عورت کے ساتھ حسن وخوبی کے ساتھ رہنے کی شرط عائد کرنا، اور اس کے اوپر خرچ کرنے کی شرط لگانا" (شرح مسلم للنووی ۱/ ۴۵۵)۔

اس توضیح کی تائید شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"جو کتاب اللہ میں نہ ہو وہ باطل ہے"، یعنی ہر وہ شرط جو قرآن مجید، سنت رسول اور اجماع سے ثابت نہ ہو وہ کتاب اللہ میں شامل نہیں ہے، بخلاف اس کے جو سنت واجماع میں ہے تو وہ کتاب اللہ میں ہے، جو اتباع سنت اور اجماع پر قرآن کی دلالت صریح ہے (القواعد النورانیۃ الفقہیہ / ۲۰۹)۔

۴۔ جہاں تک حضرت عمر کے اثر کی بات ہے تو وہ حدیث موقوف ہے اور وہ حدیث مرفوع صحیح کے مقابلہ میں مرجوح ہے، کیوں کہ دلیلوں کے تعارض کے وقت قوی تر کو ترجیح حاصل ہوتی ہے (الحموی ۱/ ۱۹۷)۔

ابن رشد قرطبی نے جو اصولیین کے حوالہ سے "القضاء بالخصوص علی العموم" نقل کیا ہے، یہ ضابطہ حنابلہ کے خلاف شافعیہ وحنفیہ کی تائید کرتا ہے، کیونکہ "المسلمون علی شروطهم"، "أحق الشروط أن یوفی الخ" عام ہے، دوسری حدیث جس میں "إلا شرطا احل حراما" اور "الناس علی شروطهم ما وافق الحق" مخصوص ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا کہنا ہے کہ اصل درستگی ہے، یہ بجاء ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کیا مطلق؟ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابن قدامہ بھی مطلق کے قائل نہیں ہیں (القواعد النورانیۃ الفقہیہ / ۲۲۹، المغنی ۷/ ۴۴۷) معلوم ہوا کہ مقید ہے اور وہ یہ کہ اس کی دلیل معارض نہ ہو، یہ اس وقت ہوگا جب کہ مقصد نکاح مشروط ہونے کہ مصالح نکاح کے خلاف ہو۔

مذکورہ تجزیہ ومحاکمہ سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ حنفیہ وشافعیہ کی رائے اصول شرع، روح اسلام اور دلائل شرعیہ سے قریب تر ہے، اور حنابلہ کی رائے میں عورتوں کے لئے کشائش ہے، خصوصاً ہندو پاک کی موجودہ حالت میں عورتوں کے لئے دوسری شادی ایک مشکل مسئلہ ہے، بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے، اسی طرح بسا اوقات شوہر آبائی وطن سے کہیں اور ذریعہ معاش کے لئے جاتا ہے، تبدیلی مکان سے ان میں بھی تبدیلی آجاتی ہے، اور عورت کو معلقہ چھوڑ دیتا ہے، کبھی وہیں بود و باش اختیار کر لیتا ہے، جس سے عورت کے حقوق متاثر ہوتے ہیں، یہاں اسلامی سلطنت بھی نہیں ہے کہ اس کی تادیب وسرزنش کی جاسکے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ حنفیہ کے اصول استحسان کو اختیار کرتے ہوئے حنابلہ کے مذہب پر فتوی دیا جائے یا پھر تعلیق بالشرط کے اصول سے مدد لی جائے جس کے تحت مذکورہ فتنہ کا سد باب بھی ممکن ہے۔

## تفویض طلاق کا حکم

۱۔ تفویض طلاق کی تینوں قسمیں شوہر کی طرف سے لازم ہیں، اسے اپنے قول سے رجوع کا حق ساقط ہوجاتا ہے (فتح القدیر ۳/ ۴۱۲، الدر المختار ورد المحتار ۳/ ۳۳۲) اسی کے قائل شافعیہ بھی ہیں (الفقہ الاسلامی وادلتہ نقلا عن مغنی المحتاج ۳/ ۲۸۵، ۲۸۷)۔

۲۔ شوہر کو شرعا یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ عورت کو اپنے ارادہ سے باز رکھے یا دوہ اسے فسخ کردے، کیونکہ طلاق کا مالک بنادینے کے بعد اس کی ولایت ملکیت طلاق سے ختم ہو گئی (بدائع ۳/ ۱۱۳) حنابلہ کا اس میں اختلاف ہے، ان کے نزدیک شوہر اپنے قول سے رجوع کرسکتا ہے، اور عورت کے قبول کرنے سے پہلے فسخ کرسکتا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک تفویض طلاق در اصل توکیل ہے، اس میں بیوی اور غیر شخص کی تفریق نہیں ہے (المغنی ۷/ ۴۰۸) جیسا کہ حنفیہ کے نزدیک ہے۔

۳۔ تفویض مطلق (وقت و زمانے سے خالی ہو) میں انتہاء مجلس اگر عورت مجلس میں ہے، اور اگر غائب ہے تو جس مجلس میں اسے تفویض طلاق کی اطلاع ملی تو اس کے انتہا تک عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار ہوگا، اس پر صحابہ کرام کا اجماع بھی ہے (ہدایہ ۲/ ۴۱۰)۔

۴۔ اگر تفویض طلاق وقت کے ساتھ مقید ہو، جیسے مرد کہتا ہے "أمرک بیدک إذا شئت" تمہارا معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے، جیسے تم چاہو، تو اس عورت کو مجلس اور مجلس کے بعد بھی جب چاہے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار ہوگا (بدائع ۳/ ۱۱۵)۔

۵۔ اگر تفویض متعین زمانے کے ساتھ مقید ہو تو عورت کو پورے وقت میں حق طلاق حاصل ہوگا، اگر بالغرض اسے تفویض طلاق کا علم نہیں ہوسکا، یہاں تک پورا وقت گذر گیا تو اب عورت کو حق طلاق حاصل نہیں ہوگا، جیسے مرد کہے "أمرك بيدك يوما" (تمہارا معاملہ تمہارے ہاتھ میں ایک دن) یا کہے "أمرك بيدك اليوم" (آج تمہارا معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے) پہلی صورت میں تفویض طلاق کے وقت سے لے کر چوبیس گھنٹے تک عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار ہوگا، دوسری صورت میں شوہر کے تکلم کے وقت سے لے کر دن کے بقیہ حصوں میں حق طلاق رہے گا پھر ساقط ہو جائے گا۔

۶۔ تفویض معلق مشروط ہو، اس کی تین صورتیں ہوتی ہیں:

۱۔ وقت و زمانہ سے خالی ہو جیسے "إذا قدم فلان فأمرك بيدك" یعنی جب فلاں شخص آئے گا تو تمہارا معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہوگا، فلاں شخص آیا، عورت کو اس کی آمد کا علم جس مجلس میں ہوا، اسی میں اسے حق طلاق ہے، اس مجلس کے برخواست ہونے کے بعد ساقط ہو جائے گا۔

۲۔ مطلق وقت کے ساتھ مقید ہو جیسے "إذا قدم فلان فأمرك بيدك متى شئت" جب فلاں آدمی آئے گا تو تمہارا معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہوگا جب تم چاہو، فلاں شخص کی آمد کی خبر جس مجلس مین ملی، اسی حد تک حق طلاق نہیں ہوگا، بلکہ دوسری مجلس میں بھی حق طلاق ہوگا۔

۳۔ متعین وقت و زمانہ کے ساتھ تفویض معلق ہو جیسے "إذا قدم فلان فأمرك بيدك يوما" جب فلاں شخص آئے گا تو تمہارا معاملہ تمہارے ہاتھ میں ایک دن ہوگا اور اس نے "إذا قدم فلان فأمرك بيدك اليوم" کہا یعنی جب فلاں شخص آئے گا تو تمہارا معاملہ تمہارے ہاتھ میں دن کے بقیہ حصہ میں ہوگا (تلخیص بدائع ۳/ ۱۱۳، ۱۱۶، التاتارخانیہ ۳/ ۳۰۳ وغیرہ)۔

## عقد نکاح سے قبل شرائط کی حیثیت

اتنی بات مسلم ہے کہ نکاح سے قبل طلاق لغو ہے، کیونکہ طلاق کا محل نکاح ہے، لیکن جب طلاق کی نسبت نکاح کی جانب کی جائے تو نکاح کے بعد واقع ہو جاتی ہے (الدر المختار ورد المحتار ۳/ ۳۴۴) یہی مالکیہ وحنفیہ کا مذہب ہے، حضرت عمر بن الخطاب، ابن مسعود، ابن عمر، ابوبکر، عمرو بن حزم، عبد الرحمن، شریح، زہری، سعید بن المسیب، نخعی، شعبی، مکحول، سالم بن عبد اللہ، عطا، حماد بن ابی سلیمان، اوزاعی، قاسم، عمر بن عبد العزیز اور ابن ابی لیلی کا قول یہی ہے، امام شافعی اور احمد کا اختلاف ہے، چونکہ احادیث دونوں طرح کی ہیں، اور صحابہ کے آثار بھی متعارض ہیں، علامہ عینی اور علامہ ابن الہمام نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہیں اور احادیث پر کلام کیا ہے، امام شافعی کی مستدل احادیث کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور مختلف وجوہات کی بنا پر ضعیف قرار دیا ہے (دیکھئے: عینی شرح ہدایہ ۲/ ۲۹۴، فتح القدیر ۳/ ۴۴۲، ۴۴۳)۔

ٹھیک اسی طرح سے تفویض طلاق ملک نکاح کے ساتھ معلق ہو تو عقد نکاح کے بعد تفویض طلاق کا تحقق ہو جائے گا مذکورہ تفصیلات کے ساتھ عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوگا (تفصیل کے لئے دیکھئے: ہدایہ ۲/ ۳۸۶، ہندیہ ۱/ ۴۱۵، درمختار بہامش الرد ۳/ ۳۵۲ وغیرہ)۔

## عقد نکاح میں شرائط ذکر کرنا (ج "۲")

عقد نکاح کے وقت طلاق مشروط ہونے کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ شوہر کی جانب سے ابتداء ہو کہ اس نے عورت سے اس شرط پر شادی کی کہ طلاق کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہوگا، یا یہ کہ اس نے عورت سے اس شرط پر شادی کی کہ اسے طلاق ہے، دونوں ہی صورتوں میں صحیح قول کے مطابق نکاح درست ہو جائے گا اور شرط باطل ہوگی، ایسا ہی امام محمد نے جامع میں ذکر کیا ہے، امام حسن بن زیاد بھی اسی کے قائل ہیں اور ابواللیث نے اسی کو ترجیح دی ہے، کیونکہ تفویض طلاق اور طلاق ملکیت نکاح سے پہلے پائی گئی، اور یہ باطل ہے (الخانیہ بھامش الہندیہ ۳۲۹/۳)۔

۲۔ عورت شرط لگائے کہ میں نے اپنی شادی تم سے اس شرط پر کی کہ میرا معاملہ میرے ہاتھ میں ہوگا جب چاہوں اپنے اوپر طلاق واقع کروں، یا جب جب چاہوں اپنے اوپر طلاق واقع کروں، شوہر اسے قبول کرلے، تو حق طلاق عورت کو حاصل ہوگا، کیوں کہ اس صورت میں ملکیت نکاح کے بعد تفویض طلاق ہو رہی ہے، کیوں کہ مشہور قاعدہ ہے "السوال معاد فی الجواب" (الاشباہ لابن نجیم ۷۷/ طبع دارالفکر)۔

"خانیہ" میں ہے:

"کیونکہ شوہر نے عورت کے کلام کے بعد "قبلت" میں نے قبول کیا کہا، اصول یہ ہے کہ جواب سوال کے مضمون کو شامل ہوتا ہے، لہذا گویا کہ اس نے یہ کہا "میں نے عقد نکاح قبول کیا اس شرط پر کہ معاملہ (طلاق تمہارے ہاتھ میں ہوگا" بس یہاں تفویض طلاق نکاح کے بعد پایا گیا" (خانیہ علی الہندیہ ۳۲۹/۳)۔

مذکورہ تفویض طلاق کے اصول کے مطابق عورت کو پہلی صورت "جب چاہوں" بمعنی "إذا أردت، متی أردت" میں حق طلاق انشاء عقد کی مجلس تک محدود ہوگا، دوسری صورت "جب جب چاہوں" بمعنی "کلما ارید" میں عقد کی مجلس اور اس کے بعد جب چاہے وہ اپنے اوپر طلاق واقع کر سکتی ہے، لیکن پہلی صورت میں ایک ہی بار طلاق دینے کا اختیار ہوگا، اور دوسری صورت میں اس ملکیت نکاح کی تین طلاق تک دے سکتی ہے۔

## طلاق کے بے جا استعمال سے روکنے کے تدبیر

اگر عقد نکاح کے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کا مہر بیس ہزار اور اگر اس نے طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار ہے۔

## دوسرا نکاح نہ کرنے کی شرط

اگر نکاح کرتے وقت اس طرح مہر طے کیا کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقد میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس عورت کا مہر تیس ہزار ہوگا، اور اگر کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر پندرہ ہزار ہوگا۔

مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں بلا اختلاف نکاح درست ہے، اس لئے کہ شرط فاسد سے نکاح باطل نہیں ہوتا "النکاح لا یبطل بالشرط الفاسد" (المبسوط ۹۵/۵، الہدایہ ۳۳۱/۲، فتح القدیر ۱۱۰/۳)۔

امام زفر کے نزدیک دونوں شرطیں فاسد ہیں، اور مہر مثل لازم ہوگا، امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک دونوں شرطیں درست ہیں اور شرط کے تحت مہر مسمی لازم ہوگا، امام ابوحنیفہ کے نزدیک شرط کو بروئے کار لانے کی صورت میں مہر مسمی اور شرط کی خلاف ورزی کی حالت میں مہر مثل لازم ہوگا (دیکھئے: بدائع ۲۸۵/۲، السراجیہ ۳۹، المبسوط ۹۰/۵، التاتارخانیہ ۱۰/۳)۔

ہمارے خیال میں امام صاحب کا قول معتدل معلوم ہوتا ہے، جس کی تائید حنفیہ کے اصول سے ہوتی ہے، علامہ زیلعی اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:

"دونوں مہر مسمی میں سے ایک فوری ہے اور ایک معلق ہے، دونوں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتے، لہذا جب شوہر عورت کو باہر سفر میں لے گیا، تو دونوں مسمی کا اجتماع ہو گیا، لہذا دونوں باطل ہو گئے، اس لئے کہ جس شئی کو کسی چیز کے وجود پر موقوف کیا جاتا ہے، اس کے پائے جانے سے پہلے وہ نہیں پائی جاسکتی، معلق کے پائے جانے سے فوری لازم شئی معدوم نہیں ہوتی، لہذا شرط کے پائے جانے کے وقت دونوں مہر مسمی کا اجتماع لازم آئے گا، نہ کہ اس کے وجود سے قبل" (تبیین الحقائق ۱۴۹/۲)۔

اور چونکہ عورت نے دوسری شادی نہ کرنے کی شرط لگائی ہے، اور یہ ایسی شرط ہے جو عقد نکاح کے مقتضی کے خلاف ہے، کیونکہ اللہ تعالی نے فرمایا: "فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنی وثلاث ورباع" (العنایہ مع الفتح ۲۳۱/۳) پس شادی نہ کرنے کی شرط لگانا ایک مشروع چیز سے روکنا ہے۔

پھر امام صاحب کا قول کہ اصل مہر واجب مہر مثل ہے، ظاہر حال کہ موافق ہے، لہذا مہر مثل کے بجائے مقرر مہر اس وقت درست ہوگا جب کہ وہ ہر اعتبار سے درست ہو، چنانچہ صاحب ہدایہ نے ایک جگہ اس طرف اشارہ فرمایا ہے:

''والظاهر شاهد لمن يشهد له مهر المثل لأنه هو الموجب الأصلي في باب النكاح'' (هدايه مع الفتح ۳-۲۵۱)

اس سے معلوم ہوا کہ صاحب ہدایہ کے نزدیک امام صاحب کا قول راجح ہے، اسی طرف امام زیلعی کا بھی رجحان معلوم ہوتا ہے (دیکھئے: تبیین الحقائق ۲/۱۴۹) اور صاحبین کی رائے میں لوگوں کے لئے کشائش ہے۔

## نکاح کے بعد شرائط نامہ تحریر کرنا (ج ''۴'')

عقد نکاح کے بعد دوران زوجیت تفویض طلاق خواہ وہ تحریری شکل میں ہو یا زبانی بلا اختلاف درست ہے، چنانچہ اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہا تمہارے اختیار میں تین طلاق ہے، اس شرط پر کہ تم اپنا مہر معاف کردو "امر ثلاث تطليقات بيدك ان ابرئتني عن مهرك" عورت نے جواب میں کہا مجھے طلاق کا وکیل بنادو، مرد نے اس سے کہا: ٹھیک ہے، تم میری وکیل ہو، تم اپنے آپ کو طلاق دے لو، عورت مجلس سے اٹھ کھڑی ہوئی، طلاق کا اختیار ساقط ہوگیا، اگر وہ اب اپنے اوپر طلاق واقع کرتی ہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی، اس لئے کہ عورت کو طلاق کا وکیل بنانا دراصل طلاق کا مالک بنانا ہے اور تملیک میں حق طلاق مجلس ہی تک رہتا ہے، وہاں اگر مجلس ہی میں اپنے اوپر طلاق واقع کرتی ہے تو واقع ہو جائے گی بشرطیکہ وہ پہلے مہر معاف کردے، اگر اس نے مہر معاف نہیں کیا تو طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ تفویض طلاق مہر سے برات پر متعلق ہے (الخانیہ بھامش الہندیہ ۳/۵۲۱)۔

## عورت کا ملازمت سے سبکدوش نہ ہونے کی شرط (۴)

ملازمت کی خواہش مند عورتیں اگر نکاح کے وقت اپنے ہونے والے شوہر سے یہ شرط لگاتی ہیں کہ شوہر انہیں لگی ہوئی ملازمت سے نہیں روکے گا یا اگر آئندہ انہیں کوئی مناسب ملازمت ملے تو شوہر انہیں ملازمت سے نہیں روکے گا اور اس شرط کو ہونیوالا شوہر عقد نکاح کے وقت قبول کرتا ہے۔

شرعی نقطہ نظر سے شوہر پر ایسی شرط کو پورا کرنا لازم نہیں ہے، کیونکہ یہ شرط مقصد نکاح کے خلاف ہے، لہذا عقد نکاح درست ہوگا، اور شرط باطل ہو جائے گی، یہ حنفیہ (المبسوط ۵/۹۵، الخانیہ بھامش الہندیہ ۳/۳۳۱) اور شافعیہ کا مذہب ہے (دیکھئے: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۹۳)، حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک شرط درست ہے، البتہ حنابلہ مشروط کو بروئے کار لانا ضروری قرار دیتے ہیں، اور مالکیہ مشروط کو عملی جامہ پہنانے کو ناپسند کرتے ہیں (دیکھئے: حوالہ سابق)۔

پس اگر شوہر عورت سے مطالبہ کرے کہ وہ ملازمت سے سبکدوش ہو جائے یا یہ کہ وہ ملازمت حاصل کرنے کی سعی ترک کردے تو عورت پر حکم کی تعمیل واجب ہے ورنہ وہ ناشزہ ہوگی، اور شوہر پر اس کا نفقہ لازم نہیں ہوگا، کیونکہ شوہر کی اجازت کے بغیر ملازمت پر جانے سے شوہر کا حق متاثر ہو رہا ہے، اسی بنیاد پر فقہاء لکھتے ہیں کہ عورت کے لئے روا نہیں کہ وہ شیر خوار بچے کو اجرت پر لے اور دودھ پلائے، اگر چہ وہ گھر سے باہر نہیں جائے گی، لیکن اسے بچے کی نگہداشت ونگہبانی میں وقت صرف کرنا ہوگا، اور بدن کا تکان ہوگا جس کی وجہ سے شوہر کما حقہ اس سے متمتع نہیں ہوسکتا (الدر المختار ورد المحتار ۳/۵۷۷) اس کی علت پر علامہ شامی روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''لأن في الإرضاع والسهر تعب وذلك ينقص جمالها وجمالها حق الزوج فكان له أن يمنعها'' (رد المحتار ۳-۵۷۷)

(کیونکہ دودھ پلانے اور شب بیداری میں تکان ہوگا جس کی وجہ سے اس کے حسن وجمال میں منفی اثر مرتب ہوگا، اور حسن وخوبصورتی شوہر کا حق ہے، لہذا اسے اختیار ہے کہ عورت کو اس عمل سے باز رکھے)۔

لہذا مذکورہ صورت میں شوہر کے لئے شرط کی تکمیل واجب نہیں، بلکہ اسے حق حاصل ہے کہ عورت سے ملازمت سے سبکدوشی کا مطالبہ کرے، یا اگر وہ ملازمت کی تلاش میں ہے تو اسے باز رکھے، اگر عورت اپنے عمل سے باز نہیں آتی تو نافرمان سمجھی جائے گی، اور شوہر کے ذمہ سے نفقہ ساقط ہو جائے گا، اس لئے کہ ملازمت کے لئے آمد ورفت میں نقصانات اور فتنے الگ ہیں اور مرد کا بھی احتباس ہے وہ مفقود ہو رہا ہے۔

☆☆☆

# نکاح میں شرط کے ذریعہ خواتین کو حق طلاق

مولانا محمد طیب الرحمن[1]

عقد نکاح کے ساتھ عائد کردہ شرطوں کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ان تینوں قسم کی شرائط کے بارے میں شریعت کا حکم مع الدلائل ذیل میں مرقوم ہے۔

(۱) ایسی شرائط جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ خود عقد نکاح سے جو ذمہ داری کسی فریق پر عائد ہوتی ہو، اس کو اگر شرط کی صورت میں عقد نکاح کے وقت ذکر کردیا جائے تو یہ شرعا جائز ہے، مثلا بیوی کا یہ شرط لگانا کہ شوہر اس کے ساتھ نیک زندگی گزارنا ہوگا، اس کا نفقہ، سکنی شوہر کے ذمہ ہوگا، ایسا ہی زوج کا یہ شرط لگانا کہ بیوی ان کی اجازت کے علاوہ ان کے گھر سے نہ نکلے، نفل روزہ نہ رکھے، ان کے مال واسباب میں تصرف نہ کرے اور اس جیسی شرائط۔

مشکوۃ میں حضرت عقبہ بن عامر سے مروی ہے، انہوں نے کہا: "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج" (متفق علیہ) (نیز دیکھئے: مرقات المفاتیح ۶/ ۲۱۱، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۴/ ۸۰ وغیرہ)۔

(۲) نکاح کے وقت کسی فریق کا ایسی کوئی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز کرنا ہو، مثلا شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان ونفقہ اس کے ذمہ نہ ہوگا تو ایسی شرط لگانا شرعا جائز نہیں ہے، البتہ ایسی شرط لگانے سے عقد نکاح پر کوئی اثر نہ ہوگا، بلکہ نکاح بدستور منعقد ہوجائے گا، ایسی شرط کی پابندی متعلقہ فریق کے لئے ضروری نہیں ہوگی، بلکہ شرط لغو ہوگی اور اس پر عمل نہ کیا جائیگا (دیکھئے: فتاوی قاضی خاں ۱/ ۳۳۱، فتاوی ہندیہ ۱/ ۳۹۰، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۴/ ۸۰)۔

(۳) عقد نکاح کے وقت کوئی فریق اگر ایسی شرط لگائے جو عقد نکاح سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کے قبیل سے نہیں ہے اور نہ اس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز کرنا ہے، بلکہ اس کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہ ہوتی، مثلا عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہ کرے گا یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا، ایسی شرط لگانے سے عقد نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، البتہ یہ شرط لازم الایفاء نہیں ہے، بلکہ ایک وعدہ کے درجہ میں ہے جس کو پورا کرنا بھی اس کے لئے ضروری ہے، کیونکہ وعدہ کے خلاف کرنا حرام ہے (دیکھئے: بدائع الصنائع ۲/ ۲۸۵، ۲۷۷، عنایہ علی الہدایہ ۲/ ۴۵۸، الاشباہ والنظائر ۲/ ۴۵۲)۔

(ج) عقد نکاح کے وقت اگر عورت کی طرف سے ایجاب ہو اور عورت یہ شرط لگائے کہ اس کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا یا فلاں فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، اور شوہر اس شرط کو تسلیم کرتے ہوئے قبول کرے تو یہ شرعا جائز ہے اور اس شرط کی وجہ سے عورت کو طلاق کا اختیار ہوگا، لیکن ایجاب اگر شوہر کی طرف سے ہو تو شرط بے کار ہوگی اور عورت کو طلاق کا اختیار نہ ہوگا، نکاح کے وقت اگر شوہر بیوی کو طلاق کا حق تفویض کرے تو بعد میں اس تفویض طلاق کو ختم کرنے کا اختیار ان کو نہ رہے گا (دیکھئے: فتاوی قاضی خان ۱/ ۳۳۹، فتاوی ہندیہ ۱/ ۱۱۲، رد المحتار ۲/ ۶۵۵، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۴/ ۳۲۸)۔

[1] ☆ سابق امیر شریعت، صوبہ آسام۔

## نکاح میں شرط کی تین صورتوں کے احکام

(۱) عقد نکاح سے پہلے اگر شرائط طے ہوجائیں اور اس کی تحریر پر طرفین کے دستخط ہوجائیں تو اس کے معتبر ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ اس میں نکاح کی طرف اضافت موجود ہو، مثلاً یہ شرط طے کی جائے اور ازواج کی طرف سے لکھا جائے کہ فلانہ بنت فلاں کے ساتھ میں اگر نکاح کروں تو ان کو فلاں فلاں شکلوں میں اپنے اوپر طلاق بائن واقع کرنے کا حق ہوگا تو ایسی صورت میں اس شرط کی وجہ سے عورت کو طلاق کا اختیار حاصل ہوگا، اور اگر اس میں اضافت الی النکاح نہ ہوئے تو اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اور اس کی وجہ سے عورت کو طلاق کا اختیار حاصل نہ ہوگا، کیوں کہ عقد نکاح سے پہلے زوج کو طلاق کی ملکیت نہیں ہوتی اور ملکیت سے پہلے تفویض نہیں ہوسکتی (دیکھئے: درمختار ورد المحتار ۲/ ۶۲۸)۔

(۲) عقد نکاح کے وقت اگر شرائط کا ذکر کیا جائے اور مشروط ایجاب ہو اور وہ عورت کی طرف سے ہو تو قبول مطلق ہو یا مشروط یعنی شوہر چاہے یہ کہے کہ میں نے قبول کیا، اور چاہے یوں کہے کہ میں نے شرائط کے ساتھ قبول کیا، دونوں صورتوں میں شرط معتبر ہوگی اور عورت کو طلاق کا اختیار ہوگا، عورت کی طرف سے شرط تفویض کو ذکر نہ کرتے ہوئے اگر مطلق ایجاب ہو اور شوہر کی طرف سے شرط تفویض کو اضافہ کرتے ہوئے مشروط قبول ہو تو بھی تفویض صحیح ہوگی اور عورت کو طلاق کا اختیار ہوگا، لیکن ایجاب اگر شوہر کی طرف سے ہو اور وہ ایجاب کے وقت شرط لگائے اور عورت اس شرط کو تسلیم کرتے ہوئے قبول کرے تو شرعاً اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اور عورت کو طلاق کا اختیار نہ ہوگا، کیونکہ ابتداء اگر زوج کی طرف سے ہو تو تفویض نکاح کے تمام ہونے کے پہلے ہوگی اور یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ شوہر اس وقت طلاق کا مالک ہی نہیں ہے، لیکن ابتداءاً اگر عورت کی طرف سے ہو تو تفویض نکاح کے بعد ہوگا اور زوج عورت کے مشروط ایجاب کے بعد جب قبول کرتا ہے تو زوج کے "قبلت" کہنے کو مطلب یہ ہوگا کہ میں اس شرط پر قبول کرتا ہوں کہ تجھے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، چونکہ جواب مافی السوال کے اعادہ کا متضمن ہوتا ہے، پس تفویض بعد النکاح ہوگا لہذا عورت کو طلاق کا اختیا ہوگا (دیکھئے: فتاوی قاضی خاں ۱/ ۳۲۹، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۴/ ۸۱، رد المحتار ۲/ ۳۷۹)

(۳) عقد نکاح کے بعد مابین طرفین اگر کوئی شرائط نامہ تحریر کیا جائے تو وہ معتبر ہے، کیونکہ ایسی صورت میں اس کے معتبر ہونے کی راہ میں کوئی مانع نہیں۔

شریعت نے طلاق کا اختیار شوہر کے ہاتھ میں رکھا ہے، تفویض کے نتیجہ میں یہ اختیار عورت کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جس سے مصالح شرع کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، کیونکہ عورت اکثر ناقص العقل ہے اور ان میں صبر کا مادہ بھی مرد کی نسبت سے کم ہے، اس لئے ان کی طرف سے طلاق کے بے جا استعمال کا احتمال غالب ہے، اس لئے مصالح شرع کی حفاظت کے لئے تفویض میں ایسی کوئی قید بڑھانا مناسب ہے جس سے طلاق کے بے جا استعمال کا سد باب ہوسکے اور وہ جانبین کے لئے مفید بھی ہوسکے، مثلاً تراضی طرفین سے مناسب سمجھ کر چند اشخاص کے نام متعین کردیا جائے پھر شرائط کو ذکر کرتے ہوئے زوج یہ لکھے کہ مذکورہ شرائط میں سے کسی شرط کے خلاف اگر ان کی طرف سے ہو اور اس خلاف شرع ہونے کو مذکورہ اشخاص میں سے کم سے کم دو شخص تسلیم کریں تو عورت کو طلاق کا اختیار ہوگا، مزید احتیاط کے لئے یہ قید بھی بڑھائی جاسکتی ہے کہ وہ دونوں شخص درپیش حالات میں عورت کے لئے طلاق کو اختیار کرنا مناسب بھی قرار دیں، ایسی قید لگانے سے تسلیم کردہ اشخاص میں سے کم سے کم دو شخص کے تسلیم کرنے اور مناسب سمجھنے کے علاوہ عورت کے ہاتھ میں طلاق کا اختیار نہ آئے گا، یہاں مناسب یہ ہے کہ شرائط نامہ میں کم از کم دس آدمیوں کے نام تراضی طرفین سے متعین کرکے لکھ دئے جائیں کیوں کہ دو چار کا نام لکھنے میں ممکن ہے کہ بوقت ضرورت ان میں سے کوئی بھی موجود نہ رہے اور زیادہ آدمیوں میں یہ احتمال بعید ہے، جیسا کہ حاشیہ "الحیلۃ الناجزۃ" ہندوستان کے جن علاقوں میں قاضی شرعی موجود ہیں وہاں یہ صورت بھی اختیار کی جاسکتی ہے کہ وہاں یہ قید بڑھائی جائے کہ شوہر کی طرف سے خلاف شرط ہونا اگر قاضی شرعی تسلیم کریں اور درپیش حالات میں قاضی شرعی عورت کے لئے طلاق کو اختیار کرنا مناسب قرار دیں تو عورت کو طلاق کا اختیار ہوگا۔

(۱) عقد نکاح کے وقت اگر اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو اس کے آبائی وطن سے باہر نہیں لے جائے گا تو مہر ایک ہزار ہوگا،

اور اگر بیوی کو اس کے آبائی وطن سے باہر لے گیا تو اس کا مہر دو ہزار ہوگا، اس مسئلہ میں صاحبین کے نزدیک دونوں شرطیں درست قرار پاتی ہیں اور ہر صورت میں مہر مسمی لازم ہوتا ہے، اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک پہلی صورت میں مہر مسمی لازم ہوتا ہے اور دوسری صورت میں مہر مسمی کا اعتبار نہیں ہوتا ہے بلکہ دوسری شرط پائے جانے کی صورت میں مہر مثل لازم ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ اقل مسمی سے کم نہ ہوگا اور اکثر مسمی سے زیادہ نہ ہوگا اور اس مسئلہ کی نظیر وہ صورت بھی ہوگی کہ اگر نکاح کے وقت اس طرح مہر طے ہو کہ شوہر نے بیوی کو طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار ہے، اور اگر اس نے طلاق دی تو عورت کا مہر بیس ہزار تو ایسی حالت میں بھی صاحبین کے نزدیک دونوں صورتوں میں مہر مسمی لازم ہوگا، امام صاحب کے نزدیک اگر شوہر نے بیوی کو طلاق نہ دی تو مہر مسمی لازم ہوگا، اور اگر طلاق دی تو مہر مسمی کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ مہر مثل لازم ہوگا بشرطیکہ وہ مہر مسمی کے اقل سے کم نہ ہو اور اکثر سے متجاوز نہ ہو۔

اب کسی مسئلہ میں اگر امام صاحب اور صاحبین کے درمیان اختلاف ہو تو امام صاحب کے قول کی ترجیح ہوتی ہے، یہ بات بالکل صحیح ہے کہ طلاق کے غلط استعمال سے خاص طور پر ایک ساتھ تین طلاق دینے سے بڑی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں جس سے مرد و عورت اور خاندان سب ہی متاثر ہوتے ہیں، لہذا طلاق دینے کے ایسے غیر مشروع اقدام کو روکنے کی ضرورت ہے، لیکن عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مہر کی مقدار زیادہ کم کرنے سے طلاق کے غیر مشروع اقدام میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، اس لئے احقر کے خیال میں طلاق کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے امام صاحب کے قول سے عدول کرتے ہوئے صاحبین کے قول کو فتوی کے لئے اختیار کرنے کی کوئی وجہ نہیں نکلتی۔

(دیکھئے: فتاوی ہندیہ ۱/ ۳۰۷، عنایہ شرح الہدایہ ۲/ ۴۵۸، الدر المختار ورد المحتار ۱/ ۴۷)۔

(۲) اگر نکاح کرتے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس عورت کا مہر تیس ہزار ہوگا اور اگر اس کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر پندرہ ہزار ہوگا تو ایسی صورت میں بھی صاحبین کے قول کی بناء پر دونوں شرطیں معتبر اور لازم العمل ہوں گی، لیکن امام ابوحنیفہ کے قول کی بناء پر اگر اس عورت کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو شرط معتبر اور لازم العمل ہوگی اور اگر کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو شرط معتبر نہ ہوگی بلکہ مہر مثل واجب ہوگا بشرطیکہ اقل مسمی سے کم نہ ہو اور اکثر سے زائد نہ ہو، اور حسب قواعد فقہیہ امام صاحب کے قول کو ترجیح ہوگی۔

(۳) عورت اگر کسی ملازمت میں لگی ہوئی ہو، یا ملازمت حاصل کرنے کے لئے جدوجہد میں لگی ہوئی ہو اور نکاح کے وقت اپنے ہونے والے شوہر سے یہ شرط لگائے کہ انہیں لگی ہوئی ملازمت سے نہیں روکے گا، یا آئندہ انہیں کوئی مناسب ملازمت کرنے سے نہیں روکے گا، اور اس شرط کو ہونے والا شوہر عقد نکاح کے وقت قبول کرتا ہے تو یہ شرط خلاف وعدہ کے درجہ میں ہوگی، کیونکہ یہ شرط شرائط مباحہ کے قبیل سے ہے، شرط قبول کرنے کی وجہ سے وہ واجب الایفاء ہے، کیونکہ وعدہ کے خلاف کرنا حرام ہے، البتہ کسی مانع شدید کی وجہ سے کوئی شخص ایفاء عہد نہ کرسکے تو اس میں گناہ نہیں ہے، البتہ عورت اگر ملازمت کی وجہ سے حقوق زوجیت ادا نہ کرسکے یا ملازمت یا ملازمت کی وجہ سے حدود شرعیہ کو تجاوز کرنا پڑے تو ایسی صورت میں شوہر کے لئے اس شرط کی پابندی ضروری نہیں ہوگی، بلکہ شوہر اگر عورت کو سلسلہ ملازمت ختم کرنے کا حکم دیتا ہے تو عورت کے لئے شوہر کے حکم کی تعمیل ضروری ہوگی، ایسا ہی عورت جس نئی ملازمت سے وابستہ ہونا چاہتی ہے اس سے حدود شرعیہ سے تجاوز کرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے شوہر انہیں ایسی نئی ملازمت سے وابستہ ہونے سے روکتا ہے، تو عورت کے لئے اس کے حکم کی تعمیل ضروری ہوگی۔

(دیکھئے: الکوکب الدری، الدر المختار ورد المحتار ۵/ ۳۳۵، ۵/ ۴۴، ۴۵)۔

☆☆☆

# نکاح میں شرائط اور خواتین کے حقوق کا تحفظ

مفتی عزیز الرحمن فتحپوری

عقد نکاح کے وقت جو شرائط عائد کئے جائیں ان کے متعلق بدیہی طور پر یہ سمجھا جاسکتا ہے:

(۱) ایسے شرائط جس کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی نئی ذمہ داری عائد نہیں، بلکہ عقد نکاح سے ہونے والی ذمہ داریوں کو بصورت شرط ذکر کیا گیا ہے اس سے صورت حال میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوتی، لہذا ایسی شرائط اگر ذکر بھی کردی جائیں تو کوئی سوال پیدا نہ ہوگا۔

(۲) شرائط کی دوسری قسم یعنی نکاح کے وقت کسی فریق کا ایسی کوئی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو ایسی شرط قابل قبول نہیں ہوا کرتی، حضرات فقہاء نے مسئلہ خلع میں اس صورت میں جب کہ عورت نفقہ عدت اور سکنی کے عوض خلع حاصل کرلے یہ تصریح کی ہے کہ سکنی چونکہ حق شرع ہے اس لئے وہ ساقط نہ ہوگا: "لا سکنی لأنه حق الشرع" (درمختار) اس سے بطور اصول یہ مفہوم نکلتا ہے کہ وہ شرائط جو حق شرعی یا حق ثابت بالشرع پر اثر انداز ہوں نکاح کے وقت کوئی بھی فریق انھیں عائد کرے ان کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، چنانچہ اگر اس طرح اس شرط پر کیا جائے کہ شوہر کے ذمہ میں کوئی مہر لازم نہ ہوگا تو فقہاء لکھتے ہیں کہ اس صورت میں بھی عورت مہر مثل پائے گی (دیکھئے: الدر مختار ورد المحتار ۲/ ۲۶)۔

اس سے سوال کا جواب بھی معلوم ہوگیا کہ ایسی شروط انعقاد نکاح میں قطعاً اثر انداز نہ ہوں گی یعنی نکاح تو منعقد ہوجائے گا لیکن یہ شرائط باطل قرار پائیں گے۔

(۳) تیسری قسم، یعنی ایسی مشروط جو (۱) اور (۲) میں سے کسی دائرہ میں نہیں آتیں، بلکہ ان کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوجاتا ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہیں ہوتا، بیشتر ان کی حیثیت ایک وعدے کی ہے ان شرائط کی کئی قسمیں کی جاسکتی ہیں، مثلاً یہ شروط یا تو عورت کے لئے مفید ہونگی یا شوہر کے لئے، کسی اجنبی کے لئے مفید ہوں گی یا کسی کے حق میں مضر ہوں گی، پھر یہ تمام شرائط یا تو نفس عقد سے حاصل ہوں گی یا زوج (یا زوجہ) کے فعل پر موقوف ہوں گی۔

ان کے ساتھ مہر کا ذکر بھی ہو، مثلاً ایک ہزار پر نکاح اس شرط کے ساتھ کہ شوہر اسے دوسرے شہر نہ لے جائے گا (نكحها بالف على ان لا يخرجها من البلد أو لا يتزوج عليها) اس صورت کا ذکر کرتے ہوئے مزید تفصیل کے ساتھ علامہ شامی نے بحر کے حوالہ سے جملہ دوسو اٹھاسی (۲۸۸) اقسام نقل کی ہیں، اقسام میں جو خلاف شرع ہوں گی، وہ تو بالکل باطل ہوں گی باقی کی حیثیت ایک وعدے کی ہے، اگر کسی کو ان سے ضرر نہیں پہنچتا اور شوہر انھیں پورا کرتا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن یہ شرائط پوری نہ کی جائیں تو بھی نکاح پر اثر انداز نہ ہوں گی (بشرطیکہ انھیں طلاق سے مشروط نہ کیا گیا ہو) البتہ اگر نفس عقد میں انہیں مہر کے ساتھ ملحق کیا گیا ہے تو عورت مہر مثل کی حقدار قرار دی جائے گی تاہم شرائط کی یہ جملہ اقسام نفس عقد پر کسی طرح اثر انداز نہ ہوں گی نکاح بہر حال صحیح مانا جائے گا

(ج) شرعاً طلاق کا حق شوہر کو ہے بموجب حدیث نبوی: "الطلاق لمن أخذ الساق" شریعت نے عورتوں کی نفسیات دیکھتے ہوئے انھیں یہ حق نہیں دیا، جو لوگ انسانی مزاجوں سے واقفیت رکھتے ہیں اور جنھوں نے عورتوں اور مردوں کی ذہنی اور مزاجی کیفیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے ان پر یہ بخوبی واضح ہے کہ اگر طلاق کا حق عورت کو دیا گیا ہوتا تو معاشرہ میں جو آج طلاق کا تناسب ہے یہ بیسوں گنا زیادہ ہوتا، لہذا شرع اسلامی نے عورت کو یہ حق اسی لئے نہیں دیا تاکہ مصالح نکاح کے فوت ہونے کا اندیشہ قوی تر نہ ہوجائے، تاہم شوہر کو یہ اختیار حاصل ہوجاتا ہے کہ شوہر

کے دیئے ہوئے اختیار کے مطابق اپنے اوپر طلاق واقع کرلے پھر عورت کا یہ اختیار عارضی بھی ہوسکتا ہے اور دائمی بھی، فقہاء نے اسے تفویض طلاق، امر بالید اور مشیت بالطلاق وغیرہ عنوانات کے تحت بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے، یہ اختیار جو شوہر عورت کو دیتا ہے عقد نکاح میں بھی مشروط ہوسکتا ہے، اور بعد میں بھی جب شوہر چاہے یہ حق اسے تفویض کرسکتا ہے، فساد زمانہ کے مدنظر اگر ایسی کوئی شرط لگائی جائے یا کابین نامہ تحریر ہو تو اس میں احتیاط کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھا جانا ضروری ہے، حضرت تھانویؒ نے ''الحیلۃ الناجزۃ'' میں تفویض طلاق بوقت نکاح کے عنوان سے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے مناسب مشورے بھی دیئے ہیں تاکہ نکاح کے مصالح بھی فوت نہ ہونے پائیں اور ضرورت بھی پوری ہوجائے، اس موقع پر سب سے پہلے تو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ یہ تفویض طلاق کے سلسلہ کی تحریر جسے ''الحیلۃ الناجزۃ'' میں کابین کا عنوان دیا گیا ہے اس کے تحریر کئے جانے کی تین صورتیں ہیں:

(۱) کابین نامہ نکاح سے پہلے لکھوایا جائے (۲) عین وقت نکاح میں زبان سے کہلوالیا جائے (۳) نکاح کے بعد تحریر کیا جائے۔

پہلی صورت میں یعنی کابین نامہ نکاح سے پہلے لکھا جائے (اور ایجاب وقبول میں بطور شرط اس کا زبانی کوئی تذکرہ نہ ہو) اس کے معتبر ومفید ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ اس میں نکاح کی طرف اضافت ہو، مثلاً یہ کہ اگر فلانہ بنت فلاں سے نکاح کروں اور پھر مندرجہ اقرار نامہ ہذا میں سے کسی شرط کی خلاف ورزی کروں تو مسماۃ مذکورہ کو یہ اختیار حاصل ہوگا الخ، اگر اس میں اضافت الی النکاح نہ ہوتو بموجب حدیث نبوی طلاق قبل الملک یہ اقرار نامہ بے کار محض ہوگا، "فلغا قوله لأجنبية إن زرت زيدا فأنت طالق" (تنویر الأبصار)۔

دوسری صورت یہ تھی کہ ایجاب وقبول میں زبانی شرائط مذکور ہوں، اس کے صحیح اور معتبر ہونے کی شرط یہ ہے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو یعنی پہلے عورت یا اس کا ولی یا وکیل عقد نکاح کے وقت یہ کہے کہ میں نے اپنے آپ کو یا فلاں بنت فلاں کو تیرے نکاح میں اس شرط پر دے دیا کہ اگر تم نے یہ کیا، یا یہ نہ کیا تو اپنے معاملہ کا اختیار مجھے، یا مسماۃ فلاں کو ہوگا الخ، اس کے جواب میں شوہر یہ کہے کہ میں نے قبول کیا، یہ صورت اختیار کرنے کے بعد حسب شرط عورت کو طلاق کا اختیار حاصل ہوجائے گا، اس کے برخلاف اگر ایجاب مرد کی جانب سے بغیر کسی شرط کے ہو اور لڑکی یا اس کے ولی یا وکیل نے قبول کے ساتھ تفویض طلاق کی شرط لگادی تو نکاح بلا کسی شرط کے صحیح ہوجائے گا اور یہ شرط لغو ہوگی (شامی ۲/۶۹۷) حضرت تھانوی نے فقیہ ابواللیث کے حوالے سے ان دونوں صورتوں کا فرق بھی بیان فرمادیا ہے۔

تیسری صورت یہ تھی کہ نکاح کے بعد کوئی اقرار نامہ اس قسم کا شوہر سے لکھوالیا جائے یہ صورت بھی بالکل صحیح اور درست ہے، حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ مصائب کے وقت خلاصہ کی اصل تدبیر پہلی یا دوسری صورت ہی اختیار کرنا ہے، اور ان میں بھی آسان صورت جس میں عوام کے مغالطے میں پڑنے کا اندیشہ نہیں وہ صرف پہلی ہی صورت ہے کہ عقد سے پہلے ہی کابین لکھوالیا جائے، مگر اس میں اضافت الی النکاح ضرور ہونا چاہئے، اگر اس طرح عقد نکاح کے وقت یہ شرط عائد کردی گئی اور شوہر نے اسے تسلیم کرلیا تو شرعاً یہ شرط معتبر ہوگی اور شرط کے مطابق عورت کو طلاق کا اختیار حاصل ہوجائے گا، البتہ نوعیت اس اختیار کی الفاظ شرط کے مطابق ہوگی، تفویض طلاق کے بعد شوہر کو اس سے رجوع کا حق باقی نہیں رہتا ''الحیلۃ الناجزۃ'' میں بحوالہ در مختار منقول ہے:

''ولا يملك الزوج الرجوع منه أي من التفويض بأنواعه الثلاثة لما فيه معنى التعليق قال الشامي: قوله الثلاثة أي التخيير والأمر باليد والمشيئة الخ''

عورتوں کی نفسیاتی اور مزاجی کیفیت کے لحاظ سے طلاق کو مطلقاً اس کے ہاتھ میں دے دینا خطرے سے خالی نہیں ہے، اس لئے تفویض میں مناسب قیود کا اضافہ بھی کردینا چاہئے جس سے یہ خطرہ نہ رہے، مثلاً یہ کہ عورت یا اس کا ولی یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو، یا مسماۃ فلاں کو اس شرط پر نکاح میں دے دیا کہ جس وقت تم سے کوئی شدید تکلیف پہنچے یا فلاں فلاں شرط کی خلاف ورزی ہو جس کو فلاں فلاں اشخاص میں سے کم از کم دس آدمی تسلیم کرلیں تو اس کے مسماۃ کو ہر وقت یہ اختیار حاصل ہوگا کہ اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر نکاح سے علحدگی اختیار کرلے، اس صورت میں طلاق کا اختیار عورت کو اس وقت حاصل ہوگا جب نامزد کردہ افراد میں سے کم از کم دو آدمی یہ تسلیم کرلیں کہ شرط کی خلاف ورزی ہوئی ہے، عورت کو اس

کے باوجود جلد بازی نہ کرنی چاہئے کہ پہلے سنت کے موافق استخارہ کر لے اور اپنے خیر خواہوں سے ضروری مشورہ بھی کر لے۔

اس تعلیق میں اگر یہ الفاظ استعمال کئے گئے کہ شرط کی خلاف ورزی تسلیم کر لئے جانے کی صورت میں عورت اگر چاہے تو خود پر طلاق واقع کر کے نکاح سے علحدگی اختیار کر لے تو یہ تفویض خاص اس مجلس کے ساتھ پیدا ہو جائے گی جس میں شرط واقع ہوئی ہے، اس کے بعد عورت کو یہ اختیار نہ رہے گا، اسی طرح اگر یہ کہا گیا کہ عورت جب بھی چاہے تو خود پر طلاق واقع کر لے، اس صورت میں ہمیشہ کے لئے اسے یہ اختیار حاصل ہو جائے گا اور مصلحت نکاح کے پیش نظر نہ تو اختیار کو اتنا وسیع کر دینا مناسب ہے نہ ہی اتنا محدود کر دینا، مفید مطلب یہ ہے کہ صرف مجلس شرط کے ساتھ خاص ہو کر رہ جائے، اس لئے مناسب یہ ہے کہ ایسے الفاظ استعمال ہوں کہ صرف ایک ہی مرتبہ طلاق دینے کا اختیار حاصل ہو، لیکن اس مجلس کے ساتھ متقید نہ ہو، مثلاً ایک ماہ تک کی مدت ذکر کر دی جائے تا کہ عورت اس مدت میں مشورے اور غور وفکر کر کے صحیح فیصلہ کر سکے، سوال کی یہ شق کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کا مہر بیس ہزار اور نہ دی تو دس ہزار ہوگا، اس کی نظیر وہی مسئلہ ہے جس کا حوالہ سوالنامہ میں درج ہے، فقہاء کے الفاظ میں یہ "تسمية المهر علی تقدیر وغیرها علی تقدیر" کی صورت ہے جس کا حکم یہ ہے کہ اگر شرط پوری کی تو عورت کو اقل مسمی ملے گا، لیکن شرط پوری نہ کرنے کی صورت میں اسے مہر مثل دیا جائے گا، مگر اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مہر مثل اکثر رقم سے بھی زیادہ ہے تو اکثر مسمی سے زیادہ نہ ملے گا اور اگر اقل سے بھی کم ہے تو تو عورت اقل مسمی بہر حال پائے گی، پیش کردہ مثال میں اس کی تطبیق یوں ہوگی کہ اگر شوہر نے طلاق نہ دی تو عورت کو دس ہزار مہر ملے گا لیکن اگر طلاق دیدی تو بجائے بیس ہزار کے وہ مہر مثل کی حقدار ہوگی، مہر مثل کی مقدار میں یہاں تین احتمال ہیں: ایک یہ کہ وہ بھی بیس ہزار یا اس سے کم مگر دس سے زیادہ یا دس ہزار ہوں، ان صورتوں میں جو بھی مہر مثل ہے عورت اس کی حقدار ہوگی، لیکن مہر مثل دس ہزار سے کم ہے تو اس صورت میں دس ہزار جس پر دونوں متفق ہیں وہ دلایا جائے گا، اور اگر بیس ہزار سے زیادہ ہو تو چونکہ عورت بیس پر راضی ہے، اس لئے بیس ہزار ہی دلائیں گے، صاحبین رحمہما اللہ کے قول کے مطابق دونوں شرطیں جائز ہیں تاہم قدیم فقہاء نے اس قول کو فتوی کے لئے راجح نہیں سمجھا، لیکن موجودہ حالات میں اگر ضرورت متقاضی ہو تو اہل علم اتفاق رائے کے بعد اس کو اختیار کر لیں اس کی بھی اصولی گنجائش ہے، یہی حکم دوسری عورت سے نکاح والی صورت کا بھی ہے، یہ تمام تفصیلات اس میں بھی جاری ہو سکتی ہیں، علامہ شامی نے اس کے بعد ہی "بألفین علی أنها جميلة وبألف علی أنها قبيحة" کی تردید کو علی قول امام بھی درست بتایا ہے "لقلة الجهالة"، اس سے معلوم ہوا کہ قول امام کی بنیاد تردید نہیں اور اگر ایسی کوئی خاص وجہ نہ پائی جائے تو تردید کی صورت میں بھی ذکر کردہ مہر کے بھی خلاف ہوگا اور یہ "تغيير الاحكام بتغيير الزمان" کے قبیل سے ہوگا۔

سوال (۳)............ یعنی نکاح کے وقت عورت کا یہ شرط لگانا کہ شوہر انہیں ملازمت سے نہیں روکے گا، شوہر اگر اس شرط کو قبول بھی کر لے تو اس کی حیثیت ایک وعدے کی ہوگی اور آئندہ حالات کے مطابق اسے بہر صورت یہ حق حاصل ہوگا کہ جب چاہے عورت کو ملازمت وغیرہ سے روک دے اور جب شوہر روک دے تو عورت پر اس حکم کی تعمیل بھی لازم ہوگی، ورنہ وہ حق نفقہ سے بربنائے نشوز محروم قرار دی جا سکتی ہے۔

# نکاح میں مباح شرطیں اور احکام

مولانا ابوالحسن علی[1]

شرائط کے سلسلے میں اس حدیث شریف سے بنیادی رہنمائی ملتی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کل صلح جائز بین المسلمین إلا صلحا أحل حراما أو حرم حلالا والمسلمون عند شروطهم إلا شرطا أحل حراما أو حرم حلالا'' (رواه ابوداؤد والترمذی وابن ماجه عن عمرو بن عوف. نصب الرایه ۴۔ ۱۱۲)

(مسلمانوں کے درمیان ہر طرح کی مصالحت جائز ہے، بجز اس صلح کے جس میں کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام ٹھہرایا گیا ہو، اور مسلمانوں کو اپنی مانی ہوئی شرطوں پر قائم رہنا چاہئے، بجز ان شرائط کے جن کے ذریعہ کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دیا گیا ہو) (معارف القرآن ۲ / ۵۲۲، فتح القدیر ۳ / ۳۵۱)۔

''فتح القدیر'' میں ایک روایت شرائط نکاح کے سلسلے میں بھی ہے: "أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج (فتح القدیر ۳ / ۳۵۰)۔

احادیث مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عقد و شرط جس سے شریعت نے نہیں روکا یا بالفاظ دیگر کسی حلال کی حرمت یا حرام کی حلت ثابت نہ ہوتی ہو وہ جائز ہے، اور ان کا ایفاء ضروری ہے، اور اگر وہ شرط حرام کردہ اشیاء کو شامل ہو (چاہے اس کی حرمت کتاب اللہ کی نص خاص یا عام سے ہو یا سنت رسول سے ہو) وہ شرط منہی عنہ ہوگی، اور اس کا ارتکاب حرام ہوگا۔

معاوضہ مالیہ کے اعتبار سے شروط کی تین قسمیں ہیں:

(۱) صحیح شرط، وہ شرط بھی صحیح ہے اور عقد بھی صحیح ہے، یہ وہ شرائط ہیں کہ عقد خود ان کا تقاضہ کرے، یا عقد کے مناسب ہو یا اس سلسلے میں شرعی حکم وارد ہو یا عرف جاری ہو۔

(۲) شرط فاسد، وہ شرط بھی فاسد ہے اور عقد بھی فاسد، یہ وہ شرائط ہیں جس میں متعاقدین میں سے ایک کا نفع ہو یا ان کے علاوہ کسی مستحق کا نفع ہو اور وہ ما قبل کی شرط کے مطابق نہ ہو۔

(۳) وہ شرط جو خود تو باطل ہو، لیکن عقد صحیح ہو جاتا ہو، یہ وہ شروط ہیں جس میں اہل استحقاق کے علاوہ کا نفع ہو یہ حکم معاوضات مالیہ کا ہے، حاصل یہ ہے کہ اول شرط و عقد دونوں صحیح ہیں، (۲) ثانی عقد بھی فاسد اور شرط بھی فاسد ہے، (۳) شرط باطل اور عقد صحیح ہوگا، یہ وہ شروط ہیں جو صلب عقد (عقد سے مقارن) میں ہوں۔

## معاوضات غیر مالیہ

نکاح، خلع وغیرہ میں فاسد شرط سے فساد کا اثر نہیں ہوتا اور فاسد شرط اس کو باطل نہیں کرتی، بلکہ شرط باطل اور عقد صحیح ہو جاتا ہے۔

شرط جائز وہ شرط کہ عقد بھی اس کا تقاضہ کرے اور صراحت نہ کرے تو بھی وہ واجب ہوتی ہے، جیسے ثمن کی ادائیگی پر مبیع مشتری کے سپرد کرنے کی شرط اور عورت کا شوہر پر اپنے نفقہ کی ذمہ داری اور مہر کی ادائیگی کی شرط لگانا (الالتزامات فی الشرع الاسلامی ۲۰۹، ۲۱۱)۔

سوال میں مذکور اول شرط اسی شرط جائز کی قبیل سے ہے، لہذا ان شروط کی وجہ سے عقد میں کوئی فساد لازم نہیں آئے گا، شرط ثانی و ثالث قاعدہ کے اعتبار سے فساد کو متضمن ہونے کی وجہ سے فاسد و غیر معتبر ہیں، لیکن تعلیق و تفویض طلاق کی شرط فقہاء کرام نے احادیث شریفہ کی روشنی میں معتبر اور صحیح قرار دی ہے، لہذا یہ

[1] ☆ شیخ الحدیث دار العلوم ماٹلی والا بھروچ گجرات۔

شرطیں تفویض وتعلیق کی شرطوں کے ساتھ معتبر ہوں گی، اسی طرح مہر کی شرطیں جن کا ذکر بعد والے سوال میں ہے کہ وہ بھی ( کچھ شرائط کے ساتھ ) معتبر ہے۔

عقد نکاح کے وقت عورت کا اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق یا فلاں فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق طلب کرنا، اور شوہر کا اس کو تسلیم کرنا، عورت کو اختیار دیتا ہے، حضرات فقہاء کرام نے تفویض طلاق کے عنوان سے اس کی مختلف شکلیں اور جزئیات تحریر فرمائی ہیں، صاحب "ہدایہ" اور اور شارحین "ہدایہ" نے تفویض طلاق کے خیار پر حضرات صحابہ کرامؓ کا اجماع نقل کیا ہے، "نصب الرایہ" میں صاحب "ہدایہ" کے قول: "روى أن الصحابة أجمعوا على أن المخيرة لها الخيار مادامت في مجلسها" پر گفتگو فرماتے ہوئے لکھا ہے:

"قلت فيه عن ابن مسعود و جابر و عمر وعثمان و عبدالله بن عمر بن العاص. فحديث ابن مسعود رواه عبد الرزاق في مصنفه أخبرنا معمر عن ابن نجيح عن مجاهد أن ابن مسعود قال: إذا ملكها أمرها فتفرقا قبل أن تقضي بشئي فلا أمر لها انتهى"

"ومن طريق عبدالرزاق رواه الطبراني في معجمه قال البيهقي: فيه انقطاع بين مجاهد وابن مسعود" (نصب الرايه في تخريج احاديث الهدايه ملخصاً ۲ / ۲۲۹،۲۳۰)

سوالنامہ میں مذکورہ تینوں شکلیں جائز ہیں: (۱) چاہے عقد نکاح سے پہلے شرائط طے ہوں، (۲) چاہے عقد کے وقت ہوں، (۳) چاہے عقد نکاح کے بعد شرائط نامہ تحریر ہو۔

**شکل اول:**......اور اس کے صحیح اور معتبر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں طلاق کی اضافت ملک کی طرف ہو، اگر اضافت الی النکاح نہیں ہوئی تو شرائط کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا اور یہ شرائط نامہ لغو ثابت ہو کر صرف وعدے کی حیثیت رکھے گا، جس کا ایفاء ضروری نہیں ہے (دیکھئے: قدوری ۱۷۴، الالتزامات في الشرع الاسلامي ۲۰۳)

**شکل ثانی:**......عقد نکاح کے وقت ہی زبانی یا تحریری شرائط مذکور ہوں تو اس کے معتبر ہونے کی شرط یہ ہے کہ عورت کی جانب سے ایجاب ہو، (عورت یا اس کا ولی یا وکیل) عقد نکاح کے وقت یہ کہے کہ میں نے اپنے آپ کو یا بنت فلاں کو آپ کے نکاح میں (مذکورہ شرائط کے ساتھ) دیا اور مذکورہ شرائط میں سے کسی ایک کی خلاف ورزی کی شکل میں مجھے اختیار ہوگا کہ اسی وقت یا کسی وقت اپنے آپ کو طلاق بائن دے کر نکاح سے الگ کرسکوں، اس کے جواب میں مرد یہ کہے کہ میں نے قبول کرلیا، تو پھر عورت کو شرائط کے مطابق اختیار حاصل ہوگا اور اگر ایجاب مرد کی جانب سے ہو اور لڑکی والے قبول کے ساتھ تفویض طلاق کی شرط لگائیں تو نکاح بلا شرط کے صحیح ہوجائے گا، اور شرط لغو ہوجائے گی (دیکھئے: فتاوی قاضی خان علی الہندیہ ۱/ ۳۲۹)۔

کیونکہ جب ابتداء شوہر کی جانب سے ہوئی تو طلاق وتفویض نکاح سے پہلے ہوئی، لہذا یہ صحیح نہیں ہوئی، اور ابتداء جب عورت کی جانب سے ہوگی تو تفویض نکاح کے بعد ہوئی، کیونکہ جب شوہر نے عورت کے کلام کے بعد "قبلت" کہا یا اس طرح کہا: "قبلت على أنك طالق أو على أن يكون الأمر بيدك" تو نکاح کے بعد تفویض کرنے والا ہوا، کیوں کہ جواب سوال میں مذکور مضمون کے اعادہ کو متضمن ہوتا ہے (فتاوی قاضی خان علی الہندیہ ۱/ ۳۲۹)۔

"ردالمحتار" میں "درمختار" کی عبارت "نكحها على أن أمرها بيدها صح" پر گفتگو کرتے ہوئے علامہ شامی نے فرماتے ہیں: یہ اس صورت کے ساتھ مقید ہے کہ عورت ابتداء کرتے ہوئے "زوجت منك على أن أمري بيدي أطلق نفسي كلما أريد أو على أني طالق" کہے اور شوہر قبلت کہے اور اگر شوہر ابتداء کرے تو طلاق واقع نہ ہوگی، اور نہ عورت کو اختیار ہوگا (دیکھئے: ردالمحتار ۲/ ۵۲۶، ۲۹۹، ہندیہ ۱/ ۲۷۳)۔

**شکل ثالث:** عقد نکاح کے بعد شوہر سے شرائط طے ہوں، یہ بھی درست ہے، عورت ناقص العقل ہے، اس لئے مطلقاً اس کے ہاتھ میں طلاق کا اختیار دینا خطرے سے خالی نہیں، لہذا مناسب یہ ہے کہ تفویض میں کوئی مناسب قید بھی لگائی جائے جس میں وہ خطرہ باقی نہ رہے، مثلاً نکاح کے وقت عورت یا اس کے وکیل کی جانب سے یہ شرط لگائی جائے کہ جب تمہاری طرف سے عورت کو شدید تکلیف پہنچے جس کو فلاں فلاں آٹھ دس سنجیدہ آدمی تسلیم کرلیں اور طلاق کو مناسب بھی سمجھیں تو اس وقت یہ معاملہ عورت یا وکیل کے اختیار میں ہوگا کہ اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر اس نکاح سے علحدگی اختیار کرلے، اس صورت میں عورت کو طلاق کا اختیار اس وقت ہوگا جب کہ مذکورہ اشخاص تکلیف شدیدہ کو تسلیم کرلیں، اس کے بعد بھی عورت کو چاہئے کہ طلاق واقع کرنے میں جلدی نہ کرے، کیونکہ جلدی کرنا شرعاً ناپسندیدہ ہے، حدیث شریف میں ہے کہ جو عورت بلا ضرورت اپنے خاوند سے طلاق مانگے، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔

اس طرح احتیاط کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ شوہر شرائط نامہ میں یہ بھی لکھوائے کہ خلاف شرط تسلیم ہو جانے کے بعد عورت کو ایک ماہ تک اختیار نہ ہوگا پھر کسی وقت چاہے، یعنی ایک ماہ کے بعد اپنے اوپر ایک طلاق بائن واقع کر کے علحدگی کا اختیار ہوگا اور جب کبھی کسی شرط کے خلاف ہو تو ہر بار ایک ایک ماہ کے لئے اختیار وشرائط حاصل نہیں ہوں گے، مذکورہ شرط میں اگر چاہے کا لفظ استعمال نہ کرے ورنہ اسی مجلس کے ساتھ مقید ہو جائے گی مجلس کے اختتام کے بعد عورت کو طلاق کا اختیار باقی نہیں رہے گا اسی طرح لفظ جب کبھی چاہے بھی شرط میں استعمال نہ کرے ورنہ ہمیشہ کے لئے (اعادہ کے بعد بھی) عورت کو طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا لہذا ایسے الفاظ استعمال کرے جن سے نہ تو تفویض مقید بالمجلس ہو جائے اور نہ اتنی وسعت ہو جائے کہ عورت کو تین طلاق واقع کرنے کا اختیار مل جائے، بہتر یہ ہے کہ شرائط نامہ علمائے کرام کے پاس لکھوایا جائے یا ان سے تصحیح کرلی جائے، اسی طرح قانون داں یا سرکاری وکیل کو بھی بتا دیا جائے کہ قانونی پیچیدگی نہ ہو۔

شوہر کو تفویض کے بعد اس سے رجوع کرنے کا حق نہیں رہتا، بلکہ تفویض کے بعد عورت طلاق کی مالک ہو جاتی ہے، اس لئے عورت کو اختیار دینے سے پہلے مرد کو غور وفکر اور اہل علم وفہم سے مشورہ کرلینا ضروری ہے تاکہ بعد میں پریشانی نہ ہو، عالمگیری میں ہے:

''ولیس للزوج أن یرجع فی ذلك ولا ینهاها عما جعل إلیها ولا یفسخ'' (۱-۳۸۰. نیز دیکھئے: درمختار ۲-۵۲۱. البحر الرائق ۳-۳۴۴)

**جواب: ۲** طلاق کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے مہر میں کمی زیادتی کی شرائط، طلاق کی اور عدم طلاق کی صورت میں مہر کی کمی زیادتی کی شرط لگانے کے سلسلے میں فقہ کی کتابوں میں، بہت کچھ مسائل مذکور ہیں، جس میں امام صاحب، صاحبین اور امام زفر کے مختلف اقوال اور دلائل ہیں، اس کو ''کتاب الاجارۃ'' کے ایک مسئلہ پر قیاس کیا ہے جس میں موجر مستاجر سے کہے کہ اگر تو آج یہ کپڑا سیئے تو ایک درھم ملے گا اور اگر کل سیئے تو آدھا درھم ملے گا تو امام صاحب کے نزدیک آج کی شرط کے مطابق ایک درھم اور کل آدھا نہیں، بلکہ اجر مثل دیا جائے گا جو آدھے درھم سے کم نہ ہو اور ایک سے زیادہ نہ ہو، صاحبین کے نزدیک دونوں شرطیں صحیح، امام زفر کے نزدیک دونوں شرطیں فاسد ہوں گی، اولا نکاح کے مسئلہ کو ذکر کرنا مناسب ہے، ابن ہمام نے صاحب ''ہدایہ'' کا قول:

"وإذا تزوجها علی ألف" نقل کر کے اس کی دو صورتیں نکالی ہیں۔

(۱) عورت کے لئے مہر مقرر کیا جائے اور اس کے ساتھ ایسی شرطیں لگائی جائیں جس میں عورت کا فائدہ ہو، جیسے اس کو شہر سے نہ نکالے یا اس کے ہوتے ہوئے دوسری عورت سے شادی نہ کرے یا اس کی سوکن کو طلاق دیدے۔

(۲) دوسری صورت یہ کہ ایک تقدیر پر اور دوسری تقدیر پر اتنا مہر ہوگا "ولو تزوجها علی ألف إن أقام بها وعلی ألفین إن أخرجها" (ہدایہ اولین ر ۳۲۹)۔

اول شکل کا حکم کتاب میں ظاہر ہے کہ اگر شوہر شرط پر عمل کرے تو عورت کے لئے مہر مسمی ہوگا اور عدم ایفاء شرط کی صورت میں اس کو مہر مثل ملے گا، اگر مہر مثل مسمی کے بقدر یا اس سے کم ہو تو اب کسی دوسری چیز کی مستحق نہیں ہوگی۔

دوسری شکل کا حکم یہ ہے کہ اول صورت پر عمل کیا تو عورت کو ہزار ملے گا اور اگر صورت ثانیہ پر عمل کیا تو عورت کو مہر مثل ملے گا جو دو ہزار سے زیادہ اور ایک ہزار سے کم نہ ہو، "فإن أقام بها فلها ألف وإن أخرجها فلها مهر المثل لا یزاد علی ألفین ولا ینقص من الألف وهذا عند أبي حنیفة"

صاحبین فرماتے ہیں کہ دونوں شرطیں جائز ہیں، شرط کے مطابق مہر لازم ہوگا۔

امام زفر فرماتے ہیں کہ دونوں شرطیں فاسد ہیں، لہذا عورت کو مہر مثل ملے گا جو ہزار سے کم نہ ہو اور دو ہزار سے زیادہ نہ ہو، امام صاحب کی دلیل یہ ہے کہ اولی تسمیہ میں کوئی خطرہ نہیں ہے، بلکہ وہ بلا شرط ہے، بخلاف دوسرے تسمیہ کے کہ وہ معلق ہے، پس جب اس کی شرط پائی گئی کہ اس طرح کہ شوہر نے اس کو شہر سے نکالا تو عورت کے لئے مسمی ثابت ہوا اور وہ اول مسمی ثابت تھا، کیونکہ تنجیزی کلام شرطیہ کلام کے وجود کو ختم نہیں کرتا، پس جب معلق اپنے شرط کے وجود سے پایا گیا تو دو تسمیے جمع ہو گئے، لہذا جہالت کی وجہ سے مہر مثل واجب ہوگا۔

صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ دونوں معلق ہیں، لہذا ہر تقدیر پر مسمی واحد کے علاوہ نہیں پایا گیا۔

امام زفر فرماتے ہیں کہ اس جگہ شرطیہ کلام ہے ہی نہیں، بلکہ تنجیزی کلام ہے اور مال کا ذکر تو ترغیب کے لئے ہے نہ کہ شرط کے لئے، پس دو تسمئے جمع ہو کر جہالت کی وجہ سے فاسد ہو گئے (فتح القدیر ۳؍ ۵۲ ۳، البحر الرائق ۳؍ ۱۷ ۳)۔

فریقین کے دلائل پر نظر کرتے ہیں تو قوت میں دونوں کے دلائل قوی ہیں، لیکن مسئلہ فساد وعدم فساد کا ہے اس لحاظ سے تو امام صاحب کے قول کو ترجیح ہونی چاہئے، دوسری طرف لوگوں کی ضرورت وحاجت اور سد ذرائع کے طور پر صاحبین کے قول میں آسانی ہے۔

البتہ صاحبین کے قول پر فتویٰ دینے میں احتیاط کی ضرورت ہے، جیسے کہ علامہ شامی ابن ہمام کے متعلق ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لکن هو أهل للنظر فی الدلیل من لیس بأهل لنظر فیه، فعلیه الافتاء بقول الإمام" اہلیت سے مراد یہ ہے کہ اقوال ائمہ کے درمیان تمیز کرنے والا اور بعض کو بعض پر ترجیح دینے کی صلاحیت والا ہو۔

آخر میں فیصلہ کن بات بیان کرتے ہیں اور جب ہم دلائل میں تمیز نہیں کر سکتے اور مشائخ کے رتبے تک پہنچے تو ضروری ہے کہ سلف کے اقوال پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے جس قول پر فتویٰ نقل کیا ہے، اس کو مان لیں (دیکھئے: رسم المفتی ر ۲۳)۔

شرح "ہدایہ" میں سے تمام نے فریقین کی دلیل کو تفصیل سے ذکر کیا ہے، لیکن کسی نے بھی دونوں میں سے کسی قول کو قطعی طور پر راجح نہیں قرار دیا، ابن ہمام کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں صاحبین کے دلائل بھی وقیع ہیں، اگرچہ صراحۃً انھوں نے بھی کسی کے قول کو راجح نہیں قرار دیا ہے، قدوری کی شرح "اللباب" میں اجارہ والا مسئلہ ذکر کر کے لکھا ہے:

"قال فی التصحیح واعتمدوا قول الإمام فی الخلافیات المذکورة المحبوبی و النسفی و صدر الشریعةو هو الافضل"۔

البتہ نکاح والے مسئلے میں وہ بھی ساکت ہیں اس لئے بہتر یہ ہے کہ علم وبصیرت والے فقہائے کرام شورائی طریقہ سے مسئلہ کے ما لها وما علیها، فریقین کے دلائل اور صاحبین کے قول پر فتویٰ دینے کی صورت میں متوقع مضرات سے بچایا جا سکتا ہے کہ نہیں؟ اس پر غور کر کے اور ضرورت کا تحقق ہو رہا ہے یا نہیں؟ اس پر غور کر کے فیصلہ کر لیں۔

جواب (۳) سرکاری ملازمت میں اکثر عورتوں کو اجنبی مردوں سے اختلاط اور غیر شرعی امور انجام دینے ہوتے ہیں، اس لئے یہ شروط فاسد میں سے شمار ہوں گی جن کا ایفاء لازم نہیں ہے، البتہ اگر کوئی ایسی ملازمت مل جائے جس میں اجنبی مردوں سے اختلاط اور غیر شرعی امور سے اجتناب ممکن ہو اور شوہر نے اسی ملازمت کی شرط قبول کر لی ہو تو پھر شوہر پر اس کا ایفاء واجب ہوگا۔

لیکن ایسی ملازمت شاذ و نادر ہی ہوگی جس میں غیر مردوں سے اختلاط نہ ہو، اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس قسم کی شروط سے اجتناب ہی کیا جائے، ایک شادی شدہ عورت کو شرعاً ملازمت کی ضرورت بھی نہیں ہے، اس لئے کہ اس کی ضروریات واخراجات کا بوجھ شریعت نے شوہر کے ذمہ لازم کر دیا ہے، لہٰذا اگر شوہر عورت کو ملازمت سے روک دے تو عورت کے ذمہ لازم ہے کہ وہ اس کی اطاعت کرے، منکوحہ عورت کے لئے ملازمت غیر ضروری امور میں سے ہے جس کا مقصد آرائش وآسائش کی تکمیل ہے، نہ کہ ضرورت کی تکمیل، اسی لئے اس باب میں عورت کے لئے شرعاً شوہر کی اطاعت ضروری ہے، اور اگر شوہر نے بوقت عقد شرط قبول بھی کر لیا ہو تو بھی اس کے ذمہ اس کا ایفاء ضروری نہیں ہے، بلکہ اس کا فرض ہے کہ عورت کو غیر شرعی امور کے ارتکاب سے روک دے۔

☆☆☆

# نکاح میں شرائط کا مسئلہ

مولانا انیس الرحمن قاسمی [1]

شریعت نے معاہدات ومعاملات میں شرائط کے ایفاء کو ضروری قرار دیا ہے، اللہ تعالی نے وفاء عہد کو ایمان والوں کی صفت قرار دیا ہے، فرمایا ہے: "والموفون بعهدهم إذا عاهدوا" (سورہ بقرہ / ١٧٧) (اور جب عہد کرتے ہیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں)۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "مومن اپنے شرائط پر رہتا ہے الایہ کہ ایسی شرط جو حلال کو حرام کردے یا حرام کو حلال" (صحیح البخاری)۔

اس حدیث میں ایمان والوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ جب کسی معاہدہ ومعاملہ میں کسی شرط کا التزام کرتے ہیں تو اس کی پابندی کرتے ہیں، الایہ کہ وہ شرط ایسی ہو جس سے حلال حرام ہوجاتا ہو یا حرام حلال ہوجاتا ہو تو پھر اس کی پابندی نہیں کرنی ہے، اس کے علاوہ نکاح کے بارے میں فرمایا ہے:

"إن أحق الشروط أن توفوا بها ما استحللتم به الفروج" (صحیح البخاری) (تمام شرطوں میں ایفاء کے اعتبار سے اہم شرطیں وہ ہیں جن کی وجہ سے استمتاع حلال ہوجاتا ہے)۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نکاح میں جو شرائط طے ہوں ان کی پابندی ضروری ہے لیکن یہ مطلق نہیں ہے بلکہ اگر کسی شرط سے حکم شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہے یا وہ اس کے مقتضی کے خلاف ہے تو ایسی شرط فاسد وغلط ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "کل شرط لیس فی کتاب اللہ فهو باطل"۔

اس لئے دونوں طرح کی احادیث کی وجہ سے فقہاء اسلام کے اس اتفاق کے باوجود کہ نکاح میں شرط کی گنجائش ہے، یہ مسئلہ اجتہادی رہا ہے کہ کس نوعیت کی شرائط صحیح ہیں اور کس طرح کی باطل ہیں۔

## شرط صحیح

شرائط تقلیدی کی تین قسمیں ہیں: شرط صحیح، شرط فاسد، شرط باطل، شرط صحیح میں معاملہ کے ارکان وشرعی شروط واحکام کی خلاف ورزی نہیں ہوتی، بلکہ اس کے مقتضی کے مناسب ہوتی ہے، چنانچہ شرط صحیح کے ضابطہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ۔

١۔ عقد کرتے وقت محل کے ساتھ کسی صفت کا اشتراط ہو۔

٢۔ یا ایسی شرط ہو جس کا عقد تقاضہ کرتا ہے۔

٣۔ یا اس کے مقتضی کے مناسب ہو۔

٤۔ یا شریعت میں ہی وہ شرط منقول ہو۔

٥۔ یا ایسی شرط ہو جس کے بارے میں لوگوں کا تعامل ہو (دیکھئے: بدائع الصنائع ٥ / ١٧١ طبع الجمالیہ)۔

**قسم اول کی مثال:**...... شرط صحیح میں اگر محل عقد کے ساتھ کسی صفت قائم کا اشتراط نکاح میں ہو اور وہ صفت ایسی ہو جس کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں خلل پڑتا ہو اور ایک دوسرے کے حقوق متاثر ہوتے ہوں تو ایسی شرط کا اعتبار کیا جائے، جیسے نکاح میں عورت نے یہ شرط لگائی کہ اس کا ہونے والا شوہر جنون، جزام، جب، عنۃ، برص یا ایڈز میں مبتلا نہ ہو، اگر مبتلا ہوگا تو اسے نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہوگا، تفصیل کے لیے دیکھئے۔ (الفتاوی التاتارخانیہ ٢ / ٥٩٩)

[1] ☆ ناظم امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ پھلواری شریف پٹنہ

**دوسری قسم کی مثال:**...... عقد نکاح میں ایسی شرط لگائی جائے جس کا عقد تقاضہ کرتا ہے اور اس سے کوئی نئی ذمہ داری فریقین پر نہیں آتی ہے، جیسے نکاح کی وجہ سے بیوی کا نفقہ، سکنی و کسوہ، اسی طرح حق زوجیت یا دوزوجگی کی صورت میں انصاف یہ سارے حقوق بیوی کو ملتے ہیں، اب اگر عورت نکاح کے عقد میں ان شرائط کا اضافہ کرتی ہے تو اس اضافہ سے نکاح پر کوئی غلط اثر مرتب نہیں ہوگا اور نہ ہی اس سے کوئی نئی چیز اسے حاصل ہوگی (دیکھئے: الفتاوی التاتارخانیہ ۶/۴۲)

**تیسری قسم کی مثال:**...... ایسی شرط جس کا عقد تقاضہ تو نہیں کرتا، مگر اس کے مقتضی کے مناسب ہے، جیسے کسی عورت سے نکاح کرتے وقت مرد نے یہ شرط لگائی کہ اگر عورت خوبصورت ہوگی تو دو ہزار مہر ہوگا اور اگر بدصورت ہوگی تو ایک ہزار مہر ہوگا تو یہ شرط صحیح ہوگی، اس لئے کہ مہر مقتضاء عقد ہے اور یہ شرط اس کے مناسب ہے خلاف نہیں ہے (دیکھئے: الفتاوی التاتارخانیہ ۳/۱۰۲)

**چوتھی قسم کی مثال:**...... ایسی شرط عائد کی جائے جو شریعت میں منقول ہو، مگر اس کے ذکر سے مقصود تاکید ہوتی ہے، جیسے عورت سے نکاح کی یہ شرط ہے کہ وہ کسی کے نکاح میں نہ ہو اور نہ ہی وہ عدت میں ہو، پس اگر شوہر نے عقد نکاح میں ایسی شرط لگائی تو یہ شرط صحیح ہوگی، کیونکہ یہ شرط خود نکاح کے انعقاد کے لئے ضروری ہے یا مہر کو ایک ماہ میں ادا کرنے کی شرط لگائی تو اس کی ادائیگی ضروری ہوگی اور اس صورت میں بیوی کو اپنے نفس کو روکنے کا حق ہوگا (ردالمحتار ۳/۱۴۵)۔

**پانچویں قسم کی مثال:**...... عقد نکاح میں بیوی نے متعین مہر کے بارے میں یہ شرط لگائی کہ عرف کے مطابق مہر ادا کرنا ہوگا اور اس کے شہر کا عرف یہ ہے کہ ایک تہائی یا دو تہائی مہر کی رقم رخصتی سے پہلے دی جاتی ہے تو اس کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔ (دیکھئے: ردالمحتار مع الدرالمختار ۳/۱۴۴)

**عرض:**...... امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت کی طرف سے عقد نکاح میں اگر ایسی کوئی شرط باطل لگائی جائے کہ اس کی موجودگی میں اگر شوہر دوسری عورت سے شادی کرے گا، یا اسے شہر سے کہیں دور لے جائے گا تو اس کا مہر دو ہزار ہوگا اور اگر دوسری شادی نہیں کرے گا، یا دوسرے شہر میں نہیں لے جائے گا تو مہر ایک ہزار ہوگا، اس صورت میں شرط پوری کرنے پر عورت دو ہزار مہر نہیں پائے گی مہر مثل پائے گی جو نہ ایک ہزار سے کم ہوگا اور نہ دو ہزار سے زائد ہوگا، البتہ امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک ایسی شرط جائز ہے۔ (دیکھئے: بنایہ علی شرح الہدایہ ۲/۲۲۶)

موجودہ حالات میں جب کہ عورتوں پر مختلف قسم کے ازدواجی زندگی میں مظالم ہورہے ہیں صاحبین کے قول کو اختیار کرنا مناسب ہے۔

## عورت کی طرف سے ملازمت میں رہنے کی شرط

موجودہ دور کے معاشرتی اور اقتصادی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ پیش آرہا ہے کہ مختلف ممالک میں مسلمان عورتیں حصول تعلیم کے بعد ملازمتوں سے وابستہ ہوجاتی ہیں یا وابستی ہونے کی جدوجہد میں لگی رہتی ہیں، ایسی عورتیں اگر نکاح کے وقت یہ شرط لگاتی ہیں کہ شوہر انھیں لگی ہوئی ملازمت سے نہیں روکے گا اور اس شرط کو عقد نکاح میں مرد قبول بھی کرلیتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی پابندی شوہر کے لئے ضروری ہوگی یا نہیں اور اگر شوہر اس شرط کو قبول کرلینے کے باوجود عورت کو سلسلۂ ملازمت ختم کرنے کا حکم دیتا ہے یا نئی ملازمت سے روکتا ہے تو عورت کے لئے شوہر کے اس حکم کی تعمیل ضروری ہوگی یا نہیں؟

ہماری رائے میں یہ شرط بھی شروط فاسدہ میں داخل ہے، اس لئے کہ یہ مقتضاء عقد کے خلاف ہے، اس سے شوہر کے حق احتباس زوجہ کو نقصان ہوتا ہے، چنانچہ فقہاء حنفیہ نے ایسی عورتوں کے لئے جو دایہ یا مردہ عورتوں کو غسل دینے کا کام کرتی ہیں اور یہ فرض کفایہ بھی ہے، بغیر شوہر کی اجازت کے گھر سے نکلنے کو منع کیا ہے (دیکھئے: البحرالرائق ۳/۱۲۹)۔

## عورت کا عقد نکاح میں حق طلاق کی شرط لگانا

شریعت نے طلاق کا اختیار مرد کو دیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

"يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ" (سورۂ طلاق: ۱)، نیز (سورہ بقرہ ۲۲۷، ۲۳۱، ۲۳۲) میں طلاق کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے، لیکن یہ حق مرد اپنے علاوہ کسی دوسرے کو دے سکتا ہے اور اس میں نائب بنا سکتا ہے، اس لئے اگر عورت عقد نکاح میں خاص الفاظ کے ساتھ اس حق طلاق کو تفویض کی صورت میں حاصل کرنا چاہے تو کرسکتی ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ یہ حق مطلق نہ دیا جائے، بلکہ کچھ خاص شرائط پر دیا جائے۔ ☆☆☆

# اشتراط فی النکاح

مولانا محمد ثناء الہدیٰ قاسمی [1]

عائلی زندگی کے آغاز کے لئے نکاح مرد وعورت کے درمیان ایک ایسا عقد ہے جس سے دو اجنبی نفوس میں مودت ومحبت کا ایک نیا باب کھلتا ہے، اور وہ اس طرح ایک جان دو قالب ہوجاتے ہیں کہ ایک کی خوشی دوسرے کو مسرور وشادمان اور ایک کا رنج دوسرے کو رنجیدہ اور پریشان کر دیتا ہے، عام طور سے یہ قربت ایجاب وقبول کے مراحل طے کرتے ہی پیدا ہوجاتی ہے اور دونوں اعتماد کی فضا میں سانس لینے لگتے ہیں، نکاح کے بعد انقلاب ایسا عظیم اور متحیر کن ہوتا ہے کہ عقل انسانی اور شعور کی پہنچ وہاں تک نہیں ہو پاتی کہ یک بیک وہ کون قوت اور کیسا کنکشن ہے جو دل کی دنیا کو جوڑ دیتا ہے۔

لیکن کبھی کبھی بعض خارجی حالات اور شیطان کی کارستانیوں کی وجہ سے اس درجہ قربت اور اعتماد پیدا نہیں ہو پاتا جو نکاح کا لازمہ ہے، بلکہ نکاح کے قبل ہی فریقین شکوک وشبہات اور بے اعتمادی کا شکار ہوتے ہیں اور ہوتا ہے کہ نکاح کے بعد کی عائلی زندگی پر بھی اس کے مہیب سائے پڑیں گے، ایسے میں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ نکاح کو کچھ شرائط کے ساتھ مشروط کر دیا جائے تا کہ مخالف حالات پیدا ہونے کی صورت میں "امساك بالمعروف" ناممکن ہو تو "تسریح بالاحسان" عمل میں آجائے اور ایک دوسرے کے استحصال بچا سکے۔

## شرط صحیح

یہ شرائط عام طور سے دو قسم کی ہوتی ہیں، پہلی قسم ان شرائط کی ہے جو عقد نکاح کے متقاضی ہونے، مقتضی کے حصول کو یقینی بنانے نص کے وارد ہونے یا عرف کے جاری ہونے کی وجہ سے لگائی گئی ہوں، فقہاء کی اصطلاح میں اسے شرط صحیح کہتے ہیں (دیکھئے: احکام الاسرہ فی الاسلام ر ۱۵)۔

۱۔ زوجہ کا شرط لگانا کہ شوہر اس کا نفقہ برداشت کرے گا، مہر دے گا، حسن سلوک سے پیش آئے گا، اس کے حقوق میں کمی نہیں کرے گا، دوسری بیوی کی طرح اس کی باری مقرر کرے گا یا شوہر کا شرط لگانا کہ بیوی اس کی اجازت کے بغیر گھر سے نہیں نکلے گی، اس کی نافرمانی نہیں کرے گی، نفلی روزے اس کی اجازت کے بغیر نہیں رکھے گی، کسی کو اس کی اجازت کے بغیر گھر میں آنے نہ دے گی، اس کے سامان میں بغیر اس کی مرضی کے تصرف نہیں کرے گی وغیرہ۔

۲۔ یا یہ شرط لگانا کہ مہر ونفقہ کے کفیل شوہر کے والدین ہوں گے۔

۳۔ اسی طرح شوہر کا شرط لگانا کہ عائلی زندگی کے دشوار گزار ہونے کی صورت میں اسے طلاق کا حق ہوگا، یا عورت کا تفویض طلاق یا امر بالید کی شرط کے ساتھ نکاح کرنا۔

۴۔ یا عورت کا شرط لگانا کہ دخول سے قبل نصف مہر ادا کر دینا ہوگا، جب اس علاقہ کا رواج بھی ایسا ہی ہو، یہ ساری صورتیں علی الترتیب عقد نکاح کے متقاضی ہونے، مقتضی کے حصول کو یقینی بنانے نص کے وارد ہونے اور عرف کے قبیل کی ہیں، اس لئے یہ شرائط صحیح ہیں اور ان کا ایفاء ضروری ہے۔

قرآن کریم میں ہے:

"وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولاً" (بنی اسرائیل: ۳۴) (اور عہد (مشروع) کو پورا کرو (ایسے) عہد کی باز پرس ہوگی)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"وہ شرائط جن کا پورا سب سے زیادہ ضروری ہے، وہ ہے جن پر تم نے نکاح کیا ہو" (مسلم مع شرح النووی ار ۲۵۵)۔

[1] نائب ناظم امارت شرعیہ بہار اڑیسہ جھارکھنڈ، پھلواری شریف پٹنہ

خطابی کہتے ہیں نکاح کی مختلف شرطیں ہیں: ان میں جن کا ایفاء بالاتفاق ضروری ہے وہ ایسی شرطیں ہیں جن کا اللہ نے حکم دیا ہے، یعنی "امساک بالمعروف" اور "تسریح بالاحسان" اور اسی پر بعضوں نے اس حدیث کو محمول کیا ہے۔

## شرط فاسد

دوسری قسم ان شرائط کی ہے جو نہ تو عقد نکاح سے میل کھاتی ہیں اور نہ ہی شرع وعرف اس کی اجازت دیتے ہیں، ایسی شرائط کا مقصد بالعموم نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز یا متعاقدین میں سے کسی فریق پر ایسی پابندی لگانا یا ایسے حق کا حصول ہوتا ہے، جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں ممکن نہیں تھا، مثلاً یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان نفقہ شوہر کے ذمہ نہیں ہوگا، وہ مہر نہیں ادا کرے گا، مرنے کی صورت میں بیوی وارث نہیں ہوگی یا عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا یا بیوی کو اس کے آبائی وطن سے باہر نہیں لے جائے گا وغیرہ، اس قبیل کی شرائط فاسد ہیں، اس لئے لغو قرار پائیں گی ان کا ایفاء ضروری نہیں ہوگا اور نہ ہی عدم ایفاء کی صورت میں کوئی اثر عقد نکاح پر پڑے گا، ترمذی میں ہے:

"حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا: اللہ نے اس کی شرط سے پہلے شرط لگادی، گویا اس نے زوج کے لئے یہ گنجائش رکھی ہے کہ وہ اسے باہر لے جائے گا، اگرچہ اس نے شوہر پر شرط لگائی ہو کہ وہ اسے باہر نہیں لے جائے گا، بعض اہل علم کی یہی رائے ہے اور یہی قول سفیان ثوری اور اہل کوفہ کا ہے" (سنن الترمذی باب ماجاء فی الشرط عند عقد النکاح)۔

## نکاح پر شرط فاسد کے اثرات

جیسا کہ پہلے مذکور ہوا، حنفیہ کے یہاں شرط فاسد سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور صحیح یا فاسد کے عدم ایفاء سے عورت کو فسخ کا اختیار نہیں حاصل ہوتا ہے، کیونکہ عدم ایفاء سے زیادہ سے زیادہ شارط کی رضا فوت ہوتی ہے جو عقد نکاح میں موثر نہیں (دیکھئے: احکام الاسرۃ فی الاسلام ر ۱۵۵)۔

بعض اہل علم نے حنفیہ کے مذہب کو ان احادیث کے مخالف قرار دیا ہے، جس میں شرائط اور وعدے کے ایفاء پر زور دیا گیا ہے، اس سلسلے میں گفتگو گزر چکی ہے کہ حدیث کی مراد کیا ہے، اس سے قطع نظر واقعہ یہ ہے کہ حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ اگر کسی نے وعدہ وفا نہیں کیا تو نکاح ٹوٹ جائے گا، باطل ہوگا، یا عورت کو فسخ کا اختیار حاصل ہوگا۔ (دیکھئے: تقریر الترمذی)۔

امام مالک کے یہاں شرط فاسد سے نکاح باطل ہوجاتا ہے، اور اگر دخول کی نوبت نہیں آئی ہے تو فسخ کرنا ضروری ہے، دخول کے بعد عقد باقی رہے گا، شرط باطل ہوگی اور مہر مسمی کی جگہ مہر مثل واجب ہوگا۔

"اس سلسلے میں مالکیہ کا مذہب شرط فاسد سے عقد کے بطلان کا ہے، اور جب تک مرد اس عورت سے دخول نہ کرے نکاح کا فسخ واجب ہے، اگر دخول کرلیا تو عقد نافذ ہوجائے گا اور شرط لغو ہوجائے گی، مسمی باطل ہو کر عورت کو مہر مثل ملے گا" (الاحکام الشرعیۃ للاحوال الشخصیہ ر ۱۱۰)۔

## تعلیق طلاق کی شرط

اشتراط فی النکاح میں ایک اہم بحث تعلیق طلاق اور تفویض طلاق ہے، حنفیہ کے یہاں دونوں شرطیں معتبر اور صحیح ہیں، لہٰذا اگر کسی نے اس شرط پر نکاح کیا کہ "کل امرأۃ یتزوج بہا تکون طالقا" تو طلاق واقع ہوجائے گی، شرط باطل نہیں ہوگی، البتہ اس قسم کی شرائط سے اسلام کے تعدد ازدواج کی خلاف ورزی ہوگی، اس لئے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی، "فتاوی رشیدیہ" میں اس قسم کے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے، "یہ نکاح شرعاً صحیح اور معتبر ہے، اس تعلیق سے نکاح میں فساد نہیں آتا اور یہ تعلیق بھی شرعاً معتبر ہے، اگر اس شرط پر نکاح کیا تو خاوند کے دوسرے نکاح کرنے سے اس پر طلاق پڑ جائے گی، مگر چونکہ اصل مسئلہ شرعیہ یہ ہے کہ مرد کو بشرط اقامت عدل بین الازواج وتحمل نان ونفقہ چار تک زوجات درست ہیں اس لئے ایسی شرط رائج کرنا، ہرگز اصول شریعت کے سزاوار ومطابق نہیں (فتاوی رشیدیہ کامل ۳۳۸۵)۔

انہیں وجوہ سے امام شافعی کے نزدیک یہ شرط غیر لازم ہے، امام احمد کی بھی یہی رائے ہے، البتہ ان کے یہاں نکاح ثانی کی صورت میں معاملہ عورت کے اختیار میں چلا جاتا ہے، چاہے تو وہ اس کے ساتھ رہے اور چاہے تو علیحدگی اختیار کرلے، امام ابن تیمیہ نے اسے اعدل الاقوال قرار دیا ہے (فتاوی ابن تیمیہ ر ۳۲)۔

اور تیسرا قول جو تمام اقوال میں زیادہ قرین انصاف ہے، یہ ہے کہ اس سے نہ طلاق واقع ہوگی اور نہ عتاق لیکن عورت کے لئے وہی ہے جو اس نے شرط لگائی

تھی، اس لئے وہ چاہے تو اس کے ساتھ رہے چاہے تو جدائیگی اختیار کرے یہ متوسط قول ہے۔

## تفویض طلاق کی شرط

یہی حکم تفویض طلاق کا بھی ہے، عورت نے نکاح کے وقت یہ شرط لگادی کہ اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا اور شوہر نے اسے قبول کرلیا تو طلاق کا حق عورت کی طرف منتقل ہوجائے گا، حضرت تھانوی نے "الحیلۃ الناجزۃ" میں لکھا ہے:

"نکاح مذکورہ میں کچھ شرائط خاوند سے منظور کرالی گئی ہیں، اس کے جواز میں حنفیہ کو کلام نہیں ہے، بعض لوگوں نے اسی صورت کو نکاح معلق میں داخل کرکے شبہ کیا ہے، مگر حقیقت میں یہ نکاح معلق نہیں، بلکہ نکاح منجز ہے جو تفویض کے ساتھ مشروط ہے، نکاح معلق وہ ہے کہ اس وقت نکاح ہی نہ ہو، جیسے عورت یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو تیرے نکاح میں دے دیا، اگر میرا باپ راضی ہو یا مرد یوں کہے کہ میں نے قبول کرلیا، اگر میرا باپ راضی ہو تو اس صورت میں نکاح نہیں ہوتا اور اگر اصل نکاح معلق نہ کیا جاوے، بلکہ اس کے ساتھ کوئی شرط زائد لگادی جائے تو اس طرح نکاح ہوجاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ مجلس عقد میں نکاح اسی وقت ہورہا ہے، مگر اس کے ساتھ ایک شرط ہے جس کو شوہر سے منوایا جاتا ہے (الحیلۃ الناجزۃ ۱۲۷)۔

تفویض طلاق کی یہ شرط اگر نکاح سے پہلے لگائی گئی تو اس میں اضافت الی النکاح ضروری ہے اور فریقین کے اتفاق کے بعد عین عقد نکاح میں اس کا ذکر کرنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ نیت متقدمہ مقارنہ کی طرح ہی ہوا کرتی ہے، البتہ پہلے اتفاق ہوگیا تھا، لیکن ابھی ایجاب وقبول نہیں ہوا تھا کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہوگیا، ایسی صورت میں عین عقد نکاح کے وقت بھی شرائط کا ذکر کرنا ضروری ہوگا، اور اگر معاملات شرائط پہلے سے طے نہیں تھے اور عین عقد نکاح کے وقت شرائط لگائے جارہے ہیں تو ضروری ہے کہ ایجاب عورت، اس کے وکیل یا ولی کی جانب سے مع شرط ہو اور مرد اسے قبول کرلے، اگر معاملہ اس کے برعکس بایں طور طے ہوا کہ مرد نے ایجاب بلاشرط کیا اور عورت یا اس کے ولی نے شرائط کے ساتھ قبول کیا تو یہ شرط لغو ہوجائے گی اور نکاح منعقد ہوجائے گا (ردالمحتار ۱۷۹/۲، ۶۹۹/۲ کتاب الطلاق)۔

اس لئے کہ ابتداءً جب زوج کی طرف سے ہوگی تو طلاق وتفویض نکاح سے قبل ہوگی، اس لئے (یہ صورت) صحیح نہیں ہوگی، لیکن اگر ابتداء عورت کی طرف سے ہو تو تفویض نکاح کے بعد ہوگی، اس لئے کہ جب شوہر نے عورت کے کلام کے بعد قبلت کہا اور جواب اعادہ سوال کو متضمن ہوتا ہے تو گویا اس نے یہ کہا کہ میں نے اس شرط پر قبول کیا کہ تو مطلقہ ہوجائے، یا اختیار تیرے ہاتھ میں رہے، تو یہ تفویض بعد النکاح ہوگی جو صحیح ہے۔

البتہ اگر عورت کے مطلق ایجاب کے بعد شوہر نے مشروط قبول کیا تو نکاح مشروط بتفویض طلاق ہوگا، لیکن اس صورت میں مرد کے اختیار میں ہوگا، چاہے تو شرط لگا کر قبول کرے یا مطلق قبول کرکے نکاح منعقد کرلے، عقد نکاح کے بعد بھی طرفین کی مرضی سے اس قسم کی شرط پر اتفاق کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کی حیثیت شرط کے بجائے معاہدہ کی ہوگی، پھر طلاق کا حق چونکہ مرد کو حاصل ہے، اس لئے یہ شوہر کی مرضی پر منحصر ہوگا کہ وہ اس قسم کا کوئی معاہدہ بیوی سے کرے یا نہ کرے۔

یہاں یہ بات خاص طور سے یاد رکھنی چاہئے کہ طلاق اصلاً مرد کا حق ہے اور شریعت نے انتہائی حکمت ومصلحت کے تحت یہ حق اسے دیا ہے، اس لئے تفویض طلاق کی شرط اسلامی مزاج کے خلاف ہے، اس سے گریز افضل ہے، اعتماد کی فضا بحال کرنے کے لئے اگر اس شرط کا لگانا ضروری ہو تو بھی اس کی حوصلہ افزائی کسی درجہ میں نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ خدشہ ہے کہ عورتیں اپنی مخصوص افتاد طبع، جذباتیت، جلد بازی اور نقصان عقل کی وجہ سے اس حق کا زیادہ غلط استعمال کریں گی، ایسے میں عورت پریشانی اور پشیمانی میں تو مبتلا ہوگی، سماج پر بھی اس کے مضر اثرات پڑیں گے، ان خدشات کے پیش نظر بہتر معلوم ہوتا ہے کہ تفویض طلاق کی شرط کے ساتھ مرد درج ذیل قیود کا بھی اضافہ کردے:

۱۔ عورت اپنے اس حق کا استعمال غصہ وجذبات کی حالت میں نہیں کرسکے گی۔
۲۔ یہ حق اس طہر میں استعمال کرے گی جس میں جماع نہ کیا گیا ہو۔
۳۔ صرف ایک طلاق بائن کی مجاز ہوگی۔
۴۔ یہ حق اعزاء واقرباء سے مشورہ کے بغیر استعمال نہیں کرے گی۔
۵۔ حق کے استعمال کے پہلے شوہر کو مہر سے بری کردے گی (دیکھئے: بحر الرائق ۳/ ۳۱۹)۔

## تفویض کے بعد رجوع

اگر شوہر تفویض کے بعد عورت کو اس حق کے استعمال سے روکنا چاہے یا رجوع کرنا چاہے تو اس کا حق نہیں ہوگا، عالمگیری میں ہے:

"شوہر کو اس سلسلے میں رجوع کا یا جو کچھ تفویض کیا ہے، اس سے روکنے اور فسخ کا اختیار نہیں ہے" (عالمگیری ۲/۱۷۵، شامی، ہدایہ ۲/۳۶۱)۔

## مہر مشروط سے متعلق مسائل

اشتراط فی النکاح کی ایک شکل یہ ہے کہ مہر مشروط مقرر کیا جائے، مثلاً عقد نکاح کے وقت مہر اس طرح طے پائے کہ اگر مرد کے پاس دوسری منکوحہ ہو تو دو ہزار ورنہ ایک ہزار مہر ہوگا، یا یہ کہے کہ آبائی وطن میں رکھا تو ایک ہزار اور باہر لے گیا تو دو ہزار، یا اس عورت کے رہتے ہوئے کسی اور عورت سے نکاح کیا تو مہر تیس ہزار ورنہ پندرہ ہزار، یا یہ طے کرے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دیا تو مہر بیس ہزار ورنہ دس ہزار ہوگا، ان تمام صورتوں میں نکاح جائز ہے (دیکھئے: فتاوی تاتارخانیہ ۳/۱۰۱، بدایۃ المجتہد ۲/۲۲)۔

یہ اس مسئلہ کی فقہی تفصیلات تھیں، جہاں تک فتوی اور عمل کی بات ہے تو آج کے حالات میں جب طلاق کا غلط اور بے جا استعمال کثرت سے ہونے لگا ہے، صاحبین کے مذہب پر فتوی اور عمل احوط اور انسب معلوم ہوتا ہے، یعنی مہر مشروط میں دونوں شرطیں معتبر اور لازم العمل ہوں گی۔

## ملازمت سے متعلق شرائط

چونکہ کسب معاش عام حالات میں عورت کے فرائض میں نہیں ہے، اسلام نے اس کے نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر ڈال کر اسے تدبیر منزل کے لئے خاص کر دیا ہے، اس لئے اس قسم کی شرائط اسلامی مزاج کے خلاف اور شرط فاسد ہیں (جس کا حکم پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے) اس لئے نکاح صحیح ہوگا، شرط لغو ہوگی اور شوہر کو شرط قبول کرنے کے باوجود ملازمت ختم کرنے کا حکم دینے یا نئی ملازمت سے روکنے کا اختیار باقی رہے گا اور اس سلسلے میں شوہر کے حکم کی تعمیل ضروری ہوگی۔



# نکاح میں مقرر کی ہوئی شرطوں کے شرعی احکام

مفتی محمد زید مظاہری[1]

بخاری شریف کی روایت ہے: "أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج" (عمدۃ القاری کتاب الشروط ۲۲۱/۱۱)۔

اور مسلم شریف کی روایت ہے: "أن أحق الشروط أن یوفی بها ما استحللتم به الفروج" (مسلم شریف کتاب النکاح ۴۵۵/)۔

دونوں حدیثوں کا حاصل یہ ہے کہ "شرطوں میں پوری کرنے کے اعتبار سے زیادہ لائق وہ شرط ہے جس کے ذریعہ تم شرمگاہوں کو حلال کرتے ہو" الفاظ کے فرق کے ساتھ اس مضمون کی اور بھی روایات وارد ہوئی ہیں (فتح الباری ۱۲۵/۹) حافظ ابن حجر "فتح الباری" میں اور علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی "فتح الملہم" میں اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

"یعنی حدیث پاک میں جن شرائط کے پورا کرنے کا حکم آیا ہے ان سے جائز شرطیں مراد ہیں، ممنوع شرطیں مراد نہیں، کیونکہ فاسد شرطوں کا پورا کرنا درست نہیں" (فتح الباری ۱۲۵/۹، فتح الملہم ۲/۲۶۱)۔

## عورت کو خود طلاق واقع کر لینے کی شرط لگانے کا حکم

اصلاً تو شریعت نے شوہر ہی کو یہ اختیار دیا ہے کہ بوقت ضرورت اپنی بیوی کو طلاق دے، لیکن ساتھ ہی اس کی بھی اجازت دی ہے کہ خود طلاق نہ دے کر کسی دوسرے کو طلاق کا اختیار دے دے، جس میں عورت بھی داخل ہے، حتی کہ مرد اگر اپنی بیوی کو طلاق واقع کر لینے کا اختیار دیدے تو یہ بہت صحیح، عقل ونقل کے موافق ہے۔

"شمس الائمہ سرخسی نے "مبسوط" میں تصریح فرمائی ہے کہ مرد نے جب طلاق کو عورت کے ہاتھ میں دے دیا تو یہ قیاس واستحسان کی رو سے بالکل صحیح ہے، کیونکہ شوہر طلاق کا مالک تھا، اگر اپنے مملوک حق کا وہ کسی کو مالک بنادے تو بالکل صحیح اور لازم ہو جائے گا حتی کہ شوہر کو اس سے رجوع کا بھی حق نہ ہوگا" (بحر الرائق ۳/ ۳۱۰، مبسوط السرخسی ۲۲۱/۶)۔

اور شوہر کے یہ اختیار دینے کے بعد عورت کو یہ اختیار حاصل ہو جانا ایسا اتفاقی مسئلہ ہے کہ صحابہ میں اس مسئلہ میں سارے لوگ متفق تھے اور متعدد صحابہ اس سلسلہ میں روایات منقول ہیں (دیکھئے: نصب الرایہ ۲۲۹/۳، اعلاء السنن ۱۹۸/۱۸، درایہ ۲۲۷)۔

## تفویض کے بعد شوہر کا حق رجوع:

شمس الائمہ سرخسی کی تصریح کے مطابق تفویض کے بعد شوہر کو حق رجوع باقی نہیں رہتا۔ (مبسوط السرخسی ۲۲۱/۶، ہندیہ ۷۵/۶، درمختار ورد المحتار)

ان سب کا حاصل یہ ہے کہ شوہر کا اپنی بیوی کو طلاق کا اختیار دے دینے کے بعد رجوع کا حق باقی نہیں رہتا، اکابر علماء وفقہاء نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے۔

## تفویض کی مختلف صورتیں اور ان کے شرعی احکام

### پہلی صورت اور اس کی شرط

اس کی کل تین صورتیں جائز ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ عقد نکاح سے پہلے شرائط باہمی رضامندی سے طے ہو جائیں اور فریقین کے اس پر دستخط ہوں، اس کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس میں نکاح کی طرف نسبت بھی موجود ہو، مثلاً معاہدہ اس طرح لکھا جائے کہ "اگر میں فلانہ بنت فلاں کے ساتھ نکاح کروں اور پھر شرائط مندرجہ اقرارنامہ میں سے کسی شرط کے خلاف کروں تو مسماۃ مذکورہ کو اختیار ہوگا کہ اس وقت یا پھر کسی وقت چاہے تو اپنے اوپر طلاق واقع کر کے اس نکاح

[1] استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

سے الگ ہوجائے''

اگر اس میں اضافت الی النکاح نہ لکھی گئی تو یہ اقرار نامہ محض بے کار ہوگا، اس کی رو سے عورت کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہ ہوگا۔ (دیکھئے: الحیلۃ الناجزۃ ۳۱/)

## دوسری صورت اور اس کے شرائط

دوسری صورت یہ ہے کہ عین ایجاب وقبول میں ان شرائط کا ذکر کیا جائے، خواہ ایجاب مشروط ہو یا ایجاب مطلق اور قبول مشروط ہو۔

اس کے صحیح اور معتبر ہونے کی شرط صاحب ''درمختار'' نے یہ لکھی ہے کہ اس میں ابتداءً یعنی ایجاب عورت کی جانب سے (جس میں شرط اور تفویض کا ذکر ہو) اور قبول مرد کی جانب سے ہونا چاہئے، اگر اس کے برعکس ہوا تو اگرچہ شرط لغو اور تفویض کا ذکر کردیں تب بھی یہ شرط قرار پائے گی اور نکاح بلا کسی شرط کے درست ہوگا (دیکھئے: ردالمحتار)۔

لیکن مرد کی جانب سے ایجاب اگر اس طرح ہو کہ ''میں نے تجھ سے نکاح کیا اس شرط کے ساتھ کہ تجھ سے نکاح کرنے کے بعد عورت کو تفویض، یعنی خود طلاق واقع کرلینے کا اختیار ہوگا'' فتاوی ہندیہ'' میں اس کی تصریح موجود ہے (دیکھئے: ہندیہ کتاب الحیل ۳۹۶/۶)۔

## تیسری صورت اور اقرار نامہ زبردستی لکھوانے کا حکم

تیسری صورت یہ ہے کہ نکاح کے بعد اقرار نامہ شوہر کی جانب سے لکھوایا جائے، جس میں عورت کو حق تفویض دیا گیا ہو، یہ صورت بھی بلاشبہ درست ہے، اور مذکورہ بالا شرائط میں سے کوئی شرط بھی اس صورت میں لازم نہیں، حتی کہ شوہر کی رضامندی بھی شرط نہیں، یعنی اگر اس طرح کا اقرار نامہ جبر واکراہ کے ساتھ شوہر سے لکھوالیا گیا تب بھی عورت کو یہ حق حاصل ہوجائے گا، جیسا کہ ''فتاوی خانیہ'' کی عبارت سے مستفاد ہوتا ہے، دیکھئے: (خانیہ علی ہامش الہندیہ ۲۸/۳)۔

## تفویض واختیار کی تحدید

تفویض کے بعد عورت کو یہ اختیار کب تک باقی رہے گا، آیا شوہر اس اختیار کو ختم کرسکتا ہے یا نہیں اور عورت اس اختیار کو کب تک استعمال کرنے کی مجاز ہے؟ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل تفصیل ہے:

(۱) تفویض کے بعد شوہر کو حق رجوع باقی نہیں رہتا۔

(۲) دوسرے یہ کہ عورت کب تک اس اختیار کو استعمال کرسکتی ہے تو اگر وہ الفاظ اور صیغے عام نہیں ہیں، مثلاً اس طرح شرط مقرر کی کہ اگر شوہر نے ایسی حرکت کی تو عورت کو اختیار ہوگا، اس صورت میں تو عورت کو صرف ایک ہی مرتبہ طلاق واقع کر کے شوہر سے علیحدگی کا حق ہوگا، اور جس مجلس میں عورت کو خلاف شرط کا علم ہوا اسی مجلس تک اختیار ہوگا، اس وقت خاموشی یا رضامندی ظاہر کرنے کے بعد یا مجلس ختم ہوجانے کے بعد اس کا اختیار باطل ہوجائے گا، اور اگر تفویض عام صیغوں کے ساتھ ہوئی تھی اس طرح کہ جب جب ایسا ہو، جب بھی شوہر ایسی حرکت کرے، عورت کو طلاق واقع کرلینے کا اختیار ہوگا، ایسی صورت میں عورت کا اختیار ایک مرتبہ کے ساتھ یا اس مجلس تک محدود نہ ہوگا، بلکہ خلاف شرط جب بھی کوئی امر پایا جائے گا، عورت کو طلاق واقع کرلینے کا اختیار ہوگا (دیکھئے: شامی، بحر وغیرہ)۔

**احتیاطی تدابیر:**......لیکن اس کے باوجود عورت چونکہ ناقص العقل ہے، اس لئے طلاق کو اس کے ہاتھ میں دے دینا خطرہ سے خالی نہیں، اس لئے مناسب ہے کہ ضرر سے حفاظت کے لئے تفویض تو کی جائے، لیکن اس میں مناسب قیدیں بھی لگادی جائیں تاکہ عورت اس کا غلط استعمال نہ کرسکے، اور وہ یہ کہ مثلاً نکاح کے وقت عورت کی طرف سے اس کا وکیل یا ولی یا خود عورت یا قاضی نکاح خواں، اس طرح کہے کہ میں نے مسماۃ فلانہ بنت فلاں کو تمہارے نکاح میں اس شرط پر دیا کہ جس وقت اس کو تم سے شدید تکلیف پہنچے گی، یا عورت کو حق تلفی اور ظلم کی شکایت ہوگی، جس کو فلاں فلاں اشخاص میں سے کم از کم دو آدمی تسلیم کرلیں اور وہ دونوں آدمی طلاق کو مناسب کہیں تو اس کے بعد ہر وقت معاملہ اس کے اختیار میں ہوگا کہ اپنے آپ کو ایک طلاق بائن واقع کرکے نکاح سے علیحدگی اختیار کرلے اس کے بعد بھی عورت کو چاہئے کہ استخارہ، مشورہ اور دعاء اور انجام کو سوچنے کے بعد انشراح کے ساتھ اس حق کو استعمال کرے، ورنہ کبھی بعد میں افسوس کرنا پڑتا ہے۔ (الحیلۃ الناجزۃ مختصراً ۳۵)

## تعلیق وتردید کے ساتھ مہر متعین کرنے کا شرعی حکم

فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ کسی شخص کا عورت سے اس شرط پر نکاح کرنا کہ اگر عورت کو اس کے شہر سے نہ لیجائے گا تو ایک ہزار مہر اور اگر اس کے شہر سے

لے جائے گا تو دو ہزار مہر ہوگا، اس طرح مہر مقرر کرنے کی صورت میں نکاح تو بہر حال درست ہوگا، البتہ امام صاحب کے نزدیک مہر کی بابت پہلی شرط معتبر اور دوسری شرط فاسد ہے، یعنی اگر شوہر اپنی شرط پر رہا تو ایک ہزار مہر ہوگا ورنہ دوسری صورت میں شرط کا اعتبار نہ کرتے ہوئے مہر مثل لازم ہوگا۔

لیکن صاحبین کے نزدیک دونوں ہی شرطیں جائز ہیں، یعنی اگر شرط کے خلاف کیا تو دو ہزار مہر لازم ہوگا، عام طور پر فقہاء نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ (فتاوی تاتارخانیہ ۳/۱۰۱، ہندیہ ۱/۳۰۷، بدائع ۲/۲۸۶، بحر ۳/۱۵۹، مبسوط ۵/۹۰)

## امام صاحب کے مسلک کی توضیح اور غلط فہمی کا ازالہ

مشہور تو یہی ہے کہ اس مسئلہ میں امام صاحب کے نزدیک جس مہر کا ذکر کیا گیا ہو وہی تسمیہ صحیح ہے اور دوسری شق کا مقرر کردہ مہر معتبر نہیں، بلکہ اس صورت میں مہر مثل لازم ہوگا، لیکن یہاں پر یہ بات غور کرنے کی ہے کہ امام صاحب کے نزدیک شق اول کا تسمیہ کیوں معتبر اور شق ثانی کا غیر معتبر ہوتا ہے، خواہ اول ہو یا ثانی اس سے کوئی واسطہ نہیں، محقق ابن الہمام "فتح القدیر" میں امام صاحب کے مسلک کی دلیل بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"امام صاحب کے قول کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تسمیہ میں یعنی شق اول میں جو مہر مقرر ہوا ہے اس میں کوئی خطرہ نہیں کیونکہ وہ منجز ہے اس لئے یہ معتبر ہے، بخلاف شق ثانی کے کہ وہ معلق ہے اس لئے غیر معتبر ہے"۔ (فتح القدیر ۳/۲۳۳)

اس سے معلوم ہوا کہ وہ مہر جو تعلیق کے ساتھ مقرر ہوا وہ صحیح نہیں اور جو تنجیز کی صورت میں ہو وہ صحیح ہے خواہ اول ہو یا ثانی۔

فقیہ النفس ابن نجیم "البحر الرائق" میں تحریر فرماتے ہیں:

"تسمیہ اولی کی صحت کا مدار صرف اس پر ہے کہ وہ منجز ہے معلق نہیں اور یہ صرف اسی صورت میں منطبق ہوتا ہے، جبکہ شوہر نے یہ کہا کہ اگر عورت کے شہر میں مقیم رہا تو ایک ہزار، لیکن اس صورت میں جب کہ شوہر نے کہا کہ اگر منکوحہ کی سوکن کو طلاق دیدے تو ایک ہزار اور اگر طلاق نہ دے تو دو ہزار مہر پر نکاح ہوگا، اس صورت میں حکم مختلف ہوگا، یعنی پہلی صورت کا تسمیہ فاسد اور دوسرا صحیح ہوگا، کیوں کہ اس صورت میں طلاق نہ دینا یہ تنجیز ہے، لہذا پہلا فاسد اور دوسرا صحیح ہوگا"، (البحر الرائق ۳/۱۶۲)۔

اس تفصیل کے پیش نظر علی الاطلاق یہ کہنا درست نہیں کہ امام صاحب کے نزدیک جس مہر کا ذکر پہلے ہو وہ صحیح اور دوسرا فاسد ہوگا، بلکہ درست یہ ہے کہ جو تسمیہ بصورت تنجیز ہو وہ درست ہوگا اور جو بصورت تعلیق ہو وہ درست نہیں ہوگا۔

## صورت مسئولہ کا حکم

لہذا صورت مسئولہ میں اگر شوہر نے اس شرط پر نکاح کیا کہ اگر بیوی کو وہ طلاق دے گا تو مہر بیس ہزار ہوگا اور اگر طلاق نہ دی تو دس ہزار ہوگا، اس صورت میں چونکہ پہلی صورت میں مہر معلق ہے اور دوسری صورت میں منجز، اس لئے پہلا مہر درست نہ ہوگا اور دوسرا صحیح ہوگا، یہ مسلک امام صاحب کا ہے، امام صاحب کے مسلک کے مطابق اگر کوئی صورت مفید ہوسکتی ہو تو اس کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

## صاحبین کا مسلک

البتہ صاحبین کے نزدیک دونوں شرطیں معتبر اور دونوں صورتوں میں مہر کا تسمیہ درست ہے، لیکن ہمارے تمام فقہاء نے اس مسئلہ میں امام صاحب کے مسلک کو راجح قرار دیا ہے اور صاحبین کے مسلک کو مرجوح قرار دیا ہے، اس لئے اصحاب ترجیح یا دلائل کی قوت کے پیش نظر تو صاحبین کا مسلک اختیار کرنے کی اجازت نہیں، البتہ ضرورت کی وجہ سے جب ضعیف قول، نیز دیگر مذاہب پر فتوی دینے کی اجازت ہے تو صاحبین کے مسلک پر بدرجہ اولی ہونا چاہئے، لیکن وہ ضرورت واقعی ضرورت بھی ہو، اس کی بناء صحیح ہو، اور وہ ضرورت صاحبین کے مسلک کو اختیار کرنے سے پوری بھی ہوتی ہو۔

## صاحبین کے مسلک کو اختیار کرنا مسئلہ کا حل نہیں

ضرورت کو اگر تسلیم کرلیا جائے تب بھی اس ضرورت کی وجہ سے صاحبین کے مسلک کو اختیار کرنا بے سود اور خلاف عقل ونقل ہے، کیونکہ اس مسلک کو اختیار کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مہر کی کثرت کی وجہ سے شوہر طلاق نہ دے سکے، اور یہ نظریہ کہ مہر اس قدر زیادہ کردو تاکہ شوہر طلاق دینے کی ہمت نہ کرسکے شرعا

بھی مردود ہے اور عقلاً بھی، کیونکہ شریعت نے خود بعض حالات میں طلاق کو تجویز کیا ہے، حقوق کی ادائیگی نہ کر سکنے کی صورت میں شوہر کو طلاق دینے ہی کا حکم ہے، لہٰذا بالقصد ایسی تدبیر اختیار کرنا جس سے کہ طلاق کا دروازہ ہی گویا بند کر دیا جائے یہ درست نہیں، کیونکہ یہ تو تغییر مشروع کے مرادف ہے، اور عقلی اعتبار سے بھی اگر دیکھا جائے تب بھی یہ تدبیر غیر مفید، بلکہ مضر ہے۔

الغرض طلاق نہ دینے کے خطرہ سے مہر کی زیادتی کا تصور ہی سرے سے غلط ہے، کیونکہ بسا اوقات باہمی نباہ نہ ہونے کی وجہ سے طلاق دینا ہی شوہر بیوی دونوں کے حق میں مفید ہوتا ہے۔

## مناسب حیلہ اور مفید تدبیر

لیکن اگر کسی کے نزدیک اس کی واقعی ضرورت وافادیت مسلم ہو تو اس کے لئے ایک حیلہ ہے جس کو ہمارے فقہاء نے تحریر فرمایا ہے، ہندیہ میں بھی منقول ہے، وہ یہ کہ عورت شوہر سے اس طرح نکاح کرے کہ میں اتنے مہر پر اس شرط کے ساتھ نکاح کرتی ہوں (اور اس شرط کو ذکر کردے جو اس کو منظور ہے)، مثلاً: یہ کہ مجھ کو طلاق نہ دے یا میرے ہوتے ہوئے کسی دوسرے سے نکاح نہ کرے اور اگر اس شرط کے خلاف کیا تو بجائے مہر مسمی کے مہر مثل لازم ہوگا اور مہر مثل کی تعیین بھی کردے کہ مہر مثل اتنا ہوگا (جو شوہر پر ثقیل ہوگا) اور شوہر اس کا اقرار بھی کرلے، اس صورت کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے، خلاف شرط ہونے کی صورت میں شوہر پر مہر مثل لازم ہوگا اور چونکہ وہ کثیر مقدار میں ہوگا، لہٰذا شوہر اس شرط کے خلاف کی جرأت نہ کر سکے گا۔ (فتاوی ہندیہ کتاب الحیل ۶/ ۳۹۲)

ضرورت کے وقت کی حد تک اس کو اختیار کیا جاسکتا ہے، لیکن ایسے امور کا رواج دینا شریعت کی مراد کے خلاف، بلکہ تغییر مشروع کے مرادف ہوگا۔

## بیوی کو ملازمت سے نہ روکنے کی شرط پر نکاح کرنا

(۱) فقہاء ومحدثین نے تصریح فرمائی ہے کہ نکاح میں عائد کردہ وہ شرطیں جو مقتضاء عقد کے خلاف، حقوق زوجیت کے منافی، یا کسی غیر مشروع امر پر مشتمل ہوں ایسی شرطیں باطل اور ان کا پورا کرنا واجب نہیں، بلکہ بعض صورتوں میں جائز نہیں (دیکھئے: عینی شرح البخاری ۱۱/ ۲۲۱، فتح الباری ۹/ ۱۲۵)۔

(۲) اور عقد نکاح کے تقاضے اور اس کے حقوق میں یہ بھی داخل ہے کہ شوہر کو بیوی پر ملک تام حاصل ہو، جہاں شوہر رہے عورت کو ساتھ رکھے، ایسی کوئی شرط لگانا جس سے ملک تام حاصل نہ ہو وہ عقد نکاح کے تقاضوں کے خلاف اور حقوق زوجیت کے منافی ہے۔



# عقد نکاح کے ساتھ عائد کی جانے والی شرطیں

## ایک شرعی جائزہ

مولانا نور الحق رحمانی[1]

## جمہور فقہاء کے نزدیک شرط صحیح کی تعریف

احناف، شافعیہ اور مالکیہ کا مسلک عقود وشروط کے سلسلے میں قدرے اعتدال پر مبنی ہے، نہ اس میں اہل ظاہر کی طرح حد سے زیادہ تنگی ہے نہ حنابلہ کی طرح حد سے زیادہ توسع، اس سلسلے میں اصل تو ان کے یہاں حظر واباحت ہی ہے اور اس کی بنیاد وہ حدیث ہے جس میں بیع اور شرط سے منع کیا گیا ہے "نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من بیع وشروط" (المستدرک للحاکم) لیکن وہ اس سے ان شرائط کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں مقتضاء عقد کے مطابق ہوں یا مقتضاء عقد کو مؤکد کرنے والی ہوں، یا جن کے بارے میں کوئی نص وارد ہوں یا جن کا عرف میں رواج ہو، یہ ائمہ چوں کہ احکام کی علتوں سے بحث کرتے ہیں اور قیاس اور عرف کے اصول پر ان کا عمل ہے اس لئے وہ نہی کی علت وقوع نزاع کو قرار دے کر ان شرائط کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، جن سے نص خاموش ہے اور عرف کی بنیاد پر نزاع کا احتمال باقی نہیں رہتا، "درمختار کتاب البیوع" میں شرط صحیح کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"فیصح البیع بشرط یقتضیه العقد، کشرط الملك للمشتری......أولا یقتضیه لکن یلائمه کشرط رهن معلوم وکفیل حاضر......أوجری العرف به کبیع نعل......علی أن یحذو البائع أو یشرکه" (الدر المختار ۵۔۸۶،۸۴)

مذکورہ بالا عبارت کی روشنی میں احناف کے نزدیک شرط صحیح کی تعریف یہ نکلتی ہے کہ ہر وہ شرط جو مقتضائے عقد کے مطابق ہو، یا مقتضائے عقد کو مؤکد کرنے والی ہو، یا جس کے بارے میں کوئی شرعی نص وارد ہو یا جس کا عرفاً رواج ہو، وہ شرط صحیح ہے، اور جو شرط ان چاروں قسموں کے سوا ہو، یعنی جو نہ مقتضائے عقد کے مطابق ہو، نہ مقتضائے عقد کو ثابت کرنے والی ہو، نہ اس کے سلسلے میں کوئی نص شرعی ہو، نہ عرف میں اس کا رواج ہو تو وہ شرط فاسد ہے۔

## شرائط عائد کرنے کا طریقہ:

مقتضائے عقد کے مطابق ہونے کا مطلب یہ کہ خود عقد نکاح کے نتیجہ مین جو کام فریقین پر عائد ہوتے ہیں بوقت نکاح اسی کو شرط کی صورت میں ذکر کیا جائے، مثلاً بیوی کی طرف سے مہر اور نفقہ کی شرط یا مناسب رہائش کی شرط یا حسن معاشرت کی شرط، یا شوہر کی طرف سے یہ شرط کہ بیوی اس کی اطاعت کرے گی، اس کے گھر بار کی دیکھ ریکھ کرے گی، اس کے حکم کے بغیر گھر سے باہر نہیں جائے گی، اور نافرمانی کی صورت میں شوہر کو اس کی تادیب کا حق ہوگا کہ تمام چیزیں خود عقد نکاح کے احکام کے طور پر ثابت ہوتی ہیں۔

اور مقتضائے عقد کے مناسب اور ان کو مؤکد کرنے والی شرطیں، مثلاً عورت کی طرف سے مہر اور نفقہ کے لئے کسی کو ضامن اور کفیل مقرر کرنے کی شرط کہ مہر ونفقہ کا وجوب تو عقد نکاح کی بنیاد پر ہوتا ہے لیکن کفالت کی شرط سے انکا حصول آسان اور مؤکد ہو جائے گا، یا مثلاً بیوی کی طرف سے یہ شرط کہ وہ اسے اپنے گھر والوں سے علیحدہ کمرہ میں رکھے گا۔

اور کسی ایسی چیز کی شرط لگانا جس کی شریعت میں دلیل موجود ہو اور جو شرعی لحاظ سے مباح ہو، مثلاً شوہر کا یہ شرط لگانا کہ اگر زوجین کے درمیان ازدواجی تعلقات خوشگوار نہ رہے، تو اسے طلاق کا حق ہوگا، یا بیوی کا یہ شرط لگانا کہ فلاں فلاں صورت میں اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار ہوگا، کہ یہ دونوں

---

[1] استاذ المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء پھلواری شریف، پٹنہ

مقتضائے عقد کے مطابق ہیں نہ اس کے مقتضی کو مؤکد کرنے والی ہیں، لیکن شریعت میں اس کی اجازت موجود ہے کہ ازدواجی تعلقات کے خراب ہونے کی صورت میں شریعت نے مرد کو طلاق کا اور عورت کو خلع اور فسخ نکاح کے ذریعہ رہائی حاصل کرنے کا حق دیا ہے۔

اور کوئی ایسی شرط لگانا جس کا عرف میں رواج اور لوگوں میں تعامل ہو، مثلاً شوہر کا یہ شرط لگانا کہ وہ صرف نصف مہر فوری طور پر ادا کردے گا اور باقی مہر مؤجل ہوگا، یا بیوی کا یہ شرط لگانا کہ وہ نصف مہر فوری طور پر وصول کرے گی، جب کہ اس علاقہ میں ایسا ہی رواج ہو۔

یہ تمام شرطیں صحیح اور لازم الایفاء ہیں، لیکن اگر ان کا التزام کرنے والے فریق نے ان کی خلاف ورزی کی تو شرط لگانے والے فریق کو شریعت کے مقررہ ضابطوں کے مطابق چارہ جوئی کا حق تو حاصل ہوگا لیکن فسخ نکاح کا اختیار نہ ہوگا، کیونکہ حنفیہ کے نزدیک نکاح کی صحت کے لئے محض ایجاب وقبول کا صادر ہونا ضروری ہے، فریقین کی رضامندی ضروری نہیں ہے، اس بناء پر ان کے نزدیک مکرہ کا نکاح بھی منعقد ہوجاتا ہے، حالانکہ مکرہ کی رضامندی تو ابتداءً ہی نہیں ہے اور جب نکاح رضامندی کے بغیر ابتداءً ہی منعقد ہوجاتا ہے تو بقاء بدرجہ اولی منعقد ہوگا، حنفیہ کا استدلال اس حدیث سے ہے، جس میں نکاح، طلاق اور عتاق کے ہزل اور مذاق کو بھی سنجیدگی پر محمول کیا گیا ہے۔

''ثلاث جد هن جد وهزلهن جد، النكاح والطلاق والرجعة'' (مشكوٰة عن ابي هريره ۵۔۲۸۲ باب الخلع والطلاق)

خلاصہ یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک شرط صحیح کی خلاف ورزی کی صورت میں فریق ثانی کو فسخ نکاح کا اختیار نہ ہوگا۔

## شرط فاسد اور اس کا حکم

شرط فاسد وہ ہے جو مقتضاء عقد کے منافی اور احکام شرع کی رو سے ناجائز ہو، لیکن اس میں فریقین میں سے کسی ایک کی منفعت ہو اور شریعت میں اس کے جواز کی کوئی دلیل وارد نہ ہو اور نہ لوگوں کے درمیان اس کا تعامل ہو، مثلاً شوہر کا یہ شرط لگانا کہ وہ بیوی کو مہر نہ دے گا، یا اس کا نان ونفقہ اس کے ذمہ ہوگا یا یہ کہ بیوی ہی گھر کے اخراجات کی کفالت کرے گی یا دونوں کے مسلمان ہونے کی صورت میں یہ شرط لگانا کہ مرنے کے بعد وہ ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے یا بیوی کا یہ شرط لگانا کہ وہ اسے اپنی دوسری بیویوں پر نان ونفقہ اور باری کی تقسیم میں فوقیت دے گا، یا یہ کہ وہ شوہر کی اجازت کے بغیر اپنی مرضی سے جہاں چاہے گی جائے گی، یا یہ کہ وہ اس کے رہتے ہوئے دوسری شادی نہیں کرے گا، یا اس کو اس کے آبائی وطن سے باہر نہیں لے جائے گا، یا ملازمت کرنے دے گا، وغیرہ۔

اس نوعیت کی شرطوں کا حکم یہ ہے کہ وہ باطل ہوجائیں گے اور عقد نکاح پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، بلکہ عقد صحیح رہے گا، جمہور فقہاء کا مسلک اس سلسلے میں یہی ہے اور اس کی دلیل حدیث بریرہ ہے جو پہلے گذر چکی اور جس میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے فرمایا تھا "خذيها واشترطي الولاء فإن الولاء لمن اعتق" (بخاری کتاب الشروط)۔

حضرت بریرہ کے مالکوں نے انہیں حضرت عائشہ کے ہاتھ فروخت کرتے وقت ان کی ولاء کی شرط اپنے لئے لگائی تھی جو شرط فاسد تھی، حضرت عائشہ نے آنحضور کے حکم کے مطابق ان کی یہ شرط قبول فرمائی تھی، پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کو باطل اور بیع کو نافذ قرار دیا، معلوم ہوا کہ عقد شرط سے فاسد نہیں ہوتا۔

شرط کی صحت اور عدم صحت کے سلسلے میں مذکورہ بالا مسلک حنفیہ کا ہے، اور تقریباً یہی مسلک شافعیہ اور مالکیہ، یعنی جمہور فقہاء کا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ وہ شرط صحیح کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں (۱) شرط صحیح غیر مکروہ، (۲) شرط صحیح مکروہ۔

اس دوسری قسم میں وہ درج ذیل شرائط کو داخل کرتے ہیں، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ وہ اس کے رہتے ہوئے دوسری شادی نہیں کرے گا، اسے اس کے آبائی وطن سے باہر نہ لے جائے گا وغیرہ، اور ان شرائط کی تکمیل کو وہ مستحب قرار دیتے ہیں، لازم قرار نہیں دیتے اور جمہور ہی کی طرح شرط کی خلاف ورزی کی صورت میں فریق ثانی کو فسخ نکاح کا اختیار نہیں دیتے، اس طرح نتیجہ کے لحاظ سے وہ جمہور کے ساتھ ہیں۔

اور شرط صحیح غیر مکروہ میں وہ درج ذیل شرائط کو داخل کرتے ہیں، مثلاً مرد کا یہ شرط لگانا کہ عورت ان عیوب سے پاک ہو جن کی بناء پر فسخ نکاح کا اختیار حاصل نہیں ہوتا، مثلاً ہاتھ پیر اور قوت سماعت وبصارت کا صحیح سالم ہونا، یا عورت کا تعلیم یافتہ اور خوبصورت ہونا وغیرہ، اور شرائط کے فوت ہونے کی صورت میں وہ فریق ثانی کو فسخ نکاح کا اختیار دیتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل اور جمہور ائمہ کے نقطہ نظر میں فرق یہ ہے کہ امام احمد نکاح کے ساتھ عائد کی جانے والی شرطوں میں اصل صحت کو قرار دیتے ہیں، جب تک کہ کوئی شرعی دلیل اس کے بطلان اور فساد پر قائم نہ ہوجائے، اور جمہور ائمہ فرماتے ہیں کہ اصل شرط میں عدم الزام ہے جب تک کہ الزام کو ثابت کرنے والی کوئی شرعی دلیل (نص یا قیاس یا عرف) نہ پائی جائے، تو گویا محل اختلاف وہ شرائط ہیں جن کی صحت یا عدم صحت کے سلسلے میں کوئی خاص دلیل نہیں، امام احمد انہیں صحیح قرار دیتے ہیں اور جمہور فقہاء انہیں لغو قرار دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں سوالنامہ میں مذکور تینوں قسموں کی شرائط کا حکم درج ذیل ہوگا:

(۱) بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا، اس نوعیت کی شرطیں جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی نئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ خود عقد نکاح سے جو ذمہ داریاں فریقین پر عائد ہوتی ہیں انہیں کا شرائط کی صورت میں ذکر کیا جانا، مقتضائے عقد کے ذیل میں آتی ہیں، اس لئے وہ باتفاق ائمہ شرائط صحیحہ اور لازم الایفاء ہیں، لیکن ان کا یہ ذکر کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہے، اور شرط کی خلاف ورزی کی صورت میں فریق ثانی کو فسخ نکاح کا اختیار نہ ہوگا، بلکہ ازدواجی حقوق کی عدم ادائیگی کی صورت میں شریعت نے زوجین میں سے ہر ایک کو دوسرے کے خلاف جس کارروائی اور چارہ جوئی کا حق دیا ہے شریعت کے مقررہ ضابطوں کے مطابق انہیں اس کا حق حاصل ہوگا۔

(۲) بوقت نکاح شوہر کا یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان ونفقہ اس کے ذمہ نہیں ہوگا، اس نوعیت کی شرطیں جن کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو یا اللہ تعالی کے واجب کردہ کسی حق کو ساقط کرنا اور حکم شرعی کو بدلنا ہو مقتضاء عقد اور احکام شرع کے خلاف ہونے کی وجہ سے بالاتفاق شرائط فاسدہ کے ذیل میں آتی ہیں، اس لئے باطل قرار پائیں گی، لیکن نکاح کی صحت کے لئے مانع نہیں بنیں گی، اگر شوہر نے نان ونفقہ کی نفی کردی ہے تو بھی نان ونفقہ واجب ہوگا اور مہر کی نفی کی ہے تو دخول یا موت کے بعد مہر مثل واجب ہوگا اور اگر خلوت صحیحہ سے قبل طلاق ہوگئی تو متعہ واجب ہوگا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً وَّمَتِّعُوهُنَّ'' (سورہ بقرۃ:۲۳۶)

''وإن تزوجها ولم يسم لها مهرا أو تزوجها على أن لا مهر لها فلها مهر مثلها إن دخل بها او مات عنها'' (الهدايه باب المهر ۲۔ ۳۲۴)۔

(۳) بوقت نکاح عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہ کرے گا یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا، یہ حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک شروط فاسدہ کے ذیل میں آتی ہیں، کیونکہ ان میں شوہر کے ان حقوق کو ساقط کرنا ہے جنہیں شریعت نے اسے عطا کیا، اور اسے ایک امر مشروع سے روکنا ہے کیونکہ شریعت نے مرد کو ایک سے زیادہ چار تک شادیوں کی اجازت دی ہے۔

"فانكحوا ما طاب لكم من النساء مثنى وثلاث ورباع" (سورہ نساء ر۳) اسی طرح بیوی کو اپنے ساتھ رکھنے کا حق دیا ہے، "اسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم" (سورہ طلاق ر۶) نکاح کے مصالح میں جنسی تسکین اور گھر کی تنظیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اور ان مقاصد کا حصول پوری طرح جب ہی ممکن ہے جب کہ بیوی شوہر کے ساتھ ہو ورنہ نکاح کے یہ مقاصد متاثر ہوں گے، اس لئے بیوی کی طرف سے ایسی شرطوں کا عائد کیا جانا شرط فاسد ہے، اس لئے شوہر پر اس کی تعمیل واجب نہ ہوگی، البتہ ان کے ذکر سے عقد نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، عقد صحیح رہے گا اور شرط فاسد ہوجائے گی۔

امام مالک کے نزدیک یہ دونوں شرطیں صحیحہ مکروہہ میں داخل ہیں کیونکہ وہ نکاح کے اصل مقصود کے منافی نہیں نہ ان کے ذریعہ احکام شرعیہ میں سے کسی حکم کو ساقط کرنا لازم آتا ہے، بلکہ یہ شوہر کا حق ہے اور شوہر کو اپنے حق سے دست بردار ہونے کا اختیار ہے، لیکن چونکہ ان کی وجہ سے شوہر پر تنگی لازم آتی ہے، اس لئے وہ مکروہ ہیں، اس طرح کی شرط کا حکم ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ اصل عقد کے ساتھ لاحق ہوجائیں گی، لیکن شرط قبول کرنے والے فریق پر اس کی تعمیل واجب نہ ہوگی، شوہر پر اس کی تعمیل مستحب ہوگی اور خلاف ورزی کی صورت میں بیوی کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل نہ ہوگا، اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک جیسا کہ پہلے بھی مذکور ہوا یہ شرطیں شرائط صحیحہ کے ذیل میں آتی ہیں، چونکہ ان میں عورت کی منفعت ہے اور یہ نکاح کے اصل مقصود کے منافی نہیں ہیں، اس لئے شوہر پر ان کی تعمیل واجب ہوگی اور خلاف ورزی کی صورت میں، بیوی کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہوگا۔

اور اگر کوئی ایسی شرط لگائی گئی جو از روئے شرع ممنوع ہے اور جس سے دوسرے کو ضرر لاحق ہوتا ہے، مثلاً بیوی کی طرف سے اپنی سوکن کو طلاق دینے کی شرط تو باتفاق ائمہ یہ شرط فاسد ہے، لہذا یہ لغو ہوجائے گی اور بلا ضرورت طلاق دینا علی حالہ حرام رہے گا۔

احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ نکاح میں شرائط کو جمہور ائمہ کے مسلک کے تابع رکھا جائے، تاکہ عقد نکاح انتشار سے محفوظ رہ سکے، اور لوگ ازدواجی زندگی کو اپنی خواہشات کے تابع نہ بنائیں، اگر اس سلسلے میں امام احمد کے مسلک کو اختیار کیا جائے جس میں بے حد توسع ہے تو اس بات کا خطرہ ہے کہ نکاح عاقدین کے تابع ہو جائے اور اس کا تقدس ختم ہو جائے جو شریعت نے اسے عطا کیا ہے، اور اس کی حیثیت بھی یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں انجام پانے والے شہری نکاح کی سی ہو جائے، جو وقتی جذبات وخواہشات کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے اور عارضی غصہ کی بنیاد پر ختم ہو جاتا ہے۔

(ج) عقد نکاح کے وقت اگر عورت یہ شرط لگائے کہ اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، یا فلاں فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، اور شوہر اس شرط کو تسلیم کرتا ہے تو فقہ حنفی کی رو سے یہ شرط صحیح قرار پائے گی، اور اس کی وجہ سے عورت کو مذکورہ صورتوں میں طلاق کا اختیار حاصل ہو جائے گا، شریعت نے زوجین میں سے ہر ایک کے لئے بوقت ضرورت قید نکاح سے آزادی حاصل کرنے کی سہولت رکھی ہے، شوہر طلاق کے ذریعہ اپنے اس حق کو براہ راست استعمال کر سکتا ہے، اور بیوی خلع اور فسخ کے ذریعہ، یعنی شوہر اور قاضی کے واسطہ سے، نیز شریعت نے جس طرح شوہر کو بطور خود طلاق کے استعمال کا حق دیا ہے اسی طرح اس حق کو دوسرے کے سپرد کرنے، اور طلاق دینے کے لئے کسی کو وکیل بنانے کا حق بھی دیا ہے، لہذا اگر شوہر بوقت نکاح بیوی کو یہ اختیار تفویض کر دے، یا بیوی کی طرف سے عائد کردہ شرط کی بنیاد پر کہ اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، اس کی یہ شرط قبول کرلے تو اس کی بنیاد پر بیوی کو حسب تصریح مخصوص حالات میں یا مطلقا اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار حاصل ہو جائے گا، اور اگر بعد میں چل کر شوہر اس تفویض طلاق کو ختم کرنا چاہے تو اسے اس کا اختیار باقی نہیں رہے گا، درمختار میں ہے: نكحها على أن أمرها بيدها صح (الدر المختار ۳؍۳۲۹)۔

علامہ شامی اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

(قوله صح) مقيد بما إذا ابتدأت المرأة فقالت زوجت نفسي منك على أن أمري بيدي أطلق نفسي كلما أريد أو على أني طالق فقال الزوج قبلت، أما بعد الزوج لا تطلق ولا يصير الأمر بيدها كما في البحر من الخلاصة البزازية۔
(حاشیہ رد المحتار علی الدر ۲۔ ۳۲۹)

## نکاح میں شرط کی تین صورتیں ہیں

(۱) عقد نکاح سے پہلے شرائط طے ہو جائیں اور اس کی تحریر پر دستخط طرفین سے ہو جائیں، اس صورت میں بیوی کی طرف حق طلاق کے منتقل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ شوہر شرائط نامہ میں اس بات کی صراحت کر دے کہ اگر میں فلاں بنت فلاں سے نکاح کروں تو فلاں فلاں صورتوں میں اسے اپنے اوپر طلاق بائن واقع کرنے کا اختیار ہوگا؛ اگر شرائط نامہ میں نکاح کی طرف نسبت نہ کی گئی تو پھر اس کا اعتبار نہ ہوگا۔

(۲) اور اگر عقد نکاح ہی میں ان شرائط کا ذکر کیا جائے تو بھی صحیح ہے بشرطیکہ عورت کی طرف سے ایجاب مشروط ہو، مثلاً عورت یوں کہے کہ میں نے تم سے اس شرط پر نکاح کیا کہ فلاں فلاں صورتوں میں مجھے اپنے اوپر طلاق بائن واقع کرنے کا اختیار ہوگا اور اس کے جواب میں مرد کہے میں نے قبول کیا تو یہ تفویض صحیح ہوگی، اور شرائط نامہ کے مطابق عورت کو اپنے اوپر طلاق بائن واقع کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

اور اگر عورت کی طرف سے ایجاب مطلق ہو اور مرد قبول میں شرط کا اضافہ کر دے تب بھی تفویض درست ہوگی، لیکن اگر عورت کی طرف سے ایجاب مطلق ہو تو معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا، اب شوہر کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو شرط کا اضافہ کرے یا نہ کرے، بالغرض اگر اس نے شرط تفویض کا اضافہ نہ کیا تو پھر عورت کو طلاق کا اختیار حاصل نہ ہوگا۔

(۳) اگر عقد نکاح کے بعد مابین طرفین کوئی شرائط نامہ تحریر کیا جائے جس کی رو سے مخصوص صورتوں میں، یا مطلقا طلاق کا اختیار بیوی کی طرف منتقل ہو اور اس پر فریقین کے دستخط ہو جائیں تو بھی یہ تفویض درست ہوگی، اور حسب شرائط بیوی کو طلاق کا اختیار حاصل ہو جائے گا۔

یہ حکم تو فتوی اور مسئلہ کی رو سے ہوا، لیکن اس سے مصالح شرع اور مقاصد نکاح کے ضائع ہونے کا قوی اندیشہ ہے، صنف نازک کی زودرنجی، سریع الانفعالی اور ناعاقبت اندیشی ایک مسلمہ حقیقت ہے جس کی طرف حدیث میں بھی اشارہ کیا گیا ہے، اسی بناء پر شریعت نے اسے براہ راست طلاق کے استعمال کا حق نہیں دیا ہے؛ آج صورت حال یہ ہے کہ ہمارا مسلم معاشرہ جہالت اور ناخواندگی کا شکار ہے، دین سے دوری اور احکام شرع سے ناواقفیت عام ہے، شراب اور نشہ خوری

کا بھی کسی درجے میں رواج ہے، لوگوں کی اخلاقی وروحانی تربیت کا کوئی مؤثر اور قابل ذکر نظام نہیں، جس کی بناء پر بہت سے مرد حق طلاق کا بیجا استعمال کرتے ہیں، اور اشتعال اور جذبات میں آکر ایک ساتھ تینوں طلاقیں دے ڈالتے ہیں، جس کی وجہ سے بہت سی معاشرتی خرابیاں رونما ہوتی ہیں، اور بہت سی مسلم خواتین، اور ان کے معصوم بچوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ایسی صورت میں اگر بوقت نکاح شرط کے ذریعہ طلاق کا حق عورت کو تفویض کیا جائے اور اس نوعیت کا مشروط نکاح سماج میں رواج پذیر ہوجائے، تو حالات زیادہ سنگین ہوجائیں گے، اور طلاق کے واقعات میں خاصا اضافہ ہوجائے گا، اس لئے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ اس طرح کے مشروط نکاح کو ہرگز رواج نہ دیا جائے ورنہ مصالح نکاح بری طرح متاثر ہوں گے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الحیلۃ الناجزۃ'' میں تفویض طلاق بوقت نکاح کی جو تجویز پیش فرمائی ہے وہ ہندوستان کے سابقہ حالات کے پیش نظر تھی، جبکہ ہندوستان میں انگریز سامراج کے تسلط کے بعد کہیں بھی اسلامی دارالقضاء اور مسلم قاضی کا نظام نہیں تھا اور مسلم خواتین کو بوقت ضرورت قید نکاح سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

آج کل عورتوں کو نکاح کے بعد جس قدر پریشانیوں کا سامنا ہوتا ہے محتاج بیان نہیں، کبھی مرد ظلم اور بے رخی سے پیش آتا ہے، نہ نان ونفقہ دیتا ہے نہ طلاق دیتا ہے، کبھی بال بچوں سے بے فکر ہوکر پردیس چلا جاتا ہے اور لاپتہ ہوجاتا ہے، کبھی نامرد نکلتا ہے، بعض دفعہ یتیم لڑکی کا نکاح چچا وغیرہ نامناسب جگہ کردیتے ہیں اور لڑکی ناپسند کرتی ہے، بعض دفعہ مرد کو جنون کا مرض ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اگر ہندوستان میں قاضی شرعی کا وجود ہوتا تو اس قسم کی سب پریشانیوں کا علاج سہل تھا، مگر اب جبکہ قاضی شرع موجود نہیں عورتوں کو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ (الحیلۃ الناجزۃ/٣٠)

ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اب یہ صورت حال نہیں ہے، بہار واڑیسہ میں تقریباً پچھتر سالوں سے امارت شرعیہ قائم ہے اور اس کے تحت دارالقضاء کا مضبوط نظام چل رہا ہے، ان دونوں صوبوں کے تمام اہم اور مرکزی مقامات میں دارالقضاء قائم ہے جس کی وجہ سے مسلم خواتین کو ایسی ضرورت کی بنیاد پر فسخ نکاح کی سہولت حاصل ہوجاتی ہے، بہار واڑیسہ کے علاوہ دہلی، بنگال، آسام، آندھرا پردیش، کرناٹک وغیرہ میں شرعی دارالقضاء قائم ہیں، جس کی وجہ سے اب عورتوں کو فسخ نکاح کے لئے پریشانیوں کا سامنا کرنا نہیں پڑتا، ضرورت ہے کہ اس نظام کو مزید وسعت دی جائے اور مسلمانوں کے ہر مرکزی شہر اور مقام میں دارالقضاء قائم کیا جائے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جو ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے مؤثر، قابل اعتماد اور ہر مسلک اور جماعت کی نمائندہ تنظیم ہے اس کے ذمہ داروں نے اس ضرورت کا احساس کیا اور اپنے سابقہ اجلاس منعقدہ جیپور راجستھان میں تمام اہم اور مرکزی مقامات میں دارالقضاء کے قیام کی تجویز منظور کی ہے، ضرورت ہے کہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا جائے اور بورڈ کے ساتھ اس سلسلے میں تعاون کیا جائے، تاکہ یہ مبارک کام پایہ تکمیل کو پہنچ سکے اور مسلمانوں کے عائلی معاملات ومقامات شرعی دارالقضاء اور اسلامی شریعت کی روشنی میں فیصلہ کئے جائیں، اور ہر علاقہ کی مسلم خواتین کو بوقت ضرورت فسخ نکاح کی سہولت حاصل ہو، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی مذکورہ تجویز ہندستان کے گزشتہ حالات کے پیش نظر تھی، لیکن اب جبکہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور علاقوں میں نظام قضاء اور قاضی شرعی کا وجود ہے تو ان پریشانیوں کا علاج سہل ہے، اس لئے اب اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ بوقت نکاح بذریعہ شرط عورتوں کو طلاق کا حق تفویض کرکے طلاق کے واقعات میں اضافہ کیا جائے، اور مصالح شرع کے ضائع ہونے اور مقاصد نکاح کے فوت ہونے کا خطرہ مول لیا جائے۔

اور اگر کسی جگہ کے مخصوص حالات اور متوقع خطرات کی بنیاد پر کچھ نجی معاملات اور استثنائی کیسیز میں اس طرح کی ضرورت محسوس ہو تو احتیاط کا تقاضہ یہ ہے طلاق کا اختیار عورت کے سپرد نہ کیا جائے، بلکہ اس کے خاندان کے کسی سنجیدہ اور قابل اعتماد افراد کے سپرد کیا جائے تاکہ وہ غور وفکر کے بعد اور مصلحت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا استعمال کریں، یا پھر اس صورت پر عمل کیا جائے جو حضرت تھانوی نے اس سلسلہ میں ضروری مشورہ کے تحت ذکر کیا ہے، یعنی یہ کہ شرط کے ساتھ تراضی طرفین سے کم از کم دس آدمی کے نام متعین کردئے جائیں کہ ان میں سے کم از کم دو آدمی طلاق کی ضرورت کو تسلیم کرلیں تو عورت کو طلاق بائن واقع کرنے کا اختیار حاصل ہو، لیکن اس صورت کو عام نہ کیا جائے ورنہ مصالح شرع فوت ہوں گے۔

اور دوسرے ائمہ کے نزدیک چونکہ نکاح سے قبل تعلیق طلاق، یا تفویض طلاق صحیح نہیں خواہ اس کی اضافت اور نسبت نکاح ہی کی طرف کیوں نہ ہو، اس لئے مذکورہ تین صورتوں میں سے پہلی دو صورتوں میں جب کہ نکاح سے قبل شرائط طے ہوجائیں اور اس کی تحریر پر طرفین کے دستخط ہوجائیں یا عقد نکاح ہی میں ان شرائط کا ذکر کیا جائے، ان دونوں صورتوں میں تفویض طلاق صحیح نہ ہوگی، ہاں اگر عقد نکاح کے بعد باہمی رضامندی سے طرفین کے مابین کوئی شرائط نامہ تحریر کیا

جائے تو یہ تفویض صحیح ہوگی۔

طلاق کے بیجا استعمال کو روکنے کے لئے اگر سوالنامہ میں مذکورہ صورت پر عمل کیا جائے اور عقد نکاح کے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کا مہر بیس ہزار اور اگر اس نے طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار، تا کہ شوہر مہر کی خطیر رقم سے بچنے کے لئے ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا غیر مشروع اقدام نہ کرے، اس طرح مہر طے کرنا عاجز کے خیال میں جائز اور معتبر ہوگا، جیسا کہ بیوی کو اس کے آبائی وطن میں رکھنے کی صورت میں مہر ایک ہزار اور باہر لے جانے کی صورت میں دو ہزار مقرر کیا جائے، تو صاحبین کے نزدیک دونوں تسمیے صحیح قرار پاتے ہیں، امام ابوحنیفہ کے قول کی بنیاد پر تو اس کا کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، کیونکہ دوسرا تسمیہ باطل قرار پائے گا، البتہ صاحبین کے قول کی رو سے دونوں تسمیے صحیح ہوں گے، اور ضرورت کی بنیاد پر صاحبین کے قول پر فتوی دیا جا سکتا ہے، بیجا طلاق کی روک تھام کے لئے یہ صورت کوئی زیادہ مؤثر تو نظر نہیں آتی، کیونکہ جاہل لوگ غصہ اور جذبات میں آکر جس طرح طلاق دیتے ہیں اس میں اس کی توقع کم ہی کی جاسکتی ہے کہ وہ مہر کی خطیر رقم سے بچنے کے لئے طلاق دینے سے باز رہیں گے، البتہ ممکن ہے کہ یہ صورت کسی درجے میں طلاق کے غلط استعمال کو روکنے میں مؤثر ثابت ہو، جبکہ اس میں اس کا بھی خطرہ ہے کہ طلاق مشکل ہوجائے، اور لوگ مہر کے خطرہ سے بچنے کے لئے واقعی ضرورت کی بنیاد پر بھی طلاق کے استعمال سے باز رہیں، اور عورت کالمعلقۃ ہو کر رہ جائے، دوسرے یہ کہ مہر کی زیادتی شرعی نقطہ نظر سے پسندیدہ نہیں، جیسا کہ صحیح حدیث "إن أعظم النكاح بركة أيسره مؤنة" (مشکوۃ عن عائشۃ کتاب النکاح ۲؍ ۲۶۸) وغیرہ سے پتہ چلتا ہے، بہر حال مہر مقرر کرنے میں اگر منفعت اور مصلحت کا پہلو ہے تو دوسری طرف مضرت اور مفسدہ کا پہلو بھی ہے، فیصلہ میں ان دونوں پہلوؤں پر نظر رکھنا ضروری ہے، ان دونوں میں سے جونسا پہلو غالب ہوگا، حکم اسی کے تابع ہوگا۔

**جواب سوال (۲)**

مہر طے کرنے کی یہ صورت کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس عورت کا مہر تیس ہزار ہوگا، اور اگر اس کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر پندرہ ہزار ہوگا، مذکورہ بالا اصول اور تفصیلات کی روشنی میں درست معلوم ہوتی ہے، اس لئے صاحبین کے قول کی بنیاد پر دونوں شرطوں کو معتبر اور لازم ہونا چاہئے۔

## بوقت نکاح عورت کی جانب سے ملازمت کی شرط

**جواب سوال (۳)**

بوقت نکاح عورت کا یہ شرط لگانا کہ شوہر اسے لگی ہوئی ملازمت سے نہیں روکے گا، یا اگر آئندہ اسے کوئی مناسب ملازمت ملے تو شوہر اسے ملازمت کرنے سے نہیں روکے گا، حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک شرط فاسد ہے، جیسا کہ دوسرا نکاح نہ کرنے اور آبائی وطن سے باہر نہ لے جانے کی شرط، کیوں کہ بیوی محبوس بحق زوج ہے، نکاح کے نتیجہ میں شریعت نے اس پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ اپنے اوقات کو شوہر، خاندان اور گھر کے مصالح کے لئے فارغ رکھے، اور اسی کے عوض میں شریعت نے اس کا نفقہ شوہر پر واجب کیا ہے، تا کہ وہ کسب معاش کی فکر سے آزاد اور اس کی گرانبار اور جاں گسل ذمہ داری سے فارغ ہو کر یکسوئی سے اپنی ازدواجی زندگی کے فرائض ادا کرے، کیونکہ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی غیر کے کام میں مصروف ہو اس کا نفقہ اس غیر پر واجب ہوتا ہے، اسی بناء پر قاضی، مفتی، صدقات کی وصولی پر مامور عاملین اور حکومت کے ملازمین کا نفقہ بیت المال اور حکومت پر واجب ہوتا ہے۔

"لأن النفقة جزاء الاحتباس وكل من كان محبوسا بحق مقصود لغيره كانت نفقته عليه. أصله القاضي والعامل في الصدقات" ۔ (الهدايه باب النفقه ۲)

اور ملازمت یا کسی ایسے پیشہ کو اختیار کرنے سے جس کے لئے اسے گھر سے باہر جانا پڑے تو شوہر کا حق متاثر ہوگا، اس لئے اسے اس سے روکنے کا حق ہے، فقہاء نے تصریح کی ہے کہ شوہر بیوی کو ہر ایسے کام سے روک سکتا ہے جس سے اس کا حق احتباس متاثر ہوتا ہو، یا اسے کوئی ضرر پہنچتا ہو، یا جس کے لئے عورت کو گھر سے باہر جانا پڑتا ہو، علامہ شامی لکھتے ہیں:

"والذي ينبغي تحريره أن يكون له منعها من كل عمل يودي إلى تنقيص حقه أوضرره أو إلى خراجها من بيته" ۔ (حاشية رد المحتار على الدر ۲۔ ۶۰۳)

اس میں صرف اس قدر استثناء ہے کہ اگر وہ لڑکیوں کو اور عورتوں کو باہر جا کر دینی تعلیم دیتی ہے، نماز، روزہ، وضو، غسل اور طہارت وغیرہ کے ضروری مسائل بتلاتی ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا معقول ذریعہ ان کی تعلیم کا نہیں، یا خود ان مسائل کو سیکھنے کے لئے اسے باہر جانا پڑتا ہے، اور گھر میں رہ کر دینی علم اور مسائل کی جانکاری کی کوئی معقول صورت نہیں ہے، یا کوئی ایسا شرعی مسئلہ پیش آ گیا ہے جو شوہر خود سے یا کسی اور سے پوچھ کر نہیں بتا سکتا تو ایسی صورت میں وہ باہر جا سکتی ہے اور شوہر کو اسے روکنا نہیں چاہئے، صاحب "درمختار" لکھتے ہیں:

"وفي البحر له منعها من الغزل وكل عمل ولو تبرعا لأجنبي ولو قابلة أو مغسلة لتقدم حقه على فرض الكفاية. ومن مجلس العلم إلا لنازلة وامتنع زوجها من سوالها" (الدر المختار مع حاشیه رد المحتار ۲-۲۰۲)

ہاں گھر میں رہ کر سلائی کڑھائی، بنائی، دستکاری، کتابت، مضمون نگاری، تصنیف و تالیف اور عورتوں اور بچوں کی تعلیم وغیرہ کر سکتی ہے، کیونکہ اگر گھر میں وہ اس نوعیت کے کام کاج میں مصروف نہ ہو تو شیطانی وسوسوں کا شکار ہونے اور پڑوسیوں اور اجنبی لوگوں کے ساتھ لایعنی کاموں میں مشغول ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

"أما العمل الذي لاضرر له فيه فلاوجه لمنعها عنه خصوصا في حال غيبته من بيته فإن ترك العمل بلاعمل في بيتها يؤدي إلى وساوس النفس والشيطان، أو الاشتغال بما لا يعني مع الأجانب والجيران" (حاشیه رد المحتار ۲-۲۰۳)

خلاصہ یہ کہ عورت کی طرف سے ملازمت کی شرط لگانا شرط فاسد ہے، اس لئے لغو قرار پائے گی اور اگر شوہر بوقت نکاح اس شرط کو قبول بھی کر لے تب بھی اس پر اس کی پابندی لازم نہ ہوگی، اور اگر شوہر اس شرط کو قبول کرنے کے بعد بیوی کو سلسلہ ملازمت ختم کرنے کا حکم دیتا ہے، یا نئی ملازمت کرنے سے روکتا ہے تو بیوی کے لئے شوہر کے حکم کی تعمیل ضروری ہوگی، تعمیل نہ کرنے کی صورت میں نافرمان شمار ہوگی اور نشوز کی بنیاد پر اس کا نفقہ ساقط ہو جائے گا۔

امام مالک کے نزدیک عورت کی طرف سے ملازمت کی شرط شرط صحیح مکروہ ہے، اس لئے وہ اصل عقد کے ساتھ لاحق ہو جائے گی، لیکن شوہر پر اس کی تعمیل مستحب ہوگی لازم نہ ہوگی، اور شرط کی خلاف ورزی کی صورت میں بیوی کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل نہ ہوگا،

امام احمد بن حنبل کے نزدیک چونکہ اس میں عورت کی منفعت ہے اور مرد کو اپنے حق سے دستبردار ہونے کا حق ہے، اس لئے یہ شرط صحیح ہے، لہٰذا شوہر پر اس کی پابندی لازم ہوگی، اور شرائط کی خلاف ورزی کی صورت میں فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا۔



# مشروط نکاح کے چند بنیادی احکام

مولانا آل مصطفی مصباحی[1]

۱۔ ایسی ذمہ داری جو عقد نکاح کی وجہ سے شریعت طاہرہ نے کسی فریق پر عائد کی ہے، اگر اسی کو عقد نکاح کے وقت شرط کی صورت میں ذکر کر دیا گیا، مثلاً بیوی نے شوہر پر نفقہ دینے کی شرط لگا دی، تو اس سے عقد نکاح پر کوئی منفی اثر مرتب نہ ہوگا، البتہ ایسی شرط لگانا بے سود ہے، کیوں کہ شریعت نے نکاح کے نتیجہ میں جو حقوق شوہر کے ذمہ لازم کر دئے ہیں، عقد نکاح میں وہ مشروط ہوں یا نہ ہوں، بہر صورت شوہر پر ان کی ادائیگی لازم ہوگی، نکاح صحیح کے بعد عورت کی جانب سے تسلیم نفس ہو جائے، تو شوہر پر عورت کا نفقہ واجب ہو جاتا ہے، عقد نکاح کے وقت اس کی شرط لگائی جائے یا نہ لگائی جائے، تنویر الابصار و درمختار میں ہے:

(۱) ''النفقة تجب للزوجة بنكاح صحيح على زوجها، لأنها جزاء الاحتباس وكل محبوس لنفعة غيره يلزمه نفقته'' (۲۔ ۲۹۹)

نکاح صحیح کے بعد شوہر پر بیوی کا نفقہ واجب ہے، کیونکہ نفقہ عورت کو اپنے قابو میں رکھنے کا بدل ہے، اور جو بھی غیر کی منفعت کے لئے اس کے قابو میں ہو تو قابو حاصل کرنے والے پر محبوس کا نفقہ واجب ہوتا ہے۔

عورت بیمار ہو جب بھی اس کا نفقہ شوہر پر واجب ہوتا ہے۔

مبسوط میں ہے:

(۲) ''ونفقة المرأة واجبة وإن مرضت من قبل، إنما مسلمة نفسها إلى الزوج في بيته. ولا فعل منها في المرض لتصير به مفوتة، مع أنه لم يفوت ماهو المقصود من الاستئناس وغيره، ولامعتبر بمقصود الجماع في حق النفقة''۔ (۵۔ ۱۹۲)

عورت کا نفقہ واجب ہے، اگر چہ وہ پہلے سے مریضہ ہو کہ عورت اپنے آپ کو شوہر کے گھر میں سپرد کر رہی ہے اور بیمار ہونے میں اس کا کوئی دخل نہیں کہ اسے شوہر کے حق کو ضائع کرنے والی کہا جائے، اس کے باوجود انسیت حاصل کرنے اور اس کے علاوہ دیگر مقاصد ختم نہیں ہوتے اور حق نفقہ میں مقصد جماع کا کوئی اعتبار نہیں۔

اسی طرح عقد نکاح سے شوہر پر مہر لازم ہو جاتا ہے، خواہ بیوی عقد نکاح کے وقت یہ شرط لگائے کہ اس کا مہر شوہر کے ذمہ ہوگا، خواہ نہ لگائے، اگر دس درہم سے کم مقرر ہوا ہے تو دس درہم واجب ہوگا، اور اگر دس سے زیادہ مقرر کیا ہے تو مقرر کردہ واجب ہوگا، ''درمختار'' میں ہے:

''وتجب العشرة إن سماها ودونها ويجب الأكثر منها إن سمى الأكثر منها. ويتاكد عند وطء وخلوة صحت أو موت احدهما''۔ (درمختار ۲۔ ۳۰۸)

(دس درہم یا اس سے کم مہر مقرر کیا تو دس درہم واجب ہوگا، اور اگر دس سے زیادہ مقرر کیا تو دس سے زیادہ، اور وطی یا خلوت صحیحہ یا کسی ایک کی موت سے مہر مؤکد ہوتا ہے)۔

[1] استاذ جامعہ امجدیہ رضویہ مئو

بلکہ اگر مہر کا ذکر نہ بھی ہو جب بھی واجب ہوگا، اس صورت میں مہر مثل واجب ہوگا۔

ہدایہ میں ہے:

''وإن تزوجها ولم يسم لها مهرا فلها مهر مثلها'' (هدایه ۲۔ ۳۲۴ کتاب النکاح)

(اگر عورت سے شادی کی اور مہر مقرر نہ ہوا تو مہر مثل واجب ہوگا)۔

خلاصہ یہ کہ شرعی اعتبار سے اس قسم کی شرط لگانا ایک کار عبث ہے۔

۲۔ الف:...... نکاح کے وقت کسی فریق کا ایسی شرط لگانا جس سے کسی شرعی ذمہ داری سے گریز مقصود ہو، شرط فاسد ہے، لیکن اس سے نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں ہوتا، بلکہ نکاح منعقد ہو جاتا ہے اور شرط باطل قرار پاتی اور متعلقہ فریق پر اس شرط کی پابندی ضروری نہیں، اس کے ذمے شرط لگانے کی صورت میں جو ذمہ داری شرعاً عائد تھی وہ اب بھی باقی رہے گی، مثلاً شوہر اگر عقد نکاح کے وقت یہ شرط لگاتا ہے کہ بیوی کا نان ونفقہ اس کے ذمے نہ ہوگا، اس شرط کی وجہ سے شوہر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا، بلکہ اپنی صورت وجوب میں نان ونفقہ واجب ہوگا، گو کہ عورت اپنے اس حق کو ساقط کرنے اور اس سے بری الذمہ ہونے پر راضی ہو جائے، فقہاء عظام نے اس کی ایک اہم وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ صورت وجوب سے قبل اسقاط وجوب کی ہوگی جو صحیح نہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے: (فتاوی ہندیہ ۲ / ۱۴۲، بدائع الصنائع ۲ / ۲۹)۔

۳۔ ب:...... عقد نکاح کے وقت کسی فریق کا ایسی شرط لگانا جو نہ تو نکاح سے عائد ہونے والی شرعی ذمہ داریوں کے دائرے میں آتی ہو، اور نہ ہی کسی شرعی ذمہ داری سے گریز مقصود ہو، بلکہ اس شرط کے نتیجے میں زوجین ہی میں سے کسی کو ایسا حق ملتا ہو جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں نہیں ملتا، تو اس قسم کی شرط کا حکم یہ ہے کہ شرعاً اس کا پورا کرنا متعلقہ فریق پر لازم نہیں، یہ محض ایک وعدہ ہے جس کا پورا کرنا بہتر، مگر شرعاً اس پر جبر نہیں اور نہ ہی عقد نکاح کے وقت اس قسم کی شرط لگانے سے اس کی صحت پر کوئی اثر پڑتا ہے، کیونکہ یہ ضابطہ اپنی جگہ مسلم ہے کہ شروط فاسدہ سے نکاح فاسد نہیں ہوتا، بلکہ خود شرطیں باطل وکالعدم ہو جاتی ہیں۔

درمختار میں ہے:

''لايبطل النكاح بالشرط الفاسد وإنما يبطل الشرط دونه، يعني لو عقد مع شرط فاسد لم يبطل النكاح''
(درمختار ۲۔ ۳۲۰)

شرط فاسد سے نکاح باطل نہیں ہوتا، بلکہ شرط ہی باطل ہو جاتی ہے، یعنی اگر شرط فاسد کے ساتھ عقد ہو تو نکاح باطل نہ ہوگا۔

لہٰذا اگر (مثلاً) عورت یہ شرط لگاتی ہے کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا، یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائیگا، تو اس طرح کی شرط محض ایک وعدہ ہے جو شوہر کے لئے لازم الایفاء نہیں، وہ پورا کر دے تو ٹھیک ورنہ اس پر شرعاً جبر نہیں کیا جا سکتا کہ تم اسے پورا کرو، بدائع الصنائع میں ہے:

''إن شرط الزوج من طلاق المرأة وترك الخروج عن البلاد لايلزمه في الحكم لأن ذالك وعد وعدها ولايكلف به'' (بدائع الصنائع ۲۔ ۳۰)

(اگر شوہر (عقد نکاح) میں سابقہ بیوی کو طلاق دینے اور عورت کو شہر کے باہر نہ لے جانے کی شرط لگا دے تو حکم شرعی یہ ہے کہ شوہر پر ان شرطوں کا پورا کرنا لازم نہیں، کیونکہ یہ محض ایک وعدہ ہے جو عورت سے کیا گیا ہے تو اس کو پورا کرنے کا مکلف نہیں بنایا جا سکتا)۔

بیوی کو اپنے پاس رکھنا حق شوہر بھی ہے اور حق شرع بھی، ارشاد ہے: "وأسكنوهن من حيث سكنتم" شوہر کے یہ وعدہ کرنے سے کہ بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا، شوہر کا یہ حق ختم نہیں ہو جاتا، شوہر اس حق کو خود ساقط بھی نہیں کر سکتا) اس لئے یہ معاہدہ بے کار ہے۔

## عورت کو طلاق کا حق تفویض کرنا:

شوہر نے جب اپنی بیوی کو بوقت نکاح طلاق کا حق تفویض کر دیا، تو اب وہ اس تفویض طلاق کو ختم نہیں کر سکتا، جن عمومی صورتوں کے ساتھ یا خصوصی صور ومواقع میں حق طلاق تفویض کیا گیا ہے شوہر اس سے گریز نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی اس حق کو ختم کر سکتا ہے۔

''جوہرہ نیرہ'' میں ہے:

"إن قال لها طلقي نفسك فليس كه ان يرجع عنه" (جوهرة نيرة ٢/١٠٦) (اگر عورت سے کہا کہ تو اپنے آپ کو طلاق دیدے تو شوہر اس تفویض سے رجوع نہیں کر سکتا)۔

اگر عورت سے کہا کہ تو اپنے آپ کو طلاق دے دے تو شوہر کو اس قول سے رجوع کا حق نہ ہوگا، لیکن اس طرح کی شرطوں سے مصالح شرع کے ضائع ہونے کا قوی اندیشہ ہے، عورت اپنی عقل کی کمی اور سرعت غضب کے باعث جب چاہے گی اپنے اوپر طلاق دے ڈالے گی جس سے ازدواجی زندگی ایک بڑا خطرہ بن کر رہ جائے گی۔ اس لئے اگر شوہر اپنی عورت کو طلاق کا حق تفویض کرتا ہے تو مزید احتیاط کے لئے مندرجہ ذیل قید بڑھائے، تاکہ حتی الوسع فتنوں کا سد باب ہو، اور پریشانیوں سے محفوظ رہے، (۱) شوہر تفویض طلاق میں وقت مقرر کردے (۲) تفویض طلاق میں لفظ کنایہ استعمال کرے، مثلاً تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ یا تجھے اختیار ہے، اور طلاق کی نیت نہ کرے (۲) یا شوہر یہ لفظ کہے کہ تو اپنے کو طلاق دیدے۔ یا تجھے اپنی طلاق کا اختیار ہے اور اس سے طلاق رجعی کی نیت کرے۔

## طلاق نہ دینے کیساتھ مشروط مہر

عقد نکاح کے وقت اگر اس طرح مہر طے کرے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کا مہر بیس ہزار اور اگر اسنے طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار ہے تو یہ مہر طے کرنا جائز اور معتبر تو ہے، لیکن مہر مسمی صرف ایک صورت میں لازم ہوگا، وہ صورت ہے کہ اگر اس نے طلاق نہ دی تو عورت کو مہر مسمی دینا ہوگا۔ اور اگر اس نے طلاق دی تو مہر مثل واجب ہوگا، جو ایک ہزار سے کم اور دو ہزار سے زائد نہ ہوگا، یہ امام اعظم کا مذہب ہے۔

صاحبین کے نزدیک دونوں شرطیں صحیح ہیں، جبکہ امام زفر کے نزدیک دونوں شرطیں فاسد ہیں (کتب فقہ میں تفصیلات موجود ہیں)۔

عورت سے اس شرط پر شادی کی کہ اس کی زوجیت میں اگر کوئی عورت نہ ہوگی تو مہر ایک ہزار اور اگر ہوگی تو دو ہزار، یا اس شرط پر شادی کی کہ اگر شوہر عورت کو اس کے آبائی وطن سے نہ نکالے گا، تو مہر ایک ہزار اور اگر نکالے گا تو مہر دو ہزار، تو ایسی صورت میں نکاح صحیح ہو جائے گا، اور مہر میں اعتبار پہلی شرط کا ہے، اگر شوہر نے اسے پوری کر دی تو مہر مسمی لازم ہوگا اور اگر پوری نہ کی تو مہر مثل لازم ہوگا جو نہ تو مہر مسمی کی اقل مقدار سے کم کی جائے گی اور نہ ہی مہر مسمی کی اکثر مقدار سے متجاوز ہوگی، صاحبین فرماتے ہیں کہ دونوں شرطیں درست ہیں، اور ''ہدایہ'' میں ہے کہ امام زفر کے نزدیک دونوں شرطیں فاسد ہیں اور عورت کو بہر صورت مہر مثل ملے گا، جو نہ تو ایک ہزار سے کم ہوگا، اور نہ ہی دو ہزار سے زائد، اگر عورت سے اس شرط پر شادی کی کہ اگر وہ بدصورت ہوگی تو مہر ایک ہزار، اور اگر خوبصورت ہوگی تو دو ہزار، تو اگر عورت خوبصورت ہو تو اسے دو ہزار ملے گا، اور اگر بدصورت ہو تو ایک ہزار اور اس پر سب کا اتفاق ہے، دونوں مسئلوں میں فرق یہ ہے کہ عورت کو شہر سے باہر نکالنے نہ نکالنے والے مسئلے میں مخاطرت (خطرہ میں ڈالنا) دوسرے تسمیہ میں ہے، کیونکہ عورت کو یہ علم نہیں کہ شوہر اس کو نکالے گا یا نہ نکالے گا اور خوبصورت وبدصورت والے مسئلے میں مخاطرت بالکلیہ ہے ہی نہیں، کیونکہ عورت ایک ہی صفت پر ہوگی ہاں شوہر کو اس کی معرفت حاصل نہیں، تو اس کی جہالت باعث خطر نہیں۔ (فتاوی تاتارخانیہ ۳/۱۰۱ کتاب النکاح)

''فتح القدیر'' میں ہے:

''(قوله وإذا تزوجها الخ) للمسئلة صورتان: الأولى أن يسمى لها مهرا ويشترط لها معه مالها فيه نفع كان لايخرجها من البلد الخ''۔

مسئلے کی دو صورتیں ہیں: پہلی صورت کہ عورت کے لئے مہر مقرر کیا جائے اور اس کے لئے عقد نکاح میں ایسی شرط لگائی جائے جس میں عورت کا نفع ہو، مثلاً یہ کہ عورت کو اس کے آبائی وطن سے نہ نکالے گا، یا اس کے ہوتے ہوئے دوسری شادی نہ کرے گا، یا مروت کرنے میں تکلف سے کام نہ لے گا یا۔

اس کے سوکن کو طلاق دے گا، دوسری صورت یہ ہے کہ عورت کے لئے تقدیر پر ایک مہر مقرر کیا جائے، اور دوسری تقدیر پر دوسری مہر پہلی صورت کا حکم تو کتاب ہدایہ سے ظاہر ہے، یعنی اگر شوہر نے شرط پوری کردی تو عورت کو مقررہ مہر ملے گا، ورنہ تو مہر مثل ملے گا، تو اگر اس کا مہر مثل مسمی کے برابر ہو یا اس سے کم تو عورت دوسری چیز کی مستحق نہ ہوگی، اور دوسری صورت مثلاً اس نے عورت سے شادی کی کہ اگر اسے اس کے شہر ہی میں رکھے گا تو مہر ایک ہزار یا مروت میں تکلف نہ کرے گا یا اس کی سوکن کو طلاق دے دے گا، یا اس شرط پر کہ عورت آزاد کردہ ہو یا عجمی ہو یا ثیب ہو اور دو ہزار تک اس کے مخالف شکل میں ہے، کہ اگر شوہر نے پہلی شرط کو پورا کر دیا یا عورت عجمی ہے یا اس کے مثل، تو عورت کو ایک ہزار ملے گا، ورنہ مہر مثل جو دو ہزار سے زائد نہ ہوگا، اور ایک ہزار سے کم نہیں، یہ قول امام اعظم ابوحنیفہؒ کا ہے۔ (فتح القدیر ۳/۲۳۱)

## صاحبین کے قول پر فتوی

جب تک قول امام کے ترک پر کوئی ضرورت داعیہ نہ ہو مفتی پر مطلقا قول امام پر فتوی دینا واجب ہے، قاضی پر عموماً قول امام کے مطابق فیصلہ کرنا واجب ہے۔

''البحر الرائق'' میں ہے:

''يجب علينا الافتاء بقول الامام وإن أفتى المشائخ بخلافه''۔

امام اعظم کے قول پر فتوی دینا ہم پر واجب ہے، گوکہ مشائخ اس کے خلاف فتوی دیں۔

قاضی مفتی کی طرح مطلقا قول امام کے مطابق فیصلہ کرے گا، پھر امام ابو یوسف کے قول کے مطابق اور حسن ابن زیاد کے قول کے مطابق، یہی صحیح ترین قول ہے۔

پھر جب کہ مسئلہ دائرہ میں علماء محققین و مدققین نے قول امام ہی پر جزم و اعتماد فرمایا، بلکہ متون میں امام اعظم ہی کا مذہب بیان فرمایا گیا، شروع میں جہاں قول صاحبین ذکر کیا گیا ہے، وہیں دلائل سے امام اعظم ہی کے قول کو ترجیح دی گئی ہے، تو ثابت ہوا کہ قول امام مرجح، معتمد، محقق، و منقح ہے، جب تک اسباب ستہ (ضرورت، دفع حرج، تعامل، دینی ضروری مصلحت کی تحصیل، عرف، کسی فساد مظنون بظن غالب یا موجودہ کا ازالہ) میں سے کوئی سبب متحقق نہ ہو جائے، رہا طلاق کے واقعات کو روکنے کے لئے صاحبین کے قول پر فتوی وعمل تو یہ بے بنیاد ہے:

اولا: حالات زمانہ سے باخبر ہر شخص جانتا ہے کہ طلاق کے واقعات کے قلت یا کثرت کے ساتھ رونما ہونے کا مدار مہر کی کمی یا زیادتی نہیں ہوتی، تجربہ شاہد ہے کہ ہمارے علاقہ کٹیہار و پورنیہ میں مہر کی مقدار خاصی ہوتی ہے، متوسط طبقے والوں کے یہاں بھی مہر کی مقدار لاکھ سے عموماً کم نہیں ہوتی، ایسے حالات میں ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ طلاق کے واقعات ہی رونما نہ ہوں یا تو یکا دکا ہو، لیکن واقعات شاہد ہیں کہ مہر کی قلت و کثرت کا جہلاء پر کوئی اثر نہیں پڑتا وہ ایک مجلس میں تین طلاق، بلکہ دس بیس طلاق دینے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔

ثانیا۔شوہر اگر ایسی شرط کو پوری کرتا ہے جس میں عورت کا نفع ہے تو اسے مہر مسمی کا ملنا ائمہ ثلاثہ کا متفقہ مسئلہ ہے، رہی دوسری صورت کہ وہ پوری نہ کرے تو امام اعظم کے نزدیک مہر مثل واجب ہوتا ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ مہر مسمی سے متجاوز نہ ہو، ایسی صورت حال میں اگر مہر کی مالیت پر غور کیا جائے تو باعتبار مالیت دونوں مکاتب فکر کبھی تو ایک ہوں گے، مثلاً مہر مسمی دو ہزار ہو اور مہر مثل ڈھائی ہزار تو امام اعظم کے نزدیک بھی دو ہی ہزار واجب ہوگا، البتہ اس صورت میں تفاوت ہوگا، جب مہر مثل مہر مسمی سے کم ہو، لیکن عام طور پر مہر مسمی اور مہر مثل میں کوئی زیادہ تفاوت نہیں ہوتا، بہر حال دوسری صورت میں تسمیہ کی صحت طلاق کے قلیل الوقوع ہونے کا مدار نہیں، لہذا قول امام سے عدول بھی جائز نہیں۔

(۲) صورت مذکورہ میں اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو مہر مسمی (پندرہ ہزار) واجب ہوگا، اور اگر دوسرے سے نکاح کر لیا تو مہر مثل واجب ہوگا۔

''درمختار'' میں ہے:

''اس شرط کے ساتھ نکاح کیا کہ اگر عورت کو اس کے شہر سے باہر نہ لے جائے گا یا اس کے ہوتے ہوئے دوسری عورت سے شادی نہ کرے گا، تو مہر ایک ہزار، یا اس شرط کے ساتھ نکاح کیا کہ اگر عورت کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا تو مہر ایک ہزار اور اگر باہر لے جائے گا تو دو ہزار، پہلی صورت میں اگر شرط پوری کردی اور دوسری صورت میں عورت کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھا تو عورت کو ایک ہزار مہر دینا ہوگا، کیونکہ عورت اس سے راضی ہے''۔

## ملازمت کی شرط

عورت کی جائز ملازمت کے تعلق سے شوہر کی مذکورہ بالا شرط محض ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنا اچھا مگر واجب نہیں۔ اور نہ ہی شوہر پر اس کی پابندی لازم ہے، عورت کو اپنے گھر میں رکھنا حق شوہر بھی ہے اور حق شرع بھی، جسے شوہر خود بھی ساقط نہیں کرسکتا، کما مر، لہٰذا اس شرط کو منظور کرنے کے باوجود اگر شوہر عورت کو سلسلۂ ملازمت ختم کرنے کا حکم دیتا ہے یا نئی ملازمت کرنے سے روکتا ہے تو عورت کے لئے شوہر کے اس حکم کی تعمیل ضروری ہوگی۔

☆☆☆

# نکاح میں شرائط مقرر کرنے کا حکم

مفتی نسیم احمد قاسمی[1]

اسلام میں معاہدہ اور ایفاء عہد کی بڑی اہمیت ہے، قرآن میں ایفاء عہد کو مومن کا وصف خصوصی قرار دیا گیا ہے، قرآن میں اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا

(اے ایمان والو! عہد پورا کرو)۔

نکاح میں ایسی شرطیں لگانا جن سے رشتہ نکاح میں پائیداری اور استحکام پیدا ہو، مقصد نکاح کے عین مطابق ہے اور ایسی شرطوں کی تکمیل کا حکم خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، بخاری شریف کی روایت ہے کہ:

''تمہارے لئے ان شرائط کی تکمیل زیادہ ضروری ہے جن کے ذریعہ تم عورتوں کی عصمتوں کو اپنے لئے حلال کرتے ہو''۔

عقد نکاح میں میاں بیوی کی طرف سے ایسی شرطیں لگانا جن کے لگانے کی وجہ سے فریقین میں سے کسی کو نفع اور فائدہ پہنچتا ہو، اور یہ شرائط عقد سے پہلے یا ایجاب وقبول سے متصل ہوں (عقد نکاح کی تکمیل کے بعد مقرر کی جانے والی شرطوں کا اعتبار نہیں ہے) تو اس سلسلہ میں ائمہ مذاہب کے یہاں حسب ذیل تفصیلات ملتی ہیں۔

## ا۔ فقہ حنفی میں شرائط کی قسمیں اور ان کے احکام

فقہاء حنفیہ کے یہاں شرائط کی حسب ذیل صورتیں نکلتی ہیں:

۱۔ نکاح میں میاں بیوی کا ایسی شرائط پر اتفاق کر لینا جو شریعت اسلامی کی رو سے صحیح اور درست ہوں مقتضائے عقد کے مناسب اور احکام شریعت کے منافی نہ ہوں، ایسی شرائط مقرر کرنے کی صورت میں ان کو پورا کرنا ضروری ہوگا مثلاً نکاح کے وقت بیوی کا اپنے شوہر پر یہ شرط لگانا کہ شوہر اسے اپنے گھر والوں سے علیحدہ رہائشی مکان دے، جس میں وہ اپنے سامانوں کو محفوظ رکھ سکے، اور خود رہ سکے، یا یہ کہ شوہر کسی طویل سفر میں اپنی رفاقت پر مجھے میرے گھر والوں کی اجازت کے بغیر مجبور نہیں کرے گا اور یہ کہ اپنا نکاح مہر مثل پر کرے گی، ان تمام صورتوں میں شرائط کی تکمیل درست ہوگی۔

۲۔ ایسی شرائط مقرر کرنا جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی نئی ذمہ داری اور حق عائد نہیں ہوتا ہو، بلکہ خود عقد نکاح سے جو حق اور ذمہ داری کسی فریق پر عائد ہوتی ہو، اسی کو شرط کی صورت میں عقد نکاح کے وقت ذکر کر دیا گیا ہو، مثلاً عورت کا بوقت نکاح یہ شرط لگانا کہ شوہر اس کے ساتھ حسن معاشرت سے پیش آئے گا، یا مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نان نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا۔

ایسی شرائط کی تکمیل شریعت اسلامی کا مقصد ومنشاء ہے، شرائط کے ذریعہ اس میں پائیداری اور استحکام پیدا کر دیا گیا ہے، ایسی شرطوں کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔

۳۔ فاسد شرطیں مقرر کرنا درست نہیں ہیں، فاسد سے مراد وہ شرطیں ہیں جو عقد نکاح سے میل نہ کھاتی ہوں یا شریعت اسلامی ان کی اجازت نہ دیتی ہو۔

ایسی شرائط کا حکم یہ ہے کہ اشتراط کی صورت میں صرف شرائط باطل ہوں گی، عقد نکاح اپنی جگہ پر درست اور صحیح رہے گا، جیسے عورت کا اپنی

[1] سابق نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

ہونے والی سوکن کے طلاق دینے کی شرط لگانا۔ (ردالمحتار ۲/۳۴۵، المبسوط للسرخسی ۵/۹۱، ۹۰۔ بدائع الصنائع ۲/۸۶، ۲۸۴)

## ۲۔ شرائط کے سلسلہ میں مالکیہ کا مسلک

مالکیہ کے نزدیک شرائط مقرر کرنے کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ شرائط صحیحہ مقرر کرنا، ۲۔ شرائط فاسدہ مقرر کرنا۔

۱۔ شرائط صحیحہ کی بھی دو قسمیں ہیں:

الف۔ مکروہ، ب۔ غیر مکروہ

۱۔ شرائط صحیحہ غیر مکروہ سے مراد وہ شرائط ہیں جو مقتضائے عقد سے مناسبت اور میل رکھتی ہوں، جیسے بیوی کو اس کا نان ونفقہ دینے کی شرط، یا یہ شرط لگانا کہ بیوی اپنے شوہر کی اطاعت کرے گی، یا شوہر کی طرف سے یہ شرط لگانا کہ بیوی اس کے گھر سے اس کی رضامندی اور اجازت کے بغیر نہیں نکلے گی، یا شوہر کی جانب سے یہ شرط لگانا کہ عورت کا ان عیوب سے بھی پاک ہونا ضروری ہے، جن کے ذریعہ فسخ نکاح جائز نہیں ہوتا ہے جیسے اندھاپن، گونگاپن، بہراپن وغیرہ۔

۲۔ شرائط صحیحہ مکروھہ سے مراد وہ شرطیں ہیں جو عقد نکاح سے متعلق ہوتی ہیں، ان شرائط کا مقصد صرف شوہر پر تنگی کرنا ہوتا ہے، جیسے بیوی کو اس کے شہر سے نہ نکالنے کی شرط، یا بیوی کو اپنے ساتھ سفر پر نہ لے جانے کی شرط یا اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہ کرنے کی شرط۔

۳۔ شرائط فاسدہ سے مراد وہ شرطیں جو مقتضاء عقد کے مخالف اور منافی ہوں، جیسے ایک بیوی کا یہ شرط لگانا کہ شوہر اس کے اور اس کی سوکن کے درمیان قسم (باری) مقرر نہیں کرے گا یا نکاح کے وقت عورت کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر پر واجب ہونے کے بجائے اس کے شوہر کے باپ یا ولی کے ذمہ واجب ہوگا۔ (بدایۃ المجتہد ۲/۵۸۔ مواہب الجلیل من ادلۃ الخلیل لاحمد بن احمد المختار ۳/۲۳)

## ۳۔ شرائط کے باب میں شافعیہ کی رائے

شافعیہ کے نزدیک شرائط کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ شرائط صحیحہ، ۲۔ شرائط فاسدہ۔

۱۔ شرائط صحیحہ سے مراد وہ شرطیں ہیں جو مقتضائے عقد کے موافق ہوں، جیسے عورت کی جانب سے شوہر ایک بیوی کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا، یا یہ شرط لگانا کہ عورت کے لئے نفقہ نہیں ہوگا، یا بیوی کی طرف سے یہ شرط لگانا کہ شوہر اسے اس کے شہر سے نہیں ہٹائے گا، اس قسم کی شرائط کا حکم یہ ہے کہ ان تمام صورتوں میں نکاح شرعا درست ہوجائے گا، اور شرط شرعا فاسد اور لغو قرار پائے گی، البتہ اگر عقد نکاح میں کسی فریق کی طرف سے ایسی شرط لگائی جائے جو نکاح کے مقصد اصلی کو فوت کرنے والی ہو تو پھر اس صورت میں نکاح ہی درست نہیں ہوگا، جیسے یہ شرط لگانا کہ شوہر اپنی بیوی کے ساتھ ہمبستری نہیں کرے گا، یا یہ کہ شوہر سال بھر میں صرف ایک بار بیوی سے صحبت کرے گا، یا یہ شرط لگانا کہ شوہر اسے طلاق دیدے گا۔

فقہ شافعی کی مشہور کتاب ''زاد المحتاج بشرح المنہاج'' میں ہے:

''نکاح میں خیار کی شرط لگانے سے نکاح ہی ختم ہوجاتا ہے، اور مہر کی صورت میں خیار کی شرط لگانے سے صحیح مسلک کے مطابق یہ درست نہیں ہو گا، البتہ نکاح صحیح قرار پائے گا۔

اور اگر وہ شرطیں مقتضائے عقد کے خلاف ہوں اور نکاح کے مقصود اصلی میں خلل ڈالنے والی نہ ہوں، جیسے یہ شرط لگانا کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری عورت سے نکاح نہیں کرے گا، یا یہ کہ عورت نفقہ کی مستحق نہیں ہوگی، تو ان تمام صورتوں میں مہر کی درستگی کے ساتھ نکاح بھی درست قرار پائے گا، صرف شروط فاسد قرار پائیں گی، اور اگر وہ شروط مقصود میں بھی خلل ڈالنے والی ہوں، جیسے یہ شرط لگانا کہ عورت سے اس کا شوہر ہمبستری نہیں

کرے گا یا یہ کہ شوہر اسے طلاق دیدے گا تو اس صورت میں نکاح باطل قرار پائے گا''۔ (زاد المحتاج بشرح المنهاج ۳ / ۲۸۸، کتاب الام ۴ / ۱۸۲)

## ۴۔ حنابلہ کے نزدیک شرائط کی قسمیں اور ان کے احکام

حنابلہ کے نزدیک شرائط کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ شرائط صحیحہ: ان سے مراد وہ شرطیں ہیں جو مقتضائے عقد کے موافق ہوں، یا وہ شرطیں جو مقتضائے عقد کے مخالف ہوں، مگر ان شرائط کے لگانے میں زوجین میں سے کسی کا فائدہ ہو، اور شریعت اسلامی نے اس قسم کی شرطوں کے لگانے سے ممانعت نہ کی ہو، اور نہ وہ شرطیں مقصد نکاح میں خلل ڈالنے والی ہوں، جیسے بیوی کا یہ شرط لگانا کہ شوہر اس کا نفقہ اور اخراجات ادا کرے گا، یا یہ شرط لگانا کہ شوہر اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا اور حسن معاشرت سے پیش آئے گا، یا یہ شرط لگانا کہ شوہر اسے اس کے میکہ اور شہر سے نہیں نکالے گا، اور نہ اسے اپنے ساتھ طویل سفر کرنے پر مجبور کرے گا، یا مرد کا عورت کے بارے میں یہ شرط لگانا کہ وہ صاحب حسن و جمال ہو، تعلیم یافتہ ہو، یا یہ شرط لگانا کہ ان عیوب سے پاک ہو جن کی وجہ سے فسخ نکاح کا اختیار حاصل نہیں ہوتا ہے جیسے اندھا پن، گونگا پن، بہرا پن وغیرہ۔

اس قسم کی شرطوں کا حکم یہ ہے کہ ان شرطوں کو پورا کرنا ضروری ہے، اس کی دلیل جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے:

''إن أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج'' (نیل الأوطار ۶-۱۴۶)

۲۔ شرائط فاسدہ: اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ وہ شرائط جو مقتضائے عقد کے مخالف ہوں، جیسے مرد کا بوقت نکاح یہ شرط لگانا کہ عورت مستحق مہر نہیں ہوگی یا یہ شرط لگانا کہ شوہر پر اس کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، یا بیوی کی طرف سے یہ شرط لگائی جائے کہ شوہر اس کے ساتھ صحبت نہیں کرے گا، یا عزل کرے گا، یا اس کے لئے اس کی سوکن سے زیادہ یا کم باری مقرر کرے گا، یا یہ کہ عورت اپنا خرچ خود ہی برداشت کرے گی یا عورت یہ شرط لگائے کہ شوہر اس کی سوکن کو طلاق دیدے گا، اس قسم کی تمام شرطوں کا حکم یہ ہے کہ شرائط باطل ہوں گی اور عقد نکاح صحیح رہے گا۔

۲۔ دوسری قسم کی وہ شرطیں ہیں جو نکاح کے بطلان کا تقاضا کرتی ہیں، جیسے نکاح مؤقت، متعہ، یا یہ شرط لگانا کہ شوہر اپنی بیوی کو مقررہ وقت پر طلاق دیدے گا، اس قسم کی شرطوں کا حکم یہ ہے کہ شرطیں بھی باطل ہوں گی، اور ان کی وجہ سے نکاح بھی باطل قرار پائے گا۔

## سوال نامہ کا جواب:

ایسی شرائط جن کے ذریعہ نکاح کے فریقین میں سے کسی فریق پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ خود عقد نکاح سے جو ذمہ داری کسی فریق پر عائد ہوتی ہو، اسی کو شرط کی صورت میں عقد نکاح کے وقت ذکر کر دیا گیا ہو، ایسی شرائط کے معتبر ہونے کے بارے میں حضرات امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام محمد بن ادریس، امام شافعی اور امام احمد ابن حنبل کا اتفاق ہے، ایسی شرائط کا ایفاء فریقین پر واجب ہے۔ (دیکھئے: الروضۃ الندیہ ۲/۱،۳۱،۳۰)

۲۔ نکاح کے وقت کسی فریق کا کوئی ایسی شرط لگانا، جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، مثلاً شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان ونفقہ اس پر واجب نہیں ہوگا، تو ایسی شرطوں کے بارے میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ ایسی شرطیں فاسد ہیں، البتہ فقہ حنفی کی رو سے ایسی شرائط مقرر کرنے کی صورت میں صرف شرائط فاسد ہوں گی اور نکاح اپنی جگہ صحیح اور درست رہے گا۔

۳۔ تیسری قسم کی شرط لگانا جن کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہیں ہوتا، اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی یا ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں نہ ہوتی ہو، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا، یا بیوی کو اس کے میکہ ہی میں رکھے گا، یا اسے اس کے شہر سے نہیں نکالے گا وغیرہ، ایسی شرائط کے بارے میں فقہاء اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ ایسی شرطوں کے لگانے سے نفس نکاح کے جواز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا نکاح درست رہے گا، البتہ ایسی شرائط واجب الایفاء ہوں گی یا نہیں؟ اس بارے میں ائمہ میں اختلاف ہے، اور یہ اختلاف بہت قدیم ہے، حضرت امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک چونکہ صرف وہ شرطیں معتبر ہیں جو مقتضائے عقد کے موافق ہوں اور مخالف شرع نہ ہوں یہ حضرات ایسی شرطوں کو مقتضائے

عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے معتبر نہیں مانتے ہیں، اگر ایسی شرطیں مقرر کی گئیں تو شوہر پر ان شرطوں کا ایفاء واجب نہیں ہوگا۔

ان حضرات نے اپنے مسلک پر درج ذیل احادیث رسول سے استدلال کیا ہے:

''وکل شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل وإن کان مائۃ شرط''

''المسلمون علی شروطھم إلا شرطا احل حراما أوحرم حلالا''۔

ان حضرات کے استدلال کا حال یہ ہے کہ مذکورہ بالا شرائط لگا کر ایسی چیزوں کو حرام قرار دے دیا جاتا ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال اور مباح قرار دیا ہے، جیسے مرد کے لئے دوسری بیوی کرنا، بیوی کے ساتھ سفر کرنا، بیوی کو اپنے ساتھ رکھنا وغیرہ، شرط کے ذریعہ مباح کو حرام کرلیا جاتا ہے، اسلئے ایسی شرطوں کا اعتبار نہیں ہوگا۔

اس سلسلہ میں فقہ حنبلی میں کافی توسع پائی جاتی ہے، ایسی شرط لگانے کی صورت میں حنابلہ کے نزدیک مطلقا شوہر پر اس شرط کا ایفاء واجب اور لازم ہوگا، اور شرط کے عدم ایفاء کی صورت میں عورت کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا، فقہ حنبلی کے ترجمان علامہ ابن قدامہ حنبلی نے لکھا ہے:

''مایلزم الوفاء بہ وھو مایعود. الیھا نفعہ وفائدتہ مثل أن یشترط لھا أن لا یخرجھا من دارھا۔فھذا یلزم الوفاء فإن لم یفعل فلھا فسخ النکاح''۔(المغنی لابن قدامہ ۷۔۷۱)

فقہاء نے ایسی شرطوں کے واجب الایفاء ہونے پر قرآن کریم کی ان آیات اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے استدلال کیا ہے جن میں اہل ایمان کو ایفاء عہد کا حکم دیا گیا ہے، اور عہد شکنی سے منع کیا گیا ہے، راقم الحروف کا ذاتی رجحان یہ ہے کہ اشتراط فی النکاح کے سلسلہ میں موجودہ دور کے مسائل کو حل کرنے کے لئے فقہ حنبلی سے فائدہ اٹھانا درست ہوگا۔

واضح رہے کہ صرف وہ شرطیں معتبر ہوں گی جو بوقت نکاح عقد نکاح میں ذکر کی جائیں یا عقد نکاح سے پہلے فریقین کے باہمی مشورہ سے طے ہو جائیں، نکاح ہو جانے کے بعد لکھے گئے شرائط نامہ کا اعتبار نہیں ہوگا۔

## تفویض طلاق کا حکم:

قرآن کریم میں طلاق کی نسبت مرد کی طرف کی گئی ہے، اور طلاق دینے والا مرد کو کہا گیا ہے اور مرد ہی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ بیدہ عقدۃ النکاح۔ شریعت اسلامی کی رو سے طلاق کا حق شوہر کو حاصل ہے، البتہ شوہر اپنے اس حق کو کسی اجنبی شخص کی طرف بھی منتقل کر سکتا ہے، جس کو فقہ کی اصطلاح میں'' توکیل'' کہا جاتا ہے، اور خود اپنی بیوی کو بھی یہ حق طلاق منتقل کرسکتا ہے، جس کو فقہ وشریعت کی اصطلاح میں ''تفویض طلاق'' کہا جاتا ہے، تفویض قبل النکاح بھی ہوسکتی ہے، اور نکاح کے بعد بھی، البتہ قبل النکاح تفویض کی صورت میں یہ ضروری ہوگا، کہ تفویض طلاق کی نسبت نکاح کی جانب ہو، مثلا یہ کہے کہ میں نے تم سے نکاح کیا تو تم کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

توکیل اور تفویض میں فرق یہ ہے کہ شوہر جب چاہے اپنے وکیل کو معزول کر کے اس سے حق طلاق کو واپس لے سکتا ہے۔ البتہ عورت کو حق طلاق دے دینے کے بعد شوہر کو اسے واپس لینے کا حق حاصل نہیں ہوگا، میرے نزدیک عورت کو موجودہ دور میں علی الاطلاق ''حق طلاق'' دینا مفاسد سے خالی نہیں ہے، عورت اس کا بے جا اور غلط استعمال کرنے لگے گی، اس لئے بہتر یہ ہیکہ اسے مشروط طور پر حق طلاق دیا جائے اور شرائط کے تحقق اور عدم تحقق کی نسبت مقامی دار القضاء یا اہل علم وفقہ کا فیصلہ معتبر مانا جائے، مثلا کابین نامہ میں شوہر کی طرف سے یہ عبارت لکھی جائے کہ:

''اگر میں نے اپنی بیوی کے حقوق ادا نہیں کئے، یا میری طرف سے فلاں فلاں .........شرطوں کی خلاف ورزی ہوئی، اور شرائط کی خلاف ورزی کا تحقق عند القضاء یا عند العلماء ہو جائے تو میری بیوی بنت زید کو طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوگا''

## دو طرح کا مہر مقرر کرنا

اس سلسلہ میں ضرورت وحاجت کی بنیاد پر صاحبین کی رائے کو اختیار کیا جاسکتا ہے، اور سوالنامہ میں ذکر کردہ طریقہ کے مطابق مہر کی دو مقدار

طے کرنا درست قرار پائے گا۔

## عورت کے لئے نکاح میں ملازمت کی شرط لگانا

اسلام نے عورتوں پر مالی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے، اور اپنی اولاد کی کفالت و پرورش کے لئے اسے کمانے کا مکلف نہیں بنایا ہے۔ اسلام نے گھر کی تمام ذمہ داریاں مرد کے ذمہ کی ہیں اور اندرون خانہ کی ذمہ داریاں بچوں کی پرورش، شوہر کے مال کی نگہداشت اور گھر کے ماحول کو سنوارنے کی ذمہ داری عورت پر ڈالی ہے، قرآن میں کہا گیا ہے: "وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ" (سورۂ طلاق) اسی طرح مردوں کے بارے میں کہا گیا کہ "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوْا مِنْ أَمْوَالِهِمْ" اگر عورت بھی کسب میں مشغول ہو جائے تو شوہر کا حق احتساب جس کی بنیاد پر عورت کا نفقہ شوہر پر واجب کیا گیا ہے متأثر ہوگا، اور ہر وہ کام جس کی انجام دہی کے لئے عورت کو گھر کی چہار دیواری سے باہر جانا پڑے، اور عورت کے باہر کے کاموں میں مصروف رہنے کی وجہ سے شوہر کا حق متأثر ہوتا ہو یا اسے ضرر لاحق ہو تو شوہر کو ایسے کام سے اپنی بیوی کو روکنے کا حق حاصل ہوگا۔ (دیکھئے: ردالمحتار ۳۔ ۶۰۳)

اس سلسلہ میں راقم الحروف کا ذاتی رجحان یہ ہے کہ اگر عقد نکاح کے وقت عورت کی طرف سے ملازمت کی شرط لگا دی گئی تو شرط فاسد قرار پائے گی، اور نکاح درست قرار پائے گا، اور شوہر پر اس شرط کا ایفاء لازم نہیں ہوگا، جب چاہے وہ اس سے رجوع کر سکتا ہے، البتہ بعض حالات میں جب کہ شوہر کاہل اور نکما ہو، کماتا نہ ہو، اور عورت کو مالی پریشانی لاحق ہو تو ایسی صورت میں فقہ حنبلی کے مطابق عمل کی گنجائش ہوگی۔



# نکاح میں شرائط کا مدلل جائزہ

مولانا ولی اللہ قاسمی

شرط کی وجہ سے دوسرے فریق پر کچھ ایسی ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں، جو اس پر واجب اور ضروری نہ تھیں، تاہم شریعت نے اس سلسلہ میں فریقین کو بالکل آزاد نہیں چھوڑا کہ وہ معاملہ جس طرح سے چاہیں طے کرلیں، بلکہ معاملہ کی روح اور مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے، نیز دونوں کی فطرت وصلاحیت کے پیش نظر ایک گونہ پابندی لگادی ہے، تاکہ کمزور فریق کا استحصال نہ ہو سکے اس کی مجبوری سے بے جا فائدہ اٹھانے پر بند لگایا جاسکے، اس اعتبار سے عقد نکاح میں لگائی جانے والی شرطیں تین طرح کی ہیں:

١۔ وہ فرائض وذمہ داریاں جو عقد نکاح کی وجہ سے عائد ہو رہی تھیں انہیں کو شرط کی شکل میں ذکر کر دیا جائے، مثلاً عورت یہ شرط لگائے کہ شوہر رکھ رکھاؤ اور برتاؤ میں اس کے ساتھ عمدہ سلوک کرے گا، اس قسم کی شرطیں بہ اتفاق معتبر ہیں، اگر بصورت شرط نہ بھی ذکر کیا جاتا جب بھی ضروری ہوتا، ہاں شرط لگانے کی وجہ سے مزید تاکید پیدا ہو جائے گی۔

خطابی لکھتے ہیں:

''فمنها مايجب الوفاء اتفاقا. وهو ما أمر الله به من إمساك بمعروف أو تسريح بإحسان'' (فتح الباری ٩-٢٤٢)

بعض شرائط وہ ہیں جنہیں بہ اتفاق پورا کرنا ضروری ہے، یہ وہ ہیں جن کے بجالانے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، مثلاً دستور کے مطابق نباہ کرنا یا بخیر وخوبی تعلق ازدواجی ختم کرلینا۔

٢۔ وہ شرائط جن کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، باتفاق ناقابل عمل ہیں، مثلاً یہ شرط لگانا کہ شوہر نفقہ کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

فتح الملک میں ہے:

''أويشترط أن لامهر لها أولا نفقة لها فهذه الشروط كلها باطلة اتفاقا'' (فتح الملك المعبود ٣-٢٢)

یا شرط لگادے کہ عورت کے لئے مہر یا نفقہ نہیں ہے تو یہ تمام شرطیں بہ اتفاق باطل ہیں۔

مگر کیا اس شرط کی وجہ سے عقد نکاح کی صحت پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے درمیان قدرے اختلاف ہے، حنفیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ نکاح شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوتا گو شرط کو عقد کے ساتھ بیان کیا گیا ہو، مالکیہ کہتے ہیں کہ شرط فاسد کی وجہ سے نکاح فاسد ہو جاتا ہے، لیکن اگر اس کے باوجود یکجائی ہو جائے تو عقد نکاح صحیح اور شرط باطل ہے، شافعیہ اور حنابلہ کے یہاں تفصیل ہے، کچھ فاسد شرطوں کی وجہ سے وہ نکاح کو بھی فاسد قرار دیتے ہیں اور بعض فاسد شرطوں کے باوجود نکاح کو جائز قرار دیتے ہیں۔ (الفقہ الاسلامی ٧/ ٥٣)

٣۔ وہ شرطیں جو مذکورہ دونوں قسموں میں شامل نہیں ہیں بلکہ مباح اور جائز ہیں، لیکن اس کی وجہ سے ایک فریق پر ایسی پابندی عائد ہو جاتی ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہیں ہوتی، مثلاً عورت یہ شرط لگادے کہ شوہر اس کو لے کر سفر میں نہیں جائے گا، اس کے ہوتے ہوئے دوسری شادی نہیں کرے گا، یا اس کو اپنے والدین ہی کے گھر میں رہنے دے گا، سسرال جانے پر مجبور نہیں کرے گا، وغیرہ۔ اس سلسلہ میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے، حنفیہ کے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ کشمیری رقم طراز ہیں:

''والشرط التى لاتنافى النكاح جائزة وتوفى ديانة لاتلزم قضاء'' (العرف الشذی مع الترمذی ١-٢١٦)

جو شرطیں نکاح کے منافی نہ ہوں جائز ہیں، دیانۃً اس کو پورا کیا جائے گا لیکن بطور قضاء لازم نہیں، شافعیہ میں ابو عبید کی بھی یہی رائے ہے وہ لکھتے ہیں:

''والذی نأخذ به إنا نأمره بالوفاء بشرطه من غیر أن یحکم علیه'' (فتح الباری ۹۔ ۲۷۳)

(ہمارا عمل اس پر ہے کہ شرط کے بجالانے کا حکم دیتے ہیں، لیکن (بصورت دیگر) ہم اس کے خلاف فیصلہ نہیں کریں گے)۔

علامہ عینی نے امام ابوحنیفہ کے ساتھ امام شافعی اور امام مالک کا بھی یہی مذہب نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں۔

''والثانی أن یؤمر الزوج بتقوی الله والوفاء بالشرط ولایحکم بذلك حکما......وهو قول مالك وأبی حنیفة والشافعی'' (عمدۃ القاری ۲۰۔۱۲۰)

دوسری رائے یہ ہے کہ شوہر کو اللہ سے ڈرنے اور شرط کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا جائے لیکن اس پر فیصلہ کو مسلط نہ کیا جائے، یہی امام مالک، ابوحنیفہ اور شافعی کا مسلک ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس قول کی نسبت امام مالک وشافعی کی طرف درست نہیں، نووی نے امام شافعی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ شرط لغو ہے اور نکاح مہر مثل کے ساتھ درست ہے (شرح نووی علی مسلم ۱/ ۲۵۵) امام مالک فرماتے ہیں کہ یہ شرط کراہت سے خالی نہیں، اس کی تکمیل صرف مستحب ہے (الفقہ الاسلامی ۷/ ۶۰)۔

بہر کیف یہ تینوں حضرات اس پر متفق ہیں کہ عورت کو اس کی وجہ سے فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ ابراہیم نخعی، حسن بصری، ابن سیرین، ربیعہ، ابوالزناد، لیث، اور سفیان ثوری کی یہ رائے اور مسلک ہے، اس کے بالمقابل حضرت عمر، سعد بن ابی وقاص، عمرو بن العاص اور حضرت معاویہ فرماتے ہیں کہ شرط کو پورا کرنا واجب اور ضروری ہے، عدم تعمیل کی صورت میں عورت فسخ نکاح کا مطالبہ کرسکتی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود کی طرف یہ رائے منسوب ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیز، جابر بن زید، طاؤس، ابوالشعثاء، اوزاعی، امام احمد بن حنبل اسحاق بن راہویہ اور بعض مالکیہ کا بھی یہ خیال اور مذہب ہے۔ (دیکھئے مصنف عبدالرزاق ۶/ ۱۳، عمدۃ القاری ۲۰/ ۱۴۰، المغنی ۷/ ۷۲۔ ۷۱، فقہ السنۃ ۲/ ۸۲، ۸۱ اور بعض المالکیۃ سار وامسارھم۔ امام احمد بن حنبل ۶/ ۳۴۶ لابی زہرۃ) حال کے محققین علماء اور فقہ سے دلچسپی رکھنے والوں میں استاذ ابوزہرہ، شیخ مصطفی زرقا، وہبہ زحیلی اسی خیال کے حامی ومؤید ہیں۔ (دیکھئے امام احمد بن حنبل ۱/ ۳۵۱، المدخل ۱/ ۴۸۶، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/ ۶۰)

## فریق اول کے دلائل

جو حضرات شرط کو لازم اور ضروری نہیں سمجھتے یا اس کی وجہ سے فسخ کا حق نہیں دیتے، وہ درج ذیل احادیث وآثار سے استدلال کرتے ہیں:

۱۔ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مسلمان شرائط کے مطابق عمل کریں گے مگر وہ شرط جو کسی حلال کو حرام کرے یا حرام کو حلال کردے۔ (رواہ ابوداؤد، ابن ماجہ، والترمذی وقال حسن صحیح)

طریقہ استدلال یہ ہے کہ چونکہ شرط لگانے کی وجہ سے ایک حلال چیز، یعنی دوسری شادی، یا ساتھ میں سفر وغیرہ، حرام ہوجاتی ہے، اس لئے ایسی شرط حدیث کی رو سے ناقابل وفاء ہے۔

۲۔ ایک ایسے ہی شرط کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟ وہ ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو اللہ کی کتاب میں نہیں، ہر وہ شرط جو اللہ کی کتاب میں نہ ہو، وہ باطل ہے گو وہ سو شرطیں ہوں، اللہ کے فیصلے کا حق زیادہ ہے اور اللہ کی شرط زیادہ قابل اعتماد ہے''۔ (رواہ البخاری، کتاب العتق)

معلوم ہوا کہ جو شرطیں اللہ کی کتاب اور اس کے مقتضی کے مطابق نہیں، وہ باطل ہیں، مذکورہ شرائط بھی اسی قبیل کی ہیں، کیونکہ قرآن نے اس سلسلہ میں کوئی پابندی نہیں لگائی ہے، جب کہ شرط سے شوہر کو پابند ہونا پڑتا ہے۔

۳۔ حضرت علی سے اس عورت کے متعلق دریافت کیا گیا جس نے عقد کے وقت اپنے میکے میں رہنے کی شرط لگادی تھی، تو آپ نے فرمایا کہ شوہر کو وہاں سے لے جانے کا حق حاصل ہے، کیونکہ اللہ کی شرط عورت کی شرط پر مقدم ہے، ''شرط الله قبل شرطها'' (دیکھئے مصنف عبدالرزاق ۶/ ۲۳۱، مصنف ابن شیبہ ۲/

۱۲۰۱ المحلی ۹؍۴۲۵، ترمذی ۱؍۲۱۲)

۴۔ چونکہ شرط عقد کی مصلحت اور تقاضا کے موافق و مطابق نہیں، اس لئے لازم وفاء نہیں۔

۵۔ ابن وہب "بہ سند جید" روایت کرتے ہیں کہ عورت نے نکاح کے وقت یہ شرط لگادی تھی کہ وہ میکے میں ہی رہے گی، بعد میں شوہر نے وہاں سے لے جانا چاہا، مقدمہ حضرت عمر کی عدالت میں پیش ہوا، آپ نے شرط کا کوئی اعتبار نہیں کیا اور فیصلہ کیا کہ عورت شوہر کے ساتھ رہے گی، وہ جہاں جانا چاہتا ہے، لے جاسکتا ہے۔ (فتح الباری ۹؍۲۷۲)

۶۔ حدیث "إن أحق الشروط أن یوفی بها ما استحللتم بها الفروج" میں شرط سے مراد مہر ہے، یا وہ ذمہ داریاں ہیں جو عقد نکاح کی وجہ سے خود لازم اور ضروری ہوجاتی ہیں۔

چنانچہ قاضی خاں لکھتے ہیں:

"شرط" سے مراد یہاں مہر ہے، اس "بضع" کے مقابلہ میں وہی مشروط ہے، اور کہا گیا ہے کہ مراد وہ تمام چیزیں ہیں، جس کی بیوی ہونے کی بنیاد پر عورت حقدار ہے، یعنی مہر، نفقہ اور حسن معاشرت، کیونکہ شوہر نے عقد کی وجہ سے اسے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے گویا عورت نے عقد میں اس کی شرط لگادی ہے۔

## دوسرے فریق کے دلائل

جو حضرات شرط کی تکمیل کو لازم اور ضروری سمجھتے ہیں اور عدم تعمیل کی صورت میں عورت کو فسخ نکاح کا حق دیتے ہیں، ان کے دلائل یہ ہیں:

"یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا أَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" (سورہ مائدہ:۱)

آیت میں "عقود" سے مراد عہد اور وعدے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس، مجاہد، ابن جریج، ابو عبیدہ اور دیگر لوگوں سے آیت کی یہی تفسیر منقول ہے، اور ظاہر ہے کہ شرط بھی ایک عہد اور وعدہ ہی ہے۔

چنانچہ جصاص رازی لکھتے ہیں:

"وکذالك كل شرط شرطه إنسان علی نفسه فی شئی فی المستقبل فهو عقد" (احکام القرآن ۲۔۲۸۳)

اور ایسے ہی ہر وہ شرط جو انسان کسی چیز میں اپنے اوپر لگالے وہ "عقد" ہے، آگے اس آیت کے تحت وہ لکھتے ہیں کہ انسان جو شرط قبول کرلے، اس کو پورا کرنا واجب اور ضروری ہے، انہیں کے الفاظ ہیں:

"وهو فی إیجاب الوفاء بجمیع ما یشترط الإنسان علی نفسه مالم تقم دلالة تخصصه" (حوالہ سابق ۲۔۲۸۶)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام شرطوں کو جو انسان اپنے اوپر لگائے، پورا کرنا واجب ہے جب تک کہ تخصیص کی کوئی دلیل نہ ہو۔

"وَأَوْفُوْا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا" (الاسراء:۳۴)

(اور عہد کو پورا کرو اس کے متعلق پوچھا جائے گا)۔

یہ عہد عام ہے کہ اللہ سے کیا گیا ہو یا بندے سے، گو وہ کافر ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ ارشاد ہے:

إِلَّا الَّذِیْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْئًا وَّ لَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوْا إِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلٰی مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (التوبہ:۷)

(سوائے ان مشرکوں کے جن سے تمہارا معاہدہ ہے، اور انہوں نے اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی، اور تمہارے خلاف کسی دوسرے کی مدد نہیں کی تو معین مدت تک اس معاہدہ کی پابندی کرو، واقعی اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے)۔

اسی طرح کی بہت سی آیتیں ہیں جس میں وفاء عہد کا حکم دیا گیا ہے، اور بدعہدی پر وعید سنائی گئی ہے، شرط بھی ایک طرح سے عہد ہی ہے، لہذا اس کو پورا کرنا

واجب اور ضروری ہے۔

۲۔ حدیث میں بدعہدی نفاق کی علامت بتلائی گئی ہے، بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جس میں اللہ کے رسول ﷺ نے خلاف عہد کرنے کی مذمت بیان فر مائی، سخت وعیدوں سے خبردار کیا ہے۔

۳۔ نکاح کے معاملہ میں تو اللہ کے رسول ﷺ نے بصراحت فرمایا کہ:

''أحق الشروط ان توفوا ما استحللتم به الفروج'' (بخاری ومسلم وغیرہ)

پابندی کے لائق سب سے زیادہ وہی شرطیں ہیں جن کے ذریعہ تم نے شرمگاہوں کو حلال کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ دیگر شرطوں کی بہ نسبت عقد نکاح میں لگائی جانے والی شرط زیادہ لائق وفاء ہے۔

۴۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''الناس علی شروطهم ما وافقت الحق''۔

(لوگ اپنی شرطوں پر ہیں جب تک کہ وہ حق کے مطابق ہوں)۔

یہ حدیث متعدد سندوں سے مروی ہے، جن میں بعض راوی ضعیف بھی ہیں، مگر مختلف سندوں کی وجہ سے تقویت پیدا ہو جاتی ہے، نیز اسی معنی میں دیگر صحیح حدیثیں بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شرائط شریعت کے منشاء ومقصد کے خلاف نہ ہوں، وہ جائز ہیں، لوگوں کو اس کی پابندی لازم اور ضروری ہے۔

۵۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک موقع پر فیصلہ فرمایا کہ شوہر کے لئے شرط کو پورا کرنا ضروری ہے ورنہ عورت کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا، شوہر نے اعتراض کیا کہ پھر مردوں کے حق طلاق کا کیا حاصل؟ "اذا تطلیقنا" حضرت عمر نے جواب میں یہ قانونی جملہ ارشاد فرمایا "مقاطع الحقوق عند الشروط"۔

۶۔ قرآن پاک سے یہ ثابت کہ معاملات میں اصل بنیاد ''رضا'' ہے، لہذا جس شرط پر فریقین راضی ہوں، اور عقد کے مقصد ومقتضی کے منافی نہ ہوں، نیز اس کی وجہ سے شریعت کے متعین کردہ حدود نہ ٹوٹتے ہوں، تو وہ جائز اور لازم الایفاء ہے۔

۷۔ معاملات میں اصل ''اباحت'' ہے، اس پر تقریباً فقہاء کا اتفاق ہے، صرف ظاہریہ ''حظر'' کے قائل ہیں (دیکھئے مبداء الرضائی المعقود ۱۱۸۶) اس اعتبار سے بھی وہ شرطیں جن سے شارع نے منع نہ کیا ہو، جائز ہوں گی۔

۸۔ عبادات میں اصل ''حظر'' ہے کہ صرف وہی چیزیں لازم وضروری ہوں گی جسے شریعت نے فرض وواجب قرار دیا ہے، اپنی طرف سے کسی چیز کو فرض وواجب قرار دینا درست اور صحیح نہیں، لیکن اس کے باوجود عبادات میں ''نذر'' کی شکل میں شرط لگانے کی اجازت دی گئی ہے کہ جو چیز ذمہ میں واجب نہ ہو اسے واجب کرے، جب عبادات جس میں اصل حظر ہے، میں شرط کی اجازت ہے اور اس کو پورا کرنا لازم وضروری ہے تو معاملات جس میں اصل اباحت ہے، میں بدرجہ اولی اس کی تکمیل لازم وضروری ہوگی۔

۹۔ یہ شرطیں ایسی ہیں جس میں عورت کا فائدہ ہے اور مقصد نکاح کے منافی بھی نہیں، لہذا جس طرح سے زیادتی مہر کی شرط لازم ہے، اسی طرح سے یہ شرائط بھی ضروری اور لازم ہیں (یہ تمام تر تفصیلات فتاوی کبری ۳/۲۹/۳ وما بعدہ لابن تیمیہ، اعلام الموقعین ۳/۲، ۴۰۱۔ المغنی ۷/۲۷، ۷۱، سے ماخوذ ہیں)۔

## فریقین کے دلائل کا خلاصہ:

اس سلسلہ میں حنفیہ کے نقطہ نظر کی جو ترجمانی علامہ عینی وکشمیری نے کی ہے، وہی قرآن وحدیث سے زیادہ قریب ہے، تاہم موجودہ دور میں جو اخلاقی بگاڑ اور فساد سے عبارت ہے، لوگوں کی نگاہوں میں وفاء عہد کی کوئی حیثیت اور وقعت نہیں، جائز وناجائز کی کوئی پرواہ نہیں، ضرورت ہے کہ امام احمد حنبل کی رائے کو جو بہت سے صحابہ کرام کا مذہب ومسلک ہے اختیار کرلیا جائے یا عورتوں کو ''تفویض'' کی حیثیت سے متعارف کرایا جائے کہ وہ عقد کے وقت یہ کہہ دیں کہ اگر شوہر اس شرط کی خلاف ورزی کرے گا تو انہیں اس رشتہ کو ختم کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

## تفویض طلاق

اللہ نے طلاق کا اختیار مرد کو دیا ہے، تاہم اگر وہ چاہے تو اس حق کو بیوی کے سپرد کر سکتا ہے جسے اصطلاح میں تفویض کہتے ہیں، (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷ر ۴۱۴) ''تفویض'' کی مختلف صورتیں ہیں کبھی وقت شرط وغیرہ کی کوئی تحدید نہیں ہوتی، مطلقا کہ دیا جاتا ہے کہ (أمرک بیدک) معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے، اس صورت میں عورت کو اپنے آپ کو طلاق دینے کا اختیار صرف مجلس تک باقی رہے گا، مجلس کے بدل جانے سے یہ اختیار ختم ہو جائے گا، لیکن اگر یہ کہہ دے کہ ''معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے جب بھی تو چاہے'' (أمرك بيدك متى شئت أو إذا شئت) اس صورت میں پوری زندگی عورت کو یہ اختیار حاصل رہے گا، تا آنکہ وہ خود ہی اس اختیار کو ختم کر دے، اگر اختیار کے لئے کوئی مدت متعین کر دیتا ہے، مثلاً ''آج کے دن تجھے اپنے اوپر طلاق دینے کا اختیار ہے'' تو مکمل ایک دن تک یہ اختیار برقرار رہے گا، اگر مشروط تفویض ہو، مثلاً ''فلاں آ گیا تو تیرا معاملہ تیرے اختیار میں ہے'' تو اس کی بھی وہی صورتیں اور احکام ہیں جو مذکور ہوئیں۔ (یہ تفصیل بدائع ۲ر ۱۱۶۔ ۱۱۳ سے ماخوذ ہے)

## تفویض کب درست ہے؟

''تفویض'' عقد کے وقت بھی درست ہے اور عقد کے بعد بھی، لیکن عقد کے وقت تفویض کے درست ہونے کے لئے ضروری ہے کہ یہ مطالبہ عورت کی طرف سے ہو اور شوہر اسے قبول کر لے، مثلاً مرد ایجاب کرتا ہے عورت جواب میں کہتی ہے کہ میں اس شرط پر قبول کرتی ہوں کہ طلاق کا اختیار میرے ہاتھ میں رہے گا، اور مرد اس کو مان لیتا ہے، اگر مرد ایجاب، بایں طور کرتا ہے کہ میں تم سے شادی اس شرط پر کرتا ہوں کہ طلاق کا اختیار تمہارے ہاتھ میں رہے گا، اور عورت قبول کر لیتی ہے، تو یہ درست نہیں، علامہ ابن عابدین شامی دونوں کے فرق کی وضاحت فقیہ ابو اللیث کے حوالے سے ان الفاظ میں کرتے ہیں:

اگر شوہر ابتدا کرتا ہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی اور اختیار عورت کے ہاتھ میں نہیں ہوگا، فقیہ ابو اللیث ان دونوں صورتوں میں فرق بیان کرتے ہیں کہ ابتداء جب شوہر کی طرف سے ہو تو یہ طلاق اور تفویض نکاح سے پہلے ہے، لہذا درست نہیں، اور جب ابتداء عورت کی طرف سے ہو تو یہ تفویض نکاح کے بعد ہے، اس لئے کہ جب مرد نے عورت کے کلام کے بعد کہا قبلت (میں نے قبول کیا) اور جواب میں سوال ملحوظ ہوا کرتا ہے تو گویا کہ اس نے کہا کہ میں نے قبول کیا اس شرط پر کہ تجھ پر طلاق ہو، یا اس پر کہ معاملہ تیرے اختیار میں ہو تو یہ معاملہ نکاح کے بعد عورت کے اختیار میں ہوگا۔ (رد المحتار ۳ر ۲۴۲، مطبوعہ ایم سعید کمپنی۔ پاکستان)

اگر عقد سے پہلے ہی تفویض کی شرط طے ہو جائے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ شوہر ابھی اس کا مالک ہی نہیں ہوا ہے تو جس چیز کا خود مالک نہیں دوسرے کو کیسے مالک بنا سکتا ہے؟ البتہ اگر تفویض اس طرح ہو کہ میں نے اس عورت سے نکاح کیا تو اپنے طلاق کی مختار ہوگی تو یہ درست ہے، کیونکہ یہ تفویض طلاق ہی کی طرح ہے، جس طرح نکاح سے پہلے طلاق اضافی درست ہے، ایسے ہی تفویض اضافی بھی درست ہے۔

حضرت تھانوی لکھتے ہیں:

''اس کی تینوں صورتیں جائز ہیں، چاہے نکاح سے پیشتر لکھوا لیا جائے، چاہے عین وقت عقد زبان سے کہلوا لیا جائے، چاہے بعد میں لکھوا لیا جائے، مگر پہلی اور دوسری صورت کے صحیح اور معتبر ہونے کے لئے ایک شرط ہے، پہلی صورت یہ کہ کابین نامہ نکاح سے پہلے لکھا جاوے اس کے معتبر اور مفید ہونے کیلئے یہ شرط ہے، اس میں نکاح کی طرف اضافت اور نسبت موجود ہو۔

مثلاً یہ لکھا جائے کہ اگر میں فلاں بنت فلاں کے ساتھ نکاح کروں اور پھر شرائط مندرجہ اقرار نامہ ہذا میں سے کسی شرط کے خلاف کروں تو مسماۃ مذکورہ کو اختیار ہوگا، کہ اسی وقت یا پھر اور کسی وقت چاہے تو اپنے اوپر ایک طلاق بائن واقع کر کے اس نکاح سے الگ ہو جائے، اگر اس میں اضافت الی النکاح نہ لکھی گئی تو یہ اقرار نامہ محض بیکار ہوگا، اس کی رو سے عورت کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہ ہوگا، دوسری صورت یہ کہ عین ایجاب وقبول ہی میں زبانی شرائط مذکور ہوں، اس کے صحیح اور معتبر ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو۔ (الحیلۃ الناجزۃ ۲۱)

## مشروط تفویض

عورتوں کی فہم وذہانت، عقلمندی وہوشمندی نیز فطری جلد بازی کے پیش نظر مناسب ہے کہ مطلق تفویض نہ کی جائے، بلکہ احتیاطا کچھ قیود وشرائط کا لگا دینا بہتر ہے، اسی فطری کمزوری کے پیش نظر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے "تخییر" کے موقع پر حضرت عائشہ سے فرمایا، عائشہ! فیصلہ میں جلدی بازی نہ کرنا اپنے والدین سے مشورہ کے بغیر کوئی اقدام نہ کرنا، ایک موقع پر ازواج مطہرات نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے معاشی تنگی کی شکایت کی اور مطالبہ کیا کہ ہمارے نان نفقہ میں کچھ توسیع سے کام لیا جائے اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ "يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا" (سورۂ احزاب: ۲۸)۔ اس آیت میں ازواج مطہرات کو اختیار دیا گیا کہ وہ موجودہ حالت، یعنی معاشی عسرت وتنگی کے ساتھ آپ کی زوجیت میں رہنا قبول کریں یا پھر طلاق کے ساتھ آزاد ہو جائیں، اس کو تخییر کہا جاتا ہے۔ (دیکھئے معارف القرآن۔ ج ۷ ص ۱۲۷) لہذا تفویض کے ساتھ احتیاط کے لئے مزید کچھ شرطیں بڑھائی جاسکتی ہیں، مثلا یہ کہ طلاق کا اختیار اسی وقت ہوگا، جب کہ عورت کے والدین بھی اسی پر راضی ہوں وغیرہ، حضرت تھانوی لکھتے ہیں:

چونکہ عورت ناقص العقل ہے، اس لئے طلاق کو مطلقا اس کے ہاتھ میں دینا خطرہ سے خالی نہیں، پس مناسب ہے کہ تفویض میں کوئی قید مناسب بھی لگا دی جائے جس میں خطرہ نہ رہے مثلا نکاح کے وقت عورت کی طرف سے وہ خود، یا اس کا ولی یا وکیل (یعنی قاضی نکاح خواں) یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو یا مسماۃ بنت فلاں کو تمہارے نکاح میں اس شرط پر دیا کہ جس وقت اس کو تم سے کوئی تکلیف شدید پہنچے گی، جس کو فلاں فلاں اشخاص میں سے کم از کم دو آدمی تسلیم کرلیں، تو اس کے بعد ہر معاملہ میرے یا اس کے اختیار میں ہوگا کہ اپنے آپ کو طلاق بائن دے کر اس نکاح سے علاحدہ گی اختیار کرلی جائے، اس صورت میں طلاق کا اختیار عورت کے ہاتھ میں اس وقت آئے گا جب کہ تسلیم کردہ اشخاص میں سے کم از کم دو آدمی تسلیم کرلیں کہ تکلیف شدید ہے۔ (الحیلۃ الناجزۃ ر ۲۴)

## مشروط مہر

طلاق کے بے جا استعمال کو روکنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ عقد کے وقت شرط لگا دی جائے کہ اگر شوہر طلاق دے گا تو مہر مثلا بیس ہزار ہے اور اگر طلاق نہ دی تو دس ہزار ہے، ایسی صورت میں طلاق دینے کی صورت میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک نقطۂ نظر کے مطابق مہر مثل ہے، اور امام ابو یوسف ومحمد کی رائے کے مطابق معین کردہ مہر یعنی بیس ہزار لازم ہے۔

چنانچہ سرخسی رقم طراز ہیں:

اگر کوئی نکاح اس طور پر کرے کہ اس کی کوئی بیوی نہ ہو تو ایک ہزار درہم ہے، اور اگر دو ہزار، یا اگر کوفہ سے نہ لے جائے تو ایک ہزار اور بصورت دیگر دو ہزار، تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک دونوں صورتوں میں پہلے طلاق دے تو جس مہر کا تذکرہ کیا ہے وہ صحیح ہے اور دوسرا فاسد ہے، یہاں تک اگر یکجائی سے پہلے طلاق دیدے تو جس مہر کا تذکرہ پہلے ہوا ہے اس کا آدھا مہر ادا کرے، اور اگر یکجائی ہو جائے، اور شرط کو بھی پورا کردے، تو ایک ہزار سے زیادہ نہ ہو، اور ابو یوسف ومحمد کے نزدیک دونوں شرطیں معاہدہ کے مطابق جائز ہیں۔

گرچہ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کی رائے امام ابو یوسف ومحمد سے مختلف ہے، لیکن دلیل کے اعتبار سے صاحبین کی رائے قوی ہے، نیز حالات کا تقاضا بھی یہی ہے، یہی وجہ ہے کہ حنفیہ نے امام ابو یوسف ومحمد ہی کے مذہب کو اختیار کیا ہے۔ (المبسوط ۹/۵، نیز دیکھئے: الاحوال الشخصیہ / ۱۵۵)

طلاق ہی کی طرح دوسری شادی کا مسئلہ ہے کہ اگر عقد میں یہ شرط لگا دی جائے کہ اگر مرد نے اس عورت کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کی تو مہر بیس ہزار ہوگا، بصورت دیگر دس ہزار، تو ایسی صورت میں امام ابو یوسف ومحمد کے مسلک کے مطابق دونوں شرطیں معتبر ہوں گی، اور دونوں صورتوں میں متعین کردہ مہر لازم آئے گا۔

## خلاصہ:

واضح رہے کہ ان دونوں مسئلوں میں امام ابو یوسف ومحمد کی رائے پر فتوی دیتے وقت کچھ شرائط کا اضافہ بھی ضروری ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے جس

مقصد کے تحت اسلام نے طلاق یا تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے، وہ مقصد ہی فوت ہوجائے، شرط کی وجہ سے مرد بالکل بند ہو کر رہ جائے گا، اور ناگزیر ضرورت کے وقت بھی رقم ادا نہ کرنے کی پوزیشن میں ہونے کی وجہ سے طلاق نہ دے سکے، زندگی بالکل تلخ اور اجیرن بن کر رہ جائے، طرح طرح کی خرابیاں اور بگاڑ پیدا ہوں جس کو ختم کرنے کے لئے شریعت نے طلاق کی اجازت دی ہے۔

## ملازمت پیشہ عورت

''مشروط نکاح'' کے ذیل میں یہ تفصیل گذر چکی ہے کہ مباح شرطوں کے بارے میں امام شافعی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ شرط لازم نہیں، حنفیہ کے نزدیک یہ ایک وعدہ ہے، دیانتاً اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کو نباہے، اس کے مطابق عمل کرے، اگر شوہر ایسا نہیں کرتا تو اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس کی وجہ سے عورت کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا۔

کاسانی رقم طراز ہیں:

شوہر کا یہ شرط لگانا کہ وہ اپنی دوسری بیوی کو طلاق دے گا، یا اس عورت کو اس کے شہر سے نہیں لے جائے گا تو یہ قضاءً لازم نہیں، اس لئے کہ یہ ایک وعدہ ہے جو شوہر نے اس سے کیا ہے، لہذا اس پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ (بدائع ۲/۲۸۵)

آئندہ کوئی مناسب ملازمت ملے تو اس سے منع نہیں کریگا، اور اس شرط کو شوہر قبول کر لیتا ہے اس کے باوجود اسے روکنے کا حق ہے، اور عورت کے لئے شوہر کے حکم کی تعمیل ضروری ہوگی، اگر عورت شوہر کی رضامندی کے بغیر ملازمت پر لگی رہی تو ''ناشزہ'' سمجھی جائے گی اور نفقہ کی حقدار نہیں ہوگی۔ (دیکھئے: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۷۹۲ کتاب النفقہ)

چنانچہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:

''اگر عورت صرف دن میں شوہر کے ساتھ رہے اور رات میں رفاقت نہ ہو، یا اس کے برعکس، تو وہ نفقہ کی مستحق نہ ہوگی، اس لئے کہ سپردگی ناقص ہے، اس سے ہمارے دور کے اس مسئلہ کا حل بھی نکل آیا، جبکہ شادی کسی پیشہ سے متعلق عورت کے ساتھ ہو جو دن اکثر کارخانہ میں گزارتی ہے اور رات شوہر کے ساتھ بسر کرتی ہے اس کے لئے نفقہ نہیں ہے'' (البحر الرائق ۲/۱۸۰)

امام احمد کے مسلک کے مطابق شوہر کے لئے شرط کی تعمیل ضروری ہے، اسے روکنے اور منع کرنے کا حق نہیں، اگر سلسلہ ملازمت کو ختم کرنے پر مجبور کرتا ہے تو عورت فسخ نکاح کا مطالبہ کرسکتی ہے، اور بلا اجازت ملازمت کرتے ہوئے بھی ''ناشزہ'' نہیں سمجھی جائے گی، اور نان ونفقہ کی مستحق ہوگی، وہبہ زحیلی ان کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حنابلہ نے اس شرط کو بھی صحیح قرار دیا اور اس شرط پر وفاء کو لازم گردانا، لہذا شوہر کو یہ حق نہیں کہ وہ عورت کو کام کرنے سے روک دے اور اگر روک لگادے تو وہ ''نافرمان'' نہیں سمجھی جائے گی (الفقہ الاسلامی ۷/۷۹۲)

☆☆☆

# نکاح میں شرائط کتاب وسنت کی روشنی میں

مولانا اختر امام عادل [1]

نکاح انسانی زندگی کا اہم ترین رشتہ ہے، اس کے تقدس وعظمت پر قرآن وحدیث کے بے شمار نصوص موجود ہیں، نکاح کے ذریعہ دو اجنبی شخص ایک دوسرے سے حد درجہ قریب اور دونامانوس دل باہم انتہائی مانوس ہوجاتے ہیں، اس طرح نکاح زندگی کی وہ منزل ہے جہاں سے مرد وعورت کی رفاقت کا دور شروع ہوتا ہے، یہیں سے انسان باہمی محبت واعتماد کا سلیقہ سیکھتا ہے، اس بقائے باہم کے تحفظ دوام کے لئے اسلام نے بہت سے ایسے حدود وقیود مقرر کردیئے ہیں جن سے ایک مکمل اور خوشگوار زندگی بسر کی جاسکتی ہے، بسااوقات ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ نکاح جیسا محبوب ومرغوب رشتہ بھی محفوظ نہیں رہ پاتا، یہی وجہ ہے کہ مرد وعورت کو اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے نکاح میں رائج ومتداول حدود وشرائط کے علاوہ اپنے طور پر الگ سے کچھ شرطیں لگانے کی ضرورت پیش آتی ہے، جس کو اصطلاحی طور پر ''اشتراط فی النکاح'' کہا جاتا ہے۔

## موضوع سے متعلق قرآن وحدیث کے نصوص

اس موضوع پر فقہی گفتگو کرنے سے پہلے ہم مناسب سمجھتے ہی کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک عمومی نظر اس مسئلہ پر ڈال لیں۔

قرآن وحدیث میں ایفاء عہد پر بہت زور دیا گیا ہے، خواہ وہ معاہدہ نکاح کے سلسلہ میں ہو، یا کسی اور معاملہ میں، قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ۔ (سورہ مائدۃ:۱)

(اے ایمان والو! معاہدات پورے کرو)۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے:

''وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ''۔ (سورہ بقرہ:۲۲۴)

اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ کہ تم بھلائی نہ کرو اور پرہیزگاری نہ کرو اور لوگوں کے درمیان صلح نہ کرو، اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

احادیث میں یہ مسئلہ کچھ اور وضاحت سے آیا ہے، جس میں حق وناحق اور جائز وناجائز کی تفصیل موجود ہے۔ ایک روایت ہے کہ:

منافق کی پہچان تین چیزیں ہیں، ایک یہ ہے کہ جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے (مشکوۃ ر ۱۷)، ایک دوسرے موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
اس شخص کا ایمان مکمل نہیں جس کو امانت کا خیال نہیں، اور اس شخص کا دین مکمل نہیں جس کو عہد کا پاس ولحاظ نہیں۔ (مشکوۃ شریف ر ۱۵)

حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''المسلمون على شروطهم إلا شرطا أحل حراما أو حرم حلالا'' رواه الترمذي (مشكوة۔ ۲۵۲)

مسلمانوں کو اپنی شرطوں پر قائم رہنا ضروری ہے الا یہ کہ شرط ایسی ہو جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام کردے، بخاری ومسلم میں ایک روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔

''كل شرط ليس في كتاب الله فهو باطل وان كان مائة شرط'' (مشكوة ۲۲۹)

ہر وہ شرط جو اللہ کی کتاب کے موافق نہ ہو وہ باطل ہے اگر چہ سو شرطیں ہی کیوں نہ ہوں۔

---

[1] بانی ومہتمم جامعہ ربانی منوراشریف، سمستی پور، بہار

یہ تمام احادیث تو عمومی نوعیت کی ہیں، بعض ایسی احادیث بھی موجود ہیں جو مسئلہ زیر بحث سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ محدثین نے ''کتاب النکاح'' یا ''کتاب الشروط'' میں ان احادیث کو مستقل باب کے تحت ذکر کیا ہے۔

امام بخاری نے کتاب النکاح میں دو باب قائم کئے ہیں:

(۱) ''باب الشروط فی النکاح'' اور اسکے تحت یہ روایت ذکر کی ہے:

''أحق ما أوفیتم من الشروط أن توفو أما استحللتم به الفروج'' (بخاری شریف ۲۔ ۷۷۲)

سب سے زیادہ مستحق ایفاء وہ شرطیں ہیں جن کے ذریعہ تم شرمگاہیں حلال کرتے ہو۔ (یعنی جو شرطیں بوقت نکاح طے کرتے ہو)

(۲) دوسرا باب ہے "باب الشروط التی لا تحل فی النکاح" (یعنی وہ شرطیں جو نکاح کے وقت لگانا جائز نہیں) اس کے تحت ترجمۃ الباب میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ اثر نقل کیا ہے: لا تشترط المراۃ طلاق اختہا یعنی عورت بوقت نکاح اپنی سوکن کی طلاق کی شرط نہ لگائے۔

اس کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ کے حوالہ سے یہ مسند روایت نقل کی ہے۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یحل لامرأۃ أن تسأل طلاق اختہا لتستفرغ صحفتہا فانما لہا ماقدرلہا۔ (بخاری شریف ۲۔ ۷۷۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی سوکن کی طلاق کا مطالبہ کرے تا کہ اس کا پیالہ اپنے لئے فارغ کر لے، حالاں کہ اس کو اتنا ہی ملے گا جو اس کے لئے خدا کی جانب سے طے ہو چکا ہے۔

امام بخاری نے ''کتاب الشروط'' میں بھی ان دونوں روایتوں کو اسی مفہوم و مطلب کے دو جداگانہ بابوں کے تحت ذکر کیا ہے، ایک باب ہے ''باب الشروط فی المہر عند عقدۃ النکاح'' اور اس کے تحت پہلی روایت ذکر کی ہے (بخاری شریف ۱/ ۳۷۶)۔

ان روایات سے واضح ہے کہ بوقت نکاح جو شرائط مقرر کی جاتی ہیں وہ سب کی سب قابل اعتبار نہیں ہوتیں، بلکہ صرف ان شرائط کا اعتبار کیا جائے گا، جو شریعت کے موافق اور مقتضائے عقد کے مطابق ہوں، بخاری کے مشہور شارح علامہ قسطلانی شرح بخاری میں لکھتے ہیں:

اس سے مراد ایسی شرطیں ہیں جو مقتضائے عقد کے خلاف نہ ہوں، بلکہ نکاح میں شامل ہوں، مثلاً حسن سلوک کی شرط یا کسی قسم کی حق تلفی نہ کرنے کی شرط وغیرہ، اور جو شرطیں متقضائے عقد کے خلاف ہوں مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ شوہر اس کے رہتے ہوئے کسی باندی سے صحبت نہیں کریگا، یا اس کو سفر میں نہیں لے جائے گا وغیرہ، تو ایسی شرطیں پوری کرنا واجب نہیں، بلکہ ایسی شرط لغو قرار پائے گی اور نکاح صحیح ہوگا اور شوہر کو مہر مسمی کے بجائے مہر مثل دینا ہوگا (ارشاد الساری شرح البخاری للقسطلانی ٦/ ۱۴۳، ٦/ ۱۴۴)۔

## نکاح سے متعلق شرطیں

حنفیہ کے یہاں جو شرطیں نکاح سے متعلق ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک یہ ہے کہ نکاح کو کسی شرط پر معلق کیا جائے (۲) دوسرے یہ کہ نکاح تو کسی شرط پر معلق نہ ہو، البتہ بوقت نکاح فریقین میں سے کوئی فریق کچھ شرطیں لگائے اور باہمی رضامندی سے ان پر اتفاق ہو جائے۔

ان میں پہلی قسم کا تعلق عین عقد نکاح سے ہے، جس میں خود وجود نکاح متاثر ہوتا ہے، جبکہ دوسری قسم کا تعلق عین عقد نکاح سے نہیں، بلکہ نکاح کے بعد والی زندگی سے ہے، یعنی نکاح ہونے کے بعد فلاں فلاں شرطوں پر کاربند ہونا ہوگا۔

قسم اول تو یہاں زیر بحث نہیں۔

رہی دوسری قسم کہ نکاح کسی شرط پر معلق نہ ہو، البتہ بوقت نکاح کچھ شرطیں لگائی جائیں، اس کی تین شکلیں ممکن ہیں اور تینوں کے الگ الگ احکام ہیں۔

## شکل اول:

ایسی شرائط جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی نئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ خود عقد نکاح سے جو ذمہ داری کسی فریق پر عائد ہوتی ہو اس کو شرط کی صورت میں عقد نکاح کے وقت ذکر کردیا گیا ہو، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا، یا اس کو مہر ملنا چاہئے، یا یہ کہ شوہر اس کے ساتھ حسن سلوک کرے گا، یا شوہر کا یہ شرط لگانا کہ عورت صرف میری ہی بیوی رہے گی، یا یہ کہ عورت کو خیار حاصل نہ ہوگا وغیرہ۔

ان تمام مثالوں میں حکم بالکل ظاہر ہے کہ نکاح بھی درست ہے اور جو ذمہ داریاں میاں بیوی پر عقد نکاح کی بناء پر ہوتی ہیں ان کی ادائیگی بھی لازم ہے۔
(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۴/ ۸، البحر الرائق ۲/ ۱۶۱، شامی ۲/ ۵۷۳، القسطلانی ۶/ ۱۴۳، ۱۴۴)

## شکل ثانی:

دوسری شکل یہ ہے کہ نکاح کے وقت کسی فریق کا کوئی ایسی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، یا ایسی شرط لگانا جو مقصد نکاح کے منافی ہو، جس سے شریعت کا نظام نکاح متاثر ہوسکتا ہو یا جس سے کسی فریق کا بے جا استحصال مقصود ہو، مثلاً شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا بیوی کا نفقہ اس کے ذمہ نہ ہوگا، یا یہ کہ عورت کو میرے مرنے کے بعد وراثت نہیں ملے گی، اسی طرح عورت کا یہ شرط لگانا کہ شوہر کو میری وراثت سے حصہ نہیں ملے گا یا شوہر کو ہر ماہ سو دینار یا بیس ہزار روپے (مثلاً) کا نفقہ دینا ہوگا، جبکہ دونوں کی حیثیت اتنی نہیں، اس قسم کی شرطیں لغو ہیں اور فریقین پر صرف وہی واجب ہے جو شریعت مطہرہ واجب کرتی ہے، عورت نفقہ کی مستحق ہوگی جس کی وہ لائق ہوگی، قانونی طور پر دونوں ایک دوسرے کے مرنے کے وارث بھی ہوں گے (القسطلانی شرح البخاری ۶/ ۱۴۳)۔

## عورت کے لئے خیار طلاق

اسی قسم میں نکاح کے بعد عورت کے لئے خیار طلاق کا مسئلہ بھی آتا ہے، اس کی دو شکلیں ہیں:

(۱) بوقت عقد طلاق کی پیش کش خود مرد کرے تو یہ صورت درست نہیں (۲) البتہ اگر عورت یہ شرط لگائے کہ اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار ہوگا، یا فلاں فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، اور مرد اس کو قبول کرے تو درست ہے، اور عورت کو خیار طلاق حاصل ہوجائے گا، اور اگر معاہدہ تابید کے ساتھ ہوا ہو تو مرد کو یہ حق طلاق ختم کرنے کا اختیار نہ ہوگا (البنایہ ۴/ ۵۰۵، ۵۲۳)۔

ان دونوں شکلوں میں فرق کی وجہ دو ہیں:

(۱) ایک وجہ جس کو علامہ عبدالرحمن الجزیری نے بیان کیا ہے یہ ہے کہ طلاق دینے کا اختیار شریعت نے مرد کو دیا ہے، عورت کو نہیں اب اگر یہ اختیار عورت کے حوالہ کردیا جائے تو قلب موضوع لازم آئے گا، ہاں بعض حالات ایسے ہوتے ہیں جن میں عورت کو اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لئے اس طرح کی شرطیں لگانی پڑتی ہیں، ان حالات میں عورت اس کی پیش کش کرسکتی ہے، کیونکہ اس کو اس کی ضرورت ہے، اس وقت مرد اگر چاہے تو اس کو قبول کرسکتا ہے، لیکن مرد خود ہی خیار طلاق کے اصول کو الٹنا چاہے، جس کی اس کو خود ضرورت نہیں اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۴/ ۸۵)۔

(۲) اس کی دوسری اور اصل وجہ یہ ہے کہ اصول کے مطابق مرد عورت کو نکاح کے بعد ہی طلاق تفویض کرسکتا ہے، نکاح سے قبل نہیں، تو جس شکل میں مرد از خود بوقت نکاح تفویض طلاق کی پیش کش کرے گا، تو یہ تفویض نکاح سے قبل قرار پائے گی، اس لئے کہ عقد اس وقت تمام ہوگا جب ایجاب و قبول دونوں ہوجائیں اور اس صورت میں بوقت تفویض صرف مرد کی جانب سے ایجاب ہوا، عورت کی طرف سے قبول کا مرحلہ باقی ہے، اس لئے یہ تفویض قبل الطلاق ہوگی جو باطل ہے، البتہ اگر عورت ایجاب نکاح کرتے ہوئے خیار طلاق کا مطالبہ کرے، اور مرد ایجاب کو قبول کرتے ہوئے اس کی فرمائش منظور کرلے تو یہ تفویض طلاق کے تمام ہونے کے بعد قرار پائے گی، جو قاعدہ کی رو سے درست ہے (فتاوی قاضی خاں ۱/ ۳۲۹، فتاوی عالمگیری ۱/ ۲۷۳)۔

## نکاح میں ملازمت کی شرط:

اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتیں اگر نکاح کے وقت اپنے ہونے والے شوہر سے یہ شرط لگائیں کہ شوہر انہیں ملازمت سے نہیں روکے گا یا اگر آئندہ انہیں کوئی مناسب

ملازمت ملی تو شوہر انہیں ملازمت کرنے سے نہیں روکے گا، اور اس شرط کو ہونے والا شوہر قبول کر لے۔

تو اس صورت میں مسئلہ کی دو شکلیں بن سکتی ہیں، ایک شکل تو یہ ہے کہ جس ملازمت کی شرط لگا رہی ہے، اگر وہ ملازمت شرعی طور پر درست ہو، اور عورت حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے اس کو انجام دے سکتی ہو، اور دینے کا عہد کرے، تو مرد پر ضروری ہے کہ وہ اپنے معاہدہ کا پاس رکھے اور عورت کے شرط کی تکمیل کرے، اس لئے کہ یہ شرط فاسد نہیں، بلکہ شرط صحیح ہے، لیکن اگر ملازمت غیر شرعی ہو یا عورت کے لئے حدود شرعیہ کی رعایت مشکل ہو، یا وہ آزاد رہنا چاہتی ہو تو اس شرط کو اگر مرد قبول بھی کر لے تو اس کی تکمیل واجب کیا جائز بھی نہیں۔

(اس سے اشارہ ملتا ہے کہ جس منفعت کی شرط لگائی ہو وہ جائز ہونی چاہئے، اگر ناجائز ہو، مثلاً خمر یا خنزیر کو مشروط کرے، تو مہر کی مشروع مقدار ہونے کی صورت میں صرف مہر مسمی ملے گا، اور حرام کا اسے حق نہ ہوگا، مہر مثل نہ ملے گا، اس لئے کہ مسلمان کے لئے حرام سے انتفاع جائز نہیں، پس اس کے فوت نہ ہونے کی صورت میں الگ سے معاوضہ دینا لازم نہیں) (البحر الرائق ۳ر۱۶۰)۔

## قسم ثالث۔ نکاح کے وقت خارجی شرائط:

تیسری قسم یہ ہے کہ نکاح کے وقت کسی فریق کا کوئی ایسی شرط عائد کرنا جو پہلی اور دوسری قسم کے دائرے میں نہ آتی ہو، اس کے نتیجے میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہو، جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہیں ہوتا، اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی یا ذمہ داری عائد ہوتی ہو جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہ ہوتی ہو، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہ کرے گا، یا اس کو اپنے آبائی وطن سے باہر نکال کر نہیں لے جائے گا، یا اس طرح کی کوئی اور شرط لگانا جس کا تعلق عقد نکاح سے نہ ہو۔

صاحب البحر الرائق نے اس قسم کے تحت نوع بنوع شرائط کے لحاظ سے جو مختلف شکلیں پیدا ہوتی ہیں، ان کا بہترین اور جامع احاطہ کیا ہے انہوں نے ۲۸۸ صورتیں فرض کی ہیں۔

لیکن ظاہر ہے یہ ساری صورتیں جائز نہیں ہوسکتی ہیں، ان کے لئے کچھ ایسے قیود اور شرائط لگانے ہوں گے، جن کی روشنی میں کسی بھی صورت کے جواز وعدم جواز کا فیصلہ کیا جاسکے، غور کرنے سے یہاں دو مرحلے سمجھ میں آتے ہیں، (۱) ایک مرحلہ بوقت عقد شرط لگانے کا ہے (۲) دوسرا مرحلہ ان کی تکمیل وعدم تکمیل اور اس سے پیدا ہونے والے نتیجے کا ہے۔

### پہلا مرحلہ

پہلے مرحلے میں کسی بھی صورت کے جواز کے لئے بنیادی طور پر یہ شرطیں لگائی جاسکتی ہیں۔

(۱) ایسی شرطیں نہ لگائی گئی ہوں جن سے کسی کا نقصان یا حق تلفی لازم آئے، یا کسی کو مشقت سے دوچار ہونا پڑے، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ ہونے والا شوہر اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے، اس طرح کی شرط لگانا بالکل گناہ ہے (بخاری ۲ر۷۷۴)۔

اسی طرح یہ شرط لگانا کہ شوہر عورت کو اس کے آبائی مکان یا وطن سے منتقل کر کے کہیں نہیں لے جائے گا، اس لئے کہ اس میں شوہر پر غیر شرعی جبر ہے، اسی لئے فقہاء نے اس کو شرط فاسدہ میں شمار کیا ہے۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

سوکن کو طلاق دینے کی شرط، یا آبائی مکان یا وطن سے باہر نہ لے جانے کی شرط، شروط فاسدہ میں سے ہے، اس لئے اگر اس طرح کی شرطیں لگا بھی دی گئیں تو یہ محض وعدہ ہوگا، عقد نکاح کی بناء پر ان کی تکمیل کا مطالبہ نہیں کیا جائیگا (بدائع الصنائع ۲ر۲۷۸، ۲۸۵)۔

(۲) دوسری بنیادی شرط یہ ہے کہ امر مشروط شرعی اعتبار سے ناجائز نہ ہو، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ شوہر اس کے رہتے ہوئے کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کرے گا تو یہ شرعاً ناجائز ہے، اس لئے کہ شریعت مطہرہ نے جب مرد کو چار شادیوں کی اجازت دی ہے، تو عورت کا شرط لگا کر اس سے روکنا درست نہیں (فتح القدیر ۳ر۲۳۲، والکفایہ ۳ر۲۳۲)۔

اگر چہ علامہ ابن قدامہ نے المغنی میں اس خیال پر معقول نقد کیا ہے، لیکن بہر حال حنفیہ کا نقطۂ نظر یہی ہے (المغنی ۷/ ۴۴۹)۔

## دوسرا مرحلہ:

دوسرا مرحلہ شرائط کی تکمیل کا ہے، اگر مذکورہ مشروط صورتوں میں سے کوئی صورت وجود میں آجائے تو کیا شوہر کو ان شرائط کی تکمیل کرنی چاہئے یا نہیں؟ اور اگر شوہر ان کی تکمیل نہ کرے تو اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ ان کی تعیین وتحدید کے لئے درج ذیل شرائط مقرر کئے جاسکتے ہیں۔

(۱) شرط شرعی طور پر قابل انتفاع ہو۔

(۲) اس شرط سے عورت کا یا اس کے کسی قریبی رشتہ دار کا نفع متعلق ہو، غیر متعلق شخص کا نہیں۔

(۳) نکاح کے وقت مہر شرعی مقرر کیا گیا ہو۔

(۴) عورت کا مہر مثل، مہر مقررہ سے زیادہ ہو۔

(۵) امر مشروط محض عقد نکاح کی بنا پر لازم نہ ہوتا ہو، بلکہ شوہر کا جداگانہ عزم وعمل اس میں لزوم پیدا کرتا ہو۔

(۶) عورت کی طرف سے شوہر کے لئے کسی شئی کی واپسی مشروط نہ ہو۔ (شامی ۲/ ۳۷۵، نیز دیکھئے: البحر الرائق ۳/ ۱۶۱)

اگر کسی مشروط صورت میں مذکورہ تمام شرائط پائی جاتی ہوں، تو معاہدہ ہوجانے کے بعد شوہر کو مقررہ شرائط کی تکمیل کرنی چاہئے، اگر وہ بوقت نکاح طے شدہ شرائط کی تکمیل کرے گا، تو عورت کو صرف مہر مسمی ملے گا، بصورت دیگر عورت کو مہر مسمی لینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، بلکہ پورا مہر مثل شوہر کو دینا ہوگا، اس لئے کہ وہ اپنے مہر مثل سے کم مقدار پر اس صورت میں راضی ہوئی تھی، جب اس کی شرطوں کی تکمیل کی جائے، تکمیل نہ ہونے کی صورت میں مہر مقررہ پر وہ راضی نہیں ہوگی، اس لئے مہر مثل دینا ہوگا، جو نکاح میں اولی طور پر لازم ہوتا ہے۔

مثلاً عورت نے نکاح کے وقت شرط لگائی کہ شوہر اسے اس کے آبائی وطن سے نکال کر کہیں اور نہیں لے جائے گا، یا شوہر اس کو کچھ ہدیہ وتحفہ دے گا، یا مشکل کاموں کا پابند نہ کرے گا، وغیرہ اور عورت کا مہر اس کے مہر مثل کے مقابلے میں کم ہے، تو شرط پوری ہونے کی شکل میں تو عورت کو مہر مقررہ ہی ملے گا۔

لیکن شرط پوری ہونے کی صورت میں شوہر کو مہر مثل دینا ہوگا، البتہ اگر مذکورہ شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی کسی صورت مشروطہ سے مفقود ہوجائے تو، یا شوہر پر مقررہ شرائط کی تکمیل ہی ضروری نہ ہوگی یا یہ کہ تکمیل نہ ہونے کی صورت میں بھی عورت کو مہر مقرر ہی ملے گا، مہر مثل نہیں (رد المحتار ۲/ ۳۷۵، نیز دیکھئے: البحر الرائق ۳/ ۱۶۱)۔

## مہر سے متعلق شرطیں

فقہائے حنفیہ کے نزدیک اشتراط فی النکاح کا دوسرا بنیادی حصہ مہر سے متعلق ہے جس کو فتح القدیر اور کئی کتب فقہ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

مسئلہ کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ ہے کہ بوقت نکاح تعیین مہر کے ساتھ کچھ مفید شرطیں بھی لگائی جائیں، دوسری صورت یہ ہے کہ عورت کے لئے مہر معلق مقرر کیا جائے، یعنی اگر شرط پوری ہوگی تو مہر کی مقدار یہ ہوگی، اور پوری نہ ہوگی تو مقدار یہ ہوگی (فتح القدیر ۳/ ۲۴۲)۔

مثلاً عورت اس شرط پر شادی کرے کہ اگر ہونے والا شوہر اس کو اس کے آبائی وطن سے نہ نکالے گا، تو مہر ایک ہزار ہوگا، ورنہ دو ہزار، یا یہ شرط کہ اگر شوہر اس کے رہتے ہوئے دوسری شادی نہ کرے گا تو ایک ہزار مہر ہوگا، ورنہ دو ہزار وغیرہ، ان مثالوں میں مہر کی مقدار معین نہیں ہے، بلکہ وہ موقوف ہے شرط کی تکمیل پر، اس طرح مہر کے تسمیہ میں جہالت پائی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ اس جہالت کا اثر نکاح کی صحت پر نہیں پڑے گا، البتہ مہر کا مسئلہ اس سے ضرور متاثر ہوگا، اوہ اس طرح کہ اس مسئلہ کی بھی دو صورتیں ہیں:

(۱) امر مشروط یقین کے ساتھ بآسانی معلوم ہوسکتا ہے، (۲) یا محتمل ہے۔

(۱) اگر امر مشروط یقین کے ساتھ بآسانی معلوم ہوسکتا ہے، مثلاً بوقت نکاح مرد نے یہ شرط لگائی کہ اگر عورت خوبصورت ہوگی تو مہر دو ہزار ہوگا، اور بدصورت ہوگی تو ایک ہزار، تو یہ مہر بھی معلق ہے، مگر خوبصورتی وبدصورتی پہلی ملاقات ہی سے یا دوسرے ذرائع سے معلوم ہوسکتی ہے، اور اس میں کوئی مشکل نہیں، اس لئے کہ اس

صورت میں شرط کے دونوں رخ بالا جماع درست ہیں، یعنی اگر عورت بدصورت نکلی تو مہر ایک ہزار پائے گی اور اگر خوبصورت نکلی تو دو ہزار پائے گی (فتاوی تاتار خانیہ ۳/۱۰۱، ۱۰۲)۔

اگر چہ کفایہ قاضی خاں اور کئی کتب فقہ میں نوادر ابن سماعہ کے حوالہ سے امام محمد کی روایت یہ نقل کی گئی ہے کہ اس صورت میں صاحبین اور امام ابوحنیفہ کا اختلاف ہے، یعنی صاحبین کے یہاں دونوں شرطیں جائز ہیں، مگر امام صاحب کے نزدیک بدصورتی کی حالت میں ایک ہزار مہر تو درست ہے، لیکن اگر عورت خوبصورت ثابت ہوئی تو دوسری شرط یعنی دو ہزار والی فاسد ہے، اور عورت کو اسکے بجائے مہر مثل ملے گا، اور اس کو قیاس کیا ہے، ایک دوسرے جزئیہ پر وہ یہ کہ شرط لگائی کہ اگر عورت باندی ہو تو مہر ایک ہزار ملے گا ورنہ دو ہزار، تو اس شکل میں امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف ثابت ہے، جب کہ یہاں بھی حسن و قبح کی طرح عورت بالیقین ایک ہی حالت پر ہے (الکفایہ ۳/۲۳۲، نیز قاضی خاں ۱/۲۳۰)۔

لیکن علامہ ابن نجیم مصری نے سماعہ کی اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ حسن و قبح کے مسئلہ کو آزادی و غلامی کے مسئلہ پر قیاس کرنا غلط ہے، اس لئے کہ آزادی و غلامی کے جزئیہ میں اگر چہ عورت بالیقین ایک ہی حالت پر ہوتی ہے، مگر اس کا پتہ لگنا اتنا آسان نہیں ہوتا، اس کے برخلاف عورت کے حسن و قبح کا پتہ چلنا بہت آسان ہے، اس بناء پر اس میں جہالت اتنی فحش نہیں ہے کہ تسمیہ مہر کو باطل قرار دیا جائے، اور اسی لئے امام صاحب بھی راجح قول کے مطابق صاحبین کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں۔ (شامی ۲/۳۷۶، البحر الرائق ۳/۱۶۲)

(۲) اور اگر امر مشروط یقین کے ساتھ بآسانی معلوم نہ ہو سکتا ہو، بلکہ محتمل ہو، مثلاً عورت کو آبائی وطن سے باہر نہ لے جانے کی شرط، یا شوہر کے دوسری شادی نہ کرنے کی شرط، اس کی فی الحال کیا ضمانت ہے اور نہ کوئی یقینی علم ہے، اس لئے مہر کی دو مقدار میں سے اقل ترین مقدار (مثلاً ایک ہزار روپیہ) پر تو بہر حال فریقین متفق ہیں، اور اس حد تک خاص جہالت نہیں ہے، البتہ زائد مقدار موقوف ہے شرط کی تکمیل پر، جس کا نہ علم ہے نہ ضمانت، اس لئے جہالت کی بناء پر فاضل مقدار کا جو تسمیہ کیا گیا ہے وہ باطل قرار پائے گا، اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر شرط کی تکمیل شوہر نہ کر سکے تو مہر مسمی کے بجائے اس کو مہر مثل دینا ہوگا، البتہ صاحبین کے نزدیک مہر کی دونوں مقداریں درست ہیں اور تکمیل شرط کی صورت میں ایک مقدار اور عدم تکمیل کی صورت میں دوسری مقدار واجب ہوگی (البنایہ ۲/۲۲۶، بدائع الصنائع ۲/۲۸۰)۔

استدلالی اعتبار سے تو امام صاحب ہی کا قول مضبوط معلوم ہوتا ہے، مگر موجودہ حالات میں سہولت یا مصلحت کی خاطر یا بالعموم اس جہالت کے مفضی الی النزاع نہ ہونے کی بناء پر صاحبین کے قول پر بھی عمل کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

## خلاصہ جوابات

(۱) ایسی شرائط جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی نئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ان کو پورا کرنا واجب ہوگا۔ (البحر الرائق ۳/۱۶۱، شامی ۲/۳۷۵)

(۲) نکاح کے وقت کسی فریق کا ایسی کوئی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، باطل ہے، البتہ نکاح درست رہے گا (عالمگیری ۱/۳۰۹، قاضی خاں ۱/۳۳۱)

(۳) نکاح کے وقت کسی فریق کا کوئی ایسی شرط عائد کرنا کہ اس کے نتیجے میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہیں ہوتا، اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی یا ذمہ داری عائد ہوتی ہے، جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہ ہوتی ہو اس طرح کی شرطیں لگانی تو نہیں چاہئے (بدائع الصنائع ۲/۲۸۵)، لیکن اگر لگادی جائیں تو درج ذیل شرائط پائے جانے کی صورت میں اس کی تکمیل کرنی ہوگی اور عدم تکمیل کی صورت میں عورت مہر مسمی کے بجائے مہر مثل پانے کی حقدار ہوگی:

(۱) شرط شرعی طور پر قابل انتفاع ہو۔

(۲) اس شرط سے عورت یا اس کے قریبی رشتہ دار کا نفع متعلق ہو، غیر متعلق شخص کا نہیں۔

(۳) نکاح کے وقت مہر شرعی مقرر کیا گیا ہو۔

(۴) عورت کا مہر مثل اس کے مہر مقررہ سے زیادہ ہو۔

(۵) امر مشروط محض عقد نکاح کی بناء پر لازم نہ آتا ہو، بلکہ شوہر کے جداگانہ عزم وعمل پر موقوف ہو۔

(۶) عورت کی طرف سے شوہر کے لئے کسی شئی کی واپسی مشروط نہ ہو (شامی ۲/ ۵۷۴، البحر الرائق ۳/ ۱۶۱)

(الف) اس کا جواب نمبر (۲) میں گزرا۔

(ب) اس کا جواب نمبر (۳) میں گزرا۔

(ج) شرط شرعاً معتبر ہے (عالمگیری ۱/ ۳۷۳) اور اگر شرط مؤبد طور پر لگائی گئی ہو تو شوہر کو عورت کا حق طلاق ختم کرنے کا اختیار نہ ہوگا (البنایہ ۴/ ۵۰۵، ۵۲۳)۔

نکاح میں شرط کی تین صورتیں ہیں:

(۱) عقد نکاح سے پہلے شرائط طے ہو جائیں اور اس کی تحریر پر طرفین کا دستخط ہو جائے۔

(۲) عقد نکاح میں ہی ان شرائط کا ذکر کیا جائے، ایجاب مشروط ہو یا ایجاب مطلق ہو اور قبول مشروط۔

(۳) عقد نکاح کے بعد مابین طرفین کوئی شرائط نامہ تحریر کیا جائے۔

شرائط کے سلسلہ میں اس قسم کی تفصیل مجھے حنفیہ کے یہاں نہیں ملی، البتہ شافعیہ اور حنابلہ کے یہاں بعض اشارات ملتے ہیں، مثلاً حنابلہ کے مسلک کے ذیل میں ''الفقہ علی المذاہب الاربعۃ'' میں ملتا ہے کہ:

ان شرائط کا بہر صورت اعتبار کیا جائے گا، خواہ صلب عقد میں ان پر اتفاق ہو یا عقد سے پہلے (۴/ ۸۸)، اسی طرح شافعیہ کے یہاں بعض شکلوں میں اس تعلق سے کچھ ذکر ملتا ہے، شافعیہ کے نزدیک شرائط کا اعتبار اس وقت ہے جبکہ بوقت عقد ان پر اتفاق ہوا ہو، عقد سے خارج خواہ پہلے ہو یا بعد میں طے ہونے والی شرائط کا ان کے نزدیک اعتبار نہیں (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۴/ ۸۹)۔

حنفیہ کے اصول کے مطابق اگر غور کیا جائے تو شرائط کا اثر نکاح پر تو بہر حال نہیں پڑتا اب محض اس کی تکمیل کی بات رہ جاتی ہے تو حدیث پاک: ''أحق ما أوفيتم من الشروط أن توفوا ما استحللتم به الفروج'' (بخاری شریف ۲/ ۷۷۴)

(پورا کرنے کے سب سے زیادہ لائق وہ شرطیں ہیں جن کے ذریعہ تم شرمگاہیں حلال کرتے ہو)۔

کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے تو ہر معاہدہ اگر جائز ہو اور قلب موضوع لازم نہ آتا ہو، تو واجب التکمیل ہے، لیکن وہ شرطیں جو بوقت نکاح طے کی جائیں، دوسرے معاہدات وشرائط کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور ان کو پورا کرنا بدرجہ اولی ضروری ہے، ورنہ انسان گنہگار ہوگا۔

نکاح کے وقت تفویض طلاق کی صورت میں قلب موضوع لازم آنے اور مصالح شرع کے ضائع ہونے کا اندیشہ بالیقین ہے، اسی لئے فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ اس کا آغاز مرد کی جانب سے ہونا جائز نہیں، اس کے علاوہ دوسری مزید احتیاطی قیدیں بھی بڑھائی جاسکتی ہیں، مثلاً عورت کو خیار طلاق مؤبد طور پر نہ دیا جائے، بلکہ وقت مقرر کے لئے دیا جائے یا یہ کہ بعض محدود شکلوں میں دیا جائے اور اگر شوہر چاہے تو اس خیار کو اپنی مشیت کے ساتھ مشروط بھی کر سکتا ہے، تا کہ عورت اس اختیار کا بیجا استعمال نہ کر سکے وغیرہ۔

دلائل کے لحاظ سے تو فقہاء کے نزدیک امام صاحب کا موقف ہی زیادہ مضبوط ہے، مگر حالات کی بناء پر اگر صاحبین کے مسلک پر فتوی دیا جائے تو اس کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

ملازمت شرعی ہو، اور عورت شرعی حدود میں رہ کر اس کو انجام دے سکتی ہو، تو شوہر کو اپنے معاہدے پر عمل کرنا ہوگا، لیکن اگر ملازمت شرعی نہ ہو، یا عورت شرعی حدود میں رہ کر اس کو انجام نہ دے سکتی ہو، تو یہ معاہدہ لغو ہے اس پر عمل کرنا واجب تو در کنار جائز بھی نہیں (البحر الرائق ۳/ ۱۶۰)۔

☆☆☆

# مشروط نکاح اور اس کے احکام

مفتی اقبال احمد کانپوری

## مشروط نکاح کا مصداق

شرائط نکاح کے ضمن میں یہ بات ذہن نشیں رہنی ضروری ہے کہ مشروط نکاح کا مصداق وہی نکاح ہوگا جس میں شرائط کا ذکر نفس عقد نکاح ہی میں شامل ہو، اگر قبل النکاح یا بعد النکاح شرائط طے کئے گئے تو وہ نکاح کے شرائط نہ ہوں گے، ان پر شرائط نکاح کا اطلاق مجازاً ہوگا، حقیقتاً وہ نکاح مشروط نہ ہوگا، بلکہ ان کے لئے وعدہ اور عہد کا لفظ زیادہ موزوں ہوگا، اس لئے نکاح میں اگر کوئی ایسی شرط عائد کی جائے جس کی خلاف ورزی سے عورت فسخ چاہتی ہو تو اس کی صراحت نکاح کے وقت ہی عورت کی طرف سے ہونی ضروری ہے، پھر مرد کا اس کو قبول کے وقت منظور کرنا بھی ضروری ہے اور اگر نکاح کے وقت شرائط نہ ذکر ہوں، بلکہ قبل النکاح شرائط طے کئے جائیں تو ان شرائط میں نکاح کی طرف نسبت ہونی ضروری ہے، یعنی اس طرح طے کرلینا کہ اگر ہمارا نکاح اس سے ہو تو بعد نکاح مرد پر یہ لازم یا بعد نکاح عورت کو یہ اختیار ہوگا وغیرہ وغیرہ، اگر قبل النکاح شرائط میں نسبت الی النکاح نہ ہوئی تو وہ شرائط لغو ہوں گی، عورت کو حق فسخ حاصل نہ ہوگا، البتہ بعد النکاح شرائط معتبر ہوں گے۔

## عورت کی ملازمت کی شرط

نکاح میں ذکر کردہ شرط کی اقسام اور ان کی نوعیت واضح ہونے کے بعد عورت کی ملازمت کی شرط کا حکم بھی خود بخود واضح ہو جاتا ہے، شریعت نے عورت پر من حیث المسلم جو شرعی پابندیاں، پردہ وغیرہ کے قبیل کی عائد کی ہیں وہ باہر کی ملازمت کی صورت میں عموماً نہیں ہوسکتیں، نیز عورت پر من حیث الزوجۃ جو حقوق ہیں وہ بھی ملازمت کی صورت میں عموماً بری طرح پامال ہو جاتے ہیں، مثلاً علامہ کاسانی وغیرہ نے جو نکاح کا حکم بیان کیا اس کی روشنی میں یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ ملازمت کی شرط اصل نکاح کے تقاضہ کے خلاف ہے، لہذا یہ شرط فاسد کی طرح ہے، اگر عورت یہ شرط لگائے تو مرد اس کا پابند نہ ہوگا اور یہ شرط لغو قرار پائے گی اور نکاح بدستور باقی رہے گا، البتہ ملازمت اگر ایسی ہو کہ مقاصد نکاح میں واقعی خلل نہ ہو تو ملازمت کی یہ شرط جواز کے دائرہ میں آئے گی اور شوہر کے لئے واجب العمل ہوگی۔ (بدائع الصنائع ۲/۳۳۱)

## نکاح میں تفویض طلاق کی شرط

اصولی طور پر طلاق کا اختیار شریعت نے مرد کے حوالہ کیا ہے، اس لئے کہ عورت کی نرم طبیعت، جلد متاثر ہو جانے والا مزاج اور زود رنجی و عاجلانہ اقدام والے ذہن کی بنا پر عورت کو اگر اختیار ہوتا تو طلاق آئے دن کا کھلونا اور نکاح بازیچۂ اطفال بن جاتا، نیز نکاح کے مقاصد میں خلل واقع ہوتا اور معاشرتی زندگی جس میں ذمہ دار کی حیثیت مرد کو حاصل تھی وہ غلام بن کر رہ جاتا، ان سب امور کے پیش نظر طلاق کا اختیار اصلاً مرد کے ہاتھ دیدیا گیا ہے، اور عورت کو صرف خلع اور ظلم کے مواقع میں قانونی چارہ جوئی کا حق دیا گیا ہے۔

لیکن اگر مرد مصالح کی بنیاد پر اس حق طلاق کا اختیار عورت کے حوالہ کردے تو اس کی بھی اجازت ہے، اسی طرح اگر عورت نکاح اس شرط پر کرے کہ مرد طلاق کا حق اس کے سپرد کردے تو مرد کی اجازت کے بعد عورت بھی طلاق کی مالک بن سکتی ہے، جب مرد طلاق کا اختیار عورت کے سپرد کردے تو اب مرد طلاق کا مالک نہیں رہ جاتا ہے، مرد طلاق کا اختیار زبانی طور پر بھی عورت کو دے سکتا ہے اور تحریری شکل میں ہونا بہتر ہے جیسا کہ شادی کے موقعہ پر قبول نامہ مرتب کر کے شوہر سے اس پر دستخط کرائے جاتے ہیں، طلاق کا اختیار اگر شوہر متعین مدت تک کے لئے دے تو عورت اس متعینہ مدت کی پابند ہوگی، متعینہ مدت گزر جانے کے بعد اختیار ساقط ہو جائے گا، اسی طرح اگر کسی خاص حالت و موقع کے لئے اختیار سپرد کیا ہے تو اس موقعہ ہی تک اختیار محدود رہے گا۔

"درمختار" میں ہے کہ: عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ طلاق کا معاملہ عورت کے حوالہ ہے تو صحیح ہے۔

اسی طرح ''فتاوی ہندیہ'' میں ہے:

اور شوہر کو اس دئے ہوئے اختیار سے رجوع کا حق نہیں ہے اور نہ اس اختیار کے استعمال سے وہ عورت کو روک سکتا ہے۔

البتہ خیار موقت مثلاً ایک مہینہ تک کا اختیار، تو مہینہ اور موقت مدت تک باطل نہ ہوگا۔ (شامی ۲/ ۶۵۴)

جیسا کہ ذکر کیا گیا بعد تفویض رجوع کا حق مرد کو نہیں ہے، لیکن اگر مرد طلاق کا حق پھر اپنے ہاتھ لینا چاہے تو اسکی شکل فقہاء نے یہ لکھی ہے کہ عورت کو منائے اگر وہ اپنے اختیار سے دستبردار ہو کر پھر اس کو مالک بنادے تو مرد دوبارہ مالک بن جائے گا، اسی طرح اگر مرد عورت کو کچھ مال وغیرہ دے کر یہ حق دوبارہ حاصل کرلے تو بھی حق طلاق واپس آجائے گا، لیکن اس کے لئے عورت کو مال دینا رشوت کے حکم میں ہے جس کا گناہ بھی ہوگا، اسی لئے مال دینا واجب نہیں ہے تاکہ رشوت نہ لازم آئے۔ (البحر الرائق ۳/ ۳۱۱)

اگر کسی ضرورت کی بنا پر مرد سے تفویض طلاق یا توکیل طلاق ناگزیر ہو اور بعد نکاح زبردستی تفویض طلاق یا توکیل طلاق کا اختیار لیا گیا تو بھی عورت کو اختیار حاصل ہوجائے گا، اگرچہ شوہر کی رضا نہیں ہے کیونکہ طلاق بغیر رضامندی کے بھی واقع ہوجاتی ہے۔ (البحر الرائق ۸/ ۷۵)

تفویض طلاق سے متعلق مسائل کا احاطہ نہ مقصود ہے نہ یہاں اس کی گنجائش ہے، البتہ زیر بحث مسئلہ میں تفویض کی ان صورتوں پر شرائط کی تفصیل ضروری ہے جو تفویض قبل النکاح یا بوقت نکاح یا بعد نکاح مرد کی طرف سے عورت کے لئے ہوں۔

## تفویض قبل النکاح

عقد نکاح سے پہلے ہی اگر مرد طلاق کا اختیار زبانی یا تحریری عورت کے سپرد کردے، یا نکاح سے قبل اس طرح کے شرائط طے ہوجائیں کہ جس میں عورت کو طلاق کا مالک بنا دیا گیا ہو اور اس میں فریقین زبانی طور پر متفق ہوں یا تحریری دستخط ہوجائیں تو یہ شکل اسی وقت درست ہوگی کہ ان شرائط میں نکاح کی طرف اضافت و نسبت ہو، اگر اس میں اضافت الی النکاح نہ ہوئی تو یہ اقرار نامہ یا معاہدہ محض بے کار ہوگا اور عورت کو کوئی اختیار حاصل نہ ہوگا، اضافت الی النکاح کی یہ صورت ہوگی کہ ''اگر میں تجھ سے نکاح کروں تو بعد نکاح طلاق کا اختیار تمہیں کو ہوگا'' یا ''جب میرا تم سے نکاح ہوجائے تو بعد نکاح اگر میں ان شرائط کی خلاف ورزی کروں تو تم کو طلاق اپنے اوپر واقع کرنے کا اختیار ہوگا'' اس طرح کی قید معاہدہ یا شرائط نامہ میں ہونا ضروری ہے۔ (درمختار)

## تفویض بوقت نکاح

اگر عین ایجاب وقبول میں ان شرائط کا ذکر کیا جائے جس کے نتیجہ میں عورت کو تفویض طلاق حاصل ہو تو اس صورت میں خواہ ایجاب مشروط ہو یا ایجاب مطلق اور قبول مشروط ہو، یہ تفویض واختیار کی شکل جب ہی درست ہوگی، جبکہ ان شرائط وتفویض کے مطالبہ کی ابتداء عورت کی جانب سے ہو جس میں وہ شرائط تفویض کا ذکر کرے اور قبول مرد کی جانب سے ہو، اگر اس کے برعکس ہوا تو درست نہیں کیونکہ مرد کی جانب سے تفویض ہوئی تو وہ قبل نکاح ہوجائے گی جو صحیح نہیں۔ (درمختار مع ردالمحتار ۲/ ۵۲۶، نیز فتاوی ہندیہ ۳۲۹)

البتہ اگر مرد کی جانب سے ایجاب اس طرح ہو کہ ''میں نے تجھ سے نکاح اس شرط کے ساتھ کیا کہ تجھ سے نکاح کے بعد تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہوگا، تو درست ہے۔ (فتاوی ہندیہ ۲/ ۳۹۶، فتاوی خانیہ/ ۳۳۰)

## احتیاطی تدبیر

تفویض طلاق کے مسئلہ میں ایک احتیاطی تدبیر یہ کرنی چاہئے کہ چونکہ عورت کے اندر قوت فیصلہ کمزور ہوتی ہے اور زود رنجی جیسی صفات غالب، اس لئے قوی اندیشہ ہے کہ تفویض طلاق کا اختیار حاصل ہونے سے شوہر کو تابع بنا کر رکھ دے یا اس کا بے موقعہ اور بلاوجہ استعمال کر بیٹھے، اس لئے اس کا انسداد اس طور پر کردینا چاہئے کہ شرائط تفویض میں، تفویض طلاق کا اختیار خاص حالات پیش آنے پر موقوف کردیا جائے اور خاص حالات پیش آگئے ہیں یا نہیں اس کا فیصلہ چند معتبر اشخاص کے سپرد کردیا جائے کہ جب یہ معزز اشخاص گواہی دیدیں کہ شوہر کی طرف سے ایسی صورت حال پیش آگئی ہے جس کے لئے عورت نے طلاق کا اختیار طلب کیا تھا تو اب عورت کو ایسے حالات میں طلاق کے اختیار کے استعمال کا حق ہوگا کہ وہ فوراً فیصلہ کرے ورنہ حق طلاق ختم ہوجاتا ہے، اس طرح کی قیدوں سے ازدواجی زندگی قائم ودائم رہ سکتی ہے۔

## تعلیق وتردید کے ساتھ مہر کی تعیین

اگر نکاح کے وقت مہر کی دو مقداریں ذکر کی جائیں ایک کم اور ایک زیادہ اور کوئی شرط بیان کی جائے کہ اگر یہ شرط پائی جائے گی تو زیادہ مقدار دی جائے گی، ورنہ کم مقدار، تو ایسی حالت میں نکاح تو بہر حال درست ہو جائیگا، البتہ مہر کی مقدار میں اختلاف ہے، صاحبین کے نزدیک مطلقا پہلی شرط کے پورے ہونے پر پہلی مقدار لازم ہوگی اور دوسری شرط پائے جانے پر دوسرا مہر مسمی لازم ہوگا۔

لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس مسئلہ میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ مہر کی کمی بیشی کے لئے جو شرط لگائی گئی ہے وہ اگر بدیہی ہے، یعنی اس میں جہالت واختلاف نہ ہو کہ شرط کا وقوع ہو رہا ہے یا نہیں، بلکہ ہر شخص دیکھتے ہی معلوم کرلے کہ شرط پائی جائے گی تو طے شدہ مہر کی زائد مقدار واجب ہوگی ورنہ کم مقدار واجب ہوگی، اس کی مشہور مثال یہ ہے کہ کوئی مرد کسی عورت سے نکاح کرے اور مہر اس طور پر طے کرے کہ اگر تو حسین ہے تو دو ہزار روپیہ مہر دوں گا ورنہ ایک ہزار، یا یہ کہ اگر تو جوان ہے تو دو ہزار ورنہ ایک ہزار، تو اس صورت میں اگر وہ حسین ہوگی یا جوان ہوگی تو دو ہزار اس کو ملے گا ورنہ ایک ہزار، کیوں کہ حسین ہونا یا نہ ہونا یا جوان ہونا ہر شخص دیکھ کر معلوم کرسکتا ہے۔

اس کے برخلاف اگر مہر کی مقدار میں تحدید کسی ایسی شرط کے ساتھ کی ہے جو شرط بدیہی نہیں تھی اور اس میں امکان ہے کہ واقع بھی ہوسکتی ہے نہیں بھی، تو ایسی صورت میں پہلی شرط کے بموجب مہر مسمی واجب ہوگا ورنہ مہر مثل، بشرطیکہ مہر مثل اس مقدار سے کم نہ ہو اور اس مہر مسمی سے زائد نہ ہو، مثلاً کسی مرد نے کسی عورت سے اس طرح نکاح کیا کہ اگر تو اپنے میکہ میں رہے گی تو ایک ہزار روپیہ مہر دوں گا اور میرے ساتھ رہے گی تو دو ہزار روپیہ، یا یہ شرط کہ اگر تو باکرہ ہے تو دو ہزار مہر اور باکرہ نہ ہو تو ایک ہزار، تو اس صورت میں اگر شرط پائی جائے، یعنی وہ عورت اپنے شوہر کے ساتھ رہے یا باکرہ ہو، تو دو ہزار مہر اس کو ملے گا، ورنہ مہر مثل ملے گا، دو ہزار سے زائد نہیں ملے گا۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس تفریق کی ایک مصلحت یہ ہے کہ شرط جب بدیہی ہوگی تو اس میں کسی طرح کا جھگڑا نہیں ہوسکتا، بخلاف اس کے اگر شرط بدیہی نہ ہو تو ہمہ دم شرط میں اختلاف کی گنجائش ہے۔

مذکورہ تفصیل سے خود واضح ہے کہ طلاق نہ دینے پر ایک مہر اور طلاق دینے پر دوسرے مہر کی مقدار کا تعلق غیر بدیہی شرطوں کی طرح ہے، لہذا امام ابوحنیفہ کے نزدیک طلاق کی صورت میں مہر مثل ہی لازم ہوگا جو مہر مسمی سے زائد نہ ہوگا، اور (پہلے) مہر مسمی سے کم نہ ہوگا، صاحبین کے نزدیک دونوں مقداریں درست ہیں، مہر مثل کسی صورت میں نہیں ہوگا۔

سوالنامہ میں کثرت طلاق پر بند باندھنے کے لئے صاحبین کے قول کے اختیار کرنے کا جو مشورہ دیا گیا ظاہر ہے کہ مفتیان کرام کے لئے اس میں گنجائش بہر حال ہے، خروج عن المذہب کسی میں نہیں ہے، لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی ضروری ہے کہ مہر کی زیادتی کا مانع طلاق ہونا غیر یقینی امر ہے، عام لوگ مہر کی کمی وبیشی کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے یا پہلے ہی معاف کرالیتے ہیں پھر طلاق دیتے ہیں، اس کے علاوہ بعض صورتوں میں مرد کے لئے طلاق دینا ہی ناگزیر ہوتا ہے اور اس موقع پر مرد کو حق طلاق سے روکنا لازم آئے گا، کہ وہ مہر کی زیادتی سے تلخ زندگی برداشت کرے گا اور طلاق نہ دے سکے گا، مہر میں تقلیل مطلوب ہے مہر کی زیادتی کا رواج دینا تغییر مشروع ہے لہذا طلاق کے رواج کو کم کرنے کی مذکورہ تدبیر قباحت اور مفاسد سے خالی نہیں۔

☆☆☆

# عقد نکاح میں شرائط عائد کرنے کا حکم

مولانا اخلاق الرحمن

نکاح نام ہے مرد وعورت کے باہم ازدواجی زندگی گزارنے پر راضی ہو جانے کا، اس لئے کچھ ایسی شرطوں کے ذکر کر دینے کی ضرورت پڑی جس سے باہمی نزاع کو بآسانی سلجھایا جاسکے، اور وہ شدت کی صورت اختیار نہ کرے۔

پھر واضح رہے کہ ان دونوں کی ان شرائط کا اعتبار کیا جائے گا، جو نصوص کے مخالف اور معارض نہ ہوں، لہذا وہ شرطیں جو نصوص کے معارض ہوں ان کو مسترد کر دیا جائے گا، یا نصوص میں تو نہیں پایا جاتا ہے، لیکن عرف میں ایسی شرطوں کا اعتبار کیا جاتا ہو تو عرف کا اعتبار کیا جائیگا لیکن یہ عرف بھی کسی نص کے معارض نہ ہو، اب ہم ذیل میں میاں بیوی کے درمیان شرائط کے صحیح ہونے نہ ہونے کا ذکر کرتے ہیں:

ج:۱...... فریقین میں سے کسی نے اگر ایسی شرائط کا ذکر کیا جس کا تحقق عقد نکاح ہی سے ہو جاتا ہے تو اس قسم کے شرائط غیر معتبر سمجھے جائیں گے اور اس شرط سے عقد نکاح پر کوئی اثر نہ ہوگا، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا، فضول اور غیر معتبر ہے، کیونکہ یہ تو عقد نکاح کے بعد از خود ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ مشہور قاعدہ ہے: "الشئی إذا ثبت ثبت بلوازمہ" لہذ اجتنی بھی ضروریات ہیں، یعنی نان ونفقہ، کسوی، سکنی وغیرہ یہ سب شوہر کے ذمہ ثابت ہوں گے۔

۲...... نکاح کے وقت کسی فریق کا ایسی کوئی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، مثلاً شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان نفقہ اس کے ذمہ نہ ہوگا، کسی بھی حال میں درست نہ ہوگا، بلکہ بہر صورت نفقہ لازم اور ضروری ہو، جیسا کہ تفصیلی بات مع دلائل شرعیہ گزر چکی ہے۔

۳...... نکاح نہ عبادت ہے اور نہ بالکل معاملات سے ہے بلکہ من وجہ عبادت ہے کہ نکاح کو نصف ایمان کہا گیا ہے، نکاح سے عفت وعصمت اور پاکدامنی کا جوہر پیدا ہوتا ہے، وغیر ذلک، اور من وجہ معاملات ہے کہ جس طرح بائع اور مشتری یعنی خریدنے والوں میں اور فروخت کرنے والوں میں بائع کے لئے بیع کی تعیین اور مشتری کے لئے ثمن کی تعیین ضروری ہے ورنہ نزاع باہمی کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اور جس طرح بائع نفس ثمن پر قابض ہو سکتا ہے اور مشتری نفس بیع پر کیونکہ عوض اسی کے بقدر جانبین سے پیش کیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح مرد وزن میں جو عقد نکاح عمل میں آتا ہے تو عورت صرف اپنا مال یعنی ملک بضعہ کا شوہر کو مالک بنا دیتی ہے اور قاعدہ مشہور ہے کہ غیر کی ملکیت میں تصرف کا حق اسی وقت ہوتا ہے جب کہ اس کا بدلہ چکا دے، اب یہ مہر خالص اسی وقت ہوتا ہے جب کہ اس کا بدلہ چکا دے لہذا اس کے لئے شوہر کے ذمہ اللہ نے مہر مقرر فرما دیا، اب یہ مہر خالص عورت کا حق ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے: "قد علمنا ما فرضنا علیہم فی ازواجہم" اور انسان کو اپنے حق کے بارے میں شرعی حدود میں رہ کر شرائط وغیرہ لگانے کا شریعت نے اختیار دیا جس سے ضرر ونقصان وغیرہ سے اپنے کو بچا سکے، جیسا کہ عقد بیع میں "خیار رویت"، "خیار شرط"، "خیار فسخ" وغیرہ کی شرط لگانا ہر دو فریق کے لئے جائز ہے، تاکہ نقصان نہ ہو کیونکہ حدیث شریف میں ہے "لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام" اور نکاح بھی چونکہ من وجہ معاملات میں سے ہے، لہذا اس میں زوجین کو مہر کی مقدار کا تعین کرکے اور کم وبیش کی صورت کی شرط لگا کر اپنے حساب سے اور اپنے فائدہ کو سامنے رکھتے ہوئے دونوں فریق شرط لگا سکتے ہیں، اور ان شرطوں کے ساتھ نکاح کر سکتے ہیں، اور ایفاء شرط ممکن حد تک ضروری ہے، گویا مہر وغیرہ کے تعیین میں شرط لگائی جاسکتی ہے، حدیث شریف میں ہے:

"عن عقبۃ بن عامر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احق الشروط ان توفوا بہ ما استحللتم بہ الفروج" متفق علیہ (مشکوۃ شریف ۲-۲۷۱ باب اعلان النکاح) قابل ایفاء شرطوں میں سب سے زیادہ ایفاء کی مستحق وہ شرط ہے جس کے ذریعہ تم نے بضع کو حلال کیا ہے (یعنی نکاح کی شرط)۔

صاحب لمعات شارح مشکوۃ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

"احق الشروط" سے مراد ہے مہر اور ایک قول یہ بھی ہے احق الشروط سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جس کو شوہر عورت کو خوش کرنے کے لئے بطور شرط کے ذکر

کرتا ہے، اس طور پر کہ حدود شرعی سے باہر نہ ہو، اسی طرح اس بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد تمام وہ چیزیں ہیں جس کی عورت زوجیت اور بیوی بننے کے نتیجے میں مستحق ہوسکتی ہے، گویا یہ شرط کے درجہ میں ہے۔

علامہ موصوف کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ عورت اپنی ذاتی حق مہر میں اپنے منفعت کو بحال رکھنے کے لئے مہر کی تعیین میں جائز شرطیں حدود شرعیہ میں رہ کر لگا سکتی ہے۔

لیکن عدم ایفاء شروط کی صورت میں نکاح اثر انداز نہ ہوگا، لیکن مہر شروط فوت ہوجائے اور مہر مثل لازم ہوگا اور نکاح پر اثر انداز اس لئے نہیں ہوگا کہ اگر نکاح میں مہر کا تذکرہ نہ بھی ہوا ہو یا نکاح سے قبل ہی عورت نے کہا "مہر کی کیا ضرورت ہے"؟ ہر صورت میں نکاح ہوجائے گا گو عدم تسمیہ کی صورت میں مہر مثل کا صرفہ برداشت کرنا پڑے گا، دیکھئے (ہدایہ ۲/ ۳۲۹، باب المہر)

لہٰذا عقد نکاح کے وقت اگر عورت یہ شرط لگائے کہ اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، یا فلاں فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، مثلاً شوہر کسی دور کی ریاست کا ملازم ہے اور سال میں چند دفعہ آنا دشوار ہو، عورت کی جانب سے یہ شرط ہے کہ ہر سہ ماہ یا چار ماہ کے بعد آنا پڑے گا، ورنہ میں تیرے ہاتھ سے چلی جاؤں گی، یعنی اس صورت میں مجھے طلاق واقع کر لینے کا اختیار ہوگا، اور شوہر اس قید و شرط کو قبول اور تسلیم کر لیتا ہے تو عدم ایفاء کی صورت میں عورت کو طلاق واقع کر لینے کا پورا پورا حق ہوگا، کیونکہ اس نے اپنے حق کو بحال رکھنے کے لئے یہ شرط لگائی ہے، جو شرعی حدود میں رہ کر فطری تقاضے کے مطابق ہے جس کے لئے نکاح مشروع ہوا۔

مذکورہ بیان سے معلوم ہوا کہ شرعی حدود میں رہ کر اگر عورت شرط و قید لگاتی ہے تو شوہر کی جانب سے اس کے تسلیم اور قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں، جب حرج نہیں تو عورت کو اختیار ہے کہ طلاق واقع کرلے، لہٰذا اگر غیر شرعی طور پر شرط لگاتی ہے، مثلاً ان دنوں وہ عورتیں جو امریکہ اور یورپ کے ماحول سے متاثر ہیں ان کے لئے ٹیلی ویژن، بلو فلم، کھلے عام بے پردگی کے ساتھ شہروں کا طواف کرنا عزت کی چیزیں سمجھی جاتی ہیں، تو ایسی عورتیں بوقت نکاح شوہر سے یہ شرط لگاتی ہیں کہ ان چیزوں کی فراہمی بھی تمہارے ذمہ لازم ہے، ورنہ میں تم سے دور ہوجاؤں گی اور شوہر بھی اپنے کو باعزت لوگوں میں شمار کرنے کے لئے ہاں میں ہاں بھر دیتا ہے تو ایسی صورتوں میں یہ تسلیم ہی شرعاً درست نہیں ہے، لہٰذا اختیار طلاق عورت کو نہیں ہوسکتا ہے، لہٰذا عدم ایفاء کی صورت میں اگر خود عورت طلاق واقع کر لیتی ہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔

اس لئے کہ یہ شرط ناجائز چیزوں کی ہے۔ غرض کہ عورت نے اگر خلاف شرع شرط لگائی ہے تو اس کو مسترد کر دیا جائے گا۔

## نکاح میں شرط کی تین صورتیں اور حکم

۱۔ عقد نکاح سے پہلے شرائط طے ہوجائیں اور اس کی تحریر پر دستخط طرفین کے ہوجائیں۔

۲۔ عقد نکاح ہی میں ان شرائط کا ذکر کیا جائے، ایجاب مشروط ہو یا ایجاب مطلق ہو اور قبول مشروط ہو۔

۳۔ عقد نکاح کے بعد مابین طرفین کوئی شرائط نامہ تحریر کیا جائے۔

مذکورہ تین صورتوں کا حکم ذیل میں بالترتیب ملاحظہ ہو:

واضح رہے کہ شق اول اور پہلی صورت میں فریقین کی جانب سے جو شرائط وغیرہ طے ہوجانے کا بیان ہے اور تحریر پر طرفین کے دستخط ہوجانے کا ذکر کیا گیا ہے سو یہ "تعلیق" ہے "تفویض" نہیں، لہٰذا نکاح کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے اور تعلیق تب ہوگا جب تعلیق کے طریقہ کو اختیار کرے۔

"فتاوی دار العلوم" میں ہے: نکاح سے پہلے تفویض طلاق نہیں ہوسکتی، لیکن اگر متعلقین اضافت کریں اس طرح کہ جب تجھ سے نکاح کروں تو تجھ کو اختیار طلاق لینے کا ہے یا یوں کہے کہ عقد نکاح کے بعد اختیار طلاق لینے کا ہے، تو اس طرح تفویض صحیح ہے۔ (۱/ ۳۷)

شق ثانی اور شق ثالث کا حکم یہ ہے کہ اگر شرائط بمطابق شرع طے ہوئے ہیں تو اس کے مطابق عورت کے حق تفویض کا اعتبار کیا جائے گا دو باتوں کے ساتھ کہ شوہر نے عدم ایفاء شروط کا ارتکاب کیا ہو اور ساتھ ہی قبول مشروط ہو ورنہ نہیں۔ (ہدایہ ۲/ ۳۷۸)

## کم وبیش مہر کی شرط

موجودہ حالات میں حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کا قول راجح معلوم ہوتا کہ "اگر نکاح کے وقت اس طرح مہر طے ہو کہ شوہر بیوی کو اس کے آبائی وطن سے باہر نہیں لے گیا تو مہر ایک ہزار ہوگا، اور بیوی کو اس کے آبائی وطن سے باہر لے گیا تو اس کا مہر دو ہزار ہوگا"۔ (حاشیہ ہدایہ باب المہر ۲ / ۳۲۹)

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ بالفرض حضرات فقہاء مسائل مذکورہ کو نہ بھی بیان کرتے تو موجودہ زمانہ میں طلاق کے نتیجے میں جو خرافات پائے جارہے ہیں، ان کے سد باب کے لئے ذیل کے اصول سے کام لیا جاسکتا تھا اور اس اصول سے بھی انہیں مذکورہ مسائل میں خوب رہنمائی ملتی ہے، وہ اصول یہ ہے: الأمر إذا ضاق اتسع۔

ج ۲۔ سوال نمبر دو کا جواب یہ ہے کہ شریعت کے نزدیک دونوں شرطیں معتبر اور لازم ہوں گی، یعنی اگر نکاح کے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقد میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو پھر اس عورت (منکوحہ) کا مہر تیس ہزار ہوگا، اور اگر اس کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر پندرہ ہزار ہوگا تو ایسی صورت میں شریعت کے نزدیک دونوں شرطیں لازم ہوں گی۔

حاشیہ ہدایہ میں ہے:

"کیونکہ ہر دو شرطوں کی ایک غرض ہے اور پھر یہ کہ شرط کے عوض میں بدل ہے، اس اعتبار سے ہر شرط پر عمل واجب ہے تاکہ مقصود ومطلوب ثابت ہو جائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مسلمان اپنی شرطوں کے مطابق عمل کرے"۔ (۲ / ۳۲۹)

دوسری وجہ یہ ہے کہ عورت کے لئے اپنا وطن چھوڑنا اور سفر میں جانا اتنا گراں نہیں گزرتا جتنا کہ عورت کے لئے شوہر کا دوسرا نکاح کرنا اور سوتن سے گھر بسانا گراں گزرتا ہے، تو جب عورتوں کا سفر وغیرہ میں جانے نہ جانے، وطن چھوڑنے کے بارے میں مہر میں کم وبیش کی شرط لگانا جائز ہوا تو مذکورہ صورت اس سے کہیں زیادہ عورت کے خیال میں اہم ہے، اور ایک حکم جب ادنی کے لئے ثابت ہوتا ہے تو اعلی کے لئے بدرجہ اولی ثابت ہوگا۔

۳۔ وہ تمام شرطیں جو شرعی قانون سے روگردانی کی دعوت دیتی ہوں، ایسی شرطوں کی عند الشرع کوئی قبولیت نہیں ہوتی، لہذا الغو شمار کی جائیں گی۔

البتہ اگر عورتیں اور لڑکیاں ایسی یونیورسٹی سے متعلق ملازمت سے وابستہ ہیں جہاں خالص عورتیں ہی کام کرتی ہیں یا مرد بھی کام کرتے ہوں لیکن عورتوں کا اختلاط ان سے نہ ہوتا ہو، اور یونیورسٹی یا کلبوں کا قانون بھی اس اختلاط سے پرہیز کرنے کی ہدایت دیتا ہو، اسی طرح عورت کے ناشزہ بننے کا خطرہ نہ ہو، جس سے نسب وشرافت پر داغ پڑے اور عورت بھی بڑی محتاط انداز سے ملازمت کی ذمہ داری ادا کرتی ہے تو ایسی صورتوں میں شرط قبول کر لینے کے بعد شوہر کو روکنے کا حق حاصل نہ ہوگا، لیکن تعمیل حکم زوج بہتر ہے۔

☆☆☆

# نکاح میں مباح شرائط فقہ کی روشنی میں

مولانا عبدالرشید قاسمی جونپوری

عقد نکاح میں کوئی ایسی شرط لگانا جس کے عقد نکاح سے واجب ہونے والی کسی ذمہ داری سے فرار مقصود ہو، تو اس سلسلہ میں علامہ شامی فرماتے ہیں کہ شروط فاسدہ سے عقد نکاح باطل نہیں ہوتا، بلکہ شرط خود فاسد ہوجاتی ہے، یعنی اگر عقد نکاح کیا شروط فاسدہ کے ساتھ تو نکاح نہیں باطل ہوگا، بلکہ شرط باطل ہوجائے گی۔ (ردالمحتار ۲/ ۲۹۵)

جس شرط سے عقد نکاح کے ذریعے پائی جانے والی ذمہ داری سے گریز ہو تو اس سلسلہ میں امام ابن عابدین شامی فرماتے ہیں کہ جب شوہر نے کہا کہ میں شادی کرتا ہوں اس شرط پر کہ تمہارے لئے مہر نہیں ہوگا، تو نکاح درست ہوجائے گا اور شرط فاسد ہوجائے گی اور مہر مثل واجب ہوگا۔ (ردالمحتار ۲/ ۲۹۵، ۳۵۰)

الف: دوسری قسم کی شرائط سے نکاح پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا ہے اور نکاح صحیح ہوجاتا ہے اور شرائط خواہ ہزار ہوں، سب باطل ہوجاتی ہیں...... متعلقہ فریقین میں سے کسی کے لئے ضروری نہیں کہ ان کی پابندی کرے، بلکہ اجتناب ضروری ہے۔

ب: تیسری قسم کی شرائط لازم الایفاء نہیں، ان سے عقد نکاح کی صحت پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا ہے، یعنی اگر شرط عدم مسافرت یا عدم تزوج کی ہو تو فاسد ہے، اس لئے کہ اس میں امر شرعی سے تعارض ہے۔

شروط فاسدہ سے نکاح باطل نہیں ہوتا ہے، فقہائے کرام نے اس کی صراحت کی ہے (ردالمحتار ۲/ ۲۵۳، بدائع الصنائع ۲/ ۲۷۷، فتاوی ہندیہ ۱/ ۲۷۳)

تیسری قسم کی شرائط کا شرعاً حکم یہ ہے کہ شرطیں بالکل لازم الایفاء نہیں، ان سے عقد کی صحت پر کوئی اثر نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں امر شرعی سے صریح تصادم ہوتا ہے اور اس کے اندر شرائط کے ساتھ ایک قسم کا وعدہ ہے اور ہر ایسے وعدہ کا پورا کرنا یا کرانا جس میں امر شرعی سے تعارض ہو، بالکل جائز نہیں ہے۔

## تفویض طلاق

اگر عورت بذات خود طلاق کے واقع کرنے میں مختار ہونے کی شرط لگائے اور شوہر اس کو تسلیم بھی کرلے تو اس کو تفویض کہتے ہیں اور تفویض طلاق کے بعد شوہر کو عورت کے اختیار کو ختم کرنے کا حق بالکل حاصل نہیں رہتا، بلکہ عورت خود مختار ہوچکی ہوتی ہے، اس کے اختیار کو کسی طرح ختم نہیں کیا جاسکتا۔ (مجمع الانہر ۲/ ۴۰۷)

تفویض کے سلسلہ میں پوری وضاحت مندرجہ ذیل ہے، یعنی شرائط سے خیار طلاق کی تین شکلیں ہوتی ہیں۔

(۱) اقرار نامہ عقد نکاح سے پہلے لکھا جائے، اس کے معتبر اور مفید ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں عقد نکاح کی طرف اضافت اور نسبت موجود ہو۔ (دیکھئے: ردالمحتار ۲/ ۴۹۴، عالمگیری ۶/ ۲۶۱)

(۲) اس میں شرط یہ ہے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو، ورنہ شرط لغو قرار پائے گی۔ (الحیلۃ الناجزۃ/ ۳۱)

(۳-۴) نکاح کے بعد کوئی اقرار نامہ اس قسم کا لکھوایا جائے، یہ شکل بھی صحیح اور درست ہے۔ (الحیلۃ الناجزۃ/ ۳۳)

اس تیسری شکل کے بارے میں چند باتیں عرض ہیں:

۱- یہ شکل ایسی عورت کے لئے مفید ہے جس کے عقد نکاح میں اقرار نامہ نہیں لکھوایا گیا تھا۔ (الحیلۃ الناجزۃ/ ۳۳)

۲- جو عورت نکاح کے وقت احتیاط کی طالب ہے، اس کے لئے بھی وہی کمی ہے جو ماقبل میں بیان کی (ایضاً)۔

۳۔ جب عقد نکاح مکمل ہو چکا تو عورت یا اس کے ولی وغیرہ کے اختیار میں یہ بات نہ رہی کہ شوہر کو اقرار نامہ کے لکھنے پر مجبور کرے بلکہ صرف اس کی مرضی پر معاملہ رہ جاتا ہے۔

## تفویض کے لئے قیدیں بڑھانا درست ہے

عورت چونکہ ناقص العقل ہوتی ہے، اس لئے طلاق جیسے اہم مسئلہ کو اس کے سپرد کردینا خطرہ سے خالی نہیں ہے، لہٰذا تفویض کے وقت کچھ ایسی شرطیں جو مناسب ہوں لگانا درست ہے جس میں کوئی خطرہ نہ رہے، جیسے یہ کہ نکاح کے وقت عورت کی طرف سے وہ یا اس کا ولی یا وکیل اس طرح کہے کہ میں نے اپنے آپ کو تمہارے عقد میں بعوض مہر...... روپئے...... سکہ رائج الوقت کے اس شرط پر دے دیا کہ جب کبھی بھی اس کو تمہاری جانب سے کوئی سخت تکلیف پہنچے جس کو فلاں فلاں اشخاص میں سے کم از کم دو آدمی تسلیم کرلیں تو اس کے بعد ہر وقت معاملہ میرے یا اس کے اختیار میں ہوگا کہ اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر اس نکاح سے جدا کرلے اس شکل میں عورت کو طلاق کا اختیار اسی وقت ملے گا جبکہ کم از کم دو آدمی یہ فیصلہ سنائیں کہ عورت سخت تکلیف کی حالت میں زندگی گزار رہی ہے، مبادا کہیں کوئی غیر شرعی اقدام نہ کر بیٹھے لہٰذا فریقین کی رضامندی سے مجلس عقد نکاح میں دس آدمیوں کے نام کی ایک کمیٹی تشکیل دیجائے جس میں کم سے کم دو افراد ہمہ وقت مل جائیں مگر عورت کو اس کے بعد بھی طلاق واقع کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے کیونکہ طلاق میں جلدی کرنا شرعا ناپسندیدہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: حق تعالی کے نزدیک مباح چیزوں میں مبغوض ترین طلاق ہے نیز ارشاد فرمایا: جو عورت بلا ضرورت اپنے خاوند سے طلاق مانگے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے، لہذا اطمینان کے ساتھ غور وفکر کرکے قدم اٹھاتے وقت تین باتوں کو ملحوظ رکھے:

۱۔ غصہ کی حالت میں فوراً اپنے اس اختیار سے کام نہ لے، بلکہ ٹھنڈے دل سے اور مستقبل کو پیش نظر رکھ کر ایک عرصہ تک خوب غور کرے جس کی مدت کم از کم ایک ہفتہ ہو۔

۲۔ اپنے بہی خواہوں خصوصاً والدین سے مشورہ کرے۔

۳۔ سنت کے مطابق استخارہ کرے اور دعاء بھی کرے کہ پروردگار میرا دل اس کام کی طرف پھیر دے جو میرے لئے دین ودنیا میں بہتر ہو، ان کوششوں کے بعد جو دل میں آئے اس پر خدا کی ذات پر کامل بھروسہ کرکے قدم اٹھائے۔ (الحیلۃ الناجزۃ ۳۴، ۳۵)

مذکورہ گزارشات کے بعد یہ بات غور طلب ہے کہ اس جیسی شرطیں عقد نکاح میں لگانا درست ہے کہ نہیں؟ علامہ ابن جوزی اپنی سند سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اس روایت کرتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان اپنی شرطوں پر ہوں گے، ایسی شرطیں جو حق کے موافق ہوں، اور صحیحین کی روایت ہے کہ جو شرطیں کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہیں اگر چہ وہ سو شرطیں ہوں، تو اللہ کا فیصلہ حق ہے اور اللہ کی شرط مضبوط ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں جو آیتیں اور احادیث پیش کی ہیں، انہیں کے پیش نظر حضرات ائمہ نے اختلاف کیا ہے، امام زفرؒ کا فتوی تو یہ ہے کہ دونوں شرطیں باطل ہوجائیں گی اور حضرت امام زفر کی تائید (اور قیاس کے مطابق فتوی بھی یہی ہے) امام شافعی، امام مالک، سفیان ثوری اور اسحاق ابن راہویہ رحمہم اللہ تمام کا یہی فتوی ہے، اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک شرط اول جائز ہے اور شرط ثانی فاسد، لہٰذا شرط پائے جانے کی صورت میں ان کے نزدیک متعین کردہ مہر یعنی مہر مسمی لازم ہوگا اور دوسری صورت میں ذکر کردہ مہر کا اعتبار نہیں ہوتا بلکہ صرف مہر مثل لازم ہوتا ہے، صاحب ہدایہ کے مطابق ترجیح امام کے فتوی سے معلوم ہوتی ہے اور صاحبین کے فتوی پر بھی عمل ہوسکتا ہے، اور صاحبین کا فتوی یہ ہے کہ دونوں شرطیں جائز ہیں، لہٰذا اس فتوی پر عمل کرنے سے پہلے یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا فتوی اگر ترک کرنے پر قومی فائدہ بھی ہو اور عوام الناس کا رجوع اہل علم واصلاح اور دار القضاء اور دار الافتاء کی طرف ہوجائے تو بہتر ہے، ورنہ امام کے قول کو خواہ مخواہ ترک کیا جائے اور بات جہاں سے چلی تھی وہیں رہ جائے اور کہیں ایسا نہ ہوجائے کہ ایک مرض کے علاج کے لئے تیز سے تیز دوا کی گئی لیکن بجائے اس مرض سے فرصت پانے کے اور امراض نے گھیر لیا تو پھر سب بے فائدہ ہوگا۔

چونکہ یہ حضرات ائمہ "باب الإجارة علی أحد الشرطين" پر قیاس کرتے ہیں، لہٰذا ذیل میں اب ہم ان کے مستدلات پیش کرتے ہیں (دیکھئے: ہدایہ مع البنایہ ۴/۲۲۶ عینی ۴/۲۲۷)

۱۔ دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی دلیل راجح ہے اس لئے کہ شرط اول کے اندر جہالت نہیں ہے تو یہ شرط عقد سے متعلق ہوجائے گی اور درست ہوگی اور شرط ثانی درست نہیں ہے، کیونکہ جہالت اس کے اندر ہے، لہٰذا شرط ثانی عقد سے متعلق نہیں ہوگی اور نکاح درست ہوجائے گا، کیونکہ عقد نکاح شروط

فاسدہ سے فاسد نہیں ہوتا ہے۔

۲۔ کتب فقہ اور فتاوی حنفیہ کے اندر بھی امام ابوحنیفہؒ کے فتوی کو راجح قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ جس فائدہ وداعیہ کی بنا پر صاحبین کے فتوی پر عمل کرنے کی رائے طلب کی گئی ہے، اس میں کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا ہے، جیسا کہ تفصیل سے ماقبل میں بیان کیا جا چکا ہے۔

۴۔ راجح امام ابوحنیفہؒ ہی کا قول ہے۔

۵۔ اگر ایسے ضابطے بنانے کا فائدہ ارباب حل وعقد کے نزدیک تسلیم ہوجائے تو پھر صاحبین کے فتوی پر انشراح قلب کے ساتھ عمل کیا جائے گا، کیونکہ اجرت مثل کی روایت مختلف سندوں سے امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے، لہٰذا صاحبین کی روایت بھی امام سے ہی منقول مانی جائے گی۔

## الجواب الثانی

مجلس عقد نکاح میں اس طرح شرط لگائی گئی کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس عورت کا مہر تیس ہزار ہوگا اور اگر اس کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر پندرہ ہزار ہوگا۔

اس شکل کا جواب حنفیہ کی مشہور کتاب "ہدایہ" میں یہ دیا گیا ہے:

عقد نکاح میں رہتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کرلیا تو اس عورت کا مہر، مہر مثل ہوگا، اس لئے کہ اس میں عورت کا کوئی نفع نہیں ہے اور اگر شوہر نے دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کے لئے وہی مہر ہوگا، جس پر عورت راضی ہے یعنی مہر مثل۔

ج۔ مجلس عقد نکاح میں یہ شرط لگانا کہ ملازمت سے شوہر نہیں روکے گا، یہ شرط فاسد ہی نہیں بلکہ باطل ہے، کیونکہ عورت کا ملازمت اختیار کرنا ان دوصورت سے خالی نہیں، اول یہ کہ یہ ملازمت کسب معاش کے لئے ہوگی تو کسب معاش ہی نہیں بلکہ عورت کا نان ونفقہ، سکنی وغیرہ سب اس ہونے والے شوہر پر شریعت کی طرف سے واجب ہو رہا ہے، لہذا عورت صرف گھر کی اور شوہر کے مال کی حفاظت کرے، دوسری صورت یہ ہے کہ ملازمت اس لئے اختیار کئے ہوئے ہے کہ اپنی تعلیم سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے تو یہ بھی عورت پر لازم نہیں، بلکہ اس سے بچنا ضروری ہے، کیونکہ آج کی ملازمت یہ ہے کہ عورت غیر محرم مردوں کے درمیان بیٹھ کر ان کے لئے تفریح طبع کا سامان پیدا کرے جو شرعا حرام ہے۔

ملازمت چونکہ عام طور پر بے پردہ ہوتی ہے، لہذا اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول پیش ہے:

"عن ام سلمة قالت كنت قاعدة عند النبي صلى الله عليه وسلم أنا وحفصة فاستأذن ابن أم مكتوم فقال النبي صلى الله عليه وسلم احتجبن منه"۔ (رواہ ابوداؤد)

۲۔ اس کا جواب بھی مذکورہ بالا تحریروں میں آچکا ہے۔

۳۔ اس کا جواب بھی گزر چکا ہے، مزید یہ عرض ہے کہ اس شرط کی شرعی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے، جمہور علماء کے نزدیک مہر مسمی فاسد ہوجائے گا اور عقد درست رہے گا، اور شوہر پر اس عورت کے لئے مہر مثل لازم ہوگا۔

۴۔ احادیث اور جمہور ائمہ کے فتاوی کی روشنی میں یہ بات طے ہوچکی ہے کہ جب یہ شرط لغو ہے تو شوہر پر اس کی پابندی ضروری نہیں، بلکہ کوئی شوہر ایسی شرط کو پورا کرے تو اس کو روک دیا جائے گا۔

۵۔ شوہر مذکورہ بالا شرط فاسد قبول کرلینے کے بعد اپنی بیوی کو سلسلہ ملازمت جو کہ ایک ناجائز فعل ہے یا نئی ملازمت کے طلب کرنے سے روکتا ہے تو عورت پر شوہر کے اس حکم کی تعمیل صرف ضروری ہی نہیں، بلکہ فرض ہے۔

☆☆☆

# نکاح میں مختلف شرطوں کی شرعی حیثیت

مولانا محمد عزیر اختر قاسمی

نکاح کے متعلق یہ بات ذہن میں ہونی چاہئے کہ یہ مرد وعورت کے درمیان انجام پانے والا قابل احترام عقد ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ اجنبی مرد وعورت الفت ومحبت کی راہ سے تادم عمر ہم رشتہ رہنے کا عزم مصمم کرتے ہیں، شریعت نے اس کی کچھ حدوں اور قیدوں کو ذکر کرکے ازدواجی تعلقات کو مضبوط تر بنانا چاہا ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شرطوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

''أحق الشروط بالایفاء ما استحللتم به الفروج'' (بخاری شریف)۔

**پہلی شرط:** فقہاء کرام نے عقد نکاح میں لگائی جانے والی شرطوں کی بھی حدوں اور قیدوں کا ذکر کیا ہے چنانچہ فرمایا کہ ہر وہ شرط جو مقتضائے عقد کے موافق اور نفس عقد سے ثابت ہوتی ہو جیسے بھلے طریقہ سے زندگی گزارنے کی شرط لگانا، یا عورت کا نفقہ، کسوہ اور سکنی کا اچھی طرح نظم کرنے کی شرط لگانا، اس قسم کی شرط لگانا بالکل جائز ہے، اور شوہروں کو اس قسم کی شرط کا پورا کرنا لازم وضروری ہوگا، نیز اس قسم کی شرط لگانے کی وجہ سے عقد نکاح پر کوئی اثر بھی مرتب نہ ہوگا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

المسلمون عند شروطهم إلا شرطا أحل حراما أو حرام حلالاً (فتح القدير مع هدايه ٢-٢٢٢)

حدیث کی کتابوں میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک دفعہ یہ مقدمہ پیش ہوا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے اس شرط پر شادی کی کہ اس عورت کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے باہر دوسرے شہر میں نہ لے جائے گا، اب وہ شخص اس عورت کو اپنے گھر لے جانا چاہتا ہے اور عورت جانا نہیں چاہتی ہے، تو اس مقدمہ کا فیصلہ فاروقؓ نے فرمایا:

''إن مقاطع الحقوق عند الشروط ولك ما شرطت'' (عمدة القاری ٦-٢٣٧)

فتاوی ہندیہ میں یہ ضابطہ لکھا ہے کہ ہر وہ شرط جو مقتضائے عقد کے خلاف نہ ہو اور عورت کو اس شرط کی وجہ سے یک گونہ فائدہ ہو تو اس شرط کا ایفاء لازم وضروری ہوگا، اور عدم ایفاء مہر کی صوررت میں مہر مسمی واجب نہ ہوگا، بلکہ مہر مثل واجب ہوگا، اور اگر اس شرط کی وجہ سے عورت کا فائدہ نہ ہو، بلکہ کسی اجنبی کا فائدہ ہو تو ایفاء شرط لازم وضروری نہیں اور عدم ایفاء کی صورت میں مہر مثل واجب نہ ہوگا، بلکہ مہر مسمی ہی شوہر کے ذمہ واجب الادا ہوگا (ہندیہ ا ر ۳۰۷) مسند ابوداؤد میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمام شرطوں میں لازم الایفاء وہ شرطیں ہیں جن کے ذریعہ تم نے عورت کی شرمگاہ کو اپنے لئے حلال کیا ہے۔ (بذل المجہود ۳ ر ۴۳)

**دوسری شرط:** اگر ایسی شرط لگائے جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو، مثلاً شوہر کا یہ شرط لگانا کہ اس کی بیوی کا نفقہ اس کے ذمہ نہ ہوگا، یا یہ شرط لگانا کہ اس کا کوئی مہر میرے ذمہ واجب الادا یا مؤجل نہ ہوگا، تو اس قسم کی شرط کا حکم یہ ہے کہ یہ بذات خود ساقط ہوجائے گی اور عقد نکاح منعقد ہوجائے گا، کیونکہ عقد نکاح ایک عقد ہے جو شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوتا، بلکہ شرط خود ساقط ہوجاتی ہے، چنانچہ حاشیہ ہدایہ میں لکھا ہے: "قوله لأنه يبطل بالشروط الفاسدة بخلاف النكاح فإنه لايبطل بها"۔ (۲ ر ۲۹۳، نیز دیکھئے: بذل المجہود ۳ ر ۲۳)

چنانچہ ان سب صورتوں میں شرط لازم الایفاء نہ ہوگی، بلکہ لغو ہوگی اور نکاح مہر مثل کے ساتھ ہوجائے گا۔ (عمدۃ القاری ۶ ر ۲۳۸، فتح القدیر مع ہدایہ ۳ ر ۲۱۰)

**تیسری شرط:** اگر ایسی شرط لگائی جائے جو نہ مقتضائے عقد کے خلاف ہو اور نہ نفس عقد سے ثابت ہوتی ہو، بلکہ اس شرط کے نتیجہ میں فریقین میں سے کسی کو ایسے حقوق حاصل ہوتے ہوں جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہ ہوسکتے ہوں، جیسے عورت کا یہ شرط لگانا کہ شوہر بیوی کو اس کے میکہ سے باہر نہ لے جائے گا یا اس عورت کی موجودگی میں کسی دوسری عورت سے شادی نہ کرے گا، تو اس کے متعلق ایک رائے یہ ہے کہ یہ لازم الایفاء ہوگی چنانچہ امام شافعی، امام احمد اور اسحاق

ابن راہویہ علیہم الرحمۃ کی یہی رائے ہے بطور استدلال ان کی طرف سے یہ واقعہ پیش کی جاتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک مقدمہ پیش ہوا کہ شوہر نے بوقت نکاح یہ شرط قبول کی تھی کہ بیوی کو اس کے میکہ سے باہر نہ لے جائے گا اور اب لے جانا چاہتا ہے اور عورت جانا نہیں چاہتی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فیصلہ فرمایا کہ یہ شرط لازم الایفاء ہوگی۔

یہ فیصلہ حضرت عمرؓ کا ایک طریقہ سے منقول ہے، لیکن انہیں کا دوسرا قول اس کے خلاف ہے۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ، سعید ابن مسیب، سفیان ثوری، امام مالک، فقیہ ابو اللیث اور ائمہ حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ اس قسم کی شرط لازم الایفاء نہیں ہوگی، اور "بذل" میں اسی قول کو امام طاؤس، ابو الشعثاء، اوزاعی کی طرف بھی منسوب کیا ہے، اور حضرت عمر فاروقؓ کا ایک دوسرا قول سند جید کے ساتھ یہ نقل کیا گیا ہے کہ اس قسم کی شرط کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، بلکہ باطل ہوگی اور عقد نکاح کے انعقاد میں اور اس کے بعد اس کا کوئی مرئی اثر نہ ہوگا۔ (بذل المجہود ۳؍۴۳)

اس قسم کی شرطیں لازم الایفاء اس لئے نہیں ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"کل شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل" (بذل المجھود کتاب النکاح ۳۔۲۳)

علامہ عینی صاحب عمدۃ القاری نے بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے اور حضرت عمر فاروق کی مذکورہ دوسری رائے کو نقل فرمانے کے بعد لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق نے شرط کو ختم فرمادیا اور فرمایا کہ عورت اپنے شوہر کے ساتھ ہوگی اور انہوں نے اس شرط کو لازم نہ فرمایا، اور حضرت علیؓ کا بھی یہی قول ہے، اور انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی شرط اس کی ذاتی شرط سے مقدم ہے، اور تابعین میں حضرت سعید ابن مسیب، سفیان ثوری، مالک اور لیث وغیرہ ائمہ کی یہی رائے ہے۔ (عمدۃ القاری ۹؍۴۳۵)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تیسری قسم کی شرط حضرت امام ابو حنیفہ اور بہت سے صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی رائے کے مطابق یہ ہے کہ وہ جائز ضرور ہوگی لیکن یہ شرط لازم الایفاء نہ ہوگی، البتہ شوہر کو اختیار تقوی اور شرط کو پورا کرنے پر آمادہ کیا جائے کہ جب تم نے شرط منظور کرلی ہے تو شرط کو پورا کرنا چاہئے، اور اس شرط کی وجہ سے عقد نکاح پر کوئی منفی اثر مرتب نہ ہوگا، خواہ وعدہ وفاء کرے، نہ کرے، اور شرط لگانے کی وجہ سے انعقاد نکاح اور صحت پر بھی کوئی منفی اثر نہ ہوگا۔

## تفویض طلاق بوقت نکاح

شریعت نے رشتہ ازدواج کو منقطع کرنے کا حق عورت کو نہیں دیا، اور یہ ہدایت دی ہے کہ اگر کبھی آپسی ناچاقی ہوجائے تو اولاً ہر ممکن طور پر اصلاح کی جائے، اگر بایں ہمہ اصلاح ذات البین کسی طرح ممکن نہ ہو تو مرد کو حکم ہے کہ ایک طلاق دے کر عورت کو اپنی زوجیت سے علیحدہ کردے اور حکم قرآنی: "أو تسریح بإحسان" (سورۂ بقرہ: ۲۲۹) پر پورا عمل کرلے۔

مختصر یہ کہ مرد کو حکم ہے کہ اپنی بیوی کو ناگزیر حالات میں طلاق دے کر علیحدہ کردے، اس کے بعد فریقین کے لئے اللہ تعالیٰ ضرور کوئی بہتر صورت پیدا فرمادے گا۔

عورتوں کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار دینا صحیح ہے اور شرعاً اس کا ثبوت بھی ملتا ہے، چنانچہ ایک مرتبہ ازواج مطہرات نے یہ مطالبہ کیا کہ نفقہ میں تنگی ہوتی ہے، اس لئے اضافہ کیا جائے، سرکار دوجہاں کو یہ ناگوار گزرا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

"یا أیھا النبی قل لازواجك ان کنتن تردن الحیوۃ الدنیا وزینتھا فتعالین امتعکن واسرحکن سراحا جمیلا" (سورۂ احزاب: ۲۸) اور امام بخاری نے باضابطہ اس عنوان سے ایک باب باندھا ہے جس میں اس آیت مذکورہ کو نقل فرمایا اور اسی کے متعلق چند حدیثیں نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تفویض طلاق صحیح ہے، اور اس کی وجہ سے عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔ (عمدۃ القاری شرح بخاری ۹؍۵۴۲)

تفویض طلاق کے جواز پر اجماع امت بھی منعقد ہوچکا ہے۔ (ہدایہ مع فتح القدیر ۳؍۴۱۰، بحر الرائق ۳؍۳۱۰) حاصل یہ کہ جب عورت کو عام حالات میں اختیار دینے کی وجہ سے اختیار حاصل ہوجاتا ہے تو بعض حالات میں ان کا جائز ہونا اور اس کی وجہ سے عورت کو اختیار کا حاصل ہوجانا بدرجہ اولی ہوگا۔

## تفویض کے بعد شوہر اس کو ختم نہیں کرسکتا ہے

جب شوہر نے اپنی بیوی کو یہ اختیار دیدیا کہ وہ اپنے اوپر طلاق واقع کرسکتی ہے، تو اب شوہر کو قطعاً یہ اختیار نہ ہوگا کہ وہ اس تفویض کو ختم کردے، اگر شوہر یہ

اعلان کردے اور بیوی سے کہہ دے کہ ہمارا تمہارا عہد نامہ جو تھا اور اس کی وجہ سے تمہیں طلاق واقع کرنے کا اختیار تھا آج اس کو میں ختم کر رہا ہوں، تو اس شخص کے اس اعلان و تفصیل کا کوئی اثر نہ ہوگا، اور عورت کو حسب سابق اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار حاصل ہوگا، چنانچہ فقہ کے عام متون و شروح اور فتاوی کی کتابوں میں یہ عبارت درج ہے، "ولا یملك الرجوع عن التفویض" اس شخص کو قطعاً یہ اختیار نہ ہوگا کہ وہ اس حق سے رجوع کرلے۔ (بحر الرائق ٣٧٧/٣، فتح القدیر ٤٢٨/٣)

## عقد نکاح میں تفویض کی شرط کی تین صورتیں

(الف) پہلی صورت یہ ہے کہ عقد نکاح سے قبل شرائط طے ہو جائیں اور جانبین سے دستخط بھی ہو جائیں۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ عین نکاح کے وقت شرائط زبانی کہلوا دیئے جائیں، خواہ ایجاب مشروط ہو یا قبول مشروط ہو۔

(ج) تیسری صورت یہ ہے کہ عقد نکاح کے بعد شرائط نامہ اور کابین نامہ لکھوایا جائے اور جانبین کے دستخط کرائے جائیں۔

ان تینوں قسم کی شرط کا حکم یہ ہے کہ یہ صورتیں جائز ہیں مگر ان کے معتبر ہونے نہ ہونے میں فرق ہے۔

**(ا) پہلی صورت**..... عقد نکاح سے قبل شرائط طے ہو جائیں اور اس کے بعد نکاح کا انعقاد ہو، تو اس کے معتبر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ شرائط نامہ میں نکاح کی طرف نسبت و اضافت موجود ہو، مثلاً یہ لکھا جائے کہ اگر میں فلاں بنت فلاں سے نکاح کروں اور شرائط مندرجہ اقرار نامہ ہذا کی خلاف ورزی کروں تو مسماۃ مذکورہ کو اپنے اوپر طلاق دینے کا اسی وقت یا اس کے بعد کلی اختیار ہوگا، ایسی صورت میں عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار حاصل ہو جائے گا، لیکن اگر اضافت الی النکاح نہ لکھی جائے تو یہ اقرار نامہ محض بے کار ہوگا، اور عورت کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہ ہوگا، چنانچہ "کنز الدقائق باب التعلیق" میں لکھا ہے کہ "إنما یصح فی الملك کقوله لمنکوحته إن زرت أنت طالق أو مضافا إلیه کان نکحتك فأنت طالق" (دیکھئے: البحر الرائق ٣/٤، ہدایہ ٣٦٥/٢، رد المحتار ٨١/٢-٦٨)

**دوسری صورت:**..... عقد نکاح کے وقت ہی ایجاب و قبول میں ایسی شرطیں ذکر کردی جائیں کہ اگر شوہر اس کی خلاف ورزی کرے تو عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار ہوگا، یہ صورت بھی صحیح و درست ہے اور عورت کو اختیار حاصل ہو جائے گا، اسی طرح شرطوں کو ایجاب و قبول کے ساتھ زبانی کہلوانے کے بجائے لکھ لیا جائے تو بھی صحیح و درست ہے، لیکن ایجاب و قبول کو صرف لکھ لیا جائے اور جانبین سے اس پر دستخط کرا لئے جائیں تو اس صورت میں نکاح منعقد نہ ہوگا، بلکہ زبانی طور پر ایجاب و قبول کہنا ضروری ہوگا ہاں اگر اس طرح کا اقرار نامہ تیار کرلیا جائے اور زبانی طور پر ایجاب یا قبول کے ساتھ کہہ دے کہ ان شرائط محررہ میں سے کسی کی خلاف ورزی ہو تو عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار ہوگا، تو اس طرح تفویض کی تعلیق صحیح ہے، شرائط محررہ کو زبانی ذکر کرنا ضروری نہ ہوگا۔ (الحیلۃ الناجزۃ)

**شرائط:**..... اس صورت میں تفویض کے مفید ہونے اور عورت کو طلاق واقع کرنے کا اختیار حاصل ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ ایجاب عورت کی جانب سے اس طرح ہو کہ خود عورت یا اس کا ولی یا وکیل عقد کے وقت یوں کہے کہ اگر تم نے فلاں فلاں شرطوں کی خلاف ورزی کی تو مسماۃ فلانہ کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار ہوگا، اور شوہر یوں کہے کہ میں نے اس شرط کے ساتھ قبول کیا، یا مطلقاً یوں کہے کہ میں نے تم سے اس شرط کے ساتھ نکاح کیا کہ فلاں فلاں صورتوں میں تم کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار ہوگا، اور عورت نے اس کو قبول کرلیا، یا عورت کی جانب سے ایجاب مطلق ہو اور شوہر از خود چند شرطوں کا اضافہ کر کے یوں کہے کہ میں نے اس شرط کیساتھ قبول کیا کہ فلاں فلاں صورتوں میں تمہیں اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار حاصل ہوگا، تو ان سب صورتوں میں نکاح منعقد ہو جائے گا اور عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار حاصل ہو جائے گا، اور عورت کی جانب سے ایجاب نہ ہو، بلکہ شوہر کی جانب سے ایجاب مطلق ہو اور عورت کی جانب سے قبول اس طرح ہو کہ میں نے اس شرط کے ساتھ قبول کیا کہ مجھے فلاں فلاں صورتوں میں اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار ہوگا، یا مطلقاً یوں کہے کہ میں نے اس شرط کے ساتھ قبول کیا کہ مجھے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار ہوگا، تو ان دونوں صورتوں میں نکاح تو منعقد ہو جائے گا مگر عورت کو کوئی اختیار حاصل نہ ہوگا۔

یہ مذکورہ تفصیلات تفویض مقید کے متعلق تھیں، اگر مطلق تفویض طلاق کی شرط لگائے کہ عورت کی جانب سے بوقت نکاح ایجاب میں یہ کہا جائے کہ تم سے اس شرط پر نکاح کیا کہ مسماۃ فلاں بنت فلاں کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار ہوگا، اور اس میں کسی شرط کی تعیین نہ کی جائے تو یہ صورت بھی صحیح ہے اور عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوگا، لہٰذا وہ عورت جب چاہے اپنے کو طلاق دے کر شوہر سے علیحدہ ہو سکتی ہے، چنانچہ علامہ شامی نے شروع

''کتاب الطلاق'' میں یہ وضاحت فرمائی ہے کہ شوہر نے اگر کسی سے کہا کہ میں نے تم سے اس شرط پر نکاح کیا کہ تو طلاق والی ہے تو نکاح منعقد ہوجائے گا اور طلاق باطل ہوجائے گی اور اگر عورت نے ابتداء کلام کیا ہو بایں طور کہ میں نے تم سے اس شرط پر نکاح کیا کہ میں طلاق والی ہوں تو نکاح منعقد ہوجائے گا اور عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار حاصل ہوجائیگا فقیہ ابواللیث نے دونوں کلاموں میں یوں فرق فرمایا ہے کہ جب آغاز کلام شوہر کی جانب سے ہوا تو طلاق وتفویض طلاق قبل النکاح ہوئی (اوراس کی صحت کے لئے اضافت الی النکاح جو شرط تھی وہ نہ پائی گئی) لہذا یہ طلاق وتفویض طلاق صحیح نہ ہوئی، اور جب آغاز کلام عورت کی جانب سے ہوا تو ایسی صورت میں شوہر نے ایجاب مشروط کو قبول کیا ہے اور ایجاب مشروط کی وجہ سے عورت کو تفویض طلاق حاصل ہوجاتی ہے، اس لئے اس صورت میں عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا پورا حق حاصل ہوجائے گا۔ (رد المحتار ۲/ ۵۸۵)

تیسری صورت: عقد نکاح کے بعد کوئی شرائط نامہ زوجین کے درمیان لکھ لیا جائے اور شوہر کی طرف سے عورت کو یہ اختیار مل جائے، تو عورت عام اوقات میں یا مشروط اوقات میں جب شرط پائی جائے اپنے اوپر طلاق واقع کرنا چاہے تو کرسکتی ہے، یہ صورت بھی صحیح ہے اور عورت کو اپنے اوپر طلاق کرنے کا اختیار حاصل ہوجائے گا، اور شوہر عورت کے حاصل شدہ اختیار کو ختم کرنا چاہے تو اس کو اس کا اختیار نہ ہوگا، ہاں اگر عورت ہی از خود اس حاصل شدہ اختیار کو ختم کرنا چاہے تو کرسکتی ہے، چنانچہ ''بحر الرائق'' میں یہ وضاحت موجود ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ ہمیشہ کے لئے تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے تو اس عورت کے اس کو ایک مرتبہ رد کردینے سے اختیار ختم ہوجائے گا۔ (۳/ ۳۲۲)

## تفویض طلاق میں کچھ ضروری قیدوں کا اضافہ

عورتیں چونکہ فطرتاً مشتعل مزاج، زود رنج، ذکی الحس، ناعاقبت اندیش اور سریع الانفعال ہوتی ہیں، بات بات پر ناراض اور چراغ پا ہوجاتی ہیں، اس لئے تفویض طلاق کی صورت میں یہ خطرہ ہے کہ وہ اپنی ناعاقبت اندیشی کے سبب اس حاصل شدہ اختیار کا بے جا استعمال کرلیں اور زوجین میں سے ایک یا دونوں مشقت شدیدہ میں گرفتار ہوجائیں، اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ شرطوں اور قیدوں کا مزید اضافہ کردیا جائے کہ جس کے سبب اس حاصل شدہ اختیار کا وہ عورت غلط اور بے جا استعمال نہ کرے۔

مثلاً تفویض مطلق کی صورت میں شوہر بوقت تفویض یہ شرط لگائے کہ اگر ہم دونوں آدمی طلاق کے وقوع کو مناسب سمجھیں یا فلاں فلاں شخص طلاق ہی کو بہتر سمجھیں، یا یہ شرط لگادے کہ تمہارے والدین اور دیگر قریبی رشتہ داروں میں سے پانچ افراد طلاق کو ضروی یا مناسب سمجھیں، یا اس طرح کا اور کوئی لفظ یا جملہ بطور شرط وقید ذکر کردیا جائے۔

اسی طرح تفویض مشروط کی صورت میں شوہر بوقت تفویض یہ شرط لگادے کہ شرط مذکورہ کی خلاف ورزی کو فلاں فلاں آدمی تسلیم کرلیں کہ واقعی مذکورہ شرطوں میں سے بعض کی، یا کل کی خلاف ورزی ہوئی ہے یا یہ شرط لگائے کہ واقعی جب مجھ سے خلاف ورزی ہوجائے تو مجھے بھی اس خلاف ورزی کا علم کرادیا جائے کہ تم سے فلاں شرط کی خلاف ورزی ہوگئی ہے اور میں اسے تسلیم کرلوں کہ واقعی مجھ سے خلاف ورزی ہوگئی ہے، تب تمہیں اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا۔

## مالی سزا کے تقرر کی ایک صورت

اگر بوقت نکاح اس طرح مہر مقرر کردیا جائے کہ عام حالات میں اس عورت کا مہر دس ہزار اور وقوع طلاق کی صورت میں اس عورت کا مہر بیس ہزار یا تیس ہزار وغیرہ ادا کرنا لازم ہوگا، تو سطحی نقطہ نظر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت ہی اچھا ہے، کیونکہ اس طرح طلاق کی وارداتیں کم سے کم ہوں گی اور طلاق کا بے جا استعمال نہ ہوسکے گا، لیکن کیا شریعت اس کی اجازت دیتی ہے یا نہیں؟

فقہ کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرات صاحبین کی رائے کے مطابق دونوں شرطیں جائز ہوں گی، کیوں کہ اکثر متون وشروح فقہ میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کسی نے اس طرح شادی کی کہ اگر شوہر اس عورت کو اس کے میکہ سے باہر نہ لے جائے گا تو اس کا مہر ایک ہزار اور اگر باہر لے جائے گا تو اس کا مہر دو ہزار ہوگا، تو اس میں امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ اگر شرط پوری کردی جائے تو مہر مسمی اور اگر شرط پوری نہ کی جائے تو مہر مثل واجب ہوگا، لیکن صاحبین کی رائے یہ ہے کہ دونوں شرطیں درست ہیں، اور دونوں صورتوں میں سے ہر ایک صورت میں مہر مسمی ہی واجب ہوگا، اور امام زفر کی رائے یہ ہے کہ دونوں شرطیں فاسد ہوں گی اور ایفاء شرط اور عدم ایفاء شرط کی صورت میں مہر مثل ہی واجب ہوگا۔

فقہاء حنفیہ کے متون وشروح کے دیکھتے وقت ہر چند یہ سعی کی کہ صراحتاً ان اقوال ثلاثہ میں سے راجح اور مفتی بہ رائے معلوم ہوجائے لیکن میں وہاں تک نہ پہنچ سکا، البتہ صاحب بحر، علامہ شامی اور ابن ہمام وغیرہ فقہاء کرام نے امام ابوحنیفہ پر وارد ہونے والے چند اعتراضات کا جواب دیا ہے، جس سے مترشح ہوتا ہے کہ انہی کا قول راجح ہے۔ (ملاحظہ ہو رد المحتار ۲/۴۷۶)

لیکن میری رائے میں جیسے یہ صاحبین کی رائے کے عین مطابق ہے اسی طرح امام ابوحنیفہ کے دیگر متعدد اصولوں کے عین مطابق ہے کیونکہ اس طرح مہر مقرر کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلاق کی وارداتیں کم سے کم وقوع پذیر ہوں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب صاحبین کی رائے پر عمل کیا جائے اور دونوں شرطوں کو درست قرار دیا جائے۔

نیز اس لئے بھی صورت مذکورہ کو جائز ہونا چاہئے کہ وقوع طلاق کے نتیجے میں بیحد نقصانات ہیں، مثلاً یہ کہ اس کی وجہ سے زوجین اور ان کے رشتہ داروں کے درمیان عداوت، دشمنی، کینہ اور بغض وحسد پیدا ہوجاتا ہیں، انسان کا بسا بسایا گھر اجڑ جاتا ہے، بچے کی پرورش و پرداخت اچھی اور نشوونما عمدہ نہیں ہو پاتی ہے، طرفین کا سکون ختم ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے مقصد تخلیق انسان میں خلل واقع ہوجاتا ہے اور عرش رحمان میں تزلزل پیدا ہوجاتا ہے، حدیث وقرآن کی خلاف ورزی لازم آجاتی ہے، حتی کہ بسا اوقات یہ نوبت بھی آجاتی ہے کہ ایک دوسرے کے رشتہ دار ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوجاتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ ایک صورت میں ایک خرابی لازم آتی ہے، اور دوسری صورت میں چند خرابیاں لازم آتی ہیں، جس میں سے ایک صورت اولی لازم آنے والی خرابی کے ہم پلہ ہے اور دوسری اس سے زائد، لہذا قاعدہ پر اگر عمل کیا جائے گا یعنی بڑے نقصان سے بچنے کے لئے ہلکے نقصان کو انگیز کرلیا جائے تو کوئی حرج نہ ہونا چاہئے بلکہ جائز ودرست ہونا چاہئے۔

## عورت کا اپنی ملازمت کی شرط لگانا

بوقت نکاح عورت کا یہ شرط لگانا کہ شوہر اس کو موجودہ ملازمت یا آئندہ ملنے والی ملازمت سے نہیں روکے گا، صحیح نہیں ہے، یعنی اگر اس قسم کی شرط لگا کر کسی کا نکاح ہوا تو یہ شرط فاسد ہوگی، اور نکاح منعقد ہوجائے گا۔

اسلام نے جہاں اور تمام احکام دیئے ہیں وہیں خاص مرد وعورت کے حقوق وفرائض کی تعیین بھی کی ہے، مردوں کو حکم ہوا: "سیروا فی الأرض وابتغوا من فضل الله" اور دوسری جگہ حکم ہوا کہ جب نماز پوری کرچکو تو تلاش معاش کے لئے زمین میں پھیل جاؤ، لیکن عورتوں کو اس قسم کا کہیں حکم نہیں دیا کہ تم بھی تلاش معاش میں سرگرداں پھرتی رہو، بلکہ ایسے موقعہ پر ارشاد ہوا کہ عورت کا اپنے مرد کے ساتھ تجارت میں شریک ہونا یعنی کار تجارت مل کر انجام دینا علامات قیامت میں سے ہے، اسی طرح عورت ومرد کے فرق مراتب کو بیان کیا گیا "الرجال قوامون علی النساء" (سورۂ نساء: ۳۴) کہ مردوں کو عورتوں کا نگراں بنایا گیا ہے، قرآن کریم میں اس کی علت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مردوں کو عورتوں کا نگراں بنانے میں بہت ساری حکمتیں اور مصلحتیں کار فرما ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہمارے اختیار کی بات ہے کہ بعض کو افضل اور بعض کو مفضول کردیں۔ "وبما فضل الله بعضهم علی بعض" (سورۂ نساء: ۳۴) دوسرے اس وجہ سے کہ اللہ تعالی نے مردوں کو علمی اور عملی توفیق بہ نسبت عورت کے بہت زیادہ عنایت کی ہے، یہاں تک کہ عورتوں کو ناقصات عقل اور ناقصات دین کہا گیا ہے۔

پس اگر عورت بذات خود یا اس کا ولی یا وکیل بوقت نکاح یہ شرط لگائے کہ شوہر اس عورت کو اس کی موجودہ ملازمت سے یا آئندہ ہونے والی ملازمت سے نہیں روکے گا، اور ہونے والا شوہر اس شرط کو قبول ومنظور کرلیتا ہے تو نکاح منعقد ہوجائے گا، لیکن شوہر پر اس شرط کی پابندی ضروری نہ ہوگی۔ اور اگر شوہر اپنی اسی بیوی کو اس کی موجودہ یا آئندہ ہونے والی ملازمت سے روکتا ہے تو عورت پر لازم ہوگا کہ وہ شوہر کا حکم مان کر ملازمت سے باز آجائے۔

☆☆☆

# مشروط نکاح اور مصداق

مولانا محمد اقبال قاسمی

عقد نکاح کے ساتھ فریقین جو شرائط طے کرتے ہیں ان کو تین قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

۱۔ ایسی شرائط جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی نئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ خود عقد نکاح سے جو ذمہ داری کسی فریق پر عائد ہوتی ہو اسی کو شرط کی صورت میں عقد نکاح کے وقت ذکر کردیا گیا ہو، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا مختصر لفظوں میں اس کو یوں تعبیر کرسکتے ہیں، وہ شرائط جو مقتضائے عقد کے مطابق ہوں جیسے نفقہ، سکنی اور کسوہ کی شرط لگانا۔

۲۔ نکاح کے وقت کسی فریق کا ایسی کوئی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو۔

۳۔ نکاح کے وقت کسی فریق کا کوئی ایسی شرط عائد کرنا جو پہلی اور دوسری قسم میں سے کسی کے دائرہ میں نہیں آتی ہے اس کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہیں ہوتا اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی یا ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہ ہوتی، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہ کرے گا یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا، اس کی فقہی تعبیر "مالیس من القسمین" ہوسکتی ہے۔

## پہلی قسم کا شرعی حکم

اس قسم کے شرائط کا حکم یہ ہے کہ ان کا پورا کرنا بالاتفاق واجب ہے، کیونکہ وجوب فریقین کی آپسی اور باہمی رضامندی پر موقوف نہیں، بلکہ شریعت نے از خود محض عقد کی بنیاد پر واجب کردیئے ہیں، خواہ بوقت عقد اس کی تصریح یا شرط نہ لگائی گئی ہو، "مسلم شریف" میں حدیث ہے: "إن أحق الشروط أن يوفى به ما استحللتم به الفروج" (مسلم شریف ۱/۴۵۵) (پوری کرنے کے اعتبار سے لائق ترین وہ شرط ہے جس کے ذریعہ تم نے شرمگاہوں کو حلال کیا) علامہ خطابی شرائط نکاح کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> بعض شرائط وہ ہیں جن کو پورا کرنا بالاتفاق ضروری ہے اور وہ یہ ہیں جن کا اللہ نے حکم دیا ہے یعنی یا تو معروف طریقے پر روکنا یا اچھے طرز پر چھوڑ دینا (حاشیہ بخاری ۲/۴)

حضرت عمر کا قول ہے: "المؤمنون على شروطهم عند مقاطع حقوقهم" (بخاری شریف ۲/۴)

## دوسری قسم کا شرعی حکم

اس کا حکم یہ ہے کہ شرائط باطل ہیں اور نکاح منعقد ہوجاتا ہے، اور ان شرائط کی پابندی متعلقہ فریق کے لئے ضروری نہیں، کیونکہ ان شرائط کی وجہ سے ان چیزوں کا ابطال لازم آتا ہے جو شریعت نے عقد کی بناء پر واجب کی ہیں اسی وجہ سے جب حضرت فاطمہ بنت قیس نے یہ حدیث پیش کی کہ "میرے شوہر ابو عمرو بن حفص نے مجھے طلاق بائنہ دے دی، جب میں خدمت اقدس میں حاضر ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرے لئے عدت میں نہ نفقہ ہے نہ سکنی" تو حضرت عائشہؓ نے ان کی روایت کو شریعت کے خلاف دیکھ کر فرمایا: "فاطمہ کو کیا ہوگیا ہو گیا وہ اللہ سے (اس روایت کو بیان کرنے میں) نہیں ڈرتی"، اور حضرت عمرؓ نے تردید کرتے ہوئے فرمایا: "لاندع كتاب ربنا وسنة نبينا بقول امراة نسيت أو شبه لها" (مشکوۃ شریف ۲۔۲۸۸)

حدیث میں ہے: "ما كان من شرط ليس في كتاب الله فهو باطل وإن كان مأة شرط. قضاء الله أحق وشرط الله أوثق" (بخاری شریف ۱۔۳۷۷)

"جو شرط کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے خواہ ایک سو شرائط کیوں نہ ہوں اللہ کا فیصلہ زیادہ اتباع کے لائق ہے اور اللہ کی شرط زیادہ معتمد علیہ

ہے" حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں لکھتے ہیں:

وہ شرط جو مقتضاء نکاح کے خلاف اور منافی ہو مثلاً یہ شرط کہ عورت کیلئے کوئی باری رات گزاری کی نہیں، یا اس عورت کے ہوتے ہوئے کسی باندی سے جماع نہیں کرے گا یا نفقہ نہیں دے گا وغیرہ وغیرہ، تو اس شرط کو پورا کرنا لازم نہیں، بلکہ اگر صلب عقد میں یہ شرط واقع ہو تو شرط لغو اور باطل قرار پائے گی اور نکاح مہر مثل کے ساتھ درست ہو جائے گا۔ (فتح الباری ۲۱۸/۹ باب الشروط فی النکاح، شرح مسلم للنووی ۴۵۵/۱)

علامہ خطابی نے اس قسم کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے: "ومنها مالا یوفی به اتفاقاً"۔ (حاشیہ بخاری ۷۷۴/۲)

بدائع الصنائع میں علامہ کاسانی شرط فاسد سے نکاح کے عدم فساد کو ان لفظوں میں واضح کرتے ہیں:

"النكاح لایفسد بالشرط الفاسد" (بدائع الصنائع ۲۸۶/۲) نکاح شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوتا۔

## تیسری قسم کا شرعی حکم:

اس نوع کا حکم مختلف فیہ ہے، امام احمد، امام اسحاق اور امام اوزاعی وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ شرط کے مطابق عمل کرنا واجب ہے، اگر شرط کو پورا نہ کرے تو عورت کو نکاح فسخ کرانے کا حق ہوگا (المغنی لابن قدامہ ۵۴۹/۶) جب کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور سفیان ثوری کا مسلک یہ ہے کہ اس قسم کی شرطیں قضاء لازم الایفاء نہیں، اور ان سے عقد نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ دیانتاً ضروری ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے "وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولا" (سورہ: ۳۴) تم اپنے عہد کو پورا کرو بلاشبہ تم سے عہد کے بارے میں بروز قیامت سوال ہوگا، اسی طرح "یا أیها الذین آمنوا أوفوا بالعقود" (سورۂ مائدہ: ۱) امام ترمذی دونوں مسلکوں کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

جب کسی نے ایک عورت سے اس شرط پر شادی کی کہ وہ اس کو شہر سے نہیں نکالے گا تو شوہر کے لئے جائز نہیں کہ وہ اس کو نکالے یہی امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق کا قول ہے، اور علی ابن ابی طالبؓ نے فرمایا کہ عورت کی شرط سے پہلے اللہ کی شرط ہے گویا انہوں نے شوہر کو نکالنے کی اجازت دی، اگرچہ عورت نے نہ نکالنے کی شرط لگادی ہو............یہی سفیان ثوری اور بعض کوفیین کا قول ہے (ترمذی ۲۱۴/۱)۔

امام ترمذی نے امام شافعی کا مسلک اگرچہ امام احمد کے مطابق ذکر کیا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے ساتھ ہیں، چنانچہ حافظ ابن حجر امام ترمذی کا قول نقل کر کے فرماتے ہیں: "والنقل فی هذا عن الشافعی غریب" (فتح الباری ۲۱۸/۹) امام نووی نے بھی یہی لکھا ہے۔ (شرح مسلم للنووی ۴۵۵/۱)

"بدائع الصنائع" میں علامہ کاسانی حنفیہ کا مسلک ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بلاشبہ بیوی کو طلاق دینے یا شہر سے نہ نکالنے کی شرط شوہر کے لئے قضاء لازم نہیں ہے اس لئے کہ یہ وعدہ ہے جس کا شوہر کو مکلف نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ (بدائع الصنائع ۲۸۵/۲)

## ۲۔ شرائط تفویض اور اس کے احکام

عقد نکاح کے وقت اگر عورت یہ شرط لگائے کہ اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا یا فلاں فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا اور شوہر اس شرط کو تسلیم کرلے تو اس کی تین صورتیں نکل سکتی ہیں:

۱۔ عقد نکاح سے قبل شرائط طے ہو جائیں اور اس تحریر پر طرفین کی دستخط ہو جائے۔

۲۔ بوقت عقد نکاح ان شرائط کا زبانی ذکر کیا جائے، ایجاب مشروط ہو یا ایجاب مطلق اور قبول مشروط ہو۔

۳۔ عقد نکاح کے بعد طرفین کے مابین کوئی شرائط نامہ تحریر کیا جائے۔

## عقد نکاح سے قبل شرائط تفویض

اجمالاً یہ سمجھنا چاہئے کہ تفویض طلاق کی مذکورہ تینوں صورتیں معتبر اور درست ہیں، مگر پہلی اور دوسری صورت کے معتبر اور مفید ہونے کے لئے ایک شرط ہے جس کو ابھی ہم بیان کریں گے، رہا تفویض کے بعد اس سے رجوع کرنا تو یہ شوہر کے قبضہ سے خارج ہے، اس کی زبان سے تفویض کے الفاظ نکلنے کے بعد اس کو ختم

کرنے کا کوئی حق نہیں۔ "بدائع الصنائع" میں علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

"اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ زوج کی جانب سے لازم ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ اس سے رجوع یا عورت کو حق تفویض سے روکنے، اور اس کو فسخ کرنے کا حق باقی نہیں رہتا"

تفصیل یہ ہے کہ اگر تفویض نامہ نکاح سے پہلے لکھا جائے تو اس کے معتبر اور مفید ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ اس میں نکاح کی طرف اضافت اور نسبت موجود ہو، مثلاً یہ لکھا جائے کہ اگر میں فلاں بنت فلاں کے ساتھ نکاح کروں، اور تفویض نامہ میں ذکر کردہ شرائط میں سے کسی شرط کے خلاف کروں تو مسماۃ مذکورہ کو اختیار ہوگا کہ اسی وقت یا پھر جس وقت چاہے اپنے اوپر ایک طلاق بائن واقع کر کے نکاح سے الگ ہوجائے.......... اگر اس میں اضافت الی النکاح نہ لکھی گئی تو یہ تفویض نامہ غیر معتبر ہوگا اور اس کی رو سے عورت کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہ ہوگا۔

صاحب "قدوری تعلیق بالشرط" کے مسائل کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"طلاق کی نسبت شرط کی جانب درست نہیں مگر یہ کہ طلاق کو معلق کرنے والا مالک ہو یا ملکیت کی طرف طلاق کو منسوب کرے، اسی وجہ سے اگر کسی نے اجنبیہ عورت سے کہا اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھ کو طلاق، پھر اس سے شادی کرلی اور پھر وہ گھر میں دخل ہوئی تو طلاق نہیں ہوگی"۔ (قدوری ر ۱۷۴)

"عالمگیری" میں تفویض بالشرط کو معلق کرنے کی اقسام کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"دوسری قسم فلاں وقت تک مہر معجّل کو ادا نہ کرنے کی صورت میں تعلیق تفویض: اس قسم کو لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ عورت کے امر کو مطلقاً اس کے اختیار میں دے دے ایک طلاق بائن واقع کرنے کے بارے میں اس شرط کے ساتھ کہ جب مہینہ کے شروع یا آخر کے ایام گزر جائیں اور شوہر پورے مہر معجّل کو ادا نہ کرے، جس کی مقدار اتنی ہے تو عورت اپنے آپ کو ایک طلاق بائن اس مدت کے بعد جب چاہے دیدے گی اور اس طلاق کو اس نے اس کے حوالہ کردیا، اور عورت نے مجلس تفویض میں اس کو قبول کرلیا، تیسری قسم تفویض کو شوہر کے جوا کھیلنے یا شراب پینے یا سخت پٹائی کرنے کی شرط کے ساتھ معلق کرنا، اس تفویض نامہ کو بھی تحریری شکل میں لانے کا طریقہ وہی ہے جو ہم نے (دوسری قسم میں) بیان کیا۔ (عالمگیری کتاب الشروط ۲۶۱/۶)

اور اس پہلی صورت کو لکھوانے اور زبانی کہنے کا حکم برابر ہے، لیکن چونکہ عموماً لکھوانے کا معمول ہے اور اس کے بغیر شوہر کے لئے انکار اور ٹال مٹول کی گنجائش نکل سکتی ہے اس لئے اس کو قید تحریر میں لے آنا احوط ہے اور اگر اضافت الی النکاح نہ ہو تو اس اقرار کا کوئی اعتبار نہیں، ہاں اگر تحریر عقد نکاح سے قبل لکھوالی گئی اور دولہا اور گواہان کے دستخط بعد عقد کرائے گئے تو اس صورت میں تفویض نامہ کی تکمیل کے بعد عقد نکاح ہونے کی وجہ سے اضافت کی کوئی ضرورت نہیں اور یہ تیسری شکل میں داخل ہے۔

## بوقت عقد نکاح شرائط تفویض

دوسری صورت یہ ہے کہ عین ایجاب وقبول ہی میں زبانی شرائط مذکور ہوں، یہ صورت بھی معتبر اور درست ہے، اس کے صحیح اور معتبر ہونے کی شرط یہ ہے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو، یعنی اولاً خود عورت یا اس کا ولی یا وکیل عقد نکاح کے وقت یوں کہے کہ "میں نے اپنے آپ کو یا مسماۃ فلانہ بنت فلاں کو تیرے نکاح میں اس شرط پر دیا کہ اگر آپ نے فلاں، فلاں کام کیا (جتنی شرطیں لگانا مقصود ہوں سب کو ذکر کردیا جائے) تو اپنے معاملہ کا اختیار میرے ہاتھ، یا مسماۃ موصوفہ کے ہاتھ میں ہوگا اور شرائط مذکورہ میں سے کسی ایک شرط کی خلاف ورزی پر بھی اختیار ہوگا کہ اسی وقت یا جب چاہے اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر اس نکاح سے الگ کرلوں، اس کے جواب میں مرد ناکح کہے کہ میں نے قبول کرلیا یا شرائط سمیت قبول کرلیا، اس کے بعد جب عورت شوہر کی جانب سے شرط کی خلاف ورزی دیکھے تو ایک طلاق بائن کے ذریعہ جدائی اور فرقت اختیار کرلے۔

اور اگر ایجاب مرد کی جانب سے ہو اور لڑکی والے قبول کے ساتھ تفویض کی شرائط بھی ذکر کریں تو شرط باطل اور نکاح بلا کسی شرط کے درست ہوجائیگا اور عورت کے لئے کسی قسم کا اختیار نہ ہوگا۔

علامہ شامی "درمختار" کی عبارت: "نكحها على أن أمرها بيدها صح" کے ذیل میں لکھتے ہیں:

مصنف کا قول "صح" مقید ہے اس کے ساتھ کہ ابتداء (ایجاب) عورت کی جانب سے ہو، لہذا عورت کہے کہ میں نے اپنی شادی تجھ سے اس شرط پر کی کہ میرا معاملہ میرے اختیار میں ہوگا، جب بھی چاہوں گی میں اپنے آپ کو طلاق دے لوں گی اور شوہر اس کو قبول کرلے، اور اگر ابتداء (ایجاب) زوج کی جانب سے ہو تو طلاق واقع کرنے کا کوئی حق نہیں ہوگا، اور امر اس کے اختیار میں نہ ہوگا (الدر المختار مع رد المحتار ۲/ ۵۲۶ طبع ماجدیہ پاکستان، نیز دیکھئے: فتاوی ہندیہ ۶/ ۳۹۶)۔

عورت اور مرد کے ایجاب میں فرق بیان کرتے ہوئے فقیہ ابواللیث سمرقندی لکھتے ہیں:

"اس لئے کہ ابتداء جب زوج کی جانب سے ہوگی تو طلاق کی تفویض نکاح سے قبل ہوجائے گی اور یہ درست نہیں اور جب ابتداء عورت کی جانب سے ہوگی تو طلاق کی تفویض نکاح کے بعد ہورہی ہے، اس لئے کہ جب مرد ناکح نے عورت کے بعد قبلت کہا اور جواب سوال کو متضمن ہوتا ہی ہے تو یہ ایسا ہوگیا، جیسا کہ شوہر کہہ رہا ہو کہ میں نے قبول کیا اس شرط پر کہ تجھ کو طلاق کا اختیار ہوگا، یا تیرا امر تیرے اختیار میں ہوگا، چنانچہ یہ تفویض نکاح کے بعد ہورہی ہے"۔ (شامی ۲/ ۴۲۶)

شامی کی مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ وجہ فرق صرف یہ ہے کہ ایک میں تفویض نکاح سے قبل ہے جو درست نہیں اور ایک میں بعد نکاح ہے جو درست ہے، لہذا اگر شوہر ایجاب کرے اور تفویض کی نسبت مابعد النکاح کی طرف کرے اور عورت قبول کرلے تو بھی تفویض درست ہوگی۔ (ہندیہ ۶/ ۳۹۶)

اور اگر ایجاب عورت ہی کی طرف سے ہو، مگر شرط تفویض کا ذکر نہیں ہوا اور مرد نے قبول میں شرط تفویض کے اضافہ کے ساتھ قبول کیا تب بھی تفویض درست ہے، لیکن چونکہ اس صورت میں صرف مرد کو اختیار ہے خواہ بالشرط قبول کرے یا بلاشرط، عورت جبر نہیں کرسکتی، کیونکہ جب عورت کی جانب سے ایجاب مطلق ہوا اور مرد نے اس کو قبول کرلیا تو اب شرائط کا ذکر عورت کے قبضے سے خارج ہوگیا، اب تو مرد کے لئے اختیار ہے کہ مطلق قبول کرے یا مشروط، اس لئے جو عورت احتیاط کی طالب ہو اسے ایجاب کو شرط کے ساتھ مقید کردینا چاہئے تاکہ مرد کے لئے راہ فرار اختیار کرنے کا موقع نہ رہے، البتہ اگر مرد کے قبول سے پہلے پہلے عورت یا ولی کو شرط کا خیال آگیا اور ذکر کردیا تو بھی بلاشرط قبول کرنے کا حق نہ رہے گا "فتاوی ہندیہ" میں ہے:

"ہمارے نزدیک فی الفور قبول کرنا شرط نہیں......... شرط یہ ہے کہ قبول ایجاب سے مخالف نہ ہو"۔ (ایضا ۱/ ۲۶۹)

## عقد نکاح کے بعد شرائط تفویض

اس کی صورت یہ ہے کہ نکاح کے بعد تفویض نامہ تحریر کیا جائے، یا زبانی شوہر کے طلاق کو عورت کے سپرد کردیا جائے یہ درست ہے اور عورت کو اختیار ہوگا طلاق واقع کرنے کا۔

پھر تفویض اگر مطلق ہو اور وقت کو ذکر نہ کیا گیا تو یہ تفویض مجلس علم تک محدود رہے گی، اگر وہ اپنے کو اس مجلس میں طلاق دے تو ایک طلاق بائن پڑجائے گی ورنہ حق تفویض ختم ہوجائے گا۔ "بدائع الصنائع" میں ہے:

"فإن كان مطلقا بأن قال: أمرك بيدك فشرط بقاء حكمه بقاء المجلس وهو مجلس علمها بالتفويض فمادامت في مجلسها فالأمر بيدها"۔ (بدائع الصنائع ۳- ۱۱۳)

اور اگر تفویض مؤقت ہو لیکن وہ وقت عام ہو، ایام، اشہر اور سنین کے ساتھ تحدید نہ ہو تو عورت کا خیار مجلس تک مقید نہ ہوگا بلکہ جس وقت چاہے طلاق دے سکتی ہے۔ علامہ کاسانی نے بہت ہی عمدہ انداز میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ (دیکھئے: حوالہ سابق ۳/ ۱۱۵)

یہ تیسری صورت شوہر کی رضامندی پر موقوف ہے اس پر شوہر کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ عقد نکاح کے بعد شرط کو منوانا بیوی کے اختیار سے باہر کی بات ہوجاتی ہے، اس لئے جو عورت مستقبل میں شوہر کے مصائب و آلام اور ضرب موجع سے خلاصی چاہتی ہے تو اسے چاہئے کہ تفویض نامہ، اقرار نامہ، شرائط نامہ نکاح سے پہلے یا عقد کے وقت لکھوالے۔

## تفویض نامہ میں مزید احتیاطی قیود

چونکہ عورتیں ناقص العقل ناقص الدین ہوتی ہیں۔ اس لئے طلاق کو مطلقاً ان کے ہاتھوں میں دے دینا خطرہ سے خالی نہیں، اس لئے مناسب یہ ہے کہ

تفویض نامہ میں مناسب قیود احتیاطاً لگادی جائیں جو مفید ہوں اور بیجا تصرف کا سد باب کریں، مثلاً عورت یا متولی یا وکیل یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو یا مسماۃ فلانہ بنت فلاں کو تمہارے نکاح میں اس شرط پر دیا کہ جس وقت اس کو تم سے تکلیف پہنچے گی جس کو فلاں فلاں اشخاص میں سے کم از کم دو تین افراد تسلیم کرلیں اور وہ دونوں یا تینوں طلاق کو مناسب بھی کہیں تو اس کے بعد ہر وقت معاملہ میرے اختیار میں ہوگا کہ اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر جدائیگی اختیار کرلوں، یا مرد مہر معاف کرنے کی شرط لگائے اور عورت یوں کہے کہ مہر معاف کر کے اپنے آپ کو اختیار کرلوں گی، ''بحر الرائق'' میں علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں: اگر کسی نے بیوی سے کہا تینوں طلاقوں کا مسئلہ تیرے ہاتھ میں ہے اگر تو اپنے مہر سے بری کردے ......... اگر پہلے عورت بری کردے تو طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر مہر سے بری نہیں کیا تو نہیں پڑے گی اس لئے کہ توکیل ابراء کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ (البحر الرائق ۳/ ۳۱۹)

## ۳۔ خواتین کی ملازمت کی شرعی حیثیت اور عقد نکاح میں اس کی شرط

خواتین کا کوئی ایسا کام کرنا جس کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑے یا اس میں بے پردگی ہوتی ہو، اسلام کی پاکیزہ روح اور مقدس مزاج کے بالکل متصادم ہے اور شریعت اس کی اجازت نہیں دے سکتی ہے اور ملازمت میں بغیر ضرورت شرعیہ کے گھر سے باہر ہونا پڑتا ہے، اور بے پردگی کا یقین نہیں تو ظن غالب ضرور ہے اور دونوں کا حکم یکساں ہے، اور قرآن کریم نے بغیر شرعی مجبوری کے نکلنے کو زمانہ جاہلیت کا شیوہ قرار دیا ہے۔

''وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلاَ تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الأُولَى...... وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ (سورہ احزاب: ۳۳۔۳۴)

(اور تم عورتیں اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور زمانہ قدیم کی جاہلیت کی طرح نہ پھرو......... اور اپنے گھروں میں آیات اور حکمت سے نصیحت حاصل کرو)'' حدیث شریف میں ہے:

''وليس للنساء نصيب في الخروج الا مضطرة'' (الطبراني كذا في الكنز ۸۔ ۲۶۳)

(عورتوں کا باہر نکلنے کے لئے کوئی حصہ نہیں الا یہ کہ اضطراری صورت خروج کی پیش آجائے)۔

لہذا ان نصوص شرعیہ کے ہوتے ہوئے خواتین کا بوقت عقد اپنے ہونے والے شوہر سے یہ شرط لگانا کہ شوہر انہیں لگی ہوئی ملازمت سے نہیں روکے گا یا اگر آئندہ انہیں کوئی مناسب عہدہ یا ملازمت ملے تو شوہر پابندی یا رکاوٹ نہیں ڈالے گا، اور شوہر اس شرط کو قبول بھی کرلیتا ہے تو بھی یہ شرطیں لازم العمل نہیں اور یہی نہیں، بلکہ اس جیسی سو شرطیں بھی لگالیں تو بھی پابندی ضروری نہیں، ''بخاری شریف'' میں ایک حدیث ہے:

''ماكان من شرط ليس في كتاب الله فهو باطل وان كان مائة شرط''

(جو شرطیں کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہیں اگرچہ سو شرطیں کیوں نہ لگائی جائیں)۔

نیز ملازمت کی شرط کو قبول کرنے کے بعد بھی اگر شوہر سلسلہ ملازمت سے عورت کو روکے اور ملازمت ختم کرنے کا حکم دے تو عورت کو شوہر کے حکم کی تعمیل ظاہر نصوص کی بناء پر واجب ہوگی، اس لئے کہ جب شریعت نے نفقہ کسوہ اور سکنی کی ذمہ داری سے عورتوں کے کندھے کو ہلکا کردیا اور گھر سے باہر کے کام کی ذمہ داری، نیز عورتوں کے حوائج اور ضروریات کی ذمہ داری شوہر پر ڈالی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ عورت تعمیل حکم میں پس و پیش کرے اور چوں وچرا کے ذریعہ گریز کی راہ اختیار کرے، حدیث شریف میں اسی لطیف امر کی طرف اشارہ ہے:

''ان المراة تقبل في صورة شيطان وتدبر في صورة شيطان'' (مشكوة عن مسلم ۲۔۲۶۸)

(واقعتاً عورت شیطان کی صورت میں آتی جاتی رہتی ہے)۔

دوسری جگہ ہے:

''المراة عورة فإذا خرجت استشرفها الشيطان'' (مشكوة عن الترمذي ۲۔۲۶۹)

(عورت پوشیدہ رہنے کی چیز ہے جب نکلتی ہے تو شیطان تاک لیتا ہے)۔ ☆☆☆

# نکاح میں صحیح وفاسد شرائط کی نوعیت

مولانا شاہد قاسمی

عقد نکاح میں لگائی جانے والی شرطیں تین طرح کی ہیں:

۱۔ وہ شرائط جو بذات خود صحیح اور مقتضائے عقد کے مطابق ہیں۔

۲۔ وہ شرائط جو خود صحیح ہیں، لیکن مقتضائے عقد کے خلاف ہیں، البتہ ذکر سے لازم ہوجاتی ہیں۔

۳۔ وہ شرائط جو فاسد ہیں، لیکن ان کے ذکر سے عقد کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ شرط فاسد ہوجاتی ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں صاحب "قانون الأحوال الشخصیة" ضابطہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جب وہ ایسی شرط سے مقترن ہو جو اصل عقد کے منافی نہیں لیکن مقتضاء عقد کے منافی ہو، یا شرعا حرام ہو، تو شرط باطل ہے اور عقد صحیح ہے، وہ ایسی شرط سے مقترن ہو جو نہ تو اصل عقد کے منافی ہو اور نہ مقتضائے عقد کے، اور نہ ہی شرعا شرط صحیح اور لازم الایفاء ہے، لہذا عدم وفاء کی صورت میں مشروط لہ کو فسخ کا حق ہوگا۔ (قانون الأحوال الشخصیہ ر ۱۴)

علماء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ عقد نکاح کے ساتھ عائد ہونے والی شرطیں دو نوعیت کی ہیں: (۱) شرط صحیح (۲) شرط غیر صحیح، البتہ ان شرطوں کے موثر ہونے کے سلسلہ میں اختلاف ہے نیز شرط صحیح کی توضیح میں فقہاء کی مختلف رائیں ہیں۔

امام مالکؒ کے نزدیک شرط صحیح کی دو قسمیں ہیں: (۱) صحیح غیر مکروہ (۲) صحیح مکروہ، شرط صحیح غیر مکروہ، یعنی عقد نکاح کے سبب وہ چیز لازم ہو اور اس کا اثر ہو، مثلاً مرد بیوی پر اطاعت وفرمانبرداری کی شرط لگائے، یا گھر سے باہر بلا اجازت نہ جانے کی، یا شوہر پر نان ونفقہ وغیرہ یہ ایسی شرائط ہیں جو عقد کے سبب واجب ہیں، گرچہ شرط نہ لگائی جائے۔

شرط صحیح مکروہ: ایسی شرط جو مشروط کے خلاف ہو اور محض شوہر پر تنگی کرنا مقصد ہو، مثلاً بیوی کی یہ شرط کہ شوہر میری موجودگی میں دوسری شادی نہ کرے، یا مجھے سفر میں نہ لے جائے، یا مجھے دوسری جگہ منتقل نہ کرے وغیرہ، تو ایسی شرطیں لازم الایفاء نہیں، بلکہ مستحب ہیں اور عورت کو فسخ نکاح کا حق نہیں ہے۔ (احکام الشرعیة لاحوال الشخصیہ ۲ر۱۰۹)

امام احمد ابن حنبلؒ کے نزدیک شرط صحیح وہ ہے جس کا عقد تقاضہ کرے، یا جس کا عقد متقاضی تو نہ ہو، لیکن زوجین میں سے کسی کا فائدہ ہو اور شارع علیہ السلام کی طرف سے نہی نہ ہو تا کہ مقاصد عقد میں خلل ہو، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ میرا نان ونفقہ شوہر پر لازم ہوگا، یا اس کی موجودگی میں دوسری شادی نہ کرے گا وغیرہ، یہ شرائط صحیح اور لازم الایفاء ہیں، خلاف ورزی کی صورت میں عورت کو فسخ نکاح کا حق ہے، اس لئے کہ مذکورہ صورتوں میں عقد پر رضا موقوف ہے شرط کے تحقق پر، یہاں شرط کا تحقق ہوا نہیں، لہذا رضا نہیں پائی گئی اور جب رضا نہیں پائی گئی تو نکاح منعقد نہیں ہوا، اور حنفیہ کے نزدیک شرط صحیح وہ ہے جس کا عقد تقاضا کرے، یعنی عقد نکاح کے ذریعہ ثابت ہونے والے احکام میں سے کسی حکم کو واجب کرے (بیوی کے نفقہ کی ذمہ داری کی شرط) یا عقد کے تقاضہ کو مؤکد کرے (بیوی کا ولی یہ شرط لگائے کہ مہر اور نفقہ کا کفیل شوہر کا والد ہوگا) یا شریعت نے جس کا اختیار دیا ہو (تفویض طلاق)، یا جو عرف کی رو سے ثابت ہو اس کا حکم یہ ہے کہ ایسی شرطیں لازم الایفاء ہیں، لیکن فریقین میں سے جس نے اس شرط کا التزام کیا ہو، اگر اسے پوری نہ کرے تو مشروط لہ کو فسخ کا حق نہ ہوگا، کیونکہ حنفیہ کے نزدیک صحت عقد کے لئے محض ایجاب وقبول کا پایا جانا کافی ہے، اس کے بعد عقد نکاح مؤکد ہوجائے گا، فریقین کی رضامندی ضروری نہیں، یہی وجہ ہے کہ مکروہ نکاح صحیح ہوجاتا ہے، حالانکہ رضامندی نہیں ہے لقولہ علیہ السلام: "ثلاث ھزلھن ھزل وجدھن جد"۔

اس ضمن میں عبد الرحمان جزیری اپنی کتاب "الفقہ علی المذاھب الاربعة" میں لکھتے ہیں:

قاعدہ اس میں یہ ہے کہ شرط علی الاطلاق موثر نہ ہوگی، پھر اگر وہ مقتضائے عقد میں سے ہے تو طبعاً نافذ ہوگی، ورنہ شرط باطل اور عقد صحیح ہے (الفقہ علی المذاہب الأربعہ ۷۵/۴)۔

مذکورہ تصریحات سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جمہور فقہاء عظام ایسی شرطوں کی صحت پر متفق ہیں جو مقتضاء عقد کے مطابق ہیں، جس طرح کہ اس شرط فاسد پر اتفاق ہے جو رشتہ ازدواج کے مقصود کے خلاف یا احکام شرعیہ کے مخالف ہے۔

(۲) شرط فاسد: اس سلسلہ میں فقہاء کی تصریحات حسب ذیل ہیں:

جمہور فقہاء کے نزدیک شرط فاسد وہ ہے جو مذکورہ صورتوں میں سے نہ ہو (جن کا شرط صحیح کے تحت بیان ہوا لیکن فریقین میں سے کسی ایک کی مصلحت ومنفعت ہو تو ایسی شرط لغو اور باطل ہے، صحت عقد میں موثر نہیں (الدر المختار علی رد المحتار ۲/ ۴۰۵، الانصار ۸/ ۱۵۹)، البتہ اگر عقد کو کسی شرط پر معلق کرے، مثلاً یہ کہ اگر تیرا باپ راضی ہو تو میں نے تجھ سے نکاح کر دیا تو نکاح صحیح نہیں ہوا، اس لئے کہ نکاح تعلیق کو قبول نہیں کرتا۔

امام احمد ابن حنبلؒ کے نزدیک شرط فاسد ایسی شرط ہے جس کے بارے میں شارع کی ممانعت ہو، یا مقتضاء عقد کو توڑنے والی ہو، جس کے لئے شارع کی نص موجود ہے، مثلاً بیوی عقد کے وقت یہ شرط لگائے کہ شوہر اس کی سوکن کو طلاق دیدے وغیرہ، ایسی شرط صحیح نہیں ہے۔

لقوله عليه السلام: ''فيما رواه أبو هريرة إذا قال: لا تسئل المراة طلاق اختها لتكفي ما في إنائها'' (بخاری ۲۔ ۷۷۳)

## حاصل کلام

ایسی شرط مختلف فیہ ہے، جس کے لئے کوئی دلیل خاص نہ ہو، لہذا اگر دلیل خاص ہو تو شرط صحیح ہوگی یا باطل؟ امام احمدؒ ایسی شرط کی صحت کے قائل ہیں اور جمہور فقہاء لغو قرار دے کر ایسی شرط کو غیر معتبر قرار دیتے ہیں۔ (الاحوال الشخصیہ / ۱۵۹، الجامع الاختیارات الفقہیہ ۲/ ۶۲۸)

ضروری تفصیلات کے بعد اب مقالہ میں ذکر کردہ سوالات کے جوابات تحریر کئے جاتے ہیں:

(الف) سابقہ تصریحات سے یہ بات واضح ہے کہ نکاح شرط فاسد سے باطل نہیں ہوتا ہے۔

(شوہر کا یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان ونفقہ اس کے ذمہ نہ ہوگا) بیوی کا نان ونفقہ جو کہ واجب مستقل ہے ساقط نہیں ہوتا، کیونکہ اس کا وجوب شیئاً فشیئاً ہے، لہذا کسی عورت نے نفقہ معاف کر دیا، یا معافی کی شرط کے ساتھ نکاح کیا تو اسے شرعاً مطالبہ کا حق ہے۔ (فتح القدیر ۳/ ۶۹۴)

نیز اسی طرح بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ شرط خود نکاح کے نتیجہ میں واجب ولازم ہے۔

(۳) ایسی شرط لگانا جس کے نتیجے میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہے جو غیر مشروط نکاح میں حاصل نہیں ہوتا اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی عائد ہوتی ہے جو غیر مشروط نکاح میں عائد نہیں ہوتی مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا۔

## تفویض طلاق

اس کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ عقد نکاح سے پہلے شرائط طے ہو جائیں۔ ۲۔ عین وقت عقد زبان سے کہلوایا جائے۔ ۳۔ بعد میں لکھوایا جائے۔

(۱) تفویض طلاق زبانی یا تحریری نکاح سے قبل ہو تو اس میں نکاح کی طرف نسبت واضافت کرنا شرط ہے، مثلاً یوں کہے: میرا نکاح فلاں بنت فلاں سے ہونے کے بعد اگر میں فلاں فلاں شرط کی مخالفت کروں تو اس کو طلاق بائن کا حق ہوگا، ایسی صورت میں بیوی کا خیار طلاق خلاف ورزی کا علم ہونے کی مجلس تک خاص رہے گا، اس مجلس میں اس نے طلاق بائن واقع کر لی تو ہو جائے گی، بعد مجلس کے خیار باطل ہو جائے گا اور اگر شوہر نے یہ کہا کہ خلاف ورزی کی صورت میں جب چاہے طلاق بائن واقع کرلے تو مجلس علم کے بعد بھی خیار حاصل رہے گا، اگر تفویض کی مذکورہ صورت میں نکاح کی طرف اضافت نہ کی تو یہ اقرار نامہ لغو ہوگا، اس کی رو سے عورت کو کسی قسم کا خیار حاصل نہ ہوگا، البتہ اگر ایسی تحریر نکاح سے پیشتر لکھی گئی ہو، مگر شوہر اور گواہان نے اس پر نکاح کے بعد دستخط کیا ہو تو یہ تفویض درست ہے، اضافت الی النکاح ضروری نہیں۔ (الفتاوی الہندیہ ۲/ ۵۳، وکذا فی الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/ ۴۱۹۶)

(۲) عین ایجاب وقبول ہی میں تفویض طلاق کی شرط لگائی جاوے، اس کے معتبر ہونے کی دوسری شرطیں ہیں:

(الف) ایجاب مع الشرط من جانب عورت ہو، یعنی عورت یا اس کا ولی جتنی شرطیں لگائیں، سب کا تذکرہ کریں، پس اگر ایجاب من جانب مرد ہوا اور لڑکی والے قبول کے ساتھ تفویض طلاق کی شرط بھی لگائے تو نکاح بلا کسی شرط کے صحیح ہو جائے گا، اور شرط بالکل بیکار ہو جائے گی۔ (درمختار ۲/۶۹۶)

فقیہ ابو اللیثؒ دونوں صورتوں میں فرق کی وضاحت یوں بیان کرتے ہیں:

”جب ابتداء من جانب شوہر ہو تو طلاق اور تفویض نکاح سے قبل ہونا لازم آئے گا جو کہ صحیح نہیں، اور اگر عورت کی جانب سے ہو تو تفویض نکاح کے بعد سمجھا جائے گا، اس لئے کہ شوہر نے عورت کے کلام کے بعد قبلت کہا ہے، گویا اس نے یہ کہا میں نے اس شرط پر قبول کیا کہ تجھے طلاق ہے یا تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے تو یہ تفویض نکاح کے بعد ہوئی“ (ردالمحتار ۲/۶۹۹)

(ب) ایجاب مع الشرط زبانی ہو، صرف تحریری کافی نہیں، بلکہ تمام شرائط لکھنے کے بعد تفصیلاً بوقت ایجاب زبان سے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ فلاں کا نکاح اس تحریر میں مندرجہ شرائط کے ساتھ کرتا ہوں۔

## تفویض طلاق سے رجوع

”فتاویٰ ہندیہ“ میں ہے:

”ولیس للزوج أن یرجع فی ذالك ولاینهی عن عمل جعل إلیها ولایفسخ كذا فی الجوهرة“ (۳-۲۶۳، الفقہ علی المذاهب الاربعہ ۲-۷۵، البدائع الصنائع ۲-۱۸)

(تفویض طلاق کے بعد شوہر نے جس چیز کا مالک بنا دیا ہے اس سے رجوع کا حق نہیں ہے اور نہ ہی فسخ کا حق ہے)۔

گویا یہ ایسا ہی ہو گیا کہ ایک شخص نے کسی کے لئے ایک چیز کا اقرار کیا اور مقرلہ نے اسے قبول کر لیا، تو مقر پر وہ چیز واجب ہو گئی، اب اسے رد کا اختیار نہ ہوگا، اس لئے مرد کے حق میں مفید یہ ہے کہ معافی مہر کی شرط لگا دے۔

طلاق کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے صاحبین کے قول کو فتویٰ کے لئے اختیار کیا جا سکتا ہے، ہمارے نزدیک بے جا طلاق کے واقعات کے سد باب کے لئے ایک تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ مہر اس طرح طے ہو کہ اگر بلاوجہ طلاق نہ دیا تو چھ ہزار اور اگر ایک طلاق دیا تو ہزار اور اگر تین طلاق دیا تو اٹھارہ ہزار ہوں گے۔

۲۔ مذکورہ صورت میں چونکہ شرط پوری کرنے میں دوسرے کا ضرر ہے اور قاعدہ ہے کہ ”الضرر یزال“ لہذا دونوں شرطیں غیر معتبر اور ناجائز ہوں گی اور اگر عورت کا مہر مثل مہر مسمّی سے زیادہ ہے تو شرط پوری نہ ہونے کی صورت میں مہر مثل کی حقدار ہے، البتہ اگر اس کی وجہ سے بیوی کے مہر میں کچھ وضع کر لیا ہے، پھر دوسری شادی کر لی تو وہ اپنا پورا مہر لینے کی شرعاً مجاز ہے۔ لقولہ علیہ السلام: ”المؤمنون عند شروطهم“۔

اگر نکاح کے وقت یہ شرط لگا دی جائے کہ شوہر اس منکوحہ کے عقد میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہ کرے گا اور اس کی وجہ سے اس کا کچھ مہر کم کر دیا جائے گا، پھر دوسری سے نکاح کر لے تو شوہر پر کوئی چیز لازم نہیں ہے، ابن قاسم کی روایت کے مطابق، اس لئے کہ یہ شرط مالا یجوز کے قبیل سے ہے، جس طرح اہل بریرہ نے یہ شرط لگائی کہ حضرت عائشہؓ اسے آزاد کر دیں گی، اور ولاء بائع کو ہوگا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویب فرمائی اور شرط کو باطل فرمایا، اسی طرح یہاں بھی اس سے کچھ مہر کا کم کر لینا صحیح ہے اور زیجہ (وہ ہیئت جس پر عقد ہوتی ہے) باطل ہے، علامہ مرغینانیؒ وغیرہ کی بھی یہی رائے معلوم ہوتی ہے۔ (ہدایہ ۶/۳۲۹)

## ۳۔ عورت کی ملازمت

”الرجال قوامون علی النساء“ (النساء: ۳۴)۔

قوام اور قیم، عربی زبان میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کام یا نظام کا ذمہ داریاں چلانے والا ہو، آیت میں اس بات کی تعلیم دی گئی کہ اگر چہ عورت کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم وواجب ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر ہیں اور دونوں کے حقوق مماثل ہیں، لیکن ایک چیز میں مردوں کو امتیاز حاصل ہے کہ وہ حاکم ہے، پس شوہر کی حکم برداری واجب ہے، الا یہ کہ وہ معصیت کا حکم کرے، نیز بیوی کے مقاصد میں سے ہے کہ وہ گھر میں رہے تا کہ فارغ البال ہوکر اولاد کی پرورش و پرداخت، ان کے ساتھ مہربانی اور خاندان والوں کے لئے سامان تیار کر سکے اور شوہر جب بلائے فوراً حاضر ہو سکے، چنانچہ انکار کی صورت میں فرشتے لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔

''أيما امرأة دعاها زوجها إلى فراشه فأبت عليه لعنتها الملائكة حتى تصبح'' (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۲-۱۲۵)
باہر نکلنے کی صورت میں یقیناً دیر حاضری اور غیر حاضری ہوگی، جس سے شکوک وشبہات کے دروازے وسیع ہوتے چلے جائیں گے اور میاں بیوی کے تعلقات خراب اور زندگی اجیرن ہوسکتی ہے، اسی طرح زیب وزینت کا اسے شوق ہوگا جو صرف شوہر کے واسطے اختیار کرنے کی اجازت ہے، نیز جن ستروں کا چھپانا شرعاً واجب ہے ان کا کشف ہوگا، مثلاً بال، گردن، پنڈلی وغیرہ جو کہ باعث فتنہ ہے۔

''إن المرأة عورة فإذا خرجت استشرفها الشيطان وأقرب ما تكون من رحمة ربها وهي في قعر بيتها''۔
قرآن میں عورتوں کی صفت "حور مقصورات في الخيام" بیان کی گئی ہے، اس کا بھی تقاضا یہی ہے کہ گھروں ہی میں رہیں (ملازمت نہ کریں ) یہی وجہ ہے کہ کچھ عورتوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کی اجازت چاہی تا کہ مرد کی طرح وہ بھی ثواب وفضیلت حاصل کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من قعدت من كن في بيتها تدرك عمل المجاهدين في سبيل الله" (تم میں کی جو عورت اپنے گھر میں بیٹھے گی وہ جہاد فی سبیل اللہ کا ثواب پائے گی) (جب کہ اس وقت افواج اسلام کی قلت تھی) پتہ چلا کہ عورت اپنی خلقت وفطرت کے اعتبار سے نہ اس کی متحمل ہے کہ اپنے مصارف خود کما کر پیدا کرے اور نہ اس کے لئے حالات سازگار ہیں کہ وہ محنت مزدوری اور دوسرے ذرائع کسب میں مردوں کی طرح دفتروں میں اور بازاروں میں پھرا کرے، اس لئے حق تعالی نے اس کی پوری ذمہ داری مردوں پر ڈالی۔

لہٰذا اگر چہ شوہر نے بیوی کی ملازمت کی شرط منظور کر لی ہے پھر بھی اسے ملازمت ختم کرنے کا حکم دے سکتا ہے، اور نئی ملازمت سے بھی روک سکتا ہے اور عورت پر اس حکم کی تعمیل شرعاً واجب ہوگی، اس لئے کہ یہ ایسی شرط ہے جو جائز نہیں ہے اور خصوصاً اس وقت، جبکہ چہار جانب اور بے حیائی عام ہے اور عورت کی ملازمت اور بے جا حقوق کی بات کی جارہی ہے تو بدرجہ اولی ملازمت کی اجازت نہ ہونی چاہئے۔

☆☆☆

# نکاح کو پائیدار بنانے والی شرائط

مولانا بدر احمد مجیبی

نکاح کے وقت کوئی ایک فریق اپنی سہولت وآسانی کے خیال سے کچھ شرطیں پیش کرے اور دوسرا فریق اسے قبول کرلے یا یہ شرطیں فریقین کی طرف سے متفقہ طور سے پیش کی جائیں، تو جیسا کہ سوال نامہ میں مذکور ہے یہ شرطیں تین طرح کی ہوسکتی ہیں:

**پہلی قسم:** ان شرطوں کی ہے جن میں عقد نکاح سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں اور فرائض میں سے کسی کا ذکر ہو، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا۔

**دوسری قسم:** ان شرطوں کی ہے جن کے ذریعہ نکاح سے عائد ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز کیا گیا ہو، مثلاً شوہر کا یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں ہوگا۔

**تیسری قسم:** ان شرطوں کی ہے جن کے ذریعہ کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہو رہا ہے جو غیر مشروط نکاح میں حاصل نہیں ہوتا اور دوسری فریق پر ایسی ذمہ داری عائد ہو رہی ہے، جو غیر مشروط نکاح میں عائد نہیں ہوتی، مثلاً یہ کہ عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کرے گا، یا یہ شرط کہ بیوی کو اس شہر سے باہر نہیں لے جائے گا، تو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ان شرطوں کے ساتھ نکاح کرنے سے نکاح منعقد ہوجاتا ہے، البتہ ان شرطوں کی کیا حیثیت ہوگی، اور یہ لازم العمل ہوں گی یا نہیں؟

جہاں تک پہلی شرط قسم کا تعلق ہے کہ عقد نکاح سے عائد کسی ذمہ داری کو ہی شرط کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہو تو اس کا حکم واضح ہے کہ جس ذمہ داری کو مشروط کیا گیا ہے، وہ بغیر شرط لگائے بھی لازم رہتی ہے اور شرط لگانے کے بعد بھی لازم رہے گی، اس سلسلہ میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج'' (متفق علیہ)

(شرطوں میں پوری کی جانے کی سب سے زیادہ مستحق وہ شرط ہے جس کے ذریعہ تم نے فرج کو حلال کیا ہے)۔

اگر ایسی صورت ہو کہ نکاح سے عائد ہونے والا کوئی فریضہ ہی مشروط ہو، لیکن اس میں معمول سے بہت زیادہ اضافہ کر دیا گیا ہو تو ایسی صورت میں یہ پورا اضافہ لازم نہیں ہوگا، بلکہ عام طور سے جو ذمہ داری لازم ہوتی ہے وہی لازم ہوگی، مثلاً کسی شخص کی شادی اس شرط پر ہوئی کہ وہ ہر مہینے نفقہ میں ایک سو دینار (سونے کے سکے) دے گا تو نکاح درست ہے اور یہ زیادتی اس پر لازم نہیں ہوگی، معروف نفقہ ہی اس پر لازم ہوگا۔ (قاضی خاں ۱/ ۳۳۱)

اور اگر کسی نے اس شرط پر نکاح کیا کہ بیوی کو مہر نہیں ملے گا، یہ شرط بھی باطل ہوجائے گی، نکاح درست ہے اور مہر مثل لازم ہوگا۔ (رد المحتار ۲/ ۳۲)

شرائط کی تیسری قسم کہ نہ تو اس میں عقد نکاح سے عائد ذمہ داری مشروط ہے اور نہ کسی لازم ذمہ داری سے گریز کیا گیا ہے، بلکہ اس شرط کی وجہ سے فریقین میں سے کسی ایک پر کوئی دوسری ذمہ داری عائد ہو رہی ہے جو اس شرط کے بغیر عائد نہیں ہوتی، تو ایسا نکاح بھی درست ہے اور یہ شرطیں وعدے کی حیثیت رکھتی ہیں، شوہر اگر پورا کر دیتا ہے تو بہت بہتر ورنہ قانونی اعتبار سے ان کی پابندی شوہر پر لازم نہیں۔ (بدائع الصنائع ۲/ ۲۸۵)

البتہ ایفاء عہد کے حکم کے پیش نظر ایسے وعدوں کی تکمیل دیانتاً شوہر کے ذمہ ہے۔

چونکہ یہ شرطیں دین مہر کے ساتھ لگائی جاتی ہیں، اس لئے ان کا اثر دین مہر پر بھی پڑتا ہے، اور مختلف شکلوں میں مختلف حکم لگتا ہے، متعدد صورتوں میں متعین مہر لازم ہوتا ہے، اور بعض شکلوں میں مہر مثل لازم ہوتا ہے۔

(۱) اگر شوہر نے اس شرط کو پورا کر دیا تو متعین مہر لازم ہوگا، مثلاً اس شرط پر نکاح ہوا کہ بیوی کو شوہر اسی شہر میں رکھے گا، باہر نہیں لے جائے گا تو شرط پوری ہونے پر متعین مہر لازم ہوگا۔ (البحر الرائق ۳/ ۱۶۰)

(۲) اگر شوہر نے شرط پوری نہیں کی تو دیکھا جائے گا کہ اس کا دین مہر اس کے مہر مثل کے برابر ہے یا زیادہ یا کم ہے اگر برابر یا زیادہ ہے مثلاً عورت کا دین مہر ایک

ہزار ہے اور مہر مثل بھی ایک ہزار ہے یا پانچ سو ہے ایسی صورت میں شرط پوری نہ ہونے پر دین مہر لازم ہوگا۔ (ہندیہ ۳؍۱۶۰)

(۳) اگر دین مہر اس کے مہر مثل سے کم ہے مثلاً مہر ڈیڑھ ہزار ہے اور دین مہر ایک ہزار ہے تو دیکھا جائے گا کہ اس شرط پوری ہونے سے خود بیوی یا اس کے قریبی رشتہ دار (ذی رحم محرم) کو نفع ہوتا ہے یا اس کا فائدہ کسی اجنبی کو مل رہا ہے، یا بیوی کو اس سے نقصان ہو رہا ہے، اگر اس شرط سے بیوی کو نقصان ہو رہا ہے یا کسی اجنبی کو فائدہ ہو رہا ہے تو ایسی صورت میں بھی شرط پوری نہ کرنے پر شوہر کو صرف دین مہر ہی لازم ہوگا (ردالمحتار ۳؍۷۵۲)

(۴) اگر اس شرط سے بیوی یا اس کے قریبی رشتہ دار کا ہی نفع مقصود ہے، تو دیکھا جائے گا کہ اس شرط سے جو نفع حاصل ہو رہا ہے وہ جائز ہے یا نہیں، اگر یہ جائز نہیں ہے، مثلاً کسی نے دین مہر کے ساتھ شراب یا خنزیر کی بھی شرط لگائی ہے تو ایسی صورت میں شرط پوری نہ کرنے پر متعین مہر ہی لازم ہوگا۔ (البحرالرائق ۳؍۱۶۰)

(۵) اور اگر مشروط چیز سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، اور شوہر نے شرط پوری نہیں کی تو ایسی صورت میں دین مہر کی جگہ مہر مثل لازم ہوگا، حاصل یہ ہے کہ مہر مثل کے لزوم کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں:

(۱) دین مہر اس کے مہر مثل سے کم ہو۔

(۲) اس شرط میں بیوی یا اس کے ذی رحم محرم کا نفع مقصود ہو۔

(۳) مشروط شئی مباح الانتفاع ہو۔

(۴) شوہر نے شرط پوری کی ہو، مثلاً کسی نے یہ شرط رکھی کہ بیوی کو شہر سے باہر نہیں لے جائے گا، یا یہ شرط رکھی کہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کرے گا، یا شرط لگائی کہ پہلی بیوی کو طلاق دیدے گا، یا یہ کہ بیوی کو عزت سے رکھے گا، اور اس سے سخت مشقت والا کام نہیں لے گا، یا یہ کہ بیوی کو ہدایا پیش کرے گا، وغیرہ اور ان تمام صورتوں میں دین مہر اس کے مہر مثل سے کم ہے تو اگر شوہر نے شرط پوری کر دی تو دین مہر لازم ہوگا اور شرط پوری نہ کرنے پر مہر مثل لازم ہوگا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عقد نکاح کے وقت پیش کردہ تیسری قسم کی شرائط بھی لازم الایفاء نہیں ہیں، وعدے کی حیثیت رکھتی ہیں، شوہر پوری کر دیتا ہے تو بہت بہتر ہے، لیکن اس کو اس پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، البتہ دین مہر پر اس کا اثر پڑتا ہے جس کی تفصیل بیان کی گئی۔

عقد نکاح کے وقت عورت کی جانب سے یہ شرط رکھی جائے کہ جب بھی چاہے اس سے طلاق واقع کرنے کا اختیار ہوگا یا فلاں فلاں صورتوں میں اسے طلاق واقع کرنے کا اختیار ہوگا، اور شوہر اس کو تسلیم کر لیتا ہے، تو یہ تفویض کا مسئلہ ہے، اس کی متعدد صورتیں ہیں اور حکم بھی مختلف ہے۔

(۱) اگر ایجاب شوہر کی جانب سے ہو اور اس نے کہا کہ میں نے تم سے اس شرط پر نکاح کیا کہ تم کو طلاق کا اختیار ہوگا، جب بھی تم چاہو اپنے اوپر طلاق واقع کر سکتی ہو، اور عورت نے قبول کر لیا تو ایسی صورت میں نکاح منعقد ہو جائے گا لیکن عورت کو طلاق کا اختیار نہیں ملے گا۔ (فصول عمادی ۱؍۵۲۲، بزازیہ ۱؍۱۲۸)

(۲) اگر عورت کی جانب سے ایجاب ہو اور اس نے کہا میں نے خود کو تمہاری زوجیت میں اس شرط پر دیا کہ مجھے طلاق کا اختیار حاصل ہوگا کہ جب بھی چاہوں اپنے اوپر طلاق واقع کر لوں اور شوہر نے قبول کیا تو ایسی صورت میں نکاح منعقد ہو جائے گا، اور عورت کو طلاق کا اختیار حاصل ہوگا، وہ جب چاہے خود پر طلاق واقع کر سکتی ہے۔ (بزازیہ ۱؍۱۲۸)

ان دونوں صورتوں میں دو مختلف حکم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تفویض طلاق کے درست ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک ہو، یا سبب ملک کی طرف اضافت ہو، یعنی تفویض طلاق نکاح کی حالت میں ہو، یا نکاح کی طرف مضاف ہو کر ہو، تب درست نہ ہوگی، مثلاً کسی شخص نے کسی اجنبی عورت سے "أمرك بيدك" کہا تو یہ لغو ہوگا، کیونکہ وہ اس کے نکاح میں نہیں ہے، بیوی سے کہے گا تو درست ہوگا، اور اس کو طلاق کا اختیار اس مجلس میں مل جائے گا، اجنبی عورت سے شرط نکاح کے ساتھ کہا: "إن تزوجتك فأمرك بيدك تطلقين متى شئت" تو یہ درست ہوگا، اور اگر اس عورت سے وہ شادی کر لیتا ہے تو عورت کو طلاق کا اختیار مل جائے گا۔

درج ذیل دونوں صورتوں کو سامنے رکھیں، تفویض طلاق کا اختیار شوہر کو ہے، پہلی صورت میں ایجاب شوہر کی جانب سے ہوا اور اس نے تفویض طلاق کی اور یہ تفویض، نکاح کی تکمیل سے پہلے ہوئی ہے، کیونکہ بیوی نے اس وقت قبول نہیں کیا تھا، بعد میں قبول کیا ہے، تو یہ تفویض نکاح کی حالت میں نہیں ہوئی اور نہ نکاح کی طرف اضافت کے ساتھ ہوئی ہے، اس لئے یہ لغو ہوگئی اور نکاح منعقد ہوگیا۔

دوسری صورت میں عورت کی طرف سے ایجاب ہوا اور اس نے یہ شرط پیش کی، شوہر نے قبول کرلیا، قبول کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے بھی اس شرط کو مان کر تفویض طلاق کردی، قبول کے ساتھ ہی نکاح مکمل ہوجاتا ہے، اس لئے تفویض طلاق نکاح کے ساتھ ہوئی اس لئے درست ہے۔ (قاضی خاں ۲۹۱/۳ فصول عمادی ۵۲۲/۱)۔

(۴) اگر ایجاب میں شوہر شرط نکاح کے ساتھ اس طرح تفویض کرے کہ میں نے تم سے اس شرط پر نکاح کیا کہ تمہیں نکاح کے بعد طلاق کا اختیار ہے، جب چاہو تم خود پر طلاق واقع کرسکتی ہو، اور عورت نے قبول کیا تو تفویض درست ہوگی اور عورت کو اختیار طلاق حاصل ہوگا۔ (بزازیہ ۱۲۸)

عقد نکاح میں شرط لگانے کے جو تین طریقے بتائے گئے ہیں، ان میں سے پہلا طریقہ کہ عقد نکاح سے پہلے ہی شرائط طے ہوجائیں، اور اس کی تحریر پر طرفین کے دستخط ہوجائیں، یہ ضروری نہیں ہے، مگر بہتر و مناسب ہے، البتہ تفویض طلاق کی اس صورت میں کہ شوہر نکاح سے پہلے تحریر کردے کہ اگر میں نے فلاں عورت سے نکاح کیا تو اس کو طلاق کا اختیار حاصل ہوگا، اور اس کے بعد ایجاب وقبول ہو جس میں شرط ذکر نہ کی جائے، تب بھی تفویض ہوجائے گی۔

اور دوسرا طریقہ کہ عقد نکاح میں ہی ان شرائط کا ذکر کیا جائے، ایجاب مشروط ہو یا ایجاب مطلق ہو اور قبول مشروط ہو، اصل یہی ضروری ہے، ایجاب وقبول میں ہی ان شرطوں کا ہونا ضروری ہے۔

اور تیسرا طریقہ کہ عقد نکاح کے بعد طرفین کے درمیان کوئی شرائط نامہ تحریر کیا جائے، اس سے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہے، البتہ نکاح کے وقت تفویض نہیں ہوئی، لیکن شوہر نکاح کے بعد تحریری طور پر بیوی کو طلاق واقع کرنے کا اختیار دے دیتا ہے تو یہ تفویض درست ہوجائے گی۔

نکاح کے وقت جب شوہر نے بیوی کو طلاق کا اختیار دے دیا کہ وہ جب چاہے اپنے اوپر طلاق واقع کرسکتی ہے تو اب معاملہ شوہر کے ہاتھ سے نکل گیا، وہ اس تفویض کو ختم نہیں کرسکتا ہے اور نہ اس کو ختم کرنے کا اختیار باقی رہا، تاحیات بیوی کو اس کا اختیار رہے گا۔ (البحر الرائق ۳۲۷/۳)

شریعت اسلامیہ نے خاص مصلحتوں کی وجہ سے طلاق کی ملکیت مرد کو دی ہے، عورت کو نہیں دی ہے، اس کی خاص وجوہات ہیں، یہاں ان کی تفصیل غیر ضروری ہے، اب اگر مرد کے ساتھ عورت کو بھی اس کا اختیار مل جائے اور نکاح کے وقت ہی تفویض کے مسئلہ کو عام کردیا جائے تو طلاق کے واقعات کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جائیں گے، ذرا ذرا سی باتوں پر بغیر سمجھے بوجھے عورتیں اپنے اوپر طلاق واقع کرنے لگیں گی، اس طرح یہ مسئلہ بہت ہی سنگین ہوجائے گا، جس کا کوئی حل نہیں ملے گا، اس لئے نکاح کے وقت تفویض طلاق کے مسئلہ کو عام کرنا، معاشرہ کے لئے انتہائی مضر ہوگا۔

بعض ایسے مسائل ضرور پیش آتے ہیں کہ شوہر کی طرف سے شدید ظلم وستم پایا جاتا ہے اور ستم رسیدہ بیوی کو گلوخلاصی بھی نہیں ملتی، وہ پریشان حال زندہ درگور رہتی ہے، ایسی صورت حال کی اصلاح کے لئے نکاح کے وقت بہت احتیاط کے ساتھ تفویض طلاق کی شرط لگائی جاسکتی ہے، مثلاً یہ کہ فلاں فلاں شدید حالتوں میں بیوی کو طلاق کا اختیار حاصل ہوگا، اس کے لئے فقہ کی اس عبارت سے رہنمائی مل سکتی ہے۔ (بزازیہ ۲۳۴/۱)

خلاصہ یہ کہ نکاح کے وقت تفویض طلاق کی شرط کو عام نہ کیا جائے، بلکہ شدید حالتوں میں منحصر کیا جائے، تاکہ اس کا بے جا استعمال شروع نہ ہوجائے۔

یہ سوال کہ طلاق کے بے جا استعمال کی روک تھام کے لئے نکاح کے وقت دو مختلف مہر متعین کئے جائیں، مثلاً یہ کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق نہیں دی تو مہر دس ہزار اور طلاق دے دی تو مہر بیس ہزار ہوا تاکہ اس خطیر رقم سے بچنے کے لئے شوہر بلا ضرورت طلاق کا اقدام نہ کرے، اور اس سے طلاق کے واقعات میں کمی واقع ہو، اس کے لئے ہمیں رہنمائی کتب فقہ میں مذکور اس جزئیہ سے ملتی ہے کہ نکاح میں ایک تقدیر پر ایک مہر اور دوسری تقدیر پر دوسرا مہر متعین کیا جائے، اس طرح کہ شوہر نے بیوی کو اسی شہر میں رکھا، باہر نہیں لے گیا، تو مہر ایک ہزار اور اگر نہیں ہے تو مہر دو ہزار وغیرہ، اس طرح مہر کی تعیین درست ہے، حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک پہلی صورت پائی جائے، یعنی شوہر بیوی کو شہر سے باہر نہیں لے جائے گیا، یا اس کی کوئی دوسری بیوی پہلے سے موجود تھی تو مہر مثل لازم ہوگا، جو دو ہزار سے زائد اور ایک ہزار سے کم نہ ہو، اور حضرات صاحبین کے نزدیک دونوں صورتوں میں ان کے متعین مہر لازم ہوں گے، جہاں ایک ہزار متعین ہوا ہے وہاں ایک ہزار اور جہاں دو ہزار متعین ہوا ہے وہاں دو ہزار۔ (فتح القدیر ۲۳۲/۳)

فقہ کی تمام کتابوں میں یہ جزئیہ موجود ہے، اس کو پیش نظر رکھنے سے اس مسئلہ کا حکم بھی نکل آتا ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ نکاح میں مہر کی تعیین اس طرح کی جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق نہیں دی تو دس ہزار اور اگر طلاق دیدی تو بیس ہزار، اس طرح مہر طے کرانا درست وصحیح ہے، اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عدم طلاق

کی صورت میں دس ہزار متعین مہر لازم ہوگا، اور طلاق دینے کی صورت میں مہر مثل لازم ہوگا جو دس ہزار سے کم اور بیس ہزار سے زائد نہ ہوگا، حضرات صاحبین کے نزدیک دونوں صورتوں میں ان کے متعین مہر ہی لازم ہوں گے، عدم طلاق کی صورت میں دس ہزار اور طلاق میں بیس ہزار۔

اس مسئلہ میں امام صاحبؒ کا قول راجح ہے، اصحاب متون نے اسی کو اختیار کیا ہے، لیکن اگر ضرورت متقاضی ہے اور حاجت داعی ہے تو صاحبین کو قول کے فتوی کے لئے اختیار کیا جاسکتا ہے۔

یہ مسئلہ کہ نکاح کرتے وقت اس طرح مہر متعین کیا جائے کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو مہر تیس ہزار ہوگا اور اس کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو مہر پندرہ ہزار ہوگا اس کا بھی وہی حکم ہے کہ امام صاحبؒ کے نزدیک اگر اس منکوحہ کی موجودگی میں اس نے دوسری عورت سے شادی نہیں کی تو پندرہ ہزار متعین مہر لازم ہوگا اور اگر کسی دوسری عورت سے شادی کرلی تو مہر مثل لازم ہوگا جو پندرہ ہزار سے کم اور تیس ہزار سے زیادہ نہ ہوگا، صاحبین کے نزدیک دونوں شرطیں صحیح ہیں، پہلی صورت میں پندرہ ہزار اور دوسری صورت میں تیس ہزار لازم ہوں گے۔

عقد نکاح میں پیشہ یا ملازمت کی خواہش میں عورت کی طرف سے یہ شرط لگائی جائے کہ وہ جس ملازمت سے وابستہ ہے شوہر شادی کے بعد اسے اس سے منع نہیں کرے گا، یا کوئی مناسب ملازمت ملنے پر شوہر اس کی اجازت دے گا اس سے نہیں روکے گا، اور شوہر نکاح میں اس کو قبول کرتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اس طرح شرطیں وعدے کی حیثیت رکھتی ہیں، شوہر انہیں پورا کردیتا ہے تو بہت بہتر ہے، ورنہ قانوناً اس کو اس کا پابند نہیں بنایا جاسکتا، شوہر اگر بیوی کو اس شرط کے باوجود ملازمت ختم کرنے کا حکم دیتا ہے تو بیوی کو اس کی اطاعت کرنی ہوگی، کیونکہ بیوی کو ملازمت سے روکنے کا شوہر کو اختیار ہے، اور شوہر کی اطاعت وفرمانبرداری اور اس کے حکم کی بجا آوری جائز کاموں میں بیوی پر واجب ہے۔ (ردالمحتار علی الدر مختار ۲/ ۴۳۶)

البتہ دین مہر پر اس کا اثر پڑے گا، جیسا کہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

☆☆☆

# عقد نکاح کو پائیدار اور مستحکم کرنے کے لئے شرائط

مولانا محمد فضل الرحمن رشادی[1]

عقد نکاح سے جو ذمہ داری کسی فریق پر عائد ہوتی ہے، عقد نکاح کے وقت اگر اسی کو شرط کی صورت میں ذکر کیا گیا، جیسے بیوی یہ شرط لگائے کہ نان ونفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا، تو یہ شرط غیر ضروری اور تحصیل حاصل ہے، شرط نہ ہونے کی صورت میں بھی نان ونفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہے، تاہم یہ شرط صحت نکاح میں مخل نہیں ہے اور شرط کا پورا کرنا واجب ہے۔

(۱) عقد نکاح کے وقت اگر کوئی فریق ایسی شرط لگائے جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے فرار وگریز ہو، مثلاً شوہر عند النکاح یہ شرط لگائے کہ بیوی کا نان ونفقہ اس کے ذمہ نہ ہوگا تو یہ شرط فاسد ہے، نکاح ہو جائے گا اور شرط باطل ہوگی، درمختار میں ہے:

''لا یبطل النکاح بالشرط الفساد وإنما یبطل الشرط دونه، یعنی لو حقد مع شرط فاسد لم یبطل النکاح بل الشرط''۔

یہاں دو چیزیں ہیں: (۱) معلق علی الشرط، (۲) مشروط بشرط فاسد۔

جس چیز کے پائے جانے کا احتمال ہے، مگر وہ موجود نہیں ہے نکاح اس پر معلق کرنا معلق بالشرط کہلاتا ہے، جیسے اس شرط پر نکاح کرنا کہ اگر فلاں راضی ہوا یا اگر کل بارش ہوئی یا فلاں مر گیا تو شرط اور نکاح دونوں باطل ہوں گے۔

مشروط بشرط فاسد سے مراد یہ ہے کہ عقد نکاح میں لوازم نکاح کے مخالف چیزوں کی شرط لگائے جیسے شوہر یہ کہے کہ مہر نہیں دوں گا، یا نفقہ خود عورت برداشت کرے گی، شرط باطل نکاح جائز قرار دیا جائے گا:

''المسلمون عند شروطهم ما وافق الحق قال القسطلانی والمراد شروط لا تنافی مقتضی عقد النکاح بل تکون من مقاصده کشروط العشرة بالمعروف وأن یقصر شئ من حقوقها''۔

عند النکاح کسی فریق کا ایسی کوئی شرط لگانا جس کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہو جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہ ہوتا ہو، اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی یا ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہ ہوتی ہو، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہ کرے گا، یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا، یہ صورت مقتضائے عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے شرط لغو اور نکاح جائز ہوگا، جہاں تک ہوسکے ایفاء وعدہ کی کوشش کرے، چونکہ قرآن کریم کی بے شمار آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے، خلاف کرنے کی صورت میں آثم وگنہگار ہوگا، مگر صحت نکاح میں فرق نہیں آئے گا: أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج" اس کے ذیل میں علامہ قسطلانی لکھتے ہیں: "وأما شرط یخالف مقتضاہ کشرط أن لا یتسری علیها ولا یسافر بها، فلا یجب الوفاء به، بل یلغو الشرط ویصح النکاح"۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے فتاوی باقیات صالحات کا ایک جواب بعینہ نذر قرطاس کرتا ہوں۔ سائل کا یہ قول کہ زید نے ہندہ سے بایں شرط نکاح کیا تھا کہ ہندہ سن بلوغ تک اپنے باپ ہی کے ہاں رہے۔ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ زید نے ہندہ سے نکاح کرتے وقت عین ایجاب میں یہ کہا ہو کہ ہندہ سے اس کے بلوغ تک اس کے ولی کے یہاں رہنے کی شرط پر نکاح کرتا ہوں، یا مذکورہ شرط پر قبول کرتا ہوں، یعنی ایجاب وقبول جو رکن

[1] استاذ سبیل المؤمنین آننت پور، آندھرا پردیش

عقد ہے اسی میں شرط کو داخل کیا ہو تو وہ شرط خود باطل ہے اور نکاح صحیح ہے۔

''والنکاح لا یصح تعلیقه بالشرط ولا إضافته ولکن لا یبطل بالشرط ویبطل الشرط''۔ (فتاویٰ عالمگیری)

اگر اس سے فقط وعدہ مراد ہے تب بھی اس کا وفا کرنا قضاءً لازم نہیں ہے، چنانچہ ''فتاویٰ حامدیہ'' میں ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے: "لا یلزمه الوفاء بالوعد شرعا وإن أوفى فبها ونعمت" ہاں عند اللہ گنہگار ہوگا۔ اللہ جل شانہ قرآن شریف میں ارشاد فرماتا ہے: "وأوفوا بالعهد إن العهد کان مسئولا" (سورۂ اسراء: ۳۴) اور حدیث شریف میں وعدہ خلافی کا علامات نفاق میں سے ہونا ثابت ہے (فتاویٰ باقیات صالحات ص ۱۵۸۔۱۵۹)

عقد نکاح کے وقت اگر عورت یہ شرط لگائے کہ اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، یا فلاں فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا اور شوہر اس شرط کو تسلیم کرلے۔ یہ تفویض طلاق ہے اور طلاق کا اختیار مذکورہ شرطوں کے پائے جانے کے وقت عورت کو حاصل ہوگا۔

اگر کسی نے اپنی عورت سے کہا کہ "طلقي نفسك متى شئت" جب چاہے تو اپنے کو طلاق دے لے، تو عورت کو اختیار ہے چاہے وہ مجلس میں طلاق دے یا بعد میں، اس لئے کہ ''متی'' سارے وقت کے لئے عام ہے گویا ایسا ہوا، جیسا کہ اس نے کہا ہو کہ جس وقت بھی چاہے تو اپنے پر طلاق واقع کرلے، اگر اس نے کسی دوسرے آدمی سے کہا کہ میری عورت کو طلاق دے، تو اس کو مجلس اور بعد مجلس بھی طلاق کا اختیار حاصل رہتا ہے، اور شوہر کو رجوع کا حق حاصل ہوگا، اس لئے کہ یہ وکالت ہے اور اپنی بیوی کی طلاق میں استعانت و مدد طلب کر رہا ہے، یہ وکالت نہ لازم ہے اور نہ ہی مجلس تک موقوف ہوتی ہے، برخلاف پہلے مسئلہ کے، اس لئے کہ وہاں عورت اپنے لئے طلاق دے رہی ہے، یہ تملیک ہے توکیل نہیں۔

تفویض تملیک، یعنی مالک بنانے کو کہتے ہیں نہ کہ وکیل بنانے کو، چاہئے کہ عورت اسی مجلس میں تفویض کو قبول کرلے۔ تملیک سے رجوع صحیح نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر اس نے عورت کو اختیار طلاق دینے کے بعد قسم کھائی کہ وہ عورت کو طلاق نہیں دے گا۔ پس عورت خود اپنے کو طلاق دے لے تو شوہر صحیح قول کے موافق حانث نہیں ہوگا، کیونکہ شوہر کی تفویض طلاق کی وجہ سے عورت کو ملکیت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ فعل عورت کا شمار ہوگا (برخلاف توکیل کے، کیونکہ وکیل کا فعل مؤکل کا فعل شمار ہوگا) مسئلہ تفویض میں عورت کو مجلس تک ہی اختیار رہے گا اگر وہ بعد میں طلاق دے تو وہ معتبر نہیں ہوگا، مگر یہ کہ شوہر "طلقي نفسك" اور اس جیسے جملوں کے ساتھ "متى ما شئت إذا شئت، إذا ما شئت" جب چاہے اور جس وقت چاہے جیسے کلمات حروف بڑھائے تو مجلس کی قید نہیں ہوگی۔ جب چاہے عورت کو طلاق کا اختیار حاصل رہے گا، اور شوہر کو تفویض کے بعد رجوع کا حق حاصل نہیں ہوگا:

''اگر شوہر نے تفویض کے بعد بیوی کو طلاق بائن دی تو عورت کا اختیار طلاق باطل ہوگا یا نہیں؟ اگر تفویض منجز تھی، یعنی شرط پر معلق نہ تھی تب تو اس کا اختیار باطل ہوگا، اس لئے کہ اگر اختیار باطل نہ ہو تو بائن کا بائن کو لاحق ہونا لازم آتا ہے، جبکہ یہ جائز و درست نہیں اور اگر تفویض معلق تھی اس طرح کہ اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تیرا معاملہ طلاق تیرے ہاتھ میں ہے یا تفویض مؤقت ہو اس طرح کہ تیرا معاملہ طلاق کل تک تیرے ہاتھ میں ہے تو اختیار باطل نہیں ہوگا، اس لئے کہ بائن معلق اور بائن مؤقت کا ملحق ہونا جائز ہے، لیکن ''البحر الرائق'' میں ''قنیہ'' سے منقول ہے کہ ظاہر الروایہ یہ ہے کہ تفویض معلق تفویض منجز کی طرح ہے، مطلب یہ کہ دونوں صورتوں میں سے کسی میں اختیار باقی نہیں رہے گا'' (درمختار اردو)

غیاثیہ میں ذکر کیا گیا ہے: ''کوئی شخص اپنی زوجہ سے کہے کہ تیرا معاملہ طلاق تیسرے سپرد ہے جس وقت تو میری زوجہ ہے، تو یہ اختیار محض اس وقت تک باقی رہے گا جب تک اس کے نکاح میں رہے گی پس اگر بائن طلاق دے دے تو اختیار باقی نہیں رہے گا، اور رجعی طلاق دی گئی ہو تو باقی رہے گا، ایسے ہی اگر یہ کہے کہ تیرا معاملہ طلاق تیرے سپرد ہے اور اس کے بعد بائن طلاق دے دے اور پھر اسی کے ساتھ نکاح کرلے اس بارے میں دونوں طرح روایتیں ہیں، زیادہ ظاہر قول کے مطابق اختیار باطل نہ ہوگا، اسی قول پر فتویٰ دیا گیا ہے'' (تاتارخانیہ)

اگر خاوند زوجہ کو اختیار طلاق عطا کرے پھر بائن طلاق دے دے تو بموافق ظاہر روایت اختیار طلاق اس کے قبضہ میں باقی نہ رہے گا۔ ایک رجعی طلاق دینے کی صورت میں اختیار طلاق ختم نہ ہوگا اور علماء کہتے ہیں کہ یہ حکم اس صورت میں ہوگا جبکہ اختیار طلاق کسی شرط پر موقوف نہ ہو، اگر کسی شرط پر موقوف و معلق ہو، جیسے یہ کہے کہ اگر تجھے زد و کوب کردوں تو تیرا معاملہ طلاق تیرے سپرد ہے اور اختیار دینے کے بعد پھر اس کے ساتھ خلع

کرلے، یا بائن طلاق دے دے تو اختیار باقی رہے گا، پس اگر اس کے ساتھ از سر نو نکاح کرلے اور پھر زدوکوب کرے تو اسے اختیار طلاق حاصل ہوگا، چاہے دوران عدت دوبارہ نکاح کیا گیا ہو یا بعد عدت (ذخیرہ، فتاویٰ عالمگیری، اردو)۔

## تفویض قبل النکاح:

''زوجني ابنتك على أن أمرها بيدك لم يكن له الأمر لأنه تفويض قبل النكاح'' (درمختار)۔

کوئی اس شرط پر نکاح کرے کہ تم اپنی لڑکی کا نکاح میرے سے کردو معاملۂ طلاق تمہارے ہاتھ میں ہوگا تو اسے طلاق کا اختیار حاصل نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ تفویض قبل النکاح ہے۔

''إذا ابتدأت المرأة فقالت: زوجت نفسي منك على أن أمري بيدي اطلق نفسي كلما أريد أو على اني طالق فقال الزوج قبلت أما لو بدأ الزوج لا تطلق ولا يصير الأمر بيدها كما في البحر عن الخلاصة والبزازية انتهى''۔

جب ایجاب (ابتدائے کلام) عورت کی طرف سے ہو، پس وہ کہے کہ میں تیرے ساتھ نکاح اس شرط پر کرتی ہوں کہ معاملۂ طلاق میرے ہاتھ میں ہوگا کہ میں جب چاہوں گی اپنے پر طلاق واقع کرلوں گی یا یہ کہ میں طالق ہوں۔ شوہر نے کہا کہ میں نے قبول کیا تو یہ تفویض صحیح ہے، اگر ابتدائے کلام (ایجاب) مرد کی جانب سے ہو تو عورت کو نہ طلاق کا اختیار حاصل ہوگا اور نہ ہی وہ معاملۂ طلاق میں خود مختار ہوگی۔

ابتدائے کلام یعنی ایجاب مرد کی جانب سے ہو اور لڑکی والے قبول کے ساتھ تفویض طلاق کی شرط لگادیں تو نکاح بلاکسی شرط کے صحیح ہوجائے گا اور شرط بالکل بیکار جائے گا (الحیلۃ الناجزۃ)۔

نکاح میں شرط کی جو تین صورتیں سوالنامہ میں بیان کی گئیں ان کے احکام درج ذیل ہیں:

(۱) عقد نکاح سے پہلے شرائط طے ہوجائیں اور تحریر پر طرفین کے دستخط ہوجائیں بشرطیکہ نکاح کی طرف نسبت واضافت ہو تو شرط کے پائے جانے کی صورت میں عورت کو اختیار طلاق حاصل ہوگا ''تنحل الیمین بعد وجود الشرط مطلقا'' اگر نکاح کی طرف اضافت نہ ہو تو شرائط نامہ بے کار ہوگا۔

(۲) عقد نکاح میں ہی ان شرائط کا ذکر ہو تو ضروری ہے کہ ایجاب مع شرائط عورت کی جانب سے ہو اور مرد اسے قبول کرلے تو تفویض صحیح ہے، اگر اس کے برعکس ہو، یعنی ایجاب طلاق مرد کی جانب سے ہو اور عورت والے مع شرائط قبول کریں تو یہ صحیح نہیں، دلائل آگے گزر چکے ہیں۔

ہاں اگر عورت کی جانب سے ایجاب مطلق ہو اور مرد نے قبول میں تفویض طلاق کی شرط کا ذکر کردیا تو تفویض صحیح ہوگی، اس صورت میں یہ خامی ہے کہ عورت کی جانب سے اولا بلاکسی شرط کے ایجاب ہونے کی وجہ سے معاملہ عورت کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور مرد خود مختار ہوجاتا ہے۔ اب اس پر عورت والوں کی جانب سے کسی قسم کا دباؤ نہیں ہوسکتا، لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ ایجاب کی صورت میں عورت، یا اس کے ولی کی جانب سے پہلے ہی شرائط کا ذکر کردیے جائے۔

(۳) عقد نکاح کے بعد عاقدین کی جانب سے شرائط نامہ تحریر ہو تو یہ بھی درست ہے اور عورت کو طلاق کا اختیار حاصل ہوجاتا ہے، دوسری صورت میں ذکر کردہ خامی یہاں بھی موجود ہے کہ عورت کے ہاتھ سے معاملہ نکل جاتا ہے اور مرد کی مرضی پر ہی یہ شرائط معرض وجود میں آسکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ طلاق ہے، طلاق کی وجہ سے نہ صرف دودلوں بلکہ دوخاندانوں میں دراڑ اور دوری پیدا ہوتی ہے۔ بدرجۂ مجبوری وہ بھی حالت طہر میں عورت کو طلاق دینے کی اجازت دی گئی ہے، بیک وقت تین طلاق دینے پر حضور نے شدید ترین غصہ اور نفرت کا اظہار فرمایا ہے، مرد چونکہ عورت کی بہ نسبت سنجیدہ تجربہ کار اور کامل العقل ہے، لہٰذا طلاق کا اختیار بھی اسلام نے اسی کو دیا ہے، تاکہ وہ حالات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لے اور سوچ سمجھ کر قدم بڑھائے، عورت چونکہ فطری طور پر جذباتی اور ناقص العقل ہے، اس لئے عورت کو طلاق کا اختیار نہیں دیا گیا، مرد کے طلاق دئے بغیر چارہ کار نہیں چاہے عورت ہزار کوشش کرے وہ نکاح سے علیحدہ نہیں ہوسکتی، تفویض طلاق کی

صورت میں یہ اختیار عورت کو حاصل ہوتا ہے، لہٰذا شرائط نامہ تحریر کرتے وقت اس امر کا خاص کر لحاظ رکھیں کہ بالکلیہ اور علی الدوام عورت کو اختیار طلاق حاصل نہ ہو، ورنہ بہت سارے فتنے جنم لے سکتے ہیں، لہٰذا یہ شرط بھی مذکور ہو کہ شرط کی خلاف ورزی یا عورت کی تکلیف شدیدہ کی صورت میں جسے مذکورہ دس افراد میں سے کم از کم دو آدمی تسلیم کرلیں اور عورت کے لیے علیحدگی کو مناسب بھی قرار دیں تو عورت کو اسی وقت یا شرط کی خلاف ورزی کے ایک ماہ تک مہر معاف کر کے اپنے او پر ایک طلاق بائن واقع کر لینے کا اختیار ہوگا اور یہ اختیار ایک ہی نکاح تک محدود ہوگا، اگر کسی وقت فرقت وعلیحدگی کے بعد اعادہ نکاح ہو تو اس کے بعد یہ اختیار اور شرائط نہیں، بلکہ اس وقت جو کچھ دوبارہ طے ہو جائے اس کے موافق عمل درآمد ہوگا، اکثر شرائط ''الحیلۃ الناجزۃ'' سے مستفاد ہیں۔

طلاق ایک ناپسندیدہ عمل ہے، بعض ناگزیر حالات میں ایک ضرورت بھی، لہٰذا طلاق کے غلط اور بیجا استعمال کو روکنے کے لیے عقد نکاح کے وقت اگر اس طرح مہر طے کریں کہ شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کو بیس ہزار مہر دینا ہوگا۔ اگر اس نے طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار ہوگا، اسی طرح اگر شوہر نے اس دولہن کی موجودگی میں زوجیت میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس عورت (دولہن) کا مہر تیس ہزار ہوگا اور اگر اس کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر پندرہ ہزار ہوگا، اس طرح کا مہر طے کرنا درست ہے، بہر صورت مہر مسمی لازم ہے اور صاحبین کے قول پر فتویٰ درست ہوگا، اس کی نظیریں ہدایہ اور خود سوالنامہ میں تاتارخانیہ سے منقول مسائل ہیں۔

''إذا تزوجها على ألف إن لم تكن له امرأة وعلى ألفين إن كانت له المرأة وعلى ألف إن لم يخرجها من البلدة وعلى ألفين إن أخرجها، فالنكاح جائز، فقال أبو يوسف ومحمد: جائزان''۔

(اس شرط پر نکاح کرے کہ اگر پہلے سے اس کی بیوی نہیں ہے تو مہر ایک ہزار اور اگر پہلی بیوی موجود ہے تو دو ہزار، اسی طرح عورت کو اس کے آبائی وطن سے باہر نہیں لے گیا تو ایک ہزار اور اگر باہر لے جائے تو دو ہزار مہر کی رقم ادا کرنا ہوگا، تو نکاح جائز ہے۔ اور صاحبین کے نزدیک مہر مسمی لازم ہوگا)۔

عورتوں کو ملازمت اور نوکری کی اجازت نہیں دینی چاہئے، اس سے بے شمار مفاسد پیدا ہوتے ہیں، بے حجابی، شوہر کی ناقدری، نامحرموں سے گفتگو وغیرہ، اگر نکاح کے وقت عورت نے اپنے ہونے والے شوہر سے یہ شرط لگائی کہ شوہر اسے موجودہ ملازمت سے نہیں روکے گا یا اگر آئندہ کوئی مناسب ملازمت ملے تو اسے ملازمت کرنے سے نہیں روکے گا، عقد نکاح کے وقت شوہر اس شرط کو تسلیم کرلے تو شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل اور نکاح جائز ہے، ایفاء شرط لازم نہیں ہے: "لا يلزمه الوفاء بالوعد شرعا وإن أوفى فبها ونعمت" ہاں اگر عورت شریعت کے حدود میں رہ کر ملازمت کررہی ہے تو بلاوجہ روکنا عہد کے خلاف ہونے کی وجہ سے گناہ ہے، عورت کو فسخ نکاح کا کوئی اختیار نہیں ملے گا اور شوہر کے حکم کی تعمیل لازم وضروری ہوگی، گذشتہ صفحات میں دلائل آچکے ہیں۔

☆☆☆

# نکاح میں زوجین کے لئے قابل قبول شرائط کا مسئلہ

مولانا عمران قاسمی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے نکاح کو نہ صرف توالد وتناسل اور انساب کی حفاظت کا ذریعہ بنایا ہے، بلکہ اس تعلق سے جو اتحاد واتفاق اور الفت ومحبت پیدا ہوتی ہے، اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ لڑکا کہیں کا ہوتا ہے، لڑکی کہیں کی ہوتی ہے، اس قدر اجنبیت کے باوجود نکاح کا رشتہ ان دونوں میں قائم ہوتے ہی ساری اجنبیت اور ان کا بُعد ختم ہو جاتا ہے، ان دونوں کے دلوں میں قدرتی طور پر الفت ومحبت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ انس ومحبت وقتی نہیں ہوتی ہے، بلکہ جوں جوں زندگی کے ایام گزرتے جاتے ہیں، اس میں کمی کے بجائے برابر اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ قرآن نے اسی الفت ومحبت کی تعبیر اس طرح کی ہے:

''ومن آیاته أن خلقکم من أنفسکم أزواجا لتسکنوا إلیها وجعل بینکم مودة ورحمة''۔ (سورۂ روم: ۲۱)

(اس کی اونچی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ ہم نے تمہارے جی سے تمہارا جوڑا بنایا کہ تم ان سے جی ٹھنڈا کرو اور تمہارے درمیان پیار ودلداری کے جوت جگادئے)۔

''وهو الذی خلق من الماء بشرا فجعله نسبا وصهرا وکان ربك قدیرا'' (سورۂ فرقان: ۵۴)

(وہ خدا ہی کی ذات ہے جس نے پانی کے قطرے سے جیتا جاگتا انسان پیدا کیا اور اس کو خاندان وسسرال والا بنایا اور تمہارا پروردگار بڑی قدرت والا ہے)۔

شریعت نے عورت ومرد کے درمیان ہونے والے عقد کو قابل احترام قرار دیا اور متعینہ حدود میں رہ کر زندگی گزارنے کے طریقے بتائے، ان ہی قوانین وضوابط میں سے ایک اہم قانون وضابطہ اشتراط فی النکاح ہے۔

شروط فاسدہ سے نکاح باطل نہیں ہوتا، لہٰذا نکاح میں اگر کوئی شرط لگائی گئی ہو جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے انحراف وگریز ہو تو اس شرط کی وجہ سے نکاح باطل قرار نہیں دیا جائے گا، شرط کو دیکھنے کے بعد ہی کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

مثال کے طور پر شوہر شرط لگائے کہ وہ مہر نہیں دے گا، تب بھی فقہائے کرام نے صراحت کی ہے کہ شوہر پر مہر مثل بہر حال واجب ولازم ہوگا، خواہ شوہر وطی کرے یا مر جائے۔

صاحب ''ہدایہ'' نے لکھا ہے:

''وإن تزوجها ولم یسم لها مهرا أو تزوجها علی أن لا مهر لها فلها مهر مثلها إن دخل بها أو مات عنها'' (هدایه ۲- ۳۲۲)

اسی طرح اگر کسی عورت نے اپنی باری اپنی کسی سوکن کو دے دی پھر بھی اس سوکن کو اپنی دی ہوئی باری سے رجوع کر لینے کا حق ہوگا۔

ہدایہ میں ہے:

''ولها أن ترجع فی ذلك، لأنها اسقطت حقا لم یجب بعد فلا یسقط'' (هدایه ۲:۳۲۹)

اسی طرح نفقہ بھی واجب ہوتا ہے لہٰذا کسی عورت نے اپنا نفقہ معاف کر دیا یا معافی ہی کی شرط کے ساتھ عقد نکاح کیا تو بھی عورت کو نفقہ کے مطالبہ کا حق ہوگا۔ فقہ کی یہ عبارت اسی کی طرف مشیر ہے: ''لأنها اسقطت حقا لم یجب بعد فلا یسقط''۔

مزید اس سلسلہ میں ''فتح القدیر'' کی مندرجہ ذیل عبارت سے واضح روشنی ملتی ہے:

''وإبراء الزوجة من النفقة هل يصح ويلزم، إن كانت غير مفروضة لا يصح. لأنه إبراء قبل الوجوب. وإن كان القاضي فرضها كل شهر كذا أو كذا صح في الشهر الأول فقط. وكذا لو قالت: ابرأتك من نفقة سنة لا يبرأ إلا من شهر إلا أن يكون فرض لها كل سنة كذا؛ لأن القاضي إذا فرض كذا كل شهر، فإنما فرض مهما يتجدد الشهر فما لم يتجدد لم يتجدد الفرض وما لم يتجدد الفرض لم يجب نفقة الشهر. فلا يصح الإبراء عنها ولو ابرأته بعد ما مضى الشهر عما مضى وعما يستقبل برئ عما مضى وعن شهر'' (فتح القدير ۲۔ ۳۹۲۔ ۳۹۵)

اسی طرح ایسی شرط لگانا جس کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہے جو غیر مشروط نکاح میں حاصل نہیں ہوتا اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی عائد ہوتی ہے جس غیر مشروط نکاح میں عائد نہیں ہوتی، مثال کے طور پر عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کرے گا یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی دوسری جگہ نہیں لے جائے گا، ان شرائط کا بھی نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور نکاح صحیح قرار پائے گا۔

لیکن اگر شرط ایسی ہو جس سے صرف عورت کو فائدہ ہو اور کسی دوسرے کو نقصان بھی نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ شوہر اس شرط کی پابندی اس وقت تک کرے جب تک نکاح کے مقاصد فوت نہ ہوں۔ مثال کے طور پر عورت نے یہ شرط لگائی کہ شوہر اس کو اس کے آبائی وطن سے باہر نہیں لے جائے گا لہٰذا اس صورت میں اگر شوہر کو کسی دوسرے ملک میں ملازمت مل گئی یا اس کا تبادلہ ایسی جگہ ہو گیا جہاں رہ کر اسے بیوی کے حقوق ادا کرنے میں نہایت دشواری ہو رہی ہو تو اس شرط کے پورا کرنے کا مطلب یہی ہوگا کہ شوہر بیوی کو طلاق دے کر اپنے سے جدا کر دے یا پھر عورت کے حقوق کی ادائیگی سے بالکل لاپروا ہو جائے۔ ان دونوں صورتوں کے مقابلہ میں مناسب یہی ہے کہ بیوی کو اپنے ہمراہ لے کر جائے مگر اس طرح کی شرط کو قضاءً لازم الایفاء قرار دینے کی صورت نہیں ہے۔

اسی طرح کوئی ایسی شرط لگائی کہ اس کے پورا کرنے میں دوسرے کو نقصان ہوگا، اس طرح کی شرط کو پورا کرنا جائز ہی نہیں ہے۔

مثال کے طور پر کوئی عورت یہ شرط لگائے کہ شوہر اپنی فلاں بیوی کو طلاق دے دے گا۔ ان صورتوں میں اگر عورت کا مہر مثل مسمی سے زیادہ ہے تو عدم ایفاء شرط کی صورت میں عورت کو مہر مثل ملے گا۔

''قد تقدم إن النكاح لا يبطل بالشروط الفاسدة فإذا تزوج على ألف على أن لا يخرجها من البلدة أو على أن لا يتزوج عليها أو على أن يطلق فلانة فالنكاح صحيح وإن كان شرط عدم التزوج وعدم المسافرة وطلاق الضرة فاسدا لأن فيه المنع عن الأمر المشروع'' (عناية على هامش فتح القدير ۲۔ ۳۵۰)

صاحب ''فتح القدیر'' لکھتے ہیں:

''وهذه الشروط تمنع التزوج والتسري لوجوب الجري على موجبها فكانت باطلة'' (فتح القدير ۲۔ ۳۵۱)

صاحب ''ہدایہ'' فرماتے ہیں:

''إذا تزوج على ألف على أن لا يخرجها من البلدة أو على أن لا يتزوج عليها أخرى. فإن وفى بالشرط فلها المسمى وإن تزوج عليها أخرى أو أخرجها فلها مهر مثلها'' (هدايه ۲۔ ۳۲۹)

نکاح کے وقت تفویض طلاق کے سلسلہ میں حضرت تھانوی نے اپنی کتاب ''الحیلۃ الناجزۃ'' میں جو کچھ لکھا ہے، اس باب میں وہی باتیں کافی ہیں۔ اب اس میں مزید اضافہ کی ضرورت نہیں ہے، وہ باتیں اپنی جگہ کافی وشافی ہیں۔

حضرت تھانوی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ ملاحظہ ہو: (الحیلۃ الناجزۃ ص ۳۱ تا ۳۸)۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے طلاق دینے کو برا سمجھا ہے، صرف ناگزیر صورت میں اس کی اجازت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی اسے بے محل استعمال کرے یا اسے کھیل بنالے، اس سے عورتوں پر ظلم وزیادتی مقصود ہو تو پھر اس کی نوعیت بدل جاتی ہے اور عنداللہ وہ اقدام ناپسندیدہ شمار ہوتا ہے چونکہ اس کی وجہ سے دو خاندانوں کا اتفاق واتحاد تباہ وبرباد ہو جاتا ہے، بلکہ آئندہ چل کر معاشرہ اور خاندانوں پر ناقابل تلافی اثر پڑتا ہے، لیکن اگر ازدواجی زندگی الفت ومحبت کے

بجائے عداوت ودشمنی میں بدل جائے اور نباہ کی کی صورت نہ ہو تو شریعت غراء نے ان ناگزیر حالات میں طلاق کی اجازت ہی نہیں دی، بلکہ اس فعل کو مباح ومستحسن قرار دیا ہے، تا کہ آلام ومصائب میں مبتلا زوجین کو چھٹکارا مل سکے۔

مسلم معاشرہ میں وقوع طلاق کا معاملہ جس قدر مشہور ہے، واقعہ یہ ہے کہ اتنا نہیں ہے اور طلاق ثلاثہ یا طلاق کی کثرت کو روکنے کے لئے پابندیاں عائد کر کے طلاق دشوار بنانا تو یہ بالکل غیر مناسب بات ہوگی، چونکہ مسلم سماج میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ میاں بیوی کے درمیان نشوز وشقاق ہے اور نشوز وشقاق اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ فرقت ضروری ہے، مگر زیادتی مہر کے ڈر سے طلاق نہیں دیتا کہ بعد طلاق مہر ادا کرنا پڑے گا۔ اب نتیجہ یہ ہوگا کہ عورت کالمعلقہ ہو کر رہ جائے گی یا پھر حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہو جائیں کہ معافی مہر کے عوض میں طلاق حاصل کر لے۔

ایسی صورت میں یہ بات بہت قرین قیاس تھی کہ اگر مہر کی تعداد کم ہوتی تو شوہر طلاق دے دیتا اور عورت مہر پانے کی حقدار بھی ہو جاتی۔

رہا طلاق ثلاثہ یا طلاق کی کثرت کا معاملہ تو یہ درحقیقت جہالت کی بنیاد پر ہے۔ اس کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے مقدار مہر کو بڑھانے کی بات کرنا درست نہیں ہے۔

چونکہ اگر ایک شخص فرقت اختیار کرنے پر بالکل آمادہ ہو جائے تو بہر حال مہر کی مقدار جو بھی ہو اس کو ادا کر کے الگ ہو سکتا ہے۔ ہاں اس کی بہتر شکل یہ ہے کہ مسلم سماج کو ان مسائل سے زیادہ سے زیادہ واقف کرایا جائے، ان پر عمل کرنے کی ترغیب دلائی جائے۔

ان حالات کے باوجود اگر مہر اس طرح طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے طلاق نہیں دی تو مہر دس ہزار روپے ہوگا اور اگر ایک طلاق دی تو مہر بیس ہزار اور اگر تین طلاق دی تو مہر تیس ہزار روپے، اس طرح کی شرطیں لگانا درست ہے۔ اب رہا مسئلہ وجوب مہر کا تو وہ حالات کے مطابق ہوگا۔ اگر نکاح کرتے وقت مہر اس طرح طے ہو کہ منکوحہ کے نکاح میں رہتے ہوئے اگر شوہر نے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس کا مہر بیس ہزار روپے ہوگا اور اگر اس کے عقد نکاح میں رہتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر دس ہزار روپے ہوگا۔ یہ دونوں شرطیں بھی درست ہیں، بیوی کو آبائی وطن میں رکھنے یا لے جانے میں ایک ہزار اور دو ہزار مہر طے ہو تو صاحبین کے نزدیک دونوں شرطیں جائز ہیں۔

ہدایہ میں ہے:

''الشرطان جائزان حتی کان لها الألف إن أقام بها والألفان إن أخرجها'' (ہدایہ ۲:۳۲۹)

بیوی کے اقامت واخراج اور اس کی موجودگی میں دوسری عورت سے نکاح یا عدم نکاح میں کوئی فرق نہیں پڑنا چاہئے، چونکہ جس طرح صاحبین کے یہاں اقامت واخراج کے سلسلہ میں دونوں شرطیں درست ہیں۔

اسی طرح تزوج وعدم تزوج میں بھی دونوں شرطیں درست ہوں گی۔

''فكان لها عشرة آلاف إن لم يتزوج عليها أخرى وعشرون إن تزوج عليها أخرى''۔

اگر شوہر کے حقوق میں بیوی کی ملازمت سے نقصان وضرر ہو تو شوہر کو اختیار ہے کہ اس کو ایسی ملازمت سے روک دے۔ ہاں ایسی ملازمت جس سے شوہر کے حق میں نقصان نہ ہو تو اس طرح کی ملازمت سے روکنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

اگر شوہر نے نکاح کے وقت یا بعد نکاح کسی ایسی نوکری کی اجازت دے دی جس سے شوہر کے حقوق میں نقصان ہوتا ہے تو شوہر اس اجازت کو واپس لے سکتا ہے۔

''ويلاحظ أن رضاه باحترافها وقتا ما لا يمنع عدم رضاه في غيره''۔ (الاحوال الشخصیہ ص ۲۳۹)

''والذي ينبغي تحريره أن يكون له منعها من كل عمل يؤدي إلى تنقيص حقه أو ضرره أو إلى خروجها من بيته، أما العمل الذي لا ضرر له فيه فلا وجه لمنعها عنه خصوصاً في حال غيبته من بيته، فإن ترك المرأة بلا عمل في بيتها يؤدي إلى وساوس النفس والشيطان أو الاشتغال بما لا يعني مع الأجانب والجيران'' (رد المحتار، باب النفقہ ۲-۶۵)

***

# نکاح میں شرائط کا حکم

مفتی حبیب اللہ قاسمی

اس میں شک نہیں کہ اسلام رشتۂ نکاح کو پائیدار اور مستحکم دیکھنا چاہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے باہمی تعلقات کی خوشگواری کے لئے کچھ اہم و رہبر اصول بھی بتلائے ہیں، لیکن اسلامی تعلیمات سے دوری اور ناواقفیت کا یہ نتیجہ ہے کہ اکثر رشتے غیر یقینی صورت حال کے شکار ہیں، اور حدود و قیود کے متلاشی ہیں۔

نکاح سے قبل جہاں رسومات غیر شرعیہ کی تکمیل کی طرف پوری توجہ دی جاتی ہے، اگر صرف ایک عشرہ دولہا کسی صحیح عالم کی صحبت میں رہ کر مسائل نکاح وطلاق اور حسن معاشرت کی تعلیم حاصل کرے، اسی طرح بننے والی دلہن کو ایک عشرہ خالص دینی معلومات فراہم کی جائیں تو یقیناً دونوں کی زندگی میں اسلامی تعلیمات کی روشنی ہوگی، جس کے نتیجہ میں دونوں کی زندگی خوشگوار بنے گی۔

لیکن افسوس اس انداز کی تعلیمات کی طرف امت کی کوئی توجہ نہیں، جس کا لازمی نتیجہ آج سب کے سامنے ہے، اس مختصر سی تمہید کے بعد سوالات کے جوابات سپرد قلم ہیں، لیکن چند اصول جزئیات سے قبل قابل ذکر ہیں۔

۱۔ نکاح کی تین قسمیں ہیں۔(۱) منجز، (۲) مشروط، (۳) معلق۔ علامہ شامیؒ و دیگر فقہاء کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نکاح کی یہ تینوں شکلیں قابل قبول واعتبار ہیں۔

۲۔ شرائط کی دو قسمیں ہیں: (۱) شرط صحیح، (۲) شرط فاسد

۳۔ شرط فاسد سے نکاح فاسد نہیں ہوتا، بلکہ شرط فاسد ہو جاتی ہے اور نکاح صحیح ہو جاتا ہے۔ (بدائع ۲/۲۷۳)

۴۔ تفویض شرعاً ایک درست عمل ہے۔ تفویض کی تین قسمیں ہیں: (۱) تخییر (۲) امر بالید (۳) مشیت، ان کی تفصیلات کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

۵۔ ایسی کوئی بھی شرط جس سے تحلیل حرام اور تحریم حلال لازم آئے، شرعاً غیر معتبر ہے، واجب الایفاء نہیں، جیسا کہ خود اللہ کے رسول ﷺ کے ارشادات میں بھی صراحتاً یہ چیزیں موجود ہیں، ان چند اصولوں کے بعد سوال نامہ میں مذکور جزئیات سپرد قرطاس ہیں:

(الف) بیوی کا نان ونفقہ شوہر پر واجب ہے چند شرائط کے ساتھ، جن کی تفصیلات کتب فقہ میں مذکور ہیں، اگر وجوب نفقہ کی ساری شرطیں موجود ہوں تو شریعت بیوی کو یہ حق دیتی ہے کہ شوہر سے اپنا نان ونفقہ وصول کرلے، لیکن اگر کوئی صاحب حق اپنے حق کو ساقط کردے تو شریعت نے یہ حق بھی صاحب حق کو دیا ہے، لہذا اگر کوئی عورت بلا جبر واکراہ طوعاً اپنا حق واجبی (نان ونفقہ) ساقط کردے تو اس سے نہ نکاح متاثر ہوگا اور نہ ہی بیوی کو مطالبہ یعنی نفقہ کا حق ہوگا۔

(ب) ایک سے زائد نکاح کی اجازت مرد کو دی ہے، شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ ایک سے زیادہ چار تک بیک وقت زوجیت میں عورتوں کو رکھے، لیکن اگر کوئی مرد اپنا حق کسی مصلحت کے تحت ساقط کردیتا ہے اور اپنی پہلی بیوی سے یہ عہد کرلیتا ہے کہ میں تمہارے علاوہ کسی سے تمہارے رہتے ہوئے شادی نہیں کروں گا تو "وأوفوا بالعهد" (سورۂ مائدہ:۱) کے تحت یہ وعدہ بھی لازم الایفاء ہوگا، اور اس سے اس کی شادی متاثر نہ ہوگی، جس میں اس نے اپنی بیوی سے اس انداز کا عہد کیا ہے۔

(ج) طلاق شوہر کا ذاتی حق ہے، لیکن شرعاً تفویض توکیل بھی معتبر ہے، لہذا شوہر حسب موقع و مصلحت بوقت ضرورت بقدر ضرورت اپنا اختیار دوسرے کے حوالہ کرسکتا ہے، اور دوسرا شخص اس کے سپرد کردہ حق کو اگر استعمال کرتا ہے تو وہ حق بجانب ہوگا، تفویض کے بعد اگر شوہر بیوی سے حق تفویض کو واپس لینا چاہے تو نہیں لے سکتا ہے۔

نکاح میں شرط کی صورتیں:......۱۔ عقد نکاح سے قبل شرائط طے ہو جائیں۔ ۲۔ عقد نکاح میں ہی ان شرائط کا ذکر کیا جائے۔ ۳۔ عقد نکاح کے بعد طرفین کے درمیان کوئی شرط نامہ تحریر کیا جائے۔

یہ تینوں صورتیں درست اور صحیح ہیں۔

البتہ پہلی صورت کے معتبر اور مفید ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ جو تحریر لکھی جائے اور اس میں جو شرط مذکور ہو اس کی نسبت نکاح کی طرف ہو، اگر اضافت الی النکاح کو ترک کر دیا گیا تو تحریر باوجود طرفین کی دستخط کے لغو اور بے کار ہو جائے گی، جیسا کہ حضرات فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے، اور شرط کی دوسری صورت بھی درست ہے، لیکن اگر شرط تفویض طلاق سے متعلق ہو، اس وقت اس کے معتبر ہونے کی شرط یہ ہے کہ ایجاب مشروط عورت کی جانب سے ہو اور اگر ایجاب مطلق شوہر کی جانب سے ہو اس صورت میں شرط لغو ہو جائے گی اور نکاح بغیر شرط کے درست ہو جائے گا۔

تفویض طلاق کے ساتھ احسن یہ ہے کہ دو چار رجال کی تصویب حال کی شرط لگا دی جائے، تا کہ عورت اپنے نقصان عقل کی وجہ سے غلط قدم نہ اٹھا سکے، اور اگر ابراء مہر کی بھی قید تفویض طلاق کے ساتھ لگ جایا کرے تو بہتر ہے، تا کہ عورت حق تفویض کو سوچ سمجھ کر استعمال کرے اور بے جا استعمال کا سدباب ہو سکے۔

شریعت نے مصالح کے تحت ہی تفویض طلاق کا دستور بنایا ہے، اگر تصویب رجال یا ابراء مہر کی قید لگا دی جائے تو بے جا تصرف کا سدباب بھی ہو جائے گا، اور شرعی دستور بھی ضیاع سے محفوظ رہے گا۔

۲۔ مہر عورت کا حق ہے، کمی زیادتی کا اختیار بھی عورت کو حاصل ہے، مرد کے قبول کرنے سے پہلے مہر کو مشروط و مطلق رکھنے کا حق بھی عورت کو ہے۔ جس شرط کے ساتھ شوہر مہر کو قبول کرے گا اس کا ایفاء اس کے ذمہ ہوگا۔

۳۔ شریعت نے عورت کا جو مقام اور کام متعین کیا ہے، اس میں اس کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ ایک عورت بحیثیت عورت کلرک بنے اور آفسوں کی ڈیوٹی انجام دے، اس لئے راقم الحروف کے نزدیک مرد کو ایسی شرط مسترد کر دینی چاہئے، جو بہت سے مفاسد و محرمات کا ذریعہ ہو اور ایجاب و قبول کے وقت ہی یہ شرط لگا دینی چاہئے کہ تم کو صرف چراغ خانہ بن کر رہنا پڑے گا اور کسی ملازمت کی اجازت نہیں ہوگی اور اگر کوئی شوہر نادانی میں اس انداز کی نامعقول شرط کو قبول کر لیتا ہے، تو حسن تدبیر سے بیوی کو اس عمل سے روکنے پر وہ ماجور ہوگا ماز ور نہیں۔

☆☆☆

# شرائط نکاح سے متعلق بعض ضروری مسائل و دلائل

مولانا ابوبکر قاسمی

## شرائط نکاح اور ان کے احکام:

عقد نکاح میں جو شرائط لگائی جاتی ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں:

(۱) ایسی شرائط جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ خود عقد نکاح سے جو ذمہ داری کسی فریق پر عائد ہوتی ہو، اسی کو شرط کی صورت میں عقد نکاح کے وقت ذکر کردیا گیا ہو، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا، نیز شوہر عورت کو مہر دے گا، وغیرہ۔

اس قسم کی شرطوں کا حکم یہ ہے کہ ان کو پورا کرنا بالاتفاق واجب ہے، بلکہ اگر بوقت نکاح ان شرائط کی تصریح نہ کی گئی ہو تب بھی شوہر پر ان شرائط کا لحاظ ضروری ہے، کیونکہ قرآن وسنت کی واضح نصوص میں ان شرائط وحقوق کا ذکر کرکے ان کی ادائیگی کا مطالبہ کیا گیا ہے، چنانچہ مہر کے سلسلہ میں باری تعالی کا ارشاد ہے:

"فما استمتعتم به منهن فآتوهن أجورهن فريضة" (سورۂ نساء: ۲۴) جن عورتوں سے (نکاح کے بعد) تم نے فائدہ اٹھایا ہے، ان کو ان کا مقرر کردہ مہر دیدو۔

اور نفقہ کے سلسلہ میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں اعلان فرمایا تھا:

ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف (ابن ماجة: ۱۱۳)۔
دستور کے مطابق عورتوں کو کپڑا اور خوراک دینا مردوں پر لازم ہے۔

نیز قرآن پاک میں باری تعالی نے عورتوں کے نفقہ کے سلسلہ میں حکم دیا ہے: "وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف" (سورۂ بقرہ: ۲۳۳) (لڑکے والے پر عورتوں کا کھانا اور کپڑا ہے دستور کے مطابق)

عقبہ بن عامر جہنیؓ کی حدیث کو تمام ارباب صحاح نے نقل کیا ہے، جس میں مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج. (بخاری ۱/۳۷۶) (جن شرطوں کو تم لوگ پوری کرتے ہو ان میں پوری کرنے کے اعتبار سے سب زیادہ لائق و مستحق شرط وہ ہے جس کے ذریعہ تم نے شرمگاہوں کو حلال کیا ہے)۔

مطلب یہ ہے کہ جن شرطوں کی وجہ سے عورتوں سے نکاح کرنا حلال ہوتا ہے، اور جو شرطیں مقتضائے عقد کے مطابق ہوتی ہیں، یعنی جو شرطیں صلب عقد میں داخل ہوتی ہیں، وہ شرطیں پوری کرنے کے زیادہ لائق ہیں، کیونکہ رشتۂ نکاح کی پائیداری بڑی حد تک قبائل وخاندان کے سکون کی ضامن ہے، اور اس کی ناپائیداری بہت سے مطمئن معاشروں اور خاندانوں کو فتنہ وفساد، توڑ پھوڑ اور بگاڑ پر ابھارتی ہے، اسی لئے انہوں نے مقتضائے عقد نکاح کے مطابق طے کی جانیوالی شرطوں کو پورا کرنے پر زیادہ زور دیا، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، اگر یہ شرطیں نہ ہوں، تب بھی ان شرائط میں ذکر کردہ امور کے مطابق معاملہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۲) شرط کی دوسری قسم یہ ہے کہ نکاح کے وقت کوئی فریق ایسی شرط طے کرے جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، مثلاً شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نفقہ اس کے ذمہ نہ ہوگا، اسی طرح شوہر بیوی کو رہنے کے لئے مکان نہ دے گا، یا یہ شرط لگانا کہ شوہر اپنی بیوی کو رقم نہ دے گا، اسی طرح عورت کا بوقت نکاح یہ شرط لگانا کہ شوہر اپنی بیوی کو طلاق دیدے، تو اس قسم کی شرطوں کا حکم یہ ہے کہ یہ شرطیں باطل ہیں اور عقد نکاح درست ہو جائے گا، چنانچہ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری شرح بخاری "باب الشروط في النكاح" میں لکھا ہے:

"اور بہر حال وہ شرط جو مقتضاء عقد نکاح کے منافی ہو، جیسے یہ شرط کہ بیوی کے لئے وہ باری مقرر نہ کرے گا، یا اس پر باندی نہ رکھے گا، اور نہ نفقہ دے گا

وغیرہ، پس اس کو پورا کرنا واجب نہیں ہے، بلکہ اگر شرط صلب عقد میں واقع ہو تو رک جائے، اور مہر مثل کے ساتھ نکاح صحیح ہو گیا اور ایک صورت میں مہر مسمی واجب ہوگا اور شرط کا کوئی اثر نہ ہوگا، اور ایک قول میں نکاح باطل ہوگا"۔ (فتح الباری ۹/ ۲۱۸)

مندرجہ بالا دوسری قسم کی شرطوں کو فقہاء کرام نے جو باطل فرمایا ہے تو اس کی دلیل وہ حدیث ہے جسے امام بخاریؒ نے "بخاری شریف کی کتاب الشروط" کے تحت نقل فرمایا ہے:

"ماکان من شرط لیس فی کتاب اللّٰہ فھو باطل وإن کان مأۃ شرط قضاء اللّٰہ أحق وشرط اللّٰہ أوثق" (بخاری ۱/ ۳۷۷)

(جو شرط کتاب اللہ میں نہ ہو وہ باطل ہے، اگر چہ سو شرطیں ہوں، اللہ کا فیصلہ زیادہ لائق ہے (کہ اس کی پیروی کی جائے) اور اللہ کی شرط زیادہ مضبوط ہے)۔

اسی طرح مندرجہ بالا شرطوں کے باطل و ناجائز ہونے کی دلیل وہ حدیث بھی ہے، جسے ابوہریرہ نے بالفاظ ذیل مرفوعاً نقل فرمایا ہے:

"لایحل لامرأۃ تسأل أختھا لتستفرغ صفحتھا فإنما ماقدر لھا" (بخاری ۲/ ۷۷۳) (کسی عورت کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنی سوکن کی طلاق کا مطالبہ کرے تاکہ اس کے پیالہ کو خالی کردے، کیونکہ اس کے لئے وہ ہے جو اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے)۔

مذکورہ روایات ہی کی بنیاد پر امام بخاریؒ نے حضرت عمرؓ، یا ابن عمرؓ کا یہ فتویٰ نقل فرمایا ہے:

"وقال ابن مسعود: لاتشترط المرأۃ طلاق اختھا" (بخاری ۲/ ۷۷۳) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے تھے کہ کوئی عورت اپنی سوکن کی طلاق کی شرط نہ لگائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہو، جس کا تذکرہ قرآن وسنت میں نہ ہو، اور اس شرط سے حقوق واجبہ سے گریز ہو رہا ہو تو ایسی شرط عقد نکاح میں لگانی جائز نہیں ہے، اور اگر کسی نے اس قسم کی شرط لگائی تو وہ باطل ہے۔

(۳) شرائط نکاح کی تیسری قسم یہ ہے کہ متعاقدین میں سے کوئی فریق یا دونوں بوقت نکاح ایسی شرط لگائے جس کا تعلق نہ پہلی قسم کی شرطوں سے ہو، اور نہ دوسری قسم کی شرطوں سے یعنی دونوں فریقوں میں سے کوئی ایسی مباح شرط لگائے جو نہ مقتضائے عقد کے قبیل سے ہو اور نہ مقتضائے عقد کے خلاف ہو، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہ کرے گا، یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی دوسری جگہ نہیں لے جائے گا۔

اس تیسری قسم کی شرط کے حکم کے سلسلہ میں ائمہ کرام کے درمیان قدرے اختلاف ہے، امام احمدؒ، اسحاقؒ اور امام اوزاعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ شرط کے مطابق عمل کرنا واجب ہے، اگر شرط کو پورا نہ کرے تو عورت کو نکاح فسخ کرانے کا اختیار حاصل ہوگا، لیکن امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور سفیان ثوری کے نزدیک شرط کی اس تیسری قسم کو پورا کرنا قضاءً ضروری نہیں، البتہ دیانۃً ضروری ہے، کیونکہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ جو جائز وعدہ کرے اس کو پورا کرے، اور خود باری تعالیٰ کے ارشاد: "واوفوا بالعھد إن العھد کان مسئولا" (بنی اسرائیل: ۳۴) کا تقاضا بھی یہی ہے، لیکن اگر کوئی شخص ان شرطوں کو پورا نہ کرے تو عورت فسخ نکاح کا مطالبہ بھی نہیں کرسکتی، امام احمدؒ وغیرہ اپنے مسلک کے اثبات میں عقبہ بن عامر جہنیؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں، جسے امام بخاری نے "کتاب النکاح باب الشروط فی النکاح" میں نقل کیا ہے:

"أحق ما أوفیتم من الشروط أن توفوا بہ مااستحللتم بہ الفروج" (بخاری ۲/ ۷۷۳)

مگر یہ حدیث ائمہ ثلاثہ کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ وہ حضرات بھی اس تیسری قسم کی شرطوں کو پورا کرنے کو دیانۃً ضروری قرار دیتے ہیں (مستفاد از درس ترمذی ۳/ ۴۱۳) ثانیاً اس حدیث پاک کے ظاہری الفاظ سے ائمہ ثلاثہ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ ثالثاً بہت سے شارحین نے اس حدیث کو پہلی قسم کی شرطوں کے لئے مخصوص کیا ہے، بلکہ بعض حضرات نے تو اس حدیث پاک میں شرط سے مراد مہر لیا ہے، چنانچہ ترمذی شریف کی شرح "الکوکب الدری" کے حاشیہ میں مرقوم ہے کہ:

"اور شارحین حدیث کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ شرط سے مراد یہاں پر صرف مہر ہے نہ کہ اس کے ماسوا کوئی اور چیز اس لئے کہ وہی بضع کے مقابلہ میں مشروط ہے" (حاشیہ الکوکب الدری ۱/ ۳۳۵)

شارحین حدیث کی اس جماعت کے مذکورہ قول کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے:

"أحل لكم ما وراء ذلكم أن تبتغوا بأموالكم" (سورۂ نساء: ۲۴)
(تمہارے لئے ان کے علاوہ عورتیں حلال کردی گئیں ہیں، بشرطیکہ تم مہر دے کر رشتہ تلاش کرو)۔

اور ترمذی شریف کتاب النکاح "باب ماجاء لا نکاح إلا بولی" کے تحت حضرت عقبہؓ کی حدیث میں شرط سے مراد مہر ہے، اور علامہ نوویؒ نے حضرت عقبہ بن عامر کی مذکورہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "امام شافعیؒ اور اکثر علماء کا قول ہے کہ یہ حدیث ان شرطوں پر محمول ہے جو نکاح کے مقتضی کے منافی نہ ہوں، بلکہ وہ نکاح کے مقاصد و مقتضی میں سے ہوں، جیسے عورت کو اچھی طرح رکھنے، اس کا نفقہ، سکنی دستور کے مطابق دینے کی شرطیں، اور یہ شرط کہ شوہر عورت کے حقوق میں کچھ کوتاہی نہ کرے گا، اور دیگر سوکنوں کی طرح اس کے لئے باری مقرر کرے گا، اور عورت گھر سے شوہر کی اجازت کے بغیر نہ نکلے گی، اور نہ نفلی روزہ رکھے گی، اور شوہر کے گھر میں عورت کسی دوسرے کو داخل ہونے کی اجازت نہ دے گی، نیز شوہر کے سامان میں شوہر کی رضامندی کے بغیر تصرف نہ کرے گی، اور بہر حال جو شرط نکاح کے مقتضی کے خلاف ہو، جیسے یہ شرط کہ باری مقرر کرے اور نہ شوہر اس پر باندی کو رکھے اور نہ اس پر خرچ کرے اور نہ اس کو لے کر سفر کرے، پس ایسی شرطوں کا پورا کرنا واجب نہیں ہے، بلکہ شرط لغو ہوگی اور نکاح مہر مثل کے ساتھ صحیح ہو جائے گا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی وجہ سے کہ وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہیں ہے، وہ باطل ہے، امام احمدؒ اور ایک جماعت کا کہنا ہے کہ شرط کو پورا کرنا واجب ہے، حدیث "أحق الشروط" کی وجہ سے۔ (حاشیہ ۱/۴۵۵)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عقد نکاح میں جو شرائط لگائی جاتی ہیں ان کی تین قسمیں ہیں:

(۱) مقتضاء عقد کے مطابق ہو، اس کو پورا کرنا واجب ہے۔

(۲) مقتضاء عقد نکاح کے خلاف ہو، اس شرط کو پورا کرنا جائز نہیں۔

(۳) شرط کی تیسری قسم یہ ہے کہ جو نہ مقتضائے عقد نکاح کے خلاف ہو، اور نہ موافق ہو، بلکہ مباح قسم کی شرط ہو تو اس قسم کی شرطوں کا دیانۃً پورا کرنا ضروری ہے، چنانچہ ترمذی شریف کی "شرح الکوکب الدری" میں شرائط نکاح کا مفصل تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"حاصل کلام یہ ہے کہ شرطوں کی تین قسمیں ہیں (۱) جو بغیر شرط کے نکاح کی وجہ سے واجب ہو، جیسے عورت کے لئے نفقہ اور مکان تو ایسی شرط کا پورا کرنا واجب ہے، اگر چہ شرط نہ لگائے، (۲) جو شرط کتاب اللہ اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات کے خلاف ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے اگر چہ شرط لگائے (۳) اور جو مذکورہ دونوں قسموں میں سے نہ ہو، یعنی جن کا کرنا چھوڑنا دونوں مباح ہو، اگر اس قسم کی شرط ہو تو اس کا پورا کرنا واجب ہے، اور اگر شرط نہ لگائے تو واجب نہ ہوگا۔ (الکوکب الدری ۲/۳۳۶)

مذکورہ تصریحات سے جہاں نکاح کی شرطوں کا علم ہوا وہیں ان شرطوں کا شرعی حکم بھی معلوم ہو گیا، نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان شرائط کی وجہ سے عقد نکاح پر ایک اثر مرتب ہوتا ہے۔

اب نکاح کی شرطوں کے اقسام و احکام اور اثرات کو جاننے کے بعد ذیل میں نکاح کی بعض شرطوں کی تفصیل اور ان کے متعلق شرائط کی وضاحت کی جاتی ہے:

## تفویض طلاق کی شرعی حیثیت اور اس کی ممکنہ صورتوں کی تفصیل:

اگر کوئی عورت عقد نکاح میں یہ شرط لگائے کہ فلاں فلاں شکلوں میں اسے طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، اور شوہر نے عورت کی اس شرط کو تسلیم کر لیا تو شرعاً اس شرط کی کیا اہمیت ہوگی؟ اس سلسلہ میں فقہاء کرام جو قرآن وسنت کے معانی کو زیادہ سمجھتے ہیں، ان کے کلام کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی عورت کو اس کے شوہر کی طرف سے مستقبل میں کسی ناگوار بات کا کوئی خطرہ محسوس ہو، اس کے لئے شرعاً جائز ہے، کہ وہ عقد نکاح میں اپنے لئے شوہر سے اس قسم کی شرط کو منظور کرالے، تاکہ پریشانی کے وقت اس شرط سے فائدہ اٹھا کر اپنے کو تکلیف سے محفوظ رکھ سکے، فقہاء کرام کی اصطلاح میں اسی کو تفویض طلاق کہتے ہیں، جس کا مطلب ہوتا ہے کہ شوہر بیوی کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار دیدے۔

شوہر اگر عورت کو طلاق کی تفویض کردے تو عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار حاصل ہوگا، چنانچہ قرآن پاک میں تفویض کی ایک قسم تخییر کا ذکر صراحت کے ساتھ آیا ہے، جس کی رو سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کی ازواج مطہرات کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار دیا گیا تھا (ملاحظہ ہو: سورۂ احزاب)، اس سے معلوم ہوا کہ تفویض طلاق کا جواز قرآن کریم سے ثابت ہے، اب رہی یہ بات کہ شوہر اگر نکاح کے وقت بیوی کو طلاق کا حق تفویض

کردے تو اس کے بعد اگر وہ تفویض کو ختم کرنا چاہے تو شوہر کو اس کا اختیار حاصل ہوگا، یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ تفویض طلاق کے بعد شوہر کو اس تفویض سے رجوع کا حق حاصل نہ ہوگا، بلکہ تفویض کے بعد عورت طلاق کی مالک ہوجاتی ہے۔ (درمختار ۱/ ۵۳۸، فتاوی عالمگیری ۱/ ۳۸۷)

لیکن اس کے بعد بھی عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہئے، بلکہ اطمینان کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنے اوپر طلاق واقع کرنی چاہئے، کیوں کہ طلاق واقع کرنے میں جلدی کرنا شرعاً سخت ناپسندیدہ ہے، چنانچہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "أبغض الحلال إلی الله عزوجل الطلاق" (ابوداؤد ۱/ ۲۹۶)، اللہ تبارک وتعالی کے نزدیک حلال چیزوں میں مبغوض ترین طلاق ہے، نیز حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "أیما امرأة سألت زوجها الطلاق فی غیر ما بأس فحرام علیها رائحة الجنة" (مشکوۃ ۲/ ۲۸۳) (جو عورت بلاضرورت اپنے خاوند سے طلاق مانگے اس پر جنت کی بو حرام ہے)۔

مذکورہ احادیث پاک سے معلوم ہوا کہ جب طلاق کو شریعت نے سخت ناپسند فرمایا ہے تو عورت کو چاہئے کہ تفویض کی صورت میں اپنے اوپر طلاق واقع کرنے میں جلدی نہ کرے، بلکہ اطمینان سے سوچ سمجھ کر طلاق واقع کرے، اس کے ساتھ درج ذیل تین باتوں کا ضرور التزام کرے:

پہلی بات یہ ہے کہ غصہ کے وقت فوراً اپنے اس تفویض کے اختیار سے کام نہ لے، بلکہ ایک معتد بہ مدت تک غور وفکر کرے، جس کی میعاد ایک ہفتہ سے کم نہ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ اپنے والدین یا دیگر خیر خواہوں سے مشورہ کرے، چنانچہ حدیث پاک میں وارد ہے کہ جب قرآن پاک میں آیت تخییر نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ کچھ فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے والدین سے مشورہ کرلو۔ (بخاری ۲/ ۷۹۲)

تیسری بات یہ ہے کہ سنت کے مطابق استخارہ کرے، کیونکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "ماندم من استخار" (جس نے استخارہ کیا وہ شرمندہ نہیں ہوا)۔

استخارہ کے علاوہ ویسے بھی دعاء کرے کہ اللہ تعالی میرا دل ایسے کام کی طرف پھیر دے، جو میرے لئے دین ودنیا میں بہتر ہو، ان تمام کوشش کے بعد جو کچھ دل میں آئے اس پر عمل کرے، اور اللہ تعالی پر بھروسہ رکھے، اس طرح عمل کرنے سے انشاء اللہ وہ خطرہ نہ ہوگا جو تفویض کی صورت میں ہوتا ہے۔ (الحیلۃ الناجزۃ/ ۳۶)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تفویض طلاق کی صورت میں طلاق دینے کا اختیار عورت کو حاصل ہوجاتا ہے، اور عورت ہی طلاق کی مالک ہوجاتی ہے، شوہر اگر تفویض طلاق کے بعد اس سے رجوع کرنا چاہے تو اس کو رجوع کرنے کا حق نہیں رہتا ہے، اس لئے تفویض طلاق کے وقت شوہر کو چاہئے کہ عقل وہوش سے کام لے کر، بقدر ضرورت ہی طلاق کی تفویض کرے، یک لخت تینوں طلاق کی تفویض نہ کرے۔

اب یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہمارے فقہاء کرام نے دور حاضر کے پرفتن حالات میں بعض مصالح کی بناء پر تفویض طلاق کی شرط کے ساتھ نکاح کرنے کو جائز قرار دیا ہے، بلکہ ہمارے بعض تجربہ کار علماء نے تفویض طلاق کی شرط کے ساتھ نکاح کرنے کا مشورہ دیا ہے، تو اگر کوئی شخص تفویض طلاق کی شرط کے بجائے مہر کی کمی اور زیادتی کی شرط پر نکاح کرے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق نہیں دیا تو ایک ہزار مہر ہوگا، اور اگر بیوی کو طلاق دیدیا تو دو ہزار مہر ہوگا تو کیا اس طرح مہر مقرر کرنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟ نیز اس طرح مہر مقرر کرنے سے نکاح منعقد ہوگا یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں فقہ وفتاوی کی کتابوں میں جو تفصیل درج ہے، اس کی روشنی میں اس مسئلہ میں اس بات پر تو اتفاق ہے کہ شرعاً یہ نکاح صحیح ودرست ہے، البتہ اس قسم کی شرط کا کیا حکم ہے، اس کے متعلق ہمارے ائمہ ثلاثہ کے درمیان اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک شوہر شرط کی پہلی صورت پر عمل کرتا ہے تو پہلے سے جس مہر کا ذکر کیا گیا ہے، عورت کو وہ مہر ملے گا، لیکن اگر شرط کی پہلی صورت کے بجائے دوسری صورت کو اختیار کرتا ہے تو اس وقت دوسری صورت میں ذکر کردہ مہر کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ شرط کی دوسری صورت کے پائے جانے کی صورت میں شوہر پر عورت کو مہر مثل دینا لازم ہوگا، جبکہ صاحبین کے نزدیک شرط کی دونوں صورتیں صحیح ہیں، اور ہر صورت میں شوہر پر متعین کردہ مہر (مہر مسمی) لازم ہے، اب مفتی بہ قول کیا ہے؟ تو نکاح کے باب المهر کو غور سے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء حنفیہ کے نزدیک نکاح کے باب میں اصل مہر مثل ہے، ہاں اگر مہر مسمی مستحکم ہو تو ایسی صورت میں مہر مثل سے عدول کرکے مہر مسمی کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ "بدائع الصنائع" میں لکھا ہے۔

"إن الموجب الأصلی فی هذا الباب هو مهر المثل فلا یعدل عنه إلا عند استحکام التسمیة" (بدائع الصنائع ۲/ ۲۸۰)

فقہاء حنفیہ کے مذکورہ نظریہ کی تائید اس حدیث پاک سے ہوتی ہے جس میں وارد ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا اور مہر متعین نہیں کیا، اور پھر اس شخص کا انتقال ہوگیا تو اس شخص کی بیوی کا مہر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے مہر مثل مقرر فرمایا (نسائی ۲/ ۸۸) اس حدیث میں غور کرنے

سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مہر کے متعین نہ ہونے کی صورت میں عورت کو مہر مثل دیا جائے گا، اور مہر مسمی کا عدم استحکام بھی مہر متعین نہ ہونے کے درجہ میں ہے، اس لئے اس صورت میں بھی مہر مثل کا فیصلہ ہونا چاہئے۔

لہٰذا فقہاء حنفیہ کے مذکورہ اصول کے تناظر میں جب سوال نامہ کی درج شدہ مذکورہ بالا صورت میں غور کیا جاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں امام ابو حنیفہؒ کا قول مفتی بہ ہے، کیونکہ شرط کی دوسری صورت کے متعلق عورت کو کچھ نہیں معلوم کہ شوہر اس کو طلاق دے گا یا نہیں، لہٰذا طلاق دینے والی دوسری صورت میں مہر کا تسمیہ مستحکم نہیں ہے، اور مہر مسمی میں استحکام نہیں ہے، تو اس صورت میں مہر مثل کا فیصلہ کیا جانا چاہئے۔

## ۲۔ پہلی بیوی کا مہر دوسری شادی کرنے نہ کرنے پر متعین کرنا

اگر کسی شخص نے نکاح کرتے وقت اس طرح مہر طے کیا کہ اگر ہم نے اس بیوی کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے دوسری شادی کی تو اس کا مہر ۳۰ ہزار ہوگا، اور اگر اس عورت کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر پندرہ ہزار ہوگا تو ایسی صورت میں پہلی شرط صحیح ہے، اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں شوہر پر اس بیوی کو مہر مثل دینا لازم ہوگا، لیکن مہر مثل مسمی سے کم ہوگا یا زیادہ تو پھر اس کی کمی کی صورت میں مہر مسمی کی کمی اور زیادتی کی صورت میں مہر مسمی کی زیادہ مقدار کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔

## ۳۔ عورت کا ملازمت کی شرط پر شادی کرنا

کسی مرد سے کسی عورت کا ملازمت کی شرط پر شادی کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اس کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے مذہب اسلام نے عورت کو کیا مقام و مرتبہ دیا ہے، اس کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، کون نہیں جانتا کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے مرد کے آرام وسکون کے لئے پیدا فرمایا ہے، اور مردوں کو عورتوں کا نگراں مقرر کر کے عورتوں کے لئے کھانا کپڑا امکان مہیا کرنے کی ذمہ داری مردوں پر ڈالی ہے، عورتوں کو گھر میں ٹھہرے رہنے کا حکم دیا ہے، بچوں کی پرورش و پرداخت کے مقابلہ میں ماں ہی کو حق حضانت میں اولیت حاصل ہوتی ہے، شریعت نے عورت کو دنیا کے سامانوں میں سب سے بہترین سامان قرار دے کر اسے پردہ نشین رہنے کا حکم دیا ہے، اگر کبھی کسی عورت کو گھر سے نکلنا پڑے تو اسے پردہ کا حکم دیا گیا ہے، شوہر کو حکم ہے کہ جہاں رہے وہیں اپنی عورت کو بھی رکھے، پردہ عورت کی حقیقت میں داخل ہے، اور جسم کو پردہ میں رکھنے کے ساتھ آواز بھی پست رکھنے کا اسے حکم دیا گیا ہے، عورتوں کی سربراہی قوم وملت کی ہلاکت کا پیش خیمہ قرار دیا گیا ہے، اور بگڑتے ہوئے حالات میں مسجد میں جا کر نماز جیسی اہم عبادت کی ادائیگی سے عورتوں کو روکا گیا ہے، اگر کوئی عورت اپنی سرحد کو پھاند کر نمازی کے آگے جا کر کھڑی ہو جائے، یا کسی نمازی کے پاس آکر نماز شروع کر دے تو اسے نماز کے خشوع میں مخل جانا گیا ہے، بلکہ نماز کے فساد تک کا حکم دیا گیا ہے۔

مذکورہ تفصیل سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عورت کی اصل فطرت کیا ہے؟ جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا ہے، اب اگر کوئی عورت اللہ رب العزت کی طرف سے دی ہوئی حیاء کے پردہ کو چاک کر کے خلاف فطرت کاموں کے کرنے کے لئے میدان میں اترتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسے سند جواز دیا جائے، بلکہ اس کی اصلاح کی ضرورت ہے، رہا بعض عورتوں کا دنیاوی تعلیم حاصل کر کے ملازمت کے لئے آگے بڑھنا، یا دنیا کے بہت سے ملکوں میں عورتوں کا مردوں کے دوش بدوش رہ کر کام کرنا، تو یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا میں دین وفطرت کے خلاف جو بہت سے کام انجام پا رہے ہیں انہیں میں سے ایک یہ بھی ہے، لیکن کبھی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اگر کوئی عورت بوقت نکاح اپنے ہونے والے شوہر سے ملازمت کی شرط لگائے تو شوہر اس کو اجازت دیدے، یا پہلے سے وہ عورت ملازمت کو اپنائے ہوئے ہے تو شوہر اس عورت کو اس پر باقی رہنے دے، بلکہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو شادی کے بعد ملازمت پر باقی رہنے دیتا ہے، تو بظاہر ایسے شخص کو دیوث کے مانند سمجھنا چاہئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کسی عورت کا بوقت نکاح اپنے ہونے والے شوہر سے ملازمت کرنے یا ملازمت پر باقی رہنے کی شرط لگا کر نکاح کرنا اور شوہر کا عورت کی مذکورہ شرطوں کو منظور کر لینا، چونکہ مقاصد نکاح کے سراسر خلاف ہے، اسی لئے شوہر کے اس قسم کی شرطوں کو قبول کر لینے کے باوجود اس کو شرعاً حق حاصل ہے کہ وہ اپنی عورت کو سلسلہ ملازمت کے ختم کرنے کا حکم دے، یا نئی ملازمت کرنے سے روکے اور عورت پر اپنے شوہر کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔

☆☆☆

# نکاح میں شرطیں لگانا

مولانا سید اسرار الحق سبیلی

نکاح ایک مضبوط اور پاکیزہ رشتہ ہے، جس میں بندھ کر ایک اجنبی مرد وعورت سکون، اعتماد اور محبت کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، چونکہ یہ ایک دائمی رشتہ ہے، اس لئے شریعت نے اس کے لئے کچھ شرطیں لگائی ہیں، نیز موجودہ زمانہ میں طلاق کے لئے بے جا اور ناجائز استعمال نے انسانی معاشرہ میں ایک بے چینی اور بے اعتمادی کی کیفیت پیدا کردی ہے، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے معاشرہ اور حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے شریعت کی روشنی میں نکاح وطلاق کے مسائل کا جائزہ لیں، اور نکاح وطلاق کا وہی تصور امت کے سامنے پیش کریں، جو شریعت کے منشاء کے عین مطابق ہو۔

## نفقہ وغیرہ کی شرط لگانا:

نکاح کے وقت ایسی شرط لگانا جس سے کوئی نئی ذمہ داری کسی فریق پر عائد نہیں ہوتی ہو، مثلاً مرد کے لئے نان ونفقہ اور سکنی کی شرط لگانا، جیسا کہ آجکل نکاح کے وقت نان ونفقہ کا ذکر کیا جاتا ہے، ایسی شرط لگانے سے نکاح میں کوئی خرابی نہیں آئے گی، اس لئے کہ نفقہ اور سکنی وغیرہ تو شرط لگائے بغیر بھی شوہر پر واجب ہوتا ہے، اس کا وجوب قرآن وحدیث سے ثابت ہے، چنانچہ قرآن پاک کی آیت......

''وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ''۔ (سورۂ بقرۃ:۲۳۳)

(بچہ کے باپ پر اس کی ماں کا نان ونفقہ معروف طریقہ پر واجب ہے)۔

''أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم'' (سورۂ طلاق:٦)

(اپنی بیویوں کو رہنے کے لئے گھر دو جہاں تم رہتے ہو)۔

سے فقہاء نے بیوی کا نفقہ اور سکنی واجب قرار دیا ہے۔ (دیکھئے: المبسوط ۵/۱۸۰، بدائع الصنائع ۲/۲۳۳، ہدایہ ۲/۴۱۷ باب النفقۃ)

اس سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد بھی منقول ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''حجۃ الوداع'' کے موقعہ سے فرمایا تھا:

''ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف'' (ابن ماجۃ ۲۔۲۲۲ طبع دیوبند. مسند احمد ۵۔۷۳)

(عرف کے مطابق تمہاری بیویوں کا تمہارے اوپر نفقہ اور کسوہ (کپڑا) واجب ہے)۔

علامہ نووی لکھتے ہیں:

کسی عورت سے ایک ہزار روپے پر اس شرط کے ساتھ شادی کی کہ وہ بیوی سے رات ودن دونوں میں ہم بستر ہوگا، یا اس کو نفقہ دے گا، اس کو کپڑا دے گا، اس کے ساتھ سفر کرے گا، بشرطیکہ عورت بھی شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نہ نکلے، تو ایسی شرطیں لگانا صحیح ہے، اس سے مہر پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اس لئے کہ یہ شرطیں تقاضۂ عقد میں داخل ہیں۔ (المجموع شرح المھذب ۱۸/۱۸ طبع مکتبۃ الارشاد جدۃ)

## بعض ذمہ داریوں سے سبکدوشی کی شرط:

نکاح کے وقت ایسی شرطیں لگانا جن سے نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، مثلاً مرد یہ شرط لگائے کہ بیوی کا نان ونفقہ میرے ذمہ نہیں ہوگا، ایسی شرطیں لگانے سے نکاح درست ہوجائے گا اور بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہوگا، یہ شرطیں کالعدم قرار دی جائیں گی، چنانچہ ''فتاوی عالمگیری'' میں ہے:

کسی آدمی نے ایک ہزار روپے مہر کے ساتھ اس شرط پر نکاح کیا کہ اس کے ذمہ بیوی کا نفقہ نہیں ہوگا، جبکہ عورت کا مہر مثل سو روپے ہے، تو عورت

کے لئے ہزار روپے اور نفقہ مرد پر واجب ہوں گے۔ (الفتاوی الھندیہ ۱/۳۰۹ طبع دار صادر بیروت، فتاوی تاتارخانیہ ۳/۱۰۵ طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد)۔

کیونکہ نفقہ کا وجوب نفس عقد سے نہیں ہوتا ہے (اسی لئے نابالغ بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں ہوتا ہے (الہدایہ ۲/۴۱۸ طبع رشیدیہ دہلی) بلکہ نفقہ کے وجوب کا سبب حبس ہے، اور سبب سے پہلے کسی چیز کو ساقط کرنا صحیح نہیں ہے۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۳۴۱۵ طبع دار الفکر دمشق)۔

## کچھ مزید شرطیں

نکاح کے وقت ایسی شرطیں لگانا جو نہ عقد نکاح سے لازم ہوتی ہو اور نہ ایسی شرط ہو جس کی وجہ سے عقد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، ایسی شرط دو طرح کی ہو سکتی ہے:

(۱) نکاح کے وقت ایسی شرط لگائی گئی جو صحیح ہو، یعنی تقاضہ عقد کے مطابق ہو اور احکام شرع کے منافی بھی نہ ہو، جیسے عورت کا یہ شرط لگانا کہ شوہر اس کو علاحدہ (seprate) گھر میں رکھے گا، نہ کہ اپنے خاندان والوں یا سوکن کے ساتھ، یا عورت کے خاندان والوں کی اجازت کے بغیر شوہر اس کو دور سفر پر نہیں لے جائے گا یا عورت نے یہ شرط لگائی کہ شوہر اس کو کلبوں اور تھیٹروں میں نہیں لے جائے گا تو ایسی شرطیں لگانا صحیح ہوگا، نکاح منعقد ہوگا، اور ان شرطوں کا پورا کرنا بھی ضروری ہوگا۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۵۴)

(۲) عاقدین میں سے کسی نے ایسی شرط لگائی جو فاسد ہے، یعنی تقاضہ عقد کے خلاف ہے، یا احکام شرعیہ کی رو سے ایسی شرط لگانا صحیح نہیں ہے، تو عقد نکاح صحیح ہو جائے گا، اور صرف شرط باطل ہو جائے گی (حوالہ سابق)، جیسے نکاح کے وقت زوجین کا یہ شرط لگانا کہ وہ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے (فتاوی قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ۱/۳۳۱) اس لئے کہ اللہ تعالی نے زوجین کو ایک دوسرے کی وراثت کا حق دیا ہے جس کو اپنی رضامندی سے ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔

## تفویض طلاق:

نکاح کے وقت اگر عورت یہ شرط لگائے کہ طلاق واقع کرنے کا اختیار مرد کی بجائے اس کی عورت کو ہوگا، اور مرد اس کو قبول کر لے، یعنی ایجاب عورت کی طرف سے اور قبول مرد کی طرف سے ہو، تو عورت کو طلاق کا اختیار ہوگا، چنانچہ علامہ فخر الدین اوزجندی کا بیان ہے:

اگر عورت نے ابتداء کہا میں نے تجھ سے اس شرط پر نکاح کیا کہ مجھ کو طلاق واقع ہوگی یا مجھ کو طلاق کا حق ہوگا کہ میں جب چاہوں اپنے اوپر طلاق واقع کر لوں اور مرد نے کہا میں نے قبول کیا تو نکاح صحیح ہے، پہلی شرط کی بنا پر عورت کو طلاق پڑ جائے گی، اور دوسری شرط کے مطابق عورت کو طلاق کا حق حاصل ہوگا۔

اس لئے کہ اگر ابتداء (ایجاب) شوہر کی طرف سے ہو تو تفویض نکاح کے بعد ہوگی، کیونکہ عورت کے ایجاب کے بعد جب مرد نے کہا میں نے قبول کیا، اور جب کہ جواب میں سوال کے الفاظ کا اعادہ ہوتا ہے گویا اس نے کہا میں نے اس شرط پر قبول کیا کہ تجھ کو طلاق ہے، یا طلاق کا معاملہ تیرے حوالہ ہے، تو یہ نکاح کے بعد تفویض ہے۔ (فتاوی خانیہ ۱/۳۲۹)

چنانچہ جب عورت کو طلاق کا اختیار ہوگا تو اس اختیار طلاق (تفویض) کو شوہر ختم نہیں کر سکتا ہے، چنانچہ علاء الدین حصکفی فرماتے ہیں:

کسی نے اپنی بیوی سے کہا: جب اور جس وقت تو چاہے اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے، تو عورت جب چاہے اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے، کسی وقت کی قید نہیں ہوگی اور نہ شوہر کو تفویض طلاق کو ختم کرنے کا حق ہوگا۔ (درمختار علی ہامش رد المحتار ۲/۵۱۷ طبع رشیدیہ کوئٹہ پاکستان)

## نکاح میں شرائط کی صورتیں:

اگر عقد نکاح سے پہلے شرائط طے پا جائیں اور اس کی تحریر پر عاقدین کے دستخط بھی ہو جائیں تب بھی ان شرائط کی پابندی ضروری نہیں ہوگی، مثلاً اگر نکاح سے پہلے عورت نے یہ شرط لگائی کہ طلاق کا معاملہ میرے حوالہ ہوگا، تو یہ شرط لگانا صحیح نہیں ہوگا، اس لئے کہ نکاح سے پہلے مرد طلاق کا مالک ہی نہیں ہوتا، اور آدمی جس چیز کا مالک نہیں وہ چیز دوسرے کے حوالہ کس طرح کر سکتا ہے؟ چنانچہ قاضی خاں کی عبارت ابھی گذر چکی ہے کہ تفویض طلاق کی شرط میں اگر ایجاب (پہلا قول) مرد کی طرف سے ہو تو تفویض صحیح نہیں ہوگی، اگر عورت ایجاب کرے تو تفویض اس لئے صحیح ہو جاتی ہے کہ شوہر نے گویا مشروط طلاق کو قبول کیا ہے۔

موجودہ صورت میں نہ تو ایجاب پایا جاتا ہے اور نہ قبول، لہذا عقد نکاح سے پہلے شرطیں لگانا صحیح نہیں ہوگا علامہ عبدالرحمن جزیری شافعیہ کا مسلک اور ان کی

شرائط ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''فإذا اشترطت هذه الشروط خارج العقد فإنها لا يعمل بها'' (الفقه على المذاهب الاربعه ۲/ ۸۹ طبع دار الديموة استنبول)

اگر مذکورہ شرائط، عقد سے قبل لگائی جائیں تو اس پر عمل ضروری نہیں ہوگا۔

۲۔ البتہ اگر عقد نکاح ہی میں شرط لگائی اور وہ جائز ہو، تقاضہ عقد کے خلاف نہ ہو اور ایجاب مشروط ہو تو شرط لگانا صحیح ہوگا، جیسا کہ خانیہ میں ہے:

''عورت نے کہا: میں نے اپنا نکاح تجھ سے اس شرط پر کیا کہ مجھ کو طلاق ہوگی، یا طلاق کا معاملہ میرے سپرد ہوگا، جب میں چاہوں گی اپنے آپ کو طلاق دے لوں گی، شوہر نے کہا میں نے قبول کیا تو نکاح درست ہے اور شرط کے مطابق پہلی صورت ہی میں عورت کو طلاق واقع ہوجائے گی اور دوسری صورت میں عورت کو طلاق کے استعمال کا حق ہوگا'' ۔ (فتاوی قاضی خاں ار ۳۲۹)

مذکورہ صورت میں عورت کی طرف سے ایجاب مشروط ہے اور مرد کی طرف سے قبول مطلق ہے، مطلق قبول کو مشروط ایجاب پر محمول کیا جائے گا، لیکن ایجاب مطلق ہو اور قبول مشروط ہو تو ایسی شروط کا کوئی اعتبار نہیں۔

(۳) اسی طرح عقد نکاح کے بعد اگر بیوی شوہر کے درمیان شرائط نامہ تیار ہوں اور اس کو دونوں اپنی رضامندی سے قبول کریں اور اس پر دستخط بھی کریں، تو اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔

چنانچہ بخاری کی روایت ہے:

''عن عقبة عن النبي قال أحق ما أوفيتم من الشروط أن تعارفوا به ما استحللتم به الفروج'' (بخاری ۲/ ۷۷۲ باب الشروط فی النکاح)

(حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے اہم شرط جس کو پورا کرنا نہایت ضروری ہے وہ بیویوں کی بابت لگائی گئی شرط ہے، جو تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں)۔

عورت کو طلاق کا مشروط حق دینا، مصالح شرع کے خلاف نہیں، شریعت نے مردوں کو طلاق دینے کا حق دیا ہے، لیکن اس کے ساتھ شریعت نے مردوں کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو عورت کو طلاق کا اختیار دے سکتے ہیں۔

چنانچہ جب سورۃ احزاب کی آیت:

''يا أيها النبي قل لأزواجك إن كنتن تردن الحيوة الدنيا وزينتها فتعالين أمتعكن وأسرحكن سراحا جميلا وإن كنتن تردن الله ورسوله والدار الآخرة فإن الله أعد للمحسنات منكن أجرا عظيما'' (سورۂ احزاب: ۲۸)

(اے پیغمبر! اپنی ازواج سے فرمادیں کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی زیب و زینت کو ترجیح دیتی ہو تو اس کے لئے تیار ہو جاؤ، میں تمہیں کچھ مال و متاع دے کر خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کردوں گا، اور اگر تم لوگ اللہ، اس کے رسول اور دار آخرت کو ترجیح دیتی ہو تو اللہ تعالیٰ نے تم میں سے پاک دامن عورتوں کے لئے عظیم الشان بدلہ تیار کر رکھا ہے)۔

نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کو طلاق کا اختیار دیا تھا، چنانچہ بخاری کی روایت ہے:

''عن عائشة قالت خيرنا رسول الله فاخترنا الله ورسوله فلم يعد ذلك علينا شيئا'' (بخاری ۲/ ۷۹۲)

(حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم ازواج مطہرات کو طلاق کا اختیار دیا تھا تو ہم نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کیا لہذا ہم پر کوئی طلاق وغیرہ نہیں پڑی)۔

اس لئے فقہاء نے تفویض طلاق کی اجازت دی ہے، موجودہ زمانہ میں جبکہ طلاق کا غلط استعمال بہت زیادہ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے دوسری قوموں میں اسلام کا غلط تاثر پڑ رہا ہے، عورت کا طلاق کی شرط لگانا ازدواجی مصلحت اور حسن معاشرت کے لحاظ سے صحیح ہے، شیخ عبدالرحمن جزیری نے اس سلسلہ میں اچھی بحث

کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

اگر اعتراض کیا جائے کہ جب مرد عورت کے لئے طلاق کی شرط لگائے اور کہے میں تجھ سے اس شرط پر نکاح کرتا ہوں کہ تو اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے، تو یہ شرط فاسد ہے، لیکن جب عورت شرط لگائے کہ اس کو اپنے اوپر طلاق دینے کا اختیار ہوگا تو یہ شرط صحیح ہے، اس پر عمل کیا جائے گا، آخر ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں طلاق تنہا مرد کی خصوصیات میں سے ہے، اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ طلاق صرف مرد ہی کے قبضہ میں رہے نہ کہ عورت کے قبضہ میں، اور عورت کا اپنے لئے شرط لگانا صحیح نہ ہو، اور نہ ہی مرد کا یہ شرط قبول کرنا صحیح ہو، اس لئے کہ اس میں فی الجملہ قلب موضوع ہے۔

لیکن چونکہ اس جیسی شرط کے قبول کرنے میں اکثر ازدواجی مصلحت، حسن معاشرت اور باہمی ربط کی پختگی مضمر ہے، اس لئے شریعت نے اس شرط کو صحیح اور قابل قبول قرار دیا ہے، خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ کوئی تاوان نہ ہونے کی صورت میں عورت اکثر و بیشتر مرد کے ساتھ رہنے میں اندیشہ محسوس کرتی ہے، گویا اس جیسی شرط لگانے میں مرد و عورت دونوں کی مصلحت پوشیدہ ہے، لہذا ایسی شرط لگانا صحیح ہوگا (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۸۲/۴، ۸۵)۔

جزیری اور خانیہ کی عبارت سے اندازہ ہوگیا کہ تفویض کی شرط عورت کی طرف سے ہو تو صحیح ہے، لیکن مرد اگر اپنی طرف سے کوئی شرط لگادے تو یہ صحیح نہیں ہوگی۔

## طلاق کی صورت مہر میں اضافہ:

نکاح کے وقت اگر یہ شرط لگائی گئی کہ طلاق دینے کی صورت میں عورت کا مہر بیس ہزار روپے، اور طلاق نہ دینے کی صورت میں مہر دس ہزار ہوگا، میرے خیال میں یہ صورت جائز ہونی چاہئے، اس لئے کہ یہ بھی ازدواجی مصلحت میں شامل ہے، تاکہ لوگ خواہ مخواہ طلاق دینے سے گریز کریں، نیز طلاق کے بعد عورت جو بے سہارا ہو جاتی ہے، اس زائد رقم سے وہ کوئی کام کر سکتی ہے۔ اس مسئلہ میں صاحبین کے قول کو اختیار کیا جا سکتا ہے کہ اگر شوہر بیوی کو اس کے وطن سے باہر لے گیا تو مہر دو ہزار اور اگر باہر نہیں لے گیا تو مہر ایک ہزار ہوگا (ملتقی الابحر ۲۵۰/۱، موسسۃ الرسالۃ بیروت ۱۹۸۹ء) اس مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے اگر طلاق کی صورت میں مہر میں اضافہ کی شرط لگائی گئی تو طلاق کے بعد زائد مشروط رقم ادا کرنا ضروری ہوگا، کیونکہ ترجیح کی بابت اصول یہ ہے کہ جن مسائل کا تعلق باب قضاء سے ہے، اس میں امام ابو یوسف کے قول کو ترجیح ہوگی، چنانچہ علامہ شامی کا یہ شعر ہے:

وکل فرع بالقضاء تعلقا
قول أبي يوسف فيه ينتقى

(شرح عقد رسم المفتی ۸۰، طبع مکتبہ سعیدیہ سہارنپور)۔

لہذا اگر قاضی کے پاس یہ معاملہ پیش ہوگا تو صاحبین کے قول پر ہی فیصلہ کرے گا۔

## دوسرا نکاح نہ کرنے کی شرط:

نکاح کے وقت یہ شرط لگائی جائے کہ اس عورت کے رہتے ہوئے اگر شوہر دوسری شادی کرے گا تو عورت کا مہر تیس ہزار روپے ہوگا اور دوسرا نکاح نہ کرنے کی صورت میں پندرہ ہزار ہوگا، تو یہ شرط لگانا صحیح ہوگا، اور عقد ثانی کرنے کی صورت میں عورت تیس ہزار مہر کی مستحق ہوگی، عبداللہ بن قدامہ کا بیان ہے:

"وإن تزوجها وشرط لها أن لا يتزوج عليها۔ فلها فراقه إذا تزوج عليها" (المغنی ۷/۱۷، طبع دار الفکر بیروت)۔

(اگر نکاح کے وقت یہ شرط لگائی گئی کہ شوہر اس عورت کے رہتے ہوئے دوسرا نکاح نہیں کرے گا، اگر شوہر نے دوسری شادی کر لی تو اس عورت کو اپنے شوہر سے علاحدہ ہو جانے کا اختیار ہوگا)۔

اس سے معلوم ہوا کہ دوسرا نکاح نہ کرنے کی شرط حنابلہ کے نزدیک معتبر ہے، اسی طرح حنفیہ کے یہاں بھی یہ بات ملتی ہے کہ مہر میں یہ شرط لگائی کہ اس عورت کے علاوہ اگر اس کی بیوی نہ رہی تو عورت کا مہر ایک ہزار ہوگا، اگر کوئی بیوی رہی، یعنی اس نے کوئی دوسرا نکاح کیا تو عورت کا مہر دو ہزار ہوگا، صاحبین نے اس شرط کو بھی صحیح قرار دیا ہے۔ (بدائع الصنائع ۲۸۵/۲) لہذا اس مسئلہ میں اور اس سے پہلے والے مسئلہ میں موجودہ حالات و زمانہ کے لحاظ سے صاحبین کے قول کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

## ملازمت کی شرط

نکاح کے وقت اگر عورت نے شرط لگائی کہ شوہر اس کو نوکری کرنے سے نہیں روکے گا تو یہ شرط لگانا صحیح نہیں ہوگا، اس لئے کہ عورت پر ہر وقت مرد کا حق ہے، ملازمت کی شرط لگانے سے اس حق میں رکاوٹ پیدا ہوگی، نیز یہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف بھی ہے، چنانچہ ایسی شرط لگانے سے نکاح تو درست ہوجائے گا، لیکن شرط باطل ہوجائے گی، اور اس شرط کو پورا کرنا ضروری نہیں ہوگا، امام نوویؒ کا بیان ہے:

''عقد نکاح کے وقت عورت نے شرط لگائی کہ شوہر اس سے ہم بستر نہیں ہوگا، یا صرف رات میں (دن میں نہیں) ہم بستر ہوگا، یا ایک سال اس کے پاس نہیں جائے گا تو اس کی وجہ سے نکاح باطل ہوجائے گا، اس لئے کہ یہ ایسی شرط ہے جو تقاضۂ عقد کے خلاف ہے، لیکن اگر مرد نے عقد کے وقت انہی کاموں کے کرنے کی شرطیں لگائیں تو نکاح باطل نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ ایسا حق ہے جس کا ترک کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ اس شرط سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور ان شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہوگا''۔ (المجموع شرح المھذب ۱۹/۸)

حنفیہ کے نزدیک مذکورہ دونوں صورتوں میں نکاح باطل نہیں ہوگا، اس لئے کہ حنفیہ کے نزدیک شرط فاسد سے نکاح فاسد نہیں ہوتا "لأن النكاح لا يبطل بالشروط الفاسدة" (ہدایہ ۲/ ۲۹۳)

علامہ نوویؒ دوسری جگہ لکھتے ہیں: اگر عورت سے سو درہم کے ساتھ اس شرط پر نکاح کیا کہ جب چاہے عورت گھر سے باہر جاسکتی ہے تو نکاح صحیح ہے اور شرط و مہر فاسد ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اسی کے قائل ہیں۔ (المجموع ۱۸/ ۱۸)

نکاح کی شرطوں کی دوسری قسم یہ ہے کہ شرط تو باطل ہوجاتی ہے اور عقد صحیح رہتا ہے، جیسے یہ شرط لگائی جائے کہ عورت کا کچھ بھی مہر نہیں ہوگا، یا شوہر اپنی بیوی پر کچھ بھی خرچ نہیں کرے گا، یا اس کا مہر اس کو لوٹا دے گا، یا عورت یہ شرط لگائے کہ مرد اس سے ہم بستر نہیں ہوگا یا عزل کرے گا، یا دوسری سوکن کا حصہ اس کو دیدے گا، یا اس کی باری میں اضافہ کرے گا، یا یہ شرط لگائی کہ شوہر اس کے پاس صرف دن میں رہے گا، رات میں نہیں رہے گا تو یہ شرط باطل ہوں گی اور عقد نکاح صحیح ہوگا۔ اس لئے کہ یہ شرطیں مقتضائے عقد کے خلاف ہیں۔ (المغنی ۷/ ۷۲)

عورت اگر دن میں ملازمت کرتی ہے اور رات میں شوہر کے ساتھ رہتی ہے، تو شوہر پر ایسی بیوی کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

''إذا تزوج المحترفات التي تكون عامة النهار في الكارخانة والليل مع الزوج، لا نفقة لها''۔

(اگر ایسی عورت سے شادی کی جو پورے دن کارخانہ میں کام کرتی ہے اور رات میں شوہر کے ساتھ رہتی ہے، تو شوہر پر ایسی عورت کا نفقہ واجب نہیں ہوگا)۔

☆☆☆

# نکاح کے وقت لگائی جانے والی شرطیں

مولانا نعیم اختر قاسمی [1]

نکاح کے وقت لگائی جانے والی شرطیں تین قسم کی ہوسکتی ہیں:

(۱) ایسی شرائط جن سے کسی فریق پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں بلکہ عقد نکاح اس شرط کا متقاضی ہوتا ہے، مثلاً مرد کا یہ شرط لگانا کہ میں تم سے اس شرط پر نکاح کرتا ہوں کہ تو دوسرے کی بیوی یا دوسرے کی عدت میں نہیں رہے گی، یا تم کو طلاق کا اختیار نہ ہوگا، یا اس جیسی دیگر شرائط" (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۴/ ۸۵) اور ان شرائط کے احکام جاننے سے پہلے یہ بات پیش نظر رکھنی ہوگی کہ حنفیہ کے نزدیک نکاح کسی بھی شرط سے فاسد نہیں ہوتا (ہدایہ ۲/ ۲۹۳ کتاب النکاح) اگر شرط مقتضائے عقد کے موافق ہو، یا شریعت کے مخالف نہ ہو تو درست ہے اور اس کا پورا کرنا بھی واجب ہے اور اگر مقتضائے عقد کے خلاف ہو، یا اس سے شریعت کی خلاف ورزی لازم آتی ہو تو خود شرط ہی باطل ہوجاتی ہے اور نکاح درست قرار پاتا ہے۔

اس پہلی قسم کی شرطوں کی بابت علامہ مرغینانی تحریر فرماتے ہیں:

"قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر ایسی شرط جس کا خود عقد متقاضی ہو، مثلاً مشتری کیلئے ملکیت کی شرط لگانا تو اس سے عقد فاسد نہ ہوگا، یوں کہ اس کا ثبوت تو بلا شرط بھی ہوتا ہے"۔ (ہدایہ ۳/ ۵۹ باب البیع الفاسد)

ظاہر ہے کہ ایسی شرائط سے جب عقد بیع فاسد نہیں ہوتا، تو عقد نکاح جس میں شرط فاسد مؤثر ہی نہیں ہوتی، کیسے فاسد ہوسکتا ہے؟

امام شافعیؒ کی رائے اس سلسلہ میں حنفیہ کی رائے کے موافق ہے، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

"کسی عورت سے ایک ہزار مہر کے عوض اس شرط پر نکاح کیا کہ دن اور رات دونوں کے اندر جماع کرے گا یا اس کو نفقہ اور کسوہ دے گا، یا اس کے ساتھ سفر کرے گا، یا عورت شوہر کے گھر سے بلا اجازت نہیں نکلے گی، تو نکاح درست ہوگا، اور شرط کا مہر پر کوئی اثر ظاہر نہ ہوگا، کیوں کہ یہ شرائط مقتضائے عقد سے متعلق ہیں، اور اگر شوہر نے دوسری شادی کرنے یا باندی خریدنے کی شرط لگائی تو نکاح صحیح ہوگا، اور یہاں بھی شرط مہر کے اندر مؤثر نہیں ہوگی، کیوں کہ یہ شرط مقتضائے عقد کے منافی نہیں ہے"۔ (المجموع شرح المہذب ۱۸/ ۱۸ طبع الارشاد)۔

دوسری قسم میں وہ شرائط آتی ہیں جن کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، مثلاً اس شرط پر نکاح کرنا کہ شوہر مہر ادا نہیں کرے گا یا بیوی کو نفقہ اور سکنی نہیں ملے گا۔

اس قسم کی شرائط خود باطل ہوجاتی ہیں اور نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی عورت سے ایک ہزار مہر کے عوض اس شرط پر شادی کرتا ہے کہ دونوں میں ایک دوسرے کا وارث نہ ہوگا، تو یہ شرط خود باطل ہوجائے گی اور دونوں کے مابین وراثت جاری ہوگی، کیونکہ وراثت حق شرع ہے اور اللہ کی جانب سے متعین کردہ ہے، اسے ساقط کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ علامہ اوزجندیؒ لکھتے ہیں:

"کوئی شخص کسی عورت سے ایک ہزار درہم کے عوض اس شرط پر شادی کرتا ہے کہ ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے، تو نکاح درست ہوگا اور دونوں کے مابین وراثت بھی جاری ہوگی، اور مہر ایک ہزار ہی ہوگا خواہ مہر مثل اس سے کم ہو یا زائد" (قاضی خاں علی الھندیہ ۱/ ۳۴۳ فصل فی النکاح علی الشرط)

اسی طرح اگر نفقہ یا مہر نہ دینے کی شرط لگائی تو بھی یہ شرط باطل قرار پائے گی، کیوں کہ نفقہ کا سبب وجوب "احباس" ہے (ہدایہ ۲/ ۴۱۷ باب النفقہ، خانیہ علی الھندیہ ۱/ ۴۲۴) یعنی شوہر کا بیوی کو اپنے پاس روکے رکھنے سے نفقہ واجب ہوتا ہے اور یہ شرعی حق ہے اور مہر بھی شریعت کی جانب سے مقرر کردہ ہے، جس کے

[1] کوپا گنج، مئو

ابطال کا کوئی شخص مجاز نہیں۔

''فتاوی عالمگیری'' میں ہے:

''کسی عورت سے ایک ہزار مہر کے عوض اس شرط پر شادی کی کہ بیوی کو نفقہ نہ دے گا، جب کہ اس کا مہر مثل ایک سو ہے تو ایک ہزار ہوگا اور نفقہ کی بھی حقدار ہوگی۔ (ہندیہ ۱/۳۰۹ الشرط فی المھر)

اور صاحب ''ہدایہ'' لکھتے ہیں:

''مہر کا وجوب شریعت کی جانب سے محل کی شرافت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے، لہذا نکاح ہونے کے لئے مہر کا ذکر ضروری نہیں، یہی حکم اس وقت بھی ہوگا جب کہ نکاح کے وقت مہر نہ دینے کی شرط لگائی ہو''۔ (ہدایہ ۲/۳۰۴ باب المھر)

(۳) تیسری قسم کی شرطیں وہ ہیں جن کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوجاتا ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہیں ہوتا، اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی یا ذمہ داری عائد ہوتی ہے، جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہیں ہوتی۔

اس قسم کی شرائط کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں:

(۱) پہلی قسم میں وہ شرائط داخل ہوں گی جن کی بجا آوری میں ایک مشروع اور جائز امر سے باز رہنا یا حکم شرعی کی خلاف ورزی لازم آئے، مثلاً یہ شرط لگانا کہ عورت کو اس کے آبائی وطن سے نہیں نکالے گا، یا اسکے نکاح میں رہتے ہوئے کسی اور عورت سے شادی نہیں کرے گا یا فلاں عورت کو طلاق دے دے گا، تو ان تمام صورتوں میں یہ شرائط خود فاسد ہوجائیں گی اور نکاح کے بعد ان کا ایفاء لازم نہیں، چنانچہ صاحب ''عنایہ'' تحریر فرماتے ہیں:

''یہ بات پہلے مذکور ہوچکی کہ نکاح شروط فاسدہ سے باطل نہیں ہوتا، لہذا اگر کسی عورت سے ایک ہزار کے عوض اس شرط پر شادی کی کہ اس کو اس کے وطن سے نہیں نکالے گا، یا اس کی موجودگی میں کسی عورت سے شادی نہیں کرے گا، یا فلاں عورت کو طلاق دے دے گا، تو نکاح درست ہے اور شادی نہ کرنے، اس کو سفر میں نہ لے جانے اور سوکن کو طلاق دینے کی شرط فاسد ہوجائے گی، کیونکہ اس میں جائز امر سے باز رہنا لازم آتا ہے''

(عنایہ علی الفتح ۳/۲۳۱)

یہی رائے امام مالک کی بھی ہے۔ (مجموع ۱۸/۱۸ الارشاد)

(۲) دوسری قسم یہ ہے کہ اس میں کسی جائز اور مشروع امر سے باز رہنا یا شرعی حکم کی خلاف ورزی لازم نہ آئے، مثلاً عورت کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ طلاق کا اختیار میرے ہاتھ میں ہوگا، یا اس شرط پر نکاح کرتی ہوں کہ میں مطلقہ ہوجاؤں گی، تو اس صورت میں شرط معتبر ہوگی اور طلاق کا اختیار مرد کے بجائے عورت کو حاصل ہوگا۔

''فتاوی ہندیہ'' میں ہے:

''اگر عورت نے کہا کہ میں تم سے اس شرط پر شادی کر رہی ہوں کہ میں مطلقہ ہوں گی، یا طلاق دینے کا اختیار مجھے حاصل رہے گا جب چاہوں تم سے چھٹکارا حاصل کرلوں، اور شوہر نے اس شرط کو قبول کر لیا تو نکاح صحیح ہوگا، طلاق واقع ہوگی اور عورت کو طلاق دینے کا اختیار بھی رہے گا'' (ھندیہ ۱/۲۷۳ الباب الثانی فیما ینعقد بہ النکاح و مالا ینعقد)

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی باندی سے نکاح کرے کہ جو اولاد پیدا ہوگی وہ آزاد ہوگی تو یہاں بھی شرط کا اعتبار کیا جائے گا اور اولاد آزاد ہوگی۔ فخر الدین قاضی خان تحریر فرماتے ہیں:

''کسی نے دوسرے کی باندی سے بایں شرط شادی کی کہ پیدا ہونے والی اولاد آزاد ہوگی تو نکاح اور شرط دونوں درست ہیں، کیونکہ اگر شرط نہ لگائی جاتی تو پیدا ہونے والی اولاد غلام ہوتی، لہذا شرط نے ایک چیز کا فائدہ پہنچایا'' (قاضی خان علی ہامش الھندیہ ۱/۳۳۰)

خلاصہ کلام یہ کہ تیسری قسم کی شرط میں اگر کسی حکم شرعی کی مخالفت ہو رہی ہو تو وہ شرط باطل ٹھہرے گی، ورنہ اس کا اعتبار کیا جائے گا۔

## کیا بیوی کو طلاق کا حق دے دینے کے بعد اس سے رجوع ممکن ہے؟

بیوی کو طلاق دے دینے کے بعد شوہر اگر اپنے اختیار کو واپس لینا چاہے، تو اس کے لئے یہ ممکن نہیں، کیونکہ یہ اختیار دینا تملیک ہے توکیل نہیں، شامی میں ہے:

''طلاق کا اختیار بیوی کو دے دینے کے بعد شوہر اس کو واپس نہیں لے سکتا، کیونکہ اس کے اندر تعلیق کا معنی پایا جاتا ہے، تفویض کی تینوں قسموں تخییر، امر بالید اور مشیت کسی میں بھی شوہر کو رجوع کا اختیار نہیں''۔ (ردالمحتار ۲/ ۵۱۶)

## نکاح میں شرط لگانے کی صورتیں:

نکاح میں شرط لگانے کی تین صورتیں ہیں:

**پہلی صورت:**...... یہ ہے کہ عقد نکاح سے پہلے شرائط طے ہو جائیں اور اس کی تحریر پر طرفین کی دستخط ہو جائے، ایسی صورت میں چونکہ پہلے سے شرائط نکاح طے شدہ ہیں، اس لئے بوقت نکاح ایجاب وقبول میں گو صراحتاً ان شرائط کا ذکر نہ کیا جائے تاہم ان کا ذکر سمجھا جائے گا، اور یہی مانا جائے گا کہ بوقت ایجاب وقبول ان شرائط کا ذکر کیا گیا ہے۔

**دوسری صورت:**...... یہ ہے کہ ایجاب وقبول کے وقت ان شرائط کا ذکر کیا جائے، اگر ایجاب مشروط ہو تو قبول گو مطلق ہو، مثلاً صرف "قبلت" کہہ دے تو بھی ''السوال معاد فی الجواب'' (جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے) کے قاعدہ کے بموجب قبول مشروط ہی سمجھا جائے گا۔

البتہ اگر ایجاب مطلق ہو اور قبول مشروط، تو اس صورت میں قبول چونکہ ایجاب کے موافق نہیں ہے، اس لئے عقد نکاح ہی منعقد نہ ہوگا، ہاں اگر فریق اول یعنی ایجاب کرنے والا قبول مشروط کو مان لے تو پھر نکاح ان شرائط کے ساتھ منعقد ہو جائے گا، معروف فقیہ علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

''نفس عقد سے متعلق شرط یہ ہے کہ قبول ایجاب کے موافق ہو، پھر اگر مشتری نے بائع کے ایجاب میں سے بعض کو قبول کرلیا تو بائع کی جانب سے یہ دوسری بیع ہوگی، چنانچہ اگر اسی مجلس میں بائع نے مشتری کی بات قبول کرلی تو اگر بعض حصہ مبیع کی قیمت متعین ہو تو بیع جائز ہوگی ورنہ نہیں'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۳۶ کتاب البیوع)

**تیسری صورت:**...... یہ ہے کہ عقد نکاح کے بعد کوئی شرائط نامہ تحریر کیا جائے، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ نکاح بلا شرط منعقد ہوا ہے، بعد میں کوئی شرط لگانے سے وہ اصل عقد کے ساتھ ملحق نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کی حیثیت ایک معاہدہ کی ہوگی۔

## طلاق کا اختیار دینا مصلحت کے منافی نہیں:

طلاق کا اختیار مرد کے ہاتھ میں دیا جانا شریعت ہی کا نہیں، عقل کا بھی تقاضا ہے، عورتیں طبعاً جذباتی، نازک اور عجلت پسند ہوتی ہیں، جس کی بناء پر بلا عواقب و نتائج پر غور کئے کوئی اقدام کر گزرتی ہیں، اس کے بالمقابل مرد کو اللہ تعالیٰ نے سمجھدار، نتائج وعواقب پر نظر رکھنے والا اور زیادہ قوت برداشت کا مالک بنایا ہے، وہ کوئی بھی اقدام کرے گا تو اس کے صحیح نظر اس پر مرتب ہونے والے نتائج ہوں گے، جس کی بناء پر طلاق جس کی شریعت نے شدید ضرورت کے وقت اجازت دی ہے، اس کی نوبت کم آتی ہے۔ اور معاشرہ کسی بڑی تباہی سے دوچار ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔

مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اسلام میں عورت کو ظالم مرد سے نجات پانے اور اس کی جانب سے ہونے والی زیادتیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی راہ نہیں ہے، اسلام نے اس کی تین صورتیں نکالی ہیں:

پہلی صورت خلع کی ہے کہ عورت شوہر کو مال دیکر طلاق لے لے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ عورت نکاح کے وقت یہ شرط لگادے کہ نکاح کے بعد اگر فلاں صورت پیش آئی تو مجھے اپنے اوپر طلاق دینے کا حق حاصل ہوگا۔

خلع میں کوئی ضروری ہے کہ مرد بدل خلع قبول ہی کرلے، ایسا ممکن ہے کہ شوہر اس پر راضی نہ ہو اور مظلوم عورت ظلم وستم کی چکی میں پستی رہے۔

جہاں تک اسلامی عدالت میں قاضی کے فسخ نکاح کا مسئلہ ہے تو ہندوستان جیسے ملک کی اکثر ریاستوں اور شہروں میں اس کا نظم نہیں ہے اور غیر مسلم جج کا فسخ

نکاح معتبر نہیں، عورت اپنی داستان غم کسے سنائے اور کس کے پاس فریاد لے کر جائے؟ اس لئے ہمارے علاقے، زمانے اور معاشرے میں اس صورتحال کا بہترین حل یہی ہے کہ عقد نکاح کے وقت عورت کو اپنے اوپر طلاق دینے کے اختیار کی شرط کو ایسی شرائط کے ساتھ وابستہ کیا جائے، جس میں مقاصد شریعت فوت نہ ہوں اور عورت کی بھی مصیبت اور تباہی سے دوچار ہونے سے حفاظت کی جاسکے، مثلاً مرد بیرون ملک میں رہتا ہے اور کافی دنوں کے بعد واپس آتا ہے اور ایسی صورت میں عورت کو کافی مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تو عورت بوقت نکاح یہ شرط لگاسکتی ہے کہ اگر شوہر اتنے دن تک مجھ سے دور رہا تو مجھے طلاق دینے کا اختیار ہوگا، بلا شرط طلاق کے اختیار کو عورت کے حوالہ کردینے میں مصلحت شرعیہ کا فقدان لازم آئے گا۔

## مہر میں تفاوت کی شرط

اس شرط کے ساتھ نکاح ہو کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو مہر بیس ہزار روپیہ ہوگا اور اگر طلاق نہ دی تو دس ہزار روپیہ ہوگا، اسی مسئلہ کو فقہ کے اس مشہور جزئیہ پر قیاس کیا جاسکتا ہے، کہ اگر بیوی کو اس کے آبائی وطن سے باہر نہیں لے گیا تو مہر ایک ہزار روپیہ اور اگر باہر لے گیا تو دو ہزار روپیہ ہوگا، کیونکہ مسئلہ کسی خاص صورت میں محدود نہیں ہے، اس کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

چنانچہ ”فتاوی عالمگیری“ میں ہے:

”اگر ایک ہزار مہر کے عوض اس شرط پر شادی کی کہ مرد کی پہلے سے کوئی بیوی نہ ہو اور دو ہزار مہر اس شرط پر مقرر کیا کہ اس کی پہلے سے کوئی بیوی موجود ہو، یا عورت کو اس کے آبائی وطن سے نہ نکالنے پر ایک ہزار اور نکالنے کی صورت میں دو ہزار مقرر کیا، یا عجمی ہونے کی صورت میں ایک ہزار اور عربی ہونے کی صورت میں دو ہزار، یا اس طرح کی اور بھی جو صورتیں ہوں تو نکاح بلاشبہ جائز ہے، رہ گئی مہر تو پہلی شرط بالاتفاق جائز ہے، چنانچہ اگر شرط کو پورا کیا تو مہر مسمی لازم ہوگا اور اگر شرط کی مخالفت ہوئی تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مہر مثل واجب ہوگا، جو اقل سے کم نہ ہوگا اور نہ اکثر سے زائد ہوگا، اور صاحبین کے نزدیک دونوں شرطیں جائز ہیں“ (الفتاوی الہندیہ ۱/ ۳۰۸ الفصل الرابع فی المہر)۔

## کیا صاحبین کے قول پر فتوی دیا جاسکتا ہے؟

طلاق کا جو آج کل بے جا ناجائز استعمال ہو رہا ہے، اس پر قابو پانے کے لئے اس مسئلہ میں صاحبین کے قول پر فتوی دینا چاہئے۔

## ملازمت کی شرط لگانا

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ عورت گھر کی ملکہ ہو، کسی دفتر یا کارخانہ کی ملازمہ نہ ہو، گھر کی دنیا میں رہ کر وہ اپنے شوہر، بچے، والدین، بہن، بھائی کی خدمت کرے، دفتر اور کارخانوں میں ملازمہ بن کر اجنبی مردوں کی دلچسپی کا سامان نہ بنے، قرآن نے عورتوں کی تخلیق کا مقصد بایں الفاظ بیان کردیا ہے: ”وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ“ (سورۂ احزاب / ۳۳) (یعنی اپنے گھروں کو لازم پکڑو)، وہی تمہارا مسکن ہے اور وہیں تمہیں کام کرنا ہے، رہ گیا نان ونفقہ اور سکنی کا مسئلہ، سو شریعت نے شادی سے پہلے اس کا نفقہ باپ کے ذمہ لازم کیا، اور شادی کے بعد شوہر کے ذمہ عائد کی، اس لئے ملازمت وغیرہ کی شرط جو مغربی افکار ونظریات کی پیداوار ہے، اور جن کے نزدیک عورت کا نفقہ شوہر کے ذمہ واجب نہیں، شریعت اسلامی کی رو سے جائز نہیں ہے، نکاح درست ہوجائے گا، اور شوہر گو اس کو قبول کرے تاہم اس کا پورا کرنا لازم نہیں اور شرط باطل ہوجائے گی، اگر شوہر سلسلہ ملازمت ختم کرنے کا عورت کو حکم دے، یا نئی ملازمت سے روکے تو ایسا حکم دینے میں شوہر حق بجانب ہے، مسئلہ ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر عورت کو باہر نکلنا ممنوع ہے، اگرچہ وہ علم کی مجلس ہو (قاضی خاں علی الہندیہ ۱/ ۴۴۳) حتی کہ شوافع کے نزدیک شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی کے لئے اپنے والدین کی عیادت، ان کے جنازہ میں شرکت اور ان کی تعزیت بھی ممنوع ہے۔ (شرح المہذب ۱۸/ ۹۷ طبع الارشاد)

☆☆☆

# طلاق کے واقعات کو روکنے کیلئے صاحبین کے قول پر فتوی

مولوی محمد یوسف خاں قاسمی

## مہر میں زیادتی کی شرط:

طلاق کے واقعات کو روکنے کے لئے حضرات صاحبین کے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے، کیونکہ صاحبین ایک طرف ہوں اور امام صاحب دوسری طرف تو اس وقت دونوں قولوں کی حیثیت تقریباً برابر کی ہوجاتی ہے اور حالات کے پیش نظر قاضی خاںؒ تو صاحبین کے قول کو ہی راجح قرار دیتے ہیں۔ (رسم المفتی: ۲۰)

واضح رہے کہ اس طرح شرط لگا کر مہر طے کرنا جہاں عورت کے حق میں مفید ہے وہیں مرد کے حق میں نہایت مضر بھی ہے، کیونکہ بعض اوقات طلاق ایک ضرورت بن جاتی ہے جہاں شوہر کو طلاق دیئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں ہوتا ظاہر ہے کہ اس طرح مہر طے کرنے کی صورت میں شوہر کو مزید پریشانی کا سامنا ہوگا، اس لئے شوہر اس شرط کو مطلق قبول کرنے کے بجائے کوئی قید لگادے، مثلاً شوہر اس کو بلا کسی معقول وجہ کے طلاق دے تو مہر اس طرح ہوگا۔

اور جب مہر اس طرح طے کرنے کا مقصد ایک مجلس میں تین طلاق غیر مشروع اقدام کو روکنا ہی ہے تو اس طرح کیوں نہ شرط لگائی جائے کہ اگر شوہر اس کو طلاق غیر مشروع دے تو مہر بیس ہزار ہوگا ورنہ دس ہزار ہوگا، اگر اس طرح شرط لگائی جائے تو میرے خیال میں یہ عورت کے حق میں بھی بہتر ہوگا، اور شوہر کے حق میں بھی۔

**ایک نقطہ:**...... امام صاحبؒ سے جو یہ منقول ہے کہ ان کے نزدیک شرط اول صحیح ہوجاتی ہے اس لئے شرط ثانی باطل ہوجاتی ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلی شرط ہی صحیح ہوتی ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی صحیح ہوگی تو دوسری باطل ہوجائے گی، بلا کسی فرق کے اول ثانی کے درمیان، کیونکہ ابوحنیفہؒ کے نزدیک صحت وعدم صحت کا مدار اول ثانی پر نہیں ہے بلکہ منجز اور غیر منجز پر ہے، لہذا دونوں میں سے جو ایک بھی منجز ہوگی صحیح ہوجائے گی، اور معلق باطل ہوجائے گی، صاحب بحر نے اسی طرف توجہ دلایا ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: البحر الرائق ۳/ ۱۶۲)

## ۲۔ مہر کی کمی بیشی کی تعلیق دوسرے نکاح پر

اس طرح مہر طے کرنا کہ شوہر اس منکوحہ کے عقد میں ہوتے ہوئے اگر دوسرا نکاح کرے گا تو مہر بیس ہزار ہوگا، ورنہ دس ہزار ہوگا، ایسی صورت میں حضرات صاحبین کے نزدیک دونوں شرطیں معتبر و درست ہیں اور دونوں صورتوں میں مہر مسمی واجب ہوگا اور امام صاحبؒ کے نزدیک منجز والی صورت (یعنی نکاح نہ کرنے والی) صحیح ہے، اس لئے اس کے پائے جانے کی وجہ سے مہر مسمی واجب ہوگا اور دوسری شرط کا اعتبار نہیں، لہذا اگر بعد میں دوسرا نکاح کرلیتا ہے تو مہر مثل واجب ہوگا کیونکہ ایک شرط کے صحیح مان لینے کے بعد دوسری شرط لامحالہ باطل ہوجائے گی (اس میں امام صاحبؒ کے نزدیک جو منجز ہے وہ صحیح ہے اور جو شرط معلق ہے وہ باطل ہے) اس مسئلہ میں دلائل کے اعتبار سے امام صاحبؒ کا قول ہی مضبوط معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی ایک اصول ہے کہ ایسے وقت میں جس کی دلیل قوی ہوگی اسی کا اعتبار ہوگا تو مناسب ہے کہ امام صاحب کے قول کو ہی اختیار کیا جائے، بخلاف ماقبل کے کہ وہاں حالات کے پیش نظر صاحبین کے قول کو اپنانے کی گنجائش ہے۔

غرضیکہ ایسی شرطوں کا نکاح پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ اس کا اثر مہر پر ضرور پڑتا ہے امام صاحب کے نزدیک پہلی شرط صحیح ہونے کی وجہ سے

پہلا مہر مسمی واجب ہوگا، بصورت دیگر مہر مثل واجب ہوگا، بشرطیکہ وہ مہر مسمی اقل سے کم اور اکثر سے زائد نہ ہو اور صاحبین کے نزدیک چونکہ دونوں شرطیں درست ہیں اس لئے دونوں صورتوں میں مہر مسمی واجب ہوگا۔ (فتح القدیر ۳؍۲۳۳، بدائع ۲؍۲۸۵، عالمگیری ۱؍۳۰۸، البحر الرائق ۳؍۱۶۱، رد المحتار ۲؍۱۲۳، المبسوط للسرخسی ۵؍۹۰)

## ۳۔ نکاح کے وقت عورت کا ملازمت سے نہ روکنے کی شرط لگانا

عقد نکاح کے وقت عورت کا اس طرح شرط لگانا کہ شوہر اس کو سلسلۂ ملازمت سے نہیں روکے گا یا آئندہ ملنے والی مناسب ملازمت سے نہیں روکے گا اور شوہر اس کو قبول کرلیتا ہے تب بھی اس شرط کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے اور نہ ہی شوہر پر اس کی پابندی ضروری ہے، بلکہ شوہر اگر اس کو سلسلۂ ملازمت ختم کرنے کا حکم دیتا ہے یا نئی ملازمت کرنے سے روکتا ہے تو عورت پر اس حکم کی تعمیل ضروری ہوگی۔

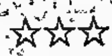
اس لئے کہ روزی کمانے اور ضروریات زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری اللہ تعالی نے مردوں پر رکھی ہے، عورت کے ذمہ گھریلو ذمہ داری ہے، عورت گھر کی ملکہ ہے، عورت چراغ خانہ ہے شمع محفل نہیں، نیز اللہ تعالی نے مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا اور ہر جائز حکم کی تعمیل عورت پر فرض کی گئی ہے، بچوں کی پرورش، امور خانہ داری کے فرائض اور گھر کی زندگی کو سکون و راحت کی جنت بنانا عورت کا کام ہے، ان کے ذمہ ملازمت کر کے روزی کمانا نہیں خاندان کے لئے روزی کمانا اور تمدن کی محنت طلب خدمات انجام دینا مرد کا کام ہے۔

حضرات فقہاء نے صراحت کردی ہے کہ بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نہیں نکل سکتی ہے اور اجنبیوں کی زیارت وعیادت کے لئے ولیمہ وغیرہ کی مجلسوں میں شرکت کے لئے عورت شوہر کی اجازت کے باوجود نہیں نکل سکتی، بلکہ شوہر کی اجازت سے نکلتی ہے تو دونوں گنہگار ہوں گے اور عورت اگر بغیر اجازت کے نکل جاتی ہے تو شوہر کو پٹائی کرنے کا حق ہوگا۔ (الاشباہ ۲؍۹۱، فتح القدیر ۴؍۲۰۸، ہدایہ ۲؍۴۴۳)

صاحب فتح لکھتے ہیں:

”عورتوں کے نکلنے میں فتنے کا دروازہ کھلے گا، اس لئے سد اللباب اس کی ممانعت کی گئی ہے“ (فتح القدیر ۴؍۲۰۸)

معلوم ہوا کہ مذکورہ پابندی شوہر پر واجب تو درکنار، بلکہ شوہر کو ملازمت سے روکنا واجب ہے، ورنہ دونوں گنہگار ہوں گے۔



# نکاح کے وقت تفویض طلاق کی نوعیت

مولانا ہارون رشید مظاہری

تفویض طلاق کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اصل شریعت نے طلاق کا اختیار مردوں کو دیا ہے، عورت کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے اوپر طلاق واقع کرے، کیوں کہ عورت ناقص العقل ہے اور اس کا بے جا استعمال کا خیال ہمیشہ رہتا ہے اس وجہ سے اس کو کلی طور پر اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا، اور مرد کو بھی اس وقت طلاق دینے کا حق ہے جب کہ حالت بالکل ناگزیر ہو اور طلاق کے بغیر چارہ کار نہ ہو، کیونکہ عام حالات میں طلاق بہت بری چیز ہے، اسی لئے طلاق کو "أبغض الحلال" کہا گیا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مرد طلاق بھی نہ دے اور حقوق زوجہ کا لحاظ بھی نہ کرے اور ظلم کو اپنے لئے روا رکھے تو ایسی صورت میں شریعت نے طریقہ بتلایا کہ عورت مرد سے خلع کرلے بہرحال! عورت کو بھی مجبوری کے وقت مرد سے چھٹکارا پانے کا راستہ بتلایا ہے، لیکن بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مرد خلع کرنے کے لئے راضی نہیں ہوتا اور عورت پر ظلم بھی کرتا رہتا ہے، ایسی صورت میں عورت "کالمعلقۃ" ہو کر رہ جاتی ہے، تو اس صورت میں مقدمہ کرکے قاضی شریعت سے نکاح کو فسخ کرادے، لیکن بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ، بہت سے لوگ مقدمہ کرنے اور قاضی کی عدالت میں جانے سے گریز کرتے ہیں وکم من واقع لا یوقع کا مظاہرہ ہوتا ہے، ان سب باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے عقد نکاح ہی کے وقت کچھ ایسی شرائط لگائی جائیں جس سے عورت بوقت ضرورت طلاق کو اختیار کرسکے اور وہ عورت کے لئے وقت پر مفید بن سکے، اس سلسلہ میں ہمارے نزدیک مولانا تھانوی کی کتاب "الحیلۃ الناجزۃ" سے پورا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

مختصراً یہ ہے کہ اس قسم کا کابین نامہ لکھوانا جس میں عورت کو طلاق کا اختیار بوقت ضرورت حاصل ہو شرعا جائز و درست ہے اور اس اختیار دینے کا نام تفویض ہے، اس کی تین صورتیں ہیں، اور تینوں جائز ہیں، چاہے وہ کابین نامہ نکاح سے پہلے لکھوایا جائے یا عین نکاح کے وقت لکھوایا جائے یا نکاح کے بعد۔

پہلا طریقہ:...... نکاح سے پہلے کابین نامہ لکھوانے کی صورت میں ایک شرط کا خاص لحاظ رکھنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں نکاح کی طرف اضافت اور نسبت کو ذکر کیا جائے، مثلاً یہ لکھا جائے کہ اگر میں فلاں بنت فلاں کے ساتھ نکاح کروں اور اس اقرار نامہ کے مرقومہ شرائط میں سے کسی شرط کے خلاف کروں تو مسماۃ مذکورہ کو اختیار ہوگا کسی وقت چاہے اپنے اوپر طلاق بائن واقع کرکے اس نکاح سے الگ ہوجائے، لیکن مذکورہ شرط میں اضافت الی النکاح نہ لکھی گئی تو اقرار نامہ غلط ہوگا اور عورت کو اختیار حاصل نہ ہوگا۔

دوسرا طریقہ:...... عین عقد کے وقت ایجاب وقبول ہی میں زبانی شرائط مذکور ہوں، اس کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو یعنی اولاً عورت، یا اس کا ولی یا وکیل، یعنی قاضی عقد نکاح کے وقت یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو یا مسماۃ فلاں بنت فلاں کو تیرے نکاح میں اس شرط پر دیا کہ تم نے یہ کام کئے (سب شرائط ذکر کردئے جائیں) تو اپنے معاملہ کا اختیار میرے یا مسماۃ موصوفہ کے اختیار میں ہوگا، شرائط مذکورہ میں سے ایک کی بھی خلاف ورزی پر اسی وقت یا کسی وقت چاہوں (یا چاہے) تو اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر اس نکاح سے الگ کرسکوں گا، یا کرسکے گی، اس کے جواب میں مرد کہے کہ میں نے قبول کیا تو اب عورت کو اختیار حاصل ہوجائے گا، اور یہ کہہ کر الگ ہوجائے کہ میں اپنے اوپر ایک طلاق بائن واقع کرتی ہوں، لیکن اس میں اس شرط کو خاص ملحوظ رکھے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو۔

تیسرا طریقہ:...... تیسری صورت میں عورت نکاح کے بعد بھی شوہر سے اقرار نامہ لکھوانا چاہے تو لکھوا سکتی ہے، یہ صورت بھی صحیح اور درست ہے، ان تمام صورتوں کے صحیح ہونے میں حنفیہ کو کوئی کلام نہیں ہے۔

انتباہ:...... طلاق ایک ناپسندیدہ چیز ہے اور ساتھ ہی بعض ناگزیر حالات میں ایک ضرورت بھی ہے، لیکن اس کے غلط اور بے جا استعمال سے بہت بڑی خرابیاں پیدا ہورہی ہیں جن سے زن وشوہر بلکہ پورا خاندان متأثر ہوتا ہے، سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ لوگوں کو تین طلاق کے سلسلہ میں شریعت کا حکم اور اس کی

قباحت کے متعلق آشنا کرایا جائے تین طلاق کو روکنے کے لئے مہر کی ایک خطیر رقم متعین کر کے طلاق کو مشکل اور دشوار بنا دینا شریعت کی نگاہ میں نامناسب ہے، شریعت نے اس کو آسان بنا دیا ہے تو ویسا ہی رکھا جائے، اس لئے کہ بعض دفعہ عورت کو طلاق دینا ضروری ہوتا ہے، لیکن مہر کی کثرت کے ڈر سے مرد طلاق نہیں دیتا، اس صورت میں عورت معلقہ بن کر رہ جاتی ہے اگر چہ عقد نکاح کے وقت اس طرح مہر طے کرنا کہ شوہر طلاق دے تو بیس ہزار ورنہ دس ہزار، یا میری موجودگی میں دوسری بیوی کرے تو دس ہزار ورنہ پانچ ہزار، اس طرح مہر طے کرنا درست ہے اور اس مسئلہ کو آبائی وطن سے اخراج اور عدم اخراج پر قیاس کر سکتے ہیں، اور اس کی موجودگی میں نکاح یا عدم نکاح میں دوسری عورت سے کوئی فرق نہیں ہوگا، اس لئے جس طرح صاحبین کے نزدیک اقامت واخراج کے سلسلہ میں دونوں شرطیں جائز ہیں اسی طرح تزوج اور عدم تزوج میں بھی دونوں شرطیں صحیح اور درست ہوں گی۔

## عورت کا ملازمت کی شرط لگانا:

گھریلو نظم ونسق سنبھالنے کی ذمہ داری عورت کی ہے اور باہر کے امور کی انجام دہی مرد کے ذمہ ہے، نیز بیوی اور نابالغ اولاد کا نفقہ شوہر اور باپ پر ہے، جس کی وجہ سے عورت کو ملازمت کرنے یا کوئی دوسرا ذریعہ معاش تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو ہر اس عمل سے روک سکتا ہے جس کے کرنے سے شوہر کے حق میں تنقیص ہو رہی ہو، یا اس کو ضرر ونقصان پہنچ رہا ہو، یا اس کام کے لئے بیوی کو شوہر کے گھر سے نکلنا پڑے، لہذا اگر شوہر گھریلو نظم ونسق سنبھالنے کے لئے اپنی بیوی کو ملازمت سے روکنا چاہے تو شرعاً شوہر کو اس کا اختیار ہوگا، اور منع کرنے کے باوجود وہ ملازمت کرے گی تو گناہ گار ہوگی، اور شرط ملازمت، شوہر کے قبول کرنے کے باوجود، شوہر بیوی کو ملازمت سے روک سکتا ہے، نیز موجودہ زمانہ میں عورت کا ملازمت کرنا مرد کی آبگینۂ غیرت کو ٹھیس پہنچانا ہے۔



# نکاح کے موافق اور منافی شرائط

مولانا محمد نور القاسمی

## مقتضیات عقد شرائط

جو شرائط مقتضیات عقد میں سے ہیں ان کا ایفاء واجب ہے، مثال کے طور پر عقد کے وقت یہ شرط لگا دینا کہ شوہر عورت کے ساتھ اچھی طرح زندگی بسر کرے گا، یا یہ کہ عورت کا نفقہ، کسوہ، اور سکنی سب شوہر پر لازم ہوگا، نیز بیوی کے حقوق میں سے کسی چیز کی کمی شوہر نہیں کرے گا، اور اس بیوی کے لئے بھی وہی باری متعین کرے گا جو دوسری بیویوں کے لئے متعین کرے گا، یا یہ کہ عورت بغیر شوہر کی اجازت کے گھر سے باہر نہ نکلے گی، نہ شوہر کی نافرمانی کرے گی اور نہ ہی شوہر کی اجازت کے بغیر نفل روزہ رکھے گی، نہ شوہر کے مال میں بغیر اس کی اجازت کے تصرفات کرے گی وغیرہ وغیرہ، ان تمام شرطوں کی وجہ سے نکاح منعقد ہوجائے گا، یعنی نکاح کے انعقاد پر اس کا کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا، اور ان شرائط کو پورا کرنا بھی ضروری ہوگا، یہ ایفا ان شرائط کے لگا دینے کی وجہ سے نہیں بلکہ عقد نکاح ہی کی وجہ سے ان امور کا پورا کرنا واجب ہوگا، چنانچہ سید سابق صاحب فقہ السنہ لکھتے ہیں:

> جن شروط کا پورا کرنا ضروری ہے وہ یہ ہیں، جو مقتضیات عقد اور مقاصد عقد میں سے ہوں اور اس سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بدلنا لازم نہ آتا ہو، مثال کے طور پر اچھی طرح زندگی گزارنے کی شرط لگانا، عورت کے نفقہ کی شرط لگانا، اس کے پہناوے اور اس کو اچھی طرح رکھنے کی شرط لگانا، نیز یہ کہ شوہر اس کے حقوق میں سے کسی چیز کی کمی نہیں کرے گا، دوسری بیویوں کی طرح اس کی باری بھی مقرر کردے گا، اور یہ شرط لگادے کہ بیوی اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے نہیں نکلے گی اور اس کی نافرمانی نہیں کرے گی اور بغیر اس کی اجازت کے نفل روزہ نہیں رکھے گی، کسی کو گھر آنے کی اجازت اس کی اجازت کے بغیر نہیں دے گی، اور بغیر اس کی رضامندی کے اس کے مال واسباب میں تصرف نہیں کرے گی وغیرہ۔ (فقہ السنہ ۲ / ۶۴)

## غیر مقتضیات عقد اور منافی عقد شرائط:

شرط کی دوسری قسم جو مقتضیات عقد میں سے نہ ہوں اور منافی عقد ہوں، مثلاً نکاح کے وقت کسی فریق کا ایسی کوئی شرط لگا دینا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، جیسے شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان ونفقہ اس کے ذمہ ہوگا، یا یہ کہ عورت کا مہر شوہر پر نہیں ہوگا، یا یہ کہ عورت ہی شوہر کا نفقہ برداشت کرے گی، یا یہ کہ بیوی شوہر کو کچھ روپے پیسے دے گی یا شوہر یہ شرط لگادے کہ وہ بیوی کے پاس دن میں تو رہے گا، مگر رات میں نہیں رہے گا وغیرہ، تو یہ تمام شرائط فاسد ہوں گی، اس لئے کہ یہ شرائط عقد نکاح کے منافی ہیں ان شرائط کو پورا کرنا بھی ضروری نہیں ہے، البتہ نکاح درست ہوجائے گا، چنانچہ "المجموع" میں ہے:

> اگر کسی عورت سے ایک سو کے عوض میں شادی کی، بشرطیکہ وہ دوسری شادی نہیں کریگا، یا یہ کہ وہ اس کے رہتے ہوئے دوسری باندی سے وطی نہیں کرے گا، یا اس شرط پر کہ وہ اس کے ساتھ سفر نہیں کرے گا، یا وہ بیوی کے ماں باپ سے بات نہیں کرے گا، یا یہ کہ وہ اس کو پہننے کے لئے کپڑا نہیں دے گا اور عورت کا نفقہ اس پر نہیں ہوگا، یا اس شرط پر نکاح کیا کہ وہ جب چاہے گھر سے نکل جائے تو نکاح تو درست ہوجائے گا، البتہ شرط اور مہر دونوں فاسد قرار دئے جائیں گے، اسی کے قائل امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ ہیں (کتاب المجموع ۱۸ / ۱۸ طبع مکتبۃ الارشاد جدہ)۔

نیز علاء الدین سمرقندیؒ فرماتے ہیں:

"کسی نے بغیر مہر کے نکاح کیا یا مہر نہ دینے کی شرط پر نکاح کیا اور عورت نے قبول کرلیا، تو ہمارے اصحاب کے نزدیک نکاح منعقد ہوجائے گا اور شوہر کے ذمہ مہر لازم ہوگا" (تحفۃ الفقہاء ۱ / ۱۳۵ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)

اس سے بھی واضح عبارت فقہ السنۃ کی ہے، جس سے مسئلہ منقح ہوجاتا ہے:

''ان شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عقد نکاح کے درست ہونے کے باوجود اس شرط کا پورا کرنا واجب نہیں ہوتا ہے، یہ مقتضاء عقد کے منافی شرط ہوتا ہے، مثال کے طور پر نفقہ اور وطی کے چھوڑ دینے کی شرط لگائی، یا اس کو مہر نہ دینے کی یا اس سے عزل کرنے کی شرط لگائی، یا یہ شرط لگائی کہ عورت ہی اس کا خرچ برداشت کرے گی یا وہ اس کو کچھ روپے دے گی، یا وہ ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ شب باشی کرے گا، یا صرف دن میں تعلق قائم کرے گا، رات میں نہیں تو یہ تمام شرائط باطل ہیں، کیوں کہ عقد کے منافی ہیں'' (فقہ السنۃ ۲ / ۱۴۷)

مذکورہ بالا شرائط فاسد ہیں اور فقہاء تصریح کرتے ہیں کہ شرائط فاسدہ کے پائے جانے کے بعد بھی نکاح منعقد ہوجاتا ہے۔

چنانچہ علامہ کاسانی ؒ فرماتے ہیں:

''والنكاح لا تبطله الشروط الفاسدة'' (بدائع الصنائع ۲ / ۷۷ دار الکتب العلمیۃ)

یہاں پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ نکاح شروط فاسدہ سے باطل نہیں ہوتا ہے، امام شافعی کے نزدیک اگر عورت نے یہ شرط لگائی کہ مرد اس سے نکاح کے بعد وطی نہیں کرے گا، یا اس شرط پر نکاح کیا کہ شوہر کو صرف رات میں تعلق قائم کرنے کا اختیار ہوگا، یا یہ کہ وہ بیوی کے پاس ایک سال تک نہیں جائے گا، تو عورت کی جانب سے لگائی گئی ان شروط کی بناء پر نکاح باطل ہوجائے گا، جیسا کہ فقہاء شافعیہ لکھتے ہیں:

''جب عقد کے وقت عورت نے شرط لگائی کہ شوہر اس سے وطی نہیں کرے گا، یا یہ شرط لگائی کہ وہ رات میں تو وطی کرے گا، لیکن دن میں نہیں، یا یہ کہ وہ اس کے پاس ایک سال تک نہیں آئے گا تو نکاح باطل ہوجائے گا'' (المجموع ۱۸ / ۱۹، حلیۃ العلماء ۶ / ۴۵۰)

## غیر مقتضیات اور غیر منافی عقد شرائط

تیسری قسم شرائط کی وہ ہیں جو نہ مقتضیات عقد میں سے ہیں اور نہ ہی منافی عقد، بلکہ بین بین ہیں، یہ وہ شرائط ہیں جن کے نتیجے میں کسی فریق پر ایسا کوئی حق حاصل ہوتا ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہیں ہوتا، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا، یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا، تو ان شرائط کے ہوتے ہوئے بھی نکاح درست ہوجائے گا، اس پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا، چنانچہ صاحب ''عنایۃ'' اکمل الدین بابرتی ؒ فرماتے ہیں:

''ایک ہزار کے بدلہ اس شرط پر شادی کی کہ وہ بیوی کو شہر سے باہر نہیں لے جائے گا، یا اس شرط پر کہ وہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کرے گا، یا اس شرط کے ساتھ کہ شوہر فلاں کو طلاق دیدے گا تو نکاح درست ہے، گو کہ دوسری شادی نہ کرلے، سفر نہ کرنے اور سوکن کو طلاق دینے کی شرط فاسد ہے، اس لئے کہ اس کے اندر امر مشروع کی ممانعت لازم آتی ہے'' (العنایہ مع فتح القدیر ۳ / ۳۵۰)

ان شرائط کا ایفاء واجب نہیں ہے، سید سابق لکھتے ہیں:

''علماء میں سے بعض یعنی امام شافعی اور بہت سے اہل علم نے نکاح کو صحیح قرار دیا ہے، گرچہ یہ شرط لغو و بے کار ہیں، ان کو پورا کرنا شوہر کے ذمہ واجب نہیں'' (فقہ السنۃ ۲ / ۴۷)

ان لوگوں کا استدلال ایک حدیث شریف سے ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو شرائط پورا کرنا چاہئے، الا یہ کہ وہ ایسی شرطیں ہوں جس سے حرام کی حلت یا حلال شئی کی حرمت ثابت ہوتی ہو، ان شروط کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے، اور اوپر کی مذکورہ شرائط کا بھی یہی حال ہے کہ ان سے ایک حلال شئی کی حرمت لازم آتی ہے۔

اور ان لوگوں کا استدلال اس حدیث سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں پر شرطوں کو پورا کرنا واجب ہے، الا یہ کہ کوئی شرط ایسی ہو جس سے کسی حرام شئی کی حلت ثابت ہوتی ہو، یا حلال چیز کی حرمت لازم آتی ہو، فرمایا کہ یہ شرائط ایسی ہیں جو حلال چیز یعنی نکاح، وطی اور سفر کو حرام کرتی ہیں، حالانکہ یہ سب حلال ہیں (دیکھئے: کتاب مذکور)۔

## بین الفریقین طے شدہ اقرار نامہ:

وہ شرائط یا اقرار نامہ جو فریقین کے درمیان طے پاتے ہیں، وہ تین قسم کے ہوتے ہیں، اول یہ کہ نکاح سے پہلے ہی وہ شرائط طے ہوجائیں اور اس پر دستخط بھی ہوجائیں، ثانی وہ جو عقد نکاح کے وقت ہوں، مثلاً ایجاب ہی مشروط ہو یا ایجاب مطلق ہو اور قبول مشروط ہو، ثالث یہ کہ عقد نکاح مکمل ہونے کے بعد کوئی شرائط نامہ فریقین کے درمیان طے پائیں اور اس پر دستخط بھی ہوجائے۔

چنانچہ "درمختار" میں ہے:

"اس کی شرط یا تو ملک حقیقی کا ہونا ہے، جیسے اپنے غلام سے یہ کہنا کہ اگر تو نے ایسا کیا تو تو آزاد ہے، یا ملک حکمی کا ہونا، جیسے اپنی منکوحہ عورت یا عدت گزار رہی بیوی سے شوہر کا یہ کہنا کہ اگر تو نکلی تو تجھے طلاق ہے، یا ملک حقیقی یا ملک حکمی کی جانب اضافت ہو، جیسے کسی آدمی کا یہ کہنا کہ اگر میں نے کسی عورت سے نکاح کیا یا تم سے نکاح کیا تو تجھے طلاق ہے، اسی طرح ہر عورت کا حکم ہے۔ (الدر المختار مع الرد المحتار ۳؍ ۳۴۴ طبع سعید کمپنی کراچی)۔

چنانچہ اگر نکاح کی جانب اضافت کو اس اقرار نامہ میں تحریر نہیں کیا گیا، تو یہ اقرار نامہ محض بے کار ہوگا اور اس کے رو سے عورت کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔

علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں: "فلغا قوله لأجنبية إن زرت زيدا فأنت طالق" (الدر المختار مع الرد المحتار ۳؍ ۳۴۵)

(سو کسی مرد کا کسی اجنبی عورت سے یہ کہنا کہ اگر تو نے زید کی زیارت کی تو تجھے طلاق ہے، لغو ہے)۔

اس کے لغو ہونے کی وجہ یہی ہے کہ یہاں ملک نکاح کی طرف اضافت نہیں پائی جارہی ہے، یہاں یہ وضاحتاً عرض ہے کہ وہ صورت جس میں اقرار نامہ پہلے سے تیار ہو اور اس میں اضافت الی النکاح نہ پایا جاتا ہو، لیکن دستخط دولہا اور گواہان کی جانب سے عقد نکاح کے وقت ہو رہا ہو، وہ اقرار نامہ معتبر ہوگا، گو اس میں اضافت الی النکاح کا فقدان ہے، کیونکہ یہ صورت دوسری صورت کے حکم میں داخل ہے، جس کا تذکرہ چند سطروں بعد ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ عین ایجاب وقبول کے وقت زبانی شرائط کا ذکر ہو، اس کے معتبر ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو، یعنی اولاً عورت خود ایجاب کے وقت کہے کہ میں نے اپنے آپ کو (یا عورت کا ولی یا وکیل یوں کہے کہ میں فلاں بنت فلاں کو) تیرے نکاح میں دیتی ہوں (یا دیتا ہوں) اس شرط پر کہ اگر تم نے یہ کام کیا یا فلاں فلاں کام تو اپنے معاملہ کا اختیار میرے ہاتھ میں ہوگا) یعنی شرائط مذکورہ میں سے کسی ایک شرط کی خلاف ورزی پر بھی اختیار ہوگا کہ وہ اسی وقت یا جس وقت چاہے اپنے آپ کو طلاق دے کر اس نکاح سے الگ کرسکے گی، ان شرائط کے جواب میں مرد جو نکاح کررہا ہو یوں کہے کہ میں نے قبول کیا یا یوں کہے کہ میں نے ان ساری شرائط کے ساتھ قبول کرلیا، تو عورت کو اختیار ہوگا کہ جب چاہے اپنے اوپر شرائط کی خلاف ورزی کے وقت طلاق واقع کرکے شوہر کے نکاح سے نکل جائے۔

چنانچہ "درمختار" میں ہے: "نكحها على أن أمرها بيدها صح" (الدر المختار مع الرد المحتار ۳؍ ۳۲۹)

(نکاح کیا عورت سے اس شرط پر کہ اس کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہوگا، تو یہ صحیح ہے)، اور علامہ شامیؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"مصنف کا "صح" کہنا اس صورت کے ساتھ مقید ہے کہ جب ابتداءً عورت نے کیا اور ایجاب اس طرح کیا ہو کہ میں تجھ سے اس شرط پر نکاح کرتی ہوں کہ میرا معاملہ میرے ہاتھ میں ہوگا، جب میں چاہوں گی اپنے آپ کو طلاق دے لوں گی یا اس شرط پر کہ مجھے طلاق ہوجائے گی، اس پر شوہر نے کہا کہ میں قبول کرتا ہوں۔ (رد المحتار ۳؍ ۳۲۹)

اگر ایجاب مرد کی جانب سے ہو اور لڑکی یا لڑکی والے قبول کے ساتھ تفویض طلاق کی شرط لگادیں تو نکاح بلا کسی شرط کے صحیح ہوجائے گا اور شرط کالعدم ہوجائے گی۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: "اگر شوہر نے ابتداء کی تو نہ تو بیوی مطلقہ ہوگی اور نہ ہی اس کے معاملہ کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ (دیکھئے: کتاب مذکور)

عورت کی جانب سے ایجاب مشروط ہو اور مرد قبول کرلے تو شرط باقی رہتی ہے، اور اگر مرد کی جانب سے ایجاب مطلق ہو اور عورت کی جانب سے قبول مشروط ہو تو کالعدم ہو جاتی ہے، ان دونوں صورتوں میں فرق بیان کرتے ہوئے فقیہ ابو اللیث فرماتے ہیں:

''اس لئے کہ ابتداء جب شوہر کی جانب سے ہوئی تو گویا طلاق اور تفویض طلاق، نکاح سے پہلے ہوا جو صحیح نہیں ہے، ہاں اگر ابتداء عورت کی جانب سے ہو تو یہ تفویض نکاح کے بعد سمجھی جائے گی، اس لئے کہ جب شوہر نے عورت کے کلام کے بعد قبلت (میں نے قبول کیا) کہا تو یہ بیوی کے قول کا جواب ہوا اور جواب سوال کے مضمون کو شامل ہوتا ہے گویا کہ اس نے کہا کہ میں نے قبول کیا اس شرط پر کہ تم کو طلاق ہوگی یا اس شرط پر کہ تیرا معاملہ تیرے ذمہ ہوگا، تو یہ تفویض نکاح کے بعد ہوگی''۔ (ردالمحتار ۳/۲۴۲)

اور اگر ایجاب عورت ہی کی جانب سے ہو، لیکن غیر مشروط ہو اور مرد نے قبول کرتے ہوئے شرط تفویض ذکر کردیا تب بھی یہ شرط صحیح ہو جائے گی، اس لئے کہ نکاح قبول کرنے کے بعد ہی تام ہوتا ہے، اور مرد نے جو قبول کی شرط لگائی ہے وہ گویا نکاح کے اندر لگائی، لہذا صحیح ہوگا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ نہ نکاح سے پہلے شرط لگائی اور نہ عقد نکاح کے وقت، بلکہ نکاح مکمل ہونے کے بعد کوئی شرط لگائی جائے اور اقرار نامہ لکھا جائے اور فریقین اس پر راضی ہوں، تو یہ صورت بھی صحیح اور درست ہے اور یہ شرط واجب الایفاء ہوگی، اسلئے کہ اس کا نکاح سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کی حیثیت یمین وقسم جیسی ہے اور یمین کا پورا کرنا واجب ہے۔

## تفویض کے بعد رجوع کا حکم:

جب شوہر نے اپنی بیوی کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار دے دیا تو اب شوہر کو یہ اختیار باقی نہیں رہتا ہے کہ وہ اس تفویض سے رجوع کرلے اور زوجہ کے اس حق کو فسخ کردے، اسلئے کہ تفویض کے بعد زوجہ اس اختیار کی بذات خود مالک ہو جاتی ہے، خواہ اس حق کو استعمال کرے یا نہ کرے اور جب چاہے کرے، اور تملیک کے بعد رجوع کا حق حاصل نہیں ہوتا ہے۔

''فتاوی عالمگیری'' میں ہے: ''شوہر کو اس سے نہ تو رجوع کرنے کا اختیار ہوگا اور نہ ہی اس چیز سے روکنے کا اختیار ہوگا جو معاملہ اس کے سپرد کر چکا ہے اور نہ ہی اس کو فسخ کرسکتا ہے، جیسا کہ جوہرۃ میں لکھا ہے'' (الفتاوی الہندیہ ۱/۳۸۷)۔

نیز فقہ السنۃ میں ہے: ''شوہر کو رجوع کرنے کا اختیار نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس نے بیوی کو اس معاملہ کا مالک بنا دیا ہے تو اب رجوع کرنے کا حق نہیں ہوگا'' (فقہ السنۃ ۱/۳۸۷)۔

علاء الدین سمرقندیؒ نے تو اس سے بھی زیادہ واضح اور لطیف عبارت پیش کی ہے۔

''ان فصلوں کے اندر یہ ہے کہ شوہر کا یہ ارادہ کرنا کہ بیوی کو اس کے اختیار کے استعمال سے باز رکھے اور اس کے معاملہ کو اس سے لے لے اور اس سے رجوع کرلے تو یہ صحیح نہیں ہے، اسی طرح اس کو اس سے روکنا بھی صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ یہ تفویض طلاق ہے اور طلاق فسخ کا احتمال رکھتا ہے تو اس کا اختیار دیدینا بھی ایسا ہی ہوگا'' (تحفۃ الفقہاء ۱/۱۹۲)

## فتوی صاحبین کے قول پر ہے:

چونکہ آج کل کے مرد بھی سنجیدگی سے دور ہو کر جذباتی ہو گئے ہیں اور ذرا سی بات پر طلاق کی نوبت آجاتی ہے، اور اس کا بے جا استعمال کرتے ہوئے طلاق دے بیٹھتے ہیں، اس سے طرح طرح کی خرابیاں لازم آتی ہیں، ان خرابیوں سے بچنے کے لئے اگر نکاح کے وقت یہ شرط لگادی جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دیا تو بیوی کا مہر بیس ہزار ہوگا اور طلاق نہ دیا تو دس ہزار ہوگا، تو صاحبین کے قول پر فتوی دیتے ہوئے دونوں صورتوں میں مہر مسمی لازم کرنا چاہئے، یعنی ضرورت کے پیش نظر امام ابوحنیفہ کے قول کو چھوڑ کر صاحبین کے قول پر فتوی دیا جاسکتا ہے، جیسا کہ مشائخ متقدمین نے بھی ضرورت زمانہ کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کے قول کو چھوڑ کر صاحبین کے قول پر فتوی دیا ہے۔

## ملازمت کی شرط لگانا:

یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ شرائط کی تین قسمیں ہیں: مقتضیات عقد، منافی عقد اور غیر مقتضائے عقد، غیر منافی عقد، تینوں کے احکام شروع میں بیان ہو چکے ہیں، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ مسئلہ حل کیا جائے کہ اگر عورت اپنے شوہر سے نکاح کے وقت یہ شرط لگا دے کہ اس کو لگی ہوئی ملازمت سے نہیں روکے گا، اور شوہر نے اس شرط کو قبول بھی کرلیا تو بھی اس کی پابندی نہیں ہے، یہ شرط لغو ہو جائے گی، اگر نکاح کے بعد ان شرائط کی رعایت نہ کرتے ہوئے عورت کو سلسلۂ ملازمت ختم کرنے کا حکم دے یا نئی ملازمت کرنے سے روکے تو عورت پر اسکے حکم کی تعمیل ضروری ہوگی، اور عدم تعمیل کی صورت میں ناشزہ شمار ہوگی، یہ تو ملازمت کی بات ہے، اگر عورت علمی مجلس میں بھی جانا چاہتی ہے اور شوہر جو عالم ہے، اس کو وہاں جانے سے منع کردے تو عورت کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ اس کی اجازت کے بغیر وہاں چلی جائے۔ (خانیہ علی هامش الہندیہ ار ۴۴۳)

''اگر عورت شوہر کی اجازت کے بغیر علم کی مجلس میں جانا چاہتی ہے تو اس کو اختیار نہیں ہوگا''۔

امام شافعیؒ نے تو بغیر اذن شوہر کے ماں باپ کے جنازہ میں بھی شرکت کی اجازت نہیں دی ہے۔

امام شافعی نے فرمایا کہ شوہر بیوی کو باپ، ماں اور بیٹے کے جنازہ میں شرکت کرنے سے روک سکتا ہے (المجموع شرح المہذب ۱۸ / ۹۷)۔



# نکاح میں شرائط اور مصالح شرعیہ

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی [1]

(۲) یہ شرط لغو اور نان ونفقہ واجب ہوگا۔

(۳) امام احمدؒ کے یہاں معتبر ہے۔ (معاشرتی مسائل ر ۱۱۴، بحوالہ زاد المعاد ۶/۴)۔

(الف) نکاح منعقد ہوجاتا ہے، مگر شرط لغو ہوتی ہے۔

نکاح منعقد ہوجاتا ہے، لیکن اس قسم کی شرط کی پابندی ضروری نہیں۔

(ب) اس میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے، امام احمدؒ کے یہاں ان میں سے بہت سی شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہے۔ (معاشرتی مسائل ر ۱۱۴ بحوالہ زاد المعاد ۶/۴)

(ج) یہ مسائل معروف ہیں، فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

نکاح میں شرط کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) غیر مفید (۲) (۳) صلب عقد میں مذکور شرطوں کا اعتبار ہوگا، بعد میں اگر شوہر اپنے حق طلاق کو جزءاً یا کلاً مشروط یا غیر مشروط طریقہ پر تفویض کردے تو (متعینہ قیود کے ساتھ جن کا تفصیلی ذکر کتب فقہ میں ملتا ہے) اسی کے بقدر حق منتقل ہوجائے گا۔

مسئلہ کا ایک پہلو:...... جب شریعت نے ہی تفویض کی اجازت دی ہے تو مصالح شرعیہ کے ضیاع کا سوال نہیں، اس لئے ایسی صورت کہ جس میں مصالح شرعیہ کے ضیاع کا خطرہ ہو، وہ معتبر نہ ہوگا۔

**عورت کا مہر دس ہزار ہے:**

(۴) عملاً اس صورت کا تحقق کیونکر ہوگا؟ کیوں کہ "طلاق نہ دی" کی شرط کے وجود یا عدم وجود کا پتہ موت سے ہی ہوسکتا ہے، جب کہ مہر خلوت صحیح سے ہی پورا واجب ہوجاتا ہے۔

۲۔ اس میں صاحبین کا مسلک اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔

۳۔ یہ شرط لغو ہوگی، ضروری نہ ہوگی۔

☆☆☆

---

[1] استاذ حدیث فقہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

# نکاح میں شرطیں اور شرعی احکام

مولانا محمد رضوان القاسمیؒ

## نکاح میں شرطیں:

(۱) ایسی شرطیں جن کے ذریعہ زوجین پر کوئی نئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ خود عقد نکاح سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو مؤکد کرنا ان شرطوں کا مقصود ہو، واجب التکمیل ہوں گی، اس لئے کہ خود شارع نے ان کو واجب قرار دیا ہے اور گویا یہ نکاح کے لوازم میں سے ہیں، اور قاعدہ ہے: "إذا ثبت الشئی ثبت بلوازمه"۔

(۲) نکاح کے وقت کوئی ایسی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی لازمی ذمہ داری سے گریز ہو، جیسے نفقہ ادا کرنے کی شرط، تو گو ایسی شرطوں کے ساتھ نکاح منعقد ہو جاتا ہے، لیکن ان کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ یہ مقصد نکاح کے خلاف اور منشاء شریعت کے مغائر ہے، اور جب شریعت خود کسی بات کا اعتبار نہ کرے تو اس کے مقابلہ مکلف کی شرط معتبر نہیں۔

(۳) نکاح کے وقت کوئی ایسی شرط لگانا جو ان دونوں سے مختلف ہو اور اس کی وجہ سے کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہو جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہیں ہو، جمہور فقہاء کے نزدیک غیر معتبر ہے اور یہی رائے حنفیہ کی ہے، میرے خیال میں یہی زیادہ درست ہے، نکاح کے وقت شرائط کا عائد کرنا بے اعتمادی کو جنم دیتا ہے اور اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے، اس لئے ایسی شرطیں لازم الایفاء نہیں۔

## تفویض طلاق:

طلاق تو اصل مرد کا حق ہے، لیکن اس بات کی گنجائش ہے کہ شوہر علاحدگی کا حق بیوی کو بھی عطاء کردے، تفویض کی تینوں ہی صورتیں درست ہیں:

(۱) نکاح سے پہلے ہی تفویض کردے، البتہ اس صورت میں ضروری ہے کہ تفویض طلاق کی نسبت نکاح کی طرف ہو۔

(۲) عقد نکاح ہی میں تفویض کیا جائے، البتہ اس صورت میں ضروری ہے کہ پہل عورت کی طرف سے ہو۔

(۳) عقد نکاح کے بعد بھی تفویض کی جاسکتی ہے، البتہ اس صورت میں قبول کرنا اور نہ کرنا مرد کے اختیار میں رہے گا۔

**مہر مشروط:**...... طلاق یا عقد ثانی کی صورت میں مہر کی مقدار بڑھا دی جائے، اس سے کچھ خاص فائدہ نہیں ہوگا، بلکہ اس سے نقصان ہی کا اندیشہ ہے، کیونکہ لوگ اس خوف سے طلاق بھی نہیں دیں گے اور بیوی کو معلق بنا کر رکھیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی زندگی اور زیادہ مصائب میں مبتلا ہو جائے گی، اس لئے راقم سطور کا خیال ہے کہ اس مسئلہ میں صاحبین کی رائے اختیار کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

**ملازمت کی شرط:**...... عورتوں کی طرف سے اس طرح کی شرط عائد کرنا کہ شادی کے بعد بھی وہ سلسلۂ ملازمت کو جاری رکھے شریعت کی روح اور اس کے مزاج کے خلاف ہے، اس لئے اگر عورت نے ایسی شرط لگائی اور شوہر نے اسے قبول بھی کرلیا تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

☆☆☆

# نکاح میں مفید شرائط اور طریقۂ کار

مولانا زبیر احمد قاسمی [1]

اشتراط فی النکاح میں اولاً یہ طے شدہ ہے کہ عقد نکاح میں جیسی بھی شرطیں لگائی جائیں فاسدہ ہوں یا صحیحہ کسی بھی شرط کے ساتھ مشروط کرنے سے نکاح کا انعقاد ونفاذ متاثر نہیں ہوتا نکاح بہر حال منعقد ہوجاتا ہے خود شرطیں ہی فاسد ولغو بن جاتی ہیں، ثانیاً یہ بھی طے شدہ ہے کہ کسی بھی عقود ومعاملات میں ایسی شرطیں لگائی جائیں جو مقتضائے عقد کے خلاف ہوں اور اس عقد کے نتیجہ میں شریعت نے جس فریق کے لئے جتنے حقوق وفرائض متعین کر کے جتنی ذمہ داری اس پر عائد کی ہے اس سے زائد ذمہ داری ڈالنا اور حقوق وفرائض میں کمی بیشی کرنا اور اسے بطور شرط عند العقد ذکر کرنا، جائز نہیں یہ شرطیں لازم الایفاء نہیں اور نکاح کے سوا دوسرے عقود ومعاملات ایسی ناجائز شرطوں کے ساتھ مشروط ہوجانے پر صحیح نہیں رہتے فاسد یا باطل قرار پاتے ہیں، خلاصہ یہ کہ عقود ومعاملات کو مشروط بالشرائط کرنا بنیادی طور پر گرچہ صحیح ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس اشتراط سے تغییر شرع اور ابطال حق واتلاف غرض شرع لازم نہ آئے۔

ان کلمات کے بعد سوالوں کے جوابات بالترتیب یہ ہیں۔

۱۔ خود عقد نکاح سے جو ذمہ داریاں فریقین پر شرعاً لازم ہوا کرتی ہیں، مثلاً وجوب نفقہ اور تمکین علی النفس وغیرہ اسی کو بوقت نکاح بصورت شرط ذکر کرنا، بلاشبہ جائز ہوگا کیونکہ یہ مقتضائے عقد کی تصریح وتاکید، احکام شریعت کی تقریر، اور اس کے واجب العمل ہونے کا اعتراف اور اعلان وتشہیر ہونے کے ساتھ شریعت کے ان اغراض ومقاصد کی تکمیل کا عہد ہے جن کے لئے نکاح کی مشروعیت ہوتی ہے، اور یہ ساری چیزیں شرعاً مطلوب ہیں۔

۲۔ نکاح کے وقت ایسی شرط لگانا جس سے ان حقوق وفرائض کی ذمہ داری سے فرار وگریز لازم آئے جو فریقین پر شریعت نے لازم قرار دیا ہے، ایسی شرطیں جائز نہیں ہوں گی، بلکہ فاسد ولغو کہلائیں گی، کیونکہ یہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف تغییر شرع اور اتلاف غرض شارع کو مستلزم ہوگی، ایسی شرطوں کے اشتراط کے باوجود عقد نکاح صحیح، منعقد اور نافذ ہوگا، اور ان شرطوں کا ایفاء ہرگز ضروری نہیں رہے گا۔

۳۔ نکاح کو ایسی شرطوں سے مشروط کرنا جس کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسے حقوق حاصل ہوجائیں، یا ایسی پابندیاں عائد ہوجائیں جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہیں ہوتے، تو ایسی شرطیں صحیح اور لازم الایفاء ہوں گی، کیونکہ اس کا حاصل یا تو التزام ضرر ہے یا اپنے بعض حقوق سے دست برداری اور اس کا اسقاط، اور یہ چیزیں شرعاً معتبر ہوا کرتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ ایسی شرطوں سے نکاح کی صحت، اس کا انعقاد ونفاذ کچھ بھی متاثر نہیں ہوتا۔

۴۔ اگر بوقت نکاح کوئی عورت اپنے لئے ایقاع طلاق کے اختیار ہونے کی شرط لگائے اور شوہر اسے تسلیم بھی کرے تو یہ تفویض طلاق کی ایک صورت ہوگی جو صحیح ہے اور نتیجۃً عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق واختیار حاصل ہوجائے گا، شوہر اس تفویض طلاق کو ختم نہیں کرسکتا۔ "لأن التفويض تمليك لا توكيل فلم يصح رجوعه" کتب فتاوی میں مصرح ہے۔

## تفویض طلاق کی مختلف صورتوں کا حکم:

یہ تو ظاہر ہے کہ تفویض طلاق کی فی نفسہ دو صورتیں ہوسکتی ہیں

(۱) تفویض مطلق، مثلاً کوئی شوہر یوں کہے: "اختاري نفسك، طلقي نفسك۔ یا۔ أمرك بيدك"۔

(۲) تفویض معلق ومشروط، مثلاً کوئی شوہر یوں کہے: "إن كان كذا فطلقي نفسك" وغیرہ، یہاں بعد نکاح تفویض طلاق سے بحث نہیں، بلکہ قبل النکاح تفویض طلاق کی شرط لگانے سے ہے، اور چونکہ عورت کا سریع الحس، مغلوب الغضب، ناقص العقل اور کثیر الانفعال ہونا ایک مسلم حقیقت ہے، اس لئے بوقت

[1] ناظم اشرف العلوم، کنہواں، سیتامڑھی

نکاح تفویض مطلق کا اشتراط تو خلاف مصلحت ہوگا، ہاں معلق ومشروط تفویض کی شرط لگائی جاسکتی ہے، تا کہ بوقت ضرورت ظالم شوہر سے نجات کی راہ بھی کھلی رہے اور عورت مطلق العنان بھی نہ بن سکے۔

اب بوقت نکاح اس معلق ومشروط تفویض کے اشتراط کی تین، بلکہ اس سے زائد صورتیں بھی ممکن ہیں، لیکن اس تفویض طلاق کی اشتراط سے مقصود، اگر عورت کے لئے بوقت ضرورت ظالم شوہر سے نجات کی راہ کھولنی ہے تو اس مقصد کے لئے صد فیصد مفید صرف دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، استیعاب صورت کے لئے تمام صورتوں کی تفصیل مع احکام درج ذیل ہے:

(الف) عقد نکاح سے پہلے شرائط تفویض طے ہوجائیں اور اس کی تحریر پر طرفین کے دستخط ہوجائیں، اس صورت کے معتبر ومفید ہونے کیلئے ضروری یہ ہے کہ اس میں نکاح کی طرف اضافت ونسبت ہو، کیونکہ جیسے ایقاع کے لئے ملک یا نسبت الی الملک ضروری ہے، ویسے ہی تفویض طلاق یا تو فی الملک ہو یا منسوب الی الملک ہو تب ہی معتبر ومفید ہوگا، مثلاً عقد سے پہلے شرائط نامہ کی تحریر اس طرح مرتب ہو اور یہ لکھا جائے کہ ''اگر میں فلاں ابن فلاں، فلانہ بنت فلاں سے نکاح کروں اور پھر شرائط مندرجہ تحریر ہذا میں سے کسی ایک یا فلاں فلاں متعدد شرطوں کی ایک دفعہ یا مثلاً تین دفعہ کی خلاف ورزی کروں، تو اس منکوحہ فلانہ کو اختیار ہوگا کہ اسی وقت یا پھر کسی وقت فلاں فلاں اپنوں کے مشورہ واجازت کے بعد اپنے اوپر طلاق واقع کر کے اس نکاح سے الگ ہوجائے، اور اس تحریر پر فریقین دستخط کر کے ایجاب مطلق اور قبول مطلق کے ذریعہ بھی نکاح کرلیں گے وہ تحریری تفویض مشروط صحیح ومفید ہوگی، عورت حسب شرائط اپنے اوپر طلاق واقع کرسکتی ہے۔

نکاح کو مشروط بہ تفویض طلاق کرنے کی یہ صورت جامع مفید اور متعدد احتیاط ومصالح پر مشتمل ہونے کے سبب مناسب ہے۔

اس میں عورت طلاق کی مختار ہونے کے باوجود پابند بھی رہے گی، کہ جب تک شرطوں کی متعدد بار خلاف ورزی نہ ہوجائے اور فلاں فلاں کی اجازت بھی حاصل نہ کرلے طلاق واقع نہیں کرسکتی۔

(ب) عقد نکاح ہی میں ان شرائط کا زبانی ذکر ہو تو اس کے مفید وصحیح ہونے کے لئے ضروری یہ ہے کہ ایجاب مشروط عورت کی جانب سے ہو، مثلاً عورت یا اس کا ولی دو وکیل یوں ایجاب کرے کہ میں نے اپنے آپ کو یا فلانہ بنت فلاں کو تیرے نکاح میں اس شرط کے ساتھ دیا کہ اگر تم نے فلاں فلاں کام کیا یا نہ کیا (یہاں مناسب شرطوں کی تعداد اور شرطوں کی خلاف ورزی کی تعداد اور دیگر مصالح کی بنیاد پر جتنی احتیاطی قیدیں بڑھانی مناسب معلوم ہوں سب کا سب ذکر کردیا جائے) تو مجھ کو یا اس فلانہ بنت فلاں منکوحہ کو اپنے اوپر طلاق بائن واقع کر کے نکاح سے الگ ہوجانے کا حق ہوگا۔

اس کے بعد مرد چاہے تو قبول مطلق کرتے ہوئے صرف اتنا کہے کہ میں نے قبول کیا یا مشروط کرتے ہوئے یوں کہے کہ میں نے شرائط قبول کیا، دونوں کا ایک ہی حکم ہوگا، عورت حسب شرائط ایقاع طلاق کی مختار ہوجائے گی۔

(ج) اگر ایجاب عورت ہی کی طرف سے ہو مگر بلا ذکر شرائط تفویض، یعنی ایجاب مطلق، اور مرد نے قبول میں شرائط تفویض کا اضافہ کر کے قبول مشروط کیا تب بھی تفویض صحیح اور معتبر ومفید ہوجائے گی، عورت حسب شرائط مالک طلاق بن کر ایقاع طلاق کرسکتی ہے، مگر یہ صورت چونکہ صرف مرد کے دائرہ اختیار میں آجاتی ہے، اس لئے ممکن ہے کہ مرد قبول مطلق ہی کرے، اپنے قبول ہی میں شرائط کا ذکر نہ کرے تو پھر عورت کچھ نہ کرسکے گی، اس طرح یہ صورت اختیار طلاق کی طالب عورت کے لئے صد فیصد مفید نہیں ہو پائے گی۔

(د) اس کے برعکس اگر ایجاب مطلق بلا ذکر شرائط تفویض مرد ہی کی جانب سے ہو اور پھر عورت شرائط تفویض ذکر کر کے قبول مشروط کرے تو اس کا کچھ حاصل نہ ہوگا، بلا شرط یہ نکاح منعقد ہوجائے گا تفویض طلاق نہ ہوگی، عورت بے اختیار و بے بس ہی رہ جائے گی۔

(ہ) عقد نکاح کے بعد طرفین تفویض اور شرائط تفویض کی تحریر مرتب کریں اور شوہر رضامندی کا دستخط تحریر پر ثبت کردے تو یہ صورت بھی صحیح اور مفید ہوسکتی ہے کیونکہ بعد النکاح بالکلیہ مرد کے دائرہ اختیار میں چلا جاتا ہے، ممکن ہے مرد اس تحریر پر راضی نہ ہو اس لئے صد فیصد مفید مطلب صورتیں وہی پہلی اور دوسری ہی ہوسکتی ہیں، اور اس میں حسب مصالح احتیاط کا پہلو ملحوظ رکھتے ہوئے جتنی شرطیں اور قیدیں بڑھانی مناسب معلوم ہوں بڑھائی جاسکتی ہیں تا کہ عورت کے مطلق العنان ہونے اور بے جا تصرف کر لینے کا سد باب ہوجائے۔

۵۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بوقت نکاح تسمیہ مہر کو مختلف شرطوں کے ساتھ مشروط کر کے قدر مسمی کو مختلف بنانا جائز ہے، اس کے بعد کس شرط کا اعتبار ہوگا کس کا

نہیں، اور مرد پر کس صورت میں کون سا قدر مسمی لازم الادا ہوگا اور کس صورت میں مہر مثل وغیرہ، یہ مسئلہ ائمہ حنفیہ کے درمیان مختلف فیہ ہے جس کی قدرے تفصیل ووضاحت سوالنامہ میں بھی درج ہے۔

مگر یہاں حل طلب سوال صرف اتنا ہے کہ کثرت طلاق کے واقعہ کو کم کرنے کی تدبیر کے طور پر اس مسئلہ میں صاحبین کے قول کو فتوی کے لئے اختیار کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

میرا خیال یہ ہے کہ اس تدبیر سے ممکن ہے کہ یہ فائدہ حاصل ہوجائے کہ کثرت مہر کے سبب اس کی ادائیگی کو ناقابل تحمل بوجھ سمجھ کر طلاق نہ دے، مگر اس میں دوسرا ضرر یہ بھی ممکن ومستور ہے کہ پھر اس عورت کو مرد کالمعلقہ بنا کر چھوڑ دے۔

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اس مسئلہ میں صاحبین کے قول کو اختیار کرنے سے "إذا ابتليت ببليتين" سے واسطہ پڑ سکتا ہے تو پھر "فاختر أهو نهما" کو تلاش کیا جائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس مسئلہ میں قول صاحبین کو برائے فتوی اختیار کرنے کا کوئی فائدہ ہماری سمجھ میں نہیں آسکا، بلکہ ایسے میں "فوار من المطر وقرار تحت الميزاب" ہی سمجھتا ہوں، "لعل الله يحدث بعد ذلك أمرا"۔ (سورۂ طلاق:۱)

۶۔ اگر نکاح کرتے وقت تسمیہ مہر اس طرح ہو کہ اگر اس منکوحہ کی سوکن نہیں لائے گا، تو تیس ہزار، ورنہ پندرہ ہزار مہر دینا ہوگا، یہ مسئلہ بھی بین الائمہ مختلف فیہ ہی ہوگا، امام ابوحنیفہ کے یہاں پہلی شرط معتبر ہوگی اور اس کے ایفاء کی صورت میں تیس ہزار ورنہ مہر مثل بشرائط مہر دین قرار پائے گا، جب کہ صاحبین کے نزدیک دونوں شرطیں معتبر ہوں گی جس شرط کا ایفاء ہوگا اس کے مطابق کم وبیش مقدار مسمی مہر دین ہوگا، یہ تو دونوں شرطوں کے معتبر ہونے نہ ہونے کے متعلق اختلاف ائمہ کی وضاحت ہوئی، باقی دونوں شرطوں کے لازم العمل ہونے نہ ہونے کا سوال، تو ظاہر ہے کہ دونوں شرطیں بیک وقت ممکن العمل ہی نہیں ہوسکتیں، لازم العمل ہونا چہ معنی دارد؟۔

۷۔ کوئی تعلیم یافتہ ملازمت سے وابستہ، یا وابستہ ہونے کی امیدوار عورت بوقت نکاح یہ شرط لگائے کہ شوہر لگی ہوئی ملازمت یا ملنے والی ملازمت سے نہیں روکے گا، تو ایسی شرط کو اگر شوہر قبول بھی کرلے گا تاہم اس کے لئے یہ شرط لازم الایفاء نہیں ہوگی، چنانچہ اس شرط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شوہر اگر اس عورت کو ملازمت سے روکے گا تو اس حکم کی تعمیل عورت پر لازم ہوگی۔

کیوں کہ عقد نکاح سے شرعاً حاصل ہونے والے حقوق میں سے ایک حق شوہر کے لئے اپنی بیوی کو منع عن الخروج کا بھی ثابت ہوجاتا ہے، اس لئے مقتضائے عقد کے خلاف عورت کا یہ شرط لگانا شروط فاسدہ کے قبیل سے ہوگا جس کا واجب التعمیل نہ ہونا مسلم ہے، کیونکہ اس کی تعمیل سے جہاں بعض مقاصد نکاح فوت ہوتے ہیں وہاں حکم شریعت کی تغییر وتنسیخ لازم آتی ہے۔

(۱) عقد نکاح سے پہلے شرائط طے ہوجائیں تو نکاح کی طرف نسبت ضروری ہوگی۔ مثلاً اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو۔

(۲) یا قبول مشروط ہو، تب بھی تفویض درست ہوگی۔

(۳) عقد نکاح کے بعد شرائط نامہ لکھا جائے تو نکاح کی طرف نسبت ضروری نہ ہوگی اور یہ تفویض درست ہوگی۔

تفویض واختیار کے ساتھ کچھ ایسے لوگوں کے نام رکھے جاسکتے ہیں کہ ان کے خلاف شرط تسلیم کرنے کی صورت میں عورت کو اختیار طلاق ہوگا تاکہ عورت اس کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاسکے، کچھ ایسے لوگوں کے نام درج کرنے سے کہ ان کے تسلیم کرنے پر اختیار طلاق عورت کو ہو تو مصالح شریعت کی حفاظت بھی ہوسکے گی۔

تین طلاقیں بیک وقت دینے یا بے جا طور پر طلاق سے روکنے کے لئے ایک تدبیر ہوسکتی ہے کہ جہیز کا رواج ختم کرنے اور مہر معجل کو رواج دینے کی سعی کی جائے، کیونکہ اس صورت میں مرد کو کافی مالی نقصان ہوگا اور وہ طلاق سے بچے گا، تجربے میں یہ آیا ہے کہ مرد کے پاس جہیز کا سامان آجاتا ہے اور مہر وہ جلدی ادا کرتا نہیں ہے اور قانونی طور پر اس کی وصولیابی بھی عورت کے لئے دشوار ہوتی ہے، اس لئے مرد طلاق دینے میں شیر ہوجاتے ہیں۔

۲۔ نکاح ثانی پہ پابندی لگانے کے لئے مہر کا تفاوت معتبر نہیں ہے۔

۳۔ صرف یہ شرط لگانے سے عقد نکاح متاثر نہ ہوگا اور شوہر کی عدم پابندی کی صورت میں عقد نکاح ختم نہ ہوگا۔

☆☆☆

# شرائط نکاح سے عائد ہونے والی ذمہ داریاں

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی [1]

(الف) نکاح کے وقت عاقدین میں سے کسی کا کوئی ایسی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی ذمہ داری سے گریز ہو، ایسی صورت میں نکاح تو درست ہوگا، مگر ایسی شرط باطل ہوگی، جیسے نفقہ کی ذمہ داری۔ "وبما أنفقوا من أموالهم" (سورۂ نساء: ۳۴)۔ سے گریز۔ ایسی شرط صحیح نہ ہوگی، کیونکہ مرد کی قوامیت جو قوانین نکاح کے بنیادی اصول میں ہے، اسی انفاق کا نتیجہ ہے۔

(ب) تیسری قسم کی شرائط، ان سے عقد نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، لیکن اگر شوہر اس کا ایفاء نہیں کرتا تو یہ نکاح ختم نہ ہوگا۔

(ج) تفویض طلاق کی صورت میں عورت کو شرعاً یہ اختیار حاصل ہوگا، شوہر اس اختیار کو واپس نہیں لے سکتا، وکالت واپس لی جاسکتی ہے، تفویض واپس نہیں لی جاسکتی۔

(۱) عقد نکاح سے پہلے شرائط طے ہو جائیں تو نکاح کی طرف نسبت ضروری ہوگی، مثلاً اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو.....۔

(۲) یا قبول مشروط ہو، تب بھی تفویض درست ہوگی۔

(۳) عقد نکاح کے بعد شرائط نامہ لکھا جائے تو نکاح کی طرف نسبت ضروری نہ ہوگی اور یہ تفویض درست ہوگی۔

تفویض واختیار کے ساتھ کچھ ایسے لوگوں کے نام رکھے جاسکتے ہیں کہ ان کے خلاف شرط تسلیم کرنے کی صورت میں عورت کو اختیار طلاق ہوگا تا کہ عورت اس کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاسکے۔ کچھ ایسے لوگوں کے نام درج کرنے سے کہ ان کے تسلیم کرنے پر اختیار طلاق عورت کو ہو تو مصالح شریعت کی حفاظت بھی ہوسکے گی۔ اس طرح کا ایک نمونہ ساتھ منسلک ہے۔

تین طلاقیں بیک وقت دینے یا بے جا طور پر طلاق سے روکنے کے لئے ایک تدبیر یہ ہوسکتی ہے کہ جہیز کا رواج ختم کرنے اور مہر معجل کو رواج دینے کی سعی کی جائے، کیونکہ اس صورت میں مرد کو کافی مالی نقصان ہوگا اور وہ طلاق سے بچے گا۔

تجربے میں یہ آیا ہے کہ مرد کے پاس جہیز کا سامان آجاتا ہے اور مہر وہ جلدی ادا کرتا نہیں ہے اور قانونی طور پر اس کی وصولیابی بھی عورت کے لئے دشوار ہوتی ہے، اس لئے مرد طلاق دینے میں شیر ہوجاتے ہیں۔

سوال۔ ۲: نکاح ثانی پر پابندی لگانے کے لئے مہر کا تفاوت معتبر نہیں ہے۔

سوال۔ ۳: صرف یہ شرط لگانے سے عقد نکاح متاثر نہ ہوگا اور شوہر کی عدم پابندی کی صورت میں عقد نکاح ختم نہ ہوگا۔

☆☆☆

[1] جامعہ دارالسلام، پنجاب

# نکاح شرائط کی حیثیت

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی

کسی بھی عقد سے واجب ہونے والے حقوق سے متعلق عقد میں شرط لگانا بالاتفاق جائز ہے، اس میں نہ کسی زائد چیز کی شرط ہوتی ہے اور نہ عقد کے خلاف کسی چیز کی، لہذا النفقہ وغیرہ کے وجوب کی شرط درست ہے۔

الف۔ اس قسم کی شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہے، حنفیہ کے نزدیک نکاح صحیح ہوتا ہے اور شرط باطل قرار پاتی ہے، اس قسم کا حکم دوسرے حضرات کے یہاں بھی ہے، البتہ حنابلہ کے یہاں کچھ وسعت ہے۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷ / ۵۴، ۵۵)

ب۔ ایسی شرطوں کے ساتھ نکاح تو بالاتفاق صحیح ہے، البتہ یہ شرطیں حنفیہ کے یہاں لازم الایفاء نہیں ہیں، حنابلہ کا اس میں بھی اختلاف ہے، اور آج کل دوسری شادی کے بعد عموماً جو بے اعتدالیاں ہوتی ہیں ان کے پیش نظر حنابلہ کے مذہب پر عمل کو سوچا جاسکتا ہے۔

ج۔ بیوی کے لئے تفویض طلاق کی شرط وصورت کی بابت ''الحیلۃ الناجزۃ'' میں آنے والی تفصیل پر اعتماد کیا جائے، اس لئے کہ وہ محقق ومدقق ہونے کے ساتھ اہل نظر علماء کی ایک اجتماعی کاوش ہے، مختصر یہ ہے کہ اس قسم کا معاملہ کچھ شرطوں و پابندیوں کے ساتھ جائز ہے، اور احتیاط اس میں ہے کہ خالص عورت کی صوابدید پر کہ اس قسم کا معاملہ کچھ شرطوں و پابندیوں کے ساتھ جائز ہے، اور احتیاط اس میں ہے کہ خالص عورت کی صوابدید پر طلاق نہ رکھی جائے، بلکہ جانبین کے کچھ لوگ بھی شامل کردئے جائیں کہ وہ طلاق کی ضرورت کو تسلیم کرلیں۔

۱۔ اگرچہ صاحبین کے قول پر کسی کے فتوی وعمل کی تصریح نہیں ملی، تاہم اصولی طور پر اس کی گنجائش یوں معلوم ہوتی ہے کہ ضرورت میں قول ضعیف پر فتوی دینے کی اجازت ہے، مگر حالات کو دیکھتے ہوئے مہر کی کمی وبیشی، تین طلاق یا کثرت طلاق کو روکنے کا مؤثر ذریعہ سمجھ میں نہیں آتا۔

۲۔ دوسری شادی کی وجہ سے پہلی بیوی کے حقوق ضیاع کا یہ پورا حل نہیں ہے، اس لئے اس کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

۳۔ نکاح کی وجہ سے بیوی پر شوہر کے حقوق جس طرح ثابت ہوتے ہیں، ان کی بنا پر اس قسم کی شرط غلط وباطل ہے اور بعد میں بھی اس کو منع کردینے کا ہمہ وقت حق ہے، حنابلہ کے یہاں اس میں بھی کچھ گنجائش ہے، لیکن کام کرنے کی مروج صورتوں کے جو مفاسد ہیں اور گھر سے باہر نکلنے میں شریعت نے جو پابندیاں لگائی ہیں ان سے عام لاپرواہی کی وجہ سے اس کو کسی طرح گوارا نہیں کیا جاسکتا۔

(ملاحظہ ہو: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷ / ۲۹۷، بحث ونظر شمارہ ۱۱، فقہی مقالات ۱ / ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۰۹)

☆☆☆

# نکاح شوہر پر عائد کئے جانے والے شرائط

مفتی محفوظ الرحمن اعظمی

(الف) دوسری قسم کی شرط لگانا شرعا درست نہیں، نکاح صحیح ہوگا ان شرطوں کا پورا کرنا ضروری نہیں، یہ شرطیں شروط فاسدہ میں سے ہیں، اس شرط میں حق زوجہ کا اسقاط بھی ہے "فتح الباری" (۱۸۹/۴) میں ہے:

أما شرط ينافي مقتضى النكاح كان لايقسم لها أولا يتسرى عليها أولا ينفق أو نحوها فلايجب الوفاء به.
وقال النبی ﷺ: كل شرط ليس في كتاب الله فهو باطل. وقال النبی ﷺ: المسلمون على شروطهم إلا شرطا أحل حراما أو حرم حلالا (فتح الباری ۴-۱۸۹)

نمبر ایک میں ذکر کردہ شرط ترغیب للمراۃ فی النکاح ہے اور یہ شرط ایسی ہے کہ بلا شرط کے بھی عورت اس چیز کی مستحق ہے جس کو شوہر نے عقد کے ساتھ اپنے اوپر لازم کرلیا، نکاح درست ہے اور شرط کی پابندی لازم ہے۔

(ب) تیسری قسم کی شرط لگانا درست نہیں ہے، ان شرطوں کے باوجود نکاح صحیح ہوتا ہے، ان شرطوں کا پورا کرنا یعنی پابند رہنا ضروری نہیں۔ (عرف الشذی علی الترمذی ۲۱۶/۱)

(ج) نکاح کے بعد تفویض طلاق نافذ ہوگا اور عورت کو طلاق کا حق اور اختیار ہوگا، شوہر حق تفویض واپس نہیں لے سکتا (شامی ۴۹۴/۲) "شرط الملک حقیقۃ" تعلیق اور اضافت کے ساتھ شرائط طے ہوں تو طلاق واقع ہوگی۔

نکاح میں شرط کی تین صورتیں ہیں:

عقد نکاح کی پہلی شرائط تعلیق اور اضافت کے ساتھ ہوں اور نکاح کے مقتضی کے خلاف نہ ہوں تو نکاح درست ہوگا، اور ان شرطوں کی پابندی بھی ضروری ہوگی اور اگر نکاح سے پہلے یا بعد میں شرط طے ہو تو وہ شرط نہیں، بلکہ وعدہ ہے، اگر یہ وعدہ خلاف شرع، یعنی عقد کے خلاف نہ ہو تا اس کی پابندی لازم ہے اور شرائط کا اضافہ بشرطیکہ خلاف حقوق زوجین نہ ہو، درست ہے۔

تفویض سے مصالح شریعت ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، اگر تفویض کے ساتھ مصالح کی حفاظت میں شرطوں کا اضافہ کردیا جائے تو درست ہے۔

۱۔ طلاق کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے نکاح کے مہر کا طلاق دینے کی صورت میں زیادہ بتانا اور عدم طلاق کی صورت میں کم بتانا، یعنی تعلیق کے ساتھ مہر مقرر کرنا نکاح کو درست رکھتا ہے، لیکن فتوی کے لئے صاحبین کے قول کو اختیار کرنا طلاق کے سدباب کے لئے مفید نہ ہوگا، بلکہ بعض صورتوں میں جب کہ نشوز شوہر کی طرف سے ہو تو اس میں عورت کو مسلسل دشواری کا سامنا ہوگا، اس لئے کہ امام ابوحنیفہؒ کا قول فتوی کے لئے زیادہ مناسب ہے۔

۲۔ مذکورہ صورت میں مہر کی کمی وزیادتی نکاح وعدم نکاح کی شرط پر درست نہیں ہے، شرط نکاح کی پابندی ضروری نہیں، کیوں کہ مقتضاء عقد کے خلاف ہے اور نکاح کرنے کی صورت میں مہر مثل لازم ہوگا۔

۳۔ نکاح کے بعد شرعا زوجین میں سے ہر ایک کے حقوق دوسرے پر متعین ہیں، ذکر کردہ شرائط کی صورت میں حقوق زوجین متاثر ہوتے ہوں تو کوئی بھی شرط پوری کرنے کا پابند نہیں۔

حق زوج یہ ہے: عورت کا اس کے حکم کی پابندی کرنا، اس کے مال کی حفاظت کرنا، بغیر اجازت گھر سے نہ نکلنا، عصمت کی حفاظت کرنا وغیرہ۔

حق زوجہ یہ ہے: شوہر پر اس کا نفقہ، کسوہ، سکنی وغیرہ لازم ہونا، جب شریعت نے زوجین کو الگ الگ حقوق کے ساتھ مربوط کردیا ہے تو عورت کی ملازمت ان حقوق کی پابندی کے لئے زبردست حائل واقع ہوگی، خصوصا عصمت کے لئے۔ ☆☆☆

# نکاح میں شرائط اور ائمہ کی آراء

مولانا عبداللہ جولم

ایسی شرائط جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ خود عقد نکاح سے جو ذمہ داری کسی فریق پر عائد ہوتی ہو، اسی کو شرط کی صورت میں عقد نکاح کے وقت ذکر کردیا گیا ہو، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا۔

ایسی شرط کی پابندی بالاتفاق واجب ہوگی، کیونکہ یہ ایسی ذمہ داری ہے، جسے شریعت نے مجرد عقد نکاح سے واجب کیا ہے، یعنی یہ شرط نہیں بھی ہوتی ہو اس کی ادائیگی ضروری تھی، اس کے وجوب کی دلیل قول اللہ تعالی "وعلی المولود له رزقهن و کسوتهن بالمعروف" (سورہ بقرۃ: ۲۳۳) "لینفق ذو سعة من سعته ومن قدر علیه رزقه فلینفق مما آتاه الله لا یکلف الله نفسا إلا ما آتاها" (سورہ طلاق: ۱۷)

وقوله رسول ﷺ فی حجة الوداع: ''ولهن علیکم رزقهن وکسوتهن بالمعروف'' (صحیح مسلم کتاب الحج ۸،۲۲۰۔ رقم الحدیث: ۱۲۷)

نکاح کے وقت کسی فریق کا ایسی کوئی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، مثلاً شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان ونفقہ اس کے ذمہ ہوگا۔

اس مسئلہ میں علماء کی تین رائیں ہیں:

۱۔ جمہور علماء کے نزدیک نکاح صحیح ہوگا اور شرط باطل ہوگی۔

ان کا استدلال قصۂ بریرہ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عقد کو درست رکھا اور شرط کو باطل قرار دیا، اور فرمایا:

''ما بال رجال یشترطون شروطا لیست فی کتاب الله۔ ماکان من شرط لیس فی کتاب الله فهو باطل'' (صحیح البخاری کتاب البیوع باب إذا اشترط فی البیع شروطا لاتحل ۳۔۲۷۶)

امام مالکؒ کے نزدیک ایسی شرط مبطل نکاح ہے اور فسخ واجب ہے الایہ کہ دخول ہو چکا ہو تو نکاح صحیح ہوجائے گا، اور شرط باطل ہوگی، ان کی دلیل بیع فاسد پر قیاس کرنا ہے جو بازار کی قیمت تبدیل ہونے سے نافذ ہوجاتی ہے۔ (بدایۃ المجتہد ۲/۴۹، الفقہ الاسلامی ۷/۵۵)

۲۔ علامہ ابن حزمؒ کے نزدیک اگر ایسی شرط نکاح کے وقت رکھی گئی ہے تو نکاح باطل ہوگا، اور اگر نکاح کے بعد رکھی گئی ہے تو نکاح صحیح ہوگا اور شرط باطل۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ اس نکاح کی بنیاد شرط باطل پر رکھی گئی ہے، اس لئے نکاح بھی باطل ہوگا، (المحلی ۹/۵۱۷) ہاں اگر شرط بعد میں رکھی جائے تو چونکہ نکاح کی بنیاد صحیح ہے، اس لئے نکاح صحیح ہوجاتا ہے، اور اگر یہی شرط بعد میں رکھی جائے تو شرط باطل ہوگی، اور نکاح صحیح رہے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایسی شرط بالاتفاق باطل ہے، اختلاف اس میں ہے کہ نکاح باطل ہوگا یا نہیں۔

۳۔ نکاح کے وقت کسی فریق کا کوئی ایسی شرط عائد کرنا، جس کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت حاصل نہیں ہوتا، اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی یا ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہ ہوتی ہو۔

مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہ کرے گا، یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا۔

اس مسئلہ میں علماء کے چار اقوال ہیں:

۱۔ نکاح جائز ہے، اور شرط لازم ہے، اس کے قائلین صحابہ میں سے عمر بن الخطاب، سعد بن ابی وقاص، معاویہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم ہیں اور اسی طرف شریح، عمر بن عبد العزیز، جابر بن زید، طاؤس، اوزاعی، اسحاق، اور امام احمد گئے ہیں۔ (المغنی ۶/ ۵۴۸، سنن الترمذی ۳/ ۴۳۴)

۲۔ نکاح جائز ہے اور شرط باطل ہے، الا یہ کہ شرط معلق ہو طلاق یا عتاق کے ساتھ، اس کے قائل امام ابوحنیفہؒ ہیں (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۴/ ۸۵)

۳۔ امام مالکؒ اس میں مزید یمین کی قید لگاتے ہیں، یعنی نکاح اگر مشروط ہو یمین بالطلاق یا عتاق کے ساتھ تو نکاح بھی جائز ہوگا اور شرط بھی لازم ہوگی۔ (المؤطا ر ۳۶۰)

۴۔ اگر ایسی شرط نکاح کے ساتھ رکھی گئی ہو تو نکاح باطل اور اگر نکاح کے بعد رکھی گئی ہو تو نکاح صحیح ہوگا اور شرط باطل ہوگی، یہ امام ابن حزمؒ کا قول ہے۔

## الادلۃ

### پہلے قول کی دلیل:

(۱) ''قول اللہ تعالی (یا ایھا الذین آمنوا اوفوا بالعقود'')(سورہ مائدہ:۱)

(۲) ''عن عقبة عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال أحق ما أوفيتم من الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج'' (صحیح البخاری باب الشروط فی النکاح ج۹۔ ص ۲۱۷)

۳۔ اجماع صحابہ، ابن قدامہ کہتے ہیں یہ رائے عمر بن الخطاب، سعد بن ابی وقاص، معاویہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم سے منقول ہے اور ہمارے علم کے مطابق ان کے زمانے میں کوئی ان کا مخالف نہیں تھا، تو صحابہ کا اجماع ہوا۔ (المغنی ۷/ ۵۴۹)

۴۔ یہ ایسی شرط ہے جس سے عورت کو ایسا فائدہ اور مقصد حاصل ہوتا ہے جو نکاح کے مقصد کے منافی نہیں ہے، تو یہ اسی طرح لازم ہوگی جیسے زیادتی مہر کی شرط۔ (المغنی ۶/ ۵۴۹)

### دوسرے قول کی دلیل

۱۔ ''قول النبی صلی اللہ علیه وسلم فی واقعة بریرة ''مابال رجال یشترطون شروطا لیست فی کتاب اللہ۔ ما کان من شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل وإن کان مائة شرط، قضاء اللہ أحق وشرط اللہ أوثق وإنما الولا لمن اعتق'' (البخاری کتاب البیوع۔ باب اذا اشترط شروطا فی البیع لاتحل ۴۔۳۷۶)

۲۔ ''روی ابن وھب باسناد جید عن عبید بن السباق أن رجلا تزوج امرأة فشرط لھا أن لا یخرجھا من دار ھا فارتفعوا إلی عمر فوضع الشرط وقال: المرأة مع زوجھا'' (فتح الباری ۹۔۲۱۹)

### تیسرے قول کی دلیل:

شروط کے بطلان کی وہی دلیلیں ہیں جو دوسرے قول کی، اور طلاق وعتاق کے استثناء کی مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ قول النبی صلی اللہ علیه وسلم ''ثلاث جدھن جد وھزلھن جد۔ النکاح والطلاق والرجعة'' (اخرجه الترمذی ۳۔۱۴۹ قال حسن غریب)

**چوتھے قول کی دلیل:**......ابن حزم کی وہی دلیل ہے جو اس سے سابق والے مسئلہ میں ہیں۔

### مناقشۃ الادلۃ:

پہلے قول کی دلیلوں پر اعتراض کیا گیا ہے کہ آیت وحدیث سے استدلال صحیح نہیں ہے، کیونکہ ایفاء عقد یا شرط اسی صورت میں واجب ہے، جبکہ عقد یا شرط صحیح ہو، یہ شرطیں صحیح نہیں ہیں، اس لئے کہ اس سے تحریم ما احل اللہ لازم آتا ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

''إنما یوفی من الشروط مایبین أنه جائز ولم تدل سنة رسول اللہ ﷺ علی أنه غیر جائز''۔

امام شافعیؒ کے نزدیک بیوی کی یہ شرط کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گا، اسے آبائی وطن سے باہر نہیں لے جائے گا، اور شوہر کی جانب سے یہ شرط کہ وہ نان ونفقہ کا ذمہ دار نہیں ہوگا، دونوں ایک ہی قبیل سے ہیں اس اعتبار سے کہ دونوں میں دوسرے کے شرعی حق کو سلب کرنا ہے جو جائز نہیں ہے۔ (الام ۵/ ۷۳، ۷۴)

اور شروط جائزہ سے ان لوگوں کی مراد وہ شرطیں ہیں جو مقتضیات عقد کے مطابق ہوں، جیسے انفاق، کسوہ، اور سکنی کی شرط، نہ کہ وہ شرطیں جو مقتضیات عقد کے منافی ہوں۔

مگر علامہ ابن دقیق العیدؒ حدیث کی اس شرح سے متفق نہیں ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو چیزیں مقتضیات عقد کے ذریعہ واجب ہیں ان کے اشتراط کا کیا فائدہ۔ (فتح الباری ۹/ ۲۱۸، معالم السنن علی ہامش سنن ابن داؤد ۲/ ۶۰۴)

اور ابن قدامہ: کہتے ہیں کہ اس شرط سے تحریم حلال لازم نہیں آتا، بلکہ وعدہ وفاء نہ کرنے کی صورت میں عورت کو صرف خیار فسخ حاصل ہوتا ہے۔ (المغنی لابن قدامہ ۶/ ۵۴۹)

پہلے قول کی دلیل میں اجماع کا دعوی درست نہیں ہے، کیونکہ خود حضرت عمرؓ کی رائے اس مسئلہ میں متردد تھی اور حضرت علیؓ بھی اس کے مخالف ہیں۔ (المحلی ۹/ ۵۱۸، فتح الباری ۹/ ۲۱۸)

دوسرے قول کی دلیل "ما کان من شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل" سے استدلال درست نہیں، کیونکہ اس سے مراد "کل شرط خالف کتاب اللہ" ہے جیسا کہ عمر اور ابن عمرؓ نے سمجھا (ملاحظہ ہو: صحیح البخاری کتاب الشروط باب المکاتب ۵/ ۳۵۳) اور بالاتفاق بیع میں ایسی شرطیں رکھ سکتے ہیں، جو شرعی حکم کے منافی نہ ہوں، اگرچہ اس کا ذکر کتاب اللہ میں نہ ہو۔

دوسرے قول کی دلیل حدیث جابر سے استدلال درست نہیں، کیوں کہ اس میں ایسی شرط رکھی گئی ہے جس سے شرط رکھنے والے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، تو وہ شرط لغو ہے۔

خلاصۂ کلام:

اصل سبب خلاف اس مسئلہ میں یہ ہے کہ ان شرطوں سے تحریم حلال لازم آتا ہے یا نہیں؟

ہمارا رجحان اس سلسلہ میں پہلے قول کی جانب ہے، یعنی تحریم حلال لازم نہیں آتا۔

☆☆☆

# طلاق اور عقد ثانی کے ساتھ مشروط اضافۂ مہر

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی [1]

نکاح شروط فاسدہ سے باطل نہیں ہوتا، اس لئے نکاح میں کوئی اگر ایسی شرط لگائی گئی ہو جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو تو اس شرط کی وجہ سے نکاح باطل نہیں ہوگا، شرط کو دیکھ کر کوئی رائے قائم کی جائے گی، مثلاً اگر شرط لگائی کہ مہر نہیں دے گا تو بھی فقہاء نے تصریح کی ہے کہ شوہر پر مہر مثل واجب ہوگا، اگر وطی کرے یا مرجائے۔ (ہدایہ ۲ / ۳۲۴)

اگر کسی عورت نے اپنی باری اپنی کسی سوکن کے لئے چھوڑ دیا، تو اس کو اس میں رجوع کا حق ہے۔ (ہدایہ ۲ / ۳۴۹)

اسی طرح نفقہ بھی شیئاً فشیئاً واجب ہوتا ہے، اگر کسی عورت نے نفقہ معاف کردیا یا معافی کی شرط کے ساتھ نکاح کیا تو میرے خیال میں اس کو نفقہ کے مطالبہ کا حق ہوگا۔ (فتح القدیر ۴ / ۳۹۴، ۳۹۵)

اسی طرح ایسی شرط لگانا جس کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہو، جو غیر مشروط نکاح میں حاصل نہیں ہوتا اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی عائد ہوتی ہو، جو غیر مشروط نکاح میں عائد نہیں ہوتی، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کرے گا، یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی دوسری جگہ نہیں لے جائے گا، ان شرائط کا بھی نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، یعنی نکاح صحیح ہوجائے گا، اگر ایسی شرط جس سے صرف اس عورت کو فائدہ ہے، کسی دوسرے کو نقصان نہیں ہے تو مناسب ہے کہ شوہر اس وقت تک اس شرط کی پابندی کرے جب تک کہ مقاصد نکاح فوت نہ ہوں، مثلاً اگر عورت نے شرط لگایا کہ اس کو اس کے آبائی وطن سے باہر نہیں لے جائے گا ایسی صورت میں اگر شوہر کو کسی دوسرے ملک میں ملازمت مل گئی، یا اس کا تبادلہ ایسی جگہ ہوگیا جہاں رہ کر بیوی کے حقوق ادا کرنا انتہائی دشوار اور پریشان کن ہو تو شرط کے پورا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یا تو شوہر بیوی کو طلاق دے کر الگ کردے یا اس کے حقوق کی ادائیگی سے غافل ہوجائے، ظاہر ہے کہ ان دونوں صورتوں کے مقابلہ میں زیادہ آسان اور بہتر یہ ہے کہ بیوی کو اپنے ساتھ لے کر جائے۔

لیکن قضاءً ایسی شرط کے پورا کرنے کو لازم قرار دینے کی کوئی صورت نہیں ہے، اور اگر ایسی شرط لگائی گئی ہے کہ اس کے پورا کرنے میں دوسرے کو ضرر پہنچے تو ایسی شرط کا پورا کرنا ضروری تو کیا میرے خیال میں جائز بھی نہیں ہوگا، مثلاً کوئی عورت یہ شرط لگائے کہ شوہر اپنی فلاں بیوی کو طلاق دیدے گا۔

ان صورتوں میں اگر عورت کا مہر مثل مسمی سے زیادہ ہے تو شرط پوری نہ ہونے کی صورت میں اس کو مہر مثل ملے گا۔ (فتح القدیر ۳ / ۳۵)

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

”وهذه الشروط تمنع التزوج والتسری لو وجب الجری علی موجبها فكانت باطلة“ (فتح القدیر ۲-۲۵۱)

علامہ مرغینانیؒ فرماتے ہیں:

”إذا تزوجها علی ألف أن لایخرجها من البلدة أوعلی ألایتزوج علیها أخری فإن وفی بالشرط فلها المسمی، وإن تزوج علیها أخری أو أخرجها فلها مهر مثلها“ (هدایه ۲-۳۲۹)

[1] قاضی امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ

نکاح کے وقت تفویض طلاق کے سلسلہ میں تھانویؒ نے جو کچھ لکھا ہے، میرے نزدیک وہ بہت کافی ہے، میں اس میں اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، اس کے لئے دیکھئے۔ (الحیلۃ الناجزۃ ر ۳۱ تا ۳۸)

طلاق ایک ناپسندیدہ چیز ہے، لیکن بعض حالات میں ناگزیر بھی ہے، مسلم معاشرہ میں طلاق کی کثرت اتنی نہیں ہے جتنی مشہور ہے، تین طلاق یا کثرت طلاق کو (واقع میں کثرت ہو) روکنے کے لئے پابندیاں عائد کرکے طلاق کو دشوار بنانا میرے خیال میں صحیح اور مناسب نہیں ہے، جس طرح شریعت نے طلاق کو آسان بنایا ہے اس کو آسان ہی رہنے دینا مناسب ہے، عملی طور پر ہمارے سامنے ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ زوجین میں تعلقات خوشگوار نہیں ہیں اور حالات ایسے ہیں کہ دونوں میں علیحدگی ضروری ہے، لیکن مہر زیادہ ہے اور شوہر مہر دینے کے ڈر سے طلاق بھی نہیں دیتا، اس طرح عورت کالمعلقۃ ہوکر رہ جاتی ہے، یا مجبور ہوتی ہے کہ مہر معاف کرکے طلاق حاصل کرے، ممکن تھا کہ اگر مہر کی مقدار کم ہوتی تو شوہر طلاق دیدیتا اور عورت مہر پانے کی حقدار رہتی۔

تین طلاق یا کثرت طلاق جہالت کا نتیجہ ہے، اس کے بے جا استعمال سے روکنے کیلئے مہر میں اضافہ میرے نزدیک مسئلہ کا حل نہیں ہے، بلکہ اس کا حل معاشرہ اور سماج میں اس بارے میں لوگوں کو مسائل سے واقف کرانا اور اس سے پرہیز کرنے کی ترغیب دلانا مفید اور مناسب ہوگا۔

اس کے باوجود اگر اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے طلاق نہیں دی تو مہر دس ہزار روپے ہوگا، اور اگر ایک طلاق دی تو مہر بیس ہزار اور اگر تین طلاق دی تو مہر تیس ہزار روپے ہوگا، میرے خیال میں یہ شرائط صحیح ہوں گے اور جو حالت ہوگی اور اسی کے مطابق مہر واجب ہوگا۔

اگر نکاح کرتے وقت اس طرح مہر طے ہو کہ منکوحہ کے نکاح میں رہتے ہوئے، اگر شوہر نے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس کا مہر بیس ہزار روپے ہوگا اور اگر اس کے عقد نکاح میں رہتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر دس ہزار روپے ہوگا، میرے خیال میں یہ دونوں شرطیں بھی صحیح ہوں گی۔

بیوی کے آبائی وطن میں رکھنے یا لے جانے میں ایک ہزار اور دو ہزار مہر طے ہو تو حضرات صاحبین فرماتے ہیں:

''الشرطان جائزان حتی کان لها الألف إن أقام بها والألفان إن أخرجها'' (ہدایہ ۲۔ ۳۲۹)

میری رائے میں بیوی کے اقامت واخراج اور اس کی موجودگی میں دوسری عورت سے نکاح یا عدم نکاح میں کوئی فرق نہیں ہوگا، اس لئے جس طرح صاحبین کے نزدیک اقامت واخراج کے سلسلہ میں دونوں شرطیں جائز ہیں، اسی طرح تزوج اور عدم تزوج میں بھی دونوں شرطیں صحیح اور جائز ہوں گی۔

شوہر کو حق ہے کہ بیوی کو ایسی ملازمت سے منع کردے، جس سے شوہر کے حقوق میں نقصان ہوسکتا ہو، البتہ ایسی ملازمت جس سے شوہر کے حقوق میں نقصان کا کوئی اندیشہ نہ ہو بیوی کو ایسی ملازمت سے منع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اگر شوہر نے نکاح کے وقت یا اس کے بعد ایسی ملازمت کی اجازت دے دی جس سے اس کے حقوق میں نقصان ہوتا ہے، تو ضروری نہیں کہ وہ اس اجازت کو واپس نہ لے، چاہے شادی کے مقاصد ختم کیوں نہ ہوجائیں۔ (الاحوال الشخصیۃ: ۲۳۹، رد المحتار ۲ر ۶۶۵ باب النفقۃ)

☆☆☆

# نکاح اور شرائط

مولانا ممتاز عالم مصباحی

عقد نکاح سے جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اسی کو شرط بنا کر عقد نکاح کے وقت ذکر کر دیا جائے تو یہ شرط صحیح ہے، نکاح بھی صحیح ہے، کیونکہ یہ شرط مقتضائے عقد کے موافق ہے، اور وہ شرط جو مقتضائے عقد کے موافق ہو، صحیح ہوتی ہے مفسد عقد نہیں ہوتی، البتہ اس طرح کی شرط لگانا بے سود ہے، کیوں کہ جو ذمہ داری کسی فریق پر عقد نکاح ہی سے عائد ہوگئی، وہ واجب الایفاء ہوگی، خواہ وقت نکاح اس کی شرط ہو یا نہ ہو، لہذا وقت نکاح بیوی کا یہ شرط لگانا کہ نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا صحیح ہے، مفسد نکاح نہیں، لیکن بے سود ہے، بیوی کا نان ونفقہ بہر حال شوہر پر لازم ہے۔

تنویر الابصار میں ہے:

''نکاح صحیح کے بعد بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہے اس لئے کہ نفقہ بیوی کو قابو اور قبضہ میں رکھنے کا بدل ہے اور ہر وہ شخص جو کسی غیر کے قابو میں اس کے فائدہ کے لئے ہو، تو قابو میں رکھنے والے پر اس کا نفقہ واجب ہے''۔

(الف): نکاح کے وقت ایسی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز نہ ہو، مثلاً شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں ہوگا، ایسی شرط فاسد ہے، کیونکہ یہ مقتضائے عقد کے خلاف اور احد المتعاقدین کے لئے نافع ہے "کل شرط شانہ هذا فهو فاسد"، لیکن اس شرط سے نکاح کی صحت پر کچھ بھی حرف نہیں آئے گا، کیو کہ نکاح شروط فاسدہ سے فاسد نہیں ہوتا، بلکہ شروط باطل اور بے اثر ہو کر رہ جاتی ہیں۔

''درمختار'' میں ہے:

''نکاح شرط فاسد سے باطل نہیں ہوتا شرط ہی باطل ہو جاتی ہے نکاح نہیں، یعنی اگر شرط فاسد کے ساتھ نکاح ہوا تو نکاح باطل نہیں ہوگا''۔

اس شرط کی پابندی ضروری نہیں بلکہ اس سے گریز ضروری ہے۔

(ب): وقت نکاح بھی فریق کی جانب سے کوئی ایسی شرط لگانا، جو نہ عقد نکاح سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کے دائرہ میں آتی ہو اور نہ اس کے ذریعہ نکاح سے عائد شدہ کسی ذمہ داری سے گریز مقصود ہو، بلکہ اس کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہو جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہ ہوتا ہو اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی اور ذمہ داری عائد ہوتی ہو جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہ ہوتی ہو، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہ کرے گا یا بیوی کو اس کے آبائی وطن میں رکھے گا، وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا۔

اس قسم کی شرط کا حکم یہ ہے کہ یہ شرط فاسد ہے، نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ اس شرط کو وعدہ کی حیثیت حاصل ہوگی جس کو پورا کرنا لازم نہیں، ''بدائع الصنائع'' میں ہے:

''وقت نکاح اگر شوہر نے ساتھ طلاق دینے اور عورت کو شہر سے باہر لے جانے کی شرط لگادی، تو عند الشرع شوہر پر ان شرطوں کا پورا کرنا لازم نہیں''۔

(ج) عقد نکاح کے وقت اگر عورت یہ شرط لگائے کہ اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق اسکو حاصل ہوگا، یا فلاں فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، اور شوہر اس شرط کو تسلیم کرتا ہے تو یہ شرط عند الشرع معتبر ہے، عورت کو طلاق کا اختیار حاصل ہو جائے گا، شوہر اس تفویض طلاق کو ختم کرنا بھی چاہے تو ختم نہیں کر سکتا۔

''فتاوی عالمگیری'' میں ہے:

''عورت نے مرد سے کہا کہ میں نے تجھ سے اس شرط پر شادی کی کہ طلاق کا اختیار مجھے رہے گا، جب چاہوں گی اپنے اوپر طلاق دے لوں گی، شوہر نے کہا مجھے قبول ہے، تو نکاح جائز ہو جائے گا، اور طلاق کا اختیار عورت ہی کو حاصل رہے گا''۔

''جوہرنیرہ'' میں ہے:

''اگر مرد نے بیوی سے کہا کہ تو اپنے کو طلاق دے لو تو شوہر اس تفویض سے رجوع نہیں کر سکتا''۔

(ج) ۲۔ عورت کا نقصان عقل و دین، کثرت طعن ولعن اور سرعت غضب جیسی صفات سے متصف ہونا، عقلاً ونقلاً ثابت ہے، اس لئے تفویض کی صورت میں نکاح سے متعلق شرعی مصالح کے ضائع ہونے کا قوی خدشہ ہے، لہذا احتیاطاً چند قیود وحدود بڑھائی جاسکتی ہیں (۱) شوہر تفویض کے وقت، وقت کی تعیین کردے، (۲) شوہر تفویض طلاق کی تعبیر اس طرح کرے کہ عورت کو صرف طلاق رجعی کا اختیار حاصل ہو، مثلاً یہ کہے کہ تجھے طلاق کا اختیار ہے اور اس سے طلاق رجعی کی نیت کرے۔

(ج) ۳۔ نکاح کے غلط استعمال سے روکنے کے لئے اگر عقد نکاح کے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کا مہر بیس ہزار اور اگر اس نے طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار، اس طرح مہر طے کرنا جائز و معتبر ہوگا، اب رہا یہ سوال کہ دونوں شکلوں میں مہر مسمی لازم ہوگا، یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء حنفیہ کا اختلاف ہے، امام اعظمؒ کے نزدیک پہلی شرط صحیح ہے، اور اس شکل میں مہر مسمی لازم ہوگا اور دوسری شرط فاسد ہے، اس میں مہر مثل واجب ہوگا، بشرطیکہ وہ مہر مثل سے متجاوز نہ ہو، صاحبین فرماتے ہیں کہ دونوں شرطیں صحیح ہیں اور دونوں شکلوں میں مہر مسمی لازم ہوگا، لیکن امام زفرؒ کے نزدیک دونوں شرطیں فاسد ہیں، دونوں شکلوں میں مہر مثل واجب ہوگا جو مہر مسمی کی اقل مقدار سے کم اور مہر مسمی کی اکثر مقدار سے متجاوز نہ ہوگا۔

اس مسئلہ میں صاحبین کے قول پر فتوی نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ قول امام سے عدول کے لئے کسی سبب کا تحقق نہیں۔

۲۔ نکاح کرتے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے، کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس کا مہر تین ہزار ہوگا، اور اگر اس کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر پندرہ ہزار ہوگا، تو امام صاحبؒ کے نزدیک اگر شوہر نے منکوحہ کے رہتے ہوئے دوسری عورت سے نکاح نہ کیا تو مہر مسمی پندرہ ہزار دینا ہوگا، اور اگر دوسری عورت سے شادی کرلی تو مہر مثل دینا ہوگا، مہر مسمی نہیں۔

۳۔ عورت جائز ملازمت کرسکتی ہے، جس میں کوئی شرعی فساد نہ ہو، اگر وقت نکاح جائز ملازمت کی شرط لگادی گئی تو اس کی حیثیت وعدے کی ہوگی جس کی پابندی شوہر پر لازم نہیں، شرط منظور کرلینے کے بعد بھی شوہر عورت کو معاملہ ملازمت ختم کرنے کا حکم دے سکتا ہے، یا نئی ملازمت کرنے سے روک سکتا ہے، اور عورت پر شوہر کے حکم کی تعمیل ضروری ہوگی۔

☆☆☆

# نکاح میں مفید و معتبر شرائط

مولانا محمد رفیق ابن آدم فلاحی

جواب (۱) پہلے نمبر کی شرطیں لگانے سے عقد نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑے گا، یہ حقوق اللہ تعالی کی طرف سے عائد کردہ ہیں، وہ ذکر کئے جائیں یا نہ کئے جائیں، بہرصورت ان حقوق کی ادائیگی واجب ہے۔

دوسرے نمبر کی شرط لگانے سے نفقہ کا یا عقد نکاح سے عائد ہونے والی ذمہ داری کا سقوط نہ ہونا چاہئے (درمختار ۲؍ ۶۵۳) میں ایک جزئیہ ہے جس سے اس مسئلہ میں مدد لی جاسکتی ہے:

''حتی لو شرط في العقد أن النفقة تكون من غير تقدير والكسوة كسوة الشتاء والصيف فلها بعد ذلك طلب التقدير فيهما''۔

مسئلہ مذکورہ میں بوقت عقد عدم تقدیر کی شرط لگائی ہے، اس کے باوجود عورت کے لئے نفقہ میں طلب تقدیر کا حق باقی رہتا ہے۔

البتہ ایسی شرائط سے عقد نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔

عقد نکاح سے شوہر کے ماتحت ایک سے زائد بیویاں ہونے کی صورت میں برابری کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، جس سے شوہر بذریعہ شرط سبکدوش ہونا چاہ رہا ہے جو باطل ہے اور شرط غیر معتبر ہے، لہذا اس مسئلہ میں بھی یہی حکم ہونا چاہئے۔

تیسرے نمبر کی شرط اگر عاقدین میں سے کسی کے حق میں مفید ہو اور وہ شرط شریعت کے خلاف نہ ہو تو ایفاء لازم ہوگا، ورنہ نہیں۔

ج (۲)۔ ایسی شرط لگانے اور مرد کے قبول کر لینے سے طلاق کا اختیار عورت کو حاصل ہو جائے گا، جس کو مرد ختم نہیں کر سکتا۔ (درمختار ۴۸۵)

نکاح میں تینوں قسم کی شرائط کا حکم اس طرح ہوگا:

(۱) اگر عقد نکاح سے پہلے شرائط طے ہو جائیں تو ان شرائط کے معتبر و مفید ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اضافت الی النکاح لکھا جائے، مثلاً یوں لکھا جائے کہ اگر میں اس عورت سے نکاح کروں تو فلاں فلاں صورت میں عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار ہوگا، اور عورت اسی مجلس میں قبول کر لے تو طلاق کا اختیار عورت کو حاصل ہو جائے گا۔

(۲) دوسری صورت میں تفویض درست ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ ایجاب مشروط عورت یا اس کے ولی، وکیل یا نکاح پڑھانے والے کی جانب سے ہو، مثلاً یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو تمہارے نکاح میں اس شرط پر دیا کہ فلاں فلاں صورت میں مجھے اپنے اوپر طلاق واقع کرکے نکاح سے الگ ہونے کا اختیار ہوگا، اور مرد قبول کر لے تو تفویض درست ہوگی۔ (الدرمختار ۲؍ ۴۸۵)

(۳) تیسری صورت میں شوہر عقد نکاح کے بعد کہے کہ فلاں فلاں صورت میں تجھے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار ہے اور عورت قبول کر لے تو تفویض درست ہوگی، مذکورہ تین صورتوں میں جس صورت پر بھی اس کے شرائط کے مطابق عمل کیا جائے گا، تو طلاق کا اختیار عورت کو ہوگا، جس کو شوہر ختم نہیں کر سکتا۔

تفویض اور اختیار میں مزید احتیاط کے لئے اس طرح کی قیدیں بڑھائی جائیں تو جانبین کے حق میں مفید ہوگا:

(۱) جس مجبوری کی بناء پر اختیار ہوگا اس کو دس آدمیوں میں سے کم از کم دو مجبوری تسلیم کرلیں اور وہ دونوں عورت کی علیحدگی کو مناسب قرار دیں، اور ان دس افراد کے نام طرفین کی رضامندی سے درج کردئے جائیں۔

(۲) اس کے بعد عورت ایک ہفتہ غور کرے گی۔

(۳) اپنے خیر خواہوں سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کرے گی۔

(۴) اور حاصل شدہ مجبوری سے ملا ہوا اختیار ایک مہینہ تک رہے گا، لہذا جب جب وہ مجبوری پیش آئے گی، ایک ایک مہینہ کا اختیار ملتا رہے گا۔

ایک قید شوہر کے لئے مفید ہے جو اس طرح لگائی جائے کہ عورت جب اختیار کا استعمال کرے گی، تو مہر معاف کرکے اپنے اوپر طلاق واقع کرے گی۔

مذکورہ قیودات کے ساتھ جب اختیار دیا جائیگا تو انشاء اللہ عورت اپنی کم عقلی اور جلد بازی کی بناء پر اس کا بے جا استعمال بھی نہ کرے گی اور شریر شوہروں سے بدرجہ مجبوری بسہولت چھٹکارا بھی حاصل کرسکے گی۔

اولاً تین طلاق دینا ایک ناجائز امر ہے اور اس کے نتیجہ میں جو مفاسد سامنے آرہے ہیں، وہ بے حد ہیں، مرد خود ہی ایسی جلد بازی سے کام لے کر پوری زندگی پچھتا تا پھرتا ہے اور حیلے ڈھونڈتا پھرتا ہے، پھر طلاق کے بعد عورت خود یا اس کے اولیاء کورٹ کا سہارا لیتے ہیں، جہاں بے شمار لوگوں کی موجودگی میں طرفین ایک دوسرے پر غلط قسم کے الزامات تھوپتے ہیں، اس منظر کو دیکھ کر ہندو وکلاء اور جج مسلمانوں کو خفت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

اور کورٹ کے تئیں ایک چکر کاٹنے کے بعد شوہر پر ناقابل برداشت خرچ کی ذمہ داری عائد کی جاتی ہے، جس کا لینا اور دلوانا سب ناجائز ہے، اس کے باوجود مال طیب سمجھ کر برضائے قلب لیا جاتا ہے، بلکہ یوں کہا جائے وصول کیا جاتا ہے۔

مذکورہ مفاسد پر نظر کرتے ہوئے میری ناقص رائے یہ ہے کہ مسئلہ ہذا میں صاحبان کے قول پر فتوی دیا جائے، جیسا کہ "باب مزارعہ" میں بوجہ ضرورت صاحبان کے قول پر فتوی دیا گیا ہے۔ (ردالمحتار ۱/۴۹)

۲۔ میں ذکر کردہ دونوں شرائط صاحبان کے قول پر معتبر ہیں اور امام صاحب کے یہاں دوسری عورت سے نکاح نہ کرنے کی صورت میں مہر مسمی لازم ہوگا اور شرط پوری نہ کرنے کی صورت میں مہر مثل لازم ہوگا، جو مسمی سے متجاوز نہ ہو۔

چونکہ اس مسئلہ میں ضرورت کا تحقق نہیں ہے، اس لئے امام صاحبؒ کے قول پر فتوی ہوگا۔

**جواب نمبر ۳:** موجودہ زمانہ میں عورت کو ملازمت پر باقی رکھنے میں قوانین اسلام کی خلاف ورزی ہوگی، اس لئے ہونے والا شوہر ایسی غیر مفید شرط کا پابند نہ رہے گا، اور ملازمت پر جانے سے عورت کو روک سکتا ہے۔ (بحوالہ قواعد فقہیہ ر ۱۸۴ قاعدہ ۱۴۹)



# نکاح میں لگائی جانے والی شرطیں اور احکام کا مسئلہ

مفتی محمد اسلم

عقد نکاح میں جو شرائط لگائی جاتی ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں:

(۱) جو زواج کی وجہ سے واجب ہوتی ہیں، یعنی مقتضاء عقد کے مطابق ہوتی ہیں، جیسے نفقہ، کسوہ، سکنی وغیرہ، ان کا پورا کرنا بالاتفاق واجب ہے، اگر چہ ان کی تصریح نہ کی گئی ہو۔

(۲) جو مقتضاء عقد کے خلاف ہوں، جیسے دوسری بیوی کو طلاق دینے کی شرط، عدم انفاق اور عدم سکنی کی شرط کا حکم یہ ہے کہ شرط باطل ہوجائے گی اور نکاح درست ہوجائے گی۔

(۳) "ومالیس من القسمین" مثلاً دوسری عورت سے نکاح نہ کرے کی شرط، یا دوسرے گھر نہ لے جانے کی شرط، یا اس جیسی دوسری مباح شرائط، اس تیسری نوع کا حکم مختلف فیہ ہے۔

امام احمد، امام اسحاق اور امام اوزاعی وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ شرط کے مطابق عمل کرنا واجب ہے، اگر شرط کو پورا نہ کرے تو عورت کو نکاح فسخ کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور سفیان ثوری کے نزدیک شروط کی اس تیسری نوع کو پورا کرنا قضاءً ضروری نہیں، البتہ دیانتاً ضروری ہے، اس لئے کہ مومن کی شان یہی ہے کہ وعدہ کرے تو پورا کرے اور فرمان باری تعالیٰ: "وأوفو ا بالعهد إن العهد كان مسئولا" (سورہ اسراء: ۳۴) کا تقاضا بھی یہی ہے۔ (درس ترمذی ۳/ ۴۱۲، الکوکب الدری ۲/ ۲۳۷)

(الف)۔ دوسری قسم کی شرط لگانا شرعاً باطل ہے۔

''روی عن علی ابن أبي طالب أنه قال شرط الله شرطها'' (ترمذی۔ ۲۱۴) ''وفی الهدایه: شرط قبول الخمر شرط فاسد فیصح النکاح ویلغو الشرط'' (هدایه۲۔۳۲۱)

جو مقتضاء عقد کے خلاف ہوں، جیسے دوسری بیوی کو طلاق دینے کی شرط، عدم انفاق اور عدم سکنی کی شرط، اس قسم کا حکم یہ ہے کہ شرط باطل ہوجائیگی اور نکاح درست ہوجائے گا۔ (درس ترمذی ۳/ ۴۱۲)

تیسری قسم کی شرائط، یعنی ایسی شرط لگانا جن کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہے یا دوسرے فریق پر ایسی پابندی یا ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہیں ہوتی، جیسے دوسری عورت سے نکاح نہ کرنے کی شرط یا دوسری جگہ نہ لے جانے کی شرط یا اس جیسی دوسری مباح شرائط، اس تیسری نوع کا حکم مختلف فیہ ہے، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا۔

''ومالیس من القسمین (ای اولیین) فهی مباحة اتیانها وترکها فهذه یجب الإیفاء بها إذا اشترط وإن لم یشترط لا'' (الکوکب الدری ۳۔ ۲۳۸)

(ج) اس قسم کا کابین نامہ لکھوانا (جس میں طلاق کا اختیار عورت کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہو) اور بوقت ضرورت اس سے کام لینا شرعاً جائز ہے (اور اختیار دینے کو تفویض طلاق کہتے ہیں) (الفتاوی الہندیہ ۶۔۲۶۱)

اور فتاوی رحیمیہ میں ہے کہ جب عورت کو طلاق کا اختیار دینے کی غرض سے کہا گیا کہ جب تم چھٹی ہونا چاہو تو بچوں کو بد دعا دینا تو عورت کو طلاق کا اختیار حاصل ہو گیا، جب عورت بچوں کو بد دعا دے گی تو چھٹی ہو جائے گی، یعنی طلاق رجعی واقع ہوگی، اگر چہ لفظ ''چھٹی ہونا'' کنایہ ہے مگر غلبہ استعمال سے صریح کے حکم میں ہے، اسلئے طلاق رجعی واقع ہوگی۔ (فتاوی رحیمیہ ۵/ ۲۷۸)

رہی بات کہ اگر شوہر نکاح کے وقت بیوی کو طلاق کا حق تفویض کرنے کے بعد اس تفویض کو ختم کرنا چاہتا ہے تو اس کا اختیار شوہر کو باقی رہتا ہے یا نہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ شوہر کو تفویض طلاق کے بعد اس تفویض سے رجوع کرنے کا حق نہیں رہتا، بلکہ تفویض کے بعد عورت طلاق کی مالک ہو جاتی ہے، اس لئے شرائط میں مرد کو غور خوض اور اہل علم وفہم سے مشورہ کر لینا ضروری ہے، ورنہ بعد میں پریشانی و پشیمانی ہوگی۔ (الحیلۃ الناجزۃ ۳۰، الہدایہ ۲/ ۳۸۱، الدر المختار ۳/ ۲۴۳)

نکاح میں شرط کی تین صورتیں ہیں، چاہے نکاح سے پیشتر لکھوالیا جائے، چاہے بعد میں لکھوایا جائے، مگر پہلی اور دوسری صورت کے صحیح ومعتبر ہونے کی ایک ایک شرط ہے۔

(۱) پہلی صورت میں شرط ہے کہ کابین نامہ میں نکاح کی طرف اضافت ونسبت موجود ہو، مثلاً یہ لکھا جائے کہ اگر میں فلاں بنت فلاں کے ساتھ نکاح کروں اور پھر شرائط مندرجہ اقرار نامہ ہذا میں سے کسی شرط کے خلاف کروں تو مسماۃ مذکورہ کو اختیار ہوگا کہ اسی وقت یا پھر کسی وقت چاہے تو اپنے اوپر طلاق بائن واقع کر کے اس نکاح سے الگ ہو جائے، اگر اس میں اضافت الی النکاح نہ لکھی گئی تو یہ اقرار نامہ بے کار ہوگا، اسکی رو سے عورت کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہ ہوگا۔ (الرد المختار ۳/ ۳۴۴)

(۲) دوسری صورت کے معتبر ہونے کی شرط یہ ہے کہ ایجاب عورت کے جانب سے ہو، یعنی اولاً خود عورت (یا اس کا ولی یا وکیل) عقد نکاح کے وقت یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو (یا مسماۃ فلاں بنت فلاں کو) تیرے نکاح میں اس شرط پر دیدیا کہ اگر تم نے یہ کام کیا یا وہ کام کیا (جتنی شرطیں لگانا مقصود ہوں سب کو ذکر کر دیا جائے) تو اپنے معاملہ کا اختیار میرے (یا مسماۃ موصوفہ کے) ہاتھ میں ہوگا، اسکے جواب میں مرد ناکح کہے کہ میں نے قبول کر لیا، اس پر عورت کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنے اوپر شرائط کے خلاف ظلم ومصیبت دیکھے، اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر شوہر کے نکاح سے نکل جائے۔

اور اگر ایسا نہ کیا گیا، بلکہ ابتدائے کلام (یعنی ایجاب) مرد کے جانب سے ہو اور لڑکی والے قبول کے ساتھ تفویض طلاق کی شرط لگا دیں تو نکاح بلا کسی شرط کے صحیح ہو جائے گا، اور شرط بالکل بے کار ہو جائے گی، خوب سمجھ لو۔ (ماخوذ مع الحذف من الناجزۃ/ ۲۵، الرد المختار ۳/ ۳۲۹)

(۳) کاح میں شرط کی تین صورتوں میں سے تیسری صورت کہ نکاح کے بعد کوئی اقرار نامہ اس قسم کا شوہر سے لکھوایا جائے، یہ صورت بھی صحیح اور بالکل درست ہے۔

رہا سوال کہ کیا تفویض واختیار کے ساتھ مزید احتیاط کے لئے ایسی قیدیں بڑھائی جاسکتی ہیں، جو جانبین کے لئے مفید ہوں اور بے جا استعمال کا سد باب کریں تو اس کے جواب میں ''الحیلۃ الناجزۃ'' کی عبارت درج ذیل ہے:

''چونکہ عورت ناقص العقل ہے اس لئے طلاق کو مطلقاً اس کے ہاتھ میں دیدینا خطرہ سے خالی نہیں، پس مناسب ہے کہ تفویض میں کوئی قید مناسب بھی لگا دی جائے، جس میں وہ خطرہ نہ رہے، مثلاً یہ کہ نکاح کے وقت عورت کی طرف سے وہ خود یا اس کا ولی یا وکیل یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو یا مسماۃ فلاں بنت فلاں کو تمہارے نکاح میں بمعاوضہ مہر روپے کے اس شرط پر دے دیا کہ جس وقت اس کو تم سے کوئی تکلیف شدید پہنچے گی جس کو فلاں فلاں اشخاص میں سے کم از کم دو آدمی تسلیم کر لیں (اس جگہ مناسب ہے کہ کم از کم دس آدمیوں کے نام تراضی طرفین سے متعین کر دئے جائیں) تو اس کے بعد ہر وقت معاملہ میرے یا اس کے اختیار میں ہوگا کہ اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر اس نکاح سے علیحدگی اختیار کر لی جائے، اس صورت میں طلاق کا اختیار عورت کے ہاتھ میں اس وقت آئے گا، جبکہ تسلیم کردہ اشخاص میں سے کم از کم دو آدمی تسلیم کر لیں کہ تکلیف شدید ہے، اور اس

کے حاشیہ میں ہے کہ اگر اس سے زیادہ احتیاط مطلوب ہوتو یہ جملہ بھی بڑھالیں ''اور وہ دونوں آدمی طلاق کو مناسب بھی کہیں'' (یہ سب کچھ حذف واختصار کے ساتھ ''الحیلۃ الناجزۃ'' کے جزء اول تفویض طلاق بوقت نکاح'' سے لیا گیا ہے۔(ص ۲۷، ۲۴)

طلاق کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے اگر عقد نکاح کے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کا مہر بیس ہزار اور اگر اس نے طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار ہوگا تو یہ شرط جائز ومعتبر نہیں، طلاق نہ دینے کی صورت میں مہر مسمی (دس ہزار) ادا کرنے ہوں گے اور طلاق دینے کی صورت میں مہر مثل واجب ہوگا، بشرطیکہ وہ مہر مسمی متجاوز نہ ہو، جیسا کہ امام اعظمؒ کا مذہب ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ امام صاحبؒ کے نزدیک دونوں شرطیں لازم العمل نہیں، بلکہ یہ بات صاحبین کے نزدیک ہے۔

اس مسئلہ میں صاحبین کے قول کو اختیار کرنا اصول کی روشنی میں صحیح نہیں، اس کی چند وجوہات ہیں:

(۱) غیر مجتہد کے لئے اصولیین کے نزدیک ایک جزئیہ کا قیاس دوسرے جزئیہ پر جائز نہیں، لہذا اس بناء پر قیاس صحیح نہ ہوا۔ (رسم المفتی: ۷۹)

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ مسئلہ زیر بحث یعنی مشروط بالطلاق کو مہر مشروط باخراجہا من الوطن پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ مقیس کا تعلق قطع نکاح سے ہے جو اشد ہے اور مقیس علیہ کا تعلق قطع نکاح سے نہیں ہے، بلکہ ایک جزئی مسئلہ سے ہے جو اھون ہے، لہذا مقیس علیہ میں تفاوت ہونے کی بناء پر قیاس صحیح نہیں ہے۔

(۳) ارباب متون معتبرہ کے قول کو ارباب شروح کے مقابلہ میں اختیار کیا جائے گا، بشرطیکہ مشائخ نے اس کے خلاف کو راجح نہ قرار دیا ہو (رسم المفتی: ۸۰)

اور یہاں پر مشائخ نے ارباب متون کے قول کو ہی اختیار کیا ہے، کیوں کہ اس کے خلاف تصحیح موجود نہیں۔

(۴) چوتھی وجہ یہ ہے کہ صاحبین کے قول کو اختیار کرنے میں مرد سے وہ آزادی سلب کرنی لازم آئے گی، جو اس کو شریعت نے ودیعت کی ہے، خصوصاً جب کہ یہ معاملہ وعظ ونصیحت اور سمجھانے بجھانے سے سلجھ سکتا ہے اور خرابیاں دور ہوسکتی ہیں، نیز یہ بات بھی بدیہی ہے کہ جس طرح بعض طبائع پر ضابطہ کارگر ہوتا ہے، اسی طرح یا اس سے زیادہ اکثر طبائع پر رابطہ مؤثر ہوتا ہے لہذا "للأكثر حكم الكل" کے تقاضے سے بجائے ضابطہ کے رابطہ اختیار کرنا چاہئے، نیز شوہر کو اگر کسی ضابطہ یا غلاء مہر کے واسطہ سے ذہنی طور پر مجبور کردیا جائے کہ وہ طلاق واقع نہ کرسکے تو اس صورت میں مفاسدہ کثیرہ کے باب کے کھلنے کا قوی اندیشہ ہے، اس میں ایک بات یہ ہے کہ جب شوہر بیوی کو رکھنا نہیں چاہتا اور یہاں قید وبند کی وجہ سے چھوڑ بھی نہیں سکتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ عورت پر ظلم وستم ڈھانا شروع کردے گا جس کا ثمرہ یہ مرتب ہوگا کہ مجبور ہوکر عورتیں لاعلمی اور کم عقلی کی وجہ سے خودکشی کرنے لگیں گی یا مرد خفیہ قتل کی سازش بنائیں گے جو بالخصوص سفلہ اور فاسق وفاجر لوگوں کے یہاں کوئی بعید از امکان نہیں۔

نیز مہر کو اگر قلیل وکثیر دو شق کی طرف دائر کیا گیا تو ظاہر بات ہے کہ شق ثانی یا تو رقم خطیر ہوگی جو مانع طلاق ہے یا رقم خطیر نہیں ہوگی، اگر رقم خطیر نہیں ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس شرط کے لگانے سے کوئی حاصل نہیں اور اگر رقم خطیر ہے تو کوئی بعید نہیں کہ سرے سے شوہر نکاح سے رک جائے اس لئے کہ لڑکیوں کی کثرت اور فراوانی کا ہونا ظاہر ہے، اس سے نہیں تو کسی اور سے نکاح کرلے گا اس صورت میں وہ لڑکی نفس نکاح سے ہی محروم رہی، پھر اس شرط کا کیا حاصل، اور اگر اس نے اس کے باوجود نکاح کا اقدام کرلیا تو وہ مفاسد کثیرہ جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا، اس مبینہ مصلحت اور ضرورت سے زیادہ ان مفاسد سے بچنے کی ضرورت ہے، جو اہم اور اشد ہے، اس وجہ سے ظاہر الروایہ سے انحراف کرکے نادر کی طرف جانا، ہمارے خیال میں لاحاصل ہے۔

لہذا ظاہر الروایہ ہی کو اختیار کرتے ہوئے علماء کرام اگر وقت کی نزاکتوں کو دیکھتے ہوئے اپنی پند ونصیحت کا دائرہ اور زیادہ وسیع کردیں تو یہ ہمارے خیال میں قرینہ مصلحت ہوگا، گو وہ اپنے فرض منصبی کو تو ادا کرتے ہی رہتے ہیں۔

۲۔ ایسی صورت میں دونوں شرطیں معتبر اور لازم العمل نہیں ہوں گی، جیسا کہ امام اعظمؒ کا مذہب مذکورہ بالا سطروں سے معلوم ہوا، لہذا اس صورت میں

بھی اگر شوہر اس منکوحہ کے عقد میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کرے تو اس عورت کا مہر تیس ہزار ہوگا، اور اگر اس کے عقد میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر مہر مثل ہوگا۔(فتح القدیر ۲/۴۵۹)

۳۔ اس شرط کے متعلق گفتگو کرنے سے پہلے عورت کی ملازمت کا شرعی حکم معلوم کرلینا ضروری ہے، تاکہ شرط کی شرعی حیثیت معلوم ہوجائے، لہذا اس سلسلہ میں ''فتاوی رحیمیہ'' کے ایک استفتاء کا جواب حذف واختصار کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

عورتوں کے لئے جائز نہیں کہ بے حجاب ہوکر دکان میں بیٹھ کر غیر محرم کے ساتھ تجارت کریں، ان کے مرد تبلیغی جماعت میں جائیں یا حج کو، یا کسی بھی وجہ سے غائب رہیں، بے حجابی اور بے پردگی کسی بھی حالت میں جائز نہیں، قرآن پاک کی آیتیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اور خود سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل، حضرات صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین یعنی جملہ سلف کی روایات کا متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ عورتوں پر پردہ فرض ہے، قرآن پاک کی آیات لاتبرجن، دکھاتی نہ پھرو، سامنے نہ آؤ وقرن فی بیوتکن گھروں میں قرار سے رہو، ارشادات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: "المراۃ عورۃ فإذا خرجت استشرفها الشیطان" (ترمذی) ان ہی فتنوں کی بناء پر حکم یہ ہے، "لیس للنساء نصیب فی الخروج الا مضطرۃ" (طبرانی)

خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کو دکان پر بیٹھنے کی، بے پردہ ہونے کی، اور غیر محرم سے باتیں کرنے کی اسلامی شریعت اجازت نہیں دیتی۔(فتاوی رحیمیہ ۲/۱۶۷)

جب عورتوں کی ملازمت کا محظور شرعی ہونا معلوم ہوگیا تو اس شرط کا باطل ہونا بھی معلوم ہوگیا، کیونکہ ہر وہ شرط جو محظور ہو وہ باطل ہے، اس کے مطابق عمل جائز نہیں ہے۔(الکوکب الدری ۴/ ۷ ۴۳)

اور ''المراۃ بین الفقہ والقانون'' میں انہیں شمار کیا گیا ہے۔( المرأۃ بین الفقہ والقانون/ ۶۸)



# طلاق کے اختیار کی شرط کا مسئلہ

مفتی ریاست علی قاسمی

مذہب اسلام میں انسانی خواہشات کا غایت درجہ احترام اور لحاظ کیا گیا ہے، اسی وجہ سے نکاح کرنے کی نہ صرف ترغیب دی ہے، بلکہ حکم دیا گیا ہے بعض صحابہ کرام نے عبادات اور نوافل میں مشغول ہونے کی خاطر تبتل اور عورتوں سے علیحدہ رہنے کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف طریقہ سے منع فرمادیا، اور مذہب حنفی کے اندر تخلی بالنوافل سے نکاح کو افضل قرار دیا گیا، اسی وجہ سے نکاح کرنا عام حالت میں مسنون اور حالت توقان میں واجب ہے نکاح مرد اور عورت کے درمیان ایسا قابل احترام عقد ہے، جس کے ذریعہ جائز تعلق استوار ہوتے ہیں اور جہاں سے عائلی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، اسلام کا مطمح نظریہ ہے کہ رشتہ نکاح پائیدار اور مضبوط رہے، اسی لئے جابجا قرآن وحدیث میں ایسی ہدایات اور شرائط کا فریقین کو پابند بنایا گیا ہے جس سے رشتہ میں استحکام اور دائمی رفاقت کا بندھن مضبوط سے مضبوط ہوجائے، اور زوجین کے عائلی حقوق کا پورا تحفظ ہوسکے۔

## عقد نکاح میں شرط لگانے کا حکم:

عقد نکاح کے اندر لگائی جانے والی شرط کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، بعض شرائط مقتضاء عقد کے مطابق ہوتی ہیں، بعض شرائط مقتضاء عقد کے خلاف ہوتی ہیں، مقتضاء عقد کے مطابق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایسی شرائط فریقین ایک دوسرے پر عائد کریں کہ شرط نہ ہونے کی صورت میں بھی ان حقوق وفرائض اور ذمہ داریوں کی ادائیگی فریقین پر ضروری ہو، شرط لگانے سے صرف ان حقوق کی تذکیر اور یاد دہانی مقصود ہوتی ہے، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ میرا نان ونفقہ رہائش وغیرہ شوہر پر لازم ہوگا، یا شوہر یہ شرط لگائے کہ بیوی میرے تمام شرعی حقوق واجبہ ادا کرے گی میرے گھر پر رہے گی، پردہ کے ساتھ رہے گی اور میری اولاد اور گھریلو اشیاء کی مکمل دیکھ بھال کرے گی، عقد نکاح کے اندر اس قسم کی شرائط عائد کرنا شرعاً جائز اور درست ہے، اس سے عقد نکاح کے انعقاد پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا

مقتضاء عقد کے خلاف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فریقین ایک دوسرے پر ایسی شرائط عائد کریں جن کے ذریعہ عقد نکاح سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں سے گریز ہو، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ شوہر مجھ سے صحبت اور مباشرت نہیں کرے گا، یا شوہر کا یہ شرط لگانا کہ بیوی کے اخراجات کی ذمہ داری میرے اوپر نہیں ہوگی وغیرہ، عقد نکاح کے اندر اس قسم کی شرطیں لگانا شرعاً ناجائز ہیں، اگر عقد نکاح میں اس قسم کی شرطیں لگادی گئیں تو نکاح درست ہوجائے گا، اور شرائط لازم الایفاء نہیں ہوں گی، کیونکہ نکاح شروط فاسدہ سے فاسد نہیں ہوتا ہے۔ (الفتاوی الہندیہ ۱ / ۲۷۳)

## عقد نکاح میں مذکورہ دونوں قسم کی شرائط کے علاوہ شرائط کا حکم:

بعض شرائط ایسی ہیں جو مذکورہ بالا دونوں قسموں میں سے کسی کے زمرہ میں نہیں آتی ہیں، بلکہ مشروط نکاح کی صورت میں فریقین کے اوپر نئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو غیر مشروط کی صورت میں عائد نہیں ہوتی ہے، اس قسم کی شرائط کی مختلف صورتیں ہیں:

(۱) عقد نکاح سے قبل ہی شرائط طے ہوجائیں اور عقد نکاح کی طرف اضافت نہ کی جائے۔

(۲) عقد نکاح سے قبل شرائط طے کی جائیں اور نکاح کی طرف اضافت کردی جائے

(۳) عقد نکاح سے قبل شرائط مقرر کی جائیں، لیکن فریقین کے دستخط عقد نکاح کے وقت کرائے جائیں۔

(۴) عقد نکاح ہی میں شرائط کا تذکرہ ہو، ایجاب مشروط ہو یا ایجاب مطلق اور قبول مشروط ہو۔

(۵) عقد نکاح کے بعد فریقین کے مابین کوئی شرائط نامہ تحریر کیا جائے۔

ان تمام صورتوں میں اول الذکر صورت کی شرائط لازم الایفاء نہیں ہیں اور نہ ہی ان شرائط سے عقد نکاح کے بعد کوئی جدید ذمہ داری فریقین پر

عائد ہوگی، اور باقی تمام صورتوں میں حسب شرائط نامہ فریقین کے لئے ان شرائط کی جو مقتضائے عقد کے مناسب ہوں پابندی کرنا شرعاً لازم اور ضروری ہے، کیوں کہ یہ ایک قسم کا عہد ہے اور عہد کی پابندی مسلمان پر لازم ہے، اور حدیث پاک میں اس کو مسلمان کی امتیازی علامت بتلایا گیا ہے اور بدعہد کو علامت نفاق قرار دیا گیا ہے، ارشاد خداوندی ہے: "وأوفوا بالعهد" (بنی اسرائیل)۔ (قواعد فقہیہ ۱۲۱)

''بخاری شریف کتاب الشروط'' میں ہے:

''قال عمر: إن مقاطع الحقوق عند الشروط ولك ما اشترطت'' (بخاری ۱۔ ۳۷۶)۔

## عقد نکاح میں عورت کی طرف سے طلاق کے اختیار کی شرط لگانے کا حکم:

اگر عقد نکاح میں عورت شوہر سے یہ شرط لگائے کہ مجھے طلاق کا اختیار رہے گا اور شوہر اس کو منظور کر لے، یا شوہر ہی صلب عقد میں عورت سے یہ کہہ دے کہ تم کو طلاق دینے کا اختیار ہے، تو اصطلاح فقہ میں اس کو تفویض طلاق کہا جاتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ فریقین نے صلب عقد میں عورت کے اختیار طلاق کی شرط لگادی ہے، یا عقد نکاح کے بعد عورت کو اختیار طلاق تفویض کیا گیا ہے، یا عقد نکاح سے پہلے شرط لگائی گئی ہے اور اس کی نسبت نکاح کی طرف کی گئی ہے، مثلاً یہ کہا کہ اگر میرا تجھ سے نکاح ہو جائے یا تو میری بیوی بنے تو تجھ کو طلاق واقع کرنے کا اختیار رہے گا تو ایسی صورت میں عورت کو حسب شرائط اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا شرعاً اختیار حاصل ہے، لیکن اگر عقد نکاح سے پہلے شرائط نامہ بابت اختیار طلاق طے کیا جائے اور اس میں اضافت الی النکاح نہ ہو تو یہ شرط لگانا محض لغو اور کالعدم ہوگا، اور اس کی وجہ سے عورت کو کسی قسم کا اختیار طلاق نہ ہوگا۔ (رد المحتار علی الدر المختار ۴/۵۳۶،۷۳، ہدایہ ۲/۳۶۵، الفتاوی الہندیہ ۱/۴۲۰)

## تفویض طلاق میں مصالح شرعیہ کے ضیاع کا اندیشہ اور اس کا حل:

عورت چونکہ ناقص العقل اور کج فطرت واقع ہوئی ہے، اس لئے طلاق کو مطلقاً اس کے حوالہ کر دینا خطرہ سے خالی نہیں ہے، اس لئے مناسب یہ ہے کہ بوقت تفویض کوئی مناسب قید لگا دی جائے، جس سے اس خطرہ کا سد باب ہو سکے، مثلاً لڑکی یا لڑکی کا وکیل یہ کہے کہ میں نے اپنے آپ کو یا مسماۃ فلاں کو تمہارے نکاح میں بعوض مہر اس شرط پر دیا کہ اگر اس کو تمہاری طرف سے کوئی گزند پہنچے گی جس کو فلاں فلاں ذمہ دار اشخاص تسلیم کر لیں (اس جگہ کم از کم دس ذمہ دار اشخاص کا نام تراضی طرفین سے لکھا جائے) تو اس کے بعد طلاق کا معاملہ میرے یا اس کے اختیار میں ہوگا کہ وہ اپنے اوپر طلاق بائنہ واقع کر کے علیحدگی اختیار کر لے، اس صورت میں یہ اشخاص صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد تفریق ناگزیر ہو تو کرنے کا اختیار ہوگا، اور عورت کے لئے مناسب یہ ہے کہ اختیار حاصل ہونے کے بعد بھی طلاق واقع کرنے میں جلدی نہ کرے بلکہ اطمینان سے سوچ سمجھ کر کام کرے، اور تین امور کا کم از کم التزام کرے اول یہ ہے کہ فوراً غصہ کے وقت اپنے اختیار سے کام نہ لے بلکہ ایک خاص مدت تک غور و خوض کرے جس کی میعاد ایک ہفتہ سے کم نہ ہو دوسرے اپنے خیر خواہ لوگوں سے مشورہ کرے تیسرے سنت کے موافق استخارہ کرے اور ویسے بھی دعا کرے پھر جو دل میں آئے اس پر توکلاً علی اللہ عمل کرے، اس طریقہ سے تفویض مطلق کی صورت میں پیش آمدہ ممکنہ خطرات سے تحفظ ممکن ہوگا (الحیلۃ الناجزۃ ۵۳) تفویض طلاق کے مسئلہ میں مولانا اشرف علیؒ ''کتاب الحیلۃ الناجزۃ'' کے باب اول بابت تفویض طلاق کو رہنما بنایا جا سکتا ہے۔

## تفویض طلاق کے بعد شوہر کو رجوع کرنے کا حکم:

اگر شوہر بیوی کو طلاق کا اختیار تفویض کر دے تو پھر شوہر کے لئے اس سے رجوع کرنا درست نہیں ہے، البتہ اگر شرائط نامہ میں شوہر رجوع کی بھی شرط لگالے اور طرفین اس کو منظور کر لیں تو رجوع کرنے کا حق ہوگا۔ (رد المحتار علی الدر المختار ۴/۵۲۸)

## شوہر کے طلاق دینے اور نہ دینے کی صورت میں اختلاف مہر کا حکم:

اگر عقد نکاح کے وقت عورت کی طرف سے اس طرح شرط لگادی جائے کہ اگر بیوی کو طلاق دے گا تو مہر بیس ہزار روپے ہوگا، اور طلاق نہ دینے کی صورت میں دس ہزار روپے ہوگا، یا اس عورت کے نکاح میں ہوتے ہوئے دوسری عورت سے نکاح کرے گا تو مہر تیس ہزار روپے ہوگا اور منکوحہ کے ہوتے ہوئے دوسری عورت سے نکاح نہ کرنے کی صورت میں مہر پندرہ ہزار روپے ہوگا، تو اس طرح شرائط عائد کرنے میں نکاح کے انعقاد کے اندر شرعاً کوئی شبہ نہیں ہے، مگر مہر کے

سلسلہ میں امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے درمیان اختلاف ہے، صاحبین حسب شرائط نامہ مہر مسمی کے وجوب کے قائل ہیں، اور امام صاحب شرط اول کو پورا کرنے کی صورت میں مہر مسمی اور شرط اول کو پورا نہ کرنے کی صورت میں مہر مثل کے وجوب کے قائل ہیں، تمام ہی فقہاء کرام نے امام صاحب کے قول کو مفتی بہ اور قابل عمل قرار دیا ہے۔

## صاحبین کے قول کو اختیار کرنے کا حکم:

اس میں کوئی شک نہیں کہ کثرت طلاق کی وباء عام ہوتی جارہی ہے، اور عوام الناس معمولی معمولی باتوں پر بلاخوف وخطر طلاق دیتے ہیں جو ایک تشویشناک امر ہے، جس کا سد باب وقت کی اولین اور اہم ضرورت ہے، اس سلسلہ میں علماء کرام اور زعماء ملت کی اولاً ذمہ داری یہ ہے کہ معاشرہ کو نکاح کی عظمت ووقعت اور طلاق کی مذمت وقباحت سے روشناش کرائیں، اور اس موضوع سے متعلق قرآن وحدیث کی صراحتات سے عوام الناس کو واقف کرایا جائے تاکہ کثرت طلاق سے رکاوٹ ہوسکے، جب معاشرہ اسلامی ہوگا، اور نکاح کی عظمت قلوب میں جاگزیں ہوگی تو اس قسم کے امراض قبیحہ سے خود ہی رکاوٹ ہوجائے گی، بصورت دیگر ارباب افتاء کی معتد بہ جماعت تمام حالات کی نزاکتوں پر غور کرکے صاحبین کے قول پر فتوی دینے کے مجاز ہیں۔ (ردالمحتار علی الدر المختار ۱/ ۳۴۵، ہدایہ ۴/ ۳۰۹، ہندیہ ۱/ ۳۰۷، تاتارخانیہ ۳/ ۱۰۱، ۱۰۲، بحر الرائق ۳/ ۱۵۹)

## ملازمت کی شرط کا حکم:

نکاح کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد عفت وعصمت اور حیاء کے ساتھ زندگی گزارنا بھی ہے، اگر نکاح کرنے کے بعد بھی عفت وعصمت اور حیاء کا لحاظ نہ کیا گیا تو یہ مقاصد کے خلاف ہوگا، اس لئے کہ اگر عورت عقد نکاح میں شوہر سے یہ شرط لگائی ء کہ مجھے میرا شوہر اعلی تعلیم، مثلاً عورتوں کے امراض مخصوصہ کی ماہر ڈاکٹر خاتون ہونا، جو وقت کی ضرورت ہے، اور سرکاری ملازمت سے نہیں روکے گا، تو اگر اس شرط کو پورا کرنے میں بے پردگی اور بے حیائی ہوتی ہو اور شوہر عورت کی عزت وآبرو اور عصمت وعفت کو محفوظ نہ سمجھتا ہو تو یہ شرط لازم الایفاء نہیں ہے اور شوہر کو اس کی خلاف ورزی کرنی چاہئے ورنہ گنہ گار ہوگا اور اگر اعلی تعلیم کے حصول اور سرکاری ملازمت سے وابستہ ہونے کی صورت میں شرعی پردہ اور حیاء کا مکمل لحاظ کیا جاتا ہو اور شوہر مطمئن بھی ہو تو اس شرط کو پورا کرنا جائز ہوگا۔



# نکاح میں ایسی شرائط جن سے ذمہ داریاں عائد ہوں

مولانا عبدالرحمن قاسمی [1]

(۱) پہلی قسم (یعنی ایسی شرائط جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ خود عقد نکاح سے جو ذمہ داری کسی فریق پر عائد ہوتی ہو اسی کو شرط کی صورت میں عقد نکاح کے وقت ذکر کر دیا گیا ہو، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا وغیرہ) کی شرط لگانے یا نہ لگانے میں شرعاً کوئی فرق نہیں ہے، دونوں صورتوں میں نکاح صحیح منعقد ہو جائے گا اور شرائط کا پورا کرنا شرعاً لازم ہوگا۔ (الکوکب الدری: ۱/۳۳۶)

(۲) الف: دوسری قسم یعنی نکاح کے وقت کسی فریق کا ایسی شرط لگانا، جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، مثلاً شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان ونفقہ اس کے ذمہ نہیں ہوگا وغیرہ کی شرائط لگانا جائز نہیں ہے، اگر وقت نکاح اس قسم کی شرائط لگادی گئیں تو شرعاً نکاح صحیح و منعقد ہو جائے گا اور شرط باطل ولغو ہو جائیں گی، ان کا پورا کرنا لازم وجائز نہیں ہے۔ (امداد الفتاوی ۲/۱۸۷، رد المحتار ۳/ ۵۳)

۳ب: تیسری قسم (یعنی نکاح کے وقت ایسے شرائط عائد کرنا جو مذکورہ بالا دونوں قسم کے شرائط کے علاوہ ہوں، ان کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہے، جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہیں ہوتا اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی یا ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہ ہوتی، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہ کرے گا، یا بیوی کو آبائی وطن ہی میں رکھے گا وہاں سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائیگا وغیرہ) کی شرط کا حکم یہ ہے کہ ایسے شرائط کے ساتھ نکاح شرعاً صحیح ومنعقد ہو جائیگا، اور جو شرائط مقتضاء عقد یا شرع کے خلاف نہ ہوں ان شرائط کو لگانا صحیح اور پورا کرنا واجب ہوگا، اور جو شرائط مقتضاء عقد کے خلاف ہوں، انکو لگانا صحیح نہ ہوں اور ان کا پورا کرنا بھی لازم نہیں ہے، حضرت تھانوی ؒ ایک سوال کے جواب تحریر میں فرماتے ہیں: جو شرط خلاف شرع نہ ہو اس کا پورا کرنا واجب ہے اور جو خلاف شرع ہو اس کا پورا کرنا واجب نہیں، غیر مشروع شرط ٹھہرانا جائز نہیں اور مشروع واجب الوفاء ہے۔ (امداد الفتاوی ۲/۱۸۷) دوسرا نکاح نہ کرنے کی شرط اور عورت کو آبائی وطن سے نہ نکالنے کی شرط پر علامہ زیلعی نے کافی اچھی بحث کی ہے، جسے "تبیین الحقائق" (۱/۱۴۹) پر دیکھا جاسکتا ہے۔

لہذا دوسرا نکاح نہ کرنے کی شرط اور عورت کو اس کے آبائی وطن سے نہ نکالنے کی شرط شرعاً لازم الایفاء نہیں ہے، کیوں کہ یہ شرطیں شرع کے خلاف ہیں۔ (الکوکب الدری ۱/۳۳۶)

(ج) عقد نکاح کے وقت اگر عورت یہ شرط لگائے کہ اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، یا فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، اور شوہر اس کو تسلیم کرتا ہے تو شرعاً عورت کو طلاق کا اختیار حاصل ہو جائے گا، درمختار میں ہے، "نکحها علی أن أمرها بیدها صح" (شامی ۳/۳۲۹) اور شوہر کو تفویض طلاق کے بعد اس تفویض سے رجوع کرنے کا حق نہیں رہتا، بلکہ تفویض طلاق کے بعد عورت طلاق کی مالک ہو جاتی ہے۔ (الحیلۃ الناجزۃ ۳۷، رد المحتار ۳/۳۳۲)۔

## نکاح میں شرط کی تین صورتوں کے احکام

(۱) اگر عقد نکاح سے پہلے شرائط طے ہو جائیں اور اس تحریر پر طرفین کے دستخط ہو جائیں تو ان شرائط کے معتبر ومفید ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ اس میں نکاح کی طرف اضافت ونسبت موجود ہو، مثلاً لکھا جائے کہ اگر میں فلاں بنت فلاں کے ساتھ نکاح کروں اور پھر شرائط اقرار نامہ ہذا میں سے کسی شرط کے

[1] مفتی ومدرس دار العلوم چھاپی، گجرات

خلاف کروں تو مساۃ مذکورہ کو اختیار ہوگا کہ اسی وقت یا پھر کسی وقت چاہے تو اپنے اوپر ایک طلاق بائن واقع کر کے اس نکاح سے الگ ہوجائے، اگر اس میں اضافت الی النکاح نہ لکھی گئی تو یہ اقرار نامہ محض بے کار ہوگا، اس کی وجہ رو سے عورت کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہ ہوگا (الحیلۃ الناجزۃ ر ۳۱)

(۲) اگر عقد نکاح میں، ہی ان شرائط کو زبانی ذکر کیا جائے تو ان کے صحیح و معتبر ہونے کی شرط یہ ہے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو اور قبول مرد کی جانب سے ہو اور اگر ایسا نہ کیا گیا، بلکہ ابتدائے کلام، یعنی ایجاب مرد کی جانب سے ہو اور عورت کی جانب سے قبول کے ساتھ تفویض طلاق کی شرائط لگائی گئیں تو نکاح بلا کسی شرط کے صحیح ہوجائے گا اور شرط بالکل بے کار و لغو ہوں گی۔ (رد المحتار ۳ر ۳۲۹)

اگر ایجاب عورت ہی کی طرف سے ہو اور شرط تفویض نہ لگائی ہو، پھر مرد نے قبول میں شرط تفویض کا اضافہ کر دیا، تب بھی تفویض صحیح ہوگئی۔ (الحیلۃ الناجزۃ ر ۳۳)

تفویض طلاق و اختیار کے بے جا استعمال کے سد باب اور مصالح شرع کی حفاظت کے لئے تفویض کے ساتھ مزید احتیاط کے لئے قیدیں بڑھانا درست ہے۔

(۱) طلاق کے غلط استعمال کو روکنا امام ابوحنیفہؒ کے قول کو اختیار کرنے سے بھی حاصل ہوسکتا ہے، کیونکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جس مہر کا ذکر پہلی شرط کے ساتھ کیا گیا ہو، اس کا تسمیہ صحیح ہوتا ہے اور پہلی شرط پائی جانے کی صورت میں متعین کردہ مہر (مہر مسمی) لازم ہوتا ہے، اور دوسری صورت میں ذکر کردہ مہر کا اعتبار نہیں ہوتا، بلکہ دوسری شرط پائی جانے کی صورت میں مہر مثل لازم ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ مہر مسمی سے متجاوز نہ ہو، لہذا جس شرط پر زیادہ مہر مقرر ہوا اس کو پہلے ذکر کیا جائے، یعنی اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کا مہر پچاس ہزار اور اگر اس نے طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار ہے، تو اس صورت میں چونکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مہر میں پہلی شرط معتبر ہے اور شوہر اگر پہلی (عورت کو طلاق دیتا ہے) شرط پوری کرتا ہے تو عورت (کثیر رقم) مہر مسمی کی حقدار بنے گی اس لئے شوہر کثیر رقم (مہر مسمی) سے بچنے کیلئے پہلی شرط واقع ہونے نہیں دے گا، اس طرح دوسری شرط پائی جائے گی اور عورت کو مہر مثل ملے گا، بشرطیکہ وہ مہر مسمی سے زیادہ نہ ہو۔

۲۔ اس صورت میں پہلی شرط معتبر و لازم العمل ہوگی، یعنی اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو عورت تیس ہزار مہر (مہر مسمی) کی حقدار ہوگی اور اگر اس کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو عورت مہر مثل کی مستحق ہوگی، جو پندرہ ہزار سے کم نہ ہو اور تیس سے زیادہ بھی نہ ہو۔

۳۔ اگر کوئی عورت اپنے نکاح کے وقت یہ شرط لگاتی ہے کہ شوہر اس کو لگی ہوئی ملازمت سے نہیں روکے گا یا اگر آئندہ اس کو کوئی ملازمت ملے تو شوہر اس کو ملازمت سے نہیں روکے گا، ایسی شرط لگانا جائز نہیں ہے، کیونکہ عورت کا نان و نفقہ شوہر کے ذمہ شرعاً واجب ہے، لہذا اس کو ملازمت کے لئے نکلنا جائز نہیں ہے، اس کے باوجود اس شرط کے ساتھ نکاح ہوا ہے تو شرعاً نکاح صحیح و منعقد ہوجائے گا اور شرط باطل و لغو ہوجائے گی اس کا پورا کرنا شوہر کے ذمہ لازم و جائز نہیں ہے اور اگر شوہر اس شرط کو قبول کرنے کے باوجود عورت کو سلسلہ ملازمت ختم کرنے کا حکم دیتا ہے یا نئی ملازمت سے روکتا ہے تو عورت کے لئے شوہر کے حکم کی تعمیل واجب ہے، ورنہ گنہگار ہوگی۔

☆☆☆

# نکاح میں مختلف نوع کے شرائط عائد کئے جانے کے احکام

مولانا عبدالقیوم پالنپوری قاسمی

ایسی شرائط عقد نکاح کے وقت لگانا جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی نئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ عقد نکاح سے جو ذمہ داری کسی فریق پر عائد ہوتی ہے، اسی کو شرط کی صورت میں ذکر کر دینا، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر پر رہے گا، اس قسم کی شرط لگانے سے عقد نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، عقد نکاح صحیح ہوجائیگا، اور اس قسم کی شرائط لگائیں یا نہ لگائیں ہر حال میں ان کا پورا کرنا ضروری رہے گا، چنانچہ ''الکوکب الدری'' (۱/ ۳۳۶) پر لکھا ہے:

''جن چیزوں کو عقد نکاح بغیر شرط کے واجب کرتا ہے، جیسے بیوی کے لئے نفقہ اور سکنی، پس ان چیزوں کو پورا کرنا ضروری ہے اگر چہ شرط نہ لگائی ہو''۔

(الف) نکاح کے وقت ایسی کوئی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، (مثلاً شوہر کے ذمہ بیوی کا نان ونفقہ نہیں ہوگا) درست نہیں ہے، اگر اس قسم کی شرائط کے ساتھ کیا گیا تو نکاح منعقد ہوجائے گا، البتہ یہ شرائط لغو ہوجائیں گی اور ان کو متعلقہ فریق پر پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔ (ردالمحتار ۴/ ۳۱۷-۳۱۶، اوجز المسالک ۴/ ۲۶۵)

(ب) اور تیسری قسم (یعنی اوپر مذکورہ شرائط کے علاوہ ایسی شرط لگانا کہ جس کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہ ہوتی ہو، مثلاً مرد اس عورت کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا، وغیرہ) کی شرائط کا حکم یہ ہے کہ ایسی شرائط کے ساتھ نکاح بھی صحیح و منعقد ہوجائے گا، اور جو شرائط خلاف شرع نہ ہوں ان کو لگانا اور پورا کرنا واجب ہے اور ان میں جو شرائط خلاف شرع ہوں ان کو عقد نکاح میں لگانا جائز نہیں اور ان کو پورا کرنا بھی واجب نہیں، جیسا کہ حضرت تھانوی نے ایک فتوی کے جواب میں لکھا ہے، جو شرط خلاف شرع نہ ہو اوس کا پورا کرنا واجب ہے اور جو خلاف شرع ہو اس کا پورا کرنا واجب نہیں، غیر مشروع ٹھہرانا جائز نہیں، اور مشروع واجب الوفاء ہے۔ (امداد الفتاوی ۲/ ۲۰۰) اور حضرت مولانا یحیی صاحب کاندھلویؒ حضرت گنگوہیؒ کے درسی افادات ''الکوکب الدری'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''خلاصہ یہ ہے کہ شرائط کی تین قسمیں ہیں: اول وہ شرائط جن کو عقد نکاح بغیر شرط کے واجب کرتا ہے، جیسے بیوی کا نفقہ اور سکنی، ان کا پورا کرنا ضروری ہے اگر چہ شرط نہ لگائی گئی ہو، اور دوم وہ شرائط جو کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہوں ان پر عمل کرنا جائز نہیں اگر چہ شرط لگائی گئی ہو، سوم وہ شرائط جو ان دو قسموں میں سے نہیں ہیں، ان کا لگانا اور ترک کرنا دونوں مباح ہیں، اگر ان کی شرط لگائی گئی تو پورا کرنا واجب ہے اور اگر ان کی شرط نہیں لگائی تو پورا کرنا واجب نہیں''۔

اور تیسری قسم کی شرط پوری کرنے کی صورت میں شوہر پر مہر مسمی واجب ہوگا، البتہ اگر ان شرائط کو پورا نہیں کیا تو شوہر پر مہر مثل واجب ہوگا یا مہر مسمی، اس بارے میں تفصیل ہے کہ اگر مہر مسمی مہر مثل کے مساوی یا زیادہ ہے، یا مہر مسمی مہر مثل سے کم ہے، لیکن عورت یا اس کے ذی رحم محرم کے علاوہ کے لئے منفعت کی شرط لگائی یا مہر مسمی کم ہے اور عورت کے لئے نقصان کی شرط لگائی ہے تو ان تین صورتوں میں مہر مسمی واجب ہوگا۔ (البحر الرائق ۳/ ۱۷۲)

اور اگر مہر مسمی مہر مثل سے کم ہو اور عورت یا اس کے کسی ذی رحم محرم کے لئے کسی منفعت کی شرط لگائی گئی ہے اور وہ منفعت شوہر کے فعل پر موقوف ہو اور مباح الانتفاع ہو، اور اس منفعت کی شرط کو پورا نہیں کیا تو شوہر پر مہر مثل واجب ہوگا۔ (البحر الرائق ۳/ ۱۷۱)

(ج) اس قسم کی شرط لگانا شرعاً صحیح اور معتبر ہے، اور اس صورت میں عورت کے لئے اختیار ہوگا کہ ان شکلوں میں اپنے اوپر طلاق واقع کر لے، اگر شوہر بیوی کو طلاق کا حق تفویض کرنے کے بعد اس تفویض طلاق کو ختم کرنا چاہے تو اس کو ختم کرنے اور رجوع کرنے کا حق نہیں رہتا، بلکہ تفویض طلاق کے بعد عورت طلاق کی مالک ہوجاتی ہے۔ (الدر المختار ۲/۵۷۷، الحیلۃ الناجزۃ: ۳۷)

سوالنامہ میں مذکورہ تینوں صورتوں میں تفویض طلاق درست ہے، اور ''الحیلۃ الناجزۃ'' نے دس صفحات میں تینوں صورتوں کے احکام مع شرائط اور مزید احتیاطی قیود کے ساتھ مفصل بیان کیا ہے، جو کافی اور شافی ہے، اس لئے اس کے جواب کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) عقد نکاح کے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو مہر بیس ہزار اور اگر اس نے طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار ہے، یا اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہ کیا تو اس کا مہر پندرہ ہزار ہوگا، ان دونوں صورتوں میں مذکورہ طریقہ سے مہر طے کرنا درست اور معتبر ہے، البتہ امام صاحبؒ کے راجح قول کے مطابق شرط اول کے پائے جانے کی صورت میں مہر مسمی لازم ہوگا، اور شرط ثانی کے پائے جانے کی صورت میں شوہر پر مہر مثل واجب ہوگا۔

امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کو چھوڑ کر صاحبین کے قول کو فتوی کے لئے اختیار کرنا درست معلوم نہیں ہوتا ہے، اس لئے کہ کثرت طلاق کے واقعات کو روکنے کا مقصد امام صاحب کے قول پر عمل کرنے میں بھی حاصل ہوسکتا ہے، اس طرح سے کہ امام صاحب کے نزدیک اول ذکر کردہ شرط صحیح ہوتی ہے اور بعد میں ذکر کی ہوئی شرط باطل ہوتی ہے، لہذا جس شرط پر کثرت مہر مقرر ہے اس شرط کو شوہر سے پہلے کہلوائی جائے اور دوسری شرط بعد میں ذکر کرلے، اس صورت میں شوہر زیادہ مہر سے بچنے کے لئے پہلی شرط واقع ہونے نہیں دے گا، اور دوسری شرط پائی جائے گی، لہذا عورت کو مہر مثل ملے گا، اور اگر پہلی شرط پائی گئی تو زیادہ مہر عورت کو ملے گی۔ (المبسوط ۵/۹۰)

(۳) ایسی عورت جس کا شوہر نہ ہو اور نہ باپ ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا رشتہ دار ہے جو اس کی معاشی کفالت کر سکے اور نہ خود اس عورت کے پاس اتنا مال ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے، اس صورت میں عورت کیلئے بقدر ضرورت کسب معاش کے لئے شرعی پردہ کی پابندی کے ساتھ گھر سے نکلنا جائز ہے، اگر ایسی صورت حال نہیں ہے تو عورت کے لئے اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسب معاش و ملازمت کے لئے گھر سے نکلے۔ (فقہی مقالات / ۲۴۹ مولانا تقی عثمانی)

لہذا اگر کوئی عورت اپنے نکاح کے وقت شرط لگاتی ہے کہ شوہر اس کو ملازمت سے نہیں روکے گا، یا آئندہ کوئی ملازمت مل گئی تو شوہر منع نہیں کرے گا، تو شرعاً ایسی شرائط باطل اور لغو ہوں گی، جن کا پورا کرنا شوہر پر جائز نہیں ہے، ایسی صورت میں اگر شوہر سلسلۂ ملازمت کے ختم کرنے کا حکم دیتا ہے یا نئی ملازمت سے روکتا ہے تو شوہر کے حکم کی تعمیل عورت پر واجب ہے۔

☆☆☆

# نکاح میں قابل ایفا شرائط عائد کرنا

مفتی معز الدین

۱۔ ایسی شرائط جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی نئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے، بلکہ خود عقد نکاح سے جو ذمہ داری کسی فریق پر عائد ہوتی ہو، اسی کو شرط کی صورت میں عقد نکاح کے وقت ذکر کر دیا گیا ہو، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا، درست نہیں ہے۔

الف۔ اسی طرح مرد کا یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نفقہ اس کے ذمہ لازم نہیں ہوگا، شرعاً درست نہیں ہے، اور اگر کوئی یہ شرط لگا بھی دے تو وہ قابل ایفاء نہ ہوگی اور مذکورہ دونوں صورتوں میں نکاح صحیح ہو جائے گا، البتہ شروط فاسدہ باطل ہو جائینگی "النکاح المؤبد الذی لا توقیت فیہ لا تبطلہ الشروط الفاسدۃ" (بدائع ۲؍۲۸۵)

ب۔ تیسری قسم کی وہ شرطیں جو مذکورہ دونوں صورتوں میں نہ پائی جاتی ہوں، اگر وہ وقت نکاح ذکر کی جاتی ہیں تو اس سلسلہ میں ائمہ حنفیہ کا اختلاف ہے، صاحبین کے پاس وہ شرطیں بھی قابل ایفاء ہیں اور امام زفر کے پاس دونوں شرطیں قابل اعتبار نہیں، البتہ نکاح صحیح ہو جائے گا۔ (ہدایہ، عالمگیری وغیرہ)۔

جو عقد نکاح کے وقت اگر عورت یہ شرط لگائے کہ اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، یا فلاں فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، اور شوہر اسکو تسلیم کرلے تو یہ صورت شرعاً تفویض طلاق کی ہے جو ائمہ حنفیہ کے نزدیک درست ہے اور عورت کو اس صورت میں ایقاع طلاق کا اختیار حاصل ہوگا، اور اگر شوہر طلاق کا حق تفویض کرنے کے بعد اس تفویض طلاق کو ختم کرنا چاہے تو شرعاً شوہر کو اس کا اختیار باقی نہیں رہتا ہے۔ (عالمگیری، جوہرہ، درمختار)

نکاح میں شرط کی جو تین صورتیں ذکر کی گئی ہیں، وہ تینوں بھی درست ہیں، البتہ ان کی کچھ شرائط ہیں جو ذکر کی جاتی ہیں۔

(۱) مثلاً عقد نکاح سے پہلے شرائط طے ہو جائیں اور اس کی تحریر پر دستخط طرفین کے ہو جائیں اس صورت میں یہ ضروری ہے کہ اس تحریر میں اضافت الی النکاح ہو، یعنی اگر فلاں بنت فلاں سے نکاح کروں اور حسب ذیل شرائط میں سے کسی ایک کے بھی خلاف کروں، تو مسماۃ فلاں بنت فلاں کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنے اوپر طلاق بائن واقع کرلے۔ (شامی ۲؍۸۱۳ عالمگیری ۲؍۲۲۱)

(۲) عقد نکاح ہی میں ان شرائط کا ذکر کیا جائے، عقد نکاح سے پہلے ہی سے شرائط وغیرہ کو طے نہ کیا گیا ہو تو اس صورت میں لازم یہ ہے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو اور وہ مشروط ہو تفویض طلاق کے ساتھ، تب ہی تفویض صحیح ہوگی، ورنہ تفویض طلاق صحیح نہیں ہوگی، چنانچہ ایجاب عورت ہی کی جانب سے ہو، لیکن مشروط نہ ہو یا ایجاب مرد کی جانب سے ہو اور قبول مشروط ہو، ہر دو صورتوں میں تفویض طلاق صحیح نہیں ہوگی۔ (درمختار، عالمگیری وغیرہ)

(۳) عقد نکاح کے بعد طرفین کی جانب سے کوئی طلاق نامہ تحریر کریں اور اس پر شوہر سے دستخط لے لیں، جسے شوہر منظور کرتے ہوئے دستخط کردے تو یہ تحریر بھی شرعاً تفویض طلاق کی ہوگی، لیکن اس میں تمام اختیار شوہر کو ہوگا نکاح پہلے صحیح ہو چکا ہے، اب اگر شوہر اس کو تسلیم کرے تو نکاح کے صحیح ہونے پر کسی قسم کا اثر نہیں ہوگا، لہذا یہ شکل اس عورت کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے جو وقت نکاح شرائط تفویض نکاح نہ لگا سکی ہو، چنانچہ اس صورت میں اگر شوہر ان شرائط کو تسلیم نہ کرے تو اس کو مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اب ان مذکورہ تینوں صورتوں کے اختیار میں چند شرائط وضوابط کا لحاظ کرنا ضروری ہے، تاکہ مصالح نکاح کی حفاظت ہو اور مصالح شرعیہ ضائع نہ ہونے پائیں۔

شوہر کے ذمہ لازم ہے کہ وہ تحریر میں جو شرائط تحریر کرائے اور اس کے بارے میں خود بھی غور وخوض کرے۔

اور اہل علم وفہم سے مشورہ کرلے تاکہ بعد میں پریشانی وپشیمانی نہ ہو، چونکہ شوہر کو تفویض طلاق کے بعد اس تفویض سے رجوع کا حق نہیں رہتا اور تفویض

طلاق کے بعد عورت طلاق کی مالک بن جاتی ہے اس طرح مہر کے معاف کرنے کی شرط کا بھی کابین نامہ بطور خاص تحریر کروادے۔ (عالمگیری ۱؍۵۷)

اسی طرح عورت اور اس کے ولی یا وکیل کے لئے لازم ہے کہ معلوم کرلے کہ اس کابین نامہ کی شرائط قانوناً معتبر ہیں یا نہیں، نیز اس کابین نامہ کی رجسٹری کرلے تا کہ اس کی قانونی حیثیت ہوجائے، اسی طرح دونوں خاندانوں کے ان افراد پر بھی لازم ہے جو اس کابین نامہ کو ترتیب دلوانے والے ہیں کہ وہ جب قاضی صاحب سے یا کسی بھی قاری النکاح سے یہ کابین نامہ تحریر کرائیں تو اس میں حسب ذیل باتوں کا بطور خاص خیال رکھیں:

۱۔ جس وقت عورت کی طرف سے وہ خود یا اس کا وکیل و ولی ایجاب کرے، یہ کہے کہ میں نے اپنے آپ کو یا مسماۃ فلاں کو تمہارے نکاح میں اس شرط پر دیا کہ جس وقت اس کو تم سے کوئی شدید تکلیف پہنچے گی، جس کو فلاں فلاں (اس جگہ کم از کم دس آدمیوں کے نام بہ اتفاق آرا تحریر کریں) اشخاص میں سے دو تسلیم کرلیں اور طلاق دینا مناسب سمجھیں، یہ دونوں شرطوں کا بڑھا دینا ضروری ہے۔

۲۔ اسی طرح تعلیق طلاق کی تحریر میں ''اگر چاہے'' کا لفظ استعمال نہ کیا جائے، ورنہ تفویض خاص اسی مجلس کے ساتھ مقید ہوجائے گی، اور مجلس کے ختم ہوجانے کے بعد عورت کو اختیار طلاق باقی رہے گا اور ایسے ہی ''جب بھی چاہے'' کے الفاظ بھی استعمال نہ کریں، ورنہ ہمیشہ کے لئے حتی کہ اعادہ نکاح کے بعد بھی اس کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار رہے گا جب تک کہ تین طلاق پوری نہ ہوجائیں، جب کہ عورت کو ایسا اختیار دینا ضرورت سے زائد اور مصلحت کے خلاف ہے۔

۳۔ ایسے ہی تعلیق طلاق کی جو تحریر ہو، اس میں عورت کو جو ایقاع طلاق کا حق دیا جائے اس کو موقت بالوقت کردینا چاہئے، یعنی ایک ماہ یا دو ماہ، جیسے مسماۃ مذکورہ کو اختیار ہوگا کہ وہ اسی وقت یا خلاف شرط تسلیم ہوجانے سے ایک ماہ تک جب چاہے اپنے اوپر ایک طلاق واقع کرکے اس نکاح سے الگ ہوجائے۔

۴۔ نیز تفویض طلاق میں ہمیشہ طلاق بائن لکھوائی جائے، طلاق ثلاثہ کبھی بھی نہ لکھوائی جائے۔

## تفویض طلاق بوقت نکاح:

عورت و مرد کے باوقار سمبندھ کو نکاح کہتے ہیں، شریعت اسلامیہ نے اس سمبندھ کو برقرار رکھنے اور پروان چڑھانے کو باعث اجر عظیم قرار دیا ہے، چنانچہ صلہ رحمی ایک بڑی نیکی ہے تو قطع رحمی گناہ کبیرہ ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض حالات میں انسانی معاشرہ کے لئے اصلاحی پہلو کے اعتبار سے اس کو لازم و واجب قرار دیا گیا ہے۔

جب یہ پہلو واضح ہوگیا کہ نکاح کا شریعت اسلامیہ ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے تمام صحیح ادیان کی تعلیمات میں بلند مقام ہے اور اس کو عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، تو اس سے یہ بھی بات صاف ہوگئی کہ اس کو ختم کرنا اور سلسلہ مناکحت کو قطع کرنا عام حالات میں کیسے پسندیدہ ہوسکتا ہے؟ چنانچہ اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "إن أبغض الحلال عند الله الطلاق" اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بابرکت قول سے جہاں طلاق کا عام حالات میں ابغض ہونا معلوم ہو رہا ہے وہیں یہ بات بھی ''المباحات'' کے لفظ سے معلوم ہو رہی ہے کہ یہ عمل طلاق مخصوص حالات میں مخصوص الفاظ وکلمات کے ذریعہ انجام دینا، نہ صرف مباح، بلکہ ایک لازمی ولابدی امر بن جاتا ہے، نیز بدلتے ہوئے حالات اور زمانے کی نیرنگیوں نے اور انسانی طبقہ کی بے مہاری اور خیالات وتفکرات کی آزادی نے پورے انسانی طبقہ اور خاص طور پر اسلامی معاشرہ کو ایسا متاثر کیا ہے کہ وہ بیان سے باہر ہے، چنانچہ یہ صنف نازک جو مرد کے پہلو بہ پہلو رہ کر تو یقیناً بہت سے عظیم کارنامے انجام دے سکتی ہے، لیکن جب میاں اور بیوی میں کسی وجہ سے ناچاقی ہوجائے اور دونوں کا مزاج آپس میں میل نہ کھائے تو مرد اس صنف نازک پر ظلم و زیادتی کے پہاڑ توڑتا ہے جو نہ صرف ناقابل برداشت، بلکہ ناقابل بیان ہیں، کبھی بے رخی سے پیش آتا ہے تو کبھی زد و کوب کرتا ہے، کبھی نان ونفقہ کے لئے اسے تڑپاتا اور ترساتا ہے تو کبھی بال بچوں کو چھوڑ کر پردیس چلا جاتا ہے، اور رسالہا سال کے لئے لاپتہ ہوجاتا ہے، اگر اس کا پتہ مل جاتا ہے تو قاضی صاحب کے یا اہل خانہ کے بار بار اصرار پر نہ تو طلاق دیتا ہے اور نہ ہی خلاصی کو منظور کرکے مسئلہ کی یکسوئی کرتا ہے، بعض مرتبہ یتیم بچیوں کا نکاح اس کے چچا یا دوسرے اولیاء مال کی لالچ میں یا اس بوجھ کو سر سے جلد اتار پھینکنے کے ارادہ سے کسی نامناسب اور غیر موزوں جگہ پر کردیتے ہیں، جس کو لڑکی ناپسند کرتی ہے، اسی طرح بعض مرتبہ مرد کو جنون یا کوئی ایسا مرض لاحق ہوجاتا ہے جس سے

علیحدگی شرعاً لازم ہوجاتی ہے، یہ وہ مسائل ہیں جن سے آج مسلم معاشرہ دوچار ہے، جن کا حل تھا اور آج بھی ہے وہ دار القضاء (شرعی اسلامی عدالت) لیکن ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی، اور اس کے طویل وعریض رقبہ کے اعتبار سے ان دار القضاؤں کا وجود نا کافی ہے، بلکہ بعض علاقے تو ان سے آج بھی خالی ہیں، جبکہ مذکورہ مسائل کسی خاص علاقہ یا خطہ ارض سے ہی متعلق نہیں ہیں، اب اگر وہ اپنے نکاح کو فسخ کروانے کی غرض سے عدالت میں دعوی دائر کرے، تو بعض دفعہ غیر مسلم حاکم اس کا فیصلہ کرتا ہے، جو شرعاً نافذ نہیں ہوتا ہے اس لئے شرعی قواعد کا لحاظ کئے بغیر ہی فیصلہ صادر کردیتا ہے جس کی وجہ سے اس کا فیصلہ قابل اطمینان نہیں ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا وجوہات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر اس قسم کی تحریر وقت نکاح لکھ کر اس پر زوجین وشاہدین سے دستخط کروالی جائیں جس میں طلاق کا اختیار عورت کو بعض شرائط کے ساتھ دیدیا جائے تاکہ وہ ظلم وزیادتی کی صورت میں اس دئے ہوئے طلاق کے حق کو استعمال کر کے شوہر کی مرضی نہ ہوتے ہوئے بھی آزاد ہوسکے، چنانچہ اس تحریر کو کابین نامہ کہتے ہیں اور ضرورت کے تحت اس قسم کی تحریر سے کام لینا شرعاً جائز ہے، بعض حضرات نے اس کو نکاح معلق میں داخل کر کے اس پر شبہ کیا ہے، حالاں کہ یہ نکاح معلق ہرگز نہیں ہے، بلکہ تفویض معلق ہے اور جو نکاح تفویض معلق سے مشروط ہو وہ نکاح بھی صحیح ہوجاتا ہے اور اس تفویض معلق کی شرط بھی لاگو ہوجاتی ہے، جب کہ شوہر نے اسے قبول کرلیا ہو۔

البتہ ایک خاص بات کا اس جگہ خیال رکھا جائے چونکہ عورت ناقص العقل والدین ہوا کرتی ہیں اور اس میں دور اندیشی اور انجام سے بے خبری ایک امر مشاہد ہے اس لئے ایقاع طلاق کو مطلقاً اس کے قبضہ میں دے دینا خطرہ سے خالی نہیں ہوگا اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تفویض طلاق میں کوئی قید ایسی لگادی جائے جس سے یہ خطرہ نہ رہے، مثلاً نکاح کے وقت عورت کی طرف سے خود یا اس کا ولی یا وکیل یوں کہے کہ میں اپنے آپ کو یا میری مؤکلہ مسماۃ فلاں بنت فلاں کو تمہارے نکاح میں بمعاوضہ مہر پانچ ہزار روپے سکہ رائج الوقت کے اس شرط پر دے دیا کہ جس وقت اس کو تم سے کوئی تکلیف شدید پہنچے گی، جس کو فلاں فلاں (اس جگہ تقریباً دس آدمیوں کے نام بتراضی طرفین دونوں خاندانوں کے تحریر کئے جائیں) اشخاص میں سے کم از کم دو آدمی تسلیم کرلیں اور وہ دونوں آدمی طلاق کو بالاتفاق مناسب بھی سمجھیں تو اس کے بعد معاملہ میرے یا اس کے اختیار میں ہوگا (اس جگہ مرد کے لئے ایک مفید بات یہ ہے کہ وہ مہر معاف کرنے کی شرط لگالے) کہ اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر اس نکاح سے علیحدگی اختیار کرلے، اس صورت میں طلاق کا اختیار عورت کو اس وقت حاصل ہوگا جب کہ وہ دونوں آدمی بالاتفاق تکلیف شدید کو تسلیم کرلیں اور طلاق کو مناسب سمجھیں۔ (الحیلۃ الناجزۃ)

اب یہ کہ تفویض طلاق کی کتنی اور کیا کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟ تو اس سلسلہ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے ''الحیلۃ الناجزۃ'' میں تین صورتیں تحریر فرمائی ہیں:

> ''تفویض طلاق کی تین صورتیں ہیں، ایک یہ کہ نکاح سے قبل کابین نامہ مع شرائط لکھوالیا جائے اور نکاح کے وقت اس پر دستخط لے لئے جائیں دوسری صورت یہ کہ عین وقت عقد زبان سے کہلوالیا جائے، تیسری صورت یہ ہے کہ بعد نکاح ان شرائط کو لکھوا کر بعد میں دستخط حاصل کرلی جائیں''

اب پہلی صورت کے مفید اور معتبر ہونے کے لئے اس میں نکاح کی طرف اضافت ونسبت ضروری ہے، مثلاً یہ تحریر کیا جائے کہ اگر میں فلاں بن فلاں کے ساتھ نکاح کردوں اور پھر شرائط مندرجہ اقرار نامہ ہذا میں سے کسی شرط کے خلاف کروں تو مسماۃ مذکورہ کو اختیار ہوگا کہ اس وقت یا پھر کسی وقت چاہے اپنے اوپر طلاق بائن واقع کر کے نکاح سے الگ ہوجائے، اگر اس میں اضافت نہ ہو تو یہ شرط بے کار و بے فائدہ ہوگی۔

دوسری صورت کے صحیح ہونے کے لئے یہ شرط ضروری ہے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو (چاہے خود عورت یا اس کا وکیل ولی) عقد نکاح کے وقت تمام شرائط ذکر کرے اور شوہر کی جانب سے قبول ہو۔

ان مذکورہ صورتوں میں آسان صورت جس میں عوام کے مغالطہ میں پڑنے کا اندیشہ نہیں ہے، وہ صرف پہلی صورت ہے کہ عقد سے پہلے ہی ایسی

تحریر لکھوالی جائے، البتہ اس میں لازم یہ ہے کہ اضافت الی النکاح ضرور ہونا چاہئے، یعنی یہ الفاظ ضرور لکھوائے جائیں کہ اگر میں فلاں بنت فلاں سے نکاح کروں اور پھر فلاں فلاں شرائط کے خلاف کروں، اگر یہ اضافت نہ پائی گئی تو یہ تحریر کالعدم ہوگی

اب رہی بات ان شرائط کی جو تحریر میں ذکر کی جائیں تو اس سلسلہ میں اہل فہم وتجربہ کار، نیز قانون داں حضرات سے مشورہ کرلیا جائے، اوران سے یہ معلوم کرلیا جائے کہ یہ شرائط قانون میں معتبر ہیں یا نہیں، اور حسب صراحت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اس کابین نامہ کی رجسٹری بھی ہوجائے تو زیادہ بہتر ہے تاکہ بعد میں اس کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ بھی موضوع بحث نہ بن سکے۔

**آخری بات**...... کابین نامہ کی جو صورتیں ذکر کی گئیں ہیں ان پر عمل ان علاقوں میں جہاں پہلے سے نکاح کے وقت زوجین کو سیاہ جات دئے جاتے ہیں اور نکاح کا باضابطہ رجسٹرڈ ادارے منضبط ومنظم ریکارڈ رکھتے ہیں بہت آسان ہے، جیسے علاقہ مہاراشٹر وآندھرا پردیش وغیرہ اور اس کی ضرورت ملک کے ان مقامات پر زیادہ محسوس کی جارہی ہے جہاں سرے سے دارالقضاء کا کوئی باضابطہ نظم نہیں ہے، البتہ ملک کے وہ علاقے جہاں الحمد للہ دار القضاء قائم ہیں اور جو اصول شرعیہ کے مطابق مصروف خدمت ہیں، عام لوگوں کا کام ہے کہ وہ اپنے اس قسم کے مسائل جس میں قضاء قاضی شرط ہے اس کو وہیں لے جائیں، اور قاضی صاحب کے شرعی فیصلوں پر عمل پیرا ہوں۔

☆☆☆

# مہر کی زیادتی وکمی کی شرط پر نکاح

ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی

"النكاح لايبطل بالشروط الفاسدة" (المختصر القدوری مع حاشیۃ التنقیح الضروری ص ۱۶۴) کے تحت:

(الف) سوال نمبر (۱) اور (۲) کا نکاح پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا، بہرکیف عورت کا نفقہ مرد پر واجب ہوجاتا ہے۔

(ب) سوال نمبر (۳) ان شرائط سے نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، مگر لازم الایفاء ہیں۔

(ج) تفویض طلاق سے مصالح شرع ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، اس لئے اس کے ساتھ احتیاط کے طور پر مزید شرائط لگائی جاسکتی ہیں تاکہ بیجا تصرف نہ ہو۔

(۱) اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کا مہر بیس ہزار اور اس نے طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار ہے، کے سلسلہ میں طلاق کے واقعات کو روکنے کے لئے صاحبین کے قول کو فتوی کے لئے اختیار کیا جاسکتا ہے، "لأن كل واحد منهما مفيد فيصحان جميعا"۔

(شرح وقایہ حاشیہ الچلپی کتاب النکاح ۲۸/)

(۲) سوال نمبر دونوں شرطیں معتبر اور لازم العمل ہوں گی۔

(۳) اگر عورت نکاح کے وقت اپنے ہونے والے شوہر سے یہ شرط لگاتی ہے کہ شوہر اسے لگی ہوئی ملازمت سے نہ روکے گا، یا آئندہ کوئی مناسب ملازمت مل جائے تو شوہر ملازمت سے نہیں روکے گا، تو ہندوستان کے موجودہ اقتصادی اور سماجی مصالح کے پیش نظر شوہر کے لئے اس کی پابندی ضروری ہوگی، اور اگر عورت کی جملہ ضروریات پوری نہیں کی جاسکتیں، اس پر شوہر کے حکم کی تعمیل ضروری نہیں ہے۔

☆☆☆

# نکاح میں مقتضائے عقد کے موافق شرائط

مولانا نذر توحید مظاہری

۱۔ عقد نکاح میں کوئی ایسی شرط جس کا خود عقد مقتضی ہو، لگانے سے نکاح منعقد ہوجائے گا اور جائز ہوگا اور اس شرط کو بطور صراحت شمار کیا جائے گا۔

۲۔ نکاح میں کوئی ایسی شرط لگانا جو مقتضاء عقد کے منافی ہو تو شرط باطل اور نکاح منعقد ہوجائے گا۔

۳۔ عقد نکاح میں کوئی شرط لگانا جو نہ مقتضاء عقد کے مطابق ہو نہ منافی ہو، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہ کرے گا، یا بیوی کو اس کے آبائی وطن ہی میں رکھے گا تو ایسی شرط کی پاسداری شوہر پر لازم ہوگی۔ (ہدایہ ۱/۳۲۹)

(الف) دوسری قسم کی شرط لگانا شرعاً لغو ہے، اس طرح کی شرط لگانے سے نکاح منعقد ہوجاتا ہے اور ایسی شرط کا ایفاء متعلقہ فریق کے لئے لازم وضروری نہیں۔

(ب) تیسری قسم کی شرط معتبر ہے لازم الایفاء ہے اور عقد نکاح جائز ہے۔

(ج) عقد نکاح کے وقت عورت اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار مانگتی ہے اور شوہر اس کو تسلیم کرلے تو شرعاً ایسی شرط کو تفویض طلاق کہتے ہیں، تفویض طلاق کا مسئلہ حضرت تھانوی نے اپنی مشہور تالیف "الحلیۃ الناجزۃ" میں ذکر فرمایا ہے، سوال میں مذکورہ تمام شقوں کا تقریباً کافی وشافی جواب اس میں موجود ہے اس سلسلہ میں کابین نامہ کے مسودے تحریر فرمائے ہیں اور اس رسالہ پر تقریباً تمام علماء کی تصدیقات موجود ہیں اور مہریں بھی ثبت ہیں اس زمانہ کی رہنمائی کے لئے مسائل مذکورہ "الحیلۃ الناجزۃ" کافی ہیں، تاہم سوالات کے اجمالاً جوابات عرض ہیں۔

۱۔ عقد نکاح سے پہلے شرائط طے ہوجائیں اس میں شرط یہ ہے کہ اضافت الی النکاح ہو تو وہ تحریر شرعاً معتبر ہوگی۔ (الحیلۃ الناجزۃ ر ۳۱)

۲۔ عین عقد کے وقت اگر شرائط ذکر کئے جائیں تو صحیح اور معتبر ہونے کی شرط یہ ہے کہ ایجاب مشروط ہو اور قبول مطلق۔ (الحیلۃ الناجزۃ ر ۳۲)

۳۔ عقد نکاح کے بعد بھی مابین طرفین کوئی شرائط نامہ تحریر کی جاسکتی ہیں "الحیلۃ الناجزۃ" (۳۳) ہر سہ صورتوں کی شرائط وقیودات "الحلیۃ الناجزۃ" میں موجود ہیں۔

طلاق ایک ناپسندیدہ چیز ہے اور بعض ناگزیر حالات میں ایک ضرورت بھی ہے، لیکن اس کے غلط اور بے جا استعمال سے معاشرہ میں بڑی خرابیاں پیدا ہورہی ہیں، جن سے سارے خاندان والے اور میاں بیوی متاثر ہوجاتے ہیں، لہذا طلاق کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے اگر عقد نکاح کے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دیدی تو عورت کا مہر ایک لاکھ روپے اور طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار روپے، جزئیات فقہ کو دیکھتے ہوئے اس طرح مہر طے کرنا جائز اور معتبر ہوگا اور دونوں شکلوں میں مہر مسمی لازم ہوگا اور طلاق کے واقعات کو روکنے کے لئے اس مسئلہ کی نظیر صاحبین کے قول کو فتوی کے لئے اختیار کیا جائے۔

۲۔ اگر نکاح کرتے وقت شوہر نے منکوحہ کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی عورت سے نکاح کیا تو اس کا مہر ۳۰ ہزار روپے ہوگا اور نکاح نہ کیا تو پندرہ ہزار روپے ہوگا، اس صورت میں صاحبین کے قول کو اختیار کرتے ہوئے فتوی دیا جائے، اور ان کے قول کے مطابق شریعت میں دونوں شرطیں معتبر اور لازم العمل ہیں۔

۳۔ عورتوں کا یہ شرط لگانا کہ اسے شوہر ملازمت کرنے سے نہ روکے یا آئندہ ملازمت ہوجائے تو نہ روکے، اگر شوہر اس شرط کو قبول بھی کرلیتا ہے تو شرعاً اس کی کوئی حیثیت نہیں، عورت کو اگر شوہر اس کے بعد بھی سلسلہ ملازمت ختم کرنے کا حکم دیتا ہے، یا نئی ملازمت سے منع کرتا ہے تو عورت کو اس حکم کی تعمیل ضروری ہوگی، کیونکہ ملازمت کا اہم مقصد معاوضہ میں رقم حاصل کرنا ہے اور یہ چیز تزویج کے ذریعہ عورت کو حاصل ہے، چونکہ نفقہ وکسوہ ومہر شوہر پر لازم ہے، اگر شوہر نہ دے تو جبراً بذریعہ عدالت عورت کو حاصل کرنے کا اختیار ہے، اس لئے عورت کو ملازمت کی کوئی حاجت نہیں۔

☆☆☆

# ذمہ داریاں عائد نہ ہونے والے شرائط

مولانا محمد اختر قاسمی

(۱) ایسے شرائط جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی نئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ وہ بلا شرط کے بھی ضروری ہیں اور بعد شرط کے بدرجہ اولی ضروری ہیں (فتاوی دار العلوم جدید)۔

(۲) نکاح کے وقت ایسے شرائط لگانا جس کا مقصد نکاح میں خلل ڈالنا ہو تو ان بیہودہ شرائط پر عمل کرنا ضروری نہیں، ایسی شرائط کے ساتھ نکاح کرنے سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے، شرط باطل ہو جاتی ہے۔

"لا یبطل بالشروط الفاسدة" (شامی ۲؍ ۳۵۳) نکاح میں کوئی فساد اور بطلان نہیں آتا (امداد الفتاوی ۲؍ ۸۱۱) مشروط نکاح درست ہیں اگر چہ شرائط پورے نہ کرے۔

(۳) جو شرط خلاف شرع نہ ہو اس کو پورا کرنا واجب ہے اور جو خلاف شرع ہو اس کو پورا کرنا واجب نہیں، شوہر پر ان کو دیانتاً پورا کرنا ضروری ہے: "یا ایھا الذین آمنوا أوفوا بالعقود" (سورہ: مائدہ: ۱) (اے ایمان والو اپنے عہد کو پورا کرو) شوہر پر وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا، یہ الگ چیز ہے "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "أحق الشروط أن توفوا به" (الحدیث) اگر شرط عین ایجاب وقبول کے وقت پیش کی گئی اور پیش بھی لڑکی کی جانب سے کی گئی اور خاوند نے منظور کر لیا تو درصورت خلاف ورزی عورت کو اختیار رہے گا۔

اگر شروط قبل از نکاح پیش ہوئیں یا بوقت نکاح خود شوہر نے پیش کیں اور لڑکی کے اولیاء نے قبول کر لیا تو اس صورت میں خلاف ورزی کرنے پر کسی قسم کی طلاق نہیں پڑے گی۔ (فتاوی دار العلوم قدیم ۳؍ ۳۴۵)

(ج) عقد نکاح کے وقت طلاق دینے کا اختیار شوہر اپنی عورت کو دیدیتا ہے، یا کسی غیر کو دیتا ہے، جس کو اختیار دیا ہے اسے اختیار استعمال کرنے کا حق ہے۔ (کفایت المفتی ۶؍ ۲۱۶)

اور اپنی عورت کو اختیار دیا ہے تو اس سے رجوع نہیں کر سکتا۔ (شرح نقایہ ۲؍ ۳۳)

اور اگر عورت کے علاوہ کسی تیسرے کے ہاتھ میں اختیار طلاق دیدیا ہے تو اس سے رجوع کر سکتا ہے۔ (شرح نقایہ ۲؍ ۳۴)

اس لئے کہ یہ توکیل ہے اور توکیل سے اس کو علاحدہ کر سکتا ہے۔

(د) عورتوں پر شوہر کی اطاعت لازم ہے اور وہ عورت کے باہر نکلنے پر اور ملازمت کرنے پر پابندی لگا سکتا ہے اور شوہر پر عورت کا نفقہ اسی وقت لازم ہے جب کہ وہ فرمانبرداری کرے اور بغیر اس کے حکم کے گھر سے نہ نکلے۔ (شامی باب النفقة ۲؍ ۶۴۴)

جو عورت بلا کسی حجت شرعیہ کے مرد کی نافرمانی کرے، ساتھ سونا چھوڑ دے، یا سخت کلامی کرے یا ستر پردہ اور غیر محارم کے روبرو ہونے میں کہا نہ مانے، یا والدین کے گھر رہنا پسند کرے اور خاوند کے یہاں نہ آئے، اس عورت کو ناشزہ کہتے ہیں، اس کو نان ونفقہ دینا واجب نہیں۔ (تفسیر حقانی ۲؍ ۱۲)

☆☆☆

# شرائط کے ذریعہ خواتین کو اختیارات دینا

مولوی نوشاد عالم

ایسی شرائط جس کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی نئی ذمہ داری عائد نہ ہو، بلکہ عقد نکاح سے جو ذمہ داری عائد ہوتی ہو اس کو شرط کی صورت میں عقد نکاح کے وقت ذکر کر دیا گیا ہو تو ایسی شرائط لگانے سے کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ ایسی شرطیں عقد نکاح سے وجود میں آتی ہیں، چاہے اس کا تذکرہ ہو یا نہ ہو۔ (الشرح الکبیر ۷/۵۲۶)

بوقت عقد نکاح ایسی شرط لگائے جو مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی ذمہ داری کے خلاف ہو مثلاً شوہر نکاح کے وقت یہ شرط لگائے کہ بیوی کا نان ونفقہ اس کے ذمہ نہیں ہوگا، ایسی تمام شرطیں باطل ہو جائیں گی، اور نکاح منعقد ہو جائے گا، نیز جو تقاضے ہیں، فریقین پر اس کی تکمیل لازمی ہوگی۔ (المغنی لابن قدامہ ۷/۲۵۰)

بوقت عقد نکاح ایسی شرط لگانا جو مذکورہ دونوں صورتوں میں کسی شرط کے دائرے میں نہ آتی ہو مثلاً بیوی یہ شرط لگائے کہ اس کی موجودگی میں شوہر دوسری شادی نہ کرے گا، یا اس کو آبائی وطن سے باہر نہ لے جائے گا، ایسی شرطوں کا بھی شریعت میں کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ یہ محض ایک وعدہ ہے جس کی تکمیل شوہر پر لازم نہیں۔ (الشرح الکبیر ۷/۵۲۶)

ج: عقد نکاح کے وقت اگر عورت یہ شرط لگائے کہ اس کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، یا فلاں فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، اور شوہر اس شرط کو قبول بھی کر لیتا ہے، تو عورت کو اب طلاق کا حق ہو جائے گا، اور عورت کے اس اختیار کو ختم کرنے کا حق مرد کو نہ ہوگا، لیکن ضروری یہ ہے کہ شرط کی نسبت عقد نکاح کی طرف کی گئی ہو، ورنہ شرط کا اعتبار نہ ہوگا۔ (ردالمحتار ۲/۵۲۶)

## نکاح میں شرط کی تین صورتیں ہیں:

عقد نکاح سے قبل شرائط طے ہو جائیں اور اس کی تحریر پر طرفین کا دستخط ہو جائے، ایسی شرط اس وقت قابل قبول ہوگی جب اس کی نسبت ناکح کی طرف کی جائے اور بوقت نکاح اس کی توثیق کی جائے۔ (الردالمحتار ۲/۵۳۶)

دوسری صورت یہ ہے کہ بوقت نکاح شرط لگائی جائے، ایسی شرط کے صحیح ہونے کے لئے ضروری یہ ہے کہ شرط کی نسبت عقد کی طرف ہو، نیز اس میں لازمی چیز یہ ہے کہ ایجاب مشروط اور قبول مرد کرے، یعنی عورت شرط لگائے اور مرد اس کو قبول کرے، ورنہ شرط کا اعتبار نہ ہوگا۔ (الردالمحتار ۲/ ۵۳۶)

عقد نکاح کے بعد طرفین کی طرف سے کوئی شرائط نامہ تحریر کیا جائے، یہ شرط بھی قابل قبول ہے، لیکن چونکہ نکاح ہو چکا ہے شوہر کو تمام اختیارات حاصل ہو چکے ہیں اس لئے کسی بھی شرط کی تکمیل و توثیق کے لئے شوہر کی رضامندی ضروری ہے۔ (فتاوی ہندیہ ۶/ ۲۶۲)

لیکن چوں کہ عورت جلد باز ہے اس لئے تفویض کے ساتھ مزید احتیاط کے لئے کچھ قیدیں بڑھائی جائیں جو کہ مفید اور طلاق کا بے جا تصرف نہ ہو سکے۔ (الحیلۃ الناجزۃ / ۳۴-۳۵)

## قابل التفات پہلو:

دور حاضر میں عورتوں کے ساتھ ناروا سلوک کوئی مخفی چیز نہیں، اسلئے بوقت عقد نکاح ایسی شرط لگائی جائے جس سے شوہر کے مظالم میں کمی

ہو سکے، مثلاً بیوی یہ شرط لگائے کہ اگر طلاق دی گئی تو مہر ۱۵ ہزار، ورنہ دس ہزار، تو ایسی شرطیں اگر تکمیل کر دی گئیں تو مہر مسمی ہوگا، اور اگر اس کی تکمیل نہ کی گئی تو پھر صاحبین اور امام ابوحنیفہ کے مابین اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں مہر مثل لازم ہوگا لیکن صاحبین فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بھی مہر مسمی (۱۵ ہزار) ہی لازم ہوگا، فقہ کی کتابوں میں اس قسم کا جزئیہ موجود ہے، مثلاً بیوی یہ شرط لگائے کہ اگر اس کو آبائی وطن میں رکھے گا، تو مہر ۱۰ ہزار، ورنہ ۱۵ ہزار اسی طرح اور دوسری شرطیں۔

جہاں تک احقر کا ناقص خیال ہے کہ صاحبین کے قول کو ترجیح ہونی چاہئے، کیونکہ وقت وحالات میں تبدیلی اس کی متقاضی ہے، اور ضرورت بھی ہے، اس لئے کہ مرد کی طرف سے دی جانے والی طلاق کے طوفان میں کمی ہو سکتی ہے۔ (فتاوی قاضی خاں ۱ / ۳)

اگر بوقت نکاح بیوی یہ شرط لگائے کہ نکاح کے بعد اس کو سفر کرنے کا حق ہوگا، یا پھر اور کوئی دوسرے خلاف شرع کام کرنے کی اجازت ہوگی، اور شوہر کو روکنے کا قطعی اختیار نہ ہوگا، جسے شوہر قبول بھی کر لیتا ہے، تو یہ شرط بھی فاسد ہے، نکاح منعقد ہو جائے گا، اور ذکر کردہ شرطوں کی تکمیل مرد پر لازم نہ ہوگی۔

☆☆☆

# عقد نکاح کو نئی شرائط سے مؤکد کرنا

مولانا محمد شہباز عالم ندوی

## نکاح کے ذریعہ عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو مشروط کرنا:

زوجین کے درمیان رشتہ نکاح کی بنا پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور جس کا ادا کرنا ہر ایک کے ذمہ لازم ہے، شریعت کی جانب سے یہ متعین ہے، خواہ نکاح کے وقت ان ذمہ داریوں کا تذکرہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، محض نکاح کی وجہ سے وہ تمام تر ذمہ داریاں ادا کرنا از خود ضروری قرار دی جاتی ہیں، مثلاً شوہر کے ذمہ بیوی کا نفقہ واجب ہوتا ہے، خواہ شرط لگائی گئی ہو یا نہ لگائی گئی ہو، قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ اس کی مؤید ہے، ارشاد باری ہے:
"وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ"۔ (البقرة: ۲۳۳)

محض عقد سے یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے، جبکہ بیوی اس لائق ہے کہ وہ حقوق زوجیت ادا کرنے کی متحمل ہو، لہذا اگر اس قسم کی ذمہ داریوں کو مشروط کر دیا جائے تو اس کا پورا کرنا جس طرح پہلے ضروری تھا، یہ اب بھی ضروری رہے گا۔ (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۷ر ۵۴)

## فریقین اپنی ذمہ داریوں سے گریز کریں:

نکاح ایک معاہدہ ہے، اس کے ذریعہ زوجین میں سے ہر ایک پر کچھ ذمہ داریاں اور کچھ فرائض کا ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، ان میں سے کوئی بھی ان ذمہ داریوں سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا، اس لئے شریعت نے اپنی جانب سے ان ذمہ داریوں کو اس رشتہ کے قائم اور با مقصد بنانے کے لئے ضروری قرار دیا۔

لہذا اگر دونوں میں سے کوئی بھی اپنی ذمہ داریوں سے گریز کرنا چاہیں، تو اس سے آزاد نہیں ہو سکتے، مثلاً شوہر اس شرط پر نکاح کرتا ہے کہ نکاح کے بعد نان ونفقہ کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوگی اور عورت خود اپنی روزی کا انتظام کرے گی، تو اب شرط کے ساتھ مربوط نکاح کو تمام ارکان عقد پائے جانے کی وجہ سے درست قرار دیا جائے گا اور جو شرط لگائی گئی ہے، وہ لغو ہوگی، اس لئے کہ شریعت کی جانب سے عقد نکاح ان ذمہ داریوں کے ساتھ مربوط ہے، ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا کہ عقد تو ہو جائے اور نفقہ کی ذمہ داری سے بری ہو۔ (فتاوی الہندیہ ۱ر ۳۰۹)

امام نوویؒ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ (دیکھئے: المجموع شرح المہذب ۱۸ر ۱۸)

لہذا جب ایجاب وقبول کی بنا پر عقد درست ہو گیا تو اب اس کے منافی شرائط کا بالکل اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ (عنایۃ علی الفتح ۳ر ۳۰۴ باب المہر)

اگر احکام شریعت کے موافق شرائط لگائے گئے تو پورا کرنا درست ہے، ورنہ شرط باطل اور عقد درست قرار پائے گا۔

## نئی ذمہ داری کی شرط لگانا:

زوجین میں سے کسی ایک کی جانب سے ایسی شرط لگانا جو نکاح کی ذمہ داری میں سے نہ ہو، بلکہ اگر نکاح کے وقت اس کا تذکرہ نہ ہوتا تو یہ حق حاصل نہ ہوتا، اگر اس طرح کی شرط عقد نکاح کے وقت لگائی جائے تو اس سے نکاح پر کچھ اثر نہیں پڑے گا اور نکاح ہو جائے گا

لیکن اگر اس میں شریعت کی جانب سے کسی امر مشروع کا انکار لازم آ رہا ہے اور اپنے اوپر ایسی چیز کو حرام قرار دینا لازم آ رہا ہے، جس کو اللہ تعالی نے حلال قرار دیا ہے، شریعت کی جانب سے اس کی اجازت نہیں ہے کہ جس چیز کو مشروع کیا گیا ہو اور بندہ اسے اپنی طرف سے قید وبند لگا کر حرام

قرار دے، چنانچہ سورہ تحریم میں ہے۔

لم تحرم ما أحل الله لك۔ (سورۃ تحریم: ۱)

لہٰذا ایسی شرطوں سے نکاح میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور اس کو پورا کرنا بھی شوہر کے لئے لازم وضروری نہیں ہوگا۔

صاحب ''عنایہ'' نے وضاحت کی ہے کہ امر مشروع کو اپنے اوپر ممنوع کرنا، چونکہ ایک اعتبار سے شریعت سے ٹکراؤ کی صورت پائی جاتی ہے، اس لئے یہ درست نہیں ہوگا اور عقد نکاح درست ہوگا۔ (عنایہ علی الفتح ۳/۲۳۱)

بعض فقہاء کرام اس کی اجازت دیتے ہیں کہ جب شوہر نے شرط قبول کرلی، اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کرے گا، یا اپنے آبائی وطن سے باہر نہ لے جائے گا، تو اب اس کو قبول کر لینے کے بعد اس کا پورا کرنا ضروری ہوگیا، چونکہ نکاح دوسرے عقود کی طرح شرط فاسد سے ختم نہیں ہوتا، لہٰذا جب معاملہ درست ہوگیا تو اس شرط کو بھی درست قرار دیں گے جس سے زوجین میں سے کسی ایک کو نفع حاصل ہو رہا ہے۔ (فقہ السنۃ ۲/ ۴۷)

لیکن چونکہ اس سے امر مشروع کو اپنے اوپر ممنوع وحرام قرار دینا لازم آرہا ہے جو درست نہیں ہے، لہٰذا امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے قول کو ترجیح حاصل ہوگی، اور اگر کسی امر مشروع کو حرام قرار دینا لازم آتا ہو پھر ایسی شرط کی پابندی میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے۔

☆☆☆

# مشروط نکاح کی شرعی حیثیت

مولانا انور حسین چترا وی

عقد نکاح کے ساتھ عائد کردہ شرطوں کی تینوں قسموں کے جوابات نقل کئے جارہے ہیں۔

ایسی شرط جس کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی نئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ نفس عقد نکاح سے ہی وہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس کو شرط کی صورت میں عقد نکاح کے وقت ذکر کردیا گیا تھا، مثلاً بیوی کا یہ شرط لگانا کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا، یہ بیوی کی طرف سے ایسی شرط ہے جو بغیر ذکر کئے بھی شوہر کے ذمہ لازم ہوتا ہے، ایسی شرط لگانا اور نہ لگانا برابر ہے، چونکہ عدم شرط کی صورت میں بھی یہ حق شوہر پر شرعاً لازم ہوتا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا: "لینفق ذوسعة من سعته" اور دوسری جگہ "وعلی المولود له رزقهن و كسوتهن بالمعروف" اور رزق وکسوت دو ہی صورت میں ہے، ایک بعد نکاح، جبکہ بیوی اپنے اوپر شوہر کو قدرت دیدے دوسرا عدت میں۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور فقہاء کرام کے آراء سے استفارہ کے بعد یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ زوجات کا نفقہ شوہروں پر شریعت نے لازم کیا ہے، لہذا ہر حال میں شوہر پر لازم ہوکر رہے گا، شرط اس کی لگائی جائے یا نہ لگائی جائے۔ (تفصیل کے لئے: المغنی لابن قدامہ ۷/ ۵۶۳، البحر الرائق ۴/ ۱۸۸ کا مطالعہ مفید ہوگا)

(۲) نکاح کے وقت کسی فریق کا ایسی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، مثلاً شوہر کا نکاح کے وقت یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں ہوگا، یہ ایسی شرط ہے جس سے قرآن وحدیث کے حکم کا تغیر لازم ہوتا ہے اور ہر ایسی شرطیں جو اللہ ورسول کے حکم کو بدل ڈالتی ہوں باطل اور فاسد ہیں، البتہ نکاح صحیح ہوجائے گا اور اس پر نفقہ بھی واجب ہوگا، چنانچہ (زاد المعاد فی ہدی خیر العباد ۲/ ۱۷۶، ۲/ ۱۷۷) پر قاعدہ بیان کی گیا کہ انہی شرطوں کو پورا کرنا ہوگا، جو تغیر حکم اللہ ورسولہ نہ ہو۔

الحاصل عدم وجوب نفقہ یا کوئی بھی ایسی شرط جس سے شرعاً لازم کردہ چیزوں سے گریز ہو فاسد ولغو ہوں گی، اور نکاح صحیح ہوگا، اور ایسی چیزوں کا لزوم بھی برقرار رہے گا، جیسا کہ اس جگہ کہ بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمہ رہے گا۔

تیسری قسم نکاح کے وقت کسی فریق کا کوئی ایسی شرط عائد کرنا جو (۱) اور (۲) میں سے کسی کے دائرہ میں نہیں آتی ہے، اس کے نتیجہ میں کسی فریق کو ایسا حق حاصل ہوتا ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں حاصل نہیں ہوتا، اور دوسرے فریق پر ایسی پابندی یا ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو غیر مشروط نکاح کی صورت میں عائد نہ ہوتی ہو، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہ کرے گا یا بیوی کو اس کے آبائی وطن سے نکال کر کسی اور جگہ نہیں لے جائے گا، بلکہ وہیں رکھے گا، یہ تمام شرطیں فاسد ہیں، البتہ نکاح صحیح ہوجائے گا، چونکہ شروط فاسدہ سے نکاح فاسد نہیں ہوتا، بلکہ نکاح صحیح ہوجاتا ہے، اور وہ شرطیں لازم الایفا نہیں ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ ان شروط فاسدہ سے نکاح کی صحت پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا، اور نہ یہ لازم الایفاء ہوں گی، بلکہ نکاح اپنی جگہ صحیح وسالم منعقد ہوجائے گا۔ (حلیۃ العلماء فی معرفۃ مذاهب الفقہاء ۶/ ۴۴۹، ہدایہ ۱/ ۱۵۱)

☆☆☆

# فریقین کا تقاضۂ عقد کے مطابق شرط لگانا

مولانا محمد شہاب الدین سبیلی

## نکاح میں لگائی جانے والی شرطیں:

زوجین میں سے کسی نے ایسی شرط لگائی جس سے فریقین پر نئی ذمہ داری عائد نہ ہوتی ہو، بلکہ عقد نکاح ہی سے وہ حقوق وفرائض فریقین پر لازم ہوجاتے ہوں، یا نئی ذمہ داری تو عائد ہورہی ہو، مگر ان شرائط کو شریعت مقتضیات عقد کے خلاف نہیں سمجھتی ہے، مثلاً شوہر کہتا ہے کہ میں اس شرط پر نکاح کررہا ہوں کہ میری بیوی کا رہنا سہنا میرے ساتھ ہی ہوگا، یا پھر عورت اس شرط پر نکاح کرے کہ اس کے قیام گاہ کا انتظام شوہر کرے گا، اور اس کا خاوند حسن معاشرت یا اچھا برتاؤ کرے گا تو متذکرہ تمام شرطوں سے نکاح میں کوئی خرابی نہ آئے گی، اور صورت بالا میں جانبین سے لگائی گئی شرائط بھی واجب العمل ہوں گی، صاحب ''فقہ السنہ'' فرماتے ہیں:

''وہ شرطیں جو مقتضیات عقد اور مقاصد نکاح میں داخل ہوں ان کا پورا کرنا واجب ہے، لیکن اس شرط پر کہ وہ اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں، جیسے حسن سلوک، نان ونفقہ اور معقول لباس وپوشاک کی شرط لگانا، اسی طرح یہ شرط لگانا کہ شوہر حقوق زوجیت کی ادائیگی میں تقصیر نہیں کرے گا، دوسری بیویوں کی طرح اس کے لئے بھی دن متعین کرے گا، اور شوہر یہ شرط لگائے کہ محترمہ گھر سے بلا اجازت باہر نہیں جائے گی، نافرمانی نہیں کرے گی، بلا اجازت نفلی روزہ نہیں رکھے گی، کسی اجنبی کو بلا اجازت گھر نہیں بلائے گی، یا یہ شرط لگانا کہ اس کے مال میں اجازت کے بغیر تصرف نہیں کرے گی، اسی طرح دوسری شرطیں''۔ (فقہ السنہ ۶ / ۴۷۔۴۷)

میاں بیوی عقد نکاح میں باہمی مشورہ سے ایسی شرائط آپس میں طے کرلیں جن میں مذہبی اعتبار سے قباحت پائی جاتی ہو، یا کوئی فریق نکاح کے وقت ایسی شرط لگائے جس کا منشاء اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریوں سے گریز ہو، مثال کے طور پر شوہر بیوی کے قیام گاہ کا انتظام اپنے ذمہ لینے سے انکار کرے، یا شوہر اپنی بیوی کو نان ونفقہ فراہم نہ کرنے کی شرط پر نکاح کرے، تو ان شکلوں میں شوہر کی لگائی ہوئی شرطوں کا اعتبار نہیں ہوگا، اور شوہر پر قیام گاہ کا انتظام، نان ونفقہ کی فراہمی لازم ہوگی، کیونکہ صورت مذکورہ میں شوہر اپنی بنیادی ذمہ داریوں سے گریز کررہا ہے، جبکہ یہ عمل شرعی ہدایات کے سراسر خلاف ہے، ہاں عقد نکاح کی صحت پر اس طرح کی ناقابل اعتناء شرائط کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، عقد نکاح اپنی جگہ بالکل صحیح ہوگا، اور ان شرائط کی پابندی متعلقہ فریق کے لئے غیر ضروری رہے گی، اس سلسلہ میں فقہاء کی صراحت موجود ہے۔ (الاحکام الفقہیہ ۲ / ۳۱۷)

عقد نکاح کی متقاضی شرائط جیسے عورت کا شرعی موانعات سے عاری ہونا، تو اس قسم کی شرطیں واجب العمل ہیں، لیکن وہ شرطیں تقاضۂ عقد کے خلاف ہوں تو وہ لغو اور ناقابل عمل ہوں گی، مگر نفس عقد درست ہوگا۔

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں کہ اگر شوہر نے عورت کا مہر متعین نہیں کیا، یا مہر ادا کرنے سے انکار کردیا اور عورت شوہر کے عمل پر ناراضگی کا اظہار بھی کرتی ہے، پھر بھی مہر مثل شوہر کے ذمہ لازم ہوجائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے عورت کو مہر معاف کردینے کا حق، مہر کے طے پاجانے یا ثابت ہوجانے کے بعد دیا ہے اور اس شکل میں عقد نکاح کے وقت مہر کا وجوب ہی ساقط ہورہا ہے، جبکہ نفس مہر کا وجوب فریقین کی اتفاق رائے سے ختم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ (البحر الرائق ۳ / ۱۵۰)

اگر شوہر مہر متعین نہ کرے یا مہر دینے سے انکار کردے، تو عورت کے لئے مہر مثل ہوگا، اس لئے کہ یہ حق شرعی ہے، ہر حالت میں عورت کا حق

ہے، لہذا عورت شوہر کو بری الذمہ کرسکتی ہے لیکن مہر کی نفی نہیں کرسکتی ہے۔ (وضاحت کے لئے: فقہ السنۃ ۲/ ۳۷ دیکھنا مفید ہوگا)

بعض شرطیں ایسی ہیں جن کو عقد کے درست ہونے کے باوجود پورا کرنا واجب نہیں اور اس قسم کی شرائط تقاضہ عقد کے خلاف ہوتی ہیں، مثلاً نفقہ یا جائز جنسی تعلقات کو قطع کرنے کی شرط عائد کرنا، یا شوہر یہ شرط لگائے کہ عورت نکاح کے بدلے کچھ دے گی، یا یہ کہے کہ ہفتہ میں ایک ہی شب بیوی کے پاس قیام کرے گا، یا شوہر یہ شرط لگائے کہ وہ بیوی کے پاس دن میں رہے گا، یہ ساری شرطیں باطل ہیں، اس لئے کہ یہ تمام شرائط تقاضہ عقد کے منافی ہیں۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی زیر بحث مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''فقہاء کرام نے ان شرطوں کی صحت پر اتفاق کیا ہے جو تقاضاء عقد میں داخل ہیں، اور ان شرائط کو باطل قرار دیا ہے جن سے مقاصد نکاح فوت ہوتے ہوں، یا مذکورہ شرطیں احکام شریعت کے خلاف ہوں''۔ (الفقہ الإسلامی وأدلتہ ۷/ ۵۹)

## تیسری قسم کی شرائط کا حکم

اگر زوجین ایسی شرطیں لگائیں جن سے شرعی مصالح کے ضائع ہونے کا اندیشہ تو نہیں ہے، البتہ متذکرہ شرطوں کے باعث شوہر و بیوی پر ایسی ذمہ داریاں عائد ہورہی ہوں کہ غیر مشروط نکاح کی صورت میں ایسی پابندیاں لازم نہیں آتی ہیں، مثلاً عورت کا یہ شرط لگانا کہ مرد اس کی موجودگی میں دوسرا عقد نہیں کرے گا، یا وہ اپنی بیوی کو آبائی وطن سے نہیں لے جائے گا، یا وہ اپنے شوہر کے ساتھ اسفار نہیں کرے گی، مذکورہ تمام صورتوں میں عورت کی شرائط شوہر کے لئے لازم الایفاء نہیں ہیں، شوہر کو بھرپور اختیار ہے وہ چاہے تو بیوی کے مطالبات پورا کرے، یا بیوی کے منشاء کی تکمیل نہ کرے، یعنی بیوی کی عائد کردہ ساری شرطیں شوہر کے لئے ناقابل اعتناء ہوں گی اور نکاح کا انعقاد عمل میں آجائے گا۔

''ایسی شرائط جو عورت کے حق میں نفع رساں اور فائدہ بخش ہوں، جیسے عورت یہ شرط لگائے کہ وہ گھر سے باہر نہیں نکلے گی، وہ اسی شہر میں رہے گی، وہ اسفار میں شوہر کے ساتھ نہیں جائے گی، شوہر اس کی موجودگی میں نیا نکاح نہیں کرے گا، اسی قسم کی اور دوسری شرطیں، تو علماء نے لکھا ہے کہ یہ عقد نکاح صحیح ہوگا، اور مذکورہ شرطیں لغو قرار دی جائیں گی، شوہر کے لئے یہ شرطیں واجب الایفاء نہیں ہوں گی، یہ مذہب حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور بہت سارے دوسرے مقتدر علماء کرام کا ہے''۔ (فقہ السنۃ ۲/ ۴۷)



# نکاح میں نفقہ، سکنی اور کسوہ کی شرط لگانا

مولانا محمد عارف مظہری

ایسی شرائط جن کے ذریعہ کسی فریق پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ خود عقد نکاح سے ہی وہ لازم ہوجاتی ہیں، ان کے ذکر سے نکاح صحیح ہوگا اور ان شرائط کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، کیونکہ نفقہ، سکنی اور کسوہ جیسی ذمہ داریاں خود ہی منجانب شرع شوہر پر لازم ہیں، فرمان خداوندی ہے:

''وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ'' (سورہ بقرۃ:۲۳۳)

(بچے کے والد پران کی ماں کا نفقہ اور کسوہ رواج کے مطابق واجب ہے)۔

اور ''وَاَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ'' (سورۃ طلاق:۶)

(بیویوں کو بھی وہیں رکھو جہاں تم رہتے ہو)۔

اسی نان ونفقہ کے مسئلہ میں اگر عورت یہ شرط لگائے کہ شوہر اس پر ماہانہ سو دینار بطور نفقہ خرچ کرتا رہے گا، تو امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ایسا نکاح جائز ہوگا، اور عورت کو رواج کے مطابق نفقہ ملے گا۔ (قاضی خاں علی ہامش الھندیہ ۱/۳۳۱ فصل فی النکاح علی الشرط)

## کسی ذمہ داری سے گریز کی شرط:

نکاح کے وقت ایسی شرط لگانا جس کا مقصد نکاح سے پیدا ہونے والی کسی ذمہ داری سے گریز ہو، مثلاً شوہر کا یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان ونفقہ اور مہر اس کے ذمہ نہیں ہوگا، اور اس طرح کی شرطوں سے نکاح فاسد نہیں ہوگا اور شرط کالعدم قرار پائے گی، بیوی یا شوہر میں سے کسی نے یہ شرط لگائی کہ مرنے کے بعد ان میں کا کوئی دوسرے کا وارث نہیں ہوگا۔

علامہ فخر الدین قاضیؒ فرماتے ہیں:

''کسی آدمی نے ایک عورت سے اس شرط پر شادی کی کہ نہ ہی بیوی وارث ہوگی اور نہ وہ بیوی کا وارث ہوگا، تو یہ نکاح جائز ہوگا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے'' (فتاوی قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ۱/۲۳)

''فتاوی ہندیہ'' میں ہے:

''کسی آدمی نے ایک عورت سے ایک ہزار مہر پر شادی کی، اس شرط کے ساتھ کہ وہ نفقہ نہیں دے گا اور اس عورت کا مہر سو ہے تو عورت کو مہر کے ایک ہزار اور نفقہ بھی ملے گا'' (فتاوی ہندیہ ۱/۳۰۹)

اسی طرح شوہر نے اگر یہ شرط لگادی کہ نکاح میں مہر کا کوئی تذکرہ نہیں ہونا چاہئے تو اس طرح کی شرط کے بارے میں صاحب ''مجمع الانہر'' شیخ محمد بن سلیمانؒ فرماتے ہیں:

''وكذا مع نفيه أي يصح النكاح مع نفي المهر ويكون النفي لغوا'' (مجمع الانهر:۱)

☆☆☆

# مباح اور قابل ایفا شرائط لگانا

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

(۱) وہ شروط جو بالاتفاق مقتضیات عقد میں سے ہوں، مثال کے طور پر عورت کا بوقت نکاح یہ شرط لگانا کہ اس کا نان ونفقہ، کپڑا اور مکان وغیرہ شوہر کے ذمہ ہوگا ان شروط کا ایفاء شوہر کے ذمہ بالاتفاق واجب ہوگا، چنانچہ فقہ السنۃ میں ہے:

''بعض شرطیں وہ ہیں جن کا ایفاء شوہر کے ذمہ واجب ہوتا ہے، یہ وہ شرطیں ہیں جو مقتضاء عقد میں سے ہوں اور اس طرح کی شرطیں لگانا، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے خلاف نہ ہوں گے، جیسے عورت کی طرف سے اچھا سلوک، نفقہ، مکان اور کپڑا کی شرطیں لگائی جائیں اسی طرح یہ شرط لگائی جائے کہ شوہر اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرے گا، اس کا مال غیر کی طرح بے دریغ تقسیم نہیں کرے گا، اسی طرح شوہر کی طرف سے یہ شرط لگانا کہ عورت بدون اس کی اجازت گھر سے نہیں نکلے گی، اس کے سامنے نازیبا حرکت نہیں کرے گی، نفلی روزہ اس کی اجازت کے بغیر نہیں رکھے گی، اور اس کی رضا کے بغیر اس کے مال میں بے جا تصرف نہیں کرے گی اور اسی طرح دوسری شرط لگائے۔ (فقہ السنۃ ۲/ ۲۶)

اس طرح کی شرائط کی پابندی فریقین میں سے ہر ایک کو لازم ہوگی، جیسا کہ فقہ السنہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے، نیز قرآن میں ہے:

''ولھن علیکم رزقھن وکسوتھن بالمعروف، لینفق ذوسعة من سعته''۔ (سورۃ طلاق: ۷)

(اور ان کے لئے تم پر عمدہ کھانا اور اچھا کپڑا فرض ہے، چاہئے کہ خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق)۔

(۲) وہ شروط جو عقد کے منافی ہوں جیسے شوہر کا یہ شرط لگانا کہ بیوی کا نان ونفقہ اور مہر اس کے ذمہ نہیں ہوگا، اسی طرح عورت کا شرط لگانا کہ شوہر سوتن کو طلاق دیدے، اس طرح کے شرطوں کی پابندی فریقین میں سے کسی پر واجب نہیں ہوگی، اس لئے کہ اس طرح کی شرط لگانا باطل ہے، لیکن نکاح صحیح ہو جائے گا، اس کی وجہ سے عقد نکاح پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا، چنانچہ علامہ زحیلی رقم طراز ہیں:

''شروط باطلہ کا ایفاء صحیح نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ نکاح صحیح ہو جائے گا اور وہ شرط یہ ہے کہ شوہر کی جانب سے ایسی قید لگائی جائے کہ جو نظام شرعی کے منافی ہو، جیسے عدم مہر یا انفاق کی شرط لگانا۔ (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۷/ ۶۲)

نیز سید سابق لکھتے ہیں:

''بعض وہ شرط ہے جس کی تکمیل واجب نہیں ہوتی ہے، لیکن عقد صحیح ہو جاتا ہے اور وہ شرط عقد کے منافی ہوتا ہے، جیسے ترک انفاق اور عدم وطی کی شرط لگانا، اور اسی طرح عورت کے لئے مہر نہ ہونے کی شرط لگانا، پس یہ تمام شرطیں باطل ہیں، اس لئے کہ یہ عقد کے منافی ہیں، اور اس لئے بھی کہ وہ شرطیں عقد کے ذریعہ واجب ہونے والے حقوق کے اسقاط کو لازم ہوتی ہیں انعقاد عقد سے پہلے، لہذا صحیح نہیں، لیکن عقد صحیح ہو جائے گا، اس لئے کہ ان شرطوں کی وجہ سے عقد نکاح میں ایک امر زائد کا اضافہ ہوتا ہے جس کا بیان کرنا ضروری بھی نہیں، لہذا نکاح باطل نہیں ہوگا، جیسا کہ نکاح میں حرام چیز کی تعیین مبطل نکاح نہیں۔ (فقہ السنۃ ۲/ ۴۷، المغنی لابن قدامہ ۷/ ۲۷، الروض المربع ۱/ ۳۴۱)

اسی طرح عورت کے لئے جائز نہیں کہ سوتن کے طلاق کی شرط لگائے، چنانچہ اس کی ممانعت حدیث سے ثابت ہے۔ (فتح الباری ۹/ ۲۱۹)

نیز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے:

''لا تشترط المراۃ طلاق أختها''

(عورت بوقت نکاح اپنی بہن کے طلاق کی شرط نہ لگائے)۔

(۳) کچھ شرطیں ایسی ہیں جو صرف عورت کے حق میں ہیں، جیسے عورت کی طرف سے یہ شرط لگانا کہ اس کا شوہر اس کے گھر یا اس کے شہر سے دوسری جگہ منتقل نہیں کرے گا، یا عورت کو اپنے ساتھ سفر میں نہیں لے جائے گا، اسی طرح یہ شرط لگانا کہ اس کے ہوتے ہوئے دوسرا نکاح نہیں کرے گا، ان شرطوں کے پورا کرنے کے بارے میں فقہاء کے یہاں قدرے اختلاف ہے، ائمہ ثلاثہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی) کے یہاں اس قسم کی شرطیں لگانے سے نکاح صحیح ہوجائے گا اور شوہر ان شرطوں کے پورا کرنے کا پابند نہیں ہوگا، بلکہ یہ شرطیں ختم ہوجائیں گی، ان حضرات کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان اپنے شروط (پابند) پر ہوتے ہیں، مگر ایسی شرط نہ ہو جو حرام کو حلال اور حلال کو حرام کردے''۔

اس لئے ایسی شرط لگانا درست نہیں، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

''کل شرط لیس فی کتاب اللّٰہ فهو باطل وإن کان مأة'' (فقه السنة ۲۔ ۴۷، حلیة العلماء ۶۔ ۴۴۹)

(جو شرط کتاب اللہ میں نہ ہو وہ باطل ہے گرچہ سو ہی کیوں نہ ہو)۔

امام احمدؒ وغیرہ کے یہاں شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہوگا، عدم ایفاء کی صورت میں عورت کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہوگا، ان کا مستدل عقبہ بن عامرؓ کی روایت ہے۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شرطوں میں سے زیادہ ایفاء کے قابل وہ شرط ہے جس کے ذریعہ تمہارے لئے فرج حلال ہو''۔

حدیث میں وہ شروط مراد ہیں جو مقتضاء عقد میں سے ہیں، چنانچہ علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

''امام شافعیؒ اور اکثر علماء نے فرمایا کہ یہ حدیث محمول ہے ایسی شرطوں پر جو مقتضاء نکاح کے منافی نہیں، بلکہ مقتضیات عقد میں سے ہیں، جیسے اچھا سلوک اور نفقہ کی شرط لگانا۔ (عون المعبود ۶/۱۷۷، فتح الباری ۹/۲۱۸)

☆☆☆

# تفویض طلاق کا مسئلہ

مولوی محمد مجتبیٰ مظاہری

جس طرح انسان خود سے یا دوسرے کو وکیل بنا کر عورت کو طلاق دیتا ہے، اسی طرح شریعت نے اس کو بھی جائز قرار دیا ہے کہ شوہر عورت کو اپنے اختیار طلاق کا مالک بنا دے جیسا کہ علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

''لأن الزوج مالك لأمرها فإنما يملكها بهذا اللفظ ماهو مملوك فيصح عنه ويلزم حتى لايملك الزوج الرجوع عنه''۔ (المبسوط ۶-۲۲۱)

اس مسئلہ کے اثبات کے لئے ذیل میں "يايها النبي قل لأزواجك إن كنتن تردن الحيوٰة الدنيا وزينتها فتعالين امتعكن وأسرحكن سراحا جميلا" (سورۂ احزاب: ۲۸) کے پیش کرنے میں علماء کا زبردست اختلاف ہے اور قول اصح بھی یہی ہے کہ حدیث میں تفویض کا ذکر نہیں، جیسا کہ علامہ زیلعیؒ نے نصب الرایہ (۳ ص ر ۲۳) پر اٹل فیصلہ فرمایا ہے:

''وهذا (أى إثبات التفويض بهذه الآية) غير ظاهر، لأنه عليه السلام لم يخيرها فى إيقاع الطلاق بنفسها وإنما خيرها على أنها اختارت نفسها أحدث لها طلاقا لقوله تعالى فتعالين امتعكن الخ''

البتہ از روئے آثار واحادیث وقواعد فقہ اس کا ثبوت بالیقین ہے، جیسا کہ مصنف عبدالرزاق ابن ابی شیبہ میں اس کی تفصیل موجود ہے، لہٰذا اب یہ اعتراض نہ رہا کہ طلاق کا حق تو شوہر کو ہے پھر عورت کی طرف منتقل کیوں ہو جاتا ہے؟ جواب واضح ہے کہ ایک اجماعی مسئلہ ہے، نیز اس میں عورت کی طرف علی الاطلاق ملک کا انتقال نہیں ہے، بلکہ ملکیت میں شرکت ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ تفویض کے بعد شوہر کو طلاق دینے کا اختیار رہتا ہے۔

بہر حال یہ تفویض یا تو مطلق طلاق کا اختیار دینا یا شرائط کے ساتھ طلاق کا حق حاصل ہونے کا نام ہے ہر دو شکلیں جائز ہیں، آنے والی دوسری صورت میں صورت تفویض کا زبان سے کہنا ضروری ہے اور بقیہ دو صورتوں میں کہنے لکھنے دونوں کا اختیار ہے

چنانچہ اس سلسلہ میں ائمہ فقہاء کی عبارات سے تین صورتیں مستفاد ہوتی ہیں کہ یا تو تفویض قبل از نکاح ہوگی یا بوقت عقد، یا نکاح کے بعد تفویض کا معاملہ پیش آئے گا، ہر ایک کی تفصیل حسب ذیل ہے:

صورت اول اور ثانی میں کچھ شرائط وقیود ہیں، مناسب ہے کہ ہر دو صورتوں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

**صورت اول:** اس میں یہ ضروری ہے کہ نکاح اگر نہ ہوا ہو، لیکن نکاح کی طرف اضافت ونسبت کی جائے، مثلاً یہ کہ فلاں بنت فلاں کے ساتھ نکاح ہوا تو مطلقاً یا فلاں شرائط کے تحت اسے اختیار حاصل ہوگا۔ (ردالمحتار ۲ ر ۴۹۴)

**صورت ثانی:** اس میں شرط یہ ہے کہ اولاً نکاح میں ایجاب عورت ہو کی جانب اور اسے جو شرائط لگائی ہو اس کا تذکرہ ایجاب کے ساتھ کرے، پھر مرد قبول کرے، ورنہ اگر مرد کی جانب سے ایجاب ہو اور بعد میں لڑکی والے کی جانب سے مطلقاً یا شرائط کے ساتھ تفویض کا تذکرہ ہو تو یہ معتبر نہیں۔ (ردالمحتار ۲ ر ۲۸۵)

البتہ اگر عورت کی جانب سے ایجاب ہو جس میں تفویض کا تذکرہ نہ ہوا ہو اور مرد نے اپنی جانب سے قبول کے ساتھ تفویض کی زیادتی کر دی، تب بھی یہ تفویض صحیح ہوگی

**صورت ثالث:** نکاح کے بعد تفویض کے سلسلہ میں کوئی شرط نہیں ہے، بالکل درست ہے۔

البتہ یہ یاد رہے کہ صورت اول پر حضرت علیؓ وابن عمرؓ وغیرہ کی روایت ''لاطلاق قبل النکاح'' (ابن ماجہ ۱ر ۱۴۸، ترمذی ۱ر ۱۴۰، مستدرک حاکم ۲ر ۵۴۴، نصب الرایہ ۳ر ۲۳۰) سے اشکال نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ اس صورت میں اگرچہ قبل النکاح طلاق کے واقع ہونے کی نفی کی گئی ہے، جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے:

''إنها محمولة على نفي التخيير، لأنه هو الطلاق أما المعلق به فليس به'' (مرقات ۳۔۴۷۷)

**ضروری نوٹ:** فقہاء امت نے اپنی خداداد بصیرت کے تحت ہر دو فریق کی رعایت فرمائی ہے، جہاں مرد کا لحاظ کیا وہاں عورت کی حاجت روائی فرمائی کہ وہ شوہر کی ظالمانہ زیادتی اور وحشیانہ برتاؤ کی بنیاد پر فسخ عن القضاء حاصل کرتے ہوئے گلو خلاصی کر سکتی ہے، تا کہ مظلومانہ زندگی سے نجات حاصل ہو، لیکن بایں ہمہ عورت کو بھی علی الاطلاق اس چیز کی اجازت نہ دینے کو بیان فرمایا، جس کی صورت یہ ہے کہ تفویض کے وقت کوئی پابندیاں ہو، ورنہ اپنے نفسیاتی جذبات کے تحت معمولی بات پر تفریق کرلے گی جس سے شریعت کا مقصد اصلی فوت ہونے کا اندیشہ ہے، لہذا تفویض میں مناسب قیود کا ضرور اضافہ ہونا چاہئے، مثلاً یہ کہ عورت کو فلاں فلاں تکلیف پہنچنے پر طلاق کا اختیار رہے گا، جس کی مصیبت وتکلیف ہونے کی گواہی فلاں فلاں کم از کم دو آدمی دیں تو ایسی صورت میں عورت اپنی مظلومیت سے بھی محفوظ رہے گی اور انسداد طلاق کا مقصد شرع بھی برقرار رہے گا، اسی لئے حضرت تھانویؒ نے ''الحیلۃ الناجزۃ'' کے (صفحہ ۳۵) پر مستقل ضروری مشورہ کا عنوان قائم فرمایا، جس کا اپنانا از حد ضروری ہے۔

اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ متعدد آدمیوں کی مشیت پر معاملہ کو چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے شرعاً اس کی اجازت ہے، چنانچہ ''بزازیہ'' میں ایک مسئلہ تحریر ہے "تزوج امراة إن شاء ت وشاء فلان فأبطل فلان المشيئة في المجلس" (بزازیہ ۴ر ۱۵۳) جو اس کی نظیر ہو سکتی ہے، اخیر میں یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ عورت سے احتیاط وفائدہ کیلئے اول دو صورتیں بہ نسبت تیسری صورت کے زیادہ مناسب ہے، اس لئے کہ صورت ثالث میں بعد النکاح معاملہ ہونے سے شوہر پر کسی قسم کا تفویض کے لئے دباؤ نہیں ہو سکتا، بلکہ معاملہ اس کی رضامندی پر طے ہوتا ہے، برخلاف پہلی دو صورتوں کے، اسی لئے فقہ میں اول دو صورتوں کے اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے، چنانچہ بزازیہ میں ہے کہ عورت کو خوف ہے کہ شوہر بعد النکاح طلاق کا اختیار نہیں دے گا تو اسے چاہئے کہ نکاح ہی میں اس طرح کا ایجاب کرلے کہ تفویض پر مشتمل ہو۔ (بزازیہ ۴ر ۲۳۴)

☆☆☆

# تفویض طلاق کا حکم

مفتی احمد نادر القاسمی [1]

## تفویض کا طریقہ:

تفویض طلاق کی ایک صورت یہ ہے کہ عورت نکاح کے وقت یہ شرط لگائے کہ اگر عورت کو کسی طرح کی تکلیف دی گئی، یا اس کو نفقہ وقت پر ادا نہیں کیا گیا، اس کے صحیح سالم ہوئے دوسری عورت کے شوہر نے شادی کی، یا بے جا ستایا گیا وغیرہ تو منکوحہ فلانہ کو اپنے اوپر مثلاً: ایک ''طلاق بائن'' واقع کر کے نکاح سے علاحدہ ہوجانے کا اختیار ہوگا اور ایجاب عورت کی طرف سے ہو اور شوہر اس کو عقد کے وقت مذکورہ شرائط کے ساتھ ایجاب وقبول میں تسلیم کرلے تو کتب فقہ میں یہ صراحت ملتی ہے کہ یہ تفویض درست ہے اور عدم ایفاء کی صورت میں عند النکاح لگائی گئی شرط کے مطابق عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، چنانچہ فخر الدین قاضی خانؒ نقل کرتے ہیں:

فقیہ ابو اللیثؒ کہتے ہیں کہ جب شوہر کی جانب سے ابتداء ہوئی اور کہا میں نے تم سے نکاح کیا، اس شرط پر کہ تو طلاق والی ہے تو واقع نہ ہوگی اور اگر عورت نے ابتداء کیا اور اس طرح کہا کہ میں نے تم سے نکاح کیا اس شرط پر کہ طلاق والی ہوں، یا میرا معاملہ میرے ہاتھ میں ہوگا، جب میں چاہوں گی اپنے اوپر طلاق واقع کرلوں گی اور شوہر نے اسے قبول کرلیا تو نکاح جائز ہوجائے گا اور طلاق واقع ہوجائے گی، اور اس کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہوگا، اس لئے کہ ابتداء اگر شوہر کی جانب سے ہو تو طلاق اور تفویض دونوں نکاح سے قبل ہوں گے، لہذا یہ درست نہ ہوگا، اور اگر ابتداء عورت کی جانب سے ہو تو تفویض نکاح کے بعد قرار پائے گی، اس لئے کہ شوہر نے عورت کے کلام کے بعد قبلت کہا اور جواب شامل ہے اس چیز کے اعادہ کو جو سوال کے اندر ہے، تو گویا شوہر کا قول ایسے ہی ہوگیا، جیسا کہ وہ کہے کہ میں نے تم کو قبول کیا اس شرط پر کہ تو طلاق والی ہے یا ایسے ہی ہوگیا، جیسے کہے کہ میں نے تم کو قبول کیا اس شرط پر کہ تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے تو گویا تفویض نکاح کے بعد کی گئی (خانیہ حاشیہ علی الھندیہ ۱/۳۲۹)

## تفویض طلاق سے رجوع:

فقہاء کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص طلاق کا حق اپنی بیوی کو سپرد کردے تو اس کو واپس نہیں لے سکتا ہے اور نہ ہی اس کو اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ بیوی کو حق تفویض کے استعمال سے روک دے، فقہ کی تمام متداول کتابوں میں یہ مضمون ملتا ہے:

شوہر کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اس سے رجوع کرلے اور نہ ہی اس کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ حق جو اس نے بیوی کی جانب سپرد کیا ہے، اس کے کرنے سے روک دے اور نہ اس کو فسخ کرسکتا ہے۔ (الفتاوی الھندیہ ۱/۳۸۷)

شوہر اس بات کا مالک نہیں ہے کہ تفویض کے انواع ثلاثہ: اختیار، امر بالید اور مشیئۃ سے رجوع کرلے۔ (درمختار ۱/۳۲۷، شامی ۳/۳۲۲)

علامہ کاسانی اس بحث میں تفصیل سے کلام کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''تفویض یہ ہے کہ وہ لازم ہوتا ہے شوہر کی جانب سے، یہاں تک کہ اس سے رجوع کا مالک نہیں ہوتا اور نہ ہی عورت کو اس سے روک سکتا ہے جس کو اس نے اس کی طرف سونپا ہے اور نہ ہی فسخ کرسکتا ہے؟ کیونکہ اس نے عورت کو طلاق کا مالک بنایا ہے اور ضابطہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو کسی چیز

[1] اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

کا مالک بنا دیتا ہے تو اس چیز پر سے اس کی ولایت ختم ہو جاتی ہے، لہذا انہیں باطل کر سکتا ہے اس کو رجوع کے ذریعہ، عورت کو روکنے کے ذریعہ، اور فسخ کے ذریعہ، اس لئے کہ طلاق وجود میں آنے کے بعد رجوع کا احتمال نہیں رکھتی اور نہ فسخ کا، اسی طرح اس کے واجب ہونے کے بعد بھی رجوع کا احتمال نہیں رکھتی''۔ (بدائع ۳؍۱۱۳)

مذکورہ بالا تمام عبارتوں کا ماحصل یہ ہے کہ شوہر نکاح کے وقت طلاق کا حق تفویض کرنے کے بعد اس سے رجوع کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا ہے او رنہ اس کو اس طلاق سے رجوع کا اختیار باقی رہتا ہے

## نکاح میں شرط کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) عقد نکاح سے قبل شرائط نامہ تحریر ہو جائے جس پر جانبین کے دستخط ہوں۔

جس وقت شرائط نامہ عقد نکاح سے قبل تحریر کیا جائے، اس وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جس لڑکی سے نکاح ہو رہا ہو اس عاقدہ کی جانب نکاح کی نسبت نام کی صراحت کے ساتھ ہو اس طرح کہ اگر میں فلاں بنت فلاں سے نکاح کروں اور مثلاً اس کو کسی طرح کی اذیت دوں، تو اس کو اپنے اوپر طلاق واقع کر کے میرے نکاح سے الگ ہو جانے کا پورا اختیار ہوگا، اگر اس شرائط نامہ پر اس عاقدہ کی جانب اضافت نہ کی گئی تو اس شرائط نامہ کا شرعاً کوئی اعتبار نہ ہوگا، چنانچہ درمختار میں ہے:

> ''اور تعلیق کے لئے شرط ہے کہ ملکیت ہو خواہ حقیقت میں ہو، مثلاً معتق کا قول اگر میں نے ایسا کیا تو تو آزاد ہے، یا حکماً ہو، جیسے کسی شخص کا قول اپنی منکوحہ کے بارے میں یا معتدہ کے بارے میں اگر تو گئی تو تو طلاق والی ہے، یا ملکیت کی طرف اضافت ہو خواہ عام ہو یا خاص، مثلاً کسی شخص کا یہ کہنا کہ اگر میں غلام کا مالک ہوا تو تو آزاد ہے، یا معین غلام کے بارے میں کہے کہ اگر میں مالک ہو جاؤں اس غلام کا تو آزاد ہے۔ (درمختار ۲۳۹)

(۲) شرائط طے ہونے کی دوسری صورت یہ ہے کہ ایجاب ہی میں تمام شرائط جو لگانے ہوں اسے ذکر کر دیا جائے اور ابتداء (ایجاب مشروط) عورت کی جانب سے ہو اور مرد تمام شرائط کے ساتھ اسے قبول کر لے، یہ صورت بھی شرعاً درست اور معتبر ہے اور نکاح کے بعد معاملہ عورت کے ہاتھ میں ہوگا جب چاہے گی شرائط کی خلاف ورزی کی صورت میں اپنے اوپر طلاق وقع کر سکے گی، ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

> ''اگر عورت نے ابتداء کیا اور کہا میں نے تم سے شادی کی اس شرط پر کہ میں طلاق والی ہوں، یا یہ کہ میرا معاملہ میرے ہاتھ میں ہوگا جب چاہوں گی اپنے اوپر طلاق واقع کرلوں گی، شوہر نے کہا میں نے قبول کیا تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اس کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہوگا'' (بحرالرائق ۳؍۳۱۸)

(۳) شرائط طے ہونے کی تیسری اور آخری صورت یہ ہے کہ نکاح کے بعد شرائط نامہ تحریر کیا جائے، اس طرح کہ عورت کو کوئی تکلیف دی گئی یا اس کی موجودگی میں شوہر نے دوسرا نکاح کیا، یا بغیر جرم اس کی ناحق پٹائی کی گئی تو عورت کو اس وقت یہ اختیار ہوگا کہ اپنے اوپر طلاق واقع کر کے شوہر سے خلاصی حاصل کر لے، تو یہ شرط بعد النکاح بھی درست اور شرعاً معتبر ہوگی، اور ان تمام شکلوں میں عورت کو اختیار ہوگا کہ اپنے اوپر طلاق واقع کر لے، ابن نجیمؒ جامع الفصولین سے نقل کرتے ہیں:

> ''اور ''جامع الفصولین'' میں ہے کہ شوہر نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر میں تیری موجودگی میں شادی کروں تو تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں اور تیرے سپرد ہوگا، پھر عورت نے اپنے شوہر کے خلاف دعوی کر دیا کہ فلاں عورت جو حاضر ہے اس سے تو نے شادی کی ہے اور حاضرہ بھی اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ ہاں اس سے شادی کی ہے، اور شاہد بھی اس نکاح کی شہادت دیدیں تو معاملہ اس عورت کے ہاتھ میں ہوگا''۔ (بحرالرائق ۳؍۳۱۹)

## جانبین کے لئے کچھ مفید قیدیں:

نکاح کے شرائط ناموں میں مزید کچھ ایسی قیدیں بڑھائی جاسکتی ہیں جو جانبین کی ازدواجی اور عائلہ زندگی میں استحکام پیدا کریں، مثلاً نکاح کے شرائط نامہ میں جانبین کے کم از کم دس افراد جو باوثوق اور اہل علم ہوں، کے نام اور ان کے دستخط، اسی طرح یہ قید بھی شرائط نامہ میں بڑھادی جائے (جس وقت عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کی نوبت آن پڑے) کہ ان دس حضرات میں سے دو حضرات اس وقت موجود ہوں اور وہ عورت کے حق میں طلاق کو مناسب سمجھیں تب عورت کو شرائط کے مطابق اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا وغیرہ، اس بارے میں قرآن کریم کی اس آیت سے مدد لی جاسکتی ہے۔

''وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكماً من أهله وحكماً من أهلها إن يريد ا إصلاحاً يوفق الله بينهما إن الله كان عليما خبيرا'' (سورہ نساء:۳۵)

اس آیت کریمہ میں عاقدین اور زوجین کو کسی معاملہ کو الجھ جانے اور تلخی کی صورت میں دونوں طرف بزرگ اور تجربہ کار لوگوں کی مداخلت پر زور دیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ نکاح میں کسی بھی قسم کے قیود وشرائط کا مقصد نکاح کی پائیداری اور نباہ نہ ہونے کی شکل میں آسانی سے گلوخلاصی ہے، اور اس مسئلہ کو خاص طور سے موجودہ حالات میں ''تفویض طلاق'' کا طریقہ اختیار کیا جانا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے، ورنہ اسی طرح خواتین پر طلاق نہ دے کر ظلم کیا جاتا رہے گا، اور موجودہ حالات میں ضرورت کے باوجود حکومت کے خوف سے طلاق نہ دے گا، نقصان دونوں کا ہوگا، اس مشکل سے آزادی کا بس یہی راستہ نظر آتا ہے۔

## کیا تفویض طلاق سے مصالح شرع کے ضیاع کا اندیشہ ہے؟

یہ بات تو اپنی جگہ مسلم ہے کہ عورت نفسیاتی طور پر جلد باز ہے، جس کی وجہ سے الجھن میں بہت جلد آجاتی ہے، اس لئے اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے شوہر کوئی ایسی شرط لگا سکتا ہے جس سے عورت خوف کرے اور طلاق واقع کرنے میں عجلت سے کام نہ لے، مثلاً مرد یہ شرط لگادے کہ عورت اس شرط پر اپنے اوپر طلاق واقع کرسکتی ہے جب سارا مہر معاف کردے، اس طرح کی قید سے ضیاع کے اندیشہ کا سد باب ممکن ہے ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

''اگر شرط لگایا شوہر نے کہ تین طلاق واقع کرنے کا حق تم کو ہے، اگر تم اپنے مہر سے مجھ کو بری کردو، اگر وہ لڑکی کھڑی ہوگئی اس مجلس سے تو اس کے ہاتھ سے معاملہ نکل جائے گا اور اگر واقع کیا طلاق مجلس میں اور اس نے مہر سے براءت کو مقدم کیا تو طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر بری نہیں کیا مہر سے، تو طلاق واقع نہیں ہوگی، اس لئے کہ طلاق واقع کرنے کا وکیل شوہر نے براءت کی شرط پہ بنایا ہے''۔ (البحر الرائق ۳/۳۱۹)

ان عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اس طرح کی شرطیں لگائی جاسکتی ہیں، تاکہ مصالح شرع پر کنٹرول رہے۔

☆☆☆

# تفویض اور احتیاطی قیودات

مولانا عبدالقادر قاسمی

## عاقدہ کی طرف تفویض کی شرط لگانا:

عقد نکاح کے وقت اگر عورت یہ شرط لگائے کہ اسے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، یا فلاں فلاں شکلوں میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، اور شوہر اس شرط کو تسلیم بھی کرلے تو یہ شرط شرعاً معتبر ہوگی اور اس تسلیم کی وجہ سے شوہر کا حق طلاق ختم ہوکر بیوی کو مل جائے گا اور شرعاً شوہر کو کچھ بھی حق طلاق نہ ہوگا۔ (المفصل فی أحکام المرأۃ ۱۳۶/۶، الفتاوی الہندیہ ۲۶۳/۱، رد المحتار ۳۲۹/۳، الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۵۴/۷)

## حق تفویض ختم کرنا:

اگر شوہر نکاح کے وقت بیوی کو طلاق کا حق تفویض کرنے کے بعد، اس تفویض کو ختم کرنا چاہے تو اس کا اختیار شوہر کو باقی نہیں رہتا ہے، بلکہ اس کے قبول کرتے ہی اس کا حق واختیار شرعاً باطل ہوجاتا ہے۔ (الفتاوی الھندیہ ۳۸۷/۱)

## شرط کی تین صورتیں:

شرط کی تین شکلیں ہیں: پہلی شکل یہ ہے کہ شرائط قبل از نکاح طے ہوجائیں اور طرفین کی جانب سے دستخط بھی ہوجائے دوسری شکل یہ ہے کہ عین نکاح کے وقت شرائط کا ذکر کیا جائے، ایجاب مشروط ہو یا ایجاب مطلق ہو اور قبول مشروط ہو تیسری شکل یہ ہے کہ عقد نکاح کے بعد طرفین آپس میں کوئی شرائط نامہ تحریر کریں۔

## حکم:

مذکورہ بالا تینوں صورتیں جائز و درست ہیں، البتہ شرائط اگر قبل از نکاح طے ہوں اور طرفین کے دستخط بھی ہوجائیں اور شرائط عین نکاح کے وقت طے ہوں، ان دونوں صورتوں کی صحت کے لئے ایک ایک شرط ہے، اس کی مکمل اور جامع تفصیل حضرت تھانویؒ کی تصنیف ''الحیلۃ الناجزۃ'' سے نقل کی جاتی ہے:

## پہلی صورت:

کابین نامہ نکاح سے پہلے لکھا جائے، اس کے معتبر اور مفید ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ اس میں نکاح کی طرف اضافت ونسبت موجود ہو، مثلاً یہ لکھا جائے کہ اگر فلاں بنت فلاں کے ساتھ نکاح کروں اور پھر شرائط مندرجہ اقرار نامہ ہذا میں سے کسی کی خلاف ورزی کروں تو مسماۃ مذکورہ کو اختیار ہوگا کہ اس وقت یا پھر کسی وقت چاہے تو اپنے اوپر طلاق بائن واقع کرکے اس نکاح سے الگ ہوجائے، اگر اس میں اضافت الی النکاح نہ لکھی گئی تو یہ اقرار نامہ محض بے کار ہوگا، اس کی رو سے عورت کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہ ہوگا۔ (رد المحتار ۸۱۳/۲، الفتاوی الہندیہ ۲۶۱/۶)

## دوسری صورت:

عین ایجاب وقبول ہی میں زبانی شرائط مذکور ہوں، اس کے صحیح ومعتبر ہونے کی شرط یہ ہے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو، یعنی اولاً خود عورت (یا اس کا ولی یا وکیل (یعنی قاضی نکاح خواں) عقد نکاح کے وقت یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو (یا مسماۃ فلاں بنت فلاں کو) تیرے نکاح میں اس شرط پر دیدیا کہ اگر تم نے یہ کام کیا یا وہ کام کیا (جتنی شرطیں لگانا مقصود ہوں سب کو ذکر کردیا جائے) تو اپنے کا اختیار میرے (یا مسماۃ موصوفہ کے) ہاتھ میں ہوگا، یعنی شرائط مذکورہ میں سے کسی کی خلاف ورزی پر بھی اختیار ہوگا کہ اس وقت یا پھر کسی وقت چاہوں (یا چاہے) تو اپنے آپ کو طلاق بائن دے کر اس نکاح سے الگ کرسکوں گی، (یا

کر سکے گی) اس کے جواب میں مرد ناکح یوں کہے کہ میں نے قبول کر لیا، اس پر عورت کو اختیار ہوگا، کہ وہ جب اپنے اوپر شرائط کے خلاف ظلم ومصیبت دیکھے تو اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر اس شوہر کے نکاح سے نکل جائے، یعنی اس طرح کہہ دے کہ میں اپنے اوپر ایک طلاق بائن واقع کرتی ہوں، اور اگر ایسا نہ کیا گیا، بلکہ ابتدائے کلام (یعنی ایجاب) مرد کی جانب سے ہوا اور لڑکی والے قبول کے ساتھ تفویض طلاق کی شرط لگا دیں تو نکاح تو بلا کسی شرط کے صحیح ہو جائے گا، اور شرط بالکل بے کار ہو جائے گی، خوب سمجھ لو۔ (رد المحتار ۲ / ۲۹۴، الفتاوی الہندیہ ۷ / ۲۶۳)

تنبیہ:

اگر ایجاب عورت ہی کی جانب سے ہو، اگر شرط تفویض ذکر نہ کی گئی اور مرد نے قبول میں شرط تفویض کا اضافہ کر دیا، تب بھی تفویض صحیح ہو گئی، لیکن چونکہ اس صورت میں صرف مرد کو اختیار ہے خواہ شرط کو بڑھائے یا نہ بڑھائے، عورت کی جانب سے جب ایجاب بلا کسی شرط کے ہو چکا، تو اس کے ہاتھ سے بات نکل چکی، اس لئے کہ عورت کا مقصد یہ ہو کہ اس کو طلاق لینے کا اختیار مل جائے، اس کے واسطہ یہ صورت کافی نہیں، بلکہ ایجاب میں شرط لگانا ضروری ہے، تاکہ مرد کو بلا کسی شرط قبول کرنے کا حق ہی نہ رہے۔

## تیسری صورت:

نکاح کے بعد کوئی اقرار نامہ اس قسم کا شوہر سے لکھوایا جائے، یہ صورت بھی بالکل صحیح اور درست ہے۔

**مشورہ:**......یہ صورت اس عورت کے لئے کارآمد ہے جس کے نکاح میں کابین نامہ نہیں لکھوایا گیا تھا، لیکن جو عورت نکاح کے وقت احتیاط کی طالب ہے، اس کے واسطہ اس میں بھی وہی کمی ہے جو ابھی تنبیہ بالا کے ذیل میں مذکور ہوئی، یعنی جبکہ عقد نکاح تمام ہو چکا تو عورت کے قبضہ میں نہ رہا کہ خاوند کو اس اقرار نامہ کے لکھنے پر مجبور کر لے، بلکہ صرف اس کی مرضی پر معاملہ رہ جاتا ہے، اس لئے کہ مصائب کے وقت خلاصی کی اصل تدبیر پہلی یا دوسری ہی صورت اختیار کرنا ہے اور ان میں بھی آسان صورت جس میں عوام کو مغالطہ میں پڑنے کا اندیشہ نہیں، وہ صرف پہلی ہی صورت ہے، کہ عقد سے پہلے ہی کابین نامہ لکھوا لیا جائے، مگر اس میں اضافت الی النکاح ضرور ہونا چاہئے، یعنی یہ لفظ ضرور لکھوا دئے جائیں کہ اگر میں "فلاں، فلاں" سے نکاح کروں اور پھر فلاں فلاں شرط کے خلاف کروں، اور اگر اضافت الی النکاح نہ لکھی گئی تو کابین نامہ کالعدم ہوگا جیسا کہ پیشتر گزر چکا۔

**فائدہ:**......نکاح مذکور جس میں کچھ شرائط خاوند سے منظور کر لی گئی ہیں، اس کے جواز میں حنفیہ کو کلام نہیں ہے، بعض لوگوں نے اس صورت کو نکاح معلق میں داخل کر کے شبہ کیا ہے، مگر در حقیقت یہ نکاح معلق نہیں، بلکہ نکاح منجز ہے، جو تفویض معلق کے ساتھ مشروط ہے، نکاح معلق وہ ہے کہ اس وقت نکاح ہی نہ ہو، جیسے عورت یوں کہے کہ "میں نے اپنے آپ کو تیرے نکاح میں دے دیا اگر میرا باپ راضی ہو" یا مرد یوں کہے کہ "میں نے قبول کر لیا اگر میرا باپ راضی ہو" اس صورت میں نکاح نہیں ہوتا، اور اگر اصل نکاح معلق نہ کیا جائے، بلکہ اس کے ساتھ کوئی شرط زائد لگا دی جائے تو اس طرح نکاح ہو جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ مجلس عقد میں نکاح اسی وقت ہو رہا ہے مگر اس کے ساتھ ایک شرط ہے، جس کو شوہر سے منوایا جاتا ہے۔

**ضروری مشورہ:**......چونکہ عورت ناقص العقل ہوتی ہے، اس لئے طلاق کو مطلقاً اس کے ہاتھ میں دے دینا خطرہ سے خالی نہیں ہے، پس مناسب یہ ہے کہ تفویض میں کوئی قید مناسب بھی لگا دی جائے، جس میں وہ خطرہ نہ رہے، مثلاً یہ کہ نکاح کے وقت عورت کی طرف سے خود یا اس کا ولی یا وکیل (یعنی قاضی نکاح خواں) یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو یا مسماۃ فلاں بنت فلاں کو تمہارے نکاح میں بمعاوضہ مہر روپے سکہ رائج الوقت کے اس شرط پر دے دیا کہ جس وقت اس کو تم سے کوئی تکلیف شدید پہنچے گی جس کو فلاں فلاں اشخاص میں سے کم از کم دو آدمی تسلیم کر لیں (اس جگہ مناسب ہے کہ کم از کم دس آدمیوں کے نام تراضی طرفین سے متعین کر دئے جائیں) تو اس کے بعد ہر وقت معاملہ میرے یا اس کے اختیار میں ہوگا، کہ اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر اس نکاح سے علیحدگی اختیار کر لی جائے اس صورت میں طلاق کا اختیار عورت کے ہاتھ میں، اس وقت آئے گا جب کہ تسلیم کردہ اشخاص میں سے کم از کم دو آدمی تسلیم کر لیں کہ تکلیف شدیدہ ہے، لیکن عورت کو اس کے بعد بھی چاہئے کہ طلاق واقع کرنے میں جلدی نہ کرے، بلکہ اطمینان کے ساتھ سوچ سمجھ کر کام کرے اور تین باتوں کا ضرور التزام کرے۔

۱۔ فوراً غصہ کے وقت اپنے اس اختیار سے کام نہ لے، بلکہ ایک معتد بہ مدت تک غور وخوض کرے جس کی میعاد ایک ہفتہ سے کم نہ ہو۔

۲۔ یہ کہ اپنے خیر خواہوں سے ضرور مشورہ کرے۔

۳۔ یہ کہ سنت کے موافق استخارہ کرے اور ویسے بھی دعا کرے کہ اللہ تعالی میرا دل ایسے کام کی طرف پھیر دے جو میرے لئے دین ودنیا میں بہتر ہو، اس تمام کوشش کے بعد جو دل میں آئے اس پر عمل کرے اور اللہ تعالی پر بھروسہ رکھے، اس طرح وہ خطرہ نہ ہوگا، جو تفویض مطلق کی صورت میں ہوتا ہے۔

## تنبیہ ضروری:

تعلیق مذکور میں "اگر چاہے" کا لفظ استعمال نہ کرنا چاہئے، ورنہ تفویض خاص اس مجلس کے ساتھ مقید ہوجائے گی جس میں وہ شرائط ہوں اور اس مجلس کے ختم ہوجانے کے بعد عورت کو اختیار طلاق کا باقی نہ رہے گا اور اختیار کو اس قدر محدود کر دینا مناسب نہیں، اسی طرح لفظ "جب چاہے" بھی شرط میں نہ استعمال کیا جائے، ورنہ ہمیشہ کے لئے (حتی کہ اعادہ کے بعد بھی) اس کو اپنے او پر طلاق واقع کرنے کا اختیار رہے گا جب تک کہ تین طلاق پوری نہ ہوجاویں، اور ایسا اختیار عورت کو دینا ضرورت سے زائد اور مصلحت کے خلاف ہے، بلکہ ایسے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں، جن سے نہ تو ایسی تنگی لازم آئے کہ تفویض مقید بمجلس ہوجائے اور نہ اتنی وسعت ہو کہ عورت کو تین طلاقیں واقع کر لینے کا اختیار مل جائے۔

تنبیہ دوم: ...... شوہر کو تفویض طلاق کے بعد اس تفویض سے رجوع کا حق نہیں رہتا، بلکہ تفویض طلاق کے بعد عورت طلاق کی مالک ہوجاتی ہے، اس لئے شرائط میں مرد کو غور وخوض اور اہل علم وفہم سے مشورہ کر لینا ضروری ہے، ورنہ بعد میں پریشانی وپشیمانی ہوگی (الحیلۃ الناجزۃ ۲۷-۳۰)



# تفویض طلاق اور اس کی شرطیں

مولانا نسیم الدین قاسمی

آج کل عورتوں کو نکاح کے بعد بسااوقات جن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے، کبھی مرد کی طرف سے ظلم وستم، کبھی نان ونفقہ سے دستبردار ہوجاتا ہے اور کبھی بیوی بال بچوں کو چھوڑ کر پردیس چلا جاتا ہے اور عورت بیچاری بیکسی کی حالت میں اپنی زندگی گذارتی ہے اور شوہر کبھی بھی اس کی طرف التفات نہیں کرتا، ایسے حالات کے پیش نظر اگر نکاح سے قبل یا عقد نکاح کے بعد باہم رضامندی سے کچھ شرائط مقرر کر لئے جائیں، کہ اگر شوہر اسکی خلاف ورزی کرے گا تو عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا اور اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) نکاح سے قبل شرائط طے ہوجائیں، (۲) نکاح کے وقت طے ہوں، (۳) یا نکاح کے بعد شرائط طے ہو۔

(۱) پہلی صورت، یعنی جب کہ نکاح سے قبل شرائط طے ہوں، ان شرائط کے قبول ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ان شرائط کی اضافت یا نسبت نکاح کی طرف کی گئی ہو، مثلاً شوہر یہ کہے کہ اگر میں مسماۃ فلاں بنت فلاں سے نکاح کروں اور پھر جو شرط طے پائے اس کا تذکرہ کرنے کے بعد شوہر یہ کہے کہ اگر میں نے مذکورہ شرائط کی ادائیگی نہیں کی تو عورت کو اختیار ہوگا کہ اسی وقت یا پھر جب چاہے اپنے اوپر ایک طلاق بائن واقع کر کے نکاح سے الگ ہوجائے، اور اگر اس شرط کی نسبت یا اضافت نکاح کی طرف نہیں کی گئی تو شرائط نامہ محض بےکار ہوگا اور عورت کو کسی قسم کا اختیار نہ ہوگا۔ (درمختار ۲/ ۷ ـ ۵۳)

(دوسری قسم):...... تفویض کو معلق کرنا ہے متعین وقت تک مہر نقد معجل کے ترک کرنے کے ذریعہ، کتابت کی صورت یہ ہے کہ شوہر نے ایک طلاق بائن کا اختیار عورت کو دے دیا، مطلقا اس شرط کے ساتھ کہ جب ایک ماہ گذر جائے اور اس کو میں نے اتنے روپے حوالہ نہیں کیا اس کے مہر معجل میں سے تو عورت کو اس کے بعد اختیار ہوگا جب چاہے ایک طلاق بائنہ لے لے، شوہر نے اس امر طلاق کو عورت کے حوالہ کردیا اور عورت نے اس تفویض طلاق کو قبول بھی کر لیا مجلس تفویض ہی میں۔ (الفتاوی الہندیہ ۶/ ۲۶۱)

(تیسری قسم):...... تفویض طلاق کو معلق کردیا، جوا کھیلنے یا شراب پینے یا ضرب شدید پر، جو تکلیف کا باعث ہو اور اس کا اثر بدن پر ظاہر بھی ہو اور اگر شوہر نے اس میں سے کسی کا ارتکاب کیا تو عورت کو اختیار ہوگا کہ اپنے آپ طلاق بائن دے کر جدا ہوجائے۔ (الفتاوی الہندیہ ۶/ ۲۶۱)

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ عین ایجاب وقبول کے وقت شرائط ذکر کی جائیں، اس شرط کے معتبر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو، یعنی اولاً عورت یا اس کا ولی عقد نکاح کے وقت یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو یا مسماۃ فلاں بنت فلاں کو تیرے نکاح میں اس شرط پر دیا کہ اگر تم نے فلاں فلاں کام کیا (جتنی شرائط لگانی ہوں بیان کردے) تو میرے معاملہ کا اختیار میرے ہاتھ میں ہوگا، یا مسماۃ فلاں بنت فلاں کے ہاتھ میں ہوگا اسی وقت یا پھر کسی وقت جب عورت چاہے اپنے اوپر ایک طلاق بائن دے کر نکاح سے جدا ہوجائے، اس کے جواب میں شوہر ناکح یوں کہے کہ میں نے قبول کیا اس پر عورت کو اختیار ہوگا جب وہ اپنے اوپر ظلم ومصیبت دیکھے اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر اس شوہر کے نکاح سے نکل جائے اور اگر ایسا نہ کیا بلکہ ابتدائے کلام (یعنی ایجاب) مرد کی جانب سے اور لڑکی قبول کے ساتھ تفویض طلاق کی شرط لگادے تو نکاح بلا کسی شرط کے صحیح ہوجائیگا اور شرط باطل ہوجائے گی۔

درمختار میں ہے:

نکاح اس شرط پر کیا کہ اس کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہے تو ایسا کرنا درست ہے۔ (درمختار ۲/ ۲۶ ـ ۵۲۵)

علامہ شامیؒ اس عبارت کے ضمن میں لفظ ''صح'' پر کلام کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''صحیح مقید ہے اس صورت کے ساتھ، جبکہ عورت کی طرف سے ایجاب ہوا ہو، چنانچہ عورت کہے کہ میں اپنا نکاح تم سے اس شرط پر کرتی ہوں کہ میرا معاملہ میرے ہاتھ میں ہے تو میں جب چاہوں گی اپنے آپ کو طلاق دے لوں گی، یا اس شرط پر کہ طلاق کا اختیار مجھ کو ہوگا تو اس کے جواب میں شوہر نے کہا میں نے قبول کیا''۔ (ردالمحتار ۲/۵۲۶)

لیکن اگر ایجاب شوہر کرے تو طلاق کا اختیار عورت کو نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کو شوہر کا اختیار حاصل ہوگا۔

''عالمگیری'' میں بھی اسی طرح بیان کیا ہے اور فقیہ ابواللیثؒ نے ان دونوں کے درمیان فرق کو بھی واضح کیا ہے۔

فقیہ ابواللیث بیان کرتے ہیں:

''ان دونوں صورتوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ جب ایجاب عورت کی جانب سے ہوگا تو طلاق اور تفویض طلاق نکاح سے قبل سمجھا جائے گا، لہذا یہ صحیح نہیں ہوگا، لیکن جب ایجاب عورت کی جانب سے ہو تو تفویض نکاح کے بعد ہوگی، کیونکہ شوہر نے جب عورت کے کلام کرنے کے بعد کہا ''قبلت'' تو گویا شوہر نے کا یہ کلام اعادہ مافی السوال کو متضمن ہوا تو، یعنی شوہر نے کہا کہ میں نے قبول کیا اس شرط پر کہ تجھے طلاق کا اختیار ہے، لہذا یہاں پر تفویض طلاق نکاح کے بعد سمجھی جائے گی۔

اس لئے دوسری شکل میں جب کہ عین عقد کے وقت شرائط طے کی جائیں، تو ایجاب شوہر کی جانب سے کیا جائے نہ کہ عورت کی جانب سے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ نکاح کے بعد کوئی اقرار نامہ اس قسم کا شوہر سے لکھوالیا جائے، یہ صورت بھی صحیح اور بالکل درست ہے، لیکن جب عقد نکاح تمام ہو چکا تو عورت کے قبضہ میں نہ رہا کہ خاوند کو اس اقرار نامہ کے لکھنے پر مجبور کرے، بلکہ صرف اس کی مرضی کی بات رہ جاتی ہے، اس لئے مصائب سے چھٹکارہ کی وجہ صرف پہلی یا دوسری تدبیر اختیار کرنے ہی میں ہے، اور اس صورت میں ضروری ہے کہ جب کابین نامہ لکھوایا جائے تو شرط کی نسبت واضافت نکاح کی طرف کرے اور اگر ایسا نہ کیا تو شرط باطل ہو جائے گی۔



# تفویض طلاق کا شرعی حکم

مولانا محمد نعیم رشیدی

عقد نکاح کے وقت عورت یہ شرط لگائے کہ اسے اپنے اوپر جس وقت طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوگا، اور شوہر بھی اس شرط کو تسلیم کرتا ہے، شرعی نقطہ نظر سے اس شرط کی کیا حیثیت ہوگی، اس کے بعد عورت کو حق اختیار حاصل ہوگا؟ اس شرط کو اصطلاح شرع میں "تفویض" کہتے ہیں اور شرعاً ایسی شرط کا اعتبار ہوگا، اور شرط صحیح ہوجائے گی، اور پھر عورت کو جوجب چاہے اپنے اوپر طلاق بائن واقع کرنے کا اختیار ہوگا، فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

"عورت نے کہا کہ میں تم سے اس شرط پر نکاح کرتی ہوں کہ میں طلاق والی ہوں، یا مجھ کو طلاق دینے کا اختیار ہوگا، تو شوہر نے کہا میں نے قبول کیا تو نکاح جائز ہوجائے گا، طلاق یا حق طلاق کا اختیار حاصل ہوجائے گا"۔ (فتاوی تاتارخانیہ ۲ / ۶۰۲)

نیز خانیہ میں بھی یہی عبارت مذکور ہے۔ (خانیہ فی ہامش الھندیہ ۱ / ۳۲۹)

علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

"اس شرط پر نکاح کیا کہ عورت کو اختیار ہے تو صحیح ہے"۔

لیکن یہاں پر ایک اہم بات قابل غور یہ ہے کہ مذکورہ شرط کا اعتبار اور اس کے صحیح ہونے کا مدار ایک قید پر موقوف ہے، اگر وہ نہ پائی جائے تو پھر شرط لغو ہوجائے گا، اور عورت کو کوئی حق طلاق کا اختیار حاصل نہیں ہوگا، وہ یہ ہے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو، یعنی شرط کی ابتدا عورت کی طرف سے واقع ہوتی ہو اور شوہر محض تسلیم کرے، اس کے برخلاف شرط ایجاب مرد کی طرف سے ہو اور عورت اس کو تسلیم کرے تو یہ شرط بے کار ہوجائے گی، اور عورت کو اس وقت کسی قسم کا حق طلاق کا اختیار حاصل نہیں ہوگا، چنانچہ فقہاء کرام نے اس کی صراحت کی ہے۔

"مرد نے کہا عورت سے کہ میں تم سے اس شرط پر نکاح کرتا ہوں کہ تم طلاق والی ہو، یا تمہارا معاملہ تمہارے اختیار میں ہے جس وقت چاہے اپنے اوپر طلاق واقع کرسکتی ہے، اور عورت نے اس کو قبول کیا، تو عورت کا معاملہ اس کے اختیار میں نہیں ہوگا" (فتاوی تاتارخانیہ ۲ / ۶۰۲)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

"مرد نے عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ عورت کا معاملہ اس کے اختیار میں ہوگا، تو یہ صحیح ہے اور یہ اس صورت کے ساتھ مقید ہے جب کہ عورت ابتداء کرے، چنانچہ عورت کہے کہ میں تم سے اس شرط پر نکاح کرتی ہوں کہ میرا معاملہ میرے اختیار میں ہوگا، جب چاہے میں طلاق واقع کرسکتی ہوں" (ردالمحتار ۲ / ۳۲۱)

دونوں میں وجہ فرق سمجھنے سے پہلے دو باتوں کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، پہلی بات یہ ہے کہ تفویض طلاق کا اعتبار ملکیت نکاح ہی میں صحیح ہوسکتا ہے، اگر حق طلاق کا اختیار ملکیت میں نہ ہوا ہو، یعنی عورت اس کے نکاح میں کسی بھی حیثیت سے داخل نہ ہو تو پھر اس طرح کی تفویض کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، دوسری بات یہ ہے کہ نکاح کا پورا ہونا قبول پر موقوف ہوتا ہے، محض ایجاب سے نکاح تام نہیں ہوتا، چنانچہ اب فرق اس طرح سمجھا جاسکتا ہے، کہ جب طلاق کی شرط کی ابتداء مرد کی طرف سے ہو تو یہ تفویض نکاح سے پہلے سمجھی جائے گی، کیونکہ یہاں محض ایجاب ہی ہوا ہے اور ابھی قبول باقی ہے، لہذا تفویض نکاح سے پہلے واقع ہوئی، چنانچہ گذشتہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ تفویض صحیح نہیں، نیز تفویض ملکیت میں نہیں پائی گئی، لہذا تفویض صحیح نہیں ہوئی، اس کے برخلاف شرط کی ابتداء عورت کی طرف سے ہو اور مرد اس کو تسلیم کرتا ہو تو یہاں تفویض کے بعد شوہر قبول کرتا ہے، تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں نے تمہاری شرط کو قبول کیا تو گویا تفویض طلاق مرد کی جانب سے نکاح کے بعد ہوا، لہذا اس صورت میں شرط صحیح ہوجائے گی، مرد و عورت کو طلاق کا اختیار حاصل ہوجائے گا، یہاں پر شوہر قبول میں شرط کے الفاظ

استعمال نہیں کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود محض اس کے "قبلت" (میں نے قبول کیا) کہنے میں خود سوال بھی شامل ہو جائے گا، جیسا کہ عام محاورات میں اس طرح کے استعمال سے ہر ایک واقف ہے، چنانچہ خانیہ میں اس کا فرق اس طرح واضح کیا ہے۔

"اس لئے کہ ابتداء اگر شوہر کی جانب سے ہو تو طلاق و تفویض نکاح سے قبل ہونے کی وجہ سے درست نہیں ہوگا، اگر ابتداء عورت کی طرف سے ہو تو یہ تفویض نکاح کے بعد ہوگا اس لئے کہ عورت کے کلام کے بعد شوہر نے "قبلت" (میں نے قبول کیا) کہا اور جواب سوال کے مضمون کو بھی شامل ہوتا ہے تو گویا وہ اس طرح کہا کہ میں نے اس شرط پر قبول کیا کہ تم طلاق والی یا تم کو اختیار ہوگا، تو یہ تفویض نکاح کے بعد ہوگا (اور درست ہو جائے گا)۔ (فتاوی خانیہ علی هامش الھندیہ ۱/ ۳۲۹)۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ شرط کے وقت مذکورہ قید کا لحاظ رکھنا صحت شرط کے لئے ضروری ہے، ورنہ شرط لغو اور بے کار سمجھی جائے گی اور عورت کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں ہوگا، لیکن یاد رہے کہ یہ تعلیق نہیں ہے کہ جس سے اشکال ہو۔

یہاں پر مزید ایک قید کا اضافہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ جب عورت شرط لگائے تو محتاط ہو کر ایسے الفاظ استعمال کرے کہ جس سے نکاح کے بعد جس وقت چاہے طلاق دینے کا اختیار حاصل ہو، چنانچہ اس کے الفاظ اس طرح ہوں "میں اس شرط پر نکاح کرتی ہوں کہ مجھے اختیار ہوگا کہ نکاح کے بعد جس وقت چاہوں گی ایک طلاق بائن اپنے اوپر واقع کر کے الگ ہو جاؤں گی" اس کے برخلاف اگر عورت مطلق یوں کہتی ہے کہ "میں اس شرط پر نکاح کرتی ہوں کہ مجھے طلاق کا اختیار ہوگا" تو اس صورت میں مجلس ختم ہونے کے بعد وہ اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کی مجاز نہیں ہوگی، چنانچہ ملک العلماء علامہ کاسانیؒ نے دونوں صورتوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

اگر مطلقاً اس طرح کہا کہ تم کو اختیار ہے تو اس کا بقاء حکم بقاء مجلس تک ہی ہے اور یہی مجلس ہے جس میں تفویض کا علم ہوا ہے، اگر چہ وہ موقت ہے، چنانچہ وقت کو مطلق رکھا اور اس طرح کہا کہ جب چاہے اور جس وقت چاہے تم کو اختیار ہوگا، تو عورت کو مجلس وغیر مجلس دونوں میں اختیار ہوگا، مجلس کے ساتھ مقید نہیں ہوگا۔ (بدائع الصنائع ۲/ ۱۳۳)

جب عورت کی جانب سے شرط پوری ہو جائے اور اس کو طلاق کا اختیار حاصل ہو جائے، اب شوہر کو تفویض طلاق کا اختیار حاصل نہیں ہوگا، عورت اب طلاق کی مالک بن چکی ہے، جب چاہے طلاق واقع کرلے، فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے، چنانچہ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

بہر حال تعلیق کی صفت شوہر کی طرف سے لازم ہے، یہاں تک کہ اس سے رجوع کرنے اور عورت کو اس کے اختیار سے منع کرنے کا مالک نہیں ہو سکتا، اور نہ فسخ کا، اس لئے کہ اس نے عورت کو طلاق کا مالک بنا دیا ہے اور جو کسی چیز کا دوسرے کو مالک بنا دے تو اسکی ولایت ملکیت سے ختم ہو جاتی ہے اور کسی طرح باطل کرنے کا مالک نہیں ہو سکتا۔ (بدائع الصنائع ۳/ ۱۲۶، مجمع الانہر ۱/ ۴۱۶، رد المحتار ۳/ ۳۴۴، فتاوی عالمگیری ۱/ ۳۸۷)

## شرائط نکاح کی تین صورتیں:

مذکورہ تینوں صورتیں درست ہیں، البتہ پہلی اور دوسری صورت میں چند قیود کا بڑھانا ضروری ہوگا، پہلی صورت کے صحیح ہونے کے لئے شرط یہ ہے، اس اقرار نامہ میں نکاح کی جانب نسبت اور اضافت موجود ہو، بغیر اضافت کے اقرار نامہ بے کار ہو جائے گا، وجہ اس کی یہ ہے کہ تفویض میں ملکیت کا ہونا ضروری ہے اور بغیر ملکیت کے تفویض معتبر نہیں ہوگی، علامہ ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں:

تعلیق صرف ملکیت ہی میں ہو سکتی ہے، جیسے اپنی منکوحہ کو کہے کہ اگر تم زیارت کرو تو تم کو طلاق ہے، یا پھر نکاح کی طرف اضافت ہو، یعنی اگر میں تم سے نکاح کروں تو تم کو طلاق ہے، یعنی ملکیت کے سبب پر طلاق کو معلق کیا ہے۔ (البحر الرائق ۴/ ۳)

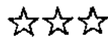
نیز علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

"تعلیق کی شرائط میں سے ملکیت یا علائق ملک کا ہونا ہے، لہذا اطلاق صرف ملکیت ہی میں درست ہو سکتی ہے، یا پھر علائق میں سے ہو، اور وہ عدت طلاق ہے، یا ملکیت کی طرف اضافت ہے"۔

معلوم ہوا کہ تفویض طلاق کے لئے ملکیت یا سبب ملک کا ہونا ضروری ہے، اور دوسری صورت معتبر ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ ایجاب عورت کی طرف سے مشروط ہو، یعنی ابتداء عورت نے کی ہو، اگر مرد ابتداء کرے اگرچہ مشروط ہی کیوں نہ ہو اور عورت قبول کرے تو یہ صورت درست نہیں ہوگی، جیسا کہ اوپر تفصیل گذر چکی، البتہ ایجاب عورت ہی کی طرف سے ہو لیکن غیر مشروط ہو، یعنی اس میں شرط کا کوئی ذکر نہ ہو لیکن شوہر کا قبول مشروط ہو، یعنی طلاق کے ساتھ قبول کرتا ہو تو ایسی صورت میں بھی شرط درست ہو جائے گی، اور عورت کو حق طلاق کا اختیار حاصل ہو جائے گا لیکن اس صورت میں شوہر کے اختیار پر معاملہ رہے گا، چاہے شرط کا ذکر کرے یا نہ کرے اس لئے کہ عورت کی جانب سے بغیر مشروط کے ایجاب واقع ہو چکا تو اب عورت کو کوئی اختیار نہیں ہوگا۔

اور تیسری صورت بھی اگرچہ درست ہے، لیکن اس صورت میں نکاح بغیر کسی شرط کے تام ہو چکا، اب شرط کا اقرار نامہ لکھا گیا تو درست ہے، لیکن شوہر انکار کردے تو اس کو مجبور بھی نہیں کیا جائے گا، اس لئے سب سے زیادہ احتیاط کی صورت پہلی اور دوسری ہے۔

چونکہ عورت ناقص العقل ہے، اور اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر مصالح کا لحاظ کئے بغیر اپنے اوپر طلاق واقع کر لینے کا عین امکان ہے، اسلئے مناسب ہے کہ کوئی قید بڑھا دیا جائے کہ جس سے یہ احتمال ختم ہو جائے، مثلاً یہ قید بڑھایا جائے کہ عورت نکاح کے وقت یا جو بھی اس کا ولی ہے یہ کہے کہ میں نے اپنے آپ کو تمہارے نکاح میں اس شرط پر دیا کہ اگر مجھ کو تم سے کوئی تکلیف شدید پہنچے جس کو فلاں فلاں دس اشخاص میں سے کم از کم دو آدمی تسلیم کر لیں تو اس وقت یا جس وقت چاہے معاملہ میرے اختیار میں ہوگا، اس صورت میں طلاق کا حق عورت کے ہاتھ میں تو آجائے گا، البتہ طلاق واقع کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ متررہ اشخاص پیش آمدہ واقعہ کو تسلیم کرلیں کہ یہ واقعی معقول عذر ہے اور اگر تسلیم نہ کریں تو پھر ابھی طلاق واقع کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔



# تفویض طلاق کی صورتیں

مولانا محمد حاذق قاسمی

## تفویض کی پہلی صورت اور اس کا حکم:

یہ اقرار نامہ نکاح سے پہلے لکھوایا جائے تو اس کے مفید ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ اس میں نکاح کی طرف اضافت ونسبت موجود ہو، مثلاً یہ لکھا جائے کہ فلاں بنت فلاں کے ساتھ نکاح کروں اور پھر میں اس اقرار نامہ کی مندرجہ شرائط میں سے کسی شرط کی خلاف ورزی کروں تو مسماۃ فلاں مذکورہ کو یہ اختیار ہوگا کہ اسی وقت یا جس وقت چاہے اپنے اوپر طلاق واقع کر کے اس نکاح سے الگ ہو جائے، دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر اس میں اضافت الی النکاح نہ کی گئی تو یہ اختیار دینا درست نہ ہوگا چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

> اس کی شرط یا تو ملک حقیقی کا ہونا ہے، جیسے اپنے غلام سے یہ کہنا کہ اگر تو نے ایسا کیا تو تو آزاد ہے، یا ملک حکمی ہونا ہے، جیسے اپنی منکوحہ عورت یا عدت گذار رہی بیوی سے شوہر کا یہ کہنا کہ اگر تو گئی تو تجھے طلاق ہے، یا ملک حقیقی یا ملک حکمی کی جانب اضافت ہو، جیسے کسی آدمی کا یہ کہنا کہ اگر میں نے کسی عورت سے نکاح کیا یا اگر تم سے نکاح کیا تو تجھے طلاق ہے اور اسی طرح ہر عورت کا حکم ہے۔ (رد المحتار ۳/ ۳۴۴)

## تفویض کی دوسری صورت اور حکم:

عقد نکاح میں ہی یہ شرائط زبانی ذکر کئے جائیں، تو اس کے معتبر اور صحیح ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو، عقد نکاح کے وقت یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو تیرے نکاح میں اس شرط کے ساتھ دے دیا کہ تم نے یہ کام کیا، یعنی مجھے مارا یا کہیں جانے سے روکا (غرض جتنی بھی شرطیں لگانا مقصود ہوں سب کو ذکر کر دے) تو اپنے معاملہ کا اختیار میرے ہاتھ میں ہوگا، یعنی مذکورہ شرائط میں سے کسی کی خلاف ورزی پر بھی اختیار ہوگا کہ اسی وقت یا جس وقت چاہوں اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر اس نکاح سے الگ کر لوں گی، تو اس کے جواب میں مرد یوں کہے کہ میں نے قبول کیا، تو اس پر عورت کو اختیار ہوگا کہ جب وہ اپنے اوپر شرائط کے خلاف ظلم ومصیبت دیکھے اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر اس شوہر کے نکاح سے نکل جائے اور یوں کہہ دے کہ میں اپنے اوپر ایک طلاق بائن واقع کرتی ہوں۔

لیکن اگر ابتداء کلام، یعنی ایجاب مرد کی جانب سے ہو، اور لڑکی قبول کرنے کے ساتھ تفویض کی شرط لگائے تو نکاح درست ہو جائے گا، لیکن شرط باطل، لغو اور بے کار ہو جائے گی، چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

> کسی نے نکاح کیا کسی عورت سے اس شرط پر کہ عورت کا معاملہ اسی کے ہاتھ میں ہوگا درست ہے، مصنف کا "صح" کہنا اس صورت کے ساتھ مقید ہے، جبکہ ابتداء عورت نے کیا ہو اور ایجاب اس طرح کیا ہو کہ میں تجھ سے نکاح اس شرط پر کرتی ہوں کہ میرا معاملہ میرے ہاتھ میں ہوگا جب چاہوں گی اپنے آپ کو طلاق دے لوں گی، یا اس شرط پر کہ مجھے طلاق ہو جائے گی، اس پر شوہر نے کہا کہ قبول کرتا ہوں اور شوہر نے ابتداء کی، تو نہ تو بیوی مطلقہ ہوگی اور نہ ہی اس کے معاملہ کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ (رد المحتار ۳/ ۳۲۹)۔

## تفویض طلاق کی تیسری صورت اور حکم:

تیسری صورت یہ ہے کہ عقد نکاح سے پہلے شرط نہ لگائی جائے اور نہ ہی عقد نکاح کے وقت، بلکہ نکاح کے مکمل ہونے کے بعد مابین الطرفین کوئی اقرار نامہ لکھوایا جائے، اور فریقین اس پر راضی ہوں تو یہ صورت بھی صحیح اور درست ہے، اور یہ شرط واجب الایفاء ہوگی، اس لئے کہ اس کا نکاح سے کوئی تعلق نہیں، وہ یمین

وقسم جیسی ہے اور یمین کا پورا کرنا واجب ہے۔

## تفویض واختیار کے ساتھ مزید احتیاطی قیدیں

چونکہ عورت ناقصات العقل میں سے ہیں، اس لئے طلاق کو مطلقاً اس کے ہاتھ میں دے دینا خطرہ سے خالی نہیں، لہذا مناسب ہے کہ اختیار دیتے وقت کوئی ایسی مناسب قید بڑھا دی جائے کہ وہ اس کا غلط استعمال نہ کر سکے، مثلاً نکاح کے وقت عورت کی طرف سے وہ خود یا اس کا ولی یوں کہے کہ میں نے آپ کو یا مسماۃ فلاں بنت فلاں کو تمہارے نکاح میں بمعاوضہ مہر بیس ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت کے اس شرط پر دیدیا کہ جس وقت اس کو تم سے کوئی تکلیف شدید پہنچے گی اور اس کو فلاں فلاں دو لوگ تسلیم کرلیں گے، تو اس وقت کے بعد ہر وقت معاملہ میرے یا فلاں کے اختیار میں ہوگا کہ ایک طلاق بائن واقع کرلیں، اس صورت میں طلاق کا اختیار عورت کے ہاتھ میں اس وقت ہوگا جب کہ تسلیم کردہ اور مقرر کردہ اشخاص میں سے دو آدمی تسلیم کرلیں کہ تکلیف شدید ہے۔



# مہر کی دو مشروط مقدار

مولانا محمد انظر سبیلی

(۱) اگر عقد نکاح کے وقت مہر کی تعیین دو طرح سے کی جائے، مثلاً مہر اس طرح طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو مہر ۵۰ ہزار ہوگا، اور طلاق نہ دینے کی صورت میں ۲۵ ہزار ہوگا، اور مقصد یہ کہ طلاق کے بے جا استعمال اور غیر مشروع اقدام کو روکا جاسکے، تو اس طرح کی تعیین معتبر اور جائز ہونی چاہئے، اس طرح کی تعیین میں جو صاحبین کی رائے ہے اس پر عمل کرنا فی زمانہ زیادہ بہتر اور مفید ہے، چنانچہ اس قسم کی نظیر کتب فقہ میں موجود ہے، علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

اگر کسی عورت سے اس شرط پر نکاح کرے کہ اس کی زوجیت میں اگر کوئی عورت نہ ہوگی تو مہر ایک ہزار اور دوسری عورت ہوگی تو مہر دو ہزار، یا اس شرط پر نکاح کرے کہ اگر بیوی کو اس کے شہر سے نہیں لے جائے گا تو مہر ایک ہزار اور اگر لے گیا تو مہر دو ہزار، یا اس شرط پر عقد کیا کہ اگر اس کی زوجیت میں باندی ہوگی تو مہر ایک ہزار اور اگر عربی یا اس قسم کی آزاد عورتیں ہوں گی تو مہر دو ہزار ہوگا، تو نکاح کی درستگی میں کوئی شک نہیں ہے، البتہ مہر (کی جہاں تک بات ہے) تو پہلی شرط بلا اختلاف جائز ہے، پس شرط کو پورا کیا تو مہر مسمی ہوگا، اور اگر شرط پوری نہیں کی تو اگر شرط کے خلاف کیا ہے تو مہر مثل لازم ہوگا، اصل یعنی ایک ہزار سے کم یا دو ہزار سے زیادہ نہ ہوگا، اور یہ قول امام ابوحنیفہ کا ہے، امام ابو یوسف اور امام محمد دونوں شرطوں کے جواز کے قائل ہیں۔ (بدائع الصنائع ۲/ ۲۸۵، البحر الرائق ۳/ ۱۵۹، ۱۶۱)

گوکہ امام صاحبؒ کے نزدیک دوسری صورت میں مہر مثل لازم ہوگا اور تسمیہ باطل قرار پائے گی اور فتوی بھی اسی پر ہے، لیکن چونکہ موجودہ دور میں ایک مجلس میں تین طلاق، جیسے غیر مشروع اقدام سے گریز بھی نہیں کرتے، اس لئے خیال یہی ہوتا ہے کہ مذکورہ صورت میں صاحبین کی رائے کو ترجیح دی جانی چاہئے اور تعیین مہر کی دونوں مقدار کو درست اور معتبر قرار دیا جانا چاہئے، تاکہ شوہر مہر کی خطیر رقم سے بچنے کے لئے غیر مشروع اقدام نہ کرنے پائے۔

(۲) اگر عقد کے وقت مہر میں اضافہ کی شرط شوہر کے عقد ثانی پر معلق کیا ہے، مثلاً عورت عقد کے وقت اس طرح کہے کہ اگر شوہر نے اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح کیا تو مہر تیس ہزار ہوگا، اور اگر دوسرا نکاح نہیں کیا تو مہر پندرہ ہزار ہوگا، تو درست ہے، شرعاً یہ دونوں شرطیں معتبر اور لازم العمل ہوں گی، اور اس میں بھی صاحبین کی رائے کو ترجیح ہوگی، جیسا کہ گزشتہ سوالنامہ کے حوالہ سے معلوم ہوتا ہے۔

جب ایک ہزار مہر پر اس شرط کے ساتھ نکاح کرلے کہ اس کے پاس دوسری عورت نہ ہوگی اور دو ہزار پر جب کہ اس کی زوجیت میں دوسری بیوی ہوگی، یا اگر اس کو شہر سے نہیں لے جائے گا تو ایک ہزار اور اگر لے جائے گا تو دو ہزار مہر ہوگا، پس نکاح درست ہے، شرط اول میں مہر معتبر ہے، اگر اس نے اس کی تکمیل کی، تو مہر مسمی ہوگا اور اگر تکمیل نہیں کی تو مہر مثل ہوگا، ایک ہزار سے کم اور دو ہزار سے زیادہ نہیں کیا جائے گا، امام ابو یوسف اور امام محمد نے فرمایا کہ دونوں شرطیں جائز ہیں۔ (الفتاوی التاتارخانیہ ۳/ ۱۰۲-۱۰۱)

☆☆☆

# طلاق کو روکنے کے لئے مہر میں کمی اور زیادتی کی شرط

مولانا محمد ہارون قاسمی

طلاق ایک ناپسندیدہ چیز ہے اور ساتھ ہی بعض ناگزیر حالات میں ایک ضرورت بھی ہے، لیکن اس کے غلط اور بے جا استعمال سے بڑی خرابیاں پیدا ہورہی ہیں، جس سے مرد وعورت اور خاندان سب ہی لوگ متاثر ہورہے ہیں، لہذا طلاق کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے اگر عقد نکاح کے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کا مہر بیس ہزار اور اگر اس نے طلاق نہ دی تو عورت کا مہر دس ہزار ہوگا، تو اس طرح مہر طے کرنا کون سا مہر لازم اور درست قرار دیا جائے گا؟ اس سلسلہ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جس مہر کا اول میں ذکر کیا گیا ہے اسی کا اعتبار کیا جائے گا اور پہلی شرط پائی جانے کی صورت میں متعین کردہ مہر یعنی مہر مسمی لازم ہوگا، اور دوسری شرط پائی جانے کی صورت میں ذکر کردہ مہر کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ مہر مثل لازم ہوگا، اس شرط کے ساتھ کہ مہر مثل مہر مسمی سے زائد نہ ہو، اور اس مسئلہ میں حضرات صاحبین کے نزدیک دونوں شرطیں درست ہیں، اور ہر دو صورت میں متعین کردہ مہر، یعنی مہر مسمی لازم ہوگا، اور حضرت امام زفر کے نزدیک یہ دونوں شرطیں فاسد ہیں۔

(فتاوی تاتارخانیہ: ۳/۱۵۹، الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۲۳، المبسوط للسرخسی ۵/۹۰، ہدایہ مع فتح القدیر ۳/۲۳۱)

اب رہی بات یہ کہ صاحبین کے قول پر فتوی دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ تو جب آج کل لوگ اس ناپسندیدہ چیز کے استعمال سے باز نہیں آرہے ہیں، اور بات بات پر طلاق دیتے رہتے ہیں، تو احقر کی ناقص رائے ہے کہ اس کے غلط اور بے محل استعمال سے لوگوں کو بچانے کے لئے جن سے خاندان اور معاشرہ کے بھی لوگ متاثر ہورہے ہیں، حضرات صاحبین کے قول پر فتوی دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ بہت سے ایسے مسائل ہیں جن میں تغیر زمان اور ضرورت کے پیش نظر اصحاب ابوحنیفہ نے امام صاحب کی مخالفت کی ہے، اور حوادث زمانہ کے پیش نظر فتوی دیا ہے (دیکھئے: شرح عقود رسم المفتی /۲۰)۔

(۲) اگر عقد نکاح کے وقت اس طرح مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس عورت کا مہر تیس ہزار ہوگا اور اگر اس عورت کے عقد نکاح میں رہتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نہیں کیا تو اس کا مہر پندرہ ہزار ہوگا، تو جیسا کہ ماقبل میں تفصیل ذکر کی جاچکی ہے، میرا خیال ہے کہ دونوں شرطیں شرعاً معتبر ہوں گی، اور حضرات صاحبین کے مسلک کے مطابق ہر دو صورت میں مہر مسمی لازم ہوگا، یعنی اگر شوہر نے اس منکوحہ کے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر پندرہ ہزار ہوگا اور اگر اس کی موجودگی میں کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس کا مہر تیس ہزار ہوگا، اور احقر کے نزدیک یہ اقرب الی الفقہ ہے۔

## عورت کا بغرض ملازمت باہر نکلنا:

(۳) آجکل عورتوں میں بھی ہر طرح کی اعلی تعلیم کا رواج ہوتا جارہا ہے اور تعلیم کے بعد بہت سی عورتیں مختلف ملازمتوں سے وابستہ ہوجاتی ہیں، یا وابستہ ہونے کی جد وجہد میں لگی رہتی ہیں، ایسی عورتیں اگر نکاح کے وقت اپنے ہونے والے شوہر سے یہ شرط لگاتی ہیں کہ شوہر انہیں لگی ہوئی ملازمت سے نہیں روکے گا، یا آئندہ اسے کوئی مناسب ملازمت ملے تو شوہر انہیں ملازمت کرنے سے نہیں روکے گا، اور اس شرط کو ہونے والا شوہر قبول کرلے، تو شوہر کے لئے شرعاً اس شرط کی پابندی ضروری اور لازم نہیں ہے، کیونکہ اس شرط کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہوگا، اور شرط فاسد او رلغو ہوجائے گی۔ (الأحوال الشخصیہ /۱۵۸)

پس شوہر اگر شرط کو قبول کرنے کے بعد بھی سلسلہ ملازمت ختم کرنے کا حکم دیتا ہے، نئی ملازمت سے روکتا ہے تو بیوی کے لئے شوہر کے حکم کی تعمیل ضروری اور لازم ہوگی، کیونکہ گھریلو نظم ونسق سنبھالنے کی ذمہ داری عورت کی ہے، اور گھر کے باہر کے امور کی ذمہ داری مرد کی ہے، جیسا کہ حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے ہوا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کام تقسیم اس طرح فرمائی کہ گھریلو جو امور ہیں ان کو انجام دینے کی ذمہ داری حضرت فاطمہؓ پر ڈالی اور گھر کے باہر کے جو امور ہیں ان کی خدمت حضرت علیؓ کے سپرد کی نیز عورت کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہے جس کی وجہ سے عورت کو ملازمت کرنے یا کوئی دوسرا ذریعہ معاش تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو ہر اس عمل سے روک سکتا ہے جس کے کرنے سے شوہر کے حق کے اندر تنقیص ہو رہی ہو، اور اس کو ضرر ونقصان پہنچ رہا ہو، یا اس عمل کے لئے شوہر کے گھر سے نکلنا پڑ رہا ہو، اور ظاہر ہے کہ ملازمت کی صورت میں ایک طرف تو گھریلو نظم ونسق میں دشواری ہوگی تو دوسری طرف شوہر کے حق میں تنقیص لازم آئے گی، اور تیسرے یہ کہ اس کے لئے شوہر کے گھر سے باہر نکلنا پڑے گا۔

(البحر الرائق ۴/ ۱۹۲، قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ۳/ ۶۰۳)

معلوم ہوا کہ شوہر اگر بیوی کو ملازمت سے منع کرے تو بیوی کے لئے شوہر کے حکم کی تعمیل ضروری ہوگی البتہ شوہر اگر ملازمت کرنے کی اجازت دے دیتا ہے تو پردہ شرعی اور شریعت کے دیگر امور کی رعایت کرتے ہوئے ملازمت کر سکتی ہے ساتھ ہی یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اگر فتنہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو، یا شوہر اس کو کسی مصلحت کے پیش نظر ملازمت سے روکنا چاہتا ہے تو شرعاً شوہر کو اس کا اختیار ہوگا، اور عورت کے لئے شوہر کے حکم تعمیل ضروری ہوگی، پس اگر بیوی شوہر کے منع کرنے کے بعد بھی ملازمت کرے گی تو گنہگار ہوگی اور ناشزہ کہلائے گی۔

☆☆☆

# مہر میں زیادتی کی شرط

مولانا عتیق الرحمن قاسمی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مباح چیزوں میں اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض طلاق ہے، اسی کے ساتھ بعض ناگزیر حالات میں ایک ضرورت بھی ہے، لیکن اس کا غلط اور بے جا استعمال کیا جارہا ہے، جو منشاء شریعت اور انسانی فطرت کے خلاف ہے، یہی وجہ ہے کہ خاندانوں میں رنجش، زوجین میں نا اتفاقی، بلکہ پورا معاشرہ بگڑتا چلا جارہا ہے۔

لہٰذا طلاق کے غلط اور بے جا استعمال کو روکنے کے لئے اگر عقد نکاح میں مہر اس طریقہ پر طے کیا جائے کہ فلاں اگر اپنی بیوی فلاں کو طلاق دے (چاہے وہ جتنی ہو) تو اس کی بیوی فلاں کا مہر اتنا قرار پائے گا، (جو ایک متعینہ مقدار ہو) یا اگر اس بیوی کے عقد نکاح میں رہتے ہوئے کسی دوسری عورت سے شادی کرتا ہے تو اس کی بیوی فلاں کا مہر اتنا اتنا ہوگا، اگر شوہر طلاق نہیں دیتا، یا اس عورت کے ہوتے ہوئے دوسری عورت سے شادی نہیں کرتا، تو شوہر پر اتنا ہی مہر لازم ہوگا، اور حضرات صاحبین امام ابو یوسفؒ ومحمدؒ فرماتے ہیں کہ خلاف ورزی کی صورت میں مہر مسمی یعنی دو ہزار لازم ہوگا، اور حضرات صاحبین کے نزدیک یہ دونوں شرطیں صحیح اور درست ہیں، اس کی نظیر کتب فقہ میں بھی موجود ہیں۔

**مفتی بہ قول:** ذکر کردہ مسئلہ میں مفتی بہ قول اصحاب ترجیح نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے قول کو قرار دیا ہے، البتہ حضرات صاحبین کے قول کو مفتی بہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ (فتاوی تاتارخانیہ ۱۰۱/۱۳، حاشیۃ الطحطاوی ۵۱/۲، البنایۃ فی شرح الہدایہ ۱۵۹/۳)

## حضرات صاحبین کے قول پر فتوی:

حضرات صاحبین کے قول پر فتوی دیا جانا اصولاً وفروعاً درست ہے، کوئی مانع نہیں اور نہ کوئی خرابی لازم آتی ہے، اتنی بات تو طے ہے کہ صاحبین کے اقوال بھی امام ابو حنیفہؒ کی روایت ہوتی ہے، البتہ بعد میں منسوب دوسرے نام سے کیا جانے لگتا ہے اس کی صراحت بھی کتابوں میں مذکور ہے کہ ان کے شاگردوں کے اقوال درحقیقت حضرت امام ابو حنیفہؒ ہی سے مروی ہوتے ہیں۔ (عقود رسم المفتی ۱/۱)

گرچہ مسئلہ ہذا میں اصحاب ترجیح نے حضرت امام اعظم کے قول کو راجح اور مفتی بہ قرار دیا ہے، مگر صاحبین کے قول پر فتوی دیا جاسکتا ہے، اصحاب ترجیح جو کسی مسلک اور روایت کو راجح قرار دیتے ہیں وہ چند وجوہات کی بناء پر ہوتے ہیں، ان ہی میں احوال زمانہ و دیار بھی پیش نظر ہوتے ہیں، بلکہ بعض ائمہ نے حالات کے پیش نظر بہت سارے اقوال کو بدل کر دوسرا فتوی دیدیا، اور کیوں نہ ایسا کیا جاتا، جبکہ احوال زمانہ یکساں نہیں رہتے اور شریعت نے اس کا لحاظ بھی کیا ہے اس وجہ سے جب کہ ہمارے دیار اور زمانہ کی حالت بدل چکی ہے بناء بریں ضرورت کی شکل میں ہمارے سامنے یہ مسئلہ آکھڑا ہوا ہے، اگر اس کو دیکھتے ہوئے اور ضرورت کا احساس اور تقاضہ کو سامنے رکھتے ہوئے حضرات صاحبین کے قول پر فتوی دیا جانا کوئی قباحت نہیں رکھتا، اور نہ اصولاً کوئی حرج سمجھ میں آتی ہے۔

**نوٹ:** سوالنامہ میں طلاق کے غلط اور بے جا استعمال کو روکنے کے لئے جو مہر میں زیادتی کی صورت بیان کی گئی ہے اس کا مقصد جو ذکر کیا گیا ہے کہ مہر کی خطیر رقم سے بچنے کے لئے ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا غیر مشروع اقدام نہ کرے، سوال مطلق طلاق میں مہر کی زیادتی کرنے کا ہے اور ابتداء سوال میں طلاق کے غلط اور بے جا استعمال کا سد باب کرنا مقصد بیان ہو چکا ہے، اس لئے بات سمجھ میں نہیں آتی۔

اتنی بات تو محقق ہے کہ سوال میں جو صورت بیان کی گئی ہے اس میں تینوں طلاق شامل ہیں، طلاق کا غلط اور بے جا استعمال کرنے کی بہت

ساری صورتیں ہیں صرف ایک مجلس میں تین طلاق کا دیدینا ہی نہیں ہے

طلاق کے غلط و بے جا استعمال کو روکنے کے لئے جو صورت وطریقہ بیان کیا گیا ہے وہ شرعاً صحیح و درست ہے، البتہ اس کے نتیجہ کو خالی الذہن ہو کر دیکھا جائے تو کوئی خاص فائدہ اور مسئلہ کا حل نکلتا دکھائی نہیں دیتا ایک طرف مردوں کے جانب سے ہونے والی زیادتی کا سد باب ہے، تو دوسری طرف اس صورت کے اختیار کئے جانے میں عورت کی جانب سے ہونے والی زیادتی کا دروازہ کھولنا ہے، جو مردوں کی جانب سے ہونے والی زیادتی کے بنسبت زیادہ خطرناک ہے اور یقینی پہلو لئے ہوئے ہے روزانہ کا مشاہدہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان رنجش و نا اتفاقی ہے جو دونوں کو اس موڑ پر لاکھڑی کرتی ہے کہ جہاں علیحدگی ضرورت بن جاتی ہے اس زمانہ میں، جہالت و نادانی کی وجہ سے یا تو مہر کی کوئی اہمیت نہیں یا تو باعث فخر و شرافت اور عزت کی چیز ہے، اس لئے جتنا زیادہ مہر طے کیا جائے قابل تعریف قرار پاتی ہے، اور شوہر کی مالی حالت یہ ہے کہ اس مہر کی خطیر رقم کو ادا نہیں کرسکتا اور نا اتفاقی ایسی ہے کہ علحدگی ناگزیر ہے، اس صورت میں عورت کالمعلقہ ہو کر رہ جاتی ہے، بعض مرتبہ عورت خود مہر معاف کر کے اس تنگ زندگی سے برأت حاصل کرتی ہے، ورنہ شوہر ظلم وزیادتی کرنا شروع کردیتا ہے تاکہ عورت مجبور ہو کر مہر معاف کر کے اپنا راستہ اختیار کرلے، مرتی کیا نہ کرتی بالآخر مہر معاف کر کے رستگاری حاصل کرتی ہے، ان تمام پیدا ہونے والی خرابیوں اور ظلم وزیادتی کے اس دور میں اس طریقہ کار کو اختیار کرنے سے مسئلہ کا حل نہیں نکالا جاسکتا، طلاق کا غلط اور بے جا استعمال تو لاعلمی اور بے علمی کا نتیجہ ہے، جس کے واسطہ دوسرے مناسب اقدام کئے جاسکتے ہیں اس صورت کو اپنا لینے میں شریعت کی دی ہوئی آسانی کا ختم کرنا اور طلاق کے معاملہ کو دشوار بنانا ہوگا، اس لئے مناسب ہے کہ طلاق کے باب میں شریعت کی دی ہوئی آسانی کو برقرار رکھا جائے، احقر کی اس سلسلہ میں یہی رائے ہے جو وقت کا تقاضا اور مصلحت بھی ہے۔

**نوٹ:**......خیال جو ذکر کیا گیا ہے، اس میں یہ دو صورتیں داخل نہیں ہیں:

ایک عورت کے ہوتے ہوئے شوہر کا دوسری شادی کرنا، ایک مجلس میں عورت کو تین طلاق دینا، جو غیر مشروع اقدام ہے، ان دونوں میں مہر کی زیادتی کرنا مذکورہ مقصد کے تحت بالکل درست اقدام ہے، حالات اور مصلحت کے عین مطابق ہے، ان دونوں صورتوں میں شوہر کو کوئی حرج بھی لازم نہیں آتا، کیونکہ ضرورت کے تحت طلاق دے کر شوہر اپنی زوجیت سے خارج کرتا ہے تو کیا ضروری ہے کہ غیر مشروع طلاق کے طریقہ کو اپنائے؟ جو طریقہ شریعت نے مشروع قرار دیا ہے اس کے ذریعہ شوہر اپنے مقصد کو پورا کرسکتا ہے، اسی طریقہ سے دوسری شادی کرنا مستطیع ہونے کو بتلارہی ہے، اگر مالی اعتبار سے استطاعت نہیں رکھتا تو کیسے دوسری شادی کی طرف قدم بڑھاتا؟ لہذا ان دونوں صورتوں میں وہ علت نہیں پائی جارہی ہے جس کی وجہ سے مصلحت کے خلاف اس اقدام کو قرار دیا گیا تھا۔

☆☆☆

# مہر کی کمی اور زیادتی کو طلاق پر معلق کرنا

مولانا محمد عاقل قاسمی

اگر عورت بوقت عقد نکاح اس طرح کی شرط لگائے کہ میں اس شرط پر نکاح کروں گی کہ اگر مجھے طلاق دی تو میرا مہر بیس ہزار ہوگا، اور بصورت دیگر دس ہزار ہوگا، ایسی شرط عورت لگا سکتی ہے، اس بارے میں سوال نامہ میں مذکور جزئیہ اور اس کے علاوہ بہت سے جزئیات سے رہنمائی ملتی ہے، سوال نامہ میں مذکور جزئیہ یہ ہے کہ:

> اگر بوقت نکاح اس طرح مہر طے ہو کہ شوہر بیوی کو اس کے آبائی وطن سے باہر نہیں لے گیا تو مہر ایک ہزار ہوگا، اور اگر بیوی کو اس کے آبائی وطن سے باہر لے گیا تو دو ہزار ہوگا، اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین کے درمیان اختلاف ہے، امام صاحبؒ کے نزدیک جس مہر کا پہلے ذکر کیا گیا ہے اس کا تسمیہ صحیح قرار پاتا ہے اور پہلی شرط پائی جانے کی صورت میں متعین کردہ مہر (مہر مسمی) لازم ہوتا ہے، اور دوسری صورت میں ذکر کردہ مہر کا اعتبار نہیں ہوتا ہے، بلکہ دوسری شرط پائی جانے کی صورت میں مہر مثل لازم ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ مہر مسمی سے متجاوز نہ ہو، امام صاحب کے نزدیک دونوں شرطیں درست و صحیح قرار پاتی ہیں اور ہر دو صورت میں ذکر کردہ مہر (مہر مسمی) لازم ہوتا ہے۔

بالکل اسی طرح اور ایک جزئیہ ہے، کہ اگر عورت بوقت عقد نکاح یہ شرط لگائے کہ اگر شوہر کی پہلے سے کوئی عورت ہوگی تو مہر دو ہزار ہوگا، اور اگر شوہر کی کوئی عورت نہیں ہے تو مہر ایک ہزار ہوگا، اس میں بھی امام صاحبؒ اور صاحبین کے درمیان وہی اختلاف ہے جو پہلے جزئیہ میں ہے۔ (مبسوط للسرخسی ۹۰/۵ طبع دار المعرفہ، خانیہ ۳۷۸/۱)

مذکورہ جزئیات میں فتوی امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق ہونا چاہئے، کیونکہ تسمیہ کسی عقد میں ایک ہی ہوتا ہے، دو تسمیہ نہیں ہوتے، اگر دو تسمیہ ہوں تو دونوں میں تصادم ہوگا، نیز امام صاحبؒ کے قول سے عدول اسی وقت کیا جاسکتا ہے، جبکہ کوئی ضرورت ہو، یا امام صاحبؒ کی دلیل ضعیف ہو، دونوں میں سے کوئی ایک چیز بھی یہاں نہیں ہے، نہ ہی ضرورت ہے، کیونکہ اس ضرورت سے نمٹنے کے لئے دوسری قیدیں بڑھائی جاسکتی ہیں، جیسا کہ اس سے قبل گذرا اور نہ ہی امام صاحبؒ کی دلیل ضعیف ہے، جس سے اعراض کی گنجائش ہو۔

نیز قاضی خاںؒ کا طریقہ ہے کہ وہ راجح قول کو مقدم بیان کرتے ہیں، انہوں نے امام صاحبؒ کے قول کو مقدم بیان کیا ہے اسی کو ترجیح دی ہے ان کے علاوہ فقہاء نے بھی اسی پر فتوی دیا ہے، لہذا فتوی امام صاحبؒ ہی کے قول پر ہوگا، بصورت دیگر، یعنی اگر فتوی صاحبین کے قول پر ہو تو اس کا دروازہ کھل جائے گا کہ ہر شخص ایک بڑی مقدار میں مہر باندھنے لگے گا، جس کے نتیجہ میں شوہر طلاق کی اشد ضرورت کے وقت بھی اپنا حق استعمال نہ کر سکے گا، جبکہ شریعت نے طلاق کو اسی لئے مباح قرار دیا ہے کہ اگر نباہ کی کوئی صورت نہ رہے تو حسن خوبی کے ساتھ طلاق دے کر اجیرن زندگی سے نجات حاصل کر سکے، ورنہ مرد جنہیں اللہ تعالی نے عورتوں کا حاکم بنایا ہے انہیں عورتوں کا غلام بن کر رہنا پڑے گا، اور ان کا حق تلف ہو کر رہ جائے گا۔

## بوقت نکاح مہر کی کمی وبیشی کو دوسری عورت سے نکاح کرنے نہ کرنے پر معلق کرنا

اگر بوقت عقد نکاح عورت مرد پر یہ شرط لگائے کہ اگر میرے بعد کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو مہر بیس ہزار ہوگا اور اگر کسی دوسری عورت سے نکاح نہ کیا تو مہر دس ہزار ہوگا، یا اس جیسی اور کوئی شرط لگانا، اس میں وہی اختلاف ہے جو ماقبل میں گزرا کہ امام صاحبؒ کے نزدیک جس مہر کا پہلے

ذکر کیا گیا ہے اس کا تسمیہ صحیح قرار پاتا ہے اور پہلی شرط پائی جانے کی صورت میں متعین کردہ مہر (مہر مسمی) لازم ہوتا ہے، اور دوسری صورت میں (یعنی جب شرط پوری نہ کرے) تو ذکر کردہ مہر کا اعتبار نہیں ہوتا، بلکہ دوسری صورت پائی جانے کی صورت میں مہر مثل لازم ہوتا ہے، بشرطیکہ مہر مثل مسمی سے متجاوز نہ ہو اور اقل سے کم نہ ہو، اور صاحبین کے نزدیک دونوں شرطیں درست ہیں اور دونوں صورتوں میں مہر مسمی لازم ہوگا۔

یہ گفتگو تسمیہ کے متعلق تھی جہاں تک فی نفسہ اس شرط کی بات ہے تو یہ شرط لگانا شرط فاسد ہے جس سے نکاح پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا، اور نہ ہی ایسی شرطوں کو شوہر کے ذمہ پورا کرنا ضروری ہے "والنکاح لا یبطل بالشروط الفاسدۃ"۔ (مبسوط للسرخسی ۵/۹۵)

''بدائع الصنائع'' میں ہے:

''وقال ما شرط الزوج من طلاق المرأة وترك خروج من البلد لايلزمه في الحكم. لأن ذلك وعد وعدلها فلا يكلف به'' (بدائع الصنائع ۲۔ ۲۸۵)

لہذا شوہر کے ذمہ مذکورہ شرط کو پورا کرنا ضروری نہیں، کیوں کہ یہ شرط مقتضاء عقد کے خلاف ہے اور ایسی شرطوں کا حکم جو مقتضاء عقد کے خلاف ہوں، ماقبل میں بالتفصیل گذر چکا۔

لہذا اگر شوہر اپنا اخلاقی فریضہ انجام دیتے ہوئے اگر عورت کی شرط پوری کردے تو پہلا مہر مسمی لازم ہوگا اور اگر شرط پوری نہ کرے تو امام صاحبؒ کے نزدیک شوہر کے ذمہ مہر مثل لازم ہوگا، بشرطیکہ اقل مسمی سے کم اور اکثر سے متجاوز نہ ہو۔ (خانیہ ۱/۳۷۸)

(۳) بوقت عقد نکاح عورت کا سابقہ وابستہ ملازمت سے یا آئندہ ملازمت سے نہ روکنے کی شرط لگانا اور شوہر کا قبول کرنا، تو کیا ایسی شرط کی پابندی ضروری ہے؟ اور کیا عدم پابندی کی صورت میں عورت کے لئے شوہر کی تعمیل حکم ضروری ہے؟ عورت کے لغوی معنی ہیں چھپی ہوئی چیز، عورت کو عورت اسی لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی پوشیدہ رہنے کی چیز ہے، عورت کی مثال ایک ایسے گلاب کے پھول کی طرح ہے کہ جو ایک عام شاہراہ پر رکھا ہوا ہو اور ہر ایک اس کو چھوئے تو یقیناً وہ مرجھا جائے گا اور اس کی رنگت باقی نہیں رہے گی۔

☆☆☆

# انسداد طلاق کے لئے مہر میں اضافہ

مولانا احتکام الحق قاسمی

یہ حقیقت ہے کہ طلاق ایک ناپسندیدہ عمل ہے اور ساتھ ہی بعض ناگزیر حالات میں ایک ضرورت بھی، لیکن اس کے غلط اور بے جا استعمال سے بڑی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، جن سے معاشرہ تباہ و برباد ہو رہا ہے، لہذا اس کے بے جا استعمال سے بچنے اور غلط استعمال کو روکنے کے لئے سب سے بہتر صورت تو یہ ہے کہ لوگوں کو تین طلاق کی قباحت سے آشنا کرایا جائے، تین طلاق سے روکنے کے لئے مہر کی ایک خطیر رقم متعین کرنا مناسب نہیں، کیونکہ بعض دفعہ عورت کو طلاق دینا ضروری ہوتا ہے، لیکن مہر کی کثرت کو دیکھ کر وہ طلاق دینے سے عاجز رہتا ہے، نتیجہ عورت کالمعلقہ ہو کر رہ جاتی ہے، اگر چہ نکاح کے وقت اس طرح مہر طے کرنا کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کا مہر بیس ہزار اور اگر طلاق نہ دی تو دس ہزار، درست ہے، اور شرط کی جو بھی صورت پائی جائے گی وہی مہر لازم ہوگا، بس فرق یہ کہ امام اعظمؒ کے نزدیک شرط اول کی ایفاء کی صورت میں مہر مسمی لازم آئے گا اور عدم ایفاء، یعنی طلاق دے دینے کی صورت میں مہر مثل لازم آئے گا، اور حضرات صاحبین کے نزدیک دونوں صورتوں میں مہر مسمی لازم آئے گا، یعنی طلاق دینے کی صورت میں بیس ہزار اور نہ دینے کی صورت میں دس ہزار۔

## صاحبین کے قول پر فتوی:

اس مسئلہ (مسئلہ مذکورہ) میں گرچہ فتوی امام صاحبؒ کے قول پر ہے اور دوسری شرط صحیح نہیں ہے، لیکن بوقت حاجت وضرورت صاحبین کے قول پر فتوی دیا جاسکتا ہے، چنانچہ اس جگہ بھی اگر طلاق کے واقعات کو روکنے اور اس کے غلط اور بے جا استعمال کے سد باب کے لئے صاحبین کے قول پر فتوی دیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا علامہ ابن عابدین شامیؒ نے ضرورت کے تحت صاحبین کے قول پر فتوی دینے کو جائز قرار دیا ہے۔ (دیکھئے: رسم المفتی/۱۸)

فقہاء کی صراحت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب ابوحنیفہ میں سے کسی کے قول پر عمل کیا جائے تو وہ حقیقۃً امام ابوحنیفہؒ کے قول پر عمل کرنا شمار ہوگا، اس سے عدول نہیں سمجھا جائے گا، اس اعتبار سے بھی صاحبین کے قول پر فتوی دینے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ (رسم المفتی: ۱۶)

اسی طرح ایک دوسرا مسئلہ ہے کہ اگر نکاح کرتے وقت اس طرح کا مہر طے ہو کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقد نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس عورت کا مہر بیس ہزار روپے ہوگا اور اگر نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر دس ہزار ہوگا، اس مسئلہ میں بھی اگر چہ فتوی امام صاحبؒ کے قول پر ہے اور شرط اول صحیح اور شرط ثانی باطل ہے، لیکن حضرات صاحبین کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس طرح کا مہر طے کرنا میرے خیال میں صحیح و درست ہوگا، اور دونوں شرطیں بھی صحیح ہوں گی، اس لئے کہ بیوی کے آبائی وطن میں رکھنے، یا لے جانے میں ایک ہزار اور دو ہزار مہر طے ہو تو اس سلسلہ میں حضرات صاحبین نے دونوں شرطوں کو صحیح قرار دیا ہے، اسی طرح زیر بحث مسئلہ میں بھی تزوج کی شرط پر مہر متعین کرنے کو بھی صحیح قرار دیا جائے گا۔ (دیکھئے: ہدایہ ۳۲۹/۲)

☆☆☆

# بیوی کی طرف سے عقد نکاح میں ملازمت کی شرط

مولانا معین الدین قاسمی

## عورت کا ملازمت کے سلسلہ میں باہر نکلنا:

آج کل ترقی یافتہ دور میں جہاں مردوں کے لئے اعلی تعلیم کا رواج عروج پر ہے، وہیں ہمارے مسلم معاشرہ کی عورتوں میں بھی ہر طرح کی اعلی تعلیم کا رواج دن بدن ترقی پر ہے، چنانچہ حصول تعلیم کے بعد بہت سی عورتیں مختلف ملازمتوں سے بھی وابستہ ہوجاتی ہیں اور حکومت بھی عورتوں کی ملازمت پر دھیان دیتی ہے اور اسے ملازمت سے وابستہ کرتی اور جوڑتی ہے، ایسی صورت میں ایک امر یہ ہے کہ جب عورتوں کو اپنے آپ ملازمت ملے گی تو وہ سب اپنی ملازمتوں پر جائیں گی، اور شریعت کے اندر عورتوں کا اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر باہر نکلنا جائز و درست نہیں، لیکن اگر عورت بوقت نکاح عقد ہی کو اس شرط کے ساتھ طے کرلے کہ میں نکاح کرتی ہوں اس شرط کے ساتھ کہ مجھے وہ لگی ہوئی ملازمت سے نہیں روکے گا، یا آئندہ ہونے والی ملازمت سے نہیں روکے گا، اور شوہر اس شرط کو قبول کرے تو شوہر کے لئے اس شرط کی پابندی ضروری نہیں ہوگی، اور اگر شوہر اس شرط کو قبول کرنے کے باوجود عورت کو سلسلہ ٔملازمت ختم کرنے کا حکم دیتا ہے، یا نئی جو آئندہ ہونے والی ملازمت ہو اس سے روکتا ہے تو عورت پر شوہر کے اس حکم کی تعمیل ضروری ہوگی، اس لئے کہ یہ شرط شرط فاسد ہے جس کا ایفاء لازم نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ اخراج من البلد کے سلسلہ میں ہے کہ اگر شرط پوری کرے، ورنہ کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے۔ (مجلۃ الفقہ الاسلامی ۷ / ۵۴)

اس کے علاوہ فقہاء کرام کے اقوال وصراحتات سے بھی یہ فیصلہ سامنے آتا ہے کہ شوہر پر اس شرط کے قبول کرنے کے باوجود اس کی پابندی ضروری نہیں، نیز شوہر اگر بیوی کو روکے تو اس پر اس کی تعمیل ضروری ہوجائے گا، اور عدم تعمیل کی صورت میں گنہگار ہوگی۔ (فتح القدیر ۵ / ۳۸۵)

اسی طرح شامی کے اندر علامہ ابن عابدینؒ نے اس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ شوہر بیوی کو ان تمام کاموں سے منع کرسکتا ہے جن سے اس کے حق میں ضرر بالنقص پیدا ہوتا ہے، جس کے کرنے کی صورت میں بیوی کو شوہر کے گھر سے باہر نکلنا لازم آئے گا۔ (ردالمحتار ۳ / ۶۰۳)

قرآنی آیات اور احادیث میں اس بات کی ممانعت آئی ہے کہ عورت بغیر پردے کے باہر نکلے، اور اب رہی ملازمت کی اور تعلیم کی بات، اس کے متعلق احقر کی یہی رائے ہے کہ عورت تو پردہ میں رہنے والی ہے اور اس کے لئے ہر حالت میں پردہ ضروری ہے اور اسلامی معاشرہ میں بھی اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، اگر کوئی عورت ملازمت کرتی ہے اور اس میں کوئی ضرر اس کو محسوس نہیں ہورہا ہے اور حجاب کا معقول انتظام ہو تو ملازمت کرسکتی ہے اور تعلیم کے غرض سے باہر نکل رہی ہے اور اس میں پردہ کا انتظام ہے تو کوئی حرج نہیں، اور اگر اس کے باہر نکلنے میں اندیشہ ضرر ہے اور پردے کا معقول انتظام نہیں ہے تو وہ باہر نہیں نکل سکتی ہے اور ایسی حالت میں تعلیم کے غرض سے بھی نہیں نکل سکتی ہے، اور ان کو شوہر روک بھی سکتا ہے، اس کے روکنے پر شرعاً کوئی پابندی نہیں ہے، یہاں پر ایفاء شرط ضروری نہیں ہے، اگرچہ شوہر نے اس شرط کو قبول بھی کرلیا عقد نکاح کے وقت، ان کے شوہر کو جہاں پر ضرر ہوگا، تو وہ بلا تامل اپنی بیوی کو ایسی ملازمت اور ایسی تعلیم سے روک سکتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی نے پردے کے متعلق قرآن میں فرمایا۔

☆☆☆

# عورت کی طرف سے ملازمت کی شرط

مولانا سمیع اللہ قاسمی

۳۔ ملازمت کرنے والی عورتیں اگر نکاح کے وقت اپنے ہونے والے شوہر سے یہ شرط لگاتی ہیں کہ شوہر انہیں لگی ہوئی ملازمت کرنے سے نہیں روکے گا، اور اس شرط کو ہونے والا شوہر عقد نکاح کے وقت قبول کرتا ہے، تو اس طرح کی شرطیں شرعاً جائز اور درست ہیں، اور ان کو تیسری قسم کی شرائط میں شمار کیا جائے گا، اس سلسلہ میں فقہاء نے جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی خاتون کوئی ملازمت کرے یا صنعت وحرفت میں اپنے کو مشغول رکھے، دن کو مشغول رکھے اور رات کو گھر میں حاضر رہے، یا اس کا الٹا کرتی ہے، ان تمام صورتوں میں شوہر کو سپردگی کامل نہیں ہے اس لئے عورت کا ان پیشوں میں مشغول رہنا اس کی اجازت اور رضامندی کے بغیر، مثلاً ڈاکٹر ہے یا نرس ہے یا استانی ہے جائز نہیں ہے، شوہر اس سے روک سکتا ہے، ہاں اگر وہ شوہر کی رضامندی سے ان کاموں میں مشغول ہے تو شوہر اس ناقص سپردگی کو خود قبول کرلیا ہے، اس وجہ سے اس طرح کی شرطیں جائز اور درست ہیں۔

لیکن اس ذیل میں یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ اگر شوہر نے اس شرط کو قبول کر کے ایک بار اجازت دیدی ہے تو یہ اجازت دائمی نہیں ہوگی، بلکہ شوہر کو بعد میں روکنے کا اختیار ہوگا، اور عورت پر اس حکم کی پابندی ضروری ہے، ورنہ شوہر پر اس کا نفقہ لازم نہیں ہوگا اسی طرح اگر کسی شخص نے یہ جان کر بھی کہ اس کی ہونے والی بیوی کہیں ملازمت کرتی ہے، اس کے ساتھ نکاح کیا تو سمجھا جائے گا کہ وہ اس کی ملازمت کرنے پر راضی ہے اور اس کا نفقہ برقرار رہے گا، پھر اگر وہ اسے شادی کے بعد روک دے اور عورت اس حکم کی تعمیل نہیں کرتی ہے تو منع کرنے کے بعد کی مدت میں بصورت عدم تعمیل وہ مستحق نفقہ نہیں ہوگی۔

اگر عورت اپنے کاموں میں مشغول رہتی ہے اور دن کو گھر میں حاضر رہتی ہے یا اس کے برعکس کرتی ہے، تو اس کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں ہے، اور مجتبیٰ میں ہے اسی سے اس کا بھی جواب سمجھ میں آجاتا ہے جو ہمارے زمانے میں واقع ہے کہ اگر ملازمت یا کسی طرح کا پیشہ اختیار کرنے والی سے شادی کرتا ہے جو کہ رات کو حاضر رہتی ہے اور دن کو اپنے پیشہ میں مشغول رہتی ہے تو ایسی صورت میں اس کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں ہے۔

اب ان عبارتوں سے مسئلہ کا پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ ایسی شرطیں لگانا شرعاً جائز اور درست نہیں، لیکن شوہر کے لئے اس شرط کی پابندی ضروری نہیں ہے، اس وجہ کہ شوہر اس شرط کو قبول کرنے کے باوجود عورت کو سلسلۂ ملازمت سے روک سکتا ہے تو عورت کے لئے اس حکم کی تعمیل لازم اور ضروری ہے، اور اگر اس سے باز نہیں آتی ہے اور روکنے سے بھی نہیں رکتی ہے تو شوہر پر اس کا نفقہ واجب نہیں ہوگا۔

☆☆☆

# نکاح میں شرط ملازمت اور اس کا حکم

مولانا محمد منصور عالم قاسمی

آج کل عورتوں میں ہر طرح کی اعلیٰ تعلیم کا رواج ہوتا جارہا ہے اور تعلیم کے بعد بہت سی عورتیں مختلف ملازمتوں سے وابستہ ہوجاتی ہیں یا وابستہ ہونے کی جدوجہد میں لگی ہوتی ہیں، ایسی عورتیں اگر نکاح کے وقت اپنے ہونے والے شوہر سے یہ شرط لگاتی ہیں کہ شوہر انہیں ملازمت کرنے سے نہیں روکے گا، اور اس شرط کو ہونے والا شوہر عقد نکاح کے وقت قبول کرتا ہے، تو اس شرط کی پابندی شوہر کے لئے ضروری نہیں ہے، اور یہ شرط شرعاً درست نہیں ہے، اگر شوہر اس شرط کو قبول کرنے کے باوجود عورت کو سلسلہ ملازمت ختم کرنے کا حکم دیتا ہے، یا نئی ملازمت کرنے سے روکتا ہے، تو عورت کے لئے شوہر کے اس حکم کی تعمیل ضروری اور لازمی ہے، فقہاء کرام نے فرمایا کہ شوہر عورت کو سوت کاتنے سے روک سکتا ہے، نفل روزہ بغیر شوہر کی اجازت کے نہیں رکھ سکتی ہے، صرف غزل کی تخصیص نہیں ہے، بلکہ شوہر ایسے اعمال سے بیوی کو منع کرے گا جو اعمال کسب کا مقتضی ہو، وجہ ممانعت یہ ہے کہ بیوی کا نان ونفقہ شوہر پر لازم ہے، پھر کمانے کی کیا وجہ اور ضرورت ہے؟ اسی طرح کسی غیر کے لئے بھی کوئی عملہ نہیں کرے گی۔ (البحر الرائق ۴/ ۱۹۶)

شوہر بیوی کو ہر اس چیز سے روک سکتا ہے جو اس کے اور اس کی بیوی کے حق میں خلل واقع ہو، چنانچہ بیوی کے پاس پہلے شوہر کا بچہ ہے اور بیوی اس بچہ کو دودھ پلانا چاہتی ہے، اور تربیت کرنا چاہتی ہے تو شوہر کو حق ہے کہ بیوی کو دودھ پلانے سے روک دے، کیونکہ دودھ پلانے میں اور جاگنے میں تھکے گی، اور یہ تھکنا اور جگنا حسن کو کم کرے گا جو شوہر کا حق ہے، غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ شریعت نے حقوق زوج کا کتنا خیال رکھا ہے، اگر بیوی ملازمت کے لئے نکلے گی تو یقینی بات ہے کہ پورے دن کی تھکی ماندی رہے گی، جب شام میں آئے گی تو اپنے آرام وسکون کے فکر میں رہے گی، شوہر کا کیا خیال رکھے گی؟ بچے کی بھی صحیح تربیت نہیں کر سکے گی، گھر کا نظام بھی درست نہ رکھ سکے گی، جو عورت کا فریضہ ہے۔ (البحر الرائق ۴/ ۱۹۵)

حضرات فقہاء کرام نے عورتوں کو باہر نکلنے کے حدود بیان فرمائے ہیں کہ عورتیں شوہر کی اجازت سے کن کن صورتوں میں باہر نکل سکتی ہیں اور اس کے مواقع کیا ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں: شوہر بیوی کو سات جگہوں میں باہر نکلنے کی اجازت دے گا، والدین کی زیارت وملاقات ان دونوں کی عیادت وتعزیت، یا ان میں سے ایک کسی کی عیادت وتعزیت اور محارم کی تعزیت وزیارت، عورت اپنے حق کے لئے جو کسی دوسرے پر ہو اور حج کے لئے بغیر شوہر کی اجازت کے بھی نکل سکتی ہے، ولیمہ میں شرکت کے لئے شوہر بیوی کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں دے گا، اور نہ بیوی باہر نکل سکتی ہے، اگر شوہر نے بیوی کو باہر نکلنے کی جازت دیدی اور بیوی نکل گئی تو دونوں گناہ گار ہوں گے، جن صورتوں میں عورتیں باہر نکل سکتی ہیں ان صورتوں میں کہیں یہ ذکر نہیں ملتا ہے کہ بیوی ملازمت کے لئے باہر نکل سکتی ہے، اگر عورتوں کو ملازمت کے لئے نکلنا جائز اور مناسب ہوتا تو ضرور فقہاء کرام ذکر فرماتے، لیکن کہیں اس کا تذکرہ نہیں ملتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ عورتوں کا بغرض ملازمت باہر نکلنا درست اور مناسب نہیں ہے، ولیمہ جو سنت نبوی ہے اور دعوت قبول کرنا سنت ہے، لیکن اس میں عورتوں کی شرکت ممنوع ہے، وجہ ممانعت میرے خیال میں ابتلاء فتنہ اور معصیت ہے، جب سنت نبوی میں شرکت فتنہ اور معصیت کی وجہ سے ممنوع ہے، تو ملازمت کے لئے باہر نکلنے کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے جب کہ بیوی کو اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کا نفقہ شوہر پر لازم اور واجب ہے۔ (البحر الرائق ۴/ ۲۱۲)

اگر کوئی عورت اپنے نفس کو دن میں شوہر کے حوالہ کرے، لیکن رات میں حوالہ نہ کرے، یا اس کے برعکس، تو اس صورت میں بیوی نفقہ کی مستحق نہیں ہے، اس لئے کہ تسلیم نفس ناقص ہے، اس سے اس پیشہ ور عورت کا حکم معلوم ہوا، جو دن کا اکثر حصہ کارخانہ میں گزارے، اور رات شوہر کے

ساتھ، تو اس صورت میں بھی عورت نفقہ کی مستحق نہیں رہتی ہے، اس سے پتہ چلا کہ عورت کے لئے تسلیم نفس کامل طور پر ضروری ہے، ملازمت کی صورت میں ظاہر ہے کہ نفس کی تسلیم کامل نہیں ہوگی، جو شوہر کا حق ہے، اس لئے عورت بغرض ملازمت باہر نہیں نکل سکتی ہے۔ (البحر الرائق ۴؍ ۱۹۵)

اس آیت میں پردہ کے متعلق اصلی حکم یہ ہے کہ عورتیں گھروں میں رہیں (یعنی بلاضرورت شرعیہ باہر نہ نکلیں) اور زمانہ جاہلیت کی طرح بے پردہ نہ پھریں۔

اس آیت سے پردہ کے متعلق دو باتیں معلوم ہوئیں: اول یہ ہے کہ اصل مطلوب عند اللہ عورتوں کے لئے یہ ہے کہ وہ گھروں سے باہر نہ نکلیں، ان کی تخلیق گھریلو کاموں کے لئے ہوئی ہے، ان میں مشغول رہیں اور اصل پردہ جو شرعاً مطلوب ہے وہ حجاب بالبیوت ہے، اگر چہ ضرورت کے وقت باہر نکلنے کی اجازت ہے، لیکن عورت کا ملازمت کے لئے شوہر کے موجود ہوتے ہوئے باہر نکلنا درست نہیں، ضرورت کہتے ہیں جس کے بغیر ضرر ہو ظاہر ہے کہ عورتوں کو نہ نکلنے میں ضرر نہیں ہے۔

پردہ سے متعلق تمام آیات واحادیث کا اصل مطلوب شرعی حجاب ہے، یعنی عورتوں کا وجود اور ان کی نقل وحرکت مردوں کی نگرانی میں مستور ہو، ملازمت کی صورت میں اس حکم پر عمل کرنا مشکل اور دشوار ہے، غور فرمائیں جس شریعت نے نماز جیسی اہم عبادت کو مردوں کے ساتھ مسجد میں ابتلاء فتنہ اور معصیت کی وجہ سے ممنوع قرار دیا، وہ شریعت عورتوں کو ملازمت کے لئے باہر نکلنے کی اجازت کیسے دے سکتی ہے؟

''سنن ترمذی'' میں حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إذا خرجت المراة استشرفها الشيطان" (عورت جب گھر سے نکلتی ہے، تو شیطان اس کو تاک لیتا ہے) (یعنی اس کو مسلمانوں میں برائی پھیلانے کا ذریعہ بناتا ہے) اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اس حدیث میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں:

''وأقرب ماتكون من وجه ربها وهي في قعر بيتها''

(یعنی عورت اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے گھر کے بیچ میں مستور ہو)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل عورتوں کے لئے یہی ہے کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹھیں، باہر نہ نکلیں، اور ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے

''ليس للنساء نصيب في الخروج الا مضطرة''

(یعنی عورتوں کا باہر نکلنے میں کوئی حصہ نہیں سواء اس کے کہ گھر سے باہر نکلنے کے لئے کوئی اضطراری صورت پیش آئے)۔

اس حدیث میں اضطرار کی صورت میں نکلنے کی اجازت دی گئی ہے، غور کیجئے کیا ملازمت کے لئے عورتوں کا باہر نکلنا اضطرار ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ صورت اضطرار کی نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ عورتیں شوہر کے موجود ہوتے ہوئے گھر سے باہر ملازمت کے لئے نہ نکلیں، خصوصاً یہ زمانہ پرفتن ہے جس میں ابتلاء معصیت وفتنہ وفساد کا عموم ہے، اس لئے وقت کی نزاکت کا خیال رکھتے ہوئے بلاضرورت عورتوں کو ملازمت کی اجازت نہ دی جائے۔

☆☆☆

# خواتین کی طرف سے شرط ملازمت

مولانا محمد نظام الدین قاسمی

تعلیم و تعلم کا دروازہ ہر دور میں اسلام نے مردوں کی طرح عورتوں پر بھی کھلا رکھا ہے، بلکہ ضروریات دین کے بقدر تحصیل علم کو فرض قرار دیا گیا ہے، عہد رسالت میں اس کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کی تعلیم کے لئے ہفتہ میں ایک دن مقرر کر رکھا تھا، جس کے نتیجہ میں عورتوں نے علم کے میدان میں اپنا ایک خاص مقام بنالیا تھا، اور اکثر مردوں کو عورتوں کی طرف مسائل کے سلسلہ میں رجوع کرنا پڑتا تھا، تابعین کے دور میں بھی عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی جو عہدہ قضاء وافتاء سے لے کر طب اور صنعت کے فن تک سے واقف تھیں، لہذا اس دور میں بھی اگر خواتین علم کا حصول شریعت کے حدود میں رہ کر کریں تو جائز ہی نہیں، بلکہ بہتر قدم ہوگا، جس کی وجہ سے عورتوں کو عورتوں سے مسائل معلوم کرنے میں آسانی اور سہولت ہوگی۔

اگر بیوی نے شوہر سے یہ شرط لگائی کہ اس کو لگی ہوئی ملازمت سے یا آئندہ متوقع ملازمت سے نہیں روکے گا، تو اگر یہ شرط اسلام کے موافق ہوگی، مثلاً پردہ کا اہتمام ہو، باہر نکلنے کے لئے شوہر کی اجازت ہو، جو مرد کا عورت پر ازدواجی حق ہے، غیر محرم اور اجنبی مردوں سے اختلاط اور تنہائی کی نوبت نہ آتی ہو۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی بیوی سے مروی ہے کہ وہ اپنی کمائی سے اپنے شوہر اور اپنے اہل وعیال کی کفالت کرتی تھیں۔ (طبقات ابن سعد ۸ / ۲۱۲)

تاہم شریعت نے عورت پر مرد کا یہ حق رکھا ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر باہر نہ نکلے اور شریعت کا منشاء بھی یہی ہے کہ عورتیں گھر ہی کو اپنی محنت کا میدان بنائیں، اس لئے یہ شرط واجب الایفاء نہ ہوگی، جیسا کہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

''بخلاف ما لو شرط شرطا فاسدا کما لو تزوجته علی أن لایطأھا فإنه یصح النکاح ویفسد الشرط'' (ردالمحتار علی الدر المختار ۳۔ ۱۳۱ (کراچی)

☆☆☆

مناقشہ:

# (ذیلی کمیٹی کی مجوزہ تجویز)

قانون فطرت سے مطابقت مصالح انسانی کی پوری پوری رعایت، توازن واعتدال، عدل وصلاحیت اور اہلیت کے مطابق حقوق واجبات کا متعین کرنا، شریعت اسلامی کی نمایاں خصوصیت اور اس کا اولین امتیاز ہے، اسلام کے عائلی قوانین بھی اسی خصوصیات کے حامل ہیں اور انسان کی سماجی ضروریات اور مصالح کی پوری طرح تکمیل اور معاشرتی مشکلات اور دشواریوں کا نہایت متوازن حل پیش کرتے ہیں، مگر افسوس کہ احکام شریعت سے ناآگاہی اور اس پر عمل کرنے میں کوتاہی، دوسری اقوام کی بعض رسوم سے تاثر اور خصوصیت سے نظام قسط کے فقدان کے باعث ہمارے معاشرے میں بعض پیچیدگیاں پیدا ہورہی ہیں، جن کو ہمیں شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے حل کرنا ہے، اس پس منظر میں نکاح کے ساتھ عورت کو حق طلاق کی تفویض اور مہر کے بعض مسائل کی بابت غور کیا گیا اور درج ذیل تجاویز منظور کی گئیں:

نکاح کے وقت ایسی باتوں کی شرط لگانا جن کو شریعت نے واجب ولازم قرار نہیں دیا ہے اور نہ ان سے منع کیا ہے، بلکہ ایسی شرطوں کے ذریعہ مرد اپنے بعض حقوق سے باز آجاتا ہے، ایسی شرطیں معتبر نہیں۔

۱۔ نکاح میں اگر ایسی شرطیں لگائی جائیں جو نکاح سے واجب ہونے والی ذمہ داریوں اور حقوق کو ہی مؤکد کرتی ہوں تو وہ معتبر ہیں، اور شوہر پر ان کو پورا کرنا واجب ہے۔

۲۔ نکاح کے وقت ایسی شرائط لگانا جو عقد نکاح کے تقاضوں کے خلاف ہوں، یا شریعت نے ان سے منع کیا ہو تو غیر معتبر ہیں، جیسے شوہر کا نفقہ نہ دینے کی شرط لگانا، یا جہیز تلک کی شرط لگانا، دوسری موجودہ بیوی کو طلاق دینے کی شرط لگانا، ایسی شرطیں معتبر نہیں۔

۳۔ اسلام نے انسانی فطرت، ضرورت اور مختلف مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے تعدد ازدواج کی اجازت دی، لیکن زوجہ کے درمیان عدل کو واجب قرار دیا اور اگر عدل نہ کرنے کا خطرہ ہو تو ایک ہی بیوی پر اکتفاء کا حکم دیا گیا، موجودہ صورتحال یہ ہے کہ اکثر اوقات تعدد ازدواج کی صورت میں زوجہ کے درمیان عدل نہیں کیا جاتا ہے، دوسری طرف مغرب کی تقلید میں تعدد ازدواج کو مطلقاً ممنوع قرار دئے جانے کے لئے قانون سازی کا مطالبہ کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ خود بسا اوقات فتنہ کا موجب ہوتا ہے، یہ صورت حال کہ ضرورت کے وقت بھی تعدد ازدواج ممنوع اور دوسری طرف تعدد ازدواج کی صورت میں عدل کا فقدان اور معاشرہ میں عورتوں پر ظلم کا رواج ہو جائے شرعاً قابل قبول نہیں، اس پس منظر میں اکیڈمی کا یہ سمینار طے کرتا ہے کہ نکاح کے وقت مصالح ومقاصد شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ شرط لگائی جاسکتی ہے کہ شوہر نکاح ثانی کی ضرورت محسوس کرنے پر دار القضاء یا کسی مستند یا متعین ادارہ کے سامنے اپنی ضرورت پیش کر کے نکاح ثانی کی اجازت حاصل کرنے کے بعد ہی نکاح ثانی کرے، ایسی صورت میں شوہر پر اس شرط کا پورا کرنا واجب ہوگا۔

۴۔ شریعت نے طلاق کا اختیار انسان کی فطری صلاحیت اور معاشرتی ذمہ داریوں کا لحاظ کرتے ہوئے مرد کو دیا ہے، جو عقل وفطرت کا عین تقاضا ہے، تاہم مرد کو یہ اختیار ہے کہ وہ خود زوجہ کو یا کسی تیسرے شخص کو طلاق کا مالک بنا سکتا ہے، ایسی صورت میں اس عورت کو اپنے آپ پر یا اس تیسرے شخص کو عورت پر طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوگا، لیکن اس تیسرے شخص کے طلاق واقع کرنے سے قبل مرد کا حق سلب نہیں ہوگا، بلکہ وہ خود بھی اس حق کے استعمال کا مجاز ہوگا

۵۔ عورت کو تفویض طلاق کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

الف۔ نکاح سے پہلے ہی تفویض طلاق کی جائے، ایسی صورت میں ضروری ہے کہ تفویض طلاق کو نکاح کے ساتھ مشروط کیا جائے کہ اگر میں تم سے نکاح کروں

توتم کو فلاں فلاں شرطوں کے ساتھ اپنے آپ پر اتنی طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

ب۔ نکاح کے وقت تفویض طلاق کی جائے، اس صورت میں ضروری ہے کہ تفویض طلاق کی شرط عورت یا اس کے ولی کی طرف سے پیش ہو اور مرد قبول عقد کے وقت اس شرط کو بھی قبول کرے۔

ج۔ نکاح کے بعد بھی تفویض طلاق ہوسکتی ہے۔

د۔ تفویض طلاق کے ذریعہ چونکہ عورت اپنے طلاق کی مالک ہوجاتی ہے، اس لئے یہ مسئلہ بہت نازک ہے، اور اندیشہ ہے کہ اگر تفویض کو غیر مشروط رکھا جائے تو اس حق کا غلط استعمال ہونے لگے، اس لئے اس کے ساتھ ایسی قیدیں بھی لگادی جائیں کہ اس کا شرعی و معاشرتی مصالح کے مطابق استعمال کیا جائے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے مناسب ہوگا کہ دار القضاء یا اصلاح بین المسلمین کا کام انجام دینے والے کسی ادارے سے تصدیق کی جائے کہ شوہر نے اس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے، اور وہ تفریق کو مناسب سمجھتا ہے، اس کے بعد ہی عورت کو اپنے او پر طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوگا، اور اگر وہاں کوئی ایسا ادارہ موجود نہ ہو تو چند بابصیرت متدین اور احکام دینی سے واقف افراد کے نام بھی لکھے جاسکتے ہیں جو شوہر کی جانب سے زیادتی اور حقوق زوجیت سے غفلت محسوس کریں تو عورت کو اپنے او پر طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

ھ۔ تفویض طلاق میں تین طلاق بطریق سنت، یا ایک طلاق بائن کا حق تفویض کیا جائے کیونکہ ایک دفعہ تین طلاقوں کا واقع کرنا طلاق بدعت اور سخت گناہ ہے۔

۶۔ طلاق کے واقعات کو کم کرنے اور اس کے بے جا استعمال سے بچانے کے لئے بہتر ہے کہ جہاں دار القضاء یا کوئی دوسرا معتبر ادارہ موجود ہو، وہاں تفویض طلاق عورت کے بجائے اسی ادارہ کو کیا جائے کہ اگر زوجین کے بابت وہ محسوس کرے کہ ان میں تفریق بہتر ہے تو وہ عورت پر ایک طلاق بائن واقع کردے۔

۷۔ اگر کسی معاملہ میں مرد کی طرف سے زیادتی کا اندیشہ ہو تو یہ درست ہے کہ نکاح کی دو صورتوں کے ساتھ مہر کی دو مقدار متعین کی جائے۔

مثلاً اگر کہا جائے کہ فلاں خاتون کا مہر بیس ہزار ہوگا، اگر شوہر نے اس کی موجودگی میں دوسرا نکاح کیا، یا اس منکوحہ کو طلاق دے دی، اور اگر ایسا نہیں کیا تو اس کا مہر دس ہزار ہوگا، ایسی صورت میں یہ شرط معتبر ہوگی، اور اگر مرد نے دوسرا نکاح کیا یا اس منکوحہ کو طلاق دے دیا تو مہر بیس ہزار روپے دینے ہوں گے، ورنہ دس ہزار ہی واجب ہوگا، تاہم بہتر ہے کہ اس طرح کی شرطیں لگانے کے بجائے یہ قید لگادی جائے کہ اگر مرد نے دار القضاء یا فلاں ادارہ یا اشخاص کی اجازت کے بغیر دوسرا نکاح کیا، یا طلاق دی تو بیس ہزار واجب ہوگا ورنہ دس ہزار، ایسی صورت میں اگر متذکرہ ادارہ یا شخص نے مصالح شرعی کے تحت محسوس کیا کہ واقعی اس کو دوسرے نکاح کی ضرورت ہے، یا اس کے لئے طلاق دینے کے سوا چارہ نہیں اور اجازت دے دی تو مہر مقررہ، مثلاً دس ہزار روپے ہی بطور مہر واجب ہوں گے۔

۸۔ اگر زوجین میں کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو شریعت نے تحکیم و ثالثی کا اصول مقرر فرمایا ہے، تاکہ زوجین کے درمیان ممکنہ حد تک موافقت و مصالح کی راہ نکالی جاسکے، اور اگر دونوں کا معروف طریقہ پر ایک ساتھ رہنا ممکن نہ ہو تو تفریق کا راستہ اختیار کیا جائے۔

**مولانا سید نظام الدین:** ...... اس وقت جو حالات ہمارے سامنے ہیں اس کے تحت نکاح نامہ میں شرائط اور تفویض طلاق کا درج کیا جانا بالکل مناسب نہیں ہے، کیونکہ ایک تو آجکل یونہی رشتے نہیں ملتے اور پھر ان شرطوں کے ساتھ کون نکاح کرنے پر آمادہ ہوگا، پھر نکاح کا جو ماحول ہوتا ہے وہ عام طور پر خوشگوار ماحول ہوتا ہے، اعتماد و انس کا ماحول ہوتا ہے، اس موقع پر تفویض طلاق کی بات کرنے سے باہمی اعتماد کو ٹھیس پہنچے گی، اس سے مجھے اختلاف نہیں کہ شرعاً تفویض طلاق کی گنجائش ہے، لیکن نکاح کے وقت تفویض طلاق کو لکھا جانا نہ ضروری ہے نہ مناسب، بلکہ یہ مقاصد شریعت کے بھی خلاف بھی ہے اس سے طلاق کم ہونے کے بجائے بڑھے گی، اور مردوں کی طرف سے ہونے کے بجائے عورتوں کی طرف سے زیادہ طلاق ہوگی، اس لئے آپ میرے اختلاف کو نوٹ کرلیں، میں اس کا قطعاً حامی نہیں ہوں کہ نکاح نامہ میں یا عقد نکاح کے وقت عورت کو مرد کی طرف سے یہ اختیار دیا جائے۔

**قاضی صاحب:** ...... مسئلہ یہاں شرعی نقطہ نظر سے زیر بحث ہے، اور شرعاً غور کرنا ہے کہ اگر عورت یہ کہتی ہے کہ میں آپ سے اس شرط پر نکاح کرتی ہوں کہ فلاں فلاں حالات میں مجھے حق ہوگا کہ میں اپنے نفس پر طلاق دیدوں، یا قاضی یا برادری کا سردار مطمئن ہوجائے کہ مجھ پر زیادتی ہوتی ہے تو میں اپنے آپ پر

طلاق واقع کرلوں اور مرد نے کہا کہ میں نے قبول کیا تو یہ تفویض صحیح ہوگی یا نہیں۔

**مولانا محمد رضوان القاسمی:**...... میں اس موقع پر سب سے پہلی بات یہ کہنا چاہوں گا کہ یہ اہل علم و اہل افتاء حضرات کا معزز مجمع ہے، اور اس میں کوئی ایسا فیصلہ نہ ہونا چاہئے جو ہندوستان کے موجودہ حالات میں، بہت سارے فتنے کا موجب بنے، اگر تفویض وغیرہ کے مسئلے کو اگر نکاح نامے میں داخل کر دیا گیا، اور یہ بھی احساس ہے میرا کہ یہ چیز جو آئیں گی وہ دراصل اس بات کا احساس دلاتی ہیں کہ طلاق کی شرح بہت بڑھ گئی وہ گویا ارون شوری وغیرہ مسلمانوں کے بارے میں جو لکھتے آرہے ہیں ہم اس پروپیگنڈہ سے متاثر ہوگئے ہیں اور اس پروپیگنڈہ سے متاثر ہونے کی وجہ سے ہم نے یہ تمام جزئیات اور تفصیلات بیان کی ہیں، ظاہر بات ہے آپ حضرات مالی دشواریوں کا تذکرہ کرتے ہیں کہ نکاح سب سے بابرکت وہ ہے جس میں سب سے کم خرچ ہو، مالی، دشواریاں اور دقتیں نہ ہوں، لیکن ایسا نکاح جس میں ہم شرط لگائیں ذہنی طور پر، بہت بار کا باعث ہوگا، تو ایسا نکاح بھی کسی طرح مطلوب ہوسکتا ہے؟ تو میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جیسے مغربی ممالک نے مسلمانوں کے خلاف یا اسلامی تعلیمات کے خلاف پروپیگنڈہ کیا ہے، اس میں، بہت حد تک اس کو تقویت پہنچانے والے اجزاء موجودہ ہیں، میرا اپنا احساس یہ ہے کہ اگر تفویض کی کوئی بات آتی ہے چاہے جو بھی اس کی صورت ہو، طلاق کی شرح بڑھ جائے گی، معاشرہ سدھرے گا نہیں، بلکہ بگاڑ کی طرف چلا جائے گا، اصلاح نہ ہوگی، بلکہ اور فساد کا دروازہ کھل جائے گا، اس لئے ہمیں دیکھنا ہے، اور ان حالات کے اعتبار سے سب سے بہتر طریقہ تو وہی ہے، ابھی بھی طلاق کی شرح پوری دنیا میں مسلمانوں میں سب سے کم ہے۔

ہاں دار القضاء کے مسئلہ کو بڑھایا جائے، تحکیم کی جو صورت ہوسکتی ہے اس کو اور اس جذبے کو آگے بڑھایا جائے، میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا تھا وہ یہ کہ اشتراط ہو لیکن یہ حق مرد اپنے علاوہ کسی دوسرے کو دے سکتا ہے اور اس میں نائب بنا سکتا ہے، اس لئے اگر عورت نکاح میں خاص الفاظ کے ساتھ اس حق طلاق کو تفویض کی صورت میں حاصل کرنا چاہے تو کرسکتی ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ یہ حق مطلق نہ دیا جائے، بلکہ کچھ خاص شرائط پر دیا جائے۔

**قاضی صاحب:**...... اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ امتیاز اور اعزاز ہے کہ اس نے اختلاف رائے کو ہمیشہ برداشت کیا ہے، سنا ہے اور گورا کیا ہے، اور اسی سے اس کا یہ امتیاز باقی ہے۔

**مولانا سید نظام الدین:**...... دوسری بات جو ایک سے زیادہ شادی سے متعلق کہی گئی ہے اس پر بھی غور کرنا چاہئے، شریعت نے ایک سے زیادہ شادی کی اجازت دی ہے، حکم نہیں دیا ہے، اگر کسی نے غلط طریقہ پر دوسری شادی کی ہے تو اس کی سزا آپ کیا مقرر کرسکتے ہیں؟ سماج اس کو کیا سزا دے سکتا ہے؟ اور اس پر کیسے کیسے روک لگا سکتی ہے؟ وہ تو ضرور کیجئے، لیکن فقہی نقطۂ نظر سے محض جواز کی وجہ سے محض دس ہزار یا بیس ہزار مہر دینا مسئلہ کا حل نہیں ہے یہ تو کچھ نہیں شوہر پچاس ہزار دے سکتا ہے، لیکن کیا اس سے عدل قائم ہوجائے گا۔

ہاں تحکیم کی جو بات کہی گئی ہے وہ سارے مسئلے کا حل ہے کہ آئندہ زوجین میں کبھی کوئی اختلاف ہوا تو اس میں نہ لڑکی عجلت کرے گی اور نہ لڑکا عجلت کرے گا، بلکہ یہ قرآن کے حکم کے مطابق اپنے اپنے خاندان سے حکمیں منتخب کریں گے اور اگر اپنے اہل خاندان میں حکم نہ ہوں تو دار القضاء یا علماء جو مستند ہوں ان سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کوئی اقدام کریں گے یہ ضرور لکھا جانا چاہئے، کیونکہ اس کی اجازت شریعت نے آپ کو دی ہے اور حل قرار دیا، اس کی میں تائید کرتا ہوں۔

**کوئی خاتون:**...... طلاق کا مسئلہ ہو یا وراثت کا یا خلع کا، میرے خیال میں ضروری چیز یہ ہے کہ لوگوں کو (Educate) کیا جائے، ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھادی جائے کہ یہ غلط ہے یہ صحیح ہے، اس وقت یہ معاشرہ سدھرے گا اور سب سے بڑی چیز ہوتی ہے خوف خدا، جب انسان میں خدا کا خوف نہ ہو، نہ آخرت کا ڈر ہو تو وہاں نہ قانون کام آتا ہے نہ ہی کوئی تدبیر کام آتی ہے، وہ انسان اپنا راستہ خود بخود نکال لیتا ہے، سب سے پہلی چیز جو ہے وہ یہ ہے کہ ہم اسلامی قوانین سے واقف ہی نہیں ہیں، نہ تو خواتین واقف ہیں، نہ ہی ہمارے مرد واقف ہیں تو پہلے ضرورت یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے یا جس طرح مناسب سمجھتے ہیں آپ ان کو (Educate) کریں۔

**قاضی صاحب:**...... میں آپ حضرات سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ اگر ہم ان تفصیلات میں جائے بغیر صرف ان تین اصولوں کا ذکر کردیں کہ وہ شرائط جو مقتضاء عقد کے مطابق ہیں ان میں کوئی مسئلہ نہیں ہے وہ معتبر ہیں، اور جو شرائط مقتضاء عقد کے خلاف اور ممنوعات کی ہیں ان کا اعتبار نہیں ہوگا، اور ایسی شرائط جو ممنوع ہیں

نہ مامور ہیں، ایسی شرائط کا لگانا جائز ہوگا، اگر ان تین باتوں پر اس تجویز کو ہم یہاں پر منظور کردیں تو کیسا رہے گا؟

**مولانا قاری امداد اللہ:**......ایک چھوٹا سا مسئلہ یہ ہے کہ طلاق، خلع اور فسخ تینوں چیزیں اسی غرض سے مشروع ہوئیں کہ بعد میں کوئی ایسی صورت حال پیش آئے تو مرد اور عورت اس سے فائدہ اٹھائیں، جب وہ اسی غرض سے مشروع ہوئے تو پہلے سے تذکرہ کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

**قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب:**......میں اپنے جائزے کے مطابق اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ نکاح ثانی جیسا کہ میں نے ۹۰ فیصد کہا تھا، میں اس سے آگے بھی جانے کو تیار ہوں کہ نکاح ثانی کے بعد پہلی بیوی کے ساتھ عدل بہت دور کی بات ہے، واجب اور جائز حد تک بھی اس کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا، اتنی بڑی معاشرتی حقیقت کو آپ نظر انداز کردینا چاہتے ہیں اور اس کا حل نہیں نکالنا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے حل ہم اسی دائرے میں نکالیں گے، جہاں تک فقہاء نے گنجائش ہمیں دی ہے، قانون سے اس کو ہم منع کروادیں گے کہ (Polygyny) حرام ہے، نہیں کرسکتا کوئی بھی شخص، تو قانون ظاہر ہے بنے گا، پھر جو ضرورت کے حالات ہیں تو ان حالات میں بھی تعدد ازدواج نہیں ہوسکے گا، اس کا اثر معاشرہ پر بہت گہرا پڑے گا، آپ چاہیں گے تو مجھے کوئی اس میں تکلیف نہیں ہے کہ اس پوری بحث کی جملہ تجاویز کو ختم کردیا جائے تو ہم نے کوئی بحث ہی نہیں کی، بہرحال ہمیں ایک ایسی بات کہنی ہے جس پر عام لوگوں کا بھی اتفاق ہونا چاہئے، اس معاشرتی حقیقت کو کہ یہ میری ایک بہن نے کہا اللہ ان کو جزائے خیر دے، لیکن جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ ہم نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم سے، امارت شرعیہ سے یا جہاں جہاں جو لوگ بھی ادارہ چلارہے ہیں وہ مسلمانوں سے یہ بات بار بار کہہ رہے ہیں کہ عدل کرو، انصاف کرو، ان کو ان چیزوں کی دعوت دے رہے ہیں، وہ اپنی جگہ پر سب کچھ صحیح ہے، لیکن اس کے باوجود بھی یہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اس لئے اس کے لئے کوئی قانونی تدبیر بھی تلاش کرنی ہوگی۔

میں نے کہا ان لوگوں سے کہ اگر تم واقعی مسلمانوں کو اس کا اطمینان دلادو کہ یونیفارم سول کوڈ دفعہ ۴۴ کے ذریعہ احکام شریعت میں تحریک و ترمیم نہیں کروگے تو موجودہ معاشرتی مسائل کا حل خود اسلام کے سانچے میں ہم نکالنے کی پوزیشن میں ہیں، یہ خوف ہمارا ہے، اور اس خوف کی وجہ سے قدم بہت احتیاط سے اٹھانا پڑتا ہے، اس لئے اشتراط فی النکاح کے یہ چند اصول بنتے ہیں، اسی میں ایک قاعدہ یہ بھی ہے زیادتی مہر یا تخفیف مہر کا کہ دو صورتوں میں دو قسم کا مہر مقرر ہوسکتا ہے، مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے یہ لوگ زیادہ بتائیں گے کہ کچھ اور مسلک کے فقہاء نے بھی غالباً زیادتی مہر اور قلت مہر والی بات لکھی ہے، حنابلہ کا مسلک اشتراط کے بارے میں سب سے زیادہ جائز قرار دیا ہے، ان حالات میں آپ لوگ غور کریں، دوسرا مسئلہ بالکل الگ ہے، کہ نکاح نامہ کیا ہو نہیں ہو؟ ظاہر ہے قطعی عملی چیز ہے، مرد کہیں پر راضی ہوگا، کہیں پر راضی نہیں ہوگا نکاح نامہ کی بحث بالکل الگ ہے، میں اس سلسلہ میں یہ صرف تین اصول بیان کررہا ہوں کہ کس قسم کی شرطوں کا نکاح میں لگانا جائز اور کس قسم کی شرطوں کا لگانا نہیں جائز، کس قسم کی شرطیں معتبر، کونسی شرطیں غیر معتبر، یہ تین قسمیں جو تمام فقہاء نے لکھی ہیں اس کو لکھ کر اصول کی حد تک چھوڑ دیا جائے، اب اس کے بعد اگر تفصیلات میں جانا ہے کہ عورت ملازمت کرنا چاہتی ہے یا ملازمت کررہی ہے، اس سلسلہ میں آپ لوگ کیا حکم دیں گے، اگر مرد یہ شرط لگادے کہ ملازمت نہیں کرنی پڑے گی بیوی کو نوکری سے روک سکتا ہے کہ نہیں؟ یا کس قسم کی نوکری کرے کس قسم کی نہیں؟ ان ساری تفصیلات کو ظاہر ہے کہ ہم آج طے نہیں کرسکتے، اس کی روشنی میں آپ لوگوں کی جو رائے ہو وہ تجویز لکھی جائے، یا اشتراط فی النکاح کی پوری شرط کو خارج قرار دیا جائے۔

**مفتی شبیر:**......حالات کے اعتبار سے چند باتیں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے یہاں مغربی یوپی میں مرادآباد میں محکمہ شرعیہ عدالت موجود ہے، اور عدالت میں ہم لوگ کام کرتے ہیں، تو یہ بات کہنا چاہ رہا تھا کہ میں خود بتلا رہا ہوں، اسی بات کی تشریح کرنا چاہ رہا تھا، ہمارے یہاں جتنے مقدمات آرہے ہیں، ان تمام مقدمات میں ایسا ہے کہ کم از کم ستر فیصد مقدمات ایسے ہیں جن میں عورت کی زیادتی کی وجہ سے یہ نوبت آتی ہے، اور زیادہ سے زیادہ ۲۰ یا ۳۰ فیصد مقدمات ایسے ہیں جن میں شوہر کی تعدی کی بنا پر یہ نوبت آئی، ہمارے یہاں پورے سال میں ۲۰ یا ۱۰ مقدمات آجاتے ہیں، دوسری جگہوں سے بھی آتے ہیں، اس وقت جو ہمارے یہاں پانچ مقدمے چل رہے ہیں، ان میں سے دو شوہر کی طرف سے اور تین عورت کی طرف سے دائر کئے گئے ہیں۔

**مولانا عتیق احمد بستوی:**......یہ جو پوری بحث چل رہی ہے وہ اپنے دائرے سے ہٹ گئی ہے، مسئلہ کیا ہے اور کیا شرعی حکم ہے؟ اس کے بجائے صورت حال اور مصالح کیا ہیں؟ اس پر گفتگو چل رہی ہے، میرا اپنا خیال ہے کہ ہم نے واپسی کا سفر شروع کردیا ہے، ہمارے بزرگوں نے جن حالات کی بنیاد پر گنجائش

دی اور بہت سے مسائل کو انہوں نے حل کیا، ان حل کو ہم رفتہ رفتہ واپس لیتے چلے جارہے ہیں، اس کا رجحان پایا جارہا ہے "الحیلۃ الناجزۃ" جو لکھی گئی ہے اس میں تمام علماء اس وقت کے ممتاز اصحاب افتاء موجود تھے اور وہ لوگ وہ تھے کہ جن کے پاس پورے ہندوستان سے ہی نہیں، بلکہ باہر سے سینکڑوں ہزاروں استفتاء آیا کرتے تھے اور ان کے فتاوی سے کئی جلدیں مرتب ہوچکی ہیں، حضرت تھانویؒ، مفتی شفیع صاحبؒ، مولانا عبدالکریم صاحب وغیرہ بہت سے حضرات ہیں جو اصحاب فتاوی تھے، اور ہر ایک کے فتاوی کی کئی کئی جلدیں شائع ہوچکی ہیں، ان حضرات کو جو اندازہ تھا اس وقت کے حالات کا کہ کیا واقعی عورتوں پر ظلم ہورہا ہے کہ نہیں ہورہا ہے؟ ان حالات میں ان حضرات کو غور کرنا پڑا کہ جو گنجائشیں شریعت میں ہیں اور جن کی بنیاد پر ہم بندش لگا سکتے ہیں شوہر پر کہ وہ غلط طلاق نہ دے، اور عورت کو نکاح کے بعد گویا اس طرح چھوڑ دیا جاتا ہے، بسا اوقات کہ نکاح ہوگیا اب شوہر صاحب ہندوستان سے باہر چلے گئے، اور ان کی واپسی نہیں ہورہی ہے اور نکاح بھی کب ہوتا ہے کہ صاحب ویزا آگیا ہے نکاح کردیجئے، میرا بچہ جانے والا ہے، اب نکاح کے بعد ان عورتوں کے شوہر چلے جاتے ہیں، اس میں کثرت سے ایسا ہوتا ہے کہ وہ کئی کئی سال تک نہیں آتے ہیں میں چونکہ لکھنو میں دارالقضاء سے وابستہ ہوں، ایسے مقدمات کثرت سے آتے ہیں وہاں کی عورتیں دعوی کرتی ہیں کہ چار سال ہوگئے شادی کو دس سال ہوگئے شوہر خبر نہیں لے رہا ہے، ادھر شوہر کے گھر سے اس کی والدہ بہنیں شکایت کررہی ہیں کہ ہم تو لینے آتے ہیں مگر اس نے نافرمانی کیا، عورتیں لٹکی ہوئی ہیں، یہ حالات جو ان حضرات کے زمانہ میں تھے اس کا حل ان کے سامنے نہیں تھا، دارالقضاء موجود نہیں تھے، انہیں مشکلات کو حل کرنے کے لئے ان حضرات نے محنت کی اور بہت بڑا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، حضرت تھانویؒ کے زمانہ میں شرعی پنچائت قائم کرنے کی بات ہوئی، اب صورت حال یہ ہے، آپ ذرا مجھے یہ بتائیں اور پوری دیانت داری کے ساتھ کہ اس دور میں جو مظالم عورتوں پر ہورہے تھے، کیا آج مظالم میں کمی آگئی ہے؟ اور اس وقت صورتحال یہ بھی کہ سماجی بندھن ہمارے اوپر تھا، اگر کوئی طلاق کا اقدام کررہا ہے برادری سے باہر تو اس کا کھانا پینا بند، ان بندشوں کی وجہ سے طلاق دینے کی ہمت وہ آسانی سے کرتا نہیں تھا، اور آج صورت حال کیا ہوچکی ہے کہ آدمی آزاد ہے جو چاہے کرے، جس کا کسی دوسرے پر دباؤ نہیں، سماجی دباؤ ختم ہونے کی بنا پر حالات میں تبدیلی آئی ہے اور مظالم میں اضافہ ہوا ہے، میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ یہ پروپیگنڈہ جو لوگ بھی کررہے ہیں کہ شرح طلاق اتنی ہے اس سے ہرگز ہم متاثر نہیں ہیں اللہ کا فضل ہے، اور اب بھی ہمارا مسلم سماج ان سے کہیں بہتر ہے، ہر لحاظ سے ہمارے مسلم سماج کو بھی اس کا حق ہوتا ہے، ہمارے مسلم سماج میں جو انصاف ہورہا ہے عورتوں کے ساتھ وہ کسی سماج میں نہیں ہورہا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں زیادتیاں ہیں، اور جو حضرات دارالقضاء سے وابستہ ہیں ابھی کل گفتگو ہورہی تھی مفتی حبیب اللہ قاسمی بیٹھے ہوئے ہیں وہ اعظم گڑھ میں رہتے ہیں، وہ وہاں کی صورت حال بیان کررہے تھے کہ ہر گھر سے لوگ باہر گئے ہوتے ہیں اور پتہ نہیں کیا کیا صورت حال ہے کہ بیان کرنے میں بھی شرم آتی ہے، تو سوال یہ ہے کہ صورت حال جو ہے اس پر ہم کب تک پردہ ڈالتے رہیں گے، کہ ہمارے فیصلے کی بناء پر ہمارا شرط عائد کرنے کی بنیاد پر یہ تاثر پریس میں ہوگا، وہ تاثر پریس میں ہوگا، اگر یہ واقعہ ہے کہ زیادتیاں ہورہی ہیں، اور طلاق کے دینے میں بے احتیاطی ہورہی ہے، تو بجائے اس کے پریس پر یہ تاثر پڑے گا اس کے سدباب کی کوشش کیوں نہ کریں یہ تو میں نے مصالح کی بات کہی۔

جہاں تک مسئلے کی بات ہے کہ گنجائش کیا ہے اور کس حد تک کون سی شرطیں عائد کی جاسکتی ہیں؟ تو میں نے عرض کیا کہ مہر میں کمی کی اور زیادتی کی جو بات ہے اس میں کمی اور زیادتی کی بات کو صاحبین نے اختیار کیا ہے، تو میرا خیال یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حل نہیں ہے کہ اگر ایک مرد مشروط نکاح نہیں کرنا چاہتا اس کو تو ہم لازم کر نہیں رہے ہیں کہ تم کو مشروط ہی کرنا ہے، مسئلہ صرف اتنا ہے کہ جہاں پر دونوں فریق راضی ہیں، ان شرطوں پر شرعاً اس شرط کی گنجائش ہے کہ نہیں یہ شرطیں عائد ہوسکتی ہیں کہ نہیں؟ میرا مقصد یہ ہے کہ صورت حال کی ایک تصویر ہمارے سامنے ایک قوت کے ساتھ آئی، دوسرے یہ کہ ہم غور کریں کہ ہمارے یہاں کتنی زیادتیاں ہورہی ہیں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ دارالقضاء قائم ہو پورے ملک میں مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، ہمارے ذمہ داران بیٹھے ہوئے ہیں، اس میں بڑی سست رفتاری ہے، دارالقضاء کہاں کہاں قائم ہے؟ بہار واڑیسہ میں یہ نظام قائم ہے لیکن پورے ہندوستان میں بہت سست رفتاری کے ساتھ کام ہورہا ہے اگر دارالقضاء کی تحریک کو ہم آگے بڑھاتے تو شاید مظالم میں کمی آتی اور بے جا طلاق کا استعمال نہ ہوتا اس پوری صورت حال میں ہمیں اس مسئلہ پر غور کرنا چاہئے اور تنہا محض پریس کا یہ اثر پڑے گا، یہ بنیاد بنے گی، میرے خیال میں یہ صورت حال ٹھیک نہیں، اور حضرت مولانا نظام الدین صاحب نے جو بات فرمائی ہے تحکیم والی، اس بات میں بھی آخر طلاق کا ذکر آئے گا اگر نکاح کی تقریب میں کسی بھی عنوان سے طلاق کا ذکر آنا معیوب بات ہے، اس سے ماحول خراب ہوگا تو تحکیم کی جو بات، ہم لائیں گے اس وقت بھی ماحول خراب ہوگا، بات وہی پیدا ہوگی، چاہے، تحکیم کی بات لائیں، چاہے اشتراط کی باتیں۔

**حکیم ظل الرحمن:** ...... اس کا حل یہ ہے کہ تمام نکات رشتہ کے وقت طے کئے جائیں، نکاح کے وقت نہیں۔

**مفتی نسیم قاسمی:** ......اس مسئلہ میں زیادہ الجھاؤ پیدا ہو رہا ہے، قاضی صاحب نے مسئلہ کو جس حساب سے پیش کیا ہے، میرا خیال یہ ہے کہ صرف اسی نقطۂ نظر پر ہم اور آپ غور کریں، نکاح کے وقت شرائط کی جو تفصیل ہے، دو شرطوں پر تو سب لوگوں کا اتفاق ہے، اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے، صرف ایک شکل ہے جس پر ہم کو اور آپ کو غور کرنا چاہئے اور جن حضرات کی اختلافی رائے ہو تو اس کو نوٹ کر لینا چاہئے، خاص طور پر جو اصحاب افتاء ہیں، ان سے رائے لینی چاہئے، تیسری شکل جو ہے وہ شکل یہ ہے کہ ایسی شرط لگانا جس میں بیوی یا شوہر کا فائدہ ہو اور شرع اسلامی نے اس کے لگانے کو حرام قرار نہیں دیا ہو، تو ایسی شرط نکاح میں لگانا درست ہوگا یا نہیں، اور صرف اس شرط کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ اس سلسلہ میں ظاہر ہے کہ فقہ حنفی، شافعی یا مالکی میں واجب کی بات نہیں ملتی، بلکہ فقہ حنبلی میں اس کی صراحت ملتی ہے کہ شرطیں لگانا درست ہے، اور شوہر پر اس کو پورا کرنا بھی واجب ہے، اسی چیز پر غور کیا جائے کہ یہ بات موجودہ حالات میں قابل قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

**مولانا محمد رضوان القاسمی:** ......مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ چونکہ حالات وواقعات دونوں طرف ہیں، عورتوں کے بھی مظالم کم نہیں ہیں، اور اس کی دلیلیں بہت پیش کی جا سکتی ہیں، اس لئے مسئلہ پر از سر نو مصالح اور مقاصد پر غور کر کے اس کی تشریح کی جائے، دیکھا جائے کہ تسریح میں فائدہ ہے یا اس کو روکنا زیادہ بہتر ہے، جو بھی شکل ہو اس پر از سر نو غور کیا جائے، ملک کے حالات کو دیکھا جائے، شہر کے حالات میں عورتوں کی ایسی بہت سی نظیریں پیش کی جا سکتی ہیں کہ بہت زیادتیاں ہوتی ہیں، مگر شوہر طلاق اس لئے نہیں دے سکتا کہ طلاق دے گا تو بڑی مشکلات میں آ جائے گا، قانونی طور پر، معاشرتی طور پر، اس کے اپنے تعلقات کی بنیاد پر، اس لئے اس کی تشریح و تبیین سے پہلے اس کے مصالح اور مقاصد پر از سر نو غور کر لیا جائے۔

**مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:** ......ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بحث یہ بات فرض کر کے کی جا رہی ہے کہ ہر نکاح سے پہلے لامحالہ نکاح کی کوئی شرط یا مہر کے ساتھ کوئی شرط عائد کی جائے گی، اصل میں صورت حال یہ پیش آتی ہے کہ بعض دفعہ تفویض طلاق کے ذریعہ یا مہر مشروط کے ذریعہ پچھلے رشتے کو باقی رکھنے میں مدد ملتی ہے، دار القضاء میں ہم لوگوں کا تجربہ یہ ہے کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان کسی وجہ سے علاحدگی ہو گئی اور بچوں کی وجہ سے ہم لوگ یہ چاہتے ہیں کہ دوبارہ یہ رشتہ قائم ہو جائے، تجدید نکاح کی گنجائش موجود ہوتی ہے، لیکن عورت اپنے لئے خطرہ محسوس کرتی ہے، ایسے موقع پر ہم لوگ تفویض طلاق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یا بعض شرطیں عائد کرتے ہوئے دوبارہ عورت کو اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ اجڑے ہوئے گھر کو بسانے کی کوشش کی جائے، میرا خیال ہے کہ مسئلہ کو صرف ایک پہلو سے دیکھا جا رہا ہے، اس تجویز کی وجہ سے مرد اس بات پر مجبور نہیں ہو جاتا ہے کہ لامحالہ وہ نکاح کے ساتھ شرطوں کو قبول ہی کرے، مہر مشروط کو قبول ہی کرے، یہ تو اس کے اختیار میں ہے اگر چاہے گا تو اس طرح نکاح قبول کرے گا، ورنہ نکاح قبول نہیں کرے گا، غیر معمولی حالات میں تجربات کی روشنی میں اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا، جب لوگوں کے علم میں یہ بات ہوگی کہ فلاں شخص سے رشتہ کرنے میں خطرہ ہے تو اس طرح کی شرطیں لگا کر آئندہ اس کی مضرات کو کم کیا جا سکتا ہے، نہ نکاح نامہ میں اس مضمون کو لانا ہے اور نہ نکاح کے لئے اس کے مستقل اصول ہی قرار دینا ہے، اس لئے یہ بات ناقابل فہم ہے یہ مصلحت کے منافی اور مصلحت کے خلاف کیسے ہے؟ عام حالات میں بالخصوص دیہی علاقوں میں جہاں کہ تعلیم کا فقدان ہے، صورت حال وہ ہے جو قاضی صاحب نے فرمایا، ہمارے یہاں حیدرآباد میں بھی کافی مقدمات آتے ہیں، اکثر حالات میں عورت کے مطابق فیصلہ کرنے پر آدمی مجبور ہو جاتا ہے، ہر جگہ کے حالات مختلف ہیں۔

مولانا مفتی نسیم صاحب نے جو بات کہی کہ حنفیہ کے یہاں نکاح کے وقت کی شرط لازم الایفاء نہیں ہے، تو ایسا نہیں ہے، اگر کسی شخص نے ایسی شرط کو منظور کر لیا ہے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی اس کا پورا کرنا واجب ہے، علامہ عینیؒ اور علامہ کشمیریؒ کی صراحت موجود ہے فرق صرف یہ ہے کہ دیانتاً واجب ہے، قضاء کے طور پر واجب نہیں ہے، پس حنابلہ اور حنفیہ کے درمیان وجوب میں اور لازم الایفاء ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف نہیں ہے، اس کا نتیجہ اور اثر کیا مرتب ہوگا؟ حنابلہ کے نزدیک عورت کو دعویٰ تفریق کا حق حاصل ہوگا، اور حنفیہ کے یہاں مہر مسمی کے بجائے مہر مثل کا حق حاصل ہوگا ورنہ واجب الایفاء دونوں کے نزدیک ہے، اس لئے جو تجویز لکھی گئی ہے کہ تفویض طلاق کا عورتیں غلط استعمال نہ کر پائیں، یا مہر کی جو مقدار متعین کی جا رہی ہیں، بے موقع اس کا استعمال نہ کیا جائے، اس طرح شرط کے بارے میں جو عبارت لکھی گئی ہے، اس میں صرف یہ لکھا گیا ہے کہ اس شرط کو پورا کرنا مرد پر واجب ہے، بس اس پر سکوت اور خاموشی اختیار کی گئی ہے، اس طرح جو حقائق اور واقعات ہیں، ان سے آنکھیں موند کر صرف امکانی خطرات کی وجہ سے اگر ہم جو بعض سہولتیں عورتوں کو فراہم کر سکتے ہیں، فراہم نہ

کریں تو جو اس ملک میں شریعت کے ڈاکہ زن بیٹھے ہیں، اور جو چاہتے ہیں کہ اس ملک کے مسلمانوں کا مذہبی تشخص باقی نہ رہے، ان کو اس بات کا موقع ملے گا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ہمارے خلاف مواد فراہم کریں، اور ملک کی رائے عامہ کو ہمارے خلاف بگاڑنے کی کوشش کریں، یہ نہیں ہے کہ اسلامی حکومت اگر ہوتی تب ہمارے لئے قانون کے نفاذ میں سہولت تھی، اور ہندوستان میں چونکہ مسلمانوں کے ہاتھ میں اقتدار نہیں ہے، اس لئے اس طرح کی دفعات کا لانا خلاف مصلحت ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ ہندوستان جیسے حالات ہی میں یہ مصلحت کا زیادہ تقاضا ہے اس طرح کی دفعات کا لانا، اگر اسلامی حکومت ہوتی اور اسلام کا صاف ستھرا آسان اور شستہ نظام عدل موجود ہوتا تو اس طرح کی شرطوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی، وہاں درہ فاروقی کا کرتا، وہاں نہ مہر کی شرط کی ضرورت ہوتی اور نہ نکاح کے ساتھ کسی شرط کی ضرورت ہوتی، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ واقعات اور حقائق کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے، ان تمام شرطوں کے باوجود کسی مرحلہ پر مرد مجبور نہیں ہے، وہ اس شرط کے قبول کرنے اور نہ کرنے میں اختیار رکھتا ہے، عورتیں ٹھیک ہے کہ زیادتی کرتی ہیں، لیکن مرد اس کو طلاق دینے کا اختیار رکھتا ہے، جن صورتوں میں وہ عورتوں سے تنگ ہو اور ان میں نشوز کی کیفیت پائی جائے۔

**مولانا سلطان احمد اصلاحی:** ...... میں تیسری تجویز کی پرزور تائید کرتا ہوں، یہ بہت مناسب تجویز ہے، یہ بات کہنا کہ فلاں تجویز لانے سے کون سا عدل قائم ہو جائے گا یہ دراصل غلط بحث ہے، قانون اور اخلاق کا جو فرق ہے اس کو ملحوظ نہ رکھنا ہے، اخلاق کی کمی کو قانون پورا نہیں کر سکتا ہے، مقصود یہ ہے کہ جائز قانون سازی کے ذریعہ سے اگر کچھ بے اخلاقیوں کو روکا جا سکتا ہے، تو فقہ اکیڈمی کا یہی دائرہ ہے، اور اس پس منظر میں یہ چیز بہت ہی مناسب ہے، کنفیوزن شاید اس لئے بھی ہو رہا ہے کہ ہماری نگاہ مخصوص چیزوں پر مرکوز ہے، مہر کا اضافہ وغیرہ جائز شرطوں کو اگر ہم تھوڑا سا وسیع کر دیں تو بات مزید واضح ہو سکتی ہے، اور کچھ شرطیں ایسی ہیں جن کو نکاح کے وقت ہی لگایا جا سکتا ہے، نکاح کے بعد ایک مدت گزر جانے کے بعد کوئی اس کا جواز باقی نہیں رہے گا، لیکن اگر عورت اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے کچھ جائز شرطوں کی گارنٹی چاہتی ہے، اور اگر وہ چیز جائز ہے، تو اس کو جائز حق سے محروم کرنے کا کس کو اختیار ہو سکتا ہے، میں اس کی تین مثالیں آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں، عورت یہ شرط لگاتی ہے کہ وہ شادی کے بعد جوائنٹ فیملی (Joint family) میں نہیں رہے گی، مشترکہ خاندان میں دیہات میں جو مظالم عورتوں پر ہوتے ہیں جو شریعت اسلام کے لئے باعث ننگ ہے، مسلمان معاشرے کی یہ صورت حال ہے کہ اس کے پیش نظر اگر کوئی پڑھی لکھی خاتون یہ مطالبہ کرتی ہے کہ شادی کے بعد وہ شوہر کے ساتھ جہاں رہے گی، جبکہ اس کو مناسب مقام فراہم ہو جائے گا، وہ چاہے تنگی سے زندگی بسر کرے گی، مگر وہ شوہر کے ساتھ رہنا پسند کرتی ہے، بچوں کی پرورش اور دوسرے مسائل کے لئے شریعت کا منشاء یہی ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شوہر بیوی کے حقوق کو نظر انداز کر کے دوسری چیزوں میں پیسہ خرچ کرتا ہے تو اگر جائز شرطوں کے اضافے سے مسلمانوں کے معاشرہ کا تحفظ ہوتا ہو تو کوئی حرج نہیں ہے اور مولانا عتیق صاحب نے جو بات کہی وہ بہت ہی اہم بات ہے کہ ہمارا معاشرہ اس وقت بکھرا ہوا ہے، اور خصوصی توجہ کا طالب ہے، آج سے پچاس سال پہلے بہت سی بندشیں تھیں، وہ بندشیں اب ٹوٹ رہی ہیں، اور ان بندشوں کے ٹوٹنے کے نتیجہ میں ہم کو کچھ تحفظات فراہم کرنے ضروری ہیں، گو اگر ان شرطوں کے اضافے سے یہ چیز پیدا ہوتی ہے تو ان شرطوں کا نکاح نامے میں اندراج ضروری نہیں ہے، ہر جگہ اس کا تذکرہ ضروری نہیں ہے، صرف بات یہ ہے کہ اگر عورت چاہتی ہے کہ کچھ شرطوں کا اضافہ ہو جائے اور یہ چیز جائز ہے تو ان کو اس حق سے محروم کرنے کا حق نہیں ہے، قانون اور اخلاق کے دائرے الگ الگ ہیں ان کو آپس میں ملانا چاہئے۔

**مولانا ریاست علی:** ...... مسئلہ شرائط نکاح کا چل رہا ہے، تیسری شرط کے بارے میں قاضی صاحب کی رائے پہلے سے ہے کہ مجمل رکھا جائے، میری رائے ہے کہ اس میں ذرا تشریح ہونی چاہئے، اس لئے ہم لوگ بھی محکمہ شرعیہ چلاتے ہیں، دار القضاء چلاتے ہیں، میری معلومات کے مطابق اتر پردیش میں سب سے پرانا محکمہ شرعیہ ہاپوڑ میں ہے اور صوبہ راجستھان کے مقدمات خاص طور پر ہاپوڑ میں ہی آتے ہیں، اور راجستھان کے بعض خاندانوں میں رواج ہے کہ پورے خاندان کی بچیوں کے نکاح ایک ساتھ ہو جاتے ہیں، اگر کسی خاندان میں پچاس لڑکیاں ہیں تو بالغ اور نابالغ سب کا نکاح ایک ساتھ ہو جاتا ہے، والدین چونکہ نکاح کرتے ہیں تو نکاح تو لازم ہو گیا، لیکن جب بالغ ہوتے ہیں تو دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں، لڑکی یا لڑکے کو کوئی ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں تو وہ جانے کو تیار نہیں ہوتی، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ شرائط کچھ ہونی چاہئیں اگر لڑکی کو عملی طور پر کوئی شکایت سامنے نہیں آتی یا لڑکی گئی ہی نہیں تو قاضی کیسے تفریق کرے گا تو شرائط ہونی چاہئے لیکن ان شرائط کی تفصیل ضروری ہے۔

**مولانا زبیر احمد قاسمی:** ...... تفویض طلاق کے بارے میں تائید کرتا ہوں۔

**مولانا انیس الرحمن قاسمی:** ...... میری رائے میں تو قاضی صاحب نے اصولی طور پر جو تین تجویز بیان فرمائی ہیں وہ صحیح ہیں، اور ان میں کوئی شرعی نقص نہیں ہے، دلائل کے اعتبار سے بھی صحیح ہیں۔

**مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی:** ...... تین ہی پر محدود ہو تجویز آگے نہ بڑھے، ورنہ اس میں اختلاف ہے، اس کی تائید کرتا ہوں، آگے کی تائید نہیں کرتا۔

**مولانا عبد اللہ طارق:** ...... اس سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ اس میں دو چیزوں کا اضافہ کر دیا جائے: ایک یہ کہ جو عورت یا اس کے اولیاء ضرورت محسوس کریں، دوسرے یہ کہ نکاح کے وقت نہیں، بلکہ رشتہ ہونے کے وقت یہ معاملات طے کئے جائیں۔

**مفتی عبد الرحمن:** ...... میری رائے بھی یہی ہے تجاویز جو مرتب کی گئی ہیں، اس میں مصلحت دیکھنا لڑکے اور لڑکی والوں کا کام ہے، تو اس لئے یہ قید و بند ہونی چاہئے کہ نکاح کرنے کے وقت میں اگر وہ مناسب سمجھتے ہیں تو تفویض طلاق کر سکتے ہیں۔

**مفتی حبیب اللہ قاسمی:** ...... میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔

**قاضی صاحب:** ...... اس لئے ہم جب اس مسئلہ کی تصویر کریں تو ہم کو تملیک اور توکیل کے فرق کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی تعبیر اختیار کرنی پڑے گی، کہ جس میں اگر عورت کو حاصل ہونے والے اختیار کو ہم تھوڑا مشروط کرنا چاہیں قاضی یا امام یا کسی اور منصب کی صوابدید کے ساتھ، تو وہاں پر یہ کہنا ہوگا کہ اگر قاضی یہ محسوس کرے کہ میں نے اس کے حقوق میں کوتاہی کی ہے، اور وہ اجازت دے تو بیوی کو اختیار ہوگا کہ وہ طلاق واقع کرے، تو اس طرح کی صورتیں نکالی جاسکتی ہیں جو گنجائش ہمارے فقہاء کے یہاں موجود ہے، مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ خود فقہ حنفی میں جو بحث آئی ہے، اور بحث کا عام طور پر حوالہ دیا جا رہا ہے، یعنی زیادتی مہر اور قلت مہر کی، یہ مسئلہ معروف ہے کہ نکاح کے بعد بھی مرد کو اس کا اختیار ہے کہ مہر میں اضافہ کر دے اور عورت کو اس کا اختیار ہے کہ مہر میں کمی کر دے آج جو بحثیں چل رہی ہیں، کیا کورٹ کو یہ اختیار ہے کہ نہیں کہ وہ مہر بڑھا دے، ظاہر ہے کہ یہ ایک عظیم فتنہ کی طرف نشاندہی کرتا ہے، اس لئے خود صاحب "ہدایہ" نے جس تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کو لکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہاں امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین کے قول کے اختیار و عدم اختیار کی بحث کچھ اہم نہیں ہے، محض صرف اتنا سا فرق ہے کہ دونوں ہی اس طریقہ کو جائز قرار دیتے ہیں، امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مہر مسمی اول ہے، مسمی ثانی لازم نہیں ہوگا، بلکہ مثل لاگو ہوگا، اور آج کل یہ خود مسئلہ ہے کہ مہر مثل ہے کیا؟ اتنا فرق پڑ چکا ہے کہ مہر مثل کا تعین ایک دشوار مسئلہ ہے، جیسی دونوں نے شرطیں لگائی ہیں اسی کا اعتبار ہوگا، اور اس کا کوئی بڑا فرق مسئلہ پر نہیں پڑتا ہے، آپ قول امام صاحبؒ کا اختیار کیجئے کوئی فرق نہیں، مہر زائد کا ذکر پہلے کر دیا جائے گا اور مہر قلیل کا ذکر بعد میں کر دیا جائے تو امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ دونوں مل کر یہ کہیں گے کہ مہر زائد ادا کرو، بلکہ اس میں ایک اور اچھی بات ہو جائے گی کہ عورت کی طرف سے گویا احسان ہو گیا کہ تم نے شادی دوسری نہیں کی، لہذا میں مہر بجائے ۲۰ ہزار کے دس ہزار قبول کرتی ہوں، یہ صورت حال جو ہے اس کا حل بہر حال فقہاء نکال سکتے ہیں، مجھے یہ عرض کرنا ہے اپنی بحث آپ معاشرے کی صحیح صورت حال کو سامنے رکھ کر اس خدشہ کو بھی سامنے رکھ کر کہ اگر کلی طور پر یہ اختیار دے دیا جائے تو مقصد شریعت کہیں فوت نہ ہو جائے، ایسا راستہ نکالنے کی کوشش کریں کہ اس وقت جو مسئلہ درپیش ہے اس کے حل میں مدد مل سکے، میں نے اس مداخلت کو ضروری سمجھا، چونکہ بحث کا رخ بہت تفصیل کی طرف خاص طور پر تفویض طلاق کی طرف جا رہا تھا۔

**مفتی جمیل نذیری:** ...... بات ہو گئی ہے اب مجھے کچھ بولنا نہیں اسی موضوع پر بولنا تھا مگر اب کوئی فائدہ نہیں، جانے دیجئے۔

**مولانا مفتی جنید عالم ندوی:** ...... یہاں پر دو مسئلے ہیں: پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اگر طلاق دی تو بیس ہزار اور نہیں دی تو دس ہزار، اور دوسرا مسئلہ نکاح ثانی کا ہے ...... دونوں مسئلوں میں میرے نزدیک فرق ہے، پہلے مسئلہ میں میرے خیال سے صاحبین کے قول کے مطابق عمل کرنا صحیح ہے اور دوسرے مسئلہ میں صحیح نہیں ہے، بلکہ امام صاحبؒ کے قول کو اختیار کرنا چاہئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے مہر کو جو مشروع قرار دیا ہے اور مہر مقرر کیا ہے اس کا مقصد بھی طلاق کے بے جا استعمال سے روکنا ہے کاسانیؒ نے اس کی صراحت فرمائی ہے، مہر کی مشروعیت کا مقصد یہی ہے کہ ادنی سی بات پر شوہر طلاق نہ دے دے، تو اگر اس طرح

کی شرط لگائے جس سے وہ طلاق کے بے جا استعمال سے رک سکے تو میرے نزدیک درست ہے اور ضرورت کے مطابق اور حالات کے پیش نظر صاحبین کے نزدیک اس کی گنجائش ہے، نکاح ثانی کی صورت میں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ مہر کا مقصد نکاح ثانی سے روکنا نہیں ہے، اس لئے اس کی صراحت نہیں ملتی ہے کہ مہر کا مقصد نکاح ثانی سے روکنا ہو اور پھر یہ کہ یہاں پر ضرورت بھی نہیں ہے ہندوستان کے عرف میں نکاح ثانی ایسے ہی معیوب ہے اگر اس طرح کی پابندی لگاتے ہیں تو اور معیوب سمجھا جائے گا، اس بنیاد پر دونوں مسئلوں میں میرے نزدیک فرق ہے۔

**مولانا یعقوب اسماعیل منشی:**...... حضرات علما کرام! یہ تفویض طلاق کے مسئلہ کے بارے میں جو بحثیں ہوئی ہیں، برطانیہ میں تقریبا ۳۰ سالوں سے مقیم ہوں اور وہاں پچھلے چند سالوں سے عائلی مسائل کے حل کے سلسلہ میں ایک شرعی کونسل کے قیام کے ساتھ میری بھی وابستگی ہے، ہمارے یہاں کے کچھ پیچیدہ ایسے مسائل ہیں کہ جن مسائل کے سلسلہ میں ہم قاضی صاحب سے بھی مشورہ کرتے رہتے ہیں، لیکن مسئلہ چونکہ اس سلسلہ کا تھا، میں یہ ضروری سمجھ رہا ہوں کہ اس بارے میں ہمارے یہاں کے بھی کچھ حالات رکھ دئے جائیں، تفویض طلاق کا جہاں تک سوال ہے، میرا خیال ہے کہ یہ لزوم کے درجہ میں نہیں ہے، یہ جواز کے درجہ میں ہے، اگر اس کے عدم جواز کا مسئلہ کر دیا جائے تو اس کی وجہ سے اور بہت سارے مسائل پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔

ہمارے یہاں جو واقعات ہیں وہ یہ ہیں کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا جو طبقہ انگلستان میں مقیم ہے، وہ اپنے بچوں کی شادیاں اپنے رشتہ داروں میں ہی کرنا چاہتے ہیں، بچے بچیاں بھی ساتھ جاتی ہیں خوش ہوتے ہیں، تیار ہوتے ہیں اور شادی منعقد کرتے ہیں، شادی ہوگئی، اب اس کا برطانیہ میں داخل ہونے کا ویزا، یہ ایک ایسا مستقل مرحلہ ہے کہ بقول ہمارے دوست کے جنت میں جانا آسان برطانیہ میں داخل ہونا مشکل، تو اس سلسلہ میں مصیبت یہ ہوتی ہے کہ لڑکی والے عام طور پر لڑکے کے سلسلہ میں زیادہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکے والے آ کر کوشش کرتے ہیں ویزے کے لئے، بس ایک مرتبہ حکومت کے قانون کے تحت میں لڑکوں کے سوال جواب میں لڑکا کوئی ایسی غلط بات کہہ جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ انٹرویو فیل ہوجاتا ہے اور وہ ویزا ریفیوز (Visa Refuse) کر دیتے ہیں، اب اس کے بعد اپیل کا حق ہے لڑکی کو، اب یہ بھی قانون بننے جارہا ہے اپریل ہی میں شاید اگر یہ بن گیا تو اپیل کا حق بھی ختم ہوجائے گا، اب لڑکی والے پھر اپیل کرتے ہیں اس میں خاصے مصارف ہوجاتے ہیں، تقریبا کم سے کم دوڈھائی ہزار پونڈ اس میں خرچ ہوتا ہے، اس کے بعد بھی بعض مرتبہ وہ ریفیوز (Refuse) ہوجاتی ہے، چونکہ وہ لڑکے سے کچھ سوالات اس قسم کے کرتے ہیں اس وجہ سے اب جب یہ باتیں ہوجاتی ہیں تو لڑکی والے یوں کہتے ہیں کہ بھئی یہ مسئلہ مشکل ہے، آپ طلاق دے دیں تو لڑکے والے کہتے ہیں کہ ہم طلاق دیں گے ہی نہیں، ایسے بھی واقعات ہوئے کہ لڑکی کو ہی وہاں بھیج دیا جائے لڑکی والے کہتے ہیں کہ ہم لڑکی بھیج دیتے ہیں پاکستان میں آپ رہو ساتھ میں، ویزا آجائے اب تک وہاں رہو، لڑکے نے کہا کہ منشاء تو وہاں آنا تھا کیوں بلاؤں اس کو یہاں، اس لئے میں خرچہ کیوں برداشت کروں، جب طلاق کی بات آئی تو اس کے جو واقعات اور حقائق ہیں کہ خطیر رقم کے مانگنے کے باوجود وہ اس کے اوپر تیار نہیں ہوتے، اگر اس قسم کا شادی نامہ طے کیا جائے تو میرا خیال ہے کہ ہمارے یہاں اس سلسلہ میں لڑکیوں کے لئے جان سے چھٹکارے کی شکل ہوسکتی ہے، ورنہ دو دو تین سال کی کوشش کے باوجود بھی نہیں ہوتا، میرے خیال میں اس کو نکاح نامہ میں رکھنا چاہئے۔

**مولانا عتیق احمد قاسمی:**...... یہ جو اشتراط فی النکاح کی بحث چل رہی ہے، اس کا پس منظر جیسے آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ عورتوں کے حقوق کے بارے میں بہت کوتاہیاں مردوں سے ہوتی ہیں، یہ تو واقعہ ہے کہ طلاق کی جو شرح ہمارا پریس پیش کر رہا ہے اور جس حد تک مظالم کی داستان سنا رہا ہے، مسلمانوں کی خواتین پر یہ زیادتیاں ہو رہی ہیں وہ تو بہت مبالغہ آمیز بات ہے اور انہوں نے اپنے گھر کے عیب کو چھپانے کے لئے ہماری طرف رخ موڑ دیا ہے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بے جا طلاق کے واقعات ایک ہی مجلس میں تین طلاق کے واقعات ہو رہے ہیں اور ان کی شرح بڑھ رہی ہے اسی کے ساتھ بہت سی شکلیں پیدا ہو رہی ہیں، مشکلات کی لکھنو میں میرا قیام ہے دار القضاء سے میرا تعلق ہے، وہاں جو مقدمات آتے ہیں ان مقدمات میں کثرت سے ایسے مقدمات ہوتے ہیں کہ نکاح ہوگیا اور شوہر چلے گئے سعودیہ عرب، کویت چلے گئے اب وہ خبر نہیں لے رہے ہیں اب دشواری کیا ہے مقدمہ دار القضاء میں آتا ہے، یہ مسئلہ پیش آتا ہے کہ مدعا علیہ تو غائب ہے اس پر کیسے نوٹس تعمیل ہو اور اگر نوٹس پہنچ بھی گئی تو حاضر نہیں ہوا تو غائب کے خلاف فیصلے ہم کیسے کریں اس بنیاد پر، بہت سی عورتیں اپنے حقوق سے محروم رہتی ہیں، ان کے مقدمات یا تو ہم لیتے نہیں ہیں، یا اس کے فیصلے میں خاصا وقت لگ جاتا ہے، تو یہ صورت حال کوئی نادر نہیں ہے، باہر ملکوں میں جانے

کی بات کثرت سے ہورہی ہے اور کمانے کی دھن میں شوہر کو واپسی کا موقع نہیں ہے اور اس مسئلہ کا جو حل تھا کہ دار القضاء کے نظام کو ہم فعال بنائیں، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم اس میں کوتاہی کررہے ہیں اور سست رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں، بہار، اڑیسہ کی بات میں نہیں کرتا، یوپی میں بہت کم اضلاع میں دار القضاء ملے گا آپ کو مقدمہ اگر ہمارے پاس آ بھی جائے تو بہت سی چیزیں ایسی پیدا ہوجاتی ہیں کہ ہم مقدمہ لینے کے موقف میں نہیں ہوتے، تو یہ مسئلہ تو کثرت سے موجود ہے اگر گنجائش شریعت دیتی ہے اس طرح مشروط نکاح نامے کی جس میں شریعت کے مقاصد اور احکام نکاح وطلاق متاثر نہ ہوں اور کسی حد تک عورتوں کے حقوق کا تحفظ بھی ہوسکے، تو ایسے نکاح نامہ کو ہمیں مرتب کرنا چاہئے اور اسے آگے بڑھانا چاہئے لیکن جو اصل کام ہے اصلاح معاشرہ کا وہ کام بھی مستقل جاری رہنا چاہئے اور اسے آگے بڑھانا چاہئے اور دار القضاء کے قیام کی تحریک پورے ملک میں پھیلنی چاہئے کہ ہر جگہ فعال دار القضاء قائم ہو، میری رائے یہی ہے کہ اگر فقہاء کی تشریحات کے اعتبار سے، کتاب وسنت کے اعتبار سے گنجائش ہے اور میاں بیوی چاہتے ہیں اور اس مشروط نکاح نامہ کو قبول کرتے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ جبر تو نہیں کرسکتے ہیں کہ اگر ایک شوہر مشروط نکاح نامہ قبول نہیں کرتا اور شرط کے ساتھ نکاح نہیں کرنا چاہتا ہے تو اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا، بسا اوقات نکاح میں اس کی ضرورت پڑتی ہے اور اس کی گنجائش شریعت میں ضرور ہے، تو اسے ہم کیوں اختیار نہ کریں۔

**مولانا سعود عالم قاسمی:** ......یہ جو مسئلہ زیر بحث ہے، یہ بڑا نازک مسئلہ بھی ہے اور ضروری بھی ہے کہ آپ حضرات اس پر کھل کر گفتگو کریں اور میں تو گذارش کروں گا قاضی شریعت سے اور بورڈ کے محترم سکریٹری صاحب سے بھی کہ اس پر تفصیل سے گفتگو ہونی چاہئے، صورت حال یہ ہے کہ جو سیلاب ہندوستان میں آرہا ہے، آنے والے دقتوں میں آپ ان کو فیس (Face) نہیں کرپائیں گے، حکومت کی طرف سے بھی اور خود عوامی ردعمل بھی جو پیدا ہورہا ہے اس کو بچانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس پر غور کریں، غور کرنے کے دو پہلو ہیں، ایک بات تو یہ ہے کہ قرآن کریم میں یہ ایک طرفہ معاملہ نہیں ہے کہ آپ کو قوام بنادیا گیا، آپ کے جو حقوق عورتوں پر ہیں تو عورتوں کے بھی حقوق آپ کے اوپر ہیں۔

یہ جو نکاح ہے وہ سوشل کنٹکٹ (Social Contact) ہے، یہ بیع نہیں ہے ایک معاہدہ جو آپ کرتے ہیں اسے ایک شخص توڑتا ہے اور ایک استحصال کرتا ہے اور آپ کے یہاں عائلی محکمہ ہے ایک شخص اپنے آپ کو قوام بنا کر وہ معاہدہ کو توڑتا ہے اور اس کے اللہ اور رسول نے جو احکام دئے ہیں ان کو توڑتا ہے، ضروری یہ ہے کہ ایک طبقہ کو استحصال سے اور ظلم سے بچانے کے لئے کچھ اضافی قانون بنائے جائیں تو ان کو بنانا چاہئے، تاکہ شریعت کا وہ عادلانہ نظام برقرار رہے صورت حال یہ ہے کہ جو حضرات دار القضاء سے متعلق ہیں ان کے سامنے وہ مسائل جو ابھی پیش کئے گئے وہ تو آتے ہی ہیں، سب سے بڑا مسئلہ اس وقت یہ ہے کہ ایک آدمی نے شادی کی وہ بیوی کو رکھتا نہیں اور طلاق بھی نہیں دیتا، کیوں طلاق نہیں دیتا، اس لئے کہ وہ جائے گی کسی دار القضاء میں خلع کرائے گی اور مہر معاف کردے گی اور اسے مہر نہیں دینا پڑے گا، اس وقت صورت حال عملاً زیادہ پیچیدہ ہوتی جارہی ہے کہ عورت کو جو حق ملنا تھا طلاق کے بعد وہ اس حق سے بھی محروم کردینا چاہتا ہے اور ہماری عدالت بخوشی اس کا خلع کرادیتی ہے، عورت تو مجبور ہے اس کو جان چھڑانا ہے لیکن اس کے پیسے بھی جارہے ہیں۔

ہندوستان کے معاشرہ میں ایک عورت جو بیوہ ہوگئی جو مطلقہ ہے اس سے شادی کرنے کے لئے کون لوگ تیار ہوسکتے ہیں؟ یہ سماجی مسئلہ ہے آپ اس پہلو پر غور کریں تو بجائے اس کے کہ ایک عورت کی پوری زندگی خراب ہو، کیوں نہ خراب کرنے والے کو ایسے قانون میں جکڑا جائے کہ وہ جرأت نہ کرسکے؟ اس کے تین پہلو اور ہیں، ایک تو یہ پہلو کہ آپ کچھ عدالتیں یا آپ کا پرسنل لا بورڈ اس کو نافذ کرسکے، دوسرا پہلو یہ ہے اور یہ بڑا نازک مسئلہ ہے کہ آپ کچھ اختیارات گورنمنٹ آف انڈیا (Govt.of India) کو بھی دیں۔

شاید اس کو دینے کے لئے ہم مسلمان ابھی تیار نہیں ہیں، موجودہ حالات میں مثال کے طور پر آپ یہ کہتے ہیں تین طلاقیں بیک وقت اگر دی جائیں تو وہ نافذ تو ہوجائیں گی، لیکن ہے غلط طریقہ اور حضرت عمرؓ نے درے لگوائے، ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ درے حکومت کے ہاتھوں میں دئے دیجئے کہ جو تین طلاق بیک وقت دیتا ہے تو اس کی ایسی دھنائی کریں کہ آنے والوں کو عبرت ہو، اگر آپ یہ نہیں کریں گے تو یہ سلسلہ جاری رہے گا، تیسری چیز اس سلسلہ میں یہ ہے کہ آپ نکاح کے وقت کچھ شرطیں لگائیں، خواہ شرطوں کا تعلق اس سے ہو کہ عورت کہے کہ تم دوسری شادی کروگے تو میرا مہر اتنا ہوگا، اس کے علاوہ بھی شریعت کے مطابق جو ہمارے زمانے میں جائز ہیں کچھ شرطیں اور بھی لگائی جاسکتی ہیں، جہاں تک میرا ناقص مطالعہ ساتھ دیتا ہے اور یہاں اگر تاریخ کے اساتذہ بیٹھے ہیں تو وہ تائید کریں گے کہ میڈیول انڈیا (Medieval India) میں عہد وسطی کے ہندوستان میں ایسی شرطیں لگائی جاتی تھیں نکاح ناموں کے اندر اور خود ظاہر ہے کہ فقہ حنفی کا

یہاں رواج زیادہ ہے، ماضی قریب کی تاریخ میں یاد آتا ہے کہ یہاں جو نکاح نامہ پہلے چھپتے تھے، ان میں بھی یہ ہوتا تھا، اور تفویض طلاق بھی اس میں شامل ہوتی تھی، تو ہم کیوں نہ اس پہلو پر غور کریں کہ آئے دن جو حالات ہیں خود ان میں اسلام کے عادلانہ نظام کو عائلی قوانین کو بچانے کے لئے ہم ان شرطوں کی طرف توجہ دیں، ہمارے پرسنل لا بورڈ کے اندر قوت نافذہ نہیں ہے، آپ صرف سفارش کر سکتے ہیں آپ کے سماج میں جو خرابیاں آ رہی ہیں، خواہ وہ غیر مسلموں کے تعلق سے، یا ہماری اپنی نفسانی کمزوریوں کے نتیجہ میں آ رہی ہیں، یہ بات مسلم ہے کہ استحصال حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔

میری گذارش یہ ہے کہ آپ اس پہلو پر غور کریں کہ نکاح ناموں کے اندر ایسی شرطیں لگائی جائیں اور وہ اضافی بھی شرطیں ہوں اور اس زمانہ کے مطابق پیش کریں، یا ہر جگہ آپ کی ایسی عدالت قائم ہو جائے، آپ کے پاس سفارشیں ہیں، حکومت کے پاس قوت نافذہ ہے، تو کوئی ایسی شکل ضرور نکلنی چاہئے کہ ان تینوں پہلوؤں سے اور اگر ایسا نہیں تو آپ صرف دس سال کے اندر دیکھیں گے کہ آپ اپنے اس نظام کو بچانے میں ناکام رہیں گے۔

**مولانا شاہین جمالی:**...... تفویض طلاق کا مسئلہ اصل میں طلاق "دے دو" کا نہیں ہے، بلکہ "لے لو" کا ہے اردو میں اگر اس کو اس فرق کے ساتھ دیکھیں گے کہ شریعت نے عورت کو جو اختیار دیا ہے وہ طلاق "لے لو" کا ہے طلاق "دے دو" کا نہیں ہے جہاں تک نکاح نامہ میں شرط کا تعلق ہے میرا خیال یہ ہے کہ اگر اس سلسلہ میں یہ تجویز ہو جائے کہ نکاح نامہ میں عبارت لکھی جائے کہ اگر میری طرف سے بیوی کے حقوق واجبہ کی ادائیگی میں کوتاہی ہو، جس کی وجہ سے وہ مجھ سے علاحدگی ضروری سمجھتی ہو تو فلاں فلاں پانچ علماء سے وہ رجوع کرے اور وہ ضروری سمجھیں تو مجھ سے طلاق دلوالیں، اور میں راضی نہ ہوں تو ان کو میری طرف سے طلاق دینے کا اختیار ہوگا، اگر اس قسم کی کوئی عبارت نکاح نامہ میں لکھوالی جائے اور اس پر دونوں فریق راضی ہوں تو میرے خیال سے علماء ہی کے ہاتھ میں یہ اختیار ہوگا اور طلاق دلوالینا شوہر کے لئے اور عورت کے لئے مناسب ماحول میں ممکن ہو سکے گا اور اس شرط نامہ میں یہ بھی لکھ دیا جائے مرد کی طرف سے کہ واپسی کا مجھے اختیار نہیں ہوگا۔

**مفتی نسیم احمد قاسمی:**...... اگر عورت کو مطلق حق طلاق تفویض کر دیا جائے تو عورت اس کا غلط استعمال کرے گی جہاں تک شرائط کے تحقق کا سوال ہے وہ بھی بعد میں ایک موضوع بن جائے گا کہ شرطیں پائی گئیں یا نہیں پائی گئیں، عورت چونکہ خلاصی چاہے گی وہ یہ کہے گی کہ شوہر کی طرف سے فلاں فلاں شرطوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے، اس لئے میں طلاق دینے کی مجاز ہوں، اس لئے اس سلسلہ میں دار القضاء کے فیصلے کو یا کم سے کم مستند علماء کی رائے کو معتبر ماننا چاہئے، مہر کے سلسل میں جو بات کہی جا رہی ہے اور فقہ کی تقریبا تمام ہی کتابوں میں خاص طور پر فقہ حنفی میں اور دیگر فقہی کتابوں میں اس کو بہت تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ دو طرح مہر مقرر کیا جا سکتا ہے، اگر شوہر نے دوسری شادی کی تو مہر کی یہ مقدار، اور اگر اس نے شادی نہیں کی تو مہر کی یہ مقدار ہوگی، اس کی مختلف شکلیں ہیں اس سلسلہ میں جو ہندوستان کے مخصوص حالات ہیں زیادتی مہر یہ ہمارے سماج میں مسئلہ کا حل نہیں ہے، خاص طور پر اس وقت ہمارے سماج میں جو جہیز کی لعنت اور تلک اور سلامی کی لعنت ہے، مرد اس سے ناجائز فائدہ اٹھائے گا، اور وہ سلامی یا تلک لینے کے لئے بار بار دوسری یا تیسری شادی کر سکتا ہے حیدرآباد میں ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ جا رہا تھا میں نے اس سے بات کی، میں نے اس سے یہ کہا کہ بھائی تم لوگ چھوٹی بچیوں کی شادی عرب شیخ سے کیوں کر دیتے ہو، اس نے جو بات کہی وہ علماء حضرات کے لئے قابل توجہ ہے اس نے یہ کہا کہ مولانا ہوتا یہ ہے کہ ہم اپنی بچی کی شادی یہاں کسی شخص سے کرتے ہیں، اس شادی میں لاکھ دو لاکھ روپیہ کم سے کم متوسط خاندان میں خرچ آتا ہے، شادی کرنے کے بعد میری بیٹی چلی جاتی ہے اپنے سسرال، مہینہ دو مہینہ وہ وہاں چین وسکون کی زندگی گزارتی ہے، اس کے بعد میاں بیوی میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے شوہر کیا کرتا ہے کہ جہیز کے سامان کو آہستہ آہستہ فروخت کرنا شروع کر دیتا ہے اور جب سارا سامان ختم کر دیتا ہے تو میری بیٹی کو طلاق دے دیتا ہے، اب بیٹی میرے گھر پر آ جاتی ہے تو دو لاکھ روپیہ تو میں پہلے خرچ کر چکا ہوں اور بعد میں اس بچی کا رشتہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، تو جب ہم عرب کے شیخ سے شادی کرتے ہیں تو سلامی دینے کی نوبت نہیں آتی، بلکہ جو شیخ کی طرف سے مہر ادا کی جاتی ہے اس سے ہمارا گزارا ہوتا ہے، تو اس سلسلہ میں خاص طور پر سماج میں طلاق کے بے جا استعمال کو روکنے اور جہالت دور کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے آخری مسئلہ جو اشتراط فی النکاح کا ہے، اس وقت کا اہم موضوع ہے، اس سلسلہ میں میرا اپنا ذاتی رجحان یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کی فقہ میں سب سے زیادہ وسعت اور تفصیل فقہ حنبلی میں ہے، امام ابو حنیفہ یا امام شافعی وغیرہ کے یہاں جو شرائط خود بخود نکاح کے ذریعہ یا نکاح کے ذیل میں آتی ہیں ان شرطوں کا اعتبار کرتے ہیں، یہ مسئلے کا حل نہیں ہے، مسئلہ کا حل خاص طور پر جن مشکلات یا

دشواریوں سے اس وقت ہمارا سماج گذر رہا ہے، اگر ہم ان مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں تو فقہ حنبلی سے ہمیں استفادہ کرنا چاہئے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی حرج اور مضائقہ بھی نہیں کہ وہ شرطیں اگر چہ مقتضاء عقد کے موافق نہیں ہیں، لیکن شریعت نے ایسی شرطوں کے لگانے کو حرام بھی قرار نہیں دیا ہے، اور ان شرطوں کے لگانے میں عورت کا فائدہ ہے تو ایسی شرطیں لگائی جاسکتی ہیں اور ایسی شرطیں جب لگادی جائیں تو دونوں فریق پر اس کو پورا کرنا ضروری ہوگا، بس یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے۔

**ڈاکٹر توقیر عالم:**...... اشتراط فی النکاح سے متعلق مجھے ایک بات کرنی ہے وہ یہ کہ جب طلاق ابغض المباحات ہے، اور یہ طلاق کوئی شجر ممنوعہ نہیں ہے، تو یہ طلاق اس وقت بالکل مجبوری کے حالات میں ہوتی ہے، جبکہ میاں بیوی کے درمیان سخت ناخوشگوار واقعات پیش آتے ہیں، یہ بات واضح ہے کہ اگر طلاق کے ذریعہ ایک شخص اور ایک عورت الگ ہوجاتی ہے تو ظاہر ہے دونوں کو نکاح ثانی کا حق حاصل ہے، اور اس طرح سے کسی پر جبر نہیں ہے دونوں کو حق حاصل ہے کہ وہ نکاح ثانی کر سکیں، لیکن ایک شخص جو معاشی لحاظ سے بدحال ہو اور نکاح کے وقت اس طرح کی کوئی مشروط رقم اس پر نافذ کردی جائے، ایسی حالت میں تو اس طرح سے اس پر ایک ظلم ہے، میرے خیال سے مناسب نہیں ہے، میں شاہین جمالی صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ نکاح کے وقت نکاح نامہ میں کوئی ایسی عبارت تحریر ہونی چاہئے کہ کم از کم وہ شخص زد میں نہ آئے شکریہ۔

**مولانا انیس الرحمن:**...... نکاح میں جو شرطیں نفس نکاح کے لئے ضروری ہوتی ہیں ان کے علاوہ فریقین کچھ دیگر شرائط کا اضافہ کر سکتے ہیں یا نہیں، فقہاء نفس اشتراط کو جائز قرار دیتے ہیں، مگر اختلاف اس بارے میں ہے کہ کون سی شرطیں صحیح ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہے اور کونسی شرطیں فاسد ہیں جن پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے، یہاں سوال یہ ہے کہ کیا کوئی عورت نکاح کے وقت ملازمت کرنے کی شرط عائد کرسکتی ہے، کیا شوہر سے نکاح ثانی کرنے کی صورت میں مہر کے اضافہ کی شرط لگاسکتی ہے یا اسی طرح عقد نکاح کے وقت طلاق کے حق کی شرط لگاسکتی ہے یا نہیں؟ فقہاء نے جو تشریحات کی ہیں ان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی خاتون کا ملازمت کی شرط عائد کرنا شروط فساد میں داخل ہے، اسی طرح نکاح ثانی کی صورت میں اضافہ مہر کی شرط صاحبین کے مسلک پر درست ہے، ایسا کیا جاسکتا ہے، اسی طرح اگر کوئی خاتون عقد نکاح میں خاص الفاظ کے ساتھ نکاح کی طرف اضافت کرتے ہوئے حق طلاق کو تفویض کی صورت میں حاصل کرتی ہے تو یہ اسے اختیار ہے کہ فقہاء حنفیہ کی صراحت کی روشنی میں یہ صورت جائز ہے۔

**مولانا مصطفی مفتاحی:**..... تفویض طلاق کے سلسلہ میں ایک رائے یہ آئی کہ تفویض طلاق باطل ہے، اور اس صورت میں طلاق واقع نہیں ہوگی، مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ یہ تو نص ہے کہ یہ امت ضلالت پر جمع نہیں ہوگی، پوری ملت کے ہر طبقہ کا اس بات پر اتفاق اور اجماع ہے کہ جو مسائل منصوص نہیں ہیں ان میں استنباط کیا جائے گا مسئلہ تفویض طلاق میرا خیال ہے کہ منصوص ہے، بالفرض اگر یہ منصوص نہ بھی ہو تو غیر منصوص ہونے کی بناء پر اس کو باطل اور غیر معتبر کہا جائے، تو میرا خیال ہے کہ یہ صحیح نہیں ہوگا، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے اس پر غور وفکر کرنا ہوگا، دہلی سے نکلنے والے ایک پرچہ "ترجمان" میں میں نے پڑھا تھا جس میں یہ بات بتائی گئی تھی کہ تفویض طلاق بالکل ہی باطل ہے اور اس میں کئی ملکوں کی نظیر دی گئی تھی، مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ جب یہ رائے ہی غلط ہے باطل ہونے کی تو دوسرے ملکوں کی نظیر دیکھ کر کے اس غلط نظیر کی اتباع کی دعوت دینا بھی درست نہیں ہوگا، دوسری بات جو عرض کرنی تھی وہ یہ کہ جو ڈبل مہر کی بات کی گئی ہے، اس سلسلہ میں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ملک کے دو خطے ہیں: ایک خطہ میں تلک کا رواج ہے، اور ملک کا دوسرا خطہ وہ ہے کہ جہاں تلک کی رسم وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے، وہاں ٹھیک سیدھے طریقہ سے شریعت کے مطابق نکاح عمل میں آتا ہے، لیکن وہاں دوسری خرابی ہے میرا خیال ہے کہ ڈبل مہر والی تجویز درست نہیں ہے۔

**مولانا نادر احمد مجیبی:**...... میں تجویز کی تائید کرتا ہوں۔

**مولانا شمس پیرزادہ:**...... جو مسائل اس وقت پیدا ہو رہے ہیں ہمارے معاشرہ میں عورتوں کے حقوق کے تعلق سے ان کے ساتھ جو ناانصافی ہو رہی ہے اور وہ جن مسائل میں گھری ہوئی ہیں، ان کا کوئی مناسب حل تلاش کیا جائے، معاملات کو یونہی نہ رہنے دیا جائے، کوئی اسکیم سوچی جائے، لیکن وہ ایسی ہونی چاہئے جو شریعت کے دائرہ کے اندر ہو اور کوئی ہم ایسی چیز تجویز نہ کریں کہ جس سے کہ شریعت کے احکام متاثر ہوتے ہوں، میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ طلاق قابل انتقال چیز نہیں ہے، اور اس کی کوئی دلیل قرآن وسنت سے نہیں ہے، طلاق جیسی چیز قابل انتقال نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ عظیم مصلحت پر مبنی ہوتی ہے، اور ان مصلحتوں کا لحاظ طلاق دینے والا ہی کرسکتا ہے دوسرا نہیں کرسکتا، تو اس صورت میں جب کہ طلاق تفویض کردی جائے تو کیل کی صورت میں، تو یہ عظیم مصلحت فوت

ہوجائے گی، اور ہمیں صرف یہی نہیں دیکھنا چاہئے کہ قانونیت کس طرح پیدا کی جاسکتی ہے، بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ مصلحتیں جو شریعت نے رکھی ہیں ان میں سے کوئی مصلحت فوت نہ ہوجائے، دوسری بات یہ ہے کہ اگر طلاق تفویض کی جاسکتی ہے عورت کوتو عورت کو بھی خلع کا حق ہے، تو کیا اگر کوئی عورت یہ کہتی ہے کہ میں اپنے شوہر کو خلع کا حق دے دیتی ہوں اس طور سے کہ وہ جب چاہے خلع کا معاملہ کرے اور مہر معاف ہوگا تو خلع کا حق تفویض کیا جاسکتا ہے مردوں کو، اور اگر کیا جاسکتا ہے تو مرد بھی یہ چاہیں گے کہ ایسی شرائط نکاح نامہ میں لکھ دی جائیں، تاکہ اس کو مہر دینا ہی نہ پڑے، وہ خلع کا اعلان کردے گا، تو اگر طلاق قابل انتقال ہے اگر تفویض کی جاسکتی ہے تو خلع کی بھی تفویض کی جانی چاہئے اور جو شرطیں آپ نکاح نامہ میں لکھیں، وہ جھگڑے پیدا کرنے والی، آئندہ چل کر یہ باتیں پیدا ہوسکتی ہیں، اور یہ شرطیں قابل عمل بات نہیں ہیں، ایسی صورت میں سوچنا چاہئے جس کو قبول کرنے کے لئے معاشرہ تیار ہو میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو مسائل پیدا ہورہے ہیں ان کا حل دوسری شکل میں تلاش کرنا چاہئے، مثلاً یہ کہ جو ظلماً طلاق دی جاتی ہے اس پر کوئی تادیبی کارروائی ہونی چاہئے، طلاق کے تعسف کی صورت میں کوئی معاوضہ شوہر کو دینا ہوگا اور معاوضہ کتنا دینا ہوگا یہ الگ بات ہے، کچھ اس قسم کی سزائیں تجویز کی جاسکتی ہیں کہ اس صورت میں جب کہ طلاق تعسف کو ظلماً یا ناحق قرار دیا گیا ہو، اور جس سے عورت کو ضرر واقع ہو ہر طلاق پر نہیں اس قسم کی چیزیں سوچی جاسکتی ہیں، لیکن نکاح کے لئے شرائط نامہ تجویز کریں یہ تو کوئی قابل عمل بات ہی نہیں ہے۔

**مولانا مجاہد الاسلام:** ...... میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب اس پر متفق ہیں کہ جو معاشرہ میں مشکلات ہیں ان کا کوئی حل نکلنا چاہئے اور حل عملی ہونا چاہئے اور مصالح شریعت کے مطابق ہونا چاہئے، تو اب جو کچھ بحث ہو چکی ہے اس بحث کی روشنی میں تو یہ بات واضح ہے کہ جو زیادتیاں خواتین پر ہوتی ہیں ان کو دور کرنے کا کوئی راستہ نکالنا چاہئے، ایک بنیادی جو اختلافی نقطہ نظر ہے کہ تفویض طلاق جائز ہے یا نہیں، اور جو پیرزادہ صاحب نے بات کہی کہ توکیل طلاق بھی درست نہیں، تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ بات پر ذرا غور کرنا ہوگی کہ یہ محل اجتہاد ہو بھی سکتا ہے یا نہیں، اور جو مسئلہ خلع کا بتایا گیا ہے، یہ تو روز ہم لوگ کراتے رہتے ہیں، خلع میں جو ایک مصیبت ہے وہ یہ ہے کہ میں اپنا مہر اس شرط پر معاف کرتی ہوں کہ شوہر مجھے طلاق دے دے، ظاہر ہے شوہر کی رضامندی ہی پر موقوف ہوگا، بہت احتیاط کے ساتھ کبھی ہم لوگ اپنے دار القضاء میں فقہ مالکی کے مطابق عمل کرتے ہیں کہ جب دیکھتے ہیں کہ حالات ایسے ہیں طلاق ایک بری چیز ہے، مگر طلاق ایک ضرورت بھی ہے اور شاید طلاق کی اجازت ہی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے یہاں وہ فساد نہیں ہے جو غیر مسلم معاشرہ میں ہے تو دونوں ہی چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی متوازن حل، ہمارے دوستوں کو کل جب کمیٹی میں بیٹھیں تو ان کو نکالنا چاہئے تھا، حل کا دو راستہ ہے ایک تو یہ کہ ہم باضابطہ ایک شرائط نامہ تیار کریں، دیکھیں کہ وہ شرائط نامہ کس طرح کا ہوسکتا ہے، کیا ہوسکتا ہے؟ اور وہ مصالح شریعت سے ہم آہنگ ہوں اور دوسری چیز یہ بھی ہوگی کہ ہم یہ لکھیں گے کہ اگر کوئی شخص فلاں فلاں شرطوں پر کرتا ہے تو فلاں شرط معتبر ہوگی اور فلاں شرط معتبر نہیں ہوگی، یعنی اس کی حیثیت ایک جزوی حیثیت ہے۔

☆☆☆

# نکاح نامہ

شوہر کا نام مع ولدیت عمر: ..................................................

پتہ: ..................................................

موجودہ پیشہ رعہدہ : ..................................................

نکاح اول یا نکاح ثانی: ..................................................

دلہن کا نام مع ولدیت: ..................................................

عمر : ..................................................

پتہ : ..................................................

نکاح اول یا ثانی : ..................................................

نکاح ثانی کی صورت میں کیا یہ نکاح پہلے شوہر کے بعد یا طلاق حاصل کرنے کے بعد کیا جارہا ہے۔..................

موجودہ پیشہ رعہدہ : ..................................................

وکیل نکاح کا نام مع ولدیت (زوج کی طرف سے): ..................................................

عمر : ..................................................

پتہ : ..................................................

پیشہ : ..................................................

| دلہن سے اجازت کے گواہ (۱) | گواہ نمبر (۲): |
|---|---|
| نام مع ولدیت: | نام مع ولدیت: |
| عمر: | عمر: |
| پتہ: | پتہ: |

| گواہ نکاح نمبر (۱): نام مع ولدیت: | گواہ نمبر (۲): | |
|---|---|---|
| عمر: | عمر: | پیشہ |
| پتہ: | پتہ: | پیشہ |

مہر ..................اگر زوج نے زوجہ مذکورہ کی موجودگی میں دار القضاء ..................کی رائے کے بغیر دوسرا نکاح یا زوجہ مذکورہ کو طلاق دی۔

ایسی صورت میں پیش نہ آنے کی صورت میں مہر کی مقدار ..................ہوگی۔

# اقرار نامہ

(۱) شوہر اور زوجہ دونوں مسلمان ہیں اور شرع اسلام کے پابند رہنے کا اقرار کرتے ہیں۔

(۲) میں.................. بنت.................. اقرار کرتی ہوں کہ جائز باتوں میں اپنے شوہر کی اطاعت کروں گی اور شوہر اور اس کے گھر والوں کے ساتھ بہتر اخلاق اور سلوک رکھوں گی اور ناموافق حالات میں بھی شوہر کی رفاقت کا حق ادا کروں گی۔

(۳) میں.................. ولد.................. اقرار کرتا ہوں کہ میں بیوی کے ساتھ معروف طریقہ پر زندگی بسر کروں گا اور ان تمام حقوق کو ادا کروں گا جو شریعت کی جانب سے مجھ پر واجب ہیں، نیز اگر مندرجہ ذیل باتوں میں سے کوئی بات پائی جائے اور دار القضاء.................. یا حکمین.................. یا جماعت مسلمین.................. یا برادری ر پنچایت.................. باضابطہ یا غیر رسمی طور پر تحقیق کے بعد مطمئن ہو جائیں اور اپنے اطمینان کا تحریری اظہار کر دیں تو زوجہ کو اسی وقت یا جب تک یہ صورت برقرار رہے اس میں کبھی بھی اپنے اوپر ایک طلاق بائن واقع کر کے نکاح سے الگ ہو جانے کا اختیار حاصل ہوگا۔

۱۔ شوہر دو سال سے مفقود الخبر ہو۔

۲۔ ایک سال سے زوجہ کا نفقہ باوجود زوجہ کے مطالبہ کے ادا نہیں کرے۔

۳۔ ایک سال تک عورت کے مطالبہ کے باوجود بلا وجہ حق زوجیت سے غفلت برتے۔

۴۔ شوہر مجنون یا فاتر العقل یا متعدی جنسی مرض یا خطرناک غیر متعدی مرض میں مبتلا ہو۔

۵۔ شوہر زوجہ کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتا ہو جس میں یہ صورتیں بھی شامل ہیں

(الف) بیوی کو شدید زد و کوب کرتا ہو۔

(ب) دوسری عورتوں سے ناجائز تعلق رکھتا ہو۔

(ج) بیوی کو غیر اخلاقی فعل کرنے پر مجبور کرتا ہو۔

(۴) شوہر موجودہ زوجہ کے عرصہ حیات میں اگر دوسری شادی کی ضرورت محسوس کرے تو دار القضاء یا مقامی ذمہ دار علماء یا برادری کے ذمہ داروں کے سامنے اس کی وضاحت کرے گا کہ وہ دوسرا نکاح کیوں کرنا چاہتا ہے اور کیا وہ دو بیویوں کی کفالت کی استطاعت رکھتا ہے اور وہ دو بیویوں کے درمیان حسب حکم شرع عدل کر سکے گا۔

(۵) اگر شوہر نکاح ثانی کرے تو اس کا پابند ہوگا کہ پہلی بیوی کے مطالبہ پر دوسری بیوی کے لئے علاحدہ رہائش کا انتظام کرے۔

(۶) پہلی بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد مدت حضانت میں اس سے علاحدہ نہیں کی جاسکتی، اور مدت حضانت کے بعد یہ ضروری ہوگا کہ بچوں کے مفاد کی رعایت کرتے ہوئے قاضی کے ذریعہ اس کی پرورش کے لئے مناسب حکم دیا جائے۔

(۷) زوجہ کی طرف سے مہر کی معافی کلی یا جزدی اسی صورت میں معتبر ہوگی جب کہ اس کا اطمینان ہو جائے کہ یہ معافی کسی بھی قسم کے دباؤ یا دلہن کی سادگی، یا اس کی مسائل شرع سے لاعلمی کی بنیاد پر دھوکہ دے کر نہیں کرائی گئی ہے۔

(۸) شوہر طلاق دیتے وقت شرعی اصول کو پیش نظر رکھے گا کسی سبب شرعی کے بغیر اور دار القضاء یا مقامی علماء سے مشورہ کے بغیر طلاق دینے سے اجتناب کرے گا، نیز اگر طلاق دینا ناگزیر ہو جائے تو ایک دفعہ میں ایک سے زیادہ طلاق نہیں دے گا۔

(۹) وہ تمام اشیاء جو شادی کے وقت یا اس کے بعد (نکاح اور طلاق کے درمیان) زوجہ کو اس کے والدین، رشتہ داروں شوہر کے اہل خاندان، شوہر کے رشتہ کے دوستوں وغیرہ کی جانب سے تحفے کے طور پر حاصل ہوئی ہیں زوجہ کی ملکیت مانی جائیں گی۔

(۱۰) ہم زوجین اقرار کرتے ہیں کہ خدانخواستہ ہم دونوں میں جب بھی کوئی نزاع پیدا ہو تو دار القضاء.................. یا .................. ثالث ہوگا اور تمام ازدواجی نزاعات بہ شمول طلاق، خلع، مہر، حضانت، نفقہ وغیرہ کی بابت صوابدید واطمینان پر فیصلہ کا مجاز ہوگا۔

دستخط زوج:

دستخط زوجہ:

دستخط گواہ اول:

دستخط گواہ دوم:

دستخط قاضی:

☆☆☆

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

# جبری شادی

## اور اس سے متعلق شرعی احکام و مسائل

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دار الاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# ابتدائیہ

احکام شریعت کی بنیاد عدل پر ہے، "إن الله يأمر بالعدل والإحسان" (سورۂ نحل: ۹۰)۔ اس نے تمام انسانی طبقات کو انصاف فراہم کیا ہے اور دنیا کے مختلف مذاہب اور نظامہائے حیات میں جو ناانصافیاں روا رکھی گئی تھیں، ان کو دور کیا ہے، اور جیسے شفیق باپ اور دردمند ماں کا اپنے بچوں میں اس کی طرف زیادہ جھکاؤ ہوتا ہے جو کسی پہلو سے کمزور ہو، اسی طرح پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو تمام عالم کے لئے رحمت تھے، لیکن اس وقت دو طبقات جو سب سے زیادہ مظلوم تھے: "عورتیں اور غلام"، ان پر آپ کی نگاہ التفات سب سے زیادہ تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے آخری اوقات تک ان کے بارے میں حسن سلوک کی ہدایت فرمائی۔

اسلام سے پہلے عورت کے بارے میں تصور تھا کہ وہ بھی ایک جائداد ہے، جو چیز خود جائداد ہو اس میں مالک بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی، یہاں تک کہ وہ اپنے وجود کی بھی مالک نہیں ہوتی، اسی لئے ایک طرف عورت کو میراث سے محروم کیا گیا اور دوسری طرف شادی سے پہلے اسے باپ کی اور شادی کے بعد شوہر کی ملکیت سمجھا گیا، نہ اسے اپنے مال میں کوئی اختیار حاصل تھا اور نہ وہ اپنی ذات کے بارے میں خود مختار تھی، اسی لئے وہ خود اپنا نکاح نہیں کر سکتی تھی، اولیاء اس کی مرضی کے بغیر اس کا نکاح کر دیتے تھے، اور مہر جو عورت کا حق ہے، اس پر بھی خود قابض ہو جایا کرتے تھے۔

اسلام نے عورت کو عزت واحترام کا مقام دیا، اسے مالکانہ حقوق عطا کئے، میراث کے حق سے نوازا، اور بتایا کہ وہ اپنی ذات کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے، اولیاء اس پر کوئی رشتہ مسلط نہیں کر سکتے اور اپنی خواہش ومرضی کو اس پر زبردستی تھوپنے کا حق نہیں رکھتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں بڑی وضاحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے، دوسری طرف لڑکیوں کو اس بات کی تلقین بھی کی گئی کہ اولیا کی رائے ان پر لازم نہیں ہے، لیکن وہ اس کو اہمیت دیں اور اس کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کریں، کیونکہ ان کی رائے تجربہ اور بہی خواہی پر مبنی ہے۔

مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کی طرف سے یہ صورتحال سامنے آئی کہ وہاں اس سلسلہ میں ایک گونہ بے اعتدالی پائی جاتی ہے، ایک طرف اولیاء کی طرف سے لڑکیوں پر رشتوں کے لئے جبر کیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعد کو زوجین کے درمیان تعلقات میں ناہمواری پیدا ہوتی ہے اور طلاق اور خلع تک نوبت آجاتی ہے، دوسری طرف مغربی تہذیب کے اثر سے لڑکوں اور لڑکیوں میں اولیاء کی رائے کو اہمیت نہ دینے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے اور بعض اوقات نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے جذباتی فیصلے آئندہ خود ان کے لئے دشواری کا باعث بن جاتے ہیں۔

اسی پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے تیرہویں سمینار منعقدہ ۱۳ تا ۱۶ اپریل ۲۰۰۱ء، جامعہ سید احمد شہید کٹولی میں "جبری نکاح" کا موضوع بھی شامل تھا، سمینار میں جو اہم مقالات اہل علم کی طرف سے آئے اور بہ اتفاق رائے جو فیصلہ ہوا، ان کا مجموعہ اس وقت آپ کے سامنے پیش ہے، جو عائلی زندگی کے ایک اہم پہلو کو سمجھنے میں معاون بھی ہوگا اور شخصی آزادی کے سلسلہ میں اسلام کی روشن تعلیمات کی تصویر بھی لوگوں کے سامنے آسکے گی، اس موقع سے مجھے سنگھ پریوار سے تعلق رکھنے والے سینئر سیاستداں اور سابق وزیر اعظم ہند جناب اٹل بہاری واجپائی کی بات یاد آتی ہے جسے اردو کے علاوہ انگریزی اخبارات نے نمایاں طور پر شائع کیا تھا کہ "مجھے اسلام کی یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ لڑکی سے اجازت لئے بغیر اس کا نکاح نہیں کیا جاسکتا"۔ افسوس نہ ہمارے برادران وطن نے ٹھنڈے دل سے اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ہم مسلمانوں نے ان تک اس امانت کو پہنچانے ہی کی سنجیدہ کوشش کی ہے، ورنہ اسلامی تعلیمات قانون فطرت سے ہم آہنگی، عقل ومشاہدہ سے موافقت اور انسانی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کی صلاحیت کی جہت سے نہ صرف امت مسلمہ، بلکہ پوری انسانیت کے لئے نجات وفلاح کی کلید ہے اور اس سے نہ صرف آخرت کی کامیابی متعلق ہے، بلکہ دنیا میں سکون وطمانینت کا باعث بھی ہے۔ اور شاعر کے اس شعر کا مصداق ہے:

زفرق تابقدم ہرکجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

دعا ہے کہ اللہ تعالی اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے بانی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو اجر جزیل عطا فرمائے، اکیڈمی کو دوام واستحکام بخشے اور اس کی یہ پیش کش عند اللہ وعند الناس مقبول ہو۔ واللہ ہو المستعان۔ خالد سیف اللہ رحمانی (خادم اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا) ۱۲ رجون ۲۰۰۴ء، مطابق ۲۳ ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ

## سوالنامہ:

آپ کی خدمت میں برطانیہ اور بعض دوسرے مغربی ممالک کے مسلم سماج کی بعض مشکلات ومسائل کا شرعی حل دریافت کرنے کے لئے یہ تحریر بھیجی جارہی ہے، امید ہے کہ آپ حالات کی نزاکت اور پیچیدگی کو سامنے رکھتے ہوئے کتاب وسنت، مقاصد شریعت اور فقہاء کرام کی تصریحات کی روشنی میں ایسا حل تجویز فرمائیں گے جو قابل عمل ہوگا۔

آپ کو یہ بات معلوم ہوگی کہ برطانیہ، دوسرے مغربی ممالک نیز امریکہ میں ایشیا اور افریقہ سے گئے ہوئے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے اور اس آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ بہت سے خاندان ایسے بھی ہیں جو دو تین پشتوں سے ان ممالک میں آباد ہیں۔ جن مسلمان بچوں کی پیدائش، نشوونما اور تعلیم وتربیت ان ہی مغربی ممالک میں ہوئی، انہیں ان ملکوں سے کوئی زیادہ لگاؤ اور دلچسپی نہیں ہوتی جہاں سے ان کا خاندان ترک وطن کر کے مغربی ملکوں میں آباد ہوا ہے۔ مغربی ممالک میں پلنے اور بڑھنے والے مسلمان بچے اور بچیوں کا مزاج ومذاق بھی بڑی حد تک مغربی سانچہ میں ڈھل چکا ہوتا ہے۔ ان ممالک کے مسلمان لڑکے اور لڑکیوں میں یہ رجحان تیزی کے ساتھ بڑھتا جارہا ہے کہ ان کا ازدواجی رشتہ ان ہی ملکوں میں پیدا ہونے والے اور تعلیم وتربیت حاصل کرنے والے مسلمان لڑکے اور لڑکیوں سے کرایا جائے۔

دوسری طرف بسا اوقات والدین کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ ازدواجی رشتے اپنے خاندان میں کئے جائیں، یعنی ہندوستان یا پاکستان سے برطانیہ منتقل ہونے والے ماں باپ یہ چاہتے ہیں کہ اپنی بہو اور داماد ہند و پاک میں آباد اپنے خاندان سے حاصل کریں۔

یہ کشاکش بسا اوقات بہت ناپسندیدہ صورت اختیار کر لیتی ہے، خصوصا لڑکیوں کے مسئلہ میں۔ برطانیہ میں قائم شرعی پنچایتوں اور شرعی کونسلوں کے سامنے ایسے بہت سے واقعات آتے رہتے ہیں کہ عاقلہ بالغہ لڑکی کے والدین یا بھائی وغیرہ لڑکی کو اپنا قدیم وطن دکھانے یا سیر وتفریح کرانے کے عنوان سے ہندوستان یا پاکستان لے جاتے ہیں اور لڑکی کی شادی اپنے کسی عزیز وقریب سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑکی کسی طرح اس نکاح پر رضامند نہیں ہوتی اور صاف کہہ دیتی ہے کہ ہم اس نوجوان کے ساتھ کسی طرح زندگی نہیں گذار سکتے۔ اس کے باوجود اولیاء اسے نکاح کرنے پر مجبور کرتے ہیں، جبر واکراہ کی شکلیں اختیار کرتے ہیں، اسے نکاح پر آمادہ کرنے کے لئے زدوکوب کرتے ہیں۔ یہ دھمکی دیتے ہیں کہ اگر تم نے اس شخص سے نکاح نہیں کیا تو تمہارا پاسپورٹ جلادیں گے، برباد کردیں گے اور تم کو برطانیہ کی شہریت سے محروم کر کے یہیں سڑا دیں گے۔ مجبور وبے بس لڑکی اس طرح کی دھمکیوں اور جبر واکراہ سے مجبور ہوکر نکاح پر رضامندی کا زبانی اظہار کردیتی ہے، حالانکہ وہ دل سے اس نکاح پر ہرگز آمادہ نہیں تھی۔ اس جبری نکاح کا ایک بڑا مقصد اس نوجوان کو برطانیہ کی شہریت دلوانا اور برطانیہ میں بسانا ہوتا ہے جس کے ساتھ نکاح کرنے پر لڑکی کو مجبور کیا گیا۔

اس طرح کی لڑکیاں برطانیہ واپس جانے کے بعد ان نوجوانوں کو اپنا شوہر تسلیم کرنے اور ان کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرنے سے انکار کردیتی ہیں۔ ان میں جو دیندار ہوتی ہیں، خدا کا خوف رکھتی ہیں وہ مسئلہ معلوم کرنے اور نکاح فسخ کرانے کے مقصد سے شرعی کونسلز کی طرف رجوع کرتی ہیں۔

یہ واقعات اتنی کثرت سے ہونے لگے ہیں کہ حکومت برطانیہ نے اس پر رپورٹ مرتب کروائی اور ان واقعات کا سخت نوٹس لیا۔ پریس میں ایسے واقعات آنے سے مسلمانوں اور اسلام کی تصویر بھی خراب ہوئی اور آزادی نسواں نیز حقوق انسانی کی تنظیموں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ اسلام میں آزادی رائے اور عورتوں کے حقوق اس حد تک پامال ہیں کہ عاقلہ، بالغہ، تعلیم یافتہ، باشعور لڑکی کو جبراً کسی ناپسندیدہ شخص کے نکاح میں رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

یہ نکتہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ شریعت نے اولیاء کو بچے اور بچیوں کے معاملات میں تصرف کا جو بھی اختیار دیا ہے، اس کی بنیاد ان کے ساتھ شفقت اور ان کے مفادات کی رعایت وحفاظت ہے، لہذا ولایت کی بنیاد پر انہیں ایسے ہی تصرفات کا اختیار ہونا چاہئے جن میں بچوں کا فائدہ اور ان کے مفادات کی حفاظت ہو۔

ہندوستان میں بھی اب اس طرح کے واقعات مسلسل رونما ہونے لگے ہیں، جس میں جبر کے ساتھ نکاح کر دیا جاتا ہے۔

اس پس منظر میں آپ درج ذیل سوالات کے جوابات قدرے تفصیل کے ساتھ تحریر فرمائیں:

۱۔ عاقلہ بالغہ لڑکی کے نکاح میں شریعت نے اس کی رضامندی کو بہت اہمیت دی ہے، جیسا کہ احادیث نبویہ سے واضح ہے۔ کیا وہ صورت رضامندی میں شامل ہوگی جب کہ لڑکی کو ڈرا دھمکا کر یا زدوکوب کر کے یا پاسپورٹ ضائع کر دینے کی سخت دھمکی دے کر اس سے نکاح کے لئے ہاں کہلوا لیا گیا ہو جب کہ دل سے وہ اس نکاح پر راضی نہیں ہے؟

۲۔ مکرہ کا نکاح شرعاً منعقد ہو جاتا ہے یا نہیں؟ کیا اس سلسلے میں اکراہ ملجی اور اکراہ غیر ملجی کے درمیان کوئی فرق ہے؟

۳۔ قاضی یا شرعی کونسل کے سامنے اگر اس طرح کا کیس آتا ہے اور قاضی یا شرعی کونسل کو فریقین کے بیانات وغیرہ کے بعد اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ جبر و اکراہ سے مجبور ہو کر لڑکی نے رضامندی کا اظہار کیا تھا اور لڑکی کسی طرح اس شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو تو کیا شرعی کونسل یا قاضی اس نکاح کو فسخ کر سکتے ہیں؟

۴۔ اوپر جس قسم کے نکاح کا ذکر ہوا، اس کے بعد کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان زن وشوئی تعلقات بھی قائم ہو جاتے ہیں اور کبھی زن و شوئی تعلقات قائم ہونے کی نوبت نہیں آتی، دونوں صورتوں کا حکم یکساں ہے یا الگ الگ، تحریر فرمائیں۔

☆☆☆

# اکیڈمی کا فیصلہ:

## جبری شادی

برطانیہ اور بعض مغربی ممالک کے سماجی حالات کے پس منظر میں اولیاء کی جانب سے لڑکیوں کو رشتہ نکاح کے سلسلے میں مجبور کئے جانے کے واقعات پر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے تیرہویں سمینار منعقدہ جامعہ سید احمد شہید کٹولی، ملیح آباد میں غور کیا گیا اور حسب ذیل فیصلے کئے گئے:

۱۔ لڑکا یا لڑکی جب بالغ ہو جائیں تو شریعت نے انہیں اپنی ذات کے بارے میں تصرف اور نکاح کے سلسلے میں رشتہ کے انتخاب کا حق دیا ہے۔ یہ حریت شخصیہ شریعت اسلامیہ کے امتیازات میں سے ہے، بلکہ آج مغرب ومشرق کی بہت سی قوموں نے عورتوں کو جو حقوق دیئے ہیں وہ انہی اسلامی تعلیمات سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔

۲۔ اولیاء کی جانب سے بالغ لڑکی یا لڑکے کو ان کی خواہش اور رضا کا خیال کئے بغیر کسی رشتہ پر مجبور کرنا قطعاً جائز نہیں، لہذا اولیاء کا اپنی رائے پر اصرار اور اس پر مجبور کرنے کے لئے طرح طرح کی دھمکیاں دینا اسلام کے دیئے ہوئے حقوق سے محروم کرنے کی ناروا کوشش ہے، جو کسی طرح درست نہیں ہے۔

۳۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی چاہئے کہ اپنے اولیاء کے انتخاب کردہ رشتے کو ترجیح دیں، کیونکہ اولیاء کی شفقت ومحبت اور ان کے تجربہ کی وجہ سے عموماً یہی امید ہے کہ اولیاء نے ان کے لئے رشتے کا انتخاب کرتے وقت ان کے مفادات کا پورا پورا لحاظ کیا ہوگا۔

۴۔ نکاح کے منعقد ہونے یا نہ ہونے کا تعلق نکاح کے وقت رضامندی کے اظہار سے ہے، لہذا اگر بالغ لڑکے یا لڑکی نے نکاح کے وقت رضامندی کا اظہار کر دیا تو نکاح منعقد ہو جائے گا۔

۵۔ اگر قاضی شرعی اور قضاء کے کام کرنے والے اداروں وذمہ داروں کے سامنے یہ بات بہ تحقیق ثابت ہو جائے کہ اولیاء نے بالغہ لڑکی کے نکاح کے سلسلے میں جبر وزبردستی سے کام لیا ہے اور اس کو مجبور کر کے بوقت نکاح ہاں کرا لیا ہے اور لڑکی رشتہ ہو جانے کے بعد اس رشتہ کو باقی وبرقرار رکھنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہے اور فسخ کا مطالبہ کرتی ہے اور شوہر نہ بطور خود اسے جدا کرتا ہے اور نہ خلع وطلاق پر آمادہ ہے تو قاضی شرعی کو دفع ظلم کی غرض سے فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا۔

☆☆☆

## عرض مسئلہ:

# جبری شادی

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی [1]

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے اپنے تیرہویں فقہی سمینار کا ایک موضوع جبری شادی رکھا ہے۔ اس سے متعلق عرض، خلاصہ اور تجزیہ و جائزہ پیش کرنے کا احقر کو مکلف بنایا گیا ہے۔

بنیادی طور پر اس مسئلہ کا تعلق "ولایت و کفاءت" کے موضوع سے ہے اور ان دونوں امور کے سلسلہ میں اکیڈمی کی طرف سے سمینار ہو چکا ہے اور تجاویز بھی آ چکی ہیں۔ اس کے بعد برطانیہ وغیرہ کے حالات کے پس منظر میں وہاں مقیم فکر مند علماء کے تقاضے کے تحت اس موضوع کو اختیار کیا گیا ہے۔ بہرحال پہلے تو اس سے متعلق موصول ہونے والی تحریروں کا خلاصہ ملاحظہ فرمایئے اور اس کے بعد احقر کا جائزہ و تجزیہ پیش خدمت ہے۔

اس موضوع سے متعلق مرسلہ و تیار کردہ سوالنامہ کے جواب میں اکیڈمی کو کل ۲۳ تحریریں عرض کی تجویز و تحریر کے وقت تک موصول ہوئیں جن میں اکثر تو مختصر ہیں اور چند مبسوط ہیں۔ جواب دینے والوں میں اکیڈمی کے مستقل معاونین و شریک کار، نیز اہم حضرات یہ ہیں: مفتی عزیز الرحمن بجنوری، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا قدرت اللہ باقوی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا عبد العظیم اصلاحی۔

جوابات کی نوعیت یہ ہے کہ بعض حضرات نے اجمالی جواب پر اکتفا کیا ہے اور ہر ہر دفعہ کا جواب نہیں دیا ہے اور نہ ان کے کلام سے اس کا اخذ کرنا ممکن ہے، اور بعض حضرات نے ہر دفعہ کا وضاحت و صراحت سے جواب دیا ہے، خلاصہ میں کوشش کی گئی ہے کہ کوئی رائے چھوٹنے نہ پائے اور نہ کسی رائے کے اخذ کرنے میں غلطی ہو، مگر براءت کا دعوی نہیں کیا جا سکتا۔

### پہلا سوال:

قبل عقد لڑکی سے بجبر "ہاں" کرانا۔ کیا رضا شمار کیا جائے گا؟

مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا اقبال قاسمی اور مولانا نعیم اختر صاحب کا جواب ہے کہ اس کو رضا شمار کیا جائے گا اور اکثر حضرات کا خیال ہے کہ نہیں۔

### دوسرا سوال:

بوقت عقد بجبر "ہاں" کرانا کیا قبول عقد ہے اور نکاح ہو جائے گا؟

مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا محمد ظفر، مولانا نعیم اختر، مولانا اقبال قاسمی، مولانا مصطفی قاسمی اور مولانا نیاز احمد کا خیال ہے کہ نکاح ہو جائے گا، جبکہ مفتی عزیز الرحمن بجنوری، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا قدرت اللہ باقوی اور مولانا محمد اعظمی کا خیال ہے کہ نہیں ہوگا۔ بعض حضرات نے یہ فرق کیا ہے کہ اگر بجبر دستخط کرایا گیا ہے اور زبان سے نہیں کہلایا تو نہیں ہوگا ورنہ ہو جائے گا۔

### تیسرا سوال:

برطانیہ و ہندوستان وغیرہ کا معاشرتی فرق کیا کفاءت کے تحت آتا ہے؟

اس کے تحت بصراحت جواب دینے والے متفق ہیں کہ کفاءت کی نسبت سے اس کا کوئی اعتبار نہیں اور لڑکی کو کوئی حق نہیں، البتہ مولانا ظفر عالم ندوی نے کہا

[1] سکریٹری برائے سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)، استاذ حدیث جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ

ہے کہ خلع کرلے۔

## چوتھا سوال:

مذکورہ صورت میں تفریق کے لئے دخول وعدم دخول کا فرق؟ اس کے تحت کئی آراء ہیں:

۱۔ بہر صورت حق ہے (مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا اقبال احمد قاسمی، البتہ اقبال صاحب کہتے ہیں کہ اگر دخول میں بھی جبر ہو تو بعد دخول بھی حق ہے)۔

۲۔ بہر صورت حق نہیں (مولانا نعیم اختر)۔

۳۔ بعد دخول حق نہیں (مولانا عبد العظیم اصلاحی، مولانا محمد ظفر، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا عبد القادر عبد اللہ)۔

۴۔ اگر جبر ہو تو حق ہے ورنہ نہیں (شوکت صبا)۔

## پانچواں سوال:

جبر واکراہ کا تحقق ہونے پر شرعی کونسل وغیرہ کو حق تفریق ہے یا نہیں؟

اس کے تحت مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا اقبال قاسمی اور مولانا نعیم اختر کی رائے ہے کہ کوئی حق نہیں اور بقیہ وہ حضرات جنہوں نے اس پہلو کی صراحت کی ہے سب متفق ہیں کہ شرعی کونسل کو یہ حق ہے۔ ان حضرات میں مفتی عزیز الرحمن بجنوری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا ظفر عالم ندوی اور مولانا ابو العاص وحیدی وغیرہ ہیں۔

مفتی عزیز الرحمن صاحب بجنوری اس قسم کے نکاح کے انعقاد کے قائل نہیں ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ قاضی شرعی یا شرعی پنچایت کو بلا جھجک نکاح فسخ کردینا چاہئے، یہ احتیاطا ہے، ورنہ جب نکاح کا وجود ہی تسلیم نہیں تو فسخ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

یہ مقالہ نگار حضرات کی آراء کا خلاصہ تھا۔ اب احقر کا تجزیہ سماعت فرمائیں۔

پہلی بات تو یہ کہ جبری شادی کی ایک صورت یہ ہے کہ باپ، دادا وغیرہ بچی یا بچے کی شادی خالص اپنی مرضی سے کریں اور ان کے بلوغ کے باوجود یا تو ان سے استفسار نہ کریں یا استفسار کریں تو ان کے انکار کا لحاظ کئے بغیر خود ہی ایجاب وقبول کرلیں۔ سوالنامہ میں یہ صورت شامل نہیں ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر عقد اور ایجاب وقبول کا علم ہونے پر لڑکی یا لڑکا خاموش رہے، کچھ نہ بولے تو نکاح نافذ ہوجائے گا ورنہ رد ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ لڑکی کے انکار کی صورت میں اس سے بوقت ایجاب وقبول، باصرار اور باجبار ہاں اور قبول کہلایا اور کروایا جائے۔ اسی کی بابت سوال کیا گیا ہے تو اگر اجبار کے ساتھ تحریر لی گئی، دستخط یا انگوٹھا، تو یہ غیر معتبر ہے۔ اور اگر ہاں کرایا گیا تو حنفیہ کے نزدیک یہ نکاح ہوجاتا ہے، اور اس نکاح کی صحت کی وجہ بعض وہ توسیعات ہیں جو شریعت نے انعقاد نکاح اور طلاق کی بابت رکھی ہیں جن کی بنیاد ترمذی وغیرہ کی معروف حدیث ہے: "ثلاث جدهن جد وهزلهن جد" (جامع ترمذی، کتاب الطلاق۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے اور تمام اہل علم کا عمل اس کے موافق ذکر فرمایا ہے)۔ اس حدیث کے مطابق مذاق کے طور پر کہے جانے والے ایجاب وقبول کے الفاظ بھی صحت نکاح کے لئے کافی ہیں اور جب مذاق سے نکاح ہوجاتا ہے تو اکراہ واجبار کی صورت میں بدرجہ اولی ہوجائے گا۔ کیونکہ مذاق کی صورت میں جانبین کا سرے سے رشتہ کرنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں ہے اور آپس میں گفتگو بس ایک تفریح اور دل لگی ہے اور اکراہ کی صورت میں ایک فریق تو پورے طور پر آمادہ وسنجیدہ ہی ہے، رہا دوسرا فریق جس پر جبر ہے تو وہ بھی اپنے نفع ونقصان کو سوچ کر ہی فیصلہ کررہا ہے اور ہاں کررہا ہے یعنی لڑکی، لہذا لڑکی کی طرف سے بھی عقد کا قصد وارادہ پایا گیا، اگرچہ یہ ارادہ بادل ناخواستہ انتہائی ناپسندیدگی اور ناگواری کے ساتھ ہے مگر لڑکی اس لئے ہاں کررہی ہے کہ اس کے سامنے انکار کی مضرتیں کم از کم فی الحال قبول کی مضرتوں سے بڑھ کر ہیں تو ہاں کرکے وہ خود کو فی الحال سہی بعض مضرتوں سے بچارہی ہے۔

لہذا یہ نکاح تو ہوگیا جبکہ نکاح باپ دادا نے کرایا ہے اور بظاہر انہوں نے لڑکی کے حق میں کسی برائی کا ارادہ نہیں کیا ہے اور نہ اپنی کسی ذاتی غرض ومنفعت کے حاصل کرنے کا، کہ کہا جائے کہ اپنی غرض پر لڑکی کو بھینٹ چڑھادیا۔

اور یہ نکاح حنفیہ کے علاوہ۔ بقیہ تینوں مذاہب وائمہ کی رائے کے مطابق بھی منعقد ودرست ہوگا جبکہ نکاح باپ و دادا نے کیا ہو۔ کیونکہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک

باپ کو بالغہ باکرہ پر بھی ولایت اجباری حاصل ہے اور امام شافعی اور امام احمد حنبل کے نزدیک دادا کو بھی۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ اس کے بعد لڑکی رشتے کو نباہنے کی بھی پابند اور اس پر مجبور ہے یا یہ کہ اس کو رشتے کے ختم کرنے کے مطالبے وسعی کا حق حاصل ہے۔

تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب نکاح صحیح ہوا اور بظاہر حال اس میں لڑکی کی بہتری و مصلحت کا ہی لحاظ کیا گیا تو لڑکی سے یہی کہا جائے گا کہ اس رشتے کو باقی و برقرار رکھے اور صبر وایثار سے کام لے، والدین کی خوشی اور ان کے پسند کردہ مستقبل کو اپنے حق میں بہتر سمجھے جن مضرتوں سے بچنے کے لئے اس نے مجبور ہو کر نکاح کو قبول کیا ہے، رشتے کو ختم کرنے کی صورت میں اس قسم کی مضرتوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور پھر اس کو مطلوبہ خوشیاں پورے طور پر حاصل نہ ہو سکیں گی۔

لیکن اگر وہ خود کو اس پر کسی طرح آمادہ نہ کر سکے تو اس کو رشتے کے ختم کرنے کے مطالبہ کا حق حاصل ہے۔

یہ حق اس کو اس وجہ سے حاصل ہے کہ لڑکی نے اگر چہ ہاں کر دی ہے مگر خود کو انتہائی مجبور پا کر اور اس حال میں کہ اس کا دل اس رشتے پر کسی طرح آمادہ نہ تھا، اس لئے ہاں کرنے بلکہ خود کو شوہر کے سپرد کرنے کے باوجود بھی بسا اوقات وہ شوہر کو اپنے دل میں وہ جگہ نہیں دے پاتی اور اپنے دل میں اس کے اندر وہ احساسات وجذبات پیدا کرنے سے عاجز رہتی ہے جو ازدواجی زندگی کی حقیقی مسرتوں کے لئے درکار ہیں بلکہ شوہر کے لئے معاندانہ جذبات اس میں برابر برقرار رہتے ہیں اور فروغ پاتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم و نازک رشتہ میں یہ بدمزگی کامیاب مستقبل اور اچھے نتائج کا پیش خیمہ نہیں بن سکتی بلکہ زوجین کے لئے ہر اعتبار سے مسائل کو جنم دینے والی ہوگی اور صورت حال وہ ہوگی جس کو قرآن وفقہ کی تعبیر میں ''شقاق'' سے تعبیر کیا گیا ہے، خواہ یہ ہو کہ یہ صورتحال پیدا ہو چکی ہو یا یہ کہ دونوں بتدریج اس کی طرف جارہے ہوں۔

اس لئے لڑکی کو حق ہے کہ وہ شرعی حدود میں اس رشتے کو ختم کرنے اور اپنی آزادی کا مطالبہ کرے۔ اور ایسی صورت میں اس کے مطالبے کو ان احادیث کا مصداق نہیں قرار دیا جاسکتا جن میں بغیر کسی معقول وجہ کے طلاق وخلع یعنی علاحدگی کے مطالبہ کی مذمت اور وعید آئی ہے، کیونکہ وعید ناحق مطالبے پر ہے اور یہاں مطالبہ بہرحال معقول اور برحق ہے۔

اور اس کی دلیل وہ قرآنی آیات وہدایات ہیں جن میں زوجین کے درمیان باہمی شدید اختلافات اور ایک دوسرے کی حقوق کی ادائیگی میں شدید اور موجب نزاع کوتاہی کے پائے جانے یا اس کے قوی اندیشے پر رشتے کو ختم کر دینے کی بات کہی گئی ہے:

''فإن خفتم أن لا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به'' (سورۂ بقرہ ۲۲۹)۔

''وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها'' (سورۂ نساء/ ۳۵)۔

ان آیات کے خطاب میں حکام واولیاء اور شوہر واقرباء سب داخل ہیں کہ شقاق کے حال اور اس کے قوی اندیشے میں کیا کریں، مشہور تابعی مفسر حضرت طاؤس پہلی آیت کے تحت فرماتے ہیں:

اس آیت میں حدود اللہ کو قائم نہ کرنے سے مراد ہے ایک دوسرے کی معاشرت وصحبت کے معاملات وحقوق کی اچھی طرح انجام دہی نہ کرنا (بخاری مع فتح الباری ۹/ ۳۹۴)۔

اور سب سے اہم اور واضح دلیل صحیحین وغیرہ کی روایت ہے کہ حضرت ثابت بن قیس کی بیوی حاضر خدمت ہوئیں اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھ کو ثابت بن قیس سے ان کے دین واخلاق کے اعتبار سے کوئی شکایت نہیں ہے (کیونکہ اس اعتبار سے تو وہ مناسب آدمی ہیں) لیکن میں اس کو پسند نہیں کرتی کہ اسلام سے وابستگی کے ساتھ کسی کی بیوی رہوں اور اس کے ساتھ دل سے محبت نہ کروں۔ اس کے حقوق کو پورے طور پر ادا نہ کروں اور اس طرح میں ناشکری یا کفر کے کاموں کی مرتکب ہوں یا یہ کہ عین کفر تک پہنچ جاؤں۔

شوہر سے ان کی نفرت وبددلی کا کیا سبب تھا؟ اس بابت اگر چہ بعض روایات میں اس کا تذکرہ آتا ہے کہ وہ بہت مارتے تھے حتی کہ اس سے کچھ جسمانی نقصان بھی ہوا تھا مگر محققین نے اس کے بجائے اہمیت اس کو دی ہے کہ شوہر نہایت بدصورت تھے، کیونکہ خاتون نے دین واخلاق میں کمی کی صاف نفی کر دی۔ وہ شوہر سے اتنی متنفر تھیں کہ ساتھ رہنے سہنے کے باوجود وہ خود کو شوہر سے پورے طور پر منسلک نہ کر سکیں اور وہ روز اول سے نفرت کا شکار تھیں، حتی کہ ابن ماجہ کی روایت میں آیا ہے کہ انہوں نے عرض کیا: اگر خوف خدا نہ ہوتا تو جس وقت وہ میرے پاس پہلی مرتبہ داخل ہوئے، میں ان کے منہ پر تھوک دیتی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گفتگو سن کر معروف روایات کے مطابق مزید کوئی استفسار نہیں فرمایا اور نہ ناپسندیدگی کی وجہ معلوم کی، اندازہ یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ علم تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بس یہ فرمایا کہ کیا تم مہر واپس کرنے کو تیار ہو، جب انہوں نے ہاں کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشتہ ختم کرادیا (روایت کی بابت تفصیلات کے لئے عمدۃ القاری اور فتح الباری سے رجوع کیا جائے۔ کتاب الطلاق باب الخلع)۔

ایک روایت ابوداؤد وغیرہ کی معروف ہے کہ ایک صحابی نے اپنی بیٹی کا نکاح اپنے بھتیجے سے کیا، مگر بھتیجے کے حالات کچھ ایسے تھے کہ جس کی وجہ سے وہ بیٹی کو پسند نہ تھے، خدمت اقدس میں آ کر عرض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو علاحدگی کا اختیار دیا جس پر انہوں نے عرض کیا کہ میں علاحدگی نہیں چاہتی مگر حق کو واضح کرنا چاہتی تھی۔

ایک واقعہ اور ہے جس کو محدثین، امام بخاری وغیرہ نے اس سیاق میں ذکر کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں جب یہ بات آئی کہ حضرت علیؓ دوسرا نکاح کرنا چاہتے ہیں تو آپ نے اس سے منع فرمایا بلکہ یہاں تک فرمایا کہ اگر دوسرا نکاح کرنا ہی ہے تو فاطمہ کو طلاق دے دیں۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ شراح حدیث اور شراح بخاری نے اس بابت یہ توجیہ پسند کی ہے کہ حضرت فاطمہؓ سوکن کی وجہ سے دوسرے نکاح کو پسند نہیں کرسکتی تھیں اور نتیجتاً اس کی وجہ سے باہم شدید اختلاف اور شقاق کا اندیشہ تھا (بخاری مع الفتح۔ کتاب الطلاق ۹؍ ۴۰۴)۔

اب علماء محققین اور اہل بصیرت علماء راسخین کی تحقیقات وتصریحات سنئے:

حافظ ابن حجر نے ثابت بن قیس والے قصہ کے تحت "فوائد" میں لکھا ہے: خلع وفدیہ اس وقت بھی جائز ہے جبکہ عورت شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو اگرچہ شوہر اس کو ناپسند نہ کرے اور شوہر کو اس سے کوئی شکایت نہ ہو (فتح الباری ۹؍ ۴۰۱) اور حضرت فاطمہ والی حدیث کے تحت لکھا ہے کہ مذکورہ آیت (آیت سے "وان خفتم شقاق بینهما" مراد ہے) اور اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سد باب کے طور پر بھی ایسا کرنا درست ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شقاق کے وقوع سے پہلے محض اس کے خوف واندیشے کے حال میں حکمین کو متعین کرنے کا حکم دیا ہے، جبکہ خوف کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شقاق تو فی الحال موجود نہیں لیکن مستقل تکدر اور باہمی بدمعاملگی اور بدمزگی پیدا کرنے والے شقاق واختلاف کے قرائن وعلامات موجود ہیں (فتح الباری ۹؍ ۴۰۴)۔

مولانا عبد الصمد رحمانی اولین نائب امیر شریعت بہار واڑیسہ نے موضوع سے متعلق اپنی معروف کتاب "کتاب الفسخ والتفریق" میں اس سلسلے کی ایک اصل "زن وشو میں شقاق" کو بھی قرار دیا ہے، اور شقاق کے متعدد اسباب ذکر کئے ہیں، کچھ صراحۃً اور کچھ اجمالاً۔ اس کے تحت علماء امارت کا معمول ہے کہ وہ جب قرائن سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ رشتے کو زبردستی باقی رکھنے میں زیادتی فساد کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا تو اسی اصل کے مطابق دو زوجین کے درمیان تفریق کی راہ کو اختیار کرتے ہیں (اگرچہ تفریق خلع وطلاق کی صورت میں ہو)۔

نیز مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب علیہ الرحمہ نے اپنے متعدد فتاویٰ میں بیوی کی طرف سے بعض اہم شکایتوں کی بنیاد پر یہ تحریر فرمایا ہے کہ اگر عورت صبر وتحمل سے کام نہ لے سکے تو طلاق وخلع کے ذریعہ علاحدگی اختیار کرلے۔ اور وہ شکایات ان معروف صورتوں کے تحت نہیں آتیں جن کا تذکرہ اس سیاق میں عموماً کتابوں کے اندر ملتا ہے اور جن کو فسخ وتفریق کے تحت ذکر کیا جاتا ہے (فتاویٰ امارت شرعیہ ۱؍ ۱۸۵، ۱۹۱، ۱۹۵، ۱۷۷) مثلاً ایک فتویٰ میں تحریر فرماتے ہیں: اگر زوجین میں موافقت ناممکن ہے تو ایسی صورت میں برضائے طرفین خلع ہوسکتا ہے، بلکہ ایک مفصل فتویٰ میں عدم موافقت کی بنیاد پر خلع کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ثابت بن قیس کی بیوی کے حال وقصہ اور حدیث سے استدلال کیا گیا ہے نیز آیت خلع سے بھی۔ یہ فتویٰ ایک دوسرے عالم کا تحریر کردہ ہے مگر مولانا تصدیق وتصویب میں فرماتے ہیں:

عورت کو ناموافقت مزاج یا دیگر مجبوریوں کی وجہ سے خلع کے مطالبہ کا شوہر سے حق ہے (فتاویٰ امارت شرعیہ ۱؍ ۱۷۵، ۱۷۶)۔

مولانا سجاد صاحب نے خلع وغیرہ کا حکم جن صورتوں میں ذکر کیا ہے، ان میں زوجین کی عمروں میں عدم تناسب اور اس کی وجہ سے مرد کا ناکارہ ہونا بھی آیا ہے، جیسے کہ مولانا عبد الصمد رحمانی صاحبؒ نے کتاب "الفسخ" میں عنین ہونے کی بنیاد پر تفریق کے لئے اس صورت کو بھی ذکر واختیار کیا ہے جبکہ مرد کو اس قسم کا عارضہ شادی کے ایک عرصہ کے بعد لاحق ہو۔

رہا یہ مسئلہ کہ لڑکی اپنے حق کو کس طرح حاصل کرے اور شرعی کونسل وغیرہ اس بابت کیا کرسکتے ہیں تو گذشتہ سطور میں کچھ نہ کچھ صورت کا ذکر آ گیا ہے اور وہی ان مواقع میں عموماً مذکور ہے جن کا حوالہ دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ لڑکی شوہر سے علاحدگی کے لئے طلاق یا خلع کے حصول کی سعی وتدبیر کرے، خواہ وہ خود شوہر سے گفتگو کرکے اس کو آمادہ کرے، یا متعلقین واعزہ یا شرعی کونسل وشرعی پنچایت وغیرہ کے لوگ شوہر کو تیار کریں اور سمجھائیں کہ جانبین کی بہتری اسی میں ہے کہ اس رشتہ کو

خوش اسلوبی کے ساتھ ختم کردیا جائے۔

شرعی کونسل وغیرہ جیسے اداروں کا کام صرف یہ نہیں کہ وہ اپنی طرف سے علاحدگی کا حکم کر کے نکاح کے فسخ وتفریق کا کام کریں بلکہ باہمی نزاعات کو حل وختم کرنے کی حتی الامکان سعی کے بعد شوہر کی طرف سے خلع وطلاق کا معاملہ طے کرانا اور بہ مجبوری خود تفریق کا فیصلہ کرنا، یہ سب ان اداروں کا کام ہے، ایسی بعض صورتوں میں مولانا سجاد صاحبؒ نے قاضی کی طرف سے فسخ وتفریق کا انکار کیا ہے۔

البتہ شرعی کونسل کی طرف سے فسخ وتفریق کی صورت اس بنیاد پر ہوسکتی ہے کہ اس نوع کے نکاح وقضیے کو مسئلہ کفاءت کے تحت لایا جائے اور اس پہلو سے اس کو دیکھا جائے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ یہ پہلو بھی یہاں قابل غور ہے، کیونکہ کفاءت کا مفہوم اور مقصد بہت وسیع ہے یہی وجہ ہے کہ تفصیلات وجزئیات میں اختلاف کے باوجود تمام علماء وائمہ نے نکاح کے اندر اس کی رعایت کو اختیار کیا ہے اور اس کو اہمیت دی ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/ ۲۳۰، ۲۳۲، حاشیہ ردالمحتار در مختار ۴/ ۲۰۴)۔

اس موقع پر کفاءت کی مناسبت سے گفتگو کو طول نہیں دیا جاسکتا، البتہ کفاءت کی وضاحت اور امور کفاءت کی بابت چند باتیں عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ اس کی روشنی میں اس مسئلہ پر غور کیا جاسکے۔

کفاءت کیا ہے؟ اس بابت اکیڈمی کے گیارہویں سمینار کی تجاویز کا ایک حصہ پیش خدمت ہے:

''اسلام نکاح کو پائیدار و استوار دیکھنا چاہتا ہے اور ایسی ہدایات دیتا ہے جن پر عمل کرنے سے نکاح اپنے مقاصد کو پورا کرے اور میاں بیوی تاحیات خوشگوار زندگی گذار سکیں۔ کفاءت کی حقیقت (زوجین میں) مماثلت اور یگانگت ہے۔ میاں بیوی کے درمیان فکر وخیال، معاشرت، طرز رہائش، دینداری وغیرہ میں یکسانیت یا قربت ہونے کی صورت میں زیادہ امید ہوتی ہے کہ دونوں کی ازدواجی زندگی خوشگوار گذرے اور رشتہ مستحکم ہو۔ بے جوڑ نکاح عموماً ناکام رہتے ہیں اور اس ناکامی کے برے اثرات ان دونوں شخصوں سے متجاوز ہو کر دونوں کے گھروں اور خاندانوں تک پہنچتے ہیں، اس لئے احکام نکاح میں شریعت نے کفاءت کی رعایت کی ہے''۔

یہ تو اکیڈمی کی تجویز کا ایک حصہ ہے، مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی شہید علیہ الرحمہ نے ایک موقع پر فرمایا: لڑکا ہر حقیقت سے لڑکی کے برابر ہو، مراد یہ ہے کہ دین دیانت، مال، نسب، پیشہ اور تعلیم میں لڑکا لڑکی سے کم تر نہ ہو۔

امور کفاءت کیا ہیں؟ اس بابت فقہاء نے عموماً چند متعین امور کا تذکرہ کیا ہے۔ حنفیہ نے بھی اور دوسرے حضرات نے بھی۔ لیکن قدیم وجدید فقہاء محققین اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ کفاءت میں ذکر کئے جانے والے امور کی بنیاد عرف وعادت پر ہے۔ صاحب فتح القدیر اور علامہ شامی وغیرہ نے اس کی صراحت کی ہے اور اسی بنا پر کفاءت کی بحث وجزئیات میں علم وعقل وغیرہ کا ذکر وشمار کیا ہے ورنہ کتب فقہ میں عمومی طور پر مذکور امور میں یہ چیزیں شامل نہیں ہیں، اور اسی کے تحت عمر میں تناسب کو بھی مؤثر مانا گیا ہے، جس کو بعض مسلم ممالک میں اختیار کیا گیا ہے اور بعض اہل نظر علماء کی صراحت کے مطابق قدیم فقہاء نے بھی اس کا ذکر کیا ہے (احسن الفتاوی ۵/ ۱۲۳ بحوالہ شرح مہذب)۔ آج علم وتعلیم کی معاشرہ میں جو اہمیت ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں، اس لئے فقہاء عصر اس کو بھی ذکر کیا کرتے ہیں (آپ کے مسائل ۵/ ۶۱، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/) یعنی علم سے کورا ہونا اور جہالت یا علم میں فروتر ہونا ان کے نزدیک کفاءت میں مؤثر ہے۔

جیسے کہ بعض اہم بیماریوں کو بعض ائمہ مجتہدین بلکہ بعض ائمہ حنفیہ اور بعد کے علماء محققین نے اس فہرست میں شمار کیا ہے (ملاحظہ ہو الحیلۃ الناجزۃ وکتاب الفسخ والتفریق، نیز الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/ ۲۴۰) حتی کہ عنین کے مسئلہ کو بھی بعض حضرات نے کفاءت کے مسئلے کے تحت داخل کیا ہے (ردالمحتار ۴/ ۲۰۹ طبع زکریا)۔

عالم اسلام کے ممتاز فقیہ شیخ وہبہ زحیلی نے کفاءت سے متعلق گفتگو میں ان ہی امور پر اکتفا کیا ہے جن کا ذکر معروف ہے اور دوسرے امور کے حق میں نفی کی ہے مگر اسی کے ساتھ وہ فرماتے ہیں:

لیکن ان اوصاف میں تناسب کی رعایت بہتر ہے، بالخصوص عمر وعلم کی رعایت، کیونکہ زوجین کے درمیان ان دونوں چیزوں میں تناسب کا پایا جانا دونوں کے درمیان زیادہ توافق پیدا کرسکے گا اور ان کا لحاظ نہ کرنے سے بڑا افساد وانتشار ہوگا (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/ ۲۴۳، ۲۴۸)۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ایک فتوی میں فرماتے ہیں: کفاءت کا اعتبار دفع عار کے لئے ہے اور مدار عار کا عرف پر ہے اور عرفاً فلاں خاندان فلاں خاندان کے برابر سمجھا جاتا ہے، متقدمین کے زمانے میں مساوات نہ ہوگی۔ اس لئے اختلاف زمان سے یہ حکم بدل گیا (امداد الفتاوی ۲/۲۷۳)۔

ایک فتوی میں کچھ عبارتیں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ان روایات حدیثیہ وفقہیہ سے ثابت ہوا کہ قول عمرو کا صحیح ہے (جو عجم کے خاندانوں میں بھی کفاءت کی رعایت کا قائل ہے) اور یہ کہ مبنی اس کا عرف پر ہے، جس کا حدیث میں بھی اعتبار کیا گیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ باہم عجم میں جونسا کفاءت کا معتبر نہ ہونا فقہاء نے لکھا ہے یہ بھی مقید ہے اس کے ساتھ، جبکہ عرف میں اس تفاوت کا اعتبار نہ ہو ورنہ ان میں بھی اعتبار نسب وقومیت کا معتبر ہوگا۔

کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں: اور نسب نسبت الی الآباء ہے اور حسب لغۃً عام ہے، کما فی القاموس لیکن عرفاً خاص ہے شرف نفس کے ساتھ خواہ دنیوی ہو یا دینی اور کفاءت میں یہ بھی معتبر ہے، مثل نسب کے، چنانچہ فقہاء کا دیانۃً ومالاً وحرفۃً کہنا اس کی صریح دلیل ہے اور مدار اس کا بھی عرف ہی پر ہے (امداد الفتاوی ۲/۳۶۸، ۳۶۹)۔

مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب احسن الفتاوی، ایک مبسوط فتوی کے اخیر میں فرماتے ہیں:

مذکورہ عبارات کے علاوہ بھی شامی اور دوسری کتب میں بھی بہت سی عبارات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مشائخ نے کفاءت کو امور مرویہ عن الائمہ میں منحصر نہیں سمجھا بلکہ زمانہ کے حالات وعرف کے لحاظ سے اس میں مزید غور وفکر کی گنجائش ہے (احسن الفتاوی ۵/۱۰۴)۔

اس کے بعد مفتی رشید احمد صاحب نے حکم ذکر فرمایا ہے۔ مفتی صاحب کے بیان اور بعض دیگر حضرات کی تحریروں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ زوجین کے درمیان جب کسی بنیاد پر شدید عدم تناسب اور عدم توافق پایا جائے تو اس کو بھی امور کفاءت کے تحت شمار کر کے دار القضاء وغیرہ سے رجوع کیا جائے اور دار القضاء وغیرہ کے لوگ علاحدگی کی ضرورت محسوس کر کے لڑکے کو خلع وطلاق پر آمادہ نہ کر سکیں اور ضرورت محسوس کریں تو وہ نکاح کو فسخ کر کے تفریق کرا سکتے ہیں جیسا کہ کفاءت کے معاملات کا عام حکم ہے۔

خلاصہ یہ کہ کفاءت سے مقصود زوجین میں مزاجی ہم آہنگی کی رعایت ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کے مزاج کے بنانے میں بہت سے امور مؤثر ہوتے ہیں، دین ومذہب، عمل وکردار، دولت وغربت، پیشہ وکاروبار، علم وجہالت، رہن سہن حتی کہ شہر ودیہات کا بھی فرق واثر ہوتا ہے اور فقہاء کی صراحت کے باوجود کہ شہر ودیہات کے فرق کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اس کا قائل ہونا مشکل ہے کہ شہر ودیہات کی بود وباش کے فرق کی وجہ سے مزاجوں میں فرق نہیں ہوتا۔ ایک مشہور حدیث ہے: "من سكن البادية جفا"۔

☆☆☆

# جبری شادی

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

والد اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں دادا کی ولایت سے نابالغ لڑکی اور لڑکے کا نکاح منعقد اور لازم ہو جاتا ہے کہ بالغ ہونے کے بعد اختیار بھی نہیں رہتا، خواہ اس نے یہ نکاح غیر کفو میں یا مہر مثل سے کم پر ہی کر دیا ہو (اگر وہ ماجن نہیں ہے)۔

اگر لڑکا یا لڑکی بالغ ہوں اور نکاح کے وقت اجازت دے دی ہو اگرچہ جبراً ہی دی ہو تو نکاح منعقد اور لازم ہو جاتا ہے کہ بعد میں اختیار نہیں رہتا، خواہ وہ دونوں انگلستان کے رہنے والے ہوں یا ان میں سے ایک وہاں رہتا ہو دوسرا وہیں یا کہیں بھی رہتا ہو۔

والد اور دادا کی شفقت کا مطلب اور تقاضا یہی ہے، اسی لئے شریعت نے اسے یہ امتیاز دیا ہے کہ وہ اپنی اولاد کے لئے مستقبل کے اعتبار سے جو بہتر ہو وہ اقدام کرے، چاہے لڑکوں، لڑکیوں کو اپنی ناتجربہ کاری، یا جذباتیت، جنسی انارکی اور بے راہ روی کی وجہ سے یہ رشتہ پسند نہ آئے۔

جن لوگوں کی یورپ اور امریکہ کے حالات پر نظر ہے وہاں کی جنسی آزادی اور آزادانہ اختلاط کے مشاہدات ہیں ان کے لئے یہ سمجھنا کہ والدین اپنی اولاد بالخصوص لڑکیوں کے لئے یورپ و امریکہ میں رشتہ کرنے کے بجائے ایشیاء مثلاً ہندو پاک وغیرہ میں رشتہ کرنا کیوں پسند کرتے اور ترجیح دیتے ہیں، اس پسند میں یقیناً اولاد بالخصوص لڑکیوں کی خیر خواہی، ان کے دین و اخلاق کی حفاظت ہی مقصود ہوتی ہے، حالانکہ انگلستان وغیرہ (یورپ و امریکہ) میں پلنے والے لڑکے لڑکیاں دین و اخلاق سے بے بہرہ بلکہ بے زار ہونے کی وجہ سے ان رشتوں کو پسند نہ کریں تو تعجب کی بات نہیں، مگر ان کی پسند کا اعتبار کرنا خود ان ہی کے اخلاق و دین کو تباہ کرنے کے مرادف ہوگا، ایسی صورت میں والد کو مورد الزام قرار دینا اور بے راہ رو لڑکوں، لڑکیوں کی طرف داری کرنا شریعت ہی کے نہیں پدرانہ شفقت کے بھی خلاف ہے، یہ ایسا ہی ہوگا کہ جیسے کوئی ناسمجھ بچہ بیماری یا لاغری کی حالت میں مٹھائی کھائے یا کسی اور مضر صحت یا مہلک چیز کے استعمال کی ضد کرنے لگے اور والدین یا طبیب شفقت یا ہمدردی کی بنیاد پر اس سے روکتے ہوں تو کیا کوئی ذی ہوش والدین کی مخالفت اور ضدی ناسمجھ بچے کی حمایت کرے گا! یورپ وغیرہ میں پلی لڑکیوں کا ہندوستانی لڑکوں کا کفو نہ ہونا مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے کہ محض اس فرق کی بنیاد پر اگر کفاءت بدل جائے تو پھر دیہاتی و شہری کے فرق کی وجہ سے بھی بدل جانی چاہئے، اس لئے یہ محض بہانہ لگتا ہے، عذر شرعی نہیں معلوم ہوتا۔

اور اگر بالفرض اسے کفاءت کا فرق تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی بالغ لڑکی کی اجازت سے اور والد کی رضامندی سے ہونے والا نکاح منعقد اور لازم ہو جاتا ہے، یعنی محض اس بنیاد پر فسخ کا حق نہیں ہوتا۔

کیونکہ نکاح ان عقود میں سے ہے کہ جواز روئے حدیث نبوی شریف 'جد' اور 'ہزل' دونوں صورتوں میں منعقد اور لازم ہوتا ہے۔ حدیث صحیح کی مشہور کتابوں ابوداؤد اور ترمذی میں ہے: "ثلاث جدھن جد وھزلھن جد: النکاح والطلاق والرجعة"۔

اسی بنیاد پر فقہاء معتبرین کے نزدیک جبری طور پر کیا ہوا نکاح (اگر اجازت جبراً دی ہو) بھی منعقد ہو جاتا ہے، مثلاً ہندوستان کے بلکہ ایشیاء کے سب سے بڑے مرکز دار الافتاء دار العلوم دیوبند کے مفتی اعظم مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی کا یہ فتوی ہے: "زبردستی کی اجازت سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے"[1]، علاوہ ازیں فقہ و فتاوی کی اہم مرجع کتاب رد المحتار میں بھی یہی حکم مذکور ہے[2]۔

اس لئے کسی شرعی کونسل یا قاضی کو شرعاً حق نہیں کہ محض اس بنیاد پر کسی جوڑے کا نکاح فسخ کردے کہ لڑکی یا لڑکے نے نکاح کی اجازت جبراً دی تھی۔

[1] مجموعہ فتاوی دار العلوم دیوبند، ناشر مکتبہ امدادیہ دیوبند ۲، ۳ / ۸۴، ۸۶، ۱۰۰۔

[2] ۷۲/۱، مکتبہ نعمانیہ، دیوبند۔

☆☆☆

# جبری شادی کا مسئلہ

مولانا نازبیر احمد قاسمی

جامعہ اشرف العلوم، کنہواں سیتامڑھی

میری نظر میں ان ممالک کے مسلم سماج کی اس خاص پیچیدہ صورت کا صحیح شرعی حل تو یہی ہے کہ ایسے گارجینوں پر قانون سازی کر کے تعزیری سزائیں جاری کی جائیں، تاکہ کم از کم آئندہ ایسی صورت حال پیش ہی نہ آسکے جو احکام شریعت کی شبیہ بگاڑنے بلکہ مسخ کرنے تک مفضی ہو جاتی ہے اور مذہب اسلام کی جگ ہنسائی ہوتی ہے۔

١۔ اِکراہ علی النکاح ہو یا اِکراہ علی التوکیل بالنکاح ہر دو اِکراہ فقہ حنفی کے اعتبار سے غیر مؤثر ہیں اور دونوں صورتوں میں نکاح منعقد اور صحیح ہو جاتا ہے، ''الإكراه على التوكيل بالنكاح يصح وينعقد''[1]۔ ''وحقيقة الرضاء غير مشروطة في النكاح لصحته مع الإكراه''[2]۔

٢۔ جب نکاح کا انعقاد و صحت حقیقت رضا کے ساتھ مشروط ہی نہیں ہے تو صورت رضاء کے پائے جانے کے بعد خواہ یہ صورت رضاء بشکل زبانی اقرار بلفظ ''ہاں'' ہو، یا بشکل دستخط و تحریر بہر حال اذن نکاح یعنی توکیل بالنکاح محقق و موجود ہو جائے گا۔

٣۔ برطانیہ وغیرہ مغربی ممالک میں رہنے والی لڑکی معاشرتی سطح پر، خواہ کتنی ہی اونچی ہو مگر چونکہ اس نے اس نچلی سطح کے معاشرہ کے ایک فرد کے ساتھ اذن نکاح دے کر توکیل بالنکاح کا معاملہ کر لیا ہے تو اسے معاشرتی عدم کفاءت کی بنیاد پر دعوی تفریق کا حق ہرگز نہیں ملے گا۔

ہاں اس سلسلہ میں ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کا مسلک چونکہ اِکراہ علی النکاح یا اِکراہ علی التوکیل بالنکاح کے مؤثر ہو جانے کا ہے اور نتیجتاً ان حضرات کے مسلک کے مطابق بصورت اِکراہ نہ نکاح منعقد ہوتا ہے اور نہ نکاح کی توکیل صحیح ہو پاتی ہے تو پھر جو حضرات شافعی، مالکی، یا حنبلی المسلک ہیں ان کے لئے مسئلہ آسان ہے لیکن حنفی المسلک فریقین کے لئے مسئلہ بہر حال دشوار و پیچیدہ ہی کہا جائے گا۔

اب اگر نفس مسئلہ کے مجتہد فیہ ہونے کی بنیاد پر حنفی قاضی، یا شرعی کونسل کے حنفی ممبران باتفاق رائے عدم انعقاد نکاح کا فیصلہ کر دیں تو شاید گنجائش ہو سکتی ہے، کیونکہ فقہ حنفی کا بھی یہ معروف اصول ہے۔

٤۔ اگر نکاح یا توکیل بالنکاح اِکراہ کے ساتھ ہو تو اس کے بعد زن وشوئی تعلقات کے قائم ہو جانے اور نہ ہونے کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ مہر کے متعلق احکام یقیناً مختلف اور الگ الگ ہوں گے، جو مندرجہ ذیل ہیں:

الف۔ جبری نکاح میں ایک ہے نفس نکاح پر رضاء اور عدم رضاء کا مسئلہ، دوسرا ہے تسمیہ مہر عند النکاح اور اس کی مقدار پر راضی ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ۔ اور چونکہ بلا حقیقت رضا اِکراہ سے نکاح منعقد ہونا طے شدہ ہے، اس لئے انعقاد نکاح تو بہر صورت ہو ہی جائے گا، مگر دین مہر چونکہ عوض بضع ہوتا ہے اس طرح یہ حقوق مالیہ اور عقد معاوضہ مالی کے قبیل سے سمجھا جاتا ہے، اس لئے فریقین کا مقدار مسمی پر حقیقتاً اور واقعی راضی ہونا ضروری ہے اور اِکراہ سے حقیقی رضا فوت ہو جایا کرتی ہے، اس لئے تسمیہ گویا کالعدم ہی رہتا ہے۔

ب۔ فقہ کا معروف مسئلہ ہے کہ ملک بضع بوقت دخول فی الملک متقوم ہوتا ہے اور اس کا شرعی اور حقیقی عوض مہر مثل ہی ہوا کرتا ہے اِلا یہ کہ فریقین مہر مثل

---

[1] (١) شامی ٥ / ٨٢۔

[2] شامی ٢ / ٢٧١

سے کسی کم یا زیادہ مقدار مہر پر اپنی حقیقی رضامندی ظاہر کردیں جو یقیناً اِکراہ علی النکاح کی صورت میں نہیں پائی جاتی۔

ج۔ اب اگر مرد پر اِکراہ علی النکاح ہوا ہوگا تو ظاہر ہے وہ نفس نکاح کے ساتھ اس میں جو تسمیہ مہر ہو رہا ہے اس پر بھی راضی نہ ہوگا، گرچہ عدم رضاء کے باوجود انعقاد نکاح ہوجائے گا مگر قدر مہر مثل سے زائد دین مہر تو لازم نہ ہوگا۔

د۔ اس کے بعد اگر یہ ہو کہ قبل وطی ہی عورت اپنے دین مہر کا مطالبہ کرنے لگے تو مرد پر لازم ہوگا کہ وہ یا تو بقدر مہر مثل اسے دے کر اپنی ملکیت بضع کو باقی رکھے یا اسے جدا کردے۔ اگر مرد نے دوسری صورت اختیار کی اور طلاق دے کر جدا کردیا تو کچھ لینا دینا نہیں ہوگا، معاملہ صاف ہو چکا، الا یہ کہ عورت قدر مسمی اقل من مہر المثل پر بخوشی تیار ہو۔

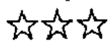
ھ۔ لیکن اگر نکاح پر مرد کو نہیں عورت ہی کو مجبور کیا گیا ہوگا تو اس عورت کے حق میں بھی تسمیہ اور قدر مہر پر اس کی رضا اِکراہ کے سبب فوت ہوجانے کی بنیاد پر تسمیہ اور قدر مسمی کالعدم کہلائے گا، اور مسمی اس کے بضع کا عوض نہیں بن سکے گا بلکہ عوض شرعی مہر مثل کو بدل بضع قرار دیا جائے گا۔

اب اگر قبل الوطی وہ اپنے مہر کا مطالبہ کرے گی تو مرد یا تو مہر مثل کے بقدر دے کر اس کو اپنی زوجیت میں رکھے اور استمتاع کا راستہ کھلا رکھے یا پھر اسے جدا کردے، اگر جدا کردے گا تو اس کے ذمہ کچھ نہیں ہوگا۔ یہاں بھی اگر خود عورت مہر مثل سے کم قدر مسمی ہی کو لینے پر راضی ہوجائے تو یہ بھی ہوسکتا ہے۔

و۔ اگر عورت کی جانب سے مطالبہ مہر بعد الوطی ہو رہا ہو تو اس کی دو صورتیں ہوں گی: اگر بوقت وطی عورت کی طرف سے تمکین علی النفس برضا ورغبت ہوئی ہوگی تو یہ گویا فریقین کی طرف سے قدر مسمی پر رضا ہوگی۔ مرد تو راضی تھا ہی کہ اس پر اِکراہ نکاح ہوا ہی نہ تھا اور عورت کی طرف سے اب برضاء ورغبت تمکین علی النفس قدر مسمی پر بھی رضاء کی دلیل کہلائے گی، اس لئے عورت اس صورت میں قدر مسمی ہی پائے گی۔

لیکن اگر عورت کی رضاء کے بغیر زبردستی اس سے وطی کی گئی ہوگی تو پھر مرد کو مہر مثل ہی دینا ہوگا۔

۵۔ اس سلسلہ میں یا تو دیگر ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے مسلک کے مطابق عدم انعقاد کا فیصلہ کیا جائے، گویا عدول کیا جائے، یا پھر مسئلہ مجتہد فیہ ہونے کی بنا پر دفع ضرر اور رفع نزاع کی نیت سے عدم انعقاد نکاح کو ترجیح دے کر نزاع کو ختم کیا جائے۔



# جبری شادی کا شرعی حکم

مفتی نسیم احمد قاسمیؒ

امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ

نکاح ایک مقدس رشتہ اور عبادت ہے، جس کے ذریعہ مرد وعورت کے مابین محبت والفت اور سکینت وطمانیت کے جذبات فروغ پاتے ہیں۔ دونوں جائز اور حلال طریقہ سے اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کر کے نسل انسانی کی افزائش اور بقا کا ذریعہ بنتے ہیں اور دونوں کے ملاپ اور اختلاط سے پاکیزہ معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ بیوی اپنے شوہر کے لئے سکون واطمینان کا ذریعہ، اس کے غم اور رنج میں شریک اور اس کی رفیقۂ سفر ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے: ''ومن آیته أن خلق لكم من أنفسكم أزواجا لتسكنوا إليها وجعل بينكم مودة ورحمة'' (سورۂ نساء ۲۵)۔

اور نبی کریم ﷺ نے نیک بیوی کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے: الدنيا كلها متاع وخير متاع الدنيا المرأة الصالحة'' (رواه مسلم، مشکاۃ ۲۶۷)۔ (پوری دنیا فائدہ اٹھانے کی چیز ہے اور دنیا کی سب سے بہتر چیز جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے وہ نیک بیوی ہے)۔

اور نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: مومن اللہ کے تقوی کے بعد نیک بیوی سے زیادہ کسی چیز سے فائدہ نہیں اٹھاتا ہے، اگر وہ اسے حکم دیتا ہے تو وہ اس کی اطاعت کرتی ہے۔ اگر وہ اس کی طرف دیکھتا ہے تو اسے خوش کر دیتی ہے اور اگر اس پر قسم کھاتا ہے تو سچ کر دکھاتی ہے، اور اگر وہ اس سے غائب رہتا ہے تو وہ اپنے نفس اور اس کے مال کے بارے میں خیر خواہی کرتی ہے (مشکاۃ ۲۶۸)۔

نکاح کے ذریعہ انسان اپنے نصف دین کی تکمیل کر لیتا ہے اور اپنے نفس کو حرام میں مبتلا ہونے سے بچا لیتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

''إذا تزوج العبد فقد استكمل نصف الدين فليتق الله في النصف الباقي'' (مشکاۃ ۲۶۸)۔ (جب انسان نکاح کر لیتا ہے تو نصف دین کی تکمیل کر لیتا ہے تو اسے باقی نصف کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے)۔

اسلام نے نکاح کے سلسلہ میں نہ تو بالغ لڑکیوں کو آزاد رکھا ہے کہ وہ جہاں چاہیں اولیاء کی مرضی اور رضامندی کے بغیر نکاح کر لیں اور نہ تو اولیاء کو اس کی اجازت دی ہے کہ وہ بالغ لڑکیوں کی اجازت ورضامندی کے بغیر جہاں چاہیں ان کا نکاح کر دیں، بلکہ نکاح کی مصلحت اس میں ہے کہ یہ رشتہ دونوں کے باہمی اعتماد اور ان کی رضامندی سے انجام پائے۔ عموماً لڑکیاں ناتجربہ کار ہوتی ہیں اور جذبات میں آکر غلط لڑکوں سے رشتہ کر لیتی ہیں اور اپنی نادانی اور ناعقلی کی وجہ سے غلط ماحول میں جانے پر آمادہ ہو جاتی ہیں، اس لئے اولیاء سے کہا گیا ہے کہ ان کی اجازت اور مرضی سے مناسب جگہ رشتہ طے کریں، تاکہ رشتہ میں پائیداری ہو، اور اس کے مفید اور بہتر نتائج ظاہر ہوں۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے نکاح کے معاملہ میں ولی کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''أيما امرأة نكحت نفسها بغير إذن وليها فنكاحها باطل، فنكاحها باطل فنكاحها باطل فإن دخل بها فلها المهر بما استحل من فرجها، فإن اشتجروا فالسلطان ولي من لا ولي له'' (مشکاۃ ۲۷۰)۔ (جس عورت نے اپنا نکاح اپنے ولی کی اجازت کے بغیر کر لیا تو اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، پھر اگر اس نے اس کے ساتھ دخول کر لیا تو اس کے لئے مہر ہوگا، اس بنا پر کہ اس نے اس کی شرمگاہ کو حلال کیا ہے، پھر اگر اولیاء کا اختلاف ہو تو سلطان اس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہیں ہے)۔

اس حدیث میں بطلان سے مراد حقیقی بطلان نہیں ہے، بلکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں ولی کو اعتراض کا حق ہوگا۔

اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالغہ لڑکی کی اجازت کو نکاح میں ضروری قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''لا تنكح الأيم حتى تستأمر ولاتنكح البكر حتى تستأذن قالوا: يا رسول الله وكيف إذنها؟ قال: أن تسكت'' (حوالہ سابق) (ثیبہ بالغہ کا نکاح اس کے مشورہ کے بغیر نہیں کیا جائے گا اور باکرہ کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہیں کیا جائے گا، صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس کی اجازت کیسے ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کہ وہ خاموش رہ جائے)۔

اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے: ''الأيم احق بنفسها من وليها والبكر تستأذن في نفسها وإذنها صماتها'' (حوالہ سابق) (بالغہ ثیبہ اپنے نفس کی اپنے ولی سے زیادہ حق دار ہے، اور باکرہ سے اس کے نکاح کے بارے میں اجازت لی جائے گی اور اس کی اجازت اس کا خاموش رہنا ہے)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالغہ لڑکی کے نکاح کو جو اس کی اجازت کے بغیر کیا گیا، مسترد فرمادیا، چنانچہ بخاری کی روایت ہے: خنسا بنت خذام کا نکاح ان کے والد نے ان کی رضامندی کے بغیر کردیا حالانکہ وہ ثیبہ تھیں، انہوں نے اس کو ناپسند کیا اور پھر اس معاملہ کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نکاح کو مسترد فرمادیا (مشکاۃ ۲۷۰)۔

اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے: ''أن جارية بكرا أتت رسول الله ﷺ فذكرت أن أباها زوّجها وهي كارهة فخيّرها النبي ﷺ (رواه ابوداؤد) ومرجع سابق'' (ایک باکرہ خاتون نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور ذکر کیا کہ اس کے باپ نے اس کا نکاح کردیا حالانکہ یہ اسے ناپسند کررہی تھی، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اختیار دیا)۔

عورتوں کو اولیاء کی اجازت اور ان کی رضامندی کے بغیر نکاح کرنے سے منع کیا گیا ہے، ارشاد نبوی ہے: (عورت، عورت کا نکاح نہ کرے، اور نہ عورت اپنا نکاح خود کرے، اس لئے کہ وہ زانیہ ہے جو اپنا نکاح اپنے طور پر کرلیتی ہے) (مشکاۃ ۲۷۰)

یہ واضح رہے کہ شریعت اسلامی نے اولیاء کو لڑکیوں کے معاملات میں تصرف کا جو اختیار دیا ہے اس کی بنیاد ان کے ساتھ محبت وشفقت اور ان کے مفادات کی رعایت وحفاظت ہے، لہذا ولایت کی بنا پر انہیں ایسے ہی تصرفات کا اختیار ہوگا جن میں لڑکیوں کے مفادات کا تحفظ ہو۔

## ۱۔ عاقلہ بالغہ لڑکی کو ڈرا دھمکا کر یا نفسیاتی دباؤ میں لاکر نکاح کے لئے تیار کرنا:

یہ صورت اکراہ اور جبر کی ہے۔ حالت اکراہ کی طلاق اور نکاح کے وقوع اور عدم وقوع کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ ائمہ اربعہ میں سے امام ابوحنیفہؒ وقوع کے قائل ہیں۔ امام شعبی، نخعی اور ثوری کا بھی یہی قول ہے۔ یہ حضرات اس معاملہ میں اکراہ کو مؤثر نہیں مانتے ہیں جبکہ ائمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل عدم وقوع کے قائل ہیں اور اکراہ کو نکاح وطلاق کے معاملہ میں مؤثر ومعتبر قرار دیتے ہیں۔ ائمہ ثلاثہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی: "لا طلاق في إغلاق" (مشکاۃ ۲۷۰۔) سے استدلال کیا ہے، یعنی اکراہ کی طلاق معتبر نہیں ہے۔

حنفیہ نے ارشاد نبوی: ''ثلاث جد هن جد وهزلهن جد: الطلاق والنكاح والرجعة'' (مشکاۃ ۲۷۰۔) سے استدلال کیا ہے، یعنی تین چیزیں ایسی ہیں جن میں سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے، اور ہنسی مذاق بھی سنجیدگی ہے۔ ہنسی مذاق کی صورت میں شریعت نے نکاح اور طلاق کو معتبر مانا جبکہ ایسی حالت میں عاقل بالغ انسان صریح الفاظ کا استعمال کرتا ہے، صرف اس کے حکم پر رضامند نہیں ہوتا ہے تو شریعت نے اس کا اعتبار کیا اور اس کو نافذ ومعتبر قرار دیا۔ اکراہ کی حالت میں مکرہ اپنے اختیار وارادہ سے نکاح وطلاق کے الفاظ کا تلفظ کرتا ہے جو سبب میں کامل ہے، مگر یہ کہ وہ اس کے حکم پر راضی نہیں ہے، اس لئے اکراہ کو غیر مؤثر مانا جائے گا اور اس کی طلاق ونکاح کو درست قرار دیا جائے گا (مرقاۃ المفاتیح)۔

علامہ کاسانی نے ''بدائع الصنائع'' میں حالت اکراہ کی طلاق اور نکاح کے وقوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تصرفات شرعیہ کی دو قسمیں ہیں، انشاء اور اقرار، پھر انشاء کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم ہے جو فسخ کا احتمال نہیں رکھتی ہے، اور دوسری قسم وہ ہے جو فسخ کا احتمال

رکھتی ہے، وہ چیزیں جو فسخ کا احتمال نہیں رکھتی ہیں، یہ ہیں: طلاق، عتاق، رجعت، نکاح، یمین، نذر، ظہار، ایلاء، فئ فی الایلاء، تبرع اور قصاص میں معافی، یہ تصرفات ہمارے نزدیک اکراہ کے ساتھ جائز ہیں"[1]۔

**۲۔ نکاح میں اکراہ موثر نہیں ہے:**...... یہ بھی اکراہ کی صورت ہے۔ لڑکی اپنی حقیقی رضا کے بغیر بھی اگر وہ کسی دباؤ اور جبر و اکراہ کی وجہ سے "ہاں" کہہ دیتی ہے اور زبان سے نکاح کا اقرار کر لیتی ہے تو اس کا قول اور تصرف معتبر قرار پائے گا، اور نکاح صحیح و درست ہو جائے گا۔ صحت نکاح پر اکراہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، لیکن اگر لڑکی نے زبان سے اقرار اور الفاظ نکاح کے اظہار کے بجائے کسی تحریر پر صرف اپنا دستخط کر دیا، مثلاً یہ کہ میں نے قبول کر لیا، یا مجھے منظور ہے تو یہ معتبر نہیں ہوگا (درمختار علی ہامش الدر ۳؍۲۱)۔

**۳۔ معاشرتی فرق کا لحاظ:**...... فقہاء نے جن چیزوں میں کفاءت کا اعتبار کیا ہے، ان میں سب سے اہم اور متفق علیہ چیز دین داری اور تقوی ہے، لہٰذا اگر دیندار اور متقی لڑکی کا رشتہ اس کے گھر والے کسی فاسق و فاجر لڑکے سے کرنا چاہیں تو وہ لڑکا اس لڑکی کے حق میں کفو نہیں قرار پائے گا، اور اس صورت میں عدم کفاءت کی وجہ سے لڑکی کو حق تفریق حاصل ہوگا، مگر سوال سے یہ واضح نہیں ہو رہا ہے کہ برطانیہ اور ہندوستان کے ماحول سے کیا مراد ہے، اور کس چیز کو بنیاد بنا کر معاشرتی فرق کی بات کہی جا رہی ہے۔ واضح رہے کہ ماحول کی آزادی، عریانیت، بے حیائی اور اس طرح کی دیگر چیزوں میں کفاءت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اسے معاشرتی فرق کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔

**۴۔ حالت اکراہ میں کئے گئے نکاح کو فسخ کرنے کا حق قاضی شریعت کو ہے:**...... ثبوت اکراہ کے بعد قاضی شریعت یا اس کی عدم موجودگی میں شرعی کونسل کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا۔



[1] بدائع الصنائع ۶؍۱۹۴ شرح النقایۃ ۲؍۵۲۹، البحر الرائق ۸؍۱۲۷، بدائع الصنائع ۷؍۱۸۴، درر الحکام فی شرح غرر الاحکام، درمختار علی ہامش الرد ۵؍۸۶۔

# جبری شادی

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی

امارت شرعیہ، پٹنہ

۱۔ نکاح ایسا عقد ہے جو زندگی بھر کے لئے کیا جاتا ہے، اسی لئے متعہ باتفاق فقہاء حرام وناجائز ہے اور یہی وجہ ہے کہ محرم عورتوں کی فہرست پیش کرنے کے بعد بقیہ تمام عورتوں سے نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے، لیکن اس سلسلے میں مزید ہدایات دی گئیں کہ ایسے دو افراد میں یہ رشتہ کیا جائے جن میں زندگی بھر اسے قائم رکھنے کی توقع ہو۔ بعض ہدایات کی رعایت ضروری ہے، جبکہ بعض کی رعایت بہتر و مناسب ہے، مثلاً عمر، تعلیم، معاشرت وغیرہ۔

۲۔ لڑکیوں کے اولیاء کو اچھی طرح یہ بات بتائی جائے کہ یہ رشتہ جن مقاصد کے لئے کیا جاتا ہے، ان میں کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ یہ رشتہ باہمی رضامندی سے پوری طرح غور وفکر کر کے کیا جائے۔

۳۔ حنفیہ نے ناحق اکراہ کی دو قسمیں کی ہیں: ۱۔ اکراہ ملجیٔ، ۲۔ اکراہ غیر ملجیٔ۔

اکراہ ملجیٔ یہ ہے کہ جان مارنے یا کوئی عضو ضائع کرنے یا سارا مال ضائع کرنے کی دھمکی ہو۔

اکراہ غیر ملجیٔ یہ ہے کہ جان مارنے یا کسی عضو کے ضائع کرنے کی دھمکی نہ ہو، مثلاً کم مدت کی قید، یا ایسی مار کی دھمکی ہو جس سے جان جانے یا کسی عضو کے تلف ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

''تقسيم الإكراه إلى ملجئ و غير ملجئ يتفرد به الحنفية، فالإكراه الملجئ عندهم هو الذى يكون بالتهديد بإتلاف النفس أو عضو منها أو بإتلاف جميع المال أو بقتل من يهم الإنسان أمره... والإكراه غير الملجئ هو الذي يكون بما لا يفوت النفس أو بعض الأعضاء كالحبس لمدة قصيرة، والضرب الذي لا يخشى منه القتل أو تلف بعض الأعضاء'' (الموسوعة الفقهيه (بحث اکراه) ۶،۱۰۵)۔

حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء کے نزدیک اکراہ کی یہ تقسیم نہیں ہے، لیکن انہوں نے اکراہ کے تحقق اور عدم تحقق سے بحث کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اکراہ صرف وہی ہے جس کو حنفیہ اکراہ ملجیٔ کہتے ہیں۔ جس اکراہ کو حنفیہ غیر ملجیٔ کہتے ہیں، ان کے بارے میں ان کے یہاں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ سے ایک روایت ہے کہ یہ اکراہ معتبر ہے۔

دوسری روایت ہے کہ یہ اکراہ معتبر نہیں ہے:

''اما غير الحنفية فلم يقسموا الإكراه إلى ملجئ وغير ملجئ كما فعل الحنفية. ولكنهم تكلموا عما يتحقق به الإكراه ومالا يتحقق، ومما قرروه في هذا الموضوع يؤخذ أنهم جميعا يقولون بماسماه الحنفية إكراها ملجئا. أما مايسمى بالإكراه غير الملجئ فإنهم يختلفون فيه. فعلى إحدى الروايتين عن الشافعي وأحمد يعتبر إكراها. وعلى الرواية الأخرى لا يعتبر إكراها'' (الموسوعة الفقهيه ۶،۱۵۰)۔

۴۔ فقہاء نے اکراہ کے تحقق کی جو شرائط ذکر کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ قتل یا کسی عضو کے ضائع کرنے کی دھمکی ہو، یا عضو کے باقی رہتے ہوئے اس کی منفعت کے اتلاف کی دھمکی ہو یا عزت وآبرو کے برباد کرنے کی دھمکی ہو۔

''الشريطة الثالثة: أن يكون ماهدد به قتلا أو إتلاف عضو ولو بإ ذهاب قوته مع بقائه كإذهاب البصر أو

القدرة على البطش أو المشي مع بقاء أعضائها أو غيرهما مما يوجب غما يعدم الرضا. ومنه تهديد المرأة بالزنى والرجل باللواط'' (الموسوعة الفقهيه ۶،۱۰۱،۱۰۲)۔

۵۔ عاقلہ بالغہ لڑکی کو ڈرا دھمکا کر یا زدوکوب کر کے یا نفسیاتی دباؤ میں لا کر یا پاسپورٹ ضائع کردینے کی سخت دھمکی دے کر اس سے نکاح کے لئے ہاں کہلوالیا جاتا ہے۔ یہ دراصل حنفیہ کے یہاں اکراہ غیر ملجئ ہے اور شافعیہ وحنابلہ کے یہاں ایک قول کے مطابق اکراہ نہیں ہے۔

۶۔ حنفیہ کے یہاں فقہ وفتاوی کی کتابوں میں اکراہ کے اثرات پر بحث کی گئی ہے۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ وہ عقود جو قابل فسخ نہیں ہوتے، یا جن میں خیار شرط صحیح نہیں ہے، ان میں اکراہ خواہ ملجئ ہی کیوں نہ ہو، مؤثر نہیں ہے، ان ہی میں نکاح بھی ہے، اس لئے اگر اکراہ کے ساتھ نکاح کیا جائے تو نکاح حنفیہ کے یہاں صحیح ہوگا۔

''ولكنهم استثنوا من ذلك بعض التصرفات فقالوا بصحتها مع الإكراه ولو كان ملجئا. ومن هذه التصرفات: الزواج، والطلاق، ومراجعة الزوجة والنذر واليمين'' (الموسوعة الفقهيه ۶،۱۰۶)۔

فقہاء حنفیہ نے اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ شارع نے ان تصرفات میں صرف الفاظ کو ان کے معنی کے قائم مقام قرار دیا ہے، جب الفاظ پائے جائیں گے تو معنی پر ان کا اثر مرتب ہوگا، خواہ بولنے والا اس معنی کا ارادہ کرے یا نہ کرے، اس پر مرتب ہونے والے اثرات سے راضی ہو یا نہ ہو؟

''وعللوا هذا بأن الشارع اعتبر اللفظ في هذه التصرفات- عند القصد إليه- قائما مقام إرادة معناه. فإذا وجد اللفظ ترتب عليه أثره الشرعي، وإن لم يكن لقائله قصد إلى معناه كما في الهازل. فإن الشارع اعتبر هذه التصرفات صحيحة إذا صدرت منه مع انعدام قصده إليها، وعدم رضاه بما يترتب عليها من الآثار'' (الموسوعة الفقهيه ۶،۱۰۶)۔

۷۔ حنابلہ کے یہاں بھی اکراہ کے ساتھ اگر نکاح کیا جائے تو صحیح ہوگا:

''يختلف أثر الإكراه عند الحنابلة باختلاف المكره عليه. فالتصرفات القولية تقع باطلة مع الإكراه إلا النكاح. فإنه يكون صحيحا مع الإكراه قياسا للمكره على الهازل'' (الموسوعة الفقهيه ۶،۱۱۰). وإذا عقد النكاح هازلا أو تلجئة صح. لأن النبي ﷺ قال: ثلاث هزلهن جد، وجد هن جد: الطلاق والنكاح والرجعة- رواه الترمذي- وعن الحسن قال: قال رسول الله ﷺ: من نكح لاعبا أو طلق لاعبا أو أعتق لاعبا جاز؛ وقال عمر: أربع جائزات إذا تكلم بهن: الطلاق والنكاح والعتاق والنذر- وقال علي: أربع لا لعب فيهن: الطلاق والعتاق والنكاح والنذر'' (المغني ۶،۳۲۵)۔

۸۔ امام شافعیؒ کے یہاں تو باکرہ بالغہ لڑکی پر ولی کو ولایت اجبار حاصل ہے، یعنی اس کا نکاح کرنے کے لئے ولی کو اس سے اجازت لینے کی ضرورت ہی نہیں ہے، ایسی صورت میں ان کے یہاں نکاح کے باب میں ولی کی طرف سے اکراہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

''ولا يجوز للولي إجبار البكر البالغة على النكاح خلافا للشافعي. له الاعتبار بالصغيرة. وهذا لأنها جاهلة بأمر النكاح لعدم التجربة. ولهذا يقبض الأب صداقها بغير أمرها (هدايه ۲،۲۹۴)۔

ولا يجوز للأب والجد تزويج البكر من غير رضاها صغيرة كانت أو كبيرة لماروي عن ابن عباس أن النبي ﷺ. قال: الثيب أحق بنفسها من وليها- والبكر يستأمرها أبوها في نفسها- فدل على أن الولي أحق بالبكر وإن كانت بالغة فالمستحب أن يستأذنها للخبر'' (المجموع ۱۶،۱۶۵)۔

۹۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ برطانیہ اور دوسرے ممالک میں بسنے والے مسلمان وہاں کے معاشرہ میں پھیلی بے راہ روی، عریانیت، بے پردگی، اور فحاشی سے بچنے کے لئے تو نہیں اپنی بچیوں کی شادی ہندوستان و پاکستان کے دین دار گھرانوں میں کرنا چاہتے ہیں؟ اور لڑکیاں جو اس بے راہ روی کی عادی ہو چکی ہوتی ہیں وہ کسی بھی طرح یہ گوارا نہیں کرتیں کہ اس گندے ماحول سے الگ کر کے اس ماحول میں ان کو لایا جائے جو ان کی نفسانیت کے بالکل خلاف ہے، اگرچہ ان کی ان خرابیوں کے ذمہ داران کے والدین اور اولیاء بھی ہیں، لیکن وہ اپنی غلطی پر نادم ہو کر اپنی بچیوں کو اس گندے ماحول سے نکالنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے وہ جبر و

اکراہ کا سہارا لیتے ہیں، تو اس کو اکراہ غیر مشروع کہنا میرے خیال میں صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ اس اکراہ میں نہ تو کوئی ظلم ہے اور نہ کوئی گناہ ہے:

''الإكراه بحق- هو الإكراه المشروع أي الذي لا ظلم فيه ولا إثم- وهو ما توافر فيه أمران: الأول: أن يحق للمكره التهديد بما هدد به- والثاني: أن يكون المكره عليه مما يحق للمكره الإلزام به، وعلى هذا فإكراه المرتد على الإسلام إكراه بحق حيث توافر فيه الأمران- وكذلك إكراه المدين القادر على وفاء الدين وإكراه المولي على الرجوع إلى زوجته أو طلاقها إذا مضت مدة الإيلاء'' (الموسوعة الفقهيه ۶،۱۰۴)-

۱۰- برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں رہنے والی لڑکیوں اور ہندوستان و پاکستان میں بسنے والے لڑکوں کے درمیان جو معاشرتی فرق ہے، اگر اس سے مراد وہاں کی عریانیت و بے پردگی وغیرہ ہے تو ظاہر ہے ان حالات میں یہ کہنا کہ لڑکا لڑکی کا کفو نہیں ہے، اس لئے بر بنائے عدم کفاءت فسخ نکاح کا حق ہے، صحیح نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عدم کفاءت کی بنا پر اعتراض کا حق اولیاء کو ہوتا ہے لڑکی کو نہیں، اس لئے اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۱- البتہ اگر نکاح کے بعد قاضی کے سامنے یہ بات ثابت ہوجائے کہ یہ نکاح غیر شرعی اور ناحق اکراہ کے ذریعہ کیا گیا ہے تو وہ اس نکاح کو فسخ کرسکتا ہے، اس لئے کہ ناحق اکراہ حرام ہے، گناہ کبیرہ اور دین کے معاملہ میں لا پرواہی ہے، اس لئے ظلم ہے اور رفع ظلم و جور قاضی کا فریضہ ہے۔

''الإكراه بغير حق ليس محرما فحسب بل هو أحد الكبائر، لأنه أيضا ينبئ بقلة الاكتراث بالدين. ولأنه من الظلم وقد جاء في الحديث القدسي: يا عبادي إني حرمت الظلم على نفسي وجعلته بينكم محرما فلا تظالموا'' (الموسوعة الفقهيه ۶،۱۰۱)-



# جبری شادی

مفتی انور علی اعظمی
دار العلوم مئو

۱، ۲۔ جن فقہاء کے نزدیک اکراہ مؤثر ہے ان کے یہاں نکاح منعقد نہیں ہوگا۔ حنفیہ کے نزدیک حالت اکراہ انعقاد نکاح میں مؤثر نہیں ہے۔ فقہاء حنفیہ اکراہ کو ہزل کے ساتھ جوڑ کر اس حال کے تصرفات میں نکاح، طلاق اور عتاق کو نافذ کرتے ہیں، اس لئے ائمہ ثلاثہ کے برخلاف حنفیہ کے نزدیک نکاح منعقد ہوگا، البتہ امام ابوحنیفہؒ کے مشہور شاگرد اس مسئلہ میں الگ رائے رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک حالت اکراہ کا نکاح موقوف رہے گا، اکراہ کے زائل ہونے کے بعد اگر مکرہ اجازت دے تو نافذ ہوگا اور اگر باطل کردے تو باطل ہوجائے گا (بدائع ۷/۱۸۸، ہدایہ رد المحتار بحوالہ حاشیہ المدخل ۱/۱۰۴)۔

۳۔ دونوں کا معاشرتی فرق عدم کفاءت کے لئے کافی نہیں ہے، جب تک کہ کوئی دوسرا معتبر سبب موجود نہ ہو۔

۴۔ اگر زن وشوئی کے تعلقات قائم ہونے سے پہلے ہی زوجین میں تفریق ہوگئی تو شوہر پر کچھ لازم نہیں ہوگا، مثلاً شوہر کفو نہیں تھا، لڑکی نے عدم کفاءت کا دعوی کیا اور قاضی نے تفریق کردی یا نکاح مہر مثل سے کم پر ہوا تھا، شوہر سے مہر مثل پورا کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور اس نے انکار کردیا، دوسری طرف بیوی مہر میں کمی پر راضی نہیں ہے، پس قاضی تفریق کردے تو اس طرح کی صورت میں شوہر پر کچھ لازم نہیں ہے، کیونکہ فرقت عورت کی جانب سے آتی ہے (بدائع الصنائع ۶/۱۹۸)۔ اور اگر زن وشوئی کے تعلقات قائم ہوچکے تھے تو پھر اس کی دو صورتیں ہیں یا دخول زبردستی شوہر کی طرف سے وجود میں آئے، عورت اس کے لئے بالکل رضامند نہ ہو یا اس کی رضامندی کے ساتھ یہ عمل ہو۔ زبردستی دخول کی صورت میں عورت کو عدم کفاءت اور مہر کے مہر مثل سے کم ہونے دونوں بنیادوں پر خیار تفریق حاصل ہے (بدائع الصنائع ۶/۱۹۹)۔

۵۔ اس صورت میں قاضی یا شرعی کونسل کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا۔

اس کی واضح دلیل سنت نبوی میں موجود ہے۔ خنساء بنت خذام کا نکاح ان کے باپ نے کردیا، وہ بالغہ تھیں اور اس نکاح پر راضی نہیں تھیں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح رد کردیا (بخاری بروایت خنساء بنت خذام، نیز عبد الرزاق بروایت ابن عمر نصب الرایہ بحوالہ الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/۴۰۴)۔

امام نسائی اور امام احمد نے حضرت عائشہ کی سند سے ایک دوسرا واقعہ بھی ذکر کیا ہے کہ ایک جوان عورت کا نکاح اس کے باپ نے اپنے بھتیجے سے زبردستی کردیا تھا، وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ عورت کے حوالہ کردیا (الفقہ الاسلامی ۵/۴۰۴)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہمارے لئے سب سے بڑی دلیل ہے۔ زبردستی کی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر لڑکی کو اختیار دیا اور ایک موقع پر نکاح فسخ کردیا، ان دونوں صورتوں سے لڑکی کی مشکل کو دور کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

# جبری شادی کا شرعی حکم

مولانا اختر امام عادل

جامعہ ربانی منوروا شریف، سمستی پور

نکاح ایک ایسا رشتہ ہے جو دو شخصوں کو تاعمر کے لئے ایک بندھن میں باندھ دیتا ہے اور دونوں کو تاحیات اس رشتہ کو نبھانا ہوتا ہے، اسی لئے اس کی بنیاد عاقدین کی رضامندی اور خود مختاری پر رکھی گئی ہے اور اس معاملہ میں زور وزبردستی کرنے سے روکا گیا ہے۔ احادیث میں صاف ہدایت دی گئی ہے:

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لا تنكح الثيب حتى تستأمر ولا تنكح البكر حتى تستأذن وإذنها الصموت''[1] (ثیبہ کا نکاح اس کے مشورہ کے بغیر اور باکرہ کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے اور باکرہ کی خاموشی اجازت ہے)۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''الأيم أحق بنفسها من وليها والبكر تستأذن وإذنها صماتها''[2] (ثیبہ اپنے معاملہ میں اپنے ولی سے زیادہ حق رکھتی ہے، اور باکرہ سے اس کے معاملے میں اجازت لی جائے اور اس کی خاموشی اس کی اجازت ہے)۔

حضرت ابوہریرہؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل فرماتے ہیں: ''اليتيمة تستأمر في نفسها فإن صمتت فهو إذنها وإن أبت فلا جواز عليها''[3] (باکرہ لڑکی سے اس کے معاملے میں پوچھا جائے گا، اگر وہ خاموش رہے تو اجازت مانی جائے گی اور اگر انکار کرے تو کوئی گنجائش نہیں)۔

عہد نبوی میں ان والدین کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی جنہوں نے اپنی لڑکیوں کی شادی ان کی مرضی کے خلاف کردی۔

یہ رضامندی کا رشتہ ہے، زندگی بھر کا سودا ہے، زندگی ایک ساتھ لڑکے لڑکی کو گذارنا ہے، والدین کا کیا ہے اور نہ وہ بہت دنوں تک دنیا میں باقی رہیں گے، لیکن ان کے بچوں کی زندگی اجیرن بن کر رہ جائے گی، یا یہ مقدس رشتہ ٹوٹ کر بکھر جائے گا، اس لئے اس معاملہ میں ہرگز کسی جبر واکراہ سے کام نہیں لینا چاہئے۔

## ایجاب وقبول اظہار رضامندی کے ذریعہ:

لیکن اس کے باوجود نکاح ایک معاملہ ہے اور اسی لئے دیگر معاملات کی طرح اس کو بھی بیٹھ کر باقاعدہ طے کرنا پڑتا ہے، اور زبانی طور پر ایجاب وقبول ہوتا ہے، اس لئے اس معاملہ کی بنیاد باطن امر پر نہیں بلکہ دلیل ظاہر پر رکھی گئی ہے۔ اندر کی پسند وناپسند کو جاننے کے لئے ہی ایجاب وقبول شروع کیا گیا ہے، ورنہ اس کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے ایجاب وقبول دراصل اندر کی پسند کا رسمی اظہار ہے، حقیقت میں پسند ہے یا نہیں دیگر بہت سے ابواب کی طرح نکاح میں بھی اس پر مدار نہیں رکھا گیا۔ ہر انسان اپنے اظہار اور الفاظ کا پابند ہے، اگر اس کو پسند نہیں تو پسند کا اظہار کیوں؟ کہا جاسکتا ہے کہ جبر واکراہ یا بعض ناگزیر حالات کی بنا پر پسند کا اظہار کرنا پڑتا ہے، مگر یہ بھی دراصل اضافی طور پر پسندیدگی ہی کا ثبوت ہے، کہ اس نے ناگزیر حالات کے مقابلے میں زیادہ آسان اس رشتہ کو سمجھا، بہرحال نفس رضامندی کا انکار ممکن نہیں، کمی وبیشی ممکن ہے، مگر حالت اکراہ میں بھی کسی نہ کسی درجہ میں پسند موجود ہوتی ہے۔ ہمیشہ آدمی بڑی مصیبت کے مقابلے چھوٹی مصیبت کو پسند کرتا ہے، جب کہ فی نفسہ مصیبت کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ یہی حال جبر واکراہ کے نکاح کا بھی ہے۔ ممکن ہے فریقین میں سے کسی فریق کو یہ رشتہ فی نفسہ پسند نہ ہو، مگر سامنے جو خطرات منڈلا رہے ہیں ان سے بچنے کے لئے اس ناپسندیدہ رشتہ کو پسند کرنا پڑتا ہے، غرض پسندیدگی اور رضامندی بہرصورت موجود ہے، خواہ کسی درجہ کی ہو۔

[1] ترمذی شریف ۱/ ۲۱۰ کتاب النکاح۔

[2] ترمذی شریف ۱/ ۲۱۰۔

[3] ترمذی شریف ۱/ ۲۱۰۔

## ایک حدیث سے رہنمائی:

اسی لئے فقہ اسلامی میں عام ضابطہ کے طور پر ایجاب وقبول کو بنیاد بنایا گیا ہے اور رضامندی وپسندیدگی کو پیمانوں سے ناپنے سے گریز کیا گیا ہے، ایک حدیث میں بھی اس کی طرف رہنمائی کی گئی ہے:

''ثلاث جدهن جد، وهزلهن جد: النكاح، والطلاق، والرجعة''[1] (تین چیزیں ایسی ہیں جن میں ارادہ بھی ارادہ ہے اور مذاق بھی ارادہ ہے: نکاح، طلاق اور رجعت)۔

جبکہ مذاق کے وقت انسان مذکورہ تینوں چیزوں میں سے کسی چیز کے معاملے میں فی الواقع سنجیدہ نہیں ہوتا، اور نہ ان چیزوں کے ارتکاب کا اس کا کوئی حقیقی ارادہ ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود محض الفاظ کی ادائیگی پر بنیاد رکھی گئی اور حکم سنجیدگی والا لگایا گیا، غور کیا جائے تو قصد وارادہ کے باب میں ہزل کا معاملہ اکراہ سے زیادہ کمزور ہے، اکراہ میں قصد تو ہوتا ہے، رضامندی نہیں ہوتی اور ہزل میں کچھ نہیں ہوتا۔

## نکاح کی بنیاد رضا پر نہیں، دلیل رضا پر ہے:

اسی طرح حدیث شریف کے اشارہ سے سمجھا جاسکتا ہے کہ نکاح کے باب میں حقیقی قصد ورضا کو کوئی دخل نہیں ہے، سارے احکام ظاہری الفاظ پر مرتب ہوتے ہیں، اسی لئے فقہاء نے اس میں رضا کا نہیں دلیل رضا کا اعتبار کیا ہے۔

علامہ شامیؒ "لیتحقق رضاهما" کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''أي ليصدر منهما ما من شأنه أن يدل على الرضا إذ حقيقة الرضا غير مشروطة في النكاح لصحته مع الإكراه والهزل''[2] (رضا پر دلالت کرنے والے الفاظ واعمال دونوں سے صادر ہوں، اس لئے کہ حقیقت رضا نکاح میں مشروط نہیں ہے، کیونکہ نکاح اکراہ اور ہزل کی صورت میں بھی درست ہوجاتا ہے)۔

علامہ کاسانی نے اس کی دو بنیادیں تحریر کی ہیں: ایک نقلی اور دوسرے عقلی۔

نقلی یہ ہے کہ ارشاد باری تعالی ہے: ''وأنكحوا الأيامى منكم''[3] (تم میں جو لوگ بے نکاح ہیں ان کا نکاح کراؤ)، اس آیت کے عموم میں بخوشی نکاح اور بالجبر نکاح دونوں داخل ہیں۔

عقلی بنیاد یہ ہے کہ یہ ایک قولی تصرف ہے، اس لئے قول پر اس کا مدار ہوگا، اکراہ اس میں مؤثر نہ ہوگا:

''ولأن النكاح تصرف قولي فلا يؤثر فيه الإكراه كالطلاق والعتاق''[4]۔

## جبری شادی کے دیگر مسائل:

فقہاء نے جبری نکاح کے ذیل میں دوسرے مسائل کو بنیاد بنا کر بحثیں کی ہیں، مگر فی نفسہ جبر کو بنیاد بنانے سے گریز کیا ہے، اور دوسرے مسائل کو بھی بنیاد بنانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ عام طور پر جبری شادی میں بنیادی طور پر دو چیزوں کا مکمل لحاظ نہیں ہو پاتا، مہر مثل اور کفاءت، یا یوں کہا جائے کہ جبر کا سبب بھی ان ہی دونوں چیزوں میں سے کسی ایک کا عدم توازن بنتا ہے اور فریقین میں سے کسی فریق کی جانب سے بالعموم انکار بھی اسی بنیاد پر ہوتا ہے کہ وہ فریق مقابل کو اپنا کفو تصور نہیں کرتا، یا مہر کی مطلوبہ مقدار میں کمی یا بیشی محسوس کرتا ہے، اسی لئے فقہاء نے جبری شادی کے ذیل میں ان دونوں امور پر بحث کی ہے اور حل کی مختلف صورتیں تجویز کی ہیں۔

علامہ کاسانیؒ نے اس پر بڑی بحث کی ہے، ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

---

[1] مشکوۃ ۲/۲۸۴۔

[2] رد المحتار علی الدر المختار ۴/۸۶ کتاب النکاح۔

[3] سورۂ نور ۳۲۔

[4] بدائع الصنائع ۶/۱۹۸ کتاب الاکراہ۔

جبری نکاح کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ جبری نکاح لڑکے کا کیا گیا ہو اور لڑکی راضی ہو، ایسی صورت میں اگر مقررہ مہر مہر مثل کے برابر یا اس سے کم ہے تو کوئی حرج نہیں، اس کو مہر مثل تو دینا ہی تھا اور اگر مہر مثل سے زیادہ ہے تب بھی نکاح درست ہے، البتہ مہر مثل کے برابر مہر واجب رہے گا اور اس سے زیادہ حصہ ساقط ہو جائے گا اور دونوں صورتوں میں جبر کرنے والے سے مہر کا بدلہ وصول نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ شوہر کا مال ضائع نہیں ہوا، بلکہ اس کا بدل مل گیا ہے۔

۲۔ اور اگر جبری نکاح لڑکی کا کیا گیا ہو اور لڑکا راضی ہو، اس صورت میں اگر مقررہ مہر مہر مثل کے برابر یا زیادہ ہے، تب تو کوئی حرج ہی نہیں اور اگر مہر مثل سے بہت کم ہو تب بھی نکاح جائز ہے، البتہ اس صورت میں دیکھنا یہ ہے کہ شوہر کفو ہے یا نہیں، اگر کفو ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ مہر مثل پورا کرو، ورنہ دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی، اگر شوہر مہر مثل پورا کر دے تو نکاح لازم ہو جائے گا، اور اگر انکار کر دے اور عورت بھی کم پر راضی نہ ہو تو تفریق کر دی جائے گی اور اگر دونوں کے مابین اب تک ازدواجی رشتہ قائم نہیں ہوا تھا تو شوہر پر کچھ واجب نہ ہوگا۔

لیکن اگر عورت صراحۃً یا دلالۃً مہر مثل پر راضی ہو جائے، زبان سے اظہار کر دے یا شوہر کو اپنے اوپر بخوشی قابو دے دے تو عورت کا حق تفریق باطل ہو جائے گا اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کے اولیاء کو بھی حق تفریق نہ رہے گا۔

اور اگر فیصلہ تفریق سے قبل شوہر عورت سے زبردستی وطی کر لے تو شوہر پر مہر مثل کی تکمیل لازم ہوگی اور نکاح لازم ہو جائے گا۔

اور اگر شوہر لڑکی کا کفو نہ ہو تو عدم کفاءت کی بنیاد پر لڑکی اور اس کے اولیاء کو حق تفریق حاصل ہوگا، اور اگر لڑکی راضی بھی ہو جائے تو اس کے اولیاء کو بہر حال حق تفریق حاصل رہے گا۔ عدم کفاءت کی صورت میں اگر شوہر نے بیوی سے جماع نہ کیا ہو اور تفریق ہو جائے تو شوہر پر کچھ بھی واجب نہیں[1]۔

## جبری نکاح علی الاطلاق درست ہے:

غرض فقہ حنفی میں جبری نکاح کی صحت کا مسئلہ کبھی زیر بحث نہیں رہا، علامہ شامیؒ کے دور میں بعض حضرات کی جانب سے قہستانی کے حوالے سے یہ خیال پیش کیا گیا تھا کہ فقہاء کے یہاں اس باب میں لڑکا اور لڑکی کے درمیان فرق ہے، لڑکے کی جبری شادی درست ہے، لڑکی کی نہیں۔ علامہ شامی نے اس کی سختی سے تردید کی اور اس کو محض وہم قرار دیا۔ اور کہا کہ قہستانی یا کسی بھی فقہ کے کلام میں اس قسم کی کوئی تقسیم نہیں کی گئی ہے، بلکہ علی الاطلاق مرد اور عورت دونوں کے لئے جواز نکاح کا حکم لگایا گیا ہے۔

’’وأما ما ذكر من أن نكاح المكره صحيح إن كان هو الرجل، و إن كان هو المرأة فهو فاسد فلم أر من ذكره وإن أوهم كلام القهستاني السابق ذلك بل عبارتهم مطلقة في أن نكاح المكره صحيح. كطلاقه وعتقه مما يصح مع الهزل ولفظ المكره شامل للرجل والمرأة. فمن ادعى التخصيص فعليه إثباته بالنقل الصريح‘‘[2]۔

## اولیاء کے اکراہ کی بحث:

بلکہ فقہاء کے مباحث پر غور کرنے سے ایک بات اور محسوس ہوتی ہے کہ جبری شادی کے تعلق سے تمام تر مباحث کا رخ اس جبر و اکراہ کی طرف ہے جو غیروں کی طرف سے یا غیر متعلق اشخاص کی جانب سے پیش آیا ہو، اگر خود اولیا اپنے لڑکے یا لڑکی پر جبر کریں اس سے فقہاء نے بحث نہیں کی ہے اور جبر و اکراہ کی عام صورتوں پر اکتفاء کیا ہے، غالباً اس کی دو وجوہات ہیں:

۱۔ جب غیروں کا اکراہ صحت نکاح میں مؤثر نہیں جن سے بالعموم ہمدردی و خیر خواہی کی امید نہیں کی جاسکتی تو اپنے اولیا کا اکراہ بدرجہ اولی مؤثر نہیں ہوگا، جن میں شفقت و خیر خواہی کا پہلو غالب ہوتا ہے۔

۲۔ لڑکا یا لڑکی اولیاء کے جس اصرار کو جبر و اکراہ کا نام دے رہے ہیں، ممکن ہے فی الواقع وہ ان کی ناعاقبت اندیشی اور درحقیقت اولیاء کا منشا ان کے اچھے مستقبل

[1] بدائع الصنائع ۶ / ۱۹۸، ۱۹۹ کتاب الاکراہ۔
[2] ردالمحتار الی الدرالمختار ۴ / ۸۷ کتاب النکاح۔

کی تعمیر ہو۔ آج کے بچوں کی نگاہ ان باریکیوں تک کہاں پہنچ سکتی ہے جہاں تک ان کے بڑوں کی پہنچ سکتی ہے، اس لئے قاضی اور مفتی کو محض بچوں کی چیخ وپکار پر توجہ نہیں دینی چاہئے، بلکہ ان حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے جو اس باب میں ممکنہ حد تک ملحوظ ہو سکتے ہیں۔

ان تفصیلات سے درج ذیل مسائل پر بخوبی روشنی پڑتی ہے:

۱۔ اسلامی تعلیمات اور عقد نکاح کے مزاج کا تقاضا یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ لڑکا اور لڑکی کی پوری رضامندی سے طے کیا جائے، اور اس باب میں کسی قسم کے جبر واکراہ کو راہ نہ دی جائے، ورنہ ایک تو یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہوگا، دوسرے اس نکاح سے وہ مقاصد حاصل نہ ہوں گے جو نکاح میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

۲۔ لیکن اگر کوئی شخص ان تعلیمات اور منشا نکاح کا لحاظ نہ کرکے لڑکا یا لڑکی سے بجبر واکراہ کسی رشتہ کے بارے میں ہاں کرالے اور لڑکا اور لڑکی اپنے اولیاء یا دیگر حالات ومسائل کا غیر معمولی دباؤ محسوس کرتے ہوئے اپنی زبان سے ایجاب وقبول کرلیں، تو فقہ اسلامی کی روشنی میں یہ نکاح درست ہو جائے گا، اس لئے کہ یہ تصرفات قولیہ میں سے ہے جن کی صحت میں اکراہ مؤثر نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں حالت اکراہ میں رضامندی بالکلیہ مفقود نہیں ہوتی، نسبۃً رضامندی موجود ہوتی ہے، پھر قصد ورضا کے باب میں اکراہ کا معاملہ ہزل سے بھی کمزور ہے، اس لئے کہ اکراہ میں قصد ہوتا ہے، رضا نہیں ہوتی جب کہ ہزل میں دونوں میں سے کچھ نہیں ہوتا، اس کے باوجود ہزل کی حالت کا نکاح باتفاق فقہاء درست ہے، اس لحاظ سے حالت اکراہ کا نکاح بدرجۂ اولی درست ہوگا۔

۳۔ برطانیہ کے ماحول میں رہنے والی لڑکی اور ہندوستان میں پرورش پانے والے لڑکے کے درمیان جو معاشرتی فرق ہے محض اس فرق کو شرعی کفاءت کی بنیاد بنانا مشکل ہے، دیگر امور کفاءت حسب ونسب، دین ومذہب، دینداری وتقوی، مال ودولت اور پیشہ واشتغال میں اگر فرق نہ ہو اور مذکورہ امور لڑکا اور لڑکی کے درمیان مشترک ہوں تو محض مشرقیت ومغربیت یا اختلاف مکان یا تہذیبی ومعاشرتی فرق کو کفاءت کی قانونی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، ورنہ دیہات کی تہذیب و معاشرت شہری تہذیب ومعاشرت سے مختلف ہوتی ہے، ایک علاقے کا مزاج رہن سہن اور طرز معاشرت دوسرے علاقے سے الگ ہوتا ہے، لیکن فقہاء نے اس کو کفاءت کے لئے قانونی درجہ دینے سے انکار کیا ہے۔

''القروي كفوء للمدني فلا عبرة بالبلد (درمختار) أي بعد وجود ما مر من أنواع الكفاءة، قال في البحر: فالتاجر في القرى كفء لبنت التاجر في المصر للتقارب'' (ردالمحتار ۲۱۹،۴)۔ (دیہاتی شہری کا کفو ہے، یعنی اگر کفاءت کی تمام مطلوبہ چیزیں موجود ہوں تو علاقائی اختلاف کا اعتبار نہیں، بحر میں ہے کہ دیہاتی تاجر شہری تاجر کی بیٹی کا کفو ہے، اس لئے کہ دونوں میں تاجرانہ یکسانیت موجود ہے)۔

۴۔ جبری شادی میں اگر کفاءت اور مہر مثل دونوں کی رعایت کی گئی ہو تو نکاح درست اور لازم ہوگا اور میاں بیوی میں ازدواجی تعلق قائم ہونے کے بعد پورا، اور قائم ہونے سے قبل اگر طلاق یا تفریق ہو جائے تو نصف مہر واجب ہوگا۔

اور اگر مہر مثل کی رعایت نہ کی گئی ہو تو شوہر کو مہر مثل کی تکمیل کا پابند کیا جائے گا، یا عورت کو کم پر راضی کیا جائے گا، اگر دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت نہ بن سکے تو تفریق کردی جائے گی، اس صورت میں اگر فیصلہ تفریق سے قبل شوہر عورت سے بالجبر وطی کرلے تو نکاح لازم ہو جائے گا، اور شوہر پر مہر مثل کی تکمیل لازم ہوگی اور اگر تفریق سے قبل عورت سے بخوشی وطی کرلے تو اس کا مطلب ہوگا کہ عورت مہر مثل سے کم پر راضی ہوگئی ہے، اس لئے نکاح لازم ہو جائے گا اور عورت کا حق تفریق باطل ہو جائے گا۔

اور اگر دونوں میاں بیوی باہم کفو نہ ہوں تو عورت کو حق تفریق حاصل ہوگا، البتہ اگر تفریق سے قبل عورت صراحۃً یا دلالۃً اس نکاح پر راضی ہو جائے تو اس کا حق تفریق باطل ہو جائے گا، اس صورت میں اگر میاں بیوی میں جنسی تعلق کی نوبت نہیں آئی اور تفریق ہوگئی تو شوہر پر کچھ بھی مہر واجب نہ ہوگا، اس لئے کہ سبب تفریق شوہر نہیں ہے، البتہ اگر جماع کرلے تو مہر مقررہ واجب ہوگا۔

۵۔ قاضی یا شرعی کونسل کے سامنے اگر اس طرح کا کیس آئے اور قاضی یا شرعی کونسل کو فریقین کے بیانات وغیرہ کے بعد اس بات کا یقین ہو جائے کہ لڑکی کو جبر واکراہ کے ذریعہ نکاح پر مجبور کیا گیا تھا حالانکہ لڑکی کسی طرح نکاح کو منظور کرنے کے لئے راضی نہیں تھی، اور نہ اس شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی تھی، تب بھی اس کو محض جبر واکراہ کی بنا پر فسخ نکاح کا اختیار نہیں ہوگا، شرعی کونسل کو دوسرے امور کی بھی چھان بین کرنی چاہئے اور اگر کوئی چیز قابل اصلاح ہو تو اصلاح کرلے اور افہام وتفہیم کے ذریعہ لڑکی کو اس رشتہ پر آمادہ کرے، ورنہ محض جبر واکراہ کی بنا پر قاضی یا شرعی کونسل کو فسخ نکاح کی اجازت نہیں ہوگی۔ ☆☆☆

# جبری شادی

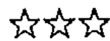
مفتی محبوب علی وجیہی (رامپور)

۱، ۲۔ بلاشبہ نکاح کے لئے عاقلہ بالغہ لڑکی کی رضامندی ضروری ہے۔ احادیث مبارکہ اس پر کثرت سے دلالت کرتی ہیں، لیکن ایک حقیقت رضا ہے اور ایک لفظی اور ظاہری رضا ہے۔ نکاح، طلاق، عتق ان کا تعلق ظاہری اور لفظی رضا سے ہے، یہاں تک کہ ہزل اور بلا قصد بھی اگر نکاح، طلاق، عتق کے الفاظ زبان سے ادا ہوجائیں گے تو نکاح، طلاق، عتق واقع ہوجائیں گے، پس معمولی اِکراہ اور جبر کے ساتھ نکاح منعقد ہوجائے گا، البتہ ایسا جبر و اِکراہ جس سے جان جانے کا یا کسی عضو کے تلف ہوجانے کا ظن غالب ہو، میرے نزدیک اس سے نکاح منعقد نہیں ہوگا۔ ایسی لڑکیاں جن کا نکاح جبر و اِکراہ کے ساتھ کرادیا جاتا ہے ان کو خلع کا حق حاصل ہے، وہ مسلم پنچایتی اداروں میں خلع حاصل کرسکتی ہیں، پاسپورٹ کے ضائع کرنے کی دھمکی اگر لڑکی کے ظن غالب میں سچی ہے تو یہ بھی جبر و اِکراہ کی دوسری صورت میں داخل ہے، اگر لڑکی کو دھوکہ دے کر نکاح پڑھوایا جائے تو اس صورت میں اس کا اذن نہیں ہوگا۔

۳۔ معاشرتی فرق کوئی اہم چیز نہیں ہے، لڑکی ہندوستان یا پاکستان میں بیاہ کر آئے تو اس کو یہاں کے سانچہ میں ڈھل جانا چاہئے اور لڑکی یورپ گئی ہے تو اس کو وہاں کے سانچہ میں ڈھل جانا چاہئے۔

۴۔ نکاح کے بعد جو تعلقات زن و شوہر کے قائم ہوتے ہیں اس کا حکم الگ ہے، اور اگر نہیں قائم ہوئے ہیں تو اس کا حکم الگ ہے جو فقہاء پر ظاہر ہے۔

۵۔ اگر لڑکی کسی طرح بھی شوہر کے یہاں رہنا نہیں چاہتی تو قاضی یا شرعی کونسل کو پہلے خلع کی کوشش کرنا چاہئے اگر شوہر خلع کے لئے راضی نہ ہو تو پھر قاضی یا شرعی کونسل کو نکاح کے فسخ کا اختیار ہے۔



# جبری شادی

ڈاکٹر مروان محمد محروس المدرس الاعظمی، عراق

## نکاح میں کفاءت کا مفہوم اور اس کی تعیین میں عرف کا اثر

### پہلی بحث: کفاءت کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

الکفاءۃ: (زبر اور مد کے ساتھ)، اور المکافأۃ لغت میں "کافأ" کا مصدر ہے۔ یہ دونوں بطور اسم بھی استعمال ہوتے ہیں اور الکفاء بدلہ کو کہتے ہیں، کہا جاتا ہے: مالی بہ قِبَلٌ ولا کِفاء یعنی مجھے اسے بدلہ دینے کی طاقت نہیں۔ حضرت حسان بن ثابتؓ کا شعر ہے: و روح القدس لیس لہ کفاء (یعنی جبرئیل کی کوئی نظیر اور مثال نہیں)۔ حدیث میں آیا ہے: "فنظر إلیھم فقال: من یکافئ ھؤلاء" (آپ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: کون ہے جو ان لوگوں کے برابر ہو) اور احنف کی حدیث میں ہے: لا أقاوم من لا کفاء لہ (میں اس سے مقابلہ نہیں کرتا جس کے برابر کوئی نہ ہو)۔ الکفیء، الکفوء، الکفاء: نظیر اور مساوی کو کہتے ہیں۔ اسی سے ہے: الکفاءۃ فی النکاح ہم کہتے ہیں: فلان کفء فلانۃ: جب کوئی مرد کسی عورت کا شوہر بن سکتا ہو، اس کی جمع أکفاء آتی ہے[1]۔ تکافأ الشیئان کا مطلب ہوا: دو چیزیں ایک دوسرے کے برابر ہوئیں۔ کافأہ مکافأۃً و کفاءً کا مطلب ہے: برابر ہونا۔ عرب کہتے ہیں: الحمد للہ کفاء الواجب یعنی اللہ تعالی کے شایان شان تعریف، حدیث میں آیا ہے: "المسلمون تتکافأ دماء ھم" یعنی دیات اور قصاص میں مسلمانوں کے خون برابر ہیں۔

فقہاء کی اصطلاح میں یہ کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً کفاءۃ فی الدماء، کفاءۃ فی النکاح۔ نکاح کے باب میں کفاءت یہ ہے کہ چند مخصوص امور میں زوجین کے مابین برابری ہو[2]۔

وہ مخصوص امور یہ ہیں: شوہر کا بیوی کے حسب نسب، دین اور گھر وغیرہ میں برابر ہونا۔

برکتی نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ زوجین کے مابین مخصوص درجہ کی برابری یا شوہر کا بیوی کے مساوی ہونا ہے[3]۔

میری رائے اسی بنیاد پر یہ ہے کہ نکاح میں کفاءت کا مفہوم یہ ہے کہ مذکورہ امور میں شوہر بیوی کے برابر ہو۔

### دوسری بحث: عرف کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم:

عرف لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو رسم و رواج اور معاملات میں لوگوں کے درمیان رائج ہو۔ عرف معروف کو بھی کہا جاتا ہے اور عرف گھوڑے کی گردن کے بال، اور مرغ کی کلغی کو بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح عرف سمندر کی موج اور اونچی جگہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے[4]۔ عَرَفَ، عَرُفَ، عَرِفَ وغیرہ ایسے افعال ہیں جن کے مختلف صیغے آتے ہیں اور ہر صیغہ کے لغوی اعتبار سے کئی معانی ہیں لیکن وہ ہماری بحث سے خارج ہیں۔ ہم نے اپنی بحث سے متعلق معنی نقل کر دیے ہیں۔ رہا عرف کا اصطلاحی معنی، تو عبد اللہ بن احمد النسفی نے "المستصفی" میں اس کی تعریف یوں کی ہے:

---

[1] لسان العرب، المعجم الوسیط اور الموسوعۃ الفقہیہ طبع کویت، جلد ۳۲۔

[2] ملاحظہ ہو: البحر الرائق جلد ۳، صفحہ ۱۳۷، الدر المختار ورد المحتار جلد ۳ صفحہ ۸۴، الموسوعۃ الفقہیہ جلد ۳۲۔

[3] دیکھیں: البرکتی، التعریفات الفقہیہ۔

[4] المعجم الوسیط ۲/ ۵۹۵۔

عرف: وہ چیز ہے جو عقلی لحاظ سے لوگوں کے ذہن میں بیٹھ گئی ہو اور جسے سلیم طبیعتوں نے قبول کرلیا ہو[1]۔

ابن عابدین نے عرف سے متعلق اپنے رسالہ میں یہی تعریف الاشباہ للبیری کے حوالہ سے اور انہوں نے المستصفی کے حوالہ سے نقل کی ہے[2]۔

لیکن یہ تعریف مکمل نہیں ہے، کیونکہ اس میں اس بات کی وضاحت نہیں کہ دل میں کیا چیز بیٹھی اور وہ کیا ہے، جسے سلیم طبیعت والے قبول کریں۔ مناسب تھا کہ تعریف کے اندر یہ بات بھی آتی کہ وہ افعال جو دل میں بیٹھ جائیں اور فعل میں مثبت ومنفی دونوں آتے ہیں (کیونکہ عدم فعل بھی ایک فعل ہے)[3]۔ ارادۃً کسی چیز سے رکنا بھی فعل ہے۔ اسی وجہ سے اس پر انسان کا محاسبہ کیا جائے گا۔

برکتی نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ عرف وہ ہے جس کو عقل کی شہادت کے ساتھ دل مان جائیں اور طبائع سلیمہ اس قبول کرلیں[4]۔ عصر حاضر کی ایک جماعت نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ یہ وہ فعل، قول یا ترک ہے جو عام لوگوں میں متعارف ہوجائے اور لوگ اس پر چلنے لگیں[5]۔ لیکن یہ تعریف بھی پوری طرح دقیق نہیں، کیونکہ:

۱۔ اہل منطق کے مطابق اس تعریف میں "دور" ہے، کیونکہ اس میں عرف لفظ تعارف پر مبنی ہے۔

۲۔ تعریف حقیقی نہیں جو اہل منطق کے نزدیک شرط ہے۔

۳۔ اس تعریف میں ترک کو ایک فعل نہیں قرار دیا گیا جبکہ جو بات معلوم ہے وہ اس کے برخلاف ہے (لہذا ترک کو بھی فعل کے زمرہ میں رکھنا چاہئے)۔ ہماری پسندیدہ تعریف وہی ہے جو نسفی نے کی ہے، اس قید کے ساتھ جو ہم نے لگائی ہے۔

اکثر فقہاء عادت اور عرف کو ایک جیسا قرار دیتے ہیں[6]۔

بعض کا کہنا ہے کہ عادت عرف سے عام اور وسیع ہے[7]۔

میری رائے یہ ہے کہ یہ محض اصطلاحی مسئلہ ہے، اور "ولا مشاحة في الاصطلاح" (اصطلاح میں بحث ومباحثہ کی چنداں ضرورت نہیں)، اور یہ معلوم ہی ہے کہ خود اصطلاح بھی ایک خاص قسم کا عرف ہوتا ہے، لہذا اس پر غور کیا جانا چاہئے[8]۔

عرف کبھی عملی ہوتا ہے اور کبھی قولی۔ عرف عملی وہ ہے جس پر عمل ہوتا ہو، چاہے وہ عام ہو جیسے بغیر کسی وقت یا اجرت کی تعیین کے حمام میں داخل ہونا یا کسی شہر کے ساتھ خاص ہو، جیسے دیہات والوں کا سرمایہ چوپایوں کی صورت میں ہونا۔

عرف قولی الفاظ سے ہوتا ہے[9]۔ اسے کسی خاص مفہوم پر دلالت کرنے کے لئے وضع کیا جاتا ہے، لہذا وہ خاص ہوتا ہے، اگر لوگوں کے ایک طبقہ کے درمیان بولا جائے تو وہ خاص ہوگا، جیسے حیاتیات کے ماہرین زمین میں جو کھدائیاں وغیرہ ڈائنامائٹ کے ذریعہ کرتے ہیں، انہیں وہ زلزالی (زلزلہ سے متعلق) ریسرچ کا نام دیتے ہیں، جبکہ زلزلہ کا ایک معروف لغوی مفہوم ہے جو اس کے علاوہ ہے۔

اور اگر تمام لوگوں کے درمیان معروف ہو تو اسے عام کہیں گے، جیسے لفظ "دابہ" کا اطلاق چوپایہ پر، حالانکہ لغت میں "دابۃ" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو زمین پر رینگے۔

[1] دیکھئے: احمد فہمی ابوسنہ، العرف والعادۃ فی رأی الفقہاء، مطبعہ ازہر جلد ۱۹، صفحہ ۸۔

[2] ابن عابدین، رسالہ نشر العرف فی بناء بعض الأحکام علی العرف۔ مذکورہ تعریف میں لفظ عادت کا اضافہ ہے۔

[3] ثار العقول فی علم الاصول از ڈاکٹر محمد محروس المدرس۔

[4] البرکتی، التعریفات الفقہیہ۔

[5] محمد مصطفی شلبی: المدخل فی التعریف بالفقہ الإسلامی، دار النہضۃ العربیہ ۱۹۶۹، ص ۲۶۰، نیز دیکھئے: عبد الوہاب خلاف، علم اصول الفقہ، دار القلم، کویت، ص ۸۹، نیز اسی مفہوم میں ڈاکٹر عبدالکریم زیدان کی الوجیز فی اصول الفقہ، مکتبۃ القدس، ص ۲۵۲، اور ڈاکٹر مصطفی الزحیلی کی اسباب اختلاف الفقہاء فی الأحکام الشرعیۃ، بغداد ص ۵۰۳۔

[6] ان میں سے ابن عابدین اور صاحب المستصفی ہیں اور جدید فضلاء میں سے ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، ڈاکٹر مصطفی زحیلی اور عبدالوہاب خلاف ہیں۔

[7] ان میں سے ابن امیر الحاج اور القرافی ہیں اور ابن الہمام "التحریر" میں کہتے ہیں کہ عرف عادت سے عام ہے۔

[8] ثار العقول، مرجع سابق۔

اس طرح لغوی عرف مجاز کے قبیل سے ہوتے ہیں، یعنی تجاوز کر کے جن کو دوسرے لفظ کے معنی میں استعمال کرلیا جاتا ہے اور کوئی ایسا قرینہ ہوتا ہے جو اصل کو مراد لینے سے مانع ہوتا ہے۔

تمام قسم کے مجازات کبھی حقیقت بھی بن جاتے ہیں۔ اس کی دو شرطیں ہیں:

۱۔ جیسے ہی بولا جائے وہی معنی ذہن میں آئے۔

۲۔ اس کی نفی نہ کی جاسکے۔

لہذا بعض حقائق شرعی ہوتے ہیں اور بعض مخصوص عرفی جو مختلف خاص قسم کے اعراف میں بدل جاتے ہیں اور بعض اعراف عام ہوتے ہیں، جبکہ سبھی ان کا استعمال کرتے ہوں۔

مسلمان فقہاء نے عرف کے اعتبار اور اس پر عمل کرنے کے لئے کئی شرطیں عائد کی ہیں۔ ان میں سے چند اہم شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ یہ ہے کہ عرف عام ہو یا غالب ہو۔ "الاشباہ والنظائر" میں کہا ہے: عادت اگر مستقل ہو یا غالب ہو تو اس کا اعتبار ہوگا اور اگر صرف مشہور ہو تو اس کا اعتبار نہ ہوگا[1]۔

۲۔ یہ کہ بعض لوگوں کی رائے کے مطابق عرف عام ہو، کیونکہ بناء احکام کے لئے معتبر عرف کے سلسلہ میں اختلاف ہے کہ آیا وہ صرف عرف عام ہو یا مطلق عرف؟

میرا کہنا یہ ہے اور اسی پر عمل بھی کیا جاتا ہے کہ ترک قیاس اور تخصیص قیاس میں عرف خاص کا اعتبار ہوگا، چنانچہ جب اہل بلخ کا یہ معمول ہوگیا کہ بننے والے کو بنے گئے کپڑے کا کچھ حصہ بطور اجرت دے دیتے تو چونکہ اس کی حرمت قفیز طحان (آٹا پیسنے والے کی ناپ) پر قیاس کرتے ہوئے قیاسی طور پر ثابت ہوتی تھی، جس کی صریح ممانعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، اس لئے یہاں قیاس کو عرف خاص کے ذریعہ خاص کردیا گیا[2]۔

۳۔ یہ کہ عرف مخالف شرع نہ ہو۔

۴۔ یہ کہ وہ عرف جس پر تصرف کو محمول کیا جائے، انشاء تصرف کے وقت موجود ہو، اس طرح کہ عرف وقت تصرف سے پہلے ہی سے موجود چلا آرہا ہو اور اس وقت بھی ہو، تب موازنہ ہوگا، چاہے تصرف قولی ہو یا فعلی۔

صاحب "الاشباہ" کہتے ہیں[3]: "وہ عرف جس پر الفاظ کو محمول کیا جائے گا وہ متوازی ہوگا جو پہلے سے موجود ہو[4]، بعد میں وجود پذیر نہ ہوا ہو، اس لئے فقہاء کہتے ہیں کہ عرف طاری کا اعتبار نہیں"۔

شارع حکیم نے عرف صالح کا لحاظ کیا ہے، کیونکہ لوگ جس طریقہ کے عادی ہوں اور اس پر عمل پیرا ہوں اس سے ان کو نکالنے میں تنگی اور شدید مشقت ہوگی۔ انبیاء کرام کو سخت مشکلات اسی لئے پیش آتی ہیں کہ وہ لوگوں کو ان کے فاسد اعراف سے باہر نکالتے ہیں۔

اسلامی شریعت نے ان اعراف کا بھی لحاظ کیا جو دور جاہلیت میں رائج تھے۔ بعض صحیح اعراف کو باقی رکھا اور جو مخالف شریعت تھے، انہیں باطل قرار دیا، اس کی مثالیں بہت ہیں۔

مثلاً شریعت نے بیع، شرکت، وکالت، رہن اور اجارہ وغیرہ کو باقی رکھا۔

جبکہ بادشاہ اپنے لئے جو زمینیں خاص کرتے ہیں ان کو اور بیع المنابذہ، بیع الملامسۃ، تلقی الرکبان (سواروں سے پہلے ہی سامان حاصل کرلینے کی

---

[1] الاشباہ لابن نجیم جلد ۱ صفحہ ۱۲۸، البرکتی، القواعد الفقہیہ قاعدہ نمبر ۵۵۔

[2] مشائخ بلخ من الحنفیہ از ڈاکٹر محمد محروس المدرس ۲/۔

[3] الاشباہ جلد ۱ صفحہ ۱۳۳

[4] اشباہ کے شارح حموی اس عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یعنی بولنے کے وقت سے مقدم، حتی کہ وہ اس وقت تک ثابت شدہ بن جائے اور جو عرف ابھی ابھی وجود پذیر ہوا ہو اس کا اعتبار نہیں ہوگا اور نہ اس کے مطابق کسی سابق لفظ کی تاویل کی جائے گی"۔ ماخوذ محمد مصطفی شلبی: المدخل فی التعریف بالفقہ الإسلامی، دار النہضۃ العربیہ ۱۹۶۹ء، ص ۲۶۴۔

کوشش)، بیع الحاضر للبادی (شہری کا دیہاتی سے دیہات ہی کے نرخ پر بیع کرنا) وغیرہ کو ممنوع قرار دیا۔

## تیسری بحث: کفاءت کی غرض وغایت:

کفاءت کی شرط کے اعتبار کرنے نہ کرنے کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض ائمہ احناف بشمول امام کرخی اور تابعین میں سے امام حسن بصری اس کا اعتبار نہیں کرتے۔ کرخی کہتے ہیں: میرے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ نکاح میں کفاءت کا اعتبار ہی نہ کیا جائے، کیونکہ جو چیز نکاح سے بھی زیادہ اہم ہے، مثلاً دیت وغیرہ کے مسائل، ان میں کفاءت معتبر نہیں، لہذا زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ نکاح میں بھی اس کا اعتبار نہ ہو[1]۔

فقہاء حنفیہ میں سے بیشتر اس کا اعتبار کرتے ہیں اور اس کا سبب ان کے نزدیک یہ ہے کہ مصالح صحیح طور پر عموماً برابر کے لوگوں میں ہی انجام پاتے ہیں۔ نکاح ان ہی مصالح کے بہتر نظم کی خاطر مشروع کیا گیا ہے، غیر مساوی لوگوں کے بیچ عموماً معاملات ٹھیک سے انجام نہیں پاتے۔ شریف عورت کسی ذلیل کے بستر کی زینت نہیں بننا چاہتی۔ وہ اس میں عار محسوس کرتی ہے۔ اور اس لئے بھی کہ نکاح سسرالی رشتوں کے قیام کے لئے مشروع کیا گیا ہے، جس سے دور کا قریبی نزدیکی اور مددگار بن جائے۔ آپ کی خوشی اس کی خوشی ہو اور ایسا موافقت اور باہمی قربت کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔ قربت نسب کی دوری سے پیدا نہیں ہوگی۔ اسی طرح غلامی یا (غلام ہوکر) آزاد ہونے وغیرہ سے بھی نہیں ہوگی، اس لئے غیر کفوء سے نکاح کرنا ایسا عقد ہوگا جو اپنے مقاصد سے دور ہوگا۔ حنفیہ حسن کی روایت میں جو فتوی کے لئے زیادہ پسندیدہ ہے اور لخمی، ابن بشیر، ابن فرحون، ابن سلمون (مالکیہ میں سے) اس طرف گئے ہیں کہ کفاءت صحت نکاح کے لئے شرط ہے[2]۔ یہی امام احمد سے بھی ایک روایت ہے۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ جب کفاءت قتال میں مطلوب ہے، تو نکاح میں تو بدرجہ اولی مطلوب ہوگی، کیونکہ نکاح تو عمر بھر کے لئے کیا جاتا ہے، جو معاشرت، الفت ومحبت، حسن سلوک اور نئے رشتے بنانے جیسے اغراض ومقاصد پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ مقاصد ایک دوسرے کے ہم سر اور برابر کے لوگوں میں بہتر طریقہ پر حاصل ہوسکتے ہیں، پھر یہ کہ عورت کے کسی کی مملوک ہونے میں اس کے لئے ایک طرح کی ذلت پائی جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی طرف یوں اشارہ کیا ہے: ''النكاح رق، فلينظر أحدكم أين يضع كريمته'' (نکاح ایک طرح کی غلامی ہے، لہذا تم میں کا ایک شخص غور کرلے کہ وہ اپنی شریف زادی کو کس کے حوالہ کررہا ہے)۔ نفس کو ذلیل کرنا حرام ہے، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ليس للمؤمن أن يذل نفسه'' (مؤمن کے لئے جائز نہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے) جس ذلت کی اجازت ہے، وہ ضرورت کی وجہ سے ہے اور ایسے شخص کے بستر کی زینت بننا جو اس کے ہم سر نہ ہو، زیادہ بڑی ذلت ہے، جس کی کوئی ضرورت نہیں، اسی لئے کفاءت کا اعتبار کیا گیا ہے[3]۔

علماء نے کہا ہے: کفاءت ازدواجی تعلق کو برقرار رکھنے کے لئے معتبر قرار دی گئی ہے، کیونکہ عورت طبعی طور پر اپنے سے کم تر کا بستر بننے پر عار محسوس کرتی ہے۔ بستر کے کم رتبہ ہونے سے اسے تنفر ہوتا ہے اور اسے اور اس کے اولیاء کو عار لاحق ہوتی ہے، اسی طرح شوہر عورت سے کم درجہ کا ہو تو بھی اسے عار لاحق ہوگی، پھر جو اولاد ہوگی وہ باپ کی طرف ہی منسوب ہوگی[4]۔

## چوتھی بحث: کفاءت کے اعتبار کا دائرہ:

فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ کفاءت کن امور میں ہوگی۔

[1] المبسوط للسرخسی جلد ۵، البدائع ۲ / ۳۱۷۔

[2] الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ۔

[3] المبسوط للسرخسی جلد ۵۔

[4] دیکھئے: البدایۃ شرح البدایۃ جلد ا صفحہ ۲۰۰، صاحب البحر الرائق شرح کنز الدقائق لکھتے ہیں: إن المصالح لا تنتظم إلا بين المتكافئين عادة، ولأن الشريفة تأبى أن تكون مستفرشة للخسيس، بخلاف زوجها، لأن الزوج مستفرش فلاتغيظه دناءة الفراش'' (مصالح عموماً برابر درجہ کے لوگوں کے درمیان بہتر طور پر انجام پاتے ہیں۔ اس کی ضرورت یوں بھی ہے کہ ایک شریف زادی کسی کمتر کا فراش (بستر) نہیں بننا چاہے گی۔ اس کے شوہر کا معاملہ اس کے برخلاف ہے، کیونکہ شوہر فراش (بستر) نہیں بلکہ مستفرش (بستر سے فائدہ اٹھانے والا) ہے، لہذا فراش کے کم رتبہ ہونے سے اسے تنفر نہیں ہوگا) عرب ملکوں کے پرسنل لا میں سے متعدد نے کفاءت کا اعتبار کیا ہے، چنانچہ شام اور اردن کے قوانین میں اس کی صراحت ہے۔ اس بارے میں ان کے قوانین زیادہ تر حنفی فقہ سے متاثر ہیں۔

حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ یہ مندرجہ ذیل چھ امور میں معتبر ہوگی: نسب، اسلام، آزادی، مال، دینداری، پیشہ۔

شافعیہ کی رائے یہ ہے کہ اس کا اعتبار نسب، عیوب سے خالی ہونے، دینداری، نیکی، پیشہ اور آزادی میں ہوگا[1]۔ ان کے ہاں مال یا خوش حالی میں کفاءت کا ذکر نہیں ملتا ہے۔

جہاں تک حنابلہ کی بات ہے تو اس سلسلہ میں امام احمد سے دو روایتیں ہیں، ایک تو امام شافعی کے مسلک کے مطابق ہے، عیوب سے خالی ہونے کی شق کو چھوڑ کر، اور دوسری روایت میں کفاءت کا اعتبار تقوی اور نسب میں کیا گیا ہے، باقی میں اختلاف ہے۔

امام مالک کے یہاں نسب، پیشہ، مال یا خوش حالی میں کفاءت کا اعتبار نہیں ہے۔ ان کے نزدیک صرف تدین، تقوی اور عیوب سے خالی ہونے میں اس کا اعتبار ہے اور آزادی کے بارے میں دو روایتیں ہیں، ایک میں اس کا اعتبار کیا گیا ہے، دوسری میں نہیں کیا گیا ہے۔

کفاءت کے امور میں ائمہ مذاہب ہی کے درمیان نہیں بلکہ ایک ہی مذہب کے ائمہ کے مابین اختلاف اس بات کی دلیل ہے کہ کفاءت کا مسئلہ اضافی اور مختلف فیہ ہے اور اس میں زمان و مکان کے اثرات کا دخل ہے۔

پھر یہ کہ امور کفاءت کی تحدید اس طرح نہیں ہوئی جیسے آیت زکاۃ میں مصارف زکاۃ کی تحدید کردی گئی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف واقع ہوا، اس سلسلہ میں جن امور کی بھی تحدید کی گئی ہے، وہ عرف پر مبنی ہیں۔ اس لئے زمان و مکان کے فرق سے کفاءت کے احکام میں اختلاف ہوگیا۔ بعض فقہاء نے اس حقیقت کی طرف معروضی طور پر اشارہ بھی کردیا ہے، "البدائع" کے مصنف نے لکھا ہے: "فلا يكون الفقير كفأً للغنية؛ لأن التفاخر بالمال أكثر من التفاخر بغيره عادةً وخصوصاً في زماننا هذا"[2] (چنانچہ غریب آدمی مال دار عورت کا کفو نہیں ہوگا، کیونکہ عموماً مال کی بنا پر تفاخر دیگر چیزوں کی وجہ سے تفاخر کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے خصوصاً ہمارے اس زمانہ میں) تو ان کے قول "خصوصا في زماننا هذا" سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے زمانہ کے عرف پر اس حکم کو قیاس کیا ہے۔

پیشہ میں کفاءت پر گفتگو کی مناسبت سے انہوں نے امام ابوحنیفہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ بھی عرف پر مبنی ہوگا۔ وہ کہتے ہیں: رہا پیشہ تو کرخی نے ذکر کیا ہے کہ پیشوں اور صناعتوں میں کفاءت امام ابو یوسف کے نزدیک معتبر ہے، اسی لئے پارچہ باف سونے کے تاجر اور سنار کا کفو نہیں ہوگا، اسی طرح ذکر کیا گیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اس سلسلہ میں عربوں کے اس دستور کو بنیاد بنایا کہ ان کے غلام یہ کام کرتے تھے، لیکن بطور پیشہ نہیں، اسی لئے انہیں ان میں عار محسوس نہیں ہوتی تھی، اور امام ابو یوسف نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے عرف کو دیکھ کر فتوی دیا کہ وہ ان کاموں کو پیشہ بناتے تھے اور کم تر درجہ کے کاموں سے عار محسوس کرتے تھے، اسی لئے حقیقتاً ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسی طرح قاضی نے اپنی شرح "مختصر الطحاوی" میں ذکر کیا ہے کہ پیشہ میں کفاءت کا اعتبار ہوگا[2]۔

مذکورہ نص میں واضح اشارہ ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اس سلسلہ میں عربوں کے عرف پر قیاس کیا، تو اگر زمانہ بدل جائے تو حکم بدلا جاسکتا ہے، اور یہ قاعدہ معروف ہے: "لا ينكر تغير الاحكام بتغير الأزمان" (زمانہ کے تغیر سے احکام میں تغیر کا انکار نہیں کیا جاسکتا)۔ حقیقت میں زمانہ نہیں بدلتا، اہل زمانہ بدلتے ہیں، اور نتیجۃً ان کا عمل بدلتا ہے۔

اسی طرح ہم نے دیکھا کہ امام ابو یوسف نے حکم کی بنیاد اہل ملک کے عرف پر رکھی ہے۔

ابن الہمام "الفتح" میں کہتے ہیں: "فإذا ثبت اعتبار الكفاءة بما قدمنا- أي بالأدلة المذكورة سابقاً- فيمكن ثبوت تفصيلها بعرف الناس فيما يحقرونه ويعيرون به. فيستأنس بالحديث الضعيف في ذلك"[3] (جب مذکورہ صدر دلائل سے کفاءت کا معتبر ہونا ثابت ہوگیا تو اس کی تفصیلات لوگوں کے اس عرف کو دیکھ کر کہ وہ کن چیزوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور کن چیزوں سے انہیں عار لاحق ہوتی ہے، ثابت کی جاسکتی ہیں، اور اس سلسلے میں ضعیف حدیث سے استدلال کیا جاسکتا ہے)۔ انہوں نے مزید کہا کہ پیشہ کے اچھے اور گھٹیا ہونے میں اعتبار ہر زمانہ اور ہر جگہ کے

[1] مغنی المحتاج ۳/۱۶۶، ملاحظہ ہو: محاضرات فی عقد النکاح، محمد ابو زہرہ ۱۹۰ تا ۱۹۱۔
[2] بدائع الصنائع جلد ۲۔
[3] الفتح جلد ۲ صفحہ ۳۱۸۔

عرف کا ہوگا۔ پیشوں کے ایک دوسرے سے قریب یا ایک دوسرے سے دور ہونے کا مدار عرف پر ہوگا۔

کفاءت کے عرفی ہونے ہی کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء کے درمیان متعدد چیزوں میں اختلاف ہوا ہے مثلاً:

## ا۔ آدمی کی دینداری کے بارے میں:

امام محمد کی رائے یہ ہے کہ اس کا اعتبار ہوگا، ہاں اگر فاسق آدمی بھی بارعب اور لوگوں میں شوکت والا ہو تو ایسی صورت میں اس کا اعتبار نہ ہوگا، امام ابوحنیفہ اس کا مطلق اعتبار نہیں کرتے، کیونکہ فسق ختم ہو سکتا ہے۔

یہی بات امام ابو یوسف بھی کہتے ہیں، الا یہ کہ فاسق لوگوں میں علانیہ فسق کا اظہار کرتا ہو تو ایسا آدمی صالح لڑکی کا کفوء نہیں ہو سکتا[1]۔

**۲۔ پیشہ:**...... اس کا امام ابو یوسف اور امام محمد نے اعتبار کیا ہے، لیکن امام ابوحنیفہ نے نہیں کیا، امام ابو یوسف سے بھی امام ابوحنیفہ کی طرح کا قول منسوب ہے، الا یہ کہ پیشہ بہت ہی گھٹیا درجہ کا ہو مثلاً نائی، چمڑا درست کرنے والا اور سائس۔

**۳۔ مال:**...... کفاءت فی المال کے مفہوم کے سلسلہ میں مختلف روایات ہیں: بعض لوگوں نے اس سے مراد یہ لیا ہے کہ مہر دینے کی قدرت ہو اور بعض نے نان ونفقہ کی قدرت مراد لی ہے[2]۔

**۴۔ حسب:**

امام محمد سے یہ مروی ہے کہ وہ اس کا اعتبار کرتے ہیں حتی کہ جو نشہ کرتا ہو اور بچے اس کا مذاق اڑاتے ہوں، وہ کسی شریف گھرانہ کی لڑکی کا کفوء نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ظالموں اور جابروں کے مددگار اور ساتھی، ان میں سے جس کا استخفاف کیا جاتا ہو، وہ بھی کسی شریف گھرانہ کی لڑکی کا کفوء نہیں ہوگا، سوائے اس کے کہ لوگوں میں بارعب اور ہیبت والا ہو۔

اور امام ابو یوسف سے مروی ہے کہ انہوں نے نشہ آور چیز کا استعمال کرنے والے شخص کے بارے میں فرمایا کہ اگر وہ اسے چھپ کر استعمال کرتا ہو اور نشہ کی حالت میں باہر نہ نکلتا ہو تو وہ کفوء ہوگا اور اگر اس کو علی الاعلان کرتا ہو تو وہ شریف گھرانہ کی لڑکی کا کفوء نہیں ہو سکتا۔

امام ابوحنیفہ سے اس سلسلہ میں کچھ بھی مروی نہیں، ان سے صحیح روایت یہ ہے کہ اس کا اعتبار نہیں ہوگا، کیونکہ یہ کوئی ایسی ضروری چیز نہیں جسے چھوڑا نہ جا سکتا ہو[3]۔ مذکورہ اختلاف سے پتہ چلتا ہے کہ احکام کفاءت کی بنیاد ان حضرات کے زمانہ میں رائج عرف پر تھی، چنانچہ ابو یوسف ظالموں کے حمایتیوں کو نیک عورت کا کفوء نہیں مانتے اگر ان کو ذلیل سمجھا جاتا ہو لیکن اگر وہ لوگوں میں مرتبہ رکھتے ہوں تو پھر کفوء ہوں گے، یعنی انہوں نے مسئلہ کی بنیاد اس پر رکھی کہ لوگ کیا سمجھتے ہیں!!

ہم اس اختلافی مسئلہ میں مختلف رایوں کو ذکر کر کے اسے طول دینا نہیں چاہتے۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ جب ایک ہی مسلک کے قریب قریب زمانہ کے ائمہ کے مابین اس مسئلہ میں اتنا اختلاف ہو گیا تو زمان و مکان کی دوری کے بعد کتنا ہو سکتا ہے، یہ آپ سمجھ سکتے ہیں؟ اسی بات کو شیخ ابوزہرہ زور دے کر بیان کرتے ہیں، کیونکہ وہ کفاءت کو ان مسائل میں شمار کرتے ہیں جو عرف کے تابع ہیں، اس لئے کہ ازدواجی زندگی کی بقاء کا تقاضا ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں کے خاندانوں میں لازماً تقارب پایا جائے۔

## پانچویں بحث: عرف اور عصر حاضر میں اس کا اثر:

اسلامی شریعت نے یہ تسلیم کیا ہے کہ احوال وظروف کی تبدیلی کا شرعی اور اجتہادی احکام پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ عدل قائم ہو، مصالح کا حصول ہو، مفاسد کو ختم کیا جائے، اسی لئے بہت سے ایسے احکام ملتے ہیں جن میں لوگوں کے احوال وظروف اور مصالح کی تبدیلی سے احکام بدل جاتے ہیں، تو اگر شارع کوئی ایسا حکم نافذ کرتا جو ناقابل تبدیل ہوتا تو اس سے لوگوں کو تنگی اور حرج پیش آتا اور یہ اسلام کے مقاصد کے خلاف ہوتا جس نے شریعت کے احکام کی

[1] السرخسی فی المبسوط، نیز دیکھئے: ابوزہرہ حوالہ سابق۔

[2] ابوزہرہ / ۱۸۸۔

[3] المبسوط للسرخسی جلد ۵، البحر الرائق ۳ / ۱۳۳۔

بنیاد بندوں کی مصلحتوں پر رکھی ہے، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ شارع نے مطلقاً احکام دے دئے ہیں اور ان کی تفصیل اور جزئیات کی توضیح نہیں کی، تا کہ ان کی تطبیق احوال وظروف کے لحاظ سے کی جاسکے جو فطری طور پر بدلتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے فقہ اسلامی ہر زمان ومکان کے لئے ہے، لیکن اگر احکام اجتہاد کے قابل نہ ہوسکتے تو یہ بات نہیں کہی جاسکتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء متاخرین نے مختلف فقہی مسالک کے بہت سے مسائل میں اپنے ائمہ مذاہب اور فقہاء متقدمین کے فتووں کے خلاف فتوے دیئے ہیں اور یہ صراحت کردی ہے کہ اختلاف کا سبب فقط اختلاف زمان ہے، لہٰذا وہ فی الواقع متقدمین کے مخالف نہیں ہوتے بلکہ بات یہ ہے کہ اگر متقدمین فقہاء متاخرین کے زمانہ میں ہوتے اور عرف وطبائع اور ضرورتوں کا اختلاف دیکھتے، بلکہ وسائل کا اختلاف بھی، تو وہ بھی وہی بات کہتے جو متاخرین نے کہی[۱]۔

فقہاء حنفیہ عرف کے بارے میں دوسرے مذاہب سے زیادہ توسع سے کام لیتے ہیں۔ ابن عابدین نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے ''نشر العرف في بناء بعض الأحکام علی العرف'' اور ان حضرات نے متقدمین کے فروع سے اخذ کر کے متعدد قواعد وضع کئے ہیں، جو اس بات کی دلیل ہیں کہ جن احکام کے سلسلے میں کوئی اجماع یا نص نہ ہو ان میں عرف کا اعتبار ہوگا۔ ہم ذیل میں ان قواعد کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ العادة محکمة (رواج فیصلہ کن ہوگا)[۲]۔

۲۔ الحقیقة تترك بدلالة العادة (رواج کے پیش نظر حقیقی معنی ترک کردیا جائے گا)[۳]۔

۳۔ استعمال الناس حجة یجب العمل بها[۴] (لوگوں کا استعمال حجت سمجھا جائے گا۔ اس پر عمل ضروری ہوگا)۔

۴۔ المعروف عرفاً کالمشروط شرطاً[۵] (جو عرف میں مشہور ہو وہ مشروط کی طرح سمجھا جائے گا)۔

۵۔ التعیین بالعرف کالتعیین بالنص[۶] (عرف سے تعیین نص سے تعیین کی طرح ہے)۔

۶۔ لاینکر تغیر الأحکام بتغیر الأزمان[۷] (زمانہ کی تبدیلی سے احکام میں تبدیلی کوئی معیوب بات نہیں)۔

۷۔ العادة تجعل حکماً إذا لم یوجد التصریح بخلافه[۸] (رواج کو حکم قرار دیا جائے گا بشرطیکہ اس کے خلاف صراحت نہ پائی جائے)۔

۸۔ العادة معتبرة في تقیید مطلق الکلام[۹] (مطلق کلام کو مقید کرنے میں رواج معتبر ہوگا)۔

۹۔ المعروف بین التجار کالمشروط بینهم[۱۰] (تاجروں کے درمیان جاری عرف کو مشروط کی طرح سمجھا جائے گا)۔

۱۰۔ الثابت بالعرف کالثابت بالنص[۱۱] (عرف سے جو چیز ثابت ہو وہ نص سے ثابت شدہ چیز کی طرح ہے)۔

۱۔ ملاحظہ ہو: رسالہ نشر العرف لابن عابدین، جو ان کے مجموعہ رسائل میں شامل ہے۔
۲۔ دیکھئے: مجلۃ الاحکام العدلیہ کی دفعہ ۴۰، برکتی نے اپنی القواعد الفقہیہ میں اسے بیان کیا ہے، قاعدہ نمبر ۱۲۶۔
۳۔ حوالہ سابق دفعہ ۴۰۔
۴۔ حوالہ سابق دفعہ ۳۷۔
۵۔ مجلۃ الاحکام کی دفعہ ۴۳، البرکتی۔ قاعدہ ۳۳۴۔
۶۔ دفعہ ۴۵ مجلۃ الاحکام العدلیہ کی دفعہ ۴۵ البرکتی القاعدہ ۸۸۔
۷۔ دفعہ ۳۹۔
۸۔ البرکتی۔ قاعدہ ۱۲۵۔
۹۔ البرکتی۔ قاعدہ ۱۲۷
۱۰۔ البرکتی۔ قاعدہ ۱۳۵۔
۱۱۔ البرکتی۔ قاعدہ ۱۰۱۔

ابن عابدین عرف سے متعلق اپنے رسالہ میں کہتے ہیں: مفتی پر لازم ہے کہ وہ ظاہر الروایہ کی کتابوں میں منقول مسئلوں پر جمود نہ برتے کہ اپنے زمانہ اور اہل زمانہ کی رعایت نہ کرے اور یہ کہ بہت سے حقوق ضائع نہ کرے اور نہ اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ ہو[1]۔

اسی لئے متاخرین نے امام ابوحنیفہ اور صاحبین سے کئی مسائل میں تغیر احوال کو بنیاد بنا کر اختلاف کیا، مثلاً انہوں نے تعلیم قرآن، اذان اور امامت وغیرہ کی اجرت کو جائز قرار دیا ہے، جبکہ امام صاحب اور صاحبین کی رائے اس کے خلاف ہے۔

اسی طرح یہ مسئلہ کہ امام ابوحنیفہ نے حدود وقصاص کو چھوڑ کر دیگر مسائل میں گواہوں کے بارے میں صرف ظاہری طور پر عادل ہونے کو کافی سمجھا اور ان کی تصدیق کو ضروری نہیں قرار دیا، دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تھا: ''المسلمون عدول بعضهم على البعض'' (مسلمان باہم راست باز ہیں)۔ یہ اجتہاد امام صاحب کے زمانہ کے لئے تو مناسب تھا، کیونکہ اس وقت خیر کا غلبہ تھا، لیکن جب امام ابویوسف اور امام محمد کا زمانہ آیا اور جھوٹ عام ہوگیا تو ظاہر عدالت کو کافی سمجھنے میں مفسدہ تھا اور حقوق کے ضائع ہونے کا اندیشہ تھا، اس لئے فساد زمانہ کے سبب انہوں نے کہا کہ تمام گواہوں کی تصدیق کرائی جائے گی تاکہ مفسدہ کو دور کیا جاسکے، اس لئے فقہاء اس اختلاف کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ یہ دور اور زمانہ کا اختلاف ہے اور انہوں نے صاحبین کے قول پر فتوی دیا ہے[2]۔

اسی بنیاد پر علماء نے عرف کو اصولِ استنباط میں سے ایک اصل سمجھا ہے۔ جن مسائل میں نص نہیں اور نہ وہ اجماعی ہیں، ان میں عرف کے ذریعہ حکم لگایا جاتا ہے، کیونکہ لوگ اپنے مصالح اور ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جس عرف پر چلتے ہوں اس کا لحاظ رکھنا واجب ہے، بشرطیکہ وہ مخالف شرع نہ ہو۔ شارع نے تشریع کے سلسلہ میں عربوں کے صحیح اعراف کا لحاظ رکھا ہے[3]۔ لیکن جو کمزور اعراف تھے انہیں باطل قرار دیا۔ اسی طریقہ پر اب بھی عرف پر احکام جاری ہوں گے، جیسا کہ اس سے پہلے اس کی تفصیل اس کی شرائط کے ضمن میں گذری۔

میری رائے یہ ہے کہ کفاءت ان امور میں سے ہے جن کا عرف پر بہت انحصار ہے، چنانچہ شیخ احمد فہمی ابوسنہ کی رائے ہے کہ کفاءت بھی عربوں کے ان قدیم اعراف میں سے ہے جنہیں اسلام نے برقرار رکھا ہے[4]۔

اور چونکہ ہمارے زمانے میں اعراف کافی حد تک بدل چکے ہیں اور فقہاء متقدمین کے زمانہ کی حالت باقی نہیں رہی، اسی لئے اب پھر سے امور کفاءت پر غور وفکر کرنا ضروری ہے، بلکہ ان امور کے معانی پر بھی غور کرنا چاہئے تاکہ ازدواجی تعلقات کے استحکام اور ان کی بقاء سے متعلق شارع کے مقصد کو ہم بروئے کار لاسکیں۔

آج عورت یونیورسٹیوں اور مختلف قسم کے کالجز میں پڑھ رہی ہے اور مختلف میدانوں میں کام کررہی ہے، مثلاً ڈاکٹری، انجینیرنگ، ٹیچنگ وغیرہ، اور ان میں ملازمت کے ذریعہ وہ اپنی روزی کمارہی ہے۔

مغربی ملکوں میں ٹیکنالوجی کے میدان میں زبردست ترقی کے باعث بہت سے تصورات بدل چکے ہیں۔ اس ترقی میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ اب وہاں ان پڑھ اسے کہا جاتا ہے جو کمپیوٹر کو آپریٹ نہ کرسکتا ہو، جبکہ تیسری دنیا اور ترقی پذیر ملکوں میں ان پڑھ ہونے کا وہی پرانا اور روایتی تصور رائج ہے، یعنی پڑھنا لکھنا نہ جاننا! یوروپ، امریکہ اور جاپان وغیرہ بہت سے ملکوں میں زندگی آج جدید ترین آلات اور ترقی یافتہ تکنیک پر چلتی ہے، جبکہ غریب ملکوں میں آج بھی روایتی وسائل پر تکیہ کیا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: کیا اس کی روشنی میں کفاءت کے تصور میں تبدیلی نہیں آنی چاہئے؟!

پیشہ کے سلسلہ میں باپ کے پیشہ کو دیکھا جاتا تھا، کیونکہ کام عموماً باپ ہی کرتا تھا اور عورتیں گذشتہ زمانوں میں بہت کم کام کرتی تھیں۔ ہمارے فقہاء نے پیشہ کی شرط کے سلسلہ میں یہی ذکر کیا تھا، مثلاً امام ابویوسفؒ سے مروی ہے کہ پیشہ کا اعتبار کیا جائے گا، یہاں تک کہ دباغت دینے والا، نائی، جولاہا اور بہشتی، کپڑا

---

[1] نشر العرف۔ مجموعۃ رسائل ابن عابدین رجلد ۲ الرسالہ ۳۱۔

[2] العرف والعادة في رأي الفقهاء لأحمد فہمی ابوسنہ ص ۸۸، ابوسنہ نے ان کے علاوہ اور مثالیں بھی اپنی کتاب میں ذکر کی ہیں اور شیخ مصطفیٰ زرقاء نے بھی کئی مثالیں اپنی کتاب المدخل الفقهي العام یعنی الفقه الاسلامي في ثوبه الجديد میں ذکر کی ہیں، ار ص ۹۲۶ تا ۹۲۹۔

[3] علم اصول الفقہ لعبد الوہاب خلاف ر ۹۰۔

[4] ابوسنہؒ حوالہ سابق ر ۲۷، خلاف، حوالہ سابق۔

فروش اور عطار کی بیٹی کے کفو نہیں ہوں گے، یعنی امام ابو یوسف نے اس سلسلہ میں رواج کا اعتبار کیا[1]۔

علم کے سلسلہ میں فقہاء متقدمین نے باپ کی علمیت کا اعتبار کیا ہے، اس لئے ان کا کہنا ہے کہ عالم کی بیٹی کے برابر کوئی نہیں، کیونکہ علم کی عزت مال اور نسب کی عزت سے بالاتر ہے[2]۔

اس کو بنیاد بنا کر کیا موجود زمانہ میں امور کفاءت کے تصور میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی؟ کیا ہم اب بھی باپ کے پیشہ کو دیکھیں گے جبکہ عورت مختلف میدانوں میں کام کر رہی ہے؟ کیا ہم لڑکی کی قابلیت سے صرف نظر کر کے باپ کی علمیت کو ہی دیکھیں گے!

کفاءت کے احکام کی بنیاد زیادہ تر سماجوں کے رواج پر ہے، یہی فقہاء کا کہنا ہے اور اسی کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے[3] لہٰذا وہ عورت جو برطانیہ میں پلی بڑھی اور اس نے وہیں تعلیم پائی، اس کی نشو ونما مختلف احوال و ظروف میں ہوئی جو ہندوستان بلکہ سارے مشرقی ملکوں کے احوال سے مختلف ہیں۔ امور کفاءت میں جہاں تک ہم سمجھتے ہیں، اختلاف بلاد اور اختلاف تعلیم کا ذکر بھی مناسب ہے!

اس کے ساتھ ہی یہ اضافہ بھی کیجئے کہ برطانوی سماج جیسے دوسرے معاشروں میں عورتیں بالعموم تعلیم یافتہ ہوتی ہیں۔ اور جدید مواصلاتی ذرائع کا استعمال جانتی ہیں اور ترقی یافتہ سائنٹیفک آلات سے واقف ہوتی ہیں جبکہ وہ مرد جو ہندوستان اور اس جیسے ملکوں میں پروان چڑھا ہوا گر اس کی شادی کسی برطانوی لڑکی سے کر دی گی جائے تو یہ شوہر لڑکی کے مقابلہ میں کم تر ہوگا اور اپنے جہل اور ماحول کے اختلاف کی بنا پر دوسروں کے تمسخر کا نشانہ بھی بنے گا اور اس کے درمیان اور اس کی بیوی کے درمیان بڑا فرق ہوگا اور اگر لڑکی ایسا نہ کرے گی تو سماج تو ضرور اسے نیچی نگاہ سے دیکھے گا، جس سے وہ اپنی بیوی کی نگاہ میں کم تر ہوگا، اور یہ اس کے لئے نقصان دہ ہے۔ اس سے معاشرت ٹوٹے گی۔ ازدواجی زندگی میں استحکام ختم ہو جائے گا اور زوجین کے درمیان مودت اور رحمت جو اللہ کو مطلوب ہے وہ ختم ہو جائے گی!

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے فقہاء نے باپ اور شوہر کے پیشہ میں تشابہ اور تقارب کی شرط سے یہ چاہا ہوگا کہ عورت کو یکساں ماحول ملے، باپ کے گھر میں اور شوہر کے گھر میں۔

اسی طرح جہاں انہوں نے شوہر کی خوش حالی کی شرط لگائی ہے وہاں بھی اس سے مقصود یہی ہوگا کہ یہ شوہر بیوی کو ایسا ہی ماحول فراہم کرے جیسے میں وہ پلی بڑھی ہے۔

اور یہیں سے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ ہمارے فقہاء نے اختلاف ماحول نہ ہونے کو کفاءت کے امور میں سے کیوں نہیں قرار دیا؟ حتی کہ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ دیہاتی شہری کا کفوء ہوگا[4] تو موجودہ دور میں وہ ملکوں کے اختلاف کو فقدان کفاءت کے اسباب میں سے کیسے شمار کرتے ہیں؟!

ہم کہتے ہیں کہ ہم اس کا اعتبار کرتے ہیں، جب دونوں ملکوں کے احوال میں بہت زیادہ فرق ہوگا، مثلاً ہندوستان اور برطانیہ کا اختلاف، ایک تو سائنٹیفک اور ٹیکنالوجیکل ترقی کی وجہ سے اور دوسرے اس وجہ سے بھی کہ برطانیہ کی روایات اور احوال اسلامی اور مشرقی ملکوں کے احوال سے عموماً مختلف ہیں۔

لیکن اگر یہ صورت ہو کہ دونوں ملک احوال و ظروف، معاشی معیار، تعلیم کے فروغ اور حاصل کئے جانے والے علوم کی نوعیت میں ایک دوسرے سے قریب ہوں تو اس اختلاف مکان کو اختلاف کفاءت کے اسباب میں سے نہیں مانا جائے گا، جیسا کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی حالت ہے۔

جو اختلاف ہمارے فقہاء نے ذکر کیا ہے وہ ان کے زمانہ کی رائج صورت حال کی ترجمانی کرتا ہے، جہاں شہر اور گاؤں میں کوئی بہت بڑا فرق نہیں ہوتا تھا، پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ انہوں نے گاؤں اور شہر پر دار الاسلام کے ضمن میں گفتگو کی ہے، دار الکفر اور دار الاسلام کے اختلاف کے بارے میں انہوں نے گفتگو نہیں کی ہے۔

[1] المبسوط السرخسی جلد ۵۔

[2] الدر المختار ۳ر۹۰، ۹۲۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسے البزازی نے بھی ذکر کیا ہے اور کمال نے پسند کیا ہے۔

[3] دیکھئے: صفحات ۹، ۱۰۔

[4] دیکھئے: شرح فتح القدیر للسیوطی جلد ۳ رص ۲۹۸۔

## نتائج بحث:

چونکہ کفاءت کا موضوع ان موضوعات میں سے ہے، جن کا زیادہ تر دار و مدار عرف پر ہوتا ہے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا اور احکام پر عرف کے اثر کا ذکر کیا اور یہ کہ بہت سے احکام اعراف کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں، اس لئے وہ عورت جو مغربی ملک میں پیدا ہوئی اور وہیں رہی، تیسری دنیا کا آدمی اس کا کفوء نہیں ہوگا۔

کیونکہ کفاءت میں جس چیز کا ہے وہ اعتبار لڑکی اور اس کے کنبہ سے عار اور حرج کو دفع کرنا ہے تا کہ اس ملک کے عرف کی وجہ سے جہاں وہ رہ رہی ہے، اسے عار نہ دلائی جائے اور اس آدمی سے شادی کے باعث اس کی تحقیر نہ ہو، کیونکہ کفاءت لڑکی ہی کے لئے مشروع کی گئی ہے، تو اگر اس آدمی نے شادی اس کے سماج کے مطابق اس کے لئے عار کا باعث بنے اور شوہر دوسروں کے تمسخر کا نشانہ بن جائے، تو وہ اس کا کفوء نہیں ہوگا۔

امور کفاءت کے اختیار کرنے کی بعض صورتوں کے جواز کے لئے امام محمدؒ کا یہ قول نقل کیا جاتا ہے: ''لا تعتبر الديانة، لأنها من أمور الآخرة فلا تبنى أحكام الدنيا عليه إلا إذا كان يصفع، ويسخر منه، أو يخرج إلى الأسواق سكرانا، ويلعب به الصبيان، لأنه مستخف به''[1] (دیانت کا اعتبار نہیں ہوگا، کیونکہ یہ آخرت کے امور میں سے ہے، لہٰذا اس پر دنیا کے احکام کی بنا نہیں رکھی جائے گی الا یہ کہ اسے تھپڑ رسید کیا جاتا ہو اور اس کا مذاق اڑایا جاتا ہو یا وہ نشہ کی حالت میں بازاروں میں نکلتا ہو اور بچے اس سے کھیلتے ہوں، کیونکہ ان صورتوں میں اس کا استخفاف کیا جاتا ہے)۔ یہ قول اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے کہ امام محمد دینداری کو امور کفاءت میں سے اس لئے شمار نہیں کرتے کہ وہ آخرت کے امور میں سے ہے، ہاں کفاءت معتبر ہوگی اگر شوہر دوسروں کے تمسخر کا نشانہ بن جائے۔

اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ کفاءت کی غرض وغایت ازدواجی تعلق کی پائیداری واستواری ہے اور ایسے خاندان کی تشکیل ہے جو مودت ورحمت پر مبنی ہو، اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو شارع کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ومن آياته أن خلق لكم من أنفسكم أزواجا لتسكنوا إليها وجعل بينكم مودة ورحمة إن في ذلك لآيات لقوم يتفكرون''[2]۔

اور احکام اگرچہ علتوں سے مربوط ہوتے ہیں لیکن ان کی اصل حکمتیں ہیں، جن کے عدم انضباط کی وجہ سے اور علتوں کے انضباط کے باعث شارع نے حکمتوں سے عدول کر لیا ہے، لیکن اس باب میں حکمتیں بھی علتوں ہی کی طرح ہیں۔



---

[1] البحر الرائق ۳/۱۴۱۔ اسی مفہوم میں الہدایہ شرح البدایہ کے مؤلف نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

[2] (۲) سورۂ روم/۲۱۔

# جبری شادی

مفتی محمد صدر عالم قاسمی
ادارہ محکمہ شرعیہ، بدزینہ، نہرا، دربھنگہ

۱، ۲- چونکہ معاملہ نکاح میں اکراہ مؤثر نہیں ہے، اس لئے لڑکی کے اپنی زبان سے الفاظ قبولیت ادا کردینے کے بعد خواہ جبراً ہی کیوں نہ ہو، اسے رضا تسلیم کیا جائے گا، اور نکاح منعقد ہوجائے گا۔ بدائع الصنائع میں ہے:

''التصرفات الشرعية فى الأصل نوعان: إنشاء و اقرار والإنشاء نوعان: نوع لا يحتمل الفسخ ونوع يحتمله. أما الذي لا يحتمل الفسخ: الطلاق والعتاق والرجعة والنكاح واليمين والنذر والظهار والإيلاء والفيء في الايلاء والتدبير والعفوعن القصاص، وهذه التصرفات جائزة مع الإكراه عندنا. وعند الشافعي رحمه الله لا تجوز''[1]۔

(تصرفات شرعیہ کی اصل میں دو قسمیں ہیں: انشاء اور اقرار، اور انشاء کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم ایسی ہے جس میں فسخ کا احتمال نہیں ہوتا ہے، اور ایک قسم ایسی ہے جس میں فسخ کا احتمال ہوتا ہے۔ جن تصرفات میں فسخ کا احتمال نہیں وہ یہ ہیں: طلاق، عتاق، رجعت، نکاح، یمین، نذر ظہار، ایلاء، فئ فی الایلاء، تدبیر، اور قصاص سے معافی۔ یہ تصرفات اکراہ کے باوجود ہمارے نزدیک جائز ہیں اور امام شافعیؒ کے نزدیک ناجائز)۔

۳، ۴- قبولیت نکاح کے بعد بصورت اکراہ ہی سہی اگر میاں بیوی کے درمیان زن وشوئی تعلقات قائم ہوجاتے ہیں تو چونکہ یہ اس کی رضا ہے اس لئے اس کا حق تفریق ختم ہوجائے گا اور اگر لڑکی الفاظ قبولیت کی ادائیگی بعد بھی پہلے ہی کی طرح انکار کرتی رہے، حتی کہ زن وشوئی تعلقات تک کی نوبت نہ آئے تو یہ اس کی حقیقی عدم رضا کی دلیل ہے، اس کو حق تفریق حاصل ہوگا، چونکہ عاقلہ بالغہ اپنے معاملے میں صاحب اختیار ہوتی ہے اس لئے کسی کا جبر اس پر درست نہیں، لہذا اس کے باپ کی حیثیت اس معاملے میں باپ کی نہیں رہی بلکہ وہ دیگر اولیاء کے مثل ہوگیا اور صغیرہ کے سلسلے میں یہ مسئلہ ہے کہ اگر اس کا نکاح باپ دادا کے علاوہ دیگر اولیاء نے غیر کفو میں کردیا تو اس کو بعد بلوغ حق تفریق ملتا ہے، تو جب صغیرہ جس کو اپنے نفس پر کوئی اختیار نہیں تھا اس کو حق مل رہا ہے تو بالغہ کو تو اکراہ کی صورت میں بدرجہ اولی یہ حق ملنا چاہئے، کیونکہ باپ نے اس کے شرعی اختیار کو پامال کیا ہے[2]۔

۵- اس صورت میں قاضی یا شرعی کونسل کو نکاح فسخ کردینا چاہئے، کیونکہ یہ نکاح کے مقاصد اور مصالح کا تقاضا ہے۔

☆☆☆

[1] بدائع الصنائع ۶ / ۱۹۳۔
[2] بدائع الصنائع ۶ / ۱۹۸۔

# جبری شادی

مولانا خورشید انور اعظمی

جامعہ مظہر العلوم، وارانسی

اسلامی شریعت نے عاقلہ بالغہ خاتون کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی شادی از خود کر سکتی ہے۔ اگر کوئی ولی اس کی شادی کرتا ہے تو اس کے لئے لازم اور ضروری ہے کہ اس سلسلے میں اس خاتون سے اجازت حاصل کرے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح الفاظ میں اس کی تاکید فرمائی ہے، ارشاد نبوی ہے:

''الأيم أحق بنفسها من وليها والبكر تستأذن في نفسها وإذنها صماتها''[1] (ثیبہ اپنی ذات کی اپنے ولی سے زیادہ حق دار ہے۔ باکرہ سے اس کے بارے میں اجازت لی جائے گی اور اس کی اجازت اس کا سکوت ہے)۔

دوسری روایت میں ہے: ''الثيب أحق بنفسها من وليها والبكر يستأذن بها أبوها في نفسها وإذنها صماتها''[2] (ثیبہ اپنی شادی کی اپنے ولی سے زیادہ حق دار ہے اور باکرہ سے اس کے بارے میں اس کے والد اجازت لیں گے، اور اس کی اجازت اس کا سکوت ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خنساء بنت خذام کا نکاح محض اس بنا پر فسخ فرما دیا تھا کہ ان کے والد نے ان کی مرضی کے برخلاف ان کا عقد کر دیا تھا[3]، نیز اسی طرح کی صورت حال میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک باکرہ لڑکی کو اپنے نکاح کے باقی رکھنے اور اس کے فسخ کرنے کا اختیار دیا[4]۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی عورت کو جبر واکراہ کے ذریعہ نکاح کی اجازت دینے پر مجبور کیا گیا اور اس نے دباؤ کو قبول کرتے ہوئے زبان سے اجازت دے دی تو وہ نکاح صحیح ہو جائے گا، اس وجہ سے کہ نکاح وطلاق انسانوں کے ان تصرفات میں سے ہیں جو اکراہ کے باوجود نافذ ہوا کرتے ہیں۔ ''نور الانوار'' میں ہے:

''فإن كان القول مما لا ينفسخ ولا يتوقف على الرضا لم يبطل بالكره كالطلاق ونحوه من العتاق والنكاح ... فإن هذه التصرفات كلها لا تحتمل الفسخ ولا تتوقف على الرضاء فلو أكره بها أحد وتكلم بها لم يبطل بالكره و تنفذ على المكره''[5] (اگر ایسا قول ہو کہ نہ فسخ ہوتا ہو اور نہ رضا پر موقوف ہوتا ہو تو وہ جبر واکراہ سے باطل نہیں ہوگا جیسے طلاق، عتاق، نکاح وغیرہ، اس وجہ سے کہ یہ تمام تصرفات احتمال فسخ نہیں رکھتے اور نہ رضا پر موقوف ہوتے ہیں، لہذا اگر کسی کو ان چیزوں پر مجبور کیا گیا اور اس نے زبان سے انہیں کہہ دیا تو اکراہ کے سبب یہ باطل نہیں ہوں گے اور مکرہ پر نافذ ہو جائیں گے)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک عہد میں بھی اس طرح کی مثالیں موجود ہیں کہ اکراہ کے باوصف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمین وطلاق کو صحیح اور نافذ مانا ہے، چنانچہ حضرت حذیفہ بن یمان کی حدیث میں ہے کہ ''جب مشرکین نے انہیں گرفتار کیا اور یہ قسم لی کہ وہ غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ نہیں دیں گے تو انہوں نے دباؤ میں آکر جبراً وقہراً قسم کھالی اور آکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان کا وعدہ پورا کرو، ہم ان کے خلاف اللہ تعالی سے مدد طلب

[1] صحیح مسلم ۱/۴۵۵۔

[2] حوالہ سابق۔

[3] صحیح بخاری ۲/۷۷۱۔

[4] ابوداؤد ۱/۲۸۵۔

[5] نور الانوار ص ۲۱۳۔

کریں گے''[1]۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یمین طوعاً و کرہاً دونوں کا حکم یکساں ہوتا ہے۔ اس طرح حالت اکراہ میں دی گئی طلاق کے تعلق سے ''نصب الرایہ للزیلعی'' میں صفوان بن غزوان کی ایک روایت ہے:

''إن رجلا كان نائما فقامت امرأته فأخذت سكينا فجلست على صدره فوضعت السكين على حلقه فقالت لتطلقني ثلاثا أو لأذبحنك، فناشدها الله فأبت فطلقها ثلاثا ثم أتى النبي ﷺ فذكر له ذلك فقال: لا قيلولة في الطلاق''[2] (ایک آدمی سویا ہوا تھا کہ اس کی عورت اٹھی اور ایک چھری لے کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھی اور اس کے حلق پر چھری رکھ کر بولی: یا تو مجھے تین طلاق دے دے یا پھر میں تمہیں ذبح کردوں گی، آدمی نے اسے اللہ کا واسطہ دیا مگر اس نے ایک نہ سنی، بالآخر اس آدمی نے اسے تین طلاق دے دی پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: طلاق میں فسخ نہیں ہے)۔

نیز یہ پہلو بھی قابل غور اور نہایت اہم ہے کہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''ثلاث جدهن جد وهزلهن جد: النكاح والطلاق والرجعة''[3] (تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا قصد بھی قصد اور ہنسی مذاق بھی قصد ہوتا ہے، یہ نکاح، طلاق اور رجعت ہیں) اس سے یہ بات عیاں ہے کہ نکاح ہنسی مذاق کے طور پر بھی منعقد ہوجاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہل علم کا طلاق ہازل کے واقع ہونے پر اتفاق ہے۔ ''مرقاۃ المفاتیح'' میں ہے:

''قال القاضي: اتفق أهل العلم أن طلاق الهازل يقع''[4] (قاضی نے کہا: اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہازل کی طلاق واقع ہوتی ہے)۔

جب ہازل کی طلاق کو تسلیم کیا جارہا ہے تو مکرہ کے تصرفات طلاق و نکاح کو بھی تسلیم کرنا اس لئے ضروری ہوگا کہ دونوں کی صورت حال یکساں ہے کہ دونوں نے اپنے اختیار سے ایسے الفاظ کہے جن کے حکم سے وہ راضی نہیں ہیں، لہذا حکماً دونوں ایک درجے میں ہوئے، چنانچہ اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ملا علی قاری رقم طراز ہیں:

''وكذلك المكره مختار في التكلم اختيارا كاملا في السبب إلا أنه غير راض بحكمه. لأنه عرف الشرين فاختار أهونهما عليه غير أنه محمول على اختياره ذلك ولا تاثير لهذا في نفي الحكم''[5] (اسی طرح مکرہ سبب کے تعلق سے اپنی بات کہنے میں پورے طور پر با اختیار ہے مگر یہ کہ وہ اس کے حکم سے راضی نہیں ہے، اس وجہ سے کہ اس کے پیش نظر دو خرابیاں ہیں، جن میں سے اس نے اپنے لئے آسان ترین کو اختیار کیا ہے، سوائے اس کے کہ وہ اس کے اختیار کرنے پر مجبور ہے اور اس جبر کا نفی حکم میں کوئی اثر نہیں ہوتا)۔

اسی وجہ سے فقہائے حنفیہ کا ضابطہ ہے کہ جو چیز ''ہزل'' کے ساتھ صحیح ہوگی وہ اکراہ کے ساتھ بھی صحیح ہوگی۔ درمختار میں ہے:

''والأصل عندنا أن كل ما يصح مع الهزل يصح مع الإكراه، لأن ما يصح مع الهزل لا يحتمل الفسخ وكل ما لا يحتمل الفسخ لا يؤثر فيه الإكراه''[6] (ہمارے نزدیک اصل یہ ہے کہ ہر وہ شئ جو ہزل کے ساتھ صحیح ہوتی ہے اکراہ کے ساتھ بھی صحیح ہوتی ہے، اس وجہ سے کہ جو شئ ہزل کے ساتھ صحیح ہوتی ہے اس میں احتمال فسخ نہیں ہوتا اور ہر وہ شئ جس میں احتمال فسخ نہیں ہوتا، اس میں اکراہ اثر انداز نہیں ہوتا)۔

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں دیکھا جائے تو سوالنامہ کے جواب کی یہ نوعیت بنتی ہے کہ:

۱- اگر کسی عورت کو دباؤ ڈال کر، مارنے پیٹنے کی دھمکی دے کر یا جبر و اکراہ کے کسی اور ذریعہ سے نکاح کی اجازت دینے پر مجبور کیا گیا اور اس نے اس کے لئے ہاں کرلیا تو نکاح ہوجائے گا، ''البحر الرائق'' میں ''المبسوط'' کے حوالے سے مرقوم ہے:

---

[1] الفقہ الاسلامی وادلتہ ۳/ ۴۴۵۲، نصب الرایہ ۳/ ۲۲۳۔

[2] نصب الرایہ ۳/ ۲۲۲۔

[3] سنن ترمذی ۱/ ۱۴۲۔

[4] مرقاۃ المفاتیح ۶/ ۲۸۷، بذل المجہود ۱۰/ ۲۸۶۔

[5] مرقاۃ المفاتیح ۶/ ۲۸۸۔

[6] الدر المختار ۹/ ۱۹۱۔

''وكل تصرف يصح مع الهزل كالطلاق والعتاق والنكاح يصح مع الإكراه''[۱] (ہر وہ تصرف جو ہزل کے ساتھ صحیح ہوتا ہے مثلاً طلاق، عتاق، نکاح وہ اکراہ کے ساتھ بھی صحیح ہوتا ہے)۔

بدائع الصنائع میں ہے: ''التصرفات الشرعية في الأصل نوعان: إنشاء وإقرار، والإنشاء نوعان: نوع لا يحتمل الفسخ ونوع يحتمله، أما الذي لا يحتمل الفسخ فالطلاق والعتاق والرجعة والنكاح... وهذه التصرفات جائزة مع الإكراه عندنا وعند الشافعي لا تجوز''[۲] (شرعی تصرفات کی دراصل دو قسمیں ہیں: انشاء و اقرار، انشاء کی دو قسمیں ہیں: ایک جس میں احتمال فسخ نہ ہو، دوسری جس میں احتمال فسخ ہو جس میں احتمال فسخ نہیں ہوتا وہ طلاق، عتاق، رجعت اور نکاح وغیرہ ہیں...... اور یہ تصرفات ہمارے نزدیک اکراہ کے ساتھ جائز ہیں اور امام شافعی کے یہاں جائز نہیں ہیں)۔

۲- یہ سچ ہے کہ عاقلہ بالغہ لڑکی کو اپنی شادی کرنے کا پورا پورا حق ہے اور ولی کو قطعاً اجازت نہیں ہے کہ اس سلسلے میں جبر و اکراہ کا معاملہ کرے، تاہم اگر ولی نے دھوکہ سے یا دھمکی دے کر یا کسی اور طرح کے دباؤ کے ذریعہ لڑکی سے بوقت نکاح ہاں کہلوالیا تو یہ اذن مانا جائے گا اور نکاح صحیح ہوگا۔

ردالمحتار میں ہے: ''إذ حقيقة الرضا غير مشروطة في النكاح لصحته مع الإكراه والهزل... بل عباراتهم مطلقة في أن نكاح المكره صحيح كطلاقه وعتقه مما يصح مع الهزل ولفظ المكره شامل للرجل والمرأة''[۳] (کیونکہ نکاح میں حقیقت رضا کی شرط نہیں ہے، اس وجہ سے کہ وہ اکراہ اور ہزل کے ساتھ بھی صحیح ہوتا ہے...... بلکہ فقہاء کی عبارتیں اس سلسلے میں مطلق ہیں کہ مکرہ کا نکاح صحیح ہے جیسے اس کی طلاق وعتق کہ یہ ان امور میں سے ہیں جو ہزل کے ساتھ صحیح ہوتے ہیں، اور لفظ مکرہ مرد وزن دونوں کو عام ہے)۔

نیز علامہ شامی نے حاکم شہید کی ''الکافی'' کتاب الاکراہ کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ ولی کا اکراہ کے ساتھ کیا ہوا نکاح بھی منعقد ہو جاتا ہے[۴]۔

اسی طرح حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانیؒ کا فتوی بھی فتاوی دار العلوم میں موجود ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''زبردستی کر کے اور زدوکوب کر کے لڑکی بالغہ سے ایجاب یا قبول کرالینے سے بھی نکاح منعقد ہو جاتا ہے''[۵]۔

''القروي كفء للمدني فلا عبرة بالبلد أي بعد وجود ما مر من أنواع الكفاءة''[۶] (دیہاتی آدمی شہری کا کفو ہے، لہذا کفاءت کی بیان کردہ انواع کے پائے جانے کے بعد شہر کا اعتبار نہیں ہوگا)۔

اسی طرح علامہ شامی نے ''البحر الرائق'' کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے: ''فالتاجر في القرى كفء لبنت التاجر في المصر للتقارب'' (دیہاتی تاجر شہری تاجر کی بیٹی کا کفو ہے، دونوں میں باہمی قربت کے سبب)۔

لہذا ایک ہندوستانی لڑکا، برطانیہ نژاد لڑکی کا کفو ہوگا، اور دونوں کے درمیان عقد نکاح صحیح ہوگا اور لڑکی کے لئے اس بنیاد پر تفریق کا مطالبہ کرنا صحیح نہ ہوگا۔

۴- یہ حکم عام ہے، خواہ زوجین کے درمیان زن وشوئی کے تعلقات قائم ہو چکے ہوں یا اس کی نوبت ابھی تک نہ آئی ہو۔

۵- قاضی اس نکاح کو فسخ نہیں کرسکتا ہے، باوجودیکہ یہ طے شدہ ہے کہ عورت کو مجبور کر کے ہاں کہلوایا گیا ہے۔

☆☆☆

[۱] البحر الرائق ۸/ ۷۵۔
[۲] بدائع الصنائع ۷/ ۱۸۲۔
[۳] ردالمحتار ۲/ ۴۹۲، ۵۹۲۔
[۴] ردالمحتار ۲/ ۵۹۲۔
[۵] فتاوی دار العلوم ۷/ ۶۸۔
[۶] ردالمحتار ۲/ ۱۵۳۔

# جبری نکاح

مولانا محمد ظفر عالم ندوی
دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱- حنفیہ کے یہاں رضامندی کے لئے حقیقی رضا ضروری نہیں بلکہ اگر ظاہری طور پر زبان سے رضامندی کا اظہار ہوجائے تو انعقاد نکاح کے لئے کافی ہے[۱]۔

ڈاکٹر مصطفی احمد زرقاء نے ''المدخل الفقہی العام'' جلد اول میں اس موضوع پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حنفیہ کے یہاں جس طرح حالت اکراہ کی طلاق واقع ہوجاتی ہے، اسی طرح نکاح بھی منعقد ہوجاتا ہے:

ایک بات قابل غور یہ بھی ہے کہ شریعت نے اولیاء کو جو ولایت سونپی ہے بلاشبہ اس کی بنیاد شفقت اور لڑکی کے مفادات کی رعایت وحفاظت پر ہے، اس لئے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ اولیاء شفقت اور مفادات کے خلاف کوئی اقدام کریں، لڑکی کا راضی نہ ہونا یا اولیاء کے فیصلہ کے خلاف جذبہ کا ہونا یہ لڑکی کی عقل اور فہم کی کمی ہے، اس لئے اس کی اس عقل وفہم پر اولیاء کے فیصلہ کو ترجیح دینا ہی لڑکی کے مفاد میں ہے، لہٰذا لڑکی کو ڈرا دھمکا کر یا زدوکوب کرکے یا نفسیاتی دباؤ میں ڈال کر یا پاسپورٹ ضائع کردینے کی دھمکی دے کر اس سے نکاح کے لئے جو ہاں کہلوایا گیا ہو، گو کہ وہ دل سے راضی نہ ہو، انعقاد نکاح میں جو رضامندی مطلوب ہے اس میں یہ شامل ہے اور نکاح ہوجائے گا۔

۲- حقیقی رضا اور اذن پر انعقاد نکاح کی بنیاد نہیں ہے بلکہ زبان سے اذن ورضا انعقاد نکاح کے لئے کافی ہے جیسا کہ سوال نمبر ۱ میں تفصیل گذر چکی ہے۔

۳- بلاشبہ برطانیہ اور ہندوستان کی معاشرت میں کافی فرق ہے اور اس معاشرتی فرق کی وجہ سے فریقین کے درمیان بے میل کا رشتہ کہلائے گا، لیکن عدم کفاءت کی بناء پر فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق اس صورت میں اولیاء کو ہوتا ہے، جب لڑکی نے اولیاء کی اجازت کے بغیر اپنا نکاح غیر کفو میں کرلیا ہو۔ اس کا مقصد اولیاء کے مفادات کا تحفظ اور معاشرے میں ان کو ننگ وعار سے بچانا ہے۔ اگر لڑکی اپنے اس نکاح میں ناہمواری محسوس کررہی ہے تو اسے خلع حاصل کرلینے کا حق موجود ہے، اس لئے وہ اس کو استعمال کرے۔

۴- میرے خیال میں جبری نکاح میں زن وشو کے تعلقات قائم ہوں یا نہ ہوں، دونوں صورتیں یکساں ہیں، ہاں غیر کفو میں جس میں کہ اولیاء کو حق فسخ حاصل ہوتا ہے، زن وشو کے تعلقات کا فرق ہوتا ہے۔ اگر زوجین کے درمیان تعلقات قائم ہوگئے ہیں تو اس صورت میں اولیاء کا حق فسخ جاتا رہتا ہے، جیسا کہ فقہی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے۔

۵- ناچیز کے خیال میں فسخ وتفریق کی بنیاد ضرر ہے، اگر اس نکاح سے لڑکی کو واقعی کوئی ضرر لاحق ہوا ہو اور اس کے مفادات متاثر ہورہے ہوں تو جس طرح فسخ نکاح کی دیگر بنیادوں اور اسباب میں ضرر کو سامنے رکھتے ہوئے فسخ کا حکم لگایا جاتا ہے اسی طرح یہاں بھی "الضرر یزال" (ضرر کا ازالہ کیا جائے گا) کے قاعدۂ شرعی کے تحت یہ حکم جاری ہونا چاہئے۔

☆☆☆

---

[۱] رد المحتار ۳/ ۱۲، المدخل الفقہی العام ۱/ ۳۶۴، ۲/ ۳۷۲، ۳۷۳۔

# جبری شادی

مولانا ابوسفیان مفتاحی

جامعہ عربیہ مفتاح العلوم، مئو

۱- چونکہ عاقلہ بالغہ لڑکی کے نکاح میں شریعت نے اس کی رضامندی کو بہت اہمیت دی ہے جیسا کہ احادیث نبویہ ﷺ سے واضح بھی ہے کہ عاقلہ بالغہ لڑکی اپنے نکاح میں خود مختار ہے، اسے کوئی شخص بھی نکاح پر مجبور نہیں کرسکتا اور اس کی اجازت ورضامندی کے بغیر اس کی طرف سے کسی شخص نے نکاح قبول کرلیا تو یہ نکاح شرعا درست نہیں، غرضیکہ عاقلہ بالغہ لڑکی جب تک خود قبول نہ کرے یا کسی کو اپنا وکیل نہ بنائے اس وقت تک اس کا نکاح صحیح نہیں ہوگا، بنابریں یہ صورت اس کی رضامندی میں شامل نہ ہوگی، اور اس طرح کیا ہوا نکاح صحیح نہ ہوگا، کیونکہ اس طرح ڈرا دھمکا کر جبری شادی کردینا لڑکی کے والدین یا دیگر اولیاء کی محبت و شفقت کے شرعا منافی ہے اور لڑکی کی زندگی کے ساتھ ایک کھلواڑ کرنا ہے [۱]۔

''ولا تجبر البالغة البكر على النكاح لا نقطاع الولاية بالبلوغ''۔

۲- یہ اس کی رضا اور حقیقی اذن شرعا تسلیم نہیں کیا جائے گا، اور اس طرح نکاح کا انعقاد نہ ہوگا۔

ہاں عاقلہ بالغہ عورت کے لئے مستحب ہے کہ وہ اپنے معاملہ نکاح کو اپنے ولی کے حوالہ کردے تاکہ بے حیائی کا دھبہ نہ لگے اور امام شافعیؒ کے اختلاف سے بچا جا سکے [۲]۔

۳- برطانیہ کے ماحول میں رہنے والی لڑکی اور ہندوستان میں پرورش پانے والے لڑکے کے درمیان ٹھیک ہے کہ معاشرتی فرق ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ معاشرتی فرق کی وجہ سے یہ شادیاں بے جوڑ تصور کی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود کفو کی شرط کے ساتھ اگر لڑکی اس شادی پر دل سے راضی ہے تو یہ شادی شرعا درست ہے، لہذا اس صورت میں لڑکی کو یہ دعوی کرنے کا ہرگز حق نہیں ہے کہ میری شادی جس شخص سے کی جارہی ہے وہ میرا کفو نہیں ہے اور بربناء کفاءت اسے حق تفریق بھی حاصل نہیں ہے، کیونکہ کفاءت میں اختلاف ملک اور اختلاف شہر و دیہات کا اعتبار نہیں ہے، شرعا تو اس اختلاف ملک اور فرق معاشرہ کی بنیاد پر انعقاد نکاح متاثر نہ ہوگا [۳]۔

۴- اوپر جس قسم کے نکاح کا ذکر ہوا ہے اس کے بعد دونوں کے درمیان زن وشوئی کے تعلقات قائم رہتے ہیں تو اچھی بات ہے اور اس نکاح کو قائم رہنے دینا چاہئے، کیونکہ اس نکاح کو فسخ کردینا مضر ہوسکتا ہے، اور اگر زن وشوئی کے تعلقات قائم ہونے کی نوبت نہیں آئی تو اس صورت میں حتی المقدور صلح اور اصلاح اور گذارے کی شکل کی کوشش کرنی چاہئے، اس پر ناکامی کی صورت میں تفریق کی صورت اختیار کی جائے جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالی نے قرآن کریم میں اس کا حل خود بیان فرمایا ہے:

''وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما إن الله كان عليماً خبيرا'' [۴] (اگر تم ڈرو کہ وہ آپس میں ضد رکھتے ہیں تو کھڑا کرو ایک منصف مرد کے خاندان سے اور ایک منصف عورت کے خاندان سے، اگر یہ دونوں چاہیں گے کہ صلح کرادیں تو اللہ موافقت کردے گا ان دونوں میں بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں دونوں کا حکم الگ الگ ہے، دونوں صورتوں میں تحریر مذکور کے مطابق عمل کیا جائے کہ اسی میں فلاح مضمر ہے۔

۵- شرعی کونسل یا قاضی کے پاس فسخ نکاح کا دعوی پیش کئے جانے کے بعد قاضی یا شرعی کونسل اس نکاح کو فسخ کرسکتے ہیں۔

[۱] درمختار وشامی ۲/ ۳۲۴۔

[۲] درمختار وشامی ۲/ ۳۲۱۔

[۳] درمختار وشامی ۲/ ۳۵۱۔

[۴] سورۂ نساء/ ۳۵۔

☆☆☆

# نکاح میں لڑکی کی پسند

مولانا ظفر الاسلام الاعظمی...... پرنسپل وشیخ الحدیث دار العلوم مئو

۱- ''إن جارية بكرا أتت رسول الله ﷺ فذكرت أن أباها زوّجها وهي كارهة فخيرها رسول الله ﷺ''۔ (ایک کنواری عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے ذکر کیا کہ اس کے باپ نے اس کی شادی کرادی ہے اور وہ اسے ناپسند کرتی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اختیار دیا)۔

''وحجتنا في ذلك حديث أبي هريرة وأبي موسى الأشعري أن النبي ﷺ رد نكاح بكر زوّجها أبوها وهي كارهة''[1] (ایک کنواری عورت کے نکاح کو جس کی شادی اس کے باپ نے کرادی تھی اور وہ اسے ناپسند تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رد فرما دیا)۔

''والدليل عليه حديث الخنساء، فإنها جاءت إلى النبي ﷺ فقالت: إن أبي زوّجني من ابن أخيه وأنا لذلك كارهة فقال: أجيزي ماصنع أبوك، فقالت: مالي رغبة فيما صنع أبي... ولكني أردت أن يعلم النساء أن ليس للآباء من أمور بناتهم شئ ولم ينكر عليها رسول الله ﷺ مقالتها''[2] (اس کی دلیل حضرت خنساء کی یہ حدیث ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور انہوں نے کہا کہ میرے والد نے اپنے بھتیجہ سے میری شادی کرادی ہے اور میں اسے ناپسند کرتی ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اسے برقرار رکھو جو تمہارے والد نے کردیا تو انہوں نے کہا کہ مجھے اپنے والد کے انجام دیئے ہوئے کام سے کوئی دلچسپی نہیں، میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ عورتوں کو معلوم ہوجائے کہ باپوں کو اپنی بیٹیوں کے سلسلے میں کچھ اختیار نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس بات کو ناپسند نہیں فرمایا)۔

''الأيم أحق بنفسها من وليها'' (شوہر دیدہ عورت اپنی ذات کی اپنے ولی سے زیادہ حق دار ہے)۔

مذکورہ تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء کو مجبور نہیں کرنا چاہئے۔ یہی امام ابوحنیفہؒ، امام ثوریؒ، امام اوزاعیؒ اور قاضی ابوثور اور ایک جماعت کا مذہب ہے[3]۔

۲- اگر بجبر و اکراہ ہی سہی لڑکی ایجاب یا قبول کرتی ہے تو اس صورت میں نکاح ہوجائے گا۔ ''إن نكاح المكره صحيح... ولفظ المكره شامل للرجل والمرأة''[4] (مکرہ (جس کو مجبور کیا جائے) کا نکاح صحیح ہے...... اور لفظ مکرہ میں مرد وعورت دونوں شامل ہیں)۔

لیکن انگوٹھے لگوالینے اور دستخط کرالینے سے نکاح نہ ہوگا، جیسا کہ خیر الفتاوی ۴ / ۲۵۷ پر ایک سوال کے جواب میں مرقوم ہے: ''صرف انگوٹھا لگانا نکاح نہیں ہے''۔

۳- چونکہ کفاءت بیوی اور اس کے اولیاء دونوں کا حق ہے جیسا کہ درمختار ۲ / ۳۱۷ پر تحریر ہے، اس لئے اس طرح کی بے جوڑ شادیوں پر عورت تفریق کا دعوی کرسکتی ہے۔

۴- اگر لڑکی نے جبراً ہی سہی ایجاب یا قبول کرلیا تو یہ نکاح صحیح ہوگیا اور وطی سے قبل طلاق دینے پر نصف مہر لازم ہوگا۔

اہل ظاہر کا بھی یہی مذہب ہے۔

لیکن اگر دخول ہوگیا تو پورا مہر لازم ہوگا اور قاضی کے ذریعہ فسخ کرانا ہوگا، لیکن اگر صرف دستخط کردیا یا نشان انگوٹھا لگادیا تو عاجز کے نزدیک سرے سے یہ نکاح ہی نہ ہونا چاہئے جیسا کہ پہلے مذکور ہوا، اس لئے اس میں تفریق کی ضرورت نہیں۔

۵- وہ دلائل جو اوپر مذکور ہیں ان کی روشنی میں سمجھ میں آتا ہے کہ قاضی یا شرعی کونسل پورے طور پر مطمئن ہونے کے بعد اس نکاح کو فسخ کرسکتی ہے۔

[1] مبسوط للسرخسی ۵ / ۲۔

[2] حوالہ سابق۔

[3] بدایۃ المجتہد ۲ / ۶، ۱۷، نیز دیکھئے: فتح القدیر مع ہدایہ ۲ / ۳۸۳، فتاوی دار العلوم دیوبند ۸ / ۳۷۔

[4] شامی ۲ / ۲۷۱ طبع بیروت۔

☆☆☆

# نکاح میں لڑکی کی پسند کی رعایت

اسلامی اصول کی روشنی میں

مولانا ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی

جامعۃ القرآن اکبر باغ، حیدرآباد

## ۱- نکاح میں عاقلہ بالغہ لڑکی کی رضامندی کی اہمیت:

اسلام نے عاقل بالغ لڑکی کو شادی کے معاملہ میں اس کی پسند اور ناپسند کا اختیار دیا ہے اور اس کی اجازت اور اس کی رضامندی کو ضروری قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

''الثيب أحق بنفسها من وليها، والبكر تستأذن في نفسها وإذنها صماتها''[۱] (شادی شدہ عورت ولی کے مقابلہ میں اپنے آپ کی زیادہ ذمہ دار ہے، اور غیر شادی شدہ لڑکی سے اس کے نکاح کی بابت اجازت لی جائے اور اس کی اجازت اس کی خاموشی ہے)۔

لہٰذا اگر کنواری لڑکی بھی کسی لڑکے سے شادی کرنے سے انکار کردے، تو زبردستی اس کا نکاح کرانا جائز نہیں ہوگا۔ ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''اليتيمة تستأمر في نفسها فإن صمتت فهو إذنها، وإن أبت فلا جواز عليها''[۲] (کنواری لڑکی سے اس کے نکاح کے بارے میں اس کی رائے معلوم کی جائے، اگر وہ خاموش رہے تو اس کی اجازت سمجھی جائے گی، اگر وہ انکار کردے تو اس کی مرضی کے خلاف (نکاح) کرنا بھی جائز نہیں)۔

چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک لڑکی کی شادی اس کے باپ نے اس کی ناپسندیدگی کے باوجود کردی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا:

''إن جارية بكرا أتت النبي ﷺ فذكرت أن أباها زوّجها وهي كارهة، فخيّرها النبي ﷺ (ایک کنواری لڑکی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے بتایا کہ اس کے باپ نے اس کی ناپسندیدگی کے باوجود اس کی شادی کردی ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اختیار دیا)[۳]۔

بلوغ المرام کے شارح علامہ محمد بن اسماعیل صنعانی (م: ۱۱۸۲ھ) اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

''وهذا الحديث أفاد ما أفاده، فدل على تحريم إجبار الأب لابنته البكر على النكاح وغيره من الأولياء بالأولى. وإلى عدم جواز إجبار الأب ذهبت الهادوية والحنفية''[۴] (یہ حدیث باپ کے اپنی کنواری بیٹی کو نکاح پر مجبور کرنے کی حرمت کو بتاتی ہے، تو بدرجہ اولی دوسرے اولیاء کے لئے یہ حرام ہوگا۔ ہادویہ اور حنفیہ کا مذہب باپ کے لئے ولایت اجبار کے ناجائز ہونے کا ہے)۔

نسائی کی حدیث میں اسی طرح کا ایک واقعہ منقول ہے:

''عن عائشة أن فتاة دخلت عليها، فقالت: إن أبي زوّجني ابن أخيه ليرفع بي خسيسته وأنا كارهة. فقالت: اجلسي حتى يأتي النبي ﷺ، فجاء رسول الله ﷺ فأخبرته، فأرسل إلى أبيها فدعاه، فجعل الأمر إليها. فقالت: يا رسول

---

[۱] صحیح مسلم ۱/۴۵۵ کتاب النکاح، باب استئذان الثیب بالنکاح فی النکاح بالنطق۔

[۲] سنن ترمذی ۱/۲۱۰ کتاب النکاح، باب ماجاء فی إکراہ الیتیمۃ علی التزویج، نیز ابوداؤد ۱/۲۸۵، نسائی ۲/۶۴ باب البکر یزوجها أبوها وهي کارهة۔

[۳] ابوداؤد ۱/۲۸۶ باب فی البکر یزوجها أبوها ولا یستأمرها۔

[۴] سبل السلام ۳/۲۲۷۔

اللّٰہ: قد أجزت ما صنع أبي، ولكن أردت أن أعلم النساء أن ليس إلى الآباء من الأمر شيء؟''[۱] (سیدہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک لڑکی ان کے پاس آئی، اس نے کہا کہ میرے باپ نے میری شادی اپنے بھتیجے سے کرادی، تاکہ میرے ذریعہ اس کی پستی کو دور کرے، جبکہ میں (یہ رشتہ) ناپسند کرتی ہوں، ام المومنین نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے تک یہاں بیٹھو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بتایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو بھیج کر اس کے باپ کو بلایا، پھر لڑکی کو فیصلہ کا اختیار دیا، لڑکی نے کہا: اے اللہ کے رسول: جو کچھ میرے ابا نے کیا، میں اسے برقرار رکھتی ہوں، لیکن میں عورتوں کو بتانا چاہتی تھی کہ باپوں کو نکاح کے معاملہ میں کچھ اختیار نہیں ہے)۔

بخاری میں ایک دوسرا واقعہ شادی شدہ عورت کے بارے میں ہے:

''عن خنساء بنت خذام الأنصارية أن أباها زوجها وهي ثيب، فكرهت ذلك، فأتت رسول اللّٰه ﷺ فرد نكاحها''[۲] (خنساء بنت خذام انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان کے والد نے ان کی شادی کردی، جبکہ وہ شوہر دیدہ تھیں، ان کو یہ شادی ناپسند تھی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح رد کردیا)۔

چنانچہ ان روایات سے استدلال کرتے ہوئے[۳] حنفیہ نے بالغ لڑکی کا جبری نکاح کرانا ناجائز قرار دیا ہے:

''ولا يجوز للولي إجبار البكر البالغة على النكاح''[۴] (ولی کے لئے کنواری بالغ لڑکی کو نکاح پر مجبور کرنا جائز نہیں ہے)۔

علامہ حافظ ابن تیمیہؒ نے حنفیہ کے مذہب کو حدیث کی روشنی میں زیادہ صحیح قرار دیا ہے:

''وإذا كانت بكرا فالبكر يجبرها أبوها على النكاح، وإن كانت بالغة: في مذهب مالك والشافعي، وأحمد في إحدى الروايتين وفي الأخرى وهي مذهب أبي حنيفة وغيره أن الأب لا يجبرها إذا كانت بالغاً، وهذا أصح مادل عليه سنة رسول اللّٰه ﷺ وشواهد الأصول''[۵] (جب لڑکی کنواری ہو تو امام مالک، شافعی اور احمد کی ایک روایت کے مطابق اس کا باپ اس کو نکاح پر مجبور کرسکتا ہے، اگرچہ وہ بالغ ہو۔ امام احمد کی دوسری روایت اور یہی امام ابوحنیفہ وغیرہ کا مذہب ہے، یہ ہے کہ جب لڑکی بالغ ہو تو باپ اس پر جبر نہیں کرے گا۔ حدیث نبوی اور اصول کی روشنی میں یہ زیادہ صحیح قول ہے)۔

حافظ ابن تیمیہؒ دوسری جگہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: ''وسئل رحمه اللّٰه تعالى عن بنت بالغ، وقد خطبت لقرابة لها فأبت وقال أهلها للعاقد: اعقد وأبوها حاضر: فهل يجوز تزويجها؟

فأجاب: أما إن كان الزوج ليس كفؤا لها فلا تجبر على نكاحه بلا ريب، وأما إن كان كفواً فللعلماء فيه قولان مشهوران ؛ لكن الاظهر في الكتاب والسنة والاعتبار أنها لا تجبر؛ كما قال النبي ﷺ: ''لا تنكح البكر حتى يستأذنها أبوها وإذنها صماتها'' واللّٰه أعلم''[۶]۔

(ابن تیمیہؒ سے ایسی بالغ لڑکی کے بارے میں پوچھا گیا، جس کو اس کے کسی رشتہ دار کی طرف سے پیغام دیا گیا ہو، وہ انکار کرتی ہو، اس کے گھر والے نکاح کرنے والے سے کہیں: اس سے عقد کرلو، وہاں اس کا باپ حاضر ہو، تو کیا اس لڑکی کا نکاح کرانا جائز ہوگا؟ انہوں نے جواب دیا: اگر شوہر لڑکی کا کفو نہیں ہے، تو بلاشبہ اس کو نکاح کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اور اگر شوہر کفو ہے تو اس بارے میں علماء کے دو اقوال مشہور ہیں، لیکن قرآن، حدیث اور قیاس کی روشنی میں زیادہ واضح بات یہ ہے کہ اس کو مجبور نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غیر شادی شدہ لڑکی کا نکاح نہ کیا جائے، یہاں تک کہ اس کا باپ اس سے اجازت

[۱] سنن النسائی ۲۰۶۳ کتاب النكاح باب البكر يزوجها أبوها وهي كارهة۔
[۲] بخاری ۲،۷۷۱،۷۷۲ کتاب النكاح باب إذا زوج ابنته وهي كارهة فنكاحه مردود۔
[۳] فتح القدیر ۳،۲۵۲۔
[۴] ہدایہ مع الفتح ۳/۲۵۱۔
[۵] مجموع فتاوی ابن تیمیہ ۳۲/۲۹، ۳۰ مطبوعہ دارالرحمۃ قاہرہ۔
[۶] فتاوی ابن تیمیہ ۳۲/۲۸۔

لے لے اور اس کی اجازت اس کی خاموشی ہے)۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ اس کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وأما تزويجها مع كراهتها للنكاح: فهذا مخالف للأصول والعقول. والله لم يسوغ لوليها أن يكرهها على بيع أو إجارة إلا بإذنها. ولا على طعام أو شراب أو لباس لا تريده، فكيف يكرهها على مباضعة ومعاشرة من تكره مباضعته ومعاشرة من تكره معاشرته؟ والله قد جعل بين الزوجين مودة ورحمة. فإذا كان لا يحصل إلا مع بغضها له. ونفورها عنه. فأي مودة ورحمة في ذلك؟''[1]۔

(لڑکی کی ناپسندیدگی کے باوجود اس کا نکاح کرانا اصول شریعت اور عقل کے خلاف ہے۔ اللہ تعالی نے ولی کے لئے گنجائش نہیں رکھی ہے کہ اس کو خرید و فروخت یا کرایہ کے معاملہ میں مجبور کرے اور نہ ہی کھانے پینے یا لباس کے معاملہ میں اس کو مجبور ایسی چیز پر کرے جس کو وہ نہ چاہتی ہو، تو کیسے اس کو ایسے شخص کے ساتھ رہنے اور زندگی گزارنے پر مجبور کر سکتا ہے، جس کو وہ ناپسند کرتی ہو؟ اللہ تعالی نے میاں بیوی کے درمیان محبت اور رحم دلی رکھی ہے۔ جب لڑکی کی طرف سے نفرت اور غصہ کے ساتھ یہ رشتہ طے پائے تو کون سی محبت اور رحم دلی پیدا ہوگی؟)۔

ان توضیحات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابن تیمیہ کا مذہب بھی حنفیہ کے مطابق ہے، لہذا کتاب وسنت اور قیاس کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ عاقل بالغ لڑکی کو اس کی مرضی کے خلاف نکاح کے لئے مجبور کرنا، اس پر دباؤ ڈالنا اور نکاح نہ کرنے پر اس کو دھمکیاں دینا جائز نہیں ہے اور اس طرح ڈرا دھمکا کر لڑکی سے ہاں کہلوالینا اس کی رضامندی نہیں کہلائے گی، کیونکہ حدیث میں "کارھۃ" کا لفظ آیا ہے کہ وہ لڑکی اپنی چچازاد بھائی سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتی تھی، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کو اختیار دیا، تو جو چیز دل سے پسند نہ ہو اس پر رضامندی کیسے ہو سکتی ہے؟۔

## ۲-نکاح کے لئے زبردستی راضی کرنا:

حنفیہ کے نزدیک اصول یہ ہے کہ وہ شرعی معاملات جو مکمل ہونے کے بعد فسخ کا احتمال نہیں رکھتے ہیں، وہ اکراہ کے باوجود جائز ہوتے ہیں، جیسے نکاح، طلاق، رجعت، ایلاء اور قسم وغیرہ[2]، چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں: ''والمرأة إذا أكرهت على النكاح ففعلت صح النكاح''[3] (عورت پر جب نکاح کے لئے زبردستی کی جائے اور وہ نکاح کرلے تو نکاح درست ہے)۔

حنفیہ کا استدلال اس سلسلہ میں قرآن کی مطلق آیات سے ہے، جن میں اکراہ وغیرہ کی کوئی قید اور تخصیص نہیں کی گئی ہے:

''وأنكحوا الأيامى منكم''[4] (اپنے میں سے بے نکاحوں کا نکاح کرادو)۔

''فطلقوهن لعدتهن''[5] (ان کو پاکی کی حالت میں طلاق دو)۔

نیز حنفیہ کا استدلال ان احادیث سے بھی ہے:

''ثلاث جد هن جد وهزلهن جد: النكاح والطلاق والرجعة''[6] (تین چیزیں ایسی ہیں جن کی سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور ان کا مذاق بھی سنجیدگی کے درجہ میں ہے: نکاح، طلاق اور رجعت)۔

[1] فتاوی ابن تیمیہ ۳۲/ ۲۵۔
[2] بدائع الصنائع ۶/ ۱۹۳۔
[3] الفتاوی الہندیہ ۵/ ۵۳ طبع دیوبند۔
[4] سورۂ نور/ ۳۲۔
[5] سورۂ طلاق/ ۱۔
[6] سبل السلام ۳/ ۳۳۵۔

اکراہ میں ہزل (مذاق) کا معنی پایا جاتا ہے، کیونکہ اس میں واقعی قصد نہیں ہوتا[1]۔ اسی طرح مصنف عبدالرزاق میں سیدنا حذیفہ بن یمانؓ سے مروی ہے کہ جب ان کو مشرکوں نے پکڑلیا اور ان سے زبردستی قسم کھلائی کہ وہ مشرکوں کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہیں کریں گے تو انہوں نے قسم کھالی۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بتایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کا عہد یعنی قسم پوری کرو: "أوف لهم بعدهم"[2]۔

اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اکراہ کی صورت میں کہ لڑکی دباؤ میں آ کر "ہاں" کردے تو نکاح منعقد ہوجائے گا، لیکن لڑکی کو قاضی کے پاس جا کر نکاح فسخ کرانے کا اختیار ہوگا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کنواری لڑکی کو اختیار دیا تھا: "إن أباها زوّجها وهي كارهة فخيّرها النبي ﷺ"[3]۔

اور نسائی کی روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکی کو اختیار دیا، لیکن اس نے اس نکاح کو باقی رکھا:

"فجعل الأمر إليها، فقالت: يا رسول الله! قد أجزت ما صنع أبي"[4]

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ناپسندیدگی اور اکراہ کی حالت میں نکاح منعقد ہوجاتا ہے، البتہ قاضی کے پاس اس نکاح کو فسخ کرایا جاسکتا ہے، علامہ سندھی نسائی کی اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

"فجعل الأمر إليها" يفيد أن النكاح منعقد إلا أن نفاذه إلى أمرها"[5] (نکاح کے معاملہ میں اس کو اختیار دیا)، اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح منعقد ہوجاتا ہے، مگر اس کا نفاذ عورت کی صواب دید پر ہے۔

## ۳- عدم کفاءت کا دعوی:

برطانیہ یا کسی مغربی ملک کی شہریت رکھنے والی لڑکی کا نکاح اس کے سرپرست زبردستی اپنے خاندان کے ہندوستانی یا پاکستانی لڑکے سے کرادیں، تو لڑکی کو اس بنا پر تفریق کا حق حاصل نہیں ہونا چاہئے کہ یہ نکاح اس کے کفو میں نہیں ہوا ہے، بلکہ یہ نکاح تو لڑکی کے کفو میں ہی شمار ہوگا کہ لڑکی کا نکاح اس کے آبائی وطن سے تعلق رکھنے والے اور اس کے خاندان کے لڑکے سے ہوا ہے۔ کسی انسان کے اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر دوسرے ملک جابسنے سے اس کی قومیت اور نسل بدل نہیں جاتی۔ دوسرے یہ کہ فقہاء نے کفاءت کا اعتبار نسب، حریت، اسلام، دیانت، مال اور پیشہ میں کیا ہے[6]، کسی بھی فقیہ نے کفاءت میں شہریت کا اعتبار نہیں کیا ہے، بلکہ علامہ حصکفی نے اس کے معتبر نہ ہونے کی صراحت کی ہے:

"والقروي كفء للمدني، فلا عبرة بالبلد، كما لا عبرة بالجمال"[7]۔

(دیہاتی شہری کا کفو ہے، لہذا شہریت کا کوئی اعتبار نہیں، جیسا کہ خوبصورتی کا کوئی اعتبار نہیں ہے)۔

## ۴- زبردستی نکاح کے بعد کی دو حالتیں:

اس طرح کے جبری نکاح کے بعد زوجین کے درمیان ازدواجی تعلقات قائم ہوگئے ہوں، یا قائم نہ ہوئے ہوں گے، دونوں صورتوں میں عورت کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا، البتہ اگر ازدواجی تعلق قائم نہ ہوا ہو، تو مقررہ مہر کا آدھا واجب ہوگا، جیسا کہ قرآن میں ہے:

"وإن طلقتموهن من قبل أن تمسوهن، وقد فرضتم لهن فريضة فنصف ما فرضتم"[8]۔

[1] الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/ ۴۰۴ طبع المکتبۃ الحقانیہ پاکستان۔
[2] مصنف عبدالرزاق بحوالہ نصب الرایہ ۳/ ۲۲۲۔
[3] ابوداؤد ۱/ ۲۸۶۔
[4] نسائی ۲/ ۶۴۔
[5] حاشیۃ الامام السندی علی النسائی ۶/ ۸۷ طبع الدار المصریہ اللبنانیہ قاہرہ۔
[6] کنز الدقائق مع البحر ۳/ ۱۳۰۔
[7] الدر المختار ۴/ ۲۱۹۔
[8] سورہ بقرہ: ۲۳۷۔

(اگر تم عورتوں کو ان کے پاس جانے سے پہلے طلاق دے دو، اور ان کے لئے مہر مقرر کر چکے تھے تو (ایسی صورت میں) مقرر کئے ہوئے مہر کا آدھا حصہ دینا ضروری ہے)۔

اور اگر ازدواجی تعلق قائم ہونے کے بعد تفریق ہو تو مکمل مہر دینا ہوگا، چنانچہ ابوداؤد کی روایت میں ہے:

''عن بصرة قال: تزوجت امرأة بكرا في سترها، فدخلت عليها، فإذاهي حبلى، فقال النبي ﷺ: لها الصداق بما استحللت من فرجها... وفرق بينهما''[1]۔

(بصرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک غیر شادی شدہ عورت سے شادی کی، میں اس کے پاس آیا، وہ حاملہ نظر آئی، تو نبی ﷺ نے فرمایا: ازدواجی تعلق قائم کرنے کی بنا پر عورت کے لئے مہر ہے،...... اور ان دونوں کے درمیان علاحدگی کرادی)۔

## ۵- تفریق کا حق:

قاضی یا شرعی کونسل کے پاس جبری نکاح کا کوئی مقدمہ آئے، فریقین کے بیانات کو سننے کے بعد وہ محسوس کریں کہ لڑکی کو جبر واکراہ کے ذریعہ نکاح پر مجبور کیا گیا تھا، لڑکی اس نکاح پر راضی نہیں تھی اور اب بھی اس شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی نہیں ہے، تو قاضی یا شرعی کونسل اس نکاح کو فسخ کر سکتے ہیں، چنانچہ اس سے پہلے ابوداؤد اور نسائی کی حدیث ذکر کردی گئی ہے:

''إن جارية بكرا أتت النبي ﷺ، فذكرت أن أباها زوّجها وهي كارهة فخيّرها النبي ﷺ''[2]۔

(ایک کنواری لڑکی نبی ﷺ کے پاس آئی اور اس نے بتایا کہ اس کے باپ نے اس کی ناپسندیدگی کے باوجود اس کا نکاح کرادیا ہے، تو نبی ﷺ نے اس لڑکی کو اختیار دیا)۔

اور دار قطنی وبیہقی کی روایت میں ہے: ''إن رجلا زوّج ابنته وهي بكر من غير أمرها فأتت النبي ﷺ، ففرق بينهما''[3]۔

(ایک شخص نے اپنی کنواری بیٹی کی شادی اس سے اجازت لئے بغیر کرادی، وہ نبی ﷺ کے پاس آئی، تو آپ ﷺ نے زوجین کے درمیان علاحدگی کرادی)۔

لہذا سب سے بہتر راستہ یہی ہے کہ جبری نکاح کو منعقد مان کر عورت کو قاضی کے پاس تفریق کا حق دیا جائے۔

## خلاصہ بحث:

۱- عاقل، بالغ لڑکی کا نکاح اس کی مرضی کے خلاف کرانا شریعت کی رو سے ناجائز ہے، لڑکی کو ڈرا دھمکا کر اور اس پر دباؤ ڈال کر اس کو نکاح کے لئے تیار کر لینا اور ''ہاں'' کہلوالینا اس کی رضامندی نہیں سمجھی جائے گی۔

۲- حنفیہ کے نزدیک جبر واکراہ کی بنا پر ہی سہی اگر لڑکی نے نکاح کی اجازت دے دی تو یہ نکاح منعقد ہو جائے گا، البتہ اس کو فسخ نکاح کا اختیار ہوگا۔

۳- برطانوی شہریت یافتہ لڑکی کا نکاح اگر اس کے رشتہ داری میں ہندوستانی یا پاکستانی لڑکے سے کر دیا جائے اور دونوں ایک جگہ رہ رہے ہیں، تو لڑکی کو محض اس بنا پر تفریق کا حق نہیں ہوگا کہ اس کا شوہر برطانیہ کا شہریت یافتہ نہیں ہے اور ان کی تعلیم وتربیت برطانیہ کے ماحول میں نہیں ہوئی ہے۔

۴- جبری نکاح کے بعد چاہے ازدواجی تعلق قائم ہو جائے، یا تعلق قائم نہ ہو، دونوں صورتوں میں تفریق کا حق حاصل ہوگا، البتہ ازدواجی تعلق قائم ہونے کے بعد تفریق ہو تو مکمل مہر واجب ہوگا اور ازدواجی تعلق سے پہلے تفریق کی صورت میں آدھا مہر واجب ہوگا۔

۵- قاضی یا شرعی کونسل کے نزدیک جب اس بات کی تصدیق ہو جائے کہ لڑکی کو اس کی رضامندی کے بغیر جبر واکراہ کے ذریعہ نکاح پر مجبور کیا گیا ہے، لڑکی کو وہ نکاح پسند نہیں، اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی ہے، تو قاضی یا شرعی کونسل اس نکاح کو فسخ کر سکتے ہیں۔ ☆☆☆

---

[1] ابوداؤد ۱،۲۹۰ باب المراء ة يتزوج المرأة فيجدها حبلى۔

[2] ابوداؤد ۱،۲۸۶۔

[3] سنن الدارقطني ۳،۲۳۳، سنن البيهقي ۷،۱۱۷۔

# جبری شادی

ڈاکٹر عبداللہ جولم عمرآباد، تامل ناڈو

ولی کے لئے جائز نہیں ہے کہ عاقلہ بالغہ کی شادی اس کی رضا اور اجازت کے بغیر کردے، اگر اس نے ایسا کیا تو لڑکی کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو نکاح قبول کرے یا فسخ کروالے، اس کی دلیل مندرجہ ذیل احادیث ہیں:

''عن أبي هريرة قال قال رسول الله ﷺ: لا تنكح الأيم حتى تستأمر ولا تنكح البكر حتى تستأذن. قالوا: يا رسول الله وكيف إذنها؟ قال: أن تسكت''[1] (حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: شوہر دیدہ عورت کا نکاح اس کے مشورہ کے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ اس کی اجازت کیسے معلوم ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کی خاموشی اس کی اجازت ہے)۔

''عن خنساء بنت خذام أن أباها زوّجها وهي ثيب فكرهت ذلك، فأتت رسول الله ﷺ فرد نكاحها''[2]۔

(حضرت خنساء بنت خذامؓ سے روایت ہے کہ ان کے والد نے ان کی شادی کرادی تھی اور وہ ثیبہ تھیں، تو انہیں یہ شادی ناپسند تھی، چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا نکاح رد کردیا)۔

''عن ابن عباس قال: إن جارية بكرا أتت رسول الله ﷺ فذكرت أن أباها زوّجها وهي كارهة فخيرها النبي ﷺ''[3]۔ (حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک کنواری لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے بتایا کہ اس کے باپ نے اس کی شادی کردی ہے اور وہ اس کو ناپسند ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو اختیار دیا)۔ اکراہ کی صورت میں اس کے ہاں کہنے یا دستخط کرنے سے رضامندی ظاہر نہیں ہوتی۔

۱، ۲- لڑکی کو نکاح فسخ کرانے کا اختیار حاصل ہے۔

۳- اگر لڑکی ابتداء نکاح سے راضی رہی ہو اور بعد میں معاشرتی فرق کی وجہ سے جدائی چاہے تو اسے خلع لینا پڑے گا، نکاح فسخ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ نکاح کی صحت کے لئے اس قسم کی کفاءت کی کوئی شرط نہیں ہے۔

۴- اگر زن وشوئی تعلقات قائم ہوچکے ہوں تو اس بات کی چھان بین اچھی طرح کرنی ہوگی کہ ابتداء نکاح میں لڑکی راضی تھی یا نہیں، کیونکہ لڑکی کا اپنے آپ کو شوہر کے حوالے کرنا فی الغالب اس کی رضا کی دلیل ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنے آپ کو مجبور پاکر حوالہ کرنے کے لئے تیار ہوئی ہو، تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ ہندوستان وپاکستان سے باہر جانے کے بعد ان کے درمیان زن وشوئی تعلقات قائم ہوئے یا نہیں، اگر قائم ہوئے ہوں تو نکاح فسخ کرانے کا اختیار نہ ہوگا، حضرت بریرہؓ کے آزاد ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا:

''وإن قربك فلا خيار لك''[4]۔ (اگر وہ (یعنی تمہارے شوہر) تم سے جماع کرچکے ہیں تو تمہیں اختیار نہیں ہے)۔

۵- اگر قاضی یا شرعی کونسل کے سامنے اس بات کا ثبوت مل جاتا ہے کہ لڑکی کو جبر واکراہ کے ذریعہ نکاح پر مجبور کیا گیا تھا اور لڑکی کسی طرح نکاح منظور کرنے کے لئے تیار نہیں تھی اور نہ ہے تو قاضی یا شرعی کونسل کو اس کے مطالبہ پر نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہوگا، کیونکہ یہی مسلمانوں کے لئے حکومت کے قائم مقام ہیں۔

☆☆☆

[1] بخاری ومسلم۔

[2] اس حدیث کی روایت مسلم کو چھوڑ کر محدثین کی ایک جماعت نے کی ہے۔

[3] اس کی روایت ابن ماجہ کو چھوڑ کر حدیث کے پانچوں ائمہ نے کی ہے۔

[4] ابوداؤد۔

# جبری شادی

ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اسلام جس نے عورتوں کا الگ وجود تسلیم کیا اور ان کو طرح طرح کے حقوق دیئے ہم اپنے عمل سے اس کی گھناؤنی تصویر پیش کریں۔ اور اغیار کو اس پر ہنسنے کا موقع فراہم کریں، مغرب کے عیش کدہ میں زندگی گذارنے اور اس کے آزادانہ ماحول میں بچوں کو اسی طرح نشوونما ہونے دینے کے بعد صرف شادی کی حد تک یہ زور وزبردستی کسی طرح اسلامی روح سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ جس کو ہو ایمان ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟ یہ مرحلہ تو آنا ہی تھا۔ ایسے لوگوں کو پہلے ہی سوچ کر یا تو اس مغربی ماحول کو خیر باد کہہ کر واپس آجانا چاہئے تھا اور نہیں آئے تو اس کے کڑوے کسیلے پھلوں کو کھانا پڑے گا۔ اس کی اصلاح کے لئے مشرق میں رشتے کرنے سے جو نتائج ہو سکتے ہیں ان کی سوالنامہ میں پوری طرح عکاسی کردی گئی ہے۔ یہ رشتے مذہبی، علمی وتہذیبی اعتبار سے بالکل غیر کفو میں ہوں گے، خواہ حسب ونسب کے اعتبار سے ایک ہوں جن کی اس ماحول میں پروردہ نسل کے لئے کوئی اہمیت نہیں ہے۔ شادی کے سلسلہ میں اس طرح کی زور زبردستی اور مکر وفریب مغرب میں پروردہ اولاد کو مذہب سے اور دور کردے گی اور اسلام کی الگ جگ ہنسائی ہوگی۔ ایسے خاندانوں کے لئے بہتر ہے کہ اسی ماحول میں رہنے والے مسلمانوں کے درمیان رشتے تلاش کریں۔ اس مختصر تمہید کے بعد دیئے گئے سوالات کے جوابات پیش خدمت ہیں:

۱- بے شک اسلام میں عاقلہ بالغہ لڑکی کی رضامندی کو شریعت نے ضروری قرار دیا ہے اور مذکورہ ظالمانہ حربے رضامندی کے منافی ہیں، اس لئے شاید نکاح کا انعقاد ہی نہ ہو۔

۲- دھوکہ، مار پیٹ اور پاسپورٹ کو ضائع کردینے جیسی دھمکی کے ذریعہ شادی کے لئے عاقلہ وبالغہ لڑکی سے جبر واکراہ کے ساتھ ہاں کرا لیا جائے یا دستخط کرا لئے جائیں تو یہ اس کی حقیقی رضا یا اذن ہرگز تسلیم نہیں ہوگا۔ اس طرح کی چیز کا تصور افریقہ کے کسی جنگلی قبیلہ میں بھلے ہی کیا جائے اسلام میں اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔

۳- تہذیبی وتمدنی اور علمی ومذہبی فرق کی بنیاد پر لڑکی کا یہ دعوی حق بجانب ہوگا کہ اس کی شادی جس سے کی جارہی ہے وہ اس کا کفو نہیں ہے اور اس بنا پر اس کو حق تفریق حاصل ہے۔

۴- اس طرح کے جبری نکاح کے بعد دونوں کے درمیان تعلقات زن وشوئی قائم ہوتے ہیں تو اسے اقرار نکاح پر دلیل مانا جائے گا ورنہ نہیں (جس طرح ایک طلاق کے بعد اس طرح کا فعل رجوع کے مترادف ہوتا ہے اور ایسا نہ ہو تو جدائی ہو جاتی ہے)۔

۵- قاضی یا شرعی کونسل کو فریقین کے بیانات کے بعد اس بات کا یقین ہو جائے کہ لڑکی کو جبر واکراہ کے ذریعہ نکاح پر مجبور کیا گیا تھا حالانکہ وہ کسی طرح راضی نہیں تھی تو قاضی یا شرعی کونسل اس نکاح کو فسخ کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

# نکاح میں اولیاء کے اختیارات

مفتی احمد نادر القاسمی

اسلام کے معاشرتی اور ازدواجی نظام میں اولیاء کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، اور شریعت کی طرف سے بہت سی معاشی، انتظامی، تربیتی اور اخلاقی ذمہ داریاں ان پر ڈالی گئی ہیں، اور اسے ہر ممکن نبھانے اور برتنے کا تقاضا کیا گیا ہے، اور ذمہ داریاں خواہ آداب واخلاق، تعلیم وتربیت اور حسن معاشرت سے متعلق ہوں یا نان ونفقہ اور شادی بیاہ سے، ان میں کسی بھی قسم کی کوتاہی اور کمی پر سخت گرفت کی ہے، چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

''کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته''[1] (کہ تم میں کا ہر شخص نگہبان ہے، اور ہر ایک سے اس کی رعیت (ماتحتوں) کے بارے میں باز پرس ہوگی)۔

اسی طرح جب بچے جوان اور بالغ ہوجائیں تو ان کی وقت پر شادی بیاہ کردینے کا بھی شریعت نے مطالبہ کیا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وأنکحوا الأیامی منکم والصالحین من عبادکم وإمائکم إن یکونوا فقراء یغنهم اللّٰه من فضله''[2] (اور نکاح کردو بے نکاح لوگوں کا اپنے میں کے (اور ان غلام اور باندیوں کا جو نیک اور صالح ہوں) اگر وہ غریب اور مفلس ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں غنی اور مالدار کردے گا)۔

اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''من ولد له ولد فلیحسن اسمه وأدبه. فإذا بلغ فلیزوجه. فإن بلغ ولم یزوّجه، فأصاب إثما فإنما إثمه علی أبیه. وفی روایة: عن رسول اللّٰه ﷺ قال: فی التوراة مکتوب من بلغت ابنته اثنتی عشرة سنة ولم یزوجها فأصابت إثما فإثم ذلك علیه''[3] (جس شخص کے گھر بچہ پیدا ہو اسے چاہئے کہ اس کا اچھا سا نام رکھے اور اسے عمدہ اخلاق وآداب سکھائے اور جب وہ بالغ ہوجائے تو اس کی شادی کرائے، بالغ ہونے کے بعد اس نے اس کی شادی نہیں کرائی اور اس سے کوئی گناہ سرزد ہوگیا تو اس گناہ کا وبال اس کے باپ پر ہوگا۔ اور دوسری روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ توریت میں یہ موجود ہے کہ جس شخص کی لڑکی بارہ سال کی ہوگئی اور اس نے اس کی شادی نہیں کرائی اور اس لڑکی سے کوئی گناہ سرزد ہوگیا تو اس گناہ کا وبال اس شخص پر ہوگا)۔

یہی نہیں بلکہ معاشرے کو پاک وصاف رکھنے اور بن بیاہی عورتوں کے رشتہ ملنے کے بعد فوراً ان کا نکاح کردینے کی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیاء کو تاکید فرمائی، چنانچہ ایک روایت میں ہے:

''ثلاث لا تؤخرها: الصلاة إذا آنت، والجنازة إذا حضرت، والأیّم إذا وجدت لها کفوأ''[4]۔

(تین چیز میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے، نماز جب اس کا وقت آجائے، جنازہ جب حاضر ہوجائے، اور جب بے شادی شدہ لڑکے یا لڑکی کا رشتہ مل جائے)۔

## اولیاء کی رضامندی اور عاقلہ بالغہ سے اجازت:

لڑکے اور لڑکی کے نکاح اور شادی بیاہ میں والدین اور اولیاء کا کردار (بالخصوص جب بالغ ہوں) ایک دینی فریضہ اور شرعی حق کی حیثیت رکھتا ہے، اسے ہر

[1] اخرجه الشیخان فی کتاب الامارہ، اللؤلؤ والمرجان ۴۷۸۔
[2] سورۂ نور: ۳۲۔
[3] رواہما البیہقی فی شعب الایمان، نیز دیکھئے: المشکاۃ ۲/ ۲۷۱۔
[4] رواہ الترمذی وقال: إسنادہ غریب۔

ممکن ادا کرنا ہے۔ شریعت کے مقاصد، بندے کے عمومی مصالح اور سماجی زندگی کا گہرائی سے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح میں اولیاء کی رضامندی اگر وہ حد اعتدال میں ہو اور کسی خاص جگہ نکاح کی کسی مصلحت کی وجہ سے اجازت نہ دینے کی صورت میں ان کے شریعت کے دیئے ہوئے حقوق ضائع نہ ہورہے ہوں، تو یہ یقیناً شرعاً مطلوب ہے اور وہ روایات جن میں اولیاء کی اجازت کو ضروری اور ان کی مرضی کے بغیر کئے ہوئے نکاح کو مردود و باطل گردانا گیا ہے، ان کا منشاء دراصل یہی ہے کہ اگر بچے اپنی مرضی سے اولیاء اور ذمہ دار کی اجازت کے بغیر اپنی شادی کرلیں گے تو سماجی حیثیت سے ان کی غیرت اور جذبات کو ٹھیس پہنچے گی جو یقیناً شریعت کی نگاہ میں والدین اور اولیاء کی ناقدری اور ادب واحترام سے دور کی بات ہے، نیز اس لئے بھی کہ اولیاء کی اجازت پر نکاح کو موقوف کر کے دراصل لڑکے اور لڑکی کی شخصی عزت اور سماج میں اس کے وقار واحترام کو برقرار رکھنا ہے، تاکہ لوگ اسے برا اور معیوب نہ سمجھیں، اسی لئے روایات میں اولیاء کی اجازت ورضامندی کے بغیر کئے گئے نکاح کو معیوب سمجھا گیا ہے، اور بعض روایات میں تو اسے زنا تک کہہ دیا گیا ہے، اس باب کی چند وہ روایات ذیل میں درج کی جاتی ہیں جن سے ولی کی اجازت کے بغیر کئے گئے نکاح کے عدم انعقاد کا پتہ چلتا ہے:

''عن عائشة رضی اللّٰہ تعالی عنها أن رسول اللّٰہ ﷺ قال: أیما امرأة نکحت بغیر إذن ولیها فنکاحها باطل. فنکاحها باطل، فنکاحها باطل، فإن دخل بها، فلها المهر بما استحل من فرجها فإن اشتجروا فالسلطان ولی من لا ولی له''[1]۔

(حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس عورت نے اپنا نکاح اپنے ولی کی اجازت کے بغیر کیا اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اور اگر اس کے شوہر نے دخول کرلیا تو اس عورت کا مہر اس کو اپنے لئے حلال سمجھنے کی وجہ سے اس پر واجب ہوگا، اور اگر اولیاء آپس میں اختلاف کرلیں تو سلطان اس کا ولی ہے، جس کا کوئی ولی نہیں)۔

اسی طرح حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے: ''أن النبی ﷺ قال: البغایا اللاتی ینکحن أنفسهن بغیر بینة''[2]۔

(جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ عورت زانیہ اور فاحشہ ہے جس نے اپنا نکاح بغیر ثبوت کے کرلیا (اس کی سند حضرت ابن عباسؓ پر موقوف ہے))۔

حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے: ''أن النبی ﷺ قال: أیما عبد تزوج بغیر إذن سیده فهو عاهر''[3]۔

(جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس غلام نے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر اپنی شادی کرلی وہ زانی ہے)۔

اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں ہے: ''قال رسول اللّٰہ ﷺ: لا تزوج المرأة نفسها فإن الزانیة التی تزوج نفسها''[4]۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی عورت خود سے شادی نہ کرے، کیونکہ وہ عورت زانیہ ہے جو خود سے اپنی شادی کرلے (اولیاء کی اجازت کے بغیر))۔

مذکورہ بالا روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیاں، خواہ بالغ ہوں، یا نابالغ ان کا نکاح اولیاء کی اجازت اور مرضی کے بغیر درست نہیں۔

## اجازت کے عدم وجوب کی روایات:

اب وہ روایات نقل کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح میں لڑکی اگر بالغہ اور عاقلہ ہو اور اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرسکتی ہو تو اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر، یا اس کی منشاء کے خلاف اور جبر واکراہ کے ساتھ کسی دوسری جگہ شادی کردینا درست نہیں، خواہ وہ اولیاء کی نظر میں کتنا ہی بہتر رشتہ کیوں نہ ہو، مگر وہ شرعاً اس کے مجاز نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وإذا طلقتم النساء فبلغن أجلهن فلا تعضلوهن أن ینکحن أزواجهن إذا تراضوا بینهم بالمعروف. ذلك

[1] رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ۔۔ والدارمی۔ مشکاۃ ۲/۲۷۰۔۲۷۱ طبع مکتبہ تھانوی سہارنپور۔

[2] والصحیح أنه موقوف علی ابن عباس، رواہ الترمذی، مشکاۃ: ۲/۲۷۱۔

[3] رواہ الترمذی وابوداؤد والدارمی۔ مشکاۃ ۲/۲۷۱۔

[4] رواہ ابن ماجہ۔ مشکاۃ ۲/۲۷۱۔

یوعظ به من كان منكم يؤمن بالله واليوم الآخر ذلكم أزكى لكم وأطهر والله يعلم وأنتم لا تعلمون''[1]۔

(اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی اور وہ اپنے عدت کے ایام پوری کر چکیں تو تم ان کو اپنے انہیں سابقہ خاوندوں سے نکاح کرنے سے مت روکو جب دونوں آپس میں خوش گوار ماحول میں اور دستور کے مطابق نکاح کرنے پر رضامند ہوں، یہ نصیحت ان لوگوں کو کی جاتی ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اور اسی میں تمہارے لئے بڑی پاکیزگی اور ستھرائی کی بات ہے، اس بات کو اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے)۔

''فإذا بلغن أجلهن فلا جناح عليكم فيما فعلن في أنفسهن بالمعروف والله بما تعلمون خبير''[2]۔

(تو جب پوری کر چکیں وہ اپنی عدت تو تم پر کوئی گناہ نہیں اس بات میں کہ وہ کوئی فیصلہ کریں اپنے حق میں قاعدہ کے مطابق، اور اللہ تعالی اچھی طرح واقف اور باخبر ہے تمہارے کاموں سے جو تم کرتے ہو)۔

''وعن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال: لا تنكح الأيم حتى تستأمر. ولا تنكح البكر حتى تستأذن قالوا: يا رسول الله! وكيف إذنها: قال: أن تسكت''[3]۔

(ثیبہ کا نکاح اس سے رائے لئے بغیر نہیں کیا جاسکتا ہے، اور باکرہ کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے، صحابہ نے پوچھا اس کا طریقہ کیا ہوگا؟ فرمایا: اس کی طرف سے اجازت اس کی خاموشی ہے)۔

''عن ابن عباس أن النبی ﷺ قال: الأيم أحق بنفسها من وليها. والبكر تستأذن في نفسها وإذنها صماتها. وفي رواية: الثيب أحق بنفسها من وليها، والبكر تستأمر وإذنها سكوتها. وفي رواية: البكر يستأذنها أبوها في نفسها''[4]۔

(بے شوہر والی (ایم) اپنی ذات کی ولی سے زیادہ حق دار ہے، اور باکرہ سے اس کی ذات کے بارے میں اجازت لی جائے گی، اور اس کی اجازت اس کی خاموشی ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ثیبہ (شوہر دیدہ) اپنی ذات کی ولی سے زیادہ حق دار ہے، اور باکرہ سے رائے لی جائے گی، اور اس کی رائے خاموشی ہے۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ باکرہ کے بارے میں اس کے والد اس سے اجازت لیں گے)۔

''عن خنساء بنت خذام أن أباها زوجها وهي ثيب فكرهت ذلك فأتت رسول الله ﷺ فرد نكاحها''[5]۔

(خنساء بنت خذام سے روایت ہے کہ ان کے والد نے ان کی شادی بغیر ان کی اجازت کے کردی جب کہ وہ ثیبہ تھیں، وہ اس شادی سے خوش نہیں تھیں، لہذا انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی شکایت کی تو جناب رسول اللہ ﷺ نے اس نکاح کو رد فرمادیا)۔

## اس باب سے متعلق روایات پر اصولی بحث:

وہ تمام روایات جن میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ "ولی کی اجازت کے بغیر باکرہ کا نکاح باطل ہے، یا جن میں یہ کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر اپنا نکاح کرلیا تو وہ زانیہ ہے" ان تمام روایات کی سندی حیثیت کو بھی سامنے رکھنا چاہئے۔

حضرت خنساء بنت خذامؓ[6] والی حدیث جس میں جناب رسول اللہ ﷺ نے نکاح کو رد فرمادیا تھا یہ حدیث بھی مرسل ہے اور اس کی روایت ابو سلمہ نے کی ہے۔ فرواہ ابو سلمۃ مرسلاً، اور مرسل روایات علی الاطلاق قابل حجت نہیں ہوتیں[7]۔

[1] سورۂ بقرہ: ۲۳۲۔
[2] سورۂ بقرہ: ۲۳۴۔
[3] مسلم ۵/ ۲۱۸ ووافقہ البخاری، والنسائی عن یحی بن ابی کثیر بہ۔
[4] مسلم: باب استئذان الثیب فی النکاح بالنطق ۵/ ۲۲۰۔
[5] رواہ البخاری۔ مشکاۃ ۲/ ۲۷۰۔
[6] بخاری فی الحیل، احمد فی المسند ۶/ ۳۶۸۔
[7] والمرسل لیس بحجۃ، نصب الرایہ ۳/ ۲۳۲۔

حدیث: "لا نکاح إلا بولی" یہ روایت بھی عن ابی اسحاق عن أبی بردۃ مرسل ہے (یعنی وہ حدیث جس میں سند کا آخری حصہ یعنی تابعی سے اوپر کے راوی کا نام غائب ہو) سفیان ثوری کے بعض تلامذہ نے اسحاق کے واسطے سے اسے مرفوع یعنی (وہ حدیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہو اور بیچ میں کوئی راوی غائب نہ ہو) ذکر کرنے کی کوشش کی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ عثمان زیلعی کہتے ہیں: "وأسنده بعض أصحاب سفيان عن أبي إسحاق ولا يصح"، البتہ موصوف عن أبی اسحاق عن ابی بردۃ عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم والی روایت کو درست اور متصل قرار دیتے ہیں ان کے الفاظ ہیں: "ورواية هولاء الذين رووا عن أبي إسحاق عن أبي بردة عن أبي موسى عن النبي ﷺ "لا نكاح إلا بولي" عندي أصح"[1] اس کی روایت ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے کی ہے، گویا یہ ثابت شدہ روایت ہے، مگر ضعیف ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اگرچہ سند میں اختلاف ہے اور اسی اختلاف کا تذکرہ امام ترمذی نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس حدیث کی دو اور سندیں ہیں:

ایک عن عروہ عن عائشہ جس کی روایت ابن ماجہ نے کی ہے، اس روایت میں ایک راوی حجاج ہے جو ضعیف ہے، دوسری سند عن ہشام عن ابیہ عن عائشہ ہے، اس میں ایک راوی محمد بن یزید بن سنان ہیں اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ دونوں باپ بیٹے ضعیف ہیں[2]، ابن حجر نے عدی بن الفضل کے واسطے سے نقل کیا ہے اور عدی کو ضعیف گردانا ہے[3]۔

حدیث: "لا تزوج المرأة نفسها فإن الزانية هي التي تزوج نفسها" اس کی روایت دارقطنی نے کی ہے اور عن ابی ہریرہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت ہے۔ اس میں دو راوی ہیں، ایک جمیل اور دوسرے مسلم ان دونوں کے بارے میں ابن الجوزی کہتے ہیں: "وجميل ومسلم هذان لا يعرفان" یہ روایت بھی موقوف ہے "ورواه بحر بن نصر... عن ابن سيرين عن ابي هريرة موقوفا وهو اشبه"[4]۔ اس زمرے کی تقریباً تمام روایات کو ابن الجوزی نے "أحاديث واهية ضعيفة" یعنی ضعیف و بے حیثیت کہا ہے[5]۔

حدیث: "أيما امرأة نكحت بغير إذن وليها فنكاحها باطل... الخ"۔

اس روایت میں ایک راوی عمر بن صبیح ہے جو ضعیف ہے، اس حدیث کی ایک سند حضرت انس کے واسطے سے ہے، ایک حضرت علی کے واسطے سے، دو حضرت ابوہریرہ کے واسطے سے، ایک حضرت جابر سے اور ان تمام سندوں میں کوئی نہ کوئی ضعف ہے، حضرت ابوہریرہ والی دونوں سندوں میں سے ایک میں سلیمان بن ارقم جن کو ابن عدی نے ضعیف قرار دیا ہے اور دوسرے میں عزرمی ہیں جن کو بخاری، نسائی اور ابن معین نے کمزور قرار دیا ہے، عثمان زیلعی آخر میں لکھتے ہیں: "وهذه الأحاديث كلها غير محفوظة انتهى" یعنی یہ تمام حدیثیں غیر محفوظ ہیں[6]، مستدرک نے اس روایت کو بخاری و مسلم کی شرط کے مطابق قرار دیا ہے۔ امام ترمذی نے حسن کہا ہے، باوجود اس کے کہ اس روایت پر کلام کیا گیا ہے، صاحب نصب الرایہ آگے تحریر کرتے ہیں: "وفيه كلام تقدم، وتقدم ذلك في حديث ابن عباس، وفي حديث جابر. وفي حديث علي. وفي حديث عبد الله بن عمرو بن العاص وكلها معلولة" یعنی ان سب میں کمزوری ہے[7]۔

حدیث: "لا تنكحوا النساء إلا الأكفاء ولا يزوجهن إلا الأولياء ولا مهر دون عشرة دراهم" یہ حدیث بھی اسی باب سے متعلق ہے۔ اس کی روایت بیہقی نے سنن میں کی ہے، اس کے راوی مبشر بن عبید ہے جو متروک الحدیث ہے اس کے اوپر جھوٹ اور حدیث گھڑنے کا الزام ہے، امام احمد بن حنبل نے ان سے مروی روایات کے متعلق کہا ہے: "أحاديث مبشر بن عبيد موضوعة كذب" یعنی ان کی

[1] نصب الرایہ ۳/ ۲۳۲۔
[2] دیکھئے: نصب الرایہ ۳/ ۲۳۶۔
[3] دیکھئے: تلخیص الحبیر ۲/ ۱۶۲۔
[4] نصب الرایہ ۳/ ۲۳۷۔
[5] حوالہ سابق۔
[6] نصب الرایہ/ ۲۴۵۔
[7] حوالہ سابق/ ۲۴۶۔

روایات موضوع ہیں[1]۔

یہاں سے یہ شبہ کہ اولیاء کو ثیبہ پر کسی جبر کا اختیار نہیں لیکن باکرہ پر ہے ختم ہوجاتا ہے، کیونکہ بیہقی کی وہ روایت جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے، اس میں بصراحت موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثیبہ اور باکرہ دونوں کا نکاح ان کی مرضی کے خلاف کئے جانے کو رد فرمادیا: ''عن ابن عباس أن النبی ﷺ رد نکاح بکر وثیب أنکحهما أبوهما وهما کارهتان فرد النبی ﷺ نکاحهما''[2]۔

مذکورہ تشریحات سے یہ بات تو ثابت ہوہی جاتی ہے کہ اس باب کی تمام روایات متکلم فیہ یا مرسل، یا ضعیف ہیں یا ان میں کوئی نہ کوئی فنی کمی ہے، اس لئے مسائل کے استنباط میں علماء اور مجتہدین کو اسے پیش نظر ضرور رکھنا چاہئے۔

## ائمہ کے نقاط نظر:

مذکورہ بالا نصوص اور آیات واحادیث سے اتنا تو واضح ہے کہ روایات دونوں طرح کی ہیں اور اسی وجہ سے فقہاء کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کی رائے ہے کہ ولی کی اجازت اور رضامندی شرط ہے، عاقلہ بالغہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے شادی نہیں کرسکتی، اور اگر کرلیا تو نکاح درست نہیں ہوگا، خواہ ثیبہ ہو، یا باکرہ، چنانچہ علامہ نووی ''شرح مسلم'' میں لکھتے ہیں:

''واختلف العلماء فی اشتراط الولی، فقال مالك والشافعی: یشترط ولا یصح نکاح إلا بولی، وقال أبوحنیفة رحمه الله: لا یشترط فی الثیب ولا فی البکر البالغة، بل لها أن تزوج نفسها بغیر إذن ولیها''[3]۔

(نکاح میں اولیاء کے شرط قرار دیئے جانے کی بابت علماء کے درمیان اختلاف ہے، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ولی کا ہونا شرط ہے، اور نکاح ولی کے بغیر درست نہیں، اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نہ تو ثیبہ کے نکاح میں ولی کا ہونا شرط ہے، اور نہ باکرہ بالغہ کے، اسے پورا اختیار ہے کہ وہ ولی کی اجازت کے بغیر اپنا نکاح کرلے)۔

اور ''ہدایہ'' میں ہے: ''ولا یجوز للولی إجبار البکر البالغة علی النکاح خلافا للشافعی رحمه الله له الاعتبار بالصغیرة. وهذا، لأنها جاهلة بأمر النکاح لعدم التجربة، ولهذا یقبض الأب صداقها بغیر أمرها. ولنا أنها حرة مخاطبة فلا یکون للغیر علیها ولایة، والولایة علی الصغیرة لقصور عقلها. وقد کمل بالبلوغ بدلیل توجه الخطاب. فصار کالغلام وکالتصرف فی المال، وإنما یملك الأب قبض الصداق برضاها دلالة. ولهذا لا یملك مع نهیها''[4]۔

(ولی کے لئے باکرہ بالغہ پر نکاح میں جبر کرنا جائز نہیں، اس میں امام شافعی کا اختلاف ہے، وہ باکرہ بالغہ کو صغیرہ پر قیاس کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ اس لئے ہے کہ وہ عدم تجربہ کی بنا پر نکاح کے معاملات سے ناواقف ہوتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ولی اپنی صغیرہ بچی کا مہر اس کی اجازت کے بغیر بھی لے سکتا ہے۔ ہمارا استدلال یہ ہے کہ عاقلہ بالغہ چونکہ آزاد ہے، اور براہ راست شریعت کی مخاطب ہے، لہذا اولیاء کو اس پر کسی قسم کی ولایت حاصل نہیں ہوگی، اور جہاں تک صغیرہ پر ولایت کا تعلق ہے تو وہ صرف عقل وشعور کی کمی کی وجہ سے ہے، اور یہ کمی بالغ ہونے سے پوری ہوجاتی ہے، جس کی دلیل اس کا احکام کا مخاطب اور مکلف ہونا ہے، لہذا وہ ایسے ہی ہوگئی، جیسے لڑکا کہ اس کو اپنے اوپر تصرف کا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے، اور جس طرح اپنے مال میں وہ پوری طرح تصرف کی حقدار ہے (اپنے نفس پر بھی حقدار ہوگی)۔ اور جہاں تک باپ کے مہر وصول کرنے کے اختیار کا تعلق ہے، تو وہ اس کی رضامندی اور اشارہ کی بنیاد پر ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر وہ اپنے والد کو مہر وصول کرنے سے منع کردے تو وہ وصول نہیں کرسکتا)۔

## ترجیح:

---

[1] حوالہ سابق ۲۴۸۔
[2] بیہقی ۳/ ۲۳۳ حدیث نمبر ۴۸ - بحوالہ نصب الرایہ ۳/ ۲۴۱۔
[3] شرح مسلم للنووی ۲/ ۴۵۵، طبع مختار اینڈ کمپنی سہارنپور۔
[4] الہدایہ مع الفتح ۳/ ۲۵۱-۲۵۶۔

اس باب میں چونکہ روایات دونوں طرح کی ہیں جیسا کہ ابھی اوپر ذکر ہوا، اس لئے بظاہر یہ دقت محسوس ہوتی ہے کہ کس پر عمل کیا جائے، یا کوئی ایسی راہ اختیار کی جائے جس میں دونوں پر عمل ممکن ہو سکے، لہذا اس کے لئے ترجیح وتطبیق کا راستہ ہی اختیار کیا جانا زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے، تا کہ روایات کی بے جا تاویل اور نقد وتبصرہ سے بچا جا سکے۔

امام شافعی کا اس باب میں اگر چہ اختلاف منقول ہے مگر خود شافعیہ کے یہاں اس پر عمل نہیں ہے، اور نووی اور قاضی عیاض کی رائے اس سے مختلف ہے، اور جہاں تک ثبوت حق کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ حق اولیاء کے بھی ہیں، اور عاقلہ کے بھی ہیں، البتہ دیکھنا یہ ہے کہ شرعاً کس کا حق مقدم ہے؟ اس بارے میں نووی لکھتے ہیں:

''أن لفظة ''أحق'' هنا مشاركة، معناه أن لها في نفسها في النكاح حقا، ولوليها حقا. وحقها أوكد من حقه. فإنه لو أراد تزويجها كفوا وامتنعت لم تجبر، ولو أرادت أن تتزوج كفواً فامتنع الولي أجبر. فإن اسرّ زوجها القاضي. فدلّ على تاكد حقها''[1]۔

(لفظ ''أحق'' یہاں پر دونوں کے حق کو شامل ہے، لہذا اس کا معنی یہ ہوگا کہ عاقلہ بالغہ کا بھی نکاح میں اپنے اوپر حق ہے اور ولی کا بھی اس پر حق ہے، اور عاقلہ کا حق ولی کے حق پر مقدم اور مؤکد ہے، لہذا ولی اگر اس کی شادی کفو میں کرنا چاہے اور عاقلہ بالغہ انکار کرے تو اس کو اس شادی پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اور اگر وہ خود کفو میں شادی کرنا چاہے اور ولی کو اس سے انکار ہو تو ولی کو مجبور کیا جائے گا، اور اگر وہ اپنے انکار پر مصر رہے تو قاضی اس کی شادی کرائے گا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا حق ولی کے حق پر مقدم ہے)۔

اسی لئے فقہاء حنفیہ نے ولایت کی دو قسمیں کی ہیں اور نابالغہ پر ولایت اجبار اور بالغہ عاقلہ پر ولایت استحباب کو ثابت کیا ہے، چنانچہ علامہ ابن الہمام حنفی لکھتے ہیں:

''والولاية في النكاح نوعان: ولاية ندب واستحباب وهو الولاية على البالغة العاقلة بكرا كانت أو ثيبا...''[2]۔ (نکاح میں ولایت دو طرح کی ہوتی ہے، ولایت استحبابی، اور وہ عاقلہ بالغہ پر ہے، خواہ ثیبہ ہو یا باکرہ......)۔

اور درمختار میں ہے: ''وہي نوعان: ولاية ندب على المكلفة ولو بكرا. وولاية إجبار على الصغيرة ولو ثيبا ومعتوهة'' (ولایت کی دو قسم ہے: ندب، یہ مکلفہ پر ہے اگر چہ باکرہ ہو، اور اجبار، یہ صغیرہ پر ہے اگر چہ وہ ثیبہ ہو اور کم عقل ہو)۔

## ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

دونوں طرح کی روایات کو اگر سامنے رکھا جائے تو تجزیاتی پہلو سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سارے حقوق خود عاقلہ بالغہ کے ہیں اور اولیاء کو کوئی اختیار اس پر نہیں تو پھر ان روایات کی کیا توجیہ کی جائے گی جن میں اولیاء کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، اور جیسا کہ بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ ان کے بغیر نکاح ہی درست نہیں ہے، اس سے تو بظاہر دونوں روایتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے؟ واضح رہے کہ اس سلسلہ میں ابن ہمام نے بڑی تفصیل سے کلام کیا ہے، اور دونوں کے درمیان تطبیق کی کوشش بھی کی ہے، اور جواب بھی دیا ہے، چنانچہ قرآن کریم کی ان دو آیات: ''وإذا طلقتم النساء فبلغن أجلهن فلا تعضلوهن أن ينكحن أزواجهن إذا تراضوا بينهم بالمعروف''[3] اور ''فإذا بلغن أجلهن فلا جناح عليكم فيما فعلن في أنفسهن بالمعروف والله بما تعملون خبير''[4] میں یہ بات کہی گئی ہے کہ محض دفع عار اور سماجی اعتبار سے باعث ننگ ہونے کی بنیاد پر عاقلہ بالغہ اور ثیبہ یعنی شوہر دیدہ عورت کو شرع کے دیئے ہوئے شخصی اور ذاتی حقوق پر عمل کرنے سے روکنے کا اولیاء کو کوئی حق نہیں ہے، اور نہ ان کو یہ اختیار ہے کہ اس کی مرضی کے خلاف جبر واکراہ کے ذریعہ جہاں چاہیں نکاح کردیں، یا ان کو اپنا نکاح مرضی کے مطابق کرنے سے روکیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] شرح مسلم للنووی ۲/ ۲۵۵۔

[2] فتح القدیر ۳/ ۱۵۹۔

[3] سورۂ بقرہ: ۲۳۲۔

[4] سورۂ بقرہ: ۲۳۴۔

''فإن له أدلة أخرى سمعية هي المعمول عليها، وهي قوله تعالى: ''فلا تعضلوهن أن ينكحن أزواجهن'' نهى الأولياء عن منعهن من نكاح من أن ينكحن إذا أريد بالنكاح العقد، هذا بعد تسليم كون الخطاب للأولياء، وإلا فقد قيل للأزواج: فإن الخطاب معهم في أول الآية: ''وإذا طلقتم النساء فلا تعضلوهن'' اى لا تمنعوهن حسا بعد انقضاء العدة أن يتزوجن''[1]۔

(جو لوگ اجبار کے قائل نہیں ان کے پاس دوسری بھی سماعی اور نقلی دلیلیں ہیں جو ان کے دلائل کو مزید معتمد بناتی ہیں اور وہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''فلا تعضلوهن أن ينكحن أزواجهن'' اس میں اولیاء کو عاقلہ بالغہ کے اپنے نکاح سے روکنے سے منع کیا گیا ہے، جب وہ شادی کرنا چاہیں، اور یہ بھی اس بات کے تسلیم کر لینے کے بعد کہ اس آیت میں خطاب اولیاء کو کیا گیا ہے، کیونکہ شوہروں کو تو پہلی آیت میں مخاطب کیا ہی گیا ہے: ''فلا جناح عليكم فيما فعلن الخ'' (جب تم عورتوں کو طلاق دے دو تو ان کو عدت کے بعد حسی طور پر اور قید کر کے نکاح سے نہ روکو)۔

اسی طرح دونوں روایت کے تعارض سے متعلق لکھتے ہیں: ''وأما الحديث المذكور وما بمعناه من الأحاديث فمعارضة بقوله ﷺ: الأيم أحق بنفسها من وليها، رواه مسلم وأبوداؤد والترمذي والنسائي ومالك في المؤطا، والأيم لا زوج لها بكرا كانت أوثيبا، وجه الاستدلال أنه أثبت لكل منها ومن الولي حقا في ضمن قوله ''أحق''. ومعلوم أنه ليس للولي سوى مباشرة العقد إذا رضيت، وقد جعلها أحق منه به، فبعد هذا إما أن يجرى بين هذا الحديث وما رواه الحاكم المعارضة والترجيح، أو طريقة الجمع فعلى الأول يترجح هذا بقوة السند وعدم الاختلاف في صحته بخلاف الحديثين فإنهما ضعيفان فحديث ''لا نكاح إلا بولي'' مضطرب في أسناده في وصله وانقطاعه وإرساله قال الترمذي: هذا حديث فيه اختلاف''[2]۔

(مذکورہ حدیث اور ان کے ہم معنی روایات رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد: ''الأيم أحق بنفسها من وليها'' سے معارض ہیں، وجہ استدلال یہ ہے کہ لفظ ''أحق'' کے ضمن میں ولی کے لئے بھی حق ثابت کیا گیا ہے اور ''ایامی'' کے لئے بھی، حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ اولیاء کے لئے صرف یہ حق ہے کہ جب وہ (عاقلہ) کسی نکاح پر راضی ہو تو وہ ان کا نکاح کر دیں، گویا اس نے رضامندی کے بعد ولی کو عقد کا حق سونپا ہے، اس تفصیل کے بعد یا تو اس حدیث اور وہ روایت جسے حاکم نے کی ہے، کے درمیان معارضہ اور ترجیح کو باقی رکھا جائے، یا پھر دونوں میں تطبیق کا راستہ تلاش کیا جائے، لہذا پہلی صورت میں سند کی قوت اور اس کی صحت میں عدم اختلاف کی بنیاد پر اس کو ترجیح دی جائے گی، بخلاف اولیاء کی شرط والی دونوں حدیثوں کے، کیونکہ وہ دونوں ضعیف ہیں، حدیث ''لا نکاح إلا بولی'' کی سند میں اتصال، انقطاع اور ارسال کے سلسلہ میں اضطراب پایا جاتا ہے، اور ترمذی کہتے ہیں کہ اس حدیث میں اختلاف ہے)۔

**خلاصہ:**...... مذکورہ بالا تمام تفصیلات اور نصوص، نیز تجزیہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عاقلہ بالغہ لڑکی پر اولیاء کو ولایت اجبار حاصل نہیں ہے، بلکہ ولایت استحباب ہے، اور جن روایات میں اولیاء کی اجازت کے بغیر نکاح کو باطل قرار دیا گیا ہے، یا اجازت کی بات کہی گئی ہے وہ استحباب کے طور پر ہے، نہ کہ وجوب کے، لہذا کوئی شخص اگر لڑکی کی شادی جبراً کفو، یا غیر کفو میں اپنی پسند سے کر دیتا ہے اور لڑکی اسے ناپسند کرتی ہے تو لڑکی کو قاضی کی عدالت میں اپنا نکاح فسخ کرانے کا اختیار ہوگا، یا نکاح کے وقت ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا کہ شرم وحیا اور حالات کے جبر کی بنیاد پر کچھ بول نہ سکی یا ہاں کہہ دیا اور نکاح ہو گیا تو نکاح تو منعقد ہو جائے گا، البتہ اسے بعدالت قاضی فسخ کرانے کا اختیار ہوگا، اس طرح کا ماحول بنا کر جبراً شادی کرنے کا اولیاء کو شرعی نقطہ نظر سے کوئی حق حاصل نہیں، ولی خواہ باپ ہی کیوں نہ ہو۔

البتہ لڑکی کو چاہئے کہ اپنی پسند کی بابت اپنے والدین اور اولیاء کو بتائے، اور اگر کوئی رشتہ پسند ہو تو اولیاء کو اپنا معاملہ اخلاقی طور پر سپرد کرے تا کہ لوگ معاشرے میں اسے گری نظروں سے نہ دیکھیں، فقہاء نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ درمختار میں ہے: ''يستحب للمرأة تفويض أمرها إلى وليها كي لا تنسب إلى الوقاحة'' (عورت کے لئے بہتر بات یہ ہے کہ وہ اپنا معاملہ اپنے ولی کے سپرد کر دے تا کہ لوگ اسے بے حیائی کی طرف منسوب نہ کریں)۔

☆☆☆

[1] فتح القدیر ۳/۲۵۰۔
[2] فتح القدیر ۳/۲۵۰۔

# جبری شادی

مولانا عبدالاحد تاراپوری
دارالعلوم گجرات

۱- عاقلہ بالغہ لڑکی نکاح میں خود مختار ہے، اسے کوئی بھی نکاح پر مجبور نہیں کرسکتا اور اس کی اجازت کے بغیر کسی نے اس کی طرف سے نکاح قبول کرلیا تو یہ نکاح درست نہیں ہے، غرض یہ کہ عاقلہ بالغہ جب تک خود قبول نہ کرے یا کسی کو اپنا وکیل نہ بنائے اس وقت تک اس کا نکاح صحیح نہیں ہے، اس کی رضا کے بغیر اس کے والدین کی اجازت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

''الأیم أحق بنفسها من ولیها''[1] (شوہر دیدہ عورت اپنے ولی کے مقابلہ میں اپنی ذات کی زیادہ حق دار ہے)۔

حدیث: ''ثلاث جدهن جد وهزلهن جد'' (تین امور میں سنجیدگی سنجیدگی ہے اور مذاق کرنا بھی سنجیدگی ہے) کے پیش نظر اگر لڑکی نے زدوکوب کے ڈر سے یا نفسیاتی دباؤ میں آکر یا پاسپورٹ ضائع کرنے کی دھمکی سے بچنے کے لئے رضامندی ظاہر کردی جب کہ دل سے اس نکاح پر راضی نہیں ہے تو اس کا نکاح ہوجانا چاہئے۔

۲- قاضی یا شرعی کونسل اس نکاح کو فسخ کرسکتے ہیں، اس کی دلیل ایک حدیث شریف ہے:

''عن خنساء بنت خذام أن أباها زوجها وهي ثیب فکرهت ذلك فأتت رسول الله ﷺ فرد نکاحها'' (حضرت خنساء بنت خذام انصاریہ سے روایت ہے کہ ان کے والد نے ان کا نکاح کردیا اور وہ ثیبہ تھیں، تو انہوں نے اس نکاح کو ناپسند کیا، چنانچہ وہ رسول اکرم ﷺ کے پاس آئیں تو آپ ﷺ نے ان کا نکاح رد کردیا) اور ابن ماجہ کی روایت میں ہے ''نکاح أبیها'' (آپ ﷺ نے ان کے والد کے کئے ہوئے نکاح کو رد کردیا)۔

فقہاء کرام نے کفاءت کا اعتبار چار چیزوں میں کیا ہے: ۱-نسب، ۲-دین، ۳-مال، ۴-پیشہ، لہٰذا برطانیہ کے ماحول میں رہنے والی لڑکی اور ہندوستان میں پرورش پانے والے لڑکے کے درمیان جو معاشرتی فرق ہے، اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، اس بنیاد پر اگر لڑکی یہ دعوی کرے کہ میرا نکاح کفو میں نہیں ہوا اور اس بنا پر مجھے تفریق کا حق حاصل ہے تو اسے اس طرح کا دعوی کرنے کا حق نہیں ہوگا۔

☆☆☆

[1] مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، موطا۔

# جبری شادی

مفتی محمد عبدالرحیم قاسمی
جامعہ خیر العلوم، نور محل روڈ، بھوپال

۱- ایسا نکاح جائز نہیں ہے[1]۔

۲- ولی اگر دھوکہ دے کر نکاح کردے تو حقیقت کی خبر ہونے پر عاقلہ بالغہ اس نکاح کو رد کرسکتی ہے[2]۔

نکاح کے سلسلے میں عاقلہ بالغہ کی رضامندی کے متعلق ولی کا قول معتبر نہیں:

''ولا يقبل عليها قول وليها بالرضاء. لأنه يقر عليها بثبوت الملك للزوج. وإقراره عليها بالنكاح بعد بلوغها غير صحيح''[3] (اس کے خلاف اس کی رضامندی کے بارے میں اس کے ولی کا قول قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ وہ اس کے خلاف شوہر کے لئے ثبوت ملک کا اقرار کررہا ہے، اور اس کے بلوغ کے بعد اس کے خلاف اس کا اقرار صحیح نہیں ہے)۔

۳- زوج اور زوجہ کے درمیان کفاءت ثابت نہ ہونے کی وجہ سے بالغ لڑکی کو تفریق کرانے کا حق حاصل رہے گا۔

''لو شرطت الكفاءة بقي حقها (شامي) تعتبر الكفاءة للزوم النكاح اى على ظاهر الرواية ولصحته على رواية الحسن المختارة للفتوى''[4] (اگر کفاءت کی شرط لگائی گئی تو عورت کا حق باقی رہے گا (شامی) کفاءت کا اعتبار ہوگا، لزوم نکاح کے لئے یعنی ظاہر الروایہ کے مطابق اور صحت نکاح کے لئے حسن کی روایت کے مطابق جو فتوی کے لئے مختار ہے)۔

بالغ لڑکی کو تفریق کا حق حاصل رہے گا۔

۴- زن وشوئی کے تعلقات لڑکی کو مجبور کرکے قائم کئے ہیں تو نکاح کو رد کرنے کا بالغ لڑکی کا قول معتبر ہوگا[5]۔

۵- قاضی یا شرعی کونسل کو عاقلہ بالغہ کا قول قسم کے ساتھ معتبر مان کر نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہے۔

☆☆☆

[1] فتاوی عالمگیری ۱/۲۸۸۔
[2] فتاوی عالمگیری ۱/۲۸۸۔
[3] فتاوی عالمگیری ۱/۲۸۹۔
[4] شامی ۲/۳۱۸۔
[5] شامی ۲/۳۰۲۔

# جبری نکاح کی شرعی حیثیت

مولانا محمد ابوبکر قاسمی
شکرپور بھرواره، دربھنگہ

## ۱- بحالت اکراہ نکاح کی اجازت کا شرعی حکم:

اس صورت میں اس کا نکاح شرعاً منعقد و نافذ ہو جائے گا۔

''وإن أكره على النكاح جاز العقد''[1] (اگر نکاح پر مجبور کیا گیا تو عقد نافذ مانا جائے گا)۔

اسی طرح فتاوی ہندیہ میں ہے: ''وإذا أكرهت المرأة على النكاح ففعلت فإنه يجوز العقد ولا ضمان على المكره''[2] (جب کسی عورت کو نکاح پر مجبور کیا گیا اور اس نے نکاح کر لیا تو عقد جائز ہو گیا اور مجبور کرنے والے پر کسی بھی حال میں تاوان نہیں ہے)۔

کون نہیں جانتا کہ مذہب اسلام کو قبول کرنے کے لئے اکراہ جائز نہیں ہے، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: ''لا إكراه في الدين''[3] تاہم حالت اکراہ کے اسلام کو بھی حضرات فقہاء نے معتبر مانا ہے[4]۔

بحالت اکراہ اسلام قبول کرنے ہی کی طرح بحالت اکراہ نکاح کے اذن کو سمجھنا چاہئے۔ ایک حدیث نبوی میں صاف صراحت موجود ہے:

''ثلاث جدهن جد وهزلهن جد: النكاح والطلاق والرجعة''[5] (تین چیزیں بالقصد اور پختگی کے ساتھ ہوں یا مذاق کے ساتھ ہوں انہیں بالقصد ہی مانا جائے گا، نکاح، طلاق اور رجعت)۔

اس حدیث پاک سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نکاح و طلاق اور رجعت کے معاملہ کو مذہب اسلام نے ہر حال میں یہاں تک کہ حالت اکراہ میں بھی معتبر مانا ہے، کیونکہ نکاح کا انعقاد ایجاب و قبول سے ہوتا ہے جس کا تکلم زبان سے کیا جاتا ہے، اس لئے زبانی اذن کے سبب جبری نکاح بھی شرعاً معتبر تسلیم کیا جائے گا[6]۔

## ۲- بحالت اکراہ نکاح کی زبانی و تحریری اجازت کا حکم:

اگر زبانی اجازت کے بجائے زبردستی اس سے تحریر لکھوا کر دستخط کروالیا گیا، اور بحالت اکراہ ہی تحریری اجازت نامہ حاصل کیا گیا مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا تو شرعاً حالت اکراہ کی اس تحریر کو حقیقی اذن و رضا نہیں مانا جائے گا اور اس حالت میں کیا ہوا نکاح شرعاً معتبر نہ ہوگا[7]۔

## ۳- عورت کے ولی کے غیر کفو مرد سے بحالت اکراہ شادی کر دینے کے دعوی کی بنیاد پر فسخ نکاح کی شرعی حیثیت:

اگر برطانیہ کے ماحول میں رہنے والی لڑکی کی ہندوستان میں پرورش پانے والے لڑکے سے دباؤ ڈال کر شادی کر دی جائے پھر شادی کے بعد دونوں ملک

[1] الجوہرة النیرة، الجزء الثانی من المجلد الثانی ص ۱۳۰۔
[2] فتاوی عالمگیری ۱/ ۲۹۴۔
[3] سورۂ بقرہ/ ۲۵۶۔
[4] الجوہرة النیرة، کتاب الاکراہ ۳/ ۱۳۰۔
[5] ابوداؤد ۱/ ۲۹۸، ابن ماجہ ۱/ ۱۴۸، مشکاة ۲/ ۲۸۴، ترمذی ۱/ ۱۴۲، شرح معانی الآثار ۲/ ۵۷۔
[6] الموسوعة الفقہیہ ۲۲/ ۲۳۴۔
[7] ردالمحتار ۲/ ۱۵۷، فتاوی خانیہ علی ہامش الہندیہ ۱/ ۲۷۴، قواعد الفقہ، قاعدہ/ ۲۵۵ ص ۱۰۷۔

کے طرز رہائش، طور وطریق، معاشرت ومزاج اور زبان کے فرق کے سبب لڑکی شوہر کو اپنے لئے بے جوڑ پاکر قاضی کی عدالت میں یا شرعی پنچائت میں فسخ نکاح کا مطالبہ کرے تو شرعاً عورت کا یہ مطالبہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ حضرات فقہاء نے مذکورہ امور میں کفاءت کا اعتبار نہیں کیا ہے، البتہ اگر واقعۃً شوہر غیر کفو ہو، مثلاً فاسق ہو، فقیر ہو، بالکل ہی ادنی پیشہ والا ہو، یا نسبی اعتبار سے بے جوڑ ہو تو عورت کو فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق ہوگا، اور قاضی ان صورتوں میں نکاح فسخ کردے گا، چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے:

''وأما إذا أكرهت على أن تزوج نفسها من غير الكفوء أو بأقل من مهر المثل ثم زال الإكراه فلها الخيار. كذا في المحيط''[1] (جب کسی عورت کو غیر کفو مرد یا مہر مثل سے کم مہر پر نکاح کرنے پر مجبور کیا گیا تو اکراہ کے ختم ہونے کے بعد عورت کو خیار فسخ ہوگا)۔

## ۴- بحالت اکراہ بے جوڑ شوہر سے شادی ہونے کی صورت میں عورت کو حق تفریق حاصل ہونے میں تفصیل:

اگر جبری شادی ہونے کے بعد عورت نے خود کو شوہر کے حوالہ کردیا، یا شوہر سے اس نے مہر کی رقم کا مطالبہ کردیا تو یہ شرعاً رضامندی ہے، اور اس رضامندی کے بعد عورت کو مہر مسمی ملے گا اور اسے شرعاً فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق حاصل نہ ہوگا، چنانچہ ''السراج الوہاج'' کے حوالہ سے فتاوی عالمگیری میں ہے:

''إذا مكنت الزوج بعد ما زوّجها الولي فهو رضا وكذا لو طالبت بصداقها بعد العلم فهو رضا''[2] (جب عورت نے ولی کے شادی کرادینے کے بعد اپنے اوپر شوہر کو قدرت دے دی اسی طرح نکاح کے علم کے بعد عورت نے شوہر سے مہر کا مطالبہ کردیا تو یہ شرعاً رضامندی ہے)۔

ہاں اگر عورت نے بخوشی شوہر کو اپنے اوپر قدرت نہ دی ہو بلکہ شوہر نے زبردستی اس سے وطی کرلی ہو تو عورت کے لئے فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق باقی رہے گا[3]۔

اسی طرح زوجین میں زن وشوئی کے تعلقات قائم نہ ہوئے ہوں تب بھی عورت کو شوہر کے غیر کفو ہونے کی صورت میں فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا، اور دخول سے پہلے نکاح فسخ ہونے کی صورت میں عورت کو مہر کی رقم میں سے کچھ نہیں ملے گا[4]۔

اور اگر عورت کے اولیاء نے کسی عورت کا نکاح مہر مثل پر کفو مرد سے زبردستی کردیا ہو تو ایسی صورت میں عورت کو ہرگز ہرگز فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق حاصل نہ ہوگا۔

''وإذا أكرهت المرأة على أن تزوج نفسها عن كفء بمهر المثل ثم زال الإكراه فلا خيار لها''[5] (جب عورت کو مہر مثل پر کفو سے شادی کرنے پر مجبور کیا گیا تو ازالہ اکراہ کے بعد عورت کو خیار فسخ حاصل نہ ہوگا)۔

## ۵- بحالت اکراہ منعقد ہونے والی شادی کا اگر قاضی کو علم ہوجائے تو وہ کیا کرے؟

محض جبر واکراہ کی بنیاد پر قاضی نکاح کو فسخ نہیں کرسکتا، ہاں اگر ولی نے غیر کفو مرد سے اور مہر مثل سے کم پر بحالت اکراہ بے جوڑ نکاح کردیا ہو اور نکاح کے بعد برضا ورغبت میاں بیوی کے تعلقات قائم نہ ہوئے ہوں یا تعلقات قائم ہوگئے ہوں مگر عورت نے خوشی سے شوہر کو اپنے اوپر قدرت نہ دی ہو بلکہ مرد نے زبردستی وطی کی ہو تو ان صورتوں میں قاضی یا شرعی کونسل عورت کے فسخ نکاح کے مطالبہ کے بعد نکاح کو فسخ کرسکتا ہے، ورنہ نہیں، اور عورت کو فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق بچہ کی ولادت سے پہلے تک رہے گا[6]۔



[1] فتاوی ہندیہ ۱/ ۲۹۷۔
[2] فتاوی ہندیہ ۱/ ۲۸۷۔
[3] حوالہ بالا۔
[4] حوالہ بالا۔
[5] حوالہ بالا۔
[6] الموسوعۃ الفقہیہ ۳۴/ ۲۸۳۔

# جبری شادی

مولانا محمد اقبال قاسمی

مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھروارہ دربھنگہ

## عاقلہ بالغہ لڑکی کا نکاح:

شریعت میں عقل اور بلوغ پر احکام اصلیہ اور فرعیہ کا مدار ہے، جب تک یہ دونوں چیزیں انسان میں موجود نہ ہوں وہ احکام کا مکلف نہیں ہوتا، اسی لئے بچہ اور مجنون غیر مکلف ہیں، اور جب آدمی عاقل، بالغ ہوجائے تو وہ احکام شرع کا مکلف ہوجاتا ہے، مرد ہو یا عورت، اور بندہ مجبور محض نہیں ہے، اس لئے احکام شرع پر عمل کرنے کی صورت میں ثواب کا اور عمل نہ کرنے کی صورت میں عذاب کا مستحق ہوتا ہے، اور جب مجبور محض نہیں ہے تو اس کو کسی کام پر مجبور کرنا اور اس پر دباؤ ڈالنا یا زدوکوب کرنا شریعت کے مزاج کے خلاف ہے، ارشاد خداوندی ہے:

"إنا هديناه السبيل إما شاكرا و إما كفورا"[1]۔ (ہم نے انسان کو راستہ بتادیا، اب اس کو اختیار ہے کہ وہ شکر گذار بنے یا ناشکرا)۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ بالکل آزاد ہے، وہ جو چاہے کرے، اور جیسی چاہے زندگی گذارے بلکہ اس کو ایک قانون دیا گیا ہے، اسی قانون میں شادی اور نکاح ہے، شادی اور نکاح کے جو اصول وضوابط ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ زوجین کے مابین توافق، ہم آہنگی اور مودّت ومحبت تاحیات برقرار رہے، اسی مقصد کے پیش نظر جہاں عورت کو جب وہ عاقلہ بالغہ ہوجائے اپنے اختیار اور رضا ورغبت سے نکاح کرنے کی اجازت دی ہے اور اس کے پسند کردہ شوہر سے نکاح کو شریعت نے نافذ مانا ہے:

"وينعقد نكاح الحرة العاقلة البالغة برضائها وإن لم يعقد عليها ولي"[2]۔

(آزاد عاقلہ بالغہ کا نکاح اس کی رضامندی سے منعقد ہوجاتا ہے، اگرچہ ولی نے عقد نہ کرایا ہو)۔

اور اولیاء پر پابندی لگادی ہے کہ وہ اس کو نکاح پر مجبور نہ کریں:

"ولا يجوز للولي إجبار البكر البالغة على النكاح"[3]۔ (بالغہ باکرہ لڑکی کو نکاح پر مجبور کرنا ولی کے لئے جائز نہیں ہے)۔

وہیں عورت پر یہ پابندی بھی لگادی ہے کہ وہ اپنی شادی غیر کفو میں نہ کرے، اگر کرلیتی ہے تو حسن بن زیاد کے قول کے مطابق نکاح درست نہیں ہوگا اور جمہور کے قول کے مطابق نکاح لازم نہیں ہوگا اور اولیاء کو اختیار ہے کہ وہ قاضی شریعت سے نکاح کو ختم کروالے۔

"عدم کفاءت کے وقت ولی کے لئے نکاح فسخ کرانا جائز ہے، اور یہ مبنی ہے ظاہر الروایۃ پر کہ عقد صحیح ہے اور ولی کو حق اعتراض حاصل ہے، اور حضرت حسنؒ کی روایت کے مطابق عقد صحیح نہیں ہے، اور یہی قول فتوی کے لئے پسندیدہ ہے"[4]۔

اور عورت چونکہ ناقص العقل ہوتی ہے وہ نکاح کے نشیب وفراز اور اس کے مصالح سے واقف نہیں ہوتی، اس لئے عورت کے لئے عاقلہ بالغہ ہونے کے باوجود مستحب یہی قرار دیا گیا ہے کہ وہ خود سے اپنا نکاح نہ کرے بلکہ نکاح کے معاملہ کو ولی کے سپرد کردے:

[1] سورۂ ہود: ۳۔

[2] الہدایہ ۲/ ۳۱۳۔

[3] الہدایہ ۲/ ۳۱۴۔

[4] ردالمحتار ۲/ ۳۴۴۔

''يستحب للمرأة تفويض أمرها إلى وليها كيلا تنسب إلى الوقاحة''[1]۔

(عورت کے لئے مستحب یہ ہے کہ وہ اپنے معاملہ کو اپنے ولی کے سپرد کردے تاکہ اس کی طرف بے حیائی منسوب نہ ہو)۔

جب شریعت نے عورت کے عاقلہ بالغہ ہونے کی حالت میں اس کے کئے ہوئے نکاح کو جائز اور درست مانا ہے اور اسے خود اپنا نکاح کرنے کا اختیار دیا ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کے لئے مستحب یہی قرار دیا ہے کہ وہ نکاح خود سے نہ کرے بلکہ ولی سے کرائے تو اب ولی کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ لڑکی کا نکاح اس کے مناسب لڑکے سے کرائے، کسی ایسے لڑکے کا انتخاب نہ کرے جو لڑکی کے میل اور جوڑ کا نہ ہو، جب لڑکی کا نکاح اس کے مناسب لڑکے سے ہوگا تو ایسی صورت میں لڑکی اور ولی دونوں کی رضامندی پائی جائے گی اور نکاح لازم ہوگا، اور یہ مناسب نہیں ہے کہ بے جوڑ لڑکے سے اس کو نکاح پر بیجا مجبور کرے، اور لڑکی کو ڈرا دھمکا کر یا زدوکوب کرکے یا نفسیاتی دباؤ ڈال کر کے نکاح کرادے حالانکہ وہ لڑکی اس سے نکاح کرنے کے لئے بالکل آمادہ نہ ہو، کیونکہ ولی کی ولایت کا مقصد یہ ہے کہ صحیح جگہ نکاح ہو ورنہ اس طرح بے جوڑ شادی تو وہ خود بھی کرسکتی تھی لیکن اگر ولی اس کا رشتہ اس کے میل اور کفو میں کرائے یا غیر کفو میں کرائے اور لڑکی زبان سے ہاں نہ کہے تو اس صورت میں نکاح ہی درست نہ ہوگا، ردالمحتار میں علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

''ليس للولي إلا مباشرة العقد إذا رضيت'' (ولی کو حق نہیں ہے مگر عقد کو انجام دینا جب کہ وہ راضی ہو)۔

اور اگر ولی نے لڑکی کو ڈرا دھمکا کر یا زدوکوب کر کے یا نفسیاتی دباؤ میں لاکر یا غیر ملکی لڑکی کو پاسپورٹ ضائع کردینے کی سخت دھمکی دے کر اس سے نکاح کے لئے ہاں کہلوالیا جب کہ دل سے وہ اس پر راضی نہیں ہے اور اس کا نکاح کرادیا تو یہ نکاح شرعاً درست ہے:

''وإذا أكرهت المرأة على النكاح ففعلت فإنه يجوز العقد''[2]۔

(جب عورت کو نکاح پر مجبور کیا گیا اور اس نے کرلیا تو بلاشبہ عقد درست ہے)۔

اور یہ صورت رضامندی میں شامل نہیں ہوگی، کیونکہ لڑکی اس نکاح سے راضی نہیں ہے، اس نے تو ولی کے دباؤ میں آکر نکاح کی اجازت دی ہے۔ رضامندی کے لئے تو ضروری ہے کہ وہ خوش ہوکر قبول کرے، دباؤ میں آکر نہیں، چنانچہ مفتی عمیم الاحسان صاحب مجددی ''التعریفات الفقہیہ'' میں رضا کی تعریف ان لفظوں میں کرتے ہیں:

''الرضاء الاختيار والقبول... وهو اسم من رضيٰ ضد سخط''[3]۔

(رضا کے معنی پسند کرنا اور قبول کرنا......اور یہ رضی کا اسم ہے جو سخط بمعنی ناراضگی کی ضد ہے)۔

ہاں یہ جبر واکراہ ہے، کیونکہ اس کو دھمکی دے کر ہاں کہنے پر مجبور کیا جارہا ہے، اور اکراہ کا مفہوم بھی یہی ہے کہ کسی شخص کو بغیر اس کی رضامندی کے دھمکی دے کر کسی کام پر مجبور کیا جائے۔

''الإكراه هو إجبار أحد على أن يعمل عملا بغير حق من دون رضاه بالإخافة''[4]۔

(اکراہ کسی شخص کو ناحق بغیر اس کی رضا کے ڈرا کر کسی کام کے کرنے پر مجبور کرنا ہے)۔

اور جب اس پر اکراہ کی تعریف صادق آتی ہے تو پھر رضا کی تعریف صادق نہیں آسکتی، کیونکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، جیسا کہ لفظ دون رضاہ دلالت کررہا ہے۔

## رضا اور اذن کی حقیقت اور لڑکی سے زبردستی دستخط کرانا:

[1] ردالمحتار ۲/ ۳۲۱۔

[2] ردالمحتار ۲/ ۳۲۲۔

[3] الفتاوی الہندیہ ۱/ ۲۹۴۔

[4] التعریفات الفقہیہ رص ۳۰۸۔

فقہاء کرام نے عاقلہ بالغہ لڑکی کے جواز نکاح کے لئے اذن کو لازم قرار دیا ہے، رضا اور خوشی کو نہیں، فتاوی ہندیہ میں ہے:

''لا یجوز نکاح أحد علی بالغة صحیحة العقل من أب أو سلطان بغیر إذنها بکراً کانت أو ثیباً فإن فعل ذلك فالنکاح موقوف علی إجازتها''[1]۔ (کسی شخص کا نکاح بالغہ عاقلہ پر بغیر اس کی اجازت کے نافذ نہیں ہوگا، خواہ باپ ہو یا بادشاہ، لڑکی کنواری ہو یا بیاہی، پس اگر ایسا کیا تو لڑکی کی اجازت پر موقوف ہوگا)۔

اور اذن کی حقیقت کسی شئی کو نافذ یا جائز قرار دینے کی اطلاع اور رخصت دینا ہے، ''المعجم الوسیط'' میں ہے:

''الإذن الإعلام بإجازة الشئ والرخصة فیه''[2]۔

(اذن کسی چیز کو جائز قرار دینے سے باخبر کرنا اور اجازت دینا ہے)۔

اور رضا کی حقیقت ہے کسی چیز کو پسند کرنا، دل سے قبول کرنا، اور اس کی ضد ناراضگی آتی ہے[3]۔

اور ان دونوں کے درمیان عام خاص من وجہ کی نسبت ہے، کبھی صرف اذن پایا جائے گا، رضا نہیں جیسے زبان سے کسی شخص کو اپنا کوئی سامان لینے کی اجازت دینا اور دل سے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنا اور کبھی رضامندی پائی جائے گی، اذن نہیں جیسے دل سے کسی شخص کو کوئی سامان دینے کے لئے تیار اور آمادہ رہنا لیکن نہ صراحتاً اجازت دینا اور نہ دلالۃً اور کبھی دونوں پائے جائیں گے جیسے بخوشی اجازت دینا، پھر اذن کی دو قسمیں ہیں: ایک صراحۃً اجازت دینا دوسرے دلالۃً اجازت دینا جیسے کنواری لڑکی کی خاموشی بوقت اجازت دلالۃً اذن ہے۔

''وإن استأذن الولي البکر البالغة فسکتت فذلك إذن منها''[4]۔

(اگر ولی نے کنواری بالغہ لڑکی سے اجازت لی اور وہ چپ رہی تو یہ اس کی جانب سے اجازت ہے)۔

زیر بحث مسئلہ میں جب لڑکی نے ہاں کہہ دیا تو کیسے اس کا مفہوم یہ لیا جائے کہ اس نے اجازت نہیں دی ہے، اس نے اجازت دی ہے اور وہ بھی زبان سے دی ہے، اگرچہ دلالۃً لڑکی کی طرف سے اجازت نہیں ہے اور فقہاء اصولیین کے نزدیک صریح کے مقابلہ میں دلالت کا کوئی اعتبار نہیں، قواعد الفقہ میں ہے:

''لا عبرة بالدلالة في مقابلة الصریح''[5]۔ (صریح کے مقابلہ میں دلالت کا کوئی اعتبار نہیں)۔

دوسری جگہ ہے: ''یسقط اعتبار دلالة الحال إذا جاء التصریح بخلافها''[6]۔

لہٰذا زبردستی ہاں کہلوالینا اذن صریحی ہے اور دستخط کرالینا نہ اذن صریحی ہے نہ کنائی، اس لئے پہلی صورت میں نکاح کا انعقاد ہو جائے گا، دوسری صورت میں نہیں۔

## لڑکی کی طرف سے عدم کفاءت کا دعوی:

برطانیہ کے ماحول میں رہنے والی لڑکی اور ہندوستان میں پرورش پانے والے لڑکے کے درمیان اگرچہ معاشرتی فرق ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے کفو نہیں ہو سکتے۔ کفو کے لئے شریعت نے جن چیزوں میں برابری کو معتبر مانا ہے، وہ حریت، اسلام، نسب، دیانت وتقوی، مالداری اور صنعت وحرفت ہیں، فتاوی ہندیہ میں ہے:

''الکفاءة تعتبر في أشیاء، منها النسب ومنها الإسلام ومنها الحریة ومنها الکفاءة في المال ومنها الدیانة ومنها

---

[1] الہندیہ ۱/ ۲۸۷۔
[2] معجم الوسیط ۱/ ۱۲۔
[3] التعریفات الفقہیہ رص ۳۰۸۔
[4] الہندیہ ۱/ ۲۸۷۔
[5] قواعد الفقہ (قاعدہ ۲۵۵) مفتی عمیم الاحسان صاحب رص ۱۰۷۔
[6] قواعد الفقہ (قاعدہ ۴۰۸) رص ۱۴۱۔

الحرفة''[۱]۔ (کفاءت چند چیزوں میں معتبر ہے، نسب میں، اسلام میں، آزادی میں، مال میں، دیانت میں اور پیشہ میں)۔

اور کچھ فقہاء نے عقل، خاندانی وجاہت اور عیوب سے پاک ہونے کو بھی امور کفاءت میں شمار کیا ہے لیکن اصحاب متون نے ان سب کو معتبر نہیں مانا ہے اور صرف امور بالا ہی کو ذکر کیا ہے[۲]۔

اب اگر والدین یا دیگر اولیاء نے لڑکی کا نکاح ایسے لڑکے سے کرایا ہے جس میں کفاءت کے مذکورہ بالا امور موجود ہیں اور لڑکا لڑکی کے جوڑ اور میل کا ہے تو ایسی صورت میں لڑکی کو یہ دعوی کرنے کا حق نہیں ہے کہ جس شخص سے میری شادی کی جارہی ہے وہ میرا کفو نہیں ہے، فتاوی ہندیہ میں ہے:

''وإذا أکرهت المرأة علی أن تزوج نفسها من کفء بمهر المثل ثم زال الإکراه فلا خیار لها''[۳]۔

(جب عورت کو اس پر مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی شادی کفو سے مہر مثل میں کرلے پھر جبر ختم ہوجائے تو عورت کے لئے کوئی اختیار نہیں ہوگا)۔

اور اگر لڑکا لڑکی کا کفو نہیں ہے تو ایسی صورت میں لڑکی عدم کفاءت کا دعوی کرکے نکاح فسخ کراسکتی ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب موقوف ہے اس پر کہ کفاءت عورت کا حق ہے یا ولی کا یا دونوں کا، تو فقہاء کی عبارتیں اس بابت مختلف ہیں، صاحب درمختار لکھتے ہیں:

''والکفاءة هي حق الولي لا حقها فلو نکحت رجلا ولم تعلم حاله فإذا هو عبد لا خیار لها بل للأولیاء''[۴]۔

(کفاءت ولی کا حق ہے، عورت کا نہیں، لہذا اگر عورت نے کسی شخص سے نکاح کیا اور اس کا حال نہ جان سکی پھر اچانک معلوم ہوا کہ وہ غلام ہے تو عورت کو کوئی اختیار نہیں ہے بلکہ اولیاء کو ہے)۔

اس قول کے اعتبار سے جب کفاءت عورت کا حق ہے ہی نہیں تو پھر اس کو ولی کے خلاف عدم کفاءت کا دعوی کرنے کا حق بھی نہیں ہوگا، اور جب حق دعوی نہیں تو حق تفریق کہاں سے حاصل ہوگا، لیکن علامہ ابن عابدین شامی کی رائے یہ ہے کہ کفاءت عورت اور ولی دونوں کا حق ہے، دلیل یہ ہے کہ باپ اور دادا کے علاوہ اگر کوئی دوسرا ولی صغیرہ کا نکاح غیر کفو سے کردے تو یہ درست نہیں ہے[۵]۔

اور یہی بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ کفاءت دونوں کا حق ہے، اس لئے کہ لڑکے کا غیر کفو ہونا جس طرح والدین اور خاندان والے کے لئے شرم و عار کی بات ہے اس سے کہیں زیادہ لڑکی کے لئے عار کا سبب ہے، اسی لئے شریعت نے لڑکی کے لئے لڑکے کا کفو ہونا معتبر گردانا ہے، نہ کہ لڑکے کے لئے لڑکی کا کفو ہونا، اور جب کفو عورت کا بھی حق ہے تو غیر کفو سے شادی کرنے کی صورت میں لڑکی کو یہ دعوی کرنے کا حق ہے کہ میری جس شخص سے شادی کی گئی ہے وہ میرا کفو نہیں ہے، اس لئے بر بنائے کفاءت مجھے حق تفریق حاصل ہے[۶]۔

## جبری شادی کے بعد زن وشوئی تعلقات:

اس طرح جبری شادی کے بعد اگر میاں بیوی میں زن وشوئی تعلقات قائم ہوجاتے ہیں اور لڑکی نے برضاء ورغبت لڑکے کو اپنے اوپر قدرت دی ہے تو یہ رضامندی شمار کی جائے گی، اس لئے کہ بخوشی اپنے اوپر قدرت دینا عقد کو جائز قرار دینا ہے۔ اسی طرح اگر لڑکی شادی کے بعد لڑکے سے مہر کا مطالبہ کرے تو وہ بھی رضامندی ہے۔ عالمگیری میں ہے:

''وکذا إذا مکنت الزوج من نفسها بعد ما زوجها الولي فهو رضا وکذا لو طالبت بصداقها بعد العلم فهو رضا

---

۱۔ الہندیہ ۱ / ۲۹۰، ۲۹۱، کنز الدقائق علی ہامش، البحر الرائق ۳ / ۱۳۹۔

۲۔ البحر الرائق ۳ / ۱۴۳۔

۳۔ عالمگیری ۱ / ۲۹۴۔

۴۔ درمختار علی ہامش رد المحتار ۲ / ۳۴۴۔

۵۔ رد المحتار ۲ / ۳۴۳۔

۶۔ الفتاوی الہندیہ ۱ / ۲۹۴۔

كذا في السراج الوهاج"[۱]۔ (اسی طرح جب وہ شوہر کو اپنے اوپر قدرت دے دے بعد اس کے کہ ولی نے اس کی شادی کرائی تھی تو یہ رضامندی ہے، اسی طرح اگر وہ شادی کے علم کے بعد اپنے مہر کا مطالبہ کرے تو یہ بھی رضا ہے)۔

اور اس صورت میں لڑکی کو حق تفریق حاصل نہیں ہوگا اگرچہ لڑکا غیر کفو ہو۔

"وإن دخل بها طائعة يلزمه المسمى ولا يزاد عليه ويكون هذا رضا منها بالنكاح لأن تمكينها من نفسها إجازة للعقد كقولها: رضيت ويسقط الخياران الثابتان لها: التفريق لعدم الكفاءة وإتمام مهر المثل"[۲]۔

(اور اگر اس نے عورت سے رضامندی کے ساتھ دخول کیا تو شوہر پر مہر مسمی لازم ہوگا، اس پر اضافہ نہیں کیا جائے گا اور یہ عورت کی جانب سے نکاح پر رضامندی ہوگی، اس لئے کہ عورت کا اپنے اوپر قدرت دینا عقد کو جائز قرار دینا ہے جیسے یہ کہنا کہ میں راضی ہوں اور وہ دونوں اختیار ساقط ہوجائیں گے جو عورت کے لئے ثابت تھے، تفریق بربنائے عدم کفاءت اور مہر مثل کی تکمیل)۔

اور اگر لڑکی نے بخوشی وطی کی اجازت نہیں دی اور اس نے اس سے زبردستی وطی کرلی تو یہ رضامندی شمار نہیں ہوگی اور لڑکی کو حق تفریق حاصل ہوگا۔

"فإن دخل بها إن كانت مكرهة لزمه مهر المثل، وحق الاعتراض لعدم الكفاءة باق"[۳]۔

(اگر اس نے اس سے دخول کیا تو اگر زبردستی کیا ہو تو شوہر پر مہر مثل لازم ہوجائے گا اور بربنائے عدم کفاءت حق اعتراض باقی رہے گا)۔

اسی طرح اگر زن وشوئی تعلقات زوجین کے مابین قائم نہیں ہوئے ہیں تو عورت کو عدم کفاءت یا مہر کے مہر مثل سے کم ہونے کی بنا پر حق تفریق حاصل ہے، وہ چاہے تو قاضی یا شرعی کونسل کو نکاح کو فسخ کرنے کی درخواست دے سکتی ہے جیسا کہ اوپر آچکا ہے[۴]۔

اگر قاضی یا شرعی کونسل نکاح فسخ کردے تو شوہر پر نہ مہر مثل لازم ہوگا اور نہ مہر مسمی، اس لئے کہ تفریق عورت کی جانب سے آئی ہے اور وہ بھی دخول سے پہلے ہے۔

"ولو فرق بينهما قبل الدخول لايلزمه شئ كذا في السراج الوهاج"[۵]۔

(اور اگر دونوں میں دخول سے پہلے تفریق ہوگئی تو شوہر پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا)۔

یہ تمام تفصیلات اس وقت ہیں جبکہ شوہر لڑکی کا کفو نہ ہو، اور اگر کفو ہے اور مہر مہر مثل ہے یا مہر پر اس کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو پھر لڑکی کو حق تفریق حاصل نہیں ہے نہ دخول سے پہلے نہ دخول کے بعد[۶]۔

## قاضی شریعت یا شرعی کونسل کا نکاح کو فسخ کرنا:

قاضی یا شرعی کونسل اس نکاح کو محض جبر واکراہ کی بنیاد پر فسخ نہیں کرسکتے ہیں، کیونکہ جبر واکراہ اسباب فسخ میں سے نہیں ہے، ہاں لڑکا لڑکی کے میل اور جوڑ کا نہ ہو اور دونوں کے درمیان شرعی اعتبار سے برابری نہ پائی جاتی ہو یا مہر مہر مثل سے کم ہو اور دونوں میں برضاء ورغبت زن وشوئی تعلقات قائم نہ ہوئے ہوں تو ایسی صورت میں اگر لڑکی فسخ نکاح کا دعوی کرتی ہے تو پھر قاضی یا شرعی کونسل فریقین کے بیانات اور شہادت کے بعد دلائل کی بنیاد پر نکاح کو فسخ کرسکتے ہیں اور اگر دونوں میں برابری پائی جاتی ہو اور مہر پر لڑکی کو کوئی اعتراض نہ ہو تو پھر جبر واکراہ کے باوجود ان کو فسخ نکاح کا اختیار نہیں ہے۔



[۱] الفتاوی الہندیہ ۱/ ۲۸۷۔

[۲] الفتاوی الہندیہ ۱/ ۲۹۴۔

[۳] الہندیہ ۱/ ۲۹۴۔

[۴] المحیط بحوالہ الفتاوی الہندیہ ۱/ ۲۹۴۔

[۵] الہندیہ ۱/ ۲۹۴۔

[۶] حوالہ سابق۔

# جبری شادی

مفتی عبدالرحیم
دارالعلوم مصطفوی، محلہ توحید گنج، بارہ مولہ کشمیر

## ۱- عاقلہ بالغہ آزاد عورت کے اختیارات اور حدود فقہاء کی نظر میں:

بالغہ، عقل مند اور آزاد عورت کا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر درست ہوجاتا ہے، خواہ وہ کنواری ہو یا غیر کنواری (بیوہ، مطلقہ وغیرہ) یہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کا مشہور مذہب ہے، اور امام ابو یوسف سے ایک روایت یہ ہے کہ ایسی عورت کا نکاح بغیر ولی کے درست نہیں، امام محمدؒ کے نزدیک ولی کی اجازت پر موقوف ہے[۱]۔

یہاں جو موقف امام محمدؒ کا بیان ہوا ہے بعد میں انہوں نے اس رائے سے رجوع فرما کر وہی قول اختیار کرلیا تھا جو اوپر حضرات شیخینؒ کا بیان ہوا ہے جیسا کہ خود صاحب ہدایہ نے اس کی تصریح فرمادی ہے، نیز ہدایہ میں ہی آگے چل کر (۲/۳۰۱) پر ''وقد صح ذلك'' سے اس رجوع کی مزید تائید ہوتی ہے۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ولی کی اجازت کے بغیر عورت کا نکاح ہی درست نہیں (صاحب بدایۃ المجتہد علامہ ابن رشد الحفید مالکیؒ نے ''بدایۃ المجتہد'' میں اس موضوع پر تفصیل سے کلام کیا ہے اور فریقین کے دلائل نقل کرنے کے بعد مالکی ہونے کے باوجود انہوں نے حنفیہ کے مسلک کی کھل کر تائید کی ہے اور فریق مخالف کی پیش کردہ تمام آیات وروایات کو ان کے دعوے کے لئے ناکافی قرار دیا ہے۔

پوری بحث کے بعد وہ یوں تبصرہ کرتے ہیں: جو بات دل کو زیادہ لگتی ہے وہ یہ ہے کہ شارع نے (نکاح میں) ولایت کی شرط نہیں لگائی ہے، کیونکہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم (عاقلہ بالغہ کے لئے) ولایت کی شرط لگاتے تو لازمی طور پر اولیاء کی جنس، ان کی قسمیں اور ان کے مراتب بیان فرماتے، وجہ یہ ہے کہ مسئلہ ولایت عامۃ الورود ہے اور اس قدر کثرت سے پیش آنے والے اہم مسئلہ میں وضاحت طلب چیزوں کی وضاحت میں تاخیر نا قابل فہم ہے اور یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت کے خلاف ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سے بعید تر، لہذا یہی ماننا پڑے گا کہ دراصل ولایت کی شرط لگانا شارع علیہ السلام کا مقصد ہی نہیں ہے)۔

اس کے بعد صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: ظاہر روایت میں ہے کہ ولی کو اس صورت میں اعتراض (اور فسخ نکاح) کا حق ہوگا جبکہ بالغہ عاقلہ عورت غیر کفو میں نکاح کرلے اور امام ابوحنیفہؒ وابو یوسفؒ کے نزدیک غیر کفو میں نکاح جائز ہی نہیں، اس لئے کہ بہت سے اولیاء ناپسندیدگی کے باوجود غیر کفو میں نکاح ہونے کی صورت میں متعدد وجوہات کی بنا پر قاضی شرعی کے پاس اعتراض ودعوائے فسخ پیش نہیں کرسکتے اور اگر پیش کر بھی دیں تو قاضی انصاف کے تقاضوں کو پورا کرے اس کی کوئی ضمانت نہیں۔

اسی وجہ سے اب فتوی یہ ہے کہ بے جوڑ نکاح منعقد ہی نہ ہوگا، چنانچہ فقہ حنفی کی مستند کتاب ''مجمع الانہر میں فتاوی قاضی خاںؒ سے یہ فتوی نقل کیا گیا ہے:

''نفذ نكاح حرة مكلفة بلا ولي وله الاعتراض في غيرالكفوء وروى الحسن عن الإمام عدم جوازه وعليه الفتوى''، پھر مصنف خود فرماتے ہیں: ''وهذا أصح وأحوط والمختار للفتوى في زماننا''[۲]۔

۲- عاقلہ، بالغہ آزاد لڑکی کا نکاح جبراً کرنا ناجائز ہے:

الف- ''ولا يجوز للولي إجبار البكر البالغة على النكاح (إلى قوله) ولنا أنها حرة فلا يكون للغير عليه ولاية الاجبار

---

[۱] ہدایہ ۲/۲۹۳، ۲۹۴۔
[۲] مجمع الأنہر ۱/۳۳۲۔

والولایة علی الصغیرة لقصور عقلها وقد کمل بالبلوغ بدلیل توجه الخطاب"[1]۔

(کنواری بالغ لڑکی کے ولی کو شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف اس کا نکاح کرے، کیونکہ یہ بالغہ ہے، آزاد ہے، شرعاً مکلف ہے اور بالغ ہوجانے کی وجہ سے فہم کا دہ قصور اور کمی جس کی وجہ سے اولیاء کو اس پر ولایت اجبار اور بالادستی حاصل تھی اب باقی نہیں رہی جس کا ثبوت یہ ہے کہ اب یہ بالغہ بلاواسطہ احکام خداوندی کی مخاطب ومکلف بن چکی ہے، لہذا کسی کو بھی اس پر جبر کرنے کا اختیار نہیں ہے)۔

"(قوله وهو السنة) بان یقول له قبل النکاح فلان یخطبك أو یذکرك فسکتت وإن زوجها بغیراستئمار فقد أخطأ السنة وتوقف علی رضاها۔ بحر عن المحیط۔ واستحسن الرحمتي ما ذکره الشافعیة من أن السنة في الاستئذان أن یرسل إلیها نسوة ثقات ینظرن ما في نفسها والأم بذلك أولی. لأنها تطلع علی مالا یطلع علیه غیرها"[2]۔

(اور سنت یہ ہے کہ نکاح سے قبل ولی بالغہ لڑکی سے باقاعدہ مشورہ کرے اور اس سے اجازت لے مثلاً فلاں شخص نے تمہارے لئے نکاح کا پیغام بھیجا ہے یا فلاں شخص تم سے نکاح کرنا چاہتا ہے (وغیرہ) تو اگر یہ سن کر بالغہ خاموش رہے تو یہ نکاح درست ہے، لیکن ولی کا بالغہ سے پوچھے بغیر ہی نکاح کردینا سنت کے بالکل خلاف ہے اور ایسا نکاح منعقد نہ ہوگا تا آنکہ بالغہ اپنی آزادانہ رضامندی سے اسے قبول نہ کرے، یہ صاحب بحر نے "المحیط" سے نقل کیا ہے اور رحمتی نے اس سلسلے میں شافعیہ کا بیان کردہ یہ طریقہ پسند کیا ہے کہ ولی کو چاہئے کہ بالغہ کی آزادانہ رائے وحقیقی رضامندی معلوم کرنے کے لئے چند قابل اعتماد عورتوں کو اس کے پاس بھیج دے، سب سے بہتر اس معاملے میں اس کی والدہ رہے گی، کیونکہ والدہ اس کے تعلق سے بہت سے ان حالات سے بھی یقیناً واقف ہوگی جن کی دوسروں کو ہوا تک نہ لگی ہو، لہذا حال دل کی صحیح ترجمانی وعکاسی بھی کما حقہ والدہ ہی کر پائے گی)۔

درمختار ہی میں ہے: اگر کسی عورت کے شوہر کا انتقال ہوجائے اور شوہر کے رشتہ دار شوہر کی وراثت سے محروم کرنے کے لئے اس عورت سے یہ کہیں کہ تمہارا نکاح مرحوم سے درست نہیں تھا، لہذا تم اس کی وارث نہیں بن سکتیں، ادھر عورت کا دعوی ان کے برعکس ہو اور یہ معاملہ عدالت شرعی تک پہنچ جائے تو قاضی شرعی اس عورت سے سوال کرے گا کہ بتاؤ تمہارا نکاح تمہارے باپ نے تمہاری اجازت سے کیا تھا یا نہیں؟ اس پر اگر عورت جواب میں یہ کہہ دے کہ میرا نکاح میرے باپ نے میری اجازت سے کیا تھا اور شوہر کے رشتہ دار اس کی بات سے انکار کردیں جب بھی یہ نکاح درست ہی سمجھا جائے گا اور مرحوم کے رشتہ داروں کے برخلاف وہ اپنے شوہر کی وارث قرار پائے گی، نیز عدت وفات گذارے گی، (لیکن اگر عورت کا جواب اس طرح ہو کہ) گو میرا نکاح میرے باپ نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی کردیا تھا مگر جب مجھے اس کی خبر ملی تو میں اس نکاح پر رضامند ہوگئی تھی، تو اب اس صورت میں قاضی کا فیصلہ اس عورت کے خلاف اور اس کے مخالفین شوہر کے رشتہ داروں کے حق میں جائے گا، وجہ اس کی یہ ہے کہ ولی نے پہلی صورت میں نکاح سے قبل ہی بالغہ سے اجازت لی تھی، لہذا بلا کسی شک وشبہ کے وہ نکاح درست قرار دیا گیا لیکن دوسری صورت میں بغیر اجازت جو نکاح ہوا وہ نکاح کے وقت درست نہیں ہوا البتہ بعد میں اگرچہ بالغہ اپنی رضامندی کا اقرار کر رہی ہے جس کی وجہ سے نکاح درست ہوجاتا ہے مگر چونکہ خاص طور پر یہ جگہ تہمت سے خالی نہیں، لہذا قاضی نکاح کے غیر صحیح ہونے کا فیصلہ کرے گا[3]۔

غور فرمائیے کہ بالغہ کی اجازت پر نکاح کے صحیح اور باطل ہونے کا کس قدر دارومدار ہے جیسا کہ اس مسئلہ سے واضح ہے۔

## ۳- بالغہ کی اجازت وانکار کی چند صورتیں اور ان کا حکم:

۱- ولی نے مسنون طریقے پر از خود بالغہ سے نکاح کی اجازت مانگی مثلاً فلاں تم سے نکاح کرنا چاہتا ہے کیا تمہیں یہ رشتہ منظور ہے؟ یا ولی کے وکیل یا قاصد نے بالغہ سے اجازت لی اور اس نے اپنی فطری شرم وحیا کی وجہ سے بجائے صاف جواب دینے کے خاموشی اختیار کی تو یہ شرعاً اس کی طرف سے اجازت ہے اور یہ نکاح منعقد ہوجائے گا[4]۔

---

۱- الہدایہ ۲/ ۲۹۴۔

۲- شامی ۲/ ۲۹۸، ۲۹۹ طبع نعمانیہ۔

۳- درمختار مع رد المحتار ۲/ ۲۹۹۔

۴- درمختار علی الشامی ۲/ ۲۹۸، ۲۹۹۔

۲۔ ولی نے بالغہ کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح کردیا اور بعد میں ازخود یا اپنے قاصد کے ذریعہ بالغہ کو اس نکاح کی اطلاع دی جس کو سن کر بالغہ نے حیاء کی وجہ سے خاموشی اختیار کی تو نکاح درست ہوگیا[۱]۔

۳۔ ولی نے بالغہ کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح کردیا اور کسی معتبر آدمی نے بالغہ کو اس نکاح کی خبر دی جس پر اس نے حیاءً خاموشی کو اپنالیا تو یہ نکاح بھی صحیح ہوگیا[۲]۔

۴۔ مندرجہ بالا تینوں صورتوں میں بالغہ خاموش نہیں بلکہ جس وقت اس سے اجازت لی جارہی تھی یا اطلاع دی جارہی تھی تو وہ ہنس پڑی یا مسکرانے لگی یا (یا اپنے والدین، بھائی بہنوں اور متعلقین کی جدائی کا تصور کرکے) چپکے چپکے رونے لگی تو ان صورتوں میں بھی نکاح منعقد ہوگیا[۳]۔

۵۔ ولی نے کسی شخص کا نام و پتہ وغیرہ بیان کرکے بالغہ سے اس کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت مانگی جس پر پہلے تو اس نے نامنظور کردیا مگر کچھ عرصہ کے بعد (جبکہ اس شخص کے متعلق بالغہ کو مکمل اطمینان ہوچکا تھا) ولی نے بغیر پوچھے اسی سے بالغہ کا نکاح کردیا اور معلوم ہونے پر اب کی بار شرم کی وجہ سے بالغہ نے خاموشی اختیار کی تو نکاح درست ہوگیا۔ صاحب فتح القدیر اور صاحب البحر الرائق کے نزدیک اس صورت میں نکاح درست نہیں لیکن معتبر قول صحت نکاح کا ہی ہے[۴]۔

۶۔ ولی نے بالغہ کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح کردیا اور وہ شرم کی بنا پر خاموش رہی تو نکاح درست ہوگیا بشرطیکہ نکاح کے وقت ہی اپنے ہونے والے شوہر کو پہچان رہی ہو[۵]۔

اوپر وہ صورتیں ذکر کی گئی ہیں جن میں نکاح درست ہوجاتا ہے، اس کے بعد ان صورتوں کا مع حوالہ ذکر کیا جاتا ہے جن میں نکاح درست نہیں ہوتا۔

۱۔ جس وقت بالغہ سے نکاح کی اجازت مانگی جارہی تھی اس نے اسی وقت رشتے کو منظور کرنے سے انکار کردیا مثلاً یہ کہا کہ وہ تو دباغ ہے یا دوسرا شخص اس سے اچھا ہے، وغیرہ وغیرہ تو نکاح ہی درست نہیں ہوا[۶]۔

۲۔ جب بالغہ سے اجازت لی گئی یا اس کو نکاح کی اطلاع دی گئی تو وہ زور زور سے رونے لگی یا طنز و تمسخر کے انداز پر ہنسنے لگی (جو کہ حاضرین کو محسوس ہوجاتا ہے) تو اس صورت میں بھی نکاح نہیں ہوگا[۷]۔

۳۔ بالغہ سے نکاح کی اجازت ولی، اس کے وکیل یا اس کے قاصد نے نہیں لی بلکہ کسی اجنبی یا دور دراز کے رشتہ دار یا دوسرے و تیسرے درجہ کے ولی نے حقیقی ولی کی موجودگی کے باوجود نکاح کی اجازت چاہی اور بالغہ خاموش رہی تو نکاح درست نہیں جب تک کہ وہ زبان قال یا زبان حال سے اس رشتے پر رضامند نہ ہو، مثلاً صاف صاف قبول یا رد کرے یا زبان سے کچھ نہ کہے بلکہ مہر طلب کرے یا شوہر کے ساتھ صحبت وغیرہ پر راضی ہو تو ان شرائط کے ساتھ نکاح درست ہوجائے گا[۸]۔

۴۔ ولی نے بالغہ کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح کردیا اور بالغہ کو اس نکاح کی اطلاع نہ ولی کے ذریعہ ملی نہ اس کے وکیل یا قاصد نے اسے مطلع کیا بلکہ کسی غیر معتبر آدمی نے بالغہ کو اس نکاح کی خبر دی اور وہ یہ خبر سن کر خاموش ہوگئی تو اس صورت میں بھی نکاح منعقد نہیں ہوا البتہ درج بالا[۹] میں مندرج شرائط کے ساتھ یہاں بھی نکاح درست ہوجائے گا۔

۵۔ ولی نے بالغہ سے نکاح کی اجازت لیتے وقت ناکح کا نام نہیں لیا نہ بالغہ کو وہ ناکح پہلے سے معلوم ہے تو ایسے وقت بالغہ کے چپ رہنے سے رضامندی ثابت نہ ہوگی اور اجازت نہ سمجھیں گے بلکہ نام و نشان بتلانا ضروری ہے جس سے بالغہ اتنا سمجھ جائے کہ یہ فلاں شخص ہے، اسی طرح اگر مہر نہیں بتلایا اور مہر مثل سے

[۱] درمختار علی ہامش الشامی ۲/۲۹۹۔
[۲] درمختار علی ہامش الشامی ۲/۲۹۹۔
[۳] درمختار علی ہامش الشامی ۲/۲۹۹۔
[۴] درمختار مع الشامی ۲/۳۰۰۔
[۵] حوالہ بالا ۲/۳۰۱۔
[۶] درمختار علی الشامی ۲/۲۹۹۔
[۷] درمختار ۲/۲۹۸، بہشتی زیور اختری حاشیہ ۴/۲۸۵۔
[۸] فتاوی ہندیہ ۱/۲۸۷، اختری بہشتی زیور حاشیہ ۴/۲۸۶۔
[۹] عالمگیری ملخصاً ۱/۲۸۸ حاشیہ بہشتی زیور ملخصاً حصہ ۴/۲۸۵۔

بہت کم پر نکاح کردیا تب بھی بالغہ کی اجازت کے بغیر نکاح نہ ہوگا بلکہ اس سے ازسرنو اجازت لینا ضروری ہے، فقہاء متاخرین کی رائے یہی ہے اور فتح القدیر میں اسی کو بہتر قرار دیا ہے[١]۔

٦۔ اجازت مانگنے پر بالغہ کا ردعمل کچھ ایسا تھا کہ جس میں رضامندی کا بھی احتمال ہے اور انکار و ناپسند کا بھی تو ایسی صورت میں اس کی طرف سے انکار ہی سمجھا جائے گا اور نکاح منعقد نہ ہوگا[٢]۔

٧۔ ولی نے کسی شخص کا نام و پتہ بتلا کر جب بالغہ سے نکاح کی اجازت چاہی تو اس نے رشتہ رد کردیا پھر کچھ عرصہ گذرنے کے بعد ولی نے بالغہ سے پوچھے بغیر ہی اس شخص سے اس کا نکاح کردیا، جب بالغہ کو اس نکاح کا علم ہوا تو اس نے دوبارہ پھر انکار کردیا یا صرف اتنا کہا کہ "میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ مجھے فلاں پسند نہیں" تو ایسا نکاح منعقد نہیں ہوگا حتی کہ اگر بالغہ اس مکرر انکار کے بعد اس رشتے پر راضی بھی ہوجائے جب بھی نکاح درست نہ ہوگا[٣]۔

٨۔ جب بالغہ سے نکاح کی اجازت لی جارہی تھی تو اسے کھانسی یا چھینک آنے لگی اور کھانسی و چھینک بند ہوتے ہی اس نے کہا: مجھے یہ رشتہ منظور نہیں یا جس وقت وہ کچھ جواب دینا چاہتی تھی تو زبردستی اس کا منہ بند کردیا گیا اور جونہی اس کا منہ آزاد ہوا اس نے فوراً رشتہ نامنظور کردیا، ان سب صورتوں میں بھی نکاح درست نہیں ہوگا اور بالغہ کے انکار کو درست مانا جائے گا، کیونکہ کھانسی، چھینک یا منہ بند ہوجانے کی وجہ سے بالغہ کی عارضی و جبری خاموشی درحقیقت وہ خاموشی ہی نہیں ہے جس کو شریعت مطہرہ نے اقرار و رضامندی کا بدل قرار دیا ہے، لہذا اس اختیاری خاموشی اور اس اضطراری سکوت میں فرق لازمی چیز ہے[٤]۔

## ۴- نکاح کے منعقد ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں زوجین کے اختلاف کا شرعی حکم:

علامہ شامیؒ نے اپنے حاشیہ میں فرمایا: (جس صورت میں زوجین کے متضاد دعووں اور شرعی ثبوت نہ ہونے پر زوجہ کے حق میں اس کے قسم کھانے کی بنا پر فیصلے کا حکم ہے جبکہ زوجین میں صحبت نہ ہوئی ہو) تو وہاں صحبت نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ یا تو بالکل صحبت نہ ہوئی ہو، یا صحبت تو ہوئی لیکن اس میں عورت کی رضا شامل نہ ہو، لہذا اگر یہ ثابت ہوجائے کہ زوجہ صحبت پر رضامند تھی تو پھر اس کا نکاح منعقد ہونے سے انکار کرنا بے معنی ہوکر رہ جائے گا اور شوہر کے حق میں ہی فیصلہ کردیا جائے گا، حاشیۃ الغزی علی الاشباہ میں صحبت ہوجانے کے بعد عورت کے انکار کے متعلق فقہاء کرام کے اختلاف کو ذکر کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ صحبت ہوجانے کے باوجود بھی اگر عورت سرے سے ہی نکاح منعقد ہونے کا انکار کررہی ہو تو اس کا انکار درست اور معتبر ہے، کیونکہ یہ تحریم فرج کا معاملہ ہے جو انتہائی حزم و احتیاط کا متقاضی ہے بلکہ مذکورہ مؤلف علامہ غزیؒ نے اپنے شیخ علامہ مقدسیؒ کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ انہوں نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تالیف فرما کر اس میں زوجین کے صحبت کرنے کے باوجود سرے سے ہی نکاح کے انعقاد کے متعلق عورت کے انکار کو معتبر و راجح قرار دیا ہے[٥]۔

پھر اس مسئلہ میں عورت کے قول کا اعتبار کرنے کے متعلق علامہ شامیؒ نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ چونکہ عورت مرد کے بقول عقد نکاح کے لازم ہونے اور اس کے نتیجے میں اسے ملک بضعہ حاصل ہونے کا انکار کررہی ہے، لہذا شریعت مقدسہ کے مقرر قواعد کی روشنی میں اس کے انکار کرنے اور قسم کھانے کی وجہ سے فیصلہ اسی کے حق میں کیا جائے گا، کیونکہ ضابطہ ہے: "الیمین علی من أنکر"[٦]۔

اس کے بعد صاحب فتح القدیر اور الکافی للحاکم الشہیدؒ کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ اگر اس معاملے میں عورت کا ولی (باپ، دادا اور بھائی وغیرہ) بھی شوہر کے حق میں شہادت دے تو اس کے باوجود فیصلہ عورت کے ہی حق میں ہوگا اور نکاح باطل قرار دیا جائے گا[٧]۔ واضح رہے کہ زیر بحث صورت میں عورت کے قسم کھانے کا مسئلہ صاحبین کی رائے پر ہے اور اسی پر فتوی ہے ورنہ امام اعظمؒ کے نزدیک عورت کی بات بغیر قسم کے ہی معتبر ہے یعنی انعقاد نکاح کے متعلق اس

---

١۔ عالمگیری ملخصا ١/ ٣٨٨ حاشیہ بہشتی زیور ملخصا حصہ ۴/ ٢٨٥۔

٢۔ شامی ٢/ ٣٠٠۔

٣۔ درمختار مع الشامی ٢/ ٣٠٠۔

۴۔ شامی ٢/ ٢٩٩۔

٥۔ شامی ٢/ ٣٠٢۔

٦۔ ہدایہ ٢/ ٥٩٢۔

٧۔ شامی ٢/ ٣٠٢، ٣٠٣۔

کے انکار پر بغیر قسم لئے ہی فیصلہ کردیا جائے گا[1]۔

مزید توضیح کے لئے ملاحظہ ہو: فتاوی محمودیہ ۳/۲۴۰۔

## ۶- خلاصہ بحث:

۱- مذکورہ صورتوں میں ہرگز نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

۲- جبر، زبردستی اور نفسیاتی دباؤ کے تحت اگر بالغہ بظاہر نکاح کے لئے ہاں کہہ دے یا نکاح نامہ وغیرہ پر اپنے دستخط بھی ثبت کردے تب بھی حقیقی اجازت اور آزادانہ رضامندی کے فقدان کی وجہ سے نکاح نہ ہوگا اور شرعاً اسے اذن اور رضا تسلیم نہ کیا جائے گا۔

۳- شریعت مطہرہ میں نکاح کے سلسلے میں برابری اور کفاءت کا اعتبار مسلمہ حقیقت ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''ولا یزوجن إلا من الأکفاء''[2] (عورتوں کے نکاح کفو میں کئے جائیں)۔

لیکن چونکہ زیر بحث مسئلہ میں دوسری وجوہات کی بنا پر نکاح باطل ہوچکا ہے، لہذا بالغہ کو یہ دعوائے کفاءت پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔

۴- جیسا کہ شامی، درمختار، ہدایہ اور فتاوی محمودیہ کی تصریحات سے قبل ازیں ثابت ہوچکا ہے کہ شرعی وجوہات کی وجہ سے جس طرح قبل صحبت وہمبستری تفریق کردی جائے گی، اسی طرح قاضی شرعی، عالم ومفتی اور مسلمان حاکم بعد صحبت وانعقاد نکاح بھی تفریق کا مجاز ہے، لہذا دونوں صورتوں کا حکم یکساں ہے۔

۵- اس میں کوئی شک نہیں کہ جب قاضی یا شرعی کونسل پر یہ بات واضح ہوجائے گی کہ جبر وإکراہ کے مختلف حربے اختیار کرکے بالغہ کو نکاح پر مجبور کیا گیا ہے تو وہ اس نکاح کو فسخ کرسکتے ہیں بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ قاضی صاحب وشرعی کونسل وغیرہ صرف برائے نام ہی فسخ نکاح کی خانہ پری فرمائیں گے، کیونکہ سابقہ بحث سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ایسا نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہوا تھا۔



# جبری نکاح

مولانا ابوالعاص وحیدی، سدھارتھ نگر

## تمہیدی بحث:

مذہب اسلام تمام انسانوں کا انتہائی ہمدرد وغمگسار مذہب ہے۔ اس نے انسانوں کے تمام طبقات کے ساتھ بڑی محبت ورافت اور اعتدال وتوازن کا معاملہ کیا ہے۔ طبقہ نسواں پر ایک نظر ڈالئے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ عورتیں مختلف مذاہب اور تاریخی مراحل میں حد درجہ مظلوم رہی ہیں۔ انہیں صرف اسلام کے دامن رحمت میں پناہ ملی ہے۔

مذہب اسلام نے ایک طرف عورتوں کی شرم وحیاء کا لحاظ اور تحفظ کیا ہے تو دوسری طرف اس کی آزادی ضمیر اور پسند وناپسند سے بھی صرف نظر نہیں کیا ہے، چنانچہ عورتوں کی حیا کے تحفظ کے پیش نظر اور اس اندیشہ کے پیش نظر کہ ان کے اندر حد درجہ شوخی وبے باکی نہ پیدا ہوجائے، اسلامی شریعت نے کہا کہ عورت کے لئے ولی ضروری ہے، چاہے وہ صغیرہ ہو یا کبیرہ، بنابریں نہ وہ اپنا نکاح کرسکتی ہے اور نہ دوسرے کا نکاح کرا سکتی ہے، لیکن مردوں کے حق ولایت کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عورتوں کے ساتھ جبر واکراہ کا معاملہ کریں، اس لئے شریعت نے نکاح وغیرہ میں جبر واکراہ سے روک دیا ہے اور یہ واضح فیصلہ کردیا ہے کہ ''الثیب أحق بنفسها من ولیها'' مگر یہاں ''أحق'' اسم تفضیل استعمال کیا گیا ہے جس سے لطیف انداز میں حق ولایت کا ثبوت بھی ہو رہا ہے، پھر بھی کسی مرد کو عاقلہ وبالغہ کے معاملہ میں اجبار واکراہ کا حق نہیں ہے، صغیرہ نابالغہ کے ساتھ اس کا ولی اجبار کا معاملہ کرسکتا ہے مگر بالغ ہونے کے بعد اسے شریعت نے خیار بلوغ دے کر اس کی آزادی رائے کا پورا لحاظ رکھا ہے، عورتوں کی آزادی ضمیر کا لحاظ مذہب اسلام نے یہاں تک کیا ہے کہ اگر کسی ولی نے کسی عورت کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کہیں کردی تو اسے عدالت میں جاکر احتجاج اور سخت رد عمل کا پورا حق دیا ہے۔

اور ایک زاویہ سے طبقۂ نسواں کے معاملہ میں مذہب اسلام کا اعتدال وتوازن دیکھئے کہ اس نے اگر ایک طرف مرد کو حق طلاق دیا ہے تو دوسری طرف عورت کو حق خلع دیا ہے تاکہ ناخوشگوار ماحول میں وہ گھٹ گھٹ کر زندگی گذارنے پر مجبور نہ ہو۔

میں نے مندرجہ بالا امور روح کتاب وسنت اور جمہور فقہاء وائمہ کے نقطہ نظر کے مطابق لکھے ہیں اگرچہ علماء حنفیہ نے ولایت اور خلع وغیرہ کی بعض جزئیات سے اختلاف کیا ہے، بہر حال ضروری ہے کہ عورتوں کے بارے میں مندرجہ بالا نکات کا لحاظ رکھا جائے تاکہ آزادی نسواں اور حقوق انسانی کی پرفریب تنظیموں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ مذہب اسلام میں آزادی رائے اور عورتوں کے حقوق کو پامال کیا گیا ہے۔

مذہب اسلام میں اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت پر بھی بہت زور دیا گیا ہے، اگر ان کی صحیح تعلیم وتربیت ہو تو مسلمان لڑکے یا لڑکیاں مشرقی ماحول میں رہیں یا مغربی ماحول میں رہیں، ان کے قدم غلط سمت نہیں بڑھ سکتے۔

اس تمہیدی بحث کے بعد اب سوالات کے جوابات ملاحظہ ہوں!

۱- اس صورت کو اس کی رضامندی ہرگز نہیں تصور کیا جائے گا جب کہ وہ دل سے اس نکاح پر راضی نہیں ہے۔

دراصل جبر واکراہ کے نتیجہ میں نکاح، طلاق اور عتاق کا تحقق نہیں ہوتا، اس لئے کہ جبر واکراہ کے نتیجہ میں جو فیصلہ آدمی کرتا ہے اسے اضطراری ترجیح تو کہا جاسکتا ہے مگر اسے اختیاری فیصلہ نہیں کہا جاسکتا، اختیاری فیصلہ کا تعلق تو داخلی جذبہ وشعور سے ہوتا ہے جو حالت اکراہ میں مفقود رہتا ہے۔

۲- اگر جبر واکراہ کے نتیجہ میں کسی عاقلہ بالغہ نے نکاح کے لئے ہاں کرلیا تو اسے اس کی رضا اور حقیقی اذن ہرگز تصور نہیں کیا جائے گا۔ عہد نبوی کا یہ واقعہ ملاحظہ ہو کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا کہ میرے والد نے میری شادی اپنے بھتیجے سے کردی ہے جو مجھے ناپسند ہے تو آپ نے اس عورت کو اختیار

دے دیا، مگر اس دانشمند عورت نے بعد میں کہا: ''قد أجزت ما صنع أبي ولكن أردت أن أعلم النساء أن ليس إلى الآباء من الأمر شيء ''[1] اس حدیث کی روایت ابن ماجہ نے کی ہے اور اس کے رواۃ صحیح کے رواۃ ہیں۔

یعنی میرے والد صاحب نے جو کیا میں اسے درست قرار دیتی ہوں، لیکن میں نے یہ چاہا کہ دوسری عورتوں کو بتادوں کہ باپ کو عورت کے معاملہ میں کچھ بھی (جبر واکراہ کا) حق نہیں ہے۔ اس طرح کا ایک دوسرا واقعہ مسند احمد، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ اور دار قطنی میں بھی آیا ہے۔

اور طلاق وعتاق میں بھی جبر واکراہ معتبر نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''لا طلاق ولا عتاق في إغلاق'' (ابوداؤد، ابن ماجہ)[2]۔

یعنی جبر واکراہ کی طلاق وعتاق کا کوئی اعتبار نہیں۔

۳- برطانیہ کے ماحول میں رہنے والی لڑکی اور ہندوستان میں پرورش پانے والے لڑکے کے درمیان یقیناً بڑا معاشرتی فرق ہوتا ہے مگر اس فرق کی وجہ سے لڑکی کو دعوی کرنے کا کوئی حق نہیں کہ میری شادی جس شخص سے کی جارہی ہے وہ میرا کفو نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام اور دینداری میں کفاءت کا اعتبار ہے، دیگر امور میں نہیں۔

۴- اگر جبر واکراہ سے نکاح ہوا ہے اور کسی طرح زن وشوئی کے تعلقات قائم ہو گئے تو چونکہ وہ نکاح ہوا ہی نہیں، اس لئے دونوں میں تفریق کرادی جائے گی اور عورت مہر کی مستحق ہوگی جیسا کہ سنن ابی داؤد میں بصرہ بن اکثم کا واقعہ آیا ہے کہ ایک عورت سے ان کی شادی ہوئی مگر وہ حاملہ تھی تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لها الصداق بما استحللت من فرجها... وفرق بينهما''[3]۔

وہ جماع کی وجہ سے مستحق مہر ہوگی، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں میں تفریق کرادی۔

اور اگر زن وشوئی کے تعلقات قائم نہیں ہوئے تو تفریق کرادی جائے گی۔

۵- اگر لڑکی کو جبر واکراہ کے ذریعہ نکاح پر مجبور کیا گیا تھا تو فریقین کے بیانات کے بعد قاضی یا شرعی کونسل کو چاہئے کہ نکاح فسخ کردے، چونکہ وہ نکاح منعقد نہیں ہوا جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔



[1] فقہ السنہ ۲/ ۲۶۶۔

[2] مشکاۃ المصابیح ۲، باب الخلع والطلاق۔

[3] فقہ السنہ ۲/ ۲۹۸ بحث المہر۔

# جبری شادی

مفتی عزیز الرحمن بجنوری مدنی دارالافتاء، مدرسہ عربی مدینۃ العلوم، بجنور

اللہ تعالیٰ نے انسانوں ہی میں نہیں بلکہ جانوروں اور حیوانوں میں بھی جوڑے پیدا فرمائے ہیں۔ اس سے مقصد جہاں ازدیاد نسل ہے وہیں ایک دوسرے کے لئے باعث راحت اور سکون ہونا بھی ہے۔

''ومن آياته أن خلق لكم من أنفسكم أزواجاً لتسكنوا إليها وجعل بينكم مودة ورحمة''[1] (اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے نفوس سے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم کو سکون حاصل ہو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت قائم کر دی ہے)۔

معلوم ہوا کہ جوڑا اور برابری ہونا باعث سکون اور راحت ہے، اگر یہ نہ ہو تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ولا يزوجن إلا من الأكفاء''[2] (عورتوں کی شادی ان کے کفو ہی سے کی جائے)۔

اسی وجہ سے ہمارے فقہاء اور مشائخ نے ارشاد فرمایا ہے:

۱- ''الكفاءة معتبرة في ابتداء النكاح لزومه وصحته''[3] (ابتدائے نکاح میں اس کے لازم ہونے اور اس کے صحیح ہونے کے لئے کفاءت معتبر ہے)۔

۲- ''إن الولي لو زوج الصغيرة غير الكفوء لا يصح مالم يكن أبا وجدا''[4] (ولی اگر نابالغہ لڑکی کا نکاح غیر کفو میں کردے تو نکاح صحیح نہیں ہوگا بشرطیکہ باپ اور دادا نہ ہو)۔

۳- ''والمختار للفتوى أنه لا يصح العقد''[5] (مفتی بہ قول یہ ہے کہ عقد صحیح نہیں ہوگا)۔

۴- امام محمدؒ فرماتے ہیں: غیر کفوء میں نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا[6]۔

۵- ''العجمي لا يكون الكفوء للعربية ولو كان عالما أو سلطانا'' (عجمی مرد عربی عورت کا کفو نہیں ہو سکتا ہے اگرچہ وہ عالم ہو یا بادشاہ)۔

مندرجہ بالا تصریحات سے چند باتیں ثابت ہیں:

۱- غیر کفو میں نکاح جائز نہیں ہے اگر ہوگا تو منعقد نہیں ہوگا۔

۲- عجمی عربی کا کفو نہیں ہوتا اگرچہ وہ عالم ہو یا سلطان ہو، ان تمام صورتوں میں علت عدم سکون اور انتظام عالم میں بگاڑ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

لہذا وہ لڑکیاں جو دوسرے ملکوں میں پیدا ہوئیں ہیں، وہاں کا ماحول پایا اور تربیت پائی وہ اگر کسی دوسرے ملک میں جبراً یا بلا رضامندی کے بیاہ دی جائیں تو ایسے نکاح منعقد نہ ہوں گے، جبکہ عاقلہ بالغہ کا نکاح کسی دباؤ سے نہیں کیا جا سکتا ہے، ان حالات میں جبری شادیاں نہ ہوں گی، بلکہ ان کا انعقاد ہی نہ ہوگا، تاہم قاضی شرعی یا شرعی پنچایت کو بلا جھجھک نکاح فسخ کر دینا چاہئے، یہ احتیاطاً ورنہ جب نکاح کا وجود ہی تسلیم نہیں تو فسخ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ☆☆☆

[1] سورۂ روم۔
[2] الہدایہ۔
[3] درمختار۔
[4] حوالہ بالا۔
[5] ردالمحتار ۲/۴۴۳۔
[6] درمختار۔

# جبری نکاح

مولانا محمد انظار عالم قاسمی

مرکزی دار القضاء، امارت شرعیہ، پٹنہ

## اِکراہ کی لغوی تعریف:

انسان کا کسی ایسی چیز کے کرنے پر مجبور ہونا جس کو وہ ناپسند کرتا ہے اکراہ ہے۔ ''حمل الإنسان علی شئ یکرہ''[۱]، اِکراہ رضا اور محبت کی ضد ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل استعمال کیا جاتا ہے، ارشاد ربانی ہے: ''وعسی أن تکرھوا شیئا وھو خیر لکم وعسی أن تحبوا شیئا وھو شر لکم''[۲]۔

## اِکراہ کی شرعی تعریف:

ناحق کسی شخص کو اس کی رضامندی کے بغیر کسی کام کے کرنے پر ڈرا کر مجبور کرنا اکراہ ہے۔

''ھو إجبار أحد علی أن یعمل عملا بغیر حق من دون رضاہ بالإخافۃ''[۳]، اور بعض فقہاء کرام نے اکراہ کی شرعی تعریف اس طرح کی ہے:

''وشرعاً حمل الغیر علی فعل بما یعدم الرضا دون اختیارہ لکنہ قد یفسد وقد لا یفسد''[۴]۔

## اِکراہ کی اقسام:

فقہاء کرام نے اکراہ کی دو قسمیں بیان کی ہیں: ۱- ملجئ، ۲- غیر ملجئ، اکراہ ملجئ: جس میں رضا معدوم اور اختیار فاسد ہوتا ہے، جیسے کسی انسان کو ناحق مجبور کرنا کہ اگر تم فلاں کام نہیں کرو گے تو تم کو قتل کر دیں گے، یا یہ کہ فلاں عضو کاٹ دیں گے، اکراہ غیر ملجئ: ایسا اکراہ جس میں رضا معدوم ہو جاتی ہے اور اختیار فاسد نہیں ہوتا ہے، یعنی کسی انسان کو پٹائی یا قید کی دھمکی دے کر کسی کام کے کرنے پر ناحق مجبور کرنا۔

''ھو أن الإکراہ نوعان: نوع یعدم الرضا ویفسد الاختیار ... ونوع یعدم الرضا ولا یفسد الاختیار''[۵]۔

خلاصہ یہ ہے کہ اکراہ کی تمام صورتوں میں رضا معدوم ہے، اور اصل اختیار تمام صورتوں میں ثابت ہے، ہاں البتہ اکراہ کی بعض صورتوں میں اختیار فاسد ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں اختیار فاسد نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ اصول وفروع کی تمام کتابوں میں ہے۔

''فالحاصل أن عدم الرضا معتبر في جمیع صور الإکراہ وأصل الاختیار ثابت في جمیع صورہ لکن في بعض الصور یفسد الاختیار وفي بعضھا لا یفسد''[۶]۔

اکراہ مکرہ کی اہلیت کے منافی نہیں ہے اور نہ ہی حالت اکراہ میں مکرہ سے خطاب ساقط ہوتا ہے، کیونکہ دراصل مکرہ مبتلی ہوتا ہے اور مبتلی سے اہلیت اور

---

۱۔ البحر الرائق ۸/۱۲۷، الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۹/۱۷۷، اللباب فی شرح الکتاب ۴/۱۰۷۔

۲۔ سورۂ بقرہ/۲۱۶۔

۳۔ التعریفات الفقہیہ علی قواعد الفقہ رص ۱۸۸، البحر الرائق ۸/۱۲۸۔

۴۔ اللباب فی شرح الکتاب ۴/۱۰۷۔

۵۔ شرح بدایۃ المبتدی علی ہامش الہدایہ ۶/ ۴۱۴، ۴۱۵، اللباب فی شرح الکتاب ۴/۱۰۷، البحر الرائق ۸/۷۰، درر الحکام فی شرح غرر الاحکام، الجزء الثانی، کتاب الاکراہ رص ۲۶۹۔

۶۔ درر الحکام فی شرح غرر الاحکام ۲/۲۶۹۔

خطاب ساقط نہیں ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ مکرہ حالت اکراہ میں فرض، حظر، اباحت اور رخصت کے درمیان متردد ہوتا ہے۔

"ثم اعلم أن الإكراه لا ينافي أهلية المكره ولا يوجب وضع الخطاب عنه بحال؛ لأن المكره مبتلى والابتلاء يحقق الخطاب والدليل عليه أن أفعاله تتردد بين فرض و حظر وإباحة ورخصة ويأثم تارة ويؤجر أخرى"۔

**رضا کی لغوی تعریف:**...... رضا، رضی یرضی رضیً ورضواناً مرضاۃ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی راضی ہونا، پسند کرنا، خوش ہونا وغیرہ ہے، رضا سخط (امور کراہت) کی ضد ہے اور صوفیاء کے یہاں رضا سے مراد سرور قلب ہے۔

## رضا کی اصطلاحی تعریف:

حنفیہ نے رضا کی اصطلاحی تعریف یہ کی ہے کہ وہ اختیار کا ایسا کامل ہونا ہے کہ جس کا اثر چہرہ کے ظاہر سے جانا جاتا ہو۔

"في الاصطلاح عرفه الحنفية بأنه امتلاء الاختيار أي بلوغه ونهايته بحيث يفضي أثره إلى الظاهر من ظهور البشاشة في الوجه ونحوها"[1]۔

اور جمہور فقہاء کرام نے رضا کی تعریف: "أنه قصد الفعل دون أن يشوبه إكراه"[2] سے کی ہے۔

اب فقہاء حنفیہ اور جمہور میں اختلاف اس بات میں ہے کہ رضا اور اختیار دونوں ایک ہیں، یا دو الگ الگ چیزیں ہیں تو اس سلسلہ میں فقہاء حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ رضا اور اختیار دو الگ الگ چیزیں ہیں، جب کہ جمہور علماء کرام کا کہنا ہے کہ دونوں ایک ہی ہیں، یعنی دونوں مترادف الفاظ ہیں۔

"ذهب الحنفية إلى أن الرضا والاختيار شيآن مختلفان من حيث المعنى الاصطلاحي والآثار في حين الجمهور إلى أنهما مترادفان"[3]۔

مذکورہ باتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تصرفات مکرہ کے سلسلہ میں حنفیہ اور جمہور کے درمیان دراصل اختلاف کی بنیاد رضا اور اختیار پر ہی ہے، کیونکہ جمہور کے نزدیک حالت اکراہ میں مکرہ سے رضا اور اختیار دونوں معدوم ہوجاتے ہیں اور حنفیہ کے نزدیک مکرہ سے حالت اکراہ میں صرف رضا معدوم ہوتی ہے نہ کہ اختیار، بلکہ حنفیہ کے نزدیک اکراہ کی بعض صورتوں میں اختیار فاسد ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں تو اختیار بھی فاسد نہیں ہوتا بلکہ اختیار صحیح باقی رہتا ہے، جیسا کہ اوپر گذرا۔

## حقیقت رضا:

اب غور طلب امر یہ ہے کہ احکام شرعیہ میں رضا کی کیا حقیقت اور اہمیت ہے؟ آیا رضا احکام شرعیہ کے لئے شرط صحت ہے یا نہیں، تو اس سلسلہ میں جمہور نے تمام احکام شرعیہ میں رضا کو شرط صحت قرار دیا ہے، سوائے ان احکام کے جن میں کوئی صریح نص وارد ہوئی ہو جیسے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ثلاث جدهن جد وهزلهن جد: الطلاق والعتاق والنكاح"[4] (اگر کسی شخص نے مذاق سے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، یا کسی سے مذاق میں نکاح کر لیا، یا اپنے غلام کو مذاق ہی میں آزاد کردیا تو سب نافذ ہوں گے)، حنفیہ کے نزدیک بعض تصرفات شرعیہ میں رضا شرط صحت ہے اور بعض میں نہیں (آگے تفصیلی بحث آرہی ہے)۔

اب حالت اکراہ میں مکرہ کے تصرفات نافذ ہوتے ہیں یا نہیں تو اس سلسلہ میں حنفیہ اور جمہور میں اختلاف ہے۔

تصرفات کی دو قسمیں ہیں: تصرفات حسیہ اور تصرفات شرعیہ، پھر تصرفات شرعیہ کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ انشاء، ۲۔ اقرار، پھر انشاء کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم وہ ہے جو فسخ کا احتمال رکھتی ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو فسخ کا احتمال نہیں رکھتی ہے۔ جو تصرفات شرعیہ فسخ کا احتمال نہیں رکھتے ہیں وہ یہ ہیں: طلاق، عتاق، نکاح، ظہار،

[1] التلویح علی التوضیح ۲/ ۱۹۵۔
[2] الحواشی علی مختصر الخلیل ۵/ ۹۔
[3] حاشیہ ابن عابدین ۴/ ۵۰۷، کشف الاسرار ۴/ ۳۸۳۔
[4] ترمذی وابوداؤد۔

یمین، قصاص کا معاف کرنا وغیرہ، اور وہ تصرفات شرعیہ جو فسخ کا احتمال رکھتے ہیں وہ بیع، اجارہ وغیرہ ہیں۔

''التصرفات الشرعية في الأصل نوعان: إنشاء وإقرار والإنشاء نوعان: نوع لا يحتمل الفسخ ونوع يحتمله. أما الذي لا يحتمل الفسخ فالطلاق والرجعة والعتاق والنكاح واليمين والنذر والظهار والايلاء والفيئ فى الإيلاء والتدبير والعفوعن القصاص، وهذه التصرفات جائزة مع الإكراه عندنا وعندالشافعي لاتجوز''[1]۔

جمہور کے نزدیک تصرفات شرعیہ میں اکراہ مؤثر ہے جب کہ حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ وہ احکام شرعیہ جو فسخ کا احتمال نہیں رکھتے ہیں اور نہ ان میں رضاء شرط ہے تو ان احکام میں اکراہ مؤثر نہیں اور ایسے تصرفات حالت اکراہ میں بھی مکرہ کے کرنے سے نافذ و لازم ہوں گے، پس اگر کسی شخص کو ناحق مجبور کیا گیا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو اور اس شخص نے بھی حالت اکراہ میں ڈر کی وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو اس شخص کی بیوی پر طلاق واقع ہو جائے گی، اسی طرح سے اگر کسی شخص کو کسی سے نکاح کرنے پر ناحق مجبور کیا گیا اور زبردستی اس سے ڈرا دھمکا کر نکاح پر ہاں کہلوالیا گیا تو نکاح منعقد ہو جائے گا۔

''وضابط ذلك أن كل مالا يؤثر فيه الفسخ بعد وقوعه لا يعمل فيه الإكراه من حيث منع الصحة. لأن الإكراه يفوت الرضا وفوات الرضا يؤثر في عدم اللزوم وعدم اللزوم يمكن المكره من الفسخ. فالإكراه يمكن المكره من الفسخ بعد التحقق، فما لا يحتمل الفسخ لا يعمل فيه الإكراه''[2]۔

جمہور فقہاء کرام کے نزدیک تصرفات شرعیہ میں اکراہ مؤثر ہے، اور حالت اکراہ میں کئے گئے تصرفات شرعیہ نافذ نہیں ہوتے ہیں، کیونکہ جمہور کے نزدیک تمام تصرفات شرعیہ میں رضا شرط ہے اور حالت اکراہ میں رضا معدوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکرہ کی دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی مکرہ کا کیا ہوا نکاح منعقد ہوتا ہے، بلکہ تمام تصرفات شرعیہ حالت اکراہ میں فاسد ہوتے ہیں۔

''ويرى جمهور العلماء غير الحنفية أن الإكراه يؤثر في هذه التصرفات فيفسدها. فلا يقع طلاق المكره مثلا. ولا يثبت عقد النكاح بالإكراه ونحوها''[3]۔

## شریعت میں عاقلہ بالغہ لڑکی کی رضامندی:

شریعت اسلامیہ نے عاقلہ بالغہ عورت کی رضامندی کو نکاح میں بڑی اہمیت دی ہے جیسا کہ آیت قرآنی اور احادیث شریفہ سے واضح ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عبارت نساء سے حنفیہ کے نزدیک نکاح منعقد ہو جاتا ہے، جبکہ بعض فقہاء کرام کے نزدیک عبارت نساء سے نکاح منعقد نہیں ہوتا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک صحت نکاح کے لئے ولایت شرط ہے، اس لئے اگر کوئی عورت از خود اپنا نکاح کرلے تو نکاح درست نہیں ہوگا۔

حنفیہ کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے: ''فإن طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجاً غيره''[4]۔

''وإذا طلقتم النساء فبلغن أجلهن فلا تعضلوهن أن ينكحن أزواجهن''[5]۔

ان دونوں آیتوں میں زواج کی نسبت عورتوں کی طرف کی گئی اور اسناد میں اصل فاعل حقیقی ہے، اب زواج کی نسبت عورت کی طرف ہونے سے یہ واضح ہوا کہ عورت کو بھی نکاح کرنے کا حق ہے[6]۔ حدیث شریف میں بھی عورت کو خود اپنا نکاح کرنے کا اختیار ثابت ہے، چنانچہ حدیث پاک ہے: ''الأيم أحق بنفسها من وليها''[7]۔

[1] بدائع الصنائع ۷ / ۱۸۲۔

[2] فتح القدیر ۹ / ۲۵۴، شرح النقایہ ۲۱ / ۵۲۹۔

[3] الموسوعۃ الفقہیہ ۶ / ۱۱۸، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵ / ۴۰۴، نیز دیکھئے: المحلی لابن حزم ۹ / ۲۵۸، التفسیر الکبیر ۲ / ۹۹، اللباب فی شرح الکتاب ۴ / ۱۱۳، الانصاف ۸ / ۴۴۱، بدائع الصنائع ۶ / ۱۹۳۔

[4] سورۂ بقرہ / ۲۳۰۔

[5] سورۂ بقرہ / ۲۳۲۔

[6] فقہ السنہ ۲ / ۲۹، ۱۲۸۔

[7] مسلم شریف۔

الأیم: ایسی عورت کو کہا جاتا ہے جس کا شوہر نہ ہو خواہ باکرہ ہو یا ثیبہ۔ شریعت نے ایسی عورت کو دوسرے سے زیادہ اپنے نفس کا حقدار بنایا ہے اور زبانی حق کا صدور اس وقت ہوگا جبکہ وہ اپنا نکاح از خود ولی کی رضامندی کے بغیر کرنے کی مجاز ہوگی[1]۔

## باکرہ بالغہ کو نکاح پر مجبور کرنا:

ولی کے لئے بالکل مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی عاقلہ بالغہ لڑکی کو کسی ایسے شخص سے نکاح کرنے پر مجبور کرے جس کو وہ ناپسند کرتی ہے۔ اگر کوئی ولی ایسا کرتا ہے تو وہ شریعت اسلامیہ کے خلاف کرتا ہے۔ اس کو ایسی حرکت سے باز آ جانا چاہئے، اس لئے کہ نکاح کے باب میں شریعت نے عاقلہ بالغہ لڑکی کی رضامندی اور اجازت کو ملحوظ رکھا ہے۔ ''ولا إجبار علی البکر البالغة فی النکاح''[2]۔ مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں سوالات کے جوابات ملاحظہ فرمائیں:

۱- ایسی صورت میں رضا نہیں پائی جائے گی اور لڑکی کی رضامندی نہیں سمجھی جائے گی، کیونکہ اکراہ کی دونوں صورتوں میں یعنی خواہ ملجی ہو یا غیر ملجی رضا معدوم ہوتی ہے۔

''فالحاصل أن عدم الرضا معتبر في جمیع صور الإکراہ''[3]۔

دوسری بات یہ ہے کہ نکاح کے باب میں انعقاد نکاح کے لئے رضا شرط نہیں ہے جیسا کہ کتب فقہ میں ہے، چنانچہ علامہ شامی رقمطراز ہیں:

''إذ حقیقة الرضا غیر مشروطة فی النکاح لصحته مع الإکراہ والهزل''[4]۔

۲- اس سے نکاح منعقد ہو جائے گا، اور اس کی رضا اور حقیقی اذن تسلیم کیا جائے گا، اس لئے کہ اکراہ کی حالت میں مکرہ سے حنفیہ کے نزدیک اختیار ساقط نہیں ہوتا ہے اور جب اس کو اختیار ہے اور وہ اہلیت بھی رکھتا ہے تو اس کے اذن کو حقیقی اذن شمار کیا جائے گا، ہزل پر قیاس کرتے ہوئے[5]، چنانچہ اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ثلاث جد هن جد وهزلهن جد: النکاح والطلاق والعتاق''[6]۔

(تین چیزیں ایسی ہیں جن کی سنجیدگی سنجیدگی ہے اور مذاق بھی سنجیدگی ہے: نکاح، طلاق اور رجعت)۔

## نکاح بذریعہ دستخط کا حکم:

اگر کسی لڑکے یا لڑکی کو غیر معمولی دباؤ میں لاکر بوقت نکاح دستخط کرالیا تو یہ نکاح درست ہوگا یا نہیں؟

حنفیہ کے نزدیک نکاح صحیح منعقد ہونے کے لئے عاقدین کا ایجاب وقبول، زبان سے کہنا اور سننا ضروری شرائط میں سے ہے۔ اسی طرح شاہدین کا بھی عاقدین کے ایجاب وقبول کا سننا ضروری ہے، صرف کسی سے دستخط کروا لینے سے نکاح منعقد نہیں ہوگا[7]۔

۳- اس صورت میں لڑکی کو قطعاً یہ دعوی کرنے کا حق نہیں ہے کہ میری شادی جس لڑکے سے کی جارہی ہے یا کی گئی وہ میرا کفو نہیں ہے اور نہ ہی اس لڑکی کو معاشرتی فرق کو کفاءت کی بنیاد بنا کر حق تفریق حاصل ہے۔

۵- چونکہ یہ ایک قسم کا ظلم ہے اور رفع ظلم قضاء یا شرعی کونسل کا فریضہ ہے، اس لئے ایسی صورت میں میری ناقص رائے یہ ہے کہ قاضی یا شرعی کونسل کو بربنائے ناحق جبر واکراہ لڑکی کا نکاح فسخ کرنے کا اختیار دیا جائے اور لڑکی کو بھی بربنائے جبر واکراہ فسخ نکاح کا حق دیا جائے۔ ☆☆☆

---

[1] البحر الرائق ۳ / ۱۱۷، الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۴ / ۱۵۵۔
[2] الاختیار ۲ / ۹۲۔
[3] درر الحکام فی شرح غرر الاحکام، الجزء الثانی / ۲۶۹۔
[4] رد المحتار ۳ / ۳۱، البحر الرائق / ۔
[5] المبسوط للسرخسی ۱۲ / ۶۴، الفتاوی الہندیہ ۵ / ۵۳، البحر الرائق ۳ / ۲۴۶، درمختار علی ہامش رد المحتار ۲ / ۴۲۱، کتاب الطلاق۔
[6] ترمذی، ابوداؤد۔
[7] الدر المختار ۱ / ۱۸۶، البحر الرائق ۳ / ۲۴۶، رد المحتار ۲ / ۴۲۱۔

# جبری شادی

مولانا اعجاز احمد قاسمی...... مدرسہ اسلامیہ محمود العلوم، دملہ

## نکاح میں عاقلہ بالغہ لڑکی کا اختیار:

عاقلہ بالغہ لڑکی اپنے نکاح میں خود مختار ہے۔ اس کو کوئی شخص نکاح پر مجبور نہیں کر سکتا۔ حدیث صحیح میں ہے: ''الأيم أحق بنفسها من وليها. والبكر تستأذن وإذنها صماتها'' (عاقلہ بالغہ لڑکی اپنے نفس کی اپنے ولی سے زیادہ حق دار ہے، باکرہ سے اس کی اجازت اور مرضی معلوم کی جائے اور اس کی اجازت خاموش رہنا ہے)، نیز دیکھئے: درمختار ۴۱۰/۲۔

ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ''ويجب على ولي المرأة أن يتقي الله فيمن يزوجها به وينظر في الزوج هل هو كفوء أو غير كفوء. فإنه إنما يزوجها لمصلحتها لا لمصلحته، وليس له أن يزوّجها بزوج ناقص لغرض له''[1]۔

(عورت کے ولی پر ضروری ہے کہ اس شخص کے بارے میں جس سے اس کی شادی کرنا چاہتا ہے اللہ سے ڈرے، اور شوہر کے بارے میں غور کرے کہ آیا وہ کفو ہے یا نہیں، اس لئے کہ وہ عورت کی شادی کرا رہا ہے اس کی مصلحت کی خاطر، نہ کہ اپنی مصلحت کے پیش نظر اور ولی کے لئے جائز نہیں اپنی غرض کو حاصل کرنے کے لئے کسی ناقص شوہر سے اس کی شادی کردے)۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''أما تزويجها مع كرهتها للنكاح فهذا مخالف للأصول والنقول، والله لم يسوغ لوليها أن يكرهها على بيع وإجارة إلا بإذنها ولا على طعام أو شراب أو لباس لا تريده فكيف يكرهها على مباضعة و معاشرة من تكره مباضعته ومعاشرة من تكره معاشرته''[2]۔

(ولی کا عورت کی ناپسندیدگی کے باوجود اس کی شادی کرانا اصول ونقول سب کے خلاف ہے۔ اللہ نے کسی ولی کے لئے جائز قرار نہیں دیا کہ وہ عورت کی مرضی کے بغیر کسی شئ کی بیع اور اجارہ پر اس کو مجبور کرے اور نہ ایسی چیز کے کھانے، پینے، اور پہننے پر مجبور کر سکتا ہے جس کو وہ ناپسند کرتی ہے، تو ولی کس طرح عورت کی مرضی کے خلاف کسی شخص سے نکاح پر اس کو مجبور کر سکتا ہے؟ اور ایسے شخص کے ساتھ معاشرت پر مجبور کر سکتا ہے جس کی معاشرت کو وہ پسند نہیں کرتی)۔

## حالت اکراہ کا نکاح:

کسی ولی نے تمام تر شرعی ذمہ داریوں کو فراموش کرتے ہوئے عاقلہ بالغہ کو کسی ناپسندیدہ شخص سے نکاح پر مجبور کردیا اور بحالت مجبوری اس نے قبول کرلیا تو حنفیہ کی رائے کے مطابق یہ نکاح منعقد ہو جائے گا[3]۔

## قاضی یا شرعی کونسل کے ذریعہ فسخ:

عورت کسی طرح شوہر کے ساتھ زندگی گذارنے پر راضی نہ ہو تو اپنے دعوی کو ثابت کرکے بذریعہ قاضی نکاح فسخ کرالے[4]۔

☆☆☆

[1] فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/۳۲۔
[2] فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/۳۲۔
[3] ردالمحتار ۹۷۵/۲۔
[4] شامی ۴۳۶/۲۔

# جبری شادی

مولانا خورشید احمد اعظمی

المکتب العلمی، رگھوناتھ پورہ، مئو

۱- یہ صورت رضامندی پر محمول ہوگی، اور نکاح صحیح ہوگا۔

۲- اولیاء کے بارے میں یہ پہلو غالب ہے کہ وہ لڑکی کے حق میں خیر خواہی، شفقت اور اس کے مفادات کی رعایت کو ملحوظ رکھیں گے۔ اگر اس سے ہٹ کر کسی جذبہ کے تحت وہ لڑکی پر دباؤ ڈالتے ہیں تو ان کا یہ فعل باعث گناہ ہوگا، مگر لڑکی کی اجازت جو جبر و اکراہ کے تحت حاصل ہو رہی ہے، نکاح کے باب میں اس کی رضامندی پر ہی محمول ہوگی۔

۳- نکاح کے باب میں شرعاً صرف دین میں کفاءت کا اعتبار کرنا چاہئے جیسا کہ احادیث نبویہ اور عہد رسالت وقرون مشہودہ کی شادیوں سے معلوم ہوتا ہے[1] اور امام مالکؒ نیز امام کرخی، ابوبکر الجصاص اور دیگر علماء عراق نے بھی صرف اسی کا اعتبار کیا ہے، اگر چہ بعض خارجی امور (فخر ومباہات) کا لحاظ کرتے ہوئے عرفاً دیگر امور میں بھی حنفیہ کے نزدیک کفاءت کا اعتبار کیا گیا ہے وہ امور یہ ہیں:

نسب، اسلام، پیشہ، آزادی، دیانت اور مال[2]۔

برطانوی لڑکی کے نکاح کی جو صورت سوالنامہ میں مذکور ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لڑکی کے اولیاء اس کا نکاح اپنے خاندان اور گھرانہ میں ہی کرتے ہیں اگر چہ ملک اور وطن بدلا ہوا ہے، لہذا لڑکی کا یہ دعوی کہ میرا نکاح غیر کفو میں ہو رہا ہے، جائز نہیں ہوگا۔

اول تو اس لئے کہ کفاءت کو اولیاء کا حق شمار کیا گیا ہے۔

دوم: اس لئے کہ لڑکی کو اس کا علم ہوتا ہے کہ اس کا نکاح کس سے کیا جا رہا ہے اور اس کی اجازت شامل ہوتی ہے اگر چہ اکراہ کے ساتھ ہو۔

سوم: اس لئے کہ ایک دیہاتی شہری کا کفو ہوسکتا ہے[3]۔

لہذا جن کے نزدیک دین کے علاوہ دیگر امور میں بھی کفاءت کا اعتبار کیا گیا ہے، ان کے نزدیک بھی اختلاف بلد یا شہری اور دیہاتی ہونے کی بنا پر کفاءت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا، اور ایک دیہاتی شہری کا کفو ہوسکتا ہے، اس لئے اس کا لحاظ کرتے ہوئے برطانوی نژاد لڑکی کا کفو ہندوستانی یا پاکستانی نژاد لڑکا ہوسکتا ہے، لہذا لڑکی کا مطالبہ تفریق درست نہیں ہوگا۔

۵- صرف اس بنیاد پر کہ نکاح کے وقت لڑکی نے جبر اور دباؤ میں اجازت دی تھی، ورنہ وہ اس نکاح پر راضی نہیں تھی، قاضی کو اس نکاح کے فسخ کا اختیار نہیں ہوگا۔



[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت تالیف محدث حبیب الرحمن الاعظمیؒ۔

[2] ردالمحتار ۴؍۲۰۹۔

[3] ردالمحتار ۴؍۲۱۹۔

# جبری شادی

مولانا بہاء الدین ندوی، کیرالا

۱- شافعی مسلک کے مطابق لڑکی کی رضامندی کی اہمیت ہے، لیکن اگر لڑکی کنواری (بکر) ہو تو اس لڑکی کے باپ (باپ نہیں ہے تو دادا) اس لڑکی کو شادی کرنے پر مجبور کرسکتا ہے، جبکہ وہ شادی کفو سے ہو جائے۔ اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ ایک لڑکی کے مستقبل کے بارے میں لڑکی سے بھی اچھی طرح باپ یا دادا جانتے ہیں اور اپنی بیٹی کو کسی طرح کی مضرت آنے کی خواہش عموماً ان کو نہیں ہوگی، تو لڑکی کے کنواری ہونے کی صورت میں اس کی پوری اجازت شافعی مسلک میں ضروری نہیں ہے اور اگر ثیب (جو کنواری نہیں ہے) ہے تو اس کی اجازت کے بغیر شادی صحیح نہیں ہے۔ ''وللأب تزوج البكر صغيرة وكبيرة بغير إذنها لكمال شفقته ويستحب استئذانها أي الكبيرة تطييباً لخاطرها. وليس له تزويج ثيب إلا بإذنها فإن كانت صغيرة لم تتزوج حتى تبلغ، لأن الصغيرة لا إذن لها، والجد كالأب عند عدمه في جميع ماذكر''

لیکن ہمارے مسئلہ میں رضامندی کی بات آتی ہے۔ اس میں شافعی مسلک کا حکم یہ ہوگا کہ اگر شادی کفو سے نہیں ہے تو وہ باطل ہے، چاہے ولی کو جبر کرنے کا حق ہو یا نہ ہو۔ امور کفاءت کی جو خصلتیں آتی ہیں وہ فقہ کی کتابوں میں درج ہیں۔

''لو زوّجها الولي غير كفء أو بعض الأولياء المستووين برضاها ورضا الباقين صح التزويج. ولو زوّجها الأقرب برضاها فليس للأب اعتراض. ولو زوّجها أحدهم بغير كفء برضاها دون رضاهم لم يصح: وفي قول: يصح. ولهم الفسخ. ويجري القولان في تزويج الأب أو الجد، بكراً صغيرة أو بالغة غير كفء بغير رضاها. ففي الأظهر باطل. وفي الآخر: يصح. وللبالغة الخيار وللصغيرة إذا بلغت''۔

۲- نکاح کے انعقاد میں یا دوسرے کسی معاملے کے انعقاد میں اکراہ موثر نہیں ہے، لیکن اکراہ اس صورت کو بولا جاتا ہے جس میں مندرجہ ذیل شرائط موجود ہوں:

۱- اکراہ کرنے والے کو جس بات کو بول کر کے وہ اکراہ کرتا ہے، اس کو نافذ کرنے کی طاقت ہو۔

۲- اکراہ معجّل یعنی حالی ہو، مطلب یہ ہے کہ اگر کل یا پرسوں یا ایک مہینہ کے بعد قتل کرنے کی دھمکی دی جائے تو یہ اکراہ میں شامل نہیں ہے۔

۳- اس دھمکی سے سلامتی پانا ناممکن ہو۔

''وشرط الإكراه قدرة المكره على تحقيق ماهدد به عاجلاً بولاية أو تغلب، وعجز المكره عن دفعه بفرار أو استغاثة وظنه أنه إن امتنع فعل ماخوّفه به ناجزاً فلا يتحقق العجز بدون اجتماع ذلك كله''۔

پاسپورٹ جلادینے کی دھمکی اس میں شامل نہیں ہے، کیونکہ عموماً وہ بات بعد کی ہوگی، ہاں اگر لڑکی کے سامنے پاسپورٹ جلادینے کی دھمکی ہو تو وہ اکراہ ہے۔

میرا شک یہ ہے کہ اکراہ کی بات اس میں کیسے آئے گی، لڑکی پر اکراہ کرنا ہماری بحث کا موضوع نہیں ہے۔ اگر ولی کو کوئی شادی پر مجبور کرے تو اس کو اکراہ (عقد یا معاملے میں اکراہ) بولا جاتا ہے۔ ولی لڑکی پر اکراہ کرے تو یہ شادی یا معاملے میں اکراہ نہیں ہوگا۔

۳- کفاءت میں جو باتیں معتبر ہیں ان میں سے ''نسب'' (خاندان) کے تحت اس مسئلہ کو رکھا جاسکتا ہے، اگر لڑکا کفو نہیں ہے تو اس صورت میں تفریق کا حق مسلک شافعی کے مطابق خود لڑکی کو حاصل ہے۔

۴- زن وشوئی تعلقات قائم ہونے کے بعد تفریق کرنا اور اس کے پہلے تفریق کرنا دونوں کا حکم ہر ایک مسئلہ میں ایک ہے، یعنی اگر زن وشوئی تعلق قائم ہونے کے بعد تفریق ہوتی ہے تو مہر واپس نہیں لے سکتا اور اگر اس کے قبل ہے تو مہر کا آدھا حصہ واپس دینا واجب ہے۔

۵- جواب نمبر (۳) کی عبارت سے واضح ہے کہ اگر غیر کفو سے شادی ہوگی تو لڑکی کو خود فسخ کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر بالغ نہیں ہے تو بالغ ہونے کے بعد بھی یہ حق حاصل ہے، تو لڑکی کے قول پر عمل کرنا قاضی اور شرعی کونسل کے لئے جائز ہے، لیکن فسخ کا صیغہ لڑکی کے منہ سے آنا چاہئے، کیونکہ فسخ کا حق اس کا ہے۔ ☆☆☆

# جبری شادی

شیخ عبدالقادر عبداللہ القادری کیرالا، عربی سے ترجمہ

ولی کو عاقلہ شوہر دیدہ لڑکی کی شادی کرانے کا اختیار نہیں ہے۔ الا یہ کہ وہ اس کی اجازت دے کیونکہ مسلم کی روایت ہے: "الثیب احق بنفسہا من ولیہا" (ثیبہ اپنے ولی کے مقابلہ میں اپنے آپ کی زیادہ حق دار ہے)، اس کی علت یہ ہے کہ مردوں سے سابقہ پیش آنے کی وجہ سے اس کی ناواقفیت ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ اور وہ مردوں کی طرف سے پہنچنے والے نفع نقصان کو سمجھ لیتی ہے، بخلاف کنواری لڑکی کے۔[1]

نکاح میں عورت کی رضامندی شرط ہے۔ کیونکہ یہ اس کا حق ہے[2] اور عورتوں کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ ثیبہ (شوہر دیدہ)، ۲۔ باکرہ (کنواری)[3] اور "والنساء علی ضربین" سے مراد یہ ہے کہ نکاح کے سلسلہ میں جبر نہیں کیا جا سکتا اور کنواری لڑکیوں کے معاملہ میں باپ اور دادا کو جبر کرنے کا حق ہے۔[4]

ثیبہ بالغہ پر جبر کرنا جائز نہیں ہے اور نہ اس کی شادی کرائی جا سکتی ہے، الا یہ کہ وہ اجازت دے اور اس کا یہ کہنا: "اگر میرے والد رضامند ہیں تو میں بھی رضامند ہوں" کافی نہ ہوگا، اگر اس کا مقصد اپنی رضامندی کو اپنے والد کی رضامندی پر معلق کرنا ہو۔ اور اگر اس کی مراد یہ ہو کہ میرے والد جو کریں میں اس پر راضی ہوں تو یہ جائز ہے اور اس وقت یہی دستور ہے۔[5] عقد کے مکمل ہونے سے قبل عورت کا رجوع نہ کرنا بھی شرط ہے، لیکن اگر وہ عقد کے مکمل ہونے کے بعد رجوع کرے تو اس کا قول معتبر نہیں ہوگا الا یہ کہ کوئی بینہ پیش کیا جائے۔

نکاح دو گواہوں کی موجودگی ہی میں صحیح ہوگا اور ان کا آزاد، مرد عادل (راست باز) اور سننے والا ہونا شرط ہے، اس لئے کہ جس چیز پر گواہی دی جاتی ہے وہ قول ہے، لہٰذا اس کا سنا جانا شرط ہے، اور دیکھنا بھی شرط ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے کہ اقوال دیکھنے اور سننے کے ذریعہ ہی ثابت ہوتے ہیں۔[6]

آواز پر اعتماد کرنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ لہٰذا اگر دونوں گواہ ایجاب کرنے والے اور قبول کرنے والے کو دیکھے بغیر ایجاب و قبول کو سن رہے ہوں لیکن قطعی طور پر ان کے دل میں یہ خیال ہو کہ ایجاب کرنے والا فلاں ہے اور قبول کرنے والا فلاں تو یہ کافی نہ ہوگا۔ اس کی علت ذکر کی جا چکی ہے۔ یعنی یہ کہ ان دونوں کو ایجاب کرنے والے اور قبول کرنے والے کا علم نہیں ہے، اس لئے کہ نکاح کے دو گواہوں سے مقصود یہ ہے کہ تنازع کی صورت میں عقد کو ثابت کیا جا سکے جو علم نہ ہونے کی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتا، "النہایہ" ۶/۲۱۸ میں ہے: "وشرطهما حرية وسمع" (گواہوں میں آزادی اور سننا شرط ہے) اس لئے کہ جس چیز کی گواہی دی جاتی ہے وہ قول ہے، لہٰذا حقیقتاً اس کا سنا جانا شرط قرار دیا گیا اور دیکھنا بھی، کیونکہ اقوال کا ثبوت دیکھ کر اور سن کر ہی ہوتا ہے۔

اگر عورت کی طرف سے رضامندی نہیں پائی گئی یا اس کے ساتھ زبردستی کی گئی اور نکاح جبر کے ساتھ ہوا اور زن و شوئی کے تعلقات نہیں قائم ہوئے تو عورت کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہے۔ اگر مرد کفو نہ ہو۔ کفاءت کا اعتبار پانچ امور میں ہوتا ہے جن کو شارع نے بیان کیا ہے اور اختلاف مکان میں اس کا کوئی اثر نہ ہوگا اور نکاح اور دیگر عقود و معاملات کے درمیان فرق ہے، چنانچہ عقد نکاح میں دونوں گواہوں کا موجود رہنا بھی شرط ہے برخلاف معاملات کے جو غیر موجودگی میں بھی درست ہو جاتے ہیں جیسا کہ "اسنی المطالب" میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ☆☆☆

---

[1] التحفہ ۷/۲۴۵۔
[2] تحفۃ الطلاب بشرح تنقیح اللباب ج ۲/۲۲۴۔
[3] شرح ابن قاسم الغزی علی متن ابی الشجاع۔
[4] حاشیۃ الباجوری ۲/۱۱۲۔
[5] الانوار فی عمل الابرار ۲/۵۲۔۵۳
[6] التحفہ مع المنہاج ج ۷/۲۲۸۔

# جبری شادی

مولانا نیاز احمد عبدالحمید طیب پوری
الجامعۃ الاسلامیہ خیر العلوم، سدھارتھ نگر

۱- جی نہیں، یہ رضامندی تصور نہ ہوگی، اس لئے کہ لڑکی مکرہ ہے اور قبول نکاح میں مکرہ کے ارادہ کی تنفیذ کررہی ہے نہ کہ اپنے جذبات کی ترجمانی۔

''رفع عن أمتي الخطأ والنسيان وما استكرهوا عليه'' (میری امت سے بھول، چوک اور اس چیز کو معاف کردیا گیا ہے جس پر اسے مجبور کیا جائے)۔

۲- عاقلہ بالغہ لڑکی کو اپنی رضامندی کا پورا اختیار ہے لیکن اس اختیار سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ اپنی شادی کے تعلق سے مختار کل ہے، بلکہ حدیث کی صراحت کے بموجب ولایت کی شرط باقی رہے گی۔

۳- لڑکی کو اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ عدم کفاءت کا دعوی کرے اور اس کے ذریعہ حق تفریق حاصل کرے۔ اصل کفاءت اسلام ہے اور سارے کلمہ گو مسلمان اور بھائی بھائی ہیں، پیشے بھلے ہی الگ الگ ہوں، کوئی مسلمان لڑکا لڑکی برضا ورغبت کسی بھی سماج میں بسنے والی لڑکی یا لڑکے سے شادی کرسکتے ہیں، اگر سماجی تفاوت اور رہن سہن کے اختلاف سے کوئی منفی پہلو سامنے آتا ہے اور ازدواجی زندگی میں ایسی کڑواہٹ پیدا ہوتی ہے جو معاشرتی زندگی کی گاڑی کے آگے بڑھنے میں سخت مانع ہے تو شریعت نے اس کے لئے استثنائی صورتیں رکھی ہیں، لیکن محض سماجی رکھ رکھاؤ اور معاشرتی تفاوت کو عدم کفاءت قرار دینا سراسر زیادتی اور اسلامی تصور کے خلاف ہے۔

۴- اکراہ کی کوئی چیز واقع نہیں ہوتی ہے، چاہے طلاق ہو یا عتاق، صورت مسئولہ میں لڑکی مکرہ ہے، اس لئے اس کا نکاح ہی نہیں ہوا، اب اگر زن وشوئی کے تعلقات قائم ہوچکے ہیں تو لڑکی مہر مثل کی مستحق ہوگی، لڑکے کو زانی نہیں کہا جائے گا اور نہ ہی اس پر شرعی حد جاری کی جاسکتی ہے، اگرچہ نکاح صحیح نہیں ہوا تھا۔

جسمانی تعلقات قائم نہ ہونے کی صورت میں لڑکی مستحق نہ ہوگی، ایک بات اور ملحوظ خاطر رہے کہ نکاح فاسد سے وطی کی صورت میں عدت واجب ہوگی، سید سابق فقہ السنہ میں رقمطراز ہیں:

''من وطي امرأة بشبهة وجبت عليها العدة؛ لأن وطأ الشبهة كالوطأ في النكاح في النسب. فكان كالوطأ في إيجاب العدة. وكذلك تجب العدة في زواج فاسد إذا تحقق الدخول۔

أما الظاهرية فقالت: لا تجب العدة في النكاح الفاسد ولو بعد الدخول لعدم وجود دليل على إيجابه من الكتاب والسنة''[1] (جو کسی عورت سے شبہ کی بنا پر وطی کرلے تو اس عورت پر عدت واجب ہوگی، اس لئے کہ شبہ کی وطی نسب کے سلسلے میں نکاح کی وطی کی طرح ہے، لہذا یہ عدت کو واجب کرنے میں وطی کی طرح ہوگیا۔ اسی طرح نکاح فاسد میں اگر دخول ہوجائے تو عدت واجب ہوگی۔ جہاں تک ظاہریہ کا تعلق ہے تو انہوں نے کہا ہے کہ نکاح فاسد میں عدت واجب نہیں ہے، خواہ دخول ہوچکا ہو، اس لئے کہ کتاب وسنت سے اس کو واجب کرنے والی کوئی دلیل نہیں ہے)۔

☆☆☆

[1] فقہ السنہ ۲/ ۲۷۵۔

# جبری شادی

مولانا محمد اعظمی (مئو)

۱- صورت مسئولہ میں عاقلہ بالغہ سے زبردستی ہاں کہلوالینا نکاح کے لئے اس کی رضامندی پر دلیل نہیں ہے، کیونکہ جبر واکراہ کی مذکورہ صورتیں اس کی عدم رضا پر دلالت کر رہی ہیں۔

۲- اگر والدین یا اولیاء محض شفقت اور مصلحت دین ودنیا کی بنا پر استیذان وانکاح کے لئے بالغہ پر جبر واکراہ کا شائستہ طریقہ اختیار کریں، اس میں ان کی اپنی یا خاندان وغیرہ کی غرض یا مفاد شامل نہ ہو اور کوئی فریب ودھوکہ کی حرکت نہ ہو تو یہ رضا ونکاح درست ہے، ورنہ سوال میں جبر واکراہ کے مذکورہ طریقوں سے جو نکاح ہوگا وہ فاسد ہوگا، کیونکہ جمہور فقہاء کے نزدیک رضا اور عدم اکراہ انعقاد نکاح کے لئے شرط ہے، چنانچہ ڈاکٹر وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

''الرضا والاختيار من العاقدين أو عدم الإكراه- هو شرط عند الجمهور غير الحنفية. فلا يصح الزواج بغير رضا العاقدين، فإن أكره أحدهما على الزواج بالقتل أو بالضرب الشديد أو بالحبس المديد كان العقد فاسداً. لقوله عليه الصلاة والسلام: ''إن الله تجاوز عن أمتي الخطأ والنسيان وما استكرهوا عليه'' وأخرج النسائي عن عائشة أن فتاة هي الخنساء ابنة خذام الأنصارية دخلت عليها فقالت: إن أبي زوّجني من ابن أخيه يرفع بي خسيسته وأنا كارهة... فجاء رسول الله ﷺ... فجعل الأمر إليها'' الحديث۔

(حنفیہ کو چھوڑ کر جمہور کے نزدیک رضامندی، اختیار اور عدم اکراہ دونوں کی جانب سے شرط ہے، چنانچہ بغیر رضائے عاقدین نکاح جائز نہیں ہے۔ اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی قتل، شدید مار، یا طویل مدت تک قید کا خوف دلا کر نکاح کے لئے راضی کر لیا گیا تو یہ نکاح فاسد ہوگا، حضور ﷺ کے اس ارشاد کی وجہ سے جس میں آپ نے فرمایا کہ میری امت کو اللہ تعالی خطا ونسیان اور اکراہ کی حالت میں معاف کرتا ہے، اور ایک حدیث جس کو امام نسائی نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے، یہ ہے کہ خنساء بنت خذام انصاریہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ میرے والد نے اپنے چچازاد بھائی سے میری شادی کردی ہے تاکہ میرے ذریعہ اس کی خست کو دور کرے اور اسے میں ناپسند کرتی ہوں، اسی دوران حضور ﷺ تشریف لائے پھر یہ بات آپ کو بتائی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں اختیار ہے)[1]۔

امام ابن تیمیہؒ نے جبری شادی کو حرام اور جاہلی عمل قرار دیا ہے[2]۔

یہ بھی ایک المیہ ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں پسند کی شادی کا رجحان روز افزوں ہے۔ کفاءت کا معیار بھی ماڈرن ہو گیا ہے، جو بیشتر محرمات کے ارتکاب کا شاخسانہ ہے، اس کے اولین مجرم اولیاء ہیں جن کی تربیت وسرپرستی میں معیار کفاءت "الخبیثات للخبیثین" کی منزل تک پہنچ گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مرحلے میں اولیاء کے حق اجبار استعمال کرنے سے عظیم مفاسد پیدا ہونے لازمی ہیں، اس لئے اولیاء کو چاہئے کہ ان حالات میں عاقدین پر ظالمانہ جبر واکراہ کا ارتکاب کر کے اپنے جرائم کے کھاتے کو ضخیم نہ بنائیں۔

۳- اسلام کی عظیم خصوصیات میں مساوات انسانی ایک ایسی حقیقت ہے جس نے عرب وعجم کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے، طبقاتی، علاقائی اور نسلی

[1] الفقہ الإسلامی وأدلتہ ۷/۷۸۔
[2] فتاوی شیخ الإسلام ۳۲/۵۲۔

امتیازات وفرق درجات کو جس طرح مٹایا ہے وہ ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ شادی کے معاملے میں کفاءت کے جتنے معیارات قائم کئے گئے ہیں جن کا ثبوت کتاب وسنت میں نہیں ہے، وہ سب قرون اولی کے بعد کی پیداوار ہیں، اس لئے مغربی وایشیائی معاشرتوں کے فرق کو عدم کفاءت کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ مشرق ومغرب میں آباد مسلمانوں کے درمیان نکاح اور قرابت کے لئے دین وایمان اور کردار واخلاق میں کفاءت ساری کفاءتوں پر مقدم ہے۔ اگر دو ملکوں یا ایک ہی ملک وبستی میں رہنے والے طرفین کے درمیان یہ شرعی کفاءت معدوم ہو تو بلا شبہ سوال میں مذکور دعوی کرنے کا حق لڑکی کو حاصل ہے۔

۴- یہ سوال مبہم ہے۔ جب تک یہ واضح نہ ہو کہ عقد نکاح رضا یا اکراہ کی حالت میں ہوا ہے اور اس رضا یا اکراہ کی کیفیت کیا رہی؟ پھر کن حالات میں زن وشوئی تعلقات قائم ہوئے، یا کیوں نہیں ہوئے؟ شرعی حکم کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے؟ البتہ فسخ نکاح کی صورت میں مہر کے وجوب وعدم وجوب کا فرق ہوگا۔

۵- فسخ کرسکتے ہیں جیسا کہ جواب نمبر ۲ میں حضرت عائشہؓ کی حدیث مذکور جو خنساء انصاریہ کے واقعہ پر مشتمل ہے، اس پر بین دلیل ہے۔



# جبری شادی

مولانا سلطان احمد اصلاحی، علی گڑھ

۱- سوال نامہ میں درج تفصیلات کی روشنی میں صورت مسئولہ میں رضامندی کا تحقق نہیں ہوگا اور اس طرح زبردستی نکاح کے لئے کہلوایا گیا ''ہاں'' معتبر نہیں ہوگا۔ عاقلہ بالغہ لڑکی کو اختیار ہوگا کہ وہ ایسے جبری نکاح کو مسترد کرتے ہوئے کفو سے اپنی پسند کا دوسرا نکاح کر سکے۔ اسلامی معاشرے پر واجب ہے کہ وہ اپنے ہاں مصالح کے تحفظ کو یقینی بنائے اور جزئیات فقہ کے غلط استعمال پر قابو پائے۔ اس طرح کی صورت حال میں شرعی عدالتوں کو بھی ایسی مظلوم خواتین کی بھرپور دادرسی کرنی چاہئے۔ اپنی کتاب ''اسلام کا نظریۂ جنس'' میں راقم ''جوڑ کا نکاح'' اور ''شادی میں اولیاء کا دخل'' کے عنوانات کے تحت مسئلہ کی جزئیات پر تفصیل سے لکھ چکا ہے جس کے دہرانے کی اس وقت ضرورت نہیں ہے[۱]۔

۲- صورت مسئولہ میں یہ لڑکی کی رضا اور اس کا حقیقی اذن نہیں ہوگا، اور اس کی بنیاد پر ہونے والا نکاح بھی اسی طرح غیر حقیقی اور غیر مؤثر ہوگا۔

۳- ہاں! صورت مسئولہ میں لڑکی کو یہ دعوی کرنے کا حق ہوگا اور بربناء کفاءت اس کو تفریق کا اختیار حاصل ہوگا۔

۴- دونوں کا حکم الگ الگ ہوگا۔ زن وشوئی تعلقات قائم ہونے کی صورت میں رشتہ کو ممکن حد تک نبھانے کی کوشش کی جائے، دوسری صورت کا حکم اس سے مختلف ہوگا۔

۵- ہاں! جبر واکراہ کا یقین ہونے کی صورت میں شرعی کونسل یا قاضی ایسے نکاح کو فسخ کر سکتے ہیں۔



[۱] مطبوعہ ادارہ علم وادب علی گڑھ طبع دوم ۲۰۰۰ء۔

# جبری نکاح

قاضی محمد کامل قاسمی

آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ، نئی دہلی

اسلام نے ازدواجی رشتوں کے انتخاب کے لئے زوجین اوران کے متعلقین کوکئی بنیادی ہدایات دی ہیں۔ ان پر عمل کرنے سے یہ رشتہ ہمیشہ خوشگوار اور مستحکم رہتاہے، مثلاً رشتہ کرتے وقت لڑکے یا لڑکی کے انتخاب میں ترجیح کی بنیاد دینداری اور حسن اخلاق ہونی چاہئے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تنکح المرأة لأربع: لمالها و لحسبها ولجمالها و لدينها فاظفر بذات الدين تربت يداك[1]۔

(عورت سے چار وجوہ سے نکاح کیا جاتا ہے: اس کے مال کی وجہ سے، اس کی خاندانی خوبیوں کی وجہ سے، اس کے حسن وجمال کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے، تم دیندار عورت سے نکاح کرکے کامیابی حاصل کرلو۔ تمہارے ہاتھ خاک آلودہ ہوں) (بخاری ومسلم)۔

دوسری حدیث میں ارشاد ہے: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إذا خطب إليكم من ترضون دينه و خلقه فزوجوه، إن لا تفعلوا تكن فتنة في الأرض و فساد عريض[2]

(جب تمہیں کوئی ایسا شخص پیغام نکاح دے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو تم اس سے نکاح کرادو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو زمین میں بڑا فتنہ اور فساد ہوگا)۔

و يندب ...... والنظر إليها قبله[3]۔ (نکاح سے پہلے عورت کو دیکھنا مندوب ہے)۔

مخطوبہ کو دیکھنے سے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات:

(۱) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا: ''إني تزوجت امرأة من الأنصار قال: فانظر إليها فإن في أعين الأنصار شيئاً[4]۔ (میں نے ایک انصاری خاتون سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے دیکھ لو، اس لئے کہ انصار کی آنکھوں میں کچھ ہوتا ہے) (مسلم)۔

(۲) حضرت جابرؓ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إذا خطب أحدكم المرأة فإن استطاع أن ينظر إلى مايدعوه إلى نكاحها فليفعل[5]۔ (جب تم میں سے کوئی عورت کو پیغام نکاح دے تو اگر وہ ان خوبیوں کو جو اسے اس خاتون سے نکاح کرنے پر آمادہ کررہی ہیں دیکھ سکتا ہو تو اسے ایسا کرلینا چاہئے)۔

(۳) حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: خطبت امرأة فقال لي رسول الله ﷺ: هل نظرت إليها فإنه أحرى أن يؤدم بينكما'' [6]۔ (میں نے کسی عورت کو نکاح کا پیغام دیا، تو مجھ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم نے اسے دیکھ لیا ہے، اس لئے کہ دیکھنا

[1] مشکاۃ ۲/۲۶۷۔

[2] مشکاۃ ۲/۲۶۷۔

[3] شامی ۲/۲۶۱، ۲۶۲۔

[4] مشکاۃ ۲/۲۶۸۔

[5] اس کی روایت ابوداؤد نے کی ہے۔ دیکھئے: مشکاۃ ۲/۲۶۸۔

[6] رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والدارمی، مشکاۃ ۲/۲۶۹۔

تم دونوں کی الفت ومحبت کے لئے زیادہ بہتر ہے)۔

اولیاء کو ہدایت کی گئی ہے کہ بالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح ان کی اجازت اور رضامندی سے کریں، اس کے بغیر نہ کریں۔

اللہ تبارک وتعالی نے فرمایا ہے: و إذا طلقتم النساء فبلغن أجلهن فلا تعضلوهن أن ينكحن أزواجهن إذا تراضوا بينهم بالمعروف[1] (اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی، پھر وہ اپنی عدت کو پورا کر چکیں، تو ان کو اس سے نہ روکو کہ اپنے انہی خاوندوں سے نکاح کر لیں جب کہ آپس میں دستور کے موافق راضی ہو جاویں)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الأيم أحق بنفسها من وليها و البكر تستأمر و إذنها سكوتها[2] (ثیبہ اپنے نفس کی، اپنے ولی سے زیادہ حق دار ہے، باکرہ سے اجازت طلب کی جائے گی اور اس کی اجازت اس کا خاموش رہنا ہے)۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے: ''باب: لا ينكح الأب وغيره البكر والثيب إلا برضاها'' (والد وغیرہ باکرہ اور ثیبہ کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر نہ کریں)۔

اس کے تحت انہوں نے حدیث پیش کی ہے۔ عن أبي سلمة أن ابا هريرة حدثهم أن النبي ﷺ قال: ''لا تنكح الأيم حتى تستأمر ولا تنكح البكر حتى تستأذن قالوا يا رسول الله: وكيف إذنها قال: أن تسكت[3]۔

(حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان سے بیان کیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شوہر دیدہ عورت کا نکاح اس کی صریح اجازت کے بغیر نہ کیا جائے اور باکرہ (کنواری) لڑکی کا نکاح بھی اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اجازت کیسے معلوم ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا خاموش ہو جانا اس کی اجازت ہے)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا: یا رسول الله ﷺ إن البكر تستحيي قال: رضاها صمتها'' (یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باکرہ حیا کرتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی رضامندی اس کا خاموش رہنا ہے) (حوالہ سابق)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اليتيمة تستأمر في نفسها فإن صمتت فهو إذنها و إن أبت فلا جواز عليها۔ (یتیم لڑکی سے اس کے نفس کے متعلق اجازت چاہی جائے گی، چنانچہ اگر وہ خاموش رہے تو یہی اس کی اجازت ہے اور اگر وہ انکار کر دے تو اس پر جبر کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے)[4]۔

یتیمہ اس بالغ لڑکی کو کہا جاتا ہے جس کے والد کا انتقال ہو گیا ہو۔ اس حدیث میں یتیمہ سے مراد وہ باکرہ لڑکی ہے جس کے والد کا انتقال اس کے بالغ ہونے سے قبل ہو گیا ہو۔ اس حدیث میں ایسی لڑکی کا نکاح کرنے کے لئے اس سے اجازت لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر کوئی باپ یا اور کوئی بالغ لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر کر دے تو وہ نکاح نافذ ولازم نہ ہوگا، بلکہ اس کی رضامندی پر موقوف رہے گا۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے: أن رجلا زوج ابنته و هي بكر من غير أمرها فأتت النبي ﷺ ففرق بينهما[5]۔

(ایک آدمی نے اپنی باکرہ لڑکی کی شادی اس کی اجازت کے بغیر کر دی، وہ لڑکی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب عثمان بن مظعونؓ کا انتقال ہوا تو انہوں نے ایک لڑکی چھوڑی، ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا

---

[1] سورۂ بقرہ/۲۳۲۔

[2] مسلم، بحوالہ مشکاۃ ۲/۲۷۰۔

[3] بخاری ۲/۷۷۱۔

[4] اس حدیث کی روایت ترمذی، ابوداؤد، نسائی نے کی ہے اور دارمی نے اسے حضرت ابوموسی سے نقل کیا ہے (مشکاۃ ۲/۲۷۱)۔

[5] المحلی لابن حزم ۹/۴۶۱، بحوالہ المفصل فی احکام المرأۃ والبیت المسلم، دفعہ ۶۰۵۱/ ۴۴۶۔

کہ میرے ماموں قدامہ نے میرا نکاح اس سے کردیا اور وہ اس لڑکی کے چچا تھے۔ اور انہوں نے اس سے مشورہ نہیں کیا، یہ واقعہ اس کے والد کے انتقال کے بعد کا ہے، اس نے اس نکاح کو ناپسند کیا اور لڑکی نے مغیرہ بن شعبہ کے ساتھ نکاح کرانے کو پسند کیا، لہذا اس کا نکاح مغیرہ بن شعبہ کے ساتھ کردیا گیا[1]۔

اور شامی میں ہے: وإن زوّجها بغير استئمار فقد أخطأ السنة و توقف على رضاها۔ بحر عن المحيط[2]۔

(اور اگر اس کا نکاح اجازت لئے بغیر کیا تو اس نے سنت کے خلاف کیا، اور نکاح اس کی رضامندی پر موقوف رہے گا)۔

ذیل میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ابوداؤد شریف کے حوالہ سے آرہی ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ ایک باکرہ لڑکی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ اس کے والد نے اس کا نکاح کردیا ہے اور وہ اس نکاح کو ناپسند کرتی ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اختیار دے دیا۔ اس حدیث میں اس کی وضاحت نہیں ہے کہ اس کا نکاح اس کے والد نے اس سے اجازت لے کر کیا تھا یا اس کی اجازت کے بغیر۔ ابوداؤد میں اس حدیث پر درج ذیل باب قائم کیا گیا ہے: باب فی البکر یزوجها أبوها ولا یستأ مرها۔ اور "بذل المجهود في حل أبي داؤد" میں اس کی تشریح "بغير إذنها" سے کی گئی ہے[3] اس تشریح سے معلوم ہوا کہ اس باکرہ لڑکی کا نکاح اس کے والد نے اس کی اجازت کے بغیر کیا تھا، لہذا حضرت خنساء بنت خذام رضی اللہ عنہما کی روایت کو بھی اس پر محمول کیا جائے گا کہ ان کے والد نے ان کا نکاح ان سے اجازت لئے بغیر کیا تھا۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: إن جارية بكراً أتت رسول الله ﷺ فذكرت أن أباها زوّجها وهي كارهة. فخيّرها النبي ﷺ[4]۔ (ایک باکرہ لڑکی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر بتایا کہ اس کے والد نے اس کا نکاح کردیا ہے اور وہ اس نکاح کو پسند نہیں کرتی ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکی کو اختیار دے دیا)۔

حضرت خنساء بنت خذامؓ انصاریہ سے روایت ہے: أن أباها زوّجها و هي ثيب فكرهت ذلك فأتت رسول الله ﷺ فرد نكاحها[5]۔ (ان کے والد نے ان کا نکاح کردیا اور وہ ثیبہ تھیں۔ انہوں نے اس نکاح کو پسند نہیں کیا، وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح رد کردیا)۔

ان حدیثوں کو اس پر محمول نہیں کیا جاسکتا کہ لڑکی پر جبر و اکراہ کرکے اس سے ایجاب یا قبول کرالیا گیا، اس کے بعد اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر اس کی شکایت کی، اور اس کے اس نکاح کو ناپسند کرنے کا اظہار کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نکاح کو رد کردیا ہو، یا اسے اختیار دے دیا ہو۔

ذیل میں مکرہ کے نکاح کا حکم بیان کرنے سے پہلے اکراہ کے لغوی معنی، اصطلاحی تعریف اور اس کی قسمیں بیان کی جاتی ہیں:

## اکراہ کا لغوی معنی:

اکراہ کا لغوی معنی بیان کرتے ہوئے "الموسوعة الفقهية" میں ہے: "قال في لسان العرب: اكرهته. حملته على أمر هو له كاره. و في مفردات الراغب نحوه۔ لسان العرب، و المصباح المنير، مادة (كره)... ولخص ذلك كله فقهاؤنا إذ قالوا: الإكراه لغة: حمل الإنسان على شئي يكرهه يقال: أكرهت فلاناً إكراها: حملته على أمر يكرهه"۔

"لسان العرب" میں اکرہتہ کے معنی میں نے اسے ناپسندیدہ کام کرنے پر اکسایا، لکھے ہیں، "مفردات الراغب" میں بھی ایسے ہی ہے۔ "لسان العرب"، "مصباح المنیر" مادہ "کرہ"......... ہمارے فقہاء نے ان سب معانی کی تلخیص کرکے فرمایا ہے کہ اکراہ کے لغوی معنی ہیں: انسان کو ایسی چیز کے

---

[1] ابن ماجہ، بحوالہ تحریر المرأۃ فی عصر الرسالہ ج ۵ / ۷۱۔
[2] شامی ۲ / ۲۹۸، ۲۹۹۔
[3] بذل المجہود فی حل ابی داؤد ۵ حصہ: ۱۰ / ۱۰۲ مکتبہ دار الباز، عباس احمد الباز، مکۃ المکرمہ۔
[4] اس حدیث کی روایت ابوداؤد نے کی ہے، مشکاۃ ۲ / ۲۷۱۔
[5] بخاری ۲ / ۷۷۱، ۷۷۲۔

کرنے پر مجبور کرنا جسے وہ ناپسند کرتا ہو، کہا جاتا ہے: أکرھت فلاناً إکراھاً میں نے اسے ناپسندیدہ کام کرنے پر مجبور کیا)[1]۔

## اِکراہ کی اصطلاحی تعریف:

''ھو فعل یفعلہ الإنسان بغیرہ فیزول بہ الرضا'' زاد في ''المبسوط'': أو یفسد بہ اختیارہ من غیر أن تنعدم بہ الأھلیة في حق المکرہ، أو یسقط عنہ الخطاب''[2]۔ (اکراہ ایسا فعل ہے جسے انسان دوسرے کی وجہ سے کرتا ہے، لہٰذا اِکراہ کی وجہ سے مکرہ کی رضامندی جاتی رہتی ہے۔''المبسوط'' میں اضافہ کیا ہے: یا اکراہ کی وجہ سے مکرہ کی اہلیت ختم ہوئے بغیر اس کا اختیار بیکار ہوجاتا ہے، یا مکرہ سے خطاب ساقط ہو جاتا ہے)۔

**اِکراہ کی قسمیں:**...... فقہاء کرام نے اکراہ کی دو قسمیں بیان کی ہیں: ۱۔ تام، ۲۔ ناقص۔

**اِکراہ تام:**...... و أما بیان أنواع الإکرہ فنقول. إنہ نوعان: نوع یوجب الإلجاء والاضطرار طبعاً کا لقتل والقطع و الضرب الذي یخاف فیہ تلف النفس أو العضو قل الضرب أو کثر . . . و ھذا النوع یسمی إکراھاً تاماً[3]۔ (جہاں تک اِکراہ کی قسموں کی وضاحت کا تعلق ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اِکراہ کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم وہ ہے جس میں مکرہ کا طبعاً مجبور و مضطر ہونا لازم آتا ہے، جیسے مکرہ کو قتل کرنے یا اس کے کسی عضو کو کاٹنے، یا ایسی پٹائی کرنے کی دھمکی دینا جس سے جان جانے یا عضو کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، پٹائی کم ہو یا زیادہ، اس قسم کا نام اِکراہ تام ہے)۔

## اِکراہ ناقص:

و نوع لا یوجب الإلجاء و الاضطرار و الحبس و القید و الضرب الذی لا یخاف منہ التلف. ولیس فیہ تقدیر لازم . . . و ھذا النوع من الإکراہ یسمی إکراھا ناقصاً[4]۔ (دوسری قسم وہ ہے جس میں مکرہ کا مجبور و مضطر ہونا لازم نہیں آتا ہے۔ اس قسم میں قید کرنے، بیڑی ڈالنے اور ایسی پٹائی کرنے کی دھمکی دینا ہے جس سے جان جانے یا کسی عضو کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور اس میں کوئی مقدار ضروری نہیں ہے۔ اِکراہ کی اس قسم کا نام کراہ ناقص ہے)۔

## اِکراہ کے ساتھ صحیح ہونے والے تصرفات:

فالطلاق والعتاق والرجعة والنکاح والیمین والنذر و الظھار . . . ھذہ التصرفات جائزة مع الإکراہ عندنا[5]۔ (طلاق، عتاق، رجعت، نکاح، قسم، نذر اور ظہار وغیرہ ایسے تصرفات ہیں جو حنفیہ کے نزدیک اِکراہ کے ساتھ (نہ چاہتے ہوئے کر لینے سے بھی) جائز ہوجاتے ہیں)۔

## مکرہ کے نکاح کا حکم:

مکرہ کا نکاح و طلاق وغیرہ تصرفات صحیح ہوجاتے ہیں، اس لئے کہ مکرہ سے اِکراہ کی صورت میں اس کی صرف طبعی رضامندی جاتی رہتی ہے۔ وقوع طلاق کے لئے طبعی رضامندی شرط نہیں ہے، اس لئے کہ مذاق میں طلاق دینے والے کی طلاق واقع ہوجاتی ہے، حالانکہ طلاق دینے پر وہ طبعاً راضی نہیں ہے۔ أن الفائت بالإکراہ لیس إلا الرضا طبعاً، وإنہ لیس بشرط لوقوع الطلاق۔ فإن طلاق الھاز ل واقع و لیس براضٍ بہ طبعاً[6]۔

صحت نکاح کے لئے عاقدین میں سے ہر ایک کا دوسرے کے لفظ کو سننا شرط ہے۔ حقیقی رضامندی شرط نہیں ہے، اس لئے کہ نکاح اِکراہ اور مذاق میں

---

[1] مجمع الانہر ۲/ ۴۱۲، شامی ۵/ ۸۰ بحوالہ الموسوعۃ الفقہیہ ۶/ ۹۸۔
[2] البحر الرائق ۸/ ۷۰۔
[3] بدائع الصنائع ۷/ ۱۷۵۔
[4] بدائع الصنائع ۷/ ۱۷۵۔
[5] بدائع الصنائع ۷/ ۱۸۲۔
[6] بدائع الصنائع ۷/ ۱۸۲۔

کرنے سے صحیح ہوجاتا ہے۔ ( و شرط سماع کل من العاقدین لفظ الآخر ) لیتحقق رضاهما ( قوله: لیتحقق رضاهما ) أي لیصدر منهما ما من شأنه أن یدل علی الرضا إذ حقیقة الرضا غیر مشروطة في النکاح لصحته مع الإکراه والهزل[1]۔

نکاح وطلاق کے مذاق میں صحیح ہونے کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ثلاث جدهن جد و هزلهن جد: النکاح و الطلاق و الرجعة''۔ (تین چیزیں ایسی ہیں جن میں سنجیدگی سنجیدگی ہے اور ان میں مذاق کرنا بھی سنجیدگی ہے: نکاح، طلاق اور رجعت)۔

اس لئے بھی کہ نکاح ایک قولی تصرف ہے، لہٰذا اس میں اکراہ مؤثر نہیں ہوگا، جیسے طلاق اور عتاق پر اکراہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔

ولأن النکاح تصرف قولي فلا یؤثر فیه الإکراه کالطلاق والعتاق[2]۔

جب نکاح میں اکراہ مؤثر ہی نہیں ہوگا تو اکراہ کے ذریعہ ہونے والا نکاح اور وہ نکاح جو بغیر اکراہ کے ہو، دونوں کا حکم ایک ہی رہے گا، یعنی دونوں قسم کے نکاح صحیح ہوجائیں گے۔

۱- یہ صورت حقیقی رضامندی میں تو شامل نہیں ہوگی، البتہ اس صورت میں اس کے نکاح کے لئے ہاں کہہ دینے سے نکاح منعقد ہوجائے گا، اس لئے کہ صحت نکاح کے لئے حقیقی رضامندی شرط نہیں ہے۔ اس لئے کہ نکاح مذاق میں کرنے سے اور زبردستی کرنے سے بھی ہوجاتا ہے۔

۲- عاقلہ بالغہ خاتون کو اپنے نفس کا پورا اختیار حاصل ہے، اس اصول کا تعلق نکاح کے سلسلہ میں انعقاد نکاح سے پہلے کے حالات سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے اختیار ورضامندی کے بغیر اس کے نفس کے متعلق کسی کو کوئی تصرف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ نکاح کے انعقاد میں اکراہ مؤثر نہیں، اس اصول کا تعلق اس صورت سے ہے کہ عاقلہ بالغہ لڑکی پر اکراہ کرکے اس سے نکاح کے لئے ہاں کہلوالیا جائے، تو نکاح کے لئے ہاں کہلوانے پر اس اکراہ کا کوئی اثر نہیں ہوگا اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس عاقلہ بالغہ لڑکی نے بغیر اکراہ نکاح کے لئے ہاں کہا ہے۔ لہٰذا اس سے نکاح صحیح ہوجائے گا، اس لئے کہ نکاح کے انعقاد میں اکراہ مؤثر نہیں ہے، بکرہ کا نکاح منعقد ہوجاتا ہے۔

ہاں اگر زبان سے نکاح قبول نہیں کرایا گیا اور زبردستی نکاح نامہ وغیرہ پر دستخط کرالئے گئے تو اس صورت میں نکاح منعقد نہ ہوگا۔

۴- سوال ۱ اور ۲ میں جس قسم کے نکاح کا ذکر ہوا ہے، اگر اس میں شوہر خاتون کا کفو ہو اور مہر، مہر مثل یا اس سے زیادہ مقرر ہوا ہو تو زوجین کے مابین ازدواجی تعلقات قائم ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، دونوں صورتوں میں یہ نکاح صحیح ولازم ہوجائے گا۔

اگر اس نکاح میں شوہر اس خاتون کا کفو ہو لیکن مہر، مہر مثل سے کم مقرر کیا گیا ہو۔ اور خاتون مہر مثل سے کم پر راضی نہ ہو اور زوجین کے درمیان ازدواجی تعلقات قائم نہ ہوئے ہوں تو یہ خاتون قاضی کے پاس کیس کرکے تفریق کرانے کا مطالبہ کرسکتی ہے اور اگر زوجین کے مابین زن وشوئی کے تعلقات قائم ہوگئے ہوں، چاہے بیوی کے شوہر کو جماع پر قدرت دینے کی وجہ سے یا شوہر نے زبردستی اس سے جماع کرلیا ہو، دونوں صورتوں میں بیوی کا حق تفریق باطل ہوجائے گا۔ مہر کے متعلق تفصیل یہ ہے کہ اگر تفریق بیوی کے مطالبہ پر باہم زن وشوئی کے تعلقات قائم ہونے سے پہلے ہوئی ہو تو بیوی کو کچھ نہیں ملے گا۔

اگر ازدواجی تعلقات قائم ہوگئے اور یہ تعلقات بیوی کی رضامندی سے ہوئے ہوں تو بیوی کو صرف مقررہ مہر ملے گا، خواہ وہ مہر مثل سے کتنا ہی کم ہو۔ اور اگر شوہر نے زبردستی اس کے ساتھ جماع کیا تو بیوی پورے مہر مثل کی حق دار ہوگی۔

اگر اس نکاح میں شوہر اس کا کفو نہ ہو اور بیوی عدم کفاءت کی صورت میں اس کے ساتھ رہنے پر نہ صراحۃً راضی ہو اور نہ دلالۃً تو وہ قاضی کے پاس مقدمہ کرکے تفریق کراسکتی ہے، بشرطیکہ باہم ازدواجی تعلقات قائم نہ ہوئے ہوں یا شوہر زبردستی جماع کرلے۔ بیوی اپنی مرضی سے شوہر کو جماع پر قدرت نہ دے۔ اگر بیوی عدم کفاءت کے باوجود شوہر کے ساتھ رہنے پر صراحۃً رضامندی کا اظہار کردے یا دلالۃً، مثال کے طور پر شوہر کو جماع پر قدرت دے دے تو اس کا حق تفریق ختم ہوجائے گا۔

۵- اس صورت میں جواب ۴ کی تفصیل کے مطابق مہر مثل میں کمی یا عدم کفاءت کی بنیاد پر شرعی کونسل یا قاضی ان کے درمیان تفریق کرسکتے ہیں، یا شوہر سے زبردستی طلاق دلواسکتے ہیں۔

☆☆☆

[1] شامی ۲/۱۷۲۔

[2] بدائع الصنائع ۷/۱۸۴۔

# جبری شادی

ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی

۱- اسلامی معاشرہ کے ازدواجی سکون وطمانیت مزاج ومذاق کے توافق پر حاصل ہوتے ہیں، شرعی طور پر جبری نکاح کی اجازت نہیں، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: ومن آیاته ''أن خلق لكم من أنفسكم أزواجا لتسكنوا إليها وجعل بينكم مودة ورحمة إن في ذلك لآيات لقوم يتفكرون ''[1]۔

اسی لئے عاقلہ بالغہ لڑکی کے نکاح میں شریعت نے رضامندی کو بہت اہمیت دی ہے: ''ولا يجبر الولي بالغة ولو بكرا''[2] (بالغہ پر خواہ وہ باکرہ ہی ہو ولی جبر نہیں کرے گا)۔

اور قدوری میں ہے: ''ولا يجوز للولي إجبار البالغة العاقلة'' (بالغہ عاقلہ پر ولی کے لئے جبر کرنا جائز نہیں ہے)۔

شرعی طور پر ولی کو جبر واکراہ کی اجازت نہیں ہے: ''وإن أبت لم يزوجها'' (اگر لڑکی انکار کردے تو ولی اس کی شادی نہیں کرائے گا)۔

۲- شریعت میں عاقلہ بالغہ کو اپنے نفس کا پورا اختیار حاصل ہے، عدم رضامندی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے، ڈرانا دھمکانا اور دھوکہ دے کر نکاح پر مجبور کرنا ہرگز جائز نہیں، نتیجتاً اس قسم کے نکاح کا انجام برا ہوتا ہے اور اگر گنہ گاری پر اتر جائے تو معاشرہ گندہ اور بدنام ہوگا۔

۳- بے جوڑ شادیوں میں معاشرتی سکون مفقود ہوجاتا ہے، لڑکی کو حق کفاءت کی بناء پر تفریق کا حق حاصل ہوتا ہے۔

''الكفاءة تعتبر في النسب والدين والمال''[3] (کفاءت کا اعتبار نسب، دین اور مال میں ہے)۔

۴- بالغہ کے لئے اجبار نکاح میں فساد کا امکان ہے، خواہ نکاح کے بعد زن وشوئی تعلقات قائم رہیں یا نہ رہیں۔

۵- زوجین کے مزاجی تفاوت وتنفر سے شرعی کونسل یا قاضی کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہے۔

☆☆☆

[1] سورۂ روم / ۲۱۔

[2] ہدایہ، باب الولی۔

[3] باب النکاح، قدوری۔

# جبری شادی

مفتی شیر علی گجراتی

۱- انعقاد نکاح کے سلسلے میں تو اس کو رضامندی ہی مانا جائے گا، اس لئے کہ اکراہ کے باوجود زبان سے قبول کرنے اور رضامندی ظاہر کرنے سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے[1]۔

حقیقی رضامندی نکاح کے صحیح ہونے کے لئے شرط یا ضروری نہیں معلوم ہوتی، جیسے باپ یا دادا صغیر یا صغیرہ کا نکاح کردیں تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے، حالانکہ ان کی رضامندی اس وقت تو معلوم ہی نہیں اور آئندہ اگر وہ اپنی عدم رضامندی کا اظہار کریں تب بھی ان کو اختیار نہیں ہے۔

۲- اذن ہی تسلیم کیا جائے گا اور نکاح منعقد ہو جائے گا، اس لئے کہ نکاح ان امور میں سے ہے جن میں جد اور ہزل دونوں برابر ہیں اور ایسے امور میں اِکراہ کا کوئی حکم نہیں ظاہر ہوگا[2]۔

''والأصل عندنا أن كل ما يصح مع الهزل يصح مع الإكراه. لأن ما يصح مع الهزل لا يحتمل الفسخ. وكل ما لا يحتمل الفسخ لا يؤثر فيه الإكراه''[3]

(ہمارے نزدیک اصل یہ ہے کہ ہر وہ تصرف جو ہزل کے ساتھ صحیح ہو، وہ اِکراہ کے ساتھ بھی صحیح ہوتا ہے، اس لئے کہ جو ہزل کے ساتھ صحیح نہیں ہوتا ہے اس میں فسخ کا احتمال نہیں ہوتا ہے اور جس میں فسخ کا احتمال نہیں ہوتا اس میں اِکراہ مؤثر نہیں ہوتا ہے)۔

۴- فقہاء کرام نے جن نو امور میں کفاءت کا اعتبار کیا ہے ان میں سے معاشرتی اعتبار سے دونوں کا کفو ہونا نہیں ہے، اس لئے کفاءت کی بنیاد پر حق تفریق کا دعوی کرنے کا حق نہیں ہوگا۔

۵- قاضی یا شرعی کونسل کو بظاہر اس کے نکاح کے فسخ کرنے کا محض اس بنیاد پر حق نہیں ہوگا الا یہ کہ فسخ نکاح کے اسباب شرعیہ میں سے کوئی سبب پایا جائے۔

☆☆☆

[1] عالمگیری ۵ / ۵۳ کتاب الإکراہ۔
[2] حوالہ سابق
[3] درمختار برشامی ۹ / ۱۹۱ کتاب الاکراہ۔

# جبری شادی

مولانا محمد یعقوب قاسمی

جامعہ عربیہ امداد العلوم زید پور بارہ بنکی

۱- اگر بالغہ عورت حالت اکراہ میں زبان سے اپنے نکاح کی اجازت دے دے اگر چہ دل سے راضی نہ ہو تو شرعاً نکاح ہو جاتا ہے۔

''لأنه يصح النكاح مع الإكراه أي الإيجاب أو القبول مكرها''[1]۔

(اس لئے کہ نکاح اِکراہ کے ساتھ صحیح ہو جاتا ہے ایجاب ہو یا قبول ہو زبردستی، دونوں حالتوں میں نکاح درست ہو جاتا ہے)۔

شامی ایک دوسری جگہ رقم طراز ہیں: ''إذ حقيقة الرضا غير مشروطة في النكاح لصحته مع الإكراه والهزل الخ''[2]۔

(کیونکہ نکاح میں حقیقی طور پر رضامندی شرط نہیں ہے اس لئے کہ نکاح زبردستی اور مذاق میں بھی صحیح ہو جاتا ہے)۔

۲- اگر لڑکی کو نکاح کے لئے زدوکوب کیا گیا اور اس نے ڈر کی وجہ سے نکاح کے کاغذات پر دستخط کر دیئے اور دل سے اس نکاح سے بیزار ہے اور نکاح کے متعلق زبان سے کوئی لفظ ادا نہیں کیا تو ایسی صورت میں نکاح منعقد نہ ہوگا جیسا کہ طلاق نامہ پر جبراً دستخط کرا لینے سے طلاق واقع نہیں ہوتی[3]۔

بالغہ عورت کا زبردستی نکاح کر دینے سے نکاح منعقد نہیں ہوتا ہے جیسا کہ کتب فقہ میں اور احادیث نبویہ میں مذکور ہے:

''ولا تجبر البالغة البكر على النكاح لانقطاع الولاية بالبلوغ الخ''[4]۔

(بالغہ لڑکی پر نکاح کے سلسلہ میں زبردستی نہ کی جائے، کیونکہ لڑکی کے بالغ ہو جانے کی وجہ سے ولایت ختم ہو جاتی ہے)۔

فتاوی ہندیہ میں مذکور ہے: ''لا يجوز نكاح أحد على بالغة صحيحة العقل من أب أو سلطان بغير إذنها بكراً كانت أو ثيبا. فإن فعل ذلك فالنكاح موقوف على إجازتها فإن أجازته جاز وإن ردته بطل''[5]۔

(باپ دادا اور بادشاہ میں سے کسی کے لئے بالغہ صحیح العقل کا نکاح کرنا اس کی اجازت کے بغیر درست نہیں۔ بالغہ باکرہ ہو خواہ ثیبہ ہو اگر کسی نے نکاح کر دیا تو نکاح بالغہ کی اجازت پر موقوف ہوگا۔ اگر اس نے اجازت دے دی تو نکاح صحیح ہوگا ورنہ باطل ہوگا)۔

احادیث نبویہ میں زبردستی نکاح کے منعقد نہ ہونے کے متعلق متعدد احادیث موجود ہیں:

''جاءت امرأة إلى رسول الله ﷺ فقالت: إن أبي أنكحني رجلا وأنا كارهة فقال لأبيها: لا نكاح اذهبي فانكحي من شئت''[6]۔ (ایک عورت نے حضور ﷺ کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے ماں باپ نے میری شادی ایک مرد کے ساتھ کر دی

[1] الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۲ / ۴۱۳۔

[2] شامی ۲ / ۳۷۳۔

[3] فتاوی عالمگیریہ ۱ / ۶۳۔

[4] در مختار ۲ / ۲۱۰۔

[5] عالمگیری ۲ / ۳۱۔

[6] دراہ ۲ / ۲۹۴۔

ہے حالانکہ میں اس کو پسند نہیں کرتی تو اس کے باپ سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تیرے نکاح کا اعتبار نہیں، تو جا اور جس سے چاہے نکاح کر)۔

بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے:

''لا تنكح الأيم حتى تستأمر ولا تنكح البكر حتى تستأذن''[1]۔

(بے شوہر عورت کا نکاح مشورہ کے بغیر اور باکرہ کا نکاح اجازت کے بغیر نہ کیا جائے)۔

حدیث اس باب میں بالکل صریح ہے کہ ثیبہ اور باکرہ کسی پر اجبار شرعاً درست نہیں ہے۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے:

''أن جارية أتت النبي ﷺ فذكرت أن أباها زوجها وهي كارهة فخيّرها النبي ﷺ''[2]۔

(ایک باکرہ لڑکی حضور ﷺ کے پاس آئی اور اس نے کہا کہ اس کے باپ نے اس کی شادی اس کی مرضی کے بغیر کر دی ہے تو حضور اکرم ﷺ نے اس کو نکاح کے معاملہ میں اختیار دیا)۔

مشکاۃ شریف میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے:

''أن النبي ﷺ ''ردنكاح ثيب وبكر أنكحهما أبوهما وهما كارهتان''[3]

(نبی ﷺ نے ایک ثیبہ اور ایک باکرہ کا نکاح رد فرما دیا جن کے والدین نے ان کی مرضی کے بغیر زبردستی ان کا نکاح کر دیا تھا)۔

۳- صورت مسئولہ میں چونکہ بالغہ لڑکی کی شادی غیر کفو میں ہوئی ہے، اس لئے اس کو کفو میں شادی نہ ہونے کی وجہ سے حق تفریق حاصل ہوگا، کیونکہ جمہور کے نزدیک کفاءت اولیاء اور بالغہ دونوں کا حق ہے۔

''ولكن الكفاءة عند الجمهور حق للمرأة والأولياء''[4]۔

(لیکن کفاءت جمہور کے نزدیک لڑکی اور اولیاء دونوں کا حق ہے)۔

۴- مذکورہ نکاح میں اگر زن وشوئی کے تعلقات قائم ہو گئے تو پھر حق کفاءت وحق تفریق لڑکی کو حاصل نہ ہوں گے، البتہ اگر اس نکاح میں زن وشوئی کے تعلقات قائم نہیں ہوئے ہیں اور لڑکی تاہنوز اس نکاح سے بیزاری کا اظہار کرتی ہے تو ایسی صورت میں لڑکی کو حق کفاءت وحق تفریق دونوں حاصل ہوں گے۔

۵- ایسی حالت میں قاضی اس نکاح کو حسب ضرورت فسخ کر سکتا ہے۔

☆☆☆

[1] بخاری ۲/۷۷۱۔

[2] ابوداؤد شریف ص ۲۸۵، ۲۸۶۔

[3] مرقاۃ شرح مشکاۃ ۶/۲۰۸، ۲۰۹۔

[4] زاد المعاد ۵/۱۶۱۔

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

## جدید فقہی مباحث

# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

## (خلع وتفریق کے احکام)

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

# پیش لفظ

نکاح کے معاملہ میں اسلام کا منشا یہ ہے کہ جب ایک بار یہ رشتہ استوار ہو جائے تو پھر شدید مجبوری کے بغیر اس کے ٹوٹنے کی نوبت نہ آئے؛ لیکن بعض حالات ایسے ہوتے ہیں کہ سکون ومحبت کا رشتہ نفرت میں تبدیل ہو جاتا ہے، رشتہ کو بہر طور باقی رکھنا زوجین میں سے کسی کے بھی مفاد میں نہیں ہوتا، ایسے مواقع پر شریعت نے رشتۂ نکاح کو ختم کرنے کی اجازت دی ہے، مرد کو طلاق دینے کا اختیار دیا گیا ہے اور عورت کے لئے گنجائش رکھی گئی ہے کہ وہ دار القضاء کے ذریعہ اپنا نکاح فسخ کرالے۔

جن اسباب کی بنیاد پر فسخ نکاح کی اجازت دی گئی ہے، ان کی بنیاد دو باتیں ہیں، ایک: بیوی کے حقوق کی عدم ادائیگی، جیسے نفقہ نہ دینا، حسن معاشرت کا طریقہ اختیار کرنے کی بجائے مار پیٹ اور سب وشتم کرنا، یا شوہر کا صنفی حق ادا کرنے کے لائق نہ ہونا، دوسرے: مناسبت اور موافقت کا نہ پایا جانا، جیسے عدم کفائت، شوہر کا قابل نفرت بیماری میں مبتلا ہونا، وغیرہ، ان اسباب کی تفصیلات میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے رہا ہے، امام ابوحنیفہؒ نے اپنے زمانہ کے حالات کے لحاظ سے بعض ایسی آراء اختیار کی ہیں، جو اس وقت موزوں تھیں؛ لیکن موجودہ دور میں ان پر عمل کرنا دشوار ہے، متاخرین احناف نے اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ نکاح کا اصل مقصد طرفین کے لئے ایسی زندگی کا حاصل ہونا ہے، جو دونوں کے لئے سکون اور محبت کا باعث ہو، اگر یہ مقصد ہی فوت ہو جائے تو رشتۂ نکاح کو باقی رکھنا دونوں کے لئے بے سکونی اور تناؤ کا سبب ہوتا ہے، اس مسئلہ میں وسعت برتتے ہوئے فقہاء مالکیہ کے نقطۂ نظر کو اختیار کرنے کی اجازت دی ہے، جن کے یہاں اس باب میں زیادہ توسع اور مصالح شرعیہ کی زیادہ رعایت ہے۔

علماء ہند نے مسلم حکومت کے خاتمہ کے بعد سے شروع سے ہی اس موضوع پر خصوصی توجہ دی ہے اور سب سے پہلے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بعض اسباب فسخ کے سلسلہ میں مالکیہ کے نقطۂ نظر کو اختیار فرمایا ہے، جس کی تفصیل ''الحیلۃ الناجزۃ فی الحیلۃ العاجزۃ'' میں موجود ہے، پھر حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نے فقہی مصادر سے مراجعت اور دار القضاء کے تجربات کی روشنی میں چودہ اسباب فسخ کا ذکر فرمایا ہے اور ان سے متعلق احکام وشرائط کی سہل اور مرتب انداز میں وضاحت فرمائی ہے، پھر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' میں بعض اسباب کے اضافہ کے ساتھ سولہ اسباب ذکر کئے گئے اور قانونی کتابوں کے انداز پر دفعات قائم کرتے ہوئے ان کی وضاحت کی گئی۔

مالکیہ کے یہاں تفریق کے جو اسباب ذکر کئے گئے ہیں، ان میں ایک ''شقاق بین الزوجین'' ہے، غالباً سب سے پہلے مولانا رحمانیؒ نے ''کتاب الفسخ والتفریق'' میں اس کا ذکر فرمایا؛ لیکن بہت اختصار کے ساتھ اس کا ذکر آیا ہے، جس سے تشنگی باقی رہتی ہے، پھر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور شقاق کی بناء پر خلع سے متعلق فقہاء مالکیہ کی بحث تفصیل سے پیش کی، اس حقیر نے بھی ''جدید فقہی مسائل'' کی تیسری جلد میں ''خلع میں قاضی وحکم کے اختیارات'' کے زیر عنوان مذاہب اربعہ کا نقطۂ نظر اور مسلکِ مالکی کی شرائط کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، نیز بعد میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے تحت مرتبہ ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' میں شقاق کو بھی اسبابِ فسخ میں شامل کیا گیا ہے، یہ شمولیت اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ یہ مجموعہ اجتماعی طور پر مرتب کیا گیا ہے، تاہم چوں کہ یہ کتاب قانونی متن کے انداز پر مرتب کی گئی ہے؛ اس لئے فطری بات ہے کہ اختصار کا راستہ اختیار کیا گیا ہے اور مختلف فقہاء کے نقاطِ نظر، ان کے دلائل اور ان کے مذاہب کی تفصیلات درج نہیں کی گئی ہیں۔

دوسری طرف بعض اہل علم کو اس پر اشکال بھی تھا، اس پس منظر میں اکیڈمی نے ضرورت محسوس کی کہ اپنے سالانہ فقہی سمینار کے موضوعات میں اسے شامل کرے اور ملک بھر کے علماء کو اس موضوع پر غور وفکر کی دعوت دے؛ چنانچہ اکیڈمی کے — ویں فقہی سمینار منعقدہ جامعہ اسلامیہ بنجاری (اندور) میں اس موضوع کو شامل کرتے ہوئے سوال نامہ جاری کیا گیا اور اہل علم نے تفصیل سے اس موضوع پر قلم اٹھایا، بلکہ دوسرے موضوعات کی بہ نسبت زیادہ مقالات اس موضوع پر آئے اور اس کو سمینار میں بحث کے لئے زیادہ وقت بھی دیا گیا؛ کیوں کہ یہ ایک اہم ترین سماجی مسئلہ ہے، تعلیمی ترقی، تہذیبی اقدار میں تبدیلی اور بعض معاشی اسباب کی بنا پر موجودہ حالات میں یہ مسئلہ زیادہ قابل توجہ ہوگیا ہے، یہاں تک کہ بعض جگہ اس کی وجہ سے خودکشی کے واقعات بھی پیش آرہے ہیں۔

چنانچہ سمینار کا سوال نامہ، مقالات، سمینار کے درمیان ہونے والے مناقشات، اور پھر طے پانے والی تجاویز کا یہ مجموعہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے، جو اردو زبان میں اس موضوع پر شاید سب سے مفصل تحریر ہے، جس کو اکیڈمی کے شعبۂ علمی کے رفیق عزیزی مفتی امتیاز احمد قاسمی نے توجہ اور محنت کے ساتھ اکیڈمی کے مجلات کے مقررہ منہج کے مطابق مرتب کیا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اکیڈمی کی اس خدمت کو قبول فرمائے، قضاء کا کام کرنے والوں کے لئے خصوصاً اور دوسرے علماء، اربابِ افتاء، قانون دانوں، اور اصحابِ دانش کے لئے عموماً نفع کا ذریعہ بنائے۔

والله هو المستعان

خالد سیف اللہ رحمانی

(خادم اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

۱۸/ربیع الاول ۱۴۳۴ھ/۳۰/جنوری ۲۰۱۳ء

☆☆☆

# باب اول تمہیدی امور

## سوالنامہ

# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

اسلام میں نکاح کو قریب قریب عبادت کا درجہ دیا گیا ہے، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ شریعت میں تاہل کی زندگی تجرد کی زندگی سے بہتر ہے، نکاح کا مقصد عفت و پاکدامنی کا تحفظ اور نسل انسانی کی افزائش کے ساتھ قلبی وروحانی سکون بھی ہے، قرآن مجید نے نکاح کے اس اہم مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے: "لتسکنوا الیہا" () اور اسی لئے شوہر وبیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے، چنانچہ شریعت میں نکاح ہونے کے بعد رشتہ نکاح کے منقطع کرنے کو سخت ناپسند کیا گیا ہے، لیکن بعض دفعہ باہمی تعلق میں ایسی کڑواہٹیں آجاتی ہیں کہ اب اس رشتہ کو باقی رکھنا سکون کی بجائے بے سکونی اور ذہنی تناؤ کا سبب بن جاتا ہے۔

ایسے مواقع پر اسلام میں رشتہ نکاح کو ختم کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے، اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مرد اپنی طرف سے رشتہ نکاح کو منقطع کردے، جس کو اصطلاح میں "طلاق" کہتے ہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ شوہر کی طرف سے ظلم وزیادتی ہو، شوہر نہ بیوی کے حقوق ادا کرے اور نہ اسے طلاق دے کر آزاد کرے، پس بیوی کی درخواست پر قاضی نکاح فسخ کردے، اس کو اصطلاح میں "فسخ نکاح یا تفریق" کہتے ہیں، تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی ایسی بات پیدا ہوجائے جس کی وجہ سے زوجین کے درمیان حرمت پیدا ہوجائے، ایسی صورت میں مرد وعورت میں سے کوئی بھی دوسرے سے علاحدگی کا اعلان کردے اور عملی طور پر بھی ترک تعلق کرلے، یہ فقہ کی اصطلاح میں "متارکہ" ہے۔

چوتھی صورت خلع کی ہے کہ بیوی شوہر کو کچھ دے کر یا اپنے حق سے دست بردار ہو کر طلاق دینے پر آمادہ کرلے؛ خواہ اس کے لئے کوئی معقول سبب موجود نہ ہو، یا شوہر کی طرف سے ظلم وزیادتی کا ارتکاب نہ ہوا ہو، آج کل صورت حال یہ ہے کہ بعض اوقات شوہر اپنی بیوی کو ایسی جگہ رکھتا ہے کہ بیوی اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو قاضی کے سامنے ثابت نہیں کرسکتی یا دونوں کے درمیان کسی وجہ سے ایسا فرق پیدا ہوجاتا ہے کہ عورت اس شوہر کے ساتھ رہنے میں عار محسوس کرتی ہے، جیسے نکاح کے وقت دونوں کم تعلیم یافتہ تھے، لیکن مستقبل میں شوہر تو تعلیم میں آگے نہیں بڑھ سکا؛ لیکن بیوی تعلیم میں بہت آگے بڑھ گئی دونوں میں تعلیمی اعتبار سے کوئی نسبت نہیں رہی، ایسی صورت میں عورت ایک ذہنی کرب میں مبتلا رہتی ہے اور معاشرت بالمعروف کی کیفیت ختم ہوجاتی ہے، کیونکہ شوہر طلاق دینے یا خلع منظور کرنے پر تیار نہیں ہوتا، اسباب فسخ یا تو موجود نہیں ہوتے یا ہوں تو عورت ان کو ثابت کرنے کے موقف میں نہیں ہوتی، ایسی صورت میں کیا خلع کو قبول کرنا صرف شوہر کے اختیار میں ہے اور اسی کی مرضی پر ہے یا اس میں قاضی اور حکم کو بھی کسی حد تک اختیار حاصل ہے؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے، جس پر موجودہ حالات میں غور کرنے کی ضرورت ہے، اسی پس منظر میں درج ذیل سوالات پیش خدمت ہیں اور گذارش ہے کہ کتاب وسنت اور سلف صالحین کے اجتہادات کی روشنی میں آپ اس کا جواب عنایت فرمائیں۔

۱۔ خلع کی فقہی واصطلاحی تعریف کیا ہے؟

۲۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ جیسے مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے، اسی طرح عورت کو خلع لینے کا حق حاصل ہے، یہ بات کس حد تک درست ہے؟

۳۔ اگر عورت شوہر کی جانب سے شدید حد تک متنفر ہو؛ لیکن شوہر طلاق دینے پر تیار نہ ہو اور عورت کے پاس شوہر کی ظلم وزیادتی کے سلسلہ میں بینہ فراہم نہ ہوں تو اس کے گلوخلاصی کی کیا صورت ہوگی؟

۴۔ شقاق سے کیا مراد ہے؟

۵۔ کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے، اس سلسلہ میں حنفیہ اور دوسرے فقہاء کا کیا نقطہ نظر ہے؟

۶۔ جن حضرات کے نزدیک خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں، ان کے یہاں کیا قاضی کی طرف سے حکمین کا مقرر کیا جانا ضروری ہے؟ کیا حکمین کی کوشش کے بعد ہی خلع معتبر ہوگا یا قاضی خود فیصلہ کرسکتا ہے اور کیا ایک حکم کا تقرر بھی کافی ہوگا؟

۷۔ اگر حنفیہ کے یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے تو کیا اس مسئلہ میں ضرورۃً کسی اور مکتب فکر کی طرف عدول کیا جاسکتا ہے؟ ☆☆☆

## عرض مسئلہ

# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

مولانا قاری ظفر الاسلام صدیقی

الحمدللہ وحدہ والصلوۃ والسلام علی من لانبی بعدہ وبعد:

اس عاجز کو "شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح" کے موضوع پر عرض کی ذمہ داری دی گئی ہے، اکیڈمی کی جانب سے کل ۷۴ مقالات موصول ہوئے جن کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا محمد یوسف آسام، مولانا صدر الحسن ندوی مدنی، مفتی جمیل احمد نذیری، ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا عبدالرب عبدالوہاب، مفتی محمد شاہد قاسمی مہاراشٹر، مولانا عبدالخالق ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مفتی محمد شاہد قاسمی مدھوبنی، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا سید قمر الدین محمود بڑودوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ممتاز خاں ندوی، مولانا مفتی عظمت اللہ میر رحیمی کشمیری، مولانا حافظ شیخ کلیم اللہ عمری مدنی، مفتی نذیر احمد قاسمی، مفتی اعجاز الحسن قاسمی، مولانا غلام اللہ کادی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی اشرف عباس ہانسوٹ، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا عبیداللہ ندوی، مولانا نثار احمد گودھروی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا منصف امروہوی، مولانا محمد روح اللہ قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی اقبال احمد قاسمی، مفتی محمد عثمان گورینی، مولانا محمد حسن ندوی، مفتی محمد خالد حسین نیموی، مفتی عبداللہ مظاہری، مولانا محمد رمضان علی فرقانی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مفتی احمد نادر القاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی رضوان الحسن مظاہری، مولانا عتیق الرحمن قاسمی، مولانا احمد شمیم ظفر الاسلام صدیقی۔

## سوال نمبر ۱: خلع کی فقہی واصطلاحی تعریف کیا ہے؟

اس کے جواب میں مقالہ نگار حضرات میں سے بعض نے کتب لغات وفقہاء کی تصریحات اور اکثر نے آیات قرآنی، اقوال فقہاء وکتب لغات سے خلع کی مشروعیت اور اس کی تعریفات رقم فرمائی ہیں، بعضوں نے خلع کی تعریف میں آئے ہوئے کلمات وقیود کا فائدہ بھی بتلایا ہے، نیز کچھ لوگوں نے ائمہ اربعہ کے نزدیک خلع کیا مفہوم رکھتا ہے اس سے بھی تعرض کیا ہے، مولانا رحمت اللہ ندوی نے بلاد اسلامیہ مصر، شام، عراق، تیونس، مراقش، پاکستان کے قوانین خلع کا بھی ذکر فرمایا ہے، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی نے عبداللہ بن محمود بن مودود الموصلی الحنفی کی کتاب "الاختیار لتعلیل المختار ۳/۲۱۶" کی عبارت: "وفی الشرع: إزالة الزوجية بما تعطيه من المال" پیش فرمائی ہے، موصوف نے دیگر تعریفات کے ساتھ نامور محقق اور فقیہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب زید مجدہ کی کتاب "قاموس الفقہ ۳/۳۶۲" سے بھی اس کی تعریف رقم فرمائی ہے، مولانا اعجاز الحسن کشمیری نے لکھا ہے کہ خلع کے لئے احناف کے نزدیک پانچ الفاظ: خلع، مباراۃ، طلاق، مفارقت، بیع وشراء ہیں، جبکہ مالکیہ کے یہاں چار الفاظ "خلع، مباراۃ، صلح، فدیہ" ہیں، نیز موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ شافعیہ وحنابلہ کے یہاں کچھ الفاظ صریح اور کچھ کنائی ہیں، جن میں نیت شرط ہے، استدلال میں "المغنی لابن قدامہ ۷/۵۷، مغنی المحتاج ۳/۲۶۹-۲۶۸" پیش فرمایا۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کی تحریر پیش ہے: "فالمراد بلفظ طلاق لفظ من ألفاظه صريحا كان أو كناية الخ" (كنز الراغبين شرح منهاج الطالبين ۳/۳۰۷)، نیز "كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ۴/۳۹۱، بدائع الصنائع ۳/۲۲۱" کے حوالوں سے بھی تعریفات سپرد قلم فرمائی ہیں۔

مولانا کلیم اللہ عمری مدنی نے یہ عبارت: "حل عقد الزوجية بلفظ الخلع، وما في معناه في مقابل عوض تلتزم به المراة" نقل فرمائی ہے، مولانا خورشید انور اعظمی یوں لکھتے ہیں: "هو في الشريعة عبارة عن أخذ مال من المرء ة بإزاء ملك النكاح بلفظ الخلع" (عنايه شرح هدايه ۴/۵۷)، بعدہ لکھتے ہیں: "الخلع هو إزالة ملك النكاح المتوقفة على قبولها بلفظ الخلع أو ما في معناه" (البحر الرائق ۴/۷۰)، مذکورہ تعریف کی عمدگی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے داماد آفندی کی تحریر "مجمع الانهر شرح ملتقى الابحر" (۱/۴۴۷) نقل فرمائی ہے، مفتی اقبال احمد قاسمی کانپور نے کئی ایک تعریفات تحریر کرنے کے بعد علامہ دکتور زحیلی کی وہ تحریر پیش کی ہے جس میں شافعیہ کی خلع کی تعریف کو انسب کہا گیا ہے: "والخلع عند الشافعية هو

فرقة بين الزوجين بعوض بلفظ طلاق أو خلع كقول الرجل طلقتك أوخالعتك على كذا فتقبل، وهذا أنسب التعاريف لاتفاقه مع المقصود بالخلع هنا، وفي مفاهيم الناس ومع القانون النافذ في مصر وسوريه'' (۹/۷۰۰۹)۔

مفتی احمد نادر القاسمی نے جزری کی تعریف بحوالہ نہایۃ ۲؍۶۵ "والخلع أن يطلق زوجته على عوض تبذله له". نیز فتح القدیر ۱۹۹/۳، کشاف القناع ۱۲۶/۳، مغنی المحتاج ۲۶۲/۳، المفصل فی احکام المرءۃ ۱۱۴/۸ از ڈاکٹر عبدالکریم زیدان کی تعریفات بھی رقم فرمائی ہیں (دیکھئے مقالہ: مفتی احمد نادر القاسمی)، مفتی عبداللہ مظاہری وغیرہ نے بھی کتب معتبرہ سے تعریفات پیش کی ہیں (دیکھئے: مقالہ مفتی عبداللہ مظاہری، مولانا محمد حسن ندوی، مفتی محمد عثمان گورینی، مفتی خالد حسین نیموی، مولانا محمد رمضان علی فرقانی خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ، مولانا شوکت ثناء قاسمی حیدرآباد)۔ راقم سطور نے بھی کئی ایک تعریفات نقل کرنے کے بعد ابن نجیم کی تعریف ''شرعا على ما اخترناه ازالة ملك النكاح المتوقفة على قبولها بلفظ الخلع او ما في معناه'' کا ذکر کرتے ہوئے اس نقد کو پیش کیا ہے جسے صاحب بحر نے ابن الہمام اور بعض شارحین کنز پر کیا ہے اور ثابت کیا ہے، شارحین کنز کی تعریف جامع اور فتح القدیر کی تعریف مانع نہیں ہے اور اپنی تعریف کی جودۃ کی جانب وقولی هذا اولی سے اشارہ فرمایا ہے۔

## سوال نمبر ۲: بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ جیسے مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے، اسی طرح عورت کو خلع لینے کا حق حاصل ہے، یہ بات کس حد تک درست ہے؟

اس سوال کے جواب میں سبھی مقالہ نگار حضرات (بجز مولانا شیخ کلیم اللہ عمری مدنی) اس پر متفق ہیں کہ جب تک شوہر کی رضامندی نہ ہوگی عورت خلع نہیں کرا سکتی، اس کے ثبوت میں تمام مقالہ نگار حضرات نے تفصیلی دلائل نصوص قرآنیہ واحادیث وکتب فقہ وفتاوی سے پیش فرمائے ہیں، اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند حضرات کے آراء پیش کئے جاتے ہیں:

مولانا منصف بدایونی نے ۱۹۵۹ء میں پاکستان کے فیصلہ خلع کا ذکر کرتے ہوئے اسے جمہور کے متفقہ فیصلہ کے خلاف قرار دیا ہے، مولانا مفتی عظمت اللہ میر رحیمی نے خلع عورت کا حق کہنے والوں کے تین دلائل قلم بند کرکے ہر ایک کا کافی ووافی جواب دیا ہے، مولانا خورشید انور اعظمی نے مولانا فرنگی محلی کی ایک عبارت ''ولقد أعجب بعض علماء عصرنا حيث ظن أن الخلع فسخ لا يتوقف على تراضي الزوج ففرق بين امرء ته وزوجها جبرا وقهرا من غير رضاه، واستدل في ذلك بعبارة الشوكاني في رسالته الخ'' (حاشیہ شرح وقایہ ۱۰۷/۲) پیش فرما کر بتلایا کہ حضرت فرنگی محلی نے ایسے علماء پر حیرت کا اظہار فرمایا ہے، جنہوں نے شوہر کی رضامندی کے بغیر خلع کو صحیح کہا ہے اور واضح کیا ہے کہ ان لوگوں کو علامہ شوکانی کی عبارت جو "الدرر البهيته" میں ہے، اس کے سمجھنے میں چوک ہوئی ہے۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی ''کنز الراغبین شرح منہاج الطالبین'' نیز وہبہ زحیلی کی ''التفسیر المنیر ۱۵۷/۱'' کی عبارت "جميع الفقهاء يرون أنه لا يجبر الرجل على قبول الخلع فلا بد فيه من التراضي بين الطرفين" نیز ''الفقہ المنہجی'' کی عبارت: "هو الطلاق الذي يقع برغبة من الزوجة الخ" (۱۴۰/۲) ودیگر حوالے پیش فرما کر لکھتے ہیں کہ یہ نظریہ اختیار کرنا کہ عورت کو خلع کا ایسا ہی حق ہے، جیسا کہ مرد کو سراسر غلط ہے، ہاں یوں کہا جائے کہ یک گونہ اس کو بھی اختیار ہے، بایں طور کہ مال دے کر شوہر کو راضی کرکے طلاق لے لے، شوہر اس کی مرضی کے بغیر مال لازم نہیں کر سکتا، مولانا خورشید احمد اعظمی نے اس کی تردید میں ''بدایۃ المجتہد'' (۵۱/۲) کی عبارت "وأما ما يرجع إلى الحال التي يجوز فيها الخلع" نیز ''کتاب الام'' (۲۱۲/۵) اور ''بدائع الصنائع'' (۲۲۹/۳) کی عبارت: "ولا يستحق العوض بدون القبول" پیش فرمائی ہے۔

مفتی شاہد علی کی رائے یہ ہے کہ عورت کے لئے حق خلع ایک غیر مستقل حق ہے، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی لکھتے ہیں: ''مجھے نہیں معلوم کہ ''جیسے سے'' کیا مراد ہے، اگر ''جیسے سے'' یہ مراد ہے کہ جس طرح مرد طلاق دینے میں آزاد ہے، بیوی کی اجازت کی ضرورت نہیں، ویسے ہی عورت خلع لینے میں آزاد ہے، شوہر کی اجازت ضروری نہیں تو یہ سراسر غلط ہے، لیکن اگر یہ مراد ہے کہ جیسے مرد کو طلاق دینے کا حق ہے ویسے ہی عورت کو خلع لینے کا حق حاصل ہے تو یہ برا نہیں، بلکہ شریعت کے عین مطابق ہے، مفتی اشرف عباس لکھتے ہیں: ''اگر بناہ مشکل ہو تو اکثر اہل علم جن میں ائمہ اربعہ بھی ہیں، اس بات کے قائل ہیں کہ عورت کی طرف سے خلع کی پیشکش کا قبول کرنا مرد کے لئے ضروری نہیں، جبکہ قاضی شوکانی اور حافظ ابن تیمیہ کی رائے وجوب کی ہے، فریقین کا استدلال حضرت ثابت بن قیسؓ والی روایت ہے: "أقبل الحديقة وطلقها تطليقة" جمہور کے یہاں یہ امر برائے وجوب نہیں، بلکہ ارشاد واصلاح ہے، شوکانی فرماتے ہیں: ''لأنه ليس من

صارف یصرف امره ﷺ عن الوجوب الذی هو حقیقة الأمر مالم تکن قرینة تصرفه عنها'' (نیل الاوطار ۲۷۹،۶)، مولانا رحمت اللہ ندوی لکھتے ہیں: ''جبری خلع درست نہیں، خلع میں دو باتوں کا پایا جانا ضروری ہے، ایک شوہر کا طلاق دینے پر آمادہ ہونا، دوسرے بیوی کی طرف سے اس کا کچھ معاوضہ، اگر شوہر آمادہ نہ ہو تو یکطرفہ خلع نہیں ہوسکتا، مولانا صدر الحسن ندوی مدنی رقم طراز ہیں: ''الطلاق والخلع لایقعان بدون رضی الزوج لحدیث ابن ماجه: الطلاق لمن أخذ بالساق'' (ردالمحتار ۵۸۵،۲)۔

مولانا نثار احمد گودھروی کی تحریر بتلاتی ہے کہ ''بعض حضرات شوہر کی رضامندی کو ضروری قرار نہیں دیتے، حالانکہ اختلاف شوہر کی رضامندی میں نہیں، بلکہ فریقین کی رضامندی کے بعد ہر حال میں خلع جائز ہے، یا اس صورت میں جبکہ بیوی اپنے شوہر کو ناپسند کرنے کی معقول وجہ رکھتی ہو، اکثر فقہاء نے پہلی رائے کو اختیار کیا اور بعض نے دوسری کو، لیکن جہاں تک خلع میں فریقین کی رضامندی کا تعلق ہے اس کو دونوں فریق ضروری قرار دیتے ہیں، جیسا کہ ''تراضیا علی الخلع'' کے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔ استدلال میں ''احسن الفتاوی ۴، فقہی مقالات ۲'' پیش فرمایا۔

مفتی اقبال احمد قاسمی نے متجددین کا بھرپور جواب دیتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ خلع یکطرفہ نہیں ہوسکتا، مفتی احمد نادر القاسمی لکھتے ہیں کہ خلع کو مرد وعورت کے حقوق طلاق کے تناظر میں دیکھنے کے بجائے اس کو ضرورت کے پیرائے میں دیکھنا چاہئے، موصوف نے ائمہ اربعہ کے یہاں خلع کی شرعی حیثیت کیا ہے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے (دیکھئے مقالہ: مفتی احمد نادر القاسمی)، احقر نے دکتور احمد ذیاب شویدح کی کتاب ''مدی سلطة القاضی فی الخلع بدون رضی الزوج فی الفقه الاسلامی ص ۱۲۰-۱۲۱'' سے ایک اقتباس ''ذهبت جمهور الفقهاء إلی أن الأصل فی الخلع بلاحاجة هو الکراهة الخ'' نقل کرکے خلع کی مکروہ مندوب اور حرام صورتوں کو پیش کیا ہے، بعدہ تراضی طرفین کو خلع کے لئے لازم قرار دیا ہے، ان تمام آراء کے برخلاف مولانا شیخ کلیم اللہ عمری مدنی تحریر فرماتے ہیں کہ ''اگر شوہر راضی نہ ہو تو عورت قاضی پنچایت کورٹ، جمعیت یا جماعت کے ذریعہ اپنا نکاح فسخ کرالے گی، موصوف کا استدلال: ''فإن خفتم أن لا یقیما حدود الله'' (سورۂ بقرہ: ۲۲۹) نیز حضرت ثابت بن قیسؓ کے واقعہ سے ہے، بعدہ لکھتے ہیں: ''خلع ایک آخری اور شرعی حل وعلاج ہے، اور عورت کا شرعی حق بھی ہے، جس طرح مرد کو طلاق کا پورا اختیار ہے، جس میں عورت کی رضامندی یا اس طلاق کا علم ہونا وغیرہ شرط نہیں ہے، اسی مفہوم کو فضیلۃ الشیخ محمد یعقوب دہلوی نے اپنی کتاب: ''ضمانات حقوق المرءة الزوجیة'' میں تفصیل کے ساتھ واضح کیا ہے کہ عورت کو شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی گذارنے میں مشکلات کا سامنا ہو تو وہ قاضی کے پاس درخواست پیش کرے گی تو ایسی صورت میں قاضی پر فسخ نکاح کی کارروائی کرنا واجب ہے، اگرچہ شوہر اس فسخ پر راضی نہ ہو۔

**سوال نمبر ۳: اگر عورت شوہر کی جانب سے شدید حد تک متنفر ہو، لیکن شوہر طلاق دینے پر تیار نہ ہو اور عورت کے پاس** شوہر کے ظلم وزیادتی کے سلسلہ میں بینہ فراہم نہ ہو تو اس کے گلوخلاصی کی کیا صورت ہوگی؟

اس میں تین نقاط نظر ہیں:

۱۔ مولانا منصف امروہوی کے علاوہ تمامی مقالہ نگاروں نے اس کا جواب تحریر فرمایا ہے، مفتی نذیر احمد کشمیری حکمین کے تقرر وعدم تقرر، ان کے اختیار وعدم اختیار کے تحت پانچ صورتیں نکال کر ہر ایک کے احکام تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کا حل مالکی مسلک کے مطابق نکالا جائے گا، مولانا صادق مبارکپوری کی تحریر بتلاتی ہے کہ قاضی کی عدالت میں مقدمہ لے جائے، قاضی ضرورت ومجبوری سمجھے تو امام مالک کے مسلک کے مطابق تفریق کردے، مفتی شاہد علی لکھتے ہیں: حنفیہ کے یہاں تو نفرت کی صورت میں گلوخلاصی کی کوئی مؤثر صورت نہیں، مگر مالکیہ کے یہاں اور ایک قول میں شافعیہ وحنابلہ کے یہاں حکمین خلع کرسکتے ہیں، ہندوستان میں اسی پر عمل کی گنجائش ہے، مولانا غلام اللہ کادی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مفتی اقبال احمد قاسمی، مولانا محمد رمضان علی فرقانی، مولانا احسن ندوی، مفتی محمد خالد حسین نیموی، مفتی عبد اللہ مظاہری، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا رضوان الحسن مظاہری کی رائے بھی وہی ہے، ندوی صاحب استدلال میں امام مالکؒ کا قول: ''وذلک أحسن ما سمعت من أهل العلم أن الحکمین یجوز قولهما بین الرجل وامرءته فی الفرقة والاجتماع'' بحوالہ المنتقی شرح مؤطا (۱۱۳،۴-۱۱۴) پیش فرماتے ہیں، مفتی محمد شاہد قاسمی مہاراشٹر کا خیال یہ ہے کہ امام مالک کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے حکمین کو اس بات کا اختیار دیا جائے کہ وہ اصلاح حال کی کوشش کے بعد فریقین کے درمیان خلع کے ذریعہ تفریق کردیں اگرچہ شوہر اس پر راضی نہ ہو لیکن بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکمین فریقین کے وکیل بن کر اس فریضہ کو انجام دیں، نیز حکمین فریقین کو مجبور کریں کہ وہ انہیں وکیل بنادیں، جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایسے ہی واقعہ میں حکمین کو وکیل بنانے پر مجبور کیا ''لا تنفلت مني حتی تقر کما أقرت'' (احکام القرآن جصاص ۲۲،۳)، مولانا نثار احمد گودھروی

سپرد قلم فرماتے ہیں: "وہ حکمین جنہیں میاں بیوی نے مقرر کیا ہے اگر وہ تفریق میں خیر سمجھیں تو تفریق کر دیں تو باتفاق ائمہ اربعہ ان کا فیصلہ نافذ ہوگا، حکمین کا بغیر توکیل زوجین کے مقرر کیا جانا فقہاء احناف وشوافع وحنابلہ کے یہاں صحیح نہ ہوگا"۔

## ۲۔ گلوخلاصی کی خلع وطلاق کے علاوہ کوئی صورت نہیں:

مفتی محمد شاہد قاسمی مدھوبنی کے نزدیک خلع یا طلاق کے علاوہ کوئی صورت نہیں تاوقتیکہ زوجین حکمین یا قاضی کو اپنا وکیل نہ بنادیں، قاضی کے یہاں معاملہ پہنچنے اور اس کے حکمین مقرر کرنے کے بعد اس کا کام صرف رپورٹ پیش کر دینا ہے، قاضی جس کی زیادتی ہوگی صرف سرزنش کر سکتا ہے، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا صدر الحسن ندوی مدنی، مولانا محمد یوسف، مولانا افتخار احمد کی بھی یہی رائے ہے، مولانا اعظمی لکھتے ہیں: اگر خلع یا طلاق پر رضامندی ہو جاتی ہے تو ٹھیک، ورنہ اسباب فسخ مہیا نہ ہونے تک صبر کرے، استدلال میں "فتاوی ابن تیمیہ" (۳۲/ ۲۸۳) کی تحریر پیش فرمائی ہے: "إذا أبغضته وهو محسن إليها فإنه يطلب منه الفرقة من غير يلزم بذلك، فإن فعل، وإلا أمرت المرءة بالصبر عليه إذا لم يكن ما يبيح الفسخ"، مولانا آسامی سپرد قلم فرماتے ہیں: "اس بات پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ صرف پانچ عیوب کی بنا پر قاضی کو تفریق کا اختیار ہے، ان کے علاوہ (ناپسندیدگی) کسی بھی فقہ میں فسخ نکاح کی وجہ جواز نہیں بنتی، مفتی اعجاز الحسن لکھتے ہیں: "عدم اداء حقوق کی صورت میں صلح واتفاق کی کوشش کی جائے"، مفتی جمیل احمد نذیری رقم فرماتے ہیں: "عورت خلع چاہتی ہے تو اس کا مطالبہ پورا کرنا چاہئے"۔

۳۔ مولانا ولی اللہ مجید قاسمی کی رائے ہے کہ اگر خلع یا طلاق پر راضی نہ ہو تو قاضی خود تفریق کرا دے گا، مولانا اشرف عباس، مولانا ابوسفیان مفتاحی کی بھی یہی رائے ہے، مفتاحی صاحب لکھتے ہیں کہ دارالقضاء، مسلم پنچایت وغیرہ میں اپنا مقدمہ لے جا کر بذریعہ قاضی نکاح فسخ کرا سکتی ہے، جبکہ مولانا اشرف عباس صاحب کی رائے یہ ہے کہ اگر نباہ ناممکن ہو تو قاضی تحکیم اور پھر خلع جبری کی صورت نکال سکتا ہے، مولانا رحمت اللہ ندوی لکھتے ہیں: "اگر حکمین کے تقرر کے بعد بھی اصلاح نہ ہو سکے تو قاضی بربنائے شقاق تفریق کر دے گا"۔

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی رقم طراز ہیں: "بیوی اگر شوہر کی ایذا رسانی کی شکایت کرے اور تفریق کا مطالبہ کرے تو قاضی دو گواہوں کی گواہی پر جنہوں نے ذہنی ایذا رسانی کی شکایت سن رکھی ہو اور دعوی کرنے والی عورت گواہوں کی گواہی کے ساتھ قسم بھی کھائے تو قاضی تفریق کر دے گا، اور اگر معاملہ مبہم ہو تو قاضی حکمین کے ذریعہ تحقیق کرائے اور شوہر کی جانب سے ضرر کا پتہ لگنے پر تفریق کر دے" (الشرح الکبیر باب الشہادات ۴/ ۲۸۱)۔

مولانا حفیظ الرحمن مدنی کے یہاں اس کا حل دو طرح ہے، لکھتے ہیں: "عورت شدید حد تک متنفر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت شوہر کے متعنت ہونے کا دعوی کرتی ہے، اور شوہر طلاق پر تیار نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حقوق زوجیت ادا کرنے کا دعویدار ہے، اور عورت اس کی منکر ہے، لہذا کتاب الدعوی کے تحت "البينة على المدعي واليمين على من أنكر" پر عمل کریں گے، دوسری صورت بذریعہ حکمین ہے، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی نے حضرت مولانا عبد الرحیم لاجپوریؒ کا ایک فتوی فتاوی رحیمیہ ۸/ ۱۰۴ سے نقل کیا ہے: "شوہر عورت کو پریشان کرنے کے لئے معلق رکھنا چاہتا ہو تو ایسے ظالم شوہر سے جبراً دا کراہاً بھی طلاق لی جا سکتی ہے، دو شرعی گواہوں کی موجودگی میں زبانی طلاق بائنہ کہلوالی جائے، مذکورہ بالا صورتوں میں سے کسی صورت پر عمل نہ ہو سکے تو عورت اپنا معاملہ شرعی پنچایت میں پیش کر کے تفریق کا مطالبہ کرے"، مولانا عبد الرب عبد الوہاب مولانا روح اللہ صاحبان نے بھی حضرت ہی کے اس مضمون کا فتوی جلد مذکور ص ۲۷۸ سے پیش کیا ہے۔ شرعی پنچایت کے ذریعہ حل کرانے کی رائے رکھنے والوں میں مولانا سید قمر الدین محمود بڑودوی، مفتی عظمت اللہ میر رحیمی، مولانا کلیم اللہ عمری مدنی بھی ہیں، آخر الذکر کی وہی دلیل ہے جو جواب ۲ کے ذیل میں پیش کی جا چکی ہے۔

مولانا خورشید احمد اعظمی کی بھی یہی رائے ہے، استدلال میں "لا ضرر ولا ضرار" (ابن ماجہ ۲۳۴۰)، "من رأى منكم منكرا فليغيره بيده الخ" (مسلم کتاب الایمان ۸۰) پیش فرمائی ہے، مولانا عبد الخالق ندوی کی رائے ہے کہ قاضی جو فدیہ تجویز کرے گا اس فدیہ کو قبول کر کے شوہر کو طلاق دینا ہوگا اور اگر وہاں شرعی عدالت نہ ہو تو مسلمانوں کی پنچایت شوہر کو مجبور کر کے گلوخلاصی کرائے گی، مفتی احمد نادر القاسمی رقم طراز ہیں: "قاضی کی عدالت میں شوہر کی زیادتی جب وہ ثابت کرنے سے قاصر ہے اور شوہر عدم رضامندی پر مصر ہے تو قاضی چونکہ رفع ظلم پر مامور ہے، اس لئے دونوں کے درمیان فسخ وتفریق کا حکم دینا اس کے ذمہ لازم ہے"، یہی رائے مولانا محمد احسن عبد الحق ندوی کی بھی ہے، مگر وہ حکمین کے تقرر اور ناکامی کے بعد قاضی کو اختیار دیتے ہیں۔

مفتی محمد عثمان گورینی سپرد قلم فرماتے ہیں: ''اگر عورت کے پاس گواہ موجود نہ ہوں، یا ہوں، لیکن وہ پیش نہ کرسکے تو شوہر کا بار بار بلانے کے باوجود عدالت میں حاضر نہ ہونا اس کی طرف سے قسم کا انکار (نکول) سمجھا جائے گا اور اس انکار کی بنیاد پر عدالت شوہر غائب کے خلاف اور بیوی کے حق میں فسخ نکاح کا فیصلہ جاری کرے گی، یہ قضاء علی الغائب کا مسئلہ ہے، جو حنابلہ کا مسلک ہے، شافعیہ وصاحبین کا بھی یہی مسلک ہے''، یہی رائے مولانا عقیل الرحمن قاسمی کی بھی ہے۔

مفتی محمد عثمان گورینی کی پیش کردہ یہ عبارت مفتی عصمت اللہ صاحب دامت برکاتہم مفتی دار العلوم کراچی کے اس فتوی سے ماخوذ ہے جو فتاوی عثمانی (۴۶۲/۲) کے حاشیہ پر درج ہے اور جس پر حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم و مفتی عبد الرؤف سکھروی و مفتی عبد المنان و مفتی محمود اشرف صاحب کی تائید ہے۔

عارض پہلے اس استفتاء کو جو فتاوی عثمانی کے حاشیہ (۴۶۱/۲) پر درج ہے نقل کررہا ہے۔

کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ جو شوہر استطاعت کے باوجود اپنی بیوی کو نان ونفقہ نہیں دیتا اور عورت کے پاس نان ونفقہ کا کوئی انتظام نہ ہو اور شوہر طلاق یا خلع کے لئے بھی راضی نہ ہو تو ایسی صورت میں عورت کے لئے مذکورہ شوہر سے خلاصی حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے۔

حضرت مفتی صاحب اس کا جواب یوں فرماتے ہیں:

۱۔ ''اگر کوئی شوہر ایسا ہو جو باوجود استطاعت کے اپنی بیوی کو نان ونفقہ نہیں دیتا اور عورت کے پاس نان ونفقہ کا کوئی انتظام نہ ہو اور شوہر طلاق یا خلع کے لئے بھی تیار نہ ہو تو ایسی صورت میں وہ مالکی مذہب کے مطابق اس شوہر سے عدالت کے ذریعہ خلاصی حاصل کرسکتی ہے۔

۲۔ خلاصی حاصل کرنے کے لئے عورت اپنا مقدمہ کسی مسلمان جج کی عدالت میں پیش کرے اور یہ ثابت کرے کہ وہ فلاں کی بیوی ہے اور وہ باوجود استطاعت کے اس کو نان ونفقہ نہیں دیتا اور نہ اس کے پاس نان ونفقہ کا کوئی انتظام ہے جس سے اس کو سخت ضرر لاحق ہے اور وہ اس وجہ سے اس کی زوجیت سے نکلنا چاہتی ہے۔

۳۔ عورت فلاں کے ساتھ نکاح اور اس کا مذکورہ رویہ گواہوں سے ثابت کرے اور اگر اس کے پاس گواہ نہ ہوں یا گواہ ہوں لیکن اسے پیش نہ کئے تو اگر شوہر عدالت میں حاضر ہو تو اس سے قسم لی جائے گی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو اس قاعدہ کلیہ ''اتفقوا علی أن البينة على المدعي واليمين على من أنكر'' (رحمۃ الامہ فی اختلاف الائمہ ص ۳۲۲) سے تسامح ہوا ہے جبکہ اس قاعدہ سے بعض صورتیں مستثنی ہیں ''إنه وإن كانت القاعدة أن اليمين على من أنكر إلا أن بعض الأمور لا استحلاف فيها'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۷،۵۵)، اسی کے ذیل میں ہے: ''قال مالك لا يستحلف إلا في كل دعوى لا تحتاج إلى شاهدين'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۷،۵۶)، عند المالكية فكل دعوى لا تثبت إلا بعد لين لا يستحق فيها شئ الا بشهادة رجلين عدلين۔۔۔ مسئلہ زیر بحث میں شاہدین کی ضرورت ہے اس لئے مدعی علیہ سے قسم لینے کا معنی اس صورت میں سمجھ میں نہیں آتا۔

''(متى شهدت بينة) أي وهي هنا رجلان لا رجل وامرء تان ولا أحدهما مع اليمين'' (حاشیۃ الدسوق علی الشرح الکبیر ۲،۲۲۵)۔

حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم آگے تحریر فرماتے ہیں: ''لیکن شوہر یا اس کا وکیل عدالت میں حاضر نہ ہو جیسا کہ آجکل عموماً ایسا ہی ہے اور عدالت کے بار بار نوٹس اور سمن جاری کرنے اور شوہر نوٹس اور سمن کے بارے میں مطلع ہونے کے باوجود حاضر عدالت نہیں ہوتا تو اگر بیوی کے پاس گواہ موجود ہوں اور وہ پیش بھی کرے تو جج ان کی گواہی کی بنیاد پر بیوی کے حق میں فسخ نکاح کا فیصلہ جاری کرے اور اگر عورت کے پاس گواہ موجود نہ ہوں یا ہوں لیکن وہ پیش نہ کرے تو شوہر کا بار بار بلانے کے باوجود عدالت میں حاضر نہ ہونا اس کی طرف سے قسم سے انکار (نکول) سمجھا جائے گا اور اس انکار کی بنیاد پر عدالت شوہر غائب کے خلاف اور بیوی کے حق میں فسخ نکاح کا فیصلہ جاری کرے گی''، اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شوہر اگر غائب ہو اور عورت کے پاس گواہ موجود نہ ہوں یا موجود ہوں لیکن عورت نے پیش نہ کئے ہوں تو اس صورت میں اس غائب شوہر کے خلاف اور عورت کے حق میں فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟ تو اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ یہ قضاء علی الغائب کا مسئلہ ہے جو مذہب حنابلہ سے لیا گیا ہے یعنی ان کے یہاں غائب کے خلاف فیصلہ جائز ہے اور یہی موقف حضرات شافعیہ کا بھی ہے''۔

حضرت کی مذکورہ بالا تحریر کے بعد عرض ہے کہ قضاء علی الغائب کا مسئلہ تو خود مالکیہ کے یہاں بھی ہے۔

۱۔ ''قلت أرأيت إذا ادعت امرءة أن هذا المفقود كان زوجها أتقبل بينها أم لا؟ قال تقبل منهما البينة لأن مالكا يرى القضاء على الغائب'' (المدونة ۲.۳۵)۔

۲۔ ''أصل مذهب مالك القضاء على الغائب في سائر الحقوق إذا كانت غيبته غيبة بعيدة'' (مواهب الجليل شرح مختصر خليل ۶۵۶.۷)۔

۳۔ ''وقال مالك يحكم على الغائب للحاضر إذا أقام الحاضر البينة وسأله الحكم له'' (رحمة الامه فی اختلاف الائمه ص ۳۲۱)۔

بہر حال صورت مسئولہ میں اس عاجز کے خیال میں جبکہ شوہر باوجود استطاعت کے نان ونفقہ نہیں دیتا، عورت کے پاس گذاران کا کوئی متبادل نہیں، شوہر طلاق وخلع پر راضی نہیں، عورت کے پاس بینہ نہیں نہ ہی وہ اس کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہے، تعنت کے ساتھ ساتھ (شقاق کی تعریفات ملحوظ رکھتے ہوئے) شقاق بھی ہے، جس کے لئے تحکیم کی ضرورت ہے۔

## سوال نمبر ۴: شقاق سے کیا مراد ہے؟

مولانا غلام اللہ کاوی نے اس کا مفہوم بحوالہ (زاد المسیر فی علم التفسیر) عداوت تحریر فرمایا ہے، آپ نے زجاج کی تعریف ''العداوة واشتقاقه من المشاقين كل صنف منهم في شق'' نیز ''تفسیر مظہری ومعارف القرآن'' کے حوالوں سے بھی رقم فرمایا ہے، مولانا صادق مبارک پوری (روائع البیان ۱/۴۶۴) سے صابونی کی تعریف ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں: ''الشقاق الخلاف والعداوة وهو ماخوذ من الشق بمعنى الجانب. لأن كلا من المتخالفين يكون في شق غير شق الأخر بسبب العداوة''، نیز روح المعانی (۳۹/۴) مختار الصحاح (ص ۳۰۲)، اوجز المسالک (۵۴۴/۴) سے بھی تعریفات ضبط فرمائی ہیں، مولانا عبدالرب عبدالوہاب بحوالہ ''لسان العرب'' (۱۱۲/۸) ''الشقاق العداوة بين الفريقين والخلاف بين اثنين سمي ذلك شقاقا الخ'' اور صفوة التفاسیر (۵۲۰/۱) وغیرہ کی تعریفات بھی سپرد قلم فرمائی ہیں، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی نے راغب اصفہانی کی تعریف ''الشقاق المخالفة وكونك في شق غير شق صاحبك'' بحوالہ المفردات (ص ۲۶۴) نقل کی ہے، مفتی محمد عظمت اللہ میر رحیمی نے ''روح المعانی'' سے مولانا خورشید انور اعظمی نے القاموس المحیط (ص ۱۱۶) عمدۃ القاری (۵۷۲/۹)، نیز نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام (ص ۸۰) سے ''أصل انشقاق أن كل واحد يأتي شقاغير شق صاحبه'' قلم بند فرمایا ہے، آپ لکھتے ہیں: ''شقاق سے مراد ایسا شدید اختلاف ہے جس میں فریقین دو انتہاؤں پر پہنچ جائیں اور دونوں کے درمیان اتنا زبردست فاصلہ ہو جائے کہ اس کے ختم ہونے کے امکانات مفقود ہوں...... کسی کا بھی عمل دوسرے کے ذہن ومزاج سے میل نہ کھاتا ہو''، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی اس طرح تحریر فرماتے ہیں: ''النشوز العصيان الماخوذ من النشز وهو ماارتفع من الأرض فالمعنى إلى تخافون عصيانهن وتعاليهن عما أوجب الله عليهم من طاعة الأزواج'' الجامع لاحکام القرآن القرطبی (۱۲۲/۳)، نیز تمہید (۱۱۳/۹)، تفسیر کبیر (۹۵/۵)، کتاب الام (۱۷۷/۵) کی تعریفات بھی پیش فرمائی ہیں۔

مولانا حفیظ الرحمن مدنی تفسیر ماجدی (۳۴۷/۱) کے حوالہ سے رقم طراز ہیں: ''شقاق ایسی کشمکش ہے جسے وہ باہم سلجھا نہ سکیں''، نیز کتاب الفتاوی (۱۷۰/۵) مجموعہ قوانین اسلامی (ص ۸۲) سے بھی نقل فرمایا ہے، مولانا خورشید احمد اعظمی لکھتے ہیں: ''وحقيقته أن يأتي كل منهما مايشق على صاحبه. فيكون كل منهما في شق غير شق صاحبه''، المصباح لاحمد بن محمد علی الفیومی، ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی نے لسان العرب (۱۱۲/۸)، مفردات فی غریب القرآن (ص ۲۶۴)، مفتی جمیل احمد نذیری نے بیان القرآن (۱۱۵/۱)، مولانا محمد یوسف نے فتح القدیر للشوکانی (۱۴۷/۱)، تفسیر احمدی (ص ۱۸۲)، سے شقاق کی وضاحت فرمائی ہے، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی نے مرتضی زبیدی کی تعریف ''أومن شق العصا بينك وبينه فيكون مجازا'' بحوالہ تاج العروس (۲۵۱/۱۳)، المجموع (۴۵۲/۱۶) سپرد قلم فرمایا ہے، جبکہ مولانا اشرف عباس معانی القرآن لابی جعفر النحاس (۲۰۹/۱) کی عبارت ''الشقاق العداوة وحقيقته أن كل واحد من المعاديين في شق خلاف شق صاحبه'' زیب قرطاس فرمائی ہے۔

مولانا عبید اللہ ندوی غریب القرآن کتاب الشین ص ۲۶۴ سے اس کا مفہوم نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''شقاق سے عام مراد ہے چاہے شوہر کی بلاوجہ مار پیٹ یا بیوی کی جائداد پر ناجائز تصرف سے پیدا ہوا ہو یا بے پردگی یا موجودہ فیشن کی عریانی اختیار کرنے پر جبر کرنے کی بنا پر یا دیگر قسم کے محرمات پر اکراہ اور

جبر کرنے کی وجہ سے، مولانا کلیم اللہ عمری مدنی نے تفسیر مفاتیح الغیب (۱۰/ ۷۳) سے ''قال الرازي... للشقاق تاويلان أحدهما أن كل واحد منهما يفعل ما يشق على صاحبه الخ'' کے علاوہ قرطبی وراغب اصفہانی کی تعریفات بھی رقم فرمائی ہیں، مفتی اقبال احمد قاسمی تفسیر مظہری، مفتی محمد عثمان گورینی مواہب الجلیل (۵/ ۲۶۵)، مولانا محمد احسن ندوی معین الحکام (ص ۳۲۹) کے حوالہ سے رقم فرماتے ہیں، مفتی عبداللہ مظاہری زیب قرطاس فرماتے ہیں: ''زوجین کے رشتوں میں ایسی کڑواہٹ وتلخی کہ اس کی وجہ سے موافقت ونباہ مشکل ہوجائے''، مولانا شوکت ثناء قاسمی نے الوجیز للواحدی ا/ ۱۱۲ کی تحریر پیش فرمائی ہے، مفتی احمد نادر القاسمی نے کئی کتابوں سے تعریفات رقم کرنے کے بعد ڈاکٹر محمد سلیمان عبد اللہ الاشقر کی تعریف ''أي تفاقم الخلاف بين الزوجين'' یعنی زوجین کے درمیان پایا جانے والا اختلاف سنگین صورت اختیار کرجانے کا اندیشہ ہو'' پیش فرمائی، اس عاجز نے بھی بخاری شریف (۲/ ۷۹۴) کے حوالہ سے نقل کیا ہے: ''وقال طاؤوس: إلا أن يخافا أن لا يقيما حدود الله فيما افترض لكل واحد منهما على صاحبه في العشرة والصحبة''، نیز مفسر قرطبی کی تعریف ''اى وإن خفتم تباعد عشرتهما وصحبتهما'' (۵/ ۱۱۵) نقل کی ہے، یعنی فریقین کے رہن سہن اور اسلوب زندگی میں بالکل ہم آہنگی نہ ہو۔

## سوال نمبر ۵: کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے، اس سلسلہ میں حنفیہ اور دوسرے فقہاء کا کیا نقطۂ نظر ہے؟

سارے ہی مقالہ نگار حضرات نے ائمہ کے نقاط نظر پیش فرما کر شقاق کے باعث قاضی کے از خود تفریق کرنے و نہ کرنے، نیز بعضوں نے شقاق کے بموجب تفریق ہونے نہ ہونے کی بابت گفتگو کی ہے، مفتی محمد شاہد قاسمی مدھوبنی تحریر فرماتے ہیں: ''جمہور ائمہ کے یہاں شقاق کی وجہ سے نکاح فسخ نہیں کیا جاسکتا، جبکہ امام مالکؒ کے نزدیک فسخ کیا جاسکتا ہے، جمہور کے یہاں شقاق چونکہ موجب فسخ نہیں، اس لئے کسی کو یہ اختیار نہیں کہ زوجین کی رضا کے بغیر نکاح کو فسخ کردے، نہ حاکم کو نہ قاضی کو اور نہ ان کے متعین کردہ حکمین کو، البتہ امام مالک کے یہاں اگر چہ سبب فسخ ہے، مگر حاکم یا قاضی فسخ کا اختیار نہیں رکھتا، ہاں البتہ ان کے متعین کردہ حکمین تفریق کا اختیار رکھتے ہیں''، مفتی شاہد علی سپرد قلم فرماتے ہیں: ''جہاں تک شقاق کی وجہ سے خود قاضی کے فیصلہ کرنے کی بات ہے، راقم الحروف نے مسالک اربعہ میں سے کسی مسلک میں اس کا جواز نہیں دیکھا کہ قاضی خود زوجین کے درمیان خلع کے ذریعہ تفریق کردے، بلکہ جن فقہاء نے بھی شقاق کی وجہ سے شوہر کے علی الرغم خلع کے ذریعہ تفریق کی اجازت دی ہے، وہ سب اس کے لئے حکمین کے تقرر کو ضروری قرار دیتے ہیں، نیز ان فقہاء کے سامنے اللہ کا وہ ارشاد ہے جس میں حکمین کے تقرر کا حکم دیا گیا ہے۔

مولانا کلیم اللہ عمری مدنی لکھتے ہیں: ''خلع زوجین کی رضامندی سے ہوگا، البتہ معاملہ رضامندی سے حل نہ ہونے کی صورت میں قاضی وقت کو یہ حق حاصل ہوگا کہ حالات کا مکمل جائزہ لینے کے بعد شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کردے، استدلال میں حدیث: ''أقبل الحديقة وطلقها تطليقة'' پیش فرمایا ہے، نیز لکھتے ہیں کہ مذکورہ صورت میں قاضی خود فیصلہ کرے یا حکمین کا تقرر کرے اور وہ فیصلہ کردیں، سید سابق لکھتے ہیں: ''الخلع يكون بتراضي الزوج والزوجة، فإذا لم يتم التراضي منهما فللقاضي إلزام الزوج بالخلع'' (فقه السنة ۲۹۹، ۲)، یہی رائے ابو الطیب محمد صدیق خاں کی ہے (دیکھئے: الروضۃ الندیہ شرح الدرر البہیۃ ۲/ ۲۷۲)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی لکھتے ہیں: ''زوجین نے حکمین کو وکیل بنایا ہو تو انہیں طلاق وخلع کا حق ہوگا، اگر وکیل نہیں بنایا تو صرف اصلاح حال تک ان کا معاملہ رہے گا، اگر اصلاح حال نہ ہوسکے تو اپنی رپورٹ قاضی کو دے دیں گے، آخری مرحلہ میں قاضی جو تفریق کرتا ہے وہ فسخ ہوا کرتا ہے''، مفتی نذیر احمد کشمیری صاحب کی رائے یہ ہے کہ بربنائے شقاق عورت کو فسخ کا مطالبہ کرنے کا حق ہے، مفتی اقبال احمد قاسمی سپرد قلم فرماتے ہیں: ''موجودہ زمانہ میں بلاد ہندو پاک وبلاد مصر وشام میں مالکی مسلک کو راجح قرار دیا گیا ہے، اسی لئے حنفیہ کی کتب میں بھی اب شقاق اسباب فسخ میں شمار کیا جاتا ہے، چند سطور کے بعد لکھتے ہیں کہ جمہور فقہاء کے مسلک کے بجائے موجودہ زمانہ میں مصر وشام اور ہندوستان وغیرہ تقریباً سبھی اسلامی اور شرعی دار القضاؤں میں مالکیہ کے مسلک کو اختیار کیا جانے لگا ہے، لہٰذا اب جبکہ تعامل عہد حاضر کا مالکی مسلک ہے تو اب نظریاتی طور پر اس کو مرجوح ثابت کرنا بے سود معلوم ہوتا ہے''، مولانا محمد رمضان علی فرقانی سپرد قلم فرماتے ہیں کہ اگر حکمین کی کوشش ناکام ہوجائے تو قاضی نیابۃ عن الزوج تفریق کردے گا، چونکہ جمہور کے یہاں خلاصی کی کوئی صورت نہیں ہے تو پھر وہ عورتیں جو شدید متنفر ہیں ان کا کیا ہوگا؟ ایسی بہت سی عورتیں دار القضاؤں میں دیکھی گئی ہیں جو قاضی سے کہتی ہیں کہ اگر مجھے میرے والدین نے شوہر کے یہاں زبردستی بھیجا تو میں زہر کھالوں گی، یا کسی اور طرح سے خودکشی کرلوں گی، اس لئے اس کا حل بس فقہ مالکی میں ہے، حکمین کے بغیر قاضی کا کیا ہوا فیصلہ قابل اعتبار ہوگا، مگر محل تحکیم کی مذکورہ صورت اس سے مستثنی ہوگی، اس کا حکم الگ ہے۔

مفتی احمد نادر القاسمی اولاً "المفصل فی احکام المرءۃ" (۸/۴۳۱) سے ایک تحریر پیش فرماتے ہیں، جس میں ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے شافعیہ وحنابلہ کے دوسرے قول کو ہی ترجیح دی ہے: "يصلح للشقاق سببا للتفريق بين الزوجين، لأن بقاء الشقاق ضرر بالزوجين والضرر يزال، وإزالته عن الزوجة بإيقاع التفريق، وهذا في الرواية الثانية عن الإمام أحمدبن حنبل، وهو قول مالك، وهو القول الثاني في مذهب الشافعية، وهو قول فقهاء المدينة وهذا القول مانرجحه" ثانیاً نادر صاحب سنگین صورت حال اختیار کر جانے کی صورت میں قاضی کو بااختیار مانتے ہوئے سپرد قلم فرماتے ہیں: "راقم الحروف کو ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ چونکہ ہندوستان کے حالات تفریق وطلاق کے سلسلہ میں نہایت پیچیدہ ہیں اور مسائل کی نوعیت بھی حد درجہ متنوع ہے، اس لئے خلع کے مسئلہ کو بھی دار القضاء اور قاضی سے مربوط کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے"، مفتی رضوان الحسن مظاہری حضرت ثابتؓ کے واقعہ کے حوالہ سے قاضی کو بااختیار مانتے ہیں، جبکہ مفتی محمد عثمان گورینی، مولانا احمد شمیم گورینی، مفتی شوکت ثناء قاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا عقیل الرحمن خلع کے باب میں قاضی وحاکم کو بااختیار نہیں گردانتے، عارض کے خیال میں وہ اسباب جو موجب فسخ ہوں اگر نہ ہوں تو عند الاحناف وشافعیہ وحنابلہ کے قول راجح کے مطابق عورت بینہ سے اضرار ثابت کرے یا نہ کرے بہر دو صورت تفریق کا اختیار قاضی کو نہیں ہونا چاہئے اور اگر بینہ کے ذریعہ اضرار ثابت کر دے تو عند المالکیہ قاضی کو اس کا حق ہوگا بصورت ثانی صرف حکمین کو اس کا حق ملنا چاہئے، قاضی کا کام صرف حکمین کے فیصلہ کو نافذ کرانا ہوگا۔

بڑے ادب کے ساتھ عرض ہے کہ جس مقالہ نگار نے یہ لکھا ہے کہ قاضی کو جب وجوہات شقاق وضرر کے وقوع کا یقین ہو تو وہ خود بھی تفریق کر سکتا ہے، اس سلسلہ میں مشہور فقیہ اور محقق حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم کی ایک تحریر پیش ہے: "قضاۃ کو اپنی ذاتی واقفیت کو اساس بنا کر فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے، تو خطرہ تھا کہ جائر قضاۃ اس کو اپنے جور کے لئے مہمیز بنالیں، اس لئے فقہ مالکی میں قضاۃ کو اپنے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ کا اختیار نہیں دیا گیا (بحث ونظر شمارہ ۱۳ جلد ۴ ص ۴۴)۔

جصاص رازی کی تحریر پیش کر رہا ہوں: "فقال أصحابنا: ليس للحكمين أن يفرقا إلا أن يرضى الزوج، وذلك. لأنه لا خلاف أن الزوج لوأقر بالإساءة إليها لم يفرق بينهما، ولم يجبره الحاكم على طلاقها قبل تحكيم الحكمين الخ" (احکام القرآن ۲،۲۳۲)۔

ڈاکٹر مفتی شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں: "خلاصہ یہ کہ شوہر بیوی کو تکلیف دہ باتیں کہہ کر ذہنی ایذاء پہنچائے اور بیوی ذہنی ایذاء رسانی کی شکایت کرے یا جسمانی ایذاء رسانی کی شکایت کرے اور تفریق کا مطالبہ کرے تو قاضی شوہر کے اقرار یا محل واقعہ پر موجود دو مرد گواہوں کے ذریعہ یا کم از کم دو ایسے مرد گواہوں کی گواہی پر جنہوں نے ذہنی ایذاء رسانی یا جسمانی ایذاء رسانی کی بات شہرت یعنی متعدد مردوں اور عورتوں سے سن رکھی ہو اور گواہی شبہ سے محفوظ ہو یعنی سننے والے وہاں کی زبان اچھی طرح سمجھتے ہوں اور دعوی کرنے والی عورت گواہوں کی گواہی کے ساتھ قسم بھی کھائے تفریق کر دے اگر معاملہ مبہم ہو تو قاضی حکمین کے ذریعہ تحقیق کرائے اور شوہر کی جانب سے ضرر کا پتہ لگنے پر تفریق کر دے ذکر کردہ شرائط کے ساتھ تفریق مالکیہ کا راجح مسلک ہے (الشرح الکبیر باب الشہادات مراتب الشہادۃ ۴/۲۸۱)، اس کے بعد موصوف لکھتے ہیں: جبکہ میرے نزدیک صرف صالح عورتیں اور خادمائیں جن کا عورت کے پاس بکثرت آنا جانا ہو ضرر کی گواہی دیں تو معتبر ہے (مواہب الجلیل ۵/ ۲۹۴)۔

ڈاکٹر صاحب نے الشرح الکبیر کی عبارت پیش نہیں کی اگر عبارت ہوتی تو دیکھا جاتا کہ گواہوں کی گواہی کے ساتھ مدعیہ علیہ قسم بھی کھائے گی اس کا مستدل کون سی عبارت ہے، اس عاجز کے خیال میں قسم کا محل کچھ اور ہے یہاں صرف بینہ درکار ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب نے خود بھی مواہب الجلیل ۵/ ۲۹۴ کے حوالہ سے اسی کی تائید فرمائی ہے پھر بھی یہ عارض مناسب سمجھتا ہے کہ بینہ اور یمین کے محل کی وضاحت دلائل کے ذریعہ کر دی جائے "(متى شهدت بينة) اى وهي هنا رجلان لا رجل وامرء تان ولا احدهما مع اليمين" (حاشية الدسوقي على الشرح الكبير ۲،۳۴۵ باب الخلع)۔

یعنی صرف دو آدمی ہوں گے اگر ایک مرد اور دو عورتیں یا ایک مرد اور یمین کے ساتھ ہو تو وہ بھی غیر معتبر ہے لیکن ہاں اگر خلع ہو گیا اور عورت نے مال دے دیا بعد کو اس نے شوہر کے ضرر کو ثابت کر دیا تو اس وقت ثبوت کا طریقہ ایک شاہد اور بیوی کی یمین ہے جس کے بعد شوہر بدل خلع واپس کر دے گا، "(ويمينها مع

شاهد)صورته خالصته على مال ثم بعد ذلك قالت شاهد اعلي أن زوجها كان يضاررها فيعمل بهذا الشاهد مع يمينها ولو شاهد سماع ويرولمال إليها'' (حاشية الدسوق ۴،۱۹۸ کتاب الشهادات)،مزید تائید درج ذیل حوالوں سے بھی ہورہی ہے۔ ''وذكر المرتبته الثالثة بقوله وإلا بأن كان المشهود به مالا أو آيلاله فعدل وامرء تان أو أحدهما أى عدل فقط وامرء تان فقط بيمين أى مع يمين المشهود له كأجل ادعاه المشترى وخيار وشفقه واجارة'' (الشرح الصغير مع الدسوق ۶،۹۲) عند المالکیہ مراتب شہادت چار ہیں جن میں سے تیسرا درجہ ایسا ہے کہ اس میں شہادت مع یمین ہے بشرطیکہ مشہود بہ مال ہو یا مال کی امید ہو جس کی وضاحت صورتہ خالعتہ الخ سے کردی گئی ہے۔

''ولعل اليمين التى نفاها ابن رشد غير التى أثبتها المقيطى فتاب له اه...لأن اليمين التى نفاها ابن رشد هى اليمين على إضراره بها كما هو واضح من كلامه واليمين التى أثبتها المقيطى هى اليمين على أنها إنما اختلعت لأجل الضرر'' (حاشيہ ابن يوسف الرهونى على شرح الشيخ عبد الباقى الزرقانى تسن الامام الجليل الى المودة خليل ۴،۶۲ دار الفكر بيروت)۔

''اتفق الائمة على أنه لايصح الحكم بالشاهد واليمين فيما عدالأحوال وحقوقها''(رحمة الامه فى اختلاف الائمة ص ۳۳۸)۔

سطور بالا سے معلوم ہوا کہ عورت پر شوہر کے ضرر کو ثابت کرنے کے لئے صرف بینہ درکار ہوگا اور یمین کی ضرورت اس صورت میں ہوگی جبکہ ضرر کی نسبت عورت کی جانب ہو کر بدل خلع شوہر کو مل چکا ہو حال یہ کہ معاملہ اس کے برعکس ہو، تو اگر عورت شاہد (خواہ شاہد سماع ہی کیوں نہ ہو) اور یمین کے ساتھ اس کے خلاف ثابت رہے تو بدل خلع شوہر سے واپس لے لے گی، معلوم ہوا کہ یمین اور بینہ کا محل الگ الگ ہے۔

اسی طرح مولانا نثار احمد گودھروی نے لکھا ہے کہ ''حکمین کا بغیر توکیل زوجین کے مقرر کیا جانا فقہاء حنفیہ وشافعیہ وحنابلہ کے یہاں صحیح نہ ہوگا، اس کے تحت یہ تحریریں پیش ہیں: ''ذهب الشافعية فى الأظهر والحنابلة فى الصحيح من المذهب إلى أن الحكمين وكيلان عن الزوجين فلا يرسل الحكمان إلابرضا الزوجين وتوكيلهما، وإن لم يرض الزوجان ببعثهما أو امتنعامن توكيلهما لم يجبرا على ذلك'' (مغنى المحتاج ۳،۲۶۱، كشاف القناع ۵،۲۱۱، الانصاف ۸،۳۸۰، الموسوعة الفقهيه ۴۰،۳۱۸). معارف القرآن (۲/۴۰۴-۴۰۵) سے مفتی محمد شفیع صاحب کی ایک تحریر پیش ہے: ''امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حسن بصری نے یہ قرار دیا کہ اگر ان حکمین کا بااختیار ہونا امر شرعی اور ضروری ہوتا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس ارشاد اور فریقین سے رضامندی حاصل کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی، فریقین کو رضامند کرنے کی کوشش خود اس کی دلیل ہے کہ اصل سے یہ حکمین بااختیار نہیں ہوتے''۔

علامہ ابن الہمام نے جصاص رازی کے حوالہ سے ایک عبارت نقل فرمائی ہے، جو اس طرح ہے: ''وفى أحكام القرآن للرازى عن سعيد بن جبير يعظها الزوج، فإن انتهت وإلاهجرها، فإن انتهت وإلاضربها، فإن انتهت وإلارفع أمرها إلى السلطان فيبعث حكما من أهله و حكما من أهلها...ولوادعى النشوز وادعت هى ظلمه وتقصيره فى حقها يفعل الحاكم ما يتفقان عليه من الجمع والتفريق'' (فتح القدير ۴/۸۴ پاکستان)۔

لیکن احقر نے جب ''احکام القرآن'' جصاص کی محولہ عبارت دیکھی تو وہ اس طرح تھی: ''فإذا اختلفا وادعى النشوز وادعت هى عليه ظلمه وتقصيره فى حقوقها حينئذ بعث الحاكم حكما من أهله وحكما من أهلها ليتوليا النظر فيما بينهما ويردا إلى الحاكم ما يتفقان عليه من أمرهما'' (احکام القرآن جصاص ۲/۲۳۱، المطبعة البهية المصرية) دونوں عبارتوں کو سامنے رکھنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ علامہ کی تحریر سے مسلک حنفی کچھ کا کچھ ہوگیا، یعنی حاکم حکمین کے فیصلہ جمع وتفریق کو نافذ کرائے گا، جبکہ یہ مسلک مالکی ہے، نہ کہ حنفی، حنفی مسلک تو صرف یہ ہے کہ حاکم جب حکمین بھیجے گا تو ان کا کام صرف زوجین کی تحقیق کرکے رپورٹ حاکم تک پہنچا دینا ہے، ان کی حیثیت صرف شاہد کی ہے، نہ کہ فیصل کی، جیسا کہ جصاص کی ایک دوسری تحریر پیش ہے: ''فهما فى حال شاهدان، وفى حال مصلحان، وفى حال آمران بمعروف و ناهيان عن المنكر ووكيلان فى حال إذا فوض إليهما الجمع والتفريق'' (۲/۲۳۵)، مرافعہ کے بعد حکمین کی ذمہ داری کیا ہے؟ اس کے لئے مزید حوالے پیش ہیں: (دیکھئے: روح المعانی ۵/۲۷، احکام القرآن از مفتی ظفر احمد عثمانی ۲/۲۵۹ کراچی، احکام القرآن جصاص ۲/۱۹۰، الموسوعة الفقهيه ۲۹/۵۴)، حالانکہ محقق

علامہ نے حنفیہ کا اصل مسلک "فتح القدیر" (۴؍۸۵) پر نقل بھی کیا ہے: "والحکمان إنما بعثا للصلح ولیعلما ظلم الظالم منہما فینکر اعلیہ ظلمہ ہؤذ الم یقبل اعلما الحاکم لیدفع ظلمہ" (مجموعہ قوانین اسلامی دفعہ ۸۲، ص ۲۰۰-۲۰۱) پر یہ تحریر موجود ہے: "اگر زوجین کے درمیان شدید نفرت پیدا ہوجائے کہ دونوں کا اللہ کے حدود کو قائم رکھتے ہوئے ازدواجی زندگی گذارنا ممکن نظر نہ آئے تو ایسی صورت میں (الف) قاضی حکمین مقرر کرے گا، تاکہ اصلاح کی صورت نکل سکے (ب) اگر تحکیم کے باوجود اصلاح حال یا باہمی رضامندی سے علاحدگی کی کوئی صورت نہیں نکل سکے تو قاضی بربنائے شقاق زوجہ کے مطالبہ کی صورت میں تفریق کردے گا"، مقالہ نگاروں میں سے کئی حضرات نے اپنے دعوی میں اسے مستدل بھی ٹھہرایا ہے، اس عاجز کے خیال میں اگر اس تحریر کا مطلب یہ ہو کہ حکمین کے فیصلہ کو قاضی نافذ کرائے گا تب تو فقہ مالکی کی رو سے درست ہے، "وإن کانا محکمین من القاضی ألزما برفع حکمہما إلیہ لینفذہ إلا أنہ لا خیار لہ فی انفاذہ بل ہو مجبر علیہ، وإن خالف اجتہادہ" (الموسوعة الفقہیہ ۲۹،۵۶)، "ویجب علی الحکمین۔ کما قال الدسوقی۔ أن یأتیا للحاکم الذی أرسلہما فیخبراہ بما فعلاہ... فإذا أجزاہ وجب امضاؤہ من غیر تعقب۔ وإن خالف مذہبہ۔ بأن یقول حکمت بما حکمتما بہ" (الموسوعة الفقہیہ ۴۰،۲۱۳)۔ "إذا قبح مابین الزوجین أظہر الشقاق۔ فإن علم الإضرار بہ من أحدہما أمر بإزالتہ۔ وإن انغلق الأمر فیہ بعث الحاکم رجلا من أہلہ ورجلا من أہلہا ویعملان علی ما یریانہ صلاحا للفریقین من صلاح أو تفریق من غیر اعتبار برضا الزوجین ولا لموافقة حاکم البلد أو مخالفتہ" (التلقین ۱،۱۳۱)، "قال مالک: الأمر الذی یکون فیہ الحکمان إنما ذلک إذا قبح مابین الرجل وامرأتہ حتی لا یثبت بینہما بنیة ولا یستطاع أن یتخلص إلی أمرہما۔ فإذا بلغ ذالک بعث الوالی رجلا من أہل زوجہا ورجلا من أہلہا عدلین۔ فینظر ان فی أمرہما واجتہدا۔ فإن استطاعا الصلح أصلحا بینہما۔ وإلا فرقا بینہما۔ ثم یجوز فراقہما دون الإمام۔ وإن رأیا أن یأخذالہ من مالہا حتی یکون خلعا فعلا" (احکام القرآن للامام القاضی ابی اسحاق المالکی ص ۱۲۰ دار حزم)، لیکن شاید اس تحریر سے یہ مفہوم نہ نکل سکے، نیز جمہور کے یہاں تراضی طرفین شرط ہے جو یہاں مفقود ہے، اس لئے اس عاجز کے نزدیک یہ ائمہ اربعہ میں سے کسی کا بھی مسلک معلوم نہیں ہوتا۔

## سوال نمبر ۶: جن حضرات کے یہاں خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں ان کے یہاں کیا قاضی کی طرف سے حکمین کا تقرر ضروری ہے، کیا حکمین کی کوشش کے بعد ہی خلع معتبر ہوگا یا قاضی خود فیصلہ کرسکتا ہے اور کیا ایک حکم کا تقرر بھی کافی ہوگا؟

راقم عرض کرتا ہے کہ حکمین کے تقرر اور قاضی کے از خود فیصلہ کرنے اور نہ کرنے کی بابت مقالہ نگاروں کے نو نقاط نظر ہیں:

تقرر حکمین کے قائلین درج ذیل ہیں:

۱۔ مولانا صدر الحسن ندوی مدنی، مولانا محمد یوسف آسام، مولانا سید قمر الدین بڑودوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا غلام اللہ کاوی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا ممتاز خاں ندوی، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا نثار احمد گودھروی، مفتی محمد شاہد قاسمی مہاراشٹرا، مفتی عظمت اللہ میر رحیمی، مولانا عبد الرب عبد الوہاب نے صراحۃ اس کا جواب نہیں دیا، ہاں ان کا مقالہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف بھی تقرر کے قائل ہیں، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی اس وقت ضروری قرار دیتے ہیں جب عورت شوہر کے ظلم و زیادتی کا دعوی کرتے ہوئے تفریق کا مطالبہ کرے۔

مولانا صدر الحسن ندوی نے استدلال میں رد المحتار (۵، ۸۷-۸۸) کی ایک عبارت: "السنة إذا وقع بین الزوجین اختلاف أن یجمع أہلہا لیصلحوا بینہما۔ فإن لم یصلحا جاز الطلاق والخلع" پیش فرمائی، جبکہ وہ تحریر اس طرح ہے: "السنة إذا وقع بین الزوجین اختلاف أن یجتمع أہلہما لیصلحوا بینہما، فإن لم یصطلحا جاز الطلاق والخلع" (رد المحتار علی الدر ۵،۷۰)۔ مولانا آسامی اس تقرر کو مصلحت قرار دیتے ہیں جبکہ مولانا ممتاز خاں ندوی مستحب کے قائل ہیں، مولانا حفیظ الرحمن مدنی لکھتے ہیں کہ "اگر حکمین سے اصلاح حال نہ ہوسکے تو قاضی کو فسخ نکاح کا اختیار ہے۔

۲۔ جس طرح حکمین کو تفریق کا اختیار ہے اسی طرح قاضی کو بھی اختیار ہے، اس رائے کے قائلین درج ذیل ہیں:

مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مفتی نذیر احمد قاسمی کشمیری صاحب لکھتے ہیں کہ حکمین کو خود مختار قاضی بناتا ہے، وہ خود

بے اختیار کیسے ہوگا، کشمیری صاحب رقم فرماتے ہیں: حقیقت حال معلوم ہو تو قاضی خود فیصلہ کر سکتا ہے، دراصل حکمین کا تقرر تو وجوہات شقاق معلوم کرنے کی غرض سے ہوتا ہے، مولانا خورشید انور اعظمی کی رائے ہے کہ عورت اگر ضرر ثابت نہ کر سکے تو تقرر ہوگا، ورنہ نہیں، مولانا منصف امروہوی اور مولانا ولی اللہ مجید قاسمی کی بھی یہی رائے ہے، مولانا اعظمی نے استدلال میں "کتاب الکافی فی فقہ اہل المدینۃ المالکی" (۲۰۵۹۶) کی یہ عبارت: ''وللزوجين أن يبعثا الحكمين دون السلطان، فإن كان الظلم من الزوج فرقا بغير شئ''، نیز جلد مذکور صفحہ مذکورہ سے ایک دوسری تحریر: ''إذا ساء ما بين الزوجين وتفاقم أمرهما وتكرر شكواهما ولا بينة مع واحد منهما ولم يقدر على الإصلاح بينهما بعث الإمام أو القاضي أو الحاكم إن ارتفعا اليه حكمين'' پیش فرمائی ہے، موصوف نے (تبصرۃ الحکام ۲/۱۵۵، الفقہ الاسلامی ۹/۷۰۶۰) سے بھی دلائل پیش فرمائے ہیں۔

۳۔ حکمین کی کوشش کے بغیر قاضی خود فیصلہ کردے گا، مولانا عبد الخالق ندوی، مفتی اعجاز الحسن کشمیری، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا منصف امروہوی یہ رائے رکھتے ہیں، مولانا عبد الخالق ندوی تحریر کرتے ہیں: ''امام مالک کے یہاں شقاق کی وجہ سے عورت اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے، اور تفریق چاہتی ہو تو قاضی تفریق کرادے گا، موصوف نے ''الشرح الصغیر'' (۲/۵۱۲) کا صرف حوالہ دیا، عبارت پیش نہیں کی، اس عاجز نے محولہ صفحہ دیکھا تو عبارت اس طرح ہے: ''ويجب عليهما الإصلاح ما استطاعا أن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما، فإن تعذر الإصلاح طلقا أي حكما بالطلاق ونفذ حكمهما ظاهرا وباطنا، وإن لم يرضا أي الزوجان بحكمهما أولم يرضي الحاكم به'' (الشرح الصغیر علی اقرب المسالک الی مذہب الامام مالک ۲۰۵۱۲)، واضح ہو کہ ندوی صاحب کا بیان کردہ مطلب اس عبارت سے نہیں نکل رہا ہے، مولانا منصف امروہوی نے استدلال میں دکتور وہبہ زحیلی کی تحریر: ''إذا ادعى أحد الزوجين إضرار لآخر به جاز له طلب التفريق من القاضي وإذا ثبت الإضرار وعجز القاضي عن الإصلاح فرق بينهما وذلك بطلقة بائنة'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲۰۵۲۹) پیش فرمائی ہے، موصوف کی یہ رائے اثبات ضرر کی صورت میں تو درست ہے، ورنہ نہیں (دیکھئے: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۵۲۹)۔

۴۔ ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں: ''تفریق کا حق قاضی کو ہے اور حکمین کو اس وقت جبکہ قاضی یہ اختیار ان کو تفویض کردے، پھر موصوف اپنے مقالہ ص ۲۷ پر تحریر فرماتے ہیں: ''لہٰذا اس سمینار کو یہ طے کرنا چاہئے کہ ضرر یا شقاق کی وجہ سے تفریق کا فیصلہ حکمین بھیجنے کے بعد ہی کرنا لازم ہے، موصوف نے ائمہ کے مذاہب اس طرح رقم فرمائے ہیں: ''مالکیہ وشافعیہ کے یہاں حکمین کا بھیجنا ضروری ہے، حنابلہ کے یہاں بھی بظاہر وجوب ہے، ابن عربی مالکی لکھتے ہیں: ''إذا علم الإمام من حال الزوجين الشقاق لزمه أن يبعث إليهما حكمين ولا ينتظر ارتفاعهما'' (احکام القرآن ۱۰۵۴۳)، شیخ محمد شربینی الخطیب الشافعی لکھتے ہیں: ''(البعث واجب) وصححه في زيادة الروضة...'' (مغنی المحتاج ۲۰۲۶۱)، نیز ''الشرح الصغیر'' (۲۳۸،۵) کے حوالہ سے سپرد قلم فرماتے ہیں: ''إذا رضيا بإقامة حكم واحد بلا رفع كفى'' یعنی مرافعہ سے قبل اور بعد کے احکام جدا گانہ ہیں، آپ آگے لکھتے ہیں: زوجین کے خاندان والوں کا خود سے حکمین بھیجنا مستحب ہے، یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ حضرت انیسؓ کے واقعہ سے استدلال درست نہیں، کیونکہ اقرار وگواہی میں فرق ہے۔

۵۔ مرافعہ کے بعد قاضی کا حکمین بھیجنا ضروری ہے، اس رائے کے قائلین مولانا روح اللہ، مولانا اشرف عباس ہیں، آخر الذکر تحریر کرتے ہیں کہ اس مسئلہ میں احناف کے یہاں بھی مرافعہ کے بعد قاضی کے لئے حکمین بھیجنا ضروری ہوجاتا ہے، ''لا خلاف أن الزوج لو أقر بالإساءة إليها لم يفرق بينهما ولم يجبره الحاكم على طلاقها قبل تحكيم الحكمين'' (احکام القرآن جصاص ۲۰۱۵۲)، البتہ قاضی ابن العربی مالکی کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ مالکیہ کے یہاں تحکیم کے وجوب کے لئے مرافعہ بھی شرط نہیں ہے ''إذا علم الإمام من حال الزوجين الشقاق لزمه أن يبعث إليهما حكمين ولا ينتظر ارتفاعهما؛ لأن ما فيه من حقوق الله أثناء ما ينتظر رفعهما إليه لا جبرله'' (احکام القرآن لابن العربی ۱۰۵۴۳)۔

مولانا روح اللہ استدلال میں یہ تحریر پیش فرماتے ہیں: ''ونص جمهور فقهاء المالكية والشافعيه على أن بعث الحكمين واجب على الحاكم والقاضي، لأن بعث الحكمين محكمة غير منسوخة، فالعمل بها واجب'' (روضۃ الطالبین، التحکیم بین الزوجین فی الشقاق)۔

۶۔ تحکیم قاضی کی صوابدید پر منحصر ہے، بعض حالات میں حاکم یا قاضی تحکیم کے بغیر بھی خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے، تحکیم کے بغیر طلاق وخلع کا ثبوت عہد نبوت و قرون مفضلہ میں موجود ہے، (طلاق عبداللہ بن عمر صحیح بخاری ۵۲۵۱، طلاق فاطمہ بنت قیس صحیح مسلم ۱۲/۷۳، سنن ابی داؤد ۲۲۸۴ طلاق رکانہ سنن ابی داؤد ۲۱۹۶) (دیکھئے مقالہ مولانا کلیم اللہ عمری مدنی)۔

۷۔ جن فقہاء کے یہاں قاضی بااختیار ہے ان کے یہاں نہ تو تحکیم ضروری ہے، نہ دو حکم کا تقرر، لیکن تحکیم کا عمل اولی وافضل ہے، یہ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کا خیال ہے، ''فإذا ارتفع الزوجان المخوف شقاقهما إلى الحاكم فحق عليه أن يبعث حكما من أهله وحكما من أهلها من أهل القناعة ليكشفا أمرهما ويصلحا بينهما إن قدرا'' (کتاب الام ۵/۱۷۷) نیز وہبہ زحیلی بھی امام شافعیؒ کی طرف منسوب کر کے لکھتے ہیں: کہ قاضی کو ارسال کا جو حکم ہے وہ وجوبی ولازمی ہے (التفسیر المنیر ۵/۶۲)۔

۸۔ تفریق کا حق نہ تو حاکم کو ہے، نہ ہی اس کے مقرر کردہ حکمین کو (قائلین) مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی محمد شاہد قاسمی مدھوبنی، مولانا نعیم اختر کوپا گنج، اول الذکر نے استدلال میں ابن الہمام کی ایک عبارت پیش فرمائی ہے: ''قلنا ليس للحاكم أن يطلق ولا يبرئ من مالها. فكيف يفعل نائبه (الحكمين)'' (فتح القدیر ۴/۸۴)۔

۹۔ اگر عورت ظلم وزیادتی کو ثابت کردے تو قاضی تفریق کردے گا، اور اگر ثابت نہ کرسکے تو شوہر کو قسم پر مجبور کرے گا، اگر شوہر قسم کھالے تو بھی تفریق کردے گا (مولانا مظاہر حسین قاسمی)۔

ایک حکم کے تقرر کے سلسلہ میں تمام مقالہ نگار حضرات (چند کا استثناء کرکے) اس بات کے قائل ہیں کہ اگر ان کا تقرر زوجین نے کیا ہے تو درست ہے، قاضی وحاکم کو یہ اختیار نہیں، مفتی محمد شاہد قاسمی مہاراشٹر تحریر فرماتے ہیں کہ مالکیہ کے یہاں ایک حکم کا تقرر ضروری ہے کہ نہیں باوجود تلاش کے کوئی بات نہ مل سکی، البتہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم نے ''جدید فقہی مسائل'' میں ایک حکم کے تقرر کے سلسلہ میں امام مالک کا مسلک نقل کیا ہے کہ ایک حکم کا تقرر بھی کافی ہوگا۔ مولانا افتخار احمد مفتاحی ومولانا محبوب فروغ قاسمی کی رائے ہے کہ قاضی وحاکم کو بھی ایک اور دو کے تقرر میں اختیار ہے۔ مفتی شاہد علی قاسمی لکھتے ہیں کہ جواب ۷ کے جواب میں میرے نزدیک مالکی مسلک کی پیروی کی جائے گی، اس لئے اس سے مربوط دوسرے جزء حکم کے مسئلہ میں بھی مالکی ہی مسلک (یعنی مسلک مالکیہ کا راجح مذہب ایک حکم) اپنایا جائے گا، مولانا عبد الرب عبد الوہاب بھی مالکیہ ہی مسلک کی رائے بحوالہ ''احكام القرآن لابن العربي (۱/۴۲۷) المسئلة الرابعة عشر يجزئي ارسال الواحد الخ'' نقل کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: اگر ایک ہی حکم مقرر کرے یا زوجین ایک ہی پر راضی ہوجائیں تو درست ہے، راقم سطور نے بھی زوجین کی رضامندی سے ایک حکم کا تقرر بحوالہ (فتح القدیر ۵/۴۹۹، ہندیہ ۳/۳۹۸، اوجز المسالک ۴/۵۴۵، اعلاء السنن ۱۵/۲۸۰، الموسوعۃ الفقہیہ ۲۹/۵۶، تفسیر قرطبی ۵/۱۱۶) درست قرار دیا ہے، نیز دردیر مالکی کی بھی ایک تحریر پیش ہے: ''والآية الكريمة تفيد ذلك. لأن قوله تعالى: ''(فابعثوا) يفيد أن ذلك عند الرفع. وإنهما إذا رضيا بإقامة حكم واحد بلا رفع كفى'' (الشرح الصغیر ۵/۲۲۸)۔

مفتی اقبال احمد قاسمی لکھتے ہیں: ''قاضی کو فیصلہ خلع سے قبل یا بلاعوض تفریق کے فیصلہ کے لئے امام مالک کے نزدیک حکمین کا مقرر کرنا لازمی امر نہیں، جس صورت میں حکمین کے تقرر کی ضرورت ہے، اگر قاضی حکمین کے بجائے حکم واحد کی تحکیم کو کافی سمجھے تو مالکی مسلک میں اس کی بھی گنجائش ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم کی کتاب ''جدید معاشرتی مسائل'' (ص ۲۰۹) سے استدلال کیا ہے، مفتی محمد عثمان گورینی رقم طراز ہیں: ''زوجین اگر کسی ایک فرد کی تحکیم پر متفق ہوں تو بالاتفاق درست ہے، اسی طرح زوجین کے درمیان قرابت ہو تو قاضی وحاکم کو اس رشتہ دار کو حکم بنانا جائز ہے، اجنبی ہو تو فرد واحد کی تحکیم مختلف فیہ ہے'' (مواہب الجلیل ۵/۲۶۴، ملتقی ۴/۱۱۴) سے استدلال فرمایا ہے، یہی رائے دیگر مقالہ نگار حضرات کی بھی ہے (دیکھئے مقالہ: مفتی عبد اللہ مظاہری، مولانا محمد رمضان علی فرقانی، مولانا محمد شوکت ثناء قاسمی، مولانا محمد احسن عبد الحق ندوی)، مفتی احمد نادر القاسمی صاحب ''تفسیر المنار (۵/۱۷۹) وابو اسحاق شیرازی کی تحریر ''مغنی المحتاج'' (۳/۲۶۱) وغیرہ سے حکم کے وجوب کو بتلانے کے بعد لکھتے ہیں: ''يوفق الله بينهما'' کے تحت قاضی کے لئے خلع یا فسخ وتفریق کا فیصلہ کرنے سے پہلے حکمین یا حکم کا مقرر کرنا اور صلح کی کوشش کرنا واجب ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں دار القضاء میں فسخ وتفریق کے باب میں فیصلے سے پہلے اس طریقہ کار کو اختیار کیا جاتا ہے۔

## سوال نمبر ۷: اگر حنفیہ کے یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے تو کیا اس مسئلہ میں ضرورۃً کسی اور مسلک کی طرف عدول کیا جاسکتا ہے؟

مسئلہ مسئولہ میں چار حضرات کے علاوہ سارے مقالہ نگار حضرات عدول کے قائل ہیں، اولاً قائلین عدول کی آراء پیش ہیں: مولانا صادق مبارک پوری نے استدلال میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی تحریر بحوالہ فتاوی قاضی (ص ۱۵۰)، قاموس الفقہ (۳۶۸/۳) پیش فرمایا ہے، مولانا عبدالخالق ندوی لکھتے ہیں عدول کرنا زیادہ بہتر ہوگا، چند مسائل میں امارت شرعیہ بہار واڑیسہ مالکیہ کے مسلک پر عمل کررہی ہے، ہندوستان کے تناظر میں یہی بہتر ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے باپ ودادا کے نکاح کرنے کے باوجود نابالغ کو خیار بلوغ کا مستحق قرار دیا، حضرت رحمانی صاحب نے توجیہ یہی فرمائی ہے کہ ہندوستان کے تناظر میں قاضی شریح کی رائے کو اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے، اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ نے بھی یہی توجیہ کی ہے (جدید فقہی مسائل ۱۱۵/۳)، مولانا عبد الرب عبدالوہاب زیب قرطاس فرماتے ہیں: ۱۔ زیادہ قوی ہے، ۲۔ مصر وشام وغیرہ میں بھی یہی قانون نافذ ہے، مفتی شاہد علی قاسمی قوت دلیل کے علاوہ حالات و ضروریات کا تقاضہ، بلکہ اہم سماجی ضرورت تحریر فرماتے ہیں، مولانا منصف کے خیال میں اس کی وجہ ہندوستان میں قوت قاہرہ کا نہ ہونا ہے، جبکہ مولانا رحمت اللہ ندوی حضرت قاضی صاحب علیہ الرحمہ کی ایک تحریر پیش فرماتے ہیں: ”اس مسئلہ میں جس قول کی طرف میرا رجحان ہے، اس میں قدرے تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ تتبع رخص عام حالات میں تشہی، لہو ولعب اور خواہشات کی پیروی میں ناجائز ہے، ہاں اگر کسی خاص مسئلہ میں عذر یا مرض کی ضرورت کی بنیاد پر ہو تو مخصوص شرائط کے ساتھ جائز ہے“، اثبات دعوی میں مولانا عبدالصمد رحمانی صاحب کی کتاب ”الفسخ والتفریق“ (ص ۱۵۲ تا ۱۵۶) کی تحریریں بھی پیش فرمائی ہیں، بعدہ لکھتے ہیں کہ ”مذہب غیر پر افتاء وعمل کے جواز کے لئے اصطلاحی ضرورت مراد نہیں جس میں ہلاکت کا خطرہ ہوتا ہے، بلکہ مراد یہاں مشقت ودشواری اور مصیبت میں مبتلا ہونے کا ظن غالب ہے، موصوف نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی کی کتاب ”دوسرے مسلک پر فتوی دینے کے اصول وضوابط (ص ۴۵-۴۶)“ بحوالہ (البلاغ کراچی، مفتی اعظم نمبر ص ۴۲۰) تین مفید قیود وشرائط بھی پیش کی ہیں، جو اس مسئلہ میں مشعل راہ بن سکتی ہیں، اختصار کی غرض سے چھوڑ رہا ہوں (دیکھئے مقالہ: مولانا رحمت اللہ ندوی ص ۴۵-۴۶)۔

مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی رقم فرماتے ہیں: ”ہمارا خیال ہے کہ دلائل کی قوت کے ساتھ ساتھ مسلک مالکی شریعت سے زیادہ ہم آہنگ ہے“، مفتی محمد شاہد قاسمی کی تحریر اس طرح ہے: ”اگر جماعت مسلمین (شرعی پنچایت) کے روبرو رکھا جائے تو عدول کی گنجائش ہے“ الحاصل یہ کہ اگر ایسے شخص کی عدالت میں مقدمہ کی پیشی ہو جو قوت تنفیذ رکھتا ہو تو عدول کی ضرورت نہیں اور اگر ایسے شخص کے یہاں مقدمہ لے جایا جائے جو قوت تنفیذ نہ رکھتا ہو تو عدول کی سفارش کی جاسکتی ہے، یہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، کہ علاقہ اور عرف کے تغیر سے مجتہد فیہ احکام کا مختلف ہونا فقہاء کے یہاں مسلمہ اصول ہے، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی رقم فرماتے ہیں کہ اگر تمام اصلاحی کوششیں ناکام ہوجائیں، ان کوششوں میں حکمین کا بھیجنا بھی ہے تو اگر حکمین قاضی کو اطلاع دیتے ہیں اور تفصیلات سے آگاہ کرتے ہیں، نیز واضح کرتے ہیں کہ اسباب کراہت شوہر میں موجود ہیں یا دونوں میں جس کی بنا پر عورت خلاصی چاہتی ہے، مرد اس پر کسی صورت راضی نہیں ہوتا تو قاضی دونوں کے مابین تفریق کردے گا، لیکن اگر اسباب کراہت عورت میں موجود ہیں جن کی بنا پر مرد خلع کرنا چاہتا ہے، عورت خلع کے لئے راضی نہیں، تو ایسے وقت میں بظاہر قاضی کو تفریق کی حاجت نہیں، بلکہ شوہر طلاق دے کر معاملہ کو ختم کردے۔

مفتی اعجاز الحسن لکھتے ہیں: ”علماء حنفیہ نے ''ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین'' کا قاعدہ بیان کیا ہے، اس کے بموجب ایسے فیصلے کی گنجائش نکلتی ہے، اس لئے اگر فقہ مالکی اور جزئیات علماء حنفیہ کی روح کو سمجھا جائے تو یہ صورت بالکل قابل عمل قرار پائے گی“، مولانا مفتی محمد جعفر ملی کی رائے یہ ہے کہ اگر عورت جائز شکایات کی بنا پر شوہر سے تنگ آکر تفریق کا مطالبہ کرتی ہے تو حنفی قاضی معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر امام مالک کے مسلک پر ان کی تصریحات کے مطابق فیصلہ دے سکتا ہے، استدلال میں فقیہ ابو اللیث سمرقندی کا قول جسے علامہ شامی نے (۶۵۲/۹) پر ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے: ''مافی حاشیة ابن عابدين وذكر الفقيه أبو الليث في تأسيس النظائر أنه إذا لم يوجد في مذهب الإمام قول في مسئلة يرجع إلى مذهب مالك، لأنه أقرب المذاهب إليه'' نقل کیا ہے، مفتی احمد نادر القاسمی کی تحریر عرض ہے: ”چونکہ قضاء کے باب میں حنفیہ نے دوسرے مذاہب بالخصوص مفقود الخبر کے سلسلہ میں مالکیہ کے قول کو اختیار کیا ہے، اسی طرح اقامت دعوی اور ثبوت بینہ کے بعد عدالت میں مدعی علیہ کی غیر حاضری میں مقدمہ کی کارروائی اور فیصلہ کو حنفیہ نے درست نہیں قرار دیا ہے، مگر شافعیہ نے مدعی علیہ کی حاضری کو اس کے لئے شرط نہیں قرار دیا ہے، مقدمہ کی کارروائی میں تاخیر کے پیش نظر، چونکہ عام طور سے مدعی علیہ کی جانب سے ٹال مٹول کا مشاہدہ ہے، امام ابو یوسفؒ کا بھی یہی قول ہے، حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب علیہ الرحمہ نے ”جامع الفصولین“ کے حوالہ سے اسلامی عدالت (۳۸۴/۱) پر بھی تحریر فرمایا ہے: ”جامع الفصولين من الخانية غاب المدعى عليه بعد ما برهن عليه

أو غاب الوکیل بعد ثبوت البینة قبل التعدیل أو مات الوکیل ثم عدلت تلك البینة لا یحکم بھا. وقال أبو یوسف یحکم بھا''پیش فرما کر نادر صاحب لکھتے ہیں: ''اس لئے اس باب میں اگر ضرورت داعی ہو تو شافعیہ جو خلع کے باب میں زیادہ وسعت کے قائل ہیں ان کی رائے اختیار کر کے خلع کا فیصلہ کرنے کا اختیار قاضی کو دیا جائے، بالخصوص جبکہ عورت بینہ پیش کرنے سے قاصر ہو اور قاضی کی رائے میں اگر تفریق نہ کی گئی تو کسی ایک کے بڑے مفسدہ میں پڑ جانے کا قوی امکان ہو تو دفع ضرر و رفع ظلم جو کہ قاضی کا فریضہ ہے بروئے کار لاتے ہوئے شوہر کی رضامندی کے نہ ہونے کے علی الرغم علاحدگی کا فیصلہ کردے''...... قاضی کو اس بات کا خطرہ بھی محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مرد عدالتی کارروائی کرے گا، اگر عدالتی کارروائی کرتا بھی ہے تو چونکہ اپریل ۲۰۰۶ء سے تحفظ قانون خواتین ایکٹ نافذ ہے، اس لئے قاضی جو لکھ کردے گا عدالت بھی اس کی پابند ہوگی، نیز نادر صاحب نے یہ مسئلہ بھی اٹھایا ہے کہ ہندوستان جیسے ممالک میں جہاں قوت قاہرہ نہیں ہے، شوہر کو حاضر کرنا اور اس کے لئے افراد متعین کرنا ایک بڑا چیلنج ہے اور اس شرط کی بنیاد پر نظام قضاء معطل ہو کر رہ جائے گا، اس لئے حکم کے مسئلہ کو۔ جو ایک تفسیر کے بموجب مندوب اور مستحب ہے، نیز حضرت عمرؓ کے عمل سے بھی ثابت ہے، جو بجائے خود حجت ہے: ''ذھب جمھور الفقھاء إلی جواز الخلع بحاکم أو بلا حاکم وھو قول عمرؓ فقد روی ابن أبي شیبة عن طریق خیثمة بن عبد الرحمن موصولا أن بشر بن مروان أتي في خلع کان بین الرجل وامرءة فلم یجزه. فقال له عبد الله بن شھاب الخولاني قد أتي عمر في خلع فأجازه، ولأن الطلاق من حیث النظر جائز بلاحاکم فکذلك الخلع'' (موسوعه فقهیه ۱۹٫۲۴۴)، اور یہ بھی سوچا جائے کہ اگر حکم بنانا دشوار ہو تو کیا کیا جائے؟ لیکن چونکہ یہ مسئلہ قرآن میں صراحت کے ساتھ موجود ہے، اس لئے اس بات کی تحقیق ضروری ہے کہ حکم کا مقرر کیا جانا اور بھیجنا اجتہادی ہو سکتا ہے یا نہیں، اور سلف بطور خاص قاضی ابو یوسف اور قاضی شریح رحمہا کے یہاں کیا معمول رہا ہے اور وہ ممالک جہاں مسلمانوں کے لئے قوت قاہرہ نہیں ہے ان ملکوں میں اس کی رعایت ہو سکتی ہے یا نہیں؟''۔

بہر حال عارض کا یہ خیال ہے کہ ضرورۃ مالکی مسلک کی طرف عدول کی گنجائش صاحب مذہب کی شروط معتبرہ کے مطابق اجتماعی غور و خوض کے بعد ملنی چاہئے، بشرطیکہ ضرورت شدیدہ داعی ہو تلفیق لازم نہ آئے۔

## جن حضرات کے یہاں عدول کی گنجائش نہیں ہے:

مولانا خورشید انور اعظمی لکھتے ہیں: ''شقاق ایسی صورت نہیں کہ مسلک حنفیہ کو چھوڑ کر مالکی مسلک پر عمل کرنے کا حکم دیا جائے، ورنہ شقاق کا دائرہ عام ہوتا جائے گا، اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی شقاق کے دائرہ میں رکھ کر فسخ نکاح کا مطالبہ کیا جائے گا، حضرت تھانویؒ نے ''الحیلۃ الناجزۃ'' میں جو احتیاط کے ساتھ گنجائش پیدا کی وہ کم نہیں ہے، اگر شقاق کے سبب تفریق ناگزیر ہو تو مسلک حنفیہ کے مطابق ہی اس کا حل بذریعہ توکیل نکالا جا سکتا ہے، موصوف اسباب فسخ مہیا نہ ہونے تک صبر کی تلقین نقل کرتے ہیں: '' إذا ابغضته وھو محسن إلیھا فإنه یطلب منه الفرقة من غیر یلزم بذلك. فإن فعل وإلا امرت المرأة بالصبر علیه إذا لم یکن مما یبیح الفسخ'' (فتاوی ابن تیمیه ۲۲٫۲۸۳ مطبوعه مجمع الملك فهد للطباعة مصحف الشریف ۱۹۹۵)۔

مولانا محمد یوسف آسام لکھتے ہیں: ''محض عورت کی ناپسندیدگی کی وجہ سے کسی بھی فقہ میں فسخ نکاح کی اجازت نہیں، لہٰذا عدول کی گنجائش نہیں، موصوف نے قرآن کی آیت ''الرجال قوامون علی النساء'' کی تفسیر (احکام القرآن ۲٫۲۶۸) سے پیش فرمائی ہے: ''إلا قیامھم علیھن بالتأدیب والتدبیر والحفاظ والصیانة لما فضل الله به الرجل علی المرءة في العقل والرأی وبما ألزمه الله من الإنفاق علیھا فدلت الآیة علی معان أحدھا تفضیله علی المرأة في المنزلة وإنه ھو الذي یقوم بتدبیرھا وتأدیبھا وھذا یدل علی أن له إمساکھا في بیته، ومنعھا عن الخروج، وأن علیھا طاعته وقبول أمره مالم تکن معصیة'' (احقر پر واضح نہ ہو سکا کہ دعوی دلیل میں کیا مطابقت ہے)۔

مولانا نعیم اختر صاحب لکھتے ہیں: ''مسلک مالکی کی طرف عدول کرنے میں فائدہ کے مقابلہ نقصان زیادہ ہے: ۱۔ شقاق کی وجہ سے ملنے والے اختیار کا غلط استعمال کریں گی، جھوٹا الزام عائد کر کے چھٹکارہ حاصل کر کے اپنے من پسند عاشقوں کے پاس جانا چاہیں گی، ۲۔ بعض متجددین جو جبری خلع کے قائل ہیں ان کو شقاق کے باعث تفریق کے فیصلہ سے اپنے دعوی میں سند مل جائے گی، اس لئے بغیر توکیل حکمین وہ طلاق یا خلع کا فیصلہ نہیں کر سکتے''، موصوف کے پہلے نقصان کے تحت عرض ہے کہ حکمین آخر کس مقصد کے لئے ہوں گے، دوسری بات یہ کہ اس طرح کی عورتوں کو جبراً ایک کھونٹے میں باندھے رکھنے سے ان کی روش

میں کچھ فرق آجائے گا؟ اس لئے میرے خیال میں اس نقصان کی حیثیت "الفرار الی ما منہ الفرار" کے سوا کچھ نہیں۔

علامہ شعرانی کی ایک تحریر پیش ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تنفر اور ناپسندیدگی بھی تفریق کا باعث ہے: ''اتفق الأئمة على أن المرأة إذا كرهت زوجها بقبح منظر أوسوء عشرة جاز لها أن تخالعه على عوض، وإن لم يكن في ذلك شئ وتراضيا على الخلع من غير سبب جاز، ولم يكره خلافا للزهري وعطاء وداؤد في قولهم إن الخلع لا يصح في هذه الحالة؛ لأنه عبث والعبث غير مشروع'' (الميزان الكبرى ۲، ۱۱۹)، بے شک حضرت تھانویؒ نے امت مسلمہ کے لئے آسانی کی راہ اور گنجائش نکالی ہے، لیکن اگر آج فقہ اکیڈمی اجتماعی غور وخوض کے بعد مذاہب اربعہ کے حدود میں رہتے ہوئے مزید کچھ سہولیات پیدا کرتی ہے تو اس میں کیا برا ہے، ''يريد الله بكم اليسر... الخ'' ''الدين يسر''، ''يسرا ولا تعسرا الخ'' قیامت تک کے لئے ہے، حضرت امام اعظمؒ کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی، امام محمدؒ کی ۱۸۹ھ میں، دونوں حضرات کی وفات کے درمیان ۳۹ سال کا فاصلہ ہے، پھر بھی امام محمدؒ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ اگر آج امام اعظمؒ ہوتے تو کوفہ میں دو نخل کی بیع و شراء کا چلن دیکھ کر جواز کا فتوی دے دیتے، حضرت تھانوی کی وفات ۱۳۶۲ھ میں ہوئی، آج اکہتر سال ہونے کو ہیں، اس دوران کیا کیا انقلابات ہوگئے، علامہ سرخسی تحریر فرماتے ہیں: ''النصوص معدودة والحوادث ممدودة'' (المبسوط ۱۶، ۶۲)، دکتور عمر حسن کاسولے فرماتے ہیں: ''ماضی میں جو مسائل پیدا ہوئے ان کے حل کے لئے نصوص اور قیاس کی طرف مراجعت کافی تھی...... لیکن اس وقت موجودہ عہد میں مسائل زیادہ بھی ہیں اور پیچیدہ بھی...... اس طرح کے مسائل کے لئے ہمیں بہر حال مقاصد شریعت کا سہارا لینا ہوگا (قتل بجذبہ رحم دماغی موت ر ۳۲۵-۳۲۶)، پھر یہ کہ شافعیہ کا جو دوسرا قول ہے، وہ مالکیہ کے مطابق ہے، متعدد فقہاء شافعیہ نے اسے قبول کیا ہے، گو کہ وہ مرجوح ہے ''واختاره جمع'' (زاد المحتاج ۳، ۳۲۲)، حنابلہ کی دوسری رائے نقل کر کے علامہ مقدسی لکھتے ہیں: ''والثانية أنهما حاكمان ولهما أن يفعلا مايريانه من جمع وتفريق بعوض وغير عوض ولا يحتاجان إلى توكيل الزوجين ورضاهما'' (الشرح الكبير مع المقنع والانصاف ۲۱، ۴۷۰)، ابن ہبیرہ علامہ زرکشی وشیخ تقی الدین حنبلی نے اسی قول کو مختار کہا ہے (دیکھئے مقالہ: مفتی شاہد علی قاسمی ص ۱۱)۔

فقہ مالکی کے مطابق فیصلہ نہ کرنے کی صورت میں اس سے پیدا ہونے والے عواقب ونتائج پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے، آج کل اخبارات میں ایسی خبریں بکثرت ملتی ہیں کہ عورتوں نے اپنے کو جلا ڈالا، خودکشی کر لی وغیرہ وغیرہ، اس مسئلہ کو زوجین کی حد تک محدود نہ رکھا جائے، بلکہ سماجی اعتبار سے غور کیا جائے کہ جس شوہر کے ذہن ودماغ میں یہ بات رچ بس چکی ہو کہ جمہور کے یہاں اس کا کوئی حل نہیں، زیادہ سے زیادہ افہام وتفہیم اور بس۔ تو پھر سماج پر اس کا کیا اثر ہوگا، کیونکہ وہ چھپ چھپا کر ظلم وتعدی سے باز نہ آئے گا، شیخ مصطفی الزرقاء نے اپنی وقیع کتاب ''المدخل الفقهي العام'' میں لکھا ہے کہ کبھی زمانہ میں تبدیلی اجتہادی فقہی تبدیلی کا سبب ہوتی ہے، یعنی یہ تبدیلی اخلاق میں بگاڑ، ورع وتقوی کے فقدان اور شعبہ احتساب کے کمزور پڑنے کی وجہ سے جسے فساد زمانہ کہا جاتا ہے...... مسائل وغیرہ کے پیدا ہونے سے پیدا ہوتی ہے (عصر حاضر میں فتوی کی تبدیلی کے اسباب ص ۶۷)۔

ڈاکٹر قرضاوی صاحب اپنے فتاوی میں لکھتے ہیں: ''عمر بن عبد العزیزؒ جب مدینہ کے والی تھے تو ایک شخص کی گواہی اور مدعا علیہ کی قسم کی بنیاد پر فیصلہ کر دیا کرتے تھے، لیکن جب شام میں گئے تو اس کو چھوڑ دیا، پوچھا گیا آپ مدینہ میں تو اس کے قائل تھے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ شام کے لوگوں میں وہ امانت داری نہیں جو مدینہ کے لوگوں میں تھی (مذکورہ صفحہ پر یہ بات بھی نظر نواز ہو)، ڈاکٹر صاحب اپنے اس فتاوی میں جس کا ترجمہ ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی صاحب نے کیا ہے اور اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) سے شائع بھی ہوئی ہے، لکھتے ہیں: ''پرانے زمانے میں تو یہ تھا کہ اگر کوئی عورت کسی مرد کے ساتھ رہنے پر تیار نہ ہو تو اس آدمی کا ایمان اور اس کی غیرت تقاضہ کرتی تھی کہ وہ بھی اس عورت کے ساتھ نہ رہے، لیکن ہمارے زمانے میں ایسا ہوگیا ہے کہ لوگ عورت کو اس کی مرضی کے خلاف بھی اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کرتے ہیں، اس کا مقصد تو کبھی اس سے بدلہ لینا ہوتا ہے، تو کبھی اس کو ستانا، حالانکہ دونوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ شوہر معاوضہ لے کر اس کو آزاد کر دے'' (عصر حاضر میں فتوی کی تبدیلی کے اسباب ص ۸۰)۔

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ خود مجتہد مطلق مستقل اور مجتہد مطلق منتسب نے بھی مذہب غیر پر عمل کیا ہے، کتب فقہ وفتاوی میں اس کے نظائر موجود ہیں (دیکھئے: مقالہ ظفر الاسلام صدیقی)۔

☆☆☆

اکیڈمی کا فیصلہ

# بابت شقاق بین الزوجین

عصر حاضر میں پیدا ہونے والے مسائل کے حل کے لئے قائم ادارہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا اکیسواں انٹرنیشنل فقہی سمینار مشہور تجارتی شہر اندور کے قریب جامعہ اسلامیہ بنجاری میں بتاریخ ۹۔۱۱ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ مطابق ۳۔۵ مارچ ۲۰۱۲ء منعقد ہوا، سمینار میں کشمیر سے لے کر کیرالہ تک پورے ملک سے تقریباً ۳۰۰ اسلامی اسکالرس اور مفتی وقاضی حضرات کے علاوہ مصر، برطانیہ، ماریشس، جنوبی افریقہ، امریکہ اور کناڈا کے نمائندوں نے بھی شرکت کی، اس سمینار کے لئے مروجہ انشورنس کے متبادل نظام تکافل، اہم ترین بین الاقوامی مسئلہ نشہ آور اشیاء کی تیاری اور استعمال کے سد باب، اور زوجین کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کے حل کے سلسلہ میں بحث کی گئی جس میں باتفاق رائے شقاق بین الزوجین کے سلسلہ میں درج ذیل تجاویز منظور کی گئیں:

۱۔ اسلام میں نکاح ایک پاکیزہ اور مقدس رشتہ ہے، اور شریعت چاہتی ہے کہ اس رشتہ میں حتی المقدور دوام واستحکام ہو، اس لئے کسی واقعی معتبر سبب کے بغیر مرد کا طلاق دے دینا یا عورت کا خلع کا مطالبہ کرنا انتہائی ناپسندیدہ اور مذموم عمل ہے؛ اس لئے شوہر و بیوی کو چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو اس رشتہ کو ٹوٹنے سے بچائیں، اور اگر کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو قرآن مجید نے ایسے نزاعات کو حل کرنے کے لئے جو تدابیر ذکر کی ہیں ان کو اختیار کریں، اور ایک دوسرے کے ساتھ تحمل اور عفو و درگذر سے کام لیں۔

۲۔ اگر زوجین کے تعلقات خوشگوار باقی نہ رہیں، نکاح کے مقاصد سکون اور باہمی محبت ومودت فوت ہونے لگیں اور بیوی طلاق کا مطالبہ کرے تو شوہر کو چاہئے کہ طلاق دے دے، محض ایذا رسانی کی غرض سے اسے معلق بنا کر نہ رکھے، اور اگر شوہر طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو بیوی خلع کا مطالبہ کرسکتی ہے اور ایسی صورت میں شوہر کو چاہئے کہ خلع قبول کر کے عورت کو آزاد کردے۔

۳۔ زوجین کے درمیان ایسی تلخی جس کی وجہ سے موافقت مشکل نظر آئے اسے "شقاق" کہتے ہیں۔

۴۔ زوجین کے اولیاء کا بھی فریضہ ہے کہ وہ شقاق کی صورت میں ان کے درمیان صلح کرانے اور باہمی اختلافات کو دور کرنے، نیز دونوں کو حدود اللہ پر قائم رکھنے کی کوشش کریں۔

۵۔ اگر زوجین کے درمیان شقاق پیدا ہو جائے اور بیوی شوہر کے ساتھ رہنے پر بالکل آمادہ نہ ہو تو قاضی اولاً صلح کرانے کی پوری کوشش کرے، اگر صلح نہ ہو پائے تو خلع کرانے کی سعی کرے۔

۶۔ شقاق کی صورت میں ہر ممکن کوشش کے باوجود کوئی حل نہ نکل سکے تو قاضی کے لئے ضرورتاً ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے مسلک کے مطابق ان کی شروط معتبرہ کے ساتھ نکاح فسخ کرنے کی گنجائش ہے۔

☆☆☆

# باب دوم تفصیلی مقالات

# شقاق کی بناء پر خلع وتفریق

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی[1]

نکاح نسل انسانی کی افزائش عصمت وعفت کی حفاظت، دل ودماغ کے سکون کا ذریعہ اور فطرت کی آواز ہے، شریعت اسلامی چوں کہ انسان کی فطری ضرورتوں کو پوری کرنے کی ضامن ہے؛ اس لئے اس نے نکاح کی ترغیب دی ہے، تجرد کی زندگی کو ناپسند کیا ہے، وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ رشتہ نکاح میں دوام واستحکام ہو اور جب دو مرد وعورت ایک بار رشتہ ازدواج سے منسلک ہوجائیں تو پھر اسے آخری دم تک نباہنے کی کوشش کریں؛ لیکن بعض اوقات مزاج کی عدم مناسبت، ماحول کے فرق یا کسی اور وجہ سے یہ رشتۂ محبت نفرت میں تبدیل ہونے لگتا ہے، ایسے مواقع پر رشتہ کا ختم کردینا اس کے رکھنے سے بہتر ہوتا ہے؛ تاکہ دونوں فریق اضطراب، بے سکونی اور ناآسودگی کے ماحول سے باہر نکل کر اپنے لئے نئے گھر آباد کرلیں۔

شریعت میں بحیثیت مجموعی علاحدگی کی چھ صورتیں ہیں: طلاق، خلع، متارکہ، لعان، ایلاء اور فسخ نکاح، یہ چھ صورتیں مختلف نوعیتوں کے اعتبار سے ہیں، ورنہ تو بنیادی طور پر علاحدگی کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک: طلاق، دوسرے: فسخ نکاح، نکاح کبھی قاضی کے ذریعہ فسخ ہوتا ہے اور کبھی مانع نکاح کے پیدا ہوجانے کی وجہ سے از خود فسخ ہوجاتا ہے، طلاق کی متعدد شکلوں میں سے ایک خلع ہے، خلع میں دو باتیں وہ ہیں، جو اس کو علاحدگی کی دوسری شکلوں سے ممتاز کرتی ہیں، ایک یہ کہ اس میں شوہر ہی طلاق دیتا ہے؛ لیکن دونوں فریق کی رضامندی شامل ہوتی ہے، دوسرے: بیوی طلاق کے عوض یا تو کوئی مال ادا کرتی ہے یا اپنے کسی مالی حق سے دستبردار ہوتی ہے، اُصولی طور پر اس کے درست ہونے میں فقہاء کا اتفاق ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ بعض اوقات شوہر طلاق دینے کو تیار نہیں ہوتا، اسباب فسخ یا تو موجود نہیں ہوتے یا بیوی اس کو ثابت کرنے کے موقف میں نہیں ہوتی، اس کے نتیجے میں سخت اختلاف اور نفرت کا ماحول پیدا ہوجاتا ہے، رشتۂ نکاح باقی رہتا ہے؛ لیکن نکاح کے مقاصد فوت ہوجاتے ہیں، ایسی صورت میں مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کیا تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے؟...... اس سلسلہ میں قرآن مجید کی یہ آیت ہماری رہنمائی کرتی ہے:

''وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَماً مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحاً يُوَفِّقِ اللهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللهَ كَانَ عَلِيماً خَبِيراً'' (النساء: ۳۵)۔

(اگر تم کو ان دونوں کے درمیان شدید اختلاف کا اندیشہ ہو تو ایک ایک حکم مرد وعورت کے خاندان سے بھیجو، اگر وہ دونوں اصلاح حال چاہیں گے، تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردیں گے، اللہ تعالیٰ تمام باتوں سے باخبر اور واقف ہیں)۔

## حکم کے اختیارات

اس آیت کے مخاطب حکام وامراء ہیں، یہی حضرت عبد اللہ بن عباس امام مجاہد اور جمہور کا قول ہے؛ چنانچہ علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

''الجمهور من العلماء على أن المخاطب بقوله: ''وإن خفتم'' الحكام والأمراء، وأن قوله: ''إن يريدا إصلاحاً يوفق الله بينهما'' يعني الحكمين، في قول ابن عباس ومجاهد وغيرهما، أي: إن يريدا

[1] ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

إصلاحاً يوفق الله بين الزوجين'' (الجامع لاحكام القرآن: ۵،۱۷۵)
چنانچہ حنفیہ، مالکیہ، حنابلہ اور معتمد تر قول کے مطابق شوافع حاکم پر اس بات کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ وہ ایسی صورت میں اپنی طرف سے حَکَم بھیجے، یہ اس کی ذمہ داری ہے (دیکھئے: أحکام القرآن للجصاص: ۲/۱۹۰، أحکام القرآن لابن العربی: ۱/۱۴۵، المغنی مع الشرح الکبیر ۸/۱۶۶، نہایۃ المحتاج: ۶/۳۹۲)۔

اب سوال یہ ہے کہ حکمین صرف زوجین کے درمیان موافقت ہی پیدا کرنے کی کوشش کریں گے یا اگر انھوں نے مناسب سمجھا کہ دونوں میں تفریق کردی جائے تو انھیں شوہر کی رضامندی کے بغیر بھی تفریق کرنے کی اجازت ہوگی؟ اس سلسلہ میں علامہ قرطبی کا بیان ہے:

''... وإن كان غير ذلك ورأيا الفرقة فرّقا بينهما، وتفريقهما جائز على الزوجين، وسواء وافق حكم قاضي البلد أو خالفه، وكلهما الزوجان بذلك أو لم يؤكلاهما. والفراق في ذلك طلاق بائن. وقال قوم: ليس لهما الطلاق مالم يؤكلهما الزوج في ذلك ... وهذا أحد قولي الشافعي. وبه قال الكوفيون، وهو قول عطاء وابن زيد، والحسن، وبه قال أبوثور. والصحيح الأول. وأن للحكمين التطليق دون توكيل''۔

''وهو قول مالك والأوزاعي وإسحاق، وروي عن عثمان وعلي وابن عباس وعن الشعبي والنخعي. وهو قول الشافعي'' (الجامع لأحكام القرآن: ۵،۱۷۶)۔

فقہاء مالکیہ نے اس نقطۂ نظر کو زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہے؛ چنانچہ علامہ ابن عبدالبر کی وضاحت بھی قابل ملاحظہ ہے:

''وإذا بعث الإمام الحكمين وأمرهما بالإصلاح فإن عليهما أن يسعيا في الإصلاح جهدهما. فإن رأيا أن يجمعا جمعا، وتفريقهما جائز على الزوجين، وسواء وافق حكم قاضي البلد أو خالفه. وكلهما الزوجان بذلك أو لم يؤكلاهما'' (الكافي في فقه أهل المدينة لابن عبد البر: ۱،۲۹۴)۔

حنابلہ کے یہاں اگرچہ اس سلسلہ میں دونوں طرح کے اقوال ہیں؛ لیکن دبستانِ حنبلی کے عظیم ترجمان علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ کا رجحان اُسی رائے کی طرف ہے جو مالکیہ کی ہے؛ چنانچہ اس بات کا جواب دیتے ہوئے کہ طلاق شوہر کا حق ہے، پھر حَکَم کیوں کر طلاق دے سکتا ہے؟ فرماتے ہیں:

''ولا يمتنع أن تثبت الولاية على الرشيد، أي الزوج، عند امتناعه من أداء الحق كما يقضى الدين عنه من ماله إذا امتنع، ويطلق الحاكم على المولى إذا امتنع'' (المغني: ۱۰،۲۶۳)۔

علماء حنابلہ میں یہی رجحان علامہ ابن تیمیہ کا بھی ہے؛ بلکہ ان کی عبارت سے مترشح ہے کہ اگر حَکَم کے بجائے خود حاکم یعنی قاضی شقاق کی بناء پر خلع کا فیصلہ کردے تو یہ بھی درست ہے:

''ويصح الخلع ممن يصح طلاقه بالملك، أوالوكالة، أو الولاية كالحاكم في الشقاق، وكذا لو فعله الحاكم في الإيلاء والعنة أو الإعسار وغيرهما من المواضع التي يملك الحاكم فيها الفرقة'' (كشاف القناع: ۵،۲۱۲)۔

اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت ثابت بن قیس صاور حضرت جمیلہ کے درمیان جو خلع کا واقعہ پیش آیا، اس میں ابوزبیرص کی روایت کے مطابق خود رسول اللہا نے ان کے درمیان تفریق کردی تھی اور آپ انے حضرت ثابت صکے طلاق دینے کا انتظار بھی نہیں فرمایا:

''فأخذها له وخلى سبيلها، فلما بلغ ذلك ثابت بن قيس قال: قد قبلت قضاء رسول الله صلى الله عليه وسلم''۔

دار قطنی نے اس روایت کو بسند ثقات نقل کیا ہے (دیکھئے: فتح الباری: ۱۰/۵۰۵، اصل ماخذ کے لئے: دار قطنی: ۳/۲۵۵، باب المہر، سنن بیہقی: ۷/۳۱۴۳، باب الوجہ الذی تحل بہ الفدیۃ)۔ اسی طرح مصنف عبدالرزاق کی روایت ہے: "ففرق بينهما" (دیکھئے: فتح الباری: ۱۰/۵۰۲، تفسیر قرطبی: ۵/۱۳۹) یعنی رسول اللہا نے خود ان دونوں کے درمیان تفریق کردی، اسی طرح حضرت حبیبہ بنت سہل اور حضرت ثابت بن قیس ص والے واقعہ میں بھی یہ بات آئی ہے کہ آپ انے خود ان دونوں کے درمیان تفریق کردی: '' ... ففرق بينهما رسول الله صلى الله عليه وسلم'' (سنن ابن ماجه، كتاب الطلاق، باب المختلعه تاخذ ما آتاه، نیز دیکھئے: مسند احمد: ۴/۳) اور شعیب ارناؤوط نے اس حدیث کو حسن لغیرہ کے درجہ میں رکھا ہے۔

## احناف کے دلائل

احناف دراصل اس مسئلہ میں اس عام اُصول پر چلے ہیں کہ طلاق کا اختیار مردوں کے ہاتھ میں ہے اور خلع بھی مال کے عوض میں طلاق ہی ہے؛ اس لئے مرد کی آمادگی بہر طور ضروری ہوگی، اسی بنا پر ان کے یہاں حکمین کی حیثیت زوجین کے وکیل کی ہوتی ہے اور وہ ان ہی حدود میں رہ کر اقدام کر سکتے ہیں، جو زوجین نے متعین کر دی ہیں۔

دوسرے: ان کا استدلال سنن بیہقی میں عبیدہ سلمانیؒ سے منقول اس واقعہ سے بھی ہے، جسے علامہ ابوبکر جصاص رازی نے اپنی 'احکام القرآن' میں اور دوسرے مختلف مصنفین نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک ایسے ہی مقدمہ میں حکم متعین کئے، پھر ان حکمین سے مخاطب ہو کر ان کی ذمہ داری بتائی کہ اگر ان دونوں کو جمع کر سکو تو جمع کر دو اور ان کا ازواجی رشتہ برقرار رکھو اور تفریق وعلاحدگی مناسب محسوس ہو تو ایک دوسرے کو علاحدہ کر دو، عورت تو اس پر آمادہ ہوگئی، مگر مرد نے علاحدگی پر اپنی عدم آمادگی کا اظہار کیا، حضرت علیؓ نے مرد پر دباؤ ڈالتے ہوئے فرمایا کہ جب تک تم اس عورت کی طرح فیصلہ کی ہر دو صورت پر آمادگی کا اظہار نہ کر دو، یہاں سے ہٹ نہیں سکتے: "لا تنفلت مني حتى تقر كما أقرت" یہاں حضرت علیؓ کا مرد کو تفریق کے لئے آمادہ ہونے پر مجبور کرنا بالکل بے معنی ہوگا، اگر حکم کو بطور خود طلاق دینے کا اختیار حاصل ہو اور وہ مرد کی رضامندی حاصل کرنے کا مکلف نہ ہو (دیکھئے: السنن الکبریٰ للبیہقی، باب الحکمین فی الشقاق بین الزوجین: ۷/۴۹۸-۹۹، حدیث نمبر: ۱۴۷۸۲، نیز: أحکام القرآن للجصاص: ۲/۲۴۰، تفسیر سورۂ نساء: ۳۵)۔

## مالکیہ کے دلائل

امام مالکؒ اور جو فقہاء قاضی کی طرف سے مقرر کئے ہوئے حکمین کو تفریق اور علاحدگی کا مجاز گردانتے ہیں، ان کی بنیادی دلیل خود سورۂ نساء: ۳۵ ہے، اس آیت میں متعدد قرائن ایسے ہیں، جو امام مالکؒ کے موقف کی تائید کرتے ہیں۔

اول: جیسا کہ مذکور ہوا...... اس آیت کے مخاطب قضاۃ اور حکام ہیں، خود ابوبکر جصاص رازیؒ نے بھی یہی لکھا ہے اور قرآن مجید کے لب ولہجہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اب ظاہر ہے کہ قاضی اور حاکم کی حیثیت محض واعظ اور اخلاقی اپیل کرنے والے ناصح کی نہیں ہے؛ بلکہ اس کا منصب یہ ہے کہ جو لوگ وعظ و نصیحت کی زبان سمجھنے پر آمادہ نہ ہوں، ان کے لئے قانون اور اختیارات کی تلوار استعمال کی جائے؛ لہٰذا اگر قاضی کے مقرر کردہ حکمین کو قانونی اختیار حاصل نہ ہو تو قرآن کا قاضی کو مخاطب بنانا اور قاضی ہی کی طرف سے حکمین کی تقرری ایک بے معنی بات ہوگی؛ اس لئے قضاۃ اور حکام سے خطاب بجائے خود اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس مسئلہ میں قاضی کے نمائندہ کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہونی چاہئے کہ وہ چاہے تو مصالحت کرادے یا اپنی صوابدید پر علاحدگی کر دے۔

دوسرے: قاضی کے بھیجے ہوئے ان نمائندوں کے لئے قرآن نے 'حَکَم' کا لفظ استعمال کیا ہے، حکم کے معنی خود حکم اور فیصلہ کرنے والے کے ہیں، اگر اس کی حیثیت محض طرفین کے وکیل کی ہو اور وہ ان کے احکام کا پابند ہو تو وہ حکم اور فیصل کہاں باقی رہا، اس تعبیر کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ وہ تفریق اور مصالحت کے معاملہ میں خود مختار ہوں گے؛ چنانچہ قاضی ابوبکر ابن العربی اس آیت کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"هذا نص من الله ... سبحانه ... في أنهما قاضيان، لا وكيلان، وللوكيل اسم في الشريعة ومعنى، وللحكم اسم في الشريعة ومعنى" (احکام القرآن: ۱/۴۲۴)۔

تیسرے: قرآن نے یہاں " إن يريدا إصلاحاً " کہا ہے (اگر حکمین ان دونوں میں مصالحت کرانا چاہیں)، یہاں حکمین کی طرف 'ارادہ' اور 'چاہنے' کی نسبت کی گئی ہے اور ایسی بات اسی کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جو کسی کام کے کرنے اور اس کے خلاف اقدام کرنے کا اختیار رکھتا ہو، جو شخص کسی کا وکیل ہو، وہ ارادہ واختیار کا مالک نہیں ہوتا، وہ خاص اسی کے حکم کا پابند ہوتا ہے؛ چنانچہ اگرچہ شوافع کے یہاں راجح قول وہی ہے، جو حنفیہ کا ہے (دیکھئے: روضۃ الطالبین: ۷/۳۷۱، کتاب عشرۃ النساء) لیکن خود فقہاء شوافع میں علامہ عمرانی نے مالکیہ کے نقطۂ نظر کو 'اشبہ بالقرآن' یعنی قرآن مجید سے قریب تر قرار دیا ہے (البیان: ۹/۵۳۳) نیز اگرچہ فقہاء حنابلہ کی ایک بڑی تعداد کے مطابق وہ قول راجح ہے، جو حنفیہ نے اختیار کیا ہے، جیسا کہ علامہ بیضاوی نے نقل کیا ہے (دیکھئے: الانصاف مع المقنع والشرح الکبیر: ۲۱/۴۷۹، باب عشرۃ النساء) لیکن خود فقہاء حنابلہ میں علامہ زرکشی اس دوسرے قول کو ظاہر قرآن سے ہم آہنگ قرار دیتے ہیں: " وهو ظاهر الآية الكريمة" (الانصاف مع المقنع والشرح الکبیر: ۲۱، ۴۸۲، باب عشرۃ النساء)۔

## احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اب آیئے ان احادیث کی طرف جو اس مسئلہ میں مالکیہ کی مستدل ہیں:

(۱) امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ثابت بن قیس ص کی بیوی حضورا کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ا! مجھے ثابت بن قیس ص کے دین واخلاق سے کوئی شکایت نہیں ہے؛ لیکن مجھے یہ بات بھی پسند نہیں ہے کہ مسلمان ہو کر کسی کی ناشکری کروں ''أکرہ الکفر فی الاسلام'' یعنی ایک طرف ثابت ص کا میرے ساتھ اچھا سلوک ہے، دوسری طرف میرا ان کی طرف طبعی رجحان نہیں ہے، جس کے باعث میری طرف سے ان کی ناقدری ہوتی ہے؛ اس لئے ہم دونوں میں علاحدگی کرادی جائے، آپ انے حضرت ثابت سے فرمایا کہ باغ لے لو اور اس کو طلاق دے دو ''اقبل الحديقة وطلقها تطليقة'' (صحيح بخاري: ۲،۷۹۴، باب الخلع وكيف الطلاق فيه)۔

اور ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ حضورانے ان کو حکم دیا؛ لہٰذا انھوں نے بیوی کو علاحدہ کردیا: ''امرہ ففارقھا'' امام بخاری کی ایک اور روایت اور نسائی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام جمیلہ بنت عبداللہ بن ابی بن سلول تھا اور ابوالزبیر کی روایت میں زینب بنت عبداللہ بن ابی بن سلول کا ذکر ہے۔

اس حدیث میں واقعہ کا یہ پہلو قابل توجہ ہے کہ حضورانے حضرت ثابت ص سے اپیل نہیں کی، نہ مشورہ کیا؛ بلکہ طلاق دینے کا حکم فرمایا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ قاضی مرد کی رضامندی اور آمادگی معلوم کرنے کا پابند نہ ہوگا؛ بلکہ حسب ضرورت اس کو اپنی صوابدید پر نافذ کرے گا، اب اس کے نافذ کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ خود مرد اس بات کے لئے تیار ہوجائے اور طلاق دے دے، جیسا کہ اس واقعہ میں ہوا، یا قاضی حکمین کو مقرر کردے اور وہ علاحدگی کے فیصلہ پر متفق ہوجائیں، یا پھر قاضی خود علاحدہ کردے۔

(۲) دوسرا واقعہ بھی حضرت ثابت ص ہی کا ہے، جسے ابوداؤد نے سیدنا حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے کہ حبیبہ بنت سہلؓ ثابت بن قیسؓ کے نکاح میں تھیں، ثابت ص نے حبیبہؓ کو اس قدر مارا کہ ان کا کوئی عضو ٹوٹ گیا، حبیبہ رضی اللہ عنہا حضورا کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور شوہر کی شکایت کی، آپ انے ان کو بلایا اور فرمایا ''حبیبہؓ کے مال میں سے کچھ لے کر اس کو رہا کردو'' ثابت بن قیس ص نے دریافت کیا: ''کیا یہ درست ہوگا؟'' آپ انے فرمایا: ہاں، ثابت ص نے کہا: میں نے اس کو دو باغ دیئے ہیں، جو اسی کے قبضہ میں ہیں، آپ انے فرمایا: اس کو لے کر حبیبہ کو چھوڑ دو ''خذھا وفارقھا'' چنانچہ ثابت نے ایسا ہی کیا (ابوداود: ۱ر ۳۰۳، باب فی الخلع)۔

ابن ماجہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حبیبہ بنت سہل کو اصل میں ان کی شکل وصورت سے کراہت تھی اور یہ ناپسندیدگی اس درجہ تھی کہ ان کے الفاظ میں ''اگر خدا کا خوف نہ ہوتا تو جب انھوں نے مجھ سے قربت کی، میں ان کے منھ پر تھوک دیتی: '' والله لولا مخافة الله اذا دخل علیّ لبصقت فی وجهه'' (ابن ماجہ: ۴۸، باب المختلعة، ياخذ مااعطاها) ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی بیویوں ...... حبیبہ اور جمیلہ ...... دونوں ہی کو اصل شکایت ثابت ص کی صورت سے تھی، جیسا کہ حضرت جمیلہ کا بیان گذر چکا ہے کہ مجھے ان کے دین واخلاق سے شکایت نہیں ہے؛ البتہ ہوسکتا ہے کہ اس ناپسندیدگی کی وجہ سے حبیبہؓ سے کوئی ایسی بات سرزد ہوگئی ہو، جس نے ثابت ص کو مشتعل کردیا ہو اور انھوں نے مارا ہو، جس میں ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے ہوں...... اس واقعہ میں بھی آپ انے ثابت ص سے کوئی سفارش اور اپیل نہیں کی اور ان سے طلاق پر رضامندی بھی نہیں معلوم کی؛ بلکہ حالات کو پیش نظر رکھ کر خود فیصلہ فرمایا کہ وہ مہر واپس لے لیں اور طلاق دے دیں۔

حضرت ابوسعید خدری ص کی بہن نے اپنے شوہر کی اور شوہر نے ان کی رسول اللہ اسے شکایت کی، آپ انے دونوں کی باتیں سننے کے بعد بیوی کو حکم دیا کہ شوہر نے مہر کے طور پر جو باغ دیا ہے، وہ اسے واپس کردیں اور شوہر کو حکم دیا کہ وہ طلاق دے دیں: '' فأمرها النبي صلى الله عليه وسلم أن ترد إليه حديقة كان قد دفعها إليها مهراً ويطلقها'' سنن بیہقی اور دارقطنی میں حضرت ابوسعید خدری ص سے یہ روایت نقل کی گئی ہے (سنن الدارقطنی، کتاب النکاح، باب المہر، حدیث نمبر: ۳۶۲۷، کتاب الخلع والطلاق، باب الوجہ الذي تحل بہ الفدیۃ، حدیث نمبر: ۱۴۸۵۰، عن ابی سعید الخدریؓ، دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۳/۱۴۱، نیز دیکھئے: تکملۃ المجموع: ۱۸/۱۵۸)۔

## آثارِ صحابہ

احادیث کے بعد صحابہ کے آثار پر نظر ڈالئے: (۱) اس نوعیت کا ایک واقعہ سیدنا حضرت عثمان ص کے دور میں پیش آیا، ان کے زمانہ میں عقیلؓ بن ابی

طالب اور ان کی بیوی فاطمہؓ بنت عتبہ کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا، فاطمہؓ نے حضرت عثمان غنیؓ سے شکایت کی، حضرت عثمانؓ نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور حضرت معاویہؓ کو بحیثیت حکم بھیجا، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا ''لأفرقن بينهما'' (میں ضرور ان دونوں میں تفریق کردوں گا)، حضرت معاویہؓ نے کہا کہ میں عبد مناف کے دو بزرگ خاندانوں میں تفریق نہیں کرسکتا: ''ما كنت لأفرقن بين شيخين من عبد مناف'' یہاں تک کہ ان دونوں نے باہم خود ہی مصالحت کرلی (مصنف عبدالرزاق: ۶/ ۵۲۳، ص: ۱۱۸۸۷، کتاب الطلاق باب الحکمین، نیز دیکھئے: الجامع لاحکام القرآن: ۱۷۶/۵) یہاں بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بحیثیت حکم فرمانا کہ میں ان دونوں کے درمیان ضرور تفریق کردوں گا، اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ حکم بحیثیت حکم خود ہی تفریق کے معاملہ میں مختار ہوتا ہے، نیز حضرت معاویہؓ کا اصل مسئلہ پر نکیر نہیں کرنا اس کی تائید وتوثیق ہے۔

(۲) اس سلسلہ کا دوسرا واقعہ حضرت علیؓ کے عہد خلافت کا ہے، جس کا مجمل ذکر اس سے پہلے ہوچکا ہے، دارقطنی نے محمد بن سیرین کے واسطہ سے صحیح سند سے اس واقعہ کی تفصیل نقل کی ہے کہ ایک شوہر وبیوی اپنے اپنے لوگوں کے ساتھ حضرت علیؓ کی خدمت میں آئے، حضرت علی کے حکم سے شوہر و بیوی ہر ایک کے لوگوں میں سے ایک ایک حکم منتخب کئے گئے، حضرت علیؓ نے ان دونوں سے مخاطب ہوکر فرمایا: کیا تم کو اپنی ذمہ داری معلوم ہے؟ تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ مناسب سمجھو تو دونوں میں علاحدگی کرادو، عورت نے کہا: میں اللہ کی کتاب پر راضی ہوں، چاہے اس کا فیصلہ میرے حق میں ہو یا میرے خلاف، جب کہ شوہر نے کہا: جہاں تک علاحدگی کی بات ہے تو میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں ''اما الفرقة فلا'' حضرت علی نے کہا: تم نے جھوٹ کہا، تم بھی جب تک اس عورت کی طرح اقرار نہ کرلو، یہاں سے جا نہیں سکتے (السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر: ۱۴۷۸۲، باب الحکمین فی الشقاق)۔

اس مقدمہ میں حضرت علی کا حکمین سے کہنا کہ کیا تم اپنی ذمہ داری سے واقف ہو، تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ اگر تم چاہو تو علاحدگی کرادو ''هل تدريان ما عليكما؟ إن رأيتما أن تفرقا فرقتما'' اس بات کی دلیل ہے کہ حکمین بحیثیت حکم تفریق کا اختیار رکھتے ہیں اور وہ اس کے ذمہ دار ہیں، اگر ان کی حیثیت محض وکیل کی ہوتی تو سوال اس طرح ہوتا ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم کس بات کے وکیل بنائے گئے ہو؟ ''هل تدريان ما وكلتما''۔

پھر یہ کہ خلع میں اگر یک طرفہ مرد کی رضامندی ضروری ہوتی اور قاضی کو اس سلسلہ میں کوئی اختیار نہ ہوتا تو یہ بات بھی درست نہ ہوتی کہ حضرت علیؓ اس پر طلاق کی آمادگی کے لئے دباؤ ڈالتے، وہ زیادہ سے زیادہ سفارش اور اپیل ہی کرسکتے تھے۔

ان وجوہ کی بناء پر واقعہ ہے کہ اس مسئلہ میں امام مالک کی رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے اور یہی رائے اکثر فقہاء اوزاعی، اسحاق، شعبی، نخعی، طاؤس، ابوسلمہ، ابراہیم، مجاہد اور ایک ایک قول کے مطابق امام شافعی اور امام احمد کی ہے۔ اور صحابہ میں بھی حضرت علی، حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی مسلک نقل کیا گیا ہے (المغنی: ۷/ ۲۴۴، فقہ السنۃ: ۲/ ۲۷۶)۔

## احناف کے دلائل کا تجزیہ

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں احناف کے دلائل قابل ذکر ہیں:

یہ کہنا کہ اصل یہ ہے کہ طلاق کا اختیار مرد کے ہاتھ میں ہو، تسلیم ہے، مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مقاصد نکاح کی حفاظت اور زوجین کی مصلحتوں کی رعایت کے پیش نظر قاضی بھی، بہت سی صورتوں میں تفریق کا مختار بن جاتا ہے، یہاں بھی زوجین کے بڑھتے ہوئے شدید اور ناقابل حل اختلافات کو پیش نظر رکھ کر جب قاضی کے نمائندے اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ان دونوں میں تفریق اور علاحدگی ہونی چاہئے تو مقاصد نکاح کی حفاظت اور دونوں کو اللہ کی حدوں پر قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوگا کہ مرد کے اس اختیار میں دفع ظلم کے لئے دخل دیا جائے اور قاضی کی طرف سے مقرر شدہ حکم از خود تفریق کردیں۔

احناف کا یہ استدلال کہ ''حضرت علیؓ نے شوہر کو اس کا اقرار کرنے پر مجبور کیوں کیا کہ وہ بھی حکم کے فیصلہ کے مطابق مصالحت اور علاحدگی ہر دو صورت پر آمادگی ظاہر کرے؛ کیوں کہ اگر حکم کو اس کا اختیار حاصل ہی تھا تو شوہر کا اقرار اور انکار کوئی اہمیت نہیں رکھتا'' بھی محل نظر ہے، امام مالک اور ان کے ہم خیال حضرات کے نزدیک حضرت علیؓ کے اس حکم کی حیثیت وہی تھی، جو نامرد کو طلاق کا حکم دینے کے سلسلے میں ہے، یعنی اگر شوہر نامرد ہو اور عورت نے یہ ثابت کردیا کہ وہ اس سے علاحدگی کی حقدار ہے تو قاضی پہلے خود شوہر سے کہے گا کہ وہ عورت کو طلاق دے دے، مرد اگر اس پر آمادہ ہوگیا تو ٹھیک ہے، ورنہ خود قاضی اس کی طرف سے عورت کو طلاق دے دے گا، حضرت علیؓ کا مطالبہ یہاں اسی نوعیت کا تھا کہ اگر شوہر خود طلاق دے دے تو بہتر ہے، ورنہ پھر قاضی کے نمائندے...... حکمین ......خود اس ناخوشگوار فریضہ کو انجام دیں گے؛ چنانچہ بہت سے معاملات میں شوہر کی طرف سے نکول کے سامنے آنے کے بعد قاضی اپنے اختیار کا استعمال کرتا ہے۔

شقاق کی بنیاد پر تفریق کے مسئلہ میں چند نکات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں، جن کا ذکر مناسب ہوگا:

## شقاق سے مراد اور اس کے اسباب

(۱) شقاق کے اصل معنی 'اختلاف شدید' کے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَإِن تَوَلَّوۡاْ فَإِنَّمَا هُمۡ فِي شِقَاقٍ'' (البقرۃ: ۱۳۷) جب ایک طرف سے شدید اختلاف کا اظہار ہوتا ہے تو نفرت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور پھر دونوں فریق کی طرف سے تنفر کا اظہار سامنے آتا ہے؛ اسی لئے عام طور پر اس لفظ کا استعمال ''باب مفاعلة'' سے کیا جاتا ہے، اگرچہ کہ ایک ہی طرف سے شقاق کیوں نہ ہو، جیسے ''وَمَن يُشَاقِقِ ٱلرَّسُولَ مِنۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ ٱلۡهُدَىٰ'' (النساء: ۱۱۵) ظاہر ہے کہ اس میں 'شقاق' اللہ کے رسول کی طرف سے نہیں ہوسکتا، کفار و مشرکین کی طرف سے ہی ہوسکتا ہے، زوجین کے درمیان شقاق کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے، یہ شوہر کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے اور بیوی کی طرف سے بھی، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شقاق پیدا ہونے اور پروان چڑھنے میں دونوں کا دخل ہو، علامہ فخر الدین رازی نے اس نکتہ کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے: ''فذلك الشقاق إما أن يكون منها أو منه أو منهما أو يشكل'' (مفاتیح الغیب: ۵، ۲۰۲) شقاق یا تو شوہر و بیوی دونوں کی طرف سے ہوگا، یا شوہر کی طرف سے، یا بیوی کی طرف سے، اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کس کی جانب سے شقاق ہے؟ اس کا اندازہ کرنا دشوار ہوجائے۔

لہٰذا حکمین کا تقرر اور زوجین کے درمیان تفریق کا اطلاق نفس شقاق کے پائے جانے پر ہوگا، خواہ ایک فریق اس کا سبب ہو، یا دونوں فریق ہوں۔

ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ زوجین کے درمیان شقاق کی صورت کس طور پر پیدا ہوتی ہے؟..... ظاہر ہے اس کے لئے کوئی ایک پیمانہ مقرر نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن دار القضاء میں جو تجربات سامنے آتے رہتے ہیں، ان کی روشنی میں کچھ اُمور کا ذکر کیا جاتا ہے:

(الف) شوہر بیوی پر ظلم کرتا ہو، اس کے ساتھ بدسلوکی کا معاملہ کرتا ہو؛ لیکن یہ صورت حال بیوی کے سسرال میں پیش آتی ہو، اس لئے وہ ثابت کرنے سے قاصر ہو۔

(ب) شوہر بیوی پر شک کرتا ہو، ہمیشہ اسے مشکوک نظر سے دیکھتا ہو، یا کچھ لوگوں کی طرف اس کو منسوب کرتا رہتا ہو۔

(ج) شوہر کا سلوک بیوی کے ساتھ تو اچھا ہو؛ لیکن اس کے والدین کے ساتھ نہایت ناشائستہ اور بدتمیزی پر مبنی ہو۔

(د) عورت پر اس کے سسرال کے بعض مرد یا شوہر کے ملنے جلنے والے بری نظر رکھتے ہوں اور شوہر اس کی عزت وآبرو کی حفاظت کے لئے مناسب قدم نہیں اٹھاتا ہو۔

(ھ) شوہر اگرچہ بیوی کے ساتھ اچھا سلوک رکھتا ہو؛ لیکن جرائم پیشہ ہونے کی وجہ سے بدنام ہو۔

(و) شوہر کسی دوسری عورت سے غیر شرعی تعلق رکھتا ہو، جو عورت کے لئے اسی طرح ناگوار خاطر ہوتا ہے، جیسے ایک مرد کے لئے اس کی بیوی کا غیر اخلاقی کردار۔

(ز) بیوی تعلیم یا ملازمت کے بہت اعلیٰ معیار پر ہو اور شوہر تعلیم و ملازمت کے اعتبار سے اس سے کم تر معیار پر ہو۔

(ح) بیوی بہت خوش شکل ہو اور اپنے مناسب جوڑا چاہتی ہو اور شوہر اس کے مقابلہ نمایاں طور پر بدصورت ہو۔

غرض کہ کوئی بھی ایسا سبب جو اسباب فسخ نکاح میں سے نہیں ہے، یا ہے؛ لیکن بیوی اس کو ثابت کرنے کے موقف میں نہیں ہے، اس کی وجہ سے شدید نفرت پیدا ہوجائے اور کوشش کے باوجود دونوں میں موافقت پیدا نہ ہوسکے، اس ناموافقت کی وجہ سے ''امساک بالمعروف'' کی کیفیت مفقود ہوجائے اور ''تسریح بالاحسان'' کے لئے شوہر تیار نہ ہو، شقاق میں داخل ہے اور ایسے مواقع پر بدرجہ ضرورت احتیاط کے ساتھ شقاق کی بنا پر تفریق وخلع کے سلسلہ میں فقہاء مالکیہ وغیرہ کی رائے سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم

## حکم کی تعداد

(۲) اگرچہ افضل طریقہ یہ ہے کہ دو حکم بنائے جائیں؛ لیکن اگر ایک ہی حکم بنایا جائے تو بھی جائز ہے، علامہ قرطبی کا بیان ہے:

''ويجزئ إرسال الواحد، لأن الله سبحانه حكم في الزنا بأربعة شهود ثم قد أرسل النبي صلى الله عليه وسلم إلى المرأة الزانية أنيساً وحده وقال له: إن اعترفت فارجمها، وكذا قال في المدونة'' (الجامع لاحکام القرآن: ۵، ۱۷۷)۔

اگرچہ فقہاء مالکیہ کے درمیان اس میں اختلاف ہے اور علامہ باجی کے نزدیک دو حکم ہی مقرر کرنا ضروری ہے؛ لیکن مالکیہ کا قول راجح یہی ہے کہ ایک حکم

مقرر کرنا بھی کافی ہے (دیکھئے: حاشیۃ الدسوقی: ۳/۲۱۵، فصل انما یجب القسم للزوجات)۔

## زوجین اور قاضی کی طرف سے مقرر کردہ حکم کے اختیارات

قاضی اور حاکم کے علاوہ خود فریقین کو بھی حکم مقرر کرنے کا حق ہے؛ کیوں کہ ان کو اپنی ذات پر ولایت حاصل ہے اور اس صورت میں بھی حکم کے کئے ہوئے فیصلے ان دونوں پر لازم ہوں گے۔

''ولو كانا۔ أي: الحكمان۔ مقامين من جهتهما۔ أي: الزوجين۔ فهو نافذ. ولو لم يرضه الزوجان أو الحاكم'' (الشرح الصغير مع حاشية الدسوقي: ۲،۲۱۱، باب في النكاح. فصل: انما يجب القسم للزوجات)۔

قاضی کی طرف سے مقرر کئے ہوئے حکم اور زوجین کی طرف سے مقرر شدہ حکم میں فرق یہ ہے کہ قاضی کے مقرر کردہ حکم کو فریقین معزول نہیں کر سکتے؛ لیکن وہ اپنے مقرر کئے ہوئے حکم کو اس وقت تک معزول کر سکتے ہیں، جب تک کہ مقدمہ ابتدائی کاروائی اور تحقیق کے مرحلہ میں ہو، جب تحقیقات مکمل ہو جائیں، تو اب حکم کو معزول نہیں کیا جا سکتا:

''لهما الإقلاع عنهما إن أقاماهما مالم يستوعبا الكشف ويعزما على الحكم'' (مختصر الخليل مع الشرح الصغير: ۲،۱۶، باب النكاح. قسم الزوجات مايلحق به)۔

جیسے قاضی کے مقرر کئے ہوئے حکم فیصلہ کرنے میں آزاد ہوتے ہیں، اسی طرح زوجین کے مقرر کردہ حکم بھی فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گے، زوجین کو حق نہیں ہوگا کہ وہ ان کے فیصلے مسترد کر دیں۔

(۱۰) حکم کو چوں کہ حکم بنانے والوں پر ایک طرح کی ولایت حاصل ہوتی ہے؛ اس لئے حکم کا ان صفات کا حامل ہونا ضروری ہے، جو فی الجملہ ولی کے لئے ضروری ہیں، علامہ قرطبی نے ان صفات کو سمیٹتے ہوئے کہا ہے کہ ان کو عادل، صاحب بصیرت اور احکام فقہیہ سے واقف ہونا چاہئے: ''ويكونان من أهل العدالة وحسن النظر والبصر بالفقه'' اسی سے معلوم ہو گیا کہ فاسق، غیر مسلم، ناعاقل، تہمت کا سزا یافتہ، سفیہ و کم عقل حکم نہیں ہو سکتا، مالکیہ نے حکم کے لئے مرد ہونے کو بھی ضروری قرار دیا ہے: يشترط فيه الذكوره (حاشيه خرشی: ۴،۹-۸، فصل انما يجب القسم للزوجات)؛ چوں کہ یہ مقدمہ احکام نکاح سے متعلق ہوگا، اس لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ نکاح، فسخ و تفریق اور نشوز وغیرہ کے احکام سے واقف ہو؛ چنانچہ علامہ خرشی نے حکم کی شرائط میں سے لکھا ہے: ''والفقه بما حكم فيه'' (حوالہ سابق)۔

(۴) اگر دو حکم مقرر ہوئے تو ضروری ہے کہ فیصلہ دونوں کے اتفاق رائے سے ہو، اگر ایک نے تفریق کی رائے دی اور دوسرے نے اختلاف کیا تو تفریق نہ ہو سکے گی:

''فإن اختلف الحكمان لم ينفذ قولهما ولم يلزم من ذلك شيء إلاما اجتمعا عليه. وكذلك كل حكمين حكما في أمر، فإن حكم أحدهما بالفرقة ولم يحكم بها الآخر أو حكم أحدهما بمال و أبى الآخر فليسا بشيء حتى يتفقا'' (الجامع لاحكام القرآن: ۵،۱۷۷)۔

## کیا حکمین کا زوجین کے اقارب میں ہونا ضروری ہے؟

(۵) حکمین بہتر ہے کہ مرد و عورت کے اقرباء میں سے ہوں، مگر یہ ضروری نہیں ہے، قاضی اپنی صوابدید پر کسی بھی دو آدمیوں کو اس کے لئے مقرر و معین کر سکتا ہے، فقہاء مالکیہ کا رجحان یہ ہے کہ اس آیت میں دونوں کے اعزہ میں سے حکم مقرر کرنے کا امر بطور وجوب کے ہے، اس لئے زوجین کے اقارب میں سے ہی حکم مقرر کیا جانا چاہئے؛ البتہ اگر یہ ممکن نہ ہو، یعنی زوجین کے اقارب میں ایسے لوگ موجود نہ ہوں، جو عادل و معتبر ہوں اور جن کے بارے میں اعتماد ہو کہ وہ غیر جانبداری کے ساتھ فیصلہ کریں گے تو اجنبی شخص کو قاضی حکم مقرر کر سکتا ہے، ورنہ نہیں:

''وإن لم يمكن فأجنبيين فإن بعث أجنبيين مع الإمكان ففي نقض حكمها تردد والظاهر نقضه''
(بلغة السالك بهامش الشرح الصغير: ۲،۵۱۳، باب النكاح. القسم بين الزوجات)۔

لیکن متعدد اہل علم کی رائے ہے کہ یہ حکم بطور استحباب کے ہے؛ چنانچہ فقہاء شوافع میں علامہ عمرانی رقمطراز ہیں:

''والمستحب أن يكونا من أهلهما. للاية. وإن كان من غير أهلهما جاز'' (البيان: ۵؍۲۹، كتاب الصداق، باب النشوز)۔

اسی طرح فقہاء حنابلہ میں علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

''والأولى أن يكونا من أهلهما ... فإن كان من غير أهلهما جاز. لأن القرابة ليست شرطاً في الحكم ولا الوكالة'' (المغنی: ۱۰، ۲۶۵-۲۶۶، کتاب عشرة النساء والخلع)۔

موجودہ حالات کے لحاظ سے یہ دوسری رائے ہی زیادہ قرین قیاس ہے؛ کیوں کہ آج کل خدا ناترسی اور خشیت وورع کے کم ہوجانے کی وجہ سے اچھے خاصے بظاہر دیندار لوگ بھی جب کسی فریق کی طرف سے حکم بن کے آتے ہیں تو وہ سچائی پر فیصلہ کرنے کے بجائے طرف داری پر اُتر آتے ہیں اور ان پر اس فریق کا دباؤ رہتا ہے، جس سے ان کی قرابت ہے۔

## فیصلہ میں خود مختار

(۶) حکمین تفریق کا فیصلہ کرنے میں نہ زوجین کی مرضی کے پابند ہوں گے اور نہ خود قاضی کے حکم کے:

''وتفريقهما جائز على الزوجين وسواء وافق حكم قاضي البلد أو خالفه. وكلهما الزوجان بذالك أو لم يؤكلهما'' (الجامع لاحكام القرآن: ۵؍۱۷۶)۔

## ہندوستان میں مروجہ طریقۂ کار کے لحاظ سے سہولت

ہندوستان میں دار القضاء کا عملی طریقہ کار یہ ہے کہ جب مدعی اور مدعا علیہ آتے ہیں تو وہ تحکیم کے فارم پر دستخط کرتے ہیں، جس میں یہ بات لکھی ہوتی ہے کہ ہم دونوں کے درمیان نزاع پیدا ہوگئی ہے، اسی سلسلہ میں ہم دار القضاء سے رُجوع ہوئے ہیں، قاضی شریعت جو بھی فیصلہ کریں ہمیں قبول ومنظور ہے۔

غور کیا جائے تو یہ صورت تحکیم ہی کی ہے؛ لہٰذا اگر کہیں قاضی شقاق کی بنا پر تفریق کی ضرورت محسوس کرے تو اس کو مزید کسی کو حکم بنانے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ جب فریقین حاضر ہوگئے اور اس فارم پر دستخط کردیا تو شرعاً اور قانوناً وہ خود حکم اور ثالث ہے۔

البتہ یہ صورت اسی وقت ہوگی، جب کہ دونوں فریق حاضر ہوئے ہوں اور انھوں نے تحکیم نامہ پر دستخط کردیا ہو، اگر مدعا علیہ حاضر ہی نہیں ہوا، تو عام طور پر تحکیم کی ضرورت ہی نہیں پڑتی؛ کیوں کہ ایک تو مدعا علیہ زیادہ تر اسی بنیاد پر غیر حاضر ہوتا ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ مدعی کے پاس مناسب ثبوت وشواہد موجود ہیں، دوسرے بعض دفعہ اطلاع ملنے اور تشہیر کئے جانے کے باوجود مدعا علیہ کی عدم حاضری نکول عن الحلف کے حکم میں ہوتی ہے، جو خود قضاء قاضی کی ایک اہم بنیاد ہے۔

## ایک طلاق بائن کے حکم میں

(۸) حکمین کے ذریعہ زوجین کے درمیان علاحدگی کا فیصلہ ایک طلاق بائن کے حکم میں ہوگا: ''والفراق في ذالك طلاق بائن'' (الجامع لاحكام القرآن: ۵؍۱۷۶) رابطہ عالم اسلامی کی فقہ اکیڈمی کے اٹھارہویں سیمینار منعقدہ: ۱۰-۱۴ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ کے فیصلوں کی (دفعہ نمبر: ۶) اس طرح ہے:

''إذا وقع الخلع فهو فرقة بائنة لا يحق معها للزوج مراجعة الزوجة بمقتضى العقد الاول وعليها العدة''۔

یہاں تک کہ اگر حکم ایک سے زائد طلاق واقع بھی کردے، تو ایک ہی معتبر ہوگی اور ایک سے زیادہ باطل قرار پائے گی (شرح مختصر الخليل للدردير: ۱؍۳۴۸)۔

## فیصلہ کا طریقۂ کار

(۷) جس کو حکم بنایا جائے اس کی ذمہ داری ہے کہ پہلے زوجین میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش کرے؛ کیوں کہ رشتہ نکاح کو باقی رکھنا اصل ہے، قرآن مجید نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے: ''إِن يُرِيدَا إِصْلَاحاً يُوَفِّقِ اللهُ بَيْنَهُمَا'' (النساء: ۳۵) لیکن اگر موافقت کی صورت پیدا نہ ہوسکے اور علاحدگی کی نوبت آجائے تو اگر غلطی شوہر کی طرف سے ہو تو طلاق واقع کی جائے گی نہ کہ خلع؛ کیوں کہ جب خود شوہر کا قصور ہے تو عورت پر بدل کی ادائیگی کو لازم

کرنا بے معنی ہے:

''إن أساء الزوج عليها، طلقا عليه بلا خلع، أي: بلا مال يأخذانه منها له لظلمه'' (الشرح الكبير مع حاشية الدسوقي: ۲،۱۲۲، باب في النكاح، فصل: انما يجب القسم للزوجات)۔

اور اگر دونوں فریق قصوروار ہوں تو بھی اکثر فقہاء مالکیہ کے نزدیک حکم کو طلاق بلا مال ہی کا فیصلہ کرنا چاہئے:

''وإن أساءا معاً، أي: كان كل منهما يضر بصاحبه تعين الطلاق بلا خلع عند الأكثر إذا لم ترض بالمقام معه'' (الشرح الصغير: ۲،۵۱۴، باب النكاح، القسم للزوجات ما يلحق به)۔

اور اگر بیوی کی طرف سے زیادتی ہو تو پھر خلع کے ذریعہ تفریق کا فیصلہ کرنا چاہئے، جیسا کہ حضرت ثابت بن قیس ؓ کی دونوں بیویوں کے سلسلہ میں مروی ہے؛ لیکن بہر حال حکمین اس کے پابند نہیں؛ کیوں کہ بعض دفعہ مصلحت اس کے برخلاف بھی ہوتی ہے، خاص کر ہندوستان جیسے ملک میں بعض اوقات دار القضاء فریقین کو ایک رائے پر متفق کرنے کے لئے اس تفصیل سے ہٹ کر فیصلہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

(۱۱) چوں کہ اس آیت کے مخاطب 'حکام وقضاۃ' ہیں؛ اس لئے اصل میں حکم مقرر کرنا قاضی کا کام ہے اور اسی حکم میں امیر بھی ہے؛ کیوں کہ اسے بھی 'ولایت عامہ' حاصل ہے؛ اسی لئے فقہاء نے قاضی اور حاکم دونوں الفاظ استعمال کئے ہیں: '' بعث الحاكم أو من يقوم مقامه حكمين'' (الشرح الكبير مع الدسوقي: ۲، ۲۱۱)...... مالکیہ نے اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ اس معاملہ میں قاضی کے یہاں دعویٰ کا پیش ہونا ضروری نہیں:

''إذا علم الإمام من حال الزوجين الشقاق لزمه أن يبعث إليهما حكمين ولا ينتظر ترافعهما'' (مختصر خليل مع الشرح الصغير: ۲، ۵۱۶، باب النكاح، القسم الزوجات وما يلحق به)۔

اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اصلاح بین المسلمین حقوق اللہ میں سے ہے اور حقوق اللہ میں دعویٰ ضروری نہیں ہوتا۔

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب وعلمه أتم وأحكم۔

☆☆☆

# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی[1]

(۱) خلع کی فقہی واصطلاحی تعریف اس طرح ہے:

''فی المخلص والایضاح ''الخلع عقد یفتقر الی الایجاب والقبول یثبت الفرقة ویستحق علیها العوض'' وفی السغناقی هو عبارة عن أخذ مال من المرأة بإزاء ملك النكاح بلفظ الخلع'' (الفتاوی التاتارخانیہ ۳.۴۵۲)۔

(خلع وہ معاہدہ ہے جو ایجاب وقبول کے ذریعہ رشتۂ نکاح کو ختم کردیتا ہے اور بیوی کی جانب سے شوہر طے شدہ بدل کا مستحق ہوجاتا ہے۔ سغناقی میں ہے کہ ملک نکاح کے بدلہ عورت کی جانب سے شوہر کا مال لیکر لفظ خلع کے ذریعہ گلوخلاصی کرنا خلع ہے)۔

''والخلع إسقاط الملك بعوض وبغير عوض'' (بدائع الصنائع ۳.۲۲۲) (ملک نکاح کو عوض لیکر یا بدون عوض ساقط کرنا خلع کہلاتا ہے)

علامہ ابن نجیمؒ ان الفاظ میں تعریف رقم فرماتے ہیں ''وشرعا علی ما اخترناه إزالة ملك النكاح المتوقفة علی قبولها بلفظ الخلع أو فی معناه'' (البحر الرائق ۴.۷۰) (ملک نکاح کو خلع یا اسکے ہم معنی الفاظ (مبارات، بیع وشراء وغیرہ کے ساتھ) زائل کردینے کا نام خلع ہے جو بیوی کی قبولیت پر موقوف ہے)۔

علامہ ابن الہمام ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں: ''من انه إزالة ملك النكاح ببدل بلفظ الخلع'' (فتح القدیر ۴.۱۸۹ باب الخلع دار الفکر بیروت) بعینہ یہی تعریف ہندیہ ۱/۴۸۸ پر مرقوم ہے۔ علامہ ابن نجیم نے بعض شارحین کی تعریف ''اخذه المال بازاء ملك النكاح'' اور فتح القدیر کی تعریف پر نقد کرتے ہوئے اور اپنی ذکر کردہ تعریف کی جودۃ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں تحریر فرمایا ہے: ''وقولی هذا أولی من قول بعض الشارحين أخذه المال بإزاء ملك النكاح لمغايرته المفهوم اللغوی من كل وجه والأصل أن يتحد جنس المفهومين ويزاد فی الشرعی قيد. لإخراج اللغوی ولأنه يرد عليه الطلاق علی مال وليس مساويا له فی جميع أحكامه لاستقلال الحكم الخلع باسقاط الحقوق وان اشتركا فی البينونة ويرد عليه ايضا ما اذا عری عن البدل كما سنذكره وقولی أيضا أولی مما اختاره فی فتح القدير من أنه ازالة ملك النكاح ببدل بلفظ الخلع لأنه يرد عليه ما إذا قال خالعتك ولم يسم شيئا فقلت فإنه خلع مسقط للحقوق كما فی الخلاصة'' (البحر الرائق ۴.۷۰-۷۱)۔ بعض شارحین کنز کی تعریف میں طلاق علی مال جو خلع سے الگ ہے خلع میں داخل ہوجاتا ہے اس لئے وہ تعریف مانع نہیں اور فتح القدیر کی تعریف کی رو سے خلع کا فرد خلع سے نکل جاتا ہے اس لئے وہ تعریف جامع نہیں۔ صاحب بحر کے قول کی تائید علامہ کاسانی کی اس تحریر سے بھی ہورہی ہے ''وأما الطلاق علی مال فهو فی أحكامه كالخلع لأن كل واحد طلاق بعوض فيعتبر فی أحدهما ما يعتبر فی الأخر إلا أنهما يختلفان من وجه وهو أن العوض إذا أبطل فی الخلع بأن وقع الخلع علی ما ليس بمال متقوم يبقی الطلاق بائنا وفی الطلاق علی مال إذا أبطل العوض بأن سميا ما ليس بمال متقوم فالطلاق يكون رجعيا الخ'' (بدائع الصنائع ۳.۲۲۹) بہرحال طلاق علی مال تو احکام کے اعتبار سے خلع ہی کا درجہ رکھتی ہے اور دونوں ہی میں طلاق بعوض ہوتی ہے، لہٰذا ایک میں جس چیز کا اعتبار ہوگا دوسرے میں بھی اسی کا اعتبار کیا جائے گا، مگر من وجہ دونوں میں فرق بھی ہے، اس طرح کہ طلاق علی مال میں عوض اگر مال معلوم نہ ہو تو وہ بینونت سے نکل کر رجعی بن جاتی ہے اور خلع میں ایسا کرنے سے بینونہ باقی رہتی ہے)۔ بہرحال فتح القدیر پر کیا گیا نقد تو علامہ شامی کی اس عبارت سے رفع ہوجاتا ہے ''قال فی الشامية (تنبيه) فی التاترخانية وغيرها مطلق لفظ الخلع

[1]

محمول على الطلاق بعوض حتى لو قال لغيره اخلع امرئتي فخلع بلا عوض لايصح. (رد المحتار على الدر ۵، ۸۶-۸۷) علامہ ابن رشد کی تحریر بھی ملاحظہ ہو: ''وهو بذل المرأة العوض على طلاقها إلا أن اسم الخلع يختص ببذلها له جميع ما أعطاها والصلح ببعضه والفدية بأكثره'' (بداية المجتهد ۲، ۶۷) (بیوی کا اپنی طلاق پر عوض دینا، یہ عوض مہر کی صورت میں بیوی کو جو دیا ہے وہ بھی، اس سے کم اور اس سے زیادہ بھی ہوسکتا ہے۔

ایک تحریر پیش ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ خلع کب مکروہ اور کن صورتوں میں مندوب اور حرام ہے ''ذهبت جمهور الفقهاء إلى أن الأصل في الخلع- بلا حاجة- هو الكراهة بأن يكونا متعاشرين بالمعروف وقد يكون مندوبا عند الحاجة إليه كأن يحلف بالطلاق الثلاث على عدم فعل مالابد من فعله كالأكل والشرب مثلاً فيخالع ثم يفعل المخلوف عليه فيكون وسيلة للتخلص من وقوع الثلاث وقد يكون حراما بالنسبة للزوجة إذا طلبت من غير سبب لقوله عليه السلام أيما امرءة سألت زوجها طلاقا من غير بأس فحرام عليها رائحة الجنة وكذلك قد يكون حراما بالنسبة للزوج إذا عضل زوجته لأجل أن تفتدي منه وتطلب الخلع ويكون مباحا إذا كرهت المرأة زوجها وخافت أن لاتؤدي الحقوق الزوجية فتكون عند ذالك امرأة عاصية لأمر الله تعالى ولايحل لكم أن تأخذوا مما آتيتموهن شيئا إلا أن يخافا أن لا يقيما حدود الله فإن خفتم أن لايقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به'' (مدى سلطة القاضي في الخلع بدون رضى الزوج في الفقه الاسلامي. د: احمد ذياب شويد. ۱۲۰-۱۲۱) (جبکہ زوجین بہتر طریقہ سے گزر بسر کر رہے ہوں پھر بھی بلا ضرورت خلع کیا جائے تو جمہور فقہاء کے یہاں مکروہ ہے اور بوقت ضرورت مندوب ہے جیسے شوہر تین طلاق کو کسی ایسے عمل پر معلق کرے جس سے احتراز ناگزیر ہو (جیسے کھانے اور پینے پر) اب خلع کرتا ہے اور پھر کھا پی لیتا ہے تو یہ خلع تین طلاق سے بچنے کا ایک وسیلہ ہے اور کبھی حرام ہوتا ہے اور حرمت کا باعث کبھی عورت ہوتی ہے اور وہ بغیر کسی سبب کے خلع چاہتی ہے۔ ایسی عورت کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس عورت نے بغیر کسی سبب کے شوہر سے طلاق چاہا اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ اور کبھی سبب شوہر ہوتا ہے وہ عورت سے کنارہ کش رہتا ہے تاکہ عورت شوہر سے خلع پر مجبور ہو اور مال لیکر آزاد کردے۔ نیز مباح کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ عورت شوہر کو ناپسند کرتی ہے اور اسے اندیشہ ہے کہ وہ شوہری حقوق ادا نہ کرکے عاصیہ بن سکتی ہے اس لئے خلع کراتی ہے، اس کی دلیل آیت ربانی "ولایحل لکم الخ" ہے۔

مفتی رشید احمد صاحب کہتے ہیں: ''اس پر امت مسلمہ کے تمام مجتہدین رحمہم کا اجماع ہے کہ خلع زوجین کی باہمی رضا پر موقوف ہے'' (احسن الفتاوی ۵/ ۳۸۵)، ساتھ ہی مولانا محمد یوسف لدھیانوی کی تحریر پیش ہے: ''طلاق اور خلع میں فرق یہ ہے کہ خلع کا مطالبہ عموماً عورت کی جانب سے ہوتا ہے اور اگر مرد کی طرف سے اس کی پیش کش ہو تو عورت کے قبول کرنے پر موقوف ہے، عورت قبول کرے تو خلع واقع ہوگا ورنہ نہیں جبکہ طلاق عورت کے قبول کرنے پر موقوف نہیں وہ قبول کرے یا نہ کرے طلاق واقع ہوجاتی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ عورت کے خلع کے قبول کرنے سے اس کا مہر ساقط ہوجاتا ہے طلاق سے ساقط نہیں ہوتا، البتہ اگر شوہر یہ کہے کہ میں تمہیں اس شرط پر طلاق دیتا ہوں کہ تم مہر چھوڑ دو اور عورت قبول کرلے تو یہ معاوضہ طلاق کہلاتی ہے اور اس کا حکم خلع ہی کا ہے، خلع میں شوہر کا لفظ طلاق استعمال کرنا ضروری نہیں بلکہ اگر عورت کہے کہ میں خلع چاہتی ہوں اس کے جواب میں شوہر کہے کہ میں نے خلع دیدیا تو بس خلع ہوگیا (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۵/ ۳۹۰)۔

زوجین کے درمیان نباہ نہ ہونے کی صورت میں اگر عورت علیحدگی کا مطالبہ کرے تو شوہر کو قبول کرلینا مستحب ہے (الفروع ۸/ ۱۴۱۷)۔ خلع کا رکن ایجاب وقبول ہے کیوں کہ یہ معاہدہ طلاق بعوض ہے، لہٰذا بدون قبول نہ تو فرقت ہوگی اور نہ ہی عوض کا مستحق ہوگا (بدائع الصنائع ۳/ ۲۲۹)۔

موسوعہ فقہیہ میں ہے: ''وأما الحنفية فقد ذكروا له ركنين إن كان بعوض وهما: الإيجاب والقبول لأنه عقد على الطلاق بعوض فلا تقع الفرقة ولايستحق العوض بدون القبول بخلاف الخلع بغير عوض فإنه إذا قال خالعتك ولم يذكر العوض ونوى الطلاق فإنه يقع الطلاق عليهما سواء قبلت أو لم تقبل لأن ذلك طلاق بغير عوض فلا يفتقر إلى القبول'' (الموسوعة الفقهية ۱۹، ۲۴۴-۲۴۵)۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحب نے جبری خلع کے تحت ائمہ کے مذاہب اور ان کے دلائل ذکر کرتے ہوئے مذہب مالکی کے ذیل میں علامہ ابن رشد کی تحریر ''والفقه أن الفداء إنما جعل للمرأة فى مقابلة ما بيد الرجل من الطلاق فإنه لما جعل الطلاق بيد الرجل إذا ترك المرأة جعل الخلع بيد المرأة إذا فرقت'' (بداية المجتهد ۲،۶۷) یعنی جس طرح شوہر بیوی سے بغض ونفرت کے سبب طلاق کا مالک ہے ٹھیک اسی طرح عورت شوہر سے نفرت کے باعث خلع کی مالک ہے، اس پر نقد کرتے ہوئے درج ذیل عبارت رقم فرمائی ہے۔

''اس عبارت کے مفہوم کی تعیین کے لئے حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کا اسلوب بیان سمجھنا ضروری ہے، فقہاء کا دستور یہ ہے کہ وہ احکام اور ان کی علل بیان فرماتے ہیں، احکام کی حکمتیں ومصلحتیں نہیں بتاتے مگر کبھی شاذ ونادر لفظ الفقه فيه یا السر فیہ کے تحت حکمت بھی بیان فرمادیتے ہیں۔ حکمت مدار حکم نہیں ہوتی علت مدار حکم ہوتی ہے، حکمت کہیں کامل پائی جاتی ہے کہیں ناقص اور کہیں بالکل معدوم ہوتی ہے اس عبارت میں حکم خلع کی علت کا بیان نہیں بلکہ حکمت ناقصہ کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی حد تک بیوی کے لئے بھی اختیار تفریق کی صورت موجود ہے وہ یہ کہ وہ شوہر کو مال کی ترغیب دیکر خلع پر راضی کرسکتی ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بیوی خیار تفریق میں شوہر کے برابر ہے جس طرح شوہر بیوی کی رضا کے بغیر طلاق دے سکتا ہے اسی طرح بیوی شوہر کی رضا کے بغیر خلع کرسکتی ہے۔ اس کے بعد موصوف نے چند دلائل اس قول کے ابطال کے لئے پیش فرمائے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے: ''اس مطلب کی بنا پر بیوی کو بلا عوض بھی طلاق واقع کرنے کا حق ہونا چاہئے، اس لئے کہ شوہر کے ساتھ برابری تو اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ جیسے شوہر بلا عوض طلاق دے سکتا ہے اسی طرح بیوی بلا عوض طلاق لے سکے اور اس کا دنیا میں کوئی قائل نہیں'' (احسن الفتاوی ۵/۳۸۶)۔

مذکورہ بالا دلائل سے معلوم ہوا کہ عورت کو صرف خلع کے مطالبہ کا حق ہے اور یہ حق مرد کے طلاق دینے کے حق کے بالکل مغائر ہے، دونوں کے حقوق میں یکسانیت بالکل نہیں ہے۔

۳۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے ۲۹۱۔ ۲۹۲ سے اور ایک تحریر پیش کردی جائے ''دوسری نوعیت جو بعض مسائل میں فقہی اختلاف کی ہے، یہ اختلاف ایک نعمت اور عظیم قانونی فقہی سرمایہ ہے جس نے امت مسلمہ کو اپنے دین وشریعت کے سلسلہ میں انتہائی کشادگی اور آسانی عطا کی ہے۔ امت مسلمہ جس کی وجہ سے کسی ایک شرعی تطبیق میں اس طرح محدود ہوکر نہیں رہ جاتی ہے کہ اس سے تجاوز کا امکان نہ ہو بلکہ اگر کبھی ایک مسلک کے لحاظ سے کوئی تنگی ودشواری آجاتی ہے تو دوسرے مسلک میں اس کے لئے کشائش اور آسانی میسر ہوجاتی ہے''۔

اب عرض ہے کہ اگر شوہر عوض لیکر طلاق دینے پر آمادہ ہوجاتا ہے تو بہت بہتر جیسا کہ ''فإن خفتم أن لا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به'' (سورة البقرة: ۲۲۹) نیز حدیث بھی اس کی طرف اشارہ کرتی ہے ''عن ابن عباس ؓ أن امرأة ثابت بن قيس أتت النبى صلى الله عليه وسلم فقالت يا رسول الله ثابت بن قيس ما أعيب عليه فى خلق ولا دين ولكنى أكره الكفر فى الإسلام فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم أتردين عليه حديقة فقالت نعم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اقبل الحديقة وطلقها تطليقة'' (بخاری ۲، ۷۹۴ باب الخلع وكيف الطلاق به)، حافظ ابن حجر نے حدیث کی تشریح یوں فرمائی ہے ''أى لا أريد مفارقته لسوء خلقه ولا نقصان دينه قوله ولكنى أكره الكفر أى أكره أن أقمت عنده أن أقع فيما يقتضى الكفر وفى رواية إلا أنى أخاف الكفر وكأنها أشارت إلى أنها قد تحملها شدة كراهتها له على إظهار الكفر لينفسخ نكاحها منه وهى كانت تعرف أن ذالك حرام ... ويحتمل أن تريد بالكفر كفران العشير'' (فتح الباری ۹،۵۰۰) (ثابت بن قیس کی بدخلقی اور دین کے نقصان کے سبب ان سے علیحدگی اختیار نہیں کررہی ہوں بلکہ اس لئے کہ اگر میں ان کے پاس رہوں تو ممکن ہے ان گناہوں میں ملوث ہوجاؤں جو کفر تک پہنچانے والے ہوں یا اگر میں ان کے پاس رہوں تو ان سے شدت کراہت کے سبب کفر کا اظہار کر بیٹھوں یعنی نکاح کے فسخ کا ارادہ کرلوں (جو ان کے خیال میں حرام تھا) یا کفر سے مراد شوہر کی ناشکری ہے)۔

اس کے بعد حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحب علیہ الرحمہ کی انتہائی بصیرت افروز تحریر پیش ہے جس میں حضرت نے مستند کتب فقہ مالکی (شرح دردیر ومدونہ وغیرہ) کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ اس ضیق کا سد باب اسی فقہ کے ذریعہ ہوسکتا ہے: ''اگر ظاہری اسباب موجود نہ ہوں لیکن طبعی ناپسندیدگی کی وجہ سے وہ اس شوہر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو شوہر کا فرض ہے کہ وہ امساک بالمعروف کی صورت نکالے اگر ممکن نہ ہو تو تسریح بالاحسان یعنی خلع کی صورت میں زوجہ کو اپنے نکاح

سے الگ کردے اور اگر زوج دونوں میں سے کوئی صورت نہیں نکالتا اور قاضی محسوس کرتا ہے کہ اب طرفین کے درمیان معروف اور بہتر تعلقات کے ساتھ نکاح برقرار رہنا ممکن نہیں ہے تو اس صورت میں فقہ مالکی کو سامنے رکھتے ہوئے وہ تحکیم اور پھر خلع جبری کی صورت نکال سکتا ہے (فتاوی قاضی ر ۱۵۰)۔

حضرت علیہ الرحمہ نے اس کی دلیل بحوالہ تفسیر مظہری ۲، ۱۰۱ یوں پیش کی ہے: ''فقال مالك يجوز لحكم الزوج أن يطلق المرأة بدون رضاء الزوج ولحكم المرأة أن يختلع بدون رضاء المرأة ويجب عليها المال إذا رأى الصلاح في ذالك حيث ملك على الحكمين الجمع والتفريق وكذب الزوج على نفي الفرقة''۔

حضرت قاضی صاحب علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب مباحث فقہیہ میں تحکیم سے متعلق ۴۵۷ سے ۴۹۵ تک بڑی تفصیل اور پرمغز گفتگو فرماتے ہوئے اس کے مختلف گوشوں اور جہتوں کی بابت سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ آپ رقم فرماتے ہیں ''اگر عورت ضرر رسانی کا دعوی تو کرے لیکن ثابت نہ کرسکے اور یہ شکایت عورت کی طرف سے دوبارہ قاضی کے سامنے آئے یا ہر دو ضرر کا دعوی کررہے ہوں لیکن ثبوت پیش نہ کرسکیں تو ایسی صورت میں قاضی صالحین کی نگرانی میں رکھ کر اصلاح حال کی کوشش کرے گا اور اگر پہلے ہی سے عورت صالحین کے ماحول میں ہو یا صالحین کی نگرانی میں رکھنے کے احکامات کسی وجہ سے موجود نہ ہوں یا صالحین کے ماحول میں رکھنے کے باوجود پیچیدگی برقرار رہے اور کوئی واضح بات نہ نکل سکے کہ کس فریق کی زیادتی ہے تو ایسی صورت میں قاضی معاملہ حکمین کے حوالہ کردے گا'' (مباحث فقہیہ ۴۹۲)، اس کے بعد حضرت علیہ الرحمہ کی تحریر جو ۴۹۲ تا ۴۹۵ ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کبھی عدم ثبوت کی وجہ سے اگر مقدمہ خارج کردیا جاتا ہے تو پریشانی گھٹنے کے بجائے اور بڑھ جاتی ہے، اس لئے حکمین کا تقرر کیا جائے جن کے فیصلہ کی بنیاد نجی تحقیقات پر ہوتی ہیں اور موصوف نے استدلال میں یہ عبارت پیش فرمائی ہے: ''قال مالك الأمر الذي يكون فيه الحكمان إنما ذلك إذا أقبح مابين الرجل والمرأة حتي لا تثبت بينهما بينة ولايستطاع أن يتخلص إلى أمرهما فإذا بلغ ذلك بعث الوالي'' یعنی جب زوجین کے باہمی معاملات اس حد تک مفضی ہوں کہ شہادت وبینہ کے ذریعہ ثابت کرنا مشکل اور حقیقت حال تک پہنچنا عدالت کے بس سے باہر ہوجائے تو اس وقت حکمین کا تقرر کیا جاتا ہے۔ ص: ۴۹۵ پر حضرت کی تحریر یوں ہے: ''اخیر میں یہ ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ قوانین عثمان کی تنسیخ کے بعد مصر میں نافذ ہونے والے قانون میں فقہ مالکی کے مطابق ضرر رسانی کو سبب فسخ قرار دیتے ہوئے جو ضابطہ بنایا گیا ہے اس کا ماحصل وہی ہے جو ہم نے اوپر شرح دردیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے''۔ راقم کہتا ہے کہ حضرت کے اس قول کی تائید مکہ مکرمہ کی فقہ اکیڈمی کے فیصلہ ص ۴۸۶ سے بھی ہوتی ہے ''اگر دونوں ثالث اتفاق نہ کریں اور صلح مشکل ہوجائے اور قاضی کے سامنے صلح ناگزیر ہوجائے تو شوہر کو علیحدگی کا حکم دے گا اگر شوہر انکار کرے تو قاضی بعوض یا بلاعوض جس طرح بہتر سمجھے گا جدائی کرادے گا''۔

مجموعہ قوانین اسلامی ص ۲۰۱-۲۰۲ پر اس طرح درج ہے ''اگر زوجین ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں یا زوجین میں سے کوئی ایک نفرت کرنے لگے تو بھی شقاق قرار دیا جائے گا ... قاضی کو چاہئے کہ حکمین مقرر کرے جو اصلاح حال کی صورت نکالیں اور اگر باوجود ان کوششوں کے اصلاح حال ممکن نہ ہو اور نکاح اپنے مقاصد سے خالی ہوجائے یعنی امساک بالمعروف سخت دشوار ہوجائے تو شوہر کی ذمہ داری تسریح بالاحسان ہے لیکن اگر شوہر اس سے گریز کرے تو قاضی نیابۃ عن الزوج تفریق کردے گا''۔

۴- ''وقال طاؤوس ''إلا أن يخافا أن لا يقيما حدود الله'' فيما افترض لكل واحد منهما على صاحبه في العشرة والصحبة'' (بخاری ۲، ۷۹۴)، زوجین میں سے ہر ایک پر شرعاً جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان کی رعایت کی جائے۔ شقاق کا یہی مفہوم بیہقی وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی بھی تحریر فرماتے ہیں ''يعني العداوة والخلاف لأن كلا من الاعداء يفعل مايشق على صاحبه أو يميل إلى الشق الأخر غير شق مختار لصاحبه'' (تفسیر مظہری ۲ر۱۰۱)، دونوں کی معاشرت ومیلان طبع جداگانہ ہو نیز ان کا رہن سہن ایک دوسرے کی مرضی کے خلاف ہو۔ علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں ''للشقاق اى لوجود الشقاق وهو الاختلاف والتخاصم'' (رد المحتار علی الدر ۵، ۸۷)، الموسوعۃ الفقہیۃ ۲۹ر ۵۳ پر اس طرح ہے: ''الشقاق هنا: هوالنزاع بين الزوجين سواء ا كان بسبب من احد الزوجين او بسببهما معا او بسبب امر خارج عنهما'' شقاق نام ہے زوجین کے درمیان اختلاف کا چاہے اس کا سبب دونوں ہوں یا ایک یا کوئی امر خارج۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں: ''زوجین پر واجب ہے کہ مل جل کر رہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کریں یہ حدود اللہ ہے اور اس کا ترک یہ ہے کہ عورت شوہر کے حقوق ادا نہ کرے اور ان حقوق کو اہانت اور استخفاف کی نگاہوں سے دیکھے، ابن عباسؓ و مالک بن انس وجمہور فقہاء کی یہی رائے ہے اور حسن

بن ابی الحسن اوران کے ساتھ ایک قوم کا خیال ہے کہ اگر بیوی یہ کہے کہ میں تمہاری بات نہ مانوں گی، تمہارے لئے غسل جنابت نہ کروں گی، تمہاری باری پوری نہ کروں گی تو خلع حلال ہو گیا اور شعبی نے کہا کہ ان لا یقیما حدود اللہ کا مطلب ان لا یطیعا اللہ ہے اور یہ معنی اس لئے ہے کہ شدت غضب ونفرت ترک اتباع تک پہنچا دیتا ہے اور عطاء بن ابی رباح نے کہا کہ خلع اس وقت حلال ہو جائے گا جب عورت اپنے شوہر سے کہے کہ میں تم کو ناپسند کرتی ہوں۔ تم سے محبت نہیں کرتی ہوں'' (قرطبی ۳/ ۹۲، نیز دیکھئے: فتح الباری ۹/ ۴۹۷)۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی فرماتے ہیں: ''شقاق کے معنی زوجین کے درمیان ایسی شدید نفرت پیدا ہو جائے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود کو قائم رکھتے ہوئے ازدواجی زندگی نہ گزار سکیں (کتاب الفتاوی ۵/ ۱۷۰ نیز دیکھئے مجموعہ قوانین اسلامی / ۲۰۱)۔

۵۔ شقاق کے باعث قاضی کو خلع کے فیصلہ کی اجازت نہیں ہونی چاہیے، خلع کے لئے تراضی طرفین ضروری ہے ''قال شمس الائمه السرخسی فیحتمل الفسخ بالتراضی ایضا وذالك بالخلع واعتبر هذه المعاوضة المحتملة للفسخ بالبيع والشراء في جواز فسخها بالتراضي'' (مبسوط: ۶/۱۷۱) ''لأنه عقد يعتمد التراضي كسائر العقود'' (مبسوط: ۶/۱۷۳) اوپر کی عبارتوں سے معلوم ہوا کہ خلع بھی تمام عقود کی طرح ایک معاملہ ہے، لہٰذا جس طرح تمام عقود کے فسخ میں تراضی ضروری ہے خلع کے ذریعہ فسخ نکاح میں بھی تراضی ضروری ہوگی۔ ابوبکر کاسانی وفخر الدین زیلعی کی تحریریں اسی طرح ہیں: (بدائع الصنائع ۳/ ۲۲۹، تبیین الحقائق ۲/ ۲۶۷ نیز دیکھئے احکام القرآن للجصاص ۲/ ۱۹۱ تا ۱۹۳)۔ علامہ جصاص تحریر فرماتے ہیں: ''فثبت بذالك أن الحاكم لا يملك أخذ مالها ودفعه إلى زوجها ولا يملك إيقاع طلاق على الزوج بغير توكيله ولا رضاه وهذا حكم الكتاب والسنة وإجماع الأمة'' الخ جصاص رازی ایک مقام پر اور تحریر فرماتے ہیں: ''قال أصحابنا ليس للحكمين أن يفرقا إلا برضا الزوجين لأن الحاكم لا يملك ذالك فكيف يملكه الحكمان'' جبکہ حاکم کو تراضی زوجین کے بغیر خلع کا حق نہیں ہے تو حکمین کو یہ حق کیسے مل سکتا ہے۔

فقہاء مالکیہ کے آراء پیش ہیں: ''قال العلامه ابو الوليد الباجي في شرحه لموطا الإمام مالك ويجبر على الرجوع إليه ان لم يرد فراقها بخلع أو غيره'' (المنتقى ۵/۲۹۶ دار الكتب العلمية بيروت)، علامہ ابن رشد بھی شرط کے ساتھ تراضی ہی کے قائل ہیں: ''فإن الجمهور على أن الخلع جائز مع التراضي إذا لم يكن سبب رضاها بما تعطيه إضراره بها'' (بداية المجتهد ۲/۵۷)، حضرت امام شافعیؒ کی تحریر بحوالہ کتاب الام پیش ہے: ''وإن قال لا أفارقها ولا أعدل لها أجبر على القسم لها ولا يجبر على فراقها'' (۵/۲۰۹ دار الكتب العلمية بيروت) (اگر شوہر بیوی سے یوں کہے کہ میں تمہیں نہ اپنی زوجیت سے خارج کروں گا اور نہ تمہارے ساتھ انصاف کروں گا تو قاضی شوہر کو اس کی باری پر مجبور کرے گا نہ کہ تفریق پر)۔ اسی طرح ایک دوسری تحریر اس طرح ہے ''وذهب الشافعية إلى أنه إن اشتد الشقاق بين الزوجين بعث القاضي حكما من أهله وحكما من أهلها وهما وكيلان لهما في الأظهر ... فعلى الأول يشترط رضاهما ببعث الحكمين فيوكل الزوج حكمه لطلاق وقبول عوض خلع وتوكل الزوجة حكمها ببذل عوض وقبول طلاق ويفرق الحكمان بينهما إن رأياه صوابا'' (مغني المحتاج ۳/۲۶۱)، ''قال وليس له (الحاكم) أن يأمرهما (الحكمين) يفرقان إن رأيا إلا بأمر الزوج ولا يعطيان من مال المرأة إلا بإذنها'' (كتاب الام ۵/۲۱۶) (حاکم کے لئے یہ درست نہیں کہ حکمین کو اگر وہ تفریق کو مناسب سمجھتا ہو تو تفریق کا حکم دے مگر شوہر کے حکم سے، اسی طرح وہ خلع کی صورت میں بدل خلع کے مالک نہیں مگر عورت ہی کی اجازت سے)۔ ''وقال ابو اسحق الشيرازي لأنه رفع عقد بالتراضي جعل لدفع الضرر فجاز من غير الضرر كالإقالة في البيع'' (المهذب ۲/۲۵۴ دار العلم دمشق) (چونکہ خلع نام ہے رفع عقد بالتراضی کا اس لئے جیسے ضرر کی صورت میں جائز ہے بغیر ضرر بھی جائز ہے اقالہ فی البیع کے مانند ہو کر)۔

زاد المعاد ۴/ ۲۶ پر حافظ ابن القیم جوزی تحریر فرماتے ہیں: ''وفي تسمية صلى الله عليه وسلم الخلع فدية دليل على أن فيه معنى المعاوضة ولهذا اعتبر فيه رضا الزوجين'' (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلع کو فدیہ کہنا اس پر دلیل ہے کہ اس میں معاوضہ ہے اور یہ بدون تراضی زوجین کے درست نہیں)۔ ابن حزم ظاہری لکھتے ہیں: ''ليس في الآية ولا في شيء من السنن أن للحكمين أن يفرقا ولا أن ذالك للحاكم'' (المحلى ۱۰/۸۸) (زوجین کی رضا کے بغیر نہ حکمین اور نہ ہی حاکم تفریق کر سکتے ہیں یہ بات کسی بھی آیت اور حدیث سے ثابت نہیں)۔

صاحب احسن الفتاوی نے ۵/ ۳۸۴ تا ۴۰۲ میں شقاق کے باعث حاکم وقاضی کے خلع کے فیصلہ کا بالکل اختیار نہ ہونے پر بڑی تفصیلی بحث فرمائی ہے اور ثابت کیا ہے کہ حاکم کو بذات خود بلا نصب حکمین خلع کے فیصلہ کا اختیار نہیں اور علامہ ابن رشد کی تحریر "ومالك يشبه الحكمين بالسلطان والسلطان يطلق بالضرر عند ذالك إذ تبين" کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک کے یہاں بلا نصب حکمین حاکم کو بھی اختیار ہے اسکی توجیہ اس طرح فرمائی ہے: "مگر درحقیقت یہاں تفصیل حکم کا بیان نہیں بلکہ تاخذ حکم کا بیان ہے جس کے لئے علت میں اشتراک کافی ہے جو یہاں تبین ضرر ہے، زوجہ مفقود ومعسر وغیرہ کے ضرر کا تبین حاکم کو بلا نصب حکمین بھی ہوسکتا ہے مگر ضرر نزاع وشقاق کا تبین بدون نصب حکمین نہیں ہوسکتا۔ اگر ضرر نزاع وشقاق کے لئے بلا نصب حکمین حاکم کو اختیار تفریق ہوتا تو پھر نصب حکمین ان کی قیود وشرائط کے تکلفات وطول عمل کی کیا ضرورت تھی" اس کے بعد حضرت مفتی صاحب نے ان شرائط کا بالتفصیل ترتیب وار ذکر کیا ہے اور اخیر میں لکھتے ہیں: "ظاہر ہے کہ ان سب تکلفات کا تحمل صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ بدون اس کے ضرر شقاق کا تبین وتحقیق نہیں ہوسکتی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شوہر کا توکیل حکمین پر مجبور کرنا بھی اس پر دلیل ہے، ورنہ وہ خود اپنی توکیل کا حکم فرماتے (احسن الفتاوی ۵/ ۴۰۲)، مولانا محمد یوسف لدھیانوی لکھتے ہیں: "عدالت کے ذریعہ جو خلع کیا جاتا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ عدالت اگر محسوس کرے کہ میاں بیوی کے درمیان موافقت نہیں ہوسکتی تو عورت سے کہے کہ وہ اپنا مہر چھوڑ دے اور شوہر سے کہے کہ وہ مہر چھوڑنے کے بدلے اس کو طلاق دیدے اور اگر شوہر اس کے باوجود طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو عدالت شوہر کی مرضی کے بغیر خلع کا فیصلہ نہیں کرسکتی" (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۵/ ۳۸۹)، اسلامی اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلہ ص: ۴۸٦ پر بھی یہی حکم ملتا ہے: "قاضی محض عورت کے مطالبہ پر شوہر کو جدائی اور معاوضہ قبول کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا بلکہ وہ دونوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرے گا اور اس کے لئے وہ ثالث بھیجے گا"۔ راقم کہتا ہے کہ تمام معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ شقاق کے باعث بلا نصب حکمین وبلا تراضیٔ طرفین خلع کا فیصلہ نہیں ہونا چاہئے، اس کے بعد مالکی مسلک ضرورتاً اپنا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئے (جبکہ حکمین کے اختیارات مجتہد فیہ ہیں)۔

٦۔ تمام ہی مسلک میں حکم کے تقرر کا ثبوت ہے، ذیل میں دلائل پیش کئے جارہے ہیں:

ونص جمهور فقهاء المالكية والشافعية على أن بعث الحكمين واجب على الحاكم والقاضي لأن آية بعث الحكمين محكمة غير منسوخة فالعمل بها واجب ولأنه من باب دفع الظلامات وهو من الفروض العامة على القاضي قال الشربيني الخطيب صححه في زيادة الروضة وجزم به الماوردي وقال الأذرعي ظاهر نص الأم الوجوب" (الموسوعة الفقهيه ۴۰،۳۰۹) (جمہور فقہاء مالکیہ وشافعیہ کی صراحت ہے کہ حکمین کا بھیجنا حاکم اور قاضی پر واجب ہے، اس لئے کہ بعث کی آیت محکم اور غیر منسوخ ہے جس پر عمل واجب ہے اور اس لئے بھی کہ یہ دفعیہ ظلم کے قبیل سے ہے جو قاضی کا فرض ہے، خطیب شربینی کہتے ہیں کہ زیادۃ الروضۃ میں اسی کی تصحیح ہے اور ماوردی نے اسی پر اعتماد کیا ہے اور اذرعی نے کہا کہ کتاب الام کا ظاہر بھی وجوب ہی کو بتلاتا ہے)۔

ابن رشد قرطبی تحریر فرماتے ہیں: "اتفق العلماء على جواز بعث الحكمين إذا وقع التشاجر بين الزوجين وجهلت أحوالهما في التشاجر: أعني المحق من المبطل" (بداية المجتهد ۲،۱۰٦)۔

(جب زوجین کے درمیان اختلاف ہوجائے اور عدالت کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے تو حکمین کے تقرر پر سبھی علماء متفق ہیں)۔ اسی کے ساتھ ایک تحریر اور پیش ہے: "قال صاحب الجمل البعث واجب وكونهما من أهلهما مندوب" (اوجز المسالك ۴،۵۲۲) "لأن التحكيم عندنا جائز" (تفسیر القرطبی ۵،۱۱٦)۔

اس سلسلہ کے اور بھی دلائل ہیں جن سے حکم کا وجوب ثابت ہوتا ہے (اسلامی عدالت ۱/ ۳۳۲، عنایہ علی الہدایہ ۳/ ۱۲۸، احکام القرآن للإمام ابواسحاق المالکی / ۱۲۰)۔

عبارت بالا سے معلوم ہوا کہ جب عدالت کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے تو حکمین کا تقرر کرے گی اور حکمین اصلاح حال کی کوشش کریں گے لیکن اگر اس میں بھی ناکامی ہوجائے تو انہیں اختیار ہوگا۔ اسی مفہوم کی دوسری تحریر پیش ہے شقاق کی صورت میں جبکہ واضح صورت غیر معلوم ہو تو حاکم حکمین کا تقرر کرے گا اور حکمین کو کلی اختیار ہوگا وہ زوجین کے درمیان صلاح بھی کراسکتے ہیں اور تفریق بھی، اس میں انہیں زوجین کی رضامندی کی ضرورت نہیں اور ان کا یہ فیصلہ نافذ العمل ہوگا خواہ حاکم شہر کے موافق ہو یا مخالف" (التلقین ۱/ ۱۳۱)۔

اب اخیر میں مشہور عالم دین اور محقق حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم کی ایک تحریر عرض ہے جسے بحث ونظر شمارہ ۱۳ جلد ۴ پر دیکھا جاسکتا

ہے جس میں حضرت موصوف فقہ مالکی اور اس کی خصوصیات پیش فرماتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: "شخصی اور عائلی قوانین میں فقہ مالکی انسانی فطرت اور معاشرتی مصلحت سے جس درجہ ہم آہنگ ہے شاید ہی کوئی اور فقہ اس باب میں اس کی ہم پلہ ہو، خلافت عثمانیہ ترکی کے زیر نگرانی مرتبہ مجلہ "الاحکام العدلیہ" میں شخصی قوانین میں مذہب مالکی کے بہت سے احکام کو قبول کرنا دراصل اسی حقیقت کا اعتراف ہے۔ تنگ دست اور قدرت کے باوجود نفقہ سے بے پرواشوہر کی بیوی کے لئے حق تفریق، مفقود الخبر شوہر کی بیوی کے لئے ایک مخصوص اور مناسب مدت کے بعد علیحدگی کا حق، خلع میں قاضی کو خصوصی اور وسیع اختیار اور شدید اختلاف کی صورت میں جبری خلع کی گنجائش الخ" (ص: ۴۳)، اسی شمارہ کے ص: ۴۴ پر موصوف تحریر فرماتے ہیں: "قضاۃ کو اپنی ذاتی واقفیت کو اساس بنا کر فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے تو خطرہ تھا کہ جائر قضاۃ اس کو اپنے لئے مہمیز بنالیں، اس لئے فقہ مالکی میں قضاۃ کو اپنے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ کا اختیار نہیں دیا گیا"۔ مذکورہ بالا عبارتوں اور تحریر سے معلوم ہوا کہ جن کے یہاں خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں ان کے یہاں بھی حکمین کا تقرر ضروری ہے۔

حکم کا تقرر کافی ہوگا یا نہیں؟ اس کی بابت فقہاء کے آراء اس طرح ہیں: "واذا حكم رجلان رجلا فحكم بينهما ورضيا بحكمه جاز لأن لهما ولاية على أنفسهما فصح تحكيمهما وينفذ حكمه عليهما" (فتح القدير ۵.۴۹۹ مطبوعه رياض) (جب دو آدمیوں نے ایک شخص کو حکم بنایا اور اس نے ان کے بیچ فیصلہ کر دیا اور دونوں اس فیصلہ سے راضی ہو گئے تو جائز ہے، کیوں کہ ان دونوں کو اپنے اپنے معاملہ پر ولایت حاصل ہے، لہٰذا ان کی تحکیم درست ہوگی اور اس کا حکم دونوں پر نافذ ہوگا)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: "جب فریقین نے ایک حکم پر صلح کر لی لیکن ان کی تعیین نہیں کی پھر مقدمہ ایک شخص کے پاس لے گئے اور اس نے ان کے درمیان فیصلہ کر دیا تو یہ جائز ہے، اسی طرح دونوں نے ایک حکم پر جو غائب تھا مجلس میں موجود نہ تھا اس پر صلح کر لی، اب وہ آیا اور فیصلہ کر دیا تو یہ درست ہے۔ محیط میں ایسا ہی ہے۔ اگر دونوں نے صلح کر لی کہ ہمارے درمیان فلاں یا فلاں فیصل ہوگا اب ان دونوں میں سے جو بھی فیصلہ کرے درست ہے" (ہندیہ ۳/۳۹۸)۔

ابو الولید باجی فرماتے ہیں: "اگر زوجین نے ایک حکم جو حکم کی اہلیت رکھتا ہو بنا دیا تو یہ جائز ہے۔ ابن القاسم مدونہ میں لکھتے ہیں کہ ایک حکم کا تقرر زوجین کے لئے تو روا ہے لیکن سلطان یہ حق نہیں رکھتا کیوں کہ اس صورت میں زوجین کے حق کو ساقط کرنا لازم آتا ہے" (اوجز المسالک ۴/۵۴۵)۔

علامہ ابن عابدین کہتے ہیں: "(قوله حاكما) المراد به مايعم الواحد أو المتعدد" (رد المحتار ۴.۴۱۲) "فإذا تحاكم رجلان إلى رجل حكماه بينهما ورضياه وكان ممن يصلح للقضاة فحكم بينهما جاز ذالك ونفذ حكم عليهما" (اعلاء السنن ۱۵.۲۸۰) "هل للزوجين إقامة حكم واحد بد لا من إثنين والجواب: نعم، نص عليه المالكية" (الموسوعة الفقهيه ۲۹.۵۶)۔ ایک دوسری تحریر مفسر قرطبی کی پیش ہے: "ويجزئ إرسال الواحد لأن الله سبحانه حكم في الزنا بأربعة شهود ثم قد أرسل النبي ﷺ إلى المرأة الزانية انيسا وحده وقال له إن اعترفت فارجمها وكذلك قال عبد الملك في المدونة قلت وإذا جاز إرسال الواحد فلو حكم الزوجان واحداً لأجزأ وهو بالجواز أولى إذا رضيا بذالك" (تفسير القرطبي ۵.۱۱۶) مذکورہ تمام دلائل سے ایک حکم کا ثبوت ملتا ہے لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک دو حکم کا تقرر ضروری ہے: "والشافعية يقولون بعدم الاكتفاء بواحد للأية فابعثوا حكما" الخ (الموسوعة الفقهية ۲۹.۵۷)۔

گذشتہ تحریروں سے یہ واضح ہو چکا ہوگا کہ ائمہ اربعہ کے نزدیک تحکیم (ثالثی) کا کیا درجہ ہے۔ لیکن اب حکمین کی کیا حیثیت ہوگی؟ اس کے متعلق عرض ہے کہ یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے، جمہور کی رائے یہ ہے کہ ان کی حیثیت وکیل کی ہوگی اگر فریقین نے انہیں فسخ وتفریق کا وکیل بنایا ہے تب تو تفریق کر دیں گے ورنہ نہیں، ان کا کام صرف اصلاح حال ہوگا (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۵۲۸)۔

"وهذا مذهب عطاء و أحد قولي الشافعي وحكي ذالك عن الحسن وأبي حنيفة لأن البضع حقه والمال حقها وهما رشيدان فلا يجوز يعزهما التصرف فيه إلا بوكالة منهما أو ولاية عليهما (المغني مع الشرح الكبير ۸.۱۶۷) برخلاف اس کے امام مالک وامام اوزاعی وغیرہ کے یہاں ان کی حیثیت حاکم کی ہوگی (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۵۲۸)۔

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ زوجین کی توکیل اور ان کے اذن کے بغیر حکمین تفریق کر سکتے ہیں، وہ سلطان کے مشابہ نہیں اور سلطان کی نگاہ میں جب ضرر واضح ہوتا ہے تو وہ طلاق دیدیتا ہے پھر اللہ نے آیت کے اندر خود ان پر حکمین کا لفظ استعمال کیا ہے جس میں زوجین کی رضا کا اعتبار نہیں ہے۔ مفسر قرطبی لکھتے:

ہیں: ''وتفريقهما جائز على الزوجين سواء وافق حكم قاضي البلد أو خالفه وكلهما الزوجان بذالك أو لم يوكلهما ... وإن للحكمين التطليق دون توكيل وهو قول مالك والأوزاعي وإسحاق وروى عن عثمان وعلى وابن عباس وعن الشعبي والنخعي وهو قول الشافعي ''(قرطبي ۵.۱۱۵-۱۱۶، معالم التنزيل ۱.۴۲۴، المغني مع الشرح ۸.۱۶۸) علامہ قرطبی ایک مقام پر اور لکھتے ہیں ''وأما قوله يرضى برضى الزوجين وتوكيلهما فخطأ صراح'' (۵.۱۱۷)۔ حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی زید مجدہ کا رجحان بھی مالکی مسلک کی جانب ہے، موصوف تحریر کرتے ہیں ''وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها'' میں متعدد قرائن ہیں جو مالکی موقف کی تائید کرتے ہیں۔

اس آیت کے مخاطب قضاۃ وحکام ہیں اکثر مفسرین اور خود ابوبکر جصاص رازی کی یہی رائے ہے۔ قرآن نے حکم کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حکم کے معنی خود فیصلہ کرنے والے کے ہیں۔ قرآن نے ''ان یریدا اصلاحا'' کہا ہے پس حکمین کی طرف ارادہ اور چاہئے کی نسبت کی گئی ہے اور یہ بات اس کے بارے میں کہی جاسکتی ہے جو کسی کام کے کرنے اور اس کے خلاف اقدام کرنے کا اختیار رکھتا ہے، نیز اس کی تائید میں حضرت موصوف نے حضرت ثابت بن قیس والی مشہور حدیث اور حضرت ثابتؓ ہی کے واقعہ پر مشتمل ایک دوسری روایت حضرت عائشہؓ سے جس کی تخریج امام ابوداؤدؒ نے کی ہے، پیش فرمائی ہے، ساتھ ہی اپنے دعویٰ کو آثار صحابہ سے مبرہن فرماتے ہوئے اخیر میں تحریر کرتے ہیں ''اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ حکم بحیثیت حکم خود ہی تفریق کے معاملہ میں مختار ہوتا ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ دونوں ہی حکم کسی ایک رائے پر متفق ہوں (قاموس الفقہ ۳/۳۶۶)۔

فقیہ النفس حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ نے اس صورت میں جبکہ شوہر بخوشی خلع کرنے یا طلاق بالعوض یا طلاق بلاعوض پر راضی نہ ہو تو چند صورتیں گلوخلاصی کی تحریر فرمائی ہیں جس میں سے ایک توکیل زوجین کی ہے (جسے سارے ہی ائمہ تسلیم کرتے ہیں)، ایک صورت طلاق مغلظہ یا شرط کے اقرار نامہ کی ہے، جور وتعدی وعدم ادائیگی نفقہ کی صورت میں وہ طلاق پڑ جائے گی۔ راقم کہتا ہے کہ کبھی شقاق کا باعث صرف طبعی عدم موافقت ہوتی ہے اور عورت کسی طرح شوہر کے ساتھ گوارہ کرنے پر رضامند نہیں ہوتی۔ اس وقت حضرت قاضی صاحب علیہ الرحمہ کی ذکر کردہ دونوں صورتیں مفید وسودمند نہ ہوں گی، ایسی صورت میں لامحالہ فقہ مالکی کے بموجب اس کا حل نکالنا ہوگا (تفصیل کے لئے دیکھئے قضایا سجاد از ۱۲۸ تا ۱۳۳)۔

مذہب غیر پر فتوی دینے کے لئے رسائل ابن عابدین ا/ ۱۶۳، عالمگیری ا/ ۱۴۳، رسم المفتی/ ۷۵، فتاوی رشیدیہ/ ۲۴۰، جواہر الفقہ ا/۱۲۶ پر تحریریں موجود ہیں، ساتھ ہی رد المحتار علی الدر ۵/ ۴۲ پر علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں: ''مطلب: مال أصحابنا الى بعض أقوال مالك ضرورة'' اور انہیں کی عبارت ''وكان يجب ماخفف عن امته والدين يسر'' (۷.۴۰)۔وقد قال في البزازيه الفتوي في زماننا على قول مالك وقال الزاهدى كان بعض اصحابنا يفتون به للاورة'' (شامی ۶.۲۶)۔ الحیلۃ الناجزہ/ ۹۱ پر یہ تحریر موجود ہے "افتاء بمذاهب الغير ہر زمانہ میں جائز ہے بشرطیکہ سخت ضرورت ہو کہ مذہب غیر کے بدون کوئی تکلیف نا قابل برداشت آجائے"۔

''سور الكلب والخنزير نجس خلافا لمالك وغيره ولو أفتى بقول مالك جاز'' (عقد الجيد. ۴۳)، عدول عن المذہب کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر وہبہ زحیلی فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ اس صورت میں پیدا ہوگا جو محل اجتہاد وقیاس ہو (اختلافات ائمہ کی شرعی حیثیت/ ۱۰۵)۔

مفقود الخبر کے سلسلہ میں حضرت تھانوی نے ضرورۃ فقہ مالکی کے مطابق اور حفظ کرنے والے طلباء کے لئے حدث کے پیش آنے پر وضوء کے بجائے تیمم اور جانوروں کی ادھیا (بٹائی) پر دینے کے سلسلہ میں (اجارہ پر منطبق نہ ہونے کی صورت میں) فقہ حنبلی کے مطابق فتوی دیا نیز ممتدۃ الطہر عورت کی عدت، شوہر میں بعض عیوب وامراض کی بنا پر تفریق، تعلیم قرآن واذان وامامت پر اجرت اور دلالی کے کاروبار وغیرہ مسائل میں فقہاء حنفیہ نے دیگر مذاہب کے مطابق فتاوے دیئے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے اختلافات ائمہ کی شرعی حیثیت ۱۰۳ تا ۱۰۹)، ذیل میں ایسی مثالیں دی جارہی ہیں جس میں خود مجتہد مطلق مستقل یا مجتہد مطلق منتسب نے دوسرے کے مذہب پر عمل کیا ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نیز امام شافعی رحمہم مدینہ کے مالکی ائمہ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، حالانکہ حضرات مالکیہ نہ بسم اللہ سراً پڑھتے تھے نہ جہراً۔ امام احمد بن حنبلؒ رعاف اور حجامت سے نقض وضوء کے قائل تھے، ان سے کہا گیا کہ اگر امام کو خون نکل جائے اور وہ تجدید وضوء نہ کرے تو کیا آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے، انہوں نے جواب دیا کہ میں امام مالک اور سعید بن المسیب کے پیچھے نماز کیوں نہ پڑھوں گا۔

لیجئے وہ مثالیں جن میں علمائے مقلدین نے اپنے امام کی تقلید چھوڑ کر دوسرے مسلک پر عمل کیا ہے، ابوثور حنبلی تھے، ابن عبدالحکیم مالکی تھے، عبدالعزیز بن عمر بھی مالکی ہی تھے مگر ان تینوں نے فقہ شافعی پر عمل کیا، اسی طرح امام سمعانی نے بھی فقہ شافعی پر عمل کیا جبکہ وہ حنفی تھے (اختلافات ائمہ کی شرعی حیثیت ۴۷ تا ۷۷)۔

کتب فقہ وفتاوی میں اس طرح کے بہت سارے نظائر ہیں مگر ہاں اتنا ضرور ہے کہ مذہب غیر پر عمل کرنے میں ضرورۃ شدیدہ داعی ہو اور اس صورت میں تلفیق وغیرہ (جو اباحیت کے مرادف ہے) لازم نہ آئے۔

## خلاصۂ جوابات

۱۔ تفصیلات مقالہ میں موجود ہیں۔

۲۔ عورت ومرد کے حقوق میں یکسانیت نہیں۔ عورت صرف شوہر سے خلع کا مطالبہ کرسکتی ہے۔

۳۔ فقہ مالکی کے مطابق فیصلہ کی گنجائش نکلنی چاہئے۔

۴۔ اس کے متعلق تفصیلات مقالہ میں موجود ہیں۔

۵۔ چونکہ جمہور ائمہ کے نزدیک تراضی شرط ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک حکمین کا تقرر ضروری ہے، اس لئے ان دونوں شرطوں کے فقدان کے باعث قاضی کو محض شقاق کے باعث خلع کا اختیار نہیں ملنا چاہئے۔

۶۔ جن حضرات کے یہاں خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں ان کے یہاں بھی حکمین کا تقرر ضروری ہے، حکمین کی کوشش کے بعد ہی خلع معتبر ہوگا۔ نیز ایک حکم کا تقرر بھی بشرطیکہ زوجین نے متعین کیا ہو درست ہے۔ امام شافعیؒ کے یہاں دو حکم ضروری ہیں۔

۷۔ افتاء بمذہب الغیر یا عدول عن المذہب درست ہے بشرطیکہ ضرورت شدیدہ داعی ہو اور تلفیق وغیرہ لازم نہ آئے۔ نیز یہ عدول اجتماعی غور وخوض کے بعد ہو۔



# شقاق بین الزوجین

مفتی حافظ سید صادق محی الدین فہیم [1]

ایک مردوعورت کے درمیان شرعی حکم کے مطابق معاہدہ کے ذریعہ رشتہ نکاح قائم ہوتا ہے، اس نکاح کی حیثیت اساسی طور پر سنت وعبادت کی ہے چونکہ نکاح ایک معاہدہ ہونے کے باوجود عبادت کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے معاہدہ نکاح میں شریعت اسلامیہ نے کچھ شرائط عائد کی ہیں ان کا پاس ولحاظ منشاء الٰہی کی تعمیل کا موجب اور آسودہ زندگی کی تکمیل میں ممد ومعاون ہے۔

اسلام نے رشتہ نکاح کے قیام اور اس کی بقا کے لئے اخلاقی وقانونی ہدایات دی ہیں ان پر مخلصانہ عمل سے بہت حد تک ازدواجی زندگی کامیاب اور پُرسکون رہتی ہے۔ مردوزن دونوں یا ان میں سے کوئی ایک اسلام کے ان اخلاقی وقانونی ہدایات سے صرف نظر کرلے یا ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت اور اس کی پاسداری نہ کرسکے تو اس سے الفت کے بجائے باہم اختلاف وکشیدگی کے حالات رونما ہوجاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں قرآن پاک نے زوجین کے درمیان مصالحت کے ذریعہ اس مشکل سے نکلنے کا راستہ دکھایا ہے۔ ارشاد ہے:

"ان دونوں کے درمیان اگر تم شدید اختلاف کا خوف کرو تو ایک حکم مرد کی طرف سے اور ایک حکم عورت کی طرف سے روانہ کرو اگر یہ دونوں آپسی اختلاف دور کرکے اصلاح کرلینا چاہیں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کے درمیان موافقت کے حالات بنادیں گے اور اللہ علیم وخبیر ہے"۔

دراصل اسلام کا مقصود یہ ہے کہ یہ رشتہ تاحیات پائیدار رہے۔ اگر احیانا ایسے حالات بن جائیں جو تعلقات کو کشیدہ کردیں اور اس رشتہ نکاح کے استحکام کو متزلزل کردیں تو پھر معاشرہ کے ذمہ داروں کا فرض ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دونوں کے درمیان اصلاح حال کی ہر ممکنہ تدبیر اختیار کریں اور رشتہ نکاح کو ٹوٹنے سے حتی المقدور بچانے کی سعی کریں۔ اصلاح حال کی مناسب تدابیر اختیار کرکے رشتہ کی برقراری کو ہر حال میں ترجیح دیں یہ اس لئے ضروری ہے کہ اس بندھن کے ٹوٹنے سے صرف دونوں کی زندگی متاثر نہیں ہوتی بلکہ اولاد کی زندگی اور ان کا مستقبل بھی داؤ پر لگ جاتا ہے یہ دونوں کا اختلاف بسا اوقات حد سے تجاوز کرکے دوخاندانوں کا اختلاف بن جاتا ہے، اصلاح حال کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہو اور دونوں کے درمیان موافقت وموانست کی بظاہر کوئی صورت ممکن العمل نہ ہو اور اس رشتہ کی برقراری سے اخلاقی حدود کی پامالی کا خوف وخطرہ ہو تو اس صورت حال میں ناگواری کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے اسلام مجبور نہیں کرتا بلکہ طلاق یا خلع کے ذریعہ قید نکاح سے اپنے آپ کو آزاد کرلینے کا اختیار دیتا ہے۔

ارشاد ہے: "اگر دونوں اس بات کا خوف کریں کہ وہ حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو دونوں پر کچھ حرج نہیں کہ عورت فدیہ یا مالی معاوضہ دے کر چھٹکارا حاصل کرلے"۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عورت کو دیئے گئے حق خلع کا اس آیت پاک میں ذکر فرمایا ہے۔ کسی وجہ سے عورت رشتہ ازدواج کو برقرار رکھنا نہ چاہے تو بوقت عقد شوہر کی طرف سے دیئے گئے مال مہر کی واپسی کا پیش کش کرکے شوہر سے خلع کی خواہش کرے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ایک عورت شوہر کی رضامندی کے بغیر ایک طرفہ طور پر بذریعہ خلع رشتہ نکاح کو ختم کرلینے کی مجاز ہے۔ ظاہر ہے نبی رحمت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل اس کی تائید میں نہیں۔ چنانچہ ثابت بن قیس کی بیوی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں ثابت بن قیس سے ان کی دینداری یا ان کے اخلاق کی بنیاد پر ناراض نہیں ہوں اور اسلام کی نعمت مل جانے کے بعد میں ناشکر گزار رہنا نہیں چاہتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم ان کا دیا ہوا باغ واپس کرنا چاہتی ہو انہوں نے کہا ہاں یا رسول اللہ! پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس ؓ کو ہدایت فرمائی کہ باغ واپس لے لو اور اس کو طلاق دے دو (بخاری: ۲/ ۷۹۴)۔

---

[1] صدر نشین دار القضاء والافتاء، رکن معزز آندھرا پردیش اسٹیٹ حج کمیٹی

ابو جریرؒ نے دریافت کیا کہ کیا خلع کی کوئی اصل ہے انہوں نے جواب میں فرمایا: عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دور اسلام میں پہلا خلع عبد اللہ بن ابی کی بہن کا ہوا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئیں اور عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میرا اور ان کا سر ایک جگہ جمع نہیں رہ سکتا۔ میں اپنے خیمہ کے کنارے سے دیکھی کہ وہ کچھ افراد کے ساتھ آرہے ہیں وہ ان میں سب سے زیادہ سیاہ اور قد میں کم اور شکل وشباہت میں ناپسندیدہ صورت تھے۔ ان کے شوہر نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نے ان کو اپنا پسندیدہ اور اچھا مال جو میرا باغ تھا ان کو دیا تھا اگر وہ میرا باغ لوٹا دیتی ہیں تو ٹھیک ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا تمہاری کیا رائے ہے تو وہ بولیں کہ ہاں میں وہ واپس کرنے کو تیار ہوں اور اگر وہ چاہیں تو کچھ زیادہ دینے کو بھی تیار ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے درمیان تفریق کروادی (تفصیل کیلئے دیکھئے: تفسیر روح المعانی ۱ر ۱۳۷)۔

اسی لئے فقہاء کرام نے کتاب وسنت کی روشنی میں خلع کو ایک معاہدہ قرار دیا ہے جس میں ایجاب وقبول شرط ہے، یعنی عورت شوہر سے کہے کہ مجھے اس مال مہر کے عوض خلع دیدے اور مرد اس کو قبول کرلے تو اس سے خلع واقع ہوتا ہے اور رشتہ نکاح ختم ہوجاتا ہے۔ چونکہ یہ معاملہ کم از کم مال مہر کی پیش کشی کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے شوہر نے اگر بوقت نکاح مہر نہ دیا ہو تو بوقت خلع مہر کی ادائیگی لازم نہیں رہتی، اور اگر بوقت نکاح مہر دیدیا ہو تو خلع کے لئے کم از کم اس مال مہر کے واپس لینے کا شوہر کو اختیار حاصل ہوجاتا ہے اور یہ خلع طلاق بائن کا حکم رکھتا ہے۔

## خلع کی فقہی واصطلاحی تعریف:

خلع کے معنی اتارنے کے ہیں، ''خلعت النعل، خلعت اللباس'' کے معنی ہیں: میں نے جوتا نکال لباس اتار دیا۔ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں: ''إزالة ملك النكاح ببدل بلفظ الخلع'' (فتح القدير ۱۹۹/۳)۔

(خلع کے لفظ کے ذریعہ عوض کے ساتھ نکاح کے رشتہ کو ختم کرنے کا نام خلع ہے)۔ ''مطلق لفظ الخلع محمول على الطلاق بالعوض'' (شامی ۶۷/۲) (مطلق طور پر خلع کے لفظ کا ذکر ہو تو اس کو طلاق بالعوض پر محمول کریں گے) کچھ خاص احوال میں بیوی اگر شوہر سے متنفر ہوجائے اور اس تنفر کی خواہ کوئی بنیاد ہو یا نہ ہو اور وہ شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی طے کرلے اور شوہر طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو اس صورت میں عورت کچھ مالی معاوضہ دینا طے کرکے شوہر کو خلع دینے پر رضامند کرسکتی ہے۔ کم سے کم درجہ میں وہ معاوضہ مال مہر ہے، بطور معاوضہ مال مہر واپس لینے کے بارے میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ نشوز ونافرمانی یا ظلم وزیادتی بیوی کی طرف سے ہو رہی ہو تو پھر شریعت نے اس کے لئے اجازت دی ہے، اور اگر ظلم وزیادتی شوہر ہی کی طرف سے ہو تو پھر خلع دیتے ہوئے اس مال کا لینا پسندیدہ نہیں ہے۔

فلا جناح عليهما فيما افتدت به سے استدلال کرتے ہوئے۔ شوہر نے جو کچھ دیا ہے اس سے زائد لینے یا نہ لینے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام مالک امام شافعی امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور ابوثور کہتے ہیں کہ جس پر وہ دونوں رضامند ہوں اس کا لینا جائز ہے، اگرچہ کہ شوہر نے جو کچھ دیا ہے اس سے وہ مالی فدیہ کم ہو یا زائد۔ حضرت عثمان بن عفان، قبیصہ اور نخعی سے یہی بات مروی ہے۔ اس آیت پاک کے علاوہ انہوں نے استدلال میں دار قطنی کی ایک حدیث نقل کی ہے جو پچھلے صفحات میں گزریں''۔

دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ جو کچھ شوہر نے دیا ہے اس سے زائد لینا جائز نہیں۔ یہ قول طاؤس، عطاء اوزاعی کا ہے۔ احمد واسحق نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ انہوں نے ابن جریج کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس سے زینب بنت عبد اللہ بن ابی ابن سلول کے رشتہ کے انقطاع میں جو باغ کے معاوضہ میں کیا گیا تھا بیوی کی طرف سے اس سے زیادہ دینے کی پیش کش کو حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہیں فرمایا بلکہ شوہر کی طرف سے دیا ہوا باغ واپس لوٹانے کی ہدایت دی۔ اور ثابت بن قیس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو قبول فرمایا۔ حضرت عطاء سے ایک روایت بھی انہوں نے اپنے استدلال میں پیش کی ہے۔ روى عن عطاء مرسلا أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ''لا يأخذ من المختلعة أكثر مما اعطاه'' (الدار قطني ۲۵۵/۳ في سننه، الجامع لاحكام القرآن ۱۴۳/۳)۔

امام مالک رحمہ اللہ نے نکاح کے معاوضے میں دیئے گئے مال سے زائد لینے کو مکارم اخلاق کے خلاف قرار دیا ہے۔

شوہر جب بیوی کی خواہش خلع کو قبول کرکے خلع دیدے تو اس سے خلع واقع ہوجاتا ہے۔ ائمہ اربعہ میں سب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ وہ مال کے پیشکش کی بنیاد پر ہونے والا معاملہ ہے۔ البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس خلع سے طلاق بائن واقع ہوتی ہے یا نکاح فسخ ہوتا ہے۔ بعضوں کے نزدیک خلع

طلاق بائن کے حکم میں ہے اور بعضوں نے اس کو فسخ نکاح قرار دیا ہے۔ ''واختلف العلماء فی الخلع هل هو طلاق أو فسخ؟ فروی عن عثمان وعن علی وجماعة من التابعین وهو طلاق وبه قال مالك والثوری والأوزاعی وأبو حنیفة وأصحابه الشافعی فی أحد قولیه ... وقال أبو ثور إذا لم یسمی الطلاق فالخلع فرقة ولیس بطلاق ... وممن قال إن الخلع فسخ ولیس بطلاق إلا أن ینویه إبن عباس وطاؤس وعکرمه وإسحق واحتجوا بحدیث عن ابن عیینة عن عمرو عن طاؤس أن إبراهیم بن سعد بن أبی وقاص سأله رجل طلق امرأته تطلیقتین ثم اختلعت منه أیتزوجها؟ قال نعم لینکحها لیس الخلع بطلاق'' (الجامع لاحکام القرآن ۳،۱۰۴)۔

اس اختلاف کی وجہ سے بعض مسائل میں بھی اختلاف آتا ہے، جیسے کسی عورت نے حسب قاعدہ اپنے شوہر سے خلع لے لیا اس کے بعد پھر دوبارہ انہوں نے حسب اجازت شرع اندرون عدت یا بعد انقضاء عدت تجدید نکاح کرلیا تو خلع سے طلاق بائن ہونے کی جو لوگ رائے رکھتے ہیں ان کے ہاں آئندہ شوہر کو صرف دو طلاق کا حق رہے گا اور جو لوگ خلع کو فسخ نکاح قرار دیتے ہیں اس صورت میں اس شوہر کو آئندہ تین طلاق کا حق حاصل رہے گا۔

اگر کوئی بیوی خلع چاہتی ہو تو ظاہر ہے کہ وہ بلا وجہ خلع کی طلب گار ہوسکتی ہے یا واقعی ناگزیر صورت کی وجہ سے۔ ان دونوں صورتوں میں خلع کو قبول کرلیا جانا باعث رحمت ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ ناگزیر صورت میں خلع قبول نہ کیا جائے تو گویا یہ ظلم کی صورت ہوگی۔ دوسری صورت ہو تو وہ عنداللہ گناہ گار ہوگی لیکن وہ رہنے کے لئے تیار نہ ہو تو زبردستی اس کو روکنا بھی بہتر نہیں ہوسکتا۔

احکام شرع کو ملحوظ رکھتے ہوئے زوجین خود اپنے طور پر باہمی رضامندی سے خلع کا مسئلہ حل کرسکتے ہیں، یا وہ دونوں مل کر ہر ایک کے خاندان سے ایک ایک فرد کو حکم مقرر کرسکتے ہیں۔ یا خاندان کے افراد بھی درمیان میں پڑ کر اس گتھی کو سلجھا سکتے ہیں اور معاملہ بہت ہی گمبھیر ہوجائے کسی طرح بھی سلجھنے نہ پائے تو حاکم سے بھی رجوع کیا جاسکتا ہے کہ قاضی اسلام ان دونوں کے خاندان سے حکم بنا کر یا از خود ان کے احوال معلوم کرنے کے بعد شوہر کو خلع دینے پر آمادہ کرسکتا ہے۔

چنانچہ عہد رسالت میں ثابت بن قیس اور ان کی زوجہ کے درمیان خلع کا جو معاملہ ہوا اس سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

## ایک طرفہ طور پر بیوی خلع کے ذریعہ شوہر سے جدائی اختیار کرسکتی ہے یا نہیں؟

ظاہر ہے کتاب وسنت اور شارحین کی تصریحات سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، البتہ اس دور میں بعض جدید رجحانات رکھنے والے اصحاب نے یہ سمجھا ہے کہ جس طرح مرد کو شریعت نے طلاق کا حق دیا ہے اسی طرح عورت بھی مرد ہی کی طرح ایک طرفہ طور پر لفظ خلع کے ذریعہ رشتہ نکاح کو ختم کرلینے کا اختیار رکھتی ہے۔ البتہ وہ شوہر کو مال مہر واپس کرنے کی پابند رہے گی۔ ان کے ہاں وقوع خلع کے لئے مرد کی قبولیت لازم نہیں۔ ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف (پ ۲: جزء آیت) (اور عورتوں کے بھی ویسی ہی حقوق ہیں جیسے ان پر مردوں کے ہیں عرف ودستور کے مطابق) سے استدلال کرتے ہوئے انہوں نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے۔ ظاہر ہے اس آیت پاک میں دونوں کے درمیان ایک درجہ کی مساوات مانی گئی ہے اور وہ معاشرتی مسائل میں مساوات ہے اور اس آیت پاک میں اسی طرف اشارہ ہے۔

اور ان کے اشکال کا جواب اسی آیت پاک کے اگلے جز میں موجود ہے: ''وللرجال علیهن درجة'' (لیکن مردوں کا ان عورتوں کے مقابل کچھ درجہ زیادہ ہے)۔ اس آیت پاک کے جز سے واضح ہے کہ ایک مرد عورت کو طلاق دے سکتا ہے لیکن عورت از خود شوہر کی رضامندی کے بغیر رشتہ ازدواج کو ختم نہیں کرسکتی۔

۳۔ سطور بالا سے واضح ہے کہ کوئی عورت ایک طرفہ طور پر رشتہ نکاح کو ختم نہیں کرسکتی اگر یہ صورت حال ہو جیسے کہ سوال میں بیان کی گئی ہے تو عورت کے لئے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ وہ قاضی اسلام سے اس مسئلہ کو رجوع کرے اور قاضی اسلام اگر بیوی کے اس شدید تنفر کو محسوس کرے تو بینہ کے بغیر بھی وہ چاہے تو مرد کو طلاق دینے پر آمادہ کرسکتا ہے یا بیوی کے طلب خلع کو قبول کرلینے پر مجبور کرسکتا ہے۔ ورنہ وہ خود بھی دونوں کے درمیان تفریق کردینے کا مجاز ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں جو اس طرح کے مقدمات پیش ہوئے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی اسلام ایسی عورت کو شوہر کے ساتھ گزارا کرلینے کی فہمائش کرسکتا ہے لیکن اسے خواہش خلع سے دستبردار ہونے کے لئے مجبور نہیں کرسکتا۔ چونکہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے ارشاد: ''فان خفتم ان لا یقیما حدود اللہ'' کی رو سے طلب خلع کا حق دیا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ولا تمسکوهن ضرارا لتعتدوا'' (ان کو محض تکلیف پہنچانے کے لئے روکے مت رکھو کہ ان پر زیادتی کرنے لگو)۔

ایک سے زائد بیویوں والوں کو ہدایت دی گئی: "فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقۃ" (ایک بیوی کی طرف ہی بالکلیہ مائل نہ ہو جاؤ کہ دوسری کو معلق چھوڑ دو)۔ ان نصوص سے یہ بات واضح ہے کہ عورت کو نکاح میں رکھتے ہوئے اس سے بے تعلق رہنا یا محض تکلیف پہنچانے کی غرض سے روکے رکھنا مزاج اسلامی کے منافی ہے۔ امیر المؤمنین حضرت سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت اور مرد کا مسئلہ پیش ہوا تو آپ نے عورت کو نصیحت فرمائی کہ شوہر کے ساتھ زندگی گزارے۔ عورت نے اس رائے کو منظور نہیں کیا۔ اس کے بعد آپ نے گندگی اور کچرے سے بھرے ایک کمرے میں تین دن تک بند رکھا پھر اسے نکال کر آپ نے دریافت فرمایا: بتا اب تیرا کیا حال ہے؟ اس نے کہا اللہ کی قسم انہیں راتوں میں مجھے کچھ راحت نصیب ہوئی، اس کے جواب سے اندازہ ہو گیا کہ اس کا شوہر کے ساتھ زندگی گزارنا اس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے شوہر کو حکم دیا کہ اس کو خلع دیدے اگر چہ وہ اس کے کان کی بالیوں کے معاوضہ ہی میں کیوں نہ ہو۔ بیوی کے دل میں شوہر کی طرف سے تنفر پیدا ہو گیا ہو تو جبری طور پر ان دونوں کو ایک ساتھ زندگی گزارنے کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ دینی اخلاقی اور تمدنی ہر لحاظ سے اس کے نتائج حد درجہ خراب ثابت ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ثابت بن قیس کی بیوی سے متعلق خلع کے واقعہ میں حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیوی کو ان وجوہات کی بنا جوان کے لئے ناپسند تھی جیسے ان کا سیاہ فام ہونا وغیرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیوی کو شوہر کی دینداری کا لحاظ کرتے ہوئے ساتھ رہنے کا مشورہ دے سکتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مناسب نہیں سمجھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش اسلوبی کے ساتھ ان دونوں کو آپس میں مفارقت کی راہ اختیار کر لینے کا مشورہ دیا۔ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نفرت کے اسباب جاننے کے لئے ایک تدبیر اختیار فرمائی یعنی اس کو ایک نامناسب جگہ قید کر دیا۔ اس سے مقصود اسباب نفرت کی جانکاری حاصل کرنا تھا لیکن اس کی گفتگو سے انہیں یقین ہو گیا کہ وہ اپنے شوہر سے حد درجہ نفرت رکھتی ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ قاضی اسلام چاہے تو تحقیق کے لئے کوئی مناسب تدبیر اختیار کر سکتا ہے۔ عورت کی گفتگو سننے کے بعد امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے نفرت وکراہت کے اسباب کی مزید کوئی کھوج نہیں فرمائی اور اس کے شوہر کو خلع دیدینے کی ہدایت فرمائی۔ اسی سے یہ بات بھی مفہوم ہوتی ہے کہ تنفر کئی ایک وجوہات کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ان وجوہات کو بیان کیا جا سکے یا بیان کیا جائے تو سننے والے نفرت کی بنیاد کے لئے اس کو کافی سمجھیں۔ ان حالات میں اس بات کا تحقق جواز خلع کے لئے کافی ہے کہ عورت شوہر سے متنفر ہے۔

## شقاق سے کیا مراد ہے؟

شقاق کے معنی مخالفت اور عداوت کے ہیں اور اس کا اشتقاق الشق ہے۔ شق کے معنی جانب یا کنارے کے آتے ہیں چونکہ دونوں دشمنی وعناد کی وجہ ایک دوسرے سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں، اسی لئے اس میں یہ معنوی مناسبت ہے۔ اور وہ مخالفت ایک کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے یا ہر ایک دوسرے کا مخالف ہو سکتا ہے، یہ اصل میں شقاق بینہما ہے، اس میں شقاق کی اضافت ظرف کی طرف توسعاً کی گئی ہے۔ شقاق بینہما اس لئے فرمایا گیا ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک وہ چاہتا ہے جو دوسرے پر شاق ہو یا یہ کہ فریقین نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ الگ الگ ہو۔

اصلاً شقاق یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے ساتھ مخالفانہ روش اختیار کرے، آپس میں محبت والفت، رأفت ورحمت کے بجائے دشمنی وعداوت، ناراضگی وکدورت جگہ لے لے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف سے شقاق ہو، لفظ شقاق چونکہ مفاعلت کا مصدر ہے اور یہ اشتراک کے معنی دیتا ہے۔ اس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ہر دو طرف مخالفت موجود ہو تب ہی اس کو شقاق کہا جا سکے گا، لیکن بعض ائمہ لغت نے مفاعلت میں اشتراک کو لازم نہیں سمجھا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۳۷، سورہ نساء آیت نمبر ۱۱۵، سورہ انفال آیت نمبر ۱۳، سورہ حشر آیت نمبر ۴ میں شقاق کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ جیسے ایک جگہ فرمایا گیا: ''ومن یشاقق اللہ والرسول'' (یعنی جو کوئی نافرمانی کرے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اس طرح کی آیات میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشتراک کے مفہوم کا کوئی تصور کسی بھی صورت میں ممکن نہیں۔ لفظ شقاق مفاعلت کا مصدر ہونے کے باوجود ان آیات میں اشتراک کے معنی کی نفی ثابت ہے (دیکھئے: روح المعانی ۳؍۳۸، مدارک التنزیل، روائع البیان وغیرہ)۔

۵۔ زوجین کے درمیان مخالفت ومعاندت خواہ کسی ایک کی طرف سے ہو یا دونوں کی طرف سے ہر صورت میں زندگی میں تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور یہی چیز باہم نفرت پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ ان جیسے احوال میں کتاب وسنت میں رہنمایانہ خطوط ملتے ہیں، شقاق کسی بھی وجہ سے ہو ازدواجی زندگی کے سکون کو درہم برہم کر دیتا ہے اور ازدواجی زندگی سے خوشگوار احوال میں جو سکون حاصل ہو سکتا ہے وہ ناخوشگوار حالات کی بنا پر زندگی سے رخصت ہو جاتا ہے۔ سورۃ النساء: آیت نمبر ۳۴ میں اصلاح حال کی مختلف تدابیر بتائی گئی ہیں ان میں اولاً وعظ ونصیحت، باہمی مفاہمت دوسرے درجہ میں خواب گاہ سے علیحدگی اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہو تو ہلکے انداز میں تادیب وغیرہ اختیار کی جا سکتی ہے۔ زوجین از خود مفاہمت کی راہ اختیار کر سکتے ہیں، یا پھر طلاق یا خلع کے ذریعہ قید نکاح سے آزادی

حاصل کر کے اپنا مسئلہ حل کر سکتے ہیں سورۂ نساء، آیت نمبر ۳۵ کی روشنی میں حکمین کا تقرر کر کے اپنے درمیان واقع اختلاف کی خلیج کو پاٹا جاسکتا ہے۔ حکمین کا تقرر دراصل اسلام نے اصلاح حال کے لئے تجویز کیا ہے، خاندان کے بزرگوں نے اگر حکم مقرر کئے ہوں یا قاضی اسلام نے، ان کا کام زوجین کے درمیان اصلاح حال کی ہی کوشش ہو، جہاں تک دونوں کے درمیان تفریق کرنے کا سوال ہے اس میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ میاں بیوی نے اگر اپنے درمیان حکم مقرر کئے ہوں تو وہ صرف اصلاح حال کی کوشش کر سکتے ہیں، البتہ بیوی کی طرف سے مقرر کردہ حکم کو بیوی نے صلح کرادینے یا دونوں کے درمیان خلع کروادینے کا اختیار دیا ہو، اسی طرح شوہر نے دونوں کے درمیان صلح یا طلاق و خلع کا اختیار تفویض کر دیا ہو اور اس صورت میں وہ تفریق کا فیصلہ کریں تب تو یہ فیصلہ معتبر ہوگا، خواہ وہ طلاق کی صورت میں ہو یا خلع کی صورت میں۔ امام جصاص رازی حنفیؒ لکھتے ہیں: ''قال اصحابنا ليس للحكمين أن يفرقا إلا برضى الزوجين'' (احکام القرآن، ۲۲۹.۲) (ہمارے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ میاں بیوی کی رضامندی ہو تو حکمین ان کے درمیان تفریق کر سکتے ہیں

حکمین کا قاضی نے تقرر کیا ہو اور میاں بیوی نے انہیں تفریق وغیرہ کا کوئی اختیار نہ دیا ہو اس صورت میں کیا ان کے درمیان حکمین تفریق کے مجاز ہوں گے یا نہیں؟ اس بارے میں بھی فقہاء کی آراء مختلف ہیں، بعضوں کی رائے یہ ہے کہ اس صورت میں حکمین کو تفریق کر دینے کی اجازت نہیں، اگر وہ تفریق کریں گے تو شرعاً نافذ نہیں ہوگی، چنانچہ امام جصاص رازی حنفی فرماتے ہیں: ''لايجوز إيقاع الطلاق من جهتهما من غير رضى الزوج وتوكيله ولإخراج المهر عن ملكها من غير رضاها فلذلك قال أصحابنا إنهما لايجوز خلعهما إلا برضى الزوجين فقال أصحابنا ليس للحكمين أن يفرقا إلا برضى الزوجين'' (احکام القرآن ۲.۲۲۹)۔

حکمین اصلاح حال کی کوشش تو کر سکتے ہیں لیکن تفریق کا فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں، البتہ جو بات ان کو بھلی معلوم ہو یا جو بات ان دونوں کے لئے خیر کی محسوس کرتے ہوں وہ اس کا مشورہ دے سکتے ہیں، لیکن زوجین پر اپنی رائے مسلط نہیں کر سکتے، ہاں البتہ زوجین نے ان کو طلاق یا خلع یا کسی اور امر کے فیصلہ کرنے کا ان کو مجاز بنایا ہو اور ان کو اپنا وکیل تسلیم کیا ہو تب تو ان کا فیصلہ نافذ ہو سکتا ہے اور زوجین کے لئے اس فیصلہ کو مان لینا اور تسلیم کر لینا لازم ہو جاتا ہے۔

''وإن خفتم شقاق بينهما'' میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جہاں میاں اور بیوی میں ناموافقت ہو جائے وہاں نزاع سے انقطاع تک نوبت پہنچنے یا عدالت میں معاملہ جانے سے پہلے گھر کے گھر ہی میں اصلاح کی کوشش کر لینی چاہئے اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کے خاندان کا ایک ایک آدمی اس غرض کے لئے مقرر کیا جائے کہ دونوں مل کر اسباب اختلاف کی تحقیق کریں اور پھر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور تصفیہ کی کوئی صورت نکالیں۔ یہ پنچ یا ثالث مقرر کرنے والا کون ہو؟ اس سوال کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تا کہ اگر زوجین خود چاہیں تو اپنے اپنے رشتہ داروں میں سے خود ہی ایک ایک آدمی کو اپنے اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لئے منتخب کریں، ورنہ دونوں خاندانوں کے بڑے بوڑھے مداخلت کر کے پنچ مقرر کریں، اور اگر مقدمہ عدالت میں پہنچ ہی جائے تو عدالت خود کوئی کاروائی کرنے سے پہلے خاندانی پنچ مقرر کر کے اصلاح کی کوشش کرے۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ ثالثوں کے اختیارات کیا ہیں۔ فقہاء میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ ثالث فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔ البتہ تصفیہ کی جو صورت ان کے نزدیک مناسب ہو اس کے لئے سفارش کر سکتے ہیں، ماننا یا نہ ماننا زوجین کے اختیار میں ہے، ہاں اگر زوجین نے ان کو طلاق یا خلع کا فیصلہ کر دینے کے لئے اپنا وکیل بنایا ہو تو البتہ ان کا فیصلہ تسلیم کرنا زوجین کے لئے واجب ہوگا، یہ حنفی اور شافعی علماء کا مسلک ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک دونوں پنچوں کو موافقت کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے مگر علیحدگی کا فیصلہ وہ نہیں کر سکتے، یہ حسن بصری اور قتادہ اور بعض دوسرے فقہاء کا قول ہے۔ ایک اور گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ان پنچوں کو ملانے اور جدا کرنے کے پورے اختیارات ہیں۔ ابن عباس، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، شعبی، محمد بن سیرین اور بعض دوسرے حضرات نے یہی رائے اختیار کی ہے (تفہیم القرآن ۱/۳۵۱)۔

تحکیم کے سلسلہ میں علماء نے یہ بحث بھی کی ہے کہ عورت یا تو فرمانبردار ہوگی یا نافرمان، نافرمان ہو تو طبعی وفطری ہوگی یا عارضی، اگر فطری اور طبعی ہوگی تو ان میں تفریق کرادی جائے گی، جیسا کہ امام نسائی کی روایت ہے کہ حضرت عقیل بن ابی طالب کا نکاح حضرت فاطمہ بنت عتبہ سے ہوا۔ ان کے درمیان جب اختلاف رونما ہوا اور حاکم وقت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاں ان کا معاملہ پیش ہوا تو آپ نے حضرت ابن عباس، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کو ان کے معاملہ کا حکم مقرر فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے تفریق کروادینے کی تھی، جبکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا رجحان عدم تفریق کا تھا، لیکن جب دونوں وہاں پہونچے تو ان کے درمیان صلح ہو چکی تھی۔ امام قرطبی نے اس حدیث کے ضمن میں دو فریقوں کا ذکر کیا ہے: (۱) ایک جماعت کا رجحان یہ ہے کہ حکم بنائے جانے کی صورت میں ان کو تفریق کا اختیار بھی حاصل ہوگا اور یہ طلاق بائن کے حکم میں ہوگی۔ (۲) دوسرا فریق اس بات کا قائل ہے کہ حکم وکیل ہوگا جس کو زوجین کے درمیان تفریق کا اختیار نہیں ہوگا، جب تک کہ شوہر ان کو طلاق کا حق سپرد نہ کردے اور وہ حاکم وقت کو اس سے واقف کروائے، اور امام چاہے تو تفریق کر سکے

گا۔اس کو ابوثور، حسن، ابن زید، عطاء اور اہل کوفہ نے اختیار کیا ہے امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے۔امام قرطبی نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے یعنی حکمین کو تفریق کا حق حاصل ہے۔یہی بات امام مالک، اوزاعی، اسحق، حضرت عثمان، حضرت علی، ابن عباس، شعبی اور نخعی سے ثابت ہے اور ایک قول امام شافعی سے بھی ایسا ہی مروی ہے، زوجین کے ایک معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمانا: "اتدریان ما علیکما" سے استدلال کرتے ہوئے حکم کو تفریق کا مجاز گردانا گیا ہے۔حکم اگر صرف وکیل کا درجہ رکھتا تو ان کا کلام اس طرح ہوتا: "اتدریان بما وکلتما"۔حضرت امام اعظم رحمہ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول "لا تبرح حتی ترضی بما رضیت به" سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ شوہر کی رضامندی کے بغیر دونوں کے درمیان تفریق کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ (ملخص الجامع لاحکام القرآن ۵/۱۳۳)۔

البتہ فقہائے کرام میں امام مالک رحمہ اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ حکمین جس طرح دونوں کے درمیان مصالحت وموافقت پیدا کر سکتے ہیں اسی طرح ضرورت متقاضی ہو تو ان کے درمیان تفریق وجدائی کا فیصلہ بھی کرنے کے وہ مجاز ہیں۔ ''إن تعذر الإصلاح طلقا اي حكما بالطلاق ونفذ حكمهما ظاهراً وباطناً وإن لم يرضيا الزوجان بحكمهما أو لم يرضى الحاكم به'' (شرح صغیر ۲،۵۱۴)۔

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں: ''وتفريقهما جائز على الزوجين وكلهما الزوجان بذلك أو لم يؤكلاهما'' (الجامع لاحكام القرآن ۵،۱۱۵. النساء)۔

عن ابن عباس قال بعثت أنا ومعاوية حكمين فقيل لنا إن رأيتما أن تجمعا جمعتما وإن رأيتما أن تفرقا فرقتما'' (الجامع لاحكام القرآن ۳،۱۳۲)۔

۶۔ زوجین کا معاملہ حاکم کے پاس نہ پہنچا ہو از خود وہ کسی ایک کو حکم بنانے پر رضامند ہوں تو یہ امر درست ہے (الشرح الکبیر ۲/۵۱۵)۔البتہ حاکم عدالت کے پاس مقدمہ دائر ہو چکا ہو تب تو پھر زوجین کے قریبی اعزاء میں سے دو حکم مقرر کئے جائیں۔جیسا کہ آیت کریمہ سے صراحت ملتی ہے (الشرح الکبیر ۲/۵۱۵)۔

البتہ فقہائے مالکیہ کے ہاں جس طرح میاں بیوی کی طرف سے ایک حکم کا مقرر کیا جانا کافی ہے اسی طرح قاضی کو بھی اس کی اجازت ہے۔ان کا استدلال اس حدیث پاک سے ہے۔ایک عورت جس پر زنا کا الزام تھا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پاس حضرت انیس کو روانہ فرمایا کہ اگر وہ زنا کا اعتراف کرے تو اس کو رجم کر دو، جبکہ ثبوت زنا میں چار افراد کی گواہی کا اعتبار ہے (الجامع لاحکام القرآن ۳/۱۴۴)۔

مالکیہ کی رائے کے مطابق ایک حکم کا تقرر بھی کافی ہے۔حسب احوال حکمین کی کوشش کے بعد یا ضرورت داعی ہو تو اس طرح کی کوشش کے بغیر بھی قاضی اسلام دونوں کے درمیان تفریق کرادے تو موجودہ حالات میں اس کی اجازت ملنی چاہئے۔

۷۔ حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ جب کسی کو حکم مقرر کرتے تو عدالت کی طرف سے انہیں اختیارات بھی دیئے جاتے، چنانچہ عقیل بن ابی طالب اور ان کی زوجہ فاطمہ بنت عتبہ کا مسئلہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہیں نے شوہر کے خاندان سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو اور بیوی کے خاندان سے حضرت معاویہ بن ابی سفیان کو حکم مقرر کیا اور انہیں اختیار دیا کہ ان کے درمیان مفاہمت کو بہتر سمجھیں تو مفاہمت کروادیں اور اگر تفریق کو بہتر سمجھیں تو تفریق کروادیں۔ایک اور مسئلہ میں حضرت سیدنا علی رضی اللہ حکم مقرر کئے تو ان کو اختیار دیا کہ مفاہمت ممکن ہو تو ان کے درمیان جوڑ پیدا کردیں اور تفریق کو بہتر سمجھیں تو ان کو جدا کریں (الجامع لاحکام القرآن ۳/۱۴۳)۔

اس سے اس بات کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ حکم بطور خود جدائی کا اختیار نہیں رکھتے، البتہ حاکم عدالت اختیار دے تو ان کا فیصلہ عدالتی فیصلہ ہی کی طرح نافذ العمل ہو سکتا ہے۔ان اختلافات سے قطع نظر موجودہ حالات میں جب زوجین کے درمیان تنفر اس درجہ کا ہو کہ مفاہمت اس میں کارگر نہ ہو سکتی ہو اور رشتہ ازدواج کا انقطاع ہی ان کے حق میں بہتر سمجھا جا رہا ہو تو بوقت ضرورت شدید فقہائے مالکیہ کے رائے پر عمل کر کے اس مشکل کو حل کیا جا سکتا ہے۔پچھلے زمانوں میں فقہائے احناف نے بھی مفقود الخبر کے بارے میں فقہائے مالکیہ کی رائے پر عمل کیا ہے تا کہ فقہ حنفی میں اس مسئلہ کے حل کے لئے جو دشواری ہے اس کا حل نکل سکے۔فقط واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

☆☆☆

# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

مولانا خورشید احمد اعظمی [1]

بسا اوقات زوجین کے مابین مزاج میں عدم موافقت یا بعض دیگر وجوہات سے عقد نکاح کو ختم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، عام حالات میں شریعت نے عقد نکاح کو ختم کرنے کا حق صرف شوہر کو دیا ہے، البتہ اگر عقد نکاح کو ختم کرنے کی ضرورت ہونے کے باوجود شوہر طلاق نہیں دیتا یا طلاق پر راضی نہیں ہوتا تو قاضی یا جو اس کے قائم مقام ہو مثلاً شرعی پنچایت اس کو یہ حق ہوتا ہے کہ زوجین کے عقد نکاح کو فسخ کردے۔

شوہر کے طلاق دینے کی صورتوں میں سے ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ بنفس نفیس خود طلاق دے، دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کو طلاق دینے کے لئے وکیل بنادے، تیسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنا یہ حق عورت کو تفویض کردے، اور عورت خود اپنے کو طلاق دے، اس صورت میں عورت کو بھی حسب شرائط طلاق دینے کا اختیار ہوتا ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ شوہر کو بھی طلاق دینے کا حق اختیار رہتا ہے، ان مذکورہ صورتوں میں طلاق حاصل ہونے کے عوض میں عورت پر کوئی مال یا فدیہ واجب نہیں ہوتا، طلاق حاصل ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ عورت کسی عوض میں طلاق حاصل کرے یا شوہر معاوضہ لیکر طلاق دے اس صورت میں بھی طلاق شوہر کے دینے سے ہی پائی جاتی ہے، اس کو خلع سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس صورت کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ **خلع کی تعریف:** خلع، خاء کے فتحہ کے ساتھ، لغت میں اس کا معنی نکالنا، اتارنا ہے، الخلع کالمنع. النزع. (القاموس المحیط) قرآن کریم میں مذکور ہے "فاخلع نعلیك"۔

اور شرعی اصطلاح میں یہ لفظ خاء کے ضمہ کے ساتھ مستعمل ہے جس کا معنی ہے "عورت کی طرف سے کسی مال کے عوض میں شوہر کا طلاق دینا۔

"وبالضم طلاق المرأة ببدل منها أو من غيرها" (القاموس المحيط)۔

"والخلع بالضم: وهو استعارة من خلع اللباس لأن كل واحد منهما لباس للآخر. فإذا فعلا ذلك فكأن كل واحد نزع لباسه عنه" (المصباح المنير)۔

(اور خلع ضمہ کے ساتھ یہ استعارہ ہے لباس کے (خلع) اتارنے سے کیونکہ زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے لباس ہے لہٰذا جب انھوں نے خلع کیا تو گویا ہر ایک نے اپنا لباس اتار دیا)۔

صاحب "البحر الرائق" علامہ زین الدین ابن نجیم نے یہ تعریف کی ہے: "إزالة ملك النكاح المتوقفة على قبولها بلفظ الخلع أو ما في معناه" (البحر الرائق ۴، ۱۱۹)۔ (خلع یا اس کے ہم معنی لفظ کے ذریعہ ملک نکاح کا ازالہ جو کہ موقوف ہو عورت کے قبول کرنے پر)۔

عورت کے قبول کرنے پر اس لئے موقوف ہوتا ہے کہ بدل اور عوض اسی کو دینا ہے اس لئے اس کی رضا اور قبولیت لازم ہے۔ اس تعریف میں "بدل" یا عوض کا ذکر اگرچہ صراحۃً نہیں ہے لیکن "المتوقفة على قبولها" سے یہ مفہوم ہوتا ہے، کیونکہ بقیہ طلاق کی صورتیں عورت کے قبول کرنے پر موقوف نہیں ہیں۔

تاتارخانیہ وغیرہ میں ہے: "مطلق لفظ الخلع محمول على الطلاق بعوض (الدر المختار. شامی ۵، ۸۶)

فقہ مالکی کی کتاب "بدایۃ المجتہد" میں علامہ ابن رشد مالکی نے، ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اور ابن قدامہ مقدسی نے المغنی میں جو تعریفات و تشریحات کی ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خلع اس طلاق کو کہا جائے گا جو شوہر بیوی پر اس سے کوئی عوض اور مال لیکر واقع کرے۔

صاحب بدائع الصنائع نے خلع کی دو صورتیں بیان کی ہیں: خلع بغیر العوض اور خلع بالعوض۔ لکھتے ہیں: "واسم الخلع يقع عليهما. إلا أنه عند

[1]

الإطلاق ينصرف إلى النوع الثاني في عرف اللغة والشرع'' (بدائع الصنائع ۳٫۲۲۶)۔ (اور خلع کا اسم ان دونوں پر صادق آتا ہے مگر عند الاطلاق لغت وشرع کے عرف میں نوع ثانی کی طرف ہی لوٹتا ہے)۔

## خلع کا ثبوت:

خلع کا جواز کتاب اللہ کی آیت کریمہ کے اس حصہ سے ماخوذ ہے: ''فإن خفتم ألا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به'' (سورۂ بقرہ: ۲۲۹)۔ (اور اگر تم کو خوف ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ پائیں گے تو دونوں پر کچھ حرج اور گناہ نہیں ہے اس میں جو عورت، شوہر سے رہائی پانے کے لئے فدیہ میں ادا کرے)۔

نیز اس کی مشروعیت سنت سے بھی ثابت ہے۔ اور اس سلسلہ میں ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ جب ان کی بیوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے شوہر سے علیحدگی کی درخواست کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے استفسار کیا:

''اتردين عليه حديقته؟ قالت نعم. قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اقبل الحديقة وطلقها تطليقة'' (صحيح بخاری مع فتح الباری ۹٫۳۹۵) (کیا آپ ان کا باغ ان کو واپس کر دیں گی؟ انھوں نے کہا کہ: ہاں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت سے فرمایا: باغ قبول کرلو، اور ان کو ایک طلاق دیدو)۔

اس لیے تمام فقہاء اس کے جواز کے قائل ہیں سواء بکر بن عبداللہ المزنی کے وہ اس کے قائل نہیں ہیں کہ شوہر طلاق کے بدلہ، بیوی سے کچھ وصول کرے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''وانعقد الإجماع بعده على اعتباره'' (فتح الباری)۔ (ان کے بعد خلع کے معتبر ہونے پر اجماع ہو چکا ہے)۔

۲۔ صورت خلع میں بھی شوہر کی رضامندی ضروری ہے۔

شریعت کا منشاء نکاح منعقد ہو جانے کے بعد اس کا دوام اور بقاء ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف کے الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے: ''أبغض الحلال إلى الله الطلاق'' (سنن ابی داؤد حدیث: ۲۱۷۸)۔ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال اشیاء میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ طلاق ہے)

اور ایک دوسری حدیث میں وارد ہے: ''ايما امرأة سألت زوجها طلاقا من غير بأس، فحرام عليها رائحة الجنة'' (سنن الترمذی ۳٫۴۸۳، حدیث ۱۱۸۷) (جو عورت اپنے شوہر سے بغیر کسی تکلیف کے طلاق کا مطالبہ کرے تو اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے)۔

لیکن اگر نکاح کے بعد مزاج میں عدم موافقت یا کسی سبب سے ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ اس نکاح کو باقی رکھنے میں نفع سے زیادہ نقصان اور فتنہ کا اندیشہ ہے، ایک دوسرے کے حقوق میں کوتاہی ہو رہی ہو تو شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے اور اگر عورت کو اندیشہ ہے کہ وہ شوہر کے حقوق کو کسی وجہ سے نبھا نہ سکے گی تو اس کو اجازت ہے کہ کچھ مال دیکر شوہر سے طلاق حاصل کر لے۔ لیکن بہر صورت فرقت اور علیحدگی اسی وقت ہوگی جبکہ شوہر خود طلاق دے یا بدل لے کر بیوی کو علیحدہ کرنے پر راضی ہو، خلع لینے کے جواز کا مطلب اگر یہ سمجھا جاتا ہے کہ عورت مہر معاف کر کے جبراً یا عدالت کے ذریعہ شوہر کی رضامندی کے بغیر اس سے علیحدہ ہو جائے گی اور اس کو دوسری جگہ نکاح کرنے کی اجازت ہوگی تو خلع کا یہ مفہوم غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''مرد عورتوں کے محافظ اور ذمہ دار ہیں اس سبب سے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے جو انھوں نے اپنے مال میں سے خرچ کیا ہے'' (النساء: ۳۴)۔

اس آیت کی تفسیر میں مردوں کے مال خرچ کرنے (نفقہ اور مہر وغیرہ) اور اللہ تعالیٰ کے ان کو فضیلت دینے کے سبب مردوں کو جو فوقیت عورتوں پر حاصل ہے اس کی متعدد مثالیں مفسرین نے ذکر کی ہیں صاحب تفسیر البحر المحیط لکھتے ہیں: ''وقيل العقل والرأي وحل الأربع وطلب النكاح والطلاق والرجعة'' (البحر المحيط ۳٫۲۲۹)۔ (اور کہا گیا کہ (یہ فضیلت) عقل ورائے، اور چار بیویوں کے حلال ہونے، اور نکاح کے مالک ہونے (عند الشافعیہ) اور طلاق دینے اور رجعت کرنے (کا حق ہونے) میں ہے)۔

یہی بات تقریباً صاحب تفسیر نسفی نے بھی لکھا ہے (۱/ ۲۲۳) اور تفسیر مظہری ۲/ ۳۱۰ اور روح المعانی ۵/ ۲۳ میں بھی ان امثلہ کے ساتھ "الاستبداد بالطلاق" (طلاق کا خود مختار ہونا) کی صراحت ہے، جس سے معلوم ہوتا کہ بیوی کو نکاح سے علیحدہ اور الگ کرنے کا حق صرف شوہر کو ہے یا جس کو وہ تفویض

کردے یا وکیل بنادے، ملک العلماء علامہ کاسانی رحمہ اللہ نے خلع کی تشریح اور وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کیونکہ لفظ خلع طلاق پر دلالت کرتا ہے نہ کہ فسخ پر، اس لئے کہ وہ خلع سے ماخوذ ہے اور خلع بمعنی نزع ہے، اور نزع کا معنی لغت میں کسی چیز کو کسی چیز سے نکالنا ہے تو گویا کہ اس کے قول "خلعھا" کا معنی ہے کہ اس کو نکاح کی ملک سے نکال دیا۔ اور یہی طلاق بائن کا معنی ہے اور فسخ نکاح کا مطلب اس کو بالکل ہی زائل کردینا ہے، اور اس کو ایسا بنادینا گویا کہ بالکل تھا ہی نہیں، تو اس میں اخراج (نکالنے) کا معنی نہیں پایا جائے گا'' (بدائع الصنائع ۳؍۲۲)۔

یہ بات اگرچہ انھوں نے ان لوگوں کی تردید میں کہا ہے جو خلع کے ذریعہ واقع فرقت کو فسخ کے معنی میں لیتے ہیں جبکہ احناف کے نزدیک اس سے واقع شدہ تفریق طلاق بائن ہوتی ہے، مگر اس ضمن میں یہ مفہوم بھی حاصل ہوتا ہے کہ طلاق دینے کا حق شوہر کو ہی ہے، اور خلع میں بھی تفریق اس کی رضا سے ہی ہوگی۔

''لایتم الخلع ولا تطلق حتی یقول الزوج خلعت'' (دیکھئے: البحر الرائق ۴؍۱۲۰ اور بدائع ۳؍۲۲۹)۔

صاحب بدایۃ المجتہد ابن رشد المالکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''والفقه أن الفداء إنما جعل للمرأة في مقابلة ما بيد الرجل من الطلاق'' (بدایۃ المجتہد ۲؍۸۴)۔ (اور خلع کے جواز میں حکمت یہ ہے کہ شوہر کے ہاتھ میں جو طلاق کا حق ہے اس کے مقابلہ میں عورت کیلئے فدیہ اور عوض دینا مقرر کیا گیا ہے)۔

اس کے باوجود انھوں نے بھی صراحت کیا ہے کہ: "جمہور اس قول پر ہیں کہ خلع باہمی رضامندی سے جائز ہے، جبکہ فدیہ دینے پر عورت کی رضامندی کا سبب شوہر کو ضرر پہنچانا نہ ہو یعنی بلا وجہ محض شوہر کو تکلیف پہنچانے کے لئے خلع من جانب زوجہ جائز نہ ہوگا)۔

اس حدیث کے سبب جس میں طلاق لینے کی ممانعت وارد ہے اور المغنی لابن قدامہ میں تو یہاں تک صراحت ہے کہ: ''ولا يحصل الخلع بمجرد بذل المال وقبوله من غير لفظ الزوج'' (المغنی ۱۰؍۲۷۶)۔ (اور محض مال خرچ کردینے اور شوہر کے بولے بغیر محض قبول کرلینے سے خلع حاصل نہیں ہوگا)۔

ان تمام فقہی عبارات سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ بغیر شوہر کی رضا یا طلاق دیئے صرف مہر معاف کرکے یا مال دیکر جبراً یا عدالت کے ذریعہ مطلقہ نہیں ہوسکتی، بلکہ جو لوگ خلع کے ذریعہ فسخ کے قائل ہیں ان کا مذہب بھی یہی ہے کہ شوہر کے طلاق دینے یا طلاق کے لئے مال متعین پر راضی ہونے سے ہی طلاق ہوگی، اختلاف صرف یہ ہے کہ خلع کے ذریعہ جو طلاق ہوگی وہ طلاق بائن ہوگی یا نکاح فسخ ہوگا اور اس پر دوسرے مسائل متفرع ہوتے ہیں۔

اس لئے اگر "عورت کو خلع لینے کا حق حاصل ہے" کا یہ مطلب لیا جائے کہ عورت عوض دیکر شوہر کی رضامندی کے بغیر حاکم، عدالت یا پنچایت کے ذریعہ علاحدہ ہوسکتی ہے تو اس خیال کی کہیں سے تائید نہیں ہوتی، یہ خیال غلط ہے عدالت اور پنچایت کے ذریعہ بھی تفریق ہوسکتی ہے، مگر اس کی نوعیت دوسری ہے اور اس کا موقع الگ ہے۔

## ۳۔ قاضی یا شرعی پنچایت کے ذریعہ تفریق بین الزوجین:

اگر عورت شوہر کی جانب سے شدید حد تک متنفر ہے اور اس تنفر میں شوہر کا کوئی اختیاری دخل نہیں ہے مثلاً وہ نان ونفقہ اور حقوق کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔ اس کی طرف سے کوئی ظلم، زیادتی اور تعنت بھی نہیں پایا جاتا بلکہ اس کا سبب شوہر کی بدصورتی، یا تعلیم کی کمی یا پیشہ وحرفت کا فرق ہے تو ان اسباب کی بنیاد پر قاضی یا شرعی پنچایت کو تفریق کا حق حاصل نہیں، عدم کفائت کی وجہ سے اولیاء مرأۃ کو فسخ نکاح کا خیار حاصل ہے، اس صورت میں جبکہ عورت نے اولیاء کی اجازت کے بغیر عدم کفو میں نکاح کرلیا ہو اور اگر عدم کفو میں نکاح پر اولیاء عورت کی رضا بھی شامل رہی ہو تو پھر انہیں بھی یہ خیار نہیں رہ جاتا، نیز کفائت کا اعتبار بھی ابتداء عقد نکاح میں ہے، لہٰذا نکاح ہوجانے کے بعد وہ کفائت زائل ہوتی ہے تو اس کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے۔

''والكفائة اعتبارها عند ابتداء العقد فلا يضر زوالها بعده، فلو كان وقته كفوئا ثم فجر لم يفسخ'' (الدر المختار ۲؍۲۱۷)۔

ابتداً اگر شادی اور نکاح کے وقت دونوں ہم مثل تھے، بعد میں دونوں کے درمیان کوئی فرق پیدا ہوگیا، عورت تعلیم میں آگے بڑھ گئی، یا جیسا کہ درمختار کی عبارت میں ہے کہ شوہر فاجر ہوگیا جبکہ اس کا تعلق دین سے ہے جس میں کفائت کا اعتبار متفق علیہ ہے تو بعد میں پیدا ہونے والی عدم کفائت اور فرق سے فسخ نکاح

کے جواز کا باب کھولنا کسی طرح درست اور مناسب نہیں، اس میں مفاد واصلاح سے زیادہ مضرت اور فساد کا امکان ہے۔

اس لئے ایسی صورت میں عورت کو چاہئے کہ اس بیجا تنفر کو دور کرے، دل میں اللہ کا خوف اور تقویٰ پیدا کرے، خلاف مزاج باتوں پر صبر کرے، کسی کے مزاج سے بھی مکمل موافقت ایک مشکل چیز ہے، اللہ کے رسول نے جو مردوں کو نصیحت کی ہے وہ عورتوں کے لئے بھی ہے، انہیں بھی اس کا لحاظ کرنا ضروری ہے، ارشاد نبوی ہے:

''لایفرك مؤمن مؤمنة إن كره منها خلقا رضي منها آخر أو قال غيره'' (صحيح مسلم كتاب الرضاع ۱۴۶۹، ۶۱)۔

(کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے بغض نہیں رکھتا، اگر اس کی کچھ عادتیں ناپسند کرتا ہے تو دوسری خصلتوں سے خوش ہوتا ہے)۔ اسی طرح عورت کو بھی چاہئے کہ اگر شوہر کی کچھ باتیں، حرکتیں ناپسند ہیں تو اس کی دوسری اچھی باتوں اور عادتوں کو جو اچھی ہیں انہیں پیش نظر رکھے، اور ناپسند باتوں کو نظر انداز کر کے نباہ کرے طلاق وتفریق کی کوشش نہ کرے، بلا وجہ طلاق کا مطالبہ بھی معصیت اور گناہ ہے۔

اس کے باوجود اگر بیوی کو اندیشہ ہے کہ وہ اپنے تنفر کی وجہ سے شوہر کے حقوق ادا نہ کر پائے گی تو اس کے لئے یہ صورت جائز ہے کہ شوہر کو کسی طرح خلع پر راضی کر لے، اس کے لئے کسی کو واسطہ اور ذریعہ بھی بنا سکتی ہے جیسا کہ حضرت ثابت بن قیس کی اہلیہ حبیبہ بنت سہل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو واسطہ بنایا، اور آپ نے خلع کے ذریعہ ایک مشکل کو حل فرمایا۔

اور اگر عورت کے تنفر کا سبب شوہر کی بد خلقی، عدم تدین، کمزوری یا حقوق کی عدم ادائیگی ہے، تو اس صورت میں بھی اس کی اولین کوشش یہی ہونی چاہئے کہ شوہر کو کسی طرح طلاق پر راضی کرے، خواہ بغیر کسی فدیہ اور مال کے یا فدیہ ومال دے کر۔

اور اگر شوہر اپنی زیادتی اور عدم ادائیگی حقوق سے باز نہیں آتا، اور نہ طلاق وخلع پر ہی آمادہ ہوتا ہے، اور عورت کو بھی اس کا غالب گمان ہے کہ وہ ان حالات میں مزید نباہ نہیں کر پائے گی بایں طور کہ اس کے نفقہ وغیرہ کا کوئی نظم نہیں ہو پاتا، یا اس کے معصیت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے (عصر حاضر کے معاشرہ میں عدم تقویٰ، اور فواحش کے عام ہونے سے یہ کوئی بعید بھی نہیں) تو اس عورت کے لئے یہ گنجائش ہے کہ وہ اپنے معاملہ کو مسلمان حاکم، قاضی اور ان کے نہ ہونے کی صورت میں شرعی پنچایت جس میں کم سے کم دو عالم سمجھدار، معاملہ فہم، مسائل سے واقف ہوں، ان کے سامنے اپنے قضیہ کو پیش کرے، وہ اس کے معاملہ کی تفتیش وتحقیق اور احوال وکوائف کا جائزہ لینے کے بعد اولاً شوہر کو سمجھائیں کہ وہ اپنی کوتاہی سے باز آجائے، ورنہ اسے طلاق یا خلع پر آمادہ کریں، اور شوہر کی طرف سے معاملہ کے حل کی کوئی صورت نہ ملنے پر بدرجہ مجبوری عورت کی درخواست پر اس نکاح کو فسخ کر دیں، کیونکہ شریعت میں منکرات اور تعدی سے روکنا بھی ایک فریضہ ہے۔

ضرر کو زائل کرنا بھی ایک امر معروف ہے، حدیث میں آیا ہے: ''لاضرر ولاضرار'' (سنن ابن ماجه ۴۱، ۲۳۴۰) (نہ نقصان پہنچانا ہے اور نہ ضرر پہنچانے میں تبادلہ)۔ اسی لئے مفتی بہ قاعدہ ہے: ''الضرر لایزال'' (الأشباه والنظائر ص: ۱۱۸)۔

الحیلۃ الناجزہ میں زوجۂ متعنت کی تفریق یا فسخ نکاح کے متعلق خلع کی شکل باوجود سعی بلیغ کے نہ پیدا ہونے کی صورت میں بدرجہ مجبوری اجازت مذکور ہے دو شرائط کے ساتھ:

ایک یہ کہ عورت کے خرچ کا کوئی انتظام نہ ہو سکے، یعنی نہ کوئی شخص عورت کے خرچ کا بندوبست کرتا ہو اور نہ خود عورت حفظ وآبرو کے ساتھ کسب معاش پر قدرت رکھتی ہو۔

دوسری صورت مجبوری کی یہ ہے کہ اگر چہ بسہولت یا بدقت خرچ کا انتظام ہو سکتا ہے لیکن شوہر سے علیحدہ رہنے میں ابتلاء معصیت کا قوی اندیشہ ہے (الحیلۃ الناجزۃ ص: ۸۲)۔

## ۴۔ معنی شقاق:

شقاق کا معنی عداوت، خلاف اور کشیدگی ہے، یہ شق (شین کے فتحہ کے ساتھ) سے مشتق ہے جو مجرد کا مصدر ہے اور اس کا معنی شگاف ہے، اور شق (شین کے کسرہ کے ساتھ) مشقت نصف۔ جانب اور ناحیہ کے معنی میں مستعمل ہے (المصباح المنیر لاحمد بن محمد بن علی الفیومی)۔

قرآن کریم کی آیت "وإن خفتم شقاق بينهما" میں شقاق سے مراد زوجین کے مابین کشیدگی اور مخالفت ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ کشیدگی اور تناؤ بیک

وقت دونوں طرف سے ابتدائی پیدا نہیں ہوگا، بلکہ ان میں سے کسی ایک کی طرف سے نشوز اور حق تلفی ہوگی جس کا رد عمل ہوگا، اور بتدریج دونوں طرف سے نشوز اور ایسی حرکتیں ہوں گی جو دوسرے کے لئے شاق اور تکلیف دہ ہوں گی اور یہ وہ مرحلہ ہوگا کہ یہ ظاہر نہیں ہو سکے گا کہ درحقیقت خطا اور نشوز کس کی طرف سے ہے، اسی حالت میں حکمین کی ضرورت ہوگی کہ وہ تحقیق وتفتیش کے بعد یہ متعین کرسکیں گے کہ نشوز کس کی طرف سے ہے، اور اس کی اصلاح کیسے ہو، جو بسا اوقات افہام وتفہیم سے حاصل ہوجاتی ہے اور زوجین کے مابین موافقت ہوجاتی ہے، لیکن کبھی کبھی یہ شقاق اس مرحلہ میں پہنچ جاتا ہے کہ کوئی اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوتا جس کی وجہ سے بذریعہ حاکم وقاضی یا شرعی پنچایت فسخ وتفریق کی نوبت آتی ہے۔

## ۵۔ کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے۔

احناف کے نزدیک طلاق کا حق صرف شوہر کو ہے یا جس کو وہ اجازت دیدے، لہٰذا شقاق کی صورت میں جبکہ کشیدگی اور تعدی دونوں طرف سے ہو اور زوجین باہم جمع یا تفریق کے نتیجہ پر نہیں پہنچتے تو اس صورت میں قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ دونوں کی طرف سے ایک ایک حکم متعین ہوں، اور وہ ان دونوں کے حالات کا جائزہ لیں، اولا اصلاح اور اجتماع کی کوشش کریں، یا پھر شوہر کو طلاق یا خلع پر راضی کریں، ورنہ ان کے معاملہ کو قاضی تک پہونچادیں، قاضی ان میں سے ظالم کو جبراً ظلم سے باز رکھے گا، ان حکمین کو یا قاضی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ شوہر کی طرف سے طلاق دیدیں، یا عورت کی طرف سے کسی عوض کو متعین کردیں، حکمین کو یہ اختیار صرف اس صورت میں حاصل ہوگا جبکہ زوجین نے اپنی اپنی طرف سے ان کو اختیار دیا ہو، آخری مرحلہ میں قاضی جو تفریق کرتا ہے وہ فسخ ہوا کرتا ہے۔

حکمین کو زوجین کی اجازت کے بغیر یہ حق حاصل نہیں ہوگا۔

فتح القدیر میں ہے: ''پھر زوجین کے درمیان جمع یا تفریق کا فیصلہ حکمین کا زوجین کی توکیل سے ہی ہمارے نزدیک نافذ ہوگا اور امام شافعیؒ کا بھی صحیح ترین قول یہی ہے اور احمدؒ کا بھی اور یہی قول ہے عطاء، قتادہ، حسن اور ابوثور رحمہم اللہ کا، اور مالکؒ نے فرمایا کہ ان دونوں کا قول بغیر توکیل بھی نافذ ہوگا...... اور یہ اسلئے کہ ان دونوں کے لئے جائز نہیں ہے کہ کسی غیر کی بیوی کو اس کی اجازت کے بغیر طلاق دیں یا کسی کا مال اس کی اجازت کے بغیر دیں۔ بخلاف ادائیگی قرض کے جبکہ وہ اس کی ادائیگی سے انکار کرے کیونکہ یہ حق کو اس کے مستحق تک پہنچانا، اور بیوی کے مال میں شوہر کا کوئی حق نہیں ہے (۴؍۸۴)۔

حکمین کے بارے میں امام محمد رحمہم اللہ سے روایات مختلف ہیں۔ تو ان سے دو روایتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ دونوں زوجین کے وکیل ہیں ان کی اجازت کے بغیر تفریق کے مالک نہیں ہیں''۔

زوجین کے درمیان تفریق حکمین کے تصرف سے اس صورت میں جبکہ وہ حکمین اس پر متفق ہوں اس میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے، کہ وہ شوہر کی جانب سے اجازت کے محتاج ہیں یا نہیں، امام مالکؒ اور ان کے اصحاب نے کہا کہ حکمین کا قول تفریق او ربقاء نکاح میں زوجین کی توکیل اور اجازت کے بغیر جائز ہے اور امام شافعی، ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ نے کہا کہ ان دونوں کو حق نہیں ہے کہ زوجین کے درمیان تفریق کریں مگر یہ کہ زوج نے تفریق کی ذمہ داری ان کو دیا ہو (بدایۃ المجتہد ۲؍۱۲۳ اور اسی طرح تفسیر قرطبی میں ہے: ۵؍۱۷۷)۔

مذکورہ عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک حکمین کو زوجین کی اجازت کے بغیر طلاق یا خلع کا اختیار ہے بقیہ فقہاء شافعیہ، حنابلہ اور احناف کے نزدیک بغیر زوجین کی توکیل واجازت کے حکمین کو خلع یا طلاق کا اختیار نہیں کیونکہ شوہر کے علاوہ کسی غیر کو اس کی بیوی پر طلاق دینے کا حق نہیں اور نہ کسی کو دوسرے کے مال میں تصرف کا حق ہے لہٰذا زوجین بیوی کی طرف سے اس کی رضا واجازت کے بغیر کسی عوض کی تعیین کرکے خلع کا معاملہ بھی نہیں کرسکتے، اور اسی طرح قاضی کو بھی طلاق یا خلع کا بغیر اجازت وتوکیل اختیار نہیں ہے۔ علامہ ابن الہمام نے صراحت کیا ہے کہ:

''قلنا لیس للحاکم أن یطلق ولا یبرئ من مالھا فکیف یفعل ذلک نائبہ'' (یعنی الحکمین) (فتح القدیر ۴؍۸۴)۔

۶۔ جبکہ خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہ ہو اس صورت میں حکمین کی تقرری اور قاضی کا خود فیصلہ کرنا۔

فقہاء مالکیہ رحمہم اللہ کے نزدیک شقاق اور اختلاف بین الزوجین کی صورت میں حاکم یا قاضی دو حکم مقرر کرے گا۔ اور یہ دونوں حکم ان کے نزدیک زوجین کے اہل میں سے ہونا شرط ہے "حکما من اھلہ وحکما من اھلھا"۔ نیز ان کا اہل عدالت اور صاحب بصیرت ہونا بھی شرط ہے، اور اگر اسی شرط کے حکم ان دونوں کے اہل سے نہ پائے جائیں تو ان کے نزدیک بھی اہل کے علاوہ سے حکم متعین کئے جاسکتے ہیں۔ اور ان حکم حضرات کو زوجین کی اجازت کے بغیر تفریق یا

بقاء نکاح کا حق ہے، دونوں جس فیصلہ پر بھی متفق ہوں گے قاضی ان کے فیصلہ کو نافذ کرے گا اور یہ دونوں حکم اس لئے مقرر کئے جائیں گے تا کہ احوال وکوائف کا جائزہ لے کر ان دونوں زوجین سے مل کر ان میں سے قصوروار کی شناخت کر سکیں، پھر زیادتی جس کی طرف سے بھی ہو اس کو اس سے باز رہنے کی تلقین ونصیحت کریں اور بصورت مجبوری تفریق کا فیصلہ کریں۔

ان کے نزدیک ایک حکم پر بھی اگر زوجین متفق ہوتے ہیں تو ایک حکم بھی کافی ہے، اور فقہی عبارتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکمین کا تقرر اس صورت میں ہے جبکہ تشاجر واختلاف کے اسباب اور زوجین میں سے کسی ایک کا قصوروار ہونا ظاہر نہ ہو، اور ظالم اور قصوروار واضح ہو تو پھر حاکم اپنے طور پر اس کو اس سے باز رکھے گا۔

''اتفق العلماء على جواز بعث الحكمين إذا وقع التشاجر بين الزوجين وجهلت أحوالهما في التشاجر اعني المحق من المبطل'' (بداية المجتهد ۲/۱۲۲، الجامع لاحكام القرآن للقرطبی ۵/۱۷۵)۔ (جب زوجین کے درمیان اختلاف ہو اور اختلاف میں ان کے احوال واضح نہ ہوں یعنی کون حق پر ہے اور کون باطل پر معلوم نہ ہو تو علماء کا اتفاق ہے دو حکم کے مقرر کرنے پر)۔

''قلت (أي القرطبي) وإذا جاز إرسال الواحد فلو حكم الزوجان واحداً لأجزأ وهو بالجواز اولى إذا رضيا بذلك'' (الجامع لاحكام القرآن ۵/۱۷۸)۔ (اور جب ایک حکم کا ارسال جائز ہے تو اگر زوجین اگر کسی ایک ہی کو حکم بنالیں تو کافی ہوگا، اور یہ اولی بالجواز ہے جبکہ دونوں اس سے راضی ہوں۔

''ومالك يشبه الحكمين بالسلطان والسلطان يطلق بالضرر عند مالك إذا تبين'' (بداية المجتهد ۲/۱۲۲)۔ (اور امام مالک رحمہ اللہ حکمین کو سلطان اور حاکم کے مشابہ قرار دیتے ہیں اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک ضرر کی وجہ سے جبکہ ظاہر ہو، حاکم طلاق دے سکتا ہے)۔

اسی لئے وہ حکمین کے فیصلہ کو زوجین کی رضا واجازت کے بغیر نافذ مانتے ہیں، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حاکم یا قاضی خود فیصلہ کر سکتا ہے، یہ ساری تفصیلات امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کے مطابق ہیں۔

حسن بصری اور ابن سیرین رحمہما اللہ کے بارے میں منقول ہیں کہ سلطان اور حاکم کے بغیر اجازت خلع درست نہیں (المغنی ۱۰/ ۲۶۸، بدایۃ المجتہد ۲/ ۸۵، السنن لسعید بن منصور القسم الأول من المجلد الثالث ص: ۳۳۲، فتح الباری ۹/ ۳۹۶)۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے حسن بصری رحمہ اللہ کے قول کی تردید کی ہے اور ان کا قول فتح الباری میں ان الفاظ میں منقول ہے: ''قال قتادة: ما أخذ الحسن هذا إلا عن زياد'' (حسن بصری رحمہ اللہ نے یہ قول زیاد سے لیا ہے)۔

حافظ کہتے ہیں: ''وزياد ليس أهلا أن يقتدى به'' (فتح الباری ۹/۳۹۶)۔

نیز ابن سیرین رحمہ اللہ اور ابوقلابہ سے یہ بھی مروی ہے جب تک بیوی سے فاحشہ اور زنا کا صدور نہ ہو خلع جائز نہیں یعنی بیوی سے مال لینا شوہر کے لئے جائز نہ ہوگا (المغنی ۱۰/ ۲۶۸)۔

اور جمہور علماء نے قرآن کریم کی آیت اور حدیث میں مذکور ثابت بن قیس اور ان کی اہلیہ کے واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے خلع کو جائز کہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ولا يحل لكم أن تأخذوا مما آتيتموهن شيئا إلا أن يخافا أن لايقيما حدود الله فإن خفتم أن لايقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به''۔ (اور تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم نے ان کو جو کچھ (مہر) دیا ہے اس میں سے کچھ لو، مگر یہ کہ ان دونوں کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے، تو اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ پائیں گے تو ان دونوں پر کوئی حرج نہیں اس کے بارے میں جو عورت فدیہ کے طور پر دے)۔

یعنی شوہر سے رہائی اور طلاق حاصل کرنے کے لئے بیوی کچھ مال دے یا وہ مہر معاف کردے تو اس پر بھی کوئی حرج اور گناہ نہیں، اور شوہر کے اسے قبول کر لینے پر بھی کچھ حرج اور گناہ نہیں اور خلع میں یہی صورت ہوتی ہے، اور احناف کا متفق علیہ قول نیز امام شافعی واحمد رحمہم اللہ سے بھی ایک روایت جو صحیح قرار دی گئی ہے کہ صورت خلع میں شوہر کی اجازت کے بغیر حکمین یا قاضی کا از خود فیصلہ تفریق یا تعیین عوض درست نہیں۔

## ۷۔ عدول عن المذہب:

ایک مقلد جب کسی امام کی تقلید کرتا ہے اور اس کے اقوال پر عمل کرتا ہے تو اس لئے کہ وہ اس امام کے قول کو بہ نسبت دوسرے اقوال کے راجح مانتا ہے، اور دوسرے کے قول کو مرجوح سمجھتا ہے، اور قول مرجوح منسوخ یا معدوم کے درجہ میں ہوتا ہے، اس پر عمل کرنا راجح کی موجودگی میں درست نہیں۔

اور حنفیہ کا مذہب مرجوح سے روکتا ہے حتی کہ خود اپنے لئے بھی، مرجوح کے منسوخ ہونے کی وجہ سے (مقدمہ شامی ۱/۷۳)۔

نیز یہ بھی بعض علماء سے منقول ہے: ''إن المرجوح في مقابلة الراجح بمنزلة العدم'' (رسائل ابن عابدین ص: ۴۹. رسم المفتي)۔ (مرجوح راجح کے مقابلہ میں بمنزلہ عدم کے ہے)۔

اس لئے بلا ضرورت دوسرے مذہب ومکتب فکر کی طرف عدول جائز نہیں، خاص طور سے فتوی اور قضا میں، یا یہ کہا جائے کہ عام آدمی کے لئے کیونکہ اس سے نفس پرستی کا دروازہ کھل جائے گا، اور بغیر علم وبصیرت کے سہل پسندی رواج پائے گی، اگرچہ کوئی عالم صاحب بصیرت وذی رائے ہو تو اس کے لئے مذہب غیر اور قول مرجوح پر خود عمل کرنے کو جائز کہا گیا ہے، لیکن اس اجازت کو بھی ضرورت یا قوت دلیل سے مطالق اور آزاد نہیں رکھا جاسکتا۔

اس سلسلہ میں فقہاء کی تصریحات کثیر ہیں (دیکھئے: رسائل ابن عابدین، عقود رسم المفتی ۵۰، مقدمہ شامی ۱/ ۷۲ وغیرہ)۔ جن سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں کسی دوسرے امام کے قول پر یا خود اپنے مکتب فکر کے قول مرجوح پر عمل کرنا یا فتوی دینا درست نہیں اور بوقت ضرورت واضطراب اس کی اجازت ہے۔

زیر بحث مسئلہ بھی کہ زوجین کے درمیان نزاع وشقاق ہو، اور ان دونوں کی جانب سے حکم مقرر کئے گئے ہوں تو اس مسئلہ میں عدول عن المذہب اور امام مالک رحمہ اللہ کے قول پر عمل کی اجازت مناسب نہیں ہے جس میں یہ ہوتا ہے کہ حکمین کو اختیار ہے کہ وہ زوجین کی اجازت کے بغیر طلاق یا بدل خلع کی تعیین کا فیصلہ کرسکتے ہیں یا قاضی ایسا کرسکتا ہے۔

بلکہ اس صورت میں وہی راہ اپنائی جائے گی کہ حکمین اصلاح اور افہام وتفہیم کی کوشش کریں اور اس میں کامیابی نہ ہو تو شوہر کو طلاق دینے یا خلع پر راضی کریں گے، اور بیوی کی اجازت سے ہی کسی بدل خلع کی تعیین کریں گے، اور اس صورت میں جبکہ شوہر کی طرف سے ظلم وتعدی ہو اور وہ طلاق یا خلع پر راضی نہ ہو، اور بیوی کے لئے پناہ کی کوئی صورت نہ ہو تو وہ پھر قاضی کے پاس یا شرعی پنچایت میں اس مسئلہ کو رکھے گی اور وہ تفتیش وتحقیق کے بعد نیز اپنے طور پر بھی کوشش کے بعد ان کے نکاح کو فسخ کردیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔



# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

مولانا خورشید انور اعظمی ...... صدر مدرس جامعہ مظہر العلوم، بنارس

اسلام نے ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے اور میاں بیوی کے درمیان بہتر تعلقات کو استوار رکھنے پر کافی زور دیا ہے، تاکہ اندرون خانہ سکون واطمینان اور مودت ومحبت کی ایسی پاکیزہ فضا قائم رہے کہ ہر شخص مسرت وشادمانی اور اعتماد وخیر سگالی کے ماحول میں زندگی کے ایام بسر کر سکے، نہ وہاں اختلاف وانشقاق پنپ سکیں اور نہ تشتت وانتشار کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے، لیکن بعض دفعہ میاں بیوی کے درمیان ایسا شدید اختلاف رونما ہوجاتا ہے کہ تمام قربتیں دوریوں میں بدل جاتی ہیں اور تعلقات اس درجہ کشیدہ ہوجاتے ہیں کہ افہام وتفہیم کی جملہ کوششیں ناکام اور نباہ کی تمام صورتیں مفقود نظر آنے لگتی ہیں اور صرف ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ دونوں کے درمیان علیحدگی ہوجائے، شریعت اسلامیہ نے اس طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لئے جو صورتیں بتائی ہیں، ان میں سے ایک خلع ہے کہ عورت اپنا مال دیکر شوہر سے گلوخلاصی حاصل کرلے۔ ہدایہ میں ہے:

"إذا تشاق الزوجان وخافا أن لايقيما حدود الله فلا بأس بأن تفتدی نفسها منه بمال يخلعها به. لقوله تعالیٰ: فلا جناح عليهما فيما افتدت به" (۲.۳۸۴)۔ (جب زوجین میں شدید اختلاف پیدا ہوجائے اور دونوں کو اندیشہ ہو کہ اللہ کا حکم قائم نہیں رکھ پائیں گے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ عورت مال کے عوض خلع کرلے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو اس میں دونوں پر کچھ گناہ نہیں کہ عورت بدلہ دیکر چھوٹ جائے)۔

المغنی میں ہے: "اگر عورت اپنے شوہر کو اس کی ہیئت، اس کے اخلاق یا اس کے دین یا اس کے بڑھاپے اور کمزوری وغیرہ کے سبب ناپسند کرتی ہو اور اسے اندیشہ ہو کہ وہ شوہر کی فرماں برداری کے تعلق سے اللہ کا حق نہیں کرپائے گی تو اس کے لئے شوہر سے بامعاوضہ خلع کرلینا جائز ہے۔ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پھر اگر تم لوگ اس بات سے ڈرو کہ وہ دونوں اللہ کا حکم قائم نہ رکھ سکیں گے" (۱۰/۲۶۷)۔

ردالمحتار میں ہے: "قہستانی میں شرح طحاوی سے منقول ہے کہ سنت یہ ہے کہ جب زوجین میں اختلاف واقع ہو تو دونوں کے اہل خاندان صلح کرانے کے لئے جمع ہوں، اور اگر دونوں میں مصالحت نہ ہوسکے تو طلاق وخلع جائز ہے" (۵/۸۷ کذا فی مجمع الانہر ۱۰/۴۴۷)۔

## ۱۔ خلع کی فقہی واصطلاحی تعریف:

علامہ بابرتی نے عنایہ شرح ہدایہ میں خلع کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: "هو فی الشريعة عبارة عن أخذ مال من المرأة بإزاء ملك النكاح بلفظ الخلع" (۴.۵۷)۔ (شریعت میں خلع نام ہے عورت سے لفظ خلع کے ذریعہ ملک نکاح کے عوض مال لینے کا)۔

علامہ ابن ہمام نے خلع کی مختلف تعریفات کے تجزیے کے بعد تحریر فرمایا ہے: "فالصحيح إزالة ملك النكاح ببدل بلفظ الخلع" (فتح القدیر ۴.۵۸)۔ (خلع کی صحیح تعریف ہے: لفظ خلع کے ذریعہ ملک نکاح کا بامعاوضہ ازالہ)۔

علامہ ابن نجیم نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر مزید غور وخوض کیا اور کہا کہ خلع کی مستحسن تعریف یہ ہوگی: "خلع نام ہے، خلع یا اس کے ہم معنی لفظ کے ذریعہ ملک نکاح کے ازالے کا جو موقوف ہو عورت کے قبول کرنے پر" (البحر الرائق ۴/۷۰)۔

صاحب تنویر الابصار نے اسی تعریف کو اختیار کیا ہے (۵/۸۳)۔ نیز علامہ داماد آفندی نے مجمع الأنہر شرح ملتقی الابحر میں ابن ہمام کی تعریف اور اس سے متعلق پوری عبارت نقل کرکے ابن نجیم کی تعریف کو اولی بتایا ہے (مجمع الانہر ۱/۴۴۷)۔

لیکن اس تعریف پر اعتراض اس صورت میں وارد ہوتا ہے جبکہ خلع بدل سے خالی ہو، جیسا کہ جب کوئی کہے میں نے تم سے خلع کیا اور کسی چیز کا ذکر نہیں کیا، اور اس نے قبول کرلیا تو وہ خلع ہے جس سے حقوق ساقط ہوجائیں گے۔ خلاصہ میں ایسا ہی ہے اور بحر کی تعریف: "وہ نام ہے خلع یا اس کے ہم معنی لفظ کے ذریعہ

ملک نکاح کے ازالے کا جو موقوف ہو عورت کے قبول کرنے پر" سب سے بہتر ہے۔

## ۲۔ خلع کے صحیح ہونے کے لئے شوہر کی رضا ضروری ہے:

یہ تو صحیح ہے کہ جس طرح مرد کو طلاق دینے کا حق ہے، اسی طرح عورت کو خلع کے مطالبہ کا حق ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شوہر کی مرضی کے بغیر عورت خلع لے سکتی ہے۔ خلع کیلئے زوجین کی رضامندی ضروری ہے۔ علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں: خلع کا رکن ایجاب وقبول ہیں اس وجہ سے کہ وہ بامعاوضہ طلاق پر عقد ہے، لہذا قبول کے بغیر نہ فرقت واقع ہوگی اور نہ عوض کا استحقاق ہوگا (بدائع ۳/۲۲۹، نیز دیکھئے: فتاوی تاتارخانیہ ۳/ ۴۵۲)۔

علامہ سرخسی نے خلع کیلئے سلطان کی موجودگی کے شرط نہ ہونے کی وجہ بتاتے ہوئے اس بات کی صراحت کی ہے کہ خلع میں زوجین کی باہمی رضامندی ضروری ہے، اور شوہر کو طلاق دینے کی ولایت باقی رہتی ہے: "إنه عقد يعتمد التراضي كسائر العقود وهو بمنزلة الطلاق بعوض وللزوج ولاية إيقاع الطلاق ولها ولاية التزام العوض" (المبسوط للامام السرخسی ۶،۱۶۹)۔ (خلع ایسا عقد ہے جس کا مدار تمام عقود کی طرح تراضی طرفین پر ہے، وہ طلاق بالمال کے درجے میں ہے، شوہر کو طلاق دینے اور عورت کو اپنے ذمے مال لازم کرنے کی ولایت حاصل ہے)۔

اسی طرح علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں اس بات کی صراحت فرمائی ہے اور لکھا ہے: "وفي تسميته صلى الله عليه وسلم الخلع فدية دليل على أن فيه معنى المعاوضة ولهذا اعتبر فيه رضا الزوجين" (زاد المعاد ۴،۳۵)۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلع کو فدیہ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں معاوضہ کا مفہوم شامل ہے، اسی وجہ سے اس میں زوجین کی رضا کا اعتبار کیا گیا ہے۔

نیز امام شافعیؒ اپنی شہرہ آفاق تصنیف "کتاب الام" میں تحریر فرماتے ہیں: "وعلمنا أن الخلع لم يقع إلا بإيقاع الزوج" (کتاب الام ۵،۱۸۱)۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بھی اپنی کتاب "تفسیر مظہری" میں خلع کے تعلق سے بحث کرتے ہوئے حضرت علی کے قول "حتی تقر بمثل الذی اقرت به" (الأم ۵،۱۷۷) سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ خلع میں شوہر کی رضامندی ضروری ہے (دیکھئے: تفسیر مظہری ۲/ ۲۹۷)۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ نے ایسے علماء پر حیرت وتعجب کا اظہار کیا ہے، جنھوں نے شوہر کی رضا کے بغیر خلع کو صحیح مانا ہے اور واضح کیا ہے کہ ان لوگوں کو علامہ شوکانی کی ایک عبارت کے سمجھنے میں چوک ہوئی ہے (حاشیہ شرح وقایہ ۲/ ۱۰۷)۔

مولانا فرنگی محلی نے ایک استفتاء کے جواب میں بھی اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ شوہر کی رضا کے بغیر خلع نہیں ہوسکتا (دیکھئے: فتاوی عبدالحی ۱/ ۴۴۳)۔

اسی بات کی صراحت فتاوی دار العلوم ۱۰/ ۱۷۸، احسن الفتاوی ۵/ ۳۸۴، خیر الفتاوی ۵/ ۱۳۸ وغیرہ میں موجود ہے۔ مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات پورے طور پر واضح ہوتی ہے کہ عورت، شوہر کی رضا کے بغیر خلع نہیں لے سکتی، اور جو لوگ ایسا خیال رکھتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے، البتہ اگر میاں بیوی کے درمیان نباہ کی کوئی صورت نہ ہو اور عورت چاہتی ہو کہ اپنا کچھ مال دیکر ہی سہی شوہر سے گلوخلاصی حاصل کرلے تو شوہر کی رضامندی سے خلع لے سکتی ہے۔

## ۳۔ عورت کے شدید تنفر کے سبب شوہر سے گلوخلاصی کی صورت

میاں بیوی کے لئے بہرصورت مناسب یہ ہے کہ حتی الامکان باہمی تعلقات کو خوشگوار بنائے رکھیں اور اگر کچھ باتیں مزاج کے خلاف بھی سامنے آئیں تو گوارا کرلیں، کسی طرح عائلی نظام کو پراگندہ نہ ہونے دیں، اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو حکم دیا کہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کریں اور ان کی نفسیات کا حد درجہ لحاظ رکھیں، آپ نے فرمایا: "استوصوا بالنساء خيرا فإنهن خلقن من ضلع وإن أعوج شئ في الضلع أعلاه فإن ذهبت تقيمه كسرته وإن تركته لم يزل أعوج فاستوصوا بالنساء" (متفق عليه مشكوة ۲،۲۸۰)۔ (عورتوں کے حق میں بھلائی کی وصیت قبول کرو، اس وجہ سے کہ عورتیں ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہیں، اور سب سے ٹیڑھی اوپر کی پسلی ہے، پس اگر تم پسلی کو سیدھا کرنا چاہو تو اس کو توڑ دو گے، اور اگر اسکو اپنے حال پر چھوڑ دو تو ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی، پس عورتوں کے حق میں وصیت قبول کرو)۔

امام نووی نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے: "اس حدیث میں عورتوں کے ساتھ نرمی، حسن سلوک، ان کی اخلاقی کجی پر صبر، ان کی عقلی کمزوری پر چشم پوشی اور بلا وجہ ان کی طلاق کی ناپسندیدگی کو بتایا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کے سیدھے ہونے کی خواہش رکھی جائے"۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو بلا وجہ طلاق وخلع کے مطالبہ سے منع فرمایا اور کہا: "جو عورت اپنے شوہر سے بلا ضرورت طلاق مانگے اس پر

جنت کی بو حرام ہے'' (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ والدارمی، مشکوۃ ۲/ ۲۸۳)۔

نیز آپ نے نافرمان اور بلاوجہ خلع وطلاق کا مطالبہ کرنے والی خواتین کو منافق کے درجہ میں رکھا ہے، آپ نے فرمایا: ''المنتزعات والمختلعات هن المنافقات'' (رواه النسائي، مشكوة ۲، ۲۸۳)۔ اپنے شوہر کی نافرمانی کرنے والی اور خلع طلب کرنے والی عورتیں منافق ہیں۔

بایں ہمہ اگر شوہر عورت کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے اور اس کے حقوق کی رعایت میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتا لیکن عورت اس سے حد درجہ متنفر ہے اور اس کے ساتھ گذر بسر کرنے پر راضی نہیں ہے تو ایسی صورت میں شوہر سے کہا جائے گا کہ اس سے علیحدگی کی کوئی راہ نکالو اگر وہ راضی ہو جاتا ہے تو بہت بہتر، ورنہ عورت کو اسباب فسخ مہیا نہ ہونے تک اسی حالت سے سمجھوتہ کرنے کی تلقین کی جائے گی۔ علامہ ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں: ''اگر عورت، شوہر سے نفرت کر رہی ہو اور شوہر اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کر رہا ہو تو شوہر سے فرقت کا مطالبہ کیا جائے گا لیکن اس پر اس کو مجبور نہیں کیا جائے، اگر کر دیتا ہے تو ٹھیک، ورنہ عورت سے، بشرطیکہ اسباب فسخ نہ ہوں۔ کہا جائے گا کہ اسی پر صبر کرے'' (فتاوی ابن تیمیہ ۳۲/ ۲۸۳)۔

اس لئے کہ جب شوہر امساک بالمعروف کر رہا ہے تو اسے تسریح بالاحسان پر مجبور نہیں کیا جائے گا الا یہ کہ ایسے اسباب ظاہر ہوں جو شریعت میں فسخ کی بنیاد قرار دیئے گئے ہیں، باقی رہا نکاح کے بعد حاصل کردہ اعلیٰ تعلیم سے عورت کا احساس ترفع، اور اس کی بناء پر عار محسوس کرنا، اور شوہر کو اپنے سے کمتر جان کر حقیر سمجھنا، نیز اس کے ساتھ نباہ کرنے پر راضی نہ ہونا تو یہ ایک غیر مستحسن عمل ہے جو مقاصد نکاح کے یکسر مخالف اور مزاج شریعت کے سراسر منافی ہے، یہی وجہ ہے کہ کفائت کا اعتبار بھی ابتداء عقد میں ہوتا ہے، بعد میں اس کے خلاف پائی جانے والی شئ کا لحاظ نہیں ہوتا (الدر المختار ۴/ ۲۱۷)۔

تاہم اگر عورت کسی بھی حالت میں شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو تو ایسی صورت میں زوجین کی جانب سے کچھ لوگ مصالحت کی کوشش کریں، اور اگر مصالحانہ کوشش ناکام ہو جائے تو شوہر طلاق دیدے یا خلع کر لے (دیکھئے: فتاوی تاتارخانیہ ۳/ ۵۳ وغیرہ)۔

اور اگر میاں بیوی کے درمیان نزاعی صورت حال غیر واضح ہو، شوہر دعوی کرتا ہے کہ یہ ناشزہ ہے اور عورت دعوی کرتی ہے کہ یہ ظالم ہے، تو حاکم وقت، حکمین کے ذریعہ مسئلے کی تحقیق کرائے اور جس کی زیادتی ثابت ہو اسے ظلم وزیادتی سے روکے۔

حکمین کا کام یہ ہے کہ پہلے ان کی نظر میں جو ظالم ہے اسے سمجھائیں، اور ظلم سے باز رہنے کی نصیحت کریں، لیکن اپنی ناکامی کی صورت میں حاکم کو صحیح صورت حال سے باخبر کر دیں تا کہ وہ ظالم کو ظلم سے روک دے (دیکھئے: احکام القرآن ۲/ ۱۹۰، ۱۹۲، نیز فتح القدیر ۴/ ۸۰)۔

محمد بن فرحون مالکی نے اپنی گرانقدر تصنیف ''تبصرۃ الحکام فی اصول الاقضیہ ومناہج الاحکام'' میں اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وإذا تكررت شكوى المرأة وذكرت إضرار زوجها بها، رفعت ذلك إلى الحاكم وعجزت عن إثبات ما تدعيه. فإن الحاكم يأمر زوجها بإسكانها بين قوم صالحين و يكلفهم تفقد خبرها واستعلام ضررها ... فإن ظهر لهم أنه ظالم رفعوا ذلك إليه فزجره الحاكم وأدبه وسجنه وعاقبه بما يراه، فإن عمي على الحاكم خبرهما وطال تكررها ولم يعلم من الظالم منهما لم يسعه أن ينظر في أمرهما بغير الحكمين'' (تبصرة الحكام ۲، ۱۵۵)۔

(اگر عورت بار بار شکایت کرے اور شوہر کی طرف سے دی جانے والی تکالیف کا ذکر کرے اور اسے حاکم کے سامنے پیش کرے لیکن اپنے دعوی کے ثابت کرنے سے عاجز ہو تو حاکم اس کے شوہر سے کہے گا کہ اس کی سکونت کا نیک لوگوں کے درمیان نظم کرے، اور ان لوگوں کو اس بات کا پابند بنائے گا کہ وہ اسکی خبر گیری کریں اور اس کی تکالیف کا پتہ لگائیں، اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ شوہر ظالم ہے تو حاکم کو اس کی اطلاع دیدیں، پھر حاکم اس کو ڈانٹے، پھٹکارے، قید کرے اور جو مناسب سمجھے اس کو سزا دے اور اگر حاکم پر زوجین کے حالات مخفی ہوں اور عورت بار بار شکایت کر رہی ہو اور معلوم بھی نہ ہو کہ کون ظالم ہے تو حاکم حکمین کے بغیر انکے معاملے میں غور وخوض نہیں کر سکتا ہے)۔

ہمارے نزدیک یہ حکمین از خود زوجین کے درمیان تفریق کے مجاز نہیں ہیں الا یہ کہ دونوں کو وکیل بنا دیا جائے اور معاملے کو بآسانی رفع دفع کرنے کے لئے بہتر صورت یہی ہے کہ جن لوگوں کو حکم مقرر کیا جائے زوجین انہیں جمع وتفریق کا وکیل بھی بنا دیں تا کہ ان کا متفقہ فیصلہ دونوں کیلئے قابل تسلیم ہو، اللہ تعالی کے قول ''فابعثوا حكما من اهله وحكما من اهلها'' سے اس بات کی جانب واضح اشارہ ملتا ہے: احکام القرآن میں ہے: ''ويدل ايضا قوله

(فابعثوا حكما من اهله وحكما من اهلها) على أن الذى من أهله وكيل له والذى من أهلها وكيل لها، كأنه قال: فابعثوا رجلا من قبله ورجلا من قبلها'' (احکام القرآن ۲،۱۹۰)۔ (اللہ تعالیٰ کے قول: ''فابعثوا حكما من أهله وحكما من اهلها'' سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جو شوہر کے گھر والوں میں سے ہے وہ اس کا وکیل ہے اور جو عورت کے گھر والوں میں سے ہے، اس کا وکیل گویا کہ فرمایا: تم لوگ ایک آدمی شوہر کی طرف سے اور ایک آدمی عورت کی طرف سے بھیجو)۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عورت کسی بھی صورت میں شوہر کے ساتھ گزر بسر پر راضی نہ ہو اور اس کے پاس شوہر کے ظلم کو ثابت کرنے کے لئے بینہ بھی نہ ہو تو ارباب حکومت یا زوجین کے اولیاء یا مسلمانوں کی مقتدر جماعت، ایک حکم شوہر کے خاندان سے اور ایک حکم عورت کے خاندان سے بھیجے تا کہ یہ باہم مصالحت کرادیں، یا زوجین میں سے جن کا ظلم ثابت ہوا سے ظلم سے باز رہنے کی نصیحت کریں، اور اس سے بھی کام نہ چلے تو حاکم وقت کو صحیح صورت سے مطلع کردیں تا کہ وہ ظالم کو ظالمانہ حرکتوں سے روکے، اور مظلوم کی دادرسی کرے اور سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ زوجین، ان حکموں کو وکیل بنادیں تا کہ انہیں فیصلہ کن نتیجہ تک پہنچنے میں سہولت ہو۔ امام شافعی نے تحریر فرمایا: ''لايبعث الحكمان إلا مأمومنين برضا الزوجين ويوكلهما الزوجان بأن يجمعا أو يفرقا إذا رأيا ذلك'' (۱۲، الأم ۵،۱۰۳)۔

## ۴۔ شقاق کا مطلب

شقاق کا معنی از روئے لغت، اختلاف، جھگڑا، پھوٹ، فرقہ بندی اور مخالفت ہے۔

''الشقاق: الخلاف والعداوه'' (القاموس المحيط ص: ۱۱۶) (شقاق کے معنی اختلاف و دشمنی کے ہے)۔

''قال الزجاج في قوله تعالىٰ: إن الظالمين لفي شقاق بعيد، الشقاق: العداوة بين الفريقين والخلاف بين الشيئين. سمي ذلك شقاقا لأن كل فريق من فرقتي العداوة قصد شقا أي ناحية غير شق صاحبه'' (لسان العرب: ۷،۱۶۶)۔

(زجاج نے اللہ تعالیٰ کے قول ''ان الظالمین لفی شقاق بعید'' کے ذیل میں کہا: شقاق کا معنی فریقین میں دشمنی اور دو چیزوں کے درمیان اختلاف ہے، اسے شقاق اس وجہ سے کہتے ہیں کہ دشمنی کرنے والوں میں سے ہر فریق اس سمت کا رخ کرتا ہے جو دوسرے کی سمت کے مختلف ہو)۔

شقاق کے اسی معنی لغوی کا لحاظ زیر بحث مسئلہ میں بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ بدرالدین عینی نے لکھا ہے کہ: ''الشقاق بالكسر الخلاف وقيل الخصام'' (عمدة القاری: ۹،۵۷۲)۔ (شقاق کسرہ کے ساتھ مخالفت اور کہا گیا ہے کہ مخاصمت)۔

علامہ شامی نے تحریر فرمایا: ''وهو الاختلاف والتخاصم'' (رد المحتار ۵،۸۷) (وہ اختلاف اور باہم جھگڑنا ہے)۔

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی نے شقاق کی تشریح کرتے ہوئے لکھا: ''شقاق سے مراد دشمنی اور اختلاف ہے، اس وجہ سے کہ ہر ایک دشمن ایسا عمل کرتا جو اس کے حریف کے لئے باعث مشقت ہو یا ایسی سمت کی طرف مائل ہوتا ہے جو اس کے مد مقابل کی پسندیدہ سمت کے ماسوا ہو'' (تفسیر مظہری ۲/۲۹۶، دیکھئے تفسیر قرطبی ۱/۱۴۳)۔

تفصیل بالا سے واضح ہوتا ہے کہ شقاق سے مراد ایسا شدید اختلاف ہے جس میں فریقین دو انتہاؤں پر پہنچ جائیں، اور دونوں کے درمیان اتنا زبردست فاصلہ ہو جائے کہ اس کے ختم ہونے کے بظاہر امکانات مفقود ہوں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے حقوق ادا نہ کرنے کی شکایت ہو اور کسی کا بھی عمل دوسرے کے ذہن و مزاج سے میل نہ کھاتا ہو۔ امام شافعیؒ نے اپنی کتاب "الأم" میں اللہ تعالیٰ کے قول: وان خفتم شقاق بينهما الخ کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''والله اعلم بمعنى ما أراد فأما ظاهر الآية فإن خوف الشقاق بين الزوجين يدعى كل واحد منهما على صاحبه منع الحق ولايطيب واحد منهما لصاحبه باعطاء مايرضي به ولاينقطع ما بينهما بفرقة ولاصلح ولا ترك القيام بالشقاق'' (الأم ۵،۱۱۷)۔ (اللہ تعالیٰ ہی اس کی مراد کو بہتر جانتے ہیں، رہا آیت کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ شقاق بین الزوجین کے خوف کا مطلب یہ کہ دونوں میں سے ہر ایک دوسرے پر حق کی عدم ادائیگی کا دعوی کرے، کوئی بھی دوسرے کو اس کی من پسند چیز عطا کر کے خوش نہ کرے اور نہ ان کے درمیان کے مسائل فرقت، صلح اور اختلافی امور کو ترک کر کے ختم ہوں)۔

## ۵۔ کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے:

جب میاں بیوی کے درمیان شدید اختلاف رونما ہوجائے تو اس کے تصفیہ کا طریقہ یہ ہے کہ دو حکم مقرر کئے جائیں تاکہ یہ مصالحت کی کوئی شکل نکالیں یا اس کی صحیح صورت حال سے حاکم وقت کو باخبر کردیں تاکہ اس کے ذریعہ ظالم کے ظلم کا سد باب ہوسکے لیکن یہ دونوں حکم اس بات کے مجاز نہیں ہیں کہ از خود زوجین میں تفریق کردیں، الایہ کہ انہیں زوجین کی جانب سے وکیل بنادیا گیا ہو، اس بات کے قائل ہیں امام ابوحنیفہ، امام احمد، اور قول اصح میں امام شافعی نیز عطاء، قتادہ، حسن بصری، اور ابوثور کا بھی یہی قول ہے، جبکہ امام مالک نے فرمایا کہ حکمین کا قول بغیر توکیل کے بھی نافذ ہوگا اور انہیں جمع وتفریق کا پورا اختیار ہوگا۔ یہی قول ہے امام اوزاعی اور امام اسحق کا اور حضرت عثمان، اور حضرت علی سے بھی یہی مروی ہے (فتح القدیر ۴؍۸۴)۔

امام مالکؒ نے حکمین کو سلطان کے مشابہ قرار دیا کہ جس طرح سلطان، ضرر کے ظاہر ہونے کی صورت میں ان کے یہاں طلاق دے سکتا ہے اسی طرح حکمین بھی زوجین کے درمیان تفریق کرسکتے ہیں (بدایۃ المجتہد ۲؍۷۴)۔

اس طرح امام مالکؒ شقاق کے سبب تفریق کو جائز قرار دیتے ہیں تاکہ نزاع کا خاتمہ ہوسکے اور ازدواجی زندگی جہنم نہ بن جائے۔ ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں یہی بات کہی ہے (۹؍۷۰۶۰)۔

امام ابوحنیفہ وغیرہ نے کہا کہ جب حاکم کو طلاق دینے اور زوجین کو ان کے مال سے سبکدوش کرنے کا حق نہیں ہے تو پھر اس کے نائب کو یہ اختیار تفریق کیسے ہوسکتا ہے۔ فتح القدیر میں ہے: ''قلنا لیس للحاکم أن یطلق ولا یبرئ من مالهما فکیف یفعل ذلك نائبه'' (فتح القدیر ۴.۸۴)۔

اس صورت حال کے پیش نظر حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک شدید شقاق کی بنا پر بھی تفریق درست نہیں ہے، اس وجہ سے کہ طلاق کے بغیر بھی عورت کے ضرر کو رفع کیا جاسکتا ہے، مسئلے کو قاضی کے سامنے پیش کر کے اور مرد کو ضرر رسانی سے باز رہنے کی تنبیہ وتادیب کر کے بھی میاں بیوی کے نزاعات کو دور کیا جاسکتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۹؍۷۰۶۰)۔

حضرت تھانویؒ نے الحیلۃ الناجزۃ میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ صرف پانچ عیوب کی بنا پر قاضی کو تفریق کا اختیار ہے ان کے علاوہ قاضی کو کہیں بھی تفریق کا اختیار نہیں ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں: ''اس بات پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ صرف پانچ عیوب کی بناء پر قاضی کو تفریق کا اختیار ملتا ہے: ایک اس وقت جبکہ شوہر پاگل ہوگیا، دوسرے جب وہ نان ونفقہ ادا نہ کرتا ہو، تیسرے جب وہ نامرد ہو، چوتھے جب وہ بالکل لاپتہ ہوگیا ہو اور پانچویں جب غائب غیر مفقود کی صورت ہو، ان صورتوں کے سوا قاضی کو کہیں بھی تفریق کا اختیار نہیں، اور محض عورت کی طرف سے ناپسندیدگی کسی بھی فقہ میں فسخ نکاح کی وجہ جواز نہیں بنتی'' (الحیلۃ الناجزۃ ۲۴۳ بحوالہ فتاوی محمودیہ ۱۳؍۱۸۹)۔

## ۶۔ جن حضرات کے نزدیک خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں ان کے یہاں حکمین کے تقرر کا مسئلہ

یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ امام مالک کے نزدیک شوہر کی توکیل واجازت کے بغیر حکمین تفریق کرنے کے مجاز ہوتے ہیں، کتب مالکیہ میں حکمین کے مقرر کئے جانے کے تعلق سے مطلوبہ وضاحتیں حسب ذیل ہیں:

(الف) حکمین کا تقرر زوجین کریں گے، کتاب الکافی فی فقہ اہل المدینۃ المالکی میں ہے: ''وللزوجین أن یبعثا الحکمین دون السلطان فإن کان الظلم من الزوج فرقا بغیر شئ'' (۲.۵۹۶)۔

اور اگر مسئلہ حل نہ ہو رہا ہو اور اسے قاضی کے سامنے پیش کیا جائے تو حکمین کا تقرر قاضی کرے گا۔ مذکورہ کتاب میں اسکی بھی صراحت موجود ہے: ''اگر زوجین کے درمیان حالات بگڑ جائیں، ان کا معاملہ سنگین ہوجائے، اور دونوں کی شکایت بار بار ہونے لگے، اور کسی کے پاس بینہ بھی نہ ہو اور نہ ان کے درمیان صلح کرانے ہی کی کوئی صورت ہو تو امام یا قاضی یا حاکم بشرطیکہ زوجین ان کے پاس اپنا معاملہ لے جائیں دو حکم بھیجیں گے'' (کتاب الکافی ۲؍۵۹۶)۔

(ب) اگر مسئلہ قاضی کے سامنے پیش کیا گیا اور یہ ثابت ہوگیا کہ عورت کا دعوی ضرر صحیح ہے تو قاضی اس عورت کو شوہر کی طرف سے طلاق دیدے گا۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے: ''وبناء علیه ترفع المرأة أمرها للقاضی، فإن أثبتت الضرر أو صحة دعواها، طلقها منه'' (۹.۷۰۶۰)۔

اور اگر عورت اپنا دعوی ضرر ثابت کرنے میں ناکام ہوجائے اور بار بار دعوی کرتی رہے تو قاضی حکمین بھیجے گا بغیر حکمین مقرر کئے ہوئے کوئی فیصلہ از خود نہیں

کرسکتا۔ علامہ محمد بن فرحون مالکی نے "تبصرة الحكام في أصول الأقضية و مناهج الأحكام" میں اس بات کی صراحت فرمائی ہے، لکھتے ہیں: ''فإن عمى على الحاكم خبرهما وطال تكررهما ولم يعلم الظالم منهما لم يسعه أن ينظر فى أمرهما بغير الحكمين'' (تبصرة الحكام: ۲،۱۵۵)۔ یہی بات الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے (۷،۶۰۹۰)۔

(ج) کتب مالکیہ میں اس بات کی بھی صراحت موجود ہے کہ زوجین کو یہ حق حاصل ہے کہ صرف ایک حکم مقرر کرلیں، یہ اختیار صرف زوجین کو حاصل ہے، سلطان کو بھی حاصل نہیں ہے۔

علامہ باجی نے المنتقی شرح المؤطا میں اسکی صراحت فرمائی ہے، لکھتے ہیں: '' ولو جعل الزوجان ذلك إلى رجل واحد جاز إذا كان من أهل الحكم قاله ابن القاسم فى المدونة ولايجوز ذلك للسلطان لأن فى ذلك إسقاطا لحق الزوجين'' (۴،۱۱۳، بحواله اوجز المسالك ۱۱،۳۶۳)۔

## ۷۔ مسئلہ شقاق میں کسی اور مکتب فکر کی طرف عدول کا مسئلہ

ہمارے علماء نے اس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ ضرورۃً قول ضعیف ومرجوح پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ مفتی عمیم الاحسان صاحب لکھتے ہیں: ''لايجوز العمل والإفتاء بالضعيف والمرجوح إلا عن ضرورة فلو أفتى فى مواضع الضرورة طلبا للتيسير كان حسنا'' (ادب المفتی ص: ۵۷۶)۔

نیز اس بات کی بھی صراحت موجود ہے کہ ضرورۃً دوسرے امام کی تقلید اس کے نقطہ نظر کی پوری رعایت کے ساتھ کی جاسکتی ہے، جیسا کہ فقہاء کرام نے امام مالک کے بعض اقوال پر فتوی دیا ہے، مفتی عمیم الاحسان صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''وقد نصوا أنه لا بأس بتقليد غير إمامه عند الضرورة لكن بشرط أن يلتزم جميع ما يوجبه ذلك الإمام لأن التلفيق باطل بالإجماع ولهذا أفتوا ببعض أقوال الإمام مالك ضرورة كما فى المفقود'' (ادب المفتی ص: ۵۷۶)۔

(علماء نے صراحت کی ہے کہ ضرورۃً اپنے امام کے علاوہ کسی دوسرے امام کی تقلید میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ اس امام کی تمام شرطوں کی پابندی کی جائے، اس وجہ سے کہ تلفیق بالاجماع باطل ہے، اسی وجہ سے علماء نے امام مالک کے بعض اقوال پر فتوی دیا ہے جیسے مفقود کے مسئلے میں)۔

یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ شقاق کی بناء پر امام مالک کے یہاں تفریق بین الزوجین کی گنجائش ہے، لیکن احناف کے یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے، باقی رہا اس سلسلے میں ضرورۃً امام مالک کے مسلک کی جانب عدول کرنے کا مسئلہ تو راقم سطور کی ناقص رائے میں شقاق ایسی ضرورت نہیں ہے کہ مسلک احناف کو چھوڑ کر مسلک مالکیہ پر عمل کرنے کا حکم دیا جائے، ورنہ تو شقاق کا دائرہ عام ہوجائے گا، اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی شقاق کے دائرے میں رکھ کر فسخ نکاح کا مطالبہ کیا جائے گا، حضرت تھانویؒ نے الحیلۃ الناجزۃ میں احتیاط کے ساتھ جتنی گنجائش پیدا کی ہے کم نہیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ عموماً عورت مظلوم ہوتی ہے لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ بعض دفعہ عورت کی نازیبا حرکتوں سے شوہر بھی تنگ رہتا ہے اور کبھی کبھی عورت کے نشوز پر شوہر کی تادیبی کاروائی کو بھی ظلم تصور کیا جانے لگتا ہے اور کبھی اندرونی مسائل کچھ ہوتے ہیں اور ظاہر میں کسی اور عنوان سے پیش کئے جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں شقاق کی بنیاد پر مسلک مالکیہ کے مطابق کسی محکمہ شرعیہ، شرعی پنچایت یا حکمین کو تفریق بین الزوجین کا اختیار دینا ازدواجی مصالح کے بھی خلاف ہوگا کہ شریعت نے جس رشتۂ نکاح کو آخری حد تک باقی رکھنے کا تاکیدی حکم فرمایا ہے، اس کو پامال کرنے کے لئے زود رنج، تنگ مزاج اور تند خو افراد شقاق کو بہانہ بنائیں گے جبکہ ضروری نہیں کہ فی الواقع شقاق بھی ہو۔

اور اگر شقاق کے سبب تفریق بین الزوجین ناگزیر ہی ہو تو مسلک احناف کے مطابق بھی اس کا حل بذریعہ توکیل نکالا جاسکتا ہے وہ اس طرح کہ جب محکمہ شرعیہ، شرعی پنچایت یا گاؤں محلے کے مقتدر لوگ زوجین کے نزاعی مسائل کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد یہ محسوس کریں کہ ان کے باہمی نزاعات کافی شدید اور نہایت الجھے ہوئے ہیں، ان کا تصفیہ بظاہر آسان نہیں ہے اور عین ممکن ہے کہ مصالحت کی جملہ کوششیں ناکام ہوجائیں تو اس سلسلے کی تمام کاروائیوں کا آغاز زوجین کی توکیل سے کریں، زوجین اپنی طرف سے کچھ لوگوں کو یا محکمہ شرعیہ اور شرعی پنچایت کے ذمہ داران کو وکیل بنادیں اور یہ لوگ ضرورت ومصلحت کے مطابق مسئلے کا حل نکالیں، اگر مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے تو بہت بہتر، ورنہ خلع وطلاق کے ذریعہ زوجین کے درمیان علیحدگی کرادی جائے۔ ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔ ☆☆☆

# خلع اور فسخ نکاح

مفتی نذیر احمد کشمیری قاسمی[1]

اسلام میں نکاح جن اہم ترین مقاصد کی بناء پر مشروع کیا گیا ہے وہ یہ ہیں، نکاح حصولِ اولاد اور بقاءِ نسل کا ذریعہ ہے، اسی کے ذریعہ انسان کی جنسی ضرورت کی تکمیل جائز طریقے سے ہوتی ہے۔ یہ تحفظ عصمت کا واحد سبب ہے، اسی کی وجہ سے معاشرہ پاکیزہ، عصمتیں محفوظ رہتی ہیں، اسی کے ذریعہ خاندان تشکیل پاتے ہیں، یہی دو مختلف بلکہ اجنبی خاندانوں کے درمیان قرابت، موانست، شفقت ومعاونت کا سبب بنتا ہے۔ اسی کے نتیجہ میں انسان کو ذہنی سکون، قلبی نشاط، جسمانی راحت اور معاشرتی وقار حاصل ہوتا ہے اور یہی گھر کے استحکام اور خاندانی اقدار کی بقاء اور حسنِ معاشرت کا مظاہرہ کرنے کی راہ ہموار کرتا ہے۔

یہ اور اس جیسے دوسرے عظیم مقاصد ہی کی بناء پر بعض حالات میں یہ نکاح لازم ہوجاتا ہے ''وعند التوقان واجب'' (کنز الدقائق)، یعنی غلبۂ شہوت کی صورت میں نکاح واجب ہے۔ جب کہ عام حالات میں یہ سنت ہے ''النکاح من سنتی'' (مشکوٰۃ)، نکاح صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں ہی سنت نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی حیات کا ایک اہم شعبہ اور ان کی شریعت کا ایک بنیادی حصہ ہے، چنانچہ ارشاد نبوی ہے: ''أربع من سنن المرسلین: النکاح، والحیاء، والتعطر، والسواك'' (ترمذی)۔ چار باتیں تمام انبیاء کی سنت ہیں: نکاح، حیاء، عطر اور مسواک)۔

یہ اہم مصالح چونکہ وقتی اور عارضی نہیں بلکہ ان کا دائرہ انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے اس لئے اس میں جس درجہ استحکام اور پائیداری ہوگی اسی درجہ یہ اہم مقاصد پورے ہوں گے۔ اسی لئے اسلام نے نکاح کو میثاق غلیظہ یعنی پختہ عقد اور مستحکم رشتہ قرار دیا ہے۔

نکاح کے ان اہم مقاصد اور زوجین کا ایک دوسرے کے اس درجہ ضرورت معیت اور حوائج زندگی میں ایک دوسرے کا معاون ہونے کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ نکاح کے اس رشتہ میں استحکام ہی نہیں دوام بھی ہو۔ ملاطفت، ملائمت، موانست اور ادائیگی حقوق کے ساتھ حسن معاشرت کو ہر حال میں قائم وبرقرار رکھنے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کی جائے اور جو امور اس میں استحکام کے بجائے بگاڑ پیدا کرنے کا سبب بنیں ان سے دونوں مکمل طور پر اجتناب کریں، اس کے لئے ایک طرف مردوں کو حکم دیا گیا: ''وعاشروهن بالمعروف'' (النساء: ۱۹) (اپنی بیویوں کے ساتھ حسن معاشرت کا حسن سلوک کرو)۔ اور دوسری طرف عورتوں کو ادائیگی حقوق، اطاعت شعاری کی صفت کی تحسین کرتے ہوئے ارشاد ہوا: ''فالصلحت قنتت حفظت للغیب بما حفظ اللہ'' (النساء: ۳۴)۔ (پس جو صالح عورتیں ہیں وہ فرماں بردار اور اطاعت شعار ہوتی ہیں، اور مردوں کے پیچھے ان چیزوں کی حفاظت کرتی ہیں جن کو اللہ نے حفاظت میں رکھا ہے)۔

زوجین جب اپنے فرائض کی ادائیگی اور ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری کا طرز عمل اپنانے کا اہتمام کریں تو یہ ان دونوں ہی نہیں بلکہ ان کی اولاد اور دونوں کے خاندانوں کے لئے وجہ تسکین اور حیات پر مسرت کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے جہاں نکاح کی ترغیب دی اور زوجین کو حسن معاشرت کی تلقین کی ہے وہیں اس رشتہ کے منقطع کرنے کو ایک ناپسندیدہ عمل قرار دیا ہے، ارشاد ہے: ''أبغض المباحات عند اللہ الطلاق'' (ابوداؤد، ابن ماجہ) (اللہ کی نظر میں مباح امور میں سے سب سے ناپسندیدہ امر طلاق ہے)۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے معاذ! اللہ نے روئے زمین پر جتنی چیزیں حلال کی ہیں ان میں سب سے ناپسندیدہ اور بری چیز طلاق ہے (دارقطنی بحوالہ مشکوٰۃ)۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تزوجوا ولا تطلقوا فإن الطلاق یهتز منه عرش الرحمن'' (نکاح کرو، مگر طلاق نہ دو، اس سے اللہ کا عرش کانپ جاتا ہے)۔

نکاح اپنے ساتھ جن بے شمار فوائد اور زندگی کے خزاں میں جو بہاریں لاتا ہے، جس طرح وہ مسرتوں، راحتوں اور نوع بنوع کے ثمرات سے لبریز کردیتا ہے

---

[1] دار الافتاء دار العلوم رحیمیہ بانڈی پورہ، کشمیر

اس سے کہیں زیادہ، مضرتوں، خرابیوں، اور قسم قسم کی تباہیوں کا سبب اس وقت بن جاتا ہے جب اس کو انقطاع کا سامنا کرنا پڑے، یہ انقطاع چونکہ بے شمار نقصانات اور ایک دوسرے کے لئے طرح طرح اذیتوں کا یقینی سبب بنتا ہے، اسی لئے دیگر مذاہب خصوصاً عیسائیت اور ہندوازم میں ابتداء سے ہی طلاق کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔

لیکن اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے وہ انسانی مزاج کی موافقت وعدم موافقت کو نظر میں رکھتا ہے، وہ آپس کے اختلاف مزاجوں کے تفاوت اور طبیعتوں کے جوڑ نہ لگنے اور ایک دوسرے پر ظلم وحق تلفی کے انسانی مزاج سے واقف ہے، اس لئے وہ جہاں نکاح کی ترغیب، اس کو مستحکم وپائیدار رکھنے کی ترغیب دیتا ہے اور طلاق کو ناپسند کرتا ہے اس کے ساتھ وہ ضرورت شدیدہ کی بناء پر اس کی اجازت بھی دیتا ہے۔

اسلام کی نظر اگر چہ معمولی اختلاف کی بناء پر رشتہ منقطع کرنے سے اجتناب برتنا ضروری ہے، لیکن اگر میاں بیوی کی زندگی رشتہ باقی رکھنے کی صورت میں اجیرن بن جائے اور نکاح راحت نہیں مصیبت بن جائے اور ان کے لئے مفارقت میں ہی بہتری ہو تو پھر اسلام میں اس فطری تقاضے کو تسلیم کیا گیا اور ناپسند ہونے کے باوجود طلاق کی اجازت دی گئی۔

ظاہر ہے کہ یہ طلاق اور جدائیگی جب واقعی ضرورت بن جائے اور رشتہ باقی رکھنا دونوں کے لئے وجہ مصیبت واذیت بن جائے تو پھر زبردستی جبر کر کے رشتہ باقی رکھنے کا حکم دینا ان کے لئے اور ان کے خاندان کے لئے عقل عام کی رو سے بھی درست نہیں ہے۔ ایک ہی ماں کے بطن سے پیدا ہونے والے دو بچوں کے مزاج میں تفاوت ایک بدیہی حقیقت ہے تو دو اجنبی خاندانوں کے مرد وعورت میں اس کا وقوع کیوں ناممکن ہے۔

چنانچہ اسلام نے طلاق کی اس ضرورت کو تسلیم کرنے کے باوجود پہلے اصلاح حال کی دوسری ہر ممکن تدبیر اختیار کرنے کا حکم دیا، ارشاد ہے:

''والتی تخافون نشوزھن فعظوھن واھجروھن فی المضاجع واضربوھن فإن اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلا'' (النساء: ۳۴)۔ (اور جن عورتوں سے تم کو نشوز کا اندیشہ ہو ان کو نصیحت کرو، اور ان کے بستر سے جدا کردو، اور (تنبیہ کے لئے مناسب) سزا دو پھر اگر وہ تمہاری فرماں بردار بن جائیں تو پھر ظلم وزیادتی کے بہانے مت ڈھونڈو)۔

اصلاح حال کی ان تمام تدابیر کے باوجود اگر موافقت پیدا نہ ہو تو پھر اسلام نے مرد کو حق دیا ہے کہ وہ رشتہ منقطع کرنے کے لئے طلاق کا قدم اٹھائے۔ طلاق کا یہ حق صرف مرد کے ہاتھ میں دیا گیا۔ اس لئے کہ مرد میں نسبتاً تحمل، بردباری، اور نگاہ کی دوررسی زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں عورت میں زود ناعاقبت اندیشی، اور وقتی اشتعال پر آخری حربہ تک اختیار کر ڈالنے کا مزاج غالب ہوتا ہے۔ اس لئے طلاق کا ہتھیار اس کے ہاتھ میں نہ دے کر دراصل اس جبلت کی رعایت اور آئندہ اس کو طرح طرح کے مصائب سے محفوظ رکھنے کا راستہ اپنایا گیا ہے۔

لیکن کبھی شوہر کی طرف سے ظلم ہوتا ہے، یا عورت کا مزاج اس سے میل نہیں کھاتا اور مرد اگر چہ رشتہ برقرار رکھنا چاہتا ہے مگر عورت گلوخلاصی میں ہی عافیت سمجھتی ہے تو اگر چہ اسلام نے عورت کو طلاق کا حق نہیں دیا مگر اسے خلع کی اجازت دی ہے، لیکن یہ اجازت بھی کسی واقعی ضرورت کی بناء پر دی گئی ہے۔ اگر کوئی حقیقی ضرورت نہ ہو تو پھر عورت کا خلع کرنے کا مطالبہ ہرگز پسندیدہ نہیں۔ چنانچہ جو عورت بلاوجہ خلع کا مطالبہ کرے اس کے متعلق حدیث میں ہے: ''حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو عورت بلاضرورت خلع کا مطالبہ کرے اس پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہوتی ہے (ابن ماجہ بحوالہ مشکوۃ)۔ ایک حدیث میں ہے جس عورت نے بلاوجہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کیا اس پر جنت کی خوشبو حرام ہوتی ہے (نسائی)۔

اس لئے معمولی اختلافات اور قابل اصلاح شکایات کی وجہ سے یا محض نئی لذت پانے کے لئے تفریق کا راستہ اختیار کرنا سخت ناپسندیدہ ہے، اگر واقعۃً عورت ظلم کا شکار ہے۔ اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے سخت اذیت میں مبتلا ہے، اور نبھاؤ کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور شوہر طلاق دینے پر بھی آمادہ نہ ہو تو پھر بلاشبہ خلع کا حق ہے۔

خلع (فتح کے ساتھ) کا معنی اتارنا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے خلع ثوبہ یعنی اس نے لباس اتار دیا (کفایہ باب الخلع)۔

شریعت کی اصطلاح میں خلع کی حقیقت یہ ہے: ''إزالة ملك النكاح ببدل بلفظ الخلع'' (فتح القدیر باب الخلع) (مالی معاوضہ لے کر لفظ خلع کے ذریعہ ملکیتِ نکاح کو ختم کرنا خلع کہلاتا ہے۔ قرآن کریم نے مرد وعورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے تو جب خلع کیا جاتا ہے تو گویا یہ ایک دوسرے کے

لباس کو اتار دیتے ہیں)۔

علامہ شامیؒ نے لکھا ہے: ''خلع، لباس اتارنے سے ماخوذ ہے، مرد وعورت چونکہ ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں اس لئے جب وہ خلع کرتے ہیں تو گویا ہرایک نے اپنے لباس ہونے کو دوسرے سے اتار دیا''۔

قرآن کریم اور احادیث سے خلع کا مشروع ہونا ثابت ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ''لا یحل لکم ان تاخذوا مما اتیتموھن شیئا الا ان یخافا الا یقیما حدود اللّٰہ'' (البقرہ: ۲۲۹)۔ (تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم ان عورتوں سے اس مہر میں سے کچھ واپس لو جو تم ان کو دے چکے ہو، ہاں اگر تم کو اس کا اندیشہ ہو کہ اللہ کی حدود قائم نہ رہ سکیں (تو پھر لے سکتے ہو)۔

نیز ارشاد ہے: فان خفتم ان لا یقیما حدود اللّٰہ فلا جناح علیھما فیما افتدت بہ (البقرہ)۔

اس پر صاحب جلالین نے لکھا ہے: ''لاحرج علی الزوج فی اخذہ ولا الزوجۃ فی بذلہ'' شوہر کے لئے کوئی حرج نہیں کہ وہ بدل خلع وصول کرے اور زوجہ کے لئے کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ عوض خرچ کرے)۔

خلع کے متعلق احادیث میں متعدد واقعات ملتے ہیں۔ چنانچہ بخاری، ترمذی، نساء، ابوداؤد، ابن ماجہ وغیرہ میں ہے:

''حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ثابت بن قیس کی زوجہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض پرداز ہوئیں کہ حضرت! ثابت بن قیس کے دین واخلاق کی مجھے کوئی شکایت نہیں لیکن اسلام قبول کر لینے کے بعد ان کی حق تلفی کا گناہ مجھ سے صادر ہوسکتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم ان کا مہر میں دیا ہوا باغ واپس کرنے کو تیار ہو، وہ بولی کہ ہاں اس پر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت بن قیسؓ سے فرمایا تم باغ قبول کرو، اور اس کو ایک طلاق دے دو۔

ثابت بن قیس کی زوجہ کی نفرت کی بنیاد کیا تھی اس سلسلے میں بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شکل وصورت کی بناء پر وہ یہ مطالبہ کرتی تھیں اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان کو زدوکوب بھی کیا تھا، چنانچہ ضرب شدید کی بناء پر ہاتھ ٹوٹنے کا تذکرہ مصنف عبد الرزاق، نسائی اور ابوداؤد وغیرہ میں ہے۔ جبکہ ان کی شکل وصورت کی وجہ سے تنفر کا بیان مصنف عبد الرزاق اور ابن ماجہ میں ہے جبکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو مختلف عورتوں کا مسئلہ ہے۔ ایک کا نام جمیلہ بنت عبد اللہ بن ابی، اور دوسری کا نام حبیبہ بنت سہل ہے۔

اور علامہ سیوطیؒ نے الدر المنثور میں حضرت عمر فاروقؓ کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے: "إذا أرادت النساء الخلع فلا تکفروھن" (جب عورتیں خلع کرنے پر مصر ہوں تو ان کو ناکارمت کرو)۔ اس ارشاد کو امام بیہقی نے بھی اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔

خلع میں چونکہ بدل اور عوض ہوتا ہے۔ اور عورت عامۃ مجبور ہوکر ہی اس کا ارادہ کرے گی تو فطری طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ بدل خلع کی مقدار کیا ہوگی، کیا شوہر کو کلی اختیار ہے کہ وہ جتنا چاہے وہ مطالبہ کرے، اس سلسلے میں تمام فقہاء نے جو اصول نقل کیا ہے وہ علامہ کاسانیؒ کے الفاظ میں یہ ہے:

نشوز یا تو شوہر کی طرف سے ہوگا یا عورت کی طرف سے، اگر شوہر کی طرف سے ہے تو اس کے خلع میں بطور عوض کوئی چیز لینا جائز نہیں، اس لئے کہ ارشاد خداوندی ہے اگر تم نے ایک زوجہ کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ارادہ کر ہی لیا (اور پہلی زوجہ تم سے خلع چاہنے لگے) اور تم اسے ڈھیر سارا مال (مہر وغیرہ) دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو، کیا تم بہتان اور ظلم عظیم کرتے ہوئے واپس لوگے؟

اگر نشوز زوجہ کی طرف سے ہی ہو اور وہی خلع کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑی ہوئی ہو تو اس صورت کے لئے علامہ کاسانیؒ نے لکھا ہے: ''وإن کان النشوز من قبلھا فلا بأس بأن یأخذ منھا شیئا قدر المھر لقولہ تعالی إلا أن یاتین بفاحشۃ مبینۃ'' (اگر نشوز عورت کی طرف سے ہو تو شوہر کے لئے کوئی حرج نہیں کہ وہ مہر کے بقدر کوئی چیز لے، اس لئے کہ ارشاد قرآنی ہے ''مگر یہ کہ وہ صریح نافرمانی کا مرتکب ہوں'')۔

اس سلسلے میں حضرت ثابت بن قیس کا واقعہ صریح ثبوت ہے کہ جس میں مہر کے طور پر دیئے گئے باغ کے عوض خلع کیا گیا۔

اب اس کے بعد سوال یہ ہے کہ جس طرح طلاق شوہر کا حق ہے اور عورت چاہے یا نہ چاہے کیا عورت کو بھی اس طرح خلع کا اختیار ہے؟

اس سلسلے میں یہ امر طے ہے کہ جبری خلع جمہور امت اور تمام فقہاء کے یہاں متفقہ طور پر درست نہیں ہے بلکہ یہ تراضی زوجین پر موقوف ہے، اس سلسلہ

میں فقہاء کی تصریحات یہ ہیں: فقہ حنفی کی تمام کتب میں خلع کے سلسلہ میں تراضی کی تصریح ہے۔ چنانچہ علامہ کاسانیؒ نے لکھا ہے:

''خلع کے ارکان ایجاب وقبول ہیں، اس لئے کہ یہ طلاق واقع کرنے کے لئے ایک عقد ہے، لہٰذا نہ تو فرقت واقع ہوگی نہ عوض کا استحقاق ہوگا جب تک دونوں اس کو قبول نہ کرلیں''۔

علامہ سرخسیؒ نے لکھا ہے: ''فیحتمل الفسخ بالتراضی وذلك بالخلع'' (آپسی رضامندی سے نکاح کو ختم کرنا ممکن ہے اور وہ بذریعہ خلع ہے)۔

علامہ سرخسی نے یہ بھی لکھا ہے: ''خلع امیر (حاکم قاضی) کے پاس کرنا بھی جائز ہے اور سلطان کے علاوہ کسی اور کے پاس بھی، اس لئے کہ یہ ایسا عقد ہے جو دوسرے عقود کی طرح آپسی رضامندی پر ہوتا ہے'' (المبسوط باب الخلع)۔

یہی بات علامہ ابوبکر الجصاصؒ نے احکام القرآن میں، علامہ شامیؒ نے رد المحتار میں، علامہ زیلعیؒ نے شرح کنز تبیین الحقائق میں، فتاوی ہندیہ، خلاصۃ الفتاوی وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا: ''لیس للحاکم أن یامرهما (الحکمین) یفرقان إن رأیا إلا بأمر الزوج ولا یعطیا من مال المرأة إلا بإذنها'' (کتاب الام)۔ (حاکم کے لئے اس کی اجازت نہیں کہ وہ دوطرف مقرر شدہ ثالثوں کو زوجین کے درمیان تفریق کرنے کا حکم کرے جب تک شوہر راضی نہ ہو اور نہ ہی ان ثالثوں کو یہ حق ہے کہ وہ عورت کا مال شوہر کو دیں جب تک کہ وہ رضامند ہو کر اجازت نہ دے)۔

امام شافعیؒ نے یہ بھی فرمایا: ''ولا یجبر علی فراقها'' (الام ۵؍۱۹۴)۔ (شوہر پر اس بات کا جبر نہیں کیا جائے گا کہ وہ زوجہ کو طلاق یا خلع سے جدا کردے)۔

یہی بات دوسرے فقہائے شافعیہ مثلاً علامہ ابو اسحق شیرازیؒ نے المہذب میں اور علامہ نوویؒ نے شرح المجموع میں نقل فرمائی ہے۔ مالکیہ کی ترجمانی علامہ ابن رشدؒ نے یوں فرمائی ہے: ''إن الجمهور علی أن الخلع جائز بالتراضی'' (بدایۃ المجتهد)۔ (جمہور کا فیصلہ یہی ہے کہ خلع رضامندی اور دونوں کے آمادہ ہونے پر ہو سکتا ہے)۔ اگر عورت خلع کی پیشکش کرے اور شوہر قبول نہ کرے تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟ اس سلسلہ میں علامہ ابوالولید باجیؒ مالکی نے لکھا'' وتجبر علی الرجوع إلیه إن لم یرد فراقها بخلع أو غیره'' (المنتقی شرح الموطا)۔ (عورت کو حکم کیا جائے گا کہ وہ شوہر کے ساتھ رہے اگر شوہر خلع وغیرہ کے ذریعہ رشتہ منقطع کرنے پر رضامند نہ ہو)۔

فقہ حنبلی کی معتبر و مستند ترین کتاب ''المغنی'' میں علامہ ابن قدامہؒ نے لکھا: ''لأنه معاوضة فلم یفتقر إلی السلطان کالبیع والنکاح ولأنه قطع عقد بالتراضی'' (المغنی ۷؍۵۴)۔ (خلع چونکہ عوض لینا اور دینا ہوتا ہے اس لئے یہ کسی حاکم یا قاضی پر موقوف نہیں جیسے بیع اور نکاح ہوتا ہے اور اس لئے بھی کہ یہ آپسی رضامندی سے عقد نکاح کو منقطع کرنے کا عمل ہے)۔

علامہ ابن قیمؒ نے زوجین کی رضامندی کی اصل وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا: ''حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلع کو فدیہ کا نام رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں عوض لینے دینے کا معاملہ ہے اور اس لئے اس سلسلہ میں یہ امر فیصلہ کن ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثابت بن قیس اور ان کی زوجہ کے درمیان جو خلع کرایا وہ دونوں کی رضامندی سے کرایا (دیکھئے: مصنف عبدالرزاق)۔

اس واقعہ سے صراحۃً یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلع میں جبر نہیں تراضیٔ طرفین شرط ہے، اس لئے قرآن کریم کی آیات، حدیث کی ان توضیحات اور فقہاء کرام کی ان تصریحات کے بعد یہ طے ہے کہ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ عورت کو شوہر کی رضامندی کے بغیر خلع لینے کا حق ہے ان کا یہ قول باطل اور شریعت اسلامیہ کے خلاف ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زوجہ شوہر سے شدید متنفر ہو اور وہ رشتہ زوجیت برقرار رکھنے پر آمادہ نہ ہو مگر شوہر نہ تو طلاق دیتا ہے اور نہ ہی خلع قبول کرنے کو تیار ہے، یا شوہر کی طرف سے ظلم و ناروا سلوک ہے کہ جس سے زوجہ کی زندگی سخت اذیت میں ہے اور وہ مزید اس اذیت کو جھیلنے کے لئے تیار بھی نہیں اور شوہر طلاق یا خلع دونوں میں سے ایک پر بھی راضی نہیں اس صورت حال کے متعلق قرآن کریم نے جو حل تجویز فرمایا ہے وہ یہ ہے:

''وإن خفتم شقاق بینهما فابعثوا حکما من أهله وحکما من أهلها، ان یریدا اصلاحا یوفق الله بینهما'' (النساء: ۳۵)۔ (اگر تم کو اندیشہ ہو کہ زوجین کے درمیان شدید ناموافقت (بلکہ آپسی عداوت) پیدا ہو گئی ہے تو ایک حکم مرد کے اقارب میں سے اور ایک حکم عورت

کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو، وہ دونوں ان کے درمیان صلح جوئی کی کوشش کریں اللہ ان کے درمیان موافقت پیدا کردے گا)۔

اس آیت میں فرمایا گیا کہ زوجین کے درمیان اگر شقاق پیدا ہوجائے تو کیا تدبیر اختیار کی جائے گی، ذیل میں پہلے شقاق کے معنی بیان کئے جاتے ہیں اور پھر قرآن کریم کی آیت کی روشنی میں حل پر بحث کی جائے گی۔

''شقاق'' کے متعلق صاحب روح المعانیؒ نے لکھا ہے: ''اصل الشقاق المخالفة وكونك في شق غير شق صاحبك'' (شقاق کے معنی مخالفت کے ہیں، اور تیرا ایک طرف اور تمہارے ساتھی کا دوسری طرف ہونا ہے)۔

صاحب تفسیر خازن نے لکھا: ''كون كل واحد من المتخالفين وهو أن يقول كل واحد من الزوجين ما يشق صاحبه سماعه'' (یعنی دو کا آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہونا اور وہ (شقاق) یہ ہے زوجین میں ایک دوسرے کو ایسی باتیں جو دوسرا سنے تو اسے رنج ہو)۔

تفسیر طبری اور عمدۃ الحفاظ وغیرہ میں بھی شقاق کی یہی صراحت ملتی ہے۔

جب زوجین کے درمیان اس درجہ کا شقاق ہو اور اس کے نتیجے میں مقاصد نکاح پورے نہ ہونے کے حالات پیدا ہوچکے ہوں تو قرآن کریم حکمین کے تقرر کا حکم دیتا ہے کہ وہ دونوں طرف کے معاملات، شکایت، اور شقاق کی وجوہات کی تحقیق کرکے اصلاح احوال کی تدابیر اختیار کریں، چنانچہ حکمین کے اس تقرر کرنے پر کیا نتائج وثمرات متوقع ہیں، قرآن نے بیان کیا: ''إن يريدا إصلاحاً يوفق الله بينهما''۔

اب سوال یہ ہے کہ حکمین کا یہ تقرر خود زوجین کریں گے یا قاضی اور ان حکمین کی حیثیت کیا ہوگی، کیا وہ صرف صلاح کار کی حیثیت رکھتے ہیں یا ان کو نکاح برقرار رکھنے یا فسخ کرنے کے بھی اختیارات ہوں گے اور یہ اختیارات زوجین کے تفویض کے بعد ہوں گے یا صرف ان کے تقرر پر ہی وہ ان اختیارات کے حامل قرار پائیں گے، اس سلسلہ میں پہلے حکمین کے تقرر کے سلسلہ میں قرآن کریم کے اس حکم میں غور کرنا چاہئے:

''وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها۔ إن يريدا إصلاحاً يوفق الله بينهما''

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین اور فقہاء نے جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ سب اس پر متفق ہیں، اس مصالحتی کمیٹی کے افراد کو صرف صلاح کار کا درجہ حاصل ہے نہ تو زوجین کو جبراً اس کا مکلف بنایا جاسکتا ہے کہ وہ حکم مقرر کریں اور نہ ہی حکمین کو جبراً خلع یا فسخ کا اختیار ہے۔ اگر حکمین نے زوجین کی رضا کے بغیر خلع کا فیصلہ کیا یا نکاح فسخ کردیا تو یہ فیصلہ نافذ نہ ہوگا، خلع میں زوجین کی رضا ضروری ہے، اس لئے کہ ایک کو مال دینا ہے اور دوسرے کو طلاق دینی ہے اور یہ دونوں کی رضا کے بغیر نہیں ہوسکتے۔ جبکہ فسخ میں شوہر کی رضا شرط ہے۔ اگرچہ امام احمد بن حنبلؒ کی اس سلسلے میں دو رائیں ہیں، ایک رائے یہ کہ حکمین کو فسخ کا اختیار ہے، یہ علامہ ابن قدامہ نے المغنی میں نقل فرمائی ہے مگر المغنی کے متن میں رضاء زوجین کو شرط قرار دیا ہے، اصول کے مطابق اگرچہ متن ہی کا حکم راجح قرار پائے گا لیکن اگر ضرورت کی بناء پر علامہ ابن قدامہ کی رائے لے لی جائے تو اس کی بھی یقیناً گنجائش ہے۔ جبکہ علامہ ابن قدامہ نے اپنی اسی رائے کو بہت مدلل کرکے نقل فرمایا ہے۔

دوسری رائے امام مالکؒ کی ہے کہ ان حکمین کو خلع یا فسخ کا اختیار ہے، امام ابوحنیفہؒ کی رائے امام طحاویؒ کے الفاظ میں یہ ہے:

''وليس للحكمين في الشقاق أن يفرقا إلا أن يجعل ذلك إليهما الزوج'' (مختصر الطحاوی: ۱۹۱)۔

(حکمین کو شقاق کی صورت میں حق تفریق نہیں ہے، ہاں اگر شوہر نے ان کو یہ اختیار سونپ دیا ہو تو وہ تفریق کرسکتے ہیں)۔

اور امام مالکؒ کی رائے خود موطا مالک میں یہ ہے: ''وذلك أحسن ما سمعت من أهل العلم أن للحكمين يجوز قولهما بين الرجل والمرأة في الفرقة والاجتماع'' (موطا مالك: ۵۲۷)۔ (اس سلسلہ میں اہل علم سے جو احسن بات مجھ تک پہنچی ہے وہ یہی کہ حکمین کی مرد وعورت کے درمیان تفریق وغیر تفریق کی بات معتبر ہوگی)۔

اس سلسلہ میں علامہ ابوبکر جصاص رازیؒ نے احکام القرآن میں، علامہ ابن رشدؒ نے بدایۃ المجتہد میں، علامہ ابوالولید الباجیؒ نے المنتقی شرح موطا میں، علامہ خرشیؒ نے مختصر خلیل میں، علامہ دسوقیؒ نے شرح کبیر میں، حضرت امام شافعیؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب 'الام' میں، امام فخر الدین رازیؒ نے تفسیر کبیر میں، علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر ابن کثیر میں، علامہ آلوسیؒ نے اپنی تفسیر روح المعانی میں، علامہ ابن قدامہؒ نے المغنی میں جو توضیحات وتصریحات فرمائی ہیں ان کا لب لباب

یہی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے یہاں حکمین کو یہ اختیار نہیں ہے اور امام مالکؒ کے یہاں اختیار ہے۔

اس سلسلہ میں دونوں طرف سے استدلال اور دلائل موجود ہیں، حنفیہ کا استدلال قرآن کریم کی اسی آیت سے اس طرح ہے کہ ان حکمین کو اولاً اصلاح حال کی سعی کرنے کی ذمہ داری ہے۔ دونوں طرف کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے کے بعد ان کے تدارک کی تدابیر بتانی ہیں، اور اگر وہ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ وہ رشتہ آگے چلنے والا نہیں ہے تو رشتہ ختم کرنے یعنی طلاق دے کر زوجہ کو آزاد کرنے یا خلع کرنے کی تجویز پیش کرنی ہوگی، از خود وہ نہ خلع کر سکتے ہیں اور نہ از خود طلاق یا فسخ کر سکتے ہیں۔

علامہ ابوبکر جصاصؒ نے لکھا: ”ہمارے حضرات حنفیہ نے کہا ہے کہ حکمین کو یہ اختیار نہیں کہ وہ تفریق کریں جب تک شوہر اس پر راضی نہ ہو اور یہ اس لئے کہ اگر بالفرض ظلم و زیادتی اور برے سلوک کو تسلیم کرے تو صرف اس تسلیم کرنے پر تفریق نہیں ہو سکتی، اور نہ ہی قاضی اس کو طلاق دینے پر جبر کر سکتا ہے جب تک حکمین کی تحکیم نہ ہو، اسی طرح اگر عورت نشوز کا اقرار کرے تو قاضی اسے خلع کرنے پر اور مہر واپس کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ جب تحکیم سے پہلے کے لئے مسئلہ یہ ہے تو تحکیم کے بعد بھی یہی حکم ہوگا کہ حکمین شوہر کی رضا اور توکیل کے بغیر طلاق واقع کرنے کا اختیار نہیں رکھتے اور عورت کی رضامندی کے بغیر خلع نہیں کر سکتے اسی وجہ سے ہمارے حضرات نے کہا کہ ان حکمین کو زوجین کی رضا کے بغیر خلع کا بھی اختیار نہیں ہے اور نہ ہی تفریق کرنے کا اختیار ہے اس لئے کہ جب قاضی اس کا اختیار نہیں رکھتا تو یہ حکم کیسے اس کا اختیار رکھیں گے“ (احکام القرآن)۔

حنفیہ کے استدلال کی دوسری بنیاد حضرت علیؓ کا وہ واقعہ ہے کہ حضرت علیؓ کے پاس دو میاں بیوی اپنے ساتھ بہت سے لوگوں کو لے کر حاضر ہوئے اور اپنے نزاع کا فیصلہ کرنے کی درخواست کی حضرت علیؓ نے حالات سن کر دونوں طرف سے حکم مقرر فرمائے اور ان دونوں حکموں کو ان کا کام سمجھایا کہ تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ اولاً ان کے درمیان صلح صفائی کراؤ، اگر ان کا رشتہ برقرار رہ سکتا ہو تو ایسا ہی کرو، اور اگر تم ان کے لئے تفریق کرانے میں ہی بہتری سمجھو تو یہی کرو یعنی ان کے درمیان علاحدگی کرادو، حضرت علیؓ کا یہ حکم صادر ہوا تو عورت نے اس کو قبول کیا مگر شوہر نے تفریق کی بات قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: ”واللہ ... تنفلت مني حتى تقر كما أقرت“ (احکام القرآن) (واللہ تم یہاں سے تب تک ہٹ نہیں سکتے ہو جب تک تم بھی اسی طرح حکمین کی بات تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو جاؤ جیسے یہ عورت تیار ہو گئی ہے)۔

ظاہر ہے کہ اگر حکمین کو از خود یہ اختیار ہوتا تو حضرت علیؓ کو اس طرح اصرار کرنے بلکہ بجبر یہ بات تسلیم کرانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے حکمین کو از خود صرف تقرر کی بناء پر نہ تو اختیار خلع ہے اور نہ ہی حق تفریق ہے۔

حضرت امام شافعیؒ نے بھی یہی رائے اختیار فرمائی ہے چنانچہ کتاب الام میں ہے: ”وليس له أن يأمرهما يفرقان ان رأيا إلا بأمر الزوج ولا يعطيا من مال المرأة إلا بإذنها وذلك أن الله عزوجل إنما ذكر أنهما إن يريدا إصلاحاً يوفق الله بينهما ولم يذكر تفريقاً“۔

امام شافعیؒ نے یہ بھی فرمایا: ”ولا يجبر الزوجان على توكيلهما إن لم يوكلا“۔ (زوجین پر اس بات کا جبر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حکمین کو تفریق کی توکیل بھی دیں، اگر وہ یہ توکیل دینے پر تیار نہ ہوں)۔

غرض کہ حنفیہ اور شافعیہ کا مدار استدلال قرآن کریم کی آیت اور حضرت علیؓ کا یہ طرز عمل ہے، اس کے برخلاف امام مالکؒ ان حکمین کو اس کا حق دیتے ہیں کہ وہ خلع و تفریق دونوں میں سے جو مناسب سمجھیں اختیار کر سکتے ہیں، چنانچہ علامہ ابن رشدؒ نے امام مالکؒ کی رائے نقل کرتے ہوئے فرمایا: ”قال مالك وأصحابه يجوز قولهما في الفرقة والاجتماع بغير توكيل الزوجين ولا إذن منهما في ذلك“۔ (امام مالکؒ اور ان کے ماننے والے حکمین کو تفریق کرنے اور رشتہ برقرار رکھنے کا حق دیتے ہیں چاہے زوجین نے ان کو یہ اختیار نہ بھی دیا ہو)۔

حضرت امام مالکؒ کا استدلال بھی اسی آیت سے ہے اور وہ اس طرح کہ آیت میں نصب حکمین کا حکم قاضی کو ہے۔ گویا جو کام خود قاضی کو کرنا ہے کہ وہ زوجین کے درمیان رشتہ برقرار رکھے یا ختم کرنے کے لئے از خود تحقیق حال کرے۔ اور پھر فیصلہ کرے۔ لیکن جب قاضی نے ثالث کمیٹی مقرر کی تو وہ قاضی کی طرف سے وکیل فیصلہ ہیں، اس لئے جو اختیارات خود قاضی کے ہوں گے وہی ان حکمین کے ہوں گے، پھر ان حکمین کے متعلق قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ وہ اگر اصلاح کرانا چاہیں تو وہ یہ اقدام کریں، ظاہر ہے اس کے معنی یہ بھی ہوں گے کہ اگر وہ تفریق کرانا چاہیں اور وہ اسی نتیجہ پر پہونچیں کہ تفریق ہی بہتر ہے تو وہ تفریق

کرانے کا بھی اختیار رکھتے ہیں چاہے زوجین رضامند بھی نہ ہوں۔

حضرت امام مالکؒ کا دوسرا استدلال ان احادیث سے ہے جو احادیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہیں، حضرت ثابت بن قیس کی زوجہ نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے شوہر کے متعلق شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اتردین علیہ حدیقتہ قالت نعم" کیا تم اس کا دیا ہوا باغ (مہر) واپس کرنے پر تیار ہو انہوں نے عرض کیا کہ جی ہاں! اس پر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت سے فرمایا: "اقبل الحدیقۃ" تم اس کا باغ واپس لے لو "وطلقھا" اور اس کو طلاق دے دو۔

جب آپ نے طلاق دینے کا حکم دیا تو یہ صرف مشورہ یا تجویز نہیں تھی بلکہ فیصلہ تھا یہ واقعہ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے اور بخاری میں ہے۔

حضرت امام مالکؒ کا استدلال دوسرے اس واقعہ سے ہے جو ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ حضرت ثابت بن قیس کی دوسری زوجہ حضرت حبیبہ بنت سہل نے شوہر کی شکایت کرتے ہوئے عرض کیا کہ انہوں نے اتنا مارا کہ میرا ہاتھ ٹوٹ گیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت بن قیس سے فرمایا کہ تم ان کو مہر میں دیا ہوا باغ لے لو اور اس کو اپنے سے جدا کردو۔ خذھا وفارقھا۔ باغ لے لو اور اس کو طلاق دے دو۔

یہ واقعہ مصنف عبدالرزاق، ابن ماجہ اور سنن نسائی میں بھی ہے اس میں آپ نے فیصلہ کن انداز میں حکم تفریق دیا۔ صرف تجویز یا مشورہ پر اکتفا نہیں فرمایا۔ اگر یہ صرف مشورہ ہوتا تو جیسے حضرت بریرہؓ نے اپنے شوہر حضرت مغیث سے دوبارہ رشتہ کرنے کا مشورہ قبول نہیں کیا تھا اسی طرح یہاں بھی حضرت ثابت بن قیس کو اس مشورہ کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہوا۔ جب کہ ایسا نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ قاضی یا حاکم کو خلع کرانے یا تفریق کرنے کا اختیار ہے۔ علامہ ابن قدامہؒ نے حضرت امام احمد بن حنبل کا مسلک ذکر کرتے ہوئے ان کی دو رائیں نقل فرمائی ہیں۔ اور پھر حکمین کو حق تفریق دینے کی رائے کو مدلل بھی کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:

"امام احمدؒ سے حکمین کے متعلق دو روایتیں ہیں: ایک روایت یہ ہے کہ حکمین صرف وکیل زوجین ہیں وہ ان کی اجازت کے بغیر تفریق نہیں کرسکتے اور یہی حضرت عطاء کا مذہب اور حضرت امام شافعیؒ کی ایک رائے ہے اور یہی حضرت حسن بصری اور امام ابوحنیفہ سے نقل کیا گیا ہے اس لئے کہ شوہر حق استمتاع کا مالک ہے اور عورت مال مہر کی مالک ہے اور وہ دونوں عاقل بالغ باشعور ہیں۔ اس لئے کسی اور کو ان کے ان حقوق میں حق تصرف نہیں ہے۔ جب تک ان کی طرف سے باقاعدہ اس کی توکیل نہ ہو یا ان پر اس کا اختیار نہ ہو جیسے قاضی کو ہوتا ہے"۔

"دوسری رائے یہ کہ حکمین دراصل ان کے حق میں حاکم ہیں اس لئے ان کو اختیار ہے کہ وہ چاہیں تو عوض (خلع) یا بغیر عوض کے تفریق کردیں (یا رشتہ برقرار رکھیں) اور وہ زوجین کی طرف سے نہ توکیل کے محتاج ہیں نہ ان کا اختیار ان کی رضامندی پر موقوف ہے" (المغنی)۔

اور یہی بات حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت ابوسلمہ، امام شعبی، امام نخعی، حضرت سعید بن جبیر، اور امام مالک، امام اوزاعی، امام اسحق اور ابن منذر سے مروی ہے، اللہ تعالیٰ شانہ کے اس ارشاد کی بناء پر کہ حکم ہوا "فابعثوا الخ" تو اللہ نے ان کو حکم قرار دیا اور اس میں زوجین کے راضی ہونے نہ ہونے کا کوئی اعتبار نہیں کیا۔ پھر فرمایا: "ان یریدا اصلاحاً" تو حکمین کو اس طرح خطاب کرنا ان کے اختیار کو ظاہر کرتا ہے۔

آگے علامہ ابن قدامہؒ نے ایک تو حضرت علیؓ کا وہی واقعہ بطور دلیل کے پیش فرمایا جو پہلے گزر چکا ہے، اور دوسرے حضرت عثمان کا واقعہ نقل فرمایا جو المدونۃ الکبریٰ میں بھی ہے: حضرت عقیل نے فاطمہ بنت عتبہ سے نکاح کیا پھر ان دونوں میں نزاع اور شقاق پیدا ہوا، تو حضرت فاطمہ نے حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہو کر استغاثہ کیا۔ حضرت عثمان نے عقیل کی طرف سے حضرت عبداللہ بن عباس کو اور حضرت فاطمہ کی طرف سے حضرت معاویہ کو حکم مقرر فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا میں ان کے درمیان تفریق کرنا ہی حل سمجھتا ہوں جب کہ حضرت معاویہ نے فرمایا کہ میں عبد مناف جیسے اونچے خاندان کے درمیان تفریق کرانے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ ان حکمین کے کسی اقدام سے پہلے ہی زوجین نے آپس میں صلح صفائی کرلی۔ اس لئے ان حکمین کو کسی اقدام کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

دیکھئے اس واقعہ میں حضرت ابن عباس تفریق پر آمادہ ہیں، گویا وہ بحیثیت حکم اپنے آپ کو اس کا مختار و مجاز سمجھتے ہیں۔ مزید لطف یہ کہ حضرت معاویہ نے اس پر اعتراض نہیں کیا کہ ہم کو اس کا اختیار ہی کہاں ہے حالانکہ وہ تفریق کے حق میں نہ تھے، اس لئے یہ کہنے کا موقع تھا۔ مگر یہ اعتراض نہ کرنا خود اس بات کی دلیل

ہے کہ وہ بھی حکم کی اس حیثیت کے قائل ہیں۔ علامہ ابن قدامہؒ نے یہ واقعہ نقل کر کے لکھا:

''ولا یمتنع أن تثبت الولایۃ علی الرشید عند امتناعہ من أداء الحق کما یقضی الدین عنہ من مالہ إذا امتنع''۔

(ایک عاقل بالغ شخص کے عدم ادائیگی حق کی صورت میں قاضی کی ولایت کا مظاہرہ اور اقدام کو نہیں روکا جاسکتا جیسے کہ قرض کی عدم ادائیگی کی صورت میں قاضی کے یہ اختیارات ہوتے ہیں کہ مقروض کے مال سے از خود قرض ادا کردے)۔

خلاصہ یہ کہ صحابہ میں سے حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن عباس، تابعین میں سے سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، امام شعبی، محمد بن سیرین، امام مجاہد، ائمہ میں سے امام مالکؒ، امام شافعیؒ کی ایک رائے، اور امام احمدؒ کی بھی ایک رائے حسب بیان المغنی یہی ہے کہ حکمین کو حکم مقرر کرنے کے ساتھ ہی وہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ جمع وتفریق میں جو فیصلہ مناسب سمجھیں کریں، دراصل ان حضرات کا خیال ہے کہ قاضی کا نصب حکم ان کو اختیار سونپ دینے کا اقدام ہے کہ وہ معاملہ کی تحقیق بھی کریں اور رشتہ برقرار رکھنے یا ختم کرنے کا فیصلہ بھی کریں۔ اگر قاضی صراحت سے ان کو اختیار تفویض نہ بھی کرے تو بھی ان کو خلع یا تفریق بلاعوض کا فیصلہ کرنے میں کوئی مانع نہ ہوگا جیسے کہ حضرت عثمان نے حضرت ابن عباس اور حضرت معاویہ کو صراحت سے یہ نہیں فرمایا۔

اب اوپر بیان شدہ تفصیلات کی روشنی میں اس مسئلہ کی جو صورتیں بنتی ہیں وہ یہ ہیں:

الف: زوجین میں شقاق ہوا اور انہوں نے یا ان کے اقارب نے حکمین کا تقرر کیا اور ان کو صراحت سے حق تفریق نہیں دیا۔

ب: نصب حکمین خود زوجین نے کیا اور ان کو حق تفریق بھی دیا گویا وکیل بنایا۔

ج: زوجین میں شقاق ہوا اور قاضی کے پاس معاملہ پہنچے اور اس نے حکمین مقرر کئے اور ان کو صراحت سے حق تفریق نہیں دیا۔

د: قاضی نے حکمین کو جمع وتفریق کے تمام اختیارات توکیلاً سونپ دئے اور صراحت سے ان کو اس کا حق دیا۔

ہ: قاضی خود معاملہ سنے اور خود ہی تفریق کا فیصلہ کرے۔

ان پانچ صورتوں میں سے کسی بھی صورت میں حنفیہ کے یہاں حق تفریق نہ قاضی کو حاصل ہے نہ حکمین کو۔ جبکہ مالکیہ کے یہاں بھی پہلی صورت میں حکمین صرف ناصح یا مصلح ہیں۔ اس صورت میں حکمین حق تفریق نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ نہ ان کو زوجین نے یہ اختیار دیا ہے اور نہ ان کا تقرر قاضی نے کیا ہے۔ لہٰذا وہ نصیحت یا سرزنش تک محدود رہیں گے، بقیہ تمام صورتوں میں مالکیہ کے مسلک کے مطابق ان کو حق تفریق ہے، اور یہ اس لئے کہ دوسری صورت میں خود زوجین نے ان کو جمع وتفریق کا وکیل بنایا ہے، اس لئے حکمین کا فیصلہ واجب القبول ہوگا۔

تیسری چوتھی اور پانچویں صورت میں قاضی کو بھی اور حکمین کو بھی حق تفریق حاصل ہے، البتہ حکمین کے لئے چند شرائط ہیں جن کے پائے جانے کے بعد ہی ان کو یہ اختیار ہوگا۔

۱۔ حکمین شرعی احکام سے واقف، زوجین کے درمیان وجوہات شقاق کو اعتدال کے ساتھ سمجھنے کے اہل، غیر جانب دار، معاملہ فہم اور دیانت دار ہوں۔

۲۔ دو حکم مقرر کئے جائیں جن میں سے ایک شوہر کی نمائندگی کرے اور ایک زوجہ کی جیسا کہ حضرت عثمان اور حضرت علیؓ نے کیا اور جیسے کہ قرآن کریم کی صراحت ہے، اس لئے قاضی کے لئے تعدد پر عمل کرنا لازم ہے۔

۳۔ تفریق کا فیصلہ ہو تو دونوں کا متفق ہونا لازم ہے صرف ایک کی رائے ہو تو تفریق نہیں ہوسکتی۔

۴۔ حکمین کا تقرر ہی ان کو خلع یا تفریق کے اختیارات تفویض کرنے کا سبب ہے۔ اب نہ تو جمع وتفریق کے لئے صریح اجازت کی ضرورت ہے اور نہ ہی زوجین کی رضامندی شرط ہے۔

۵۔ رفع نزاع اور شقاق کو دور کرنے کے لئے فہمائش اور صلح صفائی کی تمام کوششیں جب بے سود ہو جائیں اور وہ دیانۃً تفریق ہی کو بہتر سمجھتے ہوں تو اس صورت میں ہی تفریق کرا سکتے ہیں۔

سوال نامہ میں پانچواں سوال یہ ہے:

"کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے، اس سلسلہ میں حنفیہ اور دوسرے فقہاء کا نقطۂ نظر کیا ہے:

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر عورت کی طرف سے شقاق کے بغیر خلع کا مطالبہ پایا گیا جیسے حضرت ثابت بن قیس کی زوجہ نے شکل وصورت کے نامرغوب ہونے کی بناء پر مطالبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے ان کی دینداری اور اخلاق کے متعلق کوئی شکایت نہیں تو اس طرح کے خلع میں تراضی طرفین شرط ہے۔ اور اس پر تمام امت کا اتفاق ہے جیسے کہ ابتداء میں تفصیل سے تمام فقہاء کی آراء درج ہوچکی ہیں چنانچہ اس واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلع کرنے کی تجویز دی، تفریق نہیں فرمائی۔ لیکن اگر مطالبۂ خلع کی وجہ شقاق ہے تو حنفیہ کے یہاں اس صورت میں جب تک شوہر آمادہ نہ ہو تو خلع درست نہ ہوگا، اگر شقاق پایا جاتا ہو اور شوہر نہ خلع پر رضامند ہے اور نہ ہی تفریق بلاعوض کے لئے تو بس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا جائے اور بس۔

البتہ امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ خلع اور تفریق بلاعوض کا پورا اختیار ہے جیسے اوپر لکھا گیا (دیکھئے: تفسیر مظہری)۔

سوالنامہ میں چھٹا سوال یہ ہے: "جن حضرات کے یہاں خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں ہے ان کے یہاں کیا قاضی کی طرف سے حکمین کا مقرر کیا جانا ضروری ہے، کیا حکمین کی کوشش کے بعد ہی خلع معتبر ہوگا یا قاضی خود بھی فیصلہ کرسکتا ہے اور کیا ایک حکم کا تقرر بھی کافی ہے؟"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قاضی خود بھی تفریق کا فیصلہ کرسکتا ہے، اس لئے کہ نصب حکمین مقصد اولاً اصلاح اور ثانیاً تحقیق شقاق واثبات ضرر ہے اس کے بعد تفریق یا جمع کا فیصلہ کرنا ہے۔ جب قاضی کو ان امور کے وقوع کا یقین ہو تو بلاشبہ وہ خود تفریق کرسکتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ اصول جو خود حنفیہ کی عظیم کتاب البحر الرائق میں ہے۔ علامہ ابن نجیم مصریؒ نے طلاق کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کن حالات میں طلاق دینا واجب ہوجاتا ہے: (البحر الرائق ۳ر ۲۳۷)۔

"طلاق دینا اس وقت واجب ہوتا ہے جب امساک بالمعروف فوت ہوجائے جیسے کہ مجبوب اور عنین کی زوجہ کا حال ہوتا ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے کہا ہے کہ جب امساک بالمعروف (حسن معاشرت کے ساتھ زوجہ کو بسانا) فوت ہوجائے تو قاضی شوہر کے قائم مقام ہوجاتا ہے اور احسان کے ساتھ عورت کو چھٹکارہ دینا واجب ہوتا ہے۔

شیخ وہبہ زحیلی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب الفقہ الاسلامی میں لکھا ہے: "شقاق اور ضرر کی وجہ سے مالکیہ نے تفریق کو جائز قرار دیا ہے تاکہ نزاع ختم ہو اور یہ اس لئے بھی کہ عورت کی زندگی جہنم اور مصیبت بننے سے بچ جائے، یہ تفریق کا حق اس لئے ہے کہ حضرت نبی علیہ السلام کا ارشاد "لاضرر ولاضرار"۔

اس بناء پر عورت کو حق ہے کہ وہ معاملہ قاضی کے پاس لے جائے، اگر وہ قاضی کے سامنے ضرر اور صحت دعوی ثابت کرسکی تو قاضی شوہر کی طرف سے اسے طلاق دے دے۔

"حاکم ضرر ثابت ہونے پر صرف اپنی رائے کی بنیاد پر طلاق دے سکتا ہے" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۹ر ۷۰۶۰، ۷۰۶۱)۔

اس لئے جب قاضی کو شقاق کی وجوہات کا تفصیلی علم ہوگیا تو وہ حکمین کا تقرر ضروری نہ سمجھ کر اور نزاع کو مزید طول نہ دے، اور رفع شقاق کا بعجلت اقدام کرکے آئندہ ان کی زندگی کسی صحیح ڈگر پر استوار کرنے کا موقع فراہم کرتے ہوئے جب تفریق کا قدم اٹھانا خود مناسب سمجھتا ہو تو اس کو اس کا اختیار ہے، خصوصاً اس کے مقرر کردہ حکمین کو جب یہ اختیار ہے تو جو حکمین کا تقرر کرنے کا مختار ہے وہ خود حق تفریق سے بے اختیار کیسے ہوگا۔

سوالنامہ کا آخری سوال یہ ہے: "اگر حنفیہ کے یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے تو کیا اس مسئلہ میں ضرورۃً کسی اور مکتب فکر کی طرف عدول کیا جاسکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ:

آج کا عہد گو کہ مادی اعتبار سے ترقیات کا عہد ہے مگر دینی اعتبار سے تنزل کا عہد ہے۔ اور یہ دینی تنزل ہر ہر شعبۂ زندگی میں ہے، ہر ہر طبقہ میں ہے، یہ معاشرتی زندگی میں ہے، چنانچہ جب ایک عورت اپنے ظالم شوہر کے ظلم کا شکار ہو، اور وہ شوہر یا تو بے دینی کی وجہ سے یا جہالت کی وجہ سے یا اپنے طبعی شرارت مزاج کے ترش وتلخ ہونے کی بناء پر زوجہ کی زندگی اجیرن بنادے اور پھر اس عورت کو گلوخلاصی کی کوئی شکل نہ ہو وہ اس ظالم شوہر سے خلع یا مال دے کر بھی چھٹکارہ نہ پاسکتی ہو۔

اسی قسم کی صورت حال تھی جب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے "الحیلۃ الناجزۃ" لکھ کر ایک درد لاعلاج کا کامیاب علاج مہیا کردیا تھا۔ چنانچہ حضرت کے یہ جملے ملاحظہ ہوں: "اگر خاوند کسی طرح نہ مانے اور اس سے خلع وغیرہ بھی ممکن نہ ہو اور عورت کو صبر کی ہمت نہ ہو تو مجبوراً مذہب مالکیہ کے مطابق

مسلمانوں کی پنچایت میں معاملہ پیش کرنے کی گنجائش ہے"۔

اس سلسلے میں یہ اصول چشم کشا ہے جو علامہ شامیؒ نے لکھا ہے: ''كثير من الأحكام يختلف باختلاف الزمان لتغير العرف أو لحدوث ضرورة أو فساد اهل الزمان بحيث لو بقي حكم ما كان عليه اولاً للزم منه المشقة والضرر بالناس ومخالفة القواعد الشرعية المبنية على التخفيف والتيسير ودفع الضرر والفساد لبقاء العالم على أتم نظام وأحسن أحكام'' (رسائل ابن عابدین ۲، ۱۲۵)۔

(بہت سارے احکام دور کے بدل جانے سے بدل جاتے ہیں یا تو عرف کے تغیر کی بناء پر یا ضرورت پیدا ہونے کی وجہ سے یا اس دور کے لوگوں میں پیدا ہونے والی خرابیوں کی وجہ سے، ایسی صورت میں اگر وہ سابقہ حکم برقرار رہے تو وہ حکم لوگوں کو مشقت اور ضرر پہنچانے کا ذریعہ بنے گا، بلکہ وہ خود شریعت اسلامیہ کے اس مخصوص مزاج کے بھی خلاف ہوگا جو شریعت یسر، تخفیف اور سہولت پر قائم کی گئی ہے اور بہترین نظام کو برقرار رکھنے اور عمدہ قانون کے سائے میں زندگی گزارنے کا موقع فراہم کرنا شریعت کا امتیازی وصف ہے)۔

اس کا تقاضا یہ ہے کہ شریعت کے دائرے میں رہ کر احکام میں بھی ضرورت کے مطابق ایسی لچک پیدا کی جائے کہ وہ یسر پیدا ہونے کا سبب بنے۔

فتوی علی مذہب الغیر کے سلسلہ میں جو اصول واحکام ہیں ان کو مدنظر رکھ کر زیر نظر مسئلہ میں بھی "فقہ مالکی کے مطابق بربنائے شقاق عورت کو فسخ کا مطالبہ کرنے کا حق ہے۔ اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ میں اسی پر عمل اور وہاں کی ہزاروں ایسی پریشان حال عورتوں کی گلوخلاصی پانے کا واقعہ اس کے ضروری ہونے کا ثبوت ہے۔

اس لئے فقہ مالکی کی روشنی میں عورت کو مطالبہ فسخ دینا درست ہے، پھر قاضی چاہے تو خود فسخ کی کاروائی کرے اور چاہے تو حکمین کا تقرر کرے۔ اور پھر حکمین کے متعلق جو شرائط خود فقہ مالکی میں موجود ہیں ان شرائط کی روشنی میں فسخ کرنا درست ہوگا۔ هذا ما عندي والله اعلم بالصواب.

☆☆☆

# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

مولانا راشد حسین ندوی [1]

اسلامی شریعت اللہ تعالیٰ کی وضع کردہ ہے، جس میں انسانی فطرت وطبیعت کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

''لایکلف اللہ نفسا إلا وسعها'' (سورۃ البقرۃ: ۲۸۶)۔

اس کے تمام احکام میں اعتدال وتوازن موجود ہے، خواہ وہ طلاق کے قوانین ہوں یا خلع کے، دنیا کے وضعی قوانین اور دوسرے مذاہب کے قوانین اس کے بارے میں افراط وتفریط کا شکار ہیں، کہیں اس کو بالکل شجر ممنوعہ قرار دیا گیا ہے، اور کہیں اس کو ہوا اور پانی کی طرح سہل الوصول بنا دیا گیا ہے، جبکہ اسلام میں جہاں ایک طرف اس کی اجازت دی گئی تا کہ واقعی ضرورت کے وقت زوجین میں علاحدگی کی شکل موجود رہے، اور ایک دوسرے سے جان چھڑانے کے لئے دوسرے ادیان والوں کی طرح فریقین کو ایک دوسرے کی جان لینے جیسے ناجائز ذرائع استعمال نہ کرنے پڑیں، تو دوسری طرف بے جا استعمال سے منع کیا گیا۔

بہر حال، اسلام نے طلاق وتفریق کا جو نظام بنایا ہے، اس کی بنیادی اعتبار سے تین قسمیں کی جاسکتی ہیں:

۱۔ ایک وہ جس میں مکمل اختیارات شوہر کے پاس ہوتے ہیں۔

۲۔ دوسری وہ جس کا اختیار مسلمان حاکم اور قاضی کے پاس ہوتا ہے۔

۳۔ تیسری قسم وہ جس کی ابتداء عورت کی طرف سے ہوتی ہے اگر چہ انتہائی اس میں بھی شوہر ہی کا کردار اصل ہوتا ہے۔

اس تحریر میں ہم پہلی قسم کے بجائے دوسری اور تیسری قسم سے متعلق بعض جزئیات سے بحث کریں گے۔

**خلع کی فقہی تعریف:** ......لغت میں "خلع الثوب" کے معنی کپڑے اتارنے اور جسم سے علاحدہ کرنے کے ہیں (فقہ السنہ ۲ / ۲۴۳)۔ اسلام میں میاں بیوی کے درمیان علاحدگی کی تعبیر اس لفظ سے کرنے کا سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں دونوں کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے "ھن لباس لکم وأنتم لباس لھن" (سورۃ البقرۃ: ۱۸۷)۔ لہٰذا ان کا علاحدگی اختیار کرنا گویا لباس ہٹانے کے مترادف ہے۔

**خلع کی فقہی تعریف:** ......اور شریعت کی اصطلاح میں خلع نام ہے کچھ عوض دیکر لفظ خلع کے ذریعہ ملک نکاح کے ازالہ کا، چنانچہ فقہ حنفی کی معتبر کتاب فتاوی ہندیہ میں ہے: ''الخلع إزالة ملك النكاح ببدل بلفظ الخلع كذا في فتح القدير'' (ہندیہ ۱/۴۸۸)۔

اور تنویر الابصار میں مزید موانع کے ساتھ اس کی تعریف یوں کی گئی ہے: ''إزالة ملك النكاح المتوقفة على قبولها بلفظ الخلع أو ما في معناه'' (تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ۲/۷۶۴، ۷۶۵) (لفظ خلع یا اس کے ہم معنی) الفاظ کے ذریعہ ملک نکاح کا ازالہ جو کہ عورت کے قبول کرنے پر موقوف ہوتا ہے)۔

## خلع کس کا حق ہے؟

اوپر خلع کی تعریف میں یہ بات آئی کہ خلع نام ہی ہے کچھ لیکر ملک نکاح ختم کرنے کا، جب اس کی تعریف ہی میں یہ الفاظ آ گئے تو معلوم ہوا کہ اس کا اختیار بھی مرد کو ہوگا، اس لئے کہ ملک نکاح اسی کے پاس ہوتی ہے، لہٰذا اس کو ختم کرنے کا اختیار بھی اسی کو ہوگا، البتہ کچھ مخصوص حالات میں یہ اختیار حاکم کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے، چنانچہ اسی طرح کی ایک حالت سے متعلق بحث کرتے ہوئے علامہ شامی فرماتے ہیں:

''لأنه وجب عليه التسريح بالاحسان حين عجز عن الإمساك بالمعروف، فإذا امتنع كان ظالما، مناب عنه

---

[1] مدرسہ ضیاء العلوم، میدانپور، تکیہ کلاں، رائے بریلی

وأضيف فعله عليه'' (شامی، کتاب الطلاق باب العنين وغيره ۲، ۶۴۷)۔ (اس لئے کہ جب وہ بھلائی کے ساتھ بیوی رکھنے پر قادر نہیں تھا تو اس پر لازم تھا کہ حسن سلوک کے ساتھ اس کو چھوڑ دیتا تو جب اس نے اس سے گریز کیا تو وہ ظالم ہوا، لہٰذا قاضی اس کا نائب بن گیا اور اس کا فعل اس کی طرف منسوب کردیا گیا)۔

لیکن جمہور فقہاء کے نزدیک خلع طلاق ہی کا ایک طریقہ ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض حضرات اس کو فسخ قرار دیتے ہیں، لیکن وہ بھی اس کا اختیار مکمل طور سے مرد کے پاس رکھتے ہیں، اس سلسلہ کی چند عبارات ملاحظہ ہوں، فقہ حنفی کے مایہ ناز فقیہ علامہ کاسانی فرماتے ہیں: "خلع کی ماہیت میں اختلاف ہے، ہمارے اصحاب کہتے ہیں: وہ طلاق ہے، یہ قول حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، اور امام شافعی کے دو قول ہیں، ایک قول ہمارے قول کے مثل ہے، اور ایک قول میں وہ طلاق نہیں بلکہ فسخ ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے" (بدائع الصنائع ۳ / ۲۲۷، دیکھئے: المغنی ۸ / ۱۸۰)۔

اور علامہ ابن رشد مالکی فرماتے ہیں: ''وأما نوع الخلع، فجمهور الفقهاء على أنه طلاق وبه قال مالك، وأبوحنيفة سوى بين الطلاق والفسخ وقال الشافعي: هو فسخ وبه قال أحمد وداؤد وعن الصحابة ابن عباس'' (بداية المجتهد ۲، ۶۹)۔ (رہی خلع کی نوع تو جمہور فقہاء اس رائے پر ہیں کہ وہ طلاق ہے، یہی قول امام مالک کا بھی ہے، اور امام ابوحنیفہ نے طلاق اور فسخ کو برابر قرار دیا ہے، اور امام شافعی فرماتے ہیں: وہ فسخ ہے، یہی قول امام احمد، داؤد ظاہری اور صحابہ میں سے حضرت ابن عباسؓ کا ہے)۔

جو حضرات خلع کو طلاق قرار دیتے ہیں ان کے یہاں تو مسئلہ بالکل واضح ہے کہ جب وہ طلاق ہے تو "الطلاق بالرجال" کے تحت اس کا اختیار مرد ہی کو ہوگا، اور جو حضرات اس کو فسخ قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک بھی تفریق کے لئے فریقین کی رضامندی شرط ہے، لہٰذا مکمل اختیار عورت کو کہاں حاصل ہوا، جبکہ مرد کی رضامندی کے بغیر فسخ ممکن نہیں۔

اس طرح جمہور کے نزدیک خلع بھی شوہر کی مرضی کے بغیر نہیں ہوسکتا، البتہ ابھی آگے آئے گا کہ خلع کی ایک قسم یہ ہے کہ زوجین کے درمیان شدید قسم کا اختلاف اور "شقاق" ہو تو قرآنی حکم کے مطابق اس شکل میں دو حکم مقرر کئے جاتے ہیں، ایک مرد کے خاندان کا، ایک عورت کے خاندان کا، جمہور کے نزدیک اس شکل میں بھی شوہر کی مرضی کے بغیر تفریق نہیں کرائی جاسکتی، لیکن امام مالک اور کئی دوسرے ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر حکمین چاہیں تو شوہر کی مرضی کے بغیر بھی تفریق کراسکتے ہیں:

''ومايحكم به الحكمان فعلى وجه الحكم، لا على وجه الوكالة والنيابة ...وبه قال النخعي والشافعي وغيرهم'' (المنتقی شرح موطا مالک: ۴، ۱۱۳، ۱۱۴) (حکمین کا فیصلہ حکم کے طور پر ہوگا نہ کہ وکالت یا نیابت کے طور پر،...... یہی قول نخعی اور امام شافعی وغیرہ کا بھی ہے)۔

امام مالک خود فرماتے ہیں: ''وذلك أحسن ما سمعت من أهل العلم أن الحكمين يجوز قولهما بين الرجل وامرأته في الفرقة والاجتماع'' (مؤطا، ۵۲۷)۔ (اہل علم سے میں نے جو کچھ سنا ہے اس میں سب سے بہتر قول یہی ہے کہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان، تفریق کرانے یا میل کرانے میں حکمین کا قول جائز ہوگا)۔

خلاصہ کلام یہ کہ جمہور کے نزدیک اس طرح کی بات کہنا درست نہیں ہے، لیکن امام مالک کے قول کے اعتبار سے ایک حد تک اس بات کو صحیح کہا جاسکتا ہے۔

## شوہر سے تنفر ہونے پر عورت کیا کرے:

یہ بہت ہی سنگین صورت حال ہوتی ہے کہ عورت عدالت میں آکر دعوی کرتی ہے کہ شوہر اس کو مارتا، پیٹتا ہے، طنز وتعریض کے تیر چلاتا ہے، اس کا جینا دوبھر کئے ہوئے ہے، لیکن اس کے پاس بینہ موجود نہیں ہے، شوہر سے دریافت کیا جاتا ہے تو وہ صاف انکار کردیتا ہے، اس صورت میں عدالتی اصولوں کے اعتبار سے قاضی عورت کی اپیل خارج کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے، لیکن اس سے سب واقف ہیں کہ بہت سے مواقع پر عورت سچ بول رہی ہوتی ہے، لیکن یہ معاملات چونکہ گھر کے اندر کے ہوتے ہیں لہٰذا اس کے لئے بینہ فراہم کرنا ممکن نہیں ہوتا، اور اس طرح اس کے پاس گلوخلاصی کی کوئی شکل موجود نہیں رہتی۔

اس شکل میں میرے علم کے مطابق احناف کے یہاں شوہر سے چھٹکارے کی کوئی شکل موجود نہیں ہے، البتہ امام مالک اور بعض دوسرے ائمہ کے یہاں حکمین کے ذریعہ عورت کے لئے تفریق کی شکل موجود ہے۔ واللہ اعلم۔

## شقاق کا مطلب:

شقاق کے لغوی معنی حد درجہ دشمنی اور اختلاف ہوجانے کے ہیں، اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ ابن منظور فرماتے ہیں: ''والمشاقة

والشقاق: غلبة العداوة والخلاف. شاقه مشاقة وشقاقا: خالفه وقال الزجاج ... العداوة بين الفريقين والخلاف بين اثنين سمي ذلك شقاقا، لأن كل فرقة معاً فرقتي العداوة قصدا شقا اى ناحية غير شق صاحبه'' (لسان العرب مادہ شقق)۔ (شاقہ وشقاق: عداوت اور اختلاف کے غلبہ کو کہتے ہیں، شاقہ مشاقۃ وشقاقا: اس کی مخالفت کی، زجاج کہتے ہیں..... دوفریقوں کے درمیان دشمنی اور دولوگوں کے درمیان اختلاف کو کہتے ہیں، اس کو شقاق اس لئے کہا جاتا ہے کہ عداوت رکھنے والی دونوں پارٹیاں الگ الگ شق (رخ) پر ہوتی ہیں)۔

خلاصہ کلام یہ کہ ''شقاق'' کے معنی عداوت دشمنی اور مخالفت کے ہیں اور چونکہ یہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے اس لئے اس کے معنی ہیں باہم شقاق میں اس حالت پر ہوجانا کہ ایک شخص ایک شق پر ہو یعنی ایک سرے پر ہو اور دوسرا شخص دوسری شق پر ہو یعنی دوسرے سرے پر ہو، یعنی دو آدمیوں کے درمیان شقاق (عداوت دشمنی مخالفت) نے انتہائی صورت اختیار کرلی ہو۔

## شقاق کے بارے میں اختلاف:

ائمہ اربعہ اور ان کے ہم پلہ دوسرے ائمہ کے اقوال ومسالک دیکھنے کے بعد واضح ہوجاتا ہے کہ شقاق ہونے پر کسی کے نزدیک بھی حاکم خود سے نکاح فسخ نہیں کرسکتا، اس کے متعلق آنے والی آیت کریمہ مختلف آثار اور تمام مسالک کی کتابوں میں حکمین کا ذکر موجود ہے، مثلاً دیکھئے:

۱۔ قال الله تعالیٰ: وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها إن يريدا إصلاحاً يوفق الله بينهما'' (سورۃ النساء: ۳۵)۔ (اور اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں آپس میں ضد رکھتے ہیں تو کھڑا کرو ایک منصف مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورت والوں میں سے اگر یہ دونوں چاہیں گے کہ صلح کرادیں تو اللہ موافقت کردے گا ان دونوں میں)۔

۲۔ روی عن علی بن أبي طالب رضی الله عنه ''عن عبيدة قال أتى علياً رجل وامرأته ... قال: فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها'' (احکام القرآن ۲،۱۹۲)۔ (حضرت عبیدہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس شوہر اور اس کی بیوی آئے ......حضرت علیؓ نے فرمایا: مرد کے خاندان میں سے ایک حکم اور عورت کے خاندان میں سے ایک حکم بھیجو......)۔

۳۔ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حکمین کے بارے میں سلف وخلف کا اختلاف ہے کہ آیا وہ دونوں حاکم ہیں یا وکیل یہ اختلاف دو قولوں کا ہے: پہلا یہ کہ دونوں وکیل ہیں، یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ایک قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے، اور دوسرا یہ کہ دونوں حاکم ہیں، یہ اہل مدینہ، امام مالک رحمہ اللہ دوسری روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ اور دوسرے قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے''۔

۴۔ مفتی رشید احمد لدھیانوی مختلف فقہاء کی عبارات نقل کرنے کے بعد خلاصہ بیان کرتے ہوئے تنبیہ ۲ میں فرماتے ہیں: ''حاکم کو بذات خود بلانصب حکمین یہ اختیار نہیں'' (احسن الفتاوی ۵،۴۰۲)۔

ان نصوص اور عبارات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کسی بھی امام کے نزدیک قاضی کو بذات خود فسخ نکاح کا اختیار حاصل نہیں ہے، البتہ امام مالک اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک حکمین کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہے۔

## حکمین کی کچھ تفصیلات:

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک شقاق کی صورت میں حکمین شوہر کی مرضی کے بغیر تفریق کراسکتے ہیں، اس سلسلہ کی کچھ عبارتیں پہلے گزرچکی ہیں کچھ مزید عبارتیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ''اور فقہاء کا حکمین کے تفریق کرنے کے بارے میں اس صورت میں اختلاف ہے جب دونوں تفریق پر متفق ہوکہ آیا اس کے لئے شوہر کی اجازت کی حاجت ہوگی یا حاجت نہیں ہوگی، تو امام مالک اور ان کے اصحاب کا قول ہے کہ زوجین کی توکیل یا ان کی اجازت کے بغیر ہی تفریق اور میل کرانے میں ان کا قول جائز ہوگا، اور امام شافعی وابوحنیفہ اور دونوں کے اصحاب فرماتے ہیں کہ ان کو تفریق کا اختیار نہیں ہوگا الا یہ کہ شوہر ان کو تفریق کا وکیل بنادے'' (بدایۃ المجتہد ۲؍۹۹)۔

۲۔ علامہ قرطبی مالکی فرماتے ہیں: ''صحیح قول پہلا ہے وہ یہ کہ حکمین کو توکیل کے بغیر طلاق کا اختیار ہے، یہ امام مالک اوزاعی اور اسحاق رحمہم اللہ کا قول ہے، اور اس کی روایت حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور شعبی اور نخعی سے بھی کی گئی ہے اور یہی امام شافعی کا بھی قول ہے''۔

۳۔ علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں: ''واختلفت الرواية عن أحمد رحمه الله تعالى فى الحكمين. ففى إحدى الروايتين عنه أنهما وكيلان لايملكان التفريق لهما إلا بإذنهما. وهذا مذهب عطاء وأحد قولى الشافعى وحكى ذلك عن الحسن وأبى حنيفة ... والثانية أنهما حاكمان ولهما أن يفعلا ما يريان من جمع وتفريق بعوض وغير عوض ولا يحتاجان إلى توكيل الزوجين ولا رضاهما. وروى ذلك عن على وابن عباس وأبى سلمة بن عبد الرحمن والشعبى والنخعى وسعيد ابن جبير ومالك والأوزاعى وإسحاق وابن المنذر'' (المغنی ۷،۲۴۱۹)۔ ان عبارات میں اگرچہ صراحت سے کوئی بات نہیں کہی جارہی ہے لیکن ان کا انداز بالکل واضح طور پر اس طرف اشارہ کررہا ہے کہ شقاق کی صورت میں قرآنی حکم کے پیش نظر تفریق کے لئے حکمین کا تقرر ضروری ہوگا، قاضی خود سے تفریق کا فیصلہ نہیں کرسکتا، اس سلسلہ کی بعض نصوص پچھلے صفحات پر بھی ذکر کی جاچکی ہیں، اور ظاہر بات ہے کہ یہ تفصیلات مالکیہ اور ان حضرات ہی کے یہاں ہیں جن کے نزدیک حکمین اذن زوج کے بغیر تفریق نہیں کرسکتے، ان کے یہاں حکمین کی کوئی بہت زیادہ ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔

البتہ مالکیہ کے یہاں بھی اگر زوجین صرف ایک حکم پر متفق ہوجائیں تو صرف ایک حکم کا تقرر کافی ہوگا لیکن یہ صرف زوجین کے اتفاق سے ہوسکتا ہے، اگر حاکم صرف ایک حکم مقرر کرے تو جائز نہیں ہوگا، فقہاء مالکیہ نے اس کی صراحت کی ہے: ''ولو جعل الزوجان ذلك إلى رجل واحد جاز إذا كان من أهل الحكم قاله ابن القاسم فى المدونة قال القاضى أبو الوليد رضى الله عنه ووجه ذلك عندى أن يكون من جهة الزوجين لأن الحق فى ذلك لايخرج عنهما، ولايجوز للسلطان ولا لولى اليتيمين لأن ذلك إسقاط لحق الزوجين'' (المنتقى شرح مؤطا مالك ۴،۱۱۳، ۱۱۴)۔ (اگر زوجین اس کا اختیار ایک شخص کو دیں تو جائز ہوگا بشرطیکہ اس کے اندر حکم بننے کی اہلیت ہو، یہ قول المدونہ میں ابن القاسم کا ہے، قاضی ابو الولید کہتے ہیں: اس کی توجیہ میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ زوجین کی طرف سے ہو، اس لئے کہ اس کی بابت حق ان دونوں سے باہر نہیں نکلتا، اور سلطان یا ولی یتیمین کے لئے جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ زوجین کے حق کا اسقاط ہوگا)۔

اس عبارت کے ظاہر سے جہاں یہ بات ثابت ہوئی کہ زوجین ایک شخص کو حکم بنا سکتے ہیں وہیں یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ تفریق کے لئے حکم یا حکمین ضروری ہیں، اس لئے کہ جب حاکم ایک حکم بنانے کا اختیار نہیں رکھتا تو بدرجہ اولی بغیر حکمین کے تفریق بھی نہیں کراسکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

## شقاق کی صورت میں امام مالک کا قول اختیار کرنا جائز ہے یا نہیں:

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ بعض اوقات بیوی شوہر سے متعلق اپنی شکایات بینہ سے ثابت نہیں کرپاتی، اور ان شکایات کا بینہ سے ثابت کرپانا مشکل ہے بھی، لیکن کبھی عداوت ودشمنی اس حد تک بڑھ چکی ہوتی ہے کہ عورت شوہر کے یہاں جانے میں جان تک کا خطرہ محسوس کرتی ہے، لہٰذا انسانی نفسیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایسی حالت میں بھی قاضی کا حالات سے بالکل چشم پوشی کرلینا سمجھ میں نہیں آتا، اس طرح کے حالات میں کوئی بھی باپ یا بھائی اپنی عزیزہ کو جان بوجھ کر آگ میں نہیں جھونک سکتا، لہٰذا قاضی اگر رخصتی کا حکم دے بھی دے تو ۹۵ فیصد معاملات میں اس پر عمل ممکن نہیں ہوگا، عورت الگ شادی بھی نہیں کرسکے گی، اس طرح اس کی حیثیت معلقہ جیسی ہوجائے گی، لہٰذا اس کے مظلوم ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اسی طرح کی مظلوم عورتوں کے لئے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے الحیلۃ الناجزۃ جیسی عظیم الشان کتاب تصنیف فرمائی، لہٰذا اگر ضرورت ہو، اور حالات ایسے ہوں کہ قاضی محسوس کررہا ہے کہ دونوں کا میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا ناممکن ہے تو وہ مالکیہ کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے حکمین کے ذریعہ تفریق کراسکتا ہے، لیکن اس صورت میں ضروری ہوگا کہ اس کے بارے میں مالکیہ کی شرائط پر مکمل طور سے عمل کیا جائے، مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی لکھتے ہیں: ''ہمارے زمانہ میں جہالت اور احکام شرع سے بے خبری اور اس کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں ظلم وزیادتی اور اختلافات کی روشنی میں اگر اس مسئلہ میں فقہاء مالکیہ کی رائے قبول کرلی جائے تو شاید مناسب ہو'' (طلاق وتفریق ص: ۱۰۳)۔

اور مولانا عبد الصمد رحمانی لکھتے ہیں: ''امارت شرعیہ صوبہ بہار واڑیسہ کے ''دار القضاء'' میں عملاً اس بنیاد پر کہ مشائخ حنفیہ نے بوقت ضرورت دوسرے ائمہ کے مسلک پر عمل کو جائز لکھا ہے بلکہ عمل کیا ہے حسب ذیل بنیادوں پر عورت کی اس کے شوہر سے تفریق کی جاتی ہے: پھر نمبر ۱۴ پر ہے۔

۱۴۔ زن وشوہر میں شقاق ہونا (کتاب الفسخ والتفریق ص: ۶۰، ۶۱)۔ پھر اسی کتاب کے ص ۱۵۲ تا ۱۵۷ پر اس کی مکمل تفصیلات درج کی گئی ہیں۔

اتنے پرانے اور معتبر دار القضاء کے عملاً اس کو قبول کرلینے کے بعد ہمارے لئے اس مسئلہ میں مالکیہ کے مسلک کو اختیار کرنا مزید آسان ہوگیا ہے واللہ اعلم۔

☆☆☆

# شقاق بین الزوجین کی صورت میں خلع وتفریق کا حکم

مفتی اقبال احمد قاسمی [1]

## نکاح اور فسخ نکاح:

اسلامی تعلیمات کا اصل رخ یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ اور معاہدہ عمر بھر کے لئے ہو اس کے توڑنے اور ختم کرنے کی نوبت کبھی نہ آئے کیونکہ اس معاملہ (نکاح) کے انقطاع کا اثر صرف فریقین پر نہیں پڑتا بلکہ نسل واولاد کی تباہی وبربادی اور بعض اوقات خاندانوں اور قبیلوں میں فساد تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے، اور پورا معاشرہ بری طرح اس سے متاثر ہوتا ہے، اسی لئے جو اسباب اور وجوہ اس معاملہ کے توڑنے کا سبب بن سکتے ہیں قرآن وسنت کی تعلیمات نے ان تمام اسباب کو راہ سے ہٹانے کا پورا انتظام کیا ہے، زوجین کے ہر معاملے اور ہر حال کے لئے جو ہدایتیں قرآن وسنت میں مذکور ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ یہ رشتہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا جائے اور ٹوٹنے نہ پائے۔ چنانچہ نکاح ہوجانے کے بعد میاں بیوی کے نباہ کے لئے اور ان میں موافقت پیدا کرنے کے لئے زوجین کے حقوق اور حسن سلوک کے وہ رہنما خطوط کتاب النکاح کے ابواب میں بیان کردیئے گئے ہیں کہ میاں بیوی کا یہ سفر اگر ان واضح خطوط کی روشنی میں انجام پائے تو ان کی ازدواجی زندگی بے حد خوشگوار اور پرلطف بن جائے۔

## طلاق یا خلع کی واقعی ضرورت:

تمام تر اسلامی تدابیر کو بروئے کار لانے کے باوجود اگر بدقسمتی سے نااتفاقی کی شکلیں پیدا ہو ہی جائیں اور مرد وعورت کے درمیان باہمی توافق طبع نہ ہو سکے تو نکاح کو ختم کردینے میں جلدی نہ کرے بلکہ قرآنی ہدایات کے مطابق عمل کرے۔ ارشاد باری ہے:

''جن عورتوں کی نافرمانی کا تمہیں خطرہ ہو انہیں زبانی فہمائش کرو (نہ مانیں تو) ان کو ان کی خوابگاہ میں تنہا چھوڑ دو (یعنی پاس مت لیٹو) اور اس پر بھی سدھار نہ ہو تو ان کو (معمولی) ضرب لگاؤ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت شروع کردیں تو ان پر زیادتی کے لئے بہانہ اور موقع مت ڈھونڈو کیونکہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی بڑائی اور برتری والے ہیں۔ (تمہاری زیادتی کا پھر تم سے بدلہ لیں گے)۔

پھر اگر میاں بیوی کے درمیان بگاڑ پیدا ہوجائے اور نباہ کی شکل نہ ہو تو قرآن کریم کی اس ہدایت پر عمل کرے:

''اور اگر تم اہل خاندان کو ان دونوں میاں بیوی میں ایسی کشاکش کا اندیشہ ہو کہ وہ باہم نہ سلجھا سکیں گے تو تم لوگ ایک آدمی جو منصف ہو مرد کے خاندان سے اور ایک منصف شخص عورت کے خاندان سے تجویز کرو اگر یہ صلاح کی کوشش کریں گے اللہ پاک دونوں کے درمیان موافقت پیدا فرمادیں گے، بیشک اللہ پاک علیم وخبیر ہے'' (نساء: ۳۵)۔

اگر مذکورہ مصالحانہ کارروائیوں کے باوجود اصلاح حال کی تمام انفرادی واجتماعی کوششیں ناکام ہوجائیں، عذاب بن جاتا ہے ایسی صورت میں ان کے درمیان تفریق ہوجانا نہ صرف ان نکاح کے مقاصد ومصالح تمام تر معطل ومفلوج ہوجائیں تو ایسے مواقع پر مرد کو طلاق کا اختیار دیا کہ وہ نسبتاً فکر وتدبر اور تحمل کا مادہ زیادہ رکھتا ہے عورت کو مطلق طلاق کا اختیار نہیں دیا کہ وقتی تاثرات سے مغلوب ہوجانا عورت کی فطرت میں زیادہ ہے تو یہ رشتہ جلد جلد نہ ٹوٹے اور زندگی آئے دن درہم برہم نہ ہو (جیسا کہ مغربی ملکوں نے اس کا تجربہ کرلیا ہے) البتہ عورت کو بھی بالکل محروم ومجبور نہیں کیا، ایک طرف خلع کی شکل تجویز کردی دوسری طرف یہ حق دیا کہ حاکم شرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کرکے اور شکایات کا ثبوت دے کر نکاح فسخ کراسکے۔

## طلاق یا خلع کے حق کا بیجا استعمال:

[1] صدر مدرس ومفتی مدرسہ مظہر العلوم، بیکن گنج، کانپور

اسلامی شریعت میں طلاق کا ایک مستقل نظام ہے کہ کب؟ کتنی؟ کیسے؟ طلاق کا عمل پورا کیا جائے۔

اور جس طرح مرد کو طلاق دینے کے سلسلہ میں ہدایات دی گئی ہیں اسی طرح عورت کو بھی یہ ہدایت دی گئی ہے کہ خلع یا فسخ نکاح کی درخواست کا قدم اسی وقت اٹھائیے جبکہ واقعی اس کی کوئی دینی، اخلاقی یا معاشی حق تلفی ہو رہی ہو یا اس پر کوئی ناقابل برداشت معاشرتی ظلم ہو رہا ہو یا وہ اپنی جنسی جذبات کی عدم تسکین کی بنا پر سخت ذہنی کوفت میں ہو جس کی طرف قرآن میں "فان خفتم ان لا یقیما حدود اللہ" کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے۔

آج کل نئی تعلیم اور مغربی تربیت کے اثر سے پڑھی لکھی عورتیں بھی اپنے شوہروں سے غیر ضروری طور پر اپنی گلوخلاصی کرا کے تجدید لذت کرتی ہیں، یہ اسلام میں سخت ناپسندیدہ بات ہے حدیث میں مرد و عورت دونوں کو اس سے روکا گیا ہے۔

## خلع کی لغوی و اصطلاحی تعریف:

خلع خلعٌ سے مشتق ہے جس کے معنی "اتارنے" کے ہیں، خلعت اللباس کے معنی ہیں: میں نے لباس اتار دیا، قرآن میں موسیٰ علیہ السلام کو اللہ پاک نے حکم دیا: "فاخلع نعلیك" (طہٰ: ١٦/ ١٢)۔

اصطلاح میں "خلع" زوجین کے درمیان ایسے معاہدہ کو کہتے ہیں جس میں شوہر نکاح سے حاصل ہونے والے اپنے حقوق واختیارات سے کسی طے شدہ بدل کے عوض دستبردار ہو جاتا ہے اور زوجہ عوض دیکر نکاح سے آزادی حاصل کر لیتی ہے اسی لیے یہ خلع کا معاملہ طلاق بائن کے حکم میں ہوتا ہے اور چونکہ اس میں عوض زوجہ کو ادا کرنا پڑتا ہے اس لئے زوجہ کی رضامندی ضروری ہے، نیز شوہر اپنے حاصل شدہ حقوق نکاح سے دستبردار ہوتا ہے اس لئے شوہر کی رضامندی بھی ضروری ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح القدیر ٣/ ١٩٩، در مختار ورد المحتار، الفقہ الاسلامی وادلتہ وغیرہ)۔

## خلع کی شرعی حیثیت:

خلع سے متعلق تفصیلات وتعریفات سے واضح ہوتا ہے کہ خلع تفریق زوجین اور انقطاع نکاح کی ایک خاص صورت کا نام ہے جس کو زوجین باہمی رضامندی سے خود طے کر سکتے ہیں، عدالت میں جانا اس کے لئے ضروری نہیں بلکہ اگر فسخ وتفریق کے اسباب نہ ہوں تو زوجین میں سے کسی کے مطالبہ پر عدالت خلع کا معاملہ دوسرے کی مرضی کے بغیر کرے تو یہ جائز و نافذ بھی نہیں کیونکہ خلع کوئی جبری چیز نہیں بلکہ مرضی کی چیز ہے، البتہ بلا عذر کے خلع وطلاق کا اقدام انسان کو گنہگار بناتا ہے۔ ضرورت کے موقع پر جس طرح بیع وشراء میں اقالہ، رہن اور فسخ بیع کا معاملہ کرنا پڑتا ہے اسی طرح عقد خلع بھی ایجاب وقبول کے ذریعہ عوض خلع متعین کر کے جانبین از خود کر سکتے ہیں، خلع کے لئے مستعمل الفاظ میں بھی فرق حقیقی نہیں بلکہ لفظی نوعیت کا ہے اور اس پر بھی فقہاء کا اتفاق ہے کہ خلع سے عورت بائنہ ہو جاتی ہے اس کے بعد شوہر یکطرفہ طور پر رجوع نہیں کر سکتا۔ علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں:

"اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خلع کا نام فدیہ رکھا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں معاوضہ کے معنی پائے جاتے ہیں اور اسی لیے اس میں زوجین کی رضامندی کا اعتبار ضروری ہے" (زاد المعاد ٢/ ٢٣٨ طبع مصر)۔

شمس الائمہ سرخسیؒ تحریر فرماتے ہیں: والخلع جائز عند السلطان وغيره لأنه عقد يعتمد التراض كسائر العقود وهو بمنزلتي الطلاق بعوض وللزوج ولاية إيقاع الطلاق ولها ولاية التزام العوض (المبسوط للسرخسی ٦/ ١٧٣ مصر)۔

ملک العلماء کاسانیؒ لکھتے ہیں: "خلع کا رکن ایجاب اور قبول ہے اس لئے کہ یہ معاوضہ کے ساتھ طلاق کا معاملہ ہے، لہٰذا بغیر قبول کے علیحدگی واقع نہیں ہوگی" (بدائع الصنائع ٣/ ١٤٥ مصر)۔

البتہ خلع کا معاملہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے طلاق شمار ہوگا یا فسخ؟ یعنی خلع کے معاملہ کی حیثیت فسخ نکاح کی ہوگی یا اس پر طلاق کے احکام جاری ہوں گے، اس سلسلہ میں قدرے اختلاف چلا آتا ہے، علامہ ابن کثیر نے اس سلسلہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور ائمہ مجتہدین کا اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سعید بن مسیب، حسن بصری، عطاء، قاضی شریح، شعبی، ابراہیم نخعی، جابر بن زید، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہ، سفیان ثوری اور صحیح قول کے مطابق امام شافعی کا مسلک یہی ہے کہ خلع طلاق ہے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عثمانؓ، طاؤس، عکرمہ، امام احمد بن حنبل، اسحق بن راہویہ، ابوثور اور داؤد ظاہری کا کہنا ہے کہ خلع فسخ نکاح ہے اور اس پر طلاق کے احکام جاری نہ ہوں گے (تفسیر ابن کثیر ١/ ٢٧٥ فقہی مقالات ٢/ ١٤١

ثانی)۔ ''اما نوع الخلع فالجمهور على أنه طلاق'' (بداية المجتهد ۲۰۶۹)۔

اب جو حضرات خلع کو طلاق قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک جو شخص اپنی بیوی سے ایک مرتبہ خلع کرلے تو یہ طلاق شمار ہوگی، لہٰذا اگر وہ اس کی رضامندی سے اسے دوبارہ نکاح میں لے آئے تو اسے اب صرف دو طلاقوں کا اختیار ہوگا، یعنی اب اگر وہ دو طلاقیں بھی دے دے گا تو طلاق مغلظہ واقع ہوجائے گی لیکن جو حضرات خلع کو فسخ قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اگر خلع کے بعد میاں بیوی باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرلیں تو شوہر کو ان کے نزدیک بدستور تین طلاقوں کا اختیار رہتا ہے اور صرف دو طلاقوں سے بیوی مغلظہ نہیں ہوتی کیونکہ انہوں نے خلع کو طلاق شمار نہیں کیا۔

**حق خلع میں عورت تنہا خود مختار نہیں۔ ایک شبہ اور اس کا ازالہ:**...... خلع چونکہ ایک عقد ہے جو تراضی طرفین پر موقوف ہے جیسا کہ اس کی تصریحات گزر چکی لہٰذا خلع میں عورت ایک فریق کے مانند ہے وہ صرف ایجاب یا قبول کی مکلف ہے، بذات خود تنہا خلع لینے کا حق یا عدالت سے خلع کا فیصلہ کرانے کا اختیار شوہر کی رضامندی حاصل کئے بغیر اس کے لئے جائز نہیں اور اگر عدالت بلا مرضی زوج خلع کا فیصلہ کرے تو وہ شرعاً قابل قبول نہیں، لہٰذا یہ سمجھنا کہ جس طرح مرد طلاق کا مالک ہے اسی طرح عورت تنہا خلع کی مالک ہے جب چاہے خلع لے لے شوہر راضی ہو یا نہ ہو یہ خیال صحیح نہیں۔

## خلع کے مسئلہ میں متجددین کا نظریہ اور اس کا تجزیہ۔ دلائل کی روشنی میں:

عصر حاضر میں خلع کے بارے میں ایک اور نظریہ پُرزور انداز میں اہل تحقیق کے لئے چیلنج بن کر سامنے آرہا ہے جس کا ذکر خلع وشقاق سے متعلق سوالنامہ میں شق ۲ پر ہے کہ "بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ جیسے مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے اسی طرح عورت کو خلع لینے کا حق حاصل ہے، یہ بات کس حد تک درست ہے؟"

تمام علماء امت کا اس پر اجماع اور اتفاق رہا ہے کہ خلع ایک ایسا معاملہ ہے جس میں تراضی طرفین ضروری ہے اور کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں کرسکتا لیکن موجودہ زمانہ کے متجددین کا یہ دعویٰ ہے کہ خلع عورت کا ایک حق ہے جسے وہ شوہر کی مرضی کے بغیر بھی عدالت سے وصول کرسکتی ہے جبکہ یہ نظریہ قرآن وسنت کے دلائل اور جمہور کے متفقہ فیصلہ کے خلاف ہے۔ اولاً ہم اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ اور اصحاب ظواہر کے مذاہب مختصراً نقل کرتے ہیں۔ پھر ہم اپنے دلائل کا ذکر کرکے متجددین کے دلائل کا جائزہ لیں گے ملاحظہ ہو مذاہب کی تصریحات۔

**مذہب حنفی:**...... حنفی مسلک کی کئی کتابوں کے حوالے اوپر گزر چکے ہیں مزید تصریحات بطور نمونہ ملاحظہ ہوں علامہ زیلعی فرماتے ہیں: "زوجین میں کسی کو ایک دوسرے پر اس کی رضا کے بغیر خلع مسلط کرنے کا حق نہیں ہے" (تبیین الحقائق: ۲/۲۷۱)۔

مفسر قرآن امام ابوبکر جصاص رازی لکھتے ہیں: "اگر خلع کا اختیار بادشاہ (حاکم) کو ہوتا خواہ زوجین چاہیں یا نہ چاہیں جبکہ بادشاہ جانتا بھی ہو کہ یہ دونوں حدود اللہ کو قائم نہیں کرپائیں گے تو نبی کریم علیہ السلام ان دونوں سے استفسار نہ کرتے اور شوہر کو خلع دیدینے کا مخاطب نہ بناتے بلکہ خود اس کی طرف سے خلع فرمادیتے اور شوہر کو اس کا باغ لوٹا دیتے خواہ اس کا زوجین انکار بھی کرتے جیسا کہ لعان عن تفریق کے لئے حاکم اس کو چھوڑنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ خود ان کے درمیان تفریق کردیتا ہے" (احکام القرآن ۱/۳۹۵)۔

**مذہب مالکی:**...... مالکی مسلک بھی خلع کو زوجین کی باہمی رضامندی کا معاملہ اور خلع کو طلاق کی حیثیت دیتا ہے چنانچہ علامہ ابوالولید باجی مالکی موطا مالک کی شرح میں لکھتے ہیں: "اگر شوہر خلع وغیرہ کے ذریعہ علیحدگی نہ چاہے تو عورت کو شوہر کے پاس جانے پر مجبور کیا جائے گا" (المنتقی ۔ ۶۱/۱ طبع السعادۃ)۔

"جہاں تک خلع کی نوعیت کا تعلق ہے تو وہ جمہور فقہاء کے نزدیک طلاق ہی ہے" (بدایۃ المجتہد ۲/ ۶۹ مصطفی البابی)۔

**مذہب شافعی:**...... خود امام شافعی تحریر فرماتے ہیں:

"حاکم کے لئے یہ جائز نہیں کہ حکمین کو یہ حکم دے اگر وہ مناسب سمجھیں تو تفریق بلا شوہر کی مرضی کے بھی کرادیں اسی طرح زوجہ کی مرضی کے بغیر اس کا مال بھی خلع میں وہ نہ دلائیں (نیز خلع کے مسئلہ میں ایک جگہ فرمایا) کہ خلع بغیر شوہر کے واقع کئے واقع ہی نہ ہوگا۔ نیز فرمایا: اس لئے کہ خلع طلاق کے حکم میں ہے، لہٰذا کسی کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ کسی دوسرے کی طرف سے طلاق دے نہ باپ کو یہ حق ہے نہ آقا کو نہ سرپرست کو اور نہ

حاکم“ (کتاب الأم ۵/ ۱۹۴۔ ۱۹۸۔ ۲۰۰، نیز دیکھئے: المہذب ۲/ ۷۱)۔

**مذہب حنبلی:** ...... فقہ حنبلی کے مشہور فقیہ اور مستند شارح علامہ موفق الدین بن قدامہ حنبلی فرماتے ہیں: ”اور اس لئے کہ یہ (خلع) عقد معاوضہ ہے، لہٰذا اس کے لئے حاکم کی ضرورت نہیں جیسے کہ بیع اور نکاح نیز چونکہ خلع باہمی رضامندی سے عقد کو ختم کرنے کا نام ہے، لہٰذا اقالہ (فسخ بیع) کے مشابہ ہے“ (المغنی: ۷/ ۵۲، ۷/ ۳۲۴)۔

علامہ ابن القیم جوزی کی صراحت ملاحظہ ہو: ”اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خلع کا نام فدیہ رکھا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں عقد معاوضہ کے معنی پائے جاتے ہیں، اسی لئے اس میں زوجین کی رضامندی کو شرط قرار دیا گیا ہے“ (زاد المعاد ۳/ ۲۳۸ میمنہ مصر)۔

**مذہب ظاہری:** ..... شوہر کی مرضی کے بغیر خلع کے فیصلہ کا تصور نہیں، علامہ ابن حزم تحریر فرماتے ہیں: ”خلع: وہ عورت کا فدیہ دیکر جان چھڑانا ہے جبکہ وہ اپنے شوہر کو ناپسند کرتی ہو اور اندیشہ کرتی ہو کہ وہ حق زوج ادا نہ کرسکے گی یا خوف ہو کہ شوہر اس سے بغض کی وجہ سے اس کا حق ادا نہ کرے گا تو عورت کے لئے جائز ہے کہ فدیہ دیکر طلاق لے لے بشرطیکہ شوہر راضی ہوجائے ورنہ وہ مجبور نہ کیا جائے گا جیسا کہ عورت مجبور نہیں کی جاتی بلکہ خلع دونوں کی مرضی سے ہی جائز ہوتا ہے“ (المحلی ۱۰/ ۲۳۵ المنیریہ)۔

”آیت وحدیث کسی میں یہ نہیں ہے کہ حکمین کے لئے تفریق کی اجازت ہے نہ ہی حاکم کو اس کی اجازت ہے“ (۱۰/ ۸۸ المحلی)۔

مذکورہ حوالوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خلع کی صحت کے لئے تراضیٔ طرفین کی شرط پر تمام اہل حق کا اتفاق ہے اور یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے ہی نہیں بلکہ متفق علیہ رہا ہے، البتہ اس زمانہ میں مغربیت سے مرعوب ہوکر مردوزن کی مساوات کے نعرہ نے عورتوں کو مطلق خلع کا مالک بنانے کی مہم چھیڑ رکھی ہے اور مسلم حکام وقضاۃ بھی اہل مغرب کے نقش قدم پر اس رائے کو قبول کرنے لگے ہیں حالانکہ اہل حق کا اور مجتہدین کا یہ متفق علیہ مسئلہ مضبوط دلائل وقرائن پر مبنی ہے، اولا اہل حق کے دلائل ذکر کئے جاتے ہیں بعدہ ہمدردان نسواں کے دلائل کا جائزہ لیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں اہل حق نے آیات قرآنی، احادیث، آثار صحابہ اور اجماع امت سے بے شمار دلائل پیش کئے ہیں اور عقلی توجیہات بھی پیش کی گئی ہیں۔

**مذہب جمہور پر ایک شبہ اور اس کا جواب:** ...... اگرچہ فقہاء متفق ہیں کہ خلع کے لئے تراضیٔ طرفین ضروری ہے حاکم بھی بغیر تراضی کے خلع کے فیصلہ کا مجاز نہیں، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حاکم یا قاضی کو بلا مرضی شوہر، جبری خلع کا اختیار نہیں تو پھر عورت کے عدالت میں جانے کا فائدہ ہی کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اولوالامر یا حکام وقضاۃ کی حیثیت صرف ایک جج اور حاکم ہی کی نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک مصلح اور مشیر اور مسائل کا حل نکالنے والے کی بھی ہوتی ہے حکام وقضاۃ کے سامنے نت نئے قضایا اور تجربات ہوتے ہیں اور وہ خصمین کے لئے متعدد صورتیں تجویز کرسکتے ہیں اس کے علاوہ ان کے لڑکپن اور بااثر ہونے کی وجہ سے فریقین ان کا مشورہ قبول کرتے ہیں اور وہ مصالحانہ کوششیں جو ناکام ثابت ہورہی تھیں حکام کے سامنے وہ تکمیل ہوجاتی ہیں غرضیکہ اولوالامر سے رجوع میں مسئلہ کے حل کی متعدد راہیں ہوتی ہیں، ممکن ہے اس قول پر جس میں ”فان خفتم“ کا مصداق اولوالامر کو قرار دیا گیا ہے یہی غرض ہو کہ اگر تم سے زوجین رجوع کریں یا تم زوجین میں نااتفاقی اور حقوق اللہ کی پامالی دیکھو تو تم انہیں خلع کا بھی مشورہ دے سکتے ہو نیز اپنی نگرانی میں خلع بھی کراسکتے ہو اور اس عمل پر ان کو راضی کرنا حکام کے لئے بمقابلہ دیگر اں آسان ہے۔ بطیب خاطر یا بادل نخواستہ حکام کی رائے کے خلاف کوئی راہ نہیں تلاش کرتے یہ ہے فائدہ حکام کے پاس جانے کا، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ زوجین میں سے کسی کو خلع پر مجبور کرنا اور اس کی مرضی لئے بغیر خلع کا فیصلہ کرنا بھی درست ہے۔

## بیوی کی شوہر سے نفرت اور اس کے سبب گلوخلاصی کی راہ

میاں بیوی کی علیحدگی کا معاملہ نہایت سنگین ہے، اس سے بے شمار مفاسد جنم لیتے ہیں پہلے تو یہ گھر اجڑتا ہے پھر ان کے بچوں کا مستقبل بگڑتا ہے، پھر دونوں خاندان میں جھوٹ، طعن وتشنیع، غیبت اور الزام تراشی کا ایک سلسلہ دراز ہوتا ہے پھر اس اختلاف کی آگ میں نہ جانے کتنے افراد جھلس جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ شیطان کو زوجین کی تفریق سے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ اتنی خوشی لوگوں کو چوری اور شراب نوشی جیسے بدترین گناہوں میں ملوث کرنے سے بھی نہیں ہوتی، حدیث شریف میں شیطان کا پانی پر تخت بچھا کر اپنے چیلوں سے دن بھر گمراہی کی کوششوں کی کارگزاری لینے کا واقعہ آتا ہے جس میں شیطان اس بات سے زیادہ اچھلتا ہے جب تفریق زوجین کی کارگزاری اس کو کوئی سناتا ہے، کسی اور گناہ میں مبتلا کرکے اس کو اتنی خوشی نہیں ہوتی (مشکوۃ ۱۸، بیروت، مسلم)۔

اسی لئے امام ابوحنیفہؒ کا مسلک اس سلسلہ میں سب سے زیادہ سخت ہے کہ بعض دفعہ شدید تکلیف کے باوجود اس کو شوہر سے چھٹکارہ کی کوئی شکل نظر نہیں آتی، وجہ یہی ہے کہ میاں بیوی کا تعلق ایک دو دن کے لئے نہیں بلکہ پوری زندگی نباہنے کا عہد و پیمان ہے، اس مضبوط اور پاکیزہ رشتہ کے احترام کا تقاضا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی خوشی و رنج اور صحت و مرض میں نہ صرف ساتھ رہیں بلکہ اپنے جسم و جان کی بازی لگا کر ایک دوسرے کی مدد کریں، ذرا سی تکلیف یا مصیبت میں ایک دوسرے سے کٹنے کی کوشش نہ کریں جیسا کہ آج کل مغربی ملکوں میں ہے کہ اگر کسی کے پسینہ میں یا دانت میں بدبو پیدا ہوگئی یا شوہر نے کتے کو بغل میں لٹانے سے منع کر دیا تو عورت کی طرف سے چھٹکارہ کا پیغام ملنا فیشن بن گیا ہے۔ عورت فطرتاً جذباتی ہوتی ہے، گھر میں ذرا سی نرمی، گرمی یا تلخ کلامی ہوئی آٹھ بچوں کی ماں ہونے کے باوجود فوراً کہہ دے گی کہ مجھے طلاق دو، وہ شوہر کہتا ہے کہ اچھا دیدیں گے تو کہتی ہے کہ نہیں اسی وقت دو فوراً دو، بعض اوقات مرد بھی اپنی مردانگی، حوصلہ مندی اور صبر و تحمل کی صفات چھوڑ کر عورت کی ان جذباتی لہروں کے سیلاب میں بہہ کر طلاق دے ڈالتا ہے اور اس کا نتیجہ معمولی بات پر خانہ ویرانی نکلتا ہے۔ غالباً آیت خلع میں میاں بیوی کے علاوہ فان خفتم کے ذریعہ خطاب عام میں یہی اشارہ ہے کہ میاں بیوی کسی وقتی جوش کی بنا پر علیحدگی پر آمادہ ہوں تو ان کو خانہ ویرانی سے بچانے کی کوشش کی جائے، کسی طرح مصالحت کرادی جائے معاملہ نہ سلجھے تو پھر ان کو ان کی خواہش کے مطابق خلع کرنے دیا جائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض حالات میں عورت نہایت مشکل میں پھنسی ہوتی ہے، وہ کسی ظلم یا ایسے ضرر کا شکار ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار کرتی ہے اس کا یہ انکار اور مطالبہ تفریق جائز ہوتا ہے، لیکن وہ اسباب فسخ اور وجوہ تفریق کیا ہیں؟ جن کی بنا پر عورت کو عدالت سے تفریق حاصل کرنی جائز ہوتی ہے، فقہاء نے اس بحث کو نہ صرف حنفی مکتب فکر کی روشنی میں بلکہ تغیر پذیر زمانہ کے تحت دیگر دبستان فقہ سے خوشہ چینی کرتے ہوئے مکمل و مدلل لکھ دیا ہے۔

قاضی مجاہدالاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کتاب الفسخ والتفریق کے مقدمہ میں تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی ہے، دیکھئے: مقدمہ کتاب الفسخ والتفریق ر ۹، ۱۱۔

اب فسخ و تفریق کے اسباب معتبرہ پر جب نگاہ ڈالتے ہیں تو فرقت کی وہ صورتیں جن میں قضاء قاضی شرط ہے الحیلۃ الناجزہ کی روشنی میں صرف پانچ عیوب ملتے ہیں جن میں قاضی کو تفریق کا اختیار ملتا ہے لیکن امارت شرعیہ بہار کے علماء کی تصنیفات میں سولہ عیوب تک شمار کرایا گیا ہے جنہیں تفریق کا سبب بنایا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ اسلامی قانون متعلقہ پرسنل لا اور کتاب الفسخ والتفریق میں تفصیل موجود، لیکن ہم اس بحث میں نہ پڑ کر صرف اسباب فسخ و تفریق جن کا اعتبار شرعی عدالتوں میں کیا گیا ہے اس کی فہرست ذکر کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ درج ذیل صورتوں میں زوجین کی تفریق کے لئے قضاء قاضی شرط ہے: (۱) غیر کفو میں نکاح، (۲) مہر میں غیر معمولی کمی، (۳) خیار بلوغ، (۴) شوہر کا حقوق زوجیت ادا نہ کرنا، (۵) شوہر کا وطی پر قادر نہ ہونا، (۶) شوہر کا جذام برص یا اس جیسے کسی موذی مرض میں مبتلا ہونا، (۷) شوہر کا مجنون ہونا، (۸) شوہر کا مفقود الخبر ہونا، (۹) شوہر کا غائب غیر مفقود ہونا، (۱۰) شوہر کا استطاعت کے باوجود نفقہ نہ دینا، (۱۱) شوہر کا ادائیگی نفقہ سے عاجز ہونا، (۱۲) شوہر کا بیوی کو سخت مار پیٹ کرنا، (۱۳) زوجین میں شقاق کا پایا جانا، (۱۴) مرد کا اپنی حالت کے بارے میں عورت کو دھوکہ میں ڈال کر نکاح کرنا، (۱۵) تفریق بسبب حرمت مصاہرت، (۱۶) تفریق بہ سبب فساد نکاح (اسلامی قانون ۲۲۵ مسلم پرسنل لاء بورڈ)۔

اس تمہید طولانی کا مقصد یہ ہے کہ زیر بحث مسئلہ کہ عورت شوہر سے تنفر ہو اور اظہار نفرت کا سبب طبعی ناپسندیدگی ہو اور کوئی معتبر سبب تفریق کا نہ ہو تو محض عورت کا شوہر سے متنفر ہونا تفریق قاضی کا کافی سبب نہیں ہوسکتا ہے۔ چنانچہ عورت کی طرف سے ناپسندیدگی کسی بھی فقہ میں فسخ نکاح کی وجہ جواز نہیں ہے، خدانخواستہ محض عورت کی پسند و ناپسند اور اس کی محبت اور نفرت کو سامنے رکھ کر نکاح کے اثبات و انقطاع کا فیصلہ کیا گیا تو عورت بہت کم ایک خاوند کے پاس ٹھہر سکیں گی۔

بیوی کے دل میں شوہر کی طرف سے نفرت بیٹھ جانے کا سبب معلوم کرنا چاہئے، نکاح کا تو خاصہ یہ ہے کہ، ارشاد خداوندی ہے: وجعل بينكم مودة ورحمة (روم ۲۱) (اور اللہ پاک نے تم میاں بیوی کے درمیان محبتیں اور رحم دلی پیدا کردی)۔

پھر نفرت ہونا یہ شیطانی اثرات کی علامت ہے اس کا واحد علاج تفریق نہیں ہے بلکہ نفرت دور کرنے کے مختلف نسخے اپنائے جاسکتے ہیں، احادیث میں باب عشرۃ النساء کے تحت جو ہدایات ہیں ان پر عمل کرنے سے زندگی میں محبت جھلکنے لگتی ہے۔

سوالنامہ میں سوالات سے قبل جو تمہید میں صورت ذکر کی گئی ہے کہ دونوں کے درمیان کسی وجہ سے ایسا فرق پیدا ہوجاتا ہے کہ عورت اس شوہر کے ساتھ رہنے میں عار محسوس کرتی ہے جیسے نکاح کے وقت دونوں کم تعلیم یافتہ تھے لیکن مستقبل میں شوہر تو تعلیم میں آگے نہ بڑھ سکا لیکن بیوی تعلیم میں بہت آگے بڑھ گئی، دونوں میں تعلیمی اعتبار سے کوئی نسبت نہ ہوا لخ۔

یہ اور اس قسم کی بہت سی صورتیں جن میں مرد و عورت میں نکاح کی ایک مدت کے بعد زوجین میں زمین و آسمان کا فرق ہوجاتا ہے اور کفائت ختم ہوجاتی ہے

تو اس طرح کے امور کو تفریق کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا اگر شوہر بیوی کو معروف طریقہ پر رکھنے اور آباد کرنے کے ملئے آمادہ ہے تو یہ فروق وجہ تفریق نہیں بنائے جاسکتے ،فقہاء نے کفائت کا اعتبار بوقت نکاح کیا ہے بعد میں کفائت زائل ہونے سے کچھ نہیں ہوتا اور نکاح کے بعد اگر زوجین باہم کفوء نہ رہ جائیں تو قاضی کو اس کی وجہ سے فسخ نکاح کا اختیار نہیں۔شامی میں ہے:

''کفائۃ کا اعتبار ابتداء عقد کے وقت کیا جاتا ہے لہٰذا عقد کے بعد کفائت کا ختم ہوجانا مضر نہیں ،اس لئے اگر عقد کے وقت کفاءت موجود ہو پھر نہ رہے تو نکاح فسخ نہ ہوگا'' (ردالمحتار ۲/ ۴۹۸)۔

نکاح کے بعد زوجین کی حیثیت میں فرق مراتب کا پیدا ہوجانا یا منافرت یا منازعت وغیرہ کا ہونا ایسے امور نہیں ہیں کہ ان کو بزور عدالت حل کیا جائے، جب عورت قاضی کے یہاں شوہر کی ظلم وزیادتی کو اور کسی بھی فسخ وتفریق کے سبب کو ثابت کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو قاضی کیسے اس کے دعویٰ فسخ کو قبول کرسکتا ہے؟دراصل عورت کے جو حقوق مرد پر واجب ہوتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جو قانونی حیثیت رکھتے ہیں اور جو نکاح کے قانونی مقاصد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں مثلاً نان ونفقہ اور وظائف زوجیت وغیرہ یہ وہ حقوق ہیں جنہیں بزور عدالت شوہر سے وصول کیا جاسکتا ہے اور اگر شوہر ان کی ادائیگی سے عاجز ہو تو اس پر قانوناً واجب ہوجاتا ہے کہ عورت کو طلاق دے ،ایسی صورت میں اگر وہ طلاق دینے سے انکار کرے یا طلاق دینے کے قابل نہ ہو تو مجبوراً قاضی کو اس کا قائم مقام قرار دیکر تفریق کا اختیار دیا جاتا ہے، مجنون، متعنت، عنین، مفقود الخبر وغیرہ میں یہی صورت ہوتی ہے، اس کے برخلاف نکاح کے بعض حقوق ایسے ہیں جن کی ادائیگی شوہر پر دیانۃً ضروری ہے لیکن وہ قانونی حیثیت نہیں رکھتے اور نہ انہیں بزور عدالت وصول کیا جاسکتا ہے، مثلاً بیوی کے ساتھ حسن سلوک اور خوش اخلاقی کا معاملہ، ظاہر ہے کہ یہ حقوق بزور قانون نافذ نہیں کئے جاسکتے جب تک شوہر کے دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر نہ ہو دنیا کی کوئی عدالت ان کا انتظام نہیں کرسکتی اور جب اس قسم کے حقوق کا تعلق عدالت سے نہیں ہے تو اسے یہ اختیار بھی حاصل نہیں ہے کہ اس قسم کی حق تلفی کی صورت میں وہ نکاح فسخ کردے۔

البتہ اگر عورت کا تنفر بڑھ کر شوہر کو بھی متنفر بنادے اور جانبین سے شقاق پیدا ہوجائے اور دونوں ہی نباہ سے عاجز نظر آئیں تو شقاق بین الزوجین کے سلسلہ میں جو ہدایات ہیں اس پر عمل کیا جائے گا اور جب مسلسل معاشرۃ بالمعروف کا فقدان نظر آئے اور ازدواجی زندگی کے مقاصد فوت ہوجائیں تو عورت کے تنفر کے سبب نہیں بلکہ شقاق بین الزوجین کی بنا پر مصالحت زوجین سے مایوسی کے بعد دونوں کو خلع کا مشورہ دیا جائے اور جب شوہر کسی طرح متارکت پر راضی نہ ہو اور حال یہ ہے کہ امساک بالمعروف اس کی طرف سے بھی ممکن نہ رہا ہو تو تحکیم کے بعد فقہ مالکی کے مطابق زوج کی مرضی کے بغیر بھی خلع کا فیصلہ حکمین اس صورت میں کرسکیں گے۔جیسا کہ فتاوی قاضی (ص ۱۵۰) کے حوالہ سے قاضی مجاہد الاسلام صاحب کا فتوی اوپر گزر چکا ہے (نیز شقاق کے مسئلہ میں آئندہ بھی تفصیل آرہی ہے)۔

عورت کے پاس بینہ نہ ہونے اور حالات انتہائی کشیدہ ہونے پر عورت کے لئے گلوخلاصی کا مسئلہ دراصل شقاق بین الزوجین کے باب سے ہے جس کی بحث آگے آرہی ہے، البتہ اس مسئلہ کی ضروری گفتگو چونکہ آچکی ہے لہٰذا ایک مفید اقتباس پر اس مسئلہ کو مکمل کرتے ہیں۔قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے لکھا ہے''ازدواجی تعلقات انسان کے ایسے نجی معاملات ہیں جن میں سے بہت سے ایسے مراحل آسکتے ہیں جہاں عدالتوں میں کسی امر کو ثابت کرنا دشوار امر ہوگا، ایسے حالات میں دیگر حقوق کی طرح عدم ثبوت کی بنیاد پر مقدمہ کا خارج کردیا جانا کافی نہیں ہوگا، بلکہ اس طرح کی صورت میں جبکہ میاں بیوی کی زندگی ایک دوسرے سے وابستہ ہے، محض مقدمہ کی ہارجیت مسئلہ کو حل نہیں کرسکتی بلکہ پیچیدگیاں بڑھا سکتی ہیں، اس لئے شارع کا منشاء یہ ہے کہ ایسے مواقع پر جب بھی عدالتوں میں ثبوت دشوار ہوجائے ''حکمین'' کے ذریعہ مقدمہ کا فیصلہ کیا جائے، جن کے فیصلہ کی بنیاد ''نجی تحقیقات'' پر ہوں گی باضابطہ بحث وشہادت نہیں اس طرح مسئلہ حل ہوگا۔لہٰذا:

☆ اگر عورت ضرر کا دعوی کرے اور اس کا دعوی ثابت ہوجائے تو ظاہر ہے کہ ثبوت ضرر کی وجہ سے قاضی عورت کا نکاح فسخ کردے گا۔اگر وہ ایسا چاہے گی۔

☆ اگر عورت ضرر رسانی کا دعوی تو کرے لیکن ثابت نہ کرسکے اور یہ شکایت عورت کی طرف سے دوبارہ قاضی کے سامنے آئے یا ہر دو ضرر کا دعوی کررہے ہوں لیکن ثبوت پیش نہ کرسکیں تو ایسی صورت میں قاضی صالحین کی نگرانی میں رکھ کر اصلاح حال کی کوشش کرے گا۔

☆ اور اگر پہلے ہی سے عورت صالحین کے ماحول میں ہو یا صالحین کی نگرانی میں رکھنے کے احکامات کسی وجہ سے موجود نہ ہوں یا صالحین کے ماحول میں رکھنے کے باوجود پیچیدگی برقرار رہے اور کوئی واضح بات نہ نکل سکے کہ کس فریق کی زیادتی ہے تو ایسی صورت میں قاضی معاملہ حکمین کے حوالہ کردے گا۔

''قال مالك الأمر الذی یکون فیه الحکمان إنما ذلك إذا فتح مابین الرجل وامرأته حتی لاتثبه بینهما بینة ولایستطاع أن یتخلص إلی أمرهما فإذا بلغا ذلك بعث الوالی'' (المدونة ۳۲۸)۔

حاصل یہ کہ تحکیم کا محل وہ مقدمہ ہے جہاں زوجین کے باہمی معاملات اس قسم کے ہیں جنہیں شہادت کے ذریعہ ثابت کرنا مشکل اور حقیقت حال تک پہنچنا عدالت کے بس سے باہر ہو (مباحث فقہیہ ر ۴۹۲ مطبوعہ دہلی)۔

## شقاق کا معنی ومطلب

تفسیر مظہری میں ہے: "شقاق سے مراد ہے اختلاف اور دشمنی چونکہ ہر دشمن ایسا کام کرتا ہے جو اس کے مخالف کو شاق ہو اس لئے عداوت کو شقاق کہتے ہیں یا یوں کہا جائے کہ ہر فریق دوسرے فریق کے مخالف شق کی طرف مائل ہوتا ہے اس لئے اختلاف کو شقاق کہتے ہیں (تفسیر مظہری والمحصنت ۵ ر ۲۵ النساء)۔

الشقاق۔ المخالفة وكونك في شق غير شق صاحبك (مفردات راغب اصفهانی)۔
(شقاق کے معنی مخالفت کے ہیں یعنی تم ایک طرف ہو تو تمہارا ساتھی دوسرے کنارہ پر)۔

زوجین میں شقاق کا مطلب ہے تعلقات میں شگاف اور دراڑ پیدا ہوجانا یعنی میاں بیوی کے حالات ایسے ہوجائیں کہ ان کے درمیان شدید نفرت پیدا ہوجائے اور باہمی جھگڑے کے سبب دونوں کا حدود اللہ پر قائم رہنا اور ازدواجی حقوق ادا کرنا ممکن نہ رہ جائے اور یہ بھی واضح نہ ہو کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر (دیکھئے: تفسیر المظہری)۔

یہ شقاق عام ہے خواہ شوہر کی بدخلقی اور بے اعتنائی کے سبب ہو یا بلاوجہ مار پیٹ کرنے کے سبب ہو یا زبانی طعن وتشنیع کی بنا پر ہو یا بیوی کی جانب سے بیجا تصرف کی وجہ سے ہو یا بیوی سے بے جا فرمائش کرنے اور فیشن پرستی پر مجبور کرنے کی وجہ سے ہو یا خواہ مخواہ علیحدہ پڑے رہنے اور توجہ نہ دینے کے سبب ہو وغیرہ ذلک یہ سبھی صورتیں شقاق کے مفہوم میں شامل ہیں۔

**شقاق وضرر کا مطلب**...... "وہ شدید اختلاف جو کسی کی عزت میں طعن وتشنیع کرنے کے سبب ہو اور ضرر وہ فعل یا قول جس کے ذریعہ شوہر، بیوی کو ایذا پہنچائے۔ جیسا کہ گندی گالی بکنا یا ایسی برائی کرنا جو رسوائی کا سبب ہو یا زائد مار پیٹ نیز حرام کام پر ابھارنا اور بلاوجہ شرعی بے توجہی اور لاپرواہی برتنا وغیرہ" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۹ر ۷۰۶۰)۔

## قاضی کو شقاق کی وجہ سے تفریق وخلع کے فیصلہ کا اختیار

زوجین میں شقاق پڑنے پر اگر معاملہ قاضی کی عدالت میں پہنچ جائے تو قاضی شقاق کے ضرر سے فریقین کو بچانے کے لئے تفریق بالفسخ یا بالخلع کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں ائمہ ثلاثہ اور جمہور اس بات پر متفق ہیں کہ شقاق وجہ تفریق نہیں بن سکتا، لہذا محض شقاق کی وجہ سے قاضی کو تو تفریق کردینے کا حق نہیں، البتہ شقاق کے خاتمہ اور ضرر کے دفاع کے لئے دوسرے طریقے وتدابیر تجویز کرے گا۔ حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا یہی مسلک ہے، البتہ مالکیہ شقاق سے پیدا ہونے پر تفریق کو جائز قرار دیتے ہیں اور عورت جب اپنا دعوی شقاق سے پہنچنے والے ضرر کا ثابت کردے تو قاضی دفع ضرر اور رفع نزاع کے لئے تفریق بالفسخ یا بالخلع کراسکتا ہے، لیکن اگر عورت ضرر کو ثابت نہ کرسکے تو تفریق نہیں کرسکتا ہاں اگر پھر عورت کی طرف سے یہی شکایت مکرر آئے تو پھر جانبین سے ایک ایک حکم متعین کرکے معاملہ ان کے حوالہ کردے گا کہ ان کے حق میں مصالحت ومفارقت میں سے جو بہتر ہو جائزہ لیکر وہ تجویز کریں گے، قاضی انہیں کے فیصلہ کو نافذ کرے گا یہ امام مالکؒ کا موقف ہے۔ علامہ وہبہ الزحیلی فرماتے ہیں:

احناف اور شوافع نیز حنابلہ شقاق یا ضرر کی وجہ خواہ شدید ہو تفریق کی اجازت نہیں دیتے، کیونکہ زوجہ سے ضرر کا دفعیہ بلا طلاق کے بھی قاضی کے یہاں شکوہ کے ذریعہ ممکن ہے اور مرد کی تعزیر کا حکم دیکر بھی اس کے ضرر کو روکا جاسکتا ہے۔

مالکیہ نے شقاق یا ضرر کی صورت میں تفریق کی اجازت دی ہے تا کہ جھگڑا نہ رہے اور ازدواجی زندگی جہنم اور مصیبت نہ ہوجائے، حدیث میں ہے: "لاضرر ولاضرار" لہذا عورت اپنا قضیہ قاضی کو پیش کرے پھر اگر عورت نے اپنا مدعا ثابت کردیا تو قاضی اس کی طرف سے طلاق دے دے گا اور اگر ضرر کا ثبوت نہ پیش کرسکی تو اسکا دعوی خارج ہوجائے گا پھر اگر دوبارہ یہی قضیہ لیکر عورت پہنچ جائے تو قاضی دو حکم کو ایک زوج کی طرف سے ایک زوجہ کی طرف سے مقرر کرے گا تا کہ زوجین کے حق میں مصالحت یا تفریق بالعوض یا بلاعوض جو زیادہ بہتر ہو اس کو انجام دیں (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷۰۶۰)۔

خلاصہ یہ کہ امام مالکؒ شقاق اور ضرر کو فسخ وتفریق یا خلع کا سبب قرار دیتے ہوئے شقاق کی بنا پر قاضی کو تفریق کا حق دیتے ہیں جبکہ دیگر ائمہ اس کے قائل نہیں ہیں، البتہ موجودہ زمانہ میں بلاد ہندو پاک نیز بلاد مصر وشام میں مالکی مسلک کو راجح قرار دیتے ہوئے اس پر عمل درآمد جاری ہے اسی لئے احناف کی کتب میں

بھی اب شقاق کو اسباب فسخ میں شمار کیا جاتا ہے۔

قرآنی ہدایت کے مطابق جب زوجین میں شقاق رونما ہو جائے اور معاملہ عدالت تک پہنچ جائے تو اس کے متعلق شرعی حکم آیت میں یہ ہے: ''وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما'' (النساء: ۵،۲۵)۔

امام مالکؒ کے یہاں تحکیم (حکمین مقرر کرنے) کا حکم جب ہے جبکہ معاملہ قاضی کے یہاں اس کے بغیر موافقت یا (بینہ کی صورت میں) مفارقت کے ساتھ حل نہ ہو سکے ورنہ تحکیم کی ضرورت نہیں نیز تحکیم کا مقصد بھی امام مالکؒ کے نزدیک صرف موافقت و مصالحت و مفاہمت ہی نہیں بلکہ مفارقت و مشارکت کی صورت تجویز کرنا بھی مقاصد میں شامل ہے (دیکھئے: المدونۃ الکبریٰ: ۴۲۸)۔

جبکہ دیگر فقہاء کے نزدیک اگر معاملہ عدالت تک پہنچ گیا ہے تو حکام کے لئے حکمین کو مقرر کرنا واجب ہے اور دوسروں کے لئے یہ تحکیم مستحب ہے، نیز حکمین کا اصل کام اتنا ہی ہے کہ وہ تحقیق حال کریں اور جو بے راہی پر ہو یا دونوں کا کچھ کچھ قصور ہو ان کو سمجھا دیں، تفریق یا خلع بلا مرضی زوجین کا اختیار نہ حاکم کو ہے نہ حکمین کو، علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے بہت صاف لکھا ہے: ''ليس في الآية ولا في شئ من السنن أن للحكمين أن يفرقا ولا أن ذلك للحاكم'' (المحلی ۱۰،۸۱)۔ (کسی بھی آیت یا حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حکمین کو تفریق کا اختیار ہے اور نہ اختیار حاکم کے لئے ثابت ہے)۔

البتہ اگر زوجین اپنے اپنے حکم کو طلاق یا خلع کا اختیار بھی دیدیں تو وکالۃً وہ اس کے بھی مختار ہو جائیں گے مگر اس آیت میں اس سے تعرض نہیں ہے، البتہ حكماً من اهله وحكماً من أهلها میں دونوں جگہ لفظ حکم سے تعبیر کر کے قرآن نے دونوں نمائندوں کے ضروری اوصاف کو بھی متعین کر دیا ہے کہ ان دونوں میں جھگڑوں کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو اور یہ صلاحیت ظاہر ہے کہ اسی شخص میں ہو سکتی ہے جو عاقل بالغ ذی عالم اور دیانتدار ہو جیسا کہ فقہاء نے صراحت کی ہے (المنتقی ۴ر۱۱۴)۔

بہر حال جمہور فقہاء کے نزدیک شقاق کے مسئلہ میں کلی طور پر فیصلہ کرنے میں نہ حاکم و قاضی خود مختار ہے نہ ہی حکمین کو یہ پاور حاصل ہے کہ بلا مرضی زوجین خلع کا فیصلہ صادر کر سکیں جبکہ امام مالکؒ کے نزدیک حکمین کو بھی اس کا اختیار ہوتا ہے، اب رہا مسئلہ جمہور فقہاء کے دلائل اور امام مالکؒ کے متدلات پھر ترجیحات کا تو اولاً تو اس کا ذکر طوالت کا سبب ہو جائے گا پھر جہاں جہاں یہ بحث معروف کتابوں میں مذکور ہے وہاں دلائل فریقین کے موجود ہیں مراجعت آسان ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ جمہور فقہاء کے مسلک کے بجائے موجودہ زمانہ میں مصر و شام اور ہندوستان وغیرہ تقریباً سبھی اسلامی اور شرعی دار القضاؤں میں مالکیہ کے مسلک کو اختیار کیا جانے لگا ہے، لہٰذا اب جبکہ مقابل عہد حاضر کا مالکی مسلک پر ہے تو اب نظریاتی طور پر اس کو مرجوح ثابت کرنا بظاہر بے سود معلوم ہوتا ہے، اس لئے دلائل و ترجیح کی بحث کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔

## قاضی کے لئے فیصلہ خلع سے پہلے حکمین یا حکم واحد کے تقرر کی حیثیت

شقاق کے مقدمہ میں عموماً قاضی کو یہ دشواری کا سامنا ہوتا ہے کہ شقاق و ضرر کا تحقق اور اس کا پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے دیگر مقدموں کی طرح معاملہ بآسانی واضح نہیں ہوتا نیز شقاق و ضرر کے معاملہ کا حل صرف تفریق ہی نہیں بلکہ موافقت زوجین کی سعی و کوشش میں ناکامی کے بعد تفریق کی راہ کا قول اختیار کیا جاتا ہے، اس لئے جمہور فقہاء اس کے قائل ہیں کہ قاضی بلا نصب حکمین تفریق یا خلع کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔

بلکہ حکمین کا تقرر (مسئلہ کے حل کے لئے) قاضی کا فریضہ ہے اور حکمین کے تقرر کا مقصد زوجین کے مابین مصالحت کرانا یا بوقت ضرورت حاکم کے پاس ظالم و سرکش کے خلاف شہادت فراہم کرنا ہے جیسا کہ امام ابو بکر جصاص رازی کے حوالہ سے قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ نے لکھا ہے کہ ''حکمین صرف اس لئے مقرر کئے جاتے ہیں کہ زوجین کے مابین مصالحت کرا دیں یا بوقت ضرورت حاکم کے پاس ظالم و سرکش کے خلاف شہادت دیں'' (مباحث فقہیہ ص: ۴۸۵)۔

اگر چہ جمہور علماء کے یہاں قاضی تفریق پھر بھی نہیں کرے گا بلکہ تعزیر وغیرہ دیگر تدابیر بروئے کار لائے گا جیسا کہ ۵ کے تحت گزرا۔ البتہ اس مسئلہ میں اگر عدالت مالکی مسلک کے مطابق کاروائی کرے تب تو عورت کے دعویٰ شقاق و ضرر کے بینہ واضح ہونے پر اور ایسا الزام ثابت کرنے پر جس سے فسخ نکاح کا جواز نکلتا ہے، قاضی حکمین کے مقرر کئے بغیر تفریق بالخلع یا بلا عوض خود کر سکتا ہے حکمین کو مصالحانہ کاروائی کا موقع دینا ایسی صورت میں ضروری نہیں، جب قاضی مناسب سمجھے کہ یہ معاملہ تفریق یا موافقت کی صورت میں اس کے یہاں حل ہوتے نظر نہیں آ رہا ہے تب حکمین کے ذریعہ کاروائی کرنا اس کے لئے لازم ہے اور پھر یہ حکمین حاکم کے نائب ہو کر جمع و تفریق دونوں ہی فیصلہ کا اختیار رکھیں گے۔ علامہ وہبہ الزحیلی فرماتے ہیں:

امام مالک کے مسلک پر عورت اپنا مقدمہ قاضی کے یہاں پیش کرے، پھر اگر ضرر یا جو دعوی ہو اس کو ثابت کر دے تو قاضی شوہر کی طرف سے اس کو طلاق دیدے اگر عورت اثبات ضرر سے عاجز ہو تو اس کا دعوی خارج کر دیا جائے پھر مکرر دعوی کرے تو قاضی دو حکم ایک زوج کی طرف سے ایک زوجہ کی طرف سے طے کر کے بھیجے تا کہ وہ معاملہ کا جائزہ لیکر جو فیصلہ زوجین کے حق میں بہتر ہو موافقت و مصالحت کا یا بعوض یا بلاعوض تفریق کا وہ طے کریں گے تو امام مالک نے حکمین کو حاکم کے مشابہ قرار دیتے ہوئے حاکم جیسا اختیار دیا کہ وہ اپنی رائے کے مطابق طلاق بھی دے سکتا ہے جب ضرر شقاق واضح ہو جائے نیز اللہ پاک نے دونوں کو حکم کے نام سے اپنے فرمان میں موسوم کیا ہے۔ ارشاد ہے: "فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها" اس لئے زوجین کی رضا کا اعتبار نہ ہوگا۔ حکمین کو اختیار ہوگا (زوجین کے حالات سمجھ کر کوئی فیصلہ تجویز کر سکتے ہیں) (الفقہ الاسلامی ۹/۷۰۶۱)۔

خلاصہ یہ کہ قاضی کو فیصلہ خلع سے قبل یا بلاعوض تفریق کے فیصلہ کے لئے امام مالکؒ کے نزدیک حکمین کا مقرر کرنا لازمی امر نہیں ہے اور جس صورت میں حکمین کے تقرر کی ضرورت ہو اگر قاضی حکمین کے بجائے حکم واحد کی تحکیم کو کافی سمجھے تو مالکی مسلک میں اس کی بھی گنجائش ہے جیسا کہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے علامہ قرطبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

"حکم کا تقرر قاضی کرے گا، بہتر ہے کہ دو حکم مقرر کئے جائیں، یوں اگر ایک ہی حکم مقرر کرے یا زوجین ایک ہی شخص کے حکم ہونے پر اتفاق کرلیں تو بھی کافی ہے اور اس کا فیصلہ نافذ ہوگا، اگر دو حکم مقرر ہوئے تو ضروری ہے کہ فیصلہ دونوں کے اتفاق رائے سے ہو، اگر ایک نے تفریق کی رائے دی اور دوسرے نے اختلاف کیا تو اب تفریق نہ ہو سکے گی" الخ (جدید معاشرتی مسائل ۲۰۹ بحوالہ قرطبی ۵/۱۷۵)۔ یہ تشریح مالکی مسلک کے مطابق ہے، باقی رہے وہ متجددین حضرات جو خلع کے لئے شوہر کی اجازت کے کہیں قائل نہیں ہیں بلکہ جمہور کے اجماع واتفاق کے برخلاف خلع کو عورت کا حق سمجھتے ہیں کہ وہ تنہا مالک ہے جب چاہے یہ حق بلا مرضی زوج عدالت سے حاصل کرلے ظاہر ہے ایسے آزاد مسلک میں قاضی کو فسخ و تفریق کے لئے کچھ سوچنے کی کیا حاجت اور حکم مقرر کرنے کی کیا ضرورت، آزادی نسواں کے تقاضہ پر عمل کرتے ہوئے فوراً تفریق کا فیصلہ صادر کر دے گا، یہاں ان کے مسلک کو چھیڑنا ہی فضول ہے۔

## احناف کا مالکی مسلک پر عمل کرنے کا موقف

بڑھتی ہوئی بے راہ روی، بے دینی کا ماحول، اسلامی حکومتوں کا زوال، شرعی عدالتوں کا فقدان، خواتین پر ظلم وزیادتی کا مزاج، معاشی تنگیاں اور حق تلفی، جرائم اور فواحش کی کثرت، جس کا اس زمانہ میں مشاہدہ ہو رہا ہے ان امور نے خواتین کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اور ان حالات کی بنا پر بہت سے مواقع میں عورتیں ظلم وزیادتی کا شکار ہیں جن سے نجات دلانا ارباب حل وعقد کی ذمہ داری ہے، چنانچہ علماء متاخرین احناف نے ضرورت شدیدہ کے وقت عورت کو جنسی اور معاشی تکلیف اور ذہنی کوفت اور حق تلفی سے بچانے کے لئے دوسرے ائمہ کے مسلک کو بے تکلف اختیار کیا ہے، "شرح وقایہ" میں نفقہ نہ ادا کرنے کی صورت میں بیوی کو خیار فسخ نہ دینے اور شوہر کے نام پر قرض حاصل کر کے نفقہ چلانے کے حنفی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ہمارے حنفی لوگوں نے بھی جب دیکھا کہ اس مسئلہ میں لوگوں کو تفریق کی ہی ضرورت ہے کیونکہ مستقل قرض لیکر کام چلانا کوئی آسان بات نہیں ہے اور بظاہر کوئی ملتا بھی نہیں جو عورت کو قرض دیتا رہے کیونکہ شوہر کا مالدار ہو جانا فی الحال امر موہوم ہے۔ اس لئے فقہاء احناف نے مناسب سمجھا کہ ایسے مسئلہ میں مذہب شافعی کے مقلد قاضی کے یہاں جا کر دونوں میں تفریق کرادے" (شرح وقایہ ۲/۱۷۴)۔

اسی طرح علامہ شامی وغیرہ نے مفقود الخبر کے بارے میں امام مالکؒ کے مسلک پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے گویا یہ مسئلہ اب فقہ حنفی کا جزو بن گیا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے زمانہ میں حالات کی نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے وقت کے ممتاز علماء واصحاب افتاء سے مشورہ کر کے کئی صورتوں میں فقہ مالکی کے مطابق فسخ و تفریق کا قول اختیار فرمایا اور مستقل رسالے مرتب فرمائے جو "الحیلۃ الناجزۃ" میں چھپے ہوئے ہیں اور پورے ہندوستان میں اس پر عمل درآمد ہے۔ البتہ یہ فیصلہ کہ وہ کون سے مسائل ہیں جو ہمیں حنفی کتب فکر سے مالکی یا دیگر مسلک کی طرف عدول کرنے کے متقاضی ہیں۔ سو اس سلسلہ میں علماء کا طریقۂ کار ہمیں مختلف نظر آتا ہے، چنانچہ صاحب احسن الفتاوی میں مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ اور مولانا تقی عثمانی صرف ۵/ عیوب کی بنا پر قاضی کو تفریق کا اختیار دیتے ہیں۔

۱۔ شوہر پاگل ہو گیا ہو۔ ۲۔ نان ونفقہ ادا نہ کرتا ہو۔ ۳۔ نامرد ہو۔ ۴۔ بالکل لاپتہ ہو جو غائب غیر مفقود کی صورت ہو (فقہی مقالات ۲/۱۹۲)۔

بہر حال ارباب حل وعقد شریعت کے دائرہ میں شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے حقوق زوجیت سے متعلق مسائل حل کرنے کی فکر میں مصروف ہیں، رائے و تحقیق

میں اختلاف کی بہر حال گنجائش ہے۔

شقاق کی بنا پر تفریق کی گنجائش دینے نہ دینے کے مسئلہ میں بھی یہی نقطۂ نظر ہے کہ امارت شرعیہ بہار، مالکی مسلک کے مطابق عمل پیرا ہیں جبکہ احسن الفتاوی اور فتاوی محمودیہ وغیرہ میں حنفی مسلک پر فتوی دیا گیا ہے۔

بہر حال مقدمہ کی نوعیت اور زوجین کی حالت کے پیش نظر اگر ضرورت شدیدہ مالکی مسلک کے مطابق مسئلہ حل کرنے کی محسوس ہو تو مسئلہ کو پیچیدہ حالت میں چھوڑنے کے بجائے مالکی مسلک کے مطابق اسکا نپٹارہ کر دینا ہی بہتر ہوگا بلکہ بعض دفعہ ایسا کرنا ضروری ہوگا۔ علامہ عبدالرحمن الجزیری لکھتے ہیں:

"طلاق اسلام میں اہم اجتماعی مقاصد کے لئے مشروع ہوئی اور طلاق کا ہونا کبھی ضروری ہوجاتا ہے جبکہ شوہر بیوی کے درمیان ایسی کشیدگی ہو کہ جس کی وجہ سے زوجیت کے تعلقات منقطع ہوجائیں اور اس کی جگہ کراہیت اور نفرت بیٹھ جائے اور صلح کرانے والے اس کو ختم نہ کر سکیں تو ایسی حالت میں علاج یہی ہے کہ طلاق کا فیصلہ کر دیا جائے ورنہ ازدواجی زندگی اپنے مقصد کے برعکس ہوجائے گی کیونکہ زوجیت کا رشتہ اس لئے ہے کہ دو دوستوں کی طرح دونوں اکٹھا رہیں ان میں میل ومحبت بنی رہے۔ اس لئے نہیں کہ دو دشمنوں کو جوڑ دیا جائے کہ ایک دوسرے کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۴/۱۸۰)۔

بہر حال جب مالکی مسلک پر عمل ناگزیر ہوجائے تو فقہ مالکی کی تفصیلات کے مطابق اس کو حل کیا جائے فقہ مالکی پر عمل درآمد کا طریقۂ کار مندرجہ ذیل ہوگا۔

۱۔ جب قاضی کے یہاں شقاق ونزاع کا کوئی مقدمہ پیش ہو تو قاضی ایسے مقدمہ میں جس میں فریقین کے درمیان شقاق اور دوری بڑھ چکی ہو، شہادت وثبوت سے قطعی نتیجہ تک پہنچنا دشوار ہو اور مقدمہ کا قانونی فیصلہ مسئلہ کے حل سے عاجز نظر آئے۔ "حکمین" مقرر کرے گا۔ حکمین اپنے فیصلہ کی بنیاد ذاتی تحقیقات پر رکھیں گے۔

۲۔ حکمین اپنی پوری کوشش جانبین کے مابین خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لئے صرف کریں، اس کے لئے حکمین کا احکام شرعیہ سے واقف، دیانتدار اور غیر جانب دار ہونا چاہئے۔

۳۔ اگر اصلاح حال ناممکن نظر آئے تو غور کریں۔

(الف) شوہر ظالم ہو تو بلا کسی عوض کے طلاق تجویز کر دیں (ب) اور اگر بد سلوکی عورت کی طرف سے ہو تو اگر زوج خلع پر راضی ہو تو خلع طے کر دیں اور اگر زوج جدائی نہیں چاہتا لیکن "حکمین" محسوس کریں کہ طرفین کے فلاح جدائی میں ہے اور عورت نباہ نہیں کر سکتی تو ایسی صورت میں بھی خلع کر دیں اور اگر نباہ واصلاح کے امکانات ہوں تو پھر شوہر کو صبر اور حسن معاشرت کی تلقین اور عورت کو اطاعت زوج کی تلقین کر کے مقدمہ ختم کر دیں۔

۴۔ حکمین جو کچھ فیصلہ کریں اس سے قاضی کو آگاہ کر دیں بلکہ قاضی کو اپنی تجویز پیش کر دیں تاکہ قاضی خود فیصلہ کرے۔

فقہ مالکی کا یہ طریقۂ کار تفصیل کے ساتھ علامہ وہبہ الزحیلی کی کتاب الفقہ الإسلامی وادلتہ ۹/۷۰۶۳ نیز شرح دردیر علی مختصر شیخ خلیل ۱/۳۲۹ میں مذکور ہے۔ فقط۔

واللہ تعالی اعلم

☆☆☆

# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

مفتی محمد جعفر ملی رحمانی[1]

## خلع (TRANSACTION)

۱۔ صاحب ”تنویر الابصار“ محمد بن عبد اللہ بن احمد بن محمد بن ابراہیم تمرتاشی رحمہ اللہ خلع کی تعریف یوں فرماتے ہیں: ”خلع یا اس طرح کے کسی اور لفظ سے نکاح کو ختم کردینا جو عورت کے قبول کرنے پر موقوف ہو“[2]۔

عبد اللہ بن محمود بن مودود الموصلی الحنفی رحمہ اللہ اپنی کتاب ”الاختیار لتعلیل المختار“ میں خلع کی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں: ”عورت کے عطا کردہ مال کے عوض رشتۂ زوجیت کو ختم کرنا“[3]۔

فقیہ، عالم بن علاء الاندریتی رحمہ اللہ ”تاتارخانیہ“ میں بحوالہ سغناقی رقم طراز ہیں: ”مرد کا ملکِ نکاح کے مقابلہ عورت سے مال لے کر لفظ خلع کے ذریعہ اسے نکاح سے جدا کردینا“ خلع ہے[4]۔

علامہ وہبی سلیمان غاوجی خلع کو ان الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں: ”ملکِ نکاح کے مقابلہ میں مال لینا، یا لفظِ خلع کے ذریعہ ملکِ نکاح کو ختم کردینا“ خلع ہے[5]۔

خلع کی مذکورہ بالا تعریفات سے اتنی بات واضح ہوجاتی ہے کہ: ”عورت سے کچھ لے کر اس کو نکاح سے آزاد کردینے کا نام خلع ہے“[6]۔

۲۔ بعض لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ جیسے مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے، اسی طرح عورت عام حالات میں بھی ہر وقت خلع کا حق رکھتی ہے، مرد چاہے یا نہ چاہے، تو یہ بات درست نہیں ہے۔ ہاں! جب تخالفِ طبائع یا مزاجوں کی عدمِ ہم آہنگی یا کسی اور وجہ سے زوجین میں نباہ دشوار ہوجائے اور شوہر طلاق پر آمادہ نہ ہو، تو شرعاً عورت کے لیے خلع لینا جائز ہے، بشرطیکہ تعدی ونشوز عورت کی جانب سے نہ ہو[7]۔ کیوں کہ خلع باجماعِ امت زوجین کا ایک ایسا

[1] جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، نندربار، مہاراشٹر

[2] (رد المحتار: ۸۵۔۵/۸۳، ۸۷، کتاب الطلاق، باب الخلع، بیروت، نیز دیکھئے: الفقه الحنفي في ثوبه الجديد: ۲/۲۲۶، الخلع، فتح القدير: ۴/۱۸۸، باب الخلع، بيروت، العناية شرح الهداية: ۲/۵۱۹، باب الخلع، البناية شرح الهداية: ۵/۲۹۱، باب الخلع، مكتبه رشيديه كوئته، فتح باب العناية بشرح النقاية: ۲/۱۴۲، فصل في الخلع، دار الأرقم بيروت، تحقيق وتعليق على شرح الزيادات: ۲/۴۶۹، باب الخلع بالمال مجمع الأنهر: ۲/۱۰۲، باب الخلع، الدر المنتقى شرح الملتقى مع المجمع: ۲/۱۰۱، باب الخلع، تبيين الحقائق: ۳/۱۸۲، البحر الرائق: ۴/۱۱۹، النهر الفائق: ۲/۴۳۵، دار الإيمان سهارنفور، الفتاوى الهندية: ۱/۴۸۸، الباب الثامن في الخلع وما في حكمه)۔

[3] ۲۔ ۳/۲۱۶، باب الخلع، نیز دیکھئے: دار الرسالة العالمية، ۳/۱۵۶، دار المعرفة بيروت ”الفقه الحنفي وأدلته“ میں ہے: وقال الحنفية: الخلع إزالة الزوجية بما تعطيه الزوج من المال۔ (۲/۲۲۴، باب الخلع، الجوهرة النيرة: ۲/۲۱۵، كتاب الخلع، دیکھئے: ”معجم لغة الفقهاء“ ص: ۱۹۹، إدارة القرآن كراتشي، المصباح المنير للفيّومي: ص: ۶۸، مكتبة لبنان، عون المعبود: ص: ۹۸۷، باب في الخلع، رقم الحديث: ۲۲۲۰)

[4] (۳/۲۸، الفصل السادس عشر في الخلع، مكتبة دار الإيمان سهارنفور، دیکھئے: ”الموسوعة الفقهية“ ۱۹/۲۳۴، خلع)

[5] ما في ”الكافي في الفقه الحنفي“: ”الخلع شرعاً: أخذ المال بإزاء ملك النكاح أو إزالة ملك النكاح بلفظ الخلع“ ۳/۱۰۱۷، الخلع، مؤسسة الرسالة بيروت)۔

[6] (قاموس الفقہ: ۳/۳۶۲، خلع، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)

[7] (امداد الأحکام: ۲/۴۴۷، فتاوی محمودیہ: ۱۳/۳۴۱، کراچی)

معاملہ ہے، جو زوجین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہوتا ہے[1]۔

البتہ حیثیتِ خلع میں فقہاء مجتہدین کا اختلاف ہے کہ خلع کی حیثیت طلاق کی ہے یا فسخ کی؟ تو حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، حضرت سعید ابن مسیبؒ، حسن بصریؒ، عطاءؒ، قاضی شریحؒ، شعبیؒ، ابراہیم نخعیؒ، جابر بن زیدؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ اور صحیح قول کے مطابق امام شافعیؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ "خلع طلاق" ہے۔

لیکن حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت عثمان غنیؓ، طاؤسؒ، عکرمہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، اسحق بن راہویہؒ، ابوثورؒ اور داؤد ظاہری کا کہنا یہ ہے کہ "خلع فسخ نکاح" ہے اور اس پر طلاق کے احکام جاری نہیں ہوں گے، امام شافعی کا قدیم مذہب بھی یہی تھا، لیکن پھر انہوں نے پہلے مذہب کو اختیار کرلیا تھا (فقہی مقالات: ۲/ ۱۴۲، ۱۴۳)[2]۔

اسی طرح آیت کریمہ: {وللرجال علیهنّ درجة} سے پتہ چلتا ہے کہ بعض معاملات میں جو اختیارات مرد کو حاصل ہیں وہ عورت کو حاصل نہیں ہیں[3]۔

اسی لیے مرد کو بغیر معاوضہ دیئے طلاق دینے کا اختیار حاصل ہے، جب کہ عورت معاوضہ ادا کیے بغیر طلاق حاصل نہیں کرسکتی۔ علامہ ابن رشد مالکیؒ فرماتے ہیں: "بہر حال خلع تو جمہور اس بات پر متفق ہیں کہ وہ طلاق ہی ہے"[4]۔

[1] ما في "المبسوط للسرخسي": "والخلع جائز عند السلطان وغيره) لأنه عقد يعتمد التراضي كسائر العقود وهو بمنزلة الطلاق بعوض. وللزوج ولاية إيقاع الطلاق. ولها ولاية التزام العوض" ۶/۲۰۲، بیروت، ۶/۱۷۳. مطبعة السعادة. نیز دیکھئے: المغني لابن قدامة الحنبلي: ۷/۵۲. مطبعة دار المنار. الجامع لأحكام القرآن للقرطبي: ۳/۱۳۸، دار الكتب المصرية. كتاب الأم للشافعي: ۵/۲۰۰. مكتبة الكليات الأزهرية. بدائع الصنائع ۳/۳۱۵. كتاب الطلاق. بيروت. رد المحتار: ۵/۸۸. باب الخلع. بيروت. فتاوى عثماني: ۲/۴۴۵)۔

[2] ما في "نصب الراية للزيلعي": "رواه عبد الرزاق في "مصنفه" حدثنا ابن جريج عن داود بن أبي عاصم عن سعيد بن المسيب أن النبي ﷺ جعل الخلع تطليقة ۔ انتهى ۔ وكذلك رواه ابن أبي شيبة" ۳/۳۴۸. كتاب الطلاق. باب الخلع. دار الإيمان سهارنفور اور "الفقه الحنفي وأدلته" میں ہے: روي عن علي وعثمان وابن مسعود رضي الله عنهم: أن الخلع تطليقة بائنة ۔ }شرح السنن لأبي داود للخطابي{ ۔ وبه قال الحسن البصري وإبراهيم النخعي وعطاء بن السائب وشريح والشعبي ومكحول والزهري. وبه قال الثوري وأبو حنيفة وأصحابه. وكذلك قال مالك والأوزاعي والشافعي في أحد قوليه وهو أصحهما۔ والله أعلم۔ وروى عبد الرزاق في مصنفه بسنده إلى سعيد بن المسيب: أن النبي ﷺ جعل الخلع تطليقة " ۲/۲۲۴، ۲۲۵. باب الخلع. إدارة القرآن والعلوم الإسلامية كراتشي، نیز دیکھئے: تفسير ابن كثير: ۱/۲۷۵، المكتبة التجارية الكبرى. بداية المجتهد: ۲/۶۹، بذل المجهود: ۸/۲۲۷، ۲۲۸. رقم الحديث: ۲۲۱۲. كتاب الطلاق. باب الخلع. معالم السنن شرح سنن أبي داود: ۳/۲۱۹، ۲۲۰. رقم الحديث: ۱۰۸۹. كتاب الطلاق. باب الخلع. عون المعبود: ص: ۹۸۷. رقم الحديث: ۲۲۲۷. باب في الخلع. المبدع في شرح المقنع: ۷/۲۲۷. الخلع طلاق بائن. "موسوعة مسائل الجمهور في الفقه الإسلامي" ۲/۷۱۹، ۱۸۔ باب في الخلع هل هو فسخ أم طلاق؟ رقم المسئلة: ۱۲۳۸ وغيره۔

[3] وما في "الدر المنثور": "وأخرج عبد بن حميد وابن أبي حاتم عن أبي مالك { وللرجال عليهنّ درجة } ۔ قال: يطلقها وليس لها من الأمر شيء ۔ کہ مرد عورت کو طلاق دے سکتا ہے لیکن عورت کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں" ۱/۲۹۴. سورة البقرة/ الآية: ۲۲۸. دار الكتب العلمية بيروت. ۳/۱۲۵. دار الكتب المصرية)۔

[4] ما في "كتاب الأم للشافعي": "وإنما جعلناها تطليقة لأن الله تعالى يقول: { الطلاق مرّتان } ۔ فعقلنا من الله تعالى أن ذلك إنما يقع بإيقاع الزوج. وعلمنا أن الخلع لم يقع إلا بإيقاع الزوج ... وقال أيضاً: وكذلك سيد العبد إن خالع عن عبده بغير إذنه. لأن الخلع طلاق. فلا يكون لأحد أن يطلق عن أحد" ۵/۱۹۸، ۲۰۰. دیکھئے: الانصاف للمرداوی. ۸/۲۹۱. كتاب الخلع. الخلع فسخ أو طلاق. "بداية المجتهد لابن رشد المالكي ۲/۶۹. مكتبة مصطفى البابي. تفسير ابن كثير: ۱/۲۷۵ بحواله: فقهی مقالات)۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی ہے: ''طلاق کا مالک وہی شخص ہے جسے حق جماع حاصل ہے''[1]۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جس طرح طلاق دینے کا حق مرد کو حاصل ہے، اسی طرح خلع بھی اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ شوہر راضی نہ ہو۔

۳۔ اگر عورت شوہر کی جانب سے شدید حد تک متنفر ہو، لیکن شوہر طلاق دینے پر تیار نہ ہو اور عورت کے پاس شوہر کی ظلم و زیادتی کے سلسلہ میں بینہ فراہم نہ ہو تو اس کی گلوخلاصی کی صورت یہ ہوگی کہ حنفی قاضی کو جب تحقیق حال کے بعد شواہد و ثبوت سے یہ ظن غالب ہوجائے کہ عورت اپنے دعوی میں سچی ہے، تو امام مالکؒ کے مسلک پر ان کی تصریحات کے مطابق فیصلہ دے (ماخوذ از ''کتاب الفسخ والتفریق''، ص ۱۴۸، مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ)۔

ان کی تصریحات اس بارے میں یہ ہیں: ''مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی کو مار پیٹ کرکے یا مثلاً کسی ناجائز کام کے کرنے پر مجبور کرکے ضرر پہنچائے تو عورت کو حق ہے کہ اپنا معاملہ قاضی کے پاس لے جائے اور اس کو حق ہے کہ قاضی سے شوہر کی تادیب اور زجر کا مطالبہ کرے تاکہ وہ عورت کو تکلیف پہنچانے سے باز رہے، اسی طرح اس کو یہ بھی حق ہے کہ شوہر کی طرف سے طلاق دیئے جانے کا مطالبہ کرے، تو اگر عورت قاضی سے مطالبہ کرے کہ اس کے شوہر کو ایذا رسانی سے روکا جائے تو قاضی اولاً شوہر کو سمجھائے، اس کو یہ بتائے کہ شوہر پر اپنی بیوی کے ساتھ بہترین معاشرت واجب ہے، اور اس کو بتائے کہ عورت کے ساتھ بدسلوکی کے نتیجہ میں دونوں کے درمیان علیحدگی ہوسکتی ہے، جس کے نتیجہ میں بچہ ضائع ہوجائے گا اگر ہو، پھر اگر وعظ و نصیحت سے فائدہ ہوجائے تو ٹھیک ہے، لیکن اگر عورت دوبارہ قاضی کے پاس آئے اور اس کو بتائے کہ شوہر اپنی مار پیٹ سے باز نہیں آیا ہے اور معاملہ واضح نہ ہو تو قاضی دو حکم بھیجے گا، ان دونوں پر واجب ہوگا کہ زوجین کے درمیان اصلاح حال اور آپس میں محبت اور حسن معاشرت پر دونوں کو آمادہ کرنے کی کوشش کریں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ تحقیق کریں کہ زوجین میں سے کس کی طرف سے دوسرے کے حق میں زیادتی ہوتی ہے، اگر زیادتی شوہر کی طرف سے ہو تو دونوں حکم شوہر کی طرف سے زوجہ کو بلا معاوضہ طلاق دے دیں گے، اور اگر زیادتی بیوی کی طرف سے ہو تو حکمین کو دو چیزوں میں ایک کا اختیار ہے:

اول یہ کہ حکمین شوہر کو بیوی کے معاملہ میں امین بنائے یعنی دونوں حکم شوہر کو بیوی کے ساتھ انصاف کرنے اور حسن معاشرت میں امین بنائیں گے۔

دوم یہ کہ عورت کی طرف سے معاوضہ لے کر دونوں کے درمیان تفریق کردیں، اور جائز ہے کہ یہ معاوضہ عورت کے مہر سے جس کو اس نے اپنے شوہر سے لیا ہے کم ہو، اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ اس کے مہر کے برابر یا اس سے زیادہ ہو۔

اور اگر حکمین یہ محسوس کریں کہ زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی کرتا ہے تو پھر اگر یہ ممکن ہو کہ وہ جان سکیں کہ کس کی طرف سے زیادتی زیادہ ہے، تو جس کی طرف سے زیادتی زیادہ ہوگی وہی تنہا زیادتی کرنے والا سمجھا جائے گا۔

اور اگر حکمین کے لیے یہ جاننا ممکن نہ ہو کہ ان دونوں میں سے کس کی زیادتی زیادہ ہے، یا یہ معلوم ہو کہ ہر ایک کی زیادتی دوسرے کے حق میں برابر ہے تو مذہب میں دو رائیں ہیں: اول یہ کہ حکمین کی ذمہ داری ہے کہ زوجہ کو بلا معاوضہ طلاق دیدیں، دوسری یہ کہ ان دونوں کی ذمہ داری ہے کہ معاوضہ لے کر طلاق دیں، اسی دوسری رائے کے مطابق اکثر علماء کا عمل ہے''[2]۔

[1] ما في القرآن الكريم: {لا جناح عليكم إن طلقتم النساء ما لم تمسوهن أو تفرضوا لهن فريضة}۔ ''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان بیویوں کو جنہیں تم نے نہ ہاتھ لگایا اور نہ ان کے لیے مہر مقرر کیا طلاق دے دو'' سورۃ البقرۃ: ۲۳۶ اور ''أصول الشاشي'' میں ہے: قال صاحب أصول الشاشي: ''نصّ في حكم من لم يسم لها مهر. وظاهر في استبداد المزوج بالطلاق'' ص: ۲۲، فصل في المتقابلات، مکتبہ بلال بکڈپو دہلی، اور ''السنن لابن ماجة'' میں ہے: ''عن عكرمة عن ابن عباس قال: ''أتى النبي صلى الله عليه وسلم رجل فقال: يا رسول الله! سيدي زوجني أمته وهو يريد أن يفرق بيني وبينها، قال: فصعد رسول الله صلى الله عليه وسلم المنبر فقال: يا أيها الناس ما بال أحدكم يزوّج عبده من أمته ثم يريد أن يفرق بينهما. إنما الطلاق لمن أخذ بالساق'' ۱/۱۵۱، باب طلاق العبد، مكتبه بلال ديوبند. فتح القدير: ۳/۴۷۶، كتاب الطلاق. فصل ويقع طلاق كل زوج ... الخ وغیرہ)۔

[2] (ماخوذ از ''کتاب الفسخ والتفریق'': ص ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: موسوعہ فقهيه ۲۹.۵۷ طلاق. حاشيه الدسوقي على الشرح الكبير ۲.۳۴۵ طبع دار الفكر بيروت، المدونة الكبرى ۲.۲۶۷، التاج والإكليل لمختصر خليل على هامشه ۵.۲۶۳، ۲۶۴ مغني المحتاج شرح منهاج الطالبين ۳.۲۰۸ وغیرہ)۔

۴۔ ''شقاق'' کے معنی عداوت، دشمنی، مخالفت کے ہیں، اور چوں کہ یہ باب مفاعلۃ کا مصدر ہے، اس لیے اس کے معنی ہیں ''باہم شقاق میں اس حالت پر ہوجانا کہ ایک شخص ایک شق پر ہو یعنی ایک سرے پر ہو اور دوسرا شخص دوسری شق پر ہو، یعنی دوسرے سرے پر ہو''۔ یعنی دو آدمیوں کے درمیان شقاق (عداوت، دشمنی، مخالفت) نے انتہائی صورت اختیار کرلی ہو (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی ۲ر۱۴۲، ۵ر۱۷۴) اسی کو امام راغب نے اپنی کتاب ''مفردات القرآن'' میں ان الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے:

''لشقاق المخالفة وكونك في شق غير شق صاحبك''۔ (شقاق کے معنی مخالفت کے ہیں یعنی تم ایک طرف ہو، تو تمہارا ساتھی دوسرے کنارہ) (مفردات القرآن اردو: ص ۵۴۶، نیز دیکھئے: تفسیر مظہری ۲، ۳ر۳۱۳، روح المعانی ۴، ۹ر۳۹، فتح القدیر للشوکانی ۱، ۷ر۳۷، مغنی المحتاج ۳، ۲۶۱ وغیرہ)۔

علامہ عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''شقاق سے مراد ''ایسی کشمکش جسے وہ (میاں بیوی) باہم نہ سلجھا سکیں'' (ماجدی: ص ۱۹۱، حاشیہ نمبر: ۵۳۹)۔

۵۔ قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ نہیں کرسکتا، جیسا کہ صاحب ''احکام القرآن'' ابوبکر الجصاصؒ قرآن کریم کی آیت: { وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكماً من أهله وحكماً من أهلها } کے تحت تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اجماع امت سے یہ بات ثابت ہے کہ حاکم وقت عورت سے مال لے کر اس کے شوہر کو دینے، اور مرد کی توکیل ورضاء کے بغیر اس کی بیوی پر ایقاع طلاق کا اختیار نہیں رکھتا''۔[1]

کیوں کہ اگر حاکم کو یہ اختیار ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیوی سے ''أتردين عليه حديقته؟'' سے استفہام اور شوہر کو ''طلقها'' یا ''خل سبيلها'' نہ فرماتے بلکہ خود نکاح فسخ فرمادیتے۔ ''قال الإمام أبوبكر الجصاص الرازي رحمه الله تعالى: لو كان الخلع إلى السلطان شاء الزوجان أو أبيا إذا علم أنهما لا يقيمان حدود الله لم يسألهما النبي ﷺ عن ذلك ولا خاطب الزوج بقوله: اخلعها بل كان يخلعها منه ويرد عليه حديقته وإن أبيا أو واحد منهما كما لما كانت فرقة المتلاعنين إلى الحاكم لم يقل للملاعن خلّ سبيلها بل فرق بينهما'' (۱/ ۳۹۵، بحوالہ أحسن الفتاوی: ۵/ ۳۸۶)

سنن بیہقی میں بروایت عبیدہ سلمانی منقول ہے کہ...... ایک مرد اور ایک عورت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دونوں کے ساتھ بہت سی جماعتیں تھیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حکم دیا کہ ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک عورت کے خاندان سے مقرر کریں، جب یہ حکم تجویز کردیئے گئے تو ان دونوں سے خطاب فرمایا کہ تم جانتے ہو تمہاری ذمہ داری کیا ہے؟ اور تمہیں کیا کرنا ہے؟ سن لو! اگر تم دونوں ان میاں بیوی کو یکجا رکھنے اور باہم مصالحت کرادینے پر متفق ہوجاؤ تو ایسا ہی کرلو، اور اگر تم یہ سمجھو کہ ان میں مصالحت نہیں ہوسکتی یا قائم نہیں رہ سکتی، اور تم دونوں کا اس پر اتفاق ہوجائے کہ ان میں جدائی ہی مصلحت ہے تو ایسا ہی کرلو، یہ سن کر عورت بولی کہ مجھے یہ منظور ہے، یہ دونوں حکم قانون الٰہی کے موافق جو فیصلہ کردیں خواہ میری مرضی کے مطابق ہو یا خلاف مجھے منظور ہے، لیکن مرد نے کہا کہ جدائی اور طلاق تو میں کسی حال گوارا نہ کروں گا، البتہ حکم کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ مجھ پر مالی تاوان جو چاہیں ڈال کر اس کو راضی کردیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ نہیں تمہیں بھی ان حکمین کو ایسا ہی اختیار دینا چاہیے جیسا عورت نے دے دیا۔

اس واقعہ سے بعض ائمہ مجتہدین نے یہ مسئلہ اخذ کیا کہ ان حکمین کا بااختیار ہونا ضروری ہے جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فریقین سے کہہ کر ان کو بااختیار بنوایا، اور امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حسن بصریؒ نے یہ قرار دیا کہ اگر ان حکمین کا بااختیار ہونا امر شرعی اور ضروری ہوتا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس ارشاد اور فریقین سے رضامندی حاصل کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی، فریقین کو رضامند کرنے کی کوشش خود اس کی دلیل ہے کہ اصل سے یہ حکمین بااختیار نہیں ہوتے، ہاں! میاں بیوی ان کو مختار بنادیں تو بااختیار ہوجاتے ہیں۔[2]

البتہ جب مالکیہ کے نزدیک تحکیم شقاق کی بناء پر حکمین کو بدون توکیل تفریق بین الزوجین کا اختیار ہے، اور حکمین اپنی مصلحت کے مطابق جمع وتفریق کا فیصلہ کرسکتے ہیں[3]، درآنحالیکہ حکمین یہ حاکم ہی کے نائب ہوتے ہیں، اور جب حکمین کو بدون توکیل ورضا تفریق کا اختیار حاصل ہے، تو ان کے نزدیک قاضی کو

---

[1] (۲/ ۱۴۲، باب الحكمين كيف يعملان، سورة النساء، الآية/ ۳۵، اس سلسلہ میں مزید صریح دلائل کے لئے دیکھئے: ۲ر۲۴۱، روح المعانی ۵ر۲۷، ۴ر۴۰ طبع زکریا دیوبند، موسوعہ فقہیہ ۲۹ر۵۴، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد ۳ر۱۴۰، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۴ر۳۳، مغنی المحتاج ۳ر۲۶۱ وغیرہ)۔

[2] (معارف القرآن: ۷/ ۴۰۴، ۴۰۵، فرید بکڈپو نیو دہلی، قاموس الفقہ: ۳/ ۳۶۶، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: احکام القرآن الکریم للطحاوی ۲ر۲۴۲، ۲۴۳)۔

[3] (موسوعۃ فقہیہ ۲۹ر۵۴، المدونۃ الکبری ۲ر۲۶۷، احکام القرآن للقرطبی ۵ر۱۴۴، بدایۃ المجتہد ۳ر۱۴۰، جامع الاحکام الفقہیہ ۲ر۲۸۶)

یہ حق بدرجۂ اولیٰ حاصل ہونا چاہیے۔

٦۔ (الف) جن حضرات (مالکیہ) کے نزدیک خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں، ان کے یہاں قاضی کی طرف سے حکمین کا مقرر کیا جانا ضروری ہے[1]۔

البتہ جب مالکیہ کے نزدیک تحکیم شقاق کی بناء پر حکمین کو بدونِ توکیل تفریق بین الزوجین کا اختیار ہے، اور حکمین اپنی مصلحت کے مطابق جمع وتفریق کا فیصلہ کر سکتے ہیں، درآں حالانکہ حکمین یہ حاکم ہی کے نائب ہوتے ہیں، تو حکمین کی کوشش سے پہلے بھی خود قاضی کو فیصلۂ خلع کا اختیار ہونا چاہیے، کیوں کہ یہ امر معقول نہیں ہوگا کہ نائبین قاضی تو خلع وتفریق کا اختیار رکھیں اور خود قاضی اس اختیار سے محروم ہو۔

(ب) اگر ایک ہی حکم مقرر کیا جائے یا زوجین ایک ہی شخص کے حکم ہونے پر متفق ہو جائیں تو بھی کافی ہے، اس کا فیصلہ نافذ ہوگا، لیکن بہتر یہ ہے کہ دو حکم مقرر کیے جائیں[2]۔

۷۔ زن وشوہر کے شقاق کی صورت میں جب عورت قاضی کے یہاں مقدمہ دائر کرے اور جائز شکایت کی بنا پر شوہر سے تنگ آکر تفریق کا مطالبہ کرے، تو حنفی قاضی معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک پر ان کی تصریحات کے مطابق فیصلہ دے سکتا ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے فقیہ ابو اللیث سمرقندی کے حوالہ سے یہ بات نقل فرمائی ہے کہ: "جب کسی مسئلہ کی بابت مذہبِ امام میں کوئی قول موجود نہ ہو تو مذہبِ مالک کی طرف رجوع کیا جائے گا، اس لیے کہ وہ دیگر مذاہب کی بہ نسبت مذہبِ امام سے اقرب ہے"[3]۔

اسی طرح حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ "الحیلۃ الناجزۃ" میں رقم طراز ہیں: "اگر کسی عورت کا شوہر کسی طریقہ سے نہ مانے اور خلع وغیرہ ممکن نہ ہو اور عورت صبر کی متحمل بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں مجبوراً مذہبِ مالکیہ کے مطابق دین دار مسلمانوں کی پنچائیت میں معاملہ پیش کرنے کی گنجائش ہے، اور یہ پنچائیت کم از کم تین دین دار افراد پر مشتمل ہو، اور واقعہ کی تحقیق کے بعد بموافقِ شرع فیصلہ کردے تو یہ فیصلہ فیصلۂ قاضی کے قائم مقام ہوگا" (ص ر ٦٣)۔ ☆☆☆

---

[1] ما في "الموسوعة الفقهية": ونص جمهور فقهاء المالكية والشافعية على أن بعث الحكمين واجب على الحاكم أو القاضي. لأن آية بعث الحكمين محكمة غير منسوخة، فالعمل بها واجب. ولأنه من باب دفع الظلمات. وهو من الفروض العامة على القاضي. (۴۰/۳۰۹. نشوز. الخطاب ببعث الحكمين وحكمه)

ما في "مواهب الجليل لشرح مختصر خليل": قوله: (وإن أشكل بعث حكمين). اللخمي: إذا اختلف الزوجان وخرجا إلى ما لا يحل من المشاتمة والوثوب كان على السلطان أن يبعث حكمين ينظران في أمرهما وإن لم يترافعا ويطلبا ذلك منه.

(۵/۲٦۳، ۲٦۴. كتاب النكاح. فصل في القسم بين الزوجات. وكذا في التاج والإكليل لمختصر خليل على هامش مواهب الجليل: ۵/۲٦۳، ۲٦۴. كتاب النكاح. فصل في القسم بين الزوجات. جواهر الإكليل شرح مختصر خليل: ۱/۳۲۸. دار الفكر. نهاية المحتاج: ٦/۳۸۵. مصطفى الحلبي. مغني المحتاج شرح المنهاج: ۳/۲٦۱. دار الفكر. كتاب الأم للشافعي: ۵/۱۹۴. دار المعرفة بيروت)

[2] ما في "الجامع لأحكام القرآن للقرطبي": ويجزئ إرسال الواحد. لأن الله سبحانه حكم في الزنا بأربعة شهود. ثم قد أرسل النبي ﷺ إلى المرأة الزانية أنيساً وحده ... وكذلك قال عبد الملك في المدونة. قلت: وإذا جاز إرسال الواحد فلو حكم الزوجان واحداً لأجزأ. وهو بالجواز أولى إذا رضيا بذلك ... فإن أرسل الزوجان حكمين وحكما نفذ حكمهما. لأن التحكيم عندنا جائز. وينفذ فعل الحكم في كل مسألة. (۵/۱۷۷، ۱۷۸)

(جامع الأحكام الفقهية للقرطبي: ۲/۲۸٦. مسألة جواز تحكيم الواحد بين الزوجين الخ. رقم المسئلة: ۱۲۲٦)

ما في "المدونة الكبرى": قلت: فإذا كان ذلك منهم إلى رجل واحد اجتمعوا عليه. هل يكون بمنزلة الحكمين لهما جميعاً؟ قال: نعم. إنما هي من أمورهما التي لو أخذها دون من يحكم فيها كان ذلك لهما جميعاً. فكذلك هي إلى من جعلاها إليه إذا كان يستأهل أن يكون ممن يجعل ذلك إليه" (۲/۲٦۷، ۲٦۸. كتاب إرخاء الستور. ما جاء في الحكمين)

ما في "الموسوعة الفقهية": اختلف الفقهاء في إقامة حكم واحد بين الزوجين في حال الشقاق. فقال المالكية: للزوجين إقامة حكم واحد من غير رفع للحاكم يكون عدلا رشيداً ذكراً فقيهاً بما بعث له ويفعل ذلك الحكم ما يفعله الحكمان من الإصلاح أو التطليق بغير مال أو بمال. (۴۰/۳۱۴. إقامة حكم واحد. نشوز)

[3] ما في "حاشية ابن عابدين": وذكر الفقيه أبو الليث في "تأسيس النظائر" أنه إذا لم يوجد في مذهب الإمام قول في مسألة يُرجع إلى مذهب مالك. لأنه أقرب المذاهب إليه" (۹/٦۵۲. قسم الأحوال الشخصية. مكتبة دار الثقافة والتراث بدمشق سوريا)۔

# شقاق بین الزوجین

ڈاکٹر شاہجہاں ندوی[1]

## تمہید:

نکاح قیامت تک نسل انسانی کی بقا کا ضامن اور خاندن کی تشکیل کی بنیاد ہے، لہٰذا انتہائی پاکیزہ، مقدس اور مضبوط و متین رشتہ ہے جو عمر بھر کے لیے ہوتا ہے، چنانچہ اس عقد کو ختم کرنے میں عجلت اور جلد بازی نہیں ہونی چاہئے، اور چھوٹی چھوٹی سی بات کو وجہ فرقت نہیں بنانا چاہئے، جیسے نکاح کے وقت دونوں کم تعلیم یافتہ تھے، لیکن مستقبل میں شوہر تو تعلیم میں آگے نہ بڑھ سکا، لیکن بیوی تعلیم میں بہت آگے بڑھ گئی، دونوں میں تعلیمی اعتبار سے کوئی نسبت نہیں رہی، ایسی صورت میں عورت کو ذہنی کرب میں مبتلا نہیں رہنا چاہئے، بلکہ سوچنا چاہئے کہ جس شوہر کے ساتھ میں اپنی زندگی کا ایک قیمتی حصہ گزار چکی ہوں، اب پوری زندگی اسی کے ساتھ گزارنا ہے اور مجھے چھوٹی چھوٹی بات کو وجہ فرقت نہیں بنانا چاہئے، چنانچہ حضرت ثوبانؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "المختلعات هن المنافقات" (سنن ترمذی حدیث نمبر: ۱۱۸۶، اور یہ "حسن لغیرہ" درجہ کی حدیث ہے)۔ (بے وجہ خلع طلب کرنے والی عورتیں عملی اعتبار سے منافق ہیں)۔ اور حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوع روایت ہے: "المنتزعات والمختلعات هن المنافقات" (مسند احمد، حدیث نمبر ۹۳۵۸، وسنن نسائی ۶ / ۱۶۸، حدیث نمبر ۳۴۶۱) (ناحق شوہر کی اطاعت سے دست کش ہونے والیاں اور بے وجہ خلع طلب کرنے والیاں درحقیقت منافق ہیں)۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''أيما امرأة سألت زوجها طلاقاً في غير بأس. فحرام عليها رائحة الجنة'' (سنن ابوداود، کتاب الطلاق، باب فی الخلع حدیث نمبر ۲۲۲۶، وسنن ترمذی کتاب الطلاق، حدیث نمبر ۱۱۸۷، ومسند احمد حدیث نمبر ۲۲۳۷۹، عن ثوبان رضی اللہ عنہ، واسنادہ صحیح) (جو عورت بے وجہ اپنے شوہر سے طلاق طلب کرے، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے)۔

ہاں البتہ اگر شوہر کی طرف سے بیوی کے جسم یا ذات کو اذیت یا تکلیف لاحق ہو یا اس کی طرف سے ایسی اذیت سے دوچار ہو، جو اسے ہلاکت کی زد میں لے آئے، اور اس طرح کی حرکت، یا فعل، یا قول یا صورت اس سے ناحق اور قصداً صادر ہو، خواہ وہ مادی ضرر ہو، جیسے ہاتھ یا ڈنڈے وغیرہ سے مارنا، اور بدن میں زخم پیدا کرنا، یا دانت کاٹ کر زخمی کر دینا یا کسی عضو کو توڑ دینا یا اس کے جسم پر گرم پانی ڈال دینا وغیرہ، یا معنوی یا نفسیاتی ضرر ہو، جو بیوی کے ذہنی کرب کا ذریعہ ہو، جیسے شوہر بیوی یا اس کے والدین کو سب وشتم کرتا ہو، یا کتے یا گدھے وغیرہ سے تشبیہ دیتا ہو، یا اس کے ساتھ گفتگو نہ کرتا ہو، یا اس کے بستر پر نہ سوتا ہو اور مرض وغیرہ وجہ شرعی کے بغیر اس سے وطی نہ کرتا ہو، یا اس کے سامنے چیخ وپکار مچاتا ہو، یا اس کی بات بالکل نہ سنتا ہو، یعنی اس کے ساتھ ردی شئ کی طرح برتاؤ کرتا ہو، تو ایسی صورت میں ضرر کی وجہ سے بیوی تفریق طلب کر سکتی ہے۔

خیال رہے کہ ضرر کی وجہ سے تفریق کے جواز میں سب سے زیادہ وسعت مالکیہ کے نزدیک ہے، دردیر مالکی تحریر کرتے ہیں ''ولها أي للزوجة التطليق على الزوج بالضرر، وهو ما لايجوز شرعاً كهجرها بلا موجب شرعي، وضربها كذلك وسبها وسب أبيها نحو: يا بنت الكلب، يا بنت الكافر، يا بنت الملعون، كما يقع كثيراً من رعاع الناس، ويؤدب على ذلك زيادة على التطليق: وكوطئها في دبرها'' (الدردير المالكي، أبو البركات أحمد بن محمد العدوي: ۱۲۰۱ھ. الشرح الكبير. فصل إنما يجب القسم للزوجات في المبيت من كتاب النكاح، ۲/۳۴۵، ط: الشاملة)۔

اور خطاب مالکی تحریر کرتے ہیں: ''ولها التطليق بالضرر قال ابن فرحون: من الضرر قطع كلامه عنها، وتحويل وجهه في الفراش عنها، وإيثار امرأة عليها وضربها ضربا مؤلما'' (الحطاب المالكي. شمس الدين. أبو عبد الله محمد بن محمد (۹۵۴ھ)

[1] ☆ استاذ حدیث وفقہ جامعہ اسلامیہ، شانتاپورم، پٹی کاڈ، مالاپورم، کیرالا

''مواهب الجليل شرح مختصر خليل، فصل في القسم بين الزوجات، من كتاب النكاح ۵/ ۲۶۵، ط: دار عالم الكتب، بيروت ۱۹۲۳ـ ۲۰۰۳م)۔
(اور ضرر کی وجہ سے بیوی کو طلاق دینے کا حق ہے، ابن فرحون کہتے ہیں: ضرر میں سے اس سے گفتگو منقطع کر لینا ہے، اور بستر پر اس سے رخ پھیر لینا ہے، اور اس پر کسی دوسری عورت کو ترجیح دینا ہے، اور اسے دردناک مار مارنا ہے)۔

اسی طرح کبھی میاں بیوی میں مخالفت، عداوت اور نزاع کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے جو انتہائی ناپسندیدہ شئ ہے اور ازدواجی رشتہ کو توڑ دینے والی ہے، اس صورت میں شریعت اسلامیہ نے اس کیفیت کے حل کے طور پر سب سے پہلے یہ کوشش کی ہے کہ حتی الامکان نزاع وشقاق کے اسباب کو ختم کرنے کے لئے احتیاطی تدبیریں اختیار کی جائیں، چنانچہ اس نے شقاق سے بچنے کی راہیں درج ذیل طریقے سے متعین کی ہیں:

## الف۔ میاں بیوی کے حقوق کی شناخت:

شریعت اسلامیہ نے اس بات کو واضح کردیا ہے کہ میاں بیوی دونوں پر ایک دوسرے کے حقوق ہیں، لہٰذا ہر فریق کو دوسرے فریق کے حقوق کی رعایت کرنی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف، وللرجال عليهن درجة'' (البقرہ: ۲۲۸) (اور ان عورتوں کے لیے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں، جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں، ہاں مردوں کے لیے ان پر ایک درجہ ترجیح کا ہے)۔

چنانچہ دونوں پر لازم ہے کہ اپنے حقوق کے ساتھ ذمہ داریوں کو بھی نبھائیں، تاکہ نزاع کے اسباب دور ہوں۔

**ب۔ بھلے طریقہ سے زندگی بسر کرنے کا حکم:** ...... برے طریقہ سے ازدواجی زندگی بسر کرنے سے نزاع کا بیج پڑتا ہے اور عورت کی نفسیات پر اس کا برا اثر ہوتا ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے شوہروں کو اچھی طرح ازدواجی زندگی بسر کرنے کا حکم دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: وعاشروهن بالمعروف'' (۴.النساء: ۱۹) (اور ان کے ساتھ معقول طریقے کا برتاؤ کرو)۔

## ج۔ عورت کو شوہر کے عظیم حقوق کی ادائیگی کی تاکید:

شریعت اسلامیہ نے عورت پر تاکید کی ہے کہ وہ شوہر کے عظیم حقوق کو پہچانے اور انہیں لازماً ادا کرے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''الرجال قوامون على النساء، بما فضل الله بعضهم على بعض'' (۴.النساء: ۳۴) (مرد عورتوں کے سرپرست ہیں، بوجہ اس کے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے)۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ''أي الناس أعظم حقا على المرأة؟ قال: زوجها. قلت: فأي الناس أعظم حقا على الرجل؟ قال: أمه'' (اخرجه الحاكم في المستدرك رقم: ۷۲۹۹، والنسائي في الكبرى رقم: ۹۱۴۸، واخرجه البزار كما في مجمع الزوائد ۴/ ۳۰۹، وإسناده صحيح)۔ (عورت پر لوگوں میں سب سے زیادہ کس کا حق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا، اس کے شوہر کا، میں نے پوچھا، سو مرد پر لوگوں میں سب سے زیادہ کس کا حق ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا، اس کی ماں کا)۔

## د۔ ناپسندیدگی کے تقاضے کو قبول نہ کرنا:

شریعت اسلامیہ نے شوہر کو خبردار کیا ہے کہ ممکن ہے کہ جس بیوی کو تم ناپسند کر رہے ہو اس کی طرف سے زبردست خیر حاصل ہو، لہٰذا ناپسندیدگی کے تقاضے کو قبول نہ کرکے اس سے متوقع خیر کے تقاضے کو قبول کرے، ارشاد الٰہی ہے: ''فإن كرهتموهن فعسى أن تكرهوا شيئا، ويجعل الله فيه خيراً كثيرا'' (۴.النساء: ۱۹) (اور اگر ان کو ناپسند کرتے ہو تو بعید نہیں کہ ایک چیز کو تم ناپسند کرو، اور اللہ (تمہارے لیے) اس میں بہت بڑی بہتری پیدا کردے)۔

اور ظاہر ہے کہ اس قیمتی ہدایت کا ایک مسلمان شوہر پر گہرا اثر ہوگا جس سے متاثر ہوکر وہ برے طریقہ سے برتاؤ کرنے سے باز رہے گا، اور شقاق کی صورت پیدا نہ ہوگی۔

**ہ۔ شوہر کے اعراض کے وقت بیوی کی صلح جوئی:** ...... اگر شوہر کی طرف سے اعراض ہو تو شقاق کے اسباب ختم کرنے اور رشتۂ ازدواج کو برقرار رکھنے کے لیے عورت کو چاہئے کہ اپنے سارے حقوق کے مطالبہ میں سختی نہ برتے، بلکہ مصالحت کے ساتھ زندگی گزارے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وإن امرأة

خافت من بعلها نشوزاً أو إعراضا، فلا جناح عليهما أن يصلحا بينهما صلحا، والصلح خير، وأحضرت الأنفس الشح. وإن تحسنوا وتتقوا، فإن الله كان بما تعملون خبيرا) (۴۔النساء: ۱۲۸) (اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بیزاری یا بے پروائی کا اندیشہ ہو، تو اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی سمجھوتا کرلیں، اور سمجھوتا ہی بہتر ہے، طبیعتوں میں حرص رچی بسی ہوئی ہے، اور اگر تم حسن سلوک کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو جو کچھ کرو گے اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے)۔

**بیوی کے اعراض کے وقت شوہر کی تدبیر:**...... اگر بیوی شوہر کی اطاعت سے نکل جائے، تو ایسی صورت میں سب سے پہلے شوہر اچھے ڈھنگ سے بیوی کو نصیحت کرے، اور نافرمانی کی صورت میں اس پر اللہ کے غضب سے ڈرائے، سو اگر یہ طریقہ مؤثر نہ ہو تو اس کی خوابگاہ چھوڑ دے، اور اگر یہ بھی مفید نہ ہو تو تادیب واصلاح کے ارادہ سے ہلکی پھلکی مار لگائے، سو ممکن ہے کہ اس تادیب سے بیوی کی اصلاح ہوجائے، اور شقاق کے اسباب ختم ہوجائیں، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''والتی تخافون نشوزهن فعظوهن واهجروهن في المضاجع، واضربوهن. فإن أطعنكم فلا تبغوا عليهن سبيلا، إن الله كان عليا كبيرا'' (۴۔النساء: ۳۴)۔

**تحکیم:**

اگر یہ احتیاطی وسائل شقاق کے پیدا نہ ہونے یا پیدا ہونے کے بعد دور کرنے میں کارگر نہ ہوں، تو پھر اصلاح کی خاطر دو حکم کو بھیجا جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها'' (۴۔النساء: ۳۵) (اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان افتراق کا اندیشہ ہو، تو ایک پنچ مرد کے لوگوں میں سے مقرر کرو، اور ایک پنچ عورت کے لوگوں میں سے، اگر دونوں اصلاح کے طالب ہوئے، تو اللہ ان کے درمیان سازگاری پیدا کردے گا، بے شک اللہ علم والا اور باخبر ہے)۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ان حکموں (پنچوں) کا سارا اختیار اصلاح حال کی کوشش ہی تک محدود ہے۔

اس تمہید کے بعد سوالات کے جوابات تحریر کئے جارہے ہیں:

**''خلع'' کی لغوی واصطلاحی تعریف:**

لغت میں ''خلع'' خاء کے ضمہ کے ساتھ اتار دینا اور زائل کرنا کے معنی میں ہے اور اصطلاح شرع میں اس مال کے بدلہ جو بیوی شوہر کو دے، مخصوص الفاظ کے ذریعہ ملکیت نکاح ختم کردینے کا نام ہے، مذاہب فقہیہ میں اس کی مختلف الفاظ میں تعریف کی گئی ہے۔

ان تمام تعریفوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ''خلع'' میاں بیوی کی باہمی رضامندی سے واقع ہونے والی فرقت ہے جو اس عوض کے بدلہ ہوتی ہے جو بیوی اپنے شوہر کو دیتی ہے، چنانچہ خلع طلاق کی طرح ہے کہ اس سے ازدواجی تعلق ختم ہوجاتا ہے، لیکن وہ طلاق سے اس بات میں مختلف ہے کہ خلع کا واقع ہونا میاں بیوی کی رضامندی اور بیوی کے اپنے شوہر کو مال دینے پر موقوف ہے، لیکن طلاق بیوی کی طرف سے عوض کے بغیر صرف شوہر کے ارادہ سے تصرف کرنے کا نام ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: تنویر الابصار مع الدر المختار باب الخلع ۵ / ۸۳ ـ ۸۷، فتح القدیر باب الخلع ۴ / ۵۸ طبع بیروت، الشرح الکبیر فصل فی الکلام علی الخلع ۲ / ۳۴۷، مغنی المحتاج کتاب الخلع ۳ / ۲۶۲، کشاف القناع کتاب الخلع ۳ / ۱۳۶)۔

۲۔ پیچھے (خلع) کی ذکر کردہ تعریفوں سے واضح ہے کہ خلع باہمی رضامندی پر موقوف ہے، اور عورت کو خلع لینے کا حق ہے، لیکن جبکہ شوہر راضی ہو، ''المبسوط'' میں ہے: ''الخلع عقد معاوضة'' (المبسوط، باب الخلع، ۶ / ۲۴۳، ط: ۱، دار الفكر، بيروت ۱۴۲۱ھ - ۲۰۰۰م)۔ خلع معاوضہ کا عقد ہے، اور ظاہر ہے کہ عقد معاوضہ باہمی رضامندی پر موقوف ہوتا ہے، اور ''البحر'' میں ''البزازیہ'' کے حوالہ سے ہے: ''ادعى الخلع على حالها، والمرأة تنكر يقع الطلاق بإقراره، والدعوى في المال على حالها، وعكسه لايقع'' (البحر الرائق باب الخلع ۴ / ۱۴۴) (شوہر نے بیوی کی حالت کے بارہ میں خلع کا دعویٰ کیا، اور عورت انکار کررہی ہے، تو اس کے اقرار کی وجہ سے طلاق پڑجائے گی، اور مال کا دعویٰ اپنی حالت پر رہے گا، اور برعکس صورت میں طلاق واقع نہیں ہوگی)۔

اگر عورت کو شوہر کی رضامندی کے بغیر خلع لینے کا حق ہوتا تو عورت کے خلع کا دعویٰ کرنے سے خلع ہوجاتا، خواہ شوہر منکر ہی کیوں نہیں ہوتا، لیکن حکم اس

طرح نہیں ہے، اس سے پتہ چلا کہ "خلع" شوہر کی رضامندی پر موقوف ہے۔

چنانچہ امام شیرازی شافعی (المہذب) میں تحریر کرتے ہیں: ''ولأنه أي الخلع رفع عقد بالتراضي'' (أبو اسحاق إبراهيم بن علی بن یوسف الشیرازی ''المهذب مع المجموع''. کتاب الخلع ١٦/٣، ط: الشاملة) (اور اس لیے کہ وہ یعنی خلع عقد کو باہمی رضامندی سے ختم کرنا ہے)۔ لہٰذا شوہر کی رضامندی کے بغیر عورت کو خلع لینے کا حق حاصل نہیں ہے، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ عورت کو شوہر کی رضامندی کے بغیر خلع لینے کا حق حاصل ہے، تو یہ بات غلط ہے۔

۳۔ اگر عورت شوہر کی جانب سے شدید حد تک متنفر و بیزار ہو، لیکن شوہر طلاق دینے پر تیار نہ ہو، اور عورت کے پاس شوہر کے ظلم و زیادتی کے سلسلہ میں بینہ فراہم نہ ہوں تو اس کی گلوخلاصی کی درج ذیل صورت ہوگی:

پہلے تو قاضی شوہر کو سمجھا بجھا کر طلاق یا خلع پر راضی کرلے، لیکن اگر کسی طرح راضی نہ ہو تو قاضی شوہر کو حکم دے کہ اسے نیک لوگوں کے درمیان رکھے، اور ان لوگوں کو ان دونوں کی خبر کی تفتیش اور ضرر کا پتہ لگانے کا مکلف کرے، اور اگر اس طریقہ سے بھی پتہ نہ لگے، تو دو حکم بھیج کر صورت حال کی تحقیق کرے، پھر ظلم ثابت ہونے پر تفریق کردے، فقہاء مالکیہ نے اس پر تفصیلی کلام کیا ہے (دیکھئے: التاج والإکلیل لمختصر خلیل، کتاب القسم والنشوز ۲۹۷/۵، ط: الشاملة)۔

اور اگر حکم کے ذریعہ تحقیق حال ہوجائے اور شوہر کی جانب سے ضرر ثابت ہوجائے اور عورت تفریق کی طالب ہو تو قاضی تفریق کردے، اور اس صورت میں تفریق کے مطالبہ کے لیے راجح قول کے مطابق ضرر کا مکرر ہونا بھی شرط نہیں ہے، بلکہ ایک مرتبہ ہونا بھی کافی ہے، "مختصر خلیل" اور اس کی شرح "الشرح الکبیر" میں ہے: ''ولها التطليق على الزوج بالضرر. ولو لم تشهد البينة بتكرره'' (الشرح الكبير فصل إنما يجب القسم للزوجات في المبيت ٣٤٥/٢)۔

اور دسوقی مالکی نے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "مصنف کا قول: اگرچہ گواہ اس کے مکرر ہونے کی گواہی نہ دیں، بلکہ اس بات کی گواہی دیں کہ ضرر ایک مرتبہ واقع ہوا ہے، تو عورت مشہور قول کے مطابق طلاق لے سکتی ہے" (حاشیۃ الدسوقی، فصل إنما یجب القسم ...... الکلام علی أحکام النشوز ۳۴۵/۲)۔

خلاصہ یہ کہ شوہر بیوی کو تکلیف دہ باتیں کہہ کر ذہنی ایذاء پہنچائے، اور بیوی ذہنی و جسمانی ایذاء رسانی کی شکایت کرے اور تفریق کا مطالبہ کرے، تو قاضی شوہر کے اقرار یا محل واقعہ پر موجود دو مرد گواہوں کے ذریعہ یا کم سے کم دو ایسے مرد گواہوں کی گواہی پر جنہوں نے ذہنی ایذاء رسانی یا جسمانی ایذاء رسانی کی بات شہرت یعنی متعدد مردوں اور عورتوں سے سن رکھی ہو، اور گواہی شبہ سے محفوظ ہو یعنی سننے والے وہاں کی زبان اچھی طرح سمجھتے ہوں، اور دعوی کرنے والی عورت گواہوں کی گواہی کے ساتھ قسم بھی کھائے، تفریق کردے، اور اگر معاملہ مبہم ہو تو قاضی حکمین کے ذریعہ تحقیق کرائے اور شوہر کی جانب سے ضرر کا پتہ لگنے پر تفریق کردے۔

ذکر کردہ شرائط کے ساتھ تفریق مالکیہ کا راجح مسلک ہے (دیکھئے: "الشرح الکبیر" باب الشہادات، مراتب الشہادۃ ۲۸۱/۴)۔ جبکہ میرے نزدیک اگر صرف صالح عورتیں اور خادمائیں جن کا عورت کے پاس بکثرت آنا جانا ہو، ضرر کی گواہی دیں، تو معتبر ہے (مواہب الجلیل، کتاب الطلاق، باب فی الطلاق ۲۹۴/۵)۔

زین الہندی کا قول ہے کہ اگر نیک عورتیں اور خادمائیں جو عورت کے پاس بکثرت آتی جاتی ہوں، گواہی دیں، تو جائز ہے۔

## ۴۔ شقاق کی لغوی اور اصطلاحی تعریف:

"شقاق" باب مفاعلت سے ہے، اس کے لغوی معنی: "سخت دشمنی اور مخالفت" کے ہیں، بولا جاتا ہے ''شاقه مشاقة وشقاقا. أي خالفه مخالفة'' (یعنی اس نے اس کی مخالفت کی)، اور شقاق دو فریق کی دشمنی اور دو فرد کی مخالفت کو بھی کہتے ہیں (لسان العرب ۱۱۲/۸، مفردات غریب القرآن للأصفہانی ص: ۲۶۴)۔

اور اس کی اصل شق سے ماخوذ ہے، جس کے معنی گوشہ اور کنارہ کے ہیں، سو گویا ہر فریق اپنے مخالف فریق کے گوشہ سے ہٹ کر دوسرے کنارہ میں چلا جاتا ہے، یا شق العصا بینهم (ان کے درمیان انتشار پیدا کرنا) سے ماخوذ ہے، اس صورت میں اس کا مفہوم ہوگا "باہمی انتشار میں پڑ جانا" اور باہم دشمنی کرنا "مجازی معنی" ہوں گے (لسان العرب ۱۱۲/۸)۔

### مفسرین کے نزدیک "شقاق" سے مراد:

اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وإن خفتم شقاق بينهما، فابعثوا حكماً من أهله وحكما من أهلها إن يريدا إصلاحاً يوفق الله" میں شقاق سے کیا مراد ہے؟

اس سلسلہ میں ابوجعفر محمد بن جریر طبری (ت: ۳۱۰ھ) رقم طراز ہیں: "وذلك مشاقة كل واحد منهما صاحبه. وهو إتيانه ما يشق عليه من الأمور. فأما من المرأة، فالنشوز وتركها أداء حق الله عليها. الذى ألزمها الله لزوجها. وأما من الزوج. فتركه إمساكها بالمعروف، أو تسريحها بإحسان و "الشقاق" مصدر من قول القائل: "شاق فلان فلانا" إذا أتى كل واحد منهما إلى صاحبه ما يشق عليه من الأمور. "فهو يشاقه مشاقة وشقاقا" وذلك قد يكون عداوة" (جامع البيان فى تأويل القرآن ۴۷/۴، ط: ۱، دار الكتب العلمية. بيروت) (اور یہ دونوں میں سے ہر ایک کا اپنے ساتھی کی مخالفت کرنا ہے، اور وہ اس کا ایسی چیز کا ارتکاب کرنا ہے جو دوسرے پر شاق گزرے، سو بہر حال عورت کی طرف سے تو وہ عدم اطاعت اور اللہ تعالیٰ نے اس کے شوہر کے لیے اس پر اپنے جس حق کی ادائیگی لازم کی ہے، اسے ترک کرنا ہے، اور بہر حال شوہر کی جانب سے تو وہ اس کا بھلے طریقہ سے اس کو رکھنے یا بھلائی کے ساتھ اسے علیحدہ کرنے کو چھوڑنا ہے، اور "شقاق" ہے جبکہ دونوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے حق میں ایسی چیز کا ارتکاب کرے، جو اس پر دشوار گزرے، اور مضارع کی صورت میں "يشاقه وشقاقا" (وہ اس کے حق میں دشوار چیز کا ارتکاب کر رہا ہے) بولتے ہیں، اور یہ کبھی عداوت کی بنا پر بھی ہوتا ہے)۔

اور امام رازی تحریر کرتے ہیں: "شقاق کی دو تاویلیں ہیں: ان دونوں میں سے ایک یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک ایسی چیز کا ارتکاب کرے جو اس کے ساتھی کو شاق گزرے، اور دوم یہ کہ دونوں میں سے ہر ایک دشمنی اور باہمی جدائی کے ذریعہ ایک کنارہ میں ہو جائیں" (مفاتيح الغيب ۷۳/۴، ط: ۱، دار إحياء التراث العربي، بيروت ۱۴۱۵ھ - ۱۹۹۵م)۔

خلاصہ یہ کہ شقاق کا مقصود یہ ہے کہ میاں بیوی میں سے ہر ایک وہ کام کرے جو دوسرے کو دشوار گزرے، یا دونوں میں سے ہر ایک دشمنی اور باہمی دوری وجدائی کے ذریعہ مخالف گوشہ میں ہو جائیں، اور یہ دونوں معنی باہم لازم وملزوم ہیں، کیونکہ ہر ایک کا ایسا کام کرنا جو دوسرے کے لیے شاق ہو، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں میں سے ہر ایک دشمنی اور جدائی کی مقدار میں اختلاف کے باوجود، دشمنی اور جدائی کے سبب مخالف گوشہ میں ہو جائیں گے اور مخالف پہلو اختیار کریں گے۔

## شقاق کے تحقیق میں اشتراک:

شقاق باب مفاعلت کا مصدر ہے، اور مفاعلت کی خاصیت "اشتراک" ہے، جیسے مقاتلۃ (باہم لڑائی کرنا) "منازعۃ" (باہم جھگڑا کرنا) لیکن کبھی مفاعلت فرد واحد کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے، گویا اشتراک اس کی لازمی صفت نہیں ہے، جیسے عاقبت اللص (میں نے چور کو سزا دی) اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: "يخادعون الله" (۲. البقرة: ۹) (لوگ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں)۔

چنانچہ "شقاق" کے تحقق میں اشتراک کی ضرورت نہیں ہے، لیکن قرآن کریم نے "بينهما" (دونوں کے درمیان مخالفت پیدا ہو جائے) کا استعمال عرف وعادت کے پیش نظر کیا ہے کہ ایک شخص جب دشمنی کا رویہ اپناتا ہے، تو دوسرا شخص یا فریق خود بخود اس کا مخالف رویہ اپنانے لگتا ہے، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں یہ استعمال بکثرت پایا جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: "فإن تولوا فإنما هم في شقاق" (۲. البقرة: ۱۳۷) (اور اگر وہ اعراض کریں، تو پھر وہ درپے مخالفت ہیں)۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اشتراک کا تصور ناممکن ہے۔

**شقاق کا حقیقی مطلب اور صحیح مراد:**...... خلاصہ یہ کہ شقاق سے مراد یہ ہے کہ میاں بیوی باہم یا کوئی ایک دوسرے سے سخت متنفر ہو جائے، اور ان کے درمیان باہمی محبت اور الفت کی فضا ختم ہو کر دشمنی اور مخالفت کی فضا قائم ہو جائے۔

## شقاق کی وجہ سے زوجین کے درمیان تفریق:

میاں بیوی کے درمیان شقاق پیدا ہو جانے کی وجہ سے قاضی یا اس کے مقرر کردہ حکم اصلاح کی کوشش ناکام ہونے کے بعد تفریق کرنے کا اختیار رکھتے ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں دو مختلف فقہی رائیں ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۱- حنفیہ، ظاہریہ، راجح قول کے مطابق شافعیہ، عطاء اور حسن بصری کا مسلک یہ ہے کہ شوہر کے طلاق دینے اور بیوی کے خلع کرنے کی اجازت کے بغیر قاضی

یا حکم کو تفریق کا اختیار نہیں ہے، اور یہی امام احمد بن حنبل کی ایک روایت ہے جو حنابلہ کے نزدیک راجح ہے اور یہی جعفریہ کا مسلک ہے، امام جصاص رازی تحریر کرتے ہیں:

''دونوں حکم کو اختیار نہیں کہ زوجین کے درمیان تفریق کردے، مگر یہ کہ شوہر راضی ہو، اور ایسا اس وجہ سے ہے کہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ شوہر اگر بیوی کے ساتھ بدسلوکی کا اقرار کرے، تو ان دونوں کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی، اور حاکم اس کو اسے طلاق دینے پر دو حکم بھیجنے سے پہلے مجبور نہیں کرے گا، اور ایسے ہی اگر بیوی شوہر کی نافرمانی کا اقرار کرے تو حاکم اسے خلع اور اپنے مہر واپس کرنے پر مجبور نہیں کرے گا، سو جب دو حکم بھیجنے سے پہلے ان دونوں کا ایسا حکم ہے، تو ایسا ہی حکم دو حکم بھیجنے کے بعد ہوگا، اور ان دونوں کی طرف سے شوہر کی رضامندی اور اس کے وکیل بنانے کے بغیر طلاق واقع کرنا، اور عورت کی رضامندی کے بغیر اس کی ملکیت سے مہر نکالنا جائز نہ ہوگا، سو اسی وجہ سے ہمارے علماء احناف نے کہا ہے کہ دونوں حکم کو اختیار نہیں کہ میاں بیوی کی رضامندی کے بغیر تفریق کرڈالیں، اگر خلع کے طور پر تفریق ہو، اس لیے کہ حاکم کو اس کا اختیار نہیں ہے، تو دونوں حکم کو کیسے اختیار ہوگا؟ اور دونوں حکم تو بس میاں بیوی کے وکیل ہیں، ایک عورت کا وکیل ہے، اور دوسرا خلع یا بیوی کی طرف سے مال ادا کئے بغیر تفریق کرنے میں شوہر کا وکیل ہے، اگر شوہر نے اپنے وکیل کو اس کا اختیار دیا ہو'' (أحکام القرآن، سورۃ النساء، باب الحکمین کیف یعملان ۲/۲۳۹-۲۴۰، ط: ۲، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۲۰۰۳م-۱۴۲۴ھ)۔

اور ابن قدامہ مقدسی تحریر کرتے ہیں: ''البضع حقه، والمال حقها، وهما رشيدان، فلايجوز لغيرهما التصرف فيه إلا بوكالة منهما أو ولاية عليهما'' (أبومحمد عبد الله بن أحمد بن محمد بن قدامة المقدسي (۶۲۰ھ) المغني كتاب الخلع. مسألة: والزوجان إذا وقعت بينهما العداوة ۷،۴۹، ط: عالم الكتب. بيروت)۔ اس لیے کہ نکاح اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے شوہر کے حقوق جیسے جماع وغیرہ شوہر کا حق ہے، اور مال بیوی کا حق ہے، اور وہ دونوں صاحب رشد اور سمجھدار ہیں، لہٰذا ان دونوں کے علاوہ کے لیے اس حق میں ان کی وکالت یا ان پر ولایت کے بغیر تصرف کرنا جائز نہیں ہے۔

اور ابن حزم ظاہری تحریر کرتے ہیں: ''ليس في الآية ''وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكماً من أهله وحكما من أهلها ...''، ولا في شئ من السنن أن للحكمين أن يفرقا، ولا أن ذلك للحاكم. وقال عزوجل: ''ولا تكسب كل نفس إلا عليها'' فصح أنه لايجوز أن يطلق أحد على أحد، ولا أن يفرق بين رجل وامرأته. إلا حيث جاء النص بوجوب فسخ النكاح فقط'' (الإمام أبومحمد علي بن أحمد بن سعيد بن حزم الأندلسي ''المحلى بالآثار''. كتاب النكاح. مسألة: وإذا شجر بين الرجل وامرأته ۹،۲۴۸، ط: دار الكتب العلمية. بيروت) (نہ ہی آیت ''اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت رشتہ داروں میں سے مقرر کرو''، اور نہ ہی احادیث میں سے کسی حدیث میں ہے کہ دونوں حکم کو اختیار ہے کہ وہ تفریق کردیں، اور نہ ہی یہ بات ہے کہ اس کا اختیار حاکم کو ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور ہر جان جو کمائی کرتی ہے وہ اسی کے کھاتے میں پڑتی ہے'' سو یہ بات صحیح ہے کہ جائز نہیں ہے کہ کوئی کسی کے حق میں طلاق دے، اور یہ کہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کردے، مگر صرف اسی جگہ جہاں فسخ نکاح کے وجوب کے ساتھ نص وارد ہو)۔

اور امام نووی تحریر کرتے ہیں: ''پھر دونوں بھیجے گئے حکم میاں بیوی کے وکیل ہیں، یا حاکم کی طرف سے مقرر کردہ حاکم ہیں؟ اس میں دو قول ہیں، ان دونوں میں سے زیادہ راجح یہ ہے کہ وہ دونوں وکیل ہیں، چنانچہ اس قول کی بنیاد پر شوہر اپنے حکم کو اپنے حق میں طلاق دینے اور خلع قبول کرنے کا وکیل بنادے، اور عورت اپنے حکم کو عوض ادا کرنے اور طلاق قبول کرنے کا وکیل بنادے، اور ان دونوں حکم کو میاں بیوی کی رضامندی کے بغیر بھیجنا جائز نہیں ہے، تو اگر وہ دونوں راضی نہ ہوں، اور کسی چیز پر اتفاق نہ کریں، تو قاضی ظالم کی تعزیر کرے، اور مظلوم کا حق وصول کرے'' (روضۃ الطالبین، کتاب عشرۃ النساء، الباب الثانی: فی الشقاق بین الزوجین ۳/۷/۷، ط: ۳، المکتب ال اسلامی، بیروت)۔

''اللہ تعالیٰ نے تفریق کا ذکر نہیں کیا...... سو اگر دونوں حکم میاں بیوی کے اجتماع کو بہتر سمجھیں، تو فراق کی طرف رجوع نہ کریں، اور اگر دونوں فراق کو بہتر سمجھیں تو میاں بیوی کو حکم دیں سو وہ اسے اختیار کرلیں...... اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے طلاق کا اختیار شوہروں کو دیا ہے، لہٰذا ان کے علاوہ دوسرے کو یہ اختیار نہ ہوگا، اور حاکم میاں بیوی کی رضامندی کے بغیر طلاق، فرقت اور خلع کا اختیار نہیں رکھتا ہے، جیسا کہ ''الحاوی الکبیر'' میں ہے'' (المجموع، باب النشوز من کتاب النکاح، فصل:

الحکمان ۱۸/۱۳۱-۱۳۲، ط: دارالفکر، بیروت ۱۴۲۵-۱۴۲۶ھ-۲۰۰۵م)۔

اس رائے کے دلائل...... اس رائے کی دلیلیں پیچھے ذکر کردہ تحریروں کے ضمن میں گزر چکی ہیں۔

**دوسری رائے:**...... قاضی اور اسی طرح دونوں حکم میاں بیوی کی اجازت اور موافقت کے بغیر ان کے درمیان تفریق کا اختیار رکھتے ہیں، یہ مالک، اوزاعی، اسحاق اور ابن المنذر کا مسلک ہے، اور امام احمد بن حنبل سے یہی دوسری روایت ہے، اور شافعیہ کے نزدیک یہی دوسرا مرجوح قول ہے، اور یہی حضرت علی، ابن عباس رضی اللہ عنہم۔ اور ابوسلمہ بن عبدالرحمن، شعبی، نخعی اور سعید بن جبیر سے مروی ہے۔

## دوسری رائے کے ادلہ:

۱۔ دونوں حکم کی صفت حاکم ہونے کی ہے، لہٰذا وہ میاں بیوی کے وکیل نہیں، اور جب وہ حاکم ہیں تو انہیں دونوں کے درمیان اصلاح کا اختیار ہے، اسی طرح معاوضہ یا بلا معاوضہ تفریق کا بھی اختیار ہوگا، اور اس تفریق کو واقع کرنے کے سلسلہ میں میاں بیوی کے وکیل بنانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس لیے کہ ارشاد الٰہی ہے: ''فابعثوا حکماً من أھله وحکماً من أھلھا'' (۴. النساء: ۳۵)۔ (تو ایک تصفیہ کرنے والا مرد کے خاندان سے اور ایک تصفیہ کرنے والا عورت کے خاندان سے بھیج دو)، سو اللہ تعالیٰ نے دونوں کو حکم قرار دیا، اور اس میں میاں بیوی کی رضامندی کا اعتبار نہیں کیا ہے (المغنی ۷/۴۹)۔

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے مقرر کردہ حکم سے فرمایا: ''علیکما من الحق إن رأیتما أن تجمعا جمعتما. وإن رأیتما أن تفرقا. فرقتما'' (تم دونوں پر جو حق اور ذمہ داری عائد ہے وہ یہ ہے کہ اگر تم دونوں کی رائے میاں بیوی کو یکجا رکھنے کی ہو، تو ان کو یکجا رکھو، اور اگر تم دونوں کی رائے تفریق کی ہو تو ان کے درمیان تفریق کردینا) اس پر عورت رضامند ہوگئی، لیکن مرد فرقت واقع کرنے پر راضی نہیں ہوا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا ''کذبت حتی ترضی بما رضیت به'' (تم غلط کہہ رہے ہو، یہاں تک کہ تم بھی اس بات پر راضی ہوجاؤ جس پر عورت راضی ہوئی) (اخرجہ النسائی فی السنن الکبری رقم: ۴۶۶۱، وسعید بن منصور فی سننہ رقم ۶۲۸)۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تفریق پر مرد کو مجبور کیا، اگر حکم کو اس کا اختیار نہ ہوتا تو آپ شوہر کو تفریق قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتے۔

۳۔ جس طرح سمجھدار آدمی اگر دین و قرض ادا کرنے سے باز آجائے، تو قاضی جبراً اس کے مال سے ادا کرائے گا، اور جس طرح ایلاء کی صورت میں مرد پر طلاق واجب ہونے کے بعد بھی اگر وہ طلاق نہ دے تو حاکم طلاق دیدے گا، اسی طرح حکمین کو میاں بیوی پر فرقت واقع کرنے کا اختیار ہوگا، جبکہ اسی میں مصلحت ہو، سو گویا سمجھدار اور صاحب رشد پر ولایت کا ثبوت ممکن ہے (المغنی: ۷/۴۹)۔

۴۔ دونوں حکم حاکم ہیں، اور وکیل نہیں ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''فابعثوا حکما من أھله وحکما من أھلھا'' (تو ایک فیصل مرد کے خاندان سے اور ایک فیصل عورت کے خاندان سے بھیج دو) جبکہ اسلامی شریعت میں ''وکیل'' کے لیے خاص لفظ اور معنی ہے، اور ''حکم'' کے لیے خاص لفظ اور معنی ہے، لہٰذا کسی کے لیے یہ بات درست نہیں ہے کہ وہ ایک کے معنی کو دوسرے پر جڑ دے، اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ دونوں حکم حاکم اور فیصلہ کرنے والے ہیں، تو ان دونوں کو اپنے اجتہاد کے مطابق میاں بیوی کی حالت کا پتہ چلنے کی صورت میں مصلحت اگر یکجا رکھنے میں ہو تو ان کو یکجا رکھنے کا اختیار ہوگا، اور اگر مصلحت تفریق کرنے میں ہو تو تفریق کا بھی اختیار ہوگا (ابن العربی، ابوبکر محمد بن عبداللہ، احکام القرآن ۱/۵۳۹-۵۴۰، ط: ۱، دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۰۸ھ-۱۹۹۰)۔

## مناقشہ وترجیح:

فریقین کے دلائل پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ راجح قول یہ ہے کہ ''حکمین'' کو تفریق کا اختیار نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ''ثالث'' یا ''پنچ'' کو حکم یعنی فیصلہ کرنے والا اس اعتبار سے قرار دیا ہے کہ میاں بیوی کی بات سن کر وہ دونوں کبھی شوہر پر حکم لگائیں گے کہ یہاں پر غلطی آپ کی ہے، اور کبھی بیوی پر حکم لگائیں گے کہ یہاں پر زیادتی آپ کی طرف سے ہے، اور اس لفظ سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ دونوں حکم تفریق کا بھی فیصلہ کرنے والے ہیں، اس لیے کہ آگے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حکمین کے اندر نیک نیتی، غیر جانبداری، خیر خواہی اور اصلاح احوال کی تڑپ ہوگی، تو اللہ تعالیٰ زوجین میں موافقت پیدا کردے گا، چنانچہ اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے شوہر کو اصلاح حال کی ہدایت فرمائی ہے، اور اس آیت میں حکام کو ہدایت فرمائی ہے کہ نکاح کے مقدس رشتہ کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کریں، اور اس رشتہ کو کمزور کرنے میں کس کا ہاتھ ہے اس کی تحقیق کے لیے حکمین بھیجیں، لہٰذا یہ مفہوم مخالف سے

استدلال نہیں ہے، اور نہ ہی آیت کا آخری ٹکڑا پہلے ٹکڑے سے متعارض ہے، بلکہ یہ سباق وسیاق کی روشنی میں آیت کا مفہوم متعین کرنا ہے کہ اگر میاں بیوی اصلاح کے طالب ہوئے اور حکمین کے اس فیصلہ کو قبول کیا کہ غلطی کس کی ہے، تو اللہ تعالیٰ موافقت پیدا کر دے گا، اور اگر اپنی ضد پر جمے رہیں، تو حکمین قاضی کو صورت حال سے مطلع کر دیں۔

اسی طرح حضرت علی نے فریقین کو رضامند کرنے کی کوشش کی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اصلاً حکمین بااختیار نہیں ہوتے ہیں، البتہ اگر میاں بیوی ان کو مختار کر دیں تو بااختیار ہو جائیں گے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان حکموں کا اختیار تمام تر اصلاح حال کی کوشش ہی تک محدود ہے، "وإن یریدا" کی ضمیر "زوجین" کی طرف لوٹنا زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے اندر اصلاح احوال کی تڑپ ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہے گی، اور آیت میں حکمین بھیجنے کی ذمہ داری حکام وامراء کی ہے، لہٰذا فیصلہ بھی ان ہی کے اختیار میں ہوگا، ہاں وہ اگر حکمین کو فیصلہ کا اختیار سپرد کر دیں، تو پھر ان کا فیصلہ نافذ ہوگا جیسا کہ حضرت علی کے اثر میں مذکور ہے، لہٰذا حضرت علی کے اثر سے استدلال اس لیے درست نہیں ہے کہ حاکم اگر حکمین کو فیصلہ کا اختیار تفویض کر دے تو ان کا فیصلہ معتبر ہے، اور دیگر اثر میں بھی یہی تفویض حکم ہے۔

اور اگر حاکم "حکمین" کو تفویض حکم نہ کرے، تو ایسی صورت میں ان کا اختیار تمام تر اصلاح حال کی کوشش ہی تک محدود رہے گا۔

ہاں البتہ اصلاح حال کی یہ کوشش ناکام ہو جائے، اور اصلاح کی تمام ممکنہ تدبیریں اختیار کر چکنے کے بعد بھی یہ ثابت ہو جائے کہ اب اس رشتہ کا جڑا رہنا ناممکن یا مزید فساد کا باعث ہے تو ایسی صورت میں اگر عورت کی غلطی ہو تو قاضی خلع کا فیصلہ کر دے، اور اگر ظلم وزیادتی مرد کی جانب سے ہو تو طلاق کا فیصلہ کر دے، کیونکہ قاضی کو خصوصی اختیار حاصل ہے، اور ظلم کو دور کرنا، اس کا فریضۂ منصبی ہے، تو جب یہ ثابت ہو جائے کہ زوجین کے درمیان پرسکون زندگی مشکل ہے تو اسے اپنے خصوصی اختیار کے تحت اسے ختم کر دینا چاہئے، اس لیے کہ نکاح کا مقصد اتفاق باہمی الفت اور حسن معاشرت ہے تو جب مقصد فوت ہو جائے تو اب فرقت ہی میں مصلحت ہے اور ایسی صورت میں مالی معاملہ کی طرح ظالم کو تنبیہ کرنا اور مظلوم کا حق وصول کرنا اور دوسرے فریق کو حقوق کی ادائیگی کا حکم دینا کافی نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ "حکمین" کو رپورٹ دینی چاہئے، تاکہ قاضی اس کی روشنی میں فیصلہ کر سکے، ہاں اگر قاضی "حکمین" کو اصلاح اور تفریق دونوں کا اختیار دے کر تحقیق حال کے لیے روانہ کرے، تو ایسی صورت میں حکمین طلاق یا خلع کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

اور اگر کہیں شرعی قاضی نہ ہو تو شرعی پنچایت جس میں احکام شریعت سے واقف کم از کم دو عالم دین ہوں، پوری تحقیق کے بعد خلع یا طلاق کا فیصلہ لے سکتی ہے۔

اور اگر "حکمین" کی رپورٹ میں اختلاف ہو، تو ایسی حالت میں قاضی دو دوسرے حکم مقرر کر دے، تاکہ متفقہ رپورٹ کے بعد قاضی کو صحیح فیصلہ لینے میں آسانی ہو، ابن قدامہ تحریر کرتے ہیں:

> "اور اگر ایک رائے پر دونوں کا اتفاق مشکل ہو جائے، تو ظاہر یہ ہے کہ حاکم ان دونوں کے علاوہ دو حکم اختیار کرے جو میاں بیوی کے شقاق پر غور کریں اور بالاتفاق اپنا فیصلہ صادر کریں کہ وہ فیصلہ میاں بیوی پر نافذ ہو جائے، خواہ وہ دونوں راضی ہوں یا انکار کریں" (المغنی ۷/۵۰)۔

اور دونوں حکم کو چاہئے کہ تنہائی میں میاں بیوی سے شقاق کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کریں چنانچہ بیوی کے خاندان کا حکم اگر محرم ہو یعنی عورت کا چچا یا دادا ہو تو تنہائی میں اس سے حقائق جاننے کی کوشش کرے اور اگر نامحرم ہو تو عورت کی ماں یا اس کے تمیز دار بھائی کی موجودگی میں اسباب معلوم کرے، اسی طرح شوہر کے خاندان کا حکم تنہائی میں اس سے مخاصمت کے اسباب کا پتہ لگائے، پھر دونوں حکم یکجا ہو کر ایک دوسرے کو پوری روداد سنائیں اور غلطی کس کی ہے اس کا جائزہ لیں پھر اپنی متفقہ رپورٹ تیار کریں یا مالکیہ کے مسلک کے مطابق فیصلہ لیں اور حاکم بغیر کسی ردوبدل کے اسے نافذ کر دے (حاشیۃ الصاوی ۱/۴۴۰)۔

## کیفیت تفریق:

اگر شوہر کی زیادتی ہو تو قاضی ایک طلاق بائن کا فیصلہ کرے، اور اگر بیوی کی زیادتی ہو تو قاضی خلع کا فیصلہ کرے، یا اگر مناسب سمجھے تو شوہر کو صبر کرنے کا حکم دے، اور یہ کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دے، بلکہ حسن سلوک کا مظاہرہ کرے، اور اگر میاں بیوی میں سے ہر ایک کی طرف سے زیادتی ہو تو اس حالت میں بلا خلع طلاق کا فیصلہ لے، جبکہ بیوی شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو اور جدائی پر مصر ہو، یہی اکثر مالکیہ کا مسلک ہے، جبکہ بعض مالکیہ کے نزدیک اس حالت میں تھوڑے سے مال کے ذریعہ خلع کی گنجائش ہے، جس تھوڑے سے مال کو عورت شوہر کو دے۔

میرے نزدیک تفریق کا یہ اختیار صرف قاضی کو ہے، اور حکمین کو صرف اس صورت میں ہے جبکہ یہ اختیار قاضی ان کو تفویض کردے، جبکہ فقہاء مالکیہ کے نزدیک جیسا کہ گزرا۔ یہ اختیار حکمین کو ہے، اور ان کا فیصلہ ظاہراً وباطناً نافذ ہے، خواہ میاں بیوی اس پر راضی ہوں یا نہ ہوں، یا خود قاضی راضی ہو یا نہ ہو، حاکم پر ہر حالت میں حکمین کا متفقہ فیصلہ کرنا لازم ہے، وہ اس پر کوئی تنقید یا تبصرہ یا کمی یا زیادتی نہیں کرسکتا ہے (الصاوی المالکی احمد بن محمد" حاشیۃ الصاوی" أحکام النشوز، بعث حکمین من أہل الزوجین ۱/۴۴۰، ط: مصطفی البابی بمصر ۱۳۷۲ھ)۔

**نوعیت تفریق:** ...... شقاق کی وجہ سے واقع ہونے والی فرقت طلاق بائن ہوگی، فقیہ ابن عربی مالکی اس کی علت یہ تحریر کرتے ہیں: ''إذا حکما بالفراق فإنہ بائن لوجہین: أحدہما: کلی والآخر: معنوی، أما الکلی، فکل طلاق ینفذہ الحاکم فإنہ بائن. والثانی: أن المعنی الذی لأجلہ وقع الطلاق ہو الشقاق، ولو شرعت فیہ الرجعۃ لعاد الشقاق کما کان. فلم یکن إیقاعہ رجعیا یفید شیئا. فامتنع وقوعہ رجعیا من أجل ذلک'' (ابن العربی أحکام القرآن ۱/۵۴۲) (اگر حکمین جدائی کا فیصلہ کریں، تو یہ دو وجہوں سے بائن ہوگی، ان دونوں وجہوں میں سے ایک وجہ "کلی" ہے اور دوسری وجہ "معنوی" ہے، بہر حال کلی وجہ تو وہ یہ ہے کہ ہر طلاق جسے حاکم نافذ کرے، وہ بائن ہوتی ہے اور دوسری معنوی وجہ یہ ہے کہ جس سبب کی وجہ سے طلاق واقع ہوئی ہے، وہ شقاق ہے، اور اگر اس میں رجعت مشروع قرار دیا جائے تو شقاق کی کیفیت جس طرح تھی لوٹ آئے گی، لہٰذا اس کا رجعی واقع کرنا کچھ مفید نہ ہوگا، سو اس سبب سے اس کا رجعی واقع ہونا ممتنع ہوگیا)۔

## حکمین کی تقرری:

مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک شقاق پیدا ہونے کی صورت میں حکمین کو بھیجنا واجب ہے، ابن عربی مالکی تحریر کرتے ہیں: ''إذا علم الإمام من حال الزوجین الشقاق لزمہ أن یبعث إلیہما حکمین، ولاینتظر ارتفاعہا، لأن مایضیع من حقوق اللہ أثناء ما ینتظر رفعہما إلیہ لاجبر لہ'' (أحکام القرآن ۱/۵۴۳) (جب امام کو میاں بیوی کی حالت کے بارے میں شقاق کا علم ہو تو اس پر لازم ہے کہ ان کی طرف دو حکم بھیجے، اور عدالت میں ان کے معاملہ لانے کا انتظار نہ کرے، اس لیے کہ ان کے معاملہ لانے کے انتظار کے دوران اللہ تعالی کے حقوق سے جو ضائع ہوجائیں گے، اس کی تلافی نہیں ہوسکتی ہے)۔

اور شیخ محمد شربینی الخطیب الشافعی تحریر کرتے ہیں: ''الاستحباب لنقل البحر لہ عن نص الشافعی. وقال الأذرعی: بل ظاہر نص الأم الوجوب''۔ (اور حکمین کا بھیجنا واجب ہے، جیسا کہ زیادۃ روضۃ الطالبین میں اس کی تصحیح کی ہے، اور ماوردی نے اسی پر جزم کیا ہے، اگرچہ اہم کتابوں میں استحقاق کی البحر کے اسے امام شافعی کی نص سے نقل کرنے کی وجہ سے تصحیح کی ہے، اور أذرعی نے کہا ہے کہ بلکہ "کتاب الأم" کی نص سے بہ ظاہر وجوب نکلتا ہے" (مغنی المحتاج، کتاب القسم والنشوز، فصل: فی حکم الشقاق بالتعدی ۳/۲۶۱، ط: دار إحیاء التراث العربی، بیروت)۔

اور ابن حجر ہیتمی شافعی تحریر کرتے ہیں: "قاضی بطور وجوب حکم بھیجے، اور اس سلسلہ میں نزاع مسترد ہے، اس وجہ سے کہ یہ ظلم کی شکایت کو دور کرنے کے باب سے ہے، اور یہ قاضی پر عمومی اور مؤکد فرائض میں سے ہے" (تحفۃ المحتاج بشرح المنہاج، کتاب القسم، فصل فی بعض أحکام النشوز ۳/۳۱۵، ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۴۲۱ھ-۲۰۰۱م)۔

اور حنابلہ کے یہاں بھی بہ ظاہر وجوب معلوم ہوتا ہے۔ احناف کے یہاں بھی بہ ظاہر مرافعہ کے بعد حاکم پر حکمین کا بھیجنا واجب ہے، چنانچہ جصاص رازی تحریر کرتے ہیں: "پھر جب میاں بیوی میں اختلاف پیدا ہوجائے اور شوہر بیوی کی نافرمانی کا دعوی کرے، اور بیوی شوہر پر اس کے ظلم اور اس کے حقوق میں کوتاہی کا دعوی کرے، تو اس وقت حاکم مرد کے خاندان سے ایک پنچ اور عورت کے خاندان سے ایک پنچ بھیج دے تاکہ وہ دونوں ان کے درمیان کے احوال وواقعات پر غور وفکر کریں، اور ان کی صورت حال اور معاملات سے جس چیز پر واقف ہوں حاکم کو اس کی اطلاع دیں" (الجصاص الرازی أحکام القرآن ۲/۲۳۹)۔

امام جصاص نے بھیجنے کے وجوب یا استحباب سے تعرض نہیں کیا ہے بلکہ اس بات کی وضاحت کی ہے کہ قاضی مرافعہ کے بعد خواہ زوجین کی طرف سے ہو یا کسی ایک کی طرف سے شقاق کے موضوع میں مداخلت کرے گا، لیکن چونکہ ظلم دور کرنا قاضی کے واجبات میں سے ہے لہٰذا یہ بھیجنا واجب ہوگا، ہاں البتہ میاں بیوی کے خاندان والوں کا خود سے حکمین بھیجنا مستحب ہوگا، جیسا کہ رد المحتار میں ہے: ''السنۃ إذا وقع بین الزوجین اختلاف أن یجتمع أہلہما لیصلحوا بینہما، فإن لم یصطلحا جاز الطلاق والخلع'' (رد المحتار کتاب الطلاق، باب الخلع ۵/۸۰-۸۱) (سنت یہ ہے

کہ جب زوجین کے درمیان اختلاف واقع ہوتو ان کے خاندان والے جمع ہوکر ان کے درمیان اصلاح کرائیں، تو اگر میاں بیوی صلح نہ کریں تو طلاق وخلع درست ہے)۔

**ترجیح:**...... راجح قول یہ معلوم ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے جھگڑے میں غور وفکر کرنے اور تحقیق حال کے لیے حکمین بھیجنا واجب ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے صیغہ امر (فابعثوا) کا استعمال کیا ہے، اور امر میں اصل یہ ہے کہ وہ وجوب کے لیے ہو، مگر یہ کہ کوئی قرینہ نہیں ہے، بلکہ مانع ہو، اور یہاں پر وجوب سے پھیرنے والا کوئی قرینہ نہیں ہے، بلکہ وجوب کو موکد کرنے والا قرینہ موجود ہے جو یہ ہے کہ اسلامی شریعت میاں بیوی کے رشتے کو معاشرے کے استحکام کی بنیاد قرار دیتی ہے، اور اسے ٹوٹنے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے، لہٰذا قاضی اصلاح کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کرے، اور بگاڑ کو ختم کرنے اور حقائق کا پتہ لگانے کے لیے حکمین کو لازماً بھیجے، کیونکہ بسا اوقات دوسرے کے سمجھانے کی صورت میں آدمی اپنی بے جا ضد سے باز آ جاتا ہے، اور مسئلہ کا حل نکل آتا ہے۔

**حکمین کی کوشش کے بعد ہی خلع معتبر ہوگا:**...... اس سے معلوم ہوا کہ راجح یہی ہے کہ قاضی کی طرف سے حکمین کا مقرر کیا جانا ضروری ہے، اور حکمین کی کوشش کے بعد ہی خلع معتبر ہوگا اور قاضی خود فیصلہ نہیں کرسکتا ہے، کیونکہ اسلامی شریعت کے نظام تحکیم سے بہت سے پیچیدہ اور دشوار مسائل حل ہو سکتے ہیں، لیکن افسوس کہ عہد قدیم وجدید میں اس پر پوری توجہ نہیں دی گئی، جیسا کہ ابن العربی المالکی تحریر کرتے ہیں: ''وقد ندبت إلى ذلك فما أجابني إلى بعث الحكمين عند الشقاق إلا قاض واحد'' (أحكام القرآن في بداية تفسير الآية: ۳۵ من سورة النساء: ۱،۵۳۷) (میں نے اس کی یعنی میاں بیوی کے جھگڑے کے وقت تحکیم کے نظام کو منطبق کرنے کی دعوت دی، تو شقاق کے وقت حکمین بھیجنے کی بات صرف ایک قاضی نے قبول کی)۔ لہٰذا اس سمینار کو طے کرنا چاہئے کہ قاضی کو ''ضرر'' یا ''شقاق'' کی وجہ سے تفریق کا فیصلہ حکمین بھیجنے کے بعد ہی کرنا لازم ہے۔

**''حکمین'' کے بھیجنے کی ذمہ داری:**...... فابعثوا کا خطاب اگرچہ تمام مسلمانوں کی طرف متوجہ ہے، لیکن راجح یہ ہے کہ آیت کے اصل مخاطب ان کے نمائندے یعنی حکام ہیں، اسی طرح اس واجب کے مکلف میاں بیوی کے خاندان، برادری اور ان کے رشتہ دار اور خیر خواہ بھی ہیں کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے اثرات سے کام لیں، اور اس بگاڑ کی اصلاح کی کوشش کریں، کیونکہ بسا اوقات فریقین جس جھگڑے کو خود طے کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے، وہ دوسرے خیر خواہوں کی مداخلت سے طے ہوجاتے ہیں، کیونکہ فریقین کو ان کی غیر جانبداری اور خیر خواہی کا احترام بھی کرنا پڑتا ہے، اور بے جا ضد پر دوسروں کی ملامت کا نشانہ بننے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے، اس وجہ سے یہ شکل زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہوتی ہے، اور اس طرح ایک پیچیدہ مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہوجاتا ہے، اور میاں بیوی خوشگواری کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔

**حکمین کی شرطیں:**...... اللہ تعالیٰ نے معاملات کو سلجھانے کے لیے بھیجے گئے افراد کے لیے حکم کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ایسے شخص میں کچھ صلاحیت اور اوصاف درکار ہیں، کیونکہ نزاعات اور جھگڑے میں فیصلہ کرنا ہر ایک آدمی کا کام نہیں، لہٰذا اسلامی شریعت نے حکمین کے لیے کچھ شرطیں مقرر کی ہیں:

۱۔ حکمین میاں بیوی کے خاندان سے ہوں، اور یہ جمہور اہل علم کے نزدیک بہتر ہے، ابن ہمام، رحمہ اللہ علیہ تحریر کرتے ہیں: ''اور بہتر یہ ہے کہ حکمین میاں بیوی کے خاندان سے ہوں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، اور بہتر اس وجہ سے ہے کہ وہ دونوں ان کے اندرونی معاملات سے زیادہ باخبر ہوں گے، اور ان کے حق میں زیادہ شفیق ہوں گے، اور یہی شافعی اور احمد کا قول ہے'' (فتح القدیر آخر باب الخلع ۴/ ۸۴، مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: المغنی ۷/ ۵۰، ومغنی المحتاج ۳/ ۲۶۱)۔

جبکہ مالکیہ کے نزدیک واجب ہے، مگر یہ کہ ان کے خاندان میں کوئی ایسا فرد ہو جو حکم بننے کی صلاحیت رکھتا ہو، دردیر مالکی تحریر کرتے ہیں: ''اور اجنبی حکم بھیجنا جائز نہیں ہے جبکہ خاندانی حکم کا بھیجنا ممکن ہو'' (الشرح الکبیر مع حاشیۃ الدسوقی، باب فی النکاح فصل إنما یجب القسم للزوجات فی المبیت ۳/ ۲۱۱)۔

اور شیخ محمد بن احمد بن عرفہ دسوقی مالکی تحریر کرتے ہیں: ''والظاهر نقض الحكم، لأن ظاهر الآية أن كونهما من أهلهما مع الوجدان واجب شرط'' (حاشية الدسوقي، فصل إنما يجب القسم للزوجات في المبيت، الكلام على أحكام النشوز ۲،۲۱۱)۔

(اور خاندانی حکم کے امکان کے باوجود اجنبی حکم بھیجنے کی صورت میں ظاہر یہ ہے کہ ان کے فیصلہ کو توڑ دیا جائے گا، اس لیے کہ آیت کریمہ سے بظاہر یہ پتہ چلتا ہے کہ امکان کی صورت میں حکمین کا ان کے خاندان سے ہونا واجب اور شرط ہے)۔

ترجیح:...... قول راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ حکمین کا میاں بیوی کے خاندان سے ہونا واجب ہے، کیونکہ خاندانی حکم کی خیر خواہی اور غیر جانبداری کا تیقن ہونے کی بنا پر زوجین ان سے وہ ساری باتیں بتا سکتے ہیں، جو دوسروں کو نہیں بتا سکتے ہیں۔

۲۔ دوسری شرط:...... "حکمین" عاقل، بالغ اور معاملہ کی شرعی نوعیت سے واقف ہوں (المغنی ۷؍۴۹، مغنی المحتاج ۳؍۲۶۱)۔

جبکہ مالکیہ کے نزدیک درج ذیل شرطیں ہیں:

حکمین (۱) مسلمان، (۲) عاقل، (۳) بالغ، (۴) عادل (۵) معاملہ کی شرعی نوعیت یعنی جمع وتفریق، نکاح وطلاق اور میاں بیوی کے نشوز کے احکام سے واقفیت رکھنے والے ہوں، (۶) مرد ہوں، (۷) آزاد ہوں، (۸) رشید یعنی سمجھدار ہوں تاکہ مسئلہ کو صحیح سمجھ بوجھ کے ساتھ حل کرسکیں اور جمع وتفریق کی ذمہ داری کو معاملہ فہم ہونے کی وجہ سے اچھی طرح نبھا سکیں۔

لیکن فقیہ ابن عربی مالکی کا خیال ہے کہ اگر حکمین زوجین کی طرف سے مقرر کئے گئے ہوں، تو ان کے فیصلہ کے معتبر ہونے کے لیے عدالت شرط نہیں، بلکہ فاسق ہوں، تب بھی ان کا فیصلہ معتبر ہوگا (ابن العربی المالکی ا/احکام القرآن ال آیۃ: ۳۵ من سورۃ النساء المسألۃ الخامسۃ عشرۃ ۱؍۵۴۳۔۵۴۴)۔

۳۔ تیسری شرط:...... مالکیہ، شافعیہ اور بعض حنابلہ کا مسلک ہے کہ حکمین کا آزاد ہونا شرط ہے، خرشی مالکی تحریر کرتے ہیں: "سو بچہ، پاگل، غلام، کافر، فاسق، ناسمجھ، عورت اور احکام نشوز سے ناواقف آدمی کا فیصلہ باطل ہے" (الخرشی المالکی محمد بن عبداللہ ۱۱۰۱ھ شرح مختصر خلیل، فصل انما یجب القسم للزوجات، احکام النشوز ۱۲؍۱۹، ط: الشاملۃ)۔

جبکہ ابن قدامہ کی رائے ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ حکمین کی حیثیت وکیل کی ہے تو حریت اور آزادی شرط نہیں ہے، اس لیے کہ غلام کو وکیل بنانا درست ہے، اور اگر حکمین کی حیثیت حاکم کی ہو تو آزادی شرط ہوگی، کیونکہ حاکم غلام نہیں ہوسکتا ہے (المغنی کتاب عشرۃ النساء، مسألۃ: واذا وجان راذ اوقعت بینہما العداوۃ ۷؍۵۰)۔

۴۔ چوتھی شرط:...... مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک حکم کا مرد ہونا شرط ہے، اس کی علت ابن قدامہ یہ بیان کرتے ہیں: "لأنه يفتقر إلى الرأي والنظر" (المغني ۷،۴۹)۔ (اس لیے کہ فیصلہ میں غور وتدبر کی ضرورت پڑتی ہے)۔

جبکہ شافعیہ کے نزدیک مرد ہونا شرط نہیں ہے "الشربینی الخطیب الشافعی" تحریر کرتے ہیں: "ولا يشترط فيهما الذكورة" (مغني المحتاج ۳،۲۶۱) (اور حکمین میں مرد ہونا شرط نہیں ہے)۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول حکمین کے وکیل ہونے کی حیثیت میں ہے، کیونکہ علامہ عمرانی شافعی تحریر کرتے ہیں: "لابد أن يكونا حرين مسلمين ذكرين عدلين ... قال الشيخ أبو إسحاق: فإن قلنا: إنهما حكمان فلابد أن يكونا فقيهين" (البيان، كتاب الصداق، باب النشوز ۹،۵۲۴)۔ (ضروری ہے کہ وہ دونوں مقرر کردہ حکمین آزاد، مسلمان، مرد اور عادل ہوں...... شیخ ابو اسحاق کا قول ہے کہ اگر ہم کہیں کہ وہ دونوں حکم ہیں تو لازم ہے کہ وہ معاملہ سے متعلق احکام سے واقفیت رکھنے والے ہوں)۔ بلکہ المجموع کی عبارت سے ظاہر ہے کہ وکیل ہونے کی صورت میں بھی مرد ہونا ضروری ہے (المجموع باب النشوز ۱۶؍۴۵۴)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکمین کو حاکم ماننے کی صورت میں شوافع اور حنابلہ کے نزدیک بھی وہ ساری شرطیں لازم ہوں گی جو مالکیہ کے نزدیک ضروری ہیں۔

ترجیح:...... میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ اگر حکم بننے کی اہلیت وصلاحیت رکھنے والے مرد ہوں تو ان کو مقرر کرنا لازم ہے، کیونکہ مرد معاملات کی چھان بین اور صورت حال کی تحقیق بہتر طور سے کرسکتے ہیں، اور اگر مطلوبہ صفات کے حامل مرد موجود نہ ہوں، تو پھر زوجین کے خاندان کی باصلاحیت خواتین کا انتخاب درست ہے، اور اگر ان کے خاندان میں باصلاحیت خواتین نہ ہوں، تو دوسرے خاندان سے مقرر کیا جانا درست ہے۔

## کیا ایک حکم کا تقرر بھی کافی ہوگا؟

جمہور کے نزدیک ایک حکم کا تقرر کافی نہیں ہے، امام نووی تحریر کرتے ہیں "ولا يجوز الاقتصار على حكم واحد على الأصح" (المجموع، باب النشوز من كتاب الصداق ۱۸،۱۳۲)۔ اور صحیح قول کے مطابق ایک حکم پر اکتفا کرنا درست نہیں ہے۔

جبکہ مالکیہ کے نزدیک خود میاں بیوی ایک حکم پر اتفاق کر سکتے ہیں جبکہ وہ حکم عاقل، بالغ، عادل، رشید یعنی معاملہ فہم، مرد اور متعلقہ معاملہ کی شرعی واقفیت رکھنے والا ہو، اور اس کا دونوں سے یکساں رشتہ ہو، جیسے وہ دونوں کا چچا ہو یا چچازاد بھائی ہو، یا اجنبی ہو، لیکن مرافعہ کے بعد حاکم کے لیے دو حکم کا تقرر لازم ہے۔

''اور آیت کریمہ اس بات کا فائدہ دیتی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا قول تو بھیجو اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ یہ حاکم کے پاس معاملہ لے جانے کے وقت ہے، اور یہ کہ اگر زوجین مرافعہ کے بغیر ایک حکم مقرر کرنے پر راضی ہو جائیں تو یہ کافی ہے'' (الشرح الصغیر بعث حکمین من أہل الزوجین ۵/ ۲۳۸)۔

ہاں البتہ حاکم اور زوجین کے حکم مقرر کرنے کی صورت میں فرق ہے، چنانچہ علامہ دردیر مالکی رقم طراز ہیں: ''اور ان دونوں کو یعنی میاں بیوی کو ان دونوں یعنی دونوں حکم اور ان کے فیصلہ پر راضی ہونے سے باز آنے کا حق ہے، اگر خود زوجین نے ان دونوں حکم کو مقرر کیا ہو، یا ایک حکم سے باز آنے کا بھی حق ہے، اگر میاں بیوی نے ایک حکم مقرر کیا ہو، اور باز آنے کا موقع اس صورت میں ہے کہ اگر زوجین نے حاکم کے پاس مرافعہ کے بغیر خود اپنی طرف سے حکمین مقرر کیا ہو، جب تک یعنی ان کی طرف سے مقرر کردہ حکمین ان کی حالت کے بارہ میں مکمل چھان بین اور فیصلہ پر عزم نہ کرلیں، ورنہ ان کو باز آنے کا اختیار نہ ہوگا، اور اس سے بظاہر یہ بات نکلتی ہے کہ اگر چہ طلاق کے فیصلہ پر عزم کے بعد میاں بیوی صلح اور نکاح کی برقراری پر راضی ہوں، اور ابن یونس نے کہا کہ مناسب ہے کہ جب دونوں ایک ساتھ نکاح کے باقی رہنے پر راضی ہوں تو ان کے درمیان تفریق نہ کی جائے (اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے)، اور ان دونوں میاں بیوی نے حکمین مقرر کیا ہو، اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر حکمین حاکم کی طرف سے بھیجے گئے ہوں، تو ان کو باز آنے کا حق نہیں ہے، اگر چہ ان دونوں نے تحقیق حال نہ کی ہو، اور یہ ظاہر ہے، اس لیے کہ ان کے مقرر کرنے میں زوجین کا کوئی اختیار نہیں ہے'' (الشرح الصغیر بعث حکمین من اہل الزوجین ۵/ ۲۳۹)۔

ہاں البتہ اگر حاکم ایک ایسے حکم کو مقرر کرے جو اجنبی ہو یا دونوں کے برابر درجہ کا رشتہ دار ہو، تو فقہاء مالکیہ کے درمیان اس صورت میں اختلاف ہے، ابن عرفہ دسوقی مالکی تحریر کرتے ہیں: ''چنانچہ لخمی جواز کے قائل ہیں اور باجی عدم جواز کے قائل ہیں، اور دونوں قول میں سے راجح جواز کا قول ہے، جیسا کہ ہمارے شیخ عدوی نے کہا ہے'' (حاشیۃ الدسوقی، باب فی النکاح، فصل إنما یجب القسم للزوجات فی المبیت ۳/ ۲۱۵)

لیکن اس اختلاف کے باوجود اگر حاکم نے ایک شخص کو حکم مقرر کر دیا تو اس کے فیصلہ کو توڑا نہیں جائے گا، دردیر مالکی تحریر کرتے ہیں: وعلى القول بمنع إقامة الواحد لو أقيم وحكم بشيء لم ينقض حكمه (الشرح الكبير باب في النكاح. فصل إنما يجب القسم للزوجات ۲۱۵/۳)۔

(اور ایک حکم مقرر کرنے کے عدم جواز کے قول کے باوجود اگر ایک حکم کو مقرر کر دیا گیا، اور اس نے کچھ فیصلہ کیا تو اس کا فیصلہ توڑا نہیں جائے گا)۔

اور یہ اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ غیر جانبدار کو حکم مقرر کیا گیا ہو، لیکن اگر جانبداری کا شبہ ہو جیسے ایک فریق کے رشتہ دار یا زیادہ قریبی رشتہ دار کو مقرر کیا گیا ہو تو بالاتفاق درست نہیں ہے، دردیر مالکی تحریر کرتے ہیں: ''وأما إن كان قريبا لأحدهما أو أقرب منع اتفاقا'' (سابق مرجع ۳/ ۲۱۵)۔ اور بہر حال ایک حکم میاں بیوی میں سے ایک کا رشتہ دار یا زیادہ قریبی رشتہ دار ہو، تو بالاتفاق ایسے ایک حکم کو مقرر کرنا درست نہیں ہے)۔

**ترجیح:**...... میرے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ میاں بیوی خود ایک شخص کو حکم مقرر کر سکتے ہیں، کیونکہ جب وہ دونوں خود ایک حکم پر راضی ہیں تو اس حکم کے لیے صحیح صورت حال سمجھنے میں دقت نہ ہوگی، اور زوجین اس کے سامنے کھل کر ساری باتیں رکھیں گے۔

البتہ حاکم یا قاضی کے لیے ایک حکم مقرر کرنا درست نہیں ہے کیونکہ معاملہ مبہم اور پیچیدہ ہونے کی صورت میں بالخصوص ایک حکم کے ذریعہ مکمل تحقیق اور چھان بین دشوار ہے اسی طرح دو حکم کی صورت میں جانبداری کا شبہ نہ ہوگا اور قاضی کے سامنے صحیح صورت حال آسکے گی۔

جہاں تک ابن عربی مالکی کا حضرت انیس کے واقعہ سے استدلال ہے کہ زنا کی گواہی میں چار اشخاص کی شرط ہے، لیکن اعتراف زنا سننے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکیلے حضرت انیس کو بھیجا تو اسی طرح دو حکم کا ذکر ایک حکم مقرر کرنے کے منافی نہیں ہے (ابن العربی أحکام القرآن، المسألۃ الرابعۃ عشرۃ، الآیۃ: ۳۵ من سورۃ النساء ۱/ ۵۴۳)۔

مذکورہ بالا استدلال کمزور ہے، کیونکہ اقرار کی صورت میں کذب بیانی کا احتمال موہوم ہے، جبکہ گواہی کی صورت میں کذب بیانی کا امکان ہے اور چونکہ عفت کی دولت نہایت قیمتی دولت ہے، اس لیے زنا کے ثبوت کے معاملہ میں شریعت نے کڑی شرط رکھی ہے، لہذا گواہی پر اقرار کو قیاس کرنا درست نہیں ہے، ساتھ جمہور کے نزدیک چار مجلس میں اقرار کرنا بھی لازم ہے۔

## حکمین کا اختلاف:

اگر بنیادی اختلاف ہو تو ان کے فیصلہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے، امام قرطبی تحریر کرتے ہیں: "سو اگر دونوں حکم میں اختلاف ہو تو ان دونوں کا قول نافذ نہ ہوگا، اور اس فیصلہ سے کچھ لازم نہ ہوگا، مگر جس پر دونوں کا اتفاق ہو تو اگر ایک نے فرقت کا فیصلہ کیا، اور دوسرے نے انکار کیا تو اس کا کچھ اعتبار نہیں یہاں تک کہ دونوں کا اتفاق ہو" (ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۳/۱۲۲، ط: المکتبۃ العصریۃ بیروت ۱۴۲۵ھ-۲۰۰۵م)۔

ہاں البتہ اگر جزوی اختلاف ہو جیسے دونوں حکمین تفریق پر متفق ہوں لیکن ایک حکم ایک طلاق کا فیصلہ کرے اور دوسرا حکم تین طلاق کا فیصلہ لے تو ایسی صورت میں ایک طلاق کے ذریعہ تفریق ہوگی، چنانچہ قرطبی تحریر کرتے ہیں: "وقال ابن المواز: إن حكم أحدهما بواحدة. والآخر بثلاث فهي واحدة. وحكى ابن حبيب عن أصبغ أن ذلك ليس بشئ" (مرجع سابق، المسألۃ الرابعۃ ۳/۱۲۲) (اور ابن المواز فرماتے ہیں کہ اگر ایک حکم ایک طلاق کا فیصلہ کرے اور دوسرا حکم تین طلاق کا فیصلہ تو یہ ایک طلاق ہوگی، اور ابن حبیب نے اصبغ سے نقل کیا ہے کہ اس فیصلہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے)۔

میرے نزدیک ابن المواز کا قول راجح ہے اس لیے کہ طلاق واقع کرنے میں اصل یہ ہے کہ ایک طلاق ہو، نیز اصلاح کا تقاضا یہ ہے کہ حکمین کو ایک سے زائد طلاق کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہ ہو، چنانچہ علامہ صاوی مالکی تحریر کرتے ہیں: "حاصله أنه لا يجوز لهما ابتداء إيقاع أكثر من طلقة واحدة فإذا أوقعاه فلا ينعقد منه إلا طلقة واحدة؟ لأن الزائد خارج عن معنى الإصلاح" (حاشية الصاوی. كتاب النكاح. فصلا القسم بين الزوجات. بعث الحكمين من أہل الزوجين ۱/۴۴۱) اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکمین کے لیے ابتداً ایک طلاق سے زیادہ واقع کرنا درست نہیں ہے، سو اگر وہ ایک سے زائد طلاق واقع کریں تو اس میں سے صرف ایک ہی طلاق واقع ہوگی، اس لیے کہ ایک سے زائد طلاق اصلاح کے مفہوم سے خارج ہے)۔

ایسے ہی اگر حکمین خلع کے ذریعہ تفریق پر متفق ہوں، لیکن بدل خلع کی مقدار یا صفت یا نوعیت میں اختلاف ہو تو خلع مثل پر حکمین کا فیصلہ معتبر ہو جائے گا، بشرطیکہ خلع مثل کی مقدار دونوں حکم کے دعوی والی مقدار سے زیادہ نہ ہو، یا دونوں میں سے کمتر مقدار والے حکم کے دعوی سے کم نہ ہو (الشرح الصغیر مع حاشیۃ الصاوی، کتاب النکاح فصل القسم بین الزوجات ۱/۴۴۲)۔

۷۔ حنفیہ کے نزدیک میاں بیوی کی توکیل کے بغیر شقاق کی وجہ سے قاضی کو تفریق کرنے کا اختیار نہیں ہے، لیکن ضرورۃً مالکی مکتب فکر کی طرف عدول کرنا جائز ہے، جس طرح زوجۂ مفقود الخبر کے سلسلہ میں مالکی مکتب فکر کی طرف رجوع کیا گیا ہے، کیونکہ نکاح کا ایک مقصد پرسکون زندگی کی فراہمی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ومن آياته أن خلق لكم من أنفسكم أزواجا لتسكنوا إليها، وجعل بينكم مودة ورحمة. إن في ذلك لأيت لقوم يتفكرون" (۳۰، الروم: ۲۱)۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے، تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی رکھی، یقیناً اس کے اندر نشانیاں ہیں ان کے لیے جو غور کرتے ہیں)۔

سو جب میاں بیوی کے جھگڑوں کی وجہ سے سکون ختم ہو جائے، اور ازدواجی زندگی فساد، بے چینی، اور کرب واضطراب کا ذریعہ بن جائے، اور خاص طور سے جب عورت ظلم وتنفر کی شکار ہو، تو یہ مصالح شریعت سے ہرگز ہم آہنگ نہیں ہے کہ اسے دم گھٹ گھٹ کر جینے پر مجبور رکھا جائے، لہٰذا ایسی صورت میں قاضی کو اپنے خصوصی اختیار کا استعمال کرتے ہوئے ایسے میاں بیوی کے عقد نکاح کو ختم کر دینا چاہیے، بالخصوص ہندوستان جیسے ملک میں جہاں قاضی شرعی شوہر کو ظلم وزیادتی سے روکنے کی عملی قوت سے محروم ہے۔

## خلاصۂ بحث:

۱۔ "شقاق" یہ ہے کہ میاں بیوی باہم یا کوئی ایک دوسرے سے سخت نفرت کرنے لگے اور ان کے درمیان باہمی محبت اور چاہ کی فضا ختم ہو کر نفرت اور دشمنی کی فضا قائم ہو جائے۔

۲۔ "شقاق" پیدا ہونے کی صورت میں حکمین کو بھیجنا واجب ہے۔

۳۔ جمہور اور حنفیہ کے نزدیک میاں بیوی کی توکیل کے بغیر "شقاق" کی وجہ سے قاضی کو تفریق کرنے کا اختیار نہیں ہے، جبکہ مالکیہ اور دیگر بعض ائمہ کے نزدیک نہ صرف قاضی بلکہ "حکمین" کو بھی "شقاق" کی وجہ سے تفریق کرنے کا اختیار ہے۔

۴۔ ضرورۃً مالکی مکتب فکر کی طرف عدول کرنا جائز ہے۔ والله أعلم بالصواب، وعلمه أتم وأحكم۔ ☆☆☆

# شقاق کی بنیاد پر زوجین میں علاحدگی کا مسئلہ

مفتی احمد نادر القاسمی[1]

زوجین کے درمیان نباہ نہ ہونے کی صورت میں دونوں کے درمیان علاحدگی کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے، تاکہ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے سے آزاد ہو کر اپنی زندگی کے لئے بہتر مواقع تلاش کر سکیں، اور بقیہ زندگی چین وسکون سے گذرے، اور حدود اللہ کی پاسداری بھی باقی رہے، اگر کسی وجہ سے دونوں کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہوتا ہے تو خود قرآن نے ترتیب وار اس تنازع کو سلجھانے کا طریقہ بتایا ہے، دونوں طرف کے معزز لوگوں کو اس میں مداخلت کرنے اور مسئلہ کو حل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: ''وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما'' (سورۂ نساء: ۳۵) (اور اگر تمہیں دونوں کے درمیان کشمکش کا علم ہو تو تم ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک حکم عورت کے خاندان سے مقرر کردو اگر دونوں کی نیت اصلاح حال کی ہوگی تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردے گا)۔

زوجین کے درمیان طے پانے والے رشتہ نکاح کو طلاق، خلع اور فسخ کے ذریعہ ختم کیا جاتا ہے، جن میں طلاق کا تعلق شوہر سے ہے، البتہ فسخ وتفریق کا تعلق قاضی سے ہے۔

اس وقت معاشرے کی صورت حال یہ ہے کہ خواتین کے خلاف مظالم اور زیادتیاں مردوں کی طرف سے بھی ہو رہی ہیں، اور مردوں کے خلاف زیادتیاں عورتوں کی طرف سے بھی ہو رہی ہیں، مگر یہ بات بہر حال کہی جاتی ہے کہ شوہر کے پاس عورتوں کی اذیت سے نجات پانے کا ذریعہ بہر حال موجود ہے، لیکن جب مرد طلاق اور خلع دونوں میں سے کسی پر آمادہ نہ ہو اور عورت قاضی کے پاس بینہ پیش کرنے اور اپنا موقف ثابت کرنے کی بھی پوزیشن میں نہ ہو کہ قاضی اس کا نکاح دفع ظلم کو سامنے رکھ کر فسخ کردے تو پھر کیا صورت اختیار کی جائے گی؟ اس پس منظر میں اکیڈمی نے چند سوالات رکھے ہیں جو غور طلب بھی ہیں اور حل کے متقاضی بھی، آئندہ صفحات میں انہیں سوالات پر غور کیا جائے گا۔

## ۱۔ خلع کی فقہی اور اصطلاحی تعریف:

لغت میں اپنی ذات سے کسی چیز کو الگ اور جدا کرنے کا نام ''خلع'' ہے، خلع کی صورت میں عورت مرد کو اپنے سے دور کردیتی ہے اور مرد عورت کو اپنے سے دور کردیتا ہے، لغوی اعتبار سے خلع کے معنی جسم سے کسی چیز کو اتار پھینکنے کے بھی ہیں، کیونکہ قرآن نے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا لباس کہا ہے اور انسان جب لباس کو اپنے جسم سے اتارتا ہے تو اسے الگ ہی رکھ دیتا ہے، اسی طرح سے مرد اگر عورت کو طلاق اور خلع کے ذریعہ جدا کرتا ہے تو کپڑے کی طرح ہی اپنی ذات سے دور کردیتا ہے، چنانچہ ابن منظور نے ''لسان العرب'' میں خلع کی لغوی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: ''خلع الشيء يخلعه، خلعه واختلعه كنزعه. وخلع النعل والثوب والرداء، يخلعه خلعا جرّده. وخلع امرأته خلعا (بضم الخا) وخلاعا فاختلعت. وخالعته: أزالها عن نفسه وطلقها على بذل منها له فهي (خالع) والإسم الخلعة'' (لسان العرب لابن منظور ۹،۳۲۹، نیز دیکھئے: النہایہ لابن اثیر ۲،۶۵)

## خلع کی اصطلاحی تعریف:

خلع کی اصطلاحی تعریف میں جو الفاظ فقہاء نے استعمال کئے ہیں ان تمام کا منشا تقریبا ایک ہی ہے، اور وہ ہے مال کے عوض شوہر کی طرف سے بیوی کو طلاق کا مطالبہ کرنے پر طلاق دینا، بطور نمونہ ہم یہاں چند عبارتیں کتب فقہ کے حوالہ سے پیش کرتے ہیں:

''الخلع إزالة ملك النكاح ببدل بلفظ الخلع'' (فتح القدير ۳،۱۹۹)۔

[1] رفیق شعبہ علمی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

''الخلع إزالة ملك النكاح المتوقفة على قبول الزوجة بلفظ الخلع أو مافى معناه'' (الدر المختار ۳،۴۳۹-۴۴۱)۔

''الخلع فراق الزوج امراته بعوض يأخذه الزوج من امرأته أو غيرها بألفاظ مخصوصة'' (كشاف القناع ۳،۱۲۶)۔

''هو لغة: النزع، وشرعاً طلاق بعوض'' (الشرح الكبير للدردير ۲،۳۴۷)۔

''الخلع فى الشرع: فرقة بين الزوجين بعوض مقصود راجع لجهة الزوج بلفظ طلاق أو خلع'' (مغنى المحتاج ۳،۲۶۲)۔

مذکورہ بالا ائمہ اربعہ کی کتب سے نقل کردہ عبارات اور تعریفات کا حاصل یہ ہے کہ زوجین کی رضامندی سے اور زوجہ کی طرف سے پیش کئے گئے مال کے عوض واقع ہونے والی علاحدگی اور دی جانے والی طلاق کو خلع کہا جاتا ہے۔

طلاق اور خلع کے درمیان فرق بھی یہیں سے واضح ہوگیا ہے کہ طلاق محض شوہر کے تنہا تصرف اور ارادے سے واقع ہوتی ہے، اور خلع کے لئے دونوں کی رضامندی اور بیوی کی طرف سے مال خرچ کرنے سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔

## خلع کی مشروعیت کے دلائل:

خلع کی مشروعیت پر مندرجہ ذیل دلیلیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ ''الطلاق مرتان فإمساك بمعروف أو تسريح بإحسان، ولا يحل لكم أن تأخذوا مما آتيتموهن شيئا إلا أن يخافا ألا يقيما حدود الله'' (سورۂ بقرہ: ۲۲۹)۔

۲۔ ''فإن خفتم ألا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به'' (سورۂ نساء: ۳۵)۔

۳۔ ''عن ابن عباس قال: جاءت امرأة ثابت بن قيس إلى النبي ﷺ فقالت يا رسول الله! ما أنقم على ثابت فى دين ولا خلق إلا أني أخاف الكفر. فقال رسول الله ﷺ: فتردين عليه حديقته؟ فقالت: نعم. فردت عليه. وأمره ففارقها''
(بخاری مع الفتح ۹،۳۹۵، ابوداؤد ۶،۳۰۸-۳۱۱، نسائی ۶،۱۳۸، ابن ماجہ ۱،۶۶۳، یہ روایت ترمذی میں بھی ہے، ۴/۳۶۴)۔

''وفى رواية أخرى للإمام البخارى، أى أكره إن أقمت عنده أن أقع فيما يقتضى الكفر.'' ''وقال الطيبى: المعنى أخاف على نفسى فى الإسلام ما ينافى حكمه من نشوز و بغض وغيره مما يتوقع من الشابة الجميلة المبغضة لزوجها إذا كان بالضد منها فأطلقت على ماينافى مقتضى الإسلام، الكفر'' (فتح القدير ۹،۳۹۹-۴۰۰)۔

''قال جميع الفقهاء بالحجاز والشام، وقال ابن عبد البر: ولا نعلم أحداً خالف إلا بكر بن عبد الله المزنى. فإنه لم يجزه وزعم أن أية الخلع منسوخة، بقوله تعالى: ''وإن اردتم استبدال زوج مكان زوج... وأن الاية الناسخة متأخرة، ولم يثبت شئ من ذلك، والقول بالخلع هو قول عمرو على وعثمان وغيرهم من الصحابة لم نعرف لهم فى عصرهم مخالفا، فيكون إجماعاً'' (المغنى لابن قدامہ ۷،۵۲-۵۳)۔

## ۲۔ خلع کا مطالبہ کیا عورت کا حق ہے؟

جس طرح طلاق امر مباح ہے اور اسے ''ابغض الحلال'' کہا گیا ہے، اسی طرح خلع کا مطالبہ بھی امر مباح ہے، اور امر اختیاری ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر عورت کو کسی طرح کی کوئی پریشانی شوہر سے نہ ہو اور اخلاقی اعتبار سے عورت اپنے شوہر سے مطمئن ہو تو خلع کا مطالبہ کرنا عورت کے لئے قطعا نامناسب اور ناپسندیدہ عمل ہے، فقہاء متقدمین کی بھی یہی رائے ہے، اور فقہاء معاصرین نے بھی اسی کی پیروی کی ہے، دیکھئے: ڈاکٹر شیخ عبدالکریم زیدان کی کتاب: المفصل فی احکام المرأۃ ۸/۱۱۹، طبع موسسۃ الرسالہ۔

نیز یہ کہ خلع کو مرد اور عورت کے حقوق طلاق کے تناظر میں دیکھنے کے بجائے، اس کو ضرورت کے پیرائے میں دیکھنا چاہئے، اور قرآن نے خود یہ بات کہی ہے: ''فلا جناح عليهما فيما افتدت به'' (سورہ نساء: ۳۵)، معلوم ہوا کہ خلع میں دونوں کی شرکت ہے مرد کی بھی اور عورت کی بھی، اگر طلاق کے طور پر

اس کو دیکھا جاتا تو جس طرح مرد طلاق دے کر پورے اختیارات کے ساتھ عورت کو اپنے نکاح سے الگ کر دیتا ہے، اسی طرح عورت بھی ایک متعین رقم اپنے سامنے رکھتی اور یہ کہہ کر کہ میں آج تم سے خلع لے رہی ہوں، یہ رقم اپنی لے جاؤ اور آج سے میں تم سے آزاد اور تم مجھ سے آزاد اور شریعت اس کے اس پورے عمل کو تسلیم کر لیتی تب یہ کہا جا سکتا تھا کہ شریعت نے مرد کو جس طرح طلاق کا حق دیا ہے اسی طرح عورت کو علاحدہ ہونے کے لئے خلع کا حق دیا ہے، اس لئے یہ خیال درست نہیں ہے، بس اتنا ہی کہنا مناسب ہے کہ جس طرح طلاق ضرورت ہے، اسی طرح خلع بھی ضرورت ہے، عورت اپنے مال کے عوض خلع حاصل کر کے گلوخلاصی اختیار کر لے، یہ ایک شرعی طریقہ (Option) اور تدبیر ہے۔

**خلع کی حیثیت شریعت میں کیا ہے؟**...... اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاء کے یہاں مختلف اقوال ملتے ہیں، ان میں سے چند کا تذکرہ پہلے کرتے ہیں اس کے بعد حکم تحریر کیا جائے گا۔

### حنفی نقطہ نظر:

حنفی فقہاء کی تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ جب زوجین کی زندگی میں بے اعتدالی آجائے اور دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں اور اس بات کا اندیشہ لاحق ہو جائے کہ دونوں یا دونوں میں سے کوئی ایک شریعت کے طے کردہ ازدواجی اصول، اخلاقی رواداری اور حدود اللہ کو توڑ سکتے ہیں تو عورت کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ خلع حاصل کر لے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، چنانچہ "فتح القدیر" میں صراحت ہے: "وإذا تشاق الزوجان وخافا أن لا يقيما حدود الله، فلا بأس أن تفتدي نفسها منه بمال يخلعها به، لقوله تعالى: "فلا جناح عليهما فيما افتدت به" (هدايه مع الفتح ۱۹۹، ۳)۔

درمختار میں ہے: "ولا بأس به عند الحاجة للشقاق وبعدم الوفاق" (درمختار ۴۴۱، ۳)۔

گویا حنفیہ نے وہ روایات جن میں عورت کی طرف سے بلا وجہ طلاق کے مطالبہ کئے جانے کو مذموم قرار دیا ہے، اور بعض میں: "لم تر رائحة الجنة" (ترمذی ۳۶۶، ۲ مع تحفة الاحوذی)، اور بعض میں: "المختلعات والمتبرجات من المنافقات" (حوالہ سابق) کے الفاظ آئے ہیں، ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے خواتین کے لئے ضرورت کے وقت خلع حاصل کرنے کی اجازت دی ہے، بلا ضرورت نہیں۔

### شافعی نقطہ نظر:

شافعیہ اور اصحاب ظواہر کے نزدیک دو چیزوں کی وجہ سے عورتوں کو خلع حاصل کرنے کی اجازت ہے:

۱۔ عورت اپنے شوہر کی ظاہری شکل وصورت سے مطمئن نہ ہو، کوئی عیب ہو، یا معروف طریقہ پر زندگی گذارنے کے مواقع نہ فراہم کرتا ہو۔

۲۔ عورت کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ صحیح طریقہ پر اپنے شوہر کا حق ادا نہیں کر پائے گی، اور مثلاً نفرت وکدورت کی وجہ سے نشوز ونافرمانی کی مرتکب ہو جائے گی، چنانچہ ابو اسحاق شیرازی شافعیہ کا مذہب نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"إذا كرهت المرأة زوجها لقبح منظر أو سوء عشرة، وخافت أن لا تؤدي حقه، جاز أن تخالعه على عوض لقوله عز وجل: "فإن خفتم ألا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به" (المهذب وشرحه المجموع ۱۶، ۳)۔

البتہ ظاہریہ نے اس کو شرط کے طور پر ذکر کیا ہے کہ عورت کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ شوہر کے خفا ہونے کی وجہ سے اس کا شوہر صحیح طریقہ پر اس کا حق ادا نہیں کرے گا، یا خود عورت اپنے شوہر کا حق ادا نہیں کر پائے گی تو خلع حاصل کرنے کی اجازت ہے (المحلی ۱۰/۲۳۵، بحوالہ المفصل فی احکام المرأۃ للدکتور عبد الکریم زیدان ۸، ۱۲۰)۔

**حنبلی نقطہ نظر:**...... حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ اگر عورت اپنے شوہر کی کسی فطری چیز سے ناخوش ہو، مثلاً صورت، شکل یا جسمانی اعضاء میں سے کسی عضو میں نقص ہو، اس سے، یا شوہر کی دیانت داری اور دینداری سے غیر مطمئن ہو تو اسے شرعی طور پر اجازت ہے کہ وہ اپنے شوہر سے خلع لے لے، (دیکھئے: کشاف القناع ۳/۱۲۶، المغنی ۷/۵۱، بحوالہ المفصل فی احکام المرأۃ ۸/۱۱۹)۔

## مالکی نقطہ نظر:

مالکیہ کے یہاں بھی مشہور قول کے مطابق خلع کا جواز ملتا ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ خلع میں اگر طلاق بالعوض ہو تو مکروہ ہے، چنانچہ دردیر نے "شرح کبیر" میں لکھا ہے: "جاز الخلع على المشهور، وقيل: يكره، وهو الطلاق بعوض هذا هو الأصل فيه" (الشرح الكبير للدردير ۲،۳۴۷)۔

مذکورہ بالا فقہاء کے نقاط نظر پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح طلاق مردوں کا حق ہے، اسی طرح خلع لینا بھی عورتوں کا حق ہے، کیونکہ طلاق بھی بغیر کسی شرعی عذر کے ظلم ہے، اور خلع بھی بغیر کسی وجہ شرعی کے مکروہ ہے، اور خلع کے سلسلہ میں ائمہ ثلاثہ کا یہی موقف ہے، البتہ شوافع کی صراحت سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں بغیر کسی عذر اور قید کے عورتوں کے لئے خلع لینا جائز اور مباح ہے، ابواسحاق شیرازی کہتے ہیں: "وإن لم تكره منه شيئا وتراضيا على الخلع من غير سبب جاز، لقوله تعالى: فإن طبن لكم عن شئ منه نفسا فكلوه هنيئا مريئا. ولأنه أى الخلع رفع عقد بالتراضي جعل لدفع الضرر، فجاز من غير ضرر كالإقالة في البيع" (المهذب وشرحه ۱۶،۳)۔

بہر حال یہ بات تمام مذکورہ تصریحات کی روشنی میں ثابت ہوتی ہے کہ خلع عورت کا حق شرعی ہے، جس کا وہ اپنے اوپر کسی طرح کا اگر اندیشہ محسوس کرے تو استعمال کر سکتی ہے، اور اپنی طرف سے شوہر کی حق تلفی ہو جانے کا اندیشہ، یا شوہر کی طرف سے زیادتی کئے جانے کا خوف خلع کا مطالبہ کرنے کے لئے عذر ہے، جو آیت قرآنی: "فإن خفتم ألا يقيما حدود الله" سے متشرح ہوتا ہے، اور فقہاء حنابلہ نے تو باضابطہ اس کی صراحت کی ہے کہ خلع کی مشروعیت ہی عورتوں کو شوہر کی طرف سے لاحق ہونے والی زیادتی اور ضرر کے ازالہ کے لئے ہوتی ہے "والخلع أى شرع لإزالة الضرر الذى ملحقها" (المغنى ۷،۵۲، كشاف القناع ۳،۱۲۶)۔

نیز خلع کے مطالبہ کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کوئی ظاہری سبب موجود ہو، بلکہ باطنی طور پر بھی عورت شوہر سے کدورت محسوس کرتی ہو تو خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے، جیسا کہ صحابی رسول حضرت قیس بن ثابتؓ کے اس جملہ "ولكن أكره الكفر في الإسلام" سے پتہ چلتا ہے، اور حضور ﷺ کا اس عذر کو تسلیم کرنا خود اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ خلع کا حصول عورت کا حق ہے۔

## ۳۔ ظلم ثابت نہ ہونے کی صورت میں گلوخلاصی:

عورت اگر شوہر سے اس کے اخلاق وعادات اور طرز زندگی سے متنفر ہو اور اس شوہر کے ساتھ رہنا پسند نہ کرتی ہو، قاضی کی عدالت میں شوہر کے ظلم وزیادتی ثابت کرنے کی پوزیشن میں بھی نہ ہو تو ایسی عورت کے لئے خلع کا مطالبہ کرنا ہی گلوخلاصی کا واحد ذریعہ ہے کہ کچھ دے دلا کر خلع حاصل کر لے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی حدیث میں حضرت ثابت بن قیسؓ کی بیوی کے مطالبہ خلع اور پھر حضرت قیس کی طرف سے دیئے گئے باغ کے لوٹانے کا رسول اللہ ﷺ کی جانب سے سوال اور اس کی رضامندی سے پتہ چلتا ہے، اور یہ اس کی بہترین دلیل ہے۔

نیز خلع کی پیش کش تو خود اس بنا پر ہی ہے کہ قاضی کی عدالت میں شوہر کی زیادتی ثابت کرنے سے جب قاصر ہے اور شوہر عدم رضامندی پر مصر ہے، ورنہ ظلم ثابت کر دیتی تو قاضی چونکہ رفع ظلم پر مامور ہے دونوں کے درمیان تفریق اور فسخ کا حکم دینا اس کے ذمہ لازم ہے، جس کی تفصیل کتب فقہ کے کتاب القضاء میں موجود ہے، معاصر فقہاء میں ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے بھی اس کی صراحت کی ہے، دیکھئے: (المفصل فی احکام المرأۃ ۸/ ۱۲۲)۔

خلع کا مطالبہ اس لئے ضروری ہے کہ رشتہ زوجیت کو ختم کرنے کا اب اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ بچا ہی نہیں ہے، اس لئے مال کی قربانی دے کر ہی گلوخلاصی اختیار کرنی ہوگی۔

شریعت کے بنیادی اصول کو بروئے کار لاتے ہوئے خاکسار کی رائے یہ ہے کہ عورت کو اگر اس بات کا مکمل اعتماد اور یقین ہو کہ وہ قاضی کی عدالت میں اپنے شوہر کے خلاف بینہ نہیں پیش کر سکے گی تو اسے خلع کا ہی راستہ اختیار کرنا چاہئے، جیسا کہ حضرت ثابت بن قیسؓ کی بیوی نے باغ سے دستبرداری پر خلع کا مطالبہ کیا تھا۔

## ۴۔ شقاق کا مفہوم:

اردو زبان میں "شقاق" کا مفہوم اختلاف ونزاع، باہمی عداوت اور ضد ہے، چنانچہ اردو کی تفاسیر میں تفسیر مظہری، تفسیر عثمانی اور معارف القرآن وغیرہ میں

اس آیت کے ضمن میں یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے، یعنی دونوں سے کسی ایسی حرکت کا صدور ہو جو ایک دوسرے پر شاق گذرے، چنانچہ علامہ ثناء اللہ مجددی پانی پتی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: ''شقاق سے مراد ہے اختلاف اور دشمنی، چونکہ ہر دشمن ایسا کام کرتا ہے جو اس کے مخالف کو شاق ہو، اس لئے عداوت کو بھی شقاق کہتے ہیں'' (تفسیر مظہری ۳/۳۶/۳۴۶ اردو)۔

عربی زبان میں اختلاف کو شقاق سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بطور خاص باہمی اختلاف جب سنگین صورت اختیار کر جائے تو شقاق کی حد میں داخل ہو جاتا ہے، چنانچہ ڈاکٹر محمد سلیمان عبداللہ الاشقر نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: "أي تفاقم الخلاف بين الزوجين" (زوجین کے درمیان پایا جانے والا اختلاف سنگین صورت اختیار کر جانے کا اندیشہ ہو)۔ امام رازی نے ''شقاق'' کی دو توجیہ کی ہے:

۱۔ فریقین میں سے ہر ایک ایسا کام کرے جو دوسرے کے لئے تکلیف کا باعث ہو، ''أن كل واحد منهما يفعل ما يشق على صاحبه'' (تفسیر رازی ۱۵،۹۲)۔

۲۔ دوسرے یہ کہ فریقین میں سے دونوں دشمنی اور اختلاف کا حصہ بن جائے ''أن كل منهما صار في شق بالعداوة والمباينة'' (تفسیر رازی ۱۵،۹۲)۔

امام قرطبی نے بھی اسی سے ملتی جلتی بات کہی ہے: ''فكأن كل واحد من الفريقين يحرص على ما يشق على صاحبه'' (احکام القرآن ۲،۱۴۲، بحواله المفصل في احكام المرأة ۸،۴۰۸)، اور ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے بطور خاص یہی اس کی مراد لکھی ہے (حوالہ سابق ۸/۴۱۵)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ''شقاق سے مراد باہمی نزاع، عداوت، ضد اور اختلاف'' ہے۔

## کیا شقاق وجہ تفریق ہے؟

یہاں یہ بات اہم نہیں ہے کہ شقاق سے مراد کیا ہے؟ اس سے اہم بات یہ ہے کہ کیا شقاق زوجین کے درمیان تفریق، طلاق اور خلع کا سبب ہے یا نہیں؟ اس بارے میں حضرات فقہاء کے یہاں دو طرح کی رائے ملتی ہے:

۱۔ ایک قول یہ ہے کہ شقاق وجہ تفریق، یا خلع یا طلاق نہیں ہے، اس رائے کو حنفیہ، ایک قول میں امام احمد بن حنبل، اظہر روایت کے مطابق شافعیہ اور ظاہریہ نے اختیار کیا ہے، چنانچہ ''احکام القرآن للجصاص، المغنی لابن قدامہ، مغنی المحتاج اور محلی لابن حزم'' میں ہے:

''لاخلاف أن الزوج لو أقر بالإسائة إليها لم يفرق الحاكم بينهما، ولم يجبره الحاكم على طلاقها قبل تحكيم الحكمين، وكذلك لو أقرت المرأة بالنشوز لم يجبرها على خلع ولا على رد مهرها. فإذا كان كذلك حكمهما قبل بعث الحكمين. فكذلك بعد بعثهما لا يجوز ايقاع الطلاق من جهتهما من غير رضا الزوج وتوكيله ولا إخراج المهر عن ملكها بالمخالعة من غير رضاها'' (احكام القرآن ۲،۱۹۱) ''وهذا مذهب أحمد بن حنبل في إحدى الروايتين عنه وهو القول الأظهر في مذهب الشافعية ومذهب الظاهرية'' (المغنی ۷،۴۹، مغنی المحتاج ۲،۲۶۲، المحلی ۱۰،۸۸، المفصل فی احکام المرأة ۸،۴۱۲)

دوسری رائے یہ ہے کہ ''شقاق'' زوجین کے درمیان سبب تفریق ہے، اس لئے کہ شقاق اور عداوت و نفرت کے سائے میں رشتہ زوجیت کو باقی رکھنا حد درجہ تکلیف دہ مسئلہ ہے اور دونوں کے لئے ضرر کا باعث ہے، یہ امام احمد بن حنبل سے دوسری روایت، امام مالک، شافعیہ کا قول ثانی، اور فقہاء مدینہ کی رائے ہے، اور اسی کو ڈاکٹر زیدان موصوف نے راجح قرار دیا ہے، دیکھئے: (المغنی ۷/ ۴۹، مغنی المحتاج ۳/ ۲۶۲، زاد المعاد لابن قیم ۴/ ۳۳، المفصل فی احکام المرأة ۸/ ۴۱۳)۔

**ترجیح**:...... موجودہ حالات میں جو صورت حال ہے، اور خواتین جس کرب ناک دور سے گذر رہی ہیں، نیز موجودہ ملکی قوانین میں خواتین کے حق میں غیر ضروری مراعات کے خوف سے مردوں کا طلاق پر آمادگی سے راہ فرار اختیار کرنا، طلاق جو کہ علاحدگی کا آسان حل تھا دشواریاں پیدا کر رہی ہے۔ بے جا طلاق کی شناعت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ان تمام دشواریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے شقاق کو وجہ تفریق تسلیم کیا جانا زیادہ انسب ہے، اس میں خواتین کے لئے آسانی بھی ہے، طلاق حاصل کرنے کے لئے مال خرچ کرنے کی زحمت اور بار سے نجات بھی ہے اور حقوق کا تحفظ بھی ہے، اور ان تمام وجوہات کو مد نظر رکھتے ہوئے بینہ پیش کرنے سے قاصر ہونے کے باوجود عورت کی طرف سے پائی جانے والی نفرت جو شقاق کو متضمن ہے، اس کی بنیاد پر قاضی تفریق کر سکتا ہے، اس لئے کہ یہ ضرر ہے اور ضرر کو دور کرنا قاضی کی ذمہ داری ہے۔

## ۵۔ شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ:

قاضی شقاق کو بنیاد بنا کر خلع کرسکتا ہے یا نہیں، اس سلسلہ میں حنفیہ، ایک قول میں امام احمد بن حنبل، اظہر روایت کے مطابق شافعیہ اور ظاہریہ کا مسلک یہ ہے کہ قاضی محض شقاق کو بنیاد بنا کر خلع یا تفریق کا فیصلہ نہیں کرسکتا، جس کی تفصیل سوال نمبر ۴ کے ضمن میں گذری، تاہم امام احمد بن حنبل کی دوسری روایت، امام مالک، شافعیہ کے قول ثانی اور فقہاء مدینہ کی رائے یہ ہے کہ قاضی کو اس کا اختیار ہے، اور معاصر فقہاء میں ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے اسی کو ترجیح دیا ہے، اور اس کی بنیاد دراصل ''ضرر'' ہے، اور تفریق کے ذریعہ ضرر و ظلم سے بچانا قاضی کی ذمہ داری ہے، اس لئے قاضی مرد کو خلع کے لئے آمادہ کرے اور حالات سنگین ہوں تو پھر فسخ وتفریق کی راہ اختیار کرے، اس بابت قاضی با اختیار ہے (المفصل فی احکام المرأۃ ۸ / ۴۱۳، المغنی ۷ / ۴۹، مغنی المحتاج ۳ / ۲۶۲، زاد المعاد ۳ / ۳۳)۔

اور اگر قاضی مجتہد ہو، صائب الرائے ہو اور اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور ضرر بھی متحقق ہو تو اسے عدول عن المذہب کا نام نہیں دیا جاسکتا، نیز یہ کہ قضاء کے باب میں دیگر مسائل میں بھی قاضی کے لئے مالکیہ کے قول کو اختیار کرنے کی سہولت حاصل رہی ہے، راقم الحروف کو ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ چونکہ ہندوستان کے حالات تفریق وطلاق کے سلسلہ میں نہایت پیچیدہ ہیں، اور مسائل کی نوعیت بھی حد درجہ متنوع ہوتی ہے، اس لئے خلع کے مسئلہ کو بھی دار القضاء اور قاضی سے مربوط کردیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

## ۶۔ خلع کے لئے حکم کا تقرر اور صلح کی کوشش:

خلع سے پہلے حکم کے تقرر اور اس کے بھیجنے سے متعلق ائمہ احناف کے یہاں کوئی واضح بات نہیں ملتی، تاہم مالکیہ اور شافعیہ کے یہاں یہ تفصیل ہے کہ اگر قاضی کو زوجین کے درمیان شقاق کے سلسلہ میں کوئی بات معلوم ہو تو زوجین کے پاس فیصلہ سے قبل حکمین کا بھیجنا واجب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے شقاق کی صورت میں حکمین بھیجنے کو امر کے صیغہ کے ساتھ استعمال کیا ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ امر کا صیغہ دوسرے معنی میں استعمال کا کوئی قرینہ نہ ہو تو وجوب ہی کے لئے ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شیخ رشید رضا مصری وغیرہ نے وجوب ہی کے لئے تسلیم کیا ہے، تفسیر ''المنار'' میں ہے:

''فی هذه الآیة وما یدل علیه لفظ ''فابعثوا'' وظاهر الأمر أن هذا التحکیم واجب، ولکنهم اختلفوا فیه، فقال: بعضهم إنه واجب، وبعضهم إنه مندوب'' (تفسیر المنار ۵ / ۱۷۹)۔

ابن عربی مالکی نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حکم مقرر کرنا واجب ہے، چنانچہ ابن عربی مالکی لکھتے ہیں: ''إذا علم الامام عن حال الزوجین الشقاق لزمه أن یبعث إلیهما حکمین'' (احکام القرآن لابی العربی ۱ / ۴۲۷) ''ومعنی ذلك أن بعث الحکمین واجب'' (المفصل فی احکام المرأۃ ۸ / ۴۱۶-۴۱۵)۔

اسی طرح جیسا کہ شافعیہ کا اوپر تذکرہ ہوا کہ وہ بھی وجوب ہی کے قائل ہیں چنانچہ ابو اسحاق شیرازی لکھتے ہیں: ''والبعث أی بعث الحکمین واجب کما صححه فی زیادة الروضة وجزم به الماوردی، وقال الأذرعی ظاهر نص ''الأم'' للشافعی الوجوب'' (مغنی المحتاج ۳ / ۲۶۱)۔

اگرچہ بعض اہل علم کے مطابق حکمین بھیجنے کا حکم استحبابی بھی ہوسکتا ہے، تاہم وجوب کا معنی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

## زوجین کے درمیان صلح وآشتی کا تقاضہ:

ازدواجی زندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ دائمی اور ثباتی ہو اور زوجین نکاح کے بعد تادم حیات خوشگوار زندگی گذاریں، نیز عمومی زندگی میں جب اسلام آپسی دشمنی اور ناچاقی، نیز اختلافات کو ختم کرکے مودت ومحبت کے ساتھ زندگی گذارنے کی تلقین کرتا ہے، تو زوجین کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو ختم کرنے کی جدوجہد عین مطلوب شریعت ہے، اس سلسلہ کی جملہ آیات وروایات، مثلاً:

''وإن خفتم شقاق بینهما فابعثوا حکما من أهله وحکما من أهلها إن یریدا اصلاحا یوفق الله بینهما'' (سورۂ نساء: ۳۵) کا تقاضہ ہے کہ قاضی کے لئے خلع یا فسخ وتفریق کا فیصلہ کرنے سے پہلے حکمین یا حکم کا مقرر کرنا اور صلح کی کوشش کرنا واجب ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں دار القضاء میں فیصلے سے پہلے اسی طریقہ کو اختیار کیا جاتا ہے، اس پوری بحث میں ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے بھی حکمین بھیجنے کے

وجوب کو ترجیح دیا ہے، اور راقم کی رائے میں یہی زیادہ انسب ہے، موصوف لکھتے ہیں:

''والراجح أن بعض الحكمين للنظر في شقاق الزوجين واجب، لأن قوله تعالى: ''فابعثوا'' صيغة أمر والأصل في الأمر أنه للوجوب إلا لقرينة تصرفه عن الوجوب إلى غيره، ولا قرينة هنا تصرفه إلى غير الوجوب، بل القرينة هنا التأكيد على إرادة الوجوب، وجوب بعث الحكمين'' (المفصل فی احکام القرآن ۸٫۴۲۶)۔

اس کے آگے تقاضہ اور مصلحت کو اجاگر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''لما هو معلوم من حرص الشريعة الإسلامية على الوفاق بين الزوجين و إدامة الرابطة الزوجية واستمرار الحياة الزوجية الهادئة السعيدة التي تقوم على المودة والوفاق. فهذه القرينة مع قوله تعالى: ''فابعثوا'' وهي صيغة أمر يجعل ترجيحنا واضحا جليا لا تردد فيه'' (حوالہ سابق)۔

**حکم کی تعداد:**...... قرآن کریم کی آیت سے بظاہر تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ دو حکم ہونے چاہئیں، لیکن اگر زوجین اس بات پر اتفاق کرلیں کہ ایک ہی حکم کافی ہے تو ایک ہی حکم کافی ہونے کی بات مالکیہ نے کہی ہے، چنانچہ شرح صغیر میں دردیر نے لکھا ہے: ''وأنهما إذا رضيا بإقامة حكم واحد بلا رفع كفى'' (الشرح الصغير ۲/۴۲۰، بحواله المفصل ۸/۴۲۱)۔

**اگر حکم مقرر کرنا دشوار ہو:**...... یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بسا اوقات حکم مقرر کرنا اور زوجین کے پاس بھیجنا بھی قاضی کے لئے دشوار ہوتا ہے، اور بالخصوص ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کہ قوت قاہرہ مفقود ہونے کی وجہ سے شوہر کو حاضر کرنا اور افراد مقرر کرنا بڑا چیلنج بن جاتا ہے، ایسے حالات میں اگر قضاء کے باب میں اس کو ضروری تصور کیا جائے تو نظام قضاء معطل ہو کر رہ جائے گا، اس لئے ایسا خیال ہوتا ہے کہ قاضی کو حکم مقرر کرنے میں اگر دشواری ہو تو بغیر اس کے بھی قاضی خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے، اس کی گنجائش ہونی چاہئے، اور اس صورت میں آیت قرآنی ''فابعثوا'' کا امر کا صیغہ استحباب اور مندوب کے لئے مانا جائے، جیسے بعض مفسرین کی رائے ہے، نیز اس باب میں حضرت سیدنا عمر فاروق کے عمل سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے جو بجائے خود حجت ہے، اور جمہور فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، اگرچہ یہاں حاکم سے مراد امیر المسلمین اور خلیفہ ہے، چنانچہ موسوعہ فقہیہ میں ہے:

''ذهب جمهور الفقهاء إلى جواز الخلع بحاكم وبلا حاكم وهو قول عمر رضي الله عنه. فقد روى ابن أبي شيبة عن طريق خشيمة بن عبد الرحمن موصولا'' أن بشر بن مروان أتي في خلع كان بين رجل وامرأة فلم يجزه. فقال له عبد الله بن شهاب الخولاني: قد أتي عمر في خلع فأجازه'' ولأن الطلاق من حيث النظر جائز بلا حاكم. فكذلك الخلع'' (موسوعه فقهيه ۱۹/۲۴۴)۔

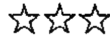
البتہ یہ مسئلہ چونکہ قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے، اس لئے اس بات کی تحقیق ضروری ہے کہ حکم کا مقرر کیا جانا اور بھیجنا اجتہادی ہوسکتا ہے یا نہیں، اور سلف، بطور خاص قاضی ابو یوسف اور قاضی شریح رحمہما اللہ کے یہاں کیا معمول رہا ہے، اور وہ ممالک جہاں مسلمانوں کے لئے قوت قاہرہ نہیں ہے، ان ملکوں میں اس میں رعایت ہوسکتی ہے یا نہیں، والله الموفق وهو المستعان وإليه المرجع والمآب۔

## ۷۔ ضرورۃً دوسرے مذاہب پر عمل:

قضاء کے باب میں حنفیہ نے دوسرے مذاہب، بالخصوص مفقود الخبر کے مسئلہ میں مالکیہ کے قول کو اختیار کیا ہے، اسی طرح اقامت دعوی اور ثبوت بینہ کے بعد عدالت میں مدعی علیہ کی غیر حاضری میں مقدمہ کی کاروائی اور فیصلہ کو حنفیہ نے درست قرار نہیں دیا ہے، مگر شافعیہ نے مدعی علیہ کی حاضری کو اس کے لئے شرط قرار نہیں دیا ہے، اس صورت میں مقدمہ کی کاروائی میں تاخیر کے پیش نظر، چونکہ عام طور سے مدعی علیہ کی جانب سے ٹال مٹول کا مشاہدہ ہے، امام ابو یوسف نے جواز کا قول اختیار کیا ہے، یا یہ کہئے کہ امام ابو یوسف کا قول امام شافعی کے مطابق ہے، اس کو حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے بھی اسلامی عدالت میں ''جامع الفصولین'' کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

''جامع الفصولين عن الخانية غاب المدعى عليه بعد ما برهن عليه أو غاب الوكيل بعد ثبوت البينة قبل التعديل أو مات الوكيل ثم عدلت تلك البينة لا يحكم بها، وقال أبو يوسف: يحكم'' (اسلامی عدالت ۱/۳۸۴)۔

اس لئے اس باب میں بھی اگر ضرورت داعی ہو تو قاضی کے لئے شافعیہ جو کہ خلع کے باب میں زیادہ وسعت کے قائل ہیں، ان کی رائے کو اختیار کر کے خلع کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے، اور بالخصوص جبکہ عورت بینہ پیش کرنے سے قاصر ہو اور قاضی کی رائے میں زوجین کے درمیان اتنی نفرت پائی جاتی ہو کہ عورت کا شوہر کے پاس رہنا دشوار معلوم ہوتا ہو، اور علاحدہ نہ ہونے کی صورت میں دونوں میں سے کسی ایک کے کسی بڑے ضرر اور مفسدہ میں پڑ جانے کا قوی امکان ہو، تو دفع ضرر اور رفع ظلم جو کہ قاضی کا فریضہ ہے، کو بروئے کار لاتے ہوئے شوہر کی رضامندی نہ ہونے کے علی الرغم علاحدگی کا فیصلہ کرے، اور اگر کسی فتنہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو تو عورت کو خلع کی بنیاد پر علاحدہ کردے اور شوہر کے جملہ حقوق محفوظ کر لے اور خاوند کے نام نوٹس جاری کردے کہ اپنے واجبات یہاں سے لے جاؤ، نیز اس سلسلہ میں قاضی کو اس بات کا خطرہ بھی محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مرد عدالتی کارروائی کرے گا، اگر عدالتی کارروائی کرتا بھی ہے تو چونکہ اپریل ۲۰۰۶ء سے ”تحفظ قانون خواتین“ نافذ ہے، اس لئے قاضی جو لکھ کردے گا عدالت بھی اسی کی پابند ہوگی۔



# خلع بقائے باہم
## کچھ نئے سوالات کے جوابات

مفتی محمد ارشد فاروقی [1]

**تمہید:**...... خالق کائنات نے کل کائنات کو انسان کے لئے مسخر فرمایا اور تسخیر کے ذریعہ اشیاء اسماء اور مسمیات کے فوائد اور منافع کا اظہار روز اول سے مسلسل ہو رہا ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔

**باہم مربوط عنصر:**...... انسانیت کے نظام کو باری تعالیٰ نے رجال و نساء کے دو مستقل باہم مربوط عنصر کے دھاگے میں پرو دیا اور نسل انسانی کی بقاء اور ارتقاء کے بنیادی مقصد کے لئے ہر دو صنف میں ایک دوسرے کے لئے کشش اور جذباتی رجحان ودیعت فرمایا اور جنسی و قلبی اور جذباتی تسکین کے لئے ایک ہی طریقہ ''نکاح'' تجویز کیا گیا (لتسکنوا إلیها)، عالم کے توازن اور نقطۂ عدل کو قائم رکھنے کے لئے شادی کرنا، اہل و عیال میں زندگی گذارنا، منشاء الٰہی کی تکمیل اور رب کی اطاعت کا تقاضا ہے۔

**استمرار و دوام مطلوب ہے:**...... نکاح سے قبل انتخاب و اختیار کا مکمل اختیار دیا گیا اور عقد نکاح کی لازمی شرط استمرار و دوام ہے، یہ تا حیات معاملہ نیکی کے فراواں جذبات کے تحت کیا جاتا ہے اور وقتی موقت نکاح حرام ہے، متعہ کی مشہور صورت اہل سنت والجماعت کے نزدیک حرام اور اخت زنا ہے، کہتے ہیں کہ شیعہ کے یہاں بھی اس کا رواج نہیں ہے۔

**دو آتشہ ہے:**...... نکاح میں معاملہ کا پہلو طاعت کے پہلو سے دو آتشہ ہے، نکاح کے لئے عقد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، جس طرح عقیدے کی پختگی و صلابت مطلوب ہے، اسی طرح نکاح کی پختگی و پائیداری مقصود ہے۔

**دو قالب یک جان:**...... نکاح کو زواج اور اس رشتہ میں مربوط ہونے والوں کو زوجین کہتے ہیں کہ دونوں جوڑے ہیں، یعنی ایک کا تصور دوسرے کے بغیر نہیں ہوسکتا، دونوں کو ازدواجی رشتے نے دو قالب یک جاں کر دیا ہے۔

**سارے شعبے درخشاں:**...... رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے سارے شعبے درخشاں مینارۂ نور و ہدایت ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی کی عطر بیز خوش گوار اداؤں نے حرم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل جیت لیا، چمن حرم رسالت کے پودوں کے گلوں سے جو دمکتا خوشبو بکھیرتا گلدستہ تیار ہوا وہ تمام انسانی جوڑوں کی زندگی کو خوشبو دینے کے لئے ہمہ وقت تازہ ہے۔

**خاتمہ عقد بھی نعمت ہے:**...... نکاح کے ذریعہ جو گل کھلتے ہیں وہ کبھی نہ مرجھانے کے لئے اور پژمردہ نہ ہونے کے لئے ہوتے ہیں، سدا شاداب رہنا مقصد ہوتا ہے پھر بھی پھولوں کی سیج میں کبھی کانٹے نکل آتے ہیں اور حلق کی پھانس بن جاتے ہیں، مزاجی اختلاف منافرت کی شکل اپنا لیتے ہیں اور سانپ بن کر ڈسنے لگتے ہیں، ایسے نازک موڑ پر دونوں کی زندگی بچانے کے لئے شریعت نے بندھے رشتے کو توڑنے کی اجازت دے کر احسان کیا ہے۔

**چند صورتیں:**...... عقد نکاح کو ختم کرنے کے لئے طلاق، تفریق و فسخ، متارکہ اور خلع کی صورتیں موجود ہیں۔

**زیر بحث صورت:**...... رشتۂ ازدواج ختم کرنے کی ان صورتوں میں ایک صورت ''خلع'' ہے، خلع کے متعلق مختلف مکاتب فقہ کے مسالک اور تشریحات کی

[1] صدر شعبۂ افتاء، جامعہ امام محمد انور شاہ، دیو بند

روشنی میں دور حاضر کے کچھ نزاعی مسائل کے حل تلاش کرنے، زوجین کے اختلاف کو ختم کرنے اور مشکلات سے دو چار خواتین کو مظالم سے بچانے کے نیک مقصد کے لئے اسلامک فقہ اکیڈمی نے چند سوالات اٹھائے ہیں: ۱۔ خلع کی فقہی واصطلاحی تعریف:

**لغوی معنی:**...... لغت میں خلع کا معنی اتارنا ہے، قرآن کریم میں سیدنا موسی علیہ السلام وعلی نبینا کو "فاخلع نعلیك (اپنے جوتے اتاریں) سے خطاب کیا گیا (طٰہٰ: ۱۲)۔

**خلع کی اصطلاحی تعریف:**...... خلع عورت سے کچھ لے کر اس کو نکاح سے آزاد کردینے کا نام ہے (الدر المختار علی ہامش الرد ۲/ ۵۵۶، فتح القدیر ۳/ ۱۹۹)۔

**خلع کا ثبوت:**...... قرآن کریم میں ہے: "فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ" (بقرہ: ۲۲۹) (اگر زوجین اللہ کی قائم کی ہوئی حدود کو قائم رکھنے کے سلسلے میں اندیشہ مند ہوں تو اس میں کوئی قباحت نہیں کہ عورت کچھ دے کر رہائی حاصل کرلے)۔

**حدیث:** صحیح بخاری کی روایت ہے: "ثابت بن قیس کی بیوی بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئیں اور کہنے لگیں اے اللہ کے رسولؐ میں ثابت (شوہر) کے اخلاق ومذہب کے بارے میں تبصرہ نہیں کرتی پر مجھے ناشکری کا اندیشہ ہے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کیا آپ ان کا باغ واپس کریں گی؟ انہوں نے کہا ضرور! باغ لوٹا دیا تو رسول اللہ نے ثابت کو حکم دیا تو انہوں نے ان کو جدا کردیا)" (صحیح البخاری ۲/ ۷۹۴)۔

**اجماع:**...... خلع کے مشروع ہونے پر علماء امت کا اجماع واتفاق ہے، صرف ابوبکر بن عبداللہ مزنی کا ایک شاذ قول ہے کہ شوہر کے لئے بیوی سے طلاق کے بدلے کچھ لینا جائز نہیں (ہدایۃ المجتہد ۲/ ۸۲، بدائع الصنائع ۳/ ۳۳۴)۔

## خلع کی حقیقت:

خلع کی حقیقت احناف، مالکیہ کے نزدیک طلاق ہے اور یہ بات سیدنا عمرؓ، سیدنا عثمانؓ، سیدنا علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ سے منقول ہے۔

سیدنا شافعی کے اس بارے میں دو قول ہیں: ایک قول حنفیہ کے موافق تو دوسرے قول کے مطابق خلع فسخ ہے، عبداللہ بن عباسؓ سے ایسی ہی روایت ہے، حنابلہ کے یہاں ایک قول طلاق کا، دوسرا فسخ کا ہے۔

خلاصہ یہ کہ خلع کو طلاق مانیں یا فسخ تو احناف طلاق مانتے ہیں اور شوافع فسخ، اس اختلاف کا نتیجہ اس شخص پر مرتب ہوگا جس نے بیوی سے خلع کے بعد نکاح کیا تو حنفیہ کے قول کے مطابق اب اسے صرف دو طلاق کا اختیار رہے گا اور شوافع کے یہاں تین طلاق کا حق رہے گا۔ اس لئے اب اگر دو طلاق دے تو حرمت مغلظہ ثابت ہوجائے گی، جبکہ تحقیق یہی ہے کہ شوافع کے یہاں بھی طلاق ہے لیکن شوافع کے یہاں حرمت مغلظہ ثابت نہیں ہوگی، وجہ اختلاف خلع کی حقیقت کی تعیین ہے، احناف کے یہاں طلاق ہے تو شوافع کے یہاں فسخ ہے۔

## خلع ایک طلاق بائن یا فسخ:

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ حنفیہ کے نزدیک خلع سے ایک طلاق بائن واقع ہوتی ہے اور حقیقت خلع طلاق ہے اور شوافع کے یہاں فسخ ہے تو یہ بات بھی عیاں ہوگئی کہ خلع کے سلسلے میں عورت خود مختار نہیں ہے بلکہ خلع عورت کی طرف سے مالی معاوضہ کے عوض میں آزاد کرنے کی درخواست ہے، حنفیہ کے مسلک کے اعتبار سے خلع کرنے کی صورت میں طلاق بائن واقع ہوجائے گی اور شوافع کے نزدیک نکاح فسخ ہوجائے گا۔

۲۔ دوسرا سوال یہ کیا گیا کہ "بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ جیسے مرد کو طلاق دیئے جانے کا حق حاصل ہے، اسی طرح عورت کو خلع لینے کا حق حاصل ہے، یہ بات کس حد تک درست ہے؟

اس سوال کے دو جزء ہیں ایک طلاق اور اس کا حق کسے ہے؟ دوسرا خلع اور اس کا حق کسے ہے؟

**پہلا جزء:**...... پہلے جزء کا جواب یہ ہے کہ طلاق دینے کا حق شوہر کو حاصل ہے یا شوہر جسے طلاق کا حق تفویض کردے حتی کہ اگر بیوی کو طلاق تفویض کردے تو اسے بھی اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوجائے گا (بدائع الصنائع، بدایۃ المجتہد، المغنی، المبسوط)۔

**دوسرا جزء:**...... دوسرے جزء کا جواب یہ ہے کہ خلع صرف میاں بیوی کی باہمی رضامندی سے ہوسکتا ہے اور ان میں سے کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں

کرسکتا، عورت مالی معاوضہ دے کر ملک نکاح سے آزاد کرنے کی درخواست کرتی ہے، شوہر قبول کرتا ہے تو علیحدگی بہ شکل خلع ہوجاتی ہے۔

دونوں کے ایجاب وقبول سے خلع انجام پاتا ہے۔ بدائع الصنائع میں ہے: ''وأما رکنه فهو الإيجاب والقبول لأنه عقد على الطلاق بعوض فلا تقع الفرقة ولا يستحق العوض بدون القبول''۔

**اجزائے ترکیبی:** ...... خلع کے اجزاء ترکیبی ایجاب وقبول ہیں کیوں کہ معاوضہ لے کر طلاق دینے کا معاملہ ہے تو بغیر قبول کئے نہ جدائی ہوگی نہ بدل کا استحقاق ہوگا (بدائع الصنائع ۳/ ۲۲۹)۔

**باہمی رضامندی:** ...... خلع صرف زوجین کی باہمی رضامندی سے ہوسکتا ہے، نہ شوہر کو خلع کا مستقل حق حاصل ہے، نہ بیوی کو یکطرفہ خلع کا حق حاصل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ عورت اپنے طور پر خلع کے نام پر مرد کے نکاح سے آزاد نہیں ہوسکتی اور خلع عورت کے حق میں مرد کے حق میں طلاق کی طرح بالکل نہیں ہے اور اس حقیقت کے قائل تمام جمہور ائمہ وفقہاء ہیں۔

**مسلک احناف:** ...... شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں: "والخلع جائز عند السلطان وغيره لأنه عقد يعتمد على التراضي" اور خلع عدالت میں بھی درست ہے اور اپنے طور پر بھی، اس لئے کہ یہ ایسا عقد ہے جس کی اساس باہمی رضامندی پر ہے (السرخسی: المبسوط ۶/ ۱۷۳، بدائع الصنائع، فتاویٰ عالمگیریہ)۔

**مسلک شافعیہ:** ...... سیدنا امام شافعیؒ کی کتاب الام میں یہ عبارت درج ہے "لأن الخلع طلاق فلا يكون لأحد أن يطلق عن أحد أب و لا سيد ولا ولي ولا سلطان" کیوں کہ خلع طلاق کے حکم میں ہے، لہٰذا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کی طرف سے طلاق دے، نہ باپ کو یہ حق ہے، نہ سرپرست کو، نہ آقا کو اور نہ حاکم کو (کتاب الام ۵/ ۲۰۰)۔

**مسلک مالکیہ:** ...... علامہ ابن رشد مالکیؒ رقم طراز ہیں: ''جہاں تک مسئلہ خلع کا ہے کہ کس حالت میں درست ہوتا ہے اور کون سی حالت میں نادرست تو جمہور فقہاء کا اتفاق ہے کہ خلع زوجین کی باہمی رضامندی مرد کی طرف سے اسے نقصان پہنچانا نہ ہو'' (بدایۃ المجتہد، ج ۲/ ۶۸)۔

**مسلک حنابلہ:** ...... علامہ موفق الدین بن قدامہؒ کی تحریر ہے: ولأنه معاوضة فلم يفتقر إلى السلطان كالبيع والنكاح ولأنه قطع عقد بالتراضي أشبه الاقالة اور اس لئے کہ یہ عقد معاوضہ ہے، لہٰذا اس کے لئے حاکم وعدالت کی طرف مراجعت کی ضرورت نہیں، جیسا کہ بیع اور نکاح، نیز اس لئے کہ خلع باہمی رضامندی سے عقد کو ختم کرنے کا نام ہے، لہٰذا ''اقالہ'' کے مشابہ ہے (المغنی: ۷/ ۵۲)۔

**مسلک ظواہر:**

علامہ ابن حزم لکھتے ہیں: ''خلع فدیہ دے کر جان چھڑانے کا نام ہے۔ جب عورت اپنے شوہر کو ناپسند کرے اور اسے ڈر ہو کہ وہ شوہر کا پورا حق ادا نہ کرسکے گی یا اسے خوف ہو کہ شوہر اس سے نفرت کرے گا اور اس کے پورے حقوق ادا نہیں کرے گا تو اسے اختیار ہے کہ وہ شوہر کو کچھ فدیہ دے، اور اگر شوہر راضی ہو تو وہ اسے طلاق دیدے اور اگر شوہر راضی نہ ہو تو نہ شوہر کو مجبور کیا جاسکتا ہے نہ عورت کو، خلع تو صرف باہمی رضامندی سے جائز ہوتا ہے۔ ... '' (المحلی ۱/ ۵ ۲۳)۔

تیسرے سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت شوہر کی جانب سے شدید نفرت کرے اور ازدواجی زندگی گذارنے کے لئے تیار نہ ہو اور اس نفرت کے اسباب اشخاص کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں جیسے عورت کی تعلیم کا معیار بلند ہوگیا تو اب وہ عار محسوس کرتی ہے، زدوکوب کی مختلف نوعیتیں جن کا ثبوت پیش کرنا دشوار ہو تو ان حالات میں عورت کس طرح شوہر سے چھٹکارا پاسکتی ہے۔

**پہلی صورت:** ...... ایسے احوال میں اولیں حل تو یہی ہے کہ بیوی شوہر سے طلاق لینے کی کوشش کرے اور شوہر کے لئے بھی بہتر یہی ہے کہ شرعی طلاق دیدے۔

**دوسری صورت:** ...... دوسری صورت یہ ہے کہ اگر شوہر طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو بیوی کچھ مالی معاوضہ دے کر مثلاً مہر معاف کر کے خلع لے لے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ ۔ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَأْخُذُوْا مِمَّا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّا اَنْ يَّخَافَا اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا

تَعْتَدُوْهَا وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ:۲۲۹)۔ (طلاق دو مرتبہ ہے، پھر خواہ رکھ لینا قاعدہ کے موافق خواہ چھوڑ دینا خوش عنوانی کے ساتھ اور تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ کچھ بھی لو اس میں سے جو تم نے ان کو دیا تھا مگر یہ کہ میاں بیوی دونوں کو احتمال ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ضابطہ کو قائم نہ کر سکیں گے، سو اگر تم لوگوں کو یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی قائم نہ کر سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا اس چیز میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑا لے، یہ خدائی ضابطے ہیں، سو تم ان سے باہر مت نکلنا، جو شخص خدائی ضابطوں سے باہر نکل جائے ایسے ہی لوگ اپنا نقصان کرنے والے ہیں)۔

بطور دلیل صحیح بخاری کی روایت جس میں امراۃ (جمیلہ) ثابت کا تذکرہ ہے:

عن ابن عباس ان امرأة ثابت بن قيس اتت النبي صلى الله عليه وسلم۔ (یہ حدیث خلع کی تفصیل میں گذر چکی ہے)

تیسری صورت:...... اگر شوہر طلاق دینے اور بیوی کی پیشکش کے مطابق خلع پر بھی تیار نہ ہو تو تیسری صورت فسخ نکاح کی ہے، قاضی شریعت اختیارات کا استعمال کرے اور زوجین کے نکاح کو فسخ کر دے۔

## ۴۔ شقاق سے کیا مراد ہے؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا (نساء:۳۵)۔

اس آیت کریمہ میں کلمہ ''شقاق'' کا استعمال ہوا ہے جس سے مراد شدید اختلاف ہے، زوجین کے درمیان ایسا اختلاف جس کے نتیجے میں ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی دشوار ہو جائے، جس کی تفصیل ابن قدامہ کی اس تحریر سے ملتی ہے:

''حاصل گفتگو یہ ہے کہ جب میاں بیوی کے درمیان شدید اختلاف پایا جائے تو حاکم (قاضی) حالات کا تجزیہ کرے، اگر اختلاف کی علامتیں بیوی کے کردار میں نمایاں ہوں تو یہ ''نشوز'' میں داخل ہے جس کا حکم گذر چکا اور اگر شوہر کی طرف سے اختلاف کی بات ہے تو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس جوڑے کو دیانت دار لوگوں کی نگرانی میں رکھا جائے جو شوہر کو بیوی کے حقوق ضائع کرنے سے روکیں اور زیادتی سے باز رہنے کی تلقین کریں اور یہ صورت اس وقت بھی اختیار کی جائے جب ان میں سے کوئی ایک دوسرے پر ظلم وجور اور تعدی کا دعویٰ کرے، اگر یہ ممکن نہ ہو اور دونوں کے اختلاف سے شر پھوٹے ٹکراؤ کا اندیشہ ہو، نافرمانی کا خطرہ بڑھے تو قاضی حکم کا انتخاب کرے، دونوں گھرانے سے وہ حالات کا جائزہ لیں، مصالحت کے امکانات روشن ہوں تو صلح صفائی کرائیں ورنہ علیحدگی کی راہ اپنائیں'' (المغنی ۷/۴۹)۔

**۵۔ کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کر سکتا ہے؟**...... شقاق کی وجہ سے قاضی خلع کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ضرور ہے اور تمام مکاتب فکر سے استفادہ مشکلات کے حل کے لئے ضروری ہے، البتہ تطبیق ذرا دشوار کام ہے، اس لئے ایسے مواقع پر انفرادی رائے کے بجائے اجتماعی رائے مبنی بر احتیاط ہے۔

**حنفی مسلک:**...... سیدنا امام ابوحنیفہ خلع کا اختیار عورت کی درخواست پر مکمل مرد کے ہاتھ میں مانتے ہیں، اس لئے قاضی خود یا اس کی طرف سے مقرر کئے ہوئے حکم بطور خود عورت کو طلاق دینے کے مجاز نہیں ہیں۔

**دلائل:**

چوں کہ طلاق کا اختیار مردوں کو ہے اور خلع کا بھی، جو در اصل مال کے بدلے طلاق ہے، اس کا اختیار بھی مرد ہی کو ہوگا اور قرآن کریم کی وہ آیت جس میں شقاق و حکم بنانے کی بات گذری وہ مستدل ہے (احکام القرآن للجصاص ۲/۱۹۲)۔

حنفیہ کا استدلال حضرت علیؓ کے طرز عمل سے بھی ہے، انہوں نے حکم کی تعیین ایسے ہی مقدمہ میں کی اور ان سے فرمایا ان دونوں میں صلح کرا سکو تو کرا دو، اگر علیحدگی کی ضرورت معلوم ہو تو علیحدہ کر دو، عورت نے رضامندی کا اظہار کیا، مرد نے انکار کیا تو سیدنا علیؓ نے مرد سے فرمایا بغیر فیصلے کے یہاں سے جا نہیں سکتے۔

**مالکی مسلک:**...... قاضی بذات خود یا اپنے حکم کے ذریعے خلع کرانے کا اختیار رکھتا ہے اور شقاق کے وقت اگر شوہر خلع پر آمادہ نہ ہو اس وقت بھی قاضی کو اختیار

ہے کہ خلع اپنے طور پر دے اور تفریق کردے۔

**دلائل:**

سورہ نساء کی پانچویں آیت میں حکم اور ان خفتم کے الفاظ سے استدلال کرتے ہیں، جس کی تفصیل خلع کی حقیقت کی بحث میں گذری، یہی رائے امام شافعیؒ، عبداللہ بن عباسؓ، سیدنا عثمانؓ، اوزاعیؒ، اسحاقؒ جیسے اکابر فقہاء وصحابہؓ کی ہے۔

پچھلے صفحات میں ائمہ کرام کے مسالک اور ان کے دلائل کا ذکر کیا گیا۔

۶۔ جن حضرات کے نزدیک خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں ان کے یہاں کیا قاضی کی طرف سے حکمیں مقرر کیا جانا ضروری ہے؟ کیا حکمین کی کوشش کے بعد ہی خلع معتبر ہوگا یا قاضی خود فیصلہ کرسکتا ہے اور کیا ایک حکم کا تقرر کافی ہوگا؟

اس سوال کی تین شقیں ہیں:

(الف) قاضی خود فیصلہ کرسکتا ہے؟ قاضی اپنے اختیارات کے ذریعے حکم کی تعیین کرتا ہے اور قاضی کی طرف سے سونپے اختیار کی وجہ سے حکم کو فیصلے کا اختیار ہوتا ہے۔ درحقیقت قاضی ہی کا فیصلہ تسلیم کیا جاتا ہے، اس لئے جو اختیار دینے کا اہل ہے وہ اختیار اسے خود حاصل ہے۔ اگر قاضی خود فیصلہ صادر کرتے تو وہ اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کرے گا۔

(ب) حکم کا تقرر ضروری ہے؟ اصل مقصد میاں بیوی کے مابین مصالحت کی کوشش کرنا ہے اور اس مقصد کے لئے قرآنی ہدایت کے مطابق زوجین کے گھرانے کے حکم زیادہ بہتر کردار ادا کرسکتے ہیں، اس لئے حکم کی خدمات حاصل کی جائیں لیکن اگر اصل مقصد قاضی حکم مقرر کئے بغیر حاصل کرسکتا ہے تو حکم کی تقرری ضروری نہیں ہوگی۔

(ج) کیا ایک حکم کفایت کرے گا؟ ایک حکم کی تقرری بھی کافی ہوگی گو بہتر دو حکم کا انتخاب ہے کہ قرآن کریم میں دو حکم کی بات کہی گئی ہے (خلاصہ تفسیر قرطبی)۔

۷۔ حنفیہ کے یہاں خلع بعوض مال طلاق ہے اور اس کا حق عورت کی درخواست پر مرد کو حاصل ہے۔

عورت شوہر سے متنفر ہو اور یکجا رشتہ کے حقوق کی ادائیگی دشوار ہو تو اس ضیق سے نجات پانے کے لئے کئی صورتیں احناف کے یہاں موجود ہیں:

(الف) عورت یا اس کے ہمدرد شوہر سے طلاق کی درخواست کریں اور ایسے احوال میں بہتر طریقے سے شوہر بیوی کو جدا کردے اور تسریح باحسان پر عمل کرے۔

(ب) شوہر طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو بیوی مال کی پیشکش کرکے خلع حاصل کرلے اور شوہر یہ صورت اختیار کرکے بیوی کو آزاد کردے۔

(ج) اگر شوہر طلاق وخلع دونوں پر آمادہ نہ ہو تو حکم کے ذریعے مصالحت یا مفارقت کی کوشش کی جائے۔

(د) مصالحت یا مفارقت میں بھی کامیابی نہ ملے تو فسخ نکاح کا آخری نسخہ استعمال کیا جائے۔

جب اس جزئیہ کے حل کی یہ صورتیں موجود ہیں تو دوسرے مسلک کی طرف عدول کی ضرورت نہیں ہے اور فسخ مستقل حل موجود ہے تو خلع کے معنی وصورت کی تبدیلی کی ضرورت نہیں پائی جاتی۔ (فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا)

☆☆☆

# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

مفتی محمد خالد حسین نیموی قاسمی [1]

الحمد لله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلی آله وصحبه أجمعین۔

## اسلام میں رشتوں کے استحکام کی اہمیت:

اسلام کی نظر میں شوہر اور بیوی کے درمیان موانست و یکجہتی، الفت و محبت اور ہم آہنگی و قدر شناسی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن کریم نے نکاح کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: "ومن آیته أن خلق لکم من أنفسکم أزواجاً لتسکنوا إلیها وجعل بینکم مودة ورحمة" (الروم: ۲۱) (کہ اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے تمہاری بیویاں پیدا کیں، تاکہ تمہیں ان سے مل کر سکون حاصل ہو اور تمہارے درمیان ایک دوسرے کے لیے محبت و ہمدردی پیدا کی)۔ سکون و اطمینان کا حصول اور باہمی الفت و محبت خاندانی زندگی کے استحکام کے لیے لازمی عنصر ہے، خاندان انسانی سماج کا بنیادی پتھر ہے۔ خاندان ایک مرد اور ایک عورت سے بنتا ہے؛ اسی سے دیگر سارے رشتے مثلاً: ماں، باپ، بھائی، بہن اور بیٹا بیٹی وغیرہ پیدا ہوتے ہیں، لہٰذا میاں بیوی کے باہمی رشتوں کی خوشگواری اور اس کا استحکام سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ رشتہ مستحکم رہتا ہے تو پورا خاندان ایک دوسرے سے جڑا رہتا ہے اور آپس کی محبت قائم رہتی ہے اور مختلف پُرسکون خاندانوں سے تشکیل پانے والا معاشرہ فروغ پاتا ہے اور رحمت و برکت سے مالا مال ہوتا ہے، اسی لیے شوہر کو حکم دیا گیا: "وعاشروهن بالمعروف" (نساء: ۱۹)۔ (اور عورتوں کے ساتھ خوش اسلوبی کے ساتھ زندگی گزارا کرو)۔

اسی طرح رشتۂ نکاح کو توڑنے والی ہر کوشش کو مبغوض اور شیطانی عمل قرار دیا گیا ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اے معاذؓ! اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر غلام کو آزاد کرنے سے زیادہ کوئی محبوب چیز اور طلاق سے زیادہ کوئی مبغوض چیز نہیں پیدا کی ہے" (دارقطنی، مشکوۃ: ۲۸۴)۔

## مخصوص حالات میں طلاق وخلع کی اجازت:

معلوم ہوا کہ میاں بیوی کے باہمی رشتوں کو توڑنے والا عمل یعنی طلاق اللہ کے نزدیک مباح امور میں سب سے ناپسندیدہ عمل ہے، لیکن جب میاں بیوی کے درمیان ہم آہنگی نہیں ہوتی ہے، اور بالآخر دونوں میں نفرت و عداوت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور خطرہ قوی ہوجاتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک حدود اللہ کو توڑ بیٹھے گا اور آمادۂ ظلم ہوجائے گا، تو افہام و تفہیم، ترک فراش، ضرب غیر مبرح اور بعث حکم کے مراحل سے گزرنے کے بعد اسلام نے شوہر کو طلاق کا اختیار اور عورت کو خلع کا اختیار دیا ہے۔ تاکہ خوش اسلوبی سے رشتہ نکاح ختم ہوجائے، کڑواہٹوں کے باوجود محض رسمی طور پر رشتہ کے برقرار رکھنے کو۔ جیسا کہ دوسرے مذاہب میں اس کا رواج ہے۔ اس لیے لازم نہیں کیا گیا کہ اس میں، بہت سی مضرتوں کا احتمال اور بہت سے حادثات کے پیش آنے کا امکان ہوتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شوہر طلاق دینے کے لیے کسی حال میں تیار نہیں ہوتا ہے اور ظلم و اذیت رسانی سے بھی باز نہیں آتا ہے۔ ایسی صورت میں رفع ظلم کے لیے قاضی شریعت یا امیر وسلطان کو نکاح فسخ کرنا پڑتا ہے۔ طلاق، خلع، فسخ و تفریق کے مسائل تفصیل کے ساتھ کتب فقہ و فتاویٰ میں مذکور ہیں، بعض لحاظ سے خلع اور فسخ و تفریق کے مسائل اور ان کی بعض جہات از سرِ نو غور و فکر اور تحقیق و تمحیص کے متقاضی ہیں۔ ذیل کے سطور اسی سلسلہ کی ایک کوشش ہیں۔

## عورتوں کا خلع لینے کا حق شوہر کی رضامندی سے مشروط ہے:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جیسے مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے، اسی طرح عورت کو خلع لینے کا حق حاصل ہے۔ اس خیال میں محض اس حد تک صداقت ہے کہ شوہر سے نااتفاقی اور مزاج کی ہم آہنگی نہ ہونے کی صورت میں عورت اپنے شوہر سے خلع دینے کا مطالبہ کرسکتی ہے اور اپنے مطالبہ کو باوزن بنانے

[1] دار الافتاء مدرسہ بدر الاسلام بیگوسرائے، بہار

کے لیے اور شوہر کو اس مطالبہ کی تکمیل پر آمادہ کرنے کے لیے اپنے حقوق کلی یا جزوی طور پر معاف کر سکتی ہے، لیکن وہ از خود خلع نہیں ہے، جس طرح طلاق کے معاملہ میں شوہر مستقل بالذات ہے۔ اور چند اخلاقی حدود کی رعایت کرتے ہوئے وہ جب چاہے، وہ اپنے حق طلاق کا استعمال کر سکتا ہے۔ جب کہ خلع کے باب میں عورت کو یہ اختیار نہیں ہے۔ خلع کے ذریعہ رشتۂ نکاح ختم کرنے کے لیے ہر حال میں شوہر کی رضامندی لازمی ہے۔ حنفیہ کے تمام متون، شروح اور کتب فتاویٰ میں یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ علامہ کاسانیؒ رقم طراز ہیں: ''وأما ركنه فهو الإيجاب والقبول. لأنه عقد على الطلاق بعوض فلا تقع الفرقة ولا يستحق العوض بدون القبول'' (بدائع ۳،۲۲۹) (خلع کا رکن ایجاب اور قبول ہے۔ اس لیے کہ وہ عوض لے کر طلاق دینے کا معاملہ ہے: تو بغیر رضامندی کے نہ تو تفریق ہو سکتی ہے اور نہ ہی شوہر عوض کا مستحق بن سکتا ہے)۔

علامہ شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں: ''نکاح کا فسخ کرنا آپسی رضامندی سے بھی ممکن ہے، ایسا خلع کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ اس معاملہ کو قیاس کیا گیا ہے خرید و فروخت پر کہ وہ بھی باہمی رضامندی سے فسخ ہو جاتے ہیں'' (المبسوط: ۶/۱۷۱)۔

مذکورہ عبارتوں سے واضح ہے کہ خلع ایک عقد ہے جو دوسرے عقود بیع و شراء، اجارہ و نکاح کی طرح جانبین کی مکمل رضامندی پر موقوف ہے، خلع کے لیے فسخ و تفریق کے مسائل کی طرح قضائے قاضی شرط نہیں ہے، بلکہ زوجین اپنے طور پر یا اپنے اولیاء سے مل کر بھی یہ معاملہ کر سکتے ہیں اور اپنے صوابدید کے مطابق خلع کا عوض مقرر کر سکتے ہیں۔

دیگر مسالک فقہیہ میں بھی تقریباً اس رائے پر اتفاق ہے کہ عورت از خود شوہر کی مرضی کے خلاف خلع کا معاملہ نہیں کر سکتی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''إنما جعلناها تطليقة لأن الله تعالى يقول الطلاق مرتان، فعقلنا من الله تعالى أن ذلك إنما يقع بإيقاع الزوج وعلمنا أن الخلع لم يقع إلا بإيقاع الزوج'' (كتاب الأم ۵،۱۹۹)۔

(کہ ہم نے خلع کے ذریعہ جدائی کو طلاق اس لیے قرار دیا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الطلاق مرتان۔ تو ہم نے حکم خداوندی سے یہ سمجھا کہ جس طرح طلاق شوہر کے واقع کرنے سے واقع ہوتی ہے۔ اسی طرح خلع شوہر کے واقع کرنے سے واقع ہوگا)۔

''ایسا اس لیے ہے کہ خلع بھی طلاق ہے اور کسی بھی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی اور کی طرف سے طلاق دے دے، چاہے وہ باپ ہو، یا آقا ہو، یا سلطان ہو، انسان تو خود اپنی طرف سے طلاق دے سکتا ہے'' (کتاب الام: ۵/۲۰۰)۔

فقہ شافعی کی مشہور کتاب مہذب میں ہے: ''یعنی خلع عقد نکاح کو ختم کرنا ہے باہمی رضامندی سے۔ اسے مشروع کیا گیا ہے دفع ضرر کے لیے، تو یہ بغیر ضرر کے بھی درست ہوگا جس طرح بیع کو اقالہ کے ذریعہ ختم کیا جاتا ہے'' (۲/المہذب ۷۱)۔

مشہور حنبلی فقیہ علامہ موفق الدین ابن قدامہؒ فرماتے ہیں: ولأنه معاوضة فلم يفتقر إلى السلطان كالبيع والنكاح ولأنه قطع عقد بالتراضي أشبه بالإقالة (المغني: ۷/۳۲۴)۔ (خلع در حقیقت عوض کے مدنظر معاملۂ نکاح کو ختم کرنا ہے۔ لہٰذا اس میں نہ سلطان کی ضرورت ہے جیسا کہ بیع اور نکاح میں ضرورت نہیں ہوتی ہے اور باہمی رضامندی سے ایک معاملہ کو ختم کرنے کے لحاظ سے یہ اقالہ کے مشابہ ہے)۔

اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرافعہ کے بعد قاضی یا امیر کی طرف سے حکمین کے تقرر کے بعد اگرچہ شوہر کی اجازت ضروری نہیں ہے، لیکن اس کے بغیر بہر حال خلع کے لیے شوہر کی اجازت ضروری ہے۔ علامہ ابو الولید باجیؒ موطا امام مالک کی شرح میں لکھتے ہیں: ''وتجبر على الرجوع إليه إن لم يرد فراقها بخلع أو غيره'' (المنتقى ۴،۶۱)۔

علامہ ابن رشد مالکیؒ تحریر فرماتے ہیں: ''جہاں تک ان احوال کا تعلق ہے، جن میں خلع جائز یا ناجائز ہوتا ہے، تو جمہور کے نزدیک خلع کے جواز کے لیے شوہر و بیوی کی رضامندی ضروری ہے۔ جب شوہر کو بیوی جو کچھ دے رہی ہے اس پر آمادگی کا سبب شوہر کا اسے اذیت پہنچانا نہ ہو (بدایۃ المجتہد: ۲/۶۸)۔

اسی بحث کے ضمن میں علامہ ابن رشد مالکیؒ نے فرمایا کہ: ''اس کی حکمت یہ ہے کہ عورت کو کچھ دے دلا کر شوہر سے گلو خلاصی کا حق در حقیقت شوہر کے حق طلاق کے بالمقابل ہے، جس طرح شوہر کو اگر بیوی ناپسند ہو تو اسے طلاق کا حق ہے اسی طرح اگر بیوی کو شوہر پسند نہ ہو تو اسے خلع کا حق ہے'' (بدایۃ المجتہد ۲/۶۸)۔

فقہاء کرام عام طور پر احکام کے ساتھ ان کی علتوں کو ذکر فرماتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ علت کی جگہ پر حکمت و مصلحت کو ذکر کر دیتے ہیں۔

کبھی وہ حکمت کاملہ ہوتی ہے اور کبھی ناقصہ۔ علامہ ابن رشدؒ کی مذکورہ عبارت میں خلع کی حکمت ناقصہ کو بیان کیا گیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی حد تک بیوی کو بھی شوہر سے تفریق کا اختیار ہے۔ وہ یہ ہے کہ بیوی شوہر کو مال کی ترغیب دے کر خلع پر راضی کرسکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بیوی خیار تفریق میں شوہر کے برابر ہے۔ جس طرح شوہر بیوی کی رضا کے بغیر طلاق دے سکتا ہے، اسی طرح بیوی بھی شوہر کی رضا کے بغیر طلاق حاصل کرسکتی ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ ''جیسے مرد کو طلاق دینے کا اختیار ہے اسی طرح عورت کو خلع لینے کا حق حاصل ہے'' اس میں اسی حد تک صداقت ہے جو اوپر مذکور ہے، اور خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ بات ابن رشدؒ کے ذکر کردہ اسی حکمت ناقصہ پر مبنی ہے ظاہر ہے کہ حکمت مدار حکم نہیں ہوتی بلکہ علت کاملہ مدار حکم ہوتی ہے۔

## شقاق سے مراد

''شقاق'' کے معنی عداوت ودشمنی، مخالفت کھینچا تانی، کشمکش اور ضد وعناد کے ہیں۔ یہ ''شق'' سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کنارے یا مشقت یا پھاڑنے کے ہیں۔ اور چونکہ یہ باب مفاعلت کا مصدر ہے، اس لیے اس کے معنی ہیں باہم شقاق میں اس طور پر ہوجانا کہ ایک شخص ایک شق پر ہو اور دوسرا دوسری شق پر یعنی دوسرے سرے پر ہو۔ یعنی دو شخصوں کے درمیان عداوت ودشمنی اور ضد وعناد نے انتہائی شکل اختیار کرلی ہو۔ اسی مفہوم کی تعبیر مشہور مفسر علامہ علاء الدین البغدادی المعروف بہ خازنؒ نے اپنی تفسیر لباب التاویل فی معانی التنزیل ہے (۱/۳۷۶) میں فرمائی۔

یعنی شقاق کی اصل مخالفت ہے اور اختلاف کرنے والوں میں سے ہر ایک کا دو انتہائی سروں پر ہونا ہے۔ یا اس کی اصل شق عصا سے ہو۔ اس کی شکل یہ ہے کہ وہ بات کہی جائے جس کا سننا دوسرے کے لیے مشکل ودشوار ہو اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب میاں بیوی میں شقاق اور مخالفت پیدا ہوجاتی ہے اور دونوں کے حالات مشتبہ ہوجاتے ہیں، شوہر صلح وصفائی، عفو ودرگزر اور تفریق پر آمادہ نہیں ہوتا ہے، اسی طرح بیوی نہ تو اپنے حقوق ادا کرتی ہے نہ ہی شوہر سے متعلق اپنے حقوق کو چھوڑ کر گلوخلاصی کے لیے تیار ہوتی ہے اور دونوں ایسے امور پر آمادہ ہوجاتے ہیں، جو نہ قولاً درست ہیں اور نہ فعلاً درست ہیں۔

میاں بیوی کے مابین جب ''شقاق'' پیدا ہوجائے تو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ واضح حکم ہے: ''وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما إن الله كان عليما خبيرا'' (النساء: ۳۵)۔ (اور اگر تم کو میاں بیوی کے درمیان شقاق کا اندیشہ ہو، تو ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی جو ایسا ہی تصفیہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو عورت کے خاندان سے تجویز کرکے بھیجو۔ اگر یہ دونوں منصف اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ بھی ان میں موافقت فرمادیں گے، بیشک اللہ تعالیٰ بڑے علم اور بڑے خبر رکھنے والے ہیں)۔

## شقاق کی شکلیں:

شقاق کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں: کبھی شوہر کے بلاوجہ مار پیٹ کی وجہ سے میاں بیوی میں شقاق پیدا ہوجاتا ہے، کبھی بیوی کے مال ومتاع یا جائیداد پر ناجائز قبضہ اور غلط تصرف کی وجہ سے شقاق پیدا ہوتا ہے، کبھی فحاشی اختیار کرنے پر جبر اور موجودہ فیشن کی عریانیت اختیار کرنے اور بے حیائی کے کاموں پر بیوی کو مجبور کرنے کی وجہ سے بھی شقاق پیدا ہوسکتا ہے، کبھی بیوی سے زبردستی کسب معاش اور ملازمت کروانے کی وجہ سے بھی شقاق پیدا ہوسکتا ہے، کبھی فرائض وواجبات کی ادائیگی سے روکنے اور حرام ومنکر امور کے اختیار کرنے پر جبر کی وجہ سے پیدا ہوسکتا ہے۔

کبھی یہ شقاق بعض طبعی، اخلاقی اور سماجی امور کی وجہ سے پیدا ہوسکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو چیزیں بھی میاں بیوی کے درمیان نفرت وعداوت، مخالفت ومخاصمت، ضد اور عناد کے پیدا ہونے کا سبب بن جائیں؛ تو ایسے حالات میں قرآن کریم کے مذکورہ حکم پر عمل کرنا خود میاں بیوی اور پورے خاندان ومعاشرہ کے لیے باعث رحمت ہوگا۔ مذکورہ آیت کریمہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس فساد عظیم کا دروازہ بھی بند کردیا، جس کا اندیشہ عام طور پر شقاق کی صورت میں بنا رہتا ہے۔ اور حکام وقت، فریقین کے کارجین حضرات اور مسلمانوں کی جماعتوں کو خطاب کرکے ایسا طریقہ بنایا، جس سے فریقین کا اشتعال بھی کم ہوجائے اور الزام تراشی کے راستے بھی بند ہوجائیں اور ان کے آپس میں مصالحت کی راہ بھی نکل آئے، اس حکم کا خلاصہ یہ ہے کہ ارباب حکومت یا فریقین کے اولیاء یا مسلمانوں کی کوئی مقتدر جماعت اور جہاں نظام امارت شرعیہ قائم ہو، وہاں امیر شریعت کی طرف سے مقرر کردہ قاضی یہ کام کرے کہ ان کے آپس میں مصالحت کرانے کے لیے دو حکم مقرر کردیں ایک مرد کے خاندان سے دوسرا عورت کے خاندان سے۔

## کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کر سکتا ہے؟

**حنفیہ کا مسلک:** حنفیہ کے نزدیک قاضی، یا حاکم، یا ان کے مقرر کردہ حکمین شوہر کی اجازت کے بغیر شقاق کی وجہ سے نکاح فسخ نہیں کر سکتا ہے۔ علامہ ابو بکر جصاص رازیؒ احکام القرآن میں آیت کریمہ: فان خفتم الخ کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں: فهذا يدل على بطلان قول من يقول أن للحكمين أن يجمعا إن شاءا وإن شاءا فرقا بغير أمرهما ... فقال أصحابنا ليس للحكمين أن يفرقا إلا برضى الزوجين لأن الحاكم لا يملك ذلك فكيف يملكه الحكمان وإنما الحكمان وكيلان لهما'' (۲،۱۹۱)۔

(یہ تفصیلات ان لوگوں کے قول کو باطل قرار دیتی ہیں، جو یہ کہتے ہیں کہ دونوں حکم کو میاں بیوی کو جوڑنے اور دونوں کے مابین جدائیگی کرانے کا بھی اختیار ہے، ہمارے اصحاب حنفیہ نے فرمایا کہ حکمین کو شوہر کی اجازت کے بغیر تفریق کا اختیار نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب حاکم کو اس کا اختیار نہیں ہے تو پھر حکمین کو کیسے اختیار ہوگا۔ جب کہ حکم تو زوجین کے محض وکیل ہیں)۔

امام ابوجعفر طحاویؒ کی رائے بھی یہی ہے (طحاوی: ۱۹۱)۔

**شافعیہ کا مسلک:** اس سلسلے میں امام شافعیؒ کے دو اقوال ہیں: قول قدیم میں حکمین یا حاکم یا قاضی کو تفریق کا اختیار ہے۔ مگر آخری قول یہی ہے کہ تفریق کا اختیار نہیں ہے۔ یہی ان کا مختار قول ہے۔ کتاب الام میں اسی آخری قول کو ذکر فرمایا ہے: '' وليس له أن يأمرهما يفرقان إن رأيا إلا بأمر الزوج ولا يعطيان من مال المرأة إلا باذنها'' (کتاب الأم ۵،۱۹۵)۔

تفسیر خازن میں ہے: ''هل يجوز لهما تنفيذ أمر يلزم الزوجين دون رضاهما وإذنهما في ذلك فللشافعي في ذلك قولان أحدهما انه لا يجوز إلا برضاهما وهو مذهب أبي حنيفة وأحمد'' (کیا دونوں حکم کے لیے درست ہے کسی ایسی چیز کا نافذ کرنا جو میاں بیوی کے لیے لازم ہو جائے۔ ان کی اجازت ورضا کے بغیر تو اس سلسلے میں امام شافعی کے دو اقوال ہیں۔ اول یہ کہ ان کی رضامندی کے بغیر جائز نہیں ہے اور یہی امام ابوحنیفہ اور امام احمدؒ کا مسلک ہے)۔

**حنابلہ کا مسلک:** امام احمد بن حنبلؒ سے اس سلسلے میں دونوں روایتیں منقول ہیں، علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ کی تحریر سے اختیار فسخ کو ترجیح معلوم ہوتی ہے مگر متون میں زوجین کی رضامندی کی شرط تحریر ہے۔ اصول ترجیح کے مطابق روایت متن راجح ہے۔ المغنی میں ہے:

''امام احمد سے حکم کے بارے میں دو مختلف روایتیں منقول ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حکمین زوجین کے وکیل ہیں۔ انہیں اجازت کے بغیر تفریق کرنے کا اختیار نہیں ہے اور یہی حضرت عطاء کا مذہب ہے اور امام شافعی کا ایک قول ہے اور ایسا ہی حسن بصری اور امام ابوحنیفہ سے منقول ہے۔ اس لیے کہ ''بضع'' شوہر کا حق ہے اور مال بیوی کا حق ہے اور دونوں عاقل وبالغ ہیں، کسی اور کو ان کے حقوق میں تصرف کرنے کا حق نہیں ہے، مگر یہ کہ وہ وکیل بنا دیں، یا انہیں ولایت عامہ حاصل ہو۔ امام احمد بن حنبلؒ کا دوسرا قول یہ ہے کہ وہ دونوں حاکم ہیں۔ اور وہ جو مناسب سمجھیں یعنی جوڑنا، تفریق کرنا، معاوضہ یا اس کے بغیر۔ وہ کر سکتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں وہ وکیل بنائے جانے کے محتاج بھی نہیں ہیں۔ ایسا ہی حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، ابوسلمہ بن عبدالرحمنؒ، امام شعبیؒ، امام نخعیؒ، سعید بن جبیرؒ، امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ، اسحٰقؒ اور ابن منذر سے منقول ہے'' (۷،۳۲۰)۔

**مالکیہ کا مسلک:** امام مالکؒ کا مسلک اس سلسلے میں بالکل واضح ہے کہ زوجین کی رضامندی اور ان کی طرف سے توکیل کے بغیر بھی حاکم یا قاضی یا ان کے مقرر کردہ حکمین شوہر اور بیوی کے درمیان تفریق کرا سکتے ہیں۔ شوہر کے حکم کے لیے جائز ہے کہ اس کی رضامندی کے بغیر اس کی بیوی کو طلاق دیدے۔ اور عورت کے حکم کے لیے جائز ہے کہ اس کی رضامندی کے بغیر خلع کرے۔ اگر اس میں انہیں مصلحت نظر آئے۔

موطا امام مالک میں ہے: وذلك احسن ما سمعت من أهل العلم أن الحكمين يجوز قولهما بين الرجل وامرأته في الفرقة والاجتماع (موطا امام مالك: ۵۲۷)۔

یعنی اہل علم کی یہ بہتر رائے مجھے معلوم ہوئی کہ حکمین کا قول نافذ ہوگا میاں بیوی کے درمیان جمع کرنے میں بھی اور جدا کرنے میں بھی (ہدایہ ۲/۷۶)۔

اس سلسلہ کی مضبوط دلیل وہ روایت ہے جو امام شافعیؒ نے اپنی سند سے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ''ایک مرد اور ایک عورت.

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان دونوں کے ساتھ لوگوں کی بھیڑ تھی۔ حضرت علیؓ نے معلوم کیا کہ ان دونوں کا کیا معاملہ ہے، جو اس قدر ہنگامہ خیزی ہو رہی ہے، لوگوں نے بتایا کہ ان کے درمیان شقاق پیدا ہو گیا ہے۔ تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک عورت کے خاندان سے مقرر کریں، جب یہ حکم تجویز کردیئے گئے، تو ان دونوں حکموں سے خطاب کر کے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ تمہاری ذمہ داری کیا ہے؟ اور تمہیں کیا کرنا ہے؟ سن لو! اگر تم دونوں ان میاں بیوی کو یکجا رکھنے اور باہم مصالحت کرانے پر متفق ہو جاؤ تو ایسا ہی کرلو۔ اور اگر تم یہ سمجھو کہ ان میں مصالحت نہیں ہو سکتی ہے یا قائم نہیں رہ سکتی ہے اور تم دونوں کا اس پر اتفاق ہو جائے کہ ان میں جدائی ہی مصلحت ہے، تو ایسا ہی کرلو۔ یہ سن کر عورت بولی کہ میں کتاب اللہ کے فیصلہ پر راضی ہوں، خواہ میری مرضی کے مطابق ہو یا خلاف، مجھے منظور ہے۔ لیکن مرد نے کہا کہ جدائی اور طلاق کو میں کسی حال میں گوارا نہ کروں گا، البتہ حکم کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ مالی تاوان جو چاہیں مجھ پر ڈال کر اس کو راضی کریں، حضرت علیؓ نے فرمایا! خدا کی قسم تم جھوٹے ہو، تمہیں بھی ان حکمین کو اسی طرح اختیار دینا ہوگا جیسا کہ عورت نے دیا ہے'' (خازن ۱/۲۸۶، مظہری ۲/۱۰۱)۔

اس واقعہ سے امام مالکؒ و دیگر مجتہدین نے یہ مسئلہ اخذ کیا کہ حکمین کا با اختیار ہونا ضروری ہے۔ جیسا کہ حضرت علیؓ نے فریقین سے کہہ کر ان کو با اختیار بنوایا، جب کہ اسی روایت سے امام ابوحنیفہؒ وغیرہ یوں استدلال کرتے ہیں کہ اگر حکم کا با اختیار ہونا امر شرعی اور ضروری ہوتا تو حضرت علیؓ کے اس ارشاد اور فریقین سے رضامندی حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ فریقین کو رضامند کرنے کی کوشش خود اس امر کی دلیل ہے کہ اصل سے یہ حکمین با اختیار نہیں ہوتے۔ ہاں! بیوی اور شوہر انہیں مختار بنادیں تو وہ با اختیار ہو جاتے ہیں۔

## حکمین کا تقرر

### کیا قاضی کی طرف سے حکمین کا تقرر ضروری ہے یا قاضی خود فیصلہ کرسکتا ہے؟

مذکورہ تفصیلات سے یہ معلوم ہوا کہ مالکیہ کا مذہب مختار یہ ہے کہ شقاق کی صورت میں حاکم کی طرف سے مقرر کردہ حکم کو زوجین کی رضامندی اور وکالت کے بغیر بھی فسخ نکاح (بلا عوض) اور خلع کا اختیار ہے۔ لیکن سلطان یا اس کا مقرر کردہ قاضی تحکیم کے عمل سے گزرے بغیر از خود نکاح فسخ کرسکتا ہے؟ یا حاکم اور اس کے مقرر کردہ قاضی کو ہر حال میں دو حکم کو مقرر کرنا پڑے گا اور حکم ہی اصلاح احوال کی کوششوں کے بعد طلاق دے سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حاکم یا قاضی کو حکم مقرر کیے بغیر از خود اس کا حق نہیں ہے کہ زوجین کی رضامندی یا ان کی وکالت کے بغیر خلع کردے یا نکاح فسخ کردے۔ اگرچہ علامہ ابن رشدؒ کی عبارت "ومالك يشبه الحكمين بالسلطان، والسلطان يطلق بالضرر عند ذلك إذا تبين" (امام مالک حکم کو سلطان کے مشابہ قرار دیتے ہیں اور سلطان ضرر کی وجہ سے دفع ضرر کے لیے طلاق دے سکتا ہے جب ضرر واضح ہو جائے)۔ یہ اور اس طرح کی دوسری عبارتوں کے ظاہر سے یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید حاکم وقاضی کو حکم کے تقرر کے بغیر خود بھی طلاق دینے کا اختیار ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام مالک کے نزدیک بھی شقاق کی صورت میں بلا نصب حکم حاکم کو خلع یا فسخ نکاح کا اختیار نہیں ہے۔ درحقیقت مذکورہ عبارت میں حکم کی تفصیل کا بیان نہیں، بلکہ حکم کے ماخذ کا بیان ہے، جس کے لیے علت کا مشترک ہونا کافی ہے۔ جو یہاں ''تبین ضرر'' یعنی ضرر کا واضح ہونا ہے۔ جب کہ زوجہ مفقود الخبر، عدم ادائیگی نفقہ اور عنین وغیرہ میں ''تبین ضرر'' کا علم حکم کے تقرر کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ جب کہ شقاق بین الزوجین ان کی باہمی مخالفت، ضد و عناد کے ضرر کا علم حکمین کے تقرر کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے۔ حضرات خلفاء راشدین کا معمول بھی یہی بتاتا ہے کہ انھوں نے شقاق کی صورت میں از خود نکاح فسخ نہیں فرمایا، بلکہ حکمین کو مقرر فرمایا۔ حضرت علیؓ کی روایت پہلے آچکی ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس نوعیت کا واقعہ پیش آیا، تو انھوں نے بھی معاملہ حل کرنے کے لیے حکمین کو مقرر فرمایا، علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ نے ''المغنی'' میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عقیلؓ بن ابی طالب کا نکاح فاطمہؓ بنت عتبہ سے ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے مابین اختلافات رونما ہونے لگے جب فاطمہ زیادہ پریشان ہوئیں تو انھوں نے ہمت کر کے اس معاملہ کو عدالت عثمانی میں پیش کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے از خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے شوہر کی طرف سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو حکم مقرر فرمایا اور بیوی کی طرف سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو حکم نامزد فرمایا۔ ان حضرات کو کسی حد تک اس معاملہ کا علم تھا تو آپسی تبادلۂ خیال میں حضرت ابن عباس نے فرمایا میں ان کے مابین تفریق کرادوں گا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ بنی عبد مناف کی دو بڑی شخصیتوں کے مابین تفریق مناسب نہیں۔ بہر حال جب یہ دونوں حضرات حکم کی حیثیت سے ان کے گھر پہنچے تو میاں بیوی نے مارے شرم کے دروازہ بند کرلیا اور آپس میں مصالحت کرلی'' (المغنی: ۷/۳۲۰)۔

حالانکہ پیش آمدہ مسائل میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ از خود فیصلہ کر سکتے تھے، لیکن انصاف کے تقاضوں کو مکمل طور پر بروئے کار لانے کے لیے حکمین کو مقرر فرمایا۔ کیا ایک حکم کا بھی تقرر ہو سکتا ہے؟ مالکیہ کے نزدیک اگر میاں بیوی کسی ایک فرد کو حکم مقرر کرنے پر راضی ہو جائیں، تو یہ درست ہوگا۔ لیکن حاکم یا قاضی کے لیے درست نہیں ہے کہ وہ محض ایک فرد کو حکم مقرر کرے۔ دو افراد کا حکم مقرر کرنا قاضی کے لیے ضروری ہے۔ موطا امام مالک کی شرح میں ہے:

"اگر میاں بیوی ایک ہی شخص کو حکم بنانے پر راضی ہو جائیں، تو یہ درست ہے اس شرط کے ساتھ کہ اس میں حکم بننے کی صلاحیت ہو، یہ مسئلہ ابن القاسم نے "المدونۃ" میں ذکر کیا ہے، قاضی ابوالولیدؒ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ ایک شخص دونوں جہت کا حکم بن جائے گا، اس لیے کہ حق تو اس سلسلے میں صرف میاں بیوی کا ہے، جب کہ سلطان اور بچوں کے ولی کے لیے ایسا کرنا درست نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں میاں بیوی کے حق کو باطل کرنا ہے" (المنتقی: ۴/ ۱۱۳)۔

## شقاق کی وجہ سے فسخ کے مسئلہ میں مالکیہ کے مسلک کو اختیار کیا جا سکتا ہے:

یہ تو واضح ہے کہ حنفیہ کے نزدیک امیر یا اس کے مقرر کردہ قاضی کو یا اس کے مقرر کردہ حکم کو میاں بیوی کی رضامندی کے بغیر یا ان کی وکالت کے بغیر خلع کرانے اور نکاح فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے، لیکن ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ میں جب کہ مزاجوں سے دین داری اور پرہیزگاری بتدریج کم ہوتی چلی جارہی ہے، بے دینی کا رجحان ہے، ظلم و تعدی کا دور دورہ ہے۔ اس ظلم و تعدی کا شکار عورت بھی بنتی ہے، بسا اوقات صورت حال ایسی ہو جاتی ہے کہ بیوی کے لیے شوہر کے ساتھ اذیت ناک زندگی بسر کرنی پڑتی ہے، اس کے ظلم و تعدی کو برداشت کرنا پڑتا ہے اس سے بچاؤ کی کوئی شکل نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا عورتوں کو ان کے شوہروں کے ظلم سے بچانے کے لیے یہ درست ہوگا کہ اس سلسلہ میں مالکیہ کے مسلک پر ان کی تمام تفصیلات کو اختیار کرتے ہوئے فتویٰ دیا جائے اور فتویٰ علی مذہب الغیر کے باب میں اس علمی توسع سے فائدہ اٹھایا جائے، جس کی گنجائش ضرورت شدیدہ کے وقت خود فقہ حنفی میں نکالی گئی ہے، علامہ ابن عابدینؒ تحریر فرماتے ہیں: "اور اسی سے مضطر کے لیے ذاتی طور پر مذہب غیر پر عمل کا جواز معلوم ہو گیا، اور مفتی کے لیے اس پر فتویٰ دینے کی گنجائش بھی معلوم ہو گئی۔ جہاں تک ضعیف اقوال اور مذہب غیر پر عمل اور فتویٰ کے عدم جواز کا مسئلہ ہے، تو ضرورت کے علاوہ جگہوں پر محمول ہے، اوپر کی پوری بحث سے یہی بات معلوم ہوتی ہے" (شرح عقود رسم المفتی/ ۵۰)۔

علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں: ولا باس بالتقليد عند الضرورة لكن يشترط أن يلتزم جميع ما يوجبه ذلك الإمام (الدر المختار مع الرد ۱/ ۲۵۶) (ضرورت کے وقت دوسرے امام کی تقلید کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس امام نے جن چیزوں کو ضروری قرار دیا ہے، ان سب کا التزام کرے)۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ نے زوجۂ مفقود الخبر کے بارے میں امام مالکؒ کے مسلک پر عمل کا فتویٰ دیتے ہوئے یہ حوالہ تحریر فرمایا ہے: "وفي حسب المفتين قول مالك معمول به في هذه المسئلة. ولو أفتى الحنفي بذلك يجوز فتواه" (فتاوی عبدالحی اردو ۲۲۶)۔

(اور حسب المفتیین میں ہے کہ امام مالکؒ کا قول اس مسئلہ میں قابل عمل ہے، اگر کوئی حنفی مفتی اس قول پر فتویٰ دیتا ہے تو اس کا فتویٰ صحیح ہوگا)۔

مگر اس فتوے کے ساتھ حنفیہ کے نزدیک اس طرح کی صورت حال میں یہ بھی مسئلہ ہے کہ جب دوسرے امام کا مسلک اختیار کیا جائے گا تو اس امر کا لحاظ رکھا جائے گا کہ اس مسئلہ میں اس امام کے نزدیک جو شرطیں ہوں ان سب کی پوری پوری رعایت ہو جائے۔ علامہ ابن عابدینؒ تحریر فرماتے ہیں: "وانه يجوز له العمل بما يخالف ما عمله على مذهبه مقلداً فيه غير إمامه مستجمعاً شروطه" (رد المحتار ۱/ ۵۱)۔ (اور اس کے لیے جائز ہے اس مسلک پر عمل کرنا جو اس کے عمل کے خلاف ہو، اس طرح کہ وہ اس مسئلہ خاص میں دوسرے امام کی تقلید کرے ان کی تمام شرطوں پر عمل کرتے ہوئے)۔

لہٰذا وقت کی نزاکت، فتنہ کے سدباب اور ظلم و تعدی کے خاتمہ کے لیے شقاق کے مسئلہ میں امام مالکؒ کا مسلک اختیار کرنا مناسب ہوگا۔

عہد قریب کے بابصیرت فقیہ مولانا عبدالصمد رحمانیؒ (مانڈر کھگڑیا) اپنی معرکۃ الآراء تصنیف "کتاب الفسخ والتفریق" میں تحریر فرماتے ہیں: بہر حال زن و شوہر کے شقاق کی صورت میں جب عورت قاضی کے یہاں مقدمہ دائر کرے اور جائز شکایت کی بنا پر شوہر سے تنگ آ کر تفریق کا مطالبہ کرے تو حنفی قاضی معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر امام مالکؒ کے مسلک پر ان ابتدائی کاروائی کے بعد جن کا ذکر امام مالکؒ کے مسلک کے تحت تیرہویں بنیاد میں ہو چکا ہے۔ یا اختیار حکمین کے ذریعہ شقاق کے معاملہ کو ان کی تفصیل کے مطابق ختم کرا دے اور حکمین کو امام مالکؒ کے مسلک کو اچھی طرح سمجھا دے۔ اور حکمین کے تقرر میں ان قیود و شرائط کا پورا پورا لحاظ رکھے جس کا مسلک مالکیہ میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے (۱۵۶)۔

## حکمین کے لیے مطلوبہ شرائط:

جن شرائط کی رعایت مالکیہ کے نزدیک ضروری ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں: (۱) مسلمان ہونا، (۲) مرد ہونا، (۳) بالغ ہونا، (۴) عادل ہونا، (۵) جس کام کے لیے حکم بنایا گیا ہے، اس سے واقف ہونا۔

قاضی ابوالولید باجیؒ فرماتے ہیں: ''یعنی حکمین کے وہ اوصاف جوان کے حکم بننے کے لیے شرط ہیں یہ ہیں: مسلمان ہونا، بالغ ہونا، آزاد ہونا اور مرد ہونا۔ ان میں سے اگر کوئی وصف نہ ہو تو حکم بنانا درست نہ ہوگا، نہ شوہر و بیوی کی رضامندی سے نہ سلطان کے مقرر کرنے سے یہ امام مالکؒ نے فرمایا ہے۔ اسی طرح عادل ہونا بھی شرط ہے، دیگر اوصاف حکم کے لیے تکمیلی ہیں۔ مثلاً ان کا رشتہ دار ہونا یا ان کا فقیہ ہونا'' (المنتقی ۴/ ۱۱۳۔ ۱۱۴)۔

حکم کے لیے زوجین کے اہل قرابت ہونے کی شرط کے بارے میں [illegible] تخصیہ میں ہے:

ثم إن وجد حكمان من أهل الزوجين وأمكن تحكيمهما لم يجز للقاضي أن يبعث أجنبيين ويندب كون الحكمين من جيران الزوجين (ص: ۴۰۸)۔ (پھر اگر زوجین کے گھرانے سے دو حکم موجود ہوں اور ان دونوں کو حکم بنانا ممکن ہو، تو ان دونوں کو حکم بنانا واجب ہوگا اور قاضی کے لیے جائز نہیں ہوگا کہ انہیں چھوڑ کر اجنبیوں کو حکم بنا کر بھیجے اور مستحب یہ ہے کہ حکمین میاں بیوی کے پڑوسی ہوں)۔

## شقاق کی وجہ سے فسخ کا حکم عمومی نہیں بلکہ ضرورۃ:

حنفی قاضی اگر شقاق کی وجہ سے فسخ نکاح کا فیصلہ کرتا ہے، تو اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ فیصلہ ضرورت شدیدہ کی وجہ سے ہو۔ مثلاً: باہمی نزاع وشقاق کا فتنہ بہت خطرناک صورت اختیار کر گیا ہو اور حکمین کی طرف سے ان کی فہمائش اور سماجی طور پر رفع ظلم کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہو، اور اس مقصد کے لیے نگرانی و دیگر تدابیر سب ناکام ہوگئی ہو (احسن الفتاوی ۵/ ۴۰۰)۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ زوجہ متعنت فی النفقہ کے ضمن میں لکھتے ہیں: ''وهذا الحكم عند المالكية لا يختص بخشية الزنا وإفلاس الزوجه۔ ولكن لم نأخذ مذهبهم على الإطلاق بل أخذناه حيث وجدت الضرورة المسوغة للخروج عن المذهب'' (حاشيه حيلة الناجزة: ۸۲)۔

(فسخ نکاح کا یہ حکم مالکیہ کے نزدیک زنا کے خوف اور بیوی کے افلاس کے اندیشہ سے مشروط نہیں ہے لیکن ہم ان کے مذہب کو مطلقاً نہیں لیتے بلکہ اس وقت لیں گے، جب ایسی ضرورت پائی جائے جو مذہب سے خروج کو جائز بنا دے)۔

چوں کہ ''شقاق'' کی وجہ سے فسخ نکاح میں بہت کچھ انحصار مذہب مالکیہ پر ہے۔ اور حنفی قاضی کا اس صورت میں نکاح فسخ کرنا امام مالک کے مسلک کی تفصیلات کے مطابق ہوگا، لہٰذا جس طرح زوجہ مفقود الخبر جیسے مسائل میں حضرت تھانویؒ نے امام مالک کے مسلک پر فتوی دینے سے قبل مالکی مفتیان کرام سے خط وکتابت کر کے تمام تر تفصیلات کے بارے میں مکمل اطمینان حاصل کر لیا۔ بہتر ہوگا کہ شقاق کی وجہ سے فسخ نکاح میں بھی علماء مالکیہ سے رابطہ کر کے مکمل اطمینان کر لیا جائے، اس کے بعد ان تفصیلات کے ساتھ امام مالک کے مسلک پر فتوی دیا جائے اور عمل کیا جائے، مقصد ہر حال میں: یسروا ولا تعسروا کے حکم کے مطابق امت کے لیے آسانی فراہم کرنا ہو اور صنف نازک کو ظلم واذیت سے بچانا ہو۔ اللهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه۔ والله أعلم وعلمه اتم۔

☆☆☆

# زوجین کے درمیان شقاق کی وجہ سے فسخ نکاح

مولانا ریاض احمد قاسمی [1]

## تمہید

اس تمہید میں زوجین کے درمیان نااتفاقی کی مختلف صورتیں اور ان کے احکام اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ بعض دفع اس نااتفاقی کی ذمہ دار تنہا عورتیں ہی ہوتی ہیں، شوہر کی طرف سے کوئی زیادتی یا حق تلفی نہیں ہوتی، بعض دفعہ اس کا ذمہ دار تنہا مرد ہوتا ہے، بیوی کی طرف سے کوئی نافرمانی یا غلطی نہیں ہوتی، جبکہ بعض دفعہ اس کے ذمہ دار شوہر اور بیوی دونوں ہوتے ہیں، خواہ وہ اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوں، یا ہر ایک خود کو بے قصور اور دوسرے کو تنہا ذمہ دار سمجھتا ہو، جس کی وجہ سے قصوروار اور ذمہ دار کا تعین مشکل ہو، ذیل میں ان مختلف صورتوں کی تفصیلات الگ الگ پیش کی جارہی ہیں:

**۱۔ ازدواجی زندگی میں نااتفاقی اور کشیدگی اگر صرف بیوی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو، شوہر کی جانب سے کوئی زیادتی یا حق تلفی سامنے نہ آئی ہو تو اس کی مندرجہ ذیل چار صورتیں ہوسکتی ہیں:**

**پہلی صورت:** بیوی شوہر کی اطاعت کو بوجھ محسوس کرے، اس کے حقوق میں ٹال مٹول اور کوتاہی سے کام لے اور بادل ناخواستہ اس کے ساتھ گذارہ کرے، تو اس صورت میں شوہر کو چاہئے کہ وہ بیوی کو خلوص اور ہمدردی کے ساتھ سمجھائے، اللہ کی نافرمانی اور اس کے غضب سے ڈرائے، آپسی اتحاد واتفاق کے فوائد اور اختلاف وانتشار کے نقصانات بتائے اور بیوی ہونے کی حیثیت سے اس پر شوہر کے کیا حقوق ہیں، ان سے آگاہ کرے، انشاء اللہ جب شوہر مکمل خلوص اور ہمدردی سے اس طرح کی نصیحتیں کرتا رہے گا اور اپنی جانب سے شفقت ومحبت کا سلوک جاری رکھے گا تو بیوی ضرور متاثر ہوگی اور راہ راست پر آجائے گی۔

**دوسری صورت:** بیوی صریح نافرمانی کرنے لگے اور شوہر کے حقوق کی پامالی شروع کردے، تو شوہر کو چاہئے کہ وہ ہمدردی اور ناراضگی کا ملا جلا رویہ اختیار کرتے ہوئے، بستر پر اسے تنہا چھوڑ دے، نہ اسے اپنے ساتھ سلائے اور نہ اس کے ساتھ شفقت ومحبت کا اظہار کرے، بلکہ ایک گونہ بے رخی اور ناراضگی ظاہر کرے، اگر بیوی سمجھدار ہوگی اور اسے شوہر سے محبت ہوگی تو وہ ضرور نادم اور شرمسار ہوگی اور آئندہ ایسی حرکت نہ کرنے کا فیصلہ کرے گی۔

**تیسری صورت:** بیوی شوہر کی نافرمانی میں بے باک ہوجائے اور پوری جرأت کے ساتھ شوہر کی مخالفت کرنے لگے، تو اب شوہر کو چاہئے کہ وہ بیوی پر تادیبی کارروائی کرتے ہوئے ہاتھ اٹھائے، البتہ اس میں دو باتوں کا خاص خیال رکھے، ایک تو یہ کہ چہرہ اور نازک مقامات کو نشانہ نہ بنائے دوسرے یہ کہ طاقت وقوت کا بھرپور استعمال نہ کرے، جس سے جسم پر نشان پڑ جائے، یا ہڈی ٹوٹ جائے، ان شاء اللہ اس سے اس کی جرأت اور بے باکی ختم ہوجائے گی اور اسے اپنی غلطی کا بہت جلد احساس ہوجائے گا۔

**چوتھی صورت:** بیوی شوہر کی مخالفت اور نافرمانی میں ضد اور ہٹ دھرمی پر کمربستہ ہوجائے اور اسے شوہر کا کوئی ڈر خوف باقی نہ رہے، تو ایسی صورت میں شوہر کو چاہئے کہ مسلمانوں کی بااثر جماعت یا قاضی کے توسط سے بیوی کی اصلاح کی کوشش کرے، چنانچہ وہ بااثر جماعت یا قاضی دو معتبر اور دیندار مردوں کو حکم نامزد کرکے اصلاح کے لئے بیوی کے پاس روانہ کریں، بہتر ہے کہ حکم حضرات زوجین کے خاندان سے ہوں، یہ حضرات ان کے آپسی معاملات کو سامنے رکھ کر صلح صفائی کی مخلصانہ کوشش کریں، بیوی کی شکایات بھی سنیں اور شوہر کو ان کے ازالہ کا پابند بنائیں، اسی طرح شوہر کے حقوق کی اہمیت اور اس میں کوتاہی کے نقصانات بیوی کو سمجھاتے ہوئے خوشگوار زندگی گذارنے کی تلقین کریں، انشاء اللہ ان حضرات کی مخلصانہ کاوشوں سے زوجین کے درمیان اتفاق پیدا ہوجائے گا، لیکن اگر بیوی کسی قیمت پر شوہر کے ساتھ رہنے کے لئے تیار نہ ہو اور اس سے علاحدگی چاہتی ہو تو بیوی کی مہر یا کسی اور بدل کے عوض خلع لینے پر راضی کریں اور شوہر کو اس کے

[1] استاذ جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر

عوض خلع دینے پر آمادہ کریں، پھر ان کی باہمی رضامندی سے ان کے درمیان خلع کرادیں۔

مذکورہ چاروں صورتوں میں جو احکام ذکر کئے گئے ہیں وہ قرآن مجید میں موجود ہیں (دیکھئے: سورۂ نساء: ۳۴، ۳۵، سورۂ بقرہ: ۲۲۹)۔

## ۲۔ اگر نا اتفاقی کا ذمہ دار تنہا شوہر ہو، تو اس کی بھی چار صورتیں ہیں:

**پہلی صورت:** شوہر نے کوئی جائز کام کیا، جس کی بنا پر نا اتفاقی پیدا ہوگئی، مثلاً اس نے دوسری شادی کرلی، یا بیوی میکے میں رہنا چاہتی تھی، شوہر اس پر تیار نہیں ہوا اور اپنے یہاں لے آیا، تو ایسی صورت میں شوہر، بیوی کے اولیاء یا مسلمانوں کی بااثر جماعت بیوی کو سمجھائیں کہ شوہر نے اپنا جائز حق استعمال کیا ہے، یہ اس پر کوئی ظلم یا حق تلفی نہیں ہے، لہٰذا صبر کرو اور مل جل کر خوشگوار زندگی گذارو، اگر بیوی سمجھ گئی تو فبہا، ورنہ اب وہ نا اتفاقی کی ذمہ دار قرار پائے گی اور اس پر وہ احکام جاری ہوں گے، جن کا ماقبل میں تذکرہ کیا گیا ہے، علامہ رازی اس صورت کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر شقاق شوہر کی جانب سے ہو، تو اگر اس نے کوئی جائز کام کیا ہے، مثلاً دوسری شادی کرلی ہے تو عورت کو بتایا جائے کہ یہ اس کے لئے جائز ہے، اور اسے شقاق سے روکا جائے، اگر اس نے منظور کرلیا، تو فبہا ورنہ اس کی طرف سے نشوز شمار ہوگا'' **(مفاتیح الغیب ۴/۳۲۰)۔**

**دوسری صورت:** شوہر کسی وجہ سے بیوی کو پسند نہ کرے، مثلاً بیوی شوہر کے معیار کے مطابق خوبصورت نہ ہو، یا زیادہ عمر کی ہو، یا اس طرح کی کوئی اور بات ہو، جس کی وجہ سے شوہر اپنا غصہ بیوی پر اتارتا ہو، یا اس سے بے رخی برتتا ہو، اور بیوی مستقبل کی دشواریاں یا بچوں کی مصلحت کی بنا پر شوہر ہی کے ساتھ رہنا چاہتی ہو، تو ایسی صورت میں بیوی اپنا مہر معاف کر کے، نان ونفقہ کا مطالبہ ترک کر کے، شب گذاری کا حق ساقط کر کے، یا کچھ مال ومتاع دے کر کے شوہر سے مصالحت کی کوشش کرے اور شوہر کو بھی چاہئے کہ جب بیوی اپنے حقوق ومطالبات چھوڑنے پر راضی ہوجائے یا اپنا مال ومتاع ہبہ کرنے پر تیار ہو تو اسے اپنی زوجیت میں رہنے دے، یہ دونوں کے حق میں بہتر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وإن امرأة خافت من بعلها نشوزاً أو إعراضا. فلاجناح عليهما أن يصلحا بينهما صلحا. والصلح خير وأحضرت الأنفس الشح. وإن تحسنوا وتتقوا فإن الله كان بما تعملون خبيرا'' (نساء: ۱۲۸)۔

(اگر کوئی عورت اپنے شوہر سے زیادتی یا بے رخی کا خطرہ محسوس کرے، تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ باہم خاص طریقے پر مصالحت کرلیں، مصالحت بہتر ہے، دلوں میں حرص موجود ہے، اور اگر تم حسن سلوک کرو اور اللہ سے ڈرو تو بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے باخبر ہیں)۔

**تیسری صورت:** شوہر بیوی پر ظلم کرے، اس کے واجب حقوق ادا نہ کرے، یا وہ کسی مہلک یا قابل نفرت مرض میں مبتلا ہو، جس کی وجہ سے وہ مصالح و مقاصد فوت ہوجائیں، جن کے پیش نظر نکاح کیا جاتا ہے اور ایسی صورت میں بیوی علاحدگی چاہے، مگر شوہر اس کے لئے تیار نہ ہو، تو بیوی کو حق ہے کہ وہ اپنا معاملہ قاضی یا شرعی پنچایت کے سامنے پیش کرے، جب اس کا دعویٰ شوہر کے اقرار یا گواہوں کے ذریعہ ثابت ہوجائے، تو قاضی یا شرعی پنچایت، شرعی ضابطے کے مطابق کارروائی مکمل کر کے تفریق کا فیصلہ کردے (فسخ وتفریق کے وجوہ واسباب اور ان کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: الحیلۃ الناجزہ اور کتاب الفسخ والتفریق)۔

**چوتھی صورت:** بیوی شوہر کی جانب سے ہونے والے ظلم وزیادتی کو ثابت کرنے کے موقف میں نہ ہو اور شوہر نہ اس کا اقرار کرتا ہو، نہ بیوی کو چھوڑنے پر آمادہ ہو، تو اس صورت میں زوجین کے خاندان سے حکمین کا تقرر کیا جائے، حکمین کا تقرر، زوجین، ان کے اولیاء، مسلمانوں کی بااثر جماعت یا قاضی کی طرف سے ہوسکتا ہے، حکمین پورے خلوص اور نیک نیتی سے مصالحت کی ہر ممکن کوشش کریں، ناکامی کی صورت میں اگر زوجین کی جانب سے مختار ہوں، تو بالعوض یا بلاعوض حسب ضابطہ تفریق کرادیں، ورنہ قاضی یا شرعی پنچایت کو صورت حال سے آگاہ کردیں (تفصیل آئندہ ابواب میں آرہی ہے)۔

۳۔ اگر کشیدگی اور نا اتفاقی کے ذمہ دار شوہر بیوی دونوں ہوں، یا اصل ذمہ دار کا تعین مشکل ہو اور بیوی علاحدگی چاہتی ہو، مگر شوہر اس کے لئے تیار نہ ہو تو اس کا حل حکمین کا تقرر ہے، اسی طریقے پر جس کا تذکرہ ماقبل میں کیا گیا اور جس کی تفصیل آئندہ ابواب میں آرہی ہے۔

## خلع کی اصطلاحی تعریف:

حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ نے خلع کی جو تعریف کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

☆ خلع کی تعریف حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک تقریباً یکساں ہے جس کی رو سے خلع کے لئے بدل خلع اور زوجین کی رضامندی ضروری ہے۔

☆ خلع کی تعریف مالکیہ کے نزدیک ان حضرات کی تعریف سے زیادہ عام ہے جس کی رو سے خلع کے لئے نہ بدل خلع ضروری ہے، نہ شقاق کی صورت میں زوجین کی رضامندی ضروری ہے۔

☆ حنفیہ وحنابلہ کے نزدیک فضولی کی طرف سے کیا ہوا خلع بھی صحیح ہے، جس کی رو سے خلع کی مذکورہ صورت میں بیوی کی رضامندی ضروری نہیں ہے۔

☆ خلع کے لئے بالاتفاق قاضی کا فیصلہ ضروری نہیں ہے، بلکہ زوجین اپنے اختیار سے اسے انجام دے سکتے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح القدیر ۴؍۲۱۱، مغنی المحتاج ۳؍۲۶۲، الشرح الصغیر ۲؍۵۶۸)۔

۲۔ بعض حضرات کا خیال کہ جیسے مرد کو طلاق کا حق حاصل ہے، اسی طرح عورت کو خلع لینے کا حق حاصل ہے، اس حد تک تو درست ہے کہ مخصوص حالات میں شریعت نے بیوی کو خلع لینے کا حق عطا کیا ہے، لہذا وہ اپنے مال کا ایک حصہ خرچ کر کے، یا اپنا کوئی حق معاف کر کے، اس کے بدلے شوہر سے خلع لے، تو اس میں اس پر وہ گناہ نہیں ہے جو معتدل حالات میں اپنے شوہر سے طلاق لینے والی بیوی کو ہوتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''أیما امرأة سألت زوجها الطلاق من غیر بأس، فحرام علیها رائحة الجنة'' (رواہ الخمسہ. النسائی) (جو عورت بلا وجہ اپنے شوہر سے طلاق مانگے، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے)۔

یہ وعید اس بیوی کے لئے نہیں ہے جو کشیدہ حالات میں ضرورۃ خلع لیتی ہے، کیونکہ اس صورت میں شریعت نے اسے خلع کا حق دیا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس طرح مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے، اسی طرح عورت کو خلع لینے کا حق حاصل ہے، کیونکہ مرد طلاق دینے میں خود مختار ہے، جبکہ عورت خلع لینے میں خود مختار نہیں ہے۔

یہ مسئلہ چونکہ آج کل بہت سے حضرات کے لئے غلط فہمی کا باعث بنا ہوا ہے، اس لئے قدرے تفصیل کے ساتھ اس پر چند دلائل پیش کئے جاتے ہیں:

**پہلی دلیل:** خلع چونکہ طلاق ہی کی ایک صورت ہے، جس میں مخصوص طریقے سے نکاح کو ختم کیا جاتا ہے، اس لئے خلع کے اختیار کا تعین کرنے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ شریعت نے نکاح کے بعد اس معاملہ میں سربراہ اور ذمہ دار کسے قرار دیا ہے؟ تاکہ معلوم ہو جائے کہ نکاح کے معاملہ میں جو سربراہ ذمہ دار ہے، اس کی مرضی کے بغیر نکاح کو ختم نہیں کیا جاسکتا، نہ طلاق کے طریقے پر، نہ خلع کے طریقے پر، دوسرے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ شریعت نے اصولی طور پر طلاق کی نسبت کس کی طرف فرمائی ہے؟ کسے طلاق دینے کا اختیار عطا کیا ہے؟ تاکہ معلوم ہو جائے کہ جسے اصولی طور پر طلاق کا مختار بنایا گیا ہے، وہی اس کی مختلف صورتوں کا بھی مختار ہے، اس کی مرضی کے بغیر طلاق کی کوئی صورت مثلاً خلع معتبر نہیں ہے۔

جہاں تک اس سوال کی بات ہے کہ شریعت نے نکاح کے بعد اس معاملے میں سربراہ اور ذمہ دار کسے قرار دیا ہے؟ تو اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کے واضح نصوص موجود ہیں کہ شریعت نے ازدواجی معاملات میں شوہر کو سربراہ اور ذمہ دار قرار دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے جہاں مرد وعورت کو حقوق وفرائض میں مساوات اور برابری کا تذکرہ فرمایا ہے، وہیں مرد کی فوقیت اور فطری برتری کو بھی واضح فرما دیا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف، وللرجال علیهن درجة'' (بقرہ: ۲۲۸) (دستور کے مطابق جس طرح عورتوں پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اسی طرح ان کے لئے حقوق بھی ثابت ہیں، اور مردوں کو ان پر ایک (خاص) درجہ حاصل ہے)۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ عورتوں کے حقوق وفرائض میں مماثلت اور مساوات ملحوظ ہے، لیکن مرد وعورت کی حیثیت اور درجہ میں مساوات نہیں ہے بلکہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ تفوق اور سربراہی کا حاصل ہے۔

یہ درجہ اور اختیار جو مردوں کو ان کی عورتوں پر عطا کیا گیا، وہ صرف گھریلو امور کو طے کرنے، یا اہم امور سے متعلق فیصلہ لینے تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ نکاح ہو جانے کے بعد یہ معاملہ پورے طور پر شوہر کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے اور اس کی بقاء یا خاتمہ کا فیصلہ بھی اسی کے سپرد ہو جاتا ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے ایک آیت میں ضمناً اس کی بھی وضاحت فرما دی ہے:

''أو یعفو الذی بیده عقدة النکاح'' (یا معاف کر دے وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کا عقدہ ہے) (بقرہ: ۲۳۷)۔

آیت کی مراد بیان کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ولی عقدة النکاح الزوج" (دارقطنی) (عقدہ نکاح کے ولی یعنی مالک شوہر ہے)۔

یہ حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے مروی ہے، جسے محققین نے حسن قرار دیا ہے۔

مذکورہ آیات وروایات کی روشنی میں جب شوہر کا بیوی پر اختیار واقتدار کا درجہ ثابت ہوگیا تو اب باقی یہ رہا کہ شوہر کا یہ اقتدار واختیار کیا طلاق کے معاملے میں بھی ثابت ہے؟ یا طلاق کے معاملے میں عورت کو بھی اختیار حاصل ہے؟ درج ذیل سطور میں اس سوال کا جواب اختصار کے ساتھ عرض کیا جارہا ہے:

الف۔ قرآن وحدیث میں طلاق واقع کرنے کی نسبت جہاں بھی کی گئی ہے، مردوں کی جانب کی گئی ہے، مثلاً:

"یأیها النبی إذا طلقتم النساء. فطلقوهن لعدتهن" (طلاق:۱) (اے نبی! جب آپ حضرات عورتوں کو طلاق دیں، تو ان کی عدت کے وقت طلاق دیں)۔

"یأیها الذین آمنوا إذا نکحتم المؤمنات ثم طلقتموهن ..." (احزاب:۴۹) (اے ایمان والو! جب تم ایمان والیوں سے نکاح کرو، پھر تم انہیں طلاق دو............)۔

☆ "وإن أردتم استبدال زوج مکان زوج وقد آتیتم إحداهن قنطارا ..." (نساء:۲۰) (اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانا چاہو، جبکہ ان میں سے کسی بیوی کو ڈھیر سارا مال دے چکے ہو ......)۔

یہ تین آیات بطور مثال ہیں، اسی طرح احادیث میں بھی طلاق کی نسبت، یا "مفارقۃ" کی نسبت عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی جانب ہی کی گئی ہے، جس کی مثالیں احادیث کی کتابوں میں "کتاب الطلاق" کے تحت دیکھی جاسکتی ہیں، لیکن قرآن وحدیث میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی، جس میں طلاق یا مفارقت کی نسبت عورت کی جانب کی گئی ہو، جبکہ بہت سی آیات واحادیث میں نکاح کی نسبت جس طرح مردوں کی جانب کی گئی ہے، اسی طرح عورتوں کی جانب بھی کی گئی ہے، اسی لئے جس طرح مرد نکاح کے معاملے میں خود مختار ہے، عورت بھی خود مختار ہے، لیکن طلاق کی نسبت عورتوں کی طرف کہیں نہیں کی گئی ہے، اس لئے وہ اس معاملے میں خود مختار نہیں ہیں۔

لیکن اس سے عورتوں کی حق تلفی یا ان پر ظلم وزیادتی لازم نہیں آتی، کیونکہ شریعت نے ایسی صورت میں عورتوں کو اختیار دیا ہے، کہ وہ قاضی یا شرعی پنچایت کے توسط سے شرعی اصولوں کے مطابق اپنا نکاح فسخ کرالیں (جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے)۔

ب۔ اسی طرح ایک آیت میں اللہ تعالی نے نکاح کی بقا اور خاتمہ کا اختیار مرد کو عطا فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

"فإذا بلغن أجلهن فامسکوهن بمعروف أوفارقوهن بمعروف" (طلاق:۲) (جب مطلقہ عورتیں اپنی عدت کے قریب پہنچ جائیں، تو تم انہیں معروف طریقے پر روک لو، یا معروف طریقے پر الگ کردو)

اس کے مقابلے میں کوئی ایسی آیت یا حدیث نہیں ہے، جس میں بیوی کو بھی اختیار دیا گیا ہو کہ وہ چاہے، تو معروف طریقے پر شوہر کے ساتھ رہے اور چاہے تو الگ ہوجائے، بلکہ اسے پابند بنایا گیا ہے کہ وہ بہر حال شوہر کے پاس رہے، وہاں سے بلا اجازت نہ نکلے، ورنہ "ناشزہ" شمار کی جائے گی، اور جب بلا اجازت شوہر کے گھر سے نہیں نکل سکتی، تو نکاح کہاں سے ختم کرسکتی ہے؟

## ج۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے:

"رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک صاحب حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے آقا نے میری شادی اپنی باندی سے کرادی ہے، اب وہ میرے اور اس کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں، راوی فرماتے ہیں کہ یہ سن کر حضور ﷺ منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور فرمایا: لوگو! کیا بات ہے، تم میں سے کوئی اپنے غلام کی شادی اپنی باندی سے کرادیتا ہے، پھر ان کے درمیان تفریق کرنا چاہتا ہے؟ طلاق تو اس کے اختیار میں ہے، جس نے پنڈلی پکڑی"۔

یہ حدیث اس حکم پر صریح ہے کہ طلاق کا مالک تنہا شوہر ہے، آپ ﷺ نے یہ حق کسی اور کو عطا نہیں فرمایا ہے۔

یہ چند دلائل ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شوہر جس طرح ازدواجی معاملات میں ایک خاص اختیار رکھتا ہے، اسی طرح طلاق کے معاملے میں بھی وہ بااختیار ہے، لیکن بیوی اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں رکھتی، چونکہ خلع بھی طلاق ہی کی ایک صورت ہے، اس لئے اس کا اختیار بھی شوہر ہی کو حاصل ہوگا، نہ کہ تنہا بیوی کو، لہذا شوہر کی مرضی کے بغیر بیوی خلع حاصل نہیں کرسکتی ہے، ذیل میں خاص اس مسئلے سے متعلق چند دلائل پیش کئے جاتے ہیں:

☆۔ خلع سے متعلق آیت میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "فإن خفتم ألا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به" (بقرہ: ۲۲۹) (اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ زوجین اللہ کے حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو ان پر اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کے بدلے بیوی خود کو چھڑالے)۔

اس آیت کے تحت علامہ ابوالبرکات نسفی فرماتے ہیں:

"فيما افتدت به أي نفسها، واختلعت به من بذل ما أوتيت من المهر" (مدارک ۱۰۹۰)۔

"فيما افتدت به" سے مراد یہ ہے کہ عورت کو جو مہر دیا گیا ہے اسے صرف کر کے اپنے آپ کو چھڑالے اور اس کے بدلے خلع حاصل کر لے، معلوم ہوا کہ خلع میں عورت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ بدل خلع کے طور پر لیا ہوا مہر یا کوئی اور مال شوہر کو ادا کر کے خود کو نکاح سے چھڑانے کی کوشش کرے، اب آگے اس بدل خلع کو قبول کرنا اور بیوی کو چھوڑنا یہ شوہر کے اختیار میں ہے، چنانچہ خود آیت میں اس کی دلیل موجود ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"فلا جناح عليهما" (تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے)۔

اس کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ ابوالبرکات نسفی فرماتے ہیں:

"أي على الرجل فيما أخذ ولا عليها فيما أعطت" (حوالہ بالا)۔

یعنی مرد پر گناہ نہیں اس میں جو اس نے لیا اور عورت پر گناہ نہیں اس میں جو اس نے دیا۔

معلوم ہوا کہ مذکورہ معاملہ دونوں سے متعلق ہے اور اس معاملے کو انجام دینے میں دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے، آیت کی یہ تفسیر مفسرین اور فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے، سلف میں کسی مفسر یا فقیہ کا یہ قول نظر نہیں آتا کہ خلع کے معاملہ میں بیوی خود مختار ہے اور وہ شوہر کے علی الرغم جس قدر چاہے اور جس طرح چاہے بدل خلع مقرر کر کے خلع حاصل کر سکتی ہے، لہذا اگر آیت کی کوئی ایسی تفسیر کی جائے تو وہ تفسیر بالرائے شمار ہوگی، جس پر حدیث شریف میں بڑی شدید وعید وارد ہوئی ہے۔

☆ خلع سے متعلق جو تفصیلی حدیث مروی ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شوہر کی مرضی کے بغیر خلع نہیں ہو سکتا:

"حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ثابت بن قیسؓ کی اہلیہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے ان کی اخلاق مندی یا دینداری پر کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن میں اسلام میں ناشکری پسند نہیں کرتی ہوں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم انہیں ان کا باغ واپس کر دوگی؟ تو انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! اس پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت ثابتؓ سے فرمایا کہ تم باغ قبول کر لو اور اسے ایک طلاق دے دو" (بخاری)۔

یہ حدیث شریف اس مسئلہ پر صریح ہے کہ خلع کے معاملے میں بیوی خود مختار نہیں ہے، بلکہ وہ شوہر کی مرضی پر موقوف ہے، ورنہ آپ ﷺ حضرت ثابتؓ کو بدل خلع قبول کرنے اور طلاق دینے کا حکم نہ فرماتے، آپ کا یہ حکم فرمانا یہ بتاتا ہے کہ خلع شوہر کی مرضی اور اس کے اختیار سے ہی واقع ہو سکتا ہے۔

☆۔ اگر بیوی شوہر سے شدید حد تک متنفر ہو، تو یہ شقاق کی صورت ہے، ایسی صورت میں زوجین کو چاہئے کہ معروف طریقے پر خود سے خلع کر لیں، لیکن بعض دفعہ شقاق اتنی شدت اختیار کر لیتا ہے کہ خود سے خلع کی گنجائش باقی نہیں رہتی، تو ایسی صورت میں بیوی قاضی یا شرعی پنچایت کے سامنے اپنا معاملہ پیش کر کے تفریق کا مطالبہ کرے، اس کے مطالبہ پر قاضی یا شرعی پنچایت، شوہر کو طلب کر کے، اس سے معاملہ کی تحقیق کرے، اگر وہ شقاق کا اقرار کر لے یا بیوی گواہ پیش کر دے، تو قاضی یا شرعی پنچایت زوجین کی رضامندی سے خلع کرا دیں، اس صورت میں حکمین کا تقرر ضروری نہیں ہے، جیسا کہ حضرت ثابتؓ اور ان کی اہلیہ کے واقعہ میں گذرا، کہ آپ نے حکمین کا تقرر کئے بغیر دونوں کی رضامندی سے خلع کرا دیا تھا، البتہ اس صورت میں بھی حکمین کا تقرر مستحب ہے، تا کہ اگر ممکن ہو تو اصلاح کی کوئی صورت نکل آئے، ورنہ خلع کرا دیا جائے۔

لیکن اگر شوہر "شقاق" کا انکار کرے، یا خلع کے لئے تیار نہ ہو اور بیوی شوہر کے ظلم و زیادتی کو ثابت کرنے کے موقف میں بھی نہ ہو تو تحقیق حال اور اس پر شہادت کے لئے قاضی یا شرعی پنچایت پر حکمین کا تقرر واجب ہے اور بہتر ہے کہ زوجین سے حکمین کے فیصلے پر رضامندی حاصل کر لی جائے، ورنہ اس کے بغیر بھی حکمین کا تقرر کیا جا سکتا ہے، حکمین پہلے پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ زوجین کے درمیان موافقت و مصالحت کی ہر ممکن کوشش کریں، لیکن جب ان کی تمام کوششیں ناکام ہو جائیں تو زوجین کی جانب سے بااختیار ہونے کی صورت میں بالعوض یا بلا عوض (حسب ضابطہ و حسب مصلحت) تفریق کا فیصلہ کر دیں، ورنہ قاضی یا شرعی پنچایت کے سامنے صورتحال کی شہادت دیں، اس صورت میں حکمین کی حیثیت شاہدین کی ہوگی، چنانچہ علامہ ابن العربیؒ فرماتے ہیں:

''حضرت حسن اور ابن زید نے فرمایا: حکمین شاہد ہیں، وہ معاملہ سلطان کے سامنے پیش کریں گے اور جو صورتحال ان کے سامنے ظاہر ہوئی ہو اس کی شہادت دیں گے، یہ قول ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے اور ابوحنیفہ وشافعیؒ اسی کے قائل ہیں'' (احکام القرآن ۱ / ۳۳۰)۔

اسی طرح علامہ ابوبکر حصاصؒ فرماتے ہیں: ''فهما في حال شاهدان . . .'' (احکام القرآن ۳، ۱۵۵) (پس حکمین ایک حالت میں شاہدین ہیں)۔

اس شہادت کے بعد جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ قاضی اور حاکم کے ذریعہ قصوروار پر تادیبی کاروائی کی جائے، ظالم کو بزور ظلم سے روکا جائے اور مظلوم کو انصاف دلایا جائے (احکام القرآن ۳ / ۱۵۴)۔

لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں یہ کاروائی ممکن نہیں، اس لئے رفع ظلم اور دفع ضرر کے لئے مالکیہ کے مذہب پر عمل کیا جائے، چنانچہ قاضی یا شرعی پنچایت حکمین کی متفقہ تجویز پر زوجین کے درمیان تفریق کردے۔

علامہ وہبہ زحیلی اس مسئلے پر بحث کے بعد متعلقہ مسئلے میں مذہب مالکی پر مبنی دستور شام کی دفعات ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ولا يملك الحكمان التفريق، وإنما يرفعان تقريرهما إلى القاضي، ولو كان غير معلل. ويفوض الأمر إلى القاضي بالحكم بمقتضاه. أو رفض التقرير، وتعيين حكمين آخرين للمرة الأخيرة'' (م: ۱۱۵)۔

(حکمین کو تفریق کا اختیار نہیں، وہ اپنی رپورٹ قاضی کو پیش کریں گے، اگرچہ اس میں وجوہ واسباب کی تفصیل نہ ہو، اور معاملہ قاضی کے سپرد کردیا جائے گا، وہ اس رپورٹ کے مطابق فیصلہ کرے، یا رپورٹ مسترد کردے اور دوسری مرتبہ کے لئے دوسرے حکمین کا تقرر کرے)۔

علامہ سید سابق اس مسئلے سے متعلق دستور مصر کی دفعہ ۱۱ نقل کرتے ہیں: ''مادة (۱۱) على الحكمين أن يرفعا إلى القاضي ما يقررانه. وعلى القاضي أن يحكم بمقتضاه'' (فقہ السنہ ۲، ۲۵۰) (دفعہ ۱۱: حکمین پر واجب ہے کہ وہ جو بات طے کریں اسے قاضی کے سامنے پیش کردیں اور قاضی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے مطابق فیصلہ کرے)۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا مرتب کردہ ''مجموعہ قوانین اسلامی'' میں اسباب فسخ وتفریق کے تحت درج ہے: ''زوجین میں شقاق کا پایا جانا'' اس دفعہ کا متن حسب ذیل ہے: ''اگر زوجین کے درمیان شدید نفرت پیدا ہوجائے کہ دونوں کا اللہ کے حدود کو قائم رکھتے ہوئے ازدواجی زندگی گذارنا ممکن نظر نہ آئے، تو ایسی صورت میں (الف) قاضی حکمین مقرر کرے گا، تاکہ اصلاح کی صورت نکل سکے، (ب) اگر تحکیم کے باوجود اصلاح حال یا باہمی رضامندی سے علاحدگی کی کوئی صورت نہ نکل سکے تو قاضی بربنائے شقاق زوجہ کے مطالبہ کی صورت میں تفریق کردیگا'' (مجموعہ / ۲۵۰-۲۵۱)۔

یہاں یہ تینوں حوالے اس لئے ذکر کئے گئے کہ مالکیہ کے اصل مذہب میں تفریق کا اختیار براہ راست حکمین کو حاصل ہے، مگر طلاق کے معاملے احتیاط کی بنا پر قاضی یا شرعی پنچایت کا فیصلہ ضروری قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ وہبہ زحیلی نے لکھا ہے: ''واضح رہے کہ حکمین کی ذمہ داری اولا اصلاح ہے، پھر قاضی کے سامنے تفریق کی قرارداد پیش کرنا، طلاق کے معاملے میں احتیاط کی بنا پر، لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا مذہب مالکی میں حکم یہ ہے کہ حکمین خود طلاق واقع کردیں، قاضی کی طرف سے کامل تفویض کی بنا پر، لہذا اگر قاضی یہ قید لگادے کہ حکمین صرف قرارداد پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، جیسا کہ قانون نے اختیار کیا ہے، تو مالکیہ کی مخالفت نہیں ہوگی'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷ / ۵۳۰)۔

اس مسئلے میں قاضی یا شرعی پنچایت کی طرف سے کی جانے والی تفریق کی نوعیت کیا ہوگی؟ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے وہبہ زحیلی دستور شام کی متعلقہ دفعات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''حکمین کا کام اولا زوجین کے درمیان اصلاح کی کوشش کرنا ہے، لیکن جب وہ اس سے عاجز ہوجائیں اور بدسلوکی کل یا اکثر شوہر کی جانب سے ہو، تو وہ طلاق بائن کے ذریعہ تفریق کی قرارداد تیار کریں اور اگر بدسلوکی بیوی کی جانب سے ہو، یا زوجین کے درمیان مشترک ہو، تو پورے مہر مثل پر، یا بدسلوکی کے بقدر اس کے ایک حصے پر تفریق کی قرارداد تیار کریں'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷ / ۵۳۰)۔

۴۔ لغت میں ''شقاق'' کے معنی ہے: سخت دشمنی اور مخالفت، چنانچہ ابن منظور لکھتے ہیں: ''الشقاق غلبة العداوة والخلاف. شاقه. مشاقة وشقاقا. خالفه'' (لسان العرب ۷، ۱۶۶)۔

اس معنی میں یہ لفظ یا تو ''شق'' بالفتح سے ماخوذ ہوگا جس کے معنی دشوار ہونے کے ہیں، عداوت ومخالفت غالب آجانے کی صورت میں چونکہ ہر فریق وہ کام

کرتا ہے، یا کرنا چاہتا ہے، جو دوسرے پر دشوار ہوتا ہے، اس لئے اس کو "شقاق" کہا جاتا ہے، یا "شق" بالکسر سے ماخوذ ہوگا، جس کے معنی "ایک جانب یا ایک پہلو" کے ہیں، مخالفت اور عداوت غالب آجانے کی صورت میں چونکہ ہر فریق دوسرے کے مخالف پہلو کو اختیار کرتا ہے اور دوسرے سے الگ ایک جانب میں ہوجاتا ہے، اس لئے اس کو "شقاق" کہا جاتا ہے (دیکھئے: تفسیر ابی سعود بہامش مفاتیح الغیب ۳/۳۱۹)۔

علامہ مرتضی زبیدیؒ نے ایک تیسرے ماخذ کی بھی نشاندہی کی ہے، وہ لکھتے ہیں: "أومن "شق العصا بينك وبينه" فيكون مجازا" یا یہ لفظ "شق العصا بينك وبينه" سے ماخوذ ہے، اس صورت میں عداوت اور مخالفت کے معنی میں مجاز ہوگا۔

"شق العصا بنيك وبينه" عربی زبان کا ایک محاورہ ہے، جو انتشار اور پھوٹ ڈالنے کے معنی میں بولا جاتا ہے، علامہ زبیدی کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے "شقاق" اسی محاورے سے ماخوذ ہو، ایسی صورت میں چونکہ پھوٹ اور انتشار کا لازمی تقاضہ مخالفت اور عداوت ہوتا ہے، اس لئے اس معنی میں "شقاق" کا استعمال مجازاً ہوگا۔

شریعت کی اصطلاح میں "شقاق" سے وہی معنی مراد ہیں، جو اہل لغت نے بیان کئے ہیں۔

علامہ زحیلی فرماتے ہیں: "شقاق سے مراد شدید جھگڑا ہے، جو عزت وشرافت پر حملہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/ ۵۲۷)۔

الغرض اب تک "شقاق" کی تشریح میں جتنے الفاظ آئے ہیں، ان کی روشنی میں "شقاق" کا یہ مفہوم متعین ہوتا ہے: "زوجین کے درمیان ایسی نااتفاقی اور دوری، جس کی وجہ سے وہ حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں اور معروف طریقے پر مل جل کر زندگی گذارنا دشوار ہوجائے"۔

خواہ اس نااتفاقی اور دوری کا ذمہ دار زوجین میں سے ہر ایک ہو، یا کوئی ایک ہو، یا کسی کو متعین طریقے پر ذمہ دار قرار دینا مشکل ہو، بہرصورت "شقاق" متحقق ہوجائے گا۔

اس عموم کی وجہ یہ ہے کہ اگر ایک جانب سے بھی نفرت وعداوت پیدا ہوجائے تو بھی ایک دوسرے سے نااتفاقی اور دوری متحقق ہوجاتی ہے اور خود بخود دوسرا الگ تھلگ ایک جانب میں ہوجاتا ہے، خواہ وہ اس کو پسند نہ کرتا ہو اور اس کا ذمہ دار نہ ہو، اسی کے پیش نظر قرآن مجید میں "مفاعلہ" کا مصدر "شقاق" استعمال کیا گیا اور اس کی اضافت "بینھما" کی طرف کی گئی۔

۵۔ قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں تفصیل ہے، جس کا حاصل تین صورتوں میں بیان کیا جاسکتا ہے:

**پہلی صورت:** زوجین کی رضامندی سے قاضی خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے، اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کا اتفاق ہے اس کی دلیل وہ حدیث شریف ہے جس میں حضرت ثابتؓ اور ان کی اہلیہ کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے، اس کے آخری الفاظ ہیں: "هل تردين عليه حديقته. قالت: نعم. فقال: اقبل الحديقة وطلقها تطليقة" (بخاری) (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اہلیہ سے دریافت فرمایا: کیا تم انہیں ان کا باغ واپس کردوگی، تو انہوں نے کہا: ہاں، اس پر آپ نے حضرت ثابت سے فرمایا: باغ قبول کرلو اور اسے ایک طلاق دے دو)۔

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ آپ نے جبری خلع کا فیصلہ نہیں فرمایا، بلکہ پہلے ان کی اہلیہ کو بدل خلع ادا کرنے پر راضی کیا، پھر حضرت ثابت سے طلاق دلوائی، لہذا اگر کوئی قاضی اس طرح زوجین کی مرضی اور اختیار سے کہہ سن کے خلع کرانا چاہے تو کراسکتا ہے، بلکہ بسا اوقات ایسا کرنا قاضی کی ذمہ داری ہے۔

**دوسری صورت:** زوجین یا ان میں سے کوئی خلع پر راضی نہ ہو، لیکن بیوی اپنا دعوی گواہوں سے ثابت کردے، تو اس صورت میں بھی حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک قاضی خلع رطلاق کا فیصلہ نہیں کرسکتا، بلکہ ظلم کا دفاع اور ضرر کا ازالہ کرے گا، البتہ مالکیہ کے نزدیک اس صورت میں بیوی کے مطالبہ پر قاضی خلع رطلاق کا فیصلہ حسب ضابطہ اور حسب مصلحت کرسکتا ہے، چنانچہ علامہ زحیلی ائمہ اربعہ کے مذاہب نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ نے شقاق یا ضرر کی وجہ سے تفریق کی اجازت نہیں دی ہے، ضرر اور شقاق خواہ جتنا شدید ہو، اور مالکیہ نے جھگڑا ختم کرنے کے لئے شقاق یا ضرر کی وجہ سے تفریق کی اجازت دی ہے، چنانچہ ان حضرات کے قول کی بنا پر بیوی اپنا معاملہ قاضی کے سامنے پیش کرے گی، اب اگر اس نے ضرر ثابت کردیا یا اپنے دعوے کی صحت ثابت کردی تو قاضی شوہر کی جانب سے اسے طلاق دے دے گا" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/ ۵۲۸)۔

**تیسری صورت:** زوجین یا ان میں سے کوئی خلع پر راضی نہ ہو اور نہ بیوی اپنا دعوی ثابت کرنے کے موقف میں ہو، تو اس صورت میں بالاتفاق قاضی ازخود خلع رطلاق کا فیصلہ نہیں کرسکتا، حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک تو ظاہر ہے اور مالکیہ کے نزدیک بھی قاضی حکمین کا تقرر کئے بغیر ازخود خلع کا فیصلہ نہیں کرسکتا، علامہ ابن العربی لکھتے ہیں: "چھٹا مسئلہ یہ ہے کہ قاضی اپنے علم کی بنا پر فیصلہ نہیں کرتا ہے، اس لئے شریعت نے ان دونوں واقعوں کے لئے حکمین کی تخصیص فرمائی، (مراد

شقاق کا واقعہ اور جزائے صید کا واقعہ ہے) تاکہ ان کے علم کی بنا پر ان کا فیصلہ نافذ ہو اور دو کی تعداد کی وجہ سے ان سے تہمت دور ہو" (احکام القرآن ار ۳۳۰)۔

البتہ اس صورت میں قاضی پر لازم ہے کہ وہ حکمین کا تقرر کرے۔

مذکورہ صورت میں حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک بھی حکمین کا تقرر واجب ہونا چاہئے، کیونکہ اس صورت میں حکمین کی حیثیت ان حضرات کے نزدیک "شاہدین" کی ہے اور بغیر شہادت کے قاضی اگلی کارروائی نہیں کرسکتا ہے۔

## حکمین کی حیثیت:

حکمین کے متعلق دو صورتوں میں ائمہ کا اتفاق ہے، پہلی صورت یہ کہ حکمین زوجین کے درمیان مصالحت اور موافقت کرادیں، تو بالاتفاق یہ درست ہے، بلکہ یہی اصل مطلوب ہے، دوسری صورت یہ کہ حکمین، زوجین کی طرف سے بااختیار ہوں اور خلع یا طلاق کا فیصلہ کردیں تو وہ بھی بالاتفاق نافذ ہے، البتہ اگر زوجین کی طرف سے انہیں تفریق کا اختیار حاصل نہ ہو اور وہ تفریق کا فیصلہ کرنا چاہیں تو اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

حنفیہ کے نزدیک حکمین کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ از خود تفریق کا فیصلہ کریں، لہٰذا اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ معتبر نہیں ہوگا، علامہ ابوبکر جصاصؒ حنفیہ کا مذہب نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "فقال أصحابنا: ليس للحكمين أن يفرقا إلا أن يرضى الزوج" (احکام القرآن ۳؍۱۵۲) (ہمارے اصحاب نے فرمایا کہ شوہر کی مرضی کے بغیر حکمین تفریق نہیں کرسکتے)۔

شافعیہ کے یہاں اس مسئلے میں دونوں اقوال ہیں، چنانچہ علامہ عمرانی شافعی تحریر فرماتے ہیں: "وهل هما وكيلان من قبل الزوجين. أو حكمان من قبل الحاكم؟ فيه قولان" (البیان ۹؍۵۲۲-۵۲۳)

البتہ شافعیہ کا پہلا قول راجح ہے، خود امام شافعیؒ نے کتاب الام میں اس قول کی صراحت کی ہے (کتاب الام ۵؍۱۱۵ تا ۱۱۷)۔

حنابلہ کے یہاں بھی اس مسئلے میں دونوں روایتیں ہیں، چنانچہ علامہ ابن قدامہ حنبلی نقل فرماتے ہیں: "حکمین کے سلسلے میں امام احمدؒ سے روایات مختلف ہیں: ایک روایت یہ ہے کہ وہ زوجین کے وکیل ہیں، ان کی اجازت کے بغیر ان کے درمیان تفریق کا اختیار نہیں رکھتے ہیں اور دوسری روایت یہ ہے کہ وہ دونوں حاکم ہیں اور انہیں اختیار ہے کہ وہ مصالحت، تفریق بعوض یا بلاعوض جو مناسب سمجھیں کریں" (المغنی ۷؍۴۹)۔

مالکیہ کے نزدیک حکمین کو اختیار ہے کہ اپنے اتفاق سے زوجین کے درمیان طلاق یا خلع کا فیصلہ کردیں، صحابہ میں حضرت علی، حضرت ابن عباس اور تابعین میں سعید بن جبیر، ابوسلمہ بن عبدالرحمن، شعبی، نخعی، اور تبع تابعین میں امام مالک کے علاوہ امام اوزاعی، اسحاق بن راہویہ اور ابن المنذر سے بھی یہ قول منقول ہے، چنانچہ علامہ ابن قدامہ، امام احمدؒ کی دوسری روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "وروي نحو ذلك عن علي. وابن عباس. وأبي سلمه بن عبد الرحمن. والشعبي. والنخعي. وسعيد بن جبير. ومالك. والأوزاعي. اسحاق. وابن المنذر" (المغنی ۷؍۴۹)۔

اس اختلاف کا حاصل یہ ہوا کہ اس مسئلے میں اسلاف ائمہ سے دو اقوال ثابت ہیں اور دونوں جانب ائمہ کی ایک جماعت موجود ہے، ذیل میں ائمہ کے دلائل کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ہمارے علم میں اس مسئلے سے متعلق منصوص دلائل تین ہیں: ایک آیت شقاق، دوسرے حضرت علی کا اثر، اور تیسرے حضرت ابن عباس کا اثر، مگر یہ تینوں دلائل حکمین کی حیثیت کے تعین پر صریح نہیں ہیں، اسی لئے ہر فریق نے ان سے اپنے موقف پر استدلال کیا ہے، چنانچہ امام رازیؒ آیت شقاق سے فریقین کے استدلال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "بعض حضرات نے پہلے قول پر آیت کے ذریعہ یہ استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "حکمین" کہا ہے، اور حکم کے معنی "حاکم یعنی فیصل" ہیں، پس جب اللہ تعالیٰ نے اسے "حاکم" قرار دیا تو اسے فیصلہ کرنے کی قدرت عطا فرمادی، جبکہ بعض حضرات نے دوسرے قول پر اسی آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکمین کا تذکرہ جب کیا تو ان کی طرف اصلاح کی نسبت فرمائی، لہٰذا اس کا تقاضا یہ ہے کہ اصلاح کے علاوہ کوئی اور کام ان کے سپرد نہیں (مفاتیح الغیب ۳؍۳۲۰)۔

حضرت علیؓ کے پاس ایک مرد اور اس کی بیوی آئی، ہر ایک کے پاس لوگوں کی ایک جماعت تھی، تو حضرت علیؓ نے فرمایا ان دونوں کا کیا مسئلہ ہے؟ لوگوں نے کہا: ان کے مابین شقاق وخلاف پیدا ہوگیا ہے، تو حضرت علیؓ نے آیت پاک پڑھی: "فابعثوا حكما من اهله الخ" اور حکمین سے فرمایا: کیا تم دونوں کو اپنی

ذمہ داری معلوم ہے؟ اگر تم دونوں کی رائے جمع وصلح کی ہوئی تو جمع وصلح کرا دینا، اور اگر تفریق کی رائے ہوئی تو تفریق کر دینا، تو عورت نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے راضی ہوں، خواہ میرے حق میں ہو یا نہ ہو، لیکن مرد نے کہا کہ اگر حکم کی رائے تفریق کی ہوگی تو ہم نہیں مانیں گے، اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا: نہیں بخدا تمہیں اس وقت تک میرے پاس سے جانے کی گنجائش نہیں ہے جب تک کہ عورت کی طرح اقرار نہ کرلو!، اور ایک روایت میں ہے کہ ہرگز نہیں! بخدا تم یہاں سے لوٹ نہیں سکتے جب تک اسی طرح اقرار نہ کرلو، جس طرح عورت نے اقرار کیا ہے"

اس حدیث میں دونوں اقوال میں سے ہر ایک کی دلیل موجود ہے، پہلے قول کی دلیل یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے زوجین کی رضامندی کے بغیر حکمین کا تقرر فرمایا، اور ان سے کہا کہ اگر تم موافقت کرانا مناسب سمجھو تو موافقت کردو، اور اگر تفریق مناسب سمجھو تو تفریق کردو، حضرت علیؓ کے قول علیکما کا کم از کم مفہوم یہ ہے، کہ ایسا کرنا ان کے لئے جائز ہے، اور دوسرے قول کی دلیل یہ ہے کہ شوہر جب علاحدگی پر راضی نہیں ہوا تو حضرت علیؓ نے حکمین کے تقرر میں توقف فرمایا (اور پہلے شوہر کو راضی کرنے پر زور دیا)۔

حضرت ابن عباسؓ کا جو اثر اس مسئلے سے متعلق استدلال میں پیش کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے: "حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ: میں اور معاویہ حکم بنا کر بھیجے گئے، تو ہم سے کہا گیا کہ اگر تم موافقت کرانا مناسب سمجھو تو موافقت کرا دینا، اور اگر تفریق کرنا مناسب سمجھو تو تفریق کردینا" (مصنف عبدالرزاق)۔

حکمین کے لئے تفریق کے قائلین نے اس اثر سے استدلال کیا ہے، لیکن یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن معاویہ کو زوجین کی رضامندی اور اتفاق سے حکم بنایا گیا تھا، اس لئے ان سے تفریق کرنے کو کہا گیا، اور اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے ان کے درمیان تفریق کی رائے ظاہر فرمائی، اس تاویل کی دلیل یہ ہے کہ خود حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حکمین، شاہدین ہیں، جن کا کام حاکم تک صحیح صورت حال پہنچانا ہے، چنانچہ علامہ ابن العربیؒ نقل فرماتے ہیں: "حضرت حسن اور ابن زید نے فرمایا کہ حکمین شاہد ہیں، وہ معاملہ سلطان کے سامنے پیش کریں گے اور جو صورت حال ان کے سامنے ظاہر ہوئی ہو اس کی شہادت دیں گے" یہ قول ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے" (احکام القرآن ۱/۴۳۰)۔

حکمین کے لئے خیار تفریق کے منکرین نے ایک استدلال یہ بھی کیا ہے: "اس لئے کہ بضعہ شوہر کا حق ہے، اور مال بیوی کا حق ہے اور یہ دونوں ہوشیار ہیں، لہذا دوسرے کے لئے ان کے حق میں بغیر وکالت یا ولایت کے تصرف کرنا جائز نہیں ہوگا" (المغنی ۷/۴۹)۔

لیکن اس استدلال پر کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح مخصوص حالات میں دفع ضرر کے پیش نظر قاضی کو یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے، اسی طرح شقاق کی صورت میں بھی حکمین کو یہ اختیار دفع ضرر کے پیش نظر دیا گیا ہے۔

فریقین کے مذکورہ دلائل کا جائزہ لینے کے بعد کسی ایک فریق کے قول کی ترجیح دلائل کی قوت کی بنیاد پر تکلف سے خالی نہیں معلوم ہوتی، البتہ خلع اور طلاق کے معاملے میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ حکمین کو شاہدین کی حیثیت دی جائے اور ان کی شہادت اور متفقہ تجویز پر قاضی یا شرعی پنچایت تفریق کا فیصلہ سنائے۔

۶- مالکیہ اور بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک، ایک خاص صورت میں خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں، بلکہ حکمین کی صوابدید پر موقوف ہے، جس کا بیان تفصیل سے پانچویں باب میں گذرا، اس صورت میں قاضی کی طرف سے حکمین کا تقرر ضروری ہے اور اصل مذہب مالکی کے مطابق حکمین ہی کو اختیار ہے کہ مصالحت کی کوششیں ناکام ہو جانے کے بعد، متفقہ طور پر خلع یا طلاق جو مناسب سمجھیں واقع کردیں، حکمین کا تقرر کئے بغیر قاضی از خود خلع یا طلاق کا فیصلہ نہیں کر سکتا، چنانچہ علامہ ابن العربیؒ فرماتے ہیں: "جب امام المسلمین / حاکم کو زوجین کے حال سے شقاق کا علم ہو جائے تو ان کی طرف حکمین روانہ کرنا اس پر لازم ہے اور وہ ان کے مقدمہ دائر کرنے کا انتظار نہ کرے" (احکام القرآن ۱/۴۳۳)۔

لیکن مذکورہ مسئلہ سے متعلق فقہ مالکی پر مبنی مصر و شام کے قوانین میں علماء ہند کا مرتب کردہ مجموعہ قوانین اسلامی میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ حکمین تفریق کا فیصلہ خود کرنے کے بجائے اس کی متفقہ تجویز قاضی کو سپرد کردیں، اور قاضی اس کے مطابق فیصلہ صادر کرے، تفصیل کے لئے مقالے کا تیسرا باب ملاحظہ ہو۔

کیا ایک حکم کا تقرر کافی ہے؟ اس مسئلے میں تفصیل ہے، کیونکہ حکم کا تقرر زوجین کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے اور قاضی کی طرف سے بھی: (الف) اگر زوجین نے حکم کا تقرر کیا ہو، تو مالکیہ کے نزدیک باتفاق روایت ایک حکم کا تقرر کافی ہے (الشرح الکبیر ۲/۵۱۵)۔

حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک۔ اصح قول کے مطابق۔ حکم چونکہ وکیل ہے اور ایک آدمی کو بھی وکیل بنانا درست ہے، اس لئے اس صورت میں ان

حضرات کے نزدیک بھی ایک حکم کا تقرر کافی ہونا چاہئے، اسی طرح ''جزائے صید'' کا تخمینہ مقرر کرنے کے لئے قرآن مجید میں ''یحکم بہ ذوا عدل منکم'' آیا ہے، لیکن فقہاء حنفیہ وشافعیہ فرماتے ہیں کہ یہ استحبابی حکم ہے، لہذا اگر ایک عادل مسلمان بھی، تخمینہ مقرر کردے، تو کافی ہے، چنانچہ علامہ مرغینانیؒ فرماتے ہیں: ''قالوا: ولو أحد يكفي، والمثنى أولى، لأنه أحوط، وأبعد عن الغلط، كما في حقوق العباد'' (ہدایہ ۱٫۲۸۰)۔

اس پر قیاس کرتے ہوئے یہاں بھی کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں حکمین کے تقرر کا حکم استحبابی ہے اور ایک حکم کا تقرر بھی کافی ہے۔

ب۔ اگر قاضی نے حکم کا تقرر کیا ہو تو اس سلسلہ میں مالکیہ کے یہاں دونوں روایتیں ہیں، چنانچہ علامہ دسوقیؒ فرماتے ہیں: ''اسی طرح حاکم ایک حکم کا تقرر کرے، تو اس میں تردد ہے، چنانچہ لخمیؒ جواز کے قائل ہیں، جبکہ باجیؒ عدم جواز کے قائل ہیں، دونوں اقوال میں سے زیادہ ظاہر جواز کا قول ہے، جیسا کہ ہمارے شیخ عدویؒ نے فرمایا ہے'' (حاشیۃ الدسوقی ۲۱۵/۳)۔

علامہ ابن العربیؒ نے جواز کا قول بیان کرنے کے بعد اس پر دلیل بھی پیش فرمائی، لکھتے ہیں: ''ایک حکم کو بھیجنا کافی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے زنا میں چار گواہوں کا حکم فرمایا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زانیہ عورت کے پاس انیسؓ کو بھیجا، اور ان سے فرمایا کہ اگر وہ اعتراف کرلے تو اسے رجم کردینا، اسی طرح عبد الملکؒ نے ''مدونہ'' میں فرمایا ہے'' (احکام القرآن ۳۳۳/۱)۔

لیکن یہ استدلال محل نظر ہے، کیونکہ زنا کا ثبوت جس طرح چار گواہوں سے ہوتا ہے، اسی طرح زنا کار کے اعتراف سے بھی ہوجاتا ہے، حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زنا کا ثبوت زانیہ کے اعتراف سے ہوجانے کی شرط پر رجم کا حکم فرمایا ہے، لہذا صحابی رسول حضرت انیسؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد اور نائب تھے، چار گواہوں کے قائم مقام نہیں تھے، اور نہ ہی وہ اس معاملے میں حکم یا فیصل تھے۔

حنفیہ اور شافعیہ کے یہاں قاضی کی طرف سے مقرر کردہ حکمین کی حیثیت شاہدین کی ہوتی ہے، جیسا کہ پانچویں باب میں تفصیل سے گذرا، اس لئے اس صورت میں ان کے یہاں ایک حکم کا تقرر کافی نہیں ہونا چاہئے، چنانچہ خطیب شربینی شافعیؒ فرماتے ہیں: ''مصنفؒ کے کلام کا تقاضا یہ ہے کہ ایک حکم پر اکتفاء درست نہیں ہے، اور یہی اصح ہے، آیت کے ظاہر کی وجہ سے'' (مغنی المحتاج ۲۶۱/۳)۔

مصر اور شام کے قوانین میں بھی ایک حکم کے تقرر کا تذکرہ نہیں ہے، بلکہ دو حکم کی ہر جگہ صراحت ہے (ملاحظہ ہو: فقہ السنہ ۲۴۸/۲، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵۲۹/۷ تا ۵۳۰)۔

اس حقیر کا خیال یہ ہے کہ جس طرح احتیاط کی بنیاد پر طلاق یا خلع قاضی کے ذریعہ ہونا چاہئے، اسی طرح احتیاط کی بنیاد پر دو حکم کا تقرر بھی ضروری ہونا چاہئے۔

ے۔ حضرت تھانویؒ نے ''الحیلۃ الناجزۃ'' میں دوسرے مکتب فکر کی طرف عدول والے مسئلے کی تحقیق فرمانے کے بعد لکھا ہے: ''ضرورت شدیدہ اور ابتلائے عام کے وقت حنفیہ کے نزدیک دوسرے ائمہ کے مذہب کو اختیار کرکے اس پر فتوی دے دینا بھی جائز ہے، لیکن عوام کو خود اپنی رائے سے جس مسئلہ پر چاہیں ایسا کرلینے کی اجازت نہیں، بلکہ بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، اور اس زمانے میں احتیاط اس طرح ہوسکتی ہے کہ جب تک محقق ومتدین علمائے کرام میں متعدد حضرات کسی مسئلے میں ضرورت کا تحقق تسلیم کرکے دوسرے امام کے مذہب پر فتوی نہ دیں، اس وقت تک ہرگز اپنے امام کے مذہب کو نہ چھوڑے، کیونکہ مذہب غیر کو لینے کے لئے شرط ہے کہ اتباع ہوی کی بنا پر نہ ہو بلکہ ضرورت داعیہ کی وجہ سے ہو اور ضرورت وہی معتبر ہے جس کو علماء اہل بصیرت ضرورت سمجھیں، و نیز یہ بھی ضروری ہے کہ فتوی دینے والا ایسا شخص ہو جس نے کسی ماہر استاذ سے فن کو حاصل کیا ہو اور اہل بصیرت اس کو فقہ میں مہارت تام حاصل ہونے پر شہادت دیتے ہوں'' (الحیلۃ الناجزہ ۳۶)۔

حضرت تھانویؒ کی اس تحقیق کے بعد زیر بحث مسئلے میں مذہب مالکی کی طرف عدول کی گنجائش نکل جاتی ہے کیونکہ ہمارے زمانے میں زوجین کے درمیان ''شقاق'' کے واقعات کثرت سے پیش آرہے ہیں، اور حنفی مسلک کے مطابق ہندوستان جیسے ملک میں قصور وار پر دارو گیر اور تادیب وتعزیر کے ذریعہ ''رفع ظلم اور دفع ضرر'' بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے آج ضرورت ہے کہ اس مسئلہ میں مذہب مالکی پر فتوی دیا جائے، البتہ یہ فتوی اجتماعی غور وفکر اور بحث وتحقیق کے بعد اس وقت دیا جائے جب علماء اہل بصیرت کی ایک جماعت اس ضرورت کو تسلیم کرلے، جیسا کہ خود تھانویؒ نے معتبر علماء کی ایک جماعت کے اتفاق سے فسخ وتفریق کی بعض صورتوں میں مذہب مالکی پر عمل کا فتوی دیا، اس پر بھی بعض علماء نے اس زمانے میں اپنے شکوک وشبہات کا اظہار کیا تھا لیکن ضرورت کے تحقق میں انہیں حائل نہیں سمجھا گیا، اور آنے والے حالات نے حضرت تھانویؒ اور ان کے رفقاء کے فکر وخیال کی تصدیق کردی۔

☆☆☆

# خلع اور شقاق کی صورت میں قاضی اور حکم کے اختیارات

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی [1]

نکاح ایک پاکیزہ اور پائیدار بندھن ہے، اس کی بنیاد باہمی الفت ومحبت اور سکون وطمانینت پر ہے (دیکھئے: سورۃ الروم/۲۱)۔ اس رشتہ کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لئے کوشاں رہنا چاہئے، اور باہم بغض، اختلاف اور ناپسندیدگی کو دور رکھنا چاہئے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وعاشروهن بالمعروف فإن كرهتموهن فعسى أن تكرهوا شيئاً ويجعل الله فيه خيراً كثيراً'' (سورۃ النساء: ۱۹)۔
(اور عورتوں کے ساتھ خوش اسلوبی کے ساتھ گزر بسر کرو، اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس کے اندر کوئی بڑی بھلائی رکھ دے)۔

اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''لايفرك مؤمن مومنة إن كره منها خلقا رضي منها خلقا آخر'' (صحیح مسلم حدیث: ۱۴۶۹)۔ (کوئی مومن مرد کسی مومنہ عورت سے جدائی اختیار نہ کرے، اگر اس کی کوئی عادت ناپسند ہوگی، تو کچھ چیزیں پسندیدہ بھی ہوں گی)۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''أيما امرئة سالت زوجها طلاقا من غير بأس فحرام عليها رائحة الجنة'' (رواہ اصحاب السنن وحسنه الترمذی وصحیح الالبانی)۔ (جو عورت بلا وجہ اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے تو اس کے لئے جنت کی خوشبو حرام ہے)۔

لیکن کبھی محبت کے اس رشتے میں تلخی آجاتی ہے، دونوں میں اختلاف اور دلوں میں دوری پیدا ہوجاتی ہے، الفت اور چاہت کی جگہ نفرت بیٹھ جاتی ہے، سکون واطمینان رخصت ہوجاتا ہے اور اصلاح حال کی تمام کوششیں ناکام ہوجاتی ہیں، اسی صورت میں ایک ناخوش گوار ضرورت کے تحت جدائیگی کی اجازت دی جاتی ہے، اگر شوہر اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو وہ طلاق دیکر خوش اسلوبی کے ساتھ اس رشتہ کو ختم کردے، اور اگر عورت محسوس کرتی ہے کہ اب اس کے لئے اس رشتہ کے تقاضوں پر عمل کرنا دشوار ہے تو وہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرسکتی ہے، جسے شرعی اصطلاح میں ''خلع'' کہا جاتا ہے۔

## خلع کی تعریف:

قرآن حکیم میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لئے ''لباس'' قرار دیا گیا ہے، نباہ نہ ہونے کی صورت میں جدائیگی ایک طرح سے اس لباس کو اتار دینا ہے، اس لئے اس کے لئے ایک لفظ ''خلع'' بھی استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو اتار دینا، کھینچ لینا، اور اصطلاحی اعتبار سے اس کی متعدد تعریفیں کی گئیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

''فراق الرجل زوجته على عوض يحصل له'' (عمدۃ القاری ۱۴،۲۷۳)۔ (کسی شخص کا اپنی بیوی سے کچھ عوض لیکر اسے چھوڑ دینا)۔

اور علامہ ابن نجیم نے اس کی تعریف ان الفاظ سے کی ہے: ''إزالة الملك النكاح المتوقفة على قبولها بلفظ الخلع أو ما في معناه'' (البحر الرائق ۴،۱۱۹)۔ (خلع یا اس جیسے کسی لفظ کے ذریعہ ملکیت نکاح کو اس طور پر ختم کرنا کہ وہ عورت کے قبول کرنے پر موقوف ہو)۔

## خلع میں قاضی کے اختیارات:

اگر شوہر یہ محسوس کرتا ہے کہ بیوی کے ساتھ اس کے تعلقات ایسے مرحلے میں داخل ہوچکے ہیں کہ بظاہر ایک ساتھ رہنے کی کوئی شکل نہیں ہے تو اس کے لئے طلاق کی اجازت ہے، اور اگر یہی چیز بیوی محسوس کرتی ہے کہ اس رشتہ کو باقی رکھنے کی صورت میں اس پر شوہر کے جو حقوق ہیں ان میں کوتاہی ہوگی، اور اس کے لئے نباہ کرنا دشوار معاملہ ہے تو ایسی صورت میں اسے خلع کا مطالبہ کرنے کا حق ہے، اور شوہر کے لئے مناسب ہے کہ وہ اسے اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائے اور اس

[1] ☆ استاذ جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ

کے مطالبہ پر اسے خلع دے دے، خلع اصلاً باہمی رضامندی کا معاملہ ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ولا یحل لکن أن تأخذوا مما آتیتموھن شیئاً إلا أن یخافا ألا یقیما حدود اللہ فإن خفتم ألا یقیما حدود اللہ فلا جناح علیھما فیما افتدت بہ. تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا'' (سورۃ البقرۃ: ۲۲۹)۔(اور تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ اپنی عورتوں کو جو کچھ دے چکے ہوا سے واپس لو، مگر یہ کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کے متعین کردہ ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے، سو اگر تم کو اندیشہ ہو وہ دونوں اللہ کے ضابطوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے اس مال کے سلسلہ میں جو عورت بطور فدیہ دے، یہ سب اللہ کے مقرر کردہ ضابطے ہیں ان سے باہر نہ نکلو)۔

مہر وغیرہ دینے کے بعد اسے واپس لینا مرد کے لئے جائز نہیں ہے، اس لئے اسے خیال آسکتا تھا کہ خلع کی صورت میں بھی اسے واپس لینا صحیح نہ ہو، اسی طرح عورت سوچ سکتی تھی کہ پیسہ دیکر چھٹکارا حاصل کرنا شاید باعث گناہ ہو، اس خیال کی تردید کے لئے کہا گیا کہ اس صورت میں بطور فدیہ عورت کے لئے کچھ دینے اور مرد کے لئے اسے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اگر شوہر خلع کے مطالبہ کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے، اور معاملہ قاضی کی عدالت تک آپہنچے تو وہ پہلے شوہر کو بلا کر اس سے خلع کے لئے کہے اور اگر اس کے کہنے کے باوجود بھی وہ تیار نہ ہو تو وہ خود بھی خلع دے سکتا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے:

''ثابت بن قیس کی بیوی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ مجھے ثابت بن قیس کی دینداری اور اخلاق سے کوئی شکایت نہیں ہے، لیکن مجھے یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ مسلمان ہو کر ناشکری کا ارتکاب کروں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تم ان کے دیئے ہوئے باغ کو واپس کر دوگی، انھوں نے کہا: ہاں، آپ صلی اللہ نے ان کے شوہر سے کہا کہ باغ لے لو اور ایک طلاق دے دو، ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر انھوں نے اسے خود سے الگ کر دیا'' (صحیح بخاری مع الفتح ۳/ ۲۷۶۸)۔

علامہ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ خلع کا مطالبہ کرنے والی اس خاتون کا نام جمیلہ بنت عبداللہ بن ابی بن سلول تھا، نیز حضرت ثابتؓ کی ایک دوسری بیوی نے بھی ان سے خلع لے لیا تھا اور ان کا نام حبیبہ بنت سہل تھا، ان دونوں واقعات میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خلع کے لئے حضرت ثابت کی مرضی معلوم نہیں کی، بلکہ صورت حال واضح ہو جانے کے بعد انھیں چھوڑ دینے کا امر صادر فرمایا، اور ''امر'' اپنی اصل کے اعتبار سے وجوب کے لئے ہوتا ہے، اور مخاطب پر اس کی پابندی لازم ہے، اور بغیر کسی دلیل کے اسے دوسرے معنی پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے، اور یہاں اس طرح کی کوئی دلیل نہیں ہے جو بتلائے کہ ''امر'' اپنے حقیقی معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے، بلکہ اس کے برخلاف دلیل موجود ہے کہ ''امر'' اصل معنی میں استعمال ہوا ہے، کیونکہ مرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ عورت کو اچھی طرح سے رکھے یا اسے خوش اسلوبی سے الگ کر دے، خلع کے مطالبہ کی صورت میں اچھی طرح سے رکھنا دشوار ہو چکا ہے اس لئے اس کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ خود سے ہی اسے الگ کر دے، اور اگر وہ ایسا کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو تو پھر قاضی اس ناخوش گوار فریضہ کو انجام دے گا (دیکھئے: نیل الاوطار ۶/ ۲۸۶، سبل السلام ۳/ ۱۶۷)۔

دوسرے یہ کہ باہمی الفت ومحبت اور سکون واطمینان کے ساتھ خوشگوار زندگی گزارنا نکاح کے بنیادی مقاصد میں سے ہے، اور جب طبعی کراہت اور ناپسندیدگی یا تعلیم اور معیار زندگی میں فرق کی وجہ سے عورت محسوس کر رہی ہے کہ اس کے لئے اسلامی حقوق وفرائض کی رعایت کرتے ہوئے خوشگوار زندگی گزارنا دشوار ہے تو اسی صورت میں قاضی کو یہ حق ملنا چاہئے کہ وہ عورت کے مطالبہ پر دونوں کے درمیان تفریق کرا دے، جیسے کہ شوہر کی نامردی کی صورت میں قاضی کو تفریق کرا دینے کا حق حاصل ہے۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت کی غیر موجودگی میں تفریق کا فیصلہ صادر فرما دیا تھا، اور جب انھیں اس کی اطلاع ملی تو بخوشی انھوں نے اس فیصلہ کو قبول کر لیا۔ ''قالت فأخذھا لہ. وخلی سبیلھا فلما بلغ ثابت بن قیس قال قد قبلت قضاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' (رواہ الدار قطنی باسناد صحیح نیل الاوطار ۶.۲۷۶. اعلاء السنن ۱۱.۲۲۲)۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت ثابت کے مذکورہ واقعہ میں خلع کا معاملہ ان کی مرضی سے طے پایا تھا، چنانچہ نسائی میں مذکور روایت کے الفاظ یہ ہیں:

''فأرسل إلی ثابت فقال لہ خذ الذی لھا علیك وخل سبیلھا'' (الدر المنثور ۱/ ۲۸۲، نیز فقہی مقالات ۲/ ۱۷۲، از مولانا تقی احمد عثمانی)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت کے پاس پیغام بھیجا کہ جو مال ان کا تم پر واجب تھا وہ لے لو اور ان کو چھوڑ دو، حضرت ثابتؓ نے کہا ہاں۔

اور امام ابوبکر جصاص رازی نے لکھا ہے کہ اگر خلع کا اختیار سلطان کو ہوتا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم شوہر سے یہ نہ کہتے کہ خلع کرلو، بلکہ خود ہی خلع کر کے عورت کو الگ کر دیتے، اور شوہر کو اس کا باغ واپس کر دیتے (احکام القرآن ار ۲۹۵، ابوبکر احمد بن علی الرازی الجصاص، ط: دار الکتاب العربی، لبنان)۔

اگر اسے تسلیم بھی کرلیا جائے کہ خلع کا معاملہ حضرت ثابت کی مرضی سے طے پایا، اور یہ کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی حیثیت وجوبی نہیں تھی اور وہ اسے قبول کرنے کے پابند نہیں تھے، اور یہ کہ اگر بحیثیت قاضی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خلع دینے کے مختار تھے تو پھر انہیں خلع کے لئے کہنے کی کیا ضرورت تھی، خود ہی اس معاملہ کو حل کر دیتے، تو اس پورے واقعہ سے صرف ایک بات معلوم ہوتی ہے کہ خلع کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قاضی پہلے خود شوہر سے خلع کرنے کے لئے کہے اور اس کی مرضی سے اس معاملے کو نپٹائے، یہ خلع کی بہتر شکل ہے، جیسا کہ فقہی کتابوں میں لکھا ہے کہ شوہر کی نامردی کی صورت میں قاضی پہلے خود اسی سے طلاق کے لئے کہے گا، اور اگر وہ آمادہ نہ ہو تو خود تفریق کرادے گا، خلع کے مسئلہ میں سوال یہ ہے کہ اگر شوہر قاضی کے کہنے پر طلاق دینے کے لئے آمادہ نہ ہو تو کیا قاضی محض اس کی خوشامد پر اکتفا کرے گا، اور عورت کو کرب اور بے چینی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے چھوڑ دے گا، یا نامردی وغیرہ کی طرح مقصد نکاح کو فوت ہوتا ہوا دیکھ کر عورت کے مطالبہ پر اسے الگ کر دے گا۔

میاں، بیوی میں ناچاقی اور کشمکش پیدا ہو جائے، جسے وہ باہم سلجھا نہ سکیں، اور معاملہ قاضی کی عدالت تک آپہنچے تو ان کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے اور اختلاف کو دور کرنے کے لئے قاضی دو آدمیوں کو مقرر کرے گا بہتر یہ ہے کہ ان میں سے ایک مرد کا رشتہ دار ہو اور دوسرا عورت سے متعلق ہو، کیونکہ غیر کے مقابلہ میں ان سے اس بات کی زیادہ امید رکھی جاسکتی ہے کہ وہ اس رشتہ کی اہمیت اور اس کی نزاکت کو پیش نظر رکھیں گے، اور ہر ممکن مصالحت کی کوشش کریں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها إن يريدا إصلاحاً يوفق الله بينهما، إن الله كان عليما خبيرا'' (سورة النساء: ۳۵)۔ (اور اگر تمہیں دونوں کے درمیان کشمکش کا علم ہو تو تم ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک حکم عورت کے خاندان سے مقرر کرو، اگر ان دونوں کی نیت اصلاح حال کی ہوگی تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا، بلاشبہ اللہ بڑا علم رکھنے والا اور ہر طرح باخبر ہے)۔

**شقاق کی تعریف:**...... اس آیت میں مذکورہ لفظ ''شقاق'' کا مفہوم یہ ہے کہ میاں، بیوی کے درمیان ایسی مخالفت اور ضد پیدا ہو جائے کہ باہم مصالحت دشوار ہو جائے، ہر فریق اپنی سوچ اور اپنی بات پر اڑا رہے اور کوئی بھی جھکنے پر آمادہ نہ ہو، علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں: ''الشقاق المخالفة. وكونك في شق غير شق صاحبك'' (المفردات، ۲۶۴)، علامہ شامی نے لکھا ہے: ''الشقاق هو الاختلاف والتخاصم'' (رد المحتار ۵۰۱)۔

## شقاق کی صورت میں حکمین کے اختیارات:

حکمین کی یہ ذمہ داری کہ وہ صحیح صورت حال کا پتہ لگائیں، ظالم و مظلوم کی شناخت کریں، ظالم کو ظلم سے روکیں اور مظلوم کی فریاد رسی کریں (دیکھئے المغنی ۱۰/ ۲۶۳)۔ اور دونوں کے درمیان ہر ممکن طریقے سے مصالحت کرانے اور شقاق کو وفاق سے بدلنے کی کوشش کریں، لیکن اگر ان کی کوشش کامیاب نہیں ہوتی ہے، اور دونوں میں موافقت کی کوئی صورت نہیں نکلتی ہے اور اندیشہ ہے کہ ساتھ رہنے کی صورت میں لڑائی، جھگڑے کا ماحول بنا رہے گا، اور دونوں اللہ کے متعین کردہ حدود پر قائم نہیں رہیں گے، اور ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے تو کیا ایسی حالت میں حکمین دونوں کے درمیان تفریق کرا سکتے ہیں یا نہیں؟

حضرت عطاء اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ حکمین کا کام صرف دونوں کے درمیان مصالحت کے لئے کوشش کرانا ہے، اس سے زیادہ ان کے اختیار میں کچھ نہیں ہے، الا یہ کہ میاں بیوی نے خوش دلی سے انہیں اس رشتہ کو باقی رکھنے اور ختم کرنے کا اختیار دیا ہو، امام ابوحنیفہ اسی کے قائل ہیں، امام شافعی اور احمد بن حنبل سے ایک قول اسی کے مطابق منقول ہے، اس نظریہ کے مطابق حکمین کی حیثیت وکیل کی ہوتی ہے، اور انہیں حدود میں رہ کر اقدام کرنا ہے، اس کے برخلاف حضرت علی، ابن عباس، شعبی، نخعی، سعید بن جبیر، اوزاعی، اسحاق راہویہ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ حکمین کو میاں بیوی کی مرضی کے بغیر بھی ان دونوں کے درمیان تفریق کا حق حاصل ہے، امام شافعی اور احمد بن حنبل سے بھی ایک قول اسی کے موافق منقول ہے (دیکھئے المغنی ۱۰/ ۲۶۴، زاد المعاد ۵/ ۱۹۰)۔

اور علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہی جمہور علماء کی رائے ہے (تفسیر ابن کثیر ۱/ ۶۰۳)۔

اس نقطہ نظر کے مطابق حکمین مکمل طور پر بااختیار ہوتے ہیں اور انہیں کوئی بھی فیصلہ لینے کے لئے کسی سے اجازت کی ضرورت نہیں ہے، اور میاں، بیوی

کے نہ چاہتے ہوئے بھی مہر کی واپسی کے ساتھ یا اس کے بغیر تفریق کا اختیار ہے۔

## حکمین کو وکیل قرار دینے والوں کے دلائل:

جو لوگ حکمین کو میاں بیوی کا وکیل اور انہیں ان کی مرضی کا پابند قرار دیتے ہیں ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ رشتہ نکاح کو باقی رکھنے اور ختم کرنے کا کلی اختیار شوہر کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا اس کی مرضی کے بغیر اس رشتہ کو ختم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وإن طلقتموهن من قبل ان تمسوهن وقد فرضتم لهن فريضة فنصف ما فرضتم إلا أن يعفون أو يعفو الذي بيده عقدة النكاح'' (سورۃ البقرہ: ۲۳۷)۔ (اگر تم نے انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دی ہو اور مہر متعین کر چکے ہو تو جتنا تم متعین کر چکے ہو اس کا آدھا مہر واجب ہے، مگر یہ کہ وہ عورتیں خود معاف کردیں، یا وہ معاف کردے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے)۔

اس آیت میں مذکور "بيده عقدة النكاح" سے مراد شوہر ہے، جیسا کہ خود حدیث میں اس کی وضاحت موجود ہے، عمرو بن شعیب کی سند سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ولی عقدة النكاح الزوج" (دیکھئے تفسیر قرطبی ۲۰۶/۳، حضرت عبداللہ بن عمر سے بھی ایک مرفوع حدیث اسی معنی میں منقول ہے، جس کی سند حسن ہے، دیکھئے روح المعانی ۱۵۴/۲، علامہ جریر طبری وغیرہ نے بھی اسی تفسیر کو صحیح قرار دیا ہے، تفسیر طبری ۳۱۸/۲)۔

۲۔ حضرت عبیدہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے پاس، میاں بیوی اپنا مسئلہ لیکر حاضر ہوئے، دونوں کے ساتھ لوگوں کی ایک بڑی تعداد تھی، ان لوگوں نے مرد وعورت کی طرف سے ایک ایک حکم کو متعین کیا، حضرت علیؓ نے حکمین کو مخاطب کرکے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ تمہاری ذمہ داری کیا ہے؟ اگر ان دونوں میں مصالحت مناسب سمجھو تو مصالحت کرادو، اور اگر تفریق مناسب سمجھو تو دونوں کو الگ الگ کردو، عورت نے کہا کہ میں اللہ کے فیصلے پر راضی ہوں، میرے موافق ہو یا میرے خلاف، شوہر نے کہا کہ علیحدگی مجھے گوارا نہیں ہے، حضرت علیؓ نے کہا: اللہ کی قسم تم جھوٹے ہو تم یہاں سے ہٹ نہیں سکتے ہو جب تک کہ اللہ کے فیصلہ پر راضی نہ ہوجاؤ، چاہے وہ تمہارے موافق ہو یا تمہارے خلاف (تفسیر قرطبی ۱۷۶/۵، وقال ہذا اسناد ثابت صحیح)۔

اگر حکمین کو علیحدگی کا اختیار ہوتا تو حضرت علیؓ کا شوہر پر علیحدگی کے لئے وکیل بنانے پر دباؤ ڈالنا بے معنی ہوتا، شوہر راضی ہو یا ناراض وہ حکمین کو جدائیگی کے لئے کہہ دیتے، شوہر کو مجبور کرنے کا مطلب ہے کہ اس کی رضامندی کے بغیر تفریق نہیں ہوسکتی ہے (دیکھئے احکام القرآن للجصاص ۱۹۲/۲)۔

۳۔ اگر شوہر قاضی کے پاس آکر بیوی کے ساتھ بدسلوکی کا اعتراف کرے تو تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ ایسی صورت میں حکم بنانے سے پہلے قاضی کو علیحدگی کا اختیار حاصل نہیں ہے، اسی طرح سے اگر عورت آکر شوہر کی نافرمانی کا اقرار کرے تو قاضی اسے خلع لینے اور مہر واپس کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا ہے، تو جس طرح سے حکم مقرر کرنے سے پہلے شوہر کی مرضی کے بغیر علیحدگی اور عورت کی رضامندی کے بغیر مہر واپس نہیں لیا جاسکتا ہے، اسی طرح سے حکم مقرر کرنے کے بعد بھی ایسا نہیں کیا جاسکتا ہے، اور جب قاضی کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے تو اس کی طرف سے مقرر کردہ حکمین کو یہ اختیار کیسے حاصل ہوگا (حوالہ مذکور)۔

۴۔ شوہر اپنی بیوی سے فائدہ اٹھانے اور عورت اس کے دیئے ہوئے مہر کا مالک ہوتی ہے، اور کسی حاکم اور قاضی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کے مال کو اس کی مرضی کے بغیر دوسرے کے حوالے کردے، کیونکہ خوش دلی کے بغیر دوسرے کے مال کو لینا باطل اور حرام ہے، جس کی کتاب وسنت میں سخت ممانعت آئی ہے، لہٰذا عورت کی مرضی کے مہر واپس لینا اور شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے فائدہ اٹھانے کے حق کو ختم کرنا جائز نہیں ہے (احکام القرآن للجصاص ۱۹۲/۲)۔

☆ قرآن کی کسی آیت، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حکمین یا قاضی کو اس صورت میں علیحدگی کا حق ہے: ''ليس في الآية ولا في شئ من السنن ان للحكمين ان يفرقا وان ذالك للحاكم'' (المحلی ۸۷/۱۰)۔

☆ قرآن میں صراحت ہے کہ حکمین کا کام دونوں کے درمیان مصالحت اور موافقت پیدا کرنا ہے "إن يريدا إصلاحا" علیحدگی کے اختیار کا کہیں ذکر نہیں ہے (کتاب الام ۱۹۴/۵)۔

☆ حکمین کو صرف اس لئے مقرر کیا جاتا ہے کہ وہ ان دونوں میں سے ظالم کو سمجھا بجھا کر ظلم سے باز رکھیں، اور حاکم کو صورت حال سے باخبر کریں تاکہ حکمین کی بات نہ ماننے پر وہ بزور قوت ظلم کو روک دے (احکام القرآن للجصاص ۱۹۳/۲)۔

۶۔ اگر میاں، بیوی ان حکمین کو مکمل بااختیار وکیل بناتے ہیں، تو ایسی صورت میں علیحدگی یا مصالحت ان کے صواب دید پر مبنی ہوتی ہے، اور اپنی رائے کے

مطابق فیصلہ کرتے ہیں اس لئے ان کو حکم کہا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ علامہ قرطبی اور علامہ عینی نے لکھا ہے کہ حضرت عطاء، ابوثور، حسن بصری اور علماء کوفہ کے نزدیک حکمین امیر اور حاکم کے نمائندے ہوتے ہیں، اور انہیں علیحدگی کا اختیار نہیں ہے، البتہ امیر اور امام علیحدگی کرا سکتا ہے، یا ان حکمین کو یہ اختیار دے سکتا ہے، امام شافعی سے بھی ایک قول اسی کے مطابق منقول ہے ''وقال قوم ليس لهما الطلاق مالم يوكلهما الزوج في ذلك وليعرفا الامام وهذا بناء على أنهما رسولان شاهدان ثم الإمام يفرق إن اراد ويأمر الحكم بالتفريق وهذا أحد قول الشافعي وبه قال الكوفيون وهو قول عطاء وابن زيد والحسن وبه قال ابو ثور'' تفسير قرطبي ۵.۱۲۶ ''وقال الكوفيون والشافعي واحمد يحتاجان إلى الإذن لأن الطلاق بيد الزوج فإن أذن في ذلك وإلا فالحاكم طلق عليه'' عمدة القاري ۱۲.۲۸۰)۔

## حکمین کو با اختیار قرار دینے والوں کے دلائل:

جو لوگ، حکمین کو میاں، بیوی کی رضامندی کے بغیر بھی تفریق کا اختیار دیتے ہیں ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ ''وان خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما إن الله كان عليما خبيراً'' (سورة النساء ۳۵)۔

اس آیت میں حاکم اور قاضی کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ وہ زوجین کے درمیان اختلاف کی صورت میں دونوں کی طرف سے ایک نمائندہ متعین کر دیں ''قال ابن بطال اجمع العلماء على ان المخاطب بقوله تعالى ان خفتم شقاق بينهما الحكام'' فتح الباری ۲.۲۷۷، اوجز المسالك ۱۱.۳۶۲)۔

اور اس نمائندہ کو حکم کہا گیا ہے، جس کے معنی فیصلہ کرنے والے کے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رشتہ نکاح کو باقی رکھنے اور ختم کرنے کا فیصلہ ان کے اختیار میں ہے، اگر ان کی حیثیت محض وکیل اور ناصح کی ہوتی تو یہ لفظ استعمال نہ کیا جاتا، اس لئے کہ قرآن میں کسی شرعی اصطلاح میں، اور خاص وعام کے عرف میں کہیں بھی وکیل کے لئے ''حکم'' کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے، نیز حکم مقرر کرنے کا اختیار، قاضی اور حاکم کو دیا گیا ہے، اگر یہ مرد وعورت کے وکیل ہوتے تو وہ دونوں خود ہی اپنا وکیل مقرر کرتے، اسے قاضی کے حوالے نہ کیا جاتا۔

علاوہ ازیں ان حکمین کے متعلق کہا گیا ہے کہ اگر وہ مصالحت کا ارادہ کریں، (ان یریدا اصلاحاً) ان کی طرف ارادہ کی نسبت اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی حیثیت وکیل کی نہیں ہے، اس لئے کہ وکیل اپنا ارادہ واختیار نہیں رکھتا بلکہ وہ موکل کے ارادہ واختیار کا پابند ہوتا ہے (دیکھئے زاد المعاد ۵/ ۱۹۰)۔

میاں بیوی کے درمیان حد سے گزرے ہوئے اختلاف کو ختم کرنے کے لئے ''اصلاح'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، یہ بڑا جامع لفظ ہے اور یکجائی اور جدائی دونوں کو شامل ہے، یعنی اس اختلاف کی اصلاح کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ دونوں کے درمیان اتفاق اور الفت ومحبت کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، اور جو رشتہ ٹوٹنے کے کگار پر ہے اسے جوڑ دیا جائے، اور دوسری شکل یہ ہے کہ ان دونوں کو الگ کر کے اختلاف ونزاع کو ختم کر دیا جائے، اس لئے کہ ساتھ رکھنے کی صورت میں مصالحت نہیں ہو سکتی ہے (''إن يريدا اى الحكمان إصلاحا أى قطعا للخصومة وهذا شامل للصلح والفراق'' أوجز المسالك ۱۱.۲۶۳)۔

۲۔ حضرت عثمان کے عہد خلافت میں حضرت عقیل بن ابی طالب اور ان کی بیوی فاطمہ بنت عتبہ میں اختلاف ہوا، فاطمہ نے حضرت عثمان سے شکایت کی اور آپ نے حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت معاویہ کو حکم بنا کر بھیجا اور کہا: ''إن رأيتما أن تجمعا جمعتما وان رأيتما أن تفرقا فرقتما''۔ (اگر تم دونوں انہیں ایک ساتھ رکھنا چاہو تو ایک ساتھ کر دو، اور اگر الگ کرانا چاہو تو الگ کرا دو)۔

اسی واقعہ کے بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس نے کہا کہ میں دونوں کو الگ الگ کر کے رہوں گا اور حضرت معاویہ نے کہا عبد مناف کے دو بزرگوں کے درمیان تفریق نہیں کروں گا (دیکھئے تفسیر ابن کثیر ۱/ ۶۰۳، زاد المعاد ۵/ ۱۹۱، زاد المعاد کے محقق نے لکھا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں)۔

۳۔ حضرت علیؓ کے دور میں بھی اس طرح کا ایک واقعہ پیش آیا، تو انھوں نے بھی حکمین کو رشتہ باقی رکھنے اور ختم کرنے دونوں کا اختیار دیا، ''علیکما إن رأیتما أن تفرقا فرقتما وإن رأیتما أن تجمعا جمعتما'' (تفسیر قرطبی ۵.۱۲۷. زاد المعاد ۵.۱۹۱.قال محققه واسناده صحیح)

یہ دونوں واقعات اس بات کے لئے واضح دلیل ہیں کہ حکمین مکمل بااختیار ہوتے ہیں اور تفریق کے لئے انہیں کسی کی مرضی اور اجازت کی ضرورت نہیں ہے، اور یہی وجہ ہے کہ حضرت علی کے دور کے واقعہ میں جب شوہر نے حکمین کی اس حیثیت کا انکار کیا تو انھوں نے دباؤ ڈال کر اس سے ان کی اس حیثیت کو منوایا، اگر تفریق کے لیے شوہر کی رضامندی ضروری ہوتی تو دباؤ ڈالنا درست نہ ہوتا، اس لئے کہ جبر و دباؤ کے ساتھ کوئی کام کرنے میں رضامندی شامل نہیں ہوتی ہے۔

۴۔ الفت ومحبت کے ساتھ رہنا نکاح کے اہم مقاصد میں سے ہے، اور جب میاں بیوی کا اختلاف گھر کے آنگن سے نکل کر قاضی کی عدالت تک آ جائے، اور لڑائی، جھگڑے کو ختم کرنے کی کوشش ناکام ہو جائے تو بہتر یہی ہے کہ دونوں کو الگ کر دیا جائے، تاکہ یہ دونوں اور ان کے متعلقین سکون واطمینان کے ساتھ رہ سکیں، اور ہر روز کے لڑائی، جھگڑے سے نجات پا سکیں، جیسے کہ شوہر کے نامرد ہونے کی صورت میں قاضی کو تفریق کا اختیار ہے، جس طرح سے نامردی کی صورت میں نکاح کا ایک مقصد فوت ہو رہا ہے اسی طرح سے حد سے گزرے ہوئے اختلاف کی شکل میں بھی نکاح کا مقصد باقی نہیں رہا، اس لئے پہلی صورت کی طرح، دوسری صورت میں بھی حکمین کو تفریق کا اختیار ہونا چاہئے۔

☆☆☆

# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے تفریق
## (قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں)

مولانا رحمت اللہ ندوی [1]

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور اس کی تعلیمات زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہیں، کسی شعبہ زندگی کو اسلام نے تشنہ اور کسی گوشہ کو ادھورا نہیں چھوڑا ہے، بلکہ اس میں ہر موقع ومناسبت کی رہنمائی موجود ہے، انسان کائنات اور تمام مخلوقات وموجودات کا خلاصہ ہے، اگر انسان کی پیدائش نہ ہوتی تو نہ کائنات وجود میں آتی اور نہ دنیا آباد ہوتی۔

لہٰذا نظام کائنات کو باقی رکھنے اور جب تک اللہ کو اسے باقی رکھنا منظور ہے اس وقت تک چلانے کے لئے اس نے اولادِ آدم وحواء میں توالد وتناسل کا سلسلہ جاری فرمادیا اور اس کے ضابطے وحدود مقرر کردیئے، نکاح افزائش نسل، عفت و پاکدامنی، آپسی محبت ومودت اور خوش وخرم زندگی بسر کرنے کا ایک بہترین اور شریفانہ ذریعہ ہے۔

واضح رہے کہ ازدواجی زندگی کا قیام، سکون واطمینان، الفت ومحبت، رحمت ورافت، حسن معاشرت اور زوجین میں سے ہر ایک کا اپنے اوپر عائد کچھ حقوق وواجبات کی ادائیگی سے ہے، لیکن نہ ہر ایک کے حالات ہمیشہ یکساں وسازگار رہتے ہیں اور نہ ہی ماحول پرسکون وخوشگوار، بلکہ معاشرتی زندگی میں ... بسا اوقات نشیب وفراز بھی آتے ہیں اور کبھی ایسی صورت پیدا ہوجاتی ہے کہ بعض معلوم یا نامعلوم وجوہات کی بنا پر زوجین ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور بظاہر نباہ کی شکل نظر نہیں آتی، اس حالت میں اسلام صبر وتحمل کی تلقین کرتا ہے اور ایسی تدبیر اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہے جو کراہت وناگواری کے اسباب کو ختم کرنے میں معاون اور مفید ثابت ہو، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وعاشروهن بالمعروف. فإن كرهتموهن فعسى أن تكرهوا شيئا ويجعل الله فيه خيراً كثيراً'' (نساء: ۱۹)۔

(عورتوں کے ساتھ بھلے طریقہ پر گزر بسر کرو، اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو ہوسکتا ہے کہ تم کوئی چیز ناپسند کرو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں بہت زیادہ خیر رکھا ہو)۔

اور حدیث شریف میں آیا ہے: ''لا يفرك مؤمن مؤمنة. إن كره منها خلقا. رضي منها خلقاً آخر'' (صحیح مسلم)۔

(کوئی مومن کسی مومنہ کو ناپسند نہ کرے اگر اس کی کوئی خصلت ناپسند ہے تو دوسری خصلت اور اخلاق پسندیدہ بھی تو ہے)۔

لیکن اس تدبیر اور علاج کے باوجود کبھی بغض وناگواری بڑھتی اور شقاق شدت اختیار کرتا چلا جاتا ہے، جس کا ازالہ مشکل اور علاج ناممکن ہوجاتا ہے، دونوں کے ضبط وتحمل کا بندھن ٹوٹ اور صبر وشکیبائی کا دامن چھوٹ جاتا ہے، گھر کو آباد رکھنے کے لئے مطلوبہ سکون واطمینان اور ادائے حقوق مفقود ہوجاتا ہے، اور ازدواجی زندگی اصلاح ودرستگی قبول کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے، ایسے نازک وقت اور دشوار گزار مرحلہ میں جب کہ آخری چارۂ کار کے طور پر صرف ایک ہی تدبیر اور علاج رہ جاتا ہے، اسلام نے اسے اپنانے اور اختیار کرنے کی رخصت واجازت دی ہے، جسے طلاق کہتے ہیں اور خلع طلاق کی ایک قسم ہے۔

اگر کراہیت آدمی کی طرف سے ہو تو اس کے اختیار میں طلاق ہے اور یہ اس کو حاصل ہونے والے حقوق میں سے ایک حق ہے، اور شریعت کے حدود میں رہ کر اسے استعمال کرسکتا ہے۔

اگر عورت کی طرف سے ناگواری وتنفر ہو تو اسلام نے اس کے لیے زوجیت سے گلوخلاصی کے طور پر خلع کا راستہ رکھا ہے کہ وہ شوہر کو زوجیت کے نام پر بطور مہر لی ہوئی رقم یا چیز واپس کرکے اپنا تعلق منقطع اور رشتہ ختم کرلے۔

شوہر کا بدل خلع لینا قرین قیاس اور مطابق انصاف ہے، کیونکہ اسی نے عورت کو مہر دیا، شادی اور ولیمہ کا بار اٹھا کر اس کے اخراجات برداشت کئے، عورت کو

[1] استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

نفقہ دیا، اور عورت ہے کہ ان سب کا صلہ احسان فراموشی اور بدلہ ناشکری سے دے رہی ہے اور فراق کا مطالبہ کررہی ہے، تو انصاف کی بات یہی ہے کہ وہ شوہر سے حاصل شدہ مال اس کو واپس کردے۔

اگر کراہیت دونوں کی طرف سے ایک ساتھ پائی جارہی ہے تو اگر شوہر تفریق وجدائی چاہتا ہے تو اس کے ہاتھ میں طلاق ہے اور اگر عورت تفریق کی خواہاں ہے تو اسے خلع کا حق حاصل ہے (فقہ السنہ للسید سابق ۳۱۸/۲)۔

خلع طلاق ہی کی ایک قسم ہے، اس کے متعلق مفتی عبد الجلیل قاسمی اپنی کتاب "اسلام کا مکمل نظام طلاق" میں تحریر فرماتے ہیں:

"خلع بھی طلاق کی ایک صورت ہے، بیوی شوہر میں گزر بسر کسی وجہ سے دشوار ہوجائے یا کسی ایک کی وجہ سے دوسرے کی زندگی دوبھر ہو اور چھٹکارہ ضروری ہوجائے تو ایسی صورت میں شوہر اگر طلاق دینے پر راضی نہ ہو اور عورت طلاق پر مصر ہو تو خلع کراسکتی ہے، خلع میں شوہر کی رضامندی ضروری ہے تحریراً یا تقریراً" (اسلام کا مکمل نظام طلاق ر ۲۰۳)۔

آگے لکھتے ہیں: "یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ شوہر کی رضامندی خلع میں ضروری ہے بغیر رضامندی کے طلاق نہیں پڑے گی، اب اگر ظلم وتشدد کرے اور نان ونفقہ بھی نہ دے یا شرعی حدود کی خلاف ورزی کرے اور خلع پر راضی کرانے کی کوئی صورت نہ ہو تو شرعی حیثیت سے امارت شرعیہ ہند کے تحت محاکم شرعیہ قائم ہیں، اس میں درخواست دے کر فسخ کراسکتی ہے" (اسلام کا مکمل نظام طلاق ۲۰۴)۔

مولانا سید ابو الاعلی مودودی تحریر فرماتے ہیں: "شرع اسلامی نے جس طرح مرد کو یہ حق دیا ہے کہ جس عورت کو وہ ناپسند کرتا ہے اور جس کے ساتھ وہ کسی طرح نباہ نہیں کرسکتا، اسے طلاق دے دے، اسی طرح عورت کو بھی یہ حق دیا ہے کہ جس مرد کو وہ ناپسند کرتی ہو اور کسی طرح اس کے ساتھ گزر بسر نہ کرسکتی ہو اس سے خلع حاصل کرلے" (حقوق الزوجین ۴۹)۔

اس باب میں احکام شریعت کے دو پہلو ہیں: ایک اخلاقی اور دوسرا قانونی۔

اخلاقی پہلو یہ ہے کہ خواہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک کو طلاق یا خلع کا اختیار صرف آخری چارۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہئے، محض خواہشات اور جذبات کی تسکین کے لئے طلاق اور خلع کو کھیل نہ بنالیا جائے، کیونکہ احادیث میں سخت وعید آئی ہے۔

لیکن قانون جس کا کام اشخاص کے حقوق متعین کرنا ہے، اس پہلو سے بحث نہیں کرتا، وہ جس طرح مرد کو شوہر ہونے کی حیثیت سے طلاق کا حق دیتا ہے، اسی طرح عورت کو بھی بیوی ہونے کی حیثیت سے خلع کا حق دیتا ہے، تاکہ دونوں کے لئے بوقت ضرورت عقد نکاح سے آزادی حاصل کرنا ممکن ہو اور کوئی فریق بھی ایسی حالت میں مبتلا نہ کردیا جائے کہ دل میں نفرت ہے، مقصد نکاح پورے نہیں ہوتے، رشتۂ ازدواج ایک مصیبت بن گیا ہے، مگر جبراً ایک دوسرے کے ساتھ محض اس لئے بندھے ہوئے ہیں کہ اس گرفت سے آزاد ہونے کی کوئی صورت نہیں۔

حق کے بجائے بے جا استعمال کرنے کا انحصار بڑی حد تک خود استعمال کرنے والے کے اختیار تمیزی اور اس کی دیانت اور خدا ترسی پر ہے، قانون معقول اور ممکن پابندیاں ضرور عائد کرتا ہے لیکن فطری حق سے محروم نہیں کرتا (حقوق الزوجین ۵۰/ ۵۱، مع حذف واضافہ)۔

## خلع کی تعریف:

خلع لغت میں نزع اور ازالہ کو اور عرف میں رشتۂ زوجیت ختم کرنے کو کہتے ہیں (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷۰۰۷/۹)۔

سید سابق کی "فقہ السنہ" میں لکھا ہے: "جس خلع کو اسلام نے مباح اور جائز قرار دیا ہے وہ "خلع الثوب إذا أزاله" (کپڑا اتارنا) سے ماخوذ ہے کیونکہ عورت مرد کا لباس اور مرد عورت کا لباس ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے "هن لباس لكم وأنتم لباس لهن" اور اس کو "فداء" (گلوخلاصی) بھی کہتے ہیں کیونکہ عورت اپنے شوہر پر مال خرچ کرکے اپنی جان چھڑاتی ہے" (فقہ السنہ ۳۲۰/۲)۔

خلع کی یہی تعریف لغت وفقہ کی کتابوں میں کی گئی ہے (دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیہ ۲۳۴/۱۹، المصباح المنیر، رد المحتار ۸۳/۵، الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۲۲۶/۲، الفقہ علی المذاہب الأربعۃ ۱۰۲۳، مجمع الانہر ۱۰۱/۲، فتح القدیر ۵۷/۴ وغیرہ)۔

## خلع کی اصطلاحی وشرعی تعریفات

خلع طلاق ہے یا فسخ؟ اس میں اختلاف کی وجہ سے فقہاء نے خلع کی مختلف الفاظ میں تعریف کی ہے، حنفیہ نے ''لفظ خلع کے ذریعہ ملک نکاح کے مقابل میں عورت سے مال لینا'' سے تعریف کی ہے جبکہ جمہور کے نزدیک اس کی تعریف ہے: ''لفظ طلاق یا خلع کے ذریعہ شوہر کی طرف سے مطلوبہ عوض سے جدائی اور علاحدگی'' (الموسوعۃ الفقہیۃ ۱۹ر ۲۳۴۔ کذا فی حاشیۃ الہدایۃ ۲ر ۴۰۴، باب الخلع)۔

''الخلع هو أن تطلب الزوجة فراق زوجها على عوض تدفعه له. وذلك إذا كرهت الزوجة زوجها وخشيت أن لاتقوم بحقه. ويسمى خلعا، كأنها تنخلع من لباس الزوجية يعني عقد الزوجية'' (موسوعة مسائل الجمهور ۲۰۱۰ء، کتاب الخلع کا حاشیہ)۔ (خلع عورت کا اپنے شوہر سے کسی عوض کی ادائیگی پر مطالبۂ جدائی کو کہتے ہیں، اور اس کی نوبت اس وقت آتی ہے جب بیوی اپنے شوہر کو ناپسند کرے اور اس کے حق کی عدم انجام دہی کا اندیشہ پیدا ہوجائے، اس کا نام خلع ہے کیونکہ عورت لباس زوجیت اتارتی ہے)۔

آگے لکھتے ہیں: ''ويسمى كذلك افتداءً. قال تعالى: ''فإن خفتم ألا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به'' (حوالہ سابق)۔ (اسی طرح اس کو افتداء کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر تم کو اندیشہ ہو کہ وہ دونوں حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو عورت جو مال دے کر رہائی حاصل کرے اس میں دونوں پر کوئی گناہ نہیں)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے ''الفقہ الإسلامی وأدلتہ'' میں ہر مسلک کی اصطلاح میں خلع کی فقہی تعریفات لکھی ہیں، طوالت کے خوف سے ہم یہاں خلاصہ کے طور پر عربی عبارت کو حذف کرتے ہوئے صرف ترجمہ وتلخیص پر اکتفا کرتے ہیں:

حنفیہ کے نزدیک خلع ملک نکاح کو لفظ خلع یا اس کے ہم معنی لفظ سے ختم کرنا ہے جو عورت کے قبول کرنے پر موقوف ہو (یہی تعریف ''الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۲ر۲۲۶ پر بھی ہے، ایضاً رد المحتار ۵ر ۸۳)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ تعریف اس خلع کے ساتھ خاص ہے جو حقوق کو ساقط کردیتا ہے اور عادۃً کسی ایسے مال کے مقابل میں پیش آتا ہے جس کے ذریعہ عورت رہائی حاصل کرتی ہے تو اگر شوہر بیوی سے خلع کرلے تو ایک طلاق بائن پڑے گی اور عورت پر مال کی ادائیگی لازم ہوگی۔

مالکیہ کے نزدیک عوض پر طلاق کو خلع کہتے ہیں خواہ بیوی کی طرف سے ہو یا اس کے علاوہ کسی ولی وغیرہ کی طرف سے ہو یا لفظ خلع کے ذریعہ ہو۔

اس تعریف سے خلع کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

۱۔ پہلی قسم اور اکثر وبیشتر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو کسی عوض کی نظیر میں ہو۔

۲۔ دوسری قسم وہ ہے جو لفظ خلع کے ساتھ ہو، اگرچہ کسی شئ کی نظیر میں نہ ہو، جیسے شوہر بیوی سے خالعتک یا أنت مخلعۃ کہے۔

بالفاظ دیگر خلع کہتے ہیں عورت یا کسی اور کا آدمی کے لئے کوئی مال صرف کرنا اس شرط پر کہ وہ عورت کو طلاق دے یا عورت شوہر پر اپنے واجب حق کو اس سے ساقط کردے، تو اس سے ایک طلاق بائن واقع ہوگی، یعنی خلع مالکیہ کے نزدیک عوض یا بغیر عوض کی فرقت کو شامل ہے۔

شافعیہ کے نزدیک خلع عوض کے ذریعہ لفظ طلاق یا خلع سے زوجین کے مابین تفریق کو کہتے ہیں، جیسے مرد عورت سے طلقتک أو خالعتک علی کذا کہے اور عورت قبول کرلے، یہ تعریف احناف سے ملتی جلتی ہے اور مؤلف نے تعریفات میں اس کو زیادہ مناسب قرار دیا ہے کیونکہ مقصود خلع اور لوگوں کے مفاہیم سے ہم آہنگ ہے۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ خلع شوہر کا اپنی بیوی کو عوض لے کر مخصوص الفاظ کے ذریعہ چھوڑنے اور اس سے جدا ہونے کو کہتے ہیں خواہ یہ معاوضہ عورت سے لے یا اس کے علاوہ کسی اور سے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ عورت شوہر سے اس طرح چھٹکارہ حاصل کرلے گی کہ عورت کی رضامندی کے بغیر شوہر کو رجوع کا حق حاصل نہ ہوگا، ایک روایت کے مطابق حنابلہ کے نزدیک مالکیہ کی طرح بغیر عوض کے خلع بھی درست ہے، ایسی صورت میں شوہر کو کچھ نہ ملے گا، لیکن حنابلہ کے نزدیک راجح یہی ہے کہ خلع میں عوض رکن ہے اس کا چھوڑنا صحیح نہیں ہے جیسے بیع میں ثمن ہے، لہٰذا اگر عوض کے بغیر خلع کرتا ہے تو نہ خلع ہوگا نہ طلاق، اِلا یہ کہ لفظ طلاق سے ہو یا اس کی نیت ہو تو ایک طلاق رجعی ہوگی (ملاحظہ ہو الفقہ الاسلامی وادلتہ ۹ر ۷۰۰۷، ۷۰۰۸، رد المحتار ۵ر ۸۳ / الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۱۰۲۳/ ۱۰۲۵)۔

شیخ محی الدین بن العربیؒ نے خلع کی تعریف ایک نئے انداز سے کی ہے: ''الخلع: هو بذل المرأة للرجل العوض عن طلاقها. فإن بذلت كل ما أعطاها عوضا كان خلعاً، وإن كان بعضه كان صلحاً، وإن كان أكثره كان فدية، وإن كان وإسقاطه كان مبارأة، هذا اصطلاح الفقهاء، وحكم الكل حكم الخلع'' (الفقه الأكبر عند الشيخ محی الدین بن العربی ۲/۲۷)۔ (خلع: عورت کا آدمی کے لئے اپنی طلاق کی خاطر عوض صرف کرنے کو کہتے ہیں، اگر عورت شوہر سے ملنے والے عوض کو پورا خرچ کردے تو یہ خلع ہے، اور اگر کچھ حصہ اور مقدار صرف کرے تو صلح ہے اور اگر وہ زیادہ ہو تو فدیہ ہے اور اگر شوہر سے حق اور عوض کو ساقط کرنا ہو تو مبارأة ہے، یہ فقہاء کی اصطلاح ہے اور سب کا حکم خلع کے حکم جیسا ہے)۔

## الفاظ خلع:

حنفیہ کے نزدیک خلع کے لئے پانچ الفاظ ہیں: خلع، مبارأة، طلاق، مفارقہ، بیع وشراء۔

مالکیہ کے یہاں چار ہیں: خلع، مبارأة، صلح، فدیہ یا مفاداة۔

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک خلع، طلاق صریح یا نیت کے ساتھ طلاق کنائی کے لفظ سے درست ہے، کنائی میں بیع وشراء ہے، جبکہ صریح شافعیہ کے یہاں لفظ خلع اور مفاداة ہے۔ اور حنابلہ کے یہاں ان دونوں کے علاوہ فسخ بھی ہے، البتہ صحیح قول کے مطابق شوافع کے نزدیک لفظ فسخ کنایہ ہے (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۹/ ۷۰۱۰)۔

## خلع کی مشروعیت اور اس کا جواز:

جمہور کے نزدیک خلع باہمی رضامندی سے جائز ہے، ابوقلابہ اور حسن بصری کا قول جو شنوذ پر مبنی ہے وہ یہ کہ آدمی کے لئے عورت سے خلع اس وقت درست ہے جبکہ اس کو بدکاری کرتے ہوئے دیکھ لے۔ آیت میں فاحشہ کے لفظ کو زنا پر محمول کیا ہے۔ داؤد کہتے ہیں ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف حدود اللہ قائم نہ رکھ سکنے کے خوف کی شرط کے ساتھ درست ہے، نعمان کہتے ہیں، اضرار کے ساتھ خلع جائز ہے۔

فقہ یہ ہے کہ مرد کے ہاتھ میں طلاق کے مقابلہ میں عورت کے لئے افتداء رکھا گیا ہے، جس طرح مرد ناپسندیدگی کی صورت میں طلاق کا حق رکھتا ہے، عورت بھی خلع کا حق رکھتی ہے (ملاحظہ ہو بدایۃ المجتہد ۲/ ۶۸)۔

ڈاکٹر محمد نعیم ہانی سائی تحریر فرماتے ہیں: ''اکثر اہل علم خلع کو درست مانتے ہیں خواہ کسی سبب کی وجہ سے ہو یا بغیر سبب کے ہو اور خواہ عورت اپنے شوہر کو ناپسند کرے یا اس کے حق کی عدم انجام دہی کا اندیشہ کرے، یا ان میں سے کوئی بات نہ ہو (اگر بغیر کسی بات کے خلع ہو) تو خلع جائز اور صحیح ہے لیکن مکروہ ہے'' (موسوعہ مسائل الجمہور ۲/ ۷۱۸)۔

صحت کے قائلین امام ابوحنیفہ، امام ثوری، امام مالک امام اوزاعی، امام شافعی ہیں اور ایک محتمل روایت میں امام احمد بن حنبل ہیں۔

جمہور فقہاء کا رجحان خلع کے جواز کا ہے، چاہے کسی حاکم وقاضی کے ذریعہ ہو یا اس کے بغیر ہو، یہی حضرت عمرؓ کا قول ہے۔

خلع کی مشروعیت کے سلسلہ میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں: ''اکثر علماء کے نزدیک خلع جائز ہے، اس میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں ہے، کیونکہ زوجین میں عداوت، شقاق، لڑائی جھگڑا اور ناانفاقی پیش آجانے کی وجہ سے لوگوں کو اس کی ضرورت ہوتی ہے، بسا اوقات عورت اپنے شوہر کو ناپسند کرتی اور اس سے بغض رکھتی ہے۔ اور جسمانی چند اسباب واعذار خواہ وہ پیدائشی ہوں، یا اخلاقی، یا دینی یا صحت وتندرستی سے متعلق اسباب مثلاً بڑھاپا یا کمزوری یا اس طرح دیگر اسباب کی وجہ سے شوہر کے ساتھ رہنا اور زندگی بسر کرنا پسند نہیں کرتی ہے اور اس بات سے ڈرتی ہے کہ شوہر کی اطاعت میں اللہ کا حق ادا نہیں کر سکے گی تو اسلام نے عورت کے لئے زوجیت سے خلاصی حاصل کرنے کا ایک طریقہ اس طلاق کے مقابل میں مشروع کر دیا ہے جو طلاق مرد کے ساتھ خاص ہے۔ تاکہ عورت سے حرج کو دفع اور ضرر کو اس سے رفع کرے، کچھ مال خرچ کر کے عورت نکاح سے گلوخلاصی اور چھٹکارہ حاصل کر سکتی ہے اور شوہر کو بدل کے طور پر وہ چیز دے گی جو اس نے نکاح کی راہ میں خرچ کیا ہے۔

جمہور علماء نے عورت کے مال سے طلاق کے مقابل میں فدیہ لینے کو نشوز اور معاشرت کے بگاڑ کے ساتھ محدود اور منحصر کیا ہے جب کہ بیوی کی طرف سے یہ پیش آئے'' (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۹/ ۷۰۰۹، نیز دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیہ ۱۹/ ۲۴۳، الفقہ علی المذاہب الأربعہ ۱۰۲۷)۔

**خلع کی مشروعیت کے دلائل:**...... خلع کی مشروعیت اور اس کا جواز قرآن وحدیث سے ثابت ہے، ذیل میں ہم چند آیات اور ایک حدیث بطور نمونہ ودلیل نقل کرتے ہیں:

آیات: (۱) ''فلاجناح علیهما فیما افتدت به'' (بقرہ:۲۲۹)۔ (تو دونوں پر اس (مال) کے باب میں کوئی گناہ نہ ہوگا جو عورت معاوضہ میں دے دے)۔

(۲) ''فإن طبن لكم عن شئ منه نفساً فكلوه هنيئاً مرئياً'' (نساء:۴)۔

(لیکن اگر وہ خوش دلی سے تمہارے لئے اس میں کا کوئی جزء چھوڑ دیں تو تم اسے مزہ دار اور خوشگوار سمجھ کر کھاؤ)۔

(۳) ''فلا جناح علیهما أن یصلحا بینهما صلحاً'' (نساء:۱۲۸)۔

(تو اس میں ان کے لئے کوئی مضائقہ نہیں کہ دونوں آپس میں ایک خاص طریق پر صلح کرلیں)۔

حدیث: حضرت ابن عباسؓ سے مروی حدیث ہے: ''أن امرأة ثابت بن قيس جاء ت إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم. فقالت: يا رسول الله! إني ما أعيب عليه في خلق ولا دين. ولكني أكره الكفر في الإسلام. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''أتردين عليه حديقته؟ قالت: نعم. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أقبل الحديقة وطلقها تطليقة'' (رواه البخاري والنسائي وابن ماجه: نيل الأوطار ۶.۲۲۶)۔ (ثابت بن قیس کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں، تو عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں ان کے دین اور اخلاق میں کوئی عیب نہیں لگاتی، لیکن اسلام کی حالت میں ناشکری کو ناپسند کرتی ہوں، تو اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تم ان کا باغ انہیں واپس کرتی ہو؟ انھوں نے کہا، جی ہاں! تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت سے فرمایا: تم باغ قبول کرلو اور ان کو ایک عدد طلاق دے دو)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ثابتؓ کی بیوی اپنے شوہر کو کسی اخلاقی خرابی یا دینی نقص کی وجہ سے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی بلکہ شوہر کی ناشکری کو ناپسند کرتی تھیں اور شدت بغض کی وجہ سے ان کے واجب حق میں کوتاہی کو نا گوار کرتی تھیں۔ اس پر حضور نے اصلاح وارشاد کا حکم دیا نہ کہ وجوب کا، کہ جو باغ ان کے شوہر نے مہر کے طور پر دیا تھا اسے واپس کرادیا، یہ اسلام کا پہلا خلع ہے اور اس میں معاوضہ کا مفہوم ہے۔

خلع کی مشروعیت کی دلیل کے طور پر جو پہلی آیت ''فإن خفتم ألا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به'' (بقرہ: ۲۹) پیش کی گئی ہے، اس سے مستنبط ہونے والے احکام کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ خلع ایسی حالت میں ہونا چاہئے جب کہ حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہو۔

۲۔ عقد نکاح سے آزادی حاصل کرنے میں عورت کی طرف سے پیش رفت کی صورت میں اسے اسی طرح مالی قربانی گوارا کرنی پڑے گی جس طرح شوہر اپنی خواہش سے طلاق دینے کی صورت میں کرتا ہے۔

۳۔ افتداء (معاوضہ دے کر رہائی حاصل کرنے) کے لئے محض فدیہ دینے والے کی خواہش کافی نہیں ہے بلکہ اس معاملے کا اتمام اس وقت ہوتا ہے جبکہ فدیہ لینے والا بھی راضی ہو۔

۴۔ خلع کے لئے صرف اس قدر کافی ہے کہ عورت اپنا پورا مہر یا اس کا ایک حصہ پیش کر کے علاحدگی کا مطالبہ کرے اور مرد اس کو قبول کر کے طلاق دے دے۔ یعنی خلع کا عمل طرفین کی رضامندی سے مکمل ہوجاتا ہے، عدالتی فیصلہ شرط نہیں ہے۔

۵۔ اگر عورت فدیہ پیش کرے اور مرد قبول نہ کرے تو اس صورت میں عورت کو عدالت سے رجوع کرنے کا حق ہے۔

یہ مجمل احکام ہیں، ان میں یہ صراحت نہیں ہے کہ حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف کن صورتوں میں متحقق ہوگا؟ فدیہ کی مقدار متعین کرنے میں انصاف کیا ہے؟ اور اگر عورت افتداء پر آمادہ ہو لیکن مرد قبول نہ کرے تو ایسی صورت میں قاضی کو کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہئے؟

ان مسائل کی تفصیلات ہم کو خلع کے ان مقدمات کی روداد وں میں ملتی ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے سامنے پیش ہوئے۔

عہد نبوی میں خلع کا سب سے زیادہ مشہور مقدمہ حضرت ثابت بن قیسؓ کی بیویوں کا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شکایت سن کر وہ باغ واپس کرایا جو حضرت ثابتؓ نے مہر میں دیا تھا، زیادہ دینے کو منع کر دیا (پورا واقعہ ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب الخلع ۲۲۲ میں ملاحظہ ہو)۔

دوسرا واقعہ حضرت عمرؓ کے عہد کا ہے کہ جب ایک عورت اور مرد کا مقدمہ پیش ہوا تو حضرت عمرؓ نے عورت کو نصیحت کی اور شوہر کے ساتھ رہنے کا مشورہ دیا، عورت نہ مانی تو ایک کالی کوٹھری میں تین دن قید کر دیا، تین دن کے بعد پوچھنے پر جب اس عورت نے پہلے دن جیسا جواب دیا تو شوہر کو عورت کی کان کی بالیوں پر خلع دینے کا حکم دیا (کشف الغمۃ ۲)۔

ربیع بنت معوذ بن عفراء نے اپنے شوہر سے اپنی تمام املاک کے معاوضہ میں خلع حاصل کرنا چاہا، شوہر نے نہیں مانا، حضرت عثمانؓ کے پاس مقدمہ پیش ہوا، حضرت عثمانؓ نے اس کو حکم دیا کہ اس کی چوٹی کا موباف تک لے لے اور اس کو خلع دے دے (عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری، حقوق الزوجین ۵۷)۔

## خلع کا شرعی حکم:

حنابلہ کے نزدیک مرد کے لئے عورت کے مطالبۂ خلع کا جواب دینا مسنون ہے، دلیل امرأۃ ثابت بن قیس والی حدیث ہے، ہاں! اگر شوہر کا عورت کی طرف میلان ہو اور اس سے محبت ہو تو اس وقت عورت کا صبر کرنا اور گلوخلاصی نہ کرنا مستحب اور پسندیدہ ہے۔

عورت کے لئے حالت سازگار ہونے کے باوجود خلع مکروہ ہے، دلیل حدیث ثوبان ہے، جس میں یہ آیا ہے کہ ''جو عورت بغیر کسی وجہ کے اپنے شوہر سے مطالبۂ طلاق کرے گی اس پر جنت کی خوشبو حرام ہو جائے گی'' (نسائی کے علاوہ ائمہ خمسہ نے اس کی روایت کی ہے)۔

یہ بھی وجہ ہے کہ ایسی صورت میں خلع عبث (بیکار) ہے، اس لئے مکروہ ہوگا، لیکن اگر خلع کر لے تو کراہت کے ساتھ ہو جائے گا،

حنفیہ کے یہاں خلع کے حکم میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ اگر نشوز شوہر کی طرف سے ہو تو اس کے لئے عورت سے عوض خلع لینا مکروہ ہے ''لأنه أوحشها بالاستبدال، فلا يزيد في وحشتها بأخذ المال'' (کیونکہ بیوی بدل کر اسے وحشت میں ڈالا ہے لہٰذا مال لے کر اس کی وحشت میں مزید اضافہ نہیں کرے گا)۔

اور اگر نشوز عورت کی طرف سے ہو تو شوہر بیوی سے بطور عوض اس سے زیادہ نہیں لے گا جو اسے مہر میں دیا ہے، لیکن اگر مہر کی مقدار سے زیادہ لے لے تو قضائً جائز ہے "فلا جناح عليهما فيما افتدت به" کے دلیل مطلق ہونے کی وجہ سے۔

شوافع کے یہاں خلع جائز ہے کیونکہ اس میں اکثر و بیشتر عورت سے دفع ضرر ہے، لیکن چونکہ شریعت میں مطلوب رشتۂ نکاح کا اس میں انقطاع بھی ہے اس لئے مکروہ ہے، اور صرف دو حالتوں میں جائز ہے:

۱۔ میاں بیوی دونوں یا ان میں سے کسی ایک کو یہ اندیشہ ہو کہ حدود اللہ قائم نہیں رکھ سکیں گے، یعنی نکاح میں اللہ نے جو چیزیں فرض کی ہیں اسے نباہ نہ سکیں گے۔

۲۔ کسی ایسی چیز پر طلاق ثلاث دینے کی قسم کھالے جو ناگزیر ہو، جیسے کھانا پینا اور قضاء حاجت تو ایسی صورت میں خلع کرے گا۔

مالکیہ کے نزدیک مشہور قول کے مطابق جائز ہے، جبکہ ایک قول کراہت کا بھی ہے (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۹/۷۰۱۱)۔

## خلع طلاق ہے یا فسخ؟

جمہور علماء کی رائے میں خلع طلاق بائن ہے، دلیل حدیث امرأۃ ثوبان ہے، اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ فسخ شوہر کے لئے فرقت غالبہ چاہتا ہے جس میں اس کو اختیار نہیں ہوتا جبکہ خلع اس کے اختیار میں ہے اس لئے خلع فسخ نہیں ہے (مزید ملاحظہ ہو: الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۴/۴۰۳، مجموعہ قوانین اسلامی ۱/۲۳۱، دفعہ ۳۱۸ کی تشریح)۔

بعض اہل علم جن میں امام احمد بن حنبل، داؤد ظاہری اور صحابہ میں حضرت ابن عباس، حضرت عثمان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم ہیں کی رائے میں فسخ ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ''الطلاق مرتان'' فرمایا پھر افتداء کا ذکر کیا، پھر فرمایا: ''فإن طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجاً غيره'' تو اگر افتداء طلاق ہوتا تو ایسا طلاق ہوتا جس میں بغیر شادی کے بیوی اس کے لئے حلال نہ ہوتی اور وہ چوتھی ہوتی، یہ حضرات اس کو جائز قرار دیتے ہیں کہ فسوخ باہمی رضامندی سے ہو جاتے ہیں، بیع کے فسوخ پر قیاس کرتے ہوئے جیسا کہ اقالہ میں ہوتا ہے۔

علامہ ابن قیمؒ نے خلع کے طلاق نہ ہونے پر دلیل یہ پیش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طلاق جس میں اس کی تعداد پوری نہ ہو، تین احکام مرتب کئے ہیں:

۱۔ اس میں شوہر رجوع کرنے کا حقدار ہے۔

۲۔ وہ طلاق تین میں شمار ہے، لہٰذا عدد پورا ہونے کے بعد عورت حلال نہ ہوگی جب تک کہ دوسرا شوہر دخول اور جماع نہ کرلے۔

۳۔ طلاق میں عدت تین قروء ہے۔

نص اور اجماع سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خلع میں رجعت نہیں ہے، اور سنت واقوال صحابہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس میں عدت ایک حیض ہے حتی کہ خطابی نے اس کو اس شخص کے لئے سب سے زیادہ طاقتور اور مضبوط دلیل قرار دیا ہے جو خلع کو فسخ مانتا ہے طلاق نہیں۔ کیونکہ اگر وہ طلاق ہوتا تو عدت کے لئے ایک حیض پر اکتفا نہ کیا جاتا۔ اور دو طلاق کے بعد بھی خلع نص سے ثابت ہے اور تیسری اس کے بعد واقع مانا ہے، یہ بہت ہی واضح ہے، خلع کے طلاق نہ ہونے میں (ملاحظہ ہو: فقہ السنہ ۲/۳۲۶،۳۲۷)۔

"الفقہ الاکبر" میں خلع کے حکم کہ اس کو طلاق شمار کیا جائے یا فسخ سمجھا جائے؟ اس سلسلہ میں جو کچھ تحریر ہے اس کا ترجمہ وخلاصہ لکھا جارہا ہے:

خلع کے ذریعہ تفریق کو طلاق کا نام دیا جائے کہ اس کا شمار تیسری طلاق ہوگا یا وہ فسخ ہے کہ اس کا شمار نہیں ہوگا، اور شوہر کے لئے بیوی کا کسی اور سے نکاح کئے بغیر رجوع جائز ہوگا، اور کیا عدت عورت پر لازم ہوگی یا نہیں؟

ظاہر ہے کہ عورت پر عدت لازم ہوگی کیونکہ عدت کا تعلق حکم نکاح سے ہے نہ کہ حکم طلاق سے، اور اس میں علماء کا اختلاف ہے، عدت کے حکم نکاح سے ہونے کو ہم نے ترجیح اس لئے دی ہے کہ غیر مدخول بہا کو جب طلاق ہو جائے تو اس پر عدت نہیں ہے تو اگر عدت کا تعلق طلاق کے حکم سے ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس پر عدت واجب کر دیتا کیونکہ طلاق پائی جارہی ہے اور نکاح ندارد ہے۔

خلع سے حاصل ہونے والی علاحدگی بائن ہے، چاہے اسے فسخ مانا جائے یا طلاق، وجہ عورت کا فدیہ اور بدل خلع پیش کرنا ہے، اگر عورت سے مال لینے کے باوجود شوہر رجوع کرنے کا مالک ہو تو عورت بے فائدہ رہے گی، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ خلع بائن ہو (الفقہ الاکبر عند الشیخ محی الدین بن العربی ر ۳۷۳)۔

## کیا خلع کے لئے قاضی کی ضرورت ہے؟

خلع کے لئے کسی حاکم اور قاضی کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر فریقین میں ناچاقی ہو تو اس کا فیصلہ کہ وہ حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے اور خلع کرنا چاہئے، کوئی تیسرا شخص ہی کر سکتا ہے اور ایسی صورت میں خلع عدالت کے ذریعہ کرایا جا سکتا ہے۔

چنانچہ اگر عورت رشتۂ زوجیت کو منقطع کرنا چاہے اور مرد کو اس کا بدل دینے کے لئے آمادہ ہو تو اسلام مذکورہ شرائط کے ساتھ عورت کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ حاکم وقت یا اس کی قائم کردہ عدالت میں حاضر ہو کر استغاثہ پیش کرے اور بذریعہ عدالت شوہر سے خلع حاصل کرے۔

تنزیل الرحمن "خلع کا جواز" کے عنوان سے اسی کتاب میں رقم طراز ہیں: "اگر عدالت کو اس امر کا اطمینان ہو گیا کہ زوجین شدید ناچاقی کے سبب باہمی معاشرت میں احکام خداوندی کی پابندی نہ کر سکیں گے تو شوہر کو خلع کا حکم دے گی، مگر شرط یہ ہے کہ اگر قصور مرد کا پایا جائے گا تو عدالت بلا معاوضہ تفریق کرا دے گی۔

مزید شرط یہ ہے کہ اگر قصور عورت کا ہو یا دونوں میں سے کسی کا نہ ہو مگر حالات خلع کے متقاضی ہوں تو شوہر کو عورت سے مناسب معاوضہ دلوایا جائے گا" (مجموعہ قوانین اسلام ۲/ ۵۹۳)۔

## ایک نظر بلاد اسلامیہ کے قوانین خلع پر

### مصر کا قانون:

مصر میں خلع کے موضوع پر کوئی قانون موضوعہ موجود نہیں ہے، البتہ حسب احکام دفعہ ۲۸۰ قانون ۳۱ بابت ۱۹۱۰ء اس کے لئے عام حنفی قانون کے مطابق عمل درآمد کیا جاتا ہے، مجموعہ الاحکام الشرعیہ کے دفعات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ نکاح صحیح میں خلع یا طلاق اسی صورت میں جائز ہوگا جبکہ زوجین نااتفاقی کی وجہ سے حقوق زوجیت اور اس کے واجبات ادا کرنے سے عاجز ہوں۔

۲۔ خلع کی صحت کے لئے شوہر کا طلاق کی اہلیت رکھنا اور بیوی کا محل خلع ہونا شرط ہے۔

۳۔ خلع میں عوض شرط نہیں، اس کے ساتھ یا اس کے بغیر بھی درست ہے۔

۴۔ قضاءً شوہر کے لئے بدل خلع بیوی کو ادا کئے ہوئے معاوضہ سے زائد لینا جائز ہے۔

۵۔ خلع سے طلاق بائن ہوتی ہے خواہ بعوض مال ہو یا بلا عوض ہو، اس میں تین طلاق کی نیت بھی درست ہے، خلع قضائے قاضی پر موقوف نہ ہوگا۔

## شام کا قانون:

شام میں خلع سے متعلق قانون کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ خلع کی صحت کے لئے شوہر میں طلاق کی اہلیت اور بیوی میں خلع کی محلیت شرط ہے۔

۲۔ اگر عورت سن رشد کو نہ پہنچی ہو تو اس پر بدل خلع لازم نہیں آتا، الا یہ کہ ولی کی موافقت ہو۔

۳۔ طرفین میں سے ہر ایک کو قبول سے پہلے ایجاب سے رجوع کر لینا جائز ہوگا۔

۴۔ ہر وہ شئ خلع کا معاوضہ ہو سکتی ہے جس کا لزوم شرعاً صحیح ہو۔

۵۔ مہر کے علاوہ کسی اور شئ پر خلع کیا جائے تو عورت پر اس کی ادائیگی لازم ہوگی اور خلع کرنے والے فریقین تمام حقوق سے جو مہر اور نفقہ سے متعلق ہوں، بری ہو جائیں گے۔

۶۔ اگر خلع کے وقت فریقین کسی شئ کا ذکر نہ کریں تو دونوں ایک دوسرے کے حق مہر اور نفقہ سے بری ہو جائیں گے۔

## عراق کا قانون خلع:

عراق میں خلع کے موضوع پر نافذ قانون کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ لفظ خلع یا اس کے ہم معنی لفظ سے قید زوجیت کا ازالہ ایجاب وقبول کے ذریعہ قاضی کے روبرو منعقد ہوتا ہے۔

۲۔ خلع کی صحت کے لئے شوہر طلاق کا اہل اور بیوی خلع کا محل ہو۔

۳۔ مہر سے زائد یا کم پر خلع کرنا شوہر کے لئے جائز ہے۔

**تیونس کا قانون خلع:**...... یہاں عام طلاق کے لئے قانون یہ ہے کہ وہ قاضی کے حکم کے بغیر نہیں ہوتی لیکن فریقین کی رضامندی والی صورت حکم قاضی سے مستثنیٰ ہے۔

## مراکش:

یہاں خلع کا جو قانون نافذ ہے وہ اس طرح ہے:

۱۔ زوجین کے لئے خلع کے ذریعہ طلاق پر رضامندی جائز ہے۔

۲۔ عورت سن رشد کو پہنچ چکی ہو تو خلع لے سکتی ہے، لیکن اگر سن رشد کو نہ پہنچی ہو تو خلع سے طلاق واقع ہوگی، مگر اس کے ذمہ خلع کا معاوضہ ولی مال کی رضامندی کے بغیر لازمی نہ ہوگا۔

**پاکستان:**...... پاکستان میں خلع پر کوئی قانون موضوعہ (Enacted Law) موجود نہیں، بنابریں عدالتوں کو اس کی تعبیر میں خاصی دشواری پیش آئی (تلخیص از مجموعہ قوانین اسلام ۲ / ۵۹۳ تا ۵۹۶)۔

## شقاق کیا ہے؟

تفسیر روح المعانی میں علامہ آلوسیؒ نے شقاق کی مراد یہ لکھی ہے:

''الشقاق: الخلاف والعداوة، واشتقاقه من الشق، وهو الجانب لأن كلاً من المتخالفين في شق غير شق الآخر'' (روح المعاني ۵.۲۶)۔ (شقاق، اختلاف اور عداوت کو کہتے ہیں جو شق سے مشتق ہے جس کے معنی کنارہ کے ہیں، شقاق کو شقاق اس لیے کہتے ہیں کہ دونوں اختلاف کرنے والوں میں سے ہر ایک، ایک ایسے کنارہ اور سرے پر ہوتا ہے جس پر دوسرا نہیں ہوتا)۔

یہی تفسیر المنار میں بھی ہے (ملاحظہ ہو ۵/ ۶۳)۔

تفسیر رازی میں اس کی دو توجیہ لکھی ہے:

۱۔ زوجین میں سے ہر ایک ایسا کام کرے جو دوسرے پر شاق (گراں) ہو۔

۲۔ ان میں سے ہر ایک عداوت و دوری اور جدائی و مجبوری میں ایک کنارہ پر چلا جائے (تفسیر رازی ۱۰/ ۹۲)۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس آیت میں استعمال شقاق کا ترجمہ ''ایسی کشمکش جسے وہ باہم سلجھا نہ سکیں'' سے کیا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر ماجدی)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے اپنی کتاب ''الفقہ الاسلامی وأدلتہ'' میں تحریر فرمایا ہے: ''الشقاق: هو النزاع الشديد بسبب الطعن في الكرامة'' (الفقه الاسلامي وأدلته ۹.۷۰۶۰، كتاب النسخ والتفريق ۱۵۲)۔ (شقاق: عزت و وقار میں طعن کے سبب شدید نزاع کو کہتے ہیں)۔

## شقاق میں حکم قرآنی:

اگر زوجین میں شقاق پیدا ہو جائے تو اس کے ختم کرنے کا کیا علاج اور تدبیر ہے؟

مسئلہ کس طرح حل کیا جائے؟ قرآن کریم میں ایسے موقع پر کیا رہنمائی ملتی ہے؟ شقاق کی وجہ سے تفریق اور اس سلسلہ میں فقہاء کی آراء کیا ہیں؟ قبل اس کے کہ ہم ان سب کا جائزہ لیں اور مفصل گفتگو کریں اس آیت کا مکمل ترجمہ پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

فإن خفتم شقاق بينهما الخ۔ (اور اگر (قرائن سے) تم اوپر والوں کو ان دونوں میاں بی بی میں (ایسی کشاکش کا) اندیشہ ہو (کہ اس کو وہ باہم نہ سلجھا سکیں گے) تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی جو (ایسا ہی) تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو عورت کے خاندان سے (تجویز کر کے اس کشاکش کے رفع کرنے کے لئے) ان کے پاس بھیجو (کہ وہ جا کر تحقیق حال کریں اور جو بے راہی پر ہو یا دونوں کا کچھ کچھ قصور ہو سمجھا دیں) اگر دونوں آدمیوں کو (سچے دل سے) اصلاح (معاملہ کی) منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بی بی میں (بشرطیکہ وہ ان دونوں کی رائے پر بھی عمل کریں) اتفاق فرما دیں گے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے علم اور بڑے خبر والے ہیں، (جس طریق سے ان میں باہم مصالحت ہو سکتی ہے اس کو جانتے ہیں، جب حکمین کی نیت ٹھیک دیکھیں گے وہ طریق ان کے قلب میں القا فرما دیں گے)۔

فائدہ: ان دونوں حکمین کا اصل کام اتنا ہی ہے، البتہ اگر زوجین اپنے اپنے حکم کو طلاق یا خلع کا اختیار بھی دے دیں تو وکالۃً وہ اس کے مختار بھی ہو جائیں گے مگر اس آیت میں اس سے تعرض نہیں...... مسئلہ: یہ فیصلہ واجب ہے، اگر زوجین حکام سے رجوع کریں اور دوسروں کے لیے مستحب ہے، اور قید أهله وأهلها کی سب کے لیے مستحب ہے (بیان القرآن ۲/ ۱۱۵، تفسیر ماجدی نساء: ۳۵، ف: ۵۴۱)۔

جب زوجین میں شقاق پیدا ہو جائے، دشمنی مستحکم ہو جائے، فرقت کا اندیشہ کیا جانے لگے، اور ازدواجی زندگی منہدم ہو جانے اور خاندانی شیرازہ بکھر جانے کا خطرہ لاحق ہو جائے تو حاکم ان دونوں کے معاملہ میں غور و فکر کرنے کے لئے دو حکم بھیجے گا تاکہ وہ غور و خوض سے کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں، کہ ازدواجی زندگی باقی رکھنا مصلحت ہے یا ختم کر دینا۔

## شقاق کی وجہ سے تفریق اور فقہاء کی آراء:

تفریق بوجہ شقاق یا ضرر خواہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو ائمہ ثلاثہ (امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد) کے نزدیک جائز نہیں ہے، کیونکہ عورت سے دفع ضرر طلاق کے بغیر بھی ممکن ہے، اس طور پر کہ معاملہ قاضی کے سامنے پیش کیا جائے اور آدمی پر تادیبی فیصلہ کیا جائے کہ وہ عورت کو مضرت پہنچانے سے باز آجائے۔

البتہ مالکیہ نے شقاق یا ضرر کی وجہ سے جھگڑا ختم کرنے اور نزاع کو روکنے کے لئے تفریق کی اجازت دی ہے تاکہ ازدواجی زندگی جہنم اور مصیبت یا

آزمائش بن کر نہ رہ جائے، ان کے پیش نظر "لاضرر ولا ضرار" (نہ ضرر اٹھاؤ نہ ضرر پہنچاؤ) حدیث ہے، اور یہ بھی وجہ ہے کہ اگر عورت اپنا معاملہ قاضی کے سامنے پیش کرے اور ضرر یا اپنے دعوی کی صحت ثابت کردے تو قاضی عورت کو شوہر کی طرف سے طلاق دے دے گا، اور اگر ضرر ثابت نہ کرسکے تو گویا اپنے دعوی کی انکاری ہوئی تو اگر دوبارہ دعوی کرے تو قاضی دو حکم بھیجے گا، ایک حکم بیوی کے گھر سے اور ایک حکم شوہر کی طرف سے، تاکہ جمع اور مصالحت یا عوض یا بغیر عوض تفریق میں سے جو زیادہ درست اور مناسب ہو وہ کردے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وإن خفتم شقاق بينهما، فابعثوا حكما من أهله وحكماً من أهلها'' (ملاحظہ ہو الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۶۰۰۹)۔

ڈاکٹر تنزیل الرحمن لکھتے ہیں: ''امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زوجین میں ایسی ناچاقی کی صورت میں کہ حدود اللہ پر قائم نہ رہ سکنے کا خوف پیدا ہو گیا ہو، خلع کرانا جائز ہے، لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں، چنانچہ امام شافعیؒ "کتاب الام" میں لکھتے ہیں کہ ''اگر شوہر نے کہا کہ میں اپنی زوجہ کو جدا نہیں کروں گا اور نہ اس کے ساتھ عدل کروں گا تو اس کو زوجہ کے ساتھ عدل کرنے پر مجبور کیا جائے گا لیکن زوجہ کو جدا کرنے کے لئے اس پر جبر نہیں کیا جا سکتا'' (مجموعہ قوانین اسلام ۲/۵۸۶)۔

## حکمین کی ضرورت اور ان کی حیثیت:

امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ آیت کریمہ "وإن خفتم الخ" میں "خفتم" بقول حضرت ابن عباسؓ "علمتم" کے معنی میں ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر حقیقت میں ہمیشہ شقاق کا علم ہو جائے تو حکمین کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔

تمام مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ شقاق کا پایا جانا اگرچہ معلوم ہے، لیکن اس کا صدور زوجین میں سے کس کی طرف سے ہوا؟ یہ معلوم نہیں ہے۔ اس لئے حکمین کی ضرورت ہے تاکہ حقیقت حال اور صحیح صورت واقعہ معلوم ہو سکے۔

علامہ قرطبیؒ نے حکمین کی حیثیت متعین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حکمین کو بغیر توکیل کے تطلیق کا حق ہے، یہ قول مالک، اوزاعی اور اسحق کا ہے، صحابہ میں حضرت عثمان و علی و ابن عباس رضی اللہ عنہم اور تابعین میں شعبی اور نخعی رحمہم اللہ کی روایت یہی ہے اور یہی امام شافعیؒ کا قول ہے، کیونکہ "فابعثوا حكما من أهله الخ" میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ صراحت ہے کہ حکمین قاضی ہیں نہ کہ وکیل اور شاہد۔ شریعت میں وکیل کا نام اور مطلب کچھ ہے اور حکم کا نام اور مفہوم کچھ اور۔ لہٰذا دونوں کے مفہوم کو گڈمڈ کرنا کسی شذوذ پسند کے لئے درست نہیں ہے تو بھلا کسی عالم کے لئے کیسے مناسب ہوگا'' (تفسیر قرطبی ۵/۱۵۲)۔

امام رازیؒ نے لکھا ہے: ''امام شافعیؒ کے ایک قول کے مطابق، امام مالک واسحق کا بھی قول ہے کہ حکمین کے لئے زوجین کی اجازت کے بغیر حکم نافذ کرنا جائز ہے، لیکن امام شافعیؒ کے دوسرے قول کے مطابق اور یہی امام ابوحنیفہؒ کا قول بھی ہے، جائز نہیں ہے، البتہ وکالۃ درست ہے'' (تفسیر رازی ۱۰/۹۳)۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ''مستحب یہ ہے کہ حاکم دو منصف کو بھیجے اور ان دونوں کو حکم بنادے، بہتر یہ ہے کہ ایک حکم مرد کے اہل اور دوسرا عورت کے اہل کی طرف سے ہو، کیونکہ زوجین کے اقرب غیروں کے مقابلہ میں ان دونوں کی حالت خوب جانتے ہیں اور صلاح و درستگی کے شدید طالب اور خواہاں ہوتے ہیں، لیکن اگر حکمین اجنبی ہوں تو بھی جائز ہے'' (ملاحظہ ہو تفسیر رازی ۱۰/۹۳)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے آیت "فابعثوا حكماً من أهله وحكماً من أهلها" کے تحت لکھا ہے: ''مهمة الحكمين: الجمع والتفريق بين الزوجين والزامها بذلك بدون إذنهما في رأى الإمام مالك والشعبي وهو رأى علي وابن عباس'' (التفسير المنير ۵/۵۱)۔ (حکمین کی ذمہ داری زوجین میں جمع وتفریق اور ان کی مرضی واجازت کے بغیر ان کو لازم کرنا ہے، امام مالک اور شعبی کی رائے میں اور یہی رائے حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی ہے)۔

ابن العربی فرماتے ہیں: "هذا نص من الله سبحانه في أنهما قاضيان لا وكيلان" (یہ اللہ کی طرف سے صراحت ہے کہ حکمین قاضی کی حیثیت رکھتے ہیں نہ کہ وکیل کی)۔

کیونکہ حکمین بھیجنے کے لئے زوجین کے علاوہ یعنی اولیاء اور سلطان کو مخاطب کیا گیا ہے...... حکمین شاہد ہیں، واقعہ کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ دونوں معاملہ سلطان کو پیش کریں گے، حسن اور ابن زید کا یہ قول ہے اور یہی حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے، امام ابوحنیفہ وشافعی بھی اسی کے قائل ہیں، جبکہ حضرت ابن عباسؓ کا صحیح قول یہ ہے کہ وہ دونوں حکم ہیں، شاہد نہیں، اگر حکمین زوجین کے درمیان تفریق کردیں تو یہ تفریق مقصود نکاح (الفت اور حسن معاشرت) میں خلل

آجانے کی بنیاد پر ہوگی، جیسا کہ ہمارے علماء فرماتے ہیں۔

اگر اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ شوہر یا بیوی کی طرف سے ظلم کا ظہور منافیٔ نکاح نہیں ہے بلکہ ظلم کرنے سے مظلوم کا حق لیا جائے گا اور عقد کو باقی رکھا جائے گا؟ تو یہ کوتاہی نظر کی بات ہوگی، عقود دالأ موال میں اس کا تصور تو ہوسکتا ہے لیکن عقود دالأ بدان میں عقد کی تکمیل اتفاق، باہمی الفت اور حسن معاشرت سے ہوتی ہے، اگر یہی مفقود ہو تو عقد کے باقی رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور مفاد ومصلحت تفریق ہی میں ہے (ملاحظہ ہو احکام القرآن للجصاص ار ۵۳ / ۵۴۳)۔

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ حکمین میں اگر اختلاف ہو جائے تو دونوں کا قول نافذ نہیں ہوگا، اور وہ اس پر بھی متفق ہیں کہ جمع بین الزوجین کے سلسلہ میں زوجین کی طرف سے بغیر توکیل کے ان کا قول نافذ ہوگا۔

اگر دونوں حکم زوجین کے درمیان تفریق پر متفق ہو جائیں تو حکمین کی تفریق میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ کیا ایسی صورت میں شوہر سے اجازت کی ضرورت پڑے گی یا نہیں؟

جمہور کا کہنا ہے کہ حکم زوج کی طرف سے توکیل پر عمل کرے گا، لہٰذا حکمین کو زوجین کے درمیان تفریق کا حق نہیں ہے، الا یہ کہ شوہر ان دونوں کو تفریق کا اختیار دے دے۔

وجہ یہ ہے کہ اصلاً طلاق کا اختیار شوہر یا وہ جس کو اپنا وکیل بنائے اس کو ہے، اس کے علاوہ کسی کو نہیں ہے، کیونکہ شرعاً طلاق شوہر کا حق ہے اور مال صرف کرنے کا حق عورت کو ہے، اس لئے دونوں کی اجازت کے بغیر تفریق جائز نہیں ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ تفریق اور جمع دونوں میں زوجین کی طرف سے بغیر توکیل اور اجازت کے حکمین کا قول نافذ اور قابل عمل ہوگا۔ دلیل حکمین کے بارے میں حضرت علیؓ کا یہ قول ہے: "إليهما التفرقة بين الزوجين والجمع" (زوجین میں جمع وتفریق دونوں کا اختیار حکمین کو ہے)۔

امام مالکؒ نے حکمین کو سلطان سے تشبیہ دی ہے اور سلطان اپنی رائے اور صواب دید کے مطابق ضرر کے سبب جبکہ وہ ظاہر ہو طلاق دے سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے بھی خود ان دونوں کو حکم کا نام دیا ہے "فابعثوا حكماً من أهله وحكماً من أهلها" اور زوجین کی رضا مندی کا اعتبار نہیں کیا ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۹ / ۷۰۶۰)۔

## حکمین کے لئے شرطیں:

حکمین کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ دونوں مرد ہوں، عادل ہوں اور جس قضیہ اور اہم مسئلہ میں ان سے مطالبہ ہے اس سے بخوبی واقف ہوں، مستحب اور بہتر ہے کہ زوجین کے اہل سے تعلق رکھتے ہوں کہ ایک عورت کے اہل سے اور دوسرا شوہر کے اہل سے ہو۔

اگر حکمین زوجین کے اہل سے نہ ہوں تو قاضی دو اجنبی مردوں کو بھیجے گا۔ اس میں بھی مستحسن ہے کہ وہ زوجین کے پڑوسی ہوں جن کو دونوں کے حال کی جانکاری ہو اور دونوں کے درمیان اصلاح اور مصالحت کی قدرت ہو (ایضاً ۷۰۱۸۔ ۷۰۲۲)۔

## ایک حکم کا مسئلہ:

ایک حکم کو بھیجنا کافی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زنا میں چار گواہوں کا حکم دیا ہے، پھر بھی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زانیہ عورت کی طرف انیس کو بھیجا اور ان سے فرمایا: "اگر وہ اعتراف کرلے تو رجم کردینا" اسی طرح کی بات عبد الملک نے مدونہ میں کہی ہے (ملاحظہ ہو احکام القرآن للجصاص ار ۵۴۳)۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: "ایک حکم بھیجنا جائز ہے اگر وہ تنہا فیصلہ کردے تو کافی ہے، اور جواز بدرجۂ اولی ہوگا جب کہ زوجین راضی ہوں" (ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی ۵ / ۱۵۳)۔

## شقاق کی وجہ سے تفریق کی نوعیت:

شقاق کی وجہ سے جو طلاق قاضی دے گا وہ ایک طلاق بائن کے درجہ میں ہوگی، کیونکہ اس کے بغیر ضرر کا ازالہ نہیں ہوسکتا کیونکہ جب طلاق رجعی ہوگی تو عدت کے دوران شوہر کو عورت سے رجوع کرنے اور دوبارہ ضرر پہنچانے کا راستہ مل جائے گا (ملاحظہ الفقہ الاسلامی وادلتہ ۹ / ۷۰۶۳)۔

مجموعۂ قوانین اسلامی میں لکھا ہے: "زوجین کے درمیان تفریق کے لئے جن صورتوں میں قضائے قاضی شرط ہے ان میں سے ایک صورت زوجین میں

شقاق کا پایا جانا ہے۔

یعنی اگر زوجین کے درمیان شدید نفرت پیدا ہو جائے کہ دونوں کا اللہ کے حدود کو قائم رکھتے ہوئے ازدواجی زندگی گزارنا ممکن نظر نہ آئے تو ایسی صورت میں: (الف) قاضی حکمین مقرر کرے گا تاکہ اصلاح کی صورت نکل سکے: (ب) اگر تحکیم کے باوجود اصلاح خال یا باہمی رضامندی سے علاحدگی کی کوئی صورت نہیں نکل سکے تو قاضی بربنائے شقاق، زوجہ کے مطالبہ کی صورت میں تفریق کردے گا" (مجموعہ قوانین اسلامی ۲۵۰/۲۵۱-۲۵۱، تیار کردہ مسلم پرسنل لابورڈ انڈیا)۔

## خلع کے لئے بیوی کی طرف سے شقاق کافی ہے:

یہ گزر چکا ہے کہ خلع زوجین کی باہمی رضامندی سے ہوگا، اگر دونوں کی آپسی رضامندی مکمل طور پر نہ ہو تو قاضی شوہر کو خلع کا پابند کرے گا، کیونکہ حضرت ثابت بن قیسؓ اور ان کی بیوی نے اپنا قضیہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیا تھا اور حضورؐ نے بدل خلع کے طور پر باغ قبول کرنے اور طلاق دینے کا پابند بنایا تھا۔

امام شوکانی نے خلع کے باب کی احادیث سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ خلع کے جواز میں محض عورت کی طرف سے شقاق کا پایا جانا کافی ہے۔

ابن منذر نے یہ پسند کیا ہے کہ دونوں طرف سے جب تک شقاق نہ ہو خلع جائز نہیں، اور انھوں نے ظاہر آیت کو مستدل بنایا ہے۔ یہی طاؤس، شعبی اور تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے، جبکہ ایک جماعت نے اس کا جواب بھی دیا ہے، جن میں طبری بھی ہیں، کہ جب عورت شوہر کے حقوق انجام نہ دے سکے اور یہ شوہر سے بغض پر مبنی ہو تو ایسی صورت میں مخالفت کو عورت کی طرف منسوب کردیا گیا ہے۔ شوہر کی طرف سے اس کا اعتبار نہ کئے جانے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابتؓ سے ان کی کراہت دریافت نہیں کی جس وقت عورت نے ان سے کراہت کا اعلان کیا تھا۔

بیوی کے بعض حقوق روک کر اسے اذیت دینا تاکہ وہ عاجز آکر خلع لینے پر مجبور ہو جائے، ایسا کرنا شوہر کے لئے حرام ہے، اس انداز سے خلع باطل اور بدل (عوض خلع) قابل واپس ہے اگرچہ قضاءً اس کا فیصلہ ہو جائے۔ یہ حرام اس لئے ہے کہ عورت پر شوہر سے جدائی اور مالی تاوان بیک وقت دونوں جمع ہو رہا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''یا أیہا الذین آمنوا ... أن یأتین بفاحشة مبینة '' (نساء:۱۹)۔

اور '' وإن أردتم استبدال زوج مکان زوج ... إثما مبینا '' (بقرہ:۲۲۹)۔

جب کہ عضل کی حرمت کے باوجود بعض علماء اس حال میں نفاذ خلع کی رائے رکھتے ہیں، امام مالکؒ کی رائے ہے کہ خلع نافذ ہوگا کیونکہ وہ طلاق ہے اور شوہر پر اپنی بیوی سے لیا ہوا بدل واپس کرنا واجب ہے (ملاحظہ ہو فقہ السنہ ۲/۳۲۲)۔

## مذاہب غیر پر فتویٰ:

ضرورت شدید میں مذہب غیر پر عمل کی اجازت ہے جبکہ اتباع ہوی نہ ہو، علامہ ابن تیمیہؒ نے اس شرط پر تمام امت کا اجماع اور اتفاق نقل کیا ہے۔

الحیلۃ الناجزۃ ص ۵۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ افتاء بمذہب الغیر ہر زمانہ میں جائز ہے بشرطیکہ سخت ضرورت ہو کہ مذہب غیر کے لئے کوئی تکلیف ناقابل برداشت پیش آجائے۔ اور ضرورت کی صحیح تفسیر تکلیف مالایطاق ہے (الحیلۃ الناجزۃ ۵۰/۵۱)۔

حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی علیہ الرحمہ نے "بوقت ضرورت دوسرے ائمہ کے مسلک پر فتویٰ اور فیصلہ" کے عنوان سے "آداب قضاء" میں تحریر فرمایا ہے۔

"نمبر ۲۴ اور ۲۵ میں قاضی مقلد کے لئے جو یہ حکم ہے "مشائخ مذہب کی تقلید اور ان کی رائے کی اتباع لازم ہے، اگر ان کی رائے کے خلاف فیصلہ دے گا تو نافذ نہیں ہوگا، اسی طرح قول ضعیف پر فیصلہ دے گا تو نافذ نہیں ہوگا" یہ مذہب کا عام حکم ہے، خصوصی صورت حال اس سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ بوقت ضرورت فقہاء حنفیہ نے دوسرے ائمہ کے مسالک و مذاہب پر عمل، فتویٰ اور قضا کی اجازت دی ہے۔

مجموعۃ الفتاویٰ مولانا عبدالحی ۲/۲۷-۴۳، جامع الرموز ۶۵۶، رد المحتار، کتاب القضاء ۸/۱۰۷، تعالیق الانوار علی الدر المختار ۳/۱۶۹ وغیرہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ بوقت ضرورت غیر مذہب پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے اور اس پر عمل کیا جاسکتا ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آداب قضا ۹۲ تا ۹۴)۔

دوسرے مسلک پر فتویٰ اور فیصلہ کے جواز اور عدم جواز کے باب میں فریقین کے تفصیلی دلائل کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام

قاسمی علیہ الرحمہ نے بڑی فیصلہ کن اور ذہن و عقل کو قبول کرنے والی بات لکھی ہے، اس کا ایک حصہ یہاں موضوع کی مناسبت سے نقل کر دینا مفید معلوم ہوتا ہے:

''اس مسئلہ میں جس قول کی طرف میرا رجحان ہے اس میں قدرے تفصیل ہے اور وہ یہ کہ تتبع رخص عام حالات میں تشہی بلہوولعب اور خواہشات کی پیروی کی بنیاد پر ناجائز ہے، ہاں! اگر کسی خاص مسئلہ میں عذر یا مرض کی ضرورت کی بنیاد پڑ ہو تو مخصوص شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ وہ تتبع رخص جس کے ممنوع ہونے پر بعض حضرات نے اجماع کا دعوی کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان ہر مسلک میں سے اس قول کو اختیار کرے جو اس کے لئے آسان ہو اور یہ کسی واقعی عذر اور ضرورت کے پیش نظر نہ ہو بلکہ محض خواہش نفس کی پیروی میں ہو۔ کیونکہ اگر اس کا دروازہ کھول دیا جائے تو یہ شریعت کے احکام سے آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے گا اور دین کھلونا اور مذاق بن کر رہ جائے گا'' (دوسرے مسلک پر فتوی دینے کے اصول وضوابط: ۲۴)۔

واضح رہے کہ مذہب غیر پر عمل اور افتاء کے جواز کے لئے اصطلاحی ضرورت مراد نہیں، جس میں ہلاکت کا خطرہ گمان ہوتا ہے، بلکہ یہاں مراد مشقت، پریشانی اور مصیبت میں مبتلا ہوجانے کا ظن غالب ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ بھی اس رائے کے حامل ہیں کہ اگر مسلمانوں کی کوئی شدید اجتماعی ضرورت داعی ہو تو اس موقع پر کسی دوسرے مجتہد کے مسلک پر فتوی دینے میں مضائقہ نہیں، لیکن دوسرے امام کا قول اختیار کرنے کے لئے حسب ذیل چند باتوں کا اطمینان کر لینا ضروری ہے۔

(۱) واقعۃً مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت متحقق ہے یا نہیں؟ ایسا نہ ہو کہ محض تن آسانی کی بنیاد پر فیصلہ کر لیا جائے۔

(۲) جس امام کا قول اختیار کیا جائے اس کی پوری تفصیلات براہ راست اس مذہب کے اہل فتوی علماء سے معلوم کی جائیں، محض کتابوں میں دیکھنے پر اکتفا نہ کیا جائے، کیونکہ بسا اوقات اس قول کی بعض ضروری تفصیلات عام کتابوں میں مذکور نہیں ہوتیں اور ان کے نظر انداز کر دینے سے تلفیق کا اندیشہ رہتا ہے۔

(۳) ائمہ اربعہ سے خروج نہ کیا جائے کیونکہ ان حضرات کے علاوہ کسی بھی مجتہد کا مذہب مدون شکل میں ہم تک نہیں پہنچا اور نہ ان کے متبعین اتنے ہوئے ہیں کہ ان کا کوئی قول استفاضہ یا تواتر کی حد تک پہنچ جائے (مستفاد از دوسرے مسلک پر فتوی دینے کے اصول وضوابط ۴۵ / ۴۶ ۔ بحوالہ ''البلاغ'' کراچی مفتی اعظم نمبر ۴۲۰)۔

تفریق کی ایک بنیاد زن وشوہر میں ''شقاق'' کا ہونا ہے، اور شقاق کے معنی عداوت، دشمنی، مخالفت کے ہیں، چونکہ یہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے، اس لئے اس کے معنی ہیں باہم شقاق میں اس حالت پر ہوجانا کہ ایک شخص ایک شق پر ہو یعنی ایک سرے پر ہو اور دوسرا شخص دوسری شق پر ہو، یعنی دوسرے سرے پر ہو، یعنی دو آدمیوں کے درمیان شقاق (عداوت: دشمنی، مخالفت) نے انتہائی صورت اختیار کر لی ہو۔

یہ شقاق عام ہے، چاہے شوہر کے بلا وجہ مار پیٹ سے باہم زن وشوہر میں پیدا ہوا ہو، یا بیوی کی جائداد پر ناجائز تصرف کی وجہ سے پیدا ہوا ہو، یا بے پردگی اور موجودہ فیشن کی عریانی اختیار کرنے پر جبر کی وجہ سے پیدا ہوا ہو، یا فرائض وواجبات کی ادائیگی سے روکنے کی بنا پر پیدا ہوا ہو، یا اسی طرح کے اور دوسرے امور کی وجہ سے رونما ہوا ہو، سب کے لئے قرآن مجید کا حکم یہ ہے کہ حکمین کے ذریعہ سے اس شقاق کو دور کیا جائے۔

جمہور کے نزدیک حکمین کو تفریق کا حق صرف اس صورت میں ہے جبکہ زوجین ان دونوں کو طلاق یا خلع کا وکیل بنادیں، ورنہ نہیں۔ البتہ امام مالکؒ کے یہاں حکمین کو زوجین کی رضامندی کے بغیر طلاق اور خلع کا اختیار ہے، لیکن زن وشوہر میں شقاق کی صورت میں جب عورت قاضی کے یہاں مقدمہ دائر کرے اور جائز شکایت کی بنا پر شوہر سے تنگ آکر تفریق کا مطالبہ کرے تو حنفی قاضی معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر امام مالکؒ کے مسلک پر ابتدائی کارروائی کے بعد یا اختیار حکمین کے ذریعہ شقاق کے معاملہ کو ان کی تفصیل کے مطابق ختم کرادے اور حکمین کو امام مالکؒ کے مسلک کو اچھی طرح سمجھا دے (ملاحظہ ہو: کتاب الفسخ والتفریق از مولانا عبد الصمد رحمانیؒ ۱۵۲ تا ۱۵۶)۔

☆☆☆

# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی [1]

شریعت کی نگاہ میں دوام واستحکام مطلوب ومقصود ہے اسی لیے تمام دروازے پر قفل لگانے کی ترغیب دی گئی جن سے نکاح کی دوامیت کو خطرہ لاحق ہوسکتا تھا، نکاح سے پہلے ایک نظر دیکھ لینے، حالات کا استفسار کر لینے، خاندان کو ساتھ ملا لینے جیسے امور کی ترغیب اسی وجہ سے ہے کہ موافقت ویگانگت، اتحاد واتفاق اور محبت وپیار کی فضا استوار ہو، لیکن نادانی وناسمجھی میں اگر ایسا نکاح ہو ہی گیا جس سے ناموافقت وناچاقی پیدا ہونے لگی تو صرف اس مقصد کے لیے کہ دوام باقی رہے مختلف حیلوں اور طریقوں کو اختیار کرنے کی تاکید کی گئی جن سے غصہ کا ماحول ختم ہو اور الفت ومحبت کا مزاج بن جائے، ہاں تمام تر کوششیں ناکام ہوجائیں، کوئی صورت اصلاح کی نہیں رہی تو پھر زندگی کو اجیرن بنانے سے بہتر یہی ہے کہ تسریح باحسان کو روبہ عمل لایا جاے اور رشتۂ نکاح کو حسن اسلوبی اور شرعی طریقہ وآداب سے ختم کردیا جائے، اس کے لیے کبھی تو طلاق کا سہارا لینا پڑتا ہے تو کبھی خلع کا، اور ناگزیر حالات ایسے بھی آتے ہیں کہ قاضی وحکم بیچ میں پڑ کر تمام تر اصلاحی کوششوں کی ناکامی کے بعد فسخ وتفریق کردیتے ہیں، مندرجہ ذیل سطور میں خلع کی بابت قدرے تفصیل سے قلم اٹھایا جارہا ہے، کیوں کہ دور حاضر میں چڑھتے مزاج اور لحہ لحہ تغیر پذیر طبیعت نیز سوسائٹی وماحول کے پراگندہ رجحان نے عدم موافقت وناچاقی کی نئی نئی راہیں کھول دی ہیں حتی کہ اکثر جوڑے پریشان اور ایک دوسرے سے شاکی ہی نہیں قابل نفریں حد تک متنفر نظر آتے ہیں، ضرورت ہے کہ معاشرے کی اس بگڑی ہوئی صورت حال کا شریعت کی روشنی میں جائزہ لے کر حل تلاش کیا جائے۔

## خلع کی تعریف:

لفظ خلع، خلع النعل سے مشتق ہے، جس کا معنی لغت میں نکالنا ہے، شریعت میں بیوی کو لباس سے تعبیر کیا گیا ہے خلع میں بیوی کو الگ کرنا ہوتا ہے اسی مناسبت سے اس کا لغوی معنی نزع اور ازالہ کیا جاتا ہے۔

فقہاء کے یہاں اس کی تعریف چند متقارب الفاظ میں کی گئی ہے۔

درمختار میں ہے: ''هو لغة: الإزالة، وشرعاً إزالة ملك النكاح المتوقفة على قبولها بلفظ الخلع أو ما في معناه'' (درمختار مع الرد: ۵: ۸۳-۸۷، باب الخلع، مطبوعہ: مکتبہ زکریا دیوبند ۱۴۱۷ھ) (لغت میں اس کے معنی ازالہ کے ہیں، شرعاً ملک نکاح کو لفظ خلع یا اس کے ہم معنی الفاظ سے اس طرح زائل کرنا کہ جو عورت کے قبول پر موقوف ہو)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ''الخلع: إزلة ملك النكاح ببدل بلفظ الخلع كذا في فتح القدير وقد يصح بلفظ البيع والشراء'' (هنديه: ۱.۴۸۸، الباب الثامن في الخلع وما في حكمه: مطبوعه: بيروت)۔ (خلع کسی عوض کے بدلہ ملک نکاح کو لفظ خلع سے ختم کرنا ہے، ایسا ہی فتح القدیر میں ہے، نیز لفظ بیع وشراء سے بھی صحیح ہوتا ہے)۔

دونوں تعریف قریب قریب ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ خلع نکاح صحیح کے بعد متحقق ہوگا، نکاح فاسد جس میں ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے، اس کے بعد خلع نہیں ہوسکتا، اسی طرح طلاق بائن کے بعد ملکیت باقی نہیں رہتی، اس لیے اس کے بعد بھی خلع کا تحقق نہیں ہوگا، ایسا ہی معاذ اللہ۔ میاں بیوی میں سے کسی سے بھی ارتداد کا صدور ہوجائے تو بھی خلع نہیں ہوگا کیوں کہ ارتداد کی صورت میں خود بخود ملکیت زائل ہوتی، زائل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اسی طرح خلع میں بدل کا ذکر ضروری ہے جو عورت پر واجب ہوتا ہے، اسی لیے قبول کرنے کا حق بھی عورت ہی کو ہوتا ہے۔ بغیر اسکے قبول کیے ہوئے بدل لازم نہیں ہوگا، لہٰذا بدل کا ذکر اگر نہ کیا جائے تو خلع کے احکام نافذ نہیں ہوں گے، صرف طلاق بائن ہوجائے گی۔

[1] استاذ حدیث مدرسہ حسینیہ کایم کلم، کیرلا، ہند

اسی طرح لفظ خلع یا اس کے ہم معنی لفظ مباراۃ، یا بیع وشراء وغیرہ ہونا چاہئے، لہٰذا لفظ طلاق استعمال کیا گیا تو خلع کے احکام نفقہ سابقہ، ومہر وغیرہ کا مسقوط نہیں ہوگا۔

ظاہر ہے کہ اس تعریف میں خلع کی ایک خاص نوع کا لحاظ رکھا گیا ہے جس میں احکام خلع کا نفاذ ہو سکے، ورنہ خلع بغیر مال بھی متحقق ہوجاتا ہے جس میں عورت کا قبول کرنا ضروری نہیں، اسی طرح ایسی طلاق جو مال کے بالمقابل ہو اس میں بھی عورت کا قبول کرنا ضروری ہے، تو نہ تو بدل، خلع کے ساتھ خاص ہے اور نہ ہی خلع میں بدل کا ذکر ضروری ہے، یہی وجہ ہے علامہ شامی تعریف کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: ''وبه ظهر أنه لا فرق عند ذكر المال بين خلعتك وخالعتك وأنه ليس كل ما توقف على قبولها يسمى خلعاً. ولا كل ما كان بلفظ الخلع يتوقف على القبول ويسقط الحقوق'' (رد المحتار: ۵/۸۶ باب الخلع، مطبوعہ: زکریا دیوبند ۱۴۱۷ھ)۔ (اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ مال کا تذکرہ ہوجانے کے وقت خلعتک اور خالعتک کے مابین کوئی فرق نہیں، نیز ایسا نہیں ہے کہ جو بھی، عورت کے قبول پر موقوف ہو اس کو ہی خلع کہا جائے گا، اور نہ ایسا ہے کہ جو بھی لفظ خلع سے ہو وہ قبول پر موقوف ہو کر مسقط حقوق ہوگا)۔

پھر آگے خلع کی مکمل چوبیس قسم میں سے ہر قسم کا تفصیلی حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''فإن كان البدل مسكوتاً عنه ففيه روايتان: أصحهما براءة كل منهما عن المهر لا غير فلا ترد ماقبضت ولا يطالب هو بما بقي ... وإن كان منفياً كقوله: اخلعي نفسك مني بغير شئ ففعلت وقبل الزوج صح بغير شي لأنه صريح في عدم المال ووقع البائن فلا يبرأ كل منهما عن حق صاحبه'' (رد المحتار: ۵/۱۰۵، باب الخلع، مطلب: حاصل مسائل الخلع والمبارأة على اربعة وعشرين وجهاً، مطبوعة: زكريا ديوبند ۱۴۱۷ھ)۔ (اگر بدل مسکوت عنہ ہو تو اس میں دو روایت ہے: اصح یہی ہے کہ دونوں صرف مہر سے بری ہوں گے، لہٰذا جتنے پر عورت نے قبضہ کرلیا ہے وہ واپس نہیں کرے گی، اور جو باقی ہے شوہر سے اس کا مطالبہ نہیں ہوگا، اور اگر بدل کی نفی کردی گئی مثلاً شوہر نے کہا: مجھ سے بغیر عوض خلع کرلو' عورت نے کرلیا، شوہر نے قبول کرلیا تو یہ صحیح ہے، اور کچھ واجب نہیں، اس لیے کہ یہ صورت مال کے عدم وجوب، اور طلاق بائن کے وقوع کے لیے صریح ہے، لہٰذا دونوں، دوسرے کے حق سے بری نہیں ہوں گے)۔

لیکن تاتارخانیہ وغیرہ میں ہے کہ لفظ خلع مطلقاً عوض پر محمول ہوتا ہے۔

''وفي التاترخانية وغيرها: مطلق لفظ الخلع محمول على الطلاق بعوض'' (رد المحتار: ۵/۸۶، باب الخلع، مطبوعة: زكريا ديوبند ۱۴۱۷ھ)۔

اسی طرح خانیہ میں خلع کو، لفظ خلع کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، اس کے ہم معنی الفاظ بیع وشراء سے منعقد نہیں ہوگا، چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں: ''خلافاً للخانية حيث قال: إن الصحيح أن الخلع بلفظ البيع والشراء لايوجب البراءة عن المهر إلا بذكره'' (رد المحتار: ۵/۸۰ باب الخلع، مطبوعه: زكريا ديوبند ۱۴۱۷ھ)۔

## عورت پر بدل کب لازم ہوتا ہے:

اگر مال کو صراحتاً مشروط کردیا تب تو بدل کا لازم ہونا ظاہر ہے، مثلاً شوہر کہتا ہے: ''خالعتك على ألف روبية'' ایک ہزار کے عوض خلع کررہا ہوں، اور بیوی قبول کرلے تو ایسی صورت میں طلاق بائن بھی واقع ہوگی اور ایک ہزار روپے بھی واجب ہوں گے۔

لیکن مال اگر صراحتاً مذکور نہیں تو بھی اس صورت میں مال لازم ہوجائے گا جبکہ ایسا لفظ استعمال کرے جو مال کو متضمن ہو جیسے مفاعلت کا لفظ استعمال کیا یا عورت کو خلع کرلینے کا حکم دیا، (خالعتك، اختلعي، اخلعي کہا)۔

ہاں اگر خلعت کہتا ہے تو طلاق واقع ہوگی، لیکن کچھ واجب نہیں ہوگا (الفقہ علی المذاہب الأربعۃ: ۴/۳۸۹، کتاب الطلاق، مباحث الخلع، مطبوعہ: دار الفکر)۔

## خلع اور اس کے ہم معنی الفاظ:

لفظ خلع، طلاق کے معنی میں کنایہ ہے، لہٰذا اس کے لیے وہی شرائط ہوں جو الفاظ کنائی کے لیے ہیں، چنانچہ اگر مال مذکور ہے تو نیت کی حاجت نہیں، اگر مال مذکور نہیں، اسی طرح مذاکرہ طلاق کی کیفیت نہیں تو لفظ اگر عرف میں طلاق کے لیے مستعمل ہے تو طلاق واقع ہوگی، ورنہ بغیر نیت طلاق، وقوع طلاق بھی نہیں ہوگا

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ: ۴/۳۸۹، کتاب الطلاق، مباحث الخلع، مطبوعہ: دارالفکر)۔

نیز حنفیہ کے نزدیک الفاظ خلع سات عدد ہیں: (۱) خلع (۲) مباراۃ (۳) مباینت (۴) مفارقت (۵) الطلاق علی المال (۶) بیع سے مشتق الفاظ (۷) شراء سے مشتق الفاظ۔

سب کے احکام میں تھوڑا تھوڑا فرق بھی ہے جو کتب فقہ میں مذکور ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ: ۴/۳۸۹-۳۹۱، کتاب الطلاق، مباحث الخلع، دارالفکر)۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عام طور پر خلع کی جو تعریف کی جاتی ہے وہ صرف ایک نوع کی تعریف ہے، ورنہ عرف شرع میں خلع کے اطلاق میں عموم ہے، اس کی تائید علامہ کاسانی کی عبارت سے بھی ہوتی ہے۔

"خلع کی دو قسم ہیں، خلع بالعوض، خلع بغیر العوض، خلع بغیر العوض جیسے کہ اپنی بیوی سے خالعتک کہے اور عوض کا ذکر نہ کرے پس اگر اس سے اس نے طلاق کی نیت کی ہو تو طلاق واقع ہوگی ورنہ نہیں، اس لیے کہ خلع حنفیہ کے نزدیک طلاق کنائی کے الفاظ میں سے ہے، اگر تین کی نیت ہو تو احناف کے تینوں ائمہ کے نزدیک ایک ہی واقع ہوگی" (بدائع الصنائع: ۳/۲۲۶، کتاب الطلاق، فصل فی حکم الخلع، مطبوعہ: زکریا ۱۴۱۹ھ)۔

بہر حال دوسری صورت تو یہ ہے کہ عوض کے ساتھ مقرون ہو" ()۔

اسی طرح علامہ کاسانی ہی ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں: "إن صحة الخلع لاتقف علی وجوب العوض. فإن الخلع یصح علی مالایصح عوضاً کالمیتة والدم والخنزیر والخمر ونحو ذلك" (بدائع: ۳.۲۲۱. کتاب الطلاق. رکن الخلع. مطبوعه. زکریا دیوبند ۱۴۱۹ھ)۔ (خلع کی صحت عوض کے وجوب پر موقوف نہیں ہے، اس لیے کہ خلع ایسی چیز پر بھی صحیح ہوتا ہے جس کا عوض بننا صحیح نہیں جیسے کہ مردار، خون، خنزیر وغیرہ)۔

"فأما الخلع فالعوض فیه غیر لازم بل هو مشروع بعوض وبغیر عوض. فلم یکن من ضرورة صحته لزوم العوض" (بدائع: ۳.۲۲۳. کتاب الطلاق. أما شرط وجوب العوض. مطبوعہ زکریا دیوبند ۱۴۱۹ھ)۔ (بہر حال خلع میں عوض لازم نہیں ہے، بلکہ دونوں طرح بالعوض وبغیر العوض مشروع ہے، لہٰذا لزوم عوض، خلع کے صحیح ہونے کی ضرورت میں سے نہیں)۔

## مالکیہ کے نزدیک خلع:

اب ذرا دوسرے مکاتب فکر کا بھی سرسری جائزہ لیتے چلیں کہ ان کے خیال میں خلع کیا ہے، اور اس کے لیے الفاظ کیا استعمال ہوتے ہیں۔

مالکیہ نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: "هو الطلاق بعوض" (الفقه علی المذاهب الأربعة: ۴.۳۹۱. کتاب الطلاق. مباحث الخلع. دار الفکر)۔

خلع عوض کے مقابلہ طلاق کا نام ہے، لہٰذا ان کے نزدیک بھی طلاق کی جملہ اقسام صریح وکنایہ وغیرہ اس میں داخل ہیں۔

نیز مالکیہ کے نزدیک الفاظ خلع چار ہیں: (۱) خلع، (۲) فدیہ، (۳) صلح، (۴) مباراۃ۔ نیز وہ تمام الفاظ جو طلاق کے مقابلہ عورت کی جانب سے عوض دینے پر دلالت کریں (الموسوعۃ الفقہیۃ: ۱۹/۲۵۸، مادۃ خلع، مطبوعہ: کویت)۔

## شافعیہ کی کتابوں میں خلع:

کتب شافعیہ میں خلع کی تعریف وتشریح کچھ اس طرح کی گئی ہے: "هو فرقة بعوض مقصود بلفظ طلاق أو خلع" (تحفة المنحاج بشرح المنهاج: ۷.۵۲۵. کتاب الخلع. مطبوعه: دار الفکر ۱۴۱۸ھ)۔ (خلع، لفظ طلاق یا خلع کے ذریعہ عوض مقصودہ کے بالمقابل تفریق کا نام ہے)۔

علامہ محلی لفظ طلاق کی تشریح اپنی کتاب کنز الراغبین میں اس طرح کرتے ہیں:

"فالمراد بلفظ طلاق لفظ من ألفاظه صریحاً کان أو کنایة ولفظ الخلع من ذلك" (کنز الراغبین شرح منهاج الطالبین: ۳.۳۰۷. کتاب الخلع. مطبوعه: دار الفکر)۔ (لفظ طلاق سے مراد طلاق کے الفاظ ہیں خواہ وہ صریحی ہوں یا کنائی ملفظ خلع اسی قسم میں سے ہے)۔

"شافعیہ فرماتے ہیں کہ عوض ہونے میں یہ شرط ہے کہ وہ مقصود ہو یعنی اس کی کوئی قیمت ہو، وہ شوہر کی جانب سے عائد ہو، وہ معلوم ہو، وہ مقدور والتسلیم ہو

اور وہ حلال غیر فاسد ہو" (الفقہ علی المذاہب الأربعۃ: ۴/ ۴۱۳، کتاب الطلاق، شروط عوض الخلع، مطبوعہ: دار الفکر)۔

"خلاصہ یہ کہ عوض جبکہ مال مقصود ہو تو خلع صحیح اور مال واجب ہے، اگر عوض کی کوئی قیمت نہ ہو تو طلاق رجعی واقع ہوگی، اور اگر عوض مال مقصود ہو لیکن (شریعت کی نگاہ میں) فاسد ہو جیسے کہ شراب، خنزیر تو طلاق بائن بعوض مہر مثل واقع ہوگی" (الفقہ علی المذاہب الأربعۃ: ۴/ ۴۱۴، کتاب الطلاق، شروط عوض الخلع، دار الفکر)۔

علامہ سیوطی رقم طراز ہیں: "خلع مطلق جو بغیر مال کے ذکر کے ہو کیا ثبوت مال کا تقاضا کرتا ہے؟ دو قول میں سے اصح امام الحرمین، امام غزالی، رویانی کے نزدیک یہ ہے کہ ہاں، عرف کی وجہ سے، دوسرا قول ہے کہ نہیں، اس لیے کہ التزام نہیں ہے" (الأشباہ والنظائر: ۲/ ۵، مطبوعہ: مکتبہ باز ۱۴۱۶ھ)۔

حاصل یہ کہ شافعیہ کے نزدیک بھی عوض کا لزوم حتمی اور متفق علیہ قول نہیں، اسی طرح مالکیہ کے نزدیک بھی خلع بغیر عوض ہو سکتا ہے، ہاں حنابلہ کے یہاں عوض، خلع میں رکن ہے، بغیر اس کے خلع کا تحقق نہیں ہوگا (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۹/ ۷۰۰۸، کتاب الطلاق، باب الخلع، مطبوعہ: دار الفکر)۔

## کیا خلع عورت کا شخصی حق ہے:

خلع کا معاملہ طلاق سے جداگانہ ہے، طلاق تو مرد کا خصوصی حق ہے جس کی تنفیذ میں وہ بااختیار ہے چاہے تو خود کرے یا اس کا قائم مقام وکیل وقاضی کرے، لیکن خلع میں ایک جانب سے یمین ہے تو دوسری جانب سے معاوضہ ہے یا بالکلیہ یہ معاملہ معاوضہ ہے جیسا کہ دوسرے فقہاء کا نظریہ ہے، نیز عقد معاوضہ میں طرفین کی رضا ضروری ہوتی ہے، بغیر تراضی طرفین معاملہ فسخ نہیں ہو سکتا ہے، تقریباً تمام ہی علماء امت اور اساطین ملت اس پر متفق ہیں، ہاں اس حد تک تو عورت کا حق تسلیم کیا گیا ہے کہ اگر وہ نہ چاہے تو خلع کا معاملہ طے نہ پائے، اس سے زیادہ حق دینا کہ جس میں وہ بااختیار ہو جائے صحیح نہیں ہے۔

بعض حضرات کی یہ نکتہ آفرینی کہ عورت بالکل مختار ہے غالباً اس کا منشأ آیت کریمہ کی تفسیر میں اختلاف ہے۔

"فإن خفتم ألا يقيما حدود الله" میں خطاب حکام کو ہے جیسا کہ روح المعانی وغیرہ تفسیری کتب سے معلوم ہو رہا ہے، اس لحاظ سے مفہوم یہ ہوگا کہ حکام شوہر کی مرضی معلوم کیے بغیر بھی محض عورت کے مطالبۂ خلع پر، خلع کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

لیکن جمہور علماء فرماتے ہیں کہ اولاً اس آیت میں خطاب حکام کو ہے یہ متعین نہیں، بلکہ خطاب اہل خاندان کو ہے تاکہ معاملہ گھر میں نمٹ جائے، عدالت تک نہ پہنچ سکے، بلکہ علامہ جصاص کا کہنا ہے کہ عدالت کو خلع کا اختیار ہے ہی نہیں، عدالت کا کام فسخ نکاح کرنا ہے نہ کہ خلع، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت خلع: "ولا يحل لكم أن تأخذوا مما آتيتموهن شيئاً إلا أن يخافا ألا يقيما حدود الله فإن خفتم ألا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به" میں دو جگہ ضمیر مرد وزن کی طرف لوٹائی گئی ہے، ایک تو "أن يخافا ألا يقيما" میں دوسرے "فلا جناح عليهما" میں، جو واضح دلیل ہے کہ دونوں کی رضا ضروری ہے۔

نیز قرآن نے فدیہ کا لفظ استعمال کیا ہے جو عام طور پر جنگی قیدی سے لیے ہوئے مال کو کہا جاتا ہے، ظاہر ہے فدیہ بھی بغیر اس کی رضا کے تھوپا نہیں جا سکتا۔

ہاں حضرت ثابت بن قیس کے واقعہ سے ممکن ہے استدلال ہو۔

"حضرت ثابت بن قیس کی اہلیہ دربار رسالت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے ثابت کے دین اور اخلاق سے نفرت نہیں لیکن (اسلام میں) کفر سے ڈرتی ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اس کو اس کا باغ واپس کر دو گی، تو اس نے جواب دیا: ہاں، چنانچہ اس خاتون نے ان کو باغ لوٹا دیا، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا تو انہوں نے ان کو الگ کر دیا" (بخاری شریف: ۲/ ۷۹۵ کتاب الطلاق، باب الخلع وکیف الطلاق فیہ)۔

بعض روایت میں اس عورت کا نام جمیلہ بنت ابی بن سلول اور بعض میں حبیبہ بنت سہل آیا ہے، ممکن ہے دونوں ان کی بیویاں ہوں، اور دونوں نے خلع کیا ہو۔

اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر ثابت کی مرضی معلوم کیے ہوئے حکم دیا کہ باغ لوٹا دو اور تم طلاق دے دو۔

لیکن نسائی کی روایت میں ہے: "تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا اور کہا کہ کیا تم وہ حق جو تم پر ہے لے کر اس کا راستہ چھوڑ سکتے ہو، انہوں نے کہا: ہاں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاتون کو حکم دیا کہ ایک حیض تک (بطور) عدت انتظار کرے" (نسائی: ۲/ ۹۵، کتاب العدۃ، عدۃ المختلعۃ)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شوہر کی مرضی کے بعد ہی خلع ہوا۔

علامہ وہبہ زحیلی لکھتے ہیں: ''جميع الفقهاء يرون أنه لايجبر الرجل على قبول الخلع فلا بد فيه من التراضي بين الطرفين'' (التفسير المنير: ١٥/ ٧١٥، مطبوعه، دار الفكر دمشق ١٤٢٤ھ)۔ (تمام فقہاء کی رائے ہے کہ مرد کو خلع قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے، لہٰذا مابین کی رضامندی ضروری ہے)۔

علامہ کاسانی رقم طراز ہیں: ''یہ بات معلوم ہے کہ عورت طلاق کی مالک نہیں، بلکہ طلاق شوہر کی ملک ہے، نہ کہ بیوی کی، اس لیے شوہر کے قول خالعتک سے ہی وقوع میں آئے گا''۔

اسی طرح فقہائے شافعیہ کی مایہ ناز کتاب منہاج الطالبین نیز اس کی شروح میں خلع کے لیے زوج کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ (دیکھئے: تحفۃ المحتاج بشرح المنہاج: ۷/ ۵۳۵، کتاب الخلع، مطبوعہ: دار الفکر ۱۴۱۸ھ، کنز الراغبین شرح منہاج الطالبین للمحلی: ۳/ ۳۰۷، کتاب الخلع مطبوعہ دار الفکر)۔

الفقہ المنہجی میں مزید تصریح موجود ہے: ''هو الطلاق الذى يقع برغبة من الزوجة وإصرار منها على ذلك. وقد شرع لذلك سبيل الخلع. فالخلع إذا قسم من الطلاق وهو كل فرقة جرت على عوض تدفعه الزوجة للزوج'' (الفقه المنهجي على مذهب الإمام الشافعي: ٢/ ١٢٠، دار القلم، دمشق ١٤٢٨ھ)۔ (خلع طلاق ہی ہے جو بیوی کی خواہش اور اصرار سے وقوع پذیر ہوتا ہے، شریعت نے خلع کا راستہ تجویز کیا ہے، لہٰذا خلع، طلاق کی ایک نوع ہے، اور وہ ایسی فرقت ہے جو بعوض، بیوی کے اصرار سے ہوتی ہے)۔

قرآن کریم کا طرز بھی مشیر ہے کہ مرد کی رضا کے بغیر خلع نہیں ہوسکتا ہے، اس لیے کہ "الطلاق مرتان" (اولاً دو طلاق) اور "فان طلقها" (تیسری طلاق) کے مابین خلع کا حکم بیان کیا گیا ہے، جو عکاس ہے کہ خلع طلاق ہی کی ایک نوع ہے۔

لہٰذا یہ نظریہ اختیار کرنا کہ عورت کو خلع کا ایسا ہی حق ہے جیسا کہ مرد کو طلاق کا، سراسر غلط ہے، ہاں! یوں کہا جائے کہ ایک گونہ اس کو بھی اختیار ہے بایں طور کہ مال دے کر (شوہر کو راضی کر کے) طلاق لے لیے، شوہر بغیر اس کی مرضی مال لازم نہیں کرسکتا، واللہ اعلم۔

مغنی ابن قدامہ میں جمہور امت کا مسلک نقل کیا گیا ہے کہ خلع کا معاملہ عقد بیع و نکاح کے بہت قریب ہے، جیسے: ''خلع کے لیے حاکم کی ضرورت نہیں، امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے، چنانچہ کہا ہے کہ خلع بغیر سلطان جائز ہے، امام بخاری نے یہی مذہب حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کا نقل کیا ہے، امام شریح، امام زہری، امام شافعی، امام مالک، امام اسحاق اور اہل رائے کی یہی رائے ہے، حسن بصری، ابن سیرین سے ایک روایت ہے کہ خلع صرف حاکم کے پاس ہوسکتا ہے، ہماری دلیل حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کا قول ہے، نیز یہ کہ خلع عقد معاوضہ ہے، لہٰذا اس میں سلطان کی ضرورت نہیں جیسے بیع و نکاح، علاوہ ازیں خلع باہمی رضامندی سے عقد نکاح کو ختم کرنا ہے، لہٰذا یہ اقالہ کے مشابہ ہوا'' (مغنی ابن قدامہ: ۷/ ۵۲، مطبوعہ: دار المنار ۱۳۶۷ھ)۔

## بلا کسی معقول وجہ کے خلع:

میاں بیوی کے مابین نااتفاقی اگر اس حد تک ہوجائے کہ زندگی کا سکون باقی نہ رہے، نکاح کو باقی رکھنے میں سکون کے بجائے، نکاح ختم کرنے میں سکون محسوس ہو تو ایسے نازک حالات میں بالخصوص جبکہ ناپسندیدگی کے وجوہات پر کوئی معقول دلیل بھی نہ ہو تو جمہور ائمہ گلوخلاصی کی شکل صرف خلع ہی کو قرار دیتے ہیں، شوہر کو چاہئے کہ کچھ لے کر، اور بیوی کو چاہئے کہ کچھ دے کر معاملہ صاف کرلے، حدیث میں جمیلہ بنت ابی کا جو قصہ ذکر کیا گیا ہے، حضرت ثابت سے ناپسندیدگی کی وجہ بعض روایت کے مطابق ان کی بدصورتی تھی، ظاہر ہے کہ ایک صورت ایک عورت کو ناپسند ہوتی ہے جبکہ دوسری عورت کی نگاہ میں بہتر اور پسندیدہ ہوتی ہے، اس پر کوئی بینہ قائم کرنا مشکل ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ خلع کرلو۔

علامہ شعرانی لکھتے ہیں: ''تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ عورت اپنے شوہر کی بدصورتی یا سوء معاشرت کی بنا پر ناپسند کرتی ہے تو اس کے لیے جائز کہ شوہر سے بالعوض خلع کا معاملہ کرلے، اور اگر ناپسندیدگی کی کوئی وجہ نہ ہو اور میاں، بیوی خلع پر بلاوجہ راضی ہوجائیں تب بھی جائز ہے، مکروہ نہیں، البتہ اس میں زہری، عطاء اور داؤد رحمہم اللہ اختلاف کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ایسی حالت میں خلع صحیح نہیں، اس لیے کہ وہ عبث ہے، اور عبث غیر مشروع ہے'' (المیزان الکبری: ۲/ ۱۱۹، دار احیاء الکتب المصری)۔

الموسوعۃ الفقہیۃ میں ہے: ''الخلع جائز في الجملة سواء في حالة الوفاق والشقاق خلافاً لابن المنذر'' (الموسوعة: ١٩/ ٢٢٠، مادہ: خلع، مطبوعه: كويت)۔ (خلع فی الجملہ جائز ہے خواہ موافقت ہو یا عدم موافقت ابن منذر کو اختلاف ہے)۔

حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ اسی طرح کے ایک سوال میں فرماتے ہیں: ''اگر وہ اپنی خوشی اور رضامندی سے طلاق دینے کے لیے تیار نہ ہو تو خلع کی صورت اختیار کی جائے، اگر خدانخواستہ شوہر نہ طلاق دینے پر آمادہ ہو نہ خلع کے لیے تیار ہو، اور عورت کو پریشان کرنے کے لیے معلق رکھنا چاہتا ہو تو ایسے ظالم شخص سے جبراً و کرہاً بھی طلاق حاصل کی جاسکتی ہے۔ دو شرعی گواہوں کی موجودگی میں زبانی طلاق بائنہ کہلوائی جائے تو اس طرح عمل کرنے سے بھی عورت کو شوہر سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا اگر مذکورہ بالا صورتوں میں سے کسی صورت پر بھی عمل نہ ہو سکے تو عورت اپنا معاملہ شرعی پنچایت میں پیش کر کے تفریق کا مطالبہ کرے'' (فتاوی رحیمیہ ۸/ ۴۱۰، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور)۔

## شقاق سے مراد:

شریعت کی نگاہ میں طلاق کی طرح خلع بھی کوئی پسندیدہ شیٔ نہیں ہے بلکہ خواہ مخواہ طلاق کا اور خلع کا مطالبہ کرنے والیوں کو منافقات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لیے حتی الامکان نباہ کی کوشش کرنی چاہئے، مجبوری کی حالت میں خلع کا طریقہ اپنانا چاہئے، مجبوری کی حالت کیا ہوتی ہے، شریعت کی زبان میں "شقاق" سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا تذکرہ آیت خلع میں اس طرح ہے: "فإن خفتم شقاق بینهما فابعثوا حكماً من أهله وحكماً من أهلها"، اسی کو دوسری جگہ "إن خافا أن لا يقيما حدود الله" سے تو کبھی نشوز واعراض سے تعبیر کیا گیا ہے، مختلف مفسرین نے اپنے اپنے الفاظ میں تھوڑے تھوڑے تعبیری فرق کے ساتھ تفسیر کی ہے جس کا ماحصل ایک ہی ہے کہ مابین میں ایسی نفرت اور ناچاقی کی صورت حال پیدا ہو جائے کہ دونوں پر عائد ادائے حقوق (ادائے نفقہ و سکنی، نیز حسن معاشرت اور عورت کے ذمہ عائد فریضۂ اطاعت وغیرہ) میں کوتاہی ہونے لگے، خواہ اس کی بنا ظلم وزیادتی ہو، یا طبعی ومزاجی ناہمواری ہو۔

علامہ قرطبی رقم طراز ہیں: ''نشوز یعنی عصیان، نشز سے ماخوذ ہے، نشز کے معنی زمین کا وہ حصہ ہے جو سطح زمین سے بلند ہو، پس معنی ہوا: تم ان کی نافرمانی اور واجب اطاعت سے اظہار بڑائی سے ڈرتے ہو، ابو منصور لغوی کہتے ہیں: نشوز زوجین میں سے ہر ایک کا دوسرے کو ناپسند کرنا ہے، کہا جاتا ہے: "نشزت المرأة تنشز ناشز (بغیرها)" بری معاشرت والی'' (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۳/ ۱۲۲، مطبوعہ: دار إحیاء التراث العربی ۱۴۲۲ھ)۔

موطا مالک کی مشہور ومعروف شرح التمہید میں نشوز کی تفسیر ان الفاظ میں کی گئی ہے: ''وكيف يكون النشوز؟ قال: أن تظهر له البغضاء وتسيء عشرته وتظهر له الكراهية وتعصى أمره فإذا فعلت ذلك فقد حل له أن يقبل منها ما أعطاها'' (التمهيد: ۹/ ۱۱۳، حديث حاد وأربعون يحيى بن سعيد. مطبوعه: دار إحياء التراث العربي ۱۴۲۰ھ)۔ (نشوز کا تحقق کس طرح ہوگا، تو فرمایا: عورت، شوہر کے لیے بغض وعداوت کا اظہار کرے، حسن معاشرت باقی نہ رکھے، نیز ناپسندیدگی کا اظہار اور شوہر کے امر کی مخالفت کرے، پس اگر وہ ایسا کرے تو مرد کے لیے جائز ہے کہ جو کچھ مہر اس نے دیا ہے اس کو قبول کرلے)۔

''وللشقاق تاويلان: أحدهما أن كل واحد منهما يفعل مايشق على صاحبه. الثاني: أن كل واحد منهما صار في شق بالعداوة والمباينة'' (التفسير الكبير للرازي: ۵/ ۹۵، سورة النساء. مطبوعه: دار الفكر)۔ (شقاق کی دو تفسیر ہے: (۱) ہر دو ایسا کام کرے جو دوسرے پر شاق ہو، (۲) دونوں ایک دوسرے سے عداوت واختلاف رکھے)۔

حضرت امام شافعی بھی اپنی مایہ ناز تصنیف کتاب الام میں رقم طراز ہیں: ''زوجین کے مابین شقاق کا خوف یہ ہے کہ ہر دو، دوسرے کے خلاف جس حق کا دعوی کرے، اور ایسی چیز دینے پر راضی نہ ہو جس سے دوسرا خوش ہو، نیز افتراق وشقاق کے چھوڑنے سے باز نہ آئے'' (کتاب الام: ۵/ ۱۷۷، کتاب الخلع، نشوز المرأة على الزوج، مطبوعہ: بمبئی)۔

روح المعانی میں شقاق کی تفسیر خلاف اور عداوت سے کی گئی ہے (روح المعانی: ۵/ ۲۶، دار الباز، مکہ)۔

اسی طرح قاضی ثناء اللہ صاحب نے بھی عداوت واختلاف سے ہی تفسیر کی ہے (تفسیر مظہری: ۲/ ۱۳ ۳، مطبوعہ زکریا دیوبند)۔

## شقاق کی وجہ سے خلع کیا قاضی کے اختیار میں ہے:

خلع کے سلسلے میں حنفیہ کا اصل موقف یہی ہے کہ میاں وبیوی کی رضامندی سے ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گا، اس لیے کہ خلع، طلاق کی نوع ہے، اور عورت کی جانب سے معاوضہ ہے، لہذا دونوں کی رضا ضروری ہے، غالباً امام شافعی کا مسلک بھی یہی ہے، اسی لیے کتاب الام میں فرماتے ہیں:

''خلع طلاق ہے، لہذا کسی کو حق نہیں کہ دوسرے کی طرف سے طلاق دے، باپ ہو یا آقا، ولی ہو یا سلطان، انسان خود طلاق دے گا، یا حاکم طلاق دے گا، جبکہ حقوق ادا

کرنے سے انکار کردے، سلطان کو طلاق کا حق ہے، لیکن خلع میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی ہے" (کتاب الام: ۵/۱۸۲، کتاب الخلع، ما یقع بالخلع من الطلاق، مطبوعہ: بمبئی)۔

اسی طرح حکم کو بھی تفریق کا اختیار نہیں، امام شافعی نے اس پر تفصیل سے کتاب الام میں روشنی ڈالی ہے، اس سلسلے میں انہوں نے حضرت علی و حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے دور خلافت کے واقعات بھی لکھے ہیں۔

**حضرت علیؓ کے دور کا واقعہ:**...... اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک جوڑا اپنے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حضرت علیؓ کی خدمت میں فیصلہ کے لیے آیا، حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ دونوں جانب سے ایک ایک حکم منتخب کرلیا جائے، پھر دونوں حکم کو مخاطب کرکے فرمایا: تم کو اپنی ذمہ داری معلوم ہے! تمہاری ذمہ داری یہ کہ مناسب اگر سمجھو تو دونوں میں علیحدگی بھی کرا سکتے ہو، عورت نے کہا کہ اللہ کی کتاب پر راضی ہوں چاہے فیصلہ میرے حق میں ہو یا میرے خلاف، شوہر نے کہا کہ جہاں تک فرقت کی بات ہے تو میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں، حضرت علی نے فرمایا: "تم نے جھوٹ کہا: بخدا تم بھی جب تک اس عورت کی طرح اقرار نہ کرلو یہاں سے جا نہیں سکتے ہو"۔

## حضرت عثمانؓ کے دور خلافت کا واقعہ:

عقیل بن ابی طالب کا نکاح فاطمہ بنت عتبہ سے ہوا، لیکن دونوں میں آن بن محض اس وجہ سے ہوگئی کہ فاطمہ پوچھتی: عتبہ وشیبہ کا کیا حال ہے، مسلسل اصرار کے بعد عقیل نے حقیقت حال واضح کردی کہ دونوں جہنم میں ہیں، بس یہیں سے اختلاف شروع ہوا، بالآخر فاطمہ حضرت عثمان کے پاس پہنچی اور اس کا ذکر کیا تو حضرت عثمان نے ابن عباس اور معاویہ رضی اللہ عنہما کو بھیجا کہ معاملہ کو سلجھائیں، حضرت ابن عباس نے فرمایا: لأفرقن بينهما میں دونوں کے مابین ضرور تفریق کروں گا، جبکہ حضرت معاویہ نے فرمایا کہ میں عبد مناف کے دو شخصوں کے مابین تفریق نہیں کروں گا، جب دونوں حکم، عقیل و فاطمہ کے پاس پہنچے تو دونوں نے اس میں صلح صفائی کرلی۔

حضرت امام شافعی ان دونوں واقعات کو لکھ کر فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک حضرت علیؓ کا قصہ ثابت ہے، پھر فرماتے ہیں: "اگر حاکم کے لیے بغیر شوہر کی توکیل کے حکمین کو تفریق کے لیے بھیجنا جائز ہوتا تو حضرت علی کو ضرورت نہیں تھی کہ ان دونوں (کے خاندان) کو کہتے کہ تم لوگ بھیجو، حضرت علیؓ ہی بھیج دیتے اور شوہر سے کہہ دیتے کہ اگر دونوں تفریق کو مناسب سمجھیں گے تو تیرے اوپر بغیر تیرے اذن کے نافذ کردیں گے" (کتاب الام: ۵/۱۷۷-۱۷۸، کتاب الخلع، باب الحکمین، مطبوعہ: بمبئی)۔

صاحب الفقہ علی المذاہب الاربعہ حنفیہ وشافعیہ کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "حنفیہ وشافعیہ نے کہا کہ حکمین کو بیوی پر طلاق واقع کرنے کا حق نہیں ہے، اس لیے کہ طلاق کی ولایت شوہر یا اس کے قائم مقام کے ساتھ مختص ہے، نیز خلع میں مال بیوی کے حقوق میں سے ہے، لہٰذا شوہر جب حکمین کو طلاق میں اپنا نائب بنادے تو ان کے لیے بھی یہ جائز ہوگا" (الفقہ علی المذاہب الأربعۃ: ۴/۳۹۴، کتاب الطلاق، الخلع جائز أو ممنوع، مطبوعہ: دار الفکر)۔

علامہ عینی کے بیان کے مطابق امام احمد کا مسلک بھی شوافع کی طرح ہے (عمدۃ القاری: ۲۰/۲۶۵، کتاب الطلاق، باب الشقاق وہل یشیر بالخلع عند الضرورۃ)۔

لیکن صاحب الفقہ علی المذاہب الاربعہ نے ان کا مسلک یہ نقل کیا ہے۔

"حنابلہ کا خیال ہے کہ جس طرح خلع شوہر یا اس کے نائب کی جانب سے صحیح ہے ہر ایسے شخص کی طرف سے بھی صحیح ہے جس کو ولایت حاصل ہے، جیسے شقاق کی صورت میں حکم کو، اور ایلاء وعنین ہونے کی صورت میں حاکم کو" (الفقہ علی المذاہب الاربعہ: ۴/۴۰۶، کتاب الطلاق، أرکان الخلع وشروطہ، مطبوعہ: دار الفکر)۔

ہاں امام مالک رحمہ اللہ کے یہاں قاضی، اسی طرح قاضی کی جانب سے مقرر کردہ حکم بھی با اختیار ہے، چاہے تو نکاح کو باقی رکھے اور چاہے تو تفریق کردے، شوہر یا بیوی کی اجازت پر موقوف نہیں (عمدۃ القاری: ۲۰/۲۶۵، کتاب الطلاق، باب الشقاق وہل یشیر بالخلع عند الضرورۃ)۔

## امام مالک علیہ الرحمۃ کے مستدلات:

(۱) قرآن کریم کی آیت: "إن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكماً من أهله وحكماً من أهلها الخ" میں خطاب حکام کو ہے، اگر حکام وقضاۃ کو تفریق کا حق نہ ہوگا تو پھر شقاق کو دور کرنے کی کیا شکل ہوگی، نیز آیت میں صلح کرنے والے کو "حکم" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جو دلالت کرتا ہے کہ وہ فیصلہ کا اختیار رکھتا ہے۔

(۲) حدیث کی کتابوں میں حضرت ثابت کا واقعہ خلع جو جمیلہ بنت ابی سے پیش آیا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باغ لے لینے اور طلاق دینے کا امر فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ بطور قاضی و حکم تھا۔

(۳) حضرت ثابت سے ہی حبیبہ بنت سہل کا قصہ خلع پیش آیا حضرت عائشہؓ سے مروی ہے:

''حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ حبیبہ بنت سہل حضرت ثابت کی زوجیت میں تھی، حضرت ثابت نے ان کو مارا حتی کہ کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی، تو فجر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور شکایت کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت کو بلا کر کہا کہ اس کے مال کا کچھ حصہ لیکر الگ کردو، تو حضرت ثابت نے عرض کیا کہ یا رسول کیا یہ جائز ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! حضرت ثابت نے کہا کہ میں نے اس کو دو باغ مہر میں دیا ہے اور وہ دونوں اس کے پاس موجود ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دونوں کو لیکر تفریق اختیار کرو، چنانچہ انہوں نے کرلیا'' (ابوداؤد: ار ۳۰۳، کتاب الطلاق، باب فی الخلع)۔

اس واقعہ میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر تفریق بحیثیت قاضی تھا۔

(۴) دور عثمانی و دور علی میں جو دونوں واقعے پیش آئے دونوں خلیفہ وقت نے خلع کی بابت فیصلہ فرمایا۔

ان وجوہ کی بنا پر کچھ علماء عصر کی رائے ہے کہ فقہ مالکی راجح ہے، لیکن ترجیح میں مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر راقم کو تردد ہے:

(الف) قرآن نے حکم کا لفظ ضرور استعمال کیا ہے جس کا تقاضا ہے کہ حاکم مذکور با اختیار ہے لیکن دوسری طرف اس کے دائرۂ کار کو اصلاح کی حد تک محدود بھی کردیا گیا ہے، اگر تفریق کا بھی اختیار ہوتا تو اصلاح کے ساتھ مقید کرنے کی وجہ کچھ نہیں رہتی ہے، اس لیے آیت سے استدلال محل نظر ہے۔

(ب) جہاں تک خطاب کا تعلق ہے تو اس میں اختلاف ہے کہ خطاب حکام کو ہے یا اہل خاندان کو، علامہ آلوسی لکھتے ہیں: ''وإن خفتم'' الخطاب كما قال ابن جبير والضحاك وغيرهما للحكام. وقيل لأهل الزوجين. أو للزوجين أنفسهما وروى ذلك عن السدي'' (روح المعانی ۵.۲۶. مکتبہ دار الباز مکہ)۔ (وإن خفتم میں خطاب ابن جبیر اور ضحاک کے مطابق حکام کو ہے، جبکہ دوسرا قول اہل خاندان، اور تیسرا قول سدی سے منقول ہے کہ زوجین کو ہے)۔

حضرت علیؓ کے دور کے قصے سے تائید ہوتی ہے کہ اس کے مخاطب اہل الزوجین ہیں، اس لیے اس واقعہ میں مذکور ہے: ''فأمرهم علي كرم الله وجهه أن يبعثوا رجلاً حكماً من أهله وحكماً من أهلها'' (روح المعانی: ۵.۲۷. بروایت بیہقی وکتاب الام)۔ (حضرت علی نے حکم دیا کہ ایک حکم شوہر کے قبیلے سے اور دوسرا حکم بیوی کے خاندان سے بھیجیں)۔

(ج) حضرت جمیلہ وحبیبہ کے قصے میں یہ کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپیل نہیں کی نہ مشورہ کیا بلکہ طلاق دینے کا حکم فرمایا جو اس بات کی علامت ہے کہ قاضی، مرد کی رضامندی معلوم کرنے کا پابند نہیں ہے، روایات پر غور کرنے سے صحیح معلوم نہیں ہوتا ہے۔

نسائی کی روایت کا قبل ازیں حوالہ آچکا ہے اس کے الفاظ ہیں: ''فأرسل رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى ثابت فقال له: خذ الذي لها عليك وخل سبيلها، قال: نعم'' (نسائی: ۲.۹۵ عدۃ المختلعۃ)۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت کو بلا بھیجا پس ان سے کہا کہ جو اس کا تیرے اوپر حق ہے لیکر اس کی راہ چھوڑ سکتے ہو، انہوں نے کہا: ہاں!)۔

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ طلب کیا اور اپیل کی تھی، شوہر نے اس مشورہ کو قبول کرلیا۔

(د) پھر غور طلب امر تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو طلاق دینے کا حکم تو دیا، خود ہی تفریق نہیں کردی۔

(ہ) پھر شارحین کی رائے میں اگر فرض ہی کرلیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت کو امر ہی فرمایا ہے تو بھی یہ حکم وجوبی نہیں بلکہ ارشادی واستحبابی تھا (فتح الباری: ۹/ ۳۲۹، عمدۃ القاری: ۲۰ / ۲۶۳، کتاب الطلاق باب الخلع)۔

امام ابوبکر جصاص نے بھی اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اور اگر یہ اختیار سلطان کو ہوتا کہ جب وہ دیکھے کہ زوجین حدود اللہ کو قائم نہیں کر پا رہے ہیں تو خلع کردے خواہ یہ زوجین کی خواہش ہو یا نہ ہو، تو آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں سے اس کا سوال نہ فرماتے اور نہ شوہر سے یہ کہتے کہ تم ان سے خلع کرلو، بلکہ خود خلع کر کے عورت کو چھڑا دیتے اور شوہر پر اس کا باغ لوٹا دیتے، خواہ وہ دونوں یا ایک انکار ہی کرتے، جیسے کہ لعان میں زوجین کی تفریق کا اختیار حاکم کو ہوتا ہے تو وہ ملاعن سے یہ نہیں کہتا ہے کہ اپنی بیوی کو چھوڑ دو بلکہ خود تفریق کر دیتا ہے" (احکام القرآن للجصاص: ۱/ ۴۶۸، مطبوعہ: المطبعۃ البہیۃ ۱۳۴۷ھ)۔

حضرت علیؓ کے دور خلافت کے قصے میں تو صراحت ہے کہ حضرت علی شوہر پر زور دے رہے ہیں کہ نہیں تم اس کا اعتراف کرو، یہ قاضی کے معاملہ کو ست کرنے کے لیے کافی ہے۔

اسی طرح دور عثمانی کے قصے کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ کا خیال خود ان ہی کی زبان سے جو ظاہر ہو وہ مسئلہ کو منقح کرنے کے لیے بہت حد تک کافی ہے:

"حضرت عثمانؓ کے قصے میں وہ دلالت نہیں ہے جو حضرت علیؓ سے مروی قصے میں ہے، اور دور عثمان (کے واقعہ میں صورت حال) زمانہ علیؓ میں آنے والی حدیث کے مشابہ ہوسکتی ہے" (کتاب الام: ۵/ ۱۷۸، کتاب الطلاق، باب الحکمین، مطبوعہ: بمبئی)۔

اس لیے اقرب إلی الصواب جمہور اور امام ابوحنیفہ کا مسلک ہے، امام مالک کے مسلک کو ترجیح دینے کی کوئی قوی وجہ موجود نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب تک زوجین، قاضی کو یا حکمین کو طلاق کا وکیل نہ بنائیں ان کو حق نہیں ہے کہ خلع و تفریق کر دیں، ہاں دونوں نے یا شوہر نے وکیل بنایا تو خلع بھی کر سکتا ہے اور طلاق بھی دے سکتا ہے۔

## قاضی کو تفریق کا حق مخصوص حالات میں ہے:

قاضی بعض اوقات شوہر کی مرضی کے بغیر بھی تفریق کر دیتا ہے جیسا کہ شوہر مفقود الخبر ہو یا نامرد ہو، یا عورت میں کوئی عیب ہو جو کتب فقہ میں مفصل موجود ہے لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ شوہر پر قانونی حق واجب ادا کرنے میں کوتاہی ہوتی ہو مثلاً نان ونفقہ، یا وظائف زوجیت وغیرہ ادا نہیں کر پا رہا ہے، نیز شوہر طلاق بھی نہیں دے رہا ہے تو قاضی نائب بن کر تفریق کر دیتا ہے جو کہ طلاق کے قائم مقام ہوتا ہے۔

لیکن اگر ان حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہو رہی ہے جو قانونی نہیں محض اخلاقی ہیں، انہیں بزور عدالت، عورت وصول نہیں کر سکتی، مثلاً اچھا معاملہ کرنا، خوش اخلاقی سے پیش آنا وغیرہ حقوق وہ ہیں جو بزور قانون نہیں لیے جا سکتے ہمیں ان دونوں کے مابین فرق کرنا چاہئے۔

## قاضی کی طرف سے دو حکم کا تقرر ضروری ہے یا قاضی کو اختیار کلی ہے:

جن حضرات کے نزدیک قاضی بھی تفریق کا حق رکھتا ہے ان حضرات کے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی کے لیے دو حکم کا تقرر ضروری نہیں، بلکہ بغیر تحکیم بھی یہ عمل ادا ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت کو طلاق کا حکم دیا، وہاں تحکیم کا کوئی ذکر نہیں۔

علامہ قرطبی مالکی نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور خلع کے اثبات کے لیے حضرت ثابت کا قصہ ہی پیش کیا ہے اور دعوی کیا ہے کہ یہ اول خلع ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے تفریق کا امر علی سبیل الخلع تھا، ان کے الفاظ ہیں:

"ففرق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بینھما بطریق الخلع فکان أول خلع فی الإسلام. روی عکرمة عن ابن عباس قال: أول من خالع فی الإسلام أخت عبد اللہ بن أبی أتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت: یا رسول اللہ: لایجتمع رأسی ورأسه أبداً. إنی رفعت جانب الخباء فرأیته أقبل فی عدة إذ هو أشدهم سواداً وأقصرهم قامة وأقبحهم وجها. فقال أتردین علیه حدیقته قالت نعم وإن شاء زدته ففرق بینهما. وهذا الحدیث أصل فی الخلع وعلیه جمهور الفقهاء" (الجامع لأحکام القرآن: ۳/ ۹۶، إن خفتم ألا یقیما الخ سورۃ بقرہ. مطبوعہ: دار احیاء التراث ۱۴۲۳ھ)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی کے لیے تحکیم لازم نہیں ہے، لیکن تحکیم کا عمل بہر حال اولی وافضل صورت ہے۔

**ایک حکم کا تقرر کافی ہے:**...... اسی طرح فقہ مالکی کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک حکم بھی دونوں کے مابین اصلاح و تفریق کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ حکم قاضی (یا شرعی پنچایت) کی طرف سے مقرر کردہ ہو، اور احکام شرعیہ سے واقف ہو، دیانت دار و غیر جانبدار ہو، علامہ قرطبی لکھتے ہیں: "یجزئ إرسال

الواحد لأن الله سبحانه حكم في الزنا بأربعة شهود ثم قد أرسل النبي صلى الله عليه وسلم إلى المرأة الزانية أنيساً وحده وقال له: إن اعترفت فارجمها وكذلك قال عبد الملك في المدونة'' (الجامع لأحكام القرآن للقرطبي ۳۔۱۲۰، دار احياء التراث ۱۴۲۲ھ)۔ (میں کہتا ہوں: جب ایک حکم کا ارسال جائز ہے تو اگر زوجین ایک شخص کو حکم بنادیں تو بھی کافی ہوگا، اور یہ جواز کے زیادہ قریب ہے جبکہ دونوں اس پر راضی ہوں، اللہ نے تو ارسال کا امر، حکام کو کیا ہے نہ کہ زوجین کو، پس اگر زوجین دو حکم یا ایک حکم کو بھیجے تو ان دونوں کا حکم نافذ ہوگا، اس لیے کہ تحکیم ہمارے نزدیک جائز ہے اور حکم کا فعل ہر مسئلہ میں نافذ ہوتا ہے، یہ اس وقت ہے جبکہ دونوں حکم عادل ہوں، اگر عادل نہیں تو عبدالملک فرماتے ہیں کہ اس کا حکم نافذ نہیں ہوگا، ابن العربی نے کہا کہ صحیح یہ ہے کہ اس کا حکم نافذ ہوگا)۔

## فقہ مالکی کی تفصیل کا خلاصہ:

اس سے معلوم ہوا: (۱) حکم کا تقرر قاضی کرے، (۲) حکم زوجین بھی متعین کر سکتے ہیں، (۳) اگر قاضی حکم مقرر کر رہا ہے تو اس کا عادل وغیر جانبدار ہونا شرط ہے اگر زوجین کریں تو مسئلہ متفق علیہ نہیں ہے، (۴) بہتر یہ ہے کہ دو حکم ہوں اور دونوں فریقین کے اقرباء سے ہوں تو اولی وافضل ہے، (۵) دونوں حکم اتفاق رائے سے فیصلہ کریں، (۶) حکمین، زوجین کے مابین فیصلہ اپنی صواب دید سے کریں قاضی یا زوجین کی مرضی کا پابند نہیں۔

لیکن جن فقہاء کے یہاں قاضی با اختیار نہیں تو ان کے نزدیک حکم کا تقرر ضروری ہے، امام شافعی نے لکھا ہے: ''فإذا ارتفع الزوجان المخوف شقاقهما إلى الحاكم فحق عليه أن يبعث حكماً من أهله وحكماً من أهلها من أهل القناعة والعقل ليكشفا أمرهما ويصلحا بينهما إن قدرا'' (كتاب الام: ۵۔۱۷۷، كتاب الطلاق بالحكمين)۔ (جب وہ زوجین جن کو شقاق کا خوف ہے حاکم کے پاس معاملہ لے جائیں تو قاضی پر ضروری ہے کہ ایک حکم مرد کے خاندان سے اور دوسرا حکم بیوی کے خاندان سے جو کہ صاحب عقل ودانش ہوں بھیجے تاکہ حقیقت حال منکشف کر سکیں اور ہو سکے تو دونوں کے مابین اصلاح کر سکیں)۔

علامہ وہبہ زحیلی بھی حضرت امام شافعی کی طرف منسوب کر کے لکھتے ہیں کہ قاضی کو ارسال کا جو حکم ہے وہ وجوبی ولازمی ہے (التفسیر المنیر ۵/ ۶۲ سورۂ نساء مطبوعہ دار الفکر)۔

## دوسرے مکتب فکر کی طرف عدول:

مذکورہ بالا تفصیلات سے بات بخوبی واضح ہو چکی ہے کہ حنفیہ کیا تمام ہی فقہاء کا راجح مسلک یہ ہے کہ حکم وقاضی کو جبراً وقہراً خلع کا حق نہیں ہے، بلکہ اس مسئلہ میں حکم وکیل کے درجہ میں ہے، البتہ امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ حکم وقاضی با اختیار ہے، صلح بھی کروا سکتا ہے اور تفریق بھی۔

عند الضرورت دوسرے امام کے مسلک کو اختیار کرنا جائز ہوتا ہے، لہٰذا مسئلہ باب میں ناقص خیال ہے کہ اگر تمام اصلاحی کوششیں ناکام ہو جائیں، ان کوششوں میں آخری کوشش حکمین کا بھیجنا بھی ہے تو اگر حکمین قاضی کو اطلاع دیتے ہیں، اور تفصیلات سے آگاہ کرتے ہیں نیز واضح کرتے ہیں کہ اسباب کراہت شوہر میں موجود ہیں یا دونوں میں موجود ہیں جس کی بنا پر عورت خلاصی چاہتی ہے، مرد اس پر کسی طرح راضی نہیں ہے تو قاضی دونوں کے مابین تفریق کردے لیکن اسباب کراہت عورت میں موجود ہیں جس کی بنا پر مرد خلع کرنا چاہتا ہے، عورت خلع کے لیے راضی نہیں تو ایسے وقت میں بظاہر قاضی کو تفریق کی حاجت نہیں بلکہ شوہر طلاق دے کر معاملہ ختم کردے۔

علامہ قرطبی، امام شافعی اور اہل کوفہ کا مسئلہ اس طرح نقل کرتے ہیں:

''وقال قوم: ليس لهما الطلاق مالم يوكلهما الزوج في ذلك وليعرفا الإمام وهذا بناء على أنهما رسولان شاهدان. ثم الإمام يفرق إن أراد، أو يأمر الحكم بالتفريق. وهذا أحد قولي الشافعي وبه قال الكوفيون وهو قول عطاء وابن زيد والحسن وبه قال أبو ثور'' (الجامع لأحكام القرآن للقرطبي: ۳۔۱۳۶، سورۂ نساء)۔

(ایک جماعت نے کہا کہ طلاق حکمین کے اختیار میں نہیں ہے جب تک شوہر ان دونوں کو اس سلسلے میں وکیل نہ بنائے، اور چاہئے کہ دونوں حکم صورت حال سے آگاہ رہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ دونوں شاہد وقاصد ہیں، پھر امام اگر چاہے تفریق کرے، یا حکم کو تفریق کا حکم دیدے، یہ امام شافعی کا ایک قول ہے، اسی کے قائل کوفہ کے فقہاء ہیں، نیز یہ عطاء، ابن زید، حسن کا قول ہے، اور ابو ثور اسی کے قائل ہیں۔

☆☆☆

# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

مفتی تنظیم عالم قاسمی[1]

مرد اور عورت کے درمیان رشتۂ نکاح اللہ کا عظیم احسان اور نہایت قابل قدر نعمت ہے، اس کا مقصد تو الد و تناسل اور عفت و پاکدامنی کے ساتھ ذہنی و قلبی سکون حاصل کرنا ہے، وہ لوگ جو تجرد کی زندگی گذراتے ہیں، ان سے بہتر اور خوشحال وہ افراد ہیں جو رشتۂ نکاح سے جڑے ہوئے ہیں، انہیں حقیقی سکون اور زندگی کا صحیح لطف میسر ہے اور قلب و نظر کی پاکیزگی بھی، غرض دینی اور دنیوی دونوں اعتبار سے ازدواجی زندگی مفید اور نفع بخش ہوتی ہے؛ اسی لئے شریعت اسلامی نے تجرد کی زندگی کے بجائے ازدواجی زندگی کی حوصلہ افزائی کی ہے اور غیر شادی شدہ افراد کو اسباب و وسائل کے مہیا ہوتے ہی رشتۂ مناکحت سے وابستہ ہونے کی ترغیب دی گئی ہے؛ بلکہ اسے عبادت قرار دے کر تمام مسلمانوں کو نکاح پر ابھارا گیا ہے، انبیاء کرام نے بھی تاہل کی زندگی کو ترجیح دی اور اپنی امت کے لئے اسے بہترین سنت قرار دیا ہے۔

نکاح کے مقاصد اس وقت پوری طرح حاصل ہو سکتے ہیں جب کہ میاں بیوی کے درمیان ازدواجی رشتہ تادیر قائم ہوں؛ اسی لئے اسلام نے نکاح ہونے کے بعد رشتۂ نکاح کے منقطع کرنے کو سخت ناپسند کیا ہے اور اسے آخری علاج کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔

تاہم اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض وجوہ سے زوجین کے درمیان ایسی رنجش ہو جاتی ہے جس کے سبب دونوں کا ایک ساتھ زندگی گذارنا مشکل ہو جاتا ہے، رفیق کے بجائے ہر ایک دوسرے کا فریق اور دشمن بن جاتا ہے، راحت اور سکون کی جگہ بے چینی، کلفت اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، ایسے وقت رشتۂ نکاح کو ختم کرنے اور علیحدگی میں عافیت محسوس کی جاتی ہے، شریعت نے اس کی بھی گنجائش رکھی ہے اور شوہروں کو ہدایت دی ہے کہ اگر باہمی اختلاف اس قدر بڑھ جائے کہ باہمی رشتہ بے سکونی اور ذہنی تناؤ کا سبب بن جائے اور نکاح اپنے مقاصد کی تکمیل و تحصیل کا ذریعہ نہ رہے تو نہایت عمدگی اور شائستگی کے ساتھ اس رشتہ کو طلاق کے ذریعہ ختم کر دیں، اضرار و استحصال کی نیت سے اس رشتہ کو باقی رکھنا درست نہیں ہے اور اگر مرد خوش اسلوبی کے ساتھ رکھیں اور نہ بھلائی کے ساتھ نکاح کو ختم کریں تو عورتوں سے کہا گیا ہے کہ کچھ معاوضہ دے کر شوہر سے علیحدگی حاصل کر لیں جس کو اصطلاح میں ''خلع'' کہا جاتا ہے؛ لیکن یہ مسئلہ اس وقت پیچیدہ ہو جاتا ہے، جب کہ شوہر نہ طلاق دینے پر راضی ہو اور نہ ہی خلع قبول کرنے پر، اس صورت میں عورت مرد کے ظلم کا شکار ہوگی اور گھٹ گھٹ کر زندگی گذارنے پر مجبور ہونا ہوگا، بالخصوص جب کہ شوہر کے ظلم و زیادتی پر بینہ نہ ہو اور عورت قاضی کے سامنے خاوند کے اضرار کو ثابت نہ کر سکے۔

مردوں کو تو مکمل آزادی حاصل ہے کہ وہ جب بھی آپسی تعلقات میں بگاڑ محسوس کریں اور بیوی کے نشوز و نافرمانی کا کوئی مناسب حل نکلتا ہوا نہ دیکھیں تو رشتۂ نکاح کو جب چاہیں ختم کر ڈالیں؛ لیکن جب عورت شوہر کے ظلم کا شکار ہو اور وہ اسے ثابت نہ کر سکے تو نجات کی کیا صورت ہوگی؟ کیا وہ یوں ہی ظلم سہتی رہے اور اپنی زندگی کو شوہر کی زیادتی کے نام پر وقف کر دے؟ یا قرآن و سنت کی روشنی میں کوئی ایسی راہ نکل سکتی ہے جس کو اختیار کرنے سے سکون مل سکتا ہے؟ یہ موجودہ دور کا ایسا حساس مسئلہ ہے، جس میں ہزاروں عورتیں مبتلا ہیں، ذہنی تناؤ اور نہایت درد و کرب کی زندگی گذار رہی ہیں، کوئی ایسی راہ انہیں نظر نہیں آتی جس کے ذریعہ وہ عافیت پا سکیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اجتماعی غور و فکر کے ذریعے کوئی ایسا حل نکالا جائے جس سے انہیں شوہر کے ظالمانہ رویے سے نجات مل سکے اور وہ چاہیں تو باقی زندگی گذارنے کے لئے کسی نئے ساتھی کی تلاش کر سکیں۔

## خلع کی لغوی و اصطلاحی تعریف:

(۱) ''خلع'' کے لغوی معنی اتارنے اور نکالنے کے ہیں، اصطلاح فقہ میں عورت سے کچھ مال لے کر طلاق دینے اور ملکیت نکاح کے ازالہ کو خلع کہا جاتا ہے، کبھی عورت اپنے پاس سے متعین رقم بطور فدیہ ادا کر کے طلاق حاصل کرتی ہے اور کبھی مرد کے ذمہ اس کا جو کچھ باقی ہے، اس کو معاف کر کے طلاق لیتی ہے، اس کے

لئے شوہر لفظ ''خلع'' کا استعمال کرتا ہے؛ اس لئے اسے خلع کہا جاتا ہے (دیکھئے: فتح القدیر ۴/ ۱۹۹)۔

گویا خلع کے لفظ میں ایجاب وقبول کا معنی پوشیدہ ہوتا ہے، یہ لفظ بولا ہی جاتا ہے، اس وقت جب کہ ایک کی طرف سے ایجاب اور دوسرے کی طرف سے قبول پایا جائے، ایجاب ہو اور قبول نہ ہو تو فقہی اصطلاح میں اسے خلع نہیں کہا جائے گا (دیکھئے: المغرب فی ترتیب المغرب ۱/ ۱۶۵)۔

## طلاق وخلع کا اختیار کس کو ہے؟

۲۔ آیات قرآنی میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کا مکمل اختیار صرف مرد کو دیا گیا ہے، عورت کو ایقاع طلاق کا معمولی اختیار بھی نہیں ہے؛ چنانچہ سورہ بقرہ میں ارشاد باری ہے: ''وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ'' (البقرۃ: ۲۲۸)۔ (اور عورتوں کے بھی حقوق ہیں جو مثل ان ہی حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں، قاعدہ کے موافق اور مردوں کا ان کے مقابلے میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے اور اللہ تعالی زبردست ہیں حکیم ہیں)۔

آیت کے شروع میں عورتوں کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مردوں سے خطاب کیا گیا ہے کہ صرف تمہارا ہی عورتوں پر حق نہیں ہے؛ بلکہ بیوی کے بھی تمہارے ذمے حقوق وفرائض ہیں، جس طرح عورتیں حسن سلوک، محبت والفت کی ذمہ دار ہیں، ویسے ہی شوہروں کو بھی اس کا ذمہ دار بنایا گیا ہے، دستور کے موافق ایک دوسرے کے حقوق ادا کئے جاتے رہے تو زندگی خوشگوار ہوسکتی ہے، آیت کے اس ٹکڑے سے یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ زوجین تمام حقوق وفرائض میں بالکل برابر ہیں تو جس طرح مردوں کو ایقاع طلاق کا حق ہے، ایسے ہی عورتوں کو بھی ایقاع طلاق اور اپنی مرضی سے علیحدگی کا حق حاصل ہوگا، قرآن نے فوراً اس شبہ کو دور کرتے ہوئے کہا: "وللرجال علیهن درجة" (مردوں کا عورتوں کے مقابلے میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے)۔ یعنی آیت کے شروع میں زوجین کے جن مساوات کا ذکر کیا گیا ہے، ان سے مراد معاشرتی مساوات ہیں، ورنہ جہاں تک ایقاع طلاق اور رشتۂ نکاح ختم کرنے کا سوال ہے تو اس کا حق بعض مصلحتوں کی وجہ سے صرف مردوں کو دیا گیا ہے اور اس اعتبار سے ان کا مقام عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، تمام مفسرین نے اس آیت کی یہی تشریح کی ہے (دیکھئے: تفسیر کبیر ۲/ ۲۴۸، المبسوط للسرخسی ۶/ ۱۷۳، احکام القرآن للجصاص ۱/ ۴۶۸، بدایۃ المجتہد ۲/ ۶۸ وغیرہ)۔

## شوہر کے ظلم وزیادتی سے نجات کی کیا شکل ہوگی؟

۳۔ اگر عورت شوہر کی جانب سے شدید حد تک متنفر ہو اور شوہر نہ تو از خود طلاق دینے پر راضی ہے اور نہ ہی خلع قبول کرنے پر اور عورت کے پاس شوہر کے ظلم وزیادتی کے اثبات کے لئے بینہ بھی نہ ہو کہ قاضی سے نکاح فسخ کراسکے تو پھر عورت کے لئے شوہر کے چنگل سے نجات کی کیا شکل ہوگی؟

اس سلسلہ میں یاد رکھنا چاہئے کہ شریعت نے اولاً مردوں کو مکلف بنایا ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور خوش اخلاقی سے پیش آئیں، اگر کسی وجہ سے دونوں کے درمیان ناچاقی اور اختلاف پیدا ہو اور عورت کی جانب سے نافرمانی کا احساس ہو تو افہام وتفہیم اور وعظ وتذکیر سے مسئلہ کو حل کریں، اگر معاملہ سلجھنے کے بجائے پیچیدہ ہوجائے اور حسن معاشرت کے تمام پہلو تاریک ہوجائیں تو شوہر کے لئے بہتر ہے کہ وہ نکاح کے رشتے کو بہتر اسلوب میں منقطع کردے؛ تاکہ عدت گذارنے کے بعد عورت جہاں چاہے نکاح کرسکے، زیادتی خواہ شوہر کی جانب سے ہو یا بیوی کی جانب سے، جب زوجین میں ناپسندیدگی اور نفرت پیدا ہوجائے اور یہ محسوس ہونے لگے کہ یہ رشتہ دونوں کے لئے ناقابل برداشت بوجھ کے سوا کچھ نہیں رہا تو مرد از خود طلاق دے کر عورت کو علیحدہ کردے، اگر شوہر طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو عورت کو یہ اختیار ہے کہ وہ شوہر کو کچھ مالی معاوضہ پیش کرکے اس کے عوض میں شوہر سے طلاق حاصل کرلے، جس کو فقہی اصطلاح میں خلع کہا جاتا ہے؛ لیکن شوہر اپنی بدمزاجی اور بدنیتی کی وجہ سے از خود طلاق دے اور نہ ہی عورت کے مطالبہ پر خلع قبول کرے تو ایسے ظالم شوہر سے جبراً اور اکراہاً طلاق حاصل کی جاسکتی ہے، اگر شوہر نے بحالت اکراہ طلاق دے دی تو واقع ہوجائے گی (دیکھئے: فتاوی رحیمیہ ۸/ ۴۱۱، امداد المفتیین ۲/ ۶۶۰)۔

اگر شوہر طلاق وخلع پر راضی نہ ہو اور نہ ہی اکراہ اور بزور طاقت اس سے طلاق لی جاسکے تو اس صورت میں بدرجۂ مجبوری دفع ضرر کے لئے سیدنا حضرت امام مالکؒ کے مسلک پر عمل کیا جائے گا، عورت اپنا مقدمہ قاضی کے پاس نہ لے جائے اور پھر وہ معاملہ حکمین کے حوالہ کردے گا، حکمین زوجین کے باہمی معاملات کی تحقیق کریں گے، اگر زوجین کے درمیان صلح ہوسکتی ہو اور صلح دونوں کے حق میں مفید بھی ہو تو صلح کرادیں گے اور اگر ذاتی تحقیقات کے نتیجے میں انہیں یقین ہوجائے کہ اب میاں، بیوی کا ساتھ زندگی گذارنا دشوار اور ناقابل اصلاح ہے تو حکمین دونوں کے درمیان تفریق کردیں، اگر مرد کی جانب سے ظلم وزیادتی ہو تو بلا کسی معاوضہ شوہر کی نیابت کرتے ہوئے طلاق دی جائے گی اور اگر عورت کی زیادتی ہو تو کچھ معاوضہ ادا کرکے طلاق دی جائے، گویا حکمین کو میاں بیوی کے درمیان تفریق

وتفریق کا مکمل اختیار ہوگا اور وہ اپنی نجی تحقیقات کی بنیاد پر اس کا فیصلہ کریں گے (دیکھئے: الاحوال الشخصیۃ ر ۳۰۴، الفقہ الاسلامی وادلتہ)۔

برصغیر کے مشہور علماء نے اس مسئلہ میں ضرورت شدیدہ کی بنیاد پر مذہب مالکیہ پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے؛ چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے زمانے میں عورتوں کی اس مجبوری کو محسوس کیا اور اپنی مشہور تصنیف ''الحیلۃ الناجزۃ'' میں اس پر بحث کرتے ہوئے مالکیہ کے مسلک پر عمل کرنے کا مشورہ دیا ہے، اس زمانہ کے مفتیان کرام اور علماء عظام نے اس کتاب کی تصدیق کی، جس سے مسئلہ مزید واضح ہوجاتا ہے۔ حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

''زوجہ متعنت کو اول تو لازم ہے کہ کسی طرح خاوند سے خلع وغیرہ کرلے؛ لیکن اگر باوجود سعی بلیغ کے کوئی صورت نہ بن سکے تو سخت مجبوری کی حالت میں مذہب مالکیہ پر عمل کرنے کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ ان کے نزدیک زوجہ متعنت کو تفریق کا حق مل سکتا ہے'' (الحیلۃ الناجزۃ ر ۷۳)۔

بیسویں صدی کے مشہور فقیہ حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ لکھتے ہیں:

''اگر ظاہری اسباب موجود نہ ہوں؛ لیکن طبعی ناپسندیدگی کی وجہ سے وہ اس شوہر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تو شوہر کا فرض ہے کہ وہ امساک بالمعروف کی صورت نکالے، اگر ممکن نہ ہو تو تسریح بالاحسان یعنی خلع کی صورت میں زوجہ کو اپنے نکاح سے الگ کردے اور اگر زوج دونوں میں سے کوئی صورت نہیں نکالتا اور قاضی محسوس کرتا ہے کہ اب طرفین کے درمیان معروف اور بہتر تعلقات کے ساتھ نکاح کا برقرار رہنا ممکن نہیں ہے تو اس صورت میں فقہ مالکی کو سامنے رکھتے ہوئے وہ تحکیم اور پھر خلع جبری کی صورت نکال سکتا ہے'' (فتاوی قاضی ر ۱۵۰)۔

حکمین مقرر کئے جانے کی اگر صورت نہ بن سکے یا اس میں کوئی دشواری ہو تو قاضی از خود حالات کا جائزہ لے کر زوجین میں تفریق کرسکتا ہے اور جہاں قضاء کا نظام نہ ہو، شرعی پنچایت کو یہ اختیار حاصل ہوگا۔۔۔۔۔ مجموعہ قوانین اسلامی جو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی جانب سے ہندوستانی سماج کے لئے اصحاب نظر علماء دین کی نگرانی میں تیار کیا گیا ہے، اس میں دفعہ ۸۲ میں یہ عبارت مذکور ہے:

''اگر زوجین کے درمیان شدید نفرت ہوجائے کہ دونوں کا اللہ کے حدود کو قائم رکھتے ہوئے ازدواجی زندگی گذارنا ممکن نظر نہ آئے تو ایسی صورت میں قاضی حکمین مقرر کرے گا؛ تاکہ اصلاح کی صورت نکل سکے، اگر تحکیم کے باوجود اصلاح حال یا باہمی رضامندی سے علیحدگی کی کوئی صورت نہیں نکل سکے تو قاضی بر بنائے شقاق زوجہ کے مطالبہ کی صورت میں تفریق کردے گا'' (مجموعہ قوانین اسلامی ر ۲۰۰)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی علماء کے درمیان یہ مسئلہ بہت پہلے ہی زیر بحث آچکا ہے اور تقریباً تمام اصحاب افتاء اور اہل علم وتحقیق اس مسئلہ میں متفق ہیں، البتہ ہندوستان میں جہاں شرعی قضاء نہ ہو، شرعی پنچایت کے ذمہ داران یہ کام انجام دے سکتے ہیں، مشہور فقہی قاعدہ ہے: ''لاضرر ولاضرار'' اس پر عمل کرتے ہوئے متاخرین فقہاء نے ظلم کی شکار عورتوں کے لئے یہ راستہ نکالا ہے جو شریعت اسلامی کے مقاصد اور روح کے عین مطابق ہے۔

## شقاق سے کیا مراد ہے

(۴) شقاق باب مفاعلت کا مصدر ہے جس کے لغوی معنی مخالفت، دشمنی، اور اختلاف وعداوت کے ہیں، امام راغب اصفہانی شقاق کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''الشقاق المخالفة وكونك في شق غير شق صاحبك'' (المفردات في غريب القرآن: ۱،۴۴۹) (شقاق مخالفت اور تیرا اپنے ساتھی کے مخالف گوشے کو اختیار کرنے کا نام ہے)...... اصطلاح میں بھی شقاق اسی معنی میں مستعمل ہوتا ہے، علامہ نووی لکھتے ہیں: ''إن أصل الشقاق أن كل واحد منهما يأخذ غير شق صاحبه'' (كتاب المجموع: ۱۸، ۹۹) (شقاق کی اصل یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے مخالف گوشہ اختیار کرے)۔

دو آدمیوں کے درمیان جب کسی وجہ سے نفرت پیدا ہوجائے اور دونوں ایک دوسرے سے دور ہوجائیں تو عرف عام میں کہا جاتا ہے کہ ان دونوں میں مخالفت، دشمنی اور عداوت ہے، اسی مفہوم کو عربی میں ''شقاق'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح میاں بیوی کے درمیان کسی وجہ سے نزاع، مخالفت اور نفرت پیدا ہوجائے، ذہنی وقلبی مناسبت باقی نہ رہے، یہاں تک کہ ایک دوسرے کو دیکھنا اور سننا پسند نہ کرتا ہو تو ان دونوں کے درمیان اس کشیدہ تعلق کو شقاق کہا جائے گا، قرآن کریم نے اسی معنی میں شقاق کا لفظ استعمال کیا ہے: { وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا } (النساء: ۳۵) (اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان پھوٹ پڑجانے کا اندیشہ ہو)۔

اللہ تعالیٰ نے مرد کو معاشرت بالمعروف کا حکم دیا ہے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ زوجین آپس میں راضی ہوں، باہمی خوش اخلاقی اور الفت ومحبت پائی جائے، اگر زوجین ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں یا زوجین میں سے کوئی ایک نفرت کرنے لگے تو بھی شقاق قرار دیا جائے گا؛ اس لئے کہ معاشرت بالمعروف کے لئے دونوں کی رضامندی ضروری ہے، اگر ایک کی طرف سے محبت ورضا کا فقدان ہوجائے تو معاشرت بالمعروف ممکن نہیں رہے گی؛ اس لئے اس پر شقاق کا اطلاق ہوگا،...... حاصل یہ ہے کہ زوجین ایک دوسرے کے سخت مخالف ہوجائیں اور ان کے درمیان باہم محبت کی فضا نفرت وعداوت سے بدل جائے یا دونوں میں سے کسی ایک کی طرف سے بھی تنفر ہو تو بھی شقاق کا تحقق ہوجائے گا (دیکھئے: مفاتیح الغیب ۲۰۲/۵)۔

## خلع کے بارے میں حکمین کی ذمہ داریاں

۵۔ حکمین کی اصل ذمہ داری اور ان کا فریضہ میاں بیوی کے درمیان موافقت کی کوشش ہے، دونوں حکم حالات کا گہرائی سے جائزہ لے کر انہام وتفہیم کے ذریعہ آپسی تلخی کو دور کرنے کی کوشش کریں گے، لیکن بسیار کوشش کے باوجود اگر تعلقات بہتر نہ ہوسکیں اور اصلاح کی کوئی صورت نظر نہ آئے، تو کیا حکمین کو خلع جبری یا تفریق کا اختیار ہوگا؟ اس بات پر تو سارے فقہاء کا اتفاق ہے کہ میاں بیوی کی طرف سے جو حکمین مقرر ہوں اور جنہیں بیوی نے صلح اور خلع دونوں کا اور شوہر نے صلح، طلاق اور خلع تینوں کا اختیار دیا ہو، وہ اگر تفریق کا فیصلہ کریں خواہ طلاق کی صورت میں ہو یا خلع کی صورت میں، ان کا فیصلہ معتبر ہے اور ان کا تفریق کرنا صحیح ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں حکمین زوجین کے وکیل ہوں گے اور وکیل کے تمام تصرفات موکل کی جانب سے سمجھے جاتے ہیں، امام جصاص رازی لکھتے ہیں: ''قال أصحابنا: ليس للحكمين أن يفرق إلا برضا الزوجين'' (أحكام القرآن للجصاص: ۲/۲۲۹) (ہمارے علماء نے فرمایا: حکمین زن وشوہر کی رضامندی ہی سے ان کے درمیان تفریق کرسکتا ہے)۔

لیکن اگر میاں بیوی کی طرف سے حکمین مقرر کئے گئے نہ ہوں اور نہ انہوں نے تفریق وغیرہ کی اجازت دی ہو تو اس صورت میں حکمین تفریق کا فیصلہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کی مختلف رائیں ہیں، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا قول راجح یہ ہے کہ حکمین کو تفریق کا اختیار نہیں ہوگا، اگر وہ اپنی تحقیقات کی روشنی میں علیحدگی کا فیصلہ بھی کردیں تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، امام جصاص رازی لکھتے ہیں:

''شوہر کی رضامندی اور اس کی طرف سے وکیل بنائے بغیر طلاق واقع کرنا اور بیوی کی رضامندی کے بغیر اس کی ملکیت سے مہر نکالنا جائز نہیں ہے، اسی وجہ سے ہمارے علماء نے فرمایا کہ حکمین کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ میاں بیوی کی رضامندی کے بغیر تفریق کردیں'' (أحکام القرآن: ۲۳۹/۲)۔

اس رائے کے حامیوں کا استدلال یہ ہے کہ زوجین عاقل وبالغ ہیں اور خودمختار مرد کا حق ملک بضع پر ہے اور عورت کا حق مال پر، اس حق میں کسی غیر کو تصرف کا حق اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب کہ وہ خود زوجین کا وکیل ہو؛ کیوں کہ شریعت کا اصول ہے کہ کسی کی بھی ملکیت اور حق میں اس کی اجازت یا وکالت وولایت کے بغیر تصرف درست نہیں اور یہاں تینوں میں کوئی موجود نہیں ہے (المغنی ۲۶۴/۱)۔

اس سلسلہ میں دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حکمین کی حیثیت حاکم کی ہے اور انہیں کلی اختیار حاصل ہے، جس طرح وہ میاں بیوی کو ساتھ رہنے کا حکم دے سکتے ہیں، اسی طرح دونوں کے درمیان بوقت ضرورت تفریق بالعوض یا بلاعوض بھی کرنے کا انہیں حق حاصل ہے، اس کے لئے نہ اس کی ضرورت ہے کہ زوجین انہیں وکیل بنائیں اور نہ یہ شرط ہے کہ میاں بیوی اس کی تحکیم یا ان کے فیصلے پر راضی ہوں، امام مالکؒ، اوزاعی، اسحاق، ابن المنذر، شعبی، نخعی، سعید بن جبیر نے اس نقطۂ نظر کو اختیار کیا ہے اور امام شافعی اور امام احمد سے بھی ایک روایت اسی کے مطابق ہے؛ بلکہ علامہ آلوسی کی صراحت کے مطابق علماء حنفیہ میں سے بھی بعض سے یہ قول منقول ہے (دیکھئے: روح المعانی ۲۷/۵)۔

اس نقطۂ نظر کے حاملین کا استدلال یہ ہے کہ قرآن نے شقاق کی صورت میں جن دو شخصیتوں کے بھیجے جانے کا حکم دیا ہے ان کو لفظ حکم سے تعبیر کیا گیا ہے اور حکم کہا جاتا ہے جس کو اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہو...... دوسرے یہ کہ آیت میں حکمین کی طرف ''ارادہ'' کی نسبت کی گئی ہے، جو ان کے صاحب اختیار ہونے کی طرف واضح اشارہ ہے، علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:

''نیز اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کی حکمین کی طرف نسبت کی ہے، چنانچہ ارشاد ہے: "إن يريدا يوفق الله بينهما" اور وکیل کا اپنا کوئی ارادہ نہیں ہوتا'' (زاد المعاد: ۱۹۰/۵)۔

ان حضرات نے حضرت علیؓ کے اثر سے بھی استدلال کیا ہے، جس کو دارقطنی نے محمد بن سیرین کے واسطے سے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت علی

کے عہد خلافت میں ایک شوہر و بیوی اپنے اپنے لوگوں کے ساتھ حضرت علی کی خدمت میں استغاثہ لے کر آئے، حضرت علی نے دونوں کے خاندان سے ایک ایک حَکَم مقرر کر دیا اور فرمایا:

''أتدريان ما عليكما. عليكما إن رأيتما أن تجمعا وإن رأيتما أن تفرقا أن تفرقا'' (بیہقی، حدیث نمبر: ۱۴۷۸۲)۔ (کیا تم کو اپنی ذمہ داری معلوم ہے، تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ اگر دونوں میں اتفاق و مصالحت پیدا کرانا مناسب سمجھو تو مصالحت کرا دو اور دونوں کو علیحدہ کرنا اگر بہتر سمجھو تو علیحدگی کرا دو)۔

ان حضرات نے حضرت ابن عباسؓ سے مروی ایک اثر سے استدلال کیا ہے، سیدنا حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں عقیل بن ابی طالب اور فاطمہ بنت عتبہ جو دونوں میاں بیوی تھے، ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا تھا تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت معاویہ کو بحیثیت حَکَم بھیجا اور ان دونوں سے فرمایا ''إن رأيتما أن تجمعا جمعتما وإن رأيتما أن تفرقا فرقتما'' (مصنف عبد الرزاق: ۶،۵۱۲) (اگر تم مصالحت کرا دینے میں بہتری سمجھو تو ویسا ہی کرنا اور اگر تمہارے خیال میں تفریق صحیح ہو تو تفریق کر دینا) (تفسیر مظہری: ۲/۱۰۱)۔

اس طرح واضح اور دوٹوک آثار کی بنیاد پر امام مالک اور ان کے متبعین کی رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے؛ اس لئے دور حاضر میں جب کہ میاں بیوی کا اختلاف ناقابل حل صورت کو اختیار کر جاتا ہے اور اخلاص و خوف خدا کی کمی کی وجہ سے شوہر بیوی کو معلق رکھتے ہوئے اس کی زندگی سے کھلواڑ کرنا چاہتا ہے، امام مالک کے مسلک پر عمل کرنا زیادہ مناسب ہے، اگر احناف کے نقطۂ نظر کو اختیار کیا جائے تو اس مسئلہ کا حل نہیں نکل سکے گا؛ حالاں کہ قرآن نے حکمین متعین کرنے کا حکم اس لئے دیا ہے؛ تاکہ زوجین کا اختلاف دور ہو کر فیصلہ کن مرحلہ میں دونوں پہنچ سکیں اور یہ اسی وقت ہوگا جب کہ دونوں میں مصالحت یا تفریق کر دی جائے، ورنہ حکمین کے مقرر کئے جانے کا کوئی حاصل نہیں، دریں صورت مظلوم کی دادرسی نہیں ہو سکے گی اور مقدمہ کے قبل جن مفاسد کا احتمال تھا وہ اور یقینی بن جائے گا۔

## قاضی اور حکمین کے اختیارات:

٦۔ قرآن کریم نے اگرچہ حکمین کے تقرر کرنے کا حکم دیا ہے، مگر حکمین کی ذمہ داری اور ان کے فرائض و واجبات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام خود حاکم اور قاضی بھی انجام دے سکتا ہے؛ کیوں کہ حکمین کے تقرر کا مقصد زوجین کے حالات کا جائزہ، صورت حال سے واقفیت اور پھر افہام و تفہیم اور طلاق و تفریق ہے اور یہ فریضہ قاضی بہتر طریقے پر انجام دے سکتا ہے، قرآن کریم نے قاضی کو اس لئے مخاطب نہیں کیا کہ وہ مسلمانوں کے مختلف شرعی و سماجی مسائل حل کرنے میں مصروف رہتے ہیں، ان پر مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کی بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ان کو اتنی کہاں فرصت ہے کہ وہ عام مسلمانوں کے گھروں تک جا کر ان کے حالات کا جائزہ لیں اور افہام و تفہیم یا تفریق وغیرہ کے ذریعہ مسائل کا حل کریں، اگر وہ جائیں بھی تو کتنے لوگوں کے گھروں تک جائیں، بیک وقت اس طرح کے اختلاف سیکڑوں مسلمانوں کے درمیان پیدا ہو سکتے ہیں اور پھر قاضی کے ان جزوی مسائل میں مصروف ہونے کی وجہ سے دار القضاء کا مکمل نظام ٹھپ ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، ان وجوہ کی بنیاد پر قرآن نے حکام اور قاضیوں کو حکمین کے تقرر کا مشورہ دیا ہے؛ تاکہ مسلمانوں کے یہ مسائل بھی حل ہو جائیں اور قضاء کا کام بھی متاثر نہ ہونے پائے، تاہم کسی حاکم اور قاضی کو اس میں دلچسپی ہو اور وہ میاں بیوی کے اختلاف کو از خود حل کرنا چاہیں تو ممانعت کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی، جس طرح حکمین کو میاں بیوی کے معاملے میں مالکیہ کے یہاں کلی اختیار ہے، ویسے ہی قاضی کو بھی مکمل اختیار ہوگا، خلع و تفریق کے لئے حکمین کا مقرر کیا جانا ضروری نہیں؛ بلکہ قاضی نجی تحقیقات کے ذریعہ خود فیصلہ کر سکتا ہے۔

مالکیہ کے یہاں اس کی صراحت نہیں ملتی؛ بلکہ ان کی بعض عبارتوں سے اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، جیسے نفقہ نہ دینے والے زوج متعنت کے بارے میں امام مالک کا فیصلہ ہے (فتوی العلامۃ سعید بن صدیق الفلاتی المالکی بحوالہ الحیلۃ الناجزۃ ص: ۱۴۳)۔

نفقہ ادا نہ کرنا ظلم کی ایک قسم ہے، جب اس میں قاضی تفریق کر سکتا ہے تو شقاق بین الزوجین میں بھی اس کو خیار حاصل ہوگا؛ کیوں کہ یہاں بھی رفع ظلم ہے، اسی کے ساتھ قاضی کو ولایت عامہ حاصل ہے؛ اسی لئے شریعت نے ان کو بہت سی صورتوں میں تفریق کا اختیار دیا ہے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ نے ۸ تا ۱۲/ اپریل ۲۰۰۶ء میں عورت کے عقد نکاح کو خلع کے ذریعہ ختم کرنے کے حق کے بارے میں سیمینار کیا تھا، جس پر سعودی عرب کے ماہرین فقہ نے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ شقاق کے سبب قاضی کو تفریق کا مکمل اختیار ہوگا، فیصلے کی پانچویں شق کی عبارت یہ ہے:

''قاضی محض عورت کے مطالبہ پر شوہر کو جدائی اور معاوضہ قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا، بلکہ وہ دونوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرے گا اور

اس کے لئے دو ثالث بھیجے گا اگر دونوں ثالث اتفاق نہ کریں اور صلح مشکل ہو جائے اور قاضی کے سامنے خلع ناگزیر ہو جائے تو شوہر کو طلاق دینے کا حکم دے گا، اگر شوہر انکار کرے تو قاضی بہ عوض یا بلا عوض جس طرح بہتر سمجھے جدائی کرائے گا'' (مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے ، ص:۴۸۶)۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی قاضی کو حکمین کی کوشش کے بغیر طلاق وتفریق کی اجازت دی ہے''الحیلۃ الناجزۃ'' میں لکھتے ہیں:

''عورت اپنا مقدمہ قاضی اسلام یا مسلمان حاکم اور ان کے نہ ہونے کی صورت میں جماعت مسلمین کے سامنے پیش کرے اور جس کے پاس پیش ہو وہ معاملہ کی شرعی شہادات وغیرہ کے ذریعہ سے پوری تحقیق کرے اور اگر عورت کا دعویٰ صحیح ثابت ہو کہ باوجود وسعت کے خرچ نہیں دیتا تو اس کے خاوند سے کہا جاوے کہ اپنی عورت کے حقوق ادا کرو یا طلاق دو، ورنہ ہم تفریق کر دیں گے، اس کے بعد بھی اگر وہ ظالم کسی صورت پر عمل نہ کرے تو قاضی یا جو شرعاً اس کے قائم مقام ہو اس کی بیوی پر طلاق واقع کر دے، اس میں کسی مدت کے انتظار ومہلت کی باتفاق مالکیہ ضرورت نہیں'' (الحیلۃ الناجزۃ ر ۱۶۴)۔

یہاں اگرچہ حقوق ادا نہ کرنے کی صورت میں تفریق کا تذکرہ ہے، مگر شقاق بین الزوجین کے وقت بھی یہی حکم ہوگا کہ دونوں کی وجہ متحد ہے۔

بہتر ہے کہ دو حَکَم مقرر کئے جائیں اور وہ دونوں زوجین کے اہل خاندان سے ہوں، یعنی ایک زوج کے خاندان سے اور دوسرا بیوی کے خاندان سے، اگر زوجین کے خاندان میں حَکَم کے لائق کوئی نہ ہو تو زوجین کے پڑوسی اور متعلقین کو ترجیح دی جائے گی اور اہل جوار ومتعلقین میں بھی اگر باصلاحیت لوگ موجود نہ ہوں تو اجانب میں سے مقرر کئے جائیں گے، جب دو حَکَم مقرر کئے جائیں تو فیصلہ دونوں کی رضامندی پر موقوف ہے، کسی بات پر اگر حَکَمین کی رائے مختلف ہو جائے تو دونوں کی بات رد کر دی جائے گی۔

دو حَکَم کے بجائے اگر ایک ہی حَکَم متعین کیا جائے یا زوجین کسی ایک حَکَم پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیں تو بھی کافی ہے اور اس کا فیصلہ نافذ ہوگا؛ البتہ قاضی کی جانب سے ایک حَکَم مقرر کرنا اس وقت درست ہوگا، جب کہ وہ اجنبی ہو یا ایسا شخص ہو جس کا میاں بیوی دونوں سے برابر کا رشتہ ہو، اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کا رشتہ دار یا زیادہ قریب رشتہ دار ہو تو مالکیہ کے یہاں بالاتفاق اس ایک فرد کو حَکَم مقرر کرنا صحیح نہیں ہے:

''اور ایسے ہی حاکم کے ایک مقرر کرنے میں اختلاف ہے، لخمی جواز کے اور باجی عدم جواز کے قائل ہیں اور زیادہ راجح قول جواز ہی کا ہے، جیسا کہ ہمارے شیخ علامہ عدوی نے فرمایا'' (حاشیۃ الدسوقی: ۲ر ۲۱۵)۔

ایک حَکَم مقرر کئے جانے میں اختلاف ہو سکتا ہے، مگر مقرر ہونے کے بعد اس کے فیصلے کے نفاذ پر تمام مالکیہ کا اتفاق ہے: ''وعلی القول بمنع إقامة الواحد لو أقيم وحكم شيء لم ينقض حكمه'' (الشرح الکبیر: ۲، ۱۲۵) (ایک حَکَم کے مقرر نہ کئے جانے کے قول کے مطابق بھی اگر مقرر کر دیا جائے اور وہ کسی طرح کا فیصلہ کر دے تو اسے توڑا نہیں جائے گا)۔

## دوسرے مکتب فکر کی طرف

۷- عورت کی جانب سے اگر زیادتی ہو اور شوہر شدید حد تک بیوی کو ناپسند کرے تو اس کے لئے طلاق دے کر گوشۂ عافیت تلاش کرنا آسان ہے؛ لیکن عورت شوہر کے ظلم کا شکار ہو اور وہ اسے ثابت نہ کر سکے اور شوہر طلاق وخلع پر راضی نہ ہو تو ایسی صورت میں اس عورت کی نجات کی کیا شکل ہوگی؟ اس لئے کہ احناف، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک حَکَمین کو تفریق کا حق نہیں ہے، ظاہر ہے کہ ان ائمہ کرام کے نقطۂ نظر پر اگر عمل کیا جائے تو عورت کے گھٹ گھٹ کر، بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں اپنی قیمتی حیات ضائع کر دینے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہوگا؛ حالاں کہ رشتۂ نکاح کا ایک اہم مقصد سکون کی تحصیل اور پرلطف زندگی گذارنا ہے؛ اس لئے ہندوستان کے موجودہ حالات میں جہاں اس طرح کے سیکڑوں مسائل عورتوں کو درپیش ہیں، مالکیہ کے قول کی طرف عدول کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے؛ تاکہ شوہر کے ظالمانہ رویے سے عورتوں کو نجات مل سکے اور وہ جہاں چاہیں خوشحال زندگی بسر کر سکیں۔

بہر حال بہت پہلے ہی سے مالکیہ کے قول کی طرف عدول کرتے ہوئے فقہاء احناف فتویٰ دیتے آرہے ہیں اور آج کے دور میں بڑھتے ہوئے ظلم وزیادتی کی وجہ سے عدول الی المالکیہ ہی مناسب ہے۔

☆☆☆

# میاں بیوی کے درمیان شقاق کی صورت میں فسخ نکاح

مفتی شاہد علی قاسمی [1]

## رشتۂ نکاح میں دوام مطلوب ہے

شریعت کا مزاج یہ ہے کہ رشتۂ نکاح ایک دفعہ قائم ہونے کے بعد پھر اسے نہ توڑا جائے، اسی لئے بلا وجہ طلاق دینے کو شریعت نے ناپسند کیا ہے، اور اسے حلال چیزوں میں سب سے مبغوض قرار دیا ہے، اسی طرح عورت کی جانب سے بلا وجہ مطالبۂ خلع کو پسند نہیں کیا گیا ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس خاتون نے بلا وجہ اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کیا اس پر جنت کی بو بھی حرام ہوگی (ترمذی: ۱؍ ۱۴۲، باب ماجاء فی المختلعات)۔

اسی لئے فقہاء نے بھی بلا ضرورت مطالبۂ خلع کو مکروہ قرار دیا ہے (دیکھئے: فتح الباری ۹؍ ۳۴۹، المغنی ۷؍ ۲۴۸ وغیرہ)۔

## کیا خلع لینا عورت کا حق ہے؟

تاہم بعض مرتبہ زوجین کے درمیان کسی وجہ سے اختلاف شدید پیدا ہوجاتا ہے، یا مزاج میں ہم آہنگی نہیں ہو پاتی ہے، اور دونوں کے درمیان تفریق ہی حاجت کا درجہ اختیار کر لیتی ہے، ایسی صورت حال میں اگر مرد عورت سے گلوخلاصی چاہے تو شریعت نے اسے طلاق کا حق دیا ہے، وہ حق طلاق کا استعمال کرتے ہوئے بیوی سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے، اور اس کے لئے اسے بیوی یا قاضی یا کسی اور کی اجازت لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی ہے، اس کے مقابلہ میں عورت خلع کا حق استعمال کرنا چاہے تو وہ اس میں شوہر کی محتاج ہوتی ہے، خود سے عورت اپنے اوپر خلع واقع نہیں کرسکتی ہے، حنفیہ کے نزدیک تو خلع کی حقیقت یہی ہے کہ عورت کی طرف سے مال کی پیشکش ہو اور شوہر اس کے عوض طلاق دے دے، تب ہی عورت اپنے شوہر سے آزاد ہوسکتی ہے، البتہ مالکیہ کے نزدیک بعض صورتوں میں قاضی کے مقرر کردہ حکمین شوہر کی مرضی کے بغیر اس کی بیوی کے لئے خلع کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔ اس تمہید کے بعد سوال کا جواب یہ ہے کہ:

جس طرح طلاق کا استعمال مرد کا حق ہے، اسی طرح خلع عورت کا حق ہے، لیکن دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مرد طلاق واقع کرنے میں کسی اور کی اجازت کا محتاج نہیں ہے، جب کہ عورت اپنے طور پر خلع واقع نہیں کرسکتی ہے، اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرد کے لئے حق طلاق ایک مستقل حق ہے، اور عورت کے لئے حق خلع ایک غیر مستقل حق ہے۔ اگر سوال میں مذکور حق سے مراد استقلالی حق ہے تو پھر خلع لینے کا استقلالی حق عورت کو حاصل نہیں ہے۔

## مظلوم بیوی کے لئے گلوخلاصی کی صورت:

اگر شوہر بیوی پر ظلم و زیادتی کرتا ہو اور وہ نہ تو طلاق ہی دیتا ہو، اور نہ خلع پر آمادہ ہو تو بیوی کو چاہئے کہ معاملہ قاضی کے پاس لے جائے اور شوہر کے ظلم و زیادتی کو ثابت کرے، اگر عورت دلائل و شواہد سے شوہر کے ظلم و زیادتی کو ثابت کردے تو حنفیہ کے نزدیک قاضی شوہر کی مناسب سرزنش کرے گا، لیکن عورت کے مطالبہ پر قاضی نہ تو نکاح فسخ کرسکتا ہے اور نہ طلاق ہی واقع کرسکتا ہے، البتہ مالکیہ کے نزدیک عورت طلاق کا مطالبہ کرسکتی ہے، اور اس کے مطالبہ پر قاضی طلاق واقع کرسکتا ہے (دیکھئے: الشرح الصغیر: ۲؍ ۵۱۲)۔ ہندوستان میں چونکہ نظام عدل مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے، اور نہ ایسی کوئی قوت ہے جس سے ظلم و زیادتی کرنے والے شوہر کی سرزنش کی جائے، اس لئے ہندوستان جیسے ملک میں مالکیہ کے مسلک پر عمل کی گنجائش ہے، بلکہ ہندوستان کے دار القضاء میں یہ اور اس طرح کے بعض اور عائلی مسائل میں مسلک مالکی پر فیصلہ کیا جاتا ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الحیلۃ الناجزۃ)۔

اگر عورت شوہر کے ظلم و زیادتی کو دلائل و شواہد سے ثابت نہ کرسکے اور اسے شوہر سے شدید نفرت ہو تو حنفی نقطۂ نظر سے ایسی عورت کے لئے گلوخلاصی کی کوئی صورت نکالنا بہت مشکل ہے، گویا اس کے لئے صبر ہی ایک راستہ ہے، بہت سے بہت اگر عورت معاملہ قاضی کے پاس لے جائے تو قاضی شوہر کی مناسب سرزنش

[1] استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد

کرے گا۔ تاہم مالکیہ کے نزدیک گلوخلاصی کا راستہ موجود ہے، کیونکہ مالکیہ کے یہاں شقاق کی صورت میں قاضی کے مقرر کردہ حکمین شوہر کی مرضی اور اجازت کے بغیر خلع کا فیصلہ کر سکتے ہیں، اس کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

## شقاق لغت و اصطلاح میں:

شقاق باب مفاعلت کا مصدر ہے، جس کے معنی لغت میں سخت دشمنی واختلاف کے ہیں، الشقاق غلبة العداوة والخلاف شاقه مشاقة وشقاقاً خالفه (لسان العرب: ۷،۱۶۲) شقاق کو شقاق اس لئے کہتے ہیں کہ ہر فریق دوسرے کے مخالف پہلو (شق) کو اختیار کرتا ہے، امام راغب اصفہانی رقمطراز ہیں: الشقاق المخالفة وکونك فی شق غیر شق صاحبك (المفردات فی غریب القرآن: ۱،۳۴۸)۔

شقاق کی اصطلاحی تعریف لغوی تعریف ہی کی طرح ہے، یعنی دو فریق کے درمیان باہم سخت دشمنی، تنفر اور اختلاف کا پیدا ہو جانا، چنانچہ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

إن اصل الشقاق أن كل واحد منهما یاخذ غیر شق صاحبه (کتاب المجموع شرح المهذب: ۱۸،۹۶ کتاب النکاح)۔

شقاق کی اصل یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے مخالف گوشہ کو اختیار کرے۔

قدرے فرق کے ساتھ علامہ رازیؒ نے بھی اسی طرح کی بات کہی ہے (دیکھئے: مفاتیح الغیب ۲۰۱/۵)۔

خلاصہ یہ ہے کہ شقاق سے مراد میاں بیوی کے درمیان اتنا سخت اختلاف وتنفر کا پیدا ہو جانا ہے کہ کسی کے دل میں دوسرے کے لئے محبت کی جگہ نہ ہو، ایک دوسرے کو برداشت نہ کر سکے، اور عداوت کی چنگاری سلگتی رہے۔

## کیا یک طرفہ نفرت سے شقاق متحقق ہو جائے گا:

شقاق متحقق ہونے کے لئے جانبین کا تنفر ضروری نہیں ہے، بلکہ شوہر و بیوی میں سے کسی ایک جانب بھی نفرت کی آگ بھڑک رہی ہو تو اسے بھی شقاق کے متحقق ہونے کے لئے کافی سمجھا جائے گا، علامہ رازیؒ نے مفاتیح الغیب میں اس کی امکانی چار صورتیں ذکر کی ہیں:

''فذلك الشقاق إما أن يكون منهما أو منه أو منها أو يشكل'' (مفاتيح الغيب: ۵،۲۰۲)۔

(تو یہ شقاق یا تو دونوں کی طرف سے ہوگا، یا مرد کی طرف سے یا عورت کی طرف سے، یا معاملہ مبہم ہوگا)۔

اس لئے صحیح یہ ہے کہ شقاق کے تحقق کے لئے دو طرفہ نفرت ضروری نہیں ہے، اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو بخاری ۲/ ۷۹۴، باب الخلع وکیف الطلاق فیہ میں مذکور ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی نے رسول اللہ صلی اللہ سے درخواست کی کہ ہم زوجین کے درمیان تفریق کر دیں، حالانکہ ثابت بن قیس کو اپنی بیوی سے نفرت نہیں تھی، نفرت صرف ان کی بیوی کو تھی، تفصیل کے لئے مذکور حوالہ دیکھا جائے۔

جیسا کہ سوال نمبر ۴ کے جواب میں شقاق کی مختلف وجوہ لکھی گئیں، شقاق کی صورت میں شریعت چاہتی ہے کہ شوہر و بیوی باہمی مفاہمت اور نصیحت و تادیب کے ذریعہ معاملے کو حل کر لیں، اگر تادیب و تفہیم کی کوئی صورت کارگر نہ ہو تو آخری درجہ میں طلاق و خلع کے ذریعہ معاملہ کو ختم کر لیں، اگر شوہر و بیوی خود مسئلہ کو ختم نہ کر پائیں تو پھر بیوی معاملہ کو قاضی شریعت تک لے جائے، اگر قاضی کے پاس شقاق واضح ہو جائے اور مرد کا ظلم ثابت ہو جائے تو قاضی شوہر کی مناسب سرزنش کرے، اگر سرزنش بھی کارگر نہ ہو اور شقاق بڑھتا جا رہا ہو نیز شوہر طلاق یا خلع پر آمادہ نہ ہو تو قرآن نے اس کا حل یہ بتایا ہے کہ قاضی دو حکم مقرر کرے ایک حکم شوہر کی طرف سے اور ایک حکم بیوی کی طرف سے، اور حکمین کی کوشش بلکہ آخری کوشش دونوں کے درمیان مصالحت کی ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما'' (النساء: ۳۵)۔

مگر اس آیت میں حکمین کا اصل فریضہ مصالحت کرنا بتایا گیا ہے، چنانچہ امام جصاص رازی حنفی لکھتے ہیں: ''فالحكمان إنما يبعثان للصلح بينهما'' (أحكام القرآن: ۲،۲۲۱)۔ حکمین زوجین کے درمیان صلح کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔

الفاظ کے قدرے فرق کے ساتھ یہی بات ائمہ ثلاثہ کے یہاں بھی ملتی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: حاشیۃ الدسوقی: ۲/ ۳۴۳، مغنی المحتاج: ۳/ ۲۶۱، الاقناع: ۳/ ۴۳۹)۔

تاہم اگر حکمین کی مصالحتی کوشش ناکام ہو جائے تو کیا حکمین شوہر کی مرضی کے بغیر خلع کا فیصلہ کر سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء کے دو نقاط نظر ہیں، ایک یہ

کہ ایسے حکمین کو تفریق کا حق حاصل نہیں ہے، اگر حکمین تفریق ہی کردیں تو یہ غیر معتبر ہوگا، یہ رائے احناف کی ہے، شوافع کا قول راجح اور حنابلہ کا قول صحیح بھی یہی ہے، مذہب حنفی کی ترجمانی کرتے ہوئے امام جصاص رازی فرماتے ہیں: ''قال أصحابنا أنهما لايجوز خلعهما إلا برضى الزوجين'' (أحكام القرآن: ۲،۲۲۹)۔ (ہمارے اصحاب مذہب نے کہا کہ حکمین کے لئے جائز نہیں ہے کہ زوجین کی رضامندی کے بغیر خلع کا فیصلہ کریں)۔

مسلک شافعی کی ترجمانی کرتے ہوئے شافعی فقیہ علامہ عمرانی تحریر فرماتے ہیں: ''هل هما وكيلان من قبل الزوج أو حكمان من قبل الزوجين أو حكمان من قبل الحاكم؟ فيه قولان أحدهما أنهما وكيلان من قبل الزوجين ... فعلى هذا لابد أن يؤكل كل واحد منهما الحكم من قبله على الجمع أو التفريق'' (البيان: ۹،۲۲،۵۲۲، كتاب الصداق، باب النشوز)۔

شوافع کا یہی قول اظہر ہے (دیکھئے روضۃ الطالبین: ۷/۱۷۱، کتاب عشرۃ النساء)۔

مسلک حنبلی پر روشنی ڈالتے ہوئے مقدسی حنبلی فرماتے ہیں کہ حکمین کو زوجین کی مرضی کے بغیر تفریق کا حق نہیں ہے چنانچہ موصوف رقمطراز ہیں: ''ففي إحدى الروايتين أنهما وكيلان لهما ولا يملكان التفريق إلا بإذنهما'' (الشرح الكبير مع المقنع والإنصاف: ۲۱،۸۰،۴۷۹)۔

علامہ مرداوی نے متعدد فقہاء حنابلہ سے نقل کیا ہے کہ یہ روایت زیادہ صحیح ہے (دیکھئے: الانصاف مع المقنع والشرح الکبیر: ۲۱/۴۷۹)۔

اس مسئلے میں دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حکمین کو اس بات کا اختیار ہے کہ زوجین کے درمیان تفریق کردیں، یہ مالکیہ کا مسلک، متعدد فقہاء شوافع کا قول اور حنابلہ کی ایک روایت ہے چنانچہ مالکی فقیہ علامہ دردیر فرماتے ہیں: ''إن تعذر الإصلاح، طلقا أي حكما بالطلاق ونفذ حكمهما ظاهرا وباطناً وإن لم يرضيا أي الزوجان بحكمهما أو لم يرض الحاكم به'' (الشرح الصغير: ۲،۵۱۲)۔

شوافع کا قول نقل کرتے ہوئے علامہ عمرانی شافعی رقمطراز ہیں: ''والثاني أنهما حكمان من قبل الحاكم فعلى هذا لايفتقر إلى رضى الزوجين'' (البيان: ۵،۵۲۲)۔

گوکہ شوافع کا راجح قول پہلا والا ہے یعنی احناف کے مطابق، تاہم دوسرے قول۔ جو مالکیہ کے مطابق ہے۔ کو متعدد فقہاء شوافع نے اختیار کیا ہے واختارہ جمع (زاد المحتاج: ۳/۳۲۳)۔

حنابلہ کی دوسری رائے نقل کرتے ہوئے علامہ مقدسی فرماتے ہیں: والثانية أنهما حاكمان ولهما أن يفعلا ما يريان من جمع وتفريق بعوض وغير عوض ولايحتاجان إلى توكيل الزوجين ورضاهما (الشرح الكبير مع المقنع والانصاف: ۲۱،۴۷۰)۔

ابن ہبیرۃ علامہ زرکشی اور شیخ تقی الدین حنبلی نے اسی قول کو مختار کہا ہے (الانصاف مع المقنع والشرح الکبیر: ۲۱/۴۸۲)۔

جہاں تک شقاق کی وجہ سے خود قاضی کے فیصلہ کرنے کی بات ہے، تو راقم الحروف نے مسالک اربعہ میں سے کسی مسلک میں اس کا جواز نہیں دیکھا کہ قاضی خود زوجین کے درمیان خلع کے ذریعہ تفریق کردے، بلکہ جن فقہاء نے بھی شقاق کی وجہ سے شوہر کے علی الرغم خلع کے ذریعہ تفریق کی اجازت دی ہے وہ سب اس کے لئے حکمین کے تقرر کو ضروری قرار دیتے ہیں جیسا کہ سابقہ عبارات سے بھی یہ واضح ہے، نیز ان فقہاء کے سامنے اللہ کا وہ ارشاد ہے جس میں حکمین کے تقرر کا حکم دیا گیا ہے: وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها (النساء: ۳۵)۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر حکم کے تقرر کا حکم دیا ہے اس لئے فقہاء نے اس آیت کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے شقاق کے فیصلے کو حکمین سے مربوط رکھا ہے۔

## ایک حکم کا تقرر

کیا دو حکم کا تقرر ضروری ہے؟ یا ایک حکم بھی کافی ہے؟ اس میں بھی اہل علم کا اختلاف ہے۔ مالکیہ کے یہاں دونوں طرح کی آراء ہیں، ایک یہ کہ دو کا تقرر ضروری ہے، مالکیہ میں علامہ باجی کا یہی نقطۂ نظر ہے جب کہ علامہ لخمی ایک حکم کے جواز کے قائل ہیں، اور مالکیہ کے یہاں یہی قول راجح ہے، چنانچہ ابن عرفہ دسوقی فرماتے ہیں: ''وكذا في إمامة الحاكم واحداً ... تردد ... فاللخمي يقول بالجواز والباجي يقول بعدمه، الأظهر من القولين القول بالجواز كما قال شيخنا العدوى'' (حاشية دسوق: ۲،۲۱۵ باب في النكاح)۔

اور ایسے ہی حاکم کے ایک حکم مقرر کرنے میں اختلاف ہے..... لخمی جواز کے اور علامہ باجی عدم جواز کے قائل ہیں، اور زیادہ راجح قول جواز ہی کا ہے، جیسا کہ ہمارے شیخ علامہ عدوی نے فرمایا۔

البتہ فقہاء مالکیہ کا یہ اختلاف صرف اس صورت میں ہے جب کہ قاضی حکم مقرر کرتے ہوئے کسی اجنبی کا تقرر کرے، یا ایسے شخص کو حکم بنائے جس کا رشتہ زوجین سے برابر درجے کا ہو، اگر مقرر کیا جانے والا حکم زوجین میں سے صرف کسی ایک کا رشتہ دار ہو، یا رشتہ دونوں سے ہو لیکن ایک فریق سے زیادہ قریبی رشتہ ہو تو پھر بالاتفاق ایک شخص کو حکم مقرر کرنا صحیح نہیں ہے، علامہ دردیر مالکی رقمطراز ہیں: ''محله في الأجنبي كما أشرنا إليه. وكذا فيما يظهر حيث كان قريبا لهما معاً قرابة مستوية كابن عم لهما. وأما إن كان قريباً لأحدهما أو أقرب منه اتفاقا'' (الشرح الكبير مع حاشية الدسوقي: ۳/۱۲۵)۔

نیز جن فقہاء مالکیہ نے ایک حکم کے مقرر کئے جانے کو درست تسلیم نہیں کیا ہے، ان کے یہاں بھی اگر قاضی ایسا ہی کردے، یعنی ایک ہی حکم کا تقرر کردے، اور حکم کوئی فیصلہ کردے تو اس کا فیصلہ معتبر ہوگا، علامہ دردیر تحریر فرماتے ہیں: ''وعلى القول بمنع إقامة الواحد. لو أقيم وحكم شئ لم ينقض حكمه'' (حوالہ سابق)۔

یہ تفصیل تو فقہاء مالکیہ کی تھی، فقہاء شوافع کے نزدیک دو حکم کا تقرر ضروری ہے، خطیب شربینی شافعی فرماتے ہیں: ''اقتضى كلام المصنف عدم الاكتفاء بحكم واحد، وهو الأصح لظاهر الآية'' (مغني المحتاج: ۳/۲۶۱)۔

تاہم جیسا کہ تحریر کیا گیا کہ مالکیہ کے راجح قول کے مطابق ایک حکم کا تقرر بھی کافی ہے، مناسب ہے کہ اسی قول کو اختیار کیا جائے، کیونکہ راقم الحروف کے نزدیک شقاق کی وجہ سے تفریق فقہاء مالکیہ کا متفقہ قول ہے، اور جیسا کہ سوال ۷ کے جواب میں تفصیل آرہی ہے کہ اس مسئلہ میں مسلک مالکی کی پیروی کی جائے گی، تو جب نفس تفریق میں مالکی مسلک کی اتباع کریں گے تو اس مسئلہ سے مربوط دوسرے جزوی مسائل میں بھی مسلک مالکی ہی کی پیروی کی جائے گی، اور مالکیہ کا راجح قول حکمین کے بجائے ایک حکم کے تقرر کے جواز کا ہے، اس لئے ایک حکم کے تقرر کو جائز سمجھا جائے گا، بشرطیکہ ایک حکم کے تقرر کی شرطیں پائی جائیں، یعنی یہ کہ وہ ایک حکم جسے قاضی مقرر کررہا ہے وہ اجنبی ہو، یعنی اس کا زوجین سے رشتہ نہ ہو، اور اگر رشتہ ہو تو دونوں سے ہو اور برابر کا رشتہ ہو، اگر حکم کا رشتہ زوجین سے برابر کا نہ ہو تو پھر ایک حکم کا تقرر کافی نہیں ہے۔

## حکمین سے متعلق شرائط:

اس موقع پر مناسب ہے کہ حکمین سے متعلق جو شرائط فقہاء مالکیہ بیان کرتے ہیں انہیں ذکر کردیا جائے، چنانچہ وہ شرطیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ اگر شوہر اور بیوی کے خاندان میں کم از کم ایک ایک فرد ایسا ہو جس میں حکم بننے کے مطلوبہ اوصاف پائے جاتے ہوں تو پھر انہیں کو حکم بنانا ضروری ہے، اگر قاضی اجنبی کو حکم بنا بھی دے تو اس کا فیصلہ معتبر نہیں ہوگا۔

۲۔ اگر دونوں کے اہل خاندان میں سے ایک ایک کو حکم بنانا کسی وجہ سے ممکن نہ ہو تو اجنبی افراد کو حکم مقرر کرنا درست ہے (دیکھئے: بلغۃ السالک بہامش الشرح الصغیر: ۲/۵۱۳)۔

اجنبی کو حکم مقرر کئے جانے کی صورت میں مالکیہ کے یہاں مستحب ہے کہ دونوں اجنبی حکم زوجین کے پڑوسی ہوں، کیوں کہ پڑوسی اپنے پڑوسی کے حال سے دوسروں کے مقابلہ زیادہ واقف ہوتا ہے۔

۳۔ حکمین مسلمان ہوں۔

۴۔ عادل ہوں۔

۵۔ رشید یعنی سمجھ دار ہوں۔

۶۔ مرد ہوں۔

۷۔ بالغ ہوں۔

۸۔ آزاد ہوں۔

۹۔ نکاح وطلاق بالخصوص نشوز کے احکام سے واقف ہوں (التاج الاکلیل بہامش مواہب الجلیل: ۵/ ۲۶۴)۔

۱۰۔ حکمین بہ اتفاق رائے تفریق کا فیصلہ کریں، اگر ایک حکم تفریق کا فیصلہ کرے اور دوسرا اس کے خلاف، یا ایک خلع کا فیصلہ کرے اور دوسرا طلاق بلا مال کا تو ایسی صورت میں ان دونوں کا فیصلہ غیر معتبر ہوگا (الجامع لأحکام القرآن ۵/ ۱۷۷)۔

سابقہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہوچکی کہ احناف کے نزدیک قاضی یا اس کے مقرر کردہ حکمین زوجین کے درمیان شقاق کی وجہ سے تفریق اور خلع کا فیصلہ اپنے طور پر نہیں کرسکتے ہیں، اور شوافع وحنابلہ کے یہاں دونوں طرح کے اقوال ہیں، البتہ مالکی فقہاء اس کی اجازت پر متفق ہیں، راقم الحروف کے نزدیک دو بنیادی وجوہ سے مسلک مالکی کو اختیار کرنے کی گنجائش ہے:

پہلی وجہ: شقاق کی صورت میں قاضی کے حکمین کا زوجین کی مرضی کے بغیر خلع کا فیصلہ کرنا قوی دلیل سے ثابت ہے، اس سلسلے کی چند دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) آیت شقاق: ''وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما'' الخ (النساء: ۳۵)۔ میں خطاب قضاۃ وحکام کو ہے، سعید بن جبیر، امام ضحاک، اکثر مفسرین اور حنفی مفسر قرآن علامہ ابوبکر جصاص رازی کی یہی رائے ہے، اب ظاہر ہے کہ قاضی وحاکم محض اخلاقی اپیل نہیں کرتا ہے، بلکہ اس کا منصب یہ ہے کہ جو لوگ وعظ ونصیحت کی زبان سمجھنے پر آمادہ نہ ہوں تو ان کے لئے قانون اور اختیارات کی تلوار استعمال کی جائے، اس لئے اگر قاضی کے حکمین کو اس کا اختیار نہ ہو تو پھر آیت کریمہ میں قاضی کو خطاب کرنے اور قاضی کی طرف سے حکمین کی تقرری بے معنی بات ہوگی۔

۲۔ ثابت بن قیسؓ کا مشہور واقعہ ہے، جیسا کہ امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے ثابت بن قیس کے دین واخلاق سے کوئی شکایت نہیں ہے، لیکن مجھے یہ بات بھی پسند نہیں ہے کہ مسلمان ہوکر کسی کی ناشکری کروں، یعنی ایک طرف ثابت کا میرے ساتھ اچھا سلوک ہے، دوسری طرف میرا ان کی طرف طبعی رجحان نہیں ہے، جس کے باعث میری طرف سے ان کی ناقدری ہوتی ہے، اس لئے ہم دونوں میں علاحدگی کردی جائے آپ نے فرمایا کہ کیا تم اس کو اس کا باغ لوٹا دوگی؟ انہوں نے کہا: ہاں آپ نے حضرت ثابت سے فرمایا کہ باغ لے لو اور اس کو طلاق دو (دیکھئے: صحیح بخاری: ۲/ ۷۹۴، باب الخلع وکیف الطلاق فیہ)۔ اس حدیث میں قابل غور بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابتؓ سے اپیل نہیں کی، نہ مشورہ کیا، بلکہ طلاق دینے کا حکم فرمایا یہ اس بات کی علامت ہے کہ قاضی مرد کی رضامندی اور آمادگی معلوم کرنے کا پابند نہ ہوگا، بلکہ اپنی صوابدید کے مطابق نافذ کرے گا، اور نافذ کرنے کی دونوں ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، یعنی یا تو خود مرد اس کے لئے تیار ہوجائے اور طلاق دے دے جیسا کہ اس واقعہ میں ہوا، یا پھر قاضی خود علاحدہ کردے۔

۳۔ مصنف عبد الرزاق میں ہے: ''عن ابن عباس قال: بعثت أنا ومعاوية حكمين فقيل لنا: إن رأيتما أن تجمعا جمعتما، وإن رأيتما أن تفرقا فرقتما'' (مصنف عبد الرزاق: ۶، ۵۱۲، کتاب الطلاق)۔

ابن عباسؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ مجھے اور معاویہ کو حکم بنا کر بھیجا گیا تو ہم سے کہا گیا کہ اگر تم مصالحت کرادینے میں بہتری سمجھو تو ویسا ہی کرنا، اور اگر تمہارے خیال میں تفریق صحیح ہو تو تفریق کردینا۔

اس اثر صحابی میں حکمین کی ذمہ داری واضح طور پر بتلائی گئی کہ مصالحت ممکن نہ ہو تو تفریق کردینے میں مضائقہ نہیں ہے، اس میں کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ہے کہ زوجین کی رضامندی حاصل کی جائے، بلکہ حکمین اپنی صوابدید پر تفریق کرسکتا ہے۔

۴۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے ایک میاں بیوی کے معاملہ میں حکمین سے ان کی ذمہ داری بتلاتے ہوئے فرمایا: ''قال للحكمين: تدريان ما عليكما، عليكما إن رأيتما أن تجمعا أن تجمعا وإن رأيتما أن تفرقا أن تفرقا'' (السنن الکبری للبیہقی، کتاب القسم والنشوز، حدیث نمبر ۱۴۷۸۲)۔

حضرت علیؓ نے حکمین سے فرمایا: تمہیں معلوم بھی ہے کہ تمہاری کیا ذمہ داری ہے؟ تمہاری ذمہ داری ہے کہ اگر تم دونوں کے درمیان مصالحت کرسکتے ہو تو کردینا، اور اگر تفریق مناسب ہو تو تفریق ہی کردینا۔

اس اثر علیؓ سے بھی یہ بات واضح ہے کہ حکمین کے اختیارات میں یہ بھی ہے کہ زوجین کی مرضی ہو یا نہ ہو تفریق مناسب ہو تو حکمین تفریق کردیں۔

دوسری وجہ:

مسلک مالکی پر عمل کی دوسری وجہ یہ ہے کہ گو احناف کے یہاں حکمین کے لئے خلع واقع کرنے کی گنجائش نہیں ہے، لیکن قابل غور پہلو یہ ہے کہ شوہر کے لئے تو راہ کھلی ہے کہ اگر مسئلہ کا کوئی حل نہ نکل سکے اور وہ عافیت اس رشتہ کو ختم کردینے میں ہی سمجھے تو طلاق کے ذریعہ ختم کردے، لیکن اگر عورت شوہر کے ظلم کی شکار ہو، اور وہ شوہر کے ظلم کو ثابت نہ کرسکے اور شوہر نہ تو طلاق دینے پر آمادہ ہو اور نہ ہی خلع پر، تو ایسی صورت میں اگر عورت کے لئے کوئی راہ نہ نکالی جائے، تو وہ پوری زندگی گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوگی، اور جب وہ محسوس کرے گی کہ میرے پاس شوہر سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں ہے تو ممکن ہے کہ وہ خودکشی کرتا، خصوصاً ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے، اور دار القضاء کو قوت تنفیذ حاصل نہیں ہے، ایسے حالات میں شوہر کو لگام دینے اور عورت کو ظلم سے بچانے کی کوئی صورت نہیں ہے، اس لئے موجودہ حالات کے تناظر میں مسلک مالکی کی طرف عدول کی گنجائش ہے۔

بعض فقہاء احناف نے بھی صراحت کی ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں مذہب کا قول ضعیف ہو اور دوسرے مذہب کا قول راجح، تو اپنے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب کی اتباع و پیروی جائز ہے۔

"جب (مجتہد) اپنے امام کے مذہب کے خلاف قول کو دلائل کے اعتبار سے قوی اور راجح محسوس کرے تو اس کی طرف عدول کرسکتا ہے، کیونکہ مکلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع پر مامور ہے، یہ رائے اس کے مطابق ہے جو امام احمد اور امام قدوری سے منقول ہے، اور اسی راہ پر علماء کا ایک گروہ چلا ہے، جن میں ابن صلاح اور ابن ہمدان بھی ہیں" (تیسیر التحریر: ۴/۲۵۵)۔

علامہ ابن ہمام نے بھی متعدد مسائل میں امام ابوحنیفہ کی رائے سے قوت دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا ہے، اور یہ اہل علم پر مخفی نہیں ہے، فقہاء متقدمین میں عصام بن یوسف کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بہت سی جزئیات میں اور خود رفع یدین کے مسئلہ میں حنفی ہونے کے باوجود امام ابوحنیفہؒ کی رائے سے عدول کرتے تھے (دیکھئے: الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیۃ: ۴۸)۔

نیز زمانہ و حالات کی تبدیلی اور مقتضیات زمانہ کی وجہ سے بھی بعض مرتبہ جزوی طور پر ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف عدول ناگزیر ہوجاتا ہے، علامہ شامی رقمطراز ہیں: بہت سے احکام ہیں جو زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدل جاتے ہیں، اس لئے کہ اہل زمانہ کا عرف بدل جاتا ہے، نئی ضرورتیں پیدا ہوجاتی ہیں، اہل زمانہ میں فساد (اخلاق) پیدا ہوجاتا ہے، اب اگر حکم شرعی پہلے ہی کی طرح باقی رکھا جائے تو یہ مشقت اور لوگوں کے لئے ضرر کا باعث ہوجائے گا اور ان شرعی اصول و قواعد کے خلاف ہوجائے گا جو سہولت و آسانی اور نظام کائنات کو بہتر اور عمدہ طریقے پر رکھنے کے لئے ضرر و فساد کے ازالہ پر مبنی ہیں (رسائل ابن عابدین: ۱/۱۲۶)۔

پس شقاق کی بنیاد پر حکمین کے فیصلۂ خلع کے بارے میں مالکیہ کی دلیل کے قوی ہونے، نیز ہندوستان جیسے ملک میں ضرورت کا درجہ اختیار کرلینے کی وجہ سے مذہب حنفی کو چھوڑ مذہب مالکی کی طرف عدول درست ہے، بلکہ ایک اہم سماجی ضرورت ہے۔

☆☆☆

# مرد کے لیے طلاق کا حق، عورت کے لیے کیا؟

مولانا محمد اعظم ندوی[1]

یہ اعتراض کوئی نیا نہیں، ایک زمانہ سے اسلام دشمن حلقوں کے علاوہ خود ناواقف مسلمانوں کو اور بسا اوقات نام نہاد واقف کاروں کو بھی اسلام کا یہ قانون خلاف عقل معلوم ہوتا ہے کہ شوہر کے لیے تو بیوی سے گلوخلاصی کی راہ موجود ہے، اور وہ ہے طلاق، یہ اور بات ہے کہ اس کی مثال مشہور عربی مثل "آخر الدواء الکی" (آخری علاج داغنا ہے) کی ہے، اور ہر حال میں مستحسن نہیں، اور یہ کہ اس کے بھی آداب ہیں، اور ان کی آداب کی جتنی زیادہ رعایت کی جاتی ہے، عورت کی دشواریاں کم سے کم تر ہوتی جاتی ہیں، لیکن ایک بیوی کے لیے جب کہ وہ ایسی صورت حال سے دوچار ہو، اور ناموافق شوہر کا جوا اپنے سر سے اتارنا چاہتی ہو تو اسلام میں اس کے لیے طلاق کی طرح کوئی آسان حل موجود نہیں، جب کہ کرامت انسانی کا تاج دونوں کے سر پر ہے، ایک کے وجود سے زندگی کے ہنگامے ہیں تو دوسرے کے وجود سے تصویر کائنات میں رنگ ہے، اور بہت سے احکام میں دونوں یکساں ہیں، اسی لیے حدیث میں فرمایا گیا: ''إن النساء شقائق الرجال'' (ترمذی: ۱۱۳) (عورتیں مردوں کی ہم سر ہیں)۔

یہ تاریخ کا روشن ترین زمانہ ہے کہ بیچاری ستم رسیدہ عورت جس کا وجود ہی باعث ننگ و عار تھا، اور مختلف قوموں میں اسے بدی اور نحوست کی علامت سمجھا جاتا تھا، اسلام نے اس کی عظمت بحال کی، اور معاشرتی زندگی میں جہاں کچھ حقوق مرد کو دیئے تو کچھ عورت کے لیے بھی خاص کئے، اور مردوں سے زیادہ عورتوں کے حقوق کا تذکرہ کیا، اور بڑے صاف صاف لفظوں میں کیا، عجب کہ جس مذہب نے انصاف کو اپنے دستور میں سب سے بنیادی اہمیت دی اسی مذہب کے قوانین کا تجزیہ اور اس پر تبصرہ و تنقید کا دروازہ کھول دیا گیا، تحریک نسواں (Feminism) نے یک طرفہ سوچنے والوں کو یہ حوصلہ دیا کہ انہوں نے عورتوں سے متعلق ایک ایک قانون میں موشگافیاں شروع کردیں، اگر وہ ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے کہ عورتوں کے لیے اسلامی قوانین میں سہولتیں کیا کیا ہیں تو شاید انصاف کی سرحدوں سے آگے نہ جاتے، مثلاً شادی کے نتیجے میں ملنے والے حقوق پر غور کرتے وقت یہ کیوں نہ سوچا کہ اسلام مرد سے تو مہر دلواتا ہے، عورت پر کوئی مالی ذمہ داری کیوں نہیں؟ زندگی بھر کے نان و نفقہ کا ذمہ دار مرد ہے، عورت بھی تو ہوسکتی تھی؟ بال بچوں کی تعلیم و تربیت، شادی بیاہ کے مسائل باپ سے جڑے ہوئے ہیں، عورت سے کیوں نہیں؟ خدا نہ کرے "حریت مرداں" کی کوئی تحریک اٹھے اور ان مسائل پر غور کرنا شروع کردے، چونکہ ہر دور میں کچھ لال بجھکو ضرور ہوتے ہیں جو خالص عقلیت پسند ہوتے ہیں، اور جو بات عقل میں نہ آئے اسے ٹھکرا دیتے ہیں، یہ عقل کا استعمال نہیں، اپنے فکر و عقیدہ سے عشق ہے جو کسی حق بات کو تسلیم کرنے کے دروازے بند رکھتا ہے، عورتوں کے سلسلہ میں امریکہ اور یورپی ممالک میں بطور خاص جو آزادانہ رویہ اختیار کیا گیا؛ اس نے فکر و نظر کی پاکیزگی کو تباہ کرکے رکھ دیا، اور خیال کی آزادی جو ایک انمول تحفہ سمجھی جاتی تھی، اب سراب نظر آتی ہے، بیسویں صدی کے نصف آخر میں امریکہ میں "تحریک نسواں" کو فروغ ملا، اس تحریک نے عورت کو متاع بازار بنادیا، اور حد تو یہ ہوئی کہ ناجائز حمل کا بازار گرم ہوگیا، اور اس کی وجہ سے اسقاط حمل کا سلسلہ شروع ہوگیا، اسقاط حمل کی صنعت (Aborion Industry) جاری ہوگئی، اور برائی اتنی بڑھ گئی کہ امریکہ کے مشہور شہر "لاس وگاس" (Las Vegas) کو معصیت آشنا شہر (Sin City) کہا جانے لگا (savior,com_is_ www.jesus:Feminism is evil)، حقیقت یہ ہے کہ کسی بات کا فطرت انسانی کے مطابق ہونا اور بات ہے اور کسی کی عقل میں نہ آنا اور بات ہے، اس میں قصور عقل کا ہے، قانون کا نہیں، دنیا کا سب سے آسان کام کسی بات کا غلط کہہ دینا ہے، لیکن دنیا کا سب سے مشکل کام اس کو غلط کہنے کی معقول وجہ بیان کرنا ہے، اسلام کا نظام اپنے اندر جمال بھی رکھتا ہے، قوت بھی اور عدالت بھی، مثلاً مرد کو ہی طلاق کا حق ہے، تو طلاق سے پہلے اور اس کے بعد بے شمار نزاکتیں اس سے جڑی ہوئی ہیں، ایک بول پر مرد کا حق ہے، لیکن اس سے پیدا ہونے والے بیشتر مسائل میں لحاظ صنف نازک کا ہے، اب اگر کوئی مرد اس حق کا ناجائز استعمال کرے، تو نقص قانون کا نہیں، مرد کے طریقۂ استعمال کا ہے، الزام اس مرد کو دینا چاہئے جو بے

سبب اس حق کا استعمال کرتا ہے، نہ اس قانون کو جو یہ حق فراہم کرتا ہے اور اس کے استعمال کے آداب بھی بتاتا ہے۔

اسلام میں میاں بیوی میں علاحدگی کے کئی طریقے ہیں، ایک علاحدگی وہ ہے جو زن وشوہر کے اتفاق سے وجود میں آتی ہے، اور دونوں اس بات پر رضامند ہوتے ہیں کہ ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوجانا چاہئے، یہ خلع ہے، دوسرا طریقہ وہ ہے جس میں مرد الگ ہونا چاہتا ہے عورت عام طور سے نہیں چاہتی، یہ طلاق ہے، یا عورت چاہتی ہے اور مرد عام طور سے نہیں چاہتا، یہ قاضی کے ذریعہ کرایا گیا فسخ ہے، یہ نظام اس بات کی شہادت ہے کہ رشتۂ زوجیت کو ختم کرنے کا حق مرد کے ہاتھ میں ہی نہیں، بلکہ حالات کے اعتبار سے عورت کو بھی یہ حق ملتا ہے، طلاق جب مرد کی طرف سے ہو تو شریعت عورت کو مالی معاوضہ فراہم کراتی ہے، چنانچہ عورت عدت کا نفقہ بھی پاتی ہے، اسے مہر بھی دیا جاتا ہے، یا بعض صورتوں میں متعہ کا جوڑا بعض حضرات کے نزدیک تو ہر مطلقہ کو متعہ کا جوڑا بھی دیا جائے گا، چونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وللمطلقات متاع بالمعروف حقا على المتقين'' (البقرہ: ۲۴۱)، (جن عورتوں کو طلاق دی گئی، ہو انہیں مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے، یہ حق ہے متقی لوگوں پر) اور طلاق عورت کے مطالبہ پر ہو تو قاضی اس کے لیے راہ ہموار کرتا ہے، اور اگر نشوز (ترفع اور حق تلفی) مرد کی جانب سے ہو تو عورت کو پورے حقوق بھی دلواتا ہے، یا معمول کے حالات میں عورت اپنی مرضی سے خود بدل دے کر اپنے آپ کو آزاد کراتی ہے، یہی خلع کہلاتا ہے، اسلامی شریعت میں عورت کو قاضی کی وساطت کے بغیر بھی طلاق کا حق ہے، اور بالکل اسی طرح جیسے مرد کو، اور اس وقت جبکہ اگر عورت عقد نکاح میں اس کی شرط لگالیتی ہے، اور خود بھی مرد کی طرح طلاق کا حق لے لیتی ہے۔

قانون کے سمجھنے میں غلطی اس وقت ہوتی ہے جب اسے مکمل دستور پر نظر کیے بغیر اس کے کسی ایک دفعہ کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے، دفعات کے درمیان جو ربط وتعلق ہے، اس پر بھی توجہ دینا ضروری ہے، شریعت کی تمام نصوص جب تک سامنے نہ ہوں گی، حقیقت سامنے نہیں آسکتی، نظام طلاق کا بھی یہی مسئلہ ہے، اسلام نے مرد وعورت دونوں کو یہ حق الگ الگ انداز سے دیا ہے، عورتوں کو محروم کرنے کا الزام سطحی مطالعہ کا نتیجہ ہے، شیخ محمد غزالی نے لکھا تھا: ''فی الوقت الذی تحتج فيه المرأة المصرية على الطلاق، تحتج المرأة الإنجليزية على أبدية الزواج'' (المفصل فی الرد على شبهات اعداء الاسلام. علی بن نایف شحود. ص: ۲۲۸)۔ (اعتراض اگر مصری عورت کو مرد کی طرح طلاق کا حق نہ ملنے پر ہے، تو دوسری طرف ایک انگریز عورت کو ہمیشہ نکاح کے بندھن میں بندھے رہنے پر ہے) ایک مصری عورت تو رشتۂ نکاح کو ختم کرسکتی ہے، لیکن عیسائیت کا قانون ایسا ہے کہ ایک عیسائی انگریز عورت کبھی رشتہ نکاح سے الگ نہیں ہوسکتی)۔

اسلام میں طلاق کی بعض صورتوں میں رجعت کا حق بھی عورتوں کے ہی حقوق کے تحفظ کے لیے ہے، پھر یہ کہ مرد جب چاہے رجعت نہیں کرسکتا، عدت کے اندر ضروری ہے، تاکہ عورت کی ذات کھلواڑ نہ بن جائے جیسا کہ جاہلیت کے زمانہ میں ہوتا تھا، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م: ۱۷۶۲ء) نے لکھا ہے:

''كان أهل الجاهلية يطلقون ويراجعون إلى متى شاءوا، وكان في ذلك من الأضرار مالا يخفى'' (حجة الله البالغة: ۱/۷۱۶)، مکتبہ دار الكتب الحديث، قاهره۔ (جاہلیت کے زمانہ میں لوگ طلاق دیتے تھے اور جب تک چاہتے تھے رجوع کرتے تھے، اور اس کے نقصانات پوشیدہ نہیں) پھر فطری طور پر عورت کی دماغی صلاحیت عام طور سے مرد جیسی نہیں ہوتی، یہ اور بات ہے کہ بعض مرد اپنی صلاحیتوں کا استعمال نہیں کرتے اور بعض عورتیں اپنی تمام تر صلاحیتیں استعمال کرتی ہیں، اور نتیجہ یہ نظر آتا ہے کہ وہ مردوں سے فائق ہوجاتی ہے، ایک جائزہ کے مطابق مرد اپنے دماغ کا بایاں حصہ زیادہ استعمال کرتا ہے، جس حصہ میں عقل اور واقعیت کا غلبہ ہے، اور عورتیں دماغ کے دائیں حصہ کا استعمال کرتی ہیں، جس میں نازک خیالی اور جذبات زیادہ ہوتے ہیں، اور نتیجہ ظاہر ہے، اسی لیے شریعت نے اس فطری تفاوت کو ملحوظ رکھتے ہوئے احکام جاری کئے ہیں، طلاق کا فیصلہ مرد کے ہاتھ میں ہے، اور عورت کو یہ حق اس مرحلہ وار کاروائیوں (Procedure) کے ساتھ دیا گیا ہے، جو اس کی جذباتی فطرت سے زیادہ ہم آہنگ ہے، یہ اس کا عیب نہیں، اس کی جمالیاتی خوبی ہے، شریعت نے اس کی نزاکت کا خیال رکھا ہے۔

ایک طرف اسلام کا یہ صاف شفاف اور مبنی برانصاف نظام دیکھئے دوسری طرف حال یہ ہے کہ بعض مغربی ممالک نے طلاق پر پابندی لگا رکھی تھی، جب ان پر اپنی غلطی منکشف ہوئی تو طلاق کا حق عام کردیا، ۱۹۷۱ء میں یہ قانون جیسے ہی عام ہوا، اطالوی عدالتوں میں ایک ملین سے زیادہ طلاق کی درخواستیں داخل ہوگئیں، اور طلاق ایک عام بات ہوگئی، یہاں تک کہ اس اقدام پر مبارکبادی کے کارڈ بازاروں میں فروخت ہونے لگے، جس پر لکھا ہوتا تھا، ''طلاق دینا مبارک''، ''آزادی کی زندگی مبارک''، ''ہمیں آپ کی آزادی پر رشک ہے'' یہ سب نتیجہ تھا صنفی فرق کا لحاظ کئے بغیر عورتوں کو بالکل مردوں کی طرح اس حق سے نوازے جانے کا، جو اس کی طبع نازک سے ہم آہنگ نہ تھا، جب تیونس میں یکساں طور پر مرد وعورت دونوں کو یہ حق فراہم کیا گیا تو طلاق کا تناسب دو چند ہوگیا، چنانچہ قانون

میں تبدیلی لانی پڑی، اور معلوم ہوا کہ زیادہ تر عورتوں نے جذباتی ردعمل میں اپنے شوہروں کو طلاق دی تھی، اور بعد میں ندامت و پشیمانی کے آنسو بہا رہی تھیں:

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اسلام نے عورتوں کے لیے نکاح کو ختم کرنے کے متعدد راستے رکھے ہیں جیسے تفویض طلاق، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شوہر نے طلاق کا حق اپنی بیوی یا کسی دوسرے عاقل بالغ شخص کے ہاتھ میں دے دیا۔ دوسرا فسخ نکاح ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ زیر بحث مقدمہ ایک اسباب کے فسخ پائے جانے کی صورت میں قاضی علیحدگی کا فیصلہ کردے اور تیسرا راستہ خلع ہے۔

خلع:...... عورت کے لیے اپنے شوہر سے ازدواجی رشتہ کو ختم کرنے کا تیسرا طریقہ "خلع" ہے، خلع کے معنی اتارنے اور جدا کرنے کے ہوتے ہیں۔

خلع سے متعلق ایک اہم سوال یہ ہے کہ یہ فسخ کے حکم میں ہے یا طلاق کے؟ تو اس کے جواب میں چاروں فقہی مسالک کی جانب سے صرف یہ عبارت پیش کردینا کافی ہے: احناف نے مفتی بہ قول کے مطابق، امام شافعی اپنے قول جدید میں، حنابلہ اور احمد سے ایک روایت کے مطابق یہ رائے اختیار کی ہے کہ خلع طلاق ہے، جبکہ امام شافعی اپنے قول قدیم میں اور حنابلہ امام احمد سے منقول مشہور قول کے مطابق اسے فسخ مانتے ہیں" (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۹/ ۲۳۷)۔

فقہ حنفی کے مطابق خلع کی ضروری تفصیلات کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ خلع کی پیشکش مرد کی طرف سے بھی ہوسکتی ہے عورت کی طرف سے بھی۔

۲۔ ایجاب کسی طرف سے بھی ہو، خلع کے لیے دوسرے فریق کا قبول کرنا ضروری ہے، ایجاب وقبول خلع کے ارکان ہیں۔

۳۔ خلع کے مکمل ہونے کے لیے قاضی یا حاکم کے واسطہ کی ضرورت نہیں۔

۴۔ خلع "مبارأۃ" (ایک دوسرے کو حقوق سے بری کردینا)، "مفارقۃ" (ایک دوسرے کو چھوڑ دینا) وغیرہ جیسے دیگر ایسے الفاظ سے بھی ہوسکتا ہے جس سے خلع کا مقصد پورا ہوتا ہو حتی کہ بیع وشراء کے الفاظ سے بھی (دیکھئے: رد المحتار، باب الخلع)۔

۵۔ خلع مہر پر بھی ہوسکتا ہے، مہر سے کم پر بھی، اور اس سے زیادہ پر بھی، لیکن زیادہ لینا بہر حال ایک طرح کی ناپسندیدہ بات ہے۔

۶۔ اگر نشوز مرد کی جانب سے ہو تو اس کے لیے دیانۃ کچھ بھی لینا درست نہیں، ہاں اگر لے چکا ہو تو مکروہ ہونے کے ساتھ جائز ہونے کا فیصلہ کردیا جائے گا۔

۷۔ مرد کی طرف سے اگر خلع کی پیشکش ہو تو یہ یمین (قسم) کے درجہ میں ہے جسے وہ واپس نہیں لے سکتا۔

۸۔ عورت کی طرف سے یہ معاوضہ کے حکم میں ہے، مرد کے قبول کرنے سے پہلے وہ اپنے اس قول سے رجوع کرسکتی ہے، جیسا کہ معوضہ کے معاملات خرید وفروخت وغیرہ میں ہوتا ہے۔

۹۔ خلع کے مکمل ہوجانے کے بعد مرد پر عورت کے جتنے بھی سابقہ حقوق نکاح کی وجہ سے تھے ساقط ہوجائیں گے، مہر بھی انہیں میں داخل ہے۔

۱۰۔ عدت کے نفقہ اور رہائش کی ذمہ داری مرد پر ہوگی، عورت عدت کے نفقہ سے دستبردار ہوکر بھی خلع حاصل کرسکتی ہے، اگر شوہر اسے قبول کرلے، سکنی (حق رہائش) عورت ساقط نہیں کرسکتی، وہ شریعت کا حق ہے۔

۱۱۔ خلع سے ایک طلاق بائن واقع ہوتی ہے (دیکھئے: رد المحتار، بدائع الصنائع، احکام القرآن للجصاص، البحر الرائق، فتح القدیر: باب الخلع)۔

فقہ مالکی میں خلع کی تعریف سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ خلع بدل کے بغیر بھی ہوسکتا ہے۔

۲۔ شوہر کو مال عورت بھی دے سکتی ہے، اور اس کی طرف سے کوئی دوسرا بھی جیسے اس کا ولی۔

۳۔ خلع سے ایک طلاق بائن واقع ہوتی ہے (الشرح الصغیر ۲/ ۵۱۷)۔

فقہ شافعی میں خلع کی تعریف یوں ذکر کی گئی ہے: ''وهو في الشرع فرقة بين الزوجين بعوض مقصود وراجع لجهة الزوج بلفظ طلاق أو خلع'' (مغني المحتاج، شربيني، ۳، ۲۶۲، دار الفكر، بيروت)۔ (خلع شریعت میں طلاق اور خلع جیسے الفاظ کے ذریعہ ایسے عوض مقصود پر میاں بیوی کے درمیان جدائی کا نام ہے جو شوہر کی طرف لوٹتا ہو)۔

فقہ شافعی کی تعریف سے یہ نقاط واضح ہوتے ہیں:

۱۔ خلع میں عوض ضروری ہے۔

۲۔ خلع لفظ طلاق سے بھی ہوسکتا ہے، اگر عوض کا ذکر آجائے، اور عورت اسے قبول کرلے۔

۳۔ خلع سے طلاق بائن نہیں، تفریق ہوتی ہے (مغنی المحتاج ۳/ ۲۶۲)۔

فقہ حنبلی کی تعریف یہ بتاتی ہے:

۱۔ خلع نام ہے مخصوص الفاظ کے ذریعہ مرد کے عورت کو چھوڑ دینے کا۔

۲۔ راجح یہ ہے کہ بدل خلع خلع کا رکن ہے، اس کی حیثیت بیع میں ثمن کی طرح ہے۔

۳۔ اگر بغیر عوض کے خلع ہو تو وہ نہ طلاق ہے نہ خلع، ہاں اگر طلاق کی نیت ہو تو ایک طلاق رجعی ہوگی۔

۴۔ خلع سے اگر طلاق کی نیت نہ ہو تو یہ فسخ ہے طلاق نہیں (کشاف القناع ۵/ ۲۳۷)۔

ان مسالک میں خلع سے متعلق بقیہ ضروری تفصیلات قریباً وہی ہیں جن کا ذکر فقہ حنفی کے ذیل میں آیا، ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ اتنی بات سب کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ خلع عورت کا حق ہے اور اس میں مرد کی رضامندی ضروری ہے، قاضی اپنی طرف سے عام حالات میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا، اور یہ کہ خلع میاں بیوی کے درمیان ایک باہمی موافقت (Mutual Consent) کے ذریعہ کی گئی علاحدگی ہے، ہندوستان کے قانون Dissolution of Muslim Marriage Act 1939 میں بھی یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ خلع زوجین کی باہمی رضامندی سے طے پاتا ہے (دیکھئے: Family Law (Company Hyderabad S.Gogia, Seventh edition,in India

خلع پر تمام محدثین وفقہاء متفق ہیں، قرآن کی جس آیت (البقرۃ: ۲۲۹) سے طلاق کا ثبوت ملتا ہے، خلع بھی اسی سے ثابت ہے، علامہ ابن عبد البر فرماتے ہیں: ''اسی پر لوگوں کی ایک جماعت کا عمل ہے سوائے ابوبکر بن عبد المزنی کے کہ وہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہوجانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ دے کر علاحدگی حاصل کرلے'' منسوخ ہے، اس کو ارشاد الٰہی: ''اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کرلو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سارا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا'' نے منسوخ کیا ہے'' (التمہید، الحدیث الحاوی والاربعون، ۲۳، ۳۷۵)۔

یہ قول شاذ ہے: چونکہ سورۂ نساء کی آیت اس مرد کے سلسلہ میں ہے جو اپنی بیوی کو چھوڑنا چاہتا ہو کہ ایک تو بلا وجہ چھوڑ رہے ہو اس پر طرفہ یہ کہ اس پر مالی بوجھ ڈال رہے ہو، اس سے منع کیا گیا، جبکہ سورۂ بقرہ کی آیت ایک ایسی عورت کے سلسلہ میں ہے جو ناپسندیدگی کی وجہ سے اپنے شوہر سے فراق چاہتی ہو۔

**کیا خلع میں مرد کی رضامندی شرط نہیں؟**...... یہ کہنا کہ جس طرح مرد کو طلاق کا اختیار ہے عورت کو بعینہ اسی طرح خلع کا اختیار ہے، درست نہیں، اس لئے کہ طلاق میں بیوی کی رضامندی شرط نہیں جبکہ عورت کی جانب سے خلع کی پیشکش میں شوہر کی رضامندی شرط ہے، امام نووی (م: ۶۷۶ھ) فرماتے ہیں: ''لأنه رفع عقد بالتراضي'' (المجموع ۲، ۱۷، کتاب الخلع) (چونکہ یہ عقد کو آپسی رضامندی سے ختم کرنا ہے)۔

**شقاق لغت میں:**...... ایک لفظ ''شقاق'' ہے، جس کے معنی اختلاف ٹکراؤ اور دشمنی کے ہیں، لسان العرب میں ہے: ''شقاق عداوت اور اختلاف کے غالب آجانے کو کہتے ہیں''، شاقه، مشاقة وشقاقاً، نحو ولغت کے امام ابو اسحاق زجاج (م: ۳۱۱ھ) کہتے ہیں: ''وإن الظالمين لفي شقاق بعيد'' (الحج: ۵۳)، (حقیقت یہ ہے کہ ظالم لوگ عناد میں بہت دور نکل گئے ہیں) میں شقاق دو فریق کے درمیان دشمنی کے معنی میں ہے، اس کے بعد ابن منظور افریقی (م: ۷۱۱ھ) لکھتے ہیں: ''سمي ذلك شقاقاً، لأن كل فريق من فرقتي العداوة قصد شقاً أي ناحية غير شق صاحبه'' (لسان

العرب ۱۸۱/۱۰)، (اس کو شقاق اس لیے کہا گیا کہ دشمنی کے دونوں فریقوں میں سے ہر ایک نے اس سمت کو اختیار کیا جو دوسرے نے نہیں کیا) علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں: ''لاشقاق: المخالفة. وكونك في شق غير شق صاحبك'' (المفردات في غريب القرآن ۱/۴۶۰، دار العلم والدار الشامية، دمشق، بيروت)، (شقاق کے معنی مخالفت کے ہیں، اور یہ کہ تمہارا ایک جانب ہونا، اور تمہارے فریق کا دوسری جانب)۔

اس کا ایک معنی مفارقت اور جدائی کا بھی ہے: ''جیسے: "شق فلان العصا" (فلاں نے جماعت کو چھوڑ دیا) ''شق فلان العصا أي فارق الجماعة'' (تاج العروس من جواهر القاموس، مادہ: ش، ق، ق ۲۵/۵۱۱)۔

## شقاق لغت واصطلاح میں:

لغت میں اس کے مختلف معنی ہیں، لیکن جبکہ اصطلاحی معنی جھگڑے کے ہیں، "الشقاق: المنازعة" (الجامع لأحکام القرآن، قرطبی، النساء: ۳۵ کے تحت) گویا نکاح جو کہ ایک شریفانہ معاہدہ (Civil Contract) ہے، اور اس کے ذریعہ دو اجنبی مرد وعورت اس قدر قریب ہوجاتے ہیں کہ دو قالب ایک جان بن جاتے ہیں، اب جو چیز بھی دونوں کو ایک دوسرے سے متنفر کردے اسے ''شقاق'' کہیں گے، علامہ ابن عابدین شامی (م: ۱۸۳۶ء) نے اس کا مفہوم یہ لکھا ہے: ''الاختلاف والتخاصم'' (رد المحتار، باب الخلع)، (اختلاف اور آپسی جھگڑا) بعض دیگر فقہاء کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ''شقاق'' سے مراد میاں بیوی کے درمیان اختلاف کا اس حد تک پہونچ جانا ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک کا قول وفعل دوسرے کے لیے زہر معلوم ہو اور حد درجہ نفرت انگیز ہوجائے (دیکھئے: الام ۵/۱۱۵، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۳۹۳ھ)۔

اس تعریف سے یہ بھی ظاہر ہورہا ہے کہ الفت ومحبت کے اس قیمتی نگینہ میں ایک ایسا عیب پیدا ہوگیا کہ اب اسے یہ دونوں خود سے دور نہیں کرسکتے، اور اختلاف اتنے بڑھ گئے کہ قاضی کے پاس معاملہ پیش کردینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں قاضی کو تحکیم کا طریقہ اختیار کرنے یعنی دو ثالث کو مقرر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے (دیکھئے: مواہب الجلیل فی شرح مختصر الخلیل ۱۱/۶۸)۔

شقاق کے موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''تحکیم'' کی ایک واضح تصویر ہمارے سامنے رہے۔

## تحکیم کی تعریف:

تحکیم کے لغت میں کئی معنی بیان کئے گئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: ''المخاصمة، المنع والضبط، التفويض، القضاء، الإتقان، الإحكام'' (لسان العرب ۱۲/۱۴۰-۱۴۵، مادہ: حکم)، (مقدمہ دائر کرنا، روکنا اور اصلاح کرنا، حوالہ کرنا، فیصلہ کرنا، کسی کام کو حسن وخوبی انجام دینا وغیرہ) تحکیم کے یہ مختلف معانی ہیں، اور غور وتدبر کی نظر اس عقدہ کو کھول دیتی ہے کہ یہ سب ''المخاصمة إلى الحاكم'' یعنی کسی معاملہ کو حاکم کے پاس لیجانے سے مربوط ہیں، جس میں وہ غور وفکر اور مہارت کے ساتھ فیصلہ صادر کرتا ہے، جہاں تک تحکیم کے اصطلاحی معنی کا تعلق ہے تو مختلف فقہی مسالک میں اس کی تعریف معمولی اختلاف کے ساتھ تقریباً یکساں نظر آتی ہے، قدیم حنفی فقہاء نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے: ''تولية الخصمين حاكما يحكم بينهما'' (الدر المختار: باب التحکیم) (کسی معاملہ کے دونوں فریقوں کا کسی ایک کو ثالث بنانا جو دونوں کے درمیان فیصلہ کا فریضہ انجام دے) حاکم سے مراد ایک حاکم بھی اور متعدد حاکم بھی (رد المحتار، دوسری تعریفات کے لئے دیکھئے: مجلۃ الأحکام العدلیۃ، مادہ: ۱۷۹۰، تبصرۃ الحکام ۱/۵۰، ادب القاضی ۱/۳۲۰، المغنی ۱۰/۱۳۷، المدخل الفقہی العام ۱/۶۱۹ وغیرہ)۔

قضاء اور تحکیم میں فرق یہ ہے کہ تحکیم میں عام طور سے شروع سے ہی فریقین کی رضامندی شرط ہے، جبکہ قضاء میں مقدمہ دائر کرتے وقت دونوں کی رضامندی شرط نہیں ہوتی، قضاء کسی مختلف فیہ مسئلہ میں ہوتو وہ رافع خلاف ہوتا ہے (اختلاف کو ختم کردیتا ہے) تحکیم میں ایسا نہیں، اور بھی کئی فرق ہیں (تفصیل کے لیے دیکھئے: بدائع الصنائع فصل فی بیان من یصلح للقضاء)۔

قرآن حکیم کی متعدد آیات سے حدیث وواقعہ حدیث اور اجماع امت تحکیم کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔

## شقاق کے مسئلہ میں تحکیم:

قرآن مجید میں میاں بیوی کے آپسی اختلافات کو حل کرنے کے چار مراحل ذکر کئے گئے ہیں: ''واللاتي تخافون نشوزهن فعظوهن

واهجروهن في المضاجع واضربوهن فإن أطعنكم فلا تبغوا عليهن سبيلاً إن الله كان عليا كبيراً وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكماً من أهله وحكماً من أهلها" (النساء: ۳۴)۔ (اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں ان سے علاحدہ رہو، اور مارو، پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہوجائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو، یقین رکھو اللہ بڑا اور بالاتر ہے، اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک حکم عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو) سب سے پہلا علاج نفسیاتی علاج ہے، وعظ ونصیحت سے عورت کو اس اخلاقی بیماری سے شفا نہ ہو اور بھلی بات اپنا اثر نہ دکھلا سکے تو دوسرا مرحلہ آتا ہے، اور وہ علاج "هجر في المضاجع" (خواب گاہوں میں علاحدگی) کا ہے، یہ جسمانی علاج بھی ہے اور نفسیاتی بھی، یہ بھی کارگر نہ ہو تو تادیبی کاروائی کرتے ہوئے "ضرب" (زدوکوب نہیں ہلکی پھلکی مار) کی اجازت ہے، یہ جسمانی سزا ہے، لیکن اس میں جذبۂ انتقام نہ ہو جانا چاہئے چونکہ "إن الله لا يحب المعتدين" (البقرة: ۱۹۰)۔ (بیشک اللہ تعالیٰ حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں فرماتے) جب ان میں سے کوئی علاج کارگر نہ ہو اور شوہر و بیوی کے اختلافات حد سے گزر جائیں، اور ایک دوسرے سے نفرت کی اس آگ پر قابو پانا خود مشکل ہوجائے تو چوتھا مرحلہ یہ ہے کہ قاضی کے پاس مقدمہ لے جایا جائے، ایسی صورت میں اکثر علماء کے نزدیک قاضی کے لیے واجب ہوجاتا ہے کہ وہ دو ثالث مقرر کرے جو اس مسئلہ میں غور کریں، چونکہ یہ حکم جس آیت سے ثابت ہے اس میں "فابعثوا" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو کہ امر ہے اور امر سے جو حکم ثابت ہوتا ہے، اگر کوئی قرینہ نہ ہو تو وہ واجب اور لازمی ہوتا ہے (تقویم الأدلة، دبوسی، ص: ۳۶، تحقیق: خلیل میس، ۲۰۰۱، دار الکتب العلمیة، بیروت) "شقاق کو عام طور سے دور جدید کے فقہاء نے اسباب فسخ میں شمار کیا ہے، دوسرے معاملات کی طرح بینہ کے مفقود ہونے پر مقدمہ کو خارج کر دینا مسئلہ کا حل نہیں۔

### اس آیت کے مخاطب کون؟

آیت "...فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها" (النساء: ۳۵) کے مخاطب راجح قول کے مطابق قضاۃ وحکام ہی ہیں "روى عن سعيد بن جبير والضحاك أنه السلطان الذي يترافعان إليه" (احکام القرآن جصاص، النساء: ۳۵ کے تحت)، (حضرت سعید بن جبیر اور ضحاک سے مروی ہے کہ اس کا مخاطب سلطان ہے جس کے پاس دونوں مقدمہ لے جاتے ہیں)، ابن العربی (م: ۵۴۳ھ) کہتے ہیں: "وأما من قال: إنه السلطان فهو الحق" (احکام القرآن۔ ابن العربي، النساء: ۳۵ کے تحت)، (جس نے اس سے سلطان کو مراد لیا وہی حق پر ہے) علامہ آلوسی (م: ۱۸۵۴ء) فرماتے ہیں: "سعید بن جبیر اور ضحاک وغیرہ کہتے ہیں کہ اس میں خطاب حکام سے ہے، اور یوں بھی جب زوجین اپنے طور پر اصلاح کی کوششیں کر چکے، جو بار آور نہ ہوسکیں تو معاملہ ان کے ہاتھ سے نکل کر امام یا قاضی کے ہاتھ میں چلا گیا جو مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے نزاعات کو حل کرنے اور ظلم کو رفع کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں، ہاں اگر کہیں قاضی موجود نہ ہو تو یہ ذمہ داری امت کے صالح اور خداترس افراد کی ہوتی ہے، تاکہ یہ خطاب عام اور تام رہے اور ہر حال میں مسئلہ کا حل نکالنے کی کوشش کی جائے" (روح المعانی: نساء: ۳۵ کے تحت، نیز دیکھئے: تفسیر خازن، البحر المحیط، تفسیر الطبری، تفسیر کبیر وغیرہ)، اور بعض حالات میں یقیناً اس کی ضرورت ہوگی، خاص طور سے ایسے علاقوں میں جہاں قاضی نہ ہوں تو معاشرہ کے صالح افراد جو اصلاح کا تجربہ بھی رکھتے ہوں اس فریضہ کو ادا کرنے کے ذمہ دار ہوں گے، عام حالات میں پہلی ہی رائے راجح ہوگی، جس کی وجہ ترجیح بھی تفسیر کی کتابوں میں تفصیل سے ذکر کی گئی ہے، ماضی قریب میں میدان قضاء کے شہسوار قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ (م: ۲۰۰۲ء) نے نہایت جامع الفاظ میں اس کا عطر کشید کرلیا ہے، میں یہاں انہیں کے الفاظ مستعار لیتا ہوں، سدی کی رائے کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "آیت کے ظاہری الفاظ بھی اس کے مخالف ہیں، اس لیے کہ محل شقاق میاں بیوی ہیں جنہیں "صیغۂ غائب" میں ذکر کیا گیا ہے اور اس شقاق کو محسوس کرنے والے اور پھر حکمین کا تقرر کرنے والے دوسرے لوگ ہیں، جنہیں مخاطب قرار دیا گیا ہے، علاوہ ازیں "فابعثوا" میں "حکمین" کے تقرر اور ان کے بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ "مرسل" اور "مرسل الیهم" میں مغایرت ہونی چاہئے، پھر یہ کہ سیاق کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ جب زوج اصلاح کے تمام طریقے آزما چکا تو اب اس کا کام ختم ہوچکا، اب تو اسے معاملہ محاکمہ کے لیے منصب کے سامنے پیش کر دینا چاہئے، اور عورت بھی اگر شوہر کے ظلم وتعدی سے بچنے کی راہ نہ پائے اور یہ محسوس کرے کہ شوہر اس کو تنگ کرنے کے لیے بہانے تلاش کرتا رہتا ہے تو وہ بھی قاضی کے سامنے محاکمہ کرسکتی ہے، اور پھر قاضی اصلاح حال کے لیے "حکمین" مقرر کرے گا، لہٰذا اس آیت کے مخاطب حکام وولاۃ ہی ہیں" (مباحث فقہیہ، ص: ۴۸۱، ایفا پبلیشنز، ۲۰۰۲ء) شیخ ابن عاشور کی عبارت سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے: "والمخاطب هنا ولاة الأمور لامحالة" (التحرير والتنوير ۴، ۱۱۹)۔

**کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے؟**...... جب صورت حال ایسی ہو کہ مرد عورت کی جانب سے نشوز کا دعوی کر رہا ہو اور عورت شوہر

کی جانب سے ظلم وتعدی اور حق تلفی کا دعوی کر رہی ہو تو قاضی "حکمین" مقرر کرے گا جو اس مسئلہ پر غور کر سکیں "فإذا اختلفا وادعى النشوز وادعت هي عليه ظلمه وتقصيره في حقوقها حينئذ بعث الحاكم حكما من أهله وحكما وأهلها ليتوليا النظر فيما بينهما" (احکام القرآن للجصاص، سورۂ نساء آیت: ۳۵ کے تحت)، (جب دونوں کے درمیان آپس میں اختلاف ہو جائے، مرد نشوز کا اور عورت مرد کے ظلم اور کوتاہی کا دعوی کرے تو حاکم ایک ایک حکم دونوں کے گھر والوں میں سے بھیجے گا تاکہ وہ دونوں کے مسئلہ پر غور کر سکیں)، مالکیہ کے نزدیک قاضی کو اگر اپنے طور پر بھی علم ہو جائے تو اس کے لیے یہ کاروائی ضروری ہے، تاکہ حقوق کا تحفظ ہو سکے اور معاملہ اور زیادہ پیچیدہ نہ ہو، ابن العربی لکھتے ہیں: "إذا علم الإمام من حال الزوجين الشقاق لزمه أن يبعث إليهما الحكمين ولا ينتظر ارتفاعهما. لأن ما يضيع من حقوق الله أثناء ما ينتظر رفعهما إليه لا جبر له" (احکام القرآن۔ ابن العربی)، (جب امام کو زوجین کے درمیان شقاق کی صورتحال کا علم ہو تو اس پر حکم مقرر کرنا ضروری ہے، وہ ان دونوں کے مرافعہ کا انتظار نہیں کرے گا، چونکہ جو حقوق ان کے مرافعہ کے دوران انتظار ضائع ہوں گے ان کی تلافی ممکن نہیں) جب کسی طور یہ واضح نہ ہو کہ غلطی کس کی ہے اور ظلم کس کی جانب سے ہے تو میری ناقص معلومات کے مطابق قاضی خود خلع کا فیصلہ نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ فریقین نے اس کو وکیل بنا دیا ہو، چونکہ یہ نص صریح کی مخالفت ہوگی، قرآن ایسی صورت میں حکمین کے تقرر کا حکم دیتا ہے جو اپنی ذاتی واقفیت، مخصوص ذرائع اور چھان بین کے ذریعہ صحیح نتیجہ تک پہنچ سکیں "... إن القاضي لا يقضي بعلمه ..." (احکام القرآن۔ ابن العربی)، (قاضی اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کرے گا) ہاں اگر معلوم ہو جائے کہ قصور میاں بیوی میں سے کس کا ہے تو اس کے مناسب حال فیصلہ قاضی کا حق ہے "فأما إن عرف الظالم فإنه يؤخذ الحق من صاحبه ويجبر على إزالة الضرر" (الجامع لاحکام القرآن۔ القرطبی)، (رہا یہ کہ قاضی اگر ان دونوں میں سے ظلم کرنے والا کون ہے، یہ پتہ لگالے، تو اس کے فریق سے اس کا حق دلا یا جائے گا، اور اسے ضرر کو ختم کرنے پر مجبور کیا جائے گا)، حکمین اگر دونوں کے آپسی رویہ کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ دونوں میں تفریق ہی بہتر ہے، پھر قاضی اس رپورٹ سے باخبر ہونے کے بعد تفریق کا فیصلہ کر دے تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، لیکن صورت "شقاق" کی ہو اور "بعث حکمین" کے بغیر خود ہی قاضی فیصلہ کر دے، یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

## طریقۂ کار:

ظاہر ہے کہ جب نشوز عورت کی طرف سے ہو تو قرآنی حکم یہ ہے کہ پہلے شوہر اس کو سمجھانے کی کوشش کرے، پھر اس کی خواب گاہ اپنی خواب گاہ سے علاحدہ کر دے، اور اس کے بعد بھی کامیابی نہ ملے تو معمولی مار پیٹ کے ذریعہ اصلاح کی کوشش کرے (النساء: ۳۴) اور جب نشوز مرد کی طرف سے ہو تو صلح کی کوشش ہو (النساء: ۱۲۸) اور اگر اندیشہ ہو کہ میاں بیوی اللہ کے حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو اس میں کوئی حرج نہیں بتایا گیا کہ عورت کچھ دے دلا کر مرد سے چھٹکارا حاصل کر لے (البقرہ: ۲۲۹) اور اگر خود مرد بیوی کو بدل دینا چاہے تو منع فرمایا گیا کہ بیوی کو جو کچھ دے چکا ہے اس میں سے کچھ واپس لے (النساء: ۲۰) اور جب معاملہ کی نوعیت یہ ہو کہ زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کی طرف ظلم وتعدی، بد خلقی، سخت مزاجی، اور ترش روئی کی نسبت کریں، اور قاضی یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ جرم کس کا ہے، تو ایک قول یہ ہے کہ حکمین کے تقرر سے پہلے قاضی ایک قابل اعتماد شخص کو مقرر کر دے جو ان سے قریب رہ کر ان کے احوال کا جائزہ لے، یہ مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کا قول ہے (الشرح الکبیر ۲/ ۳۴۳، روضۃ الطالبین ۷/ ۳۷۰، المغنی ۷/ ۲۴۳) شربینی خطیب کہتے ہیں: "وإن قال كل من الزوجين: إن صاحبه متعد عليه وأشكل الأمر بينهما تعرف القاضي الحال الواقع بينهما بثقة واحد يخبرهما" (مغنی المحتاج ۳/ ۲۶۱)، (اگر زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کے بارے میں یہ کہے کہ وہ تعدی کرنے والا ہے، اور معاملہ دونوں کے درمیان الجھ کر رہ جائے تو قاضی ایک قابل اعتماد شخص کے ذریعہ صحیح صورتحال سے واقفیت حاصل کرے گا) جب کہ شیخ محمد بن یوسف مواق (م: ۸۹۷ھ) نے "قوم صالحین" کی تعبیر استعمال کی ہے "فإن الحاكم يأمر زوجها بإسكانها بين قوم صالحين ويكلفهم تفقد خبرهما واستعلام ضررهما" (التاج والاکلیل ۴/ ۱۶)، ان عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک صالح نگراں یا چند صالح نگرانوں کا کام تحقیق حال کے بعد قاضی کو حقیقت حال سے باخبر کر دینا ہے، اس سے زیادہ انہیں کچھ اختیار نہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ایک یا ایک سے زیادہ صالح افراد کی کمیٹی مقرر کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ دو حکم براہ راست مقرر کر دیئے جائیں، احناف، بعض مالکیہ اور ابن تیمیہ کا قول یہی ہے، کاسانی رقمطراز ہیں: "فإن نفع الضرب وإلا رفع الأمر إلى القاضي ليوجه إليهما حكمين" (بدائع الصنائع ۲/ ۳۳۴، احکام القرآن، جصاص ۲/ ۲۷۰، القوانين الفقهية ۱/ ۱۴۲، الفتاوى الكبرى) (مارسے فائدہ ہو تو ٹھیک ورنہ معاملہ قاضی کے پاس لے جایا جائے گا، تاکہ ان دونوں کی طرف دو ثالث روانہ کرے)۔

فقہاء کا اس بات پر بھی تقریباً اتفاق ہے کہ حکمین میں سے ہر ایک کا مسلمان، آزاد، مکلف (عاقل و بالغ) اور منصف مزاج ہونا شرط ہے، امانت، تقویٰ اور مسئلہ کی نوعیت کو سمجھنے کی صلاحیت ترجیح کی بنیادیں ہیں، اجتہاد کسی کے یہاں شرط نہیں (دیکھئے: شرح فتح القدیر ۷/ ۳۱۶، حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۲/ ۳۴۴، روضۃ الطالبین، نووی ۷/ ۳۷۳، شرح منتہی الارادات ۳/ ۵۵) احناف کے نزدیک یہ بھی شرط ہے کہ وہ "محدود فی القذف" (کسی پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانے میں سزا یافتہ) نہ ہوں (الہدایۃ ۳/ ۱۰۸) دونوں حکم کا مرد ہونا ضروری ہے یا عورت بھی حکم بن سکتی ہے؟ اس میں فقہاء کے کئی نقطہائے نظر ہیں، بعض حضرات اس کے قائل نہیں کہ عورت کو حکم بنایا جائے چونکہ وہ قاضی نہیں بن سکتی، جمہور کا مسلک یہی ہے، احناف کا قاعدہ یہ ہے کہ جس مسئلہ میں عورت کی شہادت قبول کی جاسکتی ہے اس میں وہ حکم بھی بن سکتی ہے، جب قاضی بن سکتی ہے تو حکم بدرجۂ اولیٰ بن سکتی ہے، بعض مالکیہ کا بھی یہی قول ہے (البحر الرائق ۷/ ۲۶)، رد المحتار میں ہے: ''والمحکم کالقاضی. وأفاد جواز تحکیم المرأۃ والفاسق لصلاحیتهما للقضاء'' (۵/ ۴۲۸)، (حکم اور ثالث کی حیثیت قاضی کی سی ہے، اس سے معلوم ہو کہ عورت اور فاسق کو بھی حکم بنا سکتے ہیں چونکہ ان دونوں کے اندر قضاء کی اہلیت موجود ہے) اس کی دلیل کے طور پر ہم یہ عرض کر سکتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت سلیمان بن ابی حثمہ کی والدہ ''الشفاء'' کو مدینہ کے بازار کا نگراں بنایا تھا، اور ظاہر ہے کہ بازار کے ذمہ دار کو معمولی امور میں ہی سہی فیصلے کرنے پڑتے ہیں (''وکان عمر یقدمها فی الرأی ویرضاها ویفضلها، وربما ولاها شیئا من أمر السوق'' الاستیعاب ۲/ ۱۸۶۹، الاصابۃ ۷/ ۷۲۸، المحلی ۹/ ۴۲۹)۔

## کیا ایک حکم بھی کافی ہے؟:

شوافع کے یہاں تو صراحت ملتی ہے کہ ایک حکم کافی نہیں (مغنی المحتاج ۳/ ۲۶۱) اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ''وهو الأصح لظاهر الآیة ولأن کلا من الزوجین یتهمه ولا یفشی إلیه سره'' (مغنی المحتاج، نهایة المحتاج ۶/ ۳۸۵) (یہی زیادہ صحیح ہے چونکہ آیت کے ظاہر سے بھی یہی معلوم ہو رہا ہے، اور اس لیے بھی کہ زوجین میں سے ہر ایک اس کو متہم ٹھہرائیں گے، اور اس سے اپنا راز نہیں کھولیں گے) لیکن مالکیہ کے نزدیک کچھ شرطوں کے ساتھ ایک حکم بھی مقرر کرنا کافی ہے، مالکی فقیہ ابو الولید الباجی (م: ۴۷۴ھ) فرماتے ہیں: ''ولو جعل الزوجان ذلك إلی رجل واحد جاز إذا کان من أهل الحکم، قاله ابن قاسم فی المدونة، قال القاضی أبو الولید (رضی الله عنه): ووجه ذلك عندی أن یکون من جهة الزوجین، لأن الحق فی ذلك لا یخرج عنهما'' (المنتقی شرح الموطأ ۴/ ۱۱۳) (اگر زوجین کسی ایک ہی شخص کو حکم بنالیں تو بھی جائز ہے، اگر وہ فیصلہ کرنے کا اہل ہو، ابن قاسم نے یہ بات مدونہ میں لکھی ہے، قاضی ابو الولید فرماتے ہیں: میرے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ وہ ایک حکم میاں بیوی دونوں کی طرف سے ہوگا، چونکہ حق اس سلسلہ میں ان دونوں سے باہر نہیں)۔

**حکمین کے اختیارات:**...... ایک قابل ذکر بحث اس سلسلہ میں یہ ہے کہ حکمین کے اختیارات کیا ہوں گے؟ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ جب دو حکم مقرر کر دیئے جائیں تو ان کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ زوجین کے درمیان مفاہمت اور صلح کی کوشش کریں، دونوں کے درمیان الفت و محبت کو بحال کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ اختیار کر کے دیکھ لیں، اگر دونوں کا تعلق خاندان سے ہی ہو تو دونوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے رشتہ دار میاں یا بیوی کے ساتھ علیحدہ علیحدہ تفصیلات معلوم کرلے (حاشیۃ الدسوقی ۲/ ۳۴۵)، ابن فرحون مالکی لکھتے ہیں: ان دونوں پر صلح کرانے کی ذمہ داری ہے، یعنی طلاق پر غور کرنے سے پہلے، یہ کام ان دونوں کی جانب سے یکے بعد دیگرے کئی مرتبہ ہو، وہ دونوں نرم گفتاری، انصاف، اور ترغیب و ترہیب سے کام لیں، ان میں سے کوئی کام صرف ایک کے ساتھ نہ کریں، تاکہ ان کے درمیان صلح کرانے میں آسانی ہو'' (مواہب الجلیل ۴/ ۱۷)، اس کے بعد دونوں حکم آپس میں ایک دوسرے کو پوری تفصیلات سے آگاہ کریں گے، کچھ بھی چھپانا مناسب نہیں، زوجین سے کیا بات ہوئی واضح طور پر سامنے آنی چاہئے (مغنی المحتاج ۳/ ۲۶۱) اگر حکمین زوجین کے درمیان اس رشتۂ نکاح کو باقی رکھنے پر متفق ہو جائیں تو دونوں کا قول نافذ ہوگا اور مزید کسی کاروائی کی ضرورت نہ رہے گی، زوجین بدستور ازدواجی زندگی گزاریں گے (بدایۃ المجتہد ۲/ ۷۴)، آیت کریمہ میں بھی اسی جانب اشارہ کیا گیا ہے ''إن یریدا إصلاحا یوفق الله بینهما'' (النساء: ۳۵)۔

**صلح کرانے میں ناکامی ہو تو کیا کریں؟**...... ہاں جب دونوں حکم اصلاح حال میں اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود کامیابی حاصل نہ کر سکیں تو کیا کریں؟ کیا تفریق کردیں یا معاملہ قاضی کے حوالہ کردیں؟ تین نقطہائے نظر ہیں:

## حکمین صرف وکیل ہیں:

ایک تو یہ کہ ان کی حیثیت صرف وکیل کی ہے، وکالت اصلاح حال کے لیے ہے، اگر اس میں کامیاب نہ ہوں تو میدان خالی کردیں، چونکہ:

۱۔ ''فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها'' (ایک حکم مرد کی جانب سے اور ایک حکم عورت کی جانب سے بھیجو) کا مطلب ہے ''فابعثوا رجلا من قبله ورجلا من قبلها'' (ایک آدمی مرد کی جانب سے اور ایک آدمی عورت کی جانب سے بھیجو) (احکام القرآن ۲/۲۷۰، مفاتیح الغیب ۱۰/۷۶)۔

۲۔ آیت میں صرف "وإن يريدا إصلاحاً" (اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں) کا تذکرہ ہے "وإن يريدا تفريقاً" (اگر وہ دونوں تفریق چاہیں) کا نہیں (احکام القرآن ۲/۲۷۰، مفاتیح الغیب ۱۰/۷۶)۔

۳۔ ایک وجہ یہ ہے کہ زوجین جب عاقل وبالغ ہیں تو ان کی مرضی کے بغیر ان کی مصلحت کے خلاف فیصلہ کا حق ان کے علاوہ کسی کو حاصل نہ ہوگا، حضرت علیؓ نے اس طرح کے ایک فیصلہ میں حکمین کو حق تفریق نہیں دیا تھا، اور وہ صرف اس وجہ سے کہ مرد تفریق پر راضی نہ تھا، ہاں شوہر کو بیوی کی رضامندی کے بعد ایسا ہی کرنے کی تلقین ضرور کی تھی (دار قطنی: ۳۸۲۴) یہی رائے احناف کی ہے، شوافع کا راجح قول اور حنابلہ کا مشہور قول یہی ہے، حسن، ابوثور اور سدی سے بھی ایک روایت یہی ہے (البحر الرائق ۷/۲۵، الأم ۵/۱۹۵، روضۃ الطالبین ۷/۴۱۷، الانصاف ۸/۳۸۰، بدایۃ المجتہد ۲/۱۴۷)۔

تیسرا قول یہ ہے کہ تحکیم کے اس عقد کو "عقد إلزامي" (لازم کرنے والا عقد) قرار دیا جائے گا اور دونوں جو بہتر خیال کریں گے فیصلہ کرسکتے ہیں، جب صلح کی کوششیں بار آور نہ ہوسکیں تو تفریق بھی کرسکتے ہیں، امام مالک اسی کے قائل ہیں، ظاہریہ کا مسلک، شوافع اور حنابلہ کا بھی ایک قول یہی ہے (الموطأ ۲/۵۸۴، روضۃ الطالبین ۷/۴۱۷، المغنی ۷/۲۴۴، المحلی ۱۰/۸۷)، علامہ آلوسی رقمطراز ہیں: ''ونقل عن بعض علمائنا أن الإساءة إن كانت من الزوج فرقا بينهما، وإن كانت منهما فرقا على بعض ما أصدقها'' (روح المعانی ۵/۲۷) (ہمارے بعض علماء سے منقول ہے کہ بدسلوکی اگر شوہر کی طرف سے ہو تو دونوں میں تفریق کردی جائے گی، اور اگر دونوں کی طرف سے ہو تو اس مہر کے کچھ حصہ پر تفریق کردی جائے گی جو مرد نے عورت کو دیا تھا) اس سے معلوم ہوا کہ بعض حنفی علماء ومشائخ بھی اس کے قائل ہیں، حضرت عثمان، علی، ابن عباس، ابوسلمہ بن عبدالرحمن بن عوف، ابن سیرین، شعبی، نخعی، سعید ابن جبیر، اوزاعی، مجاہد وسدی، ضحاک اور ان کے علاوہ بھی متعدد علماء کی رائے یہی ہے (جامع البیان، الطبری ۵/۷۱-۷۵)، امام مالک فرماتے ہیں: ''وذلك أحسن ما سمعت من أهل العلم أن الحكمين يجوز قولهما بين الرجل وامرأته في الفرقة والاجتماع'' (موطأ مالك ۲/۵۸۴)، (میں نے اہل علم سے اس سلسلہ میں جو کچھ سنا ان میں سب سے بہتر یہ ہے کہ حکمین کی بات صلح اور تفریق ہر دو شکل میں مانی جائے گی)، حنبلی علماء میں سے زرکشی کا قول ہے: ''اس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ وہ دونوں حکم ہیں بہ عوض یا بلاعوض صلح یا تفریق دونوں میں سے جو بہتر سمجھیں زوجین کی رضامندی کے بغیر کر گزرنے کا اختیار رکھتے ہیں، آیت کریمہ کا ظاہر یہی بتا رہا ہے، ابن ہبیرہ، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور خرقی کی بات سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے'' ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ''ہما حاکمان کما ہو الصواب''، ابن حزم کا قول ہے: ''وإليه ذهب أصحابنا إلا ابن المغلس'' (المحلی ۱۰/۸۷)۔

ان کے کئی دلائل ہیں:

۱۔ ''آیت تحکیم'' میں ''حکم'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو فیصلہ میں اختیار کو بتا رہا ہے۔

۲۔ سورۂ مائدہ میں "جزاء الصيد" (شکار کے دم) کے سلسلہ میں حکم ہے "يحكم به ذوا عدل منكم" (جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکم کو حاکمانہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں، اس لیے حکم کو تفریق کرانے کے لیے بالکل حاکم یا قاضی کی طرح شوہر کی اجازت کی ضرورت نہیں۔

۳۔ قرآن وحدیث، فقہ ولغت اور عرف خاص وعام میں وکیل کو حکم نہیں کہا جاتا، جب حکم اور وکیل کے حدود واختیارات الگ الگ ہوتے ہیں تو ایک کو دوسرے کی جگہ پر ذکر کرنا کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے، وکیل صرف مأذون ہوتا ہے، اور حکم کو فیصلہ اور کسی پر کچھ لازم کرنے کا اختیار ہوتا ہے، امام قرطبی (م: ۶۷۱ھ)

فرماتے ہیں: ''وهذا نص من الله سبحانه وتعالى بأنهما قاضيان لا وكيلان ولاشاهدان'' (الجامع لاحکام القرآن ۵،۱۷)، (یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے صاف وضاحت ہے کہ وہ دونوں قاضی ہیں، وکیل یا شاہد نہیں)۔

۴۔ اگر ان کا فیصلہ تفریق زوجین کی رضامندی پر ہی موقوف ہے تو پھر یہ کام میاں بیوی آپس میں ہی کیوں انجام نہیں دے لیتے کہ کم وقت میں طلاق یا خلع کے ذریعہ مسئلہ کا حل نکل سکتا ہے۔

۵۔ مشہور کوفی فقیہ حضرت عبیدہ بن عمرو السلمانی (م: ۷۲ھ) نے حضرت علیؓ سے آیت "وإن خفتم شقاق بينهما" کے سلسلہ میں نقل کیا ہے: ''ایک مرد وعورت حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، دونوں کے ساتھ لوگوں کی ایک جماعت تھی، حضرت علیؓ کے حکم پر انھوں نے زوجین کے گھر والوں میں سے دو حکم مقرر کئے، ایک ایک شخص دونوں خاندان سے، حضرت علی نے ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا: "هل تدريان ما عليكما، إن عليكما إن رأيتما أن تفرقا" (تم جانتے ہو تمہیں کیا کرنا ہے؟ اگر تم دونوں ان دونوں کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنا زیادہ بہتر سمجھو تو تم ایسا کر سکتے ہو) عورت نے کہا: "رضيت بكتاب الله بما علي فيه ولي" (میں قرآن کے حکم کے مطابق جو کچھ میرا حق اور ذمہ داری ہے اس پر راضی ہوں) لیکن مرد نے کہا: "أما الفرقة فلا" (جہاں تک تفریق کا تعلق ہے تو میں اس پر راضی نہیں ہوں) اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا: "كذبت والله حتى تقر بمثل الذي أقرت به" (بخدا تم اس وقت تک جھوٹے ہو جب تک بعینہ عورت کی طرح اقرار نہ کرلو) (سنن دارقطنی: ۳۸۲۴)، الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ ابن سیرین (م: ۱۱۰ھ) سے یہ روایت (سنن البیہقی الکبری: ۱۴۵۵۵) میں بھی ہے۔

اس حدیث سے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے شوہر کی اجازت کے بغیر دونوں حکم مقرر فرمائے، اور شوہر نے جب تفریق سے انکار کیا تو اسے کتاب اللہ سے مراجعت کا حکم دیا کہ دیکھو تمہاری بیوی جو تفریق پر بھی رضامندی کا اظہار کر رہی ہے تمہیں بھی یہی کرنا چاہئے، اگر یہ صرف وکیل ہوتے تو آپ ان سے کچھ بھی نہ فرماتے، اسی طرح آپ نے حکمین سے "إن عليكما" (تمہاری ذمہ داری ہے) سے خطاب فرمایا جس میں واضح اشارہ موجود ہے کہ تم حکم ہو پوری ذمہ داری سے تمہیں یہ کام انجام دینا ہے، صرف وکیل نہیں کہ تصفیہ ہو جائے تو ٹھیک ورنہ تمہاری کوئی ذمہ داری نہ ہو۔

۶۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ راجح قول کے مطابق آیت میں خطاب زوجین سے نہیں، اگر خطاب ان سے ہوتا تو یہ کہنا صحیح ہوتا کہ وہ دونوں ان کے وکیل ہوں گے، پھر آیت میں ''اہل'' کا تذکرہ بھی یہی بتارہا ہے کہ وہ دونوں وکیل نہیں حکم ہیں، چونکہ خاندانی معاملات میں خاندان سے ہی ثالث کا تقرر زیادہ کارگر ہے، بلالحاظ کسی وکیل کا تقرر کافی نہیں۔

۷۔ اسی طرح حضرت عقیل بن ابی طالبؓ اور فاطمہ بنت عتبہ بن ربیعہ کے درمیان حضرت عثمانؓ نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت معاویہؓ کو حکم بنایا تھا، اس موقع سے حضرت عثمانؓ نے فرمایا تھا: "لأفرقن بينهما" (مصنف عبد الرزاق: ۱۱۸۸۷، باب الحكمين، تلخيص الحبير ۲۰۴،۳)، (میں ان دونوں کے درمیان ضرور تفریق کروں گا)۔

۸۔ پھر اس کی عقلی وجہ یہ ہے کہ جب میاں بیوی کے درمیان اس حد تک معاملات بگڑ جاتے ہیں تو ازدواجی زندگی متاثر ہوجاتی ہے، بچوں پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے اور دونوں خاندانوں کے محبت بھرے رشتہ پر بھی، اور اس طرح نکاح کا مقصد فوت ہوتا ہے، اس لیے ایسے اسباب کا اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے جو مظلوم کو اس کا حق دلاسکیں اور ظالم کے لیے مناسب سزا تجویز کرسکیں، یا پھر دونوں کے راستے حکمین کے ذریعہ جدا کر دیئے جائیں، واضح رہے کہ مالکیہ کے نزدیک شقاق مرد یا دونوں کی طرف سے ظاہر ہو تو بلاعوض تفریق ہوگی اور اگر عورت کی طرف سے تو عوض کے ساتھ، اور یہ تفریق ایک طلاق بائن کے حکم میں ہوگی، ایک سے زیادہ طلاق دونوں میں سے کوئی بھی واضح کرے باطل ہوگی، فقہ مالکی کے مشہور ازہری عالم شیخ دردیر مصری (م: ۱۷۸۶ء) نے مسئلہ کا جامع خلاصہ بیان فرمادیا ہے: ''دونوں حکم کی طلاق نافذ کردی جائے گی، اور یہ طلاق بائن کے حکم میں ہوگی، اگرچہ خلع کی صورت نہ بنے، بایں طور کہ بلاعوض ہو، اور اگرچہ میاں بیوی ان کے طلاق واقع کرنے کے بعد اس پر راضی نہ ہوں، ہاں اس سے پہلے وہ دونوں باز رہ سکتے ہیں، یہ فیصلہ اس وقت بھی نافذ ہوگا جبکہ حاکم اس پر رضامند نہ ہو، خواہ وہ دونوں حاکم کی طرف سے مقرر ہوں یا زوجین کی طرف سے، چونکہ ان دونوں کی حیثیت وکیل یا شاہد کی نہیں بلکہ ثالث اور فیصلہ کرنے والے کی ہے، ایک طلاق سے زیادہ واقع نہ ہوگی، اور ایک ہی لازم ہوگی اگرچہ عدد میں دونوں کا اختلاف ہو، مثلاً ایک نے ایک

طلاق واقع کی ہو اور دوسرے نے دو یا تین؛ چونکہ ایک پر دونوں کا اتفاق ہے'' (الشرح الکبیر للدردیر ۲/ ۳۴۵)۔

دونوں فریق کے اس کے علاوہ بھی بہت سے دلائل ہیں، علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ: ''ولعل المسألة اجتهادية. وكلام أحد المجتهدين لايقوم حجة على الآخر'' (روح المعانی ۵/۲۷، تفسیر آیات الأحکام، سایس ۱/۱۰۱) (شاید یہ مسئلہ اجتہادی ہے، چنانچہ کسی ایک مجتہد کا کلام دوسرے پر حجت نہیں بنے گا) اس لیے اس مسئلہ میں اس عہد کی ضرورتوں، لوگوں کی شریعت سے ناواقفیت اور حقوق کی ادائیگی سے غفلت کے پیش نظر اس دوسرے قول کو اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے، تاکہ یہ سند رہے کہ عورت کے لیے ظالم شوہر سے نجات پانے کا راستہ اسلام نے کبھی بند نہیں کیا بلکہ کچھ ضروری کارروائیاں رکھی گئی ہیں جن سے گزرنے کے بعد عورت اپنے ناموافق حال شوہر سے گلوخلاصی حاصل کرسکتی، اس کے بغیر نہ نکاح کا مقصد پورا ہوسکتا ہے نہ بچوں کی صحیح تربیت، نہ دونوں خاندانوں میں اتفاق واتحاد، اس لیے ایسے اسباب کا اختیار کرنا ضروری ہے جو مظلوم کو اس کا حق دلاسکے اور ظالم کو کیفر کردار تک پہونچاسکے، یا پھر حکمین کے ذریعہ دونوں کے اس رشتہ کو ختم کردیا جائے۔

ہندوستان کے دو بڑے دینی وملی اداروں مسلم پرسنل لابورڈ اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ کے نمائندہ علماء کی یہی رائے ہے اور اسی پر عمل ہے (دیکھئے: مجموعہ قوانین اسلامی۔ مسلم پرسنل لابورڈ ۲۰۰۰۔ ۲۰۲، کتاب الفسخ والتفریق، از حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی، ص: ۱۵۶، مباحث فقہیہ، از قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، ص: ۴۷۷۔ ۴۹۵، جدید فقہی مسائل، از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، ص: ۲۲۰۔ ۲۱۰)، مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے: ''......اور اگر باوجود ان کوششوں کے اصلاح حال ممکن نہ ہو اور نکاح اپنے مقاصد سے خالی ہوجائے تو شوہر کی ذمہ داری تسریح بالاحسان کی ہے، لیکن اگر شوہر اس سے گریز کرے تو قاضی نیابۃ عن الزوج تفریق کردے گا'' (ص: ۲۰۲) رابطہ عالم اسلامی کے ماتحت قائم ''المجمع الفقہی الاسلامی'' (مکہ مکرمہ) کا فیصلہ اس طرح ہے ''قاضی محض عورت کے مطالبہ پر شوہر کو جدائی اور معاوضہ قبول کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا، بلکہ وہ دونوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرے گا، اور اس کے لیے دو ثالث بھیجے گا، اگر دونوں ثالث اتفاق نہ کریں اور صلح مشکل ہوجائے اور قاضی کے سامنے خلع ناگزیر ہوجائے تو شوہر کو علاحدگی کا حکم دے گا، اگر شوہر انکار کرے تو قاضی بہ عوض یا بلاعوض جس طرح بہتر سمجھے گا دونوں کے درمیان تفریق کرادے گا'' چونکہ حکمین اگر تفریق پر متفق نہ ہوں تو کسی کے نزدیک تفریق نہیں ہوگی اس لیے اس تجویز میں اس کے بعد کی مشکل بھی حل کی گئی ہے کہ قاضی خود اپنی قوت نافذہ کا استعمال کرکے تفریق کردے، اس وقت مصر، اردن، فلسطین اور تقریباً پورے عالم اسلام میں اسی قول پر عمل ہے (دیکھئے: ''القرارات القضائیۃ فی الاحوال الشخصیۃ حتی عام ۱۹۹۰ء''، عبدالفتاح عمرو، فیصلہ نمبر: ۱۵۵۸۷، دار یمان، ۱۹۹۰ء، شبکۃ المعلومات القانونیۃ لدول مجلس التعاون الخلیجی)۔ واللہ اعلم۔

☆☆☆

# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخِ نکاح

مفتی محمد عظمت اللہ میر رحیمی [1]

## کیا خلع عورت کا حق ہے؟:

موجودہ دور میں خلع کے بارے میں ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا ہے وہ یہ کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس طرح مرد کو طلاق دینے کا حق ہے اسی طرح عورت کو خلع لینے کا حق ہے۔

یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ (عورت کو خلع لینے کا حق ہے) اس جملہ کا مطلب کیا ہے؟ اس کے بارے میں ہمیشہ یہ بات ذہن نشین کر لینی ضروری ہے کہ جس طرح مرد بیوی کی رضامندی کے بغیر بوجہ اختلاف وغیرہ طلاق دینے کا حق رکھتا ہے کیا عورت کسی اختلاف یا طبعی نا اتفاقی کی وجہ سے شوہر کی رضامندی کے بغیر عدالت کی طرف رجوع کرتے ہوئے "خلع" لینے کا حق رکھتی ہے؟ اس سلسلے میں تمام علماء امت کا اتفاق رہا ہے کہ "خلع" ایک ایسا معاملہ ہے جس میں تراضی طرفین ضروری ہے اور کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں کر سکتا ہے لیکن بعض دعوی کرنے والوں کا کہنا ہے کہ "خلع" عورت کا ایک حق ہے جس سے وہ شوہر کی مرضی کے بغیر عدالت سے وصول کر سکتی ہے حالانکہ یہ دعوی یا اس طرح کے فیصلے دینا قرآن وسنت کے دلائل اور جمہور علماء کے متفقہ فیصلہ کے خلاف ہے۔

اولاً ہم ان بعض لوگوں کے مستدلات تحریر میں لائیں گے ساتھ ہی ان کے جوابات بھی پھر ائمہ اربعہ کی تفصیلات اس مسئلہ میں کیا ہیں؟ زیب ورق بنائیں گے۔

**مستدل ۱:**...... جو لوگ خلع کو عورت کا حق کہتے ہیں ان کی دلیل قرآن پاک کی یہ آیت "فان خفتم الا یقیما حدود اللہ فلا جناح علیهما فیما افتدت به" (البقرۃ۔۲۲۹) ہے۔ اس آیت کریمہ میں "فان خفتم" کا خطاب حکام کو ہے، جیسا کہ بعض مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے مثلاً ملاحظہ ہو (تفسیر قرطبی ۳/۸/۱۳۳، تفسیر کبیر ۵/۱۰۶، روح المعانی ۲/۱۴۰)، لہٰذا اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اگر حکام یہ سمجھیں کہ زوجین میں موافقت نہ ہو سکے گی تو وہ اپنی صوابدید کے مطابق نکاح فسخ کر سکتے ہیں خواہ شوہر راضی ہو یا نہ ہو اگر حکام کو یہ اختیار نہ ہوتا تو پھر خطاب کی کیا حاجت تھی؟ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں (فان خفتم) "خطاب للحکام لا غیر لئلا یلزم تغییر الاسلوب قبل مضی الجملة الخ"۔

**مستدل ۲:**...... دوسرا استدلال یہ لوگ حضرت ثابت ابن قیسؓ کی اہلیہ حضرت جمیلہؓ کے واقعہ سے کرتے ہیں جو ترمذی کے باب "الخلع وکیف الطلاق فیه" میں اختصار کے ساتھ آیا ہے اور بخاری میں اس تفصیل کے ساتھ مذکور ہے "عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان امرأة ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ اتت النبی ﷺ فقالت یا رسول اللہ !ثابت بن قیس ما اعتب علیه فی حق ولا دین ولکنی اکره الکفر فی الاسلام فقال رسول اللہ ﷺ اتردین علیه حدیقته قالت نعم قال رسول اللہ ﷺ اقبل الحدیقة وطلقها تطلیقة" مدعیین کا خیال ہے کہ یہاں آنحضرت ﷺ نے حضرت ثابت کی مرضی معلوم نہیں کی بلکہ براہ راست ان کو طلاق دینے کا حکم دیا۔

**مستدل ۳:**...... یہ آیت قرآنی ہے: "ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف" (البقرۃ) (اور عورتوں کے بھی حقوق ہیں جو مثل انہی حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں قاعدہ کے موافق) اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ جس طرح مرد کو عورت کی رضامندی کے بغیر طلاق کا قانونی حق دیا گیا ہے اسی طرح عورت کو بھی مرد کی رضامندی کے بغیر "خلع" کا حق ملنا چاہیے۔

## مستدل (۱) کا جواب:

[1] دار العلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کشمیر

آیت خلع میں کم از کم تین الفاظ ایسے ہیں جو خلع کیلئے تراضی طرفین کو شرط قرار دیتے ہیں کیوں کہ پوری آیت اس طرح ہے '' ولا یحل لکم أن تاخذوا مما اٰتیتموھن شیئًا إلا أن یخافا أن لا یقیما حدود اللہ فإن خفتم ألا یقیما حدود اللہ فلا جناح علیھما فیما افتدت بہ '' اس میں سب سے پہلے '' إلا ان یخافا ألا یقیما حدود اللہ '' اس بات کی صریح دلیل ہے کہ گفتگو اس صورت میں ہو رہی ہے جب شوہر اور بیوی دونوں خلع کی ضرورت محسوس کر رہے ہوں یا کم از کم اس پر راضی ہوں۔

دوسرے "فلا جناح علیھما" میں صیغہ تثنیہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ گفتگو تراضی طرفین کی صورت میں ہے۔

قرآن کریم نے خلع کے لئے لفظ '' فدیہ '' استعمال کیا ہے جو جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے دی جانے والی رقم کو کہتے ہیں اور اس میں تراضی طرفین ضروری ہوتی ہے، لہذا خلع میں بھی تراضی طرفین ضروری ہوگی۔

چنانچہ علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ باری تعالی نے خلع کے لئے '' فدیہ '' کا لفظ استعمال کیا ہے جو اس پر دال ہے کہ خلع میں معاوضہ کے معنی موجود ہے، لہذا اس میں '' تراضی طرفین '' کا اعتبار ضروری ہے، وہ لکھتے ہیں: '' وفی تسمیتہ ﷺ الخلع فدیۃ دلیل علی أن فیہ معنی المعاوضۃ ولھذا اعتبر فیہ رضا الزوجین '' (تفصیل کیلئے دیکھئے: زاد المعاد ج ۵، ۱۹۶ حکم رسول اللہ ﷺ فی الخلع)۔

الغرض اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آیت خلع میں تین جملے ایسے ہیں جو واضح طور پر شوہر اور بیوی دونوں کی رضامندی کا مفہوم رکھتے ہیں: (۱) '' مگر یہ کہ ان دونوں میاں بیوی کو یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے ''، (۲) '' ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ''، (۳) '' اس مال میں سے جو عورت فدیہ میں دے ''۔

ان تینوں جملوں کے بیچ میں "فان خفتم" (اگر تم کو خوف ہو) کے الفاظ آئے ہیں اس سے اس کے سوا کیا نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر یہ خطاب حکام ہی کو ہے تب بھی یہ اس صورت میں ہے جبکہ شوہر اور بیوی دونوں خلع پر راضی ہوں۔

یہ ساری بات اس بات کو تسلیم کرنے کے بعد کی گئی ہے کہ "فان خفتم" میں خطاب حکام کو ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ علماء کی ایک بڑی جماعت کا قول یہی ہے لیکن اگر ان حضرات مفسرین کا قول اختیار کیا جائے جو اس کا مخاطب زوجین کو قرار دیتے ہیں تو بات بالکل ہی صاف ہو جاتی ہے اس تفسیر کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اس آیت کا پہلا جملہ یعنی "ولا یحل لکم" میں بالاتفاق خطاب شوہروں کو ہے اس لئے اس مناسبت کا تقاضہ یہ ہے کہ "فان خفتم" کا خطاب بھی انہی کو ہو چنانچہ حکیم الامت مجدد ملت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے اس آیت کی تفسیر اسی طرح فرمائی ہے۔

وہ لکھتے ہیں: '' اور تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ (بیبیوں کو چھوڑتے وقت ان سے) کچھ بھی لو (گو وہ لیا ہوا) اس (مال) میں سے (کیوں نہ ہو) جو تم (ہی) نے ان کو (مہر میں) دیا تھا مگر (ایک صورت میں البتہ حلال ہے وہ) یہ کہ (کوئی) میاں بیوی (ایسے ہوں کہ) دونوں کو احتمال ہو کہ اللہ تعالی کے ضابطوں کو (جو در بارۂ اداء حقوق زوجیت ہیں) قائم نہ کر سکیں گے، سو اگر تم لوگوں کو (یعنی میاں بیوی کو) یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اس (مال کے لینے دینے) میں جس کو دیکر عورت اپنی جان چھڑا لے '' (بیان القرآن ص ۷۵)۔

یہ تفسیر بالکل بے غبار بھی ہے، اگر اس تفسیر کو اختیار کیا جائے تو اس آیت میں حکام کا کوئی ذکر ہی نہیں رہتا نیز "فان خفتم" کے جملہ میں فا تعقیبیہ ہے (جس کا اردو ترجمہ '' پس '' ہے) وہ صاف دلالت کرتا ہے کہ حکام کو یہ خطاب بھی اسی صورت سے متعلق ہے جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے یعنی الا ان یخافا الا یقیما حدود اللہ۔

رہا "فان خفتم" کا خطاب سو اول تو مفسرین کی ایک جماعت کے نزدیک یہ خطاب اہل خاندان کو ہے جیسے کہ ہمارے اسلاف میں سے حضرت تھانویؒ کے علاوہ مفتی شفیع صاحبؒ اور علامہ کاندھلویؒ نے اپنی تفسیروں میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ دوسرے اگر خطاب حکام ہی کو ہو تب بھی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ حکام شوہر کی مرضی کے بغیر خلع کر سکتے ہیں کیونکہ حکام کا زوجین کو مشورہ بھی دینا ہوتا ہے لہذا آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ ایسی صورت میں ہے جس صورت میں اس بات کا خطرہ ہو کہ زوجین حدود اللہ کی رعایت نہ کر سکیں گے حکام زوجین کو صرف خلع کا مشورہ دیں تا کہ '' تراضی طرفین '' جس کو شرط اول قرار دیا گیا ہے متحقق ہو سکے۔

## مستدل (۲) کا جواب:

مخالفین کا دوسرا استدلال یہ تھا کہ ''آنحضرت ﷺ نے حضرت ثابت ؓ کی مرضی معلوم کئے بغیر ان کو طلاق دینے کا حکم دیا'' یہ درست نہیں ہے، اس لئے کہ ''خلع'' کا یہ فیصلہ حضرت ثابت ؓ کی مرضی سے ہوا تھا۔ جس کا ثبوت سنن نسائی کی روایت سے ملتا ہے (سنن نسائی ۲/ ۹۵)۔

نسائی کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ثابت ابن قیس ؓ خود بھی راضی تھے کیونکہ حدیث میں لفظ '' قال نعم'' حضرت ثابت ابن قیس ؓ کی منظوری کی صراحت پر دال ہے گویا حضرت ثابت ؓ کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ ان کی زوجہ ''خلع'' چاہتی ہے اور آپ نے نبی اکرم ﷺ کے دیئے ہوئے مشورہ کو سرچشم قبول فرما کر لفظ "نعم" کہہ کر اپنی رضامندی کا ثبوت پیش فرمایا۔ اس کے علاوہ بخاری کی روایت میں تو یہ الفاظ صراحتا آئے ہیں "طلقها طلقة" اگر شوہر کی رضامندی ضروری نہ ہوتی تو پھر آپ ﷺ حضرت ثابت ؓ کو طلاق دینے کا حکم نہ فرماتے بلکہ خود ہی تفریق فرمادیتے حالانکہ معاملہ بالکل دوسری نوعیت کا ہے۔

علامہ ابوبکر جصاص ؒ نے تو حضرت ثابت ؓ کے اس واقعہ اور اس روایت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ خلع کا اختیار صرف مرد کو ہے نہ کہ قاضی کو کیونکہ یہاں آنحضرت ﷺ نے ثابت ابن قیس ؓ کو طلاق دینے کے لئے فرمایا اور خود تفریق نہیں فرمائی اگر یہ معاملہ عدالت اور حکام کے ہاتھ میں ہوتا تو بجائے حکم کرنے کے خود ہی تفریق فرمادیتے جیسا کہ لعان وغیرہ میں آپ سے خود تفریق کرنا ثابت ہے ملاحظہ کے لئے (بخاری ج ۲/ ۷۹۹۔ باب احلاف الملاعن) رجوع کریں (احکام القرآن للجصاص ج ۱/ ۳۹۵ ذکر اختلاف السلف وسائر فقہاء الامصار فیما یحل اخذہ بالخلع)۔

## مستدل (۳) کا جواب:

"ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف" اس آیت کریمہ سے مستدلین نے زوجین کے حقوق کے مساوات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''جس طرح مرد کو عورت کی رضامندی کے بغیر طلاق دینے کا قانونی شرعی حق دیا گیا ہے اسی طرح عورت کو بھی مرد کی رضامندی کے بغیر ''خلع'' کا حق ملنا چاہیے۔

لیکن یہ استدلال درست نہیں بایں معنی کہ اس آیت کریمہ کے اگلے جملے پر غور نہیں کیا گیا ہے چنانچہ پوری آیت اس طرح ہے (ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف وللرجال عليهن درجة والله عزيز حكيم)۔

اس آیت کریمہ میں "وللرجال عليهن درجة" کے الفاظ واضح طور پر دلالت کررہے ہیں کہ جنس معاملات میں جو اختیارات مرد کو حاصل ہے وہ عورت کو حاصل نہیں ہیں۔

اگر اس آیت کا مطلب یہ لیا جائے کہ زوجین تمام حقوق فرائض میں بالکل برابر ہیں تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مرد کو بغیر معاوضہ طلاق دینے کا اختیار ہے اور عورت معاوضہ اداء کیے بغیر طلاق حاصل نہیں کرسکتی حالانکہ زوجین کے مساوات کا اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ رشتہ نکاح کو قطع کرنے میں بھی دونوں برابر ہیں تو عورت کو بھی مرد کی طرح طلاق کا اختیار ملنا چاہیے۔

تمام مفسرین اور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیت کریمہ میں زوجین کی جس مساوات کا ذکر کیا گیا ہے وہ معاشرتی مساوات ہے۔ ورنہ جہاں تک طلاق اور رشتہ نکاح کو ختم کرنے کا سوال ہے معمولی حالات میں اس کا مکمل اختیار صرف مرد کو ہے اور اسی کی طرف قرآن کریم میں ان الفاظ کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی "وللرجال عليهن درجة" کے بارے میں لکھتے ہیں "فضيلة في الحق من وجوب طاعتهن لهم لما ساقوه من المهر والانفاق" (جلالین ۳۵)۔

ظاہر ہے کہ ان دلائل کی موجودگی میں "وللرجال عليهن درجة" سے قطع نظر کر کے صرف "ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف" کے الفاظ سے اس بات پر کہ ''عورت کو خلع کے لئے ایسا ہی حق اور آزادی کا اختیار ہے جیسے مرد کو طلاق میں شرعی حق حاصل ہے'' استدلال کرنا درست نہیں۔

**عبارات فقہاء و مجتہدین:**...... اب فقہاء مجتہدین کی وہ عبارات پیش کی جارہی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ، ظاہریہ میں سے ہر ایک کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ''خلع'' صرف میاں بیوی کی رضامندی سے ہوسکتا ہے اور ان میں سے کوئی فریق دوسرے کو مجبور نہیں کرسکتا ہے۔

## حنفیہ:

احناف کی بہت سی کتابوں میں واضح طور پر یہ عبارتیں ملتی ہیں کہ "خلع" زوجین کی باہمی رضامندی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا اور نہ اس پر کوئی فریق دوسرے کو جبر واکراہ کرسکتا ہے چنانچہ ہم یہاں صرف شمس الائمہ سرخسیؒ کی اس سلسلے میں ایک عبارت پیش کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں "والخلع جائز عند السلطان وغیرہ لانه عقد یعتمد علی التراضی" (خلع سلطان (حاکم) کے پاس بھی جائز ہے اور اس کے علاوہ بھی۔ اس لئے کہ یہ ایسا عقد ہے جسکی بنیاد باہمی رضامندی پر ہے) (المبسوط للسرخسی ج ۶/۱۷۲)۔

یادر ہے کہ شمس الائمہ سرخسیؒ کی یہ عبارت تمام فقہاء حنفیہ کے مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

علامہ آلوسی بغدادی حنفیؒ روح المعانی میں خلع کے ارکان کو یوں تحریر فرماتے ہیں: واکثر الفقهاء علی ان الخلع بلا شقاق ویجمع ما ساق مکروہ لکنه نافذ لان ارکان العقد من الایجاب والقبول واهلیة العاقدین مع التراضی متحقق" الخ (روح المعانی ج۲، ۱۲۱)

## شافعیہ:

حضرت امام شافعیؒ تحریر فرماتے ہیں: "لان الخلع طلاق فلا یکون لأحد أن یطلق عن أحد لا لأب ولا سید ولا ولی ولا سلطان" (کتاب الام ج۵، ۲۰۰) (اس لئے کہ خلع طلاق کے حکم میں ہے، لہذا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کی طرف سے طلاق دے، نہ باپ کو یہ حق ہے، نہ آقا کو، نہ سرپرست کو اور نہ حاکم کو"

علامہ ابواسحٰق شیرازی شافعیؒ لکھتے ہیں "لان رفع عقد بالتراضی جعل لدفع الضرر فجاز من غیر ضرر کالاقالة فی البیع" (المهذب للشیرازی ج۲، ۷۱) (اس لئے کہ یہ "خلع" باہمی رضامندی سے عقد نکاح کو ختم کرنے کا نام ہے جو ضرر دور کرنے کے لئے مشروع ہو، لہذا جہاں کسی فریق کو یہ ضرر ہو وہاں (بدرجہ اولی) جائز ہے جیسے کہ بیع میں اقالہ)۔

**مالکیہ:**...... علامہ ابو ولید باجی مالکیؒ موطا امام مالک کی شرح میں لکھتے ہیں، "وتجبر علی الرجوع إلیه إن لم یرد فراقها بخلع أو غیرہ" (المنتقی ج۴، ۱۶۲) (عورت کو شوہر کے پاس جانے پر مجبور کیا جائے گا اگر شوہر خلع وغیرہ کے ذریعے علحدگی نہ چاہتا ہو)۔

**حنابلہ:**...... فقہ حنبلی کے مستند ترین شارح علامہ موفق الدین ابن قدامہ حنبلیؒ تحریر فرماتے ہیں "ولأنه معاوضة فلم یفتقر الی السلطان کالبیع والنکاح ولأنه قطع عقد بالتراضی اشبه الاقالة" (اسلئے کہ یہ عقد معاوضہ ہے لہذا اس کے لئے حاکم کی ضرورت نہیں، جیسے کہ بیع و نکاح، نیز اس لئے کہ خلع باہمی رضامندی سے عقد کو ختم کرنے کا نام ہے، لہذا یہ اقالہ (فسخ بیع) کے مشابہ ہے)۔

## ظاہریہ:

علامہ ابن حزم ظاہریؒ تحریر فرماتے ہیں۔ "خلع" اور وہ فدیہ دیکر جان چھڑانے کا نام ہے جب عورت اپنے شوہر کو ناپسند کرے اور اس سے ڈر ہو کہ وہ شوہر کا پورا حق ادا نہ کر سکے گی، یا اس سے خوف ہو کہ شوہر اس سے نفرت کریگا اور اس کے پورے حقوق ادا نہیں کرے گا تو اس سے یہ اختیار ہے کہ وہ شوہر کو کچھ فدیہ دے اور اگر شوہر راضی ہو تو وہ اس کو طلاق دیدے اور اگر شوہر راضی نہ ہو تو نہ شوہر کو مجبور کیا جا سکتا ہے نہ عورت کو۔ خلع تو صرف باہمی رضامندی سے جائز ہوتا ہے اور جب مذکورہ دو صورتوں میں سے کوئی ایک یا دونوں نہ پائی جائیں خلع حلال نہیں ہوتا، لہذا اگر ان کے سوا کسی طرح خلع کرلیا گیا تو وہ باطل ہے اور شوہر نے جو کچھ مال لیا ہے وہ لوٹائے گا، اور عورت بدستور اس کی بیوی رہے گی اور اس کی طلاق باطل ہوگی اور شوہر کو صرف عورت پر ظلم کرنے سے منع کیا جائے گا" (المحلی ۱۰/۲۳۵)۔

ان تمام دلائل اور فقہاء کی پیش کردہ عبارات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مسئلہ تمام مسالک احناف، شوافع، مالکیہ، حنابلہ یہاں تک کہ اہل ظواہر کے نزدیک بھی مسلم اور متفق علیہ ہے کہ خلع زوجین کی رضامندی پر موقوف ہے، اس میں نہ کسی پر جبر واکراہ کیا جا سکتا ہے نہ کسی عدلیہ وحکام کے فیصلہ وغیرہ کی ضرورت ہے۔

اس کے علاوہ ہمارے اسلاف کے جو بھی فتاوی اس سلسلے میں آج تک مرتب ہوئے ہیں ان تمام فتاوی میں ہر ایک مفتی صاحب نے یہی جواب لکھا ہے کہ خلع شوہر کی رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتا بلکہ اس میں زوجین کا باہم موافق ہونا ضروری ہے۔

چنانچہ حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہ، اپنے فتاوی میں ایسے ہی ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "الجواب: حامدا ومصلیا: ان تکلیف دہ حالات کے باوجود رشتۂ زوجیت قائم ہے، خلع کے لئے شوہر کا رضامند ہونا ضروری ہے جب تک شوہر خلع کو منظور نہ کرے خلع نہیں ہو سکتا" (فتاوی محمودیہ کتاب الطلاق ج ۱۹/۱۷۶)۔

رہی بات اگر عورت شوہر کی جانب سے شدید حد تک متنفر ہو لیکن شوہر طلاق دینے پر تیار نہ ہو اور عورت کے پاس شوہر کی ظلم وزیادتی کے سلسلے میں بینہ فراہم نہ ہوں تو اس کے گلوخلاصی کی کیا صورت ہوگی؟ اس سلسلے میں حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی "الحیلة الناجزہ للحیلة العاجزہ" کے جزو دوم بابت فسخ نکاح کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: "نکاح ہوجانے کے بعد جو مشکلات عورتوں کو شوہر کی طرف سے پیش آتی ہیں اور جن میں ابتلاء عام اور ضرر شدید ہے.........

ان سب صورتوں میں عورت کی رہائی کیلئے شرعی صورتیں جدا جدا ہیں جن کو بالتفصیل لکھا جائے گا لیکن ان سب میں یہ بات مشترک ہے کہ اس رہائی میں عورت یا اس کے اولیاء خود مختار نہیں بلکہ قضائے قاضی شرط ہے یعنی ضروری ہے کہ عورت اپنا مقدمہ قاضی کی عدالت میں دائر کرے اور قاضی باقاعدہ شرعی تحقیق کے بعد تفریق وغیرہ کا حکم کرے"۔

آگے حضرت والا نور اللہ مرقدہ "صورت قضائے قاضی در ہندوستان" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں: "ہندوستان کی جن ریاستوں میں قاضی شرعی موجود ہیں وہاں تو معاملہ سہل ہے...... اور اگر کسی جگہ مسلمان حاکم موجود نہ ہو یا مسلمان حاکم کی عدالت میں مقدمہ لیجانے کا قانوناً اختیار نہ ہو یا مسلمان حاکم قواعد شرعیہ کے مطابق فیصلہ نہ کرتا ہو تو اس صورت میں مذہب حنفی کے مطابق عورت کی علیحدگی کے لئے بجز خاوند کی طلاق یا خلع کے کوئی صورت نہیں، لیکن اگر خاوند طلاق اور خلع پر بھی کسی طرح راضی نہ ہو یا مفقود یا مجنون یا نابالغ ہونے کی وجہ سے اس سے طلاق وخلع نہ ہو سکے تو اس وقت مذہب امام مالکؒ کے موافق جس کا اختیار کرنا بضرورت شدیدہ حنفیہ کے نزدیک بھی جائز ہے، اس وقت مسلمانوں کی جماعت کا حکم بھی قضائے قاضی کے قائم مقام ہوجائیگا، اور اس کی صورت یہ ہے کہ محلہ یا بستی کے دیندار (اور بااثر) مسلمانوں کی ایک جماعت کے سامنے جنکا عدد کم از کم تین ہو اپنا معاملہ پیش کیا جائے اور وہ جماعت واقعہ کی تحقیق کر کے شریعت کے موافق حکم کردے۔

جماعت المسلمین کی شرائط: اس جماعت کو قاضی کے قائم مقام کرنے کے لئے چند شرائط ہیں، جس جماعت میں یہ شرطیں موجود نہ ہوں وہ شرعاً معتبر نہ ہوگی۔

(۱) کم از کم تین آدمیوں کی جماعت ہو ایک یا دو آدمی فیصلہ کریں تو وہ معتبر نہیں۔

(۲) اس جماعت کے سب ارکان کا عادل ہونا شرط ہے اور عادل وہ شخص ہے جو تمام کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو اور صغائر پر مصر نہ ہو اور اگر کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کر لیتا ہو الخ......

(۳) فیصلہ میں علماء کی شرکت لازم اور شرط ہے صرف عوام کی جماعت کا فیصلہ حکم قاضی کے قائم مقام نہیں ہو سکتا الخ......

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ جماعت مسلمین کے سب ارکان متفقہ فیصلہ دیں اگر رائے مختلف رہے اور کثرت رائے کی بنا پر فیصلہ کرنا چاہیں تو وہ فیصلہ معتبر نہ ہوگا (الحیلة الناجزہ للحیلة العاجزہ ص ۷۲-۷۰)۔

واضح رہے کہ یہ طریقۂ کار اسی صورت میں اپنانا جائز ہے جب اس کی اشد ضرورت ہو، یہ اس لئے کہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ "الحیلة الناجزہ" میں "رفاق المجتهدین للنظر فی وفاق المجتهدین" کے عنوان کے تحت اسی بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ "ان جیسے مسائل میں ضرورت شدیدہ کی وجہ سے خروج عن المذہب کی گنجائش دی گئی ہے عام حالات میں محض اتباع ہواء کی بنا پر دوسرے مذہب پر فتویٰ دینا حرام ہیں (الحیلة الناجزہ ص ۲۱۴)۔

شقاق سے کیا مراد ہے؟ شقاق کے معنی اختلاف کے ہیں جب میاں بیوی کا جھگڑا طول پکڑ جائے اور بات حد سے نکل جائے اور میاں بیوی کا یہ اختلاف گھر کی چہار دیواری سے باہر نکلا ہو، خواہ اس وجہ سے کہ عورت کی طبیعت میں تمرد وسرکشی ہو یا اس بنا پر کہ مرد کا قصور اور اس کی طرف سے بے جا تشدد ہو جس کی بناء پر طبعی منافرت بھی اس حد تک بڑھ گئی ہو کہ انضمام واتفاق مشکل لگ رہا ہو ایسے فساد عظیم کا نام قرآن نے "شقاق" رکھا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے "وان خفتم شقاق بینهما الخ" "اور اگر تم ایسے اختلاف (فساد عظیم) کا اندیشہ کرو زوجین کے درمیان الخ"۔

علامہ آلوسیؒ "شقاق بینہما" کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''شقاق بينهما) أى الزوجين. وهما وإن لم يجر ذكرهما صريحا فقد جرى ضمنا لدلالة النشوز الذى هو عصيان المرأة زوجها. والرجال والنساء عليهما. والشقاق الخلاف والعداوة واشتقاقه من الشق وهو الجانب لأن كل من المتخالفين فى شق غير شق الآخر'' (روح المعانی ج۳، الجزء الخامس ص ۲۶)۔

## کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے؟

زوجین کے درمیان حد سے گذرے ہوئے باہمی اختلاف کی بناء پر قرآن پاک نے اس فسادِ عظیم کا دروازہ بند کرنے کے لئے حکام وقت، فریقین کے اولیاء وحامیوں، اور مسلمانوں کی جماعتوں کو خطاب کر کے ایک ایسا طریقہ بتلایا جس سے فریقین کا اشتعال اور الزام تراشی کے راستے بند ہوجائیں وہ یہ کہ ارباب حکومت یا فریقین کے اولیاء یا مسلمانوں کی کوئی مقتدر جماعت یہ کام کرے کہ ان کے آپس میں مصالحت کرانے کے لئے دو حکم مقرر کریں ایک مرد کے خاندان سے دوسرا عورت کے خاندان سے ہو اور دونوں جگہ لفظ حکم سے تعبیر کر کے قرآن کریم نے ان دونوں شخصوں کے ضروری اوصاف کو بھی متعین کر دیا کہ ان دونوں میں جھگڑوں کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو اور یہ صلاحیت ظاہر ہے اسی شخص میں ہوسکتی ہے جو ذی علم بھی ہو اور دیانت دار بھی۔

چنانچہ سورہ نساء آیت ۳۵ میں اللہ تعالیٰ فرماتے نے اسی مضمون کو واضح فرمایا ہے:

خلاصہ اس آیت کا یہ ہے کہ ایک حکم مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا مقرر کر کے دونوں میاں بیوی کے پاس بھیجے جائیں اب وہاں جا کر یہ دونوں کیا کام کریں اور ان کے اختیارات کیا ہیں قرآن کریم نے اس کو متعین نہیں فرمایا، البتہ آخر میں ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا'' إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما''، یعنی اگر یہ دونوں حکم اصلاحِ حال اور باہمی مصالحت کا ارادہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے کام میں امداد فرمادیں گے اور میاں بیوی میں اتفاق پیدا کردیں گے۔

مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں: اس جملہ سے دو باتیں مفہوم ہوئیں: اوّل تو یہ کہ مصالحت کرانے والے دونوں حکم اگر نیک نیت ہوں اور دل سے چاہیں کہ باہم صلح ہوجائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی غیبی امداد ہوگی۔

دوسری بات اس جملہ سے یہ بھی سمجھی جاتی ہے کہ ان دونوں حکمین کے بھیجنے کا مقصد میاں بیوی میں صلح کرانا ہے اس سے زیادہ کوئی کام حکمین کے بھیجنے کے مقصد میں شامل نہیں یہ دوسری بات ہے کہ فریقین رضامند ہو کر انہی دونوں حکموں کو اپنا وکیل، مختار یا ثالث بنادیں اور یہ تسلیم کرلیں کہ تم دونوں مل کر جو فیصلہ بھی ہمارے حق میں دوگے وہ ہمیں منظور ہوگا، اس صورت میں یہ دونوں حکم کلی طور پر ان کے معاملہ کے فیصلہ میں مختار ہوجائیں گے دونوں طلاق پر متفق ہوجائیں تو طلاق ہوجائے گی۔ دونوں مل کر خلع وغیرہ کی کوئی صورت طے کردیں تو وہی فریقین اور مرد کی جانب سے دیئے ہوئے اختیار کی بناء پر عورت کو طلاق دیدیں تو فریقین کو ماننا پڑے گی۔ سلف صالحین میں حضرت حسن بصریؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی یہی تحقیق ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا اس میں بھی اس کی شہادت موجود ہے کہ ان دونوں حکموں کو از خود کوئی اختیار بجز صلح کرانے کے نہیں جب تک فریقین ان کو کلی اختیار نہ دیں یہ واقعہ سنن بیہقی میں ''بروایت عبیدہ سلمانی'' اس طرح مذکور ہے:

''ایک مرد اور ایک عورت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دونوں کے ساتھ بہت سی جماعتیں تھیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حکم دیا کہ ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک عورت کے خاندان سے مقرر کریں جب یہ حکم تجویز کردیئے گئے تو آپ نے ان دونوں سے خطاب فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ تمہاری ذمہ داری کیا ہے؟ اور تمہیں کیا کرنا ہے؟...... سن لو اگر تم دونوں ان میاں بیوی کو یکجا رکھنے اور باہم مصالحت کرادینے پر متفق ہوجاؤ تو ایسا ہی کرلو یہ سن کر عورت بولی مجھے یہ منظور ہے یہ دونوں حکم قانون الٰہی کے موافق جو فیصلہ کردیں خواہ میری مرضی کے مطابق ہو یا خلاف مجھے منظور ہے۔

لیکن مرد نے کہا کہ جدائی اور طلاق تو میں کسی حال گوارہ نہ کروں گا البتہ حکم کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ مجھ پر مالی تاوان جو چاہیں ڈال کر اس کو راضی کردیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ نہیں تمہیں بھی ان حکمین کو ایسا ہی اختیار دینا چاہیے جیسا عورت نے دیدیا۔

اس واقعہ سے بعض ائمہ مجتہدین نے یہ مسئلہ اخذ کیا کہ ان حکمین کا بااختیار ہونا ضروری ہے جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فریقین سے کہہ کر ان کو بااختیار بنوایا۔ اور امام اعظمؒ اور حضرت حسن بصریؒ نے یہ قرار دیا کہ اگر ان حکمین کا بااختیار ہونا امرِ شرعی اور ضروری ہوتا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس ارشاد اور

فریقین سے رضامندی حاصل کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی فریقین کو رضامند کرنے کی کوشش خود اس کی دلیل ہے کہ اصل سے یہ حکمین بااختیار نہیں ہوتے ہاں میاں بیوی ان کو مختار بنادیں تو بااختیار ہوجاتے ہیں۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے دور کے قاضیوں کے لئے یہ فرمان جاری فرمادیا تھا کہ: (ردّوا القضاة بين ذوى الارحام حتى يصطلحوا فان فصل القضاء يورث الضغائن) ''رشتہ داروں کے مقدمات کو انہی میں واپس کردو تا کہ وہ خود برادری کی امداد سے آپس میں صلح کی صورت نکال لیں کیونکہ قاضی کا فیصلہ دلوں میں کینہ وعداوت پیدا ہونے کا سبب ہوتا ہے'' (معین الاحکام ص ۲۱۴)۔

چنانچہ فقہائے حنفیہ میں سے قاضی قدس علاء الدین طرابلسیؒ نے اپنی کتاب ''معین الاحکام'' اور ابن شحنہؒ نے ''لسان الحکام'' میں اس فرمان فاروقی کو ایسے پنچائتی فیصلوں کی خاص بنیاد بنایا ہے جن کے ذریعے فریقین کی رضامندی سے صلح کی کوئی صورت نکالی جائے۔

اس سلسلہ میں فقہاء کی رائیں مختلف ہیں، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہاں یہ اختیار مکمل طور پر مرد ہی کے ہاتھ میں ہے خود قاضی یا قاضی کی طرف سے مقرر کئے ہوئے حکم بطور خود عورت کو طلاق نہیں دے سکتے ہیں اس کے برخلاف امام مالکؒ کے نزدیک قاضی زوجین کے حد سے گذرے ہوئے باہمی اختلاف کی صورت میں ایک دورکنی مصالحتی کمیٹی قائم کرے گا جس میں بہتر ہے کہ ایک مرد کا رشتہ دار ہو اور دوسرا عورت کا، پھر وہ دونوں اپنی صوابدید سے چاہیں تو مصالحت کرادیں یا چاہیں تو علیحدگی کرادیں کیونکہ اس مسئلہ میں حکمین کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوتی ہیں۔

علامہ ابوعبداللہ قرطبیؒ ''الجامع لاحکام القرآن'' میں فقہ مالکیہ کی تفصیلات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(۱) حکم کا تقرر قاضی کرے گا۔

(۲) بہتر ہے کہ دو حکم مقرر کئے جائیں یوں اگر ایک ہی حکم مقرر کرے یا زوجین ایک ہی شخص کے حکم ہونے پر اتفاق کرلیں تو بھی کافی ہے اور اس کا فیصلہ نافذ ہوگا۔

(۳) اگر دو حکم مقرر ہوئے تو ضروری ہے کہ فیصلہ دونوں کے اتفاق رائے سے ہو اگر ایک نے تفریق کی رائے دی اور دوسرے نے اختلاف کیا تو اب تفریق نہ ہوسکے گی۔

(۴) حکمین تفریق کا فیصلہ کرنے میں نہ زوجین کی مرضی کے پابند ہونگے اور نہ خود قاضی کے حکم کے۔

(۵) حکمین بہتر ہے کہ مرد وعورت کے اقرباء میں سے ہوں مگر یہ ضروری نہیں ہے قاضی اپنی صوابدید پر کسی کو بھی اس کے لئے مقرر کرسکتا ہے۔

(۶) حکمین کا احکام شرعیہ سے واقف، دیانتدار، اور غیر جانبدار ہونا ضروری ہے (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج ۵ ص ۱۷۵/۱۷۸ ماخوذ از فقہی مسائل ج ۳ ص ۲۰۹، ۲۱۰)۔

رہی بات کہ ''شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح'' تو چونکہ احناف کے یہاں اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے لیکن اگر مسئلہ طول پکڑ رہا ہو اور حدود اللہ کو قائم رکھ سکنے کے بجائے دن بدن جانبین کی جانب سے اور زیادہ ظلم ہو رہا ہو تو اس صورت میں احناف بھی یہ کہتے ہیں کہ ضرورت شدیدہ وضرورت داعیہ اور ابتلائے عام کے وقت دوسرے ائمہ کے مذہب کو اختیار کرکے اس پر فتویٰ دیدینا بھی جائز ہے جیسا کہ حکیم الامت، مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ نے (مقدمہ در بیان حکم قضائے قاضی در ہندوستان ودیگر ممالک غیر اسلامیہ) کے عنوان کے تحت اس بات کو بیان فرمایا ہے آپ لکھتے ہیں:۔

''لیکن اگر خاوند کسی طرح نہ مانے اور اس سے خلع وغیرہ ممکن نہ ہو اور عورت کو صبر کی ہمت نہ ہو تو مجبوراً مذہب مالکیہ کے مطابق دیندار مسلمانوں کی پنچایت میں معاملہ پیش کرنے کی گنجائش ہے کیونکہ مالکیہ کے مذہب میں قاضی وغیرہ نہ ہونے کی حالت میں یہ صورت بھی جائز ہے کہ محلہ کے دیندار مسلمانوں کی ایک جماعت جن کا عدد کم از کم تین ہو پنچایت کرے اور واقعہ کی تحقیق کرکے شریعت کے موافق حکم کردے تو یہ بھی قضائے قاضی کے قائم مقام ہوجاتا ہے، اور ضرورت شدیدہ اور ابتلائے عام کے وقت حنفیہ کے نزدیک دوسرے ائمہ کے مذہب کو اختیار کرکے اس پر فتویٰ دیدینا بھی جائز ہے لیکن عوام کو خود اپنی رائے سے جس مسئلہ میں چاہیں ایسا کرلینے کی اجازت نہیں بلکہ بڑی احتیاط کی ضرورت ہے ''وذلك كما صرح به العلامة الشامي في رسالة شرح المنظومة في رسم المفتي الخ.

اور اس زمانے میں احتیاط اس طرح ہوسکتی ہے کہ جب تک محقق ومتدین علمائے کرام میں سے متعدد حضرات کسی مسئلہ میں ضرورت کا تحقق تسلیم کرکے دوسرے امام کے مذہب پر فتویٰ نہ دیں اس وقت تک ہرگز اپنے امام کے مذہب کو نہ چھوڑے کیونکہ مذہب غیر کو لینے کے لئے یہ شرط ہے کہ اتباع ہویٰ کی بناء پر نہ ہو بلکہ ضرورت داعیہ کی وجہ سے ہو اور ضرورت وہی معتبر ہے جس کو علمائے بصیرت ضرورت سمجھیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ فتویٰ دینے والا ایسا شخص ہو جس نے کسی

ماہر استاذ سے فن کو حاصل کیا ہو اور اہل بصیرت اس کو فقہ میں مہارت تامہ حاصل ہونے پر شہادت دیتے ہوں'' کما قال الشامی فی عقود رسم المفتی فان المتقدمين شرطوا فی المفتی الاجتهاد وهٰذا مفقود فی زماننا فلا اقل من ان یشترط فیه معرفة المسائل بشروطها وقیودها التی کثیرا ما یسقطونها والا لیصرحون بها اعتمادا علی فهم المتفقه وکذا لا بد من معرفة عرف زمانه واحوال اهله والتخریج فی ذالك علی استاذ ماهر الخ'' (الحیلة الناجزه ص ۴۶، ۴۷)۔

چونکہ ''الحیلۃ الناجزۃ'' کے قیمتی اور علمی مباحث پر برِ صغیر کے علماء کرام کی تصدیقات موجود ہے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ برِ صغیر کے اس وقت کے علمائے کرام کے اس اتفاق کو بھی مدنظر رکھ کر کوئی فیصلہ کر لینا چاہئے۔

## آخری بات: قاضی کی تفریق بین الزوجین۔

''جمہور فقہاء کے نزدیک بعض مخصوص حالات میں قاضی شرعی کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ بلا مرضی شوہر بھی زوجین میں تفریق کر دے جو بحکم طلاق ہے اور یہ طلاق شوہر کی اجازت کے بغیر حاکم کی طرف سے نافذ ہوتی ہے اس لئے تفریق قاضی کے مسئلہ کی وضاحت کر دینا مناسب ہے''۔

''صورت حال یہ ہے کہ عورت کے جو حقوق مرد پر واجب ہیں وہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جو قانونی حیثیت رکھتے ہیں جو نکاح کے قانونی مقاصد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں مثلاً نان ونفقہ اور وظائف زوجیت وغیرہ یہ وہ حقوق ہیں جنہیں بزور عدالت شوہر سے وصول کیا جا سکتا ہے اور اگر شوہر ان کی ادائیگی سے عاجز ہو تو اس پر قانوناً واجب ہو جاتا ہے کہ عورت کو طلاق دے، ایسی صورت میں اگر وہ طلاق دینے سے انکار کرے یا طلاق دینے کے قابل نہ ہو تو مجبوراً قاضی کو اس کا قائم مقام قرار دے کر تفریق کا اختیار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ مجنوں، متعنت (نان ونفقہ نہ دینے والا)، عنّین (نامرد)، مفقود الخبر، اور غائب غیر مفقود میں یہی صورت ہوتی ہے''۔

اس کے برخلاف نکاح کے بعض حقوق ایسے ہیں جن کی ادائیگی شوہر پر دیانۃً ضروری ہے لیکن وہ قانونی حیثیت نہیں رکھتے، اور نہ انہیں بزور عدالت وصول کیا جا سکتا ہے، مثلاً بیوی کے ساتھ حسن سلوک اور خوش اخلاقی کا معاملہ ظاہر ہے کہ یہ حقوق بزور قانون نافذ نہیں کئے جا سکتے جب تک کہ شوہر کے دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر نہ ہو''۔

آخر میں اس بات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے کہ حکیم امت مجدد ملت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے ''الحیلۃ الناجزۃ'' کے جزء اول میں ''تفویض طلاق بوقت نکاح از فقہِ حنفی'' کے عنوان کے تحت جو علمی بحث دور حاضر کے مسائل کے متعلق فرمائی ہے اس کو دیکھنا اور اپنانا بہت موزوں معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اگر اس کو عمل میں لایا جائے تو بہت سارے اس قسم کے مسائل میں مؤثر رہے گا۔



# باب سوم مختصر مقالات

## شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

مفتی عبداللہ پٹیل مظاہری ناظم جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ، گجرات

**ا۔ خلع کی فقہی واصطلاحی تعریف:**...... خلع اسم مصدر ہے جس کا معنی ہے ہٹا دینا، اتار دینا، ابن منظور الافریقی فرماتے ہیں: الخلع النزع والتجريد والإزالة. خلع الرجل ثوبه أي أزاله (لسان العرب: ۸،۲۰۹)۔

ابن نجیم مصریؒ نے خلع کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: إزالة ملك النكاح المتوقفة على قبولها بلفظ الخلع أو ما في معناه (البحر الرائق: ۴،۱۱۹)، یعنی بیوی کی رضامندی کی شرط کے ساتھ خلع یا اس کے ہم معنی لفظ کے ذریعہ ملک نکاح کو ختم کر دینا۔

**(۲) کیا عورت کو خلع لینے کا حق حاصل ہے؟**...... بغیر کسی معقول وجہ کے عورت کے لیے خلع کا مطالبہ مکروہ ہے، لیکن اگر نباہ مشکل ہو اور عورت کو کفران عشیر کا اندیشہ ہو تو وہ خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے، البتہ عورت کی طرف سے خلع کی پیش کش کا قبول کرنا مرد کے ذمے ضروری نہیں بلکہ مستحب ہے، قاضی شوکانی اور حافظ ابن تیمیہؒ کی رائے اگرچہ وجوب کی ہے لیکن اس باب میں جمہور کا مسلک ہی احوط اور اسلم ہے۔

**(۳) اگر عورت شدید حد تک متنفر ہو اور شوہر طلاق پر تیار نہ ہو؟**...... اگر کوئی عورت وجوہ معتبرہ عند الشرع کی وجہ سے شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار کرتی ہے تو یہ انکار جائز ہے، اگر وہ ان اسباب کی بنا پر تفریق چاہے تو اسباب معتبرہ کو سامنے رکھ کر قاضی اس کا نکاح فسخ کر سکتا ہے، لیکن اگر یہ اسباب معتبرہ موجود نہ ہوں اور عورت شوہر کی جانب سے شدید حد تک متنفر ہو اور شوہر طلاق پر آمادہ نہ ہو اور قاضی محسوس کرتا ہے کہ اب طرفین کے درمیان معروف اور بہتر تعلقات کے ساتھ نکاح کا برقرار رہنا ممکن نہیں ہے تو اس صورت میں فقہ مالکی کو سامنے رکھتے ہوئے تحکیم اور پھر خلع جبری کی صورت نکال سکتا ہے۔

**(۴) شقاق سے کیا مراد ہے؟**...... شقاق کا معنی ہے مخالفت، اور مطلب یہ ہے کہ زوجین کے رشتے میں ایسی تلخی اور کڑواہٹ آ جائے کہ اس کی وجہ سے موافقت اور نباہ مشکل معلوم ہونے لگے، عورت نشوز پر اتر آئے، شوہر کے حقوق ادا نہ کر سکے، اور شوہر عورت کے تئیں اپنی ذمہ داری نہ بجالائے۔

**(۵) شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ**...... حنفیہ، شوافع اور حنابلہ شقاق یا ضرر کی وجہ سے تفریق کے قائل نہیں ہیں، خواہ ناچاقی اور ضرر اپنی انتہا کو پہنچ جائے، اس لئے کہ بغیر طلاق کے بھی زوجہ سے دفع ضرر ممکن ہے، زوجہ قاضی کے پاس مرافعہ کرے اور قاضی زوجہ کے خلاف تادیب کا فیصلہ کرے تا آں کہ وہ اپنے رویے سے باز آ جائے، مالکیہ نے شقاق یا ضرر کی وجہ سے تفریق کو جائز قرار دیا ہے۔

**(۶) حکمین کی تقرری اور اس کی تعداد**...... مالکیہ وغیرہ جن کے یہاں خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں ہے، ان کے یہاں بھی قاضی کی طرف سے حکمین کا تقرر کیا جانا ضروری ہے، تحکیم سے قبل قاضی کا فیصلہ خلع معتبر نہیں ہوگا (احکام القرآن جصاص ۳؍۱۵۲، احکام القرآن لابن العربی ۱؍۴۲۷)۔ مالکی علماء کی تصریحات کے مطابق ایک حکم کا تقرر بھی کافی ہوگا (احکام القرآن لابن العربی ۱؍۴۲۷)۔

**(۷) کیا اس مسئلہ میں ضرورۃً کسی اور مکتب فکر کی طرف عدول کی گنجائش ہے؟**...... ضرورۃً شرائط معتبرہ کے ساتھ مالکی مسلک کی طرف عدول کی گنجائش ہے جیسا کہ اس سے پہلے بھی اکابر نے طلاق و تفریق کے حوالے سے بعض صورتوں میں فقہ مالکی کی طرف عدول کیا ہے جس کی تفصیلات الحیلۃ الناجزۃ میں موجود ہیں۔ ☆☆☆

# شقاق کی بناء پر خلع وتفریق

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی[۱]

الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین وعلی آلہ وصحبہ أجمعین۔ أما بعد!

(۱) نسل انسانی کو قیامت تک اس دنیا میں رکھنا ہے۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے مرد وعورت کو پیدا کیا ہے اور دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف میلان کا جذبہ رکھا ہے، لیکن دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے کے لئے آزاد نہیں چھوڑا ہے بلکہ نکاح کے ذریعہ جنسی تعلق کو جائز قرار دیا ہے۔ تاکہ دونوں مل کر اپنی اولاد کی صحیح تربیت کریں اور قیامت تک انسان کی نسل باقی رہے۔

اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ نکاح کا رشتہ زندگی بھر کے لئے قائم ہو، اسی لئے اسلام نے کچھ دنوں کے لئے نکاح کرنے کو حرام قرار دیا ہے، اس کے باوجود کبھی ایسا ہوجاتا ہے کہ جن دو آدمیوں (مرد وزن) میں نکاح کا رشتہ قائم ہوتا ہے، ان کے مزاج میں ہم آہنگی نہیں ہوتی ہے، دونوں کے درمیان رحمت ومودت باقی نہیں رہتی، ایسی صورت میں شریعت نے دونوں کو الگ ہوجانے کی اجازت دی ہے، یہی طلاق ہے۔

(۲) نکاح میں مرد وعورت دونوں کو اپنی پسند کے مطابق اپنے لئے جوڑ منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، لیکن طلاق دینے کا اختیار صرف مرد کو ہے، عورت طلاق کے ذریعہ اس رشتہ کو ختم نہیں کرسکتی ہے۔ نکاح وطلاق کے قوانین فقہاء بالفاظ دیگر مردوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ مرد وزن کے خالق کے بنائے ہوئے ہیں، اسی نے ان دونوں کو پیدا کیا ہے، ان کی فطرت سے واقف ہے، اس نے مرد کو طلاق کا اختیار دیا ہے، عورت کو نہیں دیا، اس کی مصلحت تو وہی جانتا ہے۔ لیکن جو لوگ اخبارات پڑھتے ہیں۔ دنیا کے حالات سے باخبر ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عورت کو طلاق کا اختیار دینا ہرگز مناسب نہیں ہے۔

بعض لوگوں کے یہاں طلاق کی گنجائش نہیں تھی، یعنی جب نکاح ہوگیا تو حالات چاہے جو بھی ہوں بد سے بدتر حالات میں بھی اس نکاح کو ختم کرکے الگ ہونے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، ظاہر ہے کہ یہ قانون فطرت انسانی کے خلاف تھا، پھر جب انہوں نے ضرورت محسوس کی کہ طلاق کو جائز قرار دیا جائے تو اگر وہ اسلام سے رہنمائی حاصل کرتے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہے تو اس قانون کی برکت سے فائدہ اٹھاتے، مگر انہوں نے مرد وزن کے درمیان مساوات کے پرفریب نعرہ کے تحت مرد وعورت دونوں کو طلاق کا اختیار دیدیا اور طلاق کی کثرت نہ ہو اس کے لئے عدالت کے ذریعہ ان کو طلاق کا پابند بنایا، مگر دنیا جانتی ہے کہ اس کے باوجود ان ممالک میں طلاق کی کثرت تشویشناک حد تک زیادہ ہے۔

خلع کی حقیقت میں زوجین کی رضامندی داخل ہے یعنی عورت کی طرف سے مال ہو اور شوہر کی طرف سے طلاق ہو، اس کو خلع کہتے ہیں، ایسی صورت میں یہ کہنا کہ جیسے مرد کو طلاق کا حق ہے اسی طرح عورت کو خلع کا حق ہے۔ میرے لئے ناقابل فہم ہے۔

حضرت تھانویؒ نے ''الحیلۃ الناجزۃ'' میں عورت کی گلوخلاصی کے لئے جو صورتیں تجویز کی ہیں انہوں نے بھی لکھا ہے کہ مطلقاً عورت کو طلاق کا اختیار دیدینا مناسب نہیں ہے، بلکہ چند آدمیوں کے نام لکھ کر یہ لکھا جائے کہ ان میں دو آدمی بھی تفریق کو مناسب سمجھیں تو عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کر لینے کا حق ہوگا۔ غالباً حضرت تھانویؒ کے ذہن میں بھی یہ بات تھی کہ مطلقاً عورتوں کو طلاق کا اختیار دیدینا کثرت طلاق کا سبب ہوسکتا ہے۔

چند ایام پہلے ۱۶؍ فروری کو ''قومی تنظیم'' اور ''راشٹریہ سہارا'' میں ایک خبر نظر سے گزری جس میں سعودی عرب میں طلاق کی کثرت کا ذکر تھا، تفصیل دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے کثرت طلاق کی وجوہات پر غور کیا ہے ان میں ایک وجہ زواج المسیار ہے، یعنی عورت نکاح کے وقت ہی شوہر کو اپنے مہر، نفقہ وغیرہ کی ذمہ داریوں سے بری کردیتی ہے اور اس کے عوض اس کو طلاق واقع کرنے کا اختیار مل جاتا ہے، ایسی عورتیں کچھ دنوں شوہر کے ساتھ رہتی ہیں پھر جب جی

[۱] ☆ قاضی شریعت مرکزی دار القضاء امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ

چاہتا ہے چھوڑ کر چلی جاتی ہیں، اس طرح ان پر طلاق واقع ہوجاتی ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو مطلق طلاق کا اختیار دیدینا مصالح شرعیہ کے خلاف ہے۔

معاشرہ میں زوجین کے درمیان پیش آنے والی زیادتیوں کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ ہمیشہ مرد ہی ظالم ہوتے ہیں؛ صحیح نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر مردوں کی طرف سے ظلم ہوتا ہے، مگر اپنا تجربہ یہ ہے کہ کبھی کبھی عورتیں بھی ظالم ہوتی ہیں، اس طرح کے ایک واقعہ کا ذکر اسلامی عدالت میں بھی ہے کہ ایک عورت کے بہتے ہوئے آنسو کو دیکھ کر اس کے مظلومہ ہونے کا خیال ہوا، مگر تحقیق کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ عورت ہی نہایت ظالم ہے۔

بہر حال اس طرح کی برائیوں کو دور کرنے کے لئے قانون سازی کی راہ اختیار کرنا مفید نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ پند ونصائح کے ذریعہ فکر آخرت اور اللہ تعالی کا خوف پیدا کیا جائے تاکہ کوئی آدمی تنہائی میں بھی کسی دوسرے پر ظلم وزیادتی نہ کرے۔

شوہر کی طرف سے عورت کو غیر شرعی امور پر مجبور کرنے کی وجہ سے عورت کے دل میں نفرت پیدا ہوجائے، مثلاً شوہر اس کو غیر فطری عمل پر مجبور کرے، یا بے پردگی پر مجبور کرے، جس کی وجہ سے عورت متنفر ہوجائے اور زوجین کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہوجائے اس کی تعبیر عام طور پر شقاق سے کی جاتی ہے، فقہ وفتاوی نیز تفسیر کی کتابوں میں الگ الگ عبارتوں میں اس کی وضاحت کی گئی ہے، قرآن کریم میں اسی اختلاف کو دور کرنے کے لئے دونوں طرف سے حکم مقرر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ اگر یہ دونوں حکم مخلصانہ کوشش کریں گے تو اللہ کی طرف سے مدد ہوگی اور اصلاح حال ہوجائے گی۔

امام مالکؒ جیسے جلیل القدر فقیہ کی رائے ہے کہ اگر اختلاف دور ہونے کی کوئی سبیل نہ ہو تو اگر دونوں حکم چاہیں تو خلع پر بھی معاملہ کو حل کرسکتے ہیں، یہ مسئلہ فقہاء کے مابین مختلف فیہ ہے جس کی تفصیل فقہ وفتاوی کی کتابوں میں مذکور ہے، بوقت ضرورت دوسرے فقیہ کے مسلک کو اختیار کرنا بھی معروف ہے، خصوصاً امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ میں حضرت امام مالک کا مسلک کچھ مسائل میں معمول بہ ہے، لیکن موجودہ دور میں اپنا تجربہ یہ ہے کہ شقاق کے مسئلہ میں امام مالک کے مسلک کے مطابق حل نکالنا انتہائی دشوار ہے، اس لئے کہ غیر جانب دار حکم کا ملنا عام طور پر نہایت دشوار ہے، تجربہ یہ ہے کہ جو حکم مقرر کئے جاتے ہیں وہ دراصل وکالت شروع کردیتے ہیں، غیر جانب دار ہوکر کوئی رائے دینے والا عام طور پر نہیں ملتا ہے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ لوگوں کو حقوق العباد کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں، آخرت کے عذاب سے ڈرایا جائے ان کے دلوں میں اللہ تعالی کا خوف پیدا کیا جائے، اس طرح اصلاح کی امید کی جاسکتی ہے۔



# شقاق کی بناء پر خلع وتفریق

ابوابوسفیان مفتاحی [۱]

شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح۔

۱۔ خلع کا لغوی معنی ختم کرنا ہے، جو استعمال کیا گیا ہے زوجیت کے ختم کرنے میں۔

خلع کا فقہی واصطلاحی تعریف ملک نکاح کو ختم کرنا جو موقوف ہوتا ہے بیوی کے قبول کرنے پر، بحر میں کہا ہے بیوی کا قبول کرنا ضروری وہاں ہے جہاں پر خلع مال پر ہو، یا لفظ "خالعتك یا اختلعي" سے ہو۔

اور تاتارخانیہ میں ہے: شوہر نے اپنی عورت سے کہا جب تو گھر میں داخل ہوگی تو میں تم سے خلع کرلوں گا ایک ہزار (روپئے وغیرہ) پر تو عورت کے داخل ہونے سے گھر میں ایک ہزار (روپئے وغیرہ) کے بدلے طلاق واقع ہوگی، شوہر اس سے مراد لیتا ہے کہ گھر میں دخول کے وقت عورت قبول کرے اور اس کا فائدہ نکلا کہ شرط سے پہلے قبول کرنا صحیح نہیں ہے، واللہ اعلم۔

چنانچہ درمختار ۲، ۶۰۴ میں ہے: هو فقه الازالة، واستعمل فی ازالة الزوجية بالضم، وشرعاً كما فی البحر ازالة ملك النكاح المتوقفة على قبولها بلفظ الخلع الطلاق على مال فإنه غير مسقط. أو ما فی معناه ليدخل لفظ المبارأة فانه مسقط انتهى

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خلع کی فقہی واصطلاحی تعریف یہ ہے کہ مال کے ذریعہ ملک نکاح کو ختم کردیا جائے اور بیوی اس کو قبول کرلے۔ واللہ اعلم۔

۲۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے یہاں جیسے طلاق مکمل مرد کے اختیار میں ہے اسی طرح خلع کا بھی اختیار مکمل مرد ہی کے ہاتھ میں ہے۔ قاضی خود یا قاضی کی طرف سے مقرر کیے ہوئے حکم بطور خود عورت کو طلاق نہیں دے سکتے اور عورت بھی بطور خود اپنے کو طلاق نہیں دے سکتی، ٹھیک اسی طرح عورت خلع بھی بطور خود نہیں کرسکتی کیونکہ عورت کو خلع لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔

حضرات حنفیہ دراصل اس مسئلہ میں اس عام اصول پر چلے ہیں کہ طلاق کا اختیار مردوں کے ہاتھ میں ہے اور خلع بھی مال کے عوض میں طلاق میں ہے، اس لئے مرد کی آمادگی بہرصورت ضروری ہے۔ اسی بنا پر ان کے حکمین کی حیثیت زوجین کے وکیل کی ہوتی ہے اور وہ انہیں حدود میں رہ کر اقدام کرسکتے ہیں جو زوجین نے متعین کردی ہیں۔

اس کے علاوہ حنفیہ کا استدلال اس مقدمہ سے ہے جس میں حضرت علیؓ نے حکمین متعین کرکے ان کی ذمہ داری بتائی، اسی طرح حضرت ثابت بن قیس کی بیوی کا واقعہ ہے، اسی طرح حضرت ثابت کی بیوی حبیبہ بنت سہل کا واقعہ بھی ہے، نیز بعض آثار صحابہ سے بھی حنفیہ کا استدلال ہے۔

اس کے برخلاف امام مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک قاضی زوجین کے حد سے گزرے ہوئے باہمی اختلاف کی صورت میں ایک دو رکنی مصالحتی کمیٹی قائم کرے گا جس میں بہتر ہے کہ ایک مرد کا رشتہ دار ہو اور دوسرا عورت کا۔ دونوں سمجھدار اور شرعی احکام سے واقف ہوں پھر وہ ان دونوں کے حالات کا جائزہ لیں اگر مصالحت اور اتفاق کی کوئی صورت نکل آئے تو دونوں میں مصالحت کرادیں اور اگر یہ ممکن نہ ہوسکے اور دونوں کی رائے ہو کہ باہم تفریق اور علیحدگی کرادی جائے تو ایسا بھی کرسکتے ہیں اس طرح کہ مرد کا رشتہ دار حکم طلاق دیدے اور عورت کا رشتہ دار حکم مہر معاف کردے یا جو معاوضہ مناسب سمجھے عورت کو اس کی ادائیگی کا پابند کرے اور دونوں میں تفریق ہوجائے (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۵/۱۷۶)۔

امام مالک رضی اللہ عنہ اور جو فقہاء رحمہم اللہ قاضی کی طرف سے مقرر کیے ہوئے حکمین کو تفریق وعلیحدگی کا مجاز گردانتے ہیں، قرآنی آیت: ''إن

---

[۱] استاذ حدیث وافتاء جامعہ مفتاح العلوم، مئو۔

خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها إن يريدا إصلاحاً يوفق الله بينهما ان الله كان عليما خبيرا'' (النساء: ۳۵) میں متعدد قرائن ایسے ہیں جو امام مالک رضی اللہ عنہ کے موقف کی تائید کرتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مسئلہ خلع میں فقہاء مالکیہ کی رائے کو قبول کر لینا اور اسی پر عمل کرنا کرانا اور فتوی دینا اور فیصلہ کرنا ہمارے زمانہ میں انسب ہوگا، واللہ اعلم۔

۳۔ عورت کو اپنے شوہر سے نہایت نفرت ہے، چاہے یہ نفرت شوہر کے بدصورت ہونے کی وجہ سے ہو یا اس کے بدسیرت مثلاً بدچلن ہونے کی وجہ سے، اور شوہر از خود طلاق دینے پر تیار نہیں ہے، اور عورت کے پاس شوہر کی ظلم وزیادتی کے سلسلہ میں گواہ موجود نہیں ہیں تو اس عورت کے گلوخلاصی کی صورت یہ ہوگی کہ عورت دار القضاء یا امارت شرعیہ یا شرعی پنچایت میں اپنا مقدمہ پیش کرے تو قاضی کو گزر بسر نہ ہونے کی صورت میں اختیار ہوگا کہ ان دونوں کے مابین نکاح کو فسخ کردے اور دونوں کے درمیان تفریق کردے اور عورت کو مجاز کردے کہ وہ اپنی شادی کسی دوسرے سے کرلے۔ واللہ اعلم۔

۴۔ شقاق سے مراد زوجین کے درمیان اختلاف ہو جانا اور تخاصم یعنی لڑائی جھگڑا ہونا، ہے دونوں کے مزاج کے موافق نہ ہونے کی وجہ سے، اور قہستانی میں شرح طحاوی سے نقل کیا ہے کہ جب زوجین کے مابین اختلاف پیدا ہو جائے تو سنت یہ ہے کہ عورت کے رشتہ دار اور شوہر کے رشتہ دار اکٹھا ہو کر زوجین کے مابین مصالحت کرائیں پھر اگر مصالحت نہ ہو سکے تو خلع وطلاق جائز ہے کہ شوہر مال کے عوض خلع کر کے طلاق دیدے یا بغیر مال کے عوض طلاق دیدے، آیت کریمہ میں اسی حکم کو ذکر کیا گیا ہے۔

چنانچہ در مختار ۲/۶۰۶ میں ہے: "للشقاق بعدم الوفاق"۔

اور رد المحتار ۲/۶۰۶ میں ہے: ''للشقاق لوجود الشقاق وهو الاختلاف والتخاصم. وفي القهستاني عن شرح الطحاوي السنة إذا وقع بين الزوجين اختلاف أن يجتمع أهلها ليصلحوا بينهما فإن لم يصطلحا جاز الطلاق والخلع وهذا هو الحكم المذكور في الآية''۔

۵۔ قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کر سکتا ہے، اس سلسلہ میں حنفیہؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اور فقہاء مالکیہ رحمہم اللہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قاضی صورت مسئولہ میں خلع کا فیصلہ کر سکتا ہے اور یہی ہمارے موجودہ زمانہ میں انسب ہے، (حوالہ مذکورہ)۔ واللہ اعلم۔

٦۔ جن حضرات مثلاً حضرات مالکیہؒ کے نزدیک خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں تو ان حضرات کے نزدیک قاضی کی طرف سے حکمین کا مقرر کیا جانا ضروری ہے۔

حکمین کی مصالحت کی کوشش کے بعد ناکامی کی صورت میں خلع معتبر ہوگا، یہ دونوں بھی خلع کا فیصلہ کر سکتے ہیں اس صورت میں ضروری ہے کہ فیصلہ دونوں کے اتفاق رائے سے ہو، اگر ایک نے تفریق کی رائے دی اور دوسرے نے اختلاف کیا تو اب تفریق نہ ہو سکے گی اور بہتر ہے کہ دو حکم مقرر کیے جائیں، اگر ایک ہی حکم مقرر کرے یا زوجین ایک ہی شخص کے حکم ہونے پر اتفاق کرلیں تو بھی کافی ہے اور اس کا فیصلہ نافذ ہوگا، (والجامع لاحکام القرآن ۵/۱۷۵ تا ۱۷۸)۔ واللہ اعلم

۷۔ حنفیہؒ کے یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے تو اس مسئلہ میں ضرورۃً کسی اور مکتب فکر کی طرف عدول کیا جا سکتا ہے یہی انسب ہے، (جدید فقہی مسائل ۳/۲۱۰)۔ واللہ اعلم

☆☆☆

# شقاق بین الزوجین اور فسخ نکاح

مفتی جمیل احمد نذیری مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام نواده، مبارکپور

## ا۔ خلع کی فقہی و اصطلاحی تعریف:

خلع کا لغوی معنی النزع والازالۃ ہے۔ یعنی کھینچنا، ہٹانا، زائل کرنا۔ اصطلاح شرع میں ازالۂ نکاح کا نام خلع ہے (شامی ۶،۶۰۴، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷،۴۸۰)۔

پوری اصطلاحی تعریف اسی طرح ہے "هو ازالة ملك النكاح المتوقفة على قبولها بلفظ الخلع أو ما في معناه" (حوالۂ مذکورہ)۔

۲۔ الموسوعۃ الفقہیۃ میں ہے: "الخلع جائز في الجملة سواء في حالة الوفاق والشقاق خلافا لابن المنذر" (۱۹/۲۴۰)۔

درمختار میں ہے: ''ولا بأس به عند الحاجة للشقاق بعدم الوفاق'' (۲،۲۰۵)۔

ردالمحتار میں ہے: ''لوجود الشقاق وهو الاختلاف والتخاصم وفي القهستاني عن شرح الطحاوي السنة إذا وقع بين الزوجين اختلاف أن يجتمع أهلهما ليصلحوا بينهما فإن لم يصطلحا جاز الطلاق والخلع'' (حوالۂ مذکورہ)۔

عبارات مذکورہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح بوقت ضرورت، مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے، اسی طرح بوقت ضرورت عورت کو خلع لینے کا بھی حق حاصل ہے۔

۳۔ اس صورت میں عورت، خلع کا مطالبہ کرے، اور مرد کو اس کا مطالبہ پورا کرنا چاہئے ''ليس للرجل إجابة المرأة للخلع إن طلبته'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷،۴۸۳)۔

۴۔ ''شقاق'' کے معنی عداوت، دشمنی، مخالفت۔ یعنی میاں بیوی میں ایسی شدید دوری کہ دونوں آپس میں مل بیٹھ کر اس کو نہ سلجھا سکیں (بیان القرآن ۱/۱۱۵، سورۂ نساء آیت: ۳۵)۔ خواہ اس کے اسباب کچھ بھی ہوں جن کی تفصیل الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۴۱۸ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۵۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے: ''لم يجز الحنفية والشافعية والحنابلة التفريق للشقاق أو للضرر مهما كان شديداً لأن دفع الضرر عن الزوج يمكن بغير الطلاق عن طريق رفع الأمر إلى القاضي والحكم على الرجل بالتأديب حتى يرجع عن الإضرار بها'' (۷،۵۲۷)۔

لیکن موجودہ زمانہ میں یہ ممکن نہیں کیونکہ مسلمانوں کو یا بالفاظ دیگر قضاۃ کو قوت نافذہ حاصل نہیں ہے کہ وہ شوہروں کو تادیب کرسکیں اور انہیں بہ جبر عورت پر ظلم وزیادتی سے روک سکیں۔ لہٰذا مالکیہ کے مذہب پر عمل ہی مناسب نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں: ''وأجاز المالكية التفريق للشقاق أو للضرر منعاً للنزاع وحتى لا تصبح الحياة الزوجية جحيما وبلاء ولقوله عليه السلام لاضرر ولا ضرار. وبناء عليه ترفع المرأة أمرها للقاضي فإن أثبتت الضرر أو صحة دعواها طلقها منه وإن عجزت عن إثبات الضرر رفضت دعواها. فإن كررت الادعاء بعث القاضي حكمين حكماً من أهلها وحكماً من أهل الزوج بفعل الأصلح من جمع وصلح أو تفريق بعوض أو دونه'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷،۵۲۷)۔

ہندوستان جیسے حالات میں وہی بات انسب اور بہتر ہے جو حضرت مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی نائب امیر شریعت بہار واڑیسہ نے فرمائی ہے۔

وہ لکھتے ہیں: ''بہرحال زن وشوہر کے شقاق کی صورت میں جب عورت قاضی کے یہاں مقدمہ دائر کرے اور جائز شکایت کی بنا پر شوہر سے تنگ آکر فریق کا مطالبہ کرے تو حنفی قاضی معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک پر ان ابتدائی کاروائی کے بعد جن کا ذکر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے تحت تیرہویں بنیاد میں ہوچکا ہے۔ یا اختیار حکمین کے ذریعہ شقاق کے معاملہ کو ان کی تفصیل کے مطابق ختم کرادے اور حکمین کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کو اچھی طرح سمجھادے (کتاب الفسخ والتفریق ص: ۱۱۱)۔

☆☆☆

# شقاق بین الزوجین

مولانا سید قمر الدین محمود بڑودوی[1]

میاں بیوی کے درمیان نباہ نہ ہونے کی شکل میں بیوی اپنے شوہر کو کچھ مال دے کر یا شوہر کی طرف سے دیا ہوا مہر واپس کر کے یا بصورت عدم ادائیگی مہر، مہر معاف کر کے شوہر سے علیحدگی حاصل کرلے، اسے خلع کہتے ہیں۔

خلع ایک عقد ہے جو دوسرے عقود بیع، اجارہ اور نکاح وغیرہ کی طرح جانبین کی مکمل رضامندی پر موقوف ہے، خلع کے لئے عدالت میں جانا ضروری نہیں ہے بلکہ زوجین اپنے طور پر باہمی رضامندی سے عوض خلع طے کر کے معاملہ کر سکتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ زیادتی شوہر کی جانب سے ہو تو اس کے لئے مالی معاوضہ لینا مکروہ ہے۔

خلع اور فسخ نکاح میں فرق یہ ہے کہ فسخ نکاح میں عوض نہیں ہوتا اور اس کا اختیار صرف حکومت یا شرعی پنچایت یا دار القضاء کو ہے۔

جبکہ خلع میں مالی عوض ہوتا ہے اور زوجین کی آپس کی رضامندی سے ہی خلع ہوسکتا ہے حاکم خلع پر مجبور نہیں کرسکتا کیونکہ خلع ایک عقد ہے اور عقود میں تراضی طرفین ضروری ہے۔

شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''لأن النكاح عقد محتمل للفسخ حتى يفسخ بخيار عدم الكفائة وخيار العتق وخيار البلوغ عندكم فيحتمل الفسخ بالتراضي أيضا وذلك بالخلع واعتبر هذه المعاوضة المحتملة للفسخ بالبيع والشراء في جواز فسخها بالتراضي'' (مبسوط: ۶، ۱۷۱)۔

''وقال أيضا والخلع جائز عند السلطان وغيره لأنه عقد يعتمد التراضي كسائر العقود'' (مبسوط ۶، ۱۷۳)۔

صاحب بدائع فرماتے ہیں: ''وأما ركنه فهو الإيجاب والقبول لأنه عقد على الطلاق بعوض فلاتقع الفرقة ولايستحق العوض بدون القبول'' (بدائع الصنائع ۳، ۲۲۹)۔

قرآن شریف کی آیت: ''ولايحل لكم أن تأخذوا مما آتيتموهن شيئاً إلا أن يخافا أن لايقيما حدود الله فإن خفتم أن لايقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به'' سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ خلع میں رضاء زوجین ضروری ہے۔

(الف) إلا أن يخافا أن لايقيما حدود الله" واضح دلیل ہے کہ یہ حکم اس صورت سے متعلق ہے جب کہ میاں بیوی دونوں کو حدود اللہ قائم نہ رکھ سکنے کا خطرہ ہو، اس لئے وہ دونوں خلع کرنا چاہتے ہوں۔

(ب) "فلا جناح عليهما فيما افتدت به" بھی زوجین کی تراضی کو ثابت کررہی ہے، اس کا مطلب واضح ہے کہ زوجین خلع پر راضی ہیں مگر ان کو مال کے لین دین کے جواز میں شبہ ہے، اس لئے ارشاد ہوا کہ اس میں کوئی گناہ نہیں، کوئی ادنی فہم رکھنے والا بھی اس جملہ سے یہ نہیں سمجھ سکتا کہ شوہر خلع پر راضی نہ ہو تو حاکم اس کو خلع پر مجبور کرسکتا ہے۔

(ج) "فيما افتدت به" میں بدل خلع کو فدیہ قرار دیا گیا ہے جس سے ثابت ہوا کہ خلع عقد معاوضہ ہے اس لئے اس میں فریقین کی رضامندی شرط ہے۔

زوجین میں مصالحت سے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہے: ''و إن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من

[1] ناظم اعلیٰ اصلاح المسلمین بڑودہ، گجرات

أهلها إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما''۔

اس کے تحت میں امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''ویدل أیضا (قوله فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها) على أن الذى من أهله وكيل له والذى من أهلها وكيل لها كأنه قال فابعثوا رجلا من قبله ورجلا من قبلها فهذا يدل على بطلان قول من يقول إن للحكمين أن يجمعا إن شاء ا و إن شاء ا فرقا بغير أمرهما'' (احکام القرآن ۲؍۱۹۰، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: مذکورہ کتاب ۲؍۱۹۱ وغیرہ)۔

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ صاحب تفسیر مظہری میں آیت "فابعثوا حکما من اهله وحکما من اهلها" کے تحت فرماتے ہیں: ''بغوی نے اپنی سند سے بحوالہ شافعی عبیدہ کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک مرد اور ایک عورت حاضر ہوئے دونوں کے سرپرست بھی ساتھ تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ ہر فریق کے قرابتداروں میں سے ایک ایک پنچ مقرر کرو، حکم کی تعمیل کی گئی، آپ نے دونوں پنچوں سے فرمایا: کیا تم اپنے فرائض کو جانتے ہو؟ تمہارا کام یہ ہے کہ اگر دونوں کا نبھاہ ہوتا دیکھو تو اختلاف دور کرکے دونوں کو یکجا کردینا اور نباہ نہ ہوتا دیکھو تو تفریق کرادینا، عورت نے کہا میرا نفع ہو یا نقصان میں اللہ کی کتاب کے فیصلہ کو تسلیم کرتی ہوں، مرد نے کہا علیحدگی تو نہیں ہوگی (باقی معاملات کا اختیار پنچوں کو ہے) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا خدا کی قسم تو نے غلط کہا (پنچایت اس وقت تک نہ ہوگی) جب تک تو اسی طرح اقرار نہ کرے جس طرح عورت نے کیا ہے''۔

اسی بناء پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مرد کے پنچ کو طلاق دینے کا حق ہے خواہ مرد راضی نہ ہو اور عورت کے پنچ کو خلع کرنے کا اختیار ہے خواہ عورت راضی نہ ہو اور بدل خلع عورت کے مال سے ادا کیا جائے گا کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے علیحدگی اور ملاپ دونوں کا اختیار پنچوں کو دیا تھا اور علیحدگی کا اختیار نہ دینے کی تردید کی تھی۔

جمہور کا مسلک ہے کہ جب تک مرد طلاق کا اور عورت خلع کا اختیار نہ دیں پنچ از خود نہ تفریق کراسکتے ہیں نہ خلع، ان کا فرض سلجھاؤ کرانا اور بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ہے، اگر دونوں میں سے کوئی اپنی ضد پر قائم رہے تو پنچوں کا کام یہ ہے کہ حاکم کو اپنی تحقیقات کی رپورٹ کردیں اور حاکم شوہر کو حسن سلوک کے ساتھ اور دستور کے مطابق عورت کو رکھنے یا طلاق دینے کا حکم دے اور عورت کو مجبور کرے کہ وہ یا مرد کی نافرمانی چھوڑ دے یا خلع کرالے اور بدل خلع ادا کرے۔ رہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فیصلہ تو اس میں صاف موجود ہے کہ آپ نے شوہر سے فرمایا: ''جب تک تو ایسا اقرار نہ کرے جیسا عورت نے کیا ہے، تیرا قول غلط ہے'' اس سے معلوم ہوا کہ طلاق کے لئے مرد کی رضامندی شرط ہے، پنچوں کو از خود طلاق و تفریق کا اختیار نہیں ہے، اگر پنچ از خود ایسا کرے گا تو اس کا فیصلہ تفریق نافذ نہ ہوگا'' (تفسیر مظہری اردو ۳؍۲۷۔۱۷)۔

حاکم کو بغیر تراضیٔ زوجین ان دونوں میں بذریعہ خلع تفریق کرانے کا اختیار نہیں ہے۔

البتہ امام مالک رحمہ اللہ علیہ اس کے قائل ہیں کہ حاکم کی طرف سے متعین حکمین کو بدون رضاء زوج بھی خلع یا تفریق بلاعوض کا اختیار ہے، لیکن حکمین کے حکم خلع یا تفریق بلاعوض کے لئے مندرجہ ذیل شرائط ہیں:

۱۔ حکمین میں سے ایک کا اہل زوج سے ہونا اور دوسرے کا اہل زوجہ سے ہونا ضروری ہے، البتہ ان کے اہل میں ایسے افراد موجود نہ ہوں تو اجانب سے بھی حکمین مقرر کئے جاسکتے ہیں۔ حاکم کی طرف سے فرد واحد کی تحکیم جائز نہیں ہے، تعدد یعنی دو حکم کا ہونا شرط ہے۔

۲۔ فیصلہ پر دونوں حکمین متفق ہوں۔

۳۔ ضرورت شدیدہ تحکیم کے لئے داعی ہو مثلاً باہمی نزاع وشقاق کا فتنہ بہت خطرناک صورت اختیار کر گیا ہو اور حکمین کی طرف سے مصالحت کی کوشش اور ذرائع حکومت کی طرف سے رفع ظلم کی ہر ممکن کوشش ناکام ہوگئی ہو تو اس صورت میں حکمین کو حکم خلع کا اختیار ہوگا بغیر رضائے زوج، کما ہو فی احسن الفتاوی ۵؍۴۰۰۔

ان تمام تفصیلات کی روشنی میں سوال ۲ کا جواب واضح ہے کہ مرد کو تو طلاق دینے کا مکمل حق حاصل ہے، اس میں رضاء زوجہ ضروری نہیں، البتہ خلع لینے کا حق عورت کو شریعت نے دیا ہے مگر اس میں رضائے زوج ضروری ہے بغیر رضائے زوج خلع نہیں ہوسکتا۔

## گلوخلاصی کی صورتیں

اگر عورت شوہر کی جانب سے شدید حد تک متنفر ہو لیکن شوہر طلاق دینے پر تیار نہ ہو اور عورت کے پاس شوہر کے ظلم و زیادتی کے سلسلہ میں بینہ فراہم نہ ہوں تو اس کے گلوخلاصی کی صورت یہ ہے کہ وہ حاکم شرعی کے یہاں یا شرعی پنچایت یا دارالقضاء میں شوہر سے تفریق کرانے کے لئے مقدمہ دائر کرے اور حاکم شرعی یا شرعی پنچایت یا دارالقضاء مقصد کی سماعت شروط معتبرہ شرعیہ کے ساتھ کر کے زوجین میں تفریق کرادے۔

مجموعہ قوانین اسلامی میں ۲۵۰ پر کہا گیا ہے:

## زوجین میں شقاق کا پایا جانا:

دفعہ (۳۳۶) اگر زوجین کے درمیان شدید نفرت پیدا ہو جائے کہ دونوں کا اللہ کے حدود کو قائم رکھتے ہوئے ازدواجی زندگی گزارنا ممکن نظر نہ آئے تو ایسی صورت میں قاضی حکمین مقرر کرے گا تا کہ اصلاح کی صورت نکل سکے۔

(ب) اگر تحکیم کے باوجود اصلاح حال یا باہمی رضامندی سے علیحدگی کی کوئی صورت نہیں نکل سکے تو قاضی بر بنائے شقاق زوجہ کے مطالبہ کی صورت میں تفریق کردے گا (مجموعہ قوانین اسلامی ۲۵۰)۔

کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے؟ اس سلسلہ میں حنفیہ اور دوسرے فقہاء کا کیا نقطۂ نظر ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں تفصیل سے بتادیا گیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ امام احمدؒ کے نزدیک حاکم بغیر رضاء زوج خلع کا فیصلہ نہیں کرسکتا اور اگر وہ خلع کا فیصلہ کر کے تفریق کردے تب بھی وہ فیصلہ تفریق نافذ نہیں ہوگا۔

جی ہاں حکمین کا مقرر کیا جانا ضروری ہے، حکمین کی کوشش کے بعد نباہ کی کوئی شکل نہ نکل سکے تو حاکم یا حاکم کی جانب سے مقرر کردہ حکمین کو خلع کا حق ہوگا۔

ایک حکم کا تقرر حاکم کی طرف سے جائز نہیں ہے دو حکم کو مقرر کرنا ضروری ہے۔

## دوسرے مکتب فکر کی طرف عدول

اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ احناف کے یہاں بغیر رضاء زوج حاکم کو خلع کرانے کا حق حاصل نہیں ہے لہٰذا بدرجۂ اضطرار امام مالک کے مسلک کے مطابق ان کے یہاں جو شرائط ہیں جو اوپر ذکر کی گئی ہیں ان شرائط کے ساتھ حاکم شرعی یا قاضی بغیر رضاء زوج کے فیصلہ کرسکتا ہے۔

بدرجۂ مجبوری عدول الی مسلک الامام مالک کی گنجائش ہے۔

یا دوسری صورت میں جیسا کہ مجموعہ قوانین اسلامی کے حوالہ سے ذکر کیا گیا کہ شقاق کی صورت میں زوجہ کے مطالبہ کی صورت میں قاضی مقدمہ کی سماعت کر کے تفریق کردے گا۔

ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے تفریق

مولانا عبدالخالق ندوی ؔ

## خلع کی فقہی واصطلاحی تعریف کیا ہے:

فی اللغة: ''فراق الزوجة علی مال مأخوذ من خلع الثوب لأن المرأة لباس الرجل معنی'' (نیل الأوطار للشوکانی. ۲۴۳ء

خلع کے لغوی معنی اتارنے کے ہیں، جب کوئی شخص کپڑا اتار چکا ہو تو اس وقت کہا جاتا ہے: خلع الرجل ثوبه خلعا وأزاله عن بدنه ونزعه عنه. یعنی اس نے اپنا کپڑا اتارا، اور کہا جاتا ہے: خلعت النعل خلعا نزعته. اور کہا جاتا ہے: خلع الرجل امرأته و خالعت المرأة زوجها مخالعة إذا افتدت منه (تفصیل کے دیکھیں الفقہ علی المذاہب الاربعۃ للاستاذ عبدالرحمن بن محمد عوض الجزیری ۴، ۳۳۰، بدایۃ المجتہد لابن رشد)۔

اصطلاح شرع میں عورت کا اپنے شوہر سے مال کے بدلے لفظ خلع یا اس کے ہم معنی لفظ کے ذریعہ جدائی اختیار کرنا، خواہ یہ عوض بدلہ عورت کی طرف سے ہو، یا کسی تیسرے شخص کی طرف سے۔

احناف نے خلع کی تعریف یوں کی ہے " الخلع هو إزالة ملك النكاح المتوقفة علی قبول المرأة بلفظ الخلع أو ما فی معناه " (تفصیل کے دیکھیں الفقہ علی المذاہب الاربعۃ للاستاذ عبدالرحمن بن محمد عوض الجزیری ۴، ۳۳۱) لفظ خلع یا اس کے ہم معنی لفظ کے ذریعہ عورت سے کسی عوض وبدلے کے ذریعہ حق نکاح کو ختم کرنا ہے۔

مالکیہ نے خلع کی تعریف اس طرح کی ہے، قالوا: ''الخلع شرعا هو الطلاق بعوض'' (نفس المصدر ۴،۲۲۴)۔

اصطلاح شرع میں خلع مال کے بدلے طلاق ہے۔

شافعیہ نے خلع کی تعریف یوں کی ہے " الخلع شرعا هو اللفظ الدال علی الفراق بین الزوجین بعوض" (تفصیل کے دیکھیں الفقہ علی المذاہب الاربعۃ للاستاذ عبدالرحمن بن محمد عوض الجزیری ج۔ ۴، ص۔ ۳۳۴)۔

خلع شرع میں بدلے کے عوض ہر اس لفظ سے ہوسکتا ہے جس سے میاں بیوی کے درمیان جدائی کا معنی ومفہوم سمجھ میں آتا ہو۔

حنابلہ کی تعریف قالوا: الخلع هو فراق الزوج امرأته بعوض یأخذ الزوج من امرأته أو غیرها بألفاظ مخصوصة " (نفس المصدر ۴،۲۲۴) خلع مخصوص الفاظ کے ذریعہ شوہر کا اپنی بیوی سے یا کسی تیسرے سے پیسہ لیکر قطع تعلق کر لینے کا نام ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ خلع نام ہے عورت کا اپنے شوہر سے مال کے عوض لفظ خلع یا اس کے ہم معنی لفظ کے ذریعہ جدائی اختیار کرنا، اللہ کا ارشاد ہے۔ " فإن خفتم ألّا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به "(البقرة:۲۲۹) پس اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ (نکاح کو باقی رکھتے ہوئے) زوجین اللہ کی حدود پر قائم نہ رہیں گے تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علاحدگی حاصل کرلے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ ثابت ابن قیس ؓ کی بیوی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ میں ثابت بن قیس کی دینداری اور اخلاق کو الزام نہیں دیتی لیکن مجھے اسلام میں داخل ہونے کے بعد شوہر کی نافرمانی کا خدشہ ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم ان کو ان کا باغ واپس کردوگی، انہوں نے کہا جی ہاں، آپ ﷺ نے ثابت بن قیس سے فرمایا باغ واپس لے لو اور انہیں ایک طلاق دیدو (۷)۔

ؔ جامعۃ الصالحات، رامپور، یو۔ پی

**۲۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ جیسے مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے اسی طرح عورت کو خلع لینے کا حق حاصل ہے، یہ بات کس حد تک درست ہے؟**

اسلام نے طلاق کا اختیار مرد کو دیا ہے کیوں کی اس کے اندر عورت کے مقابلے فکر وتدبر اور تحمل زیادہ ہوتا ہے، لیکن اس کی حد متعین کی ہے، اور اس کو بہت سی پابندیوں سے جکڑا ہے بالکل وہ آزاد نہیں ہے جس طرح زمانۂ جاہلیت میں شوہر آزاد ہوتا تھا، بیوی سے بگڑ جاتا تو اس کو بار بار طلاق دیتا رہتا اور رجوع کرتا رہتا، بیچاری عورت عمر بھر مصیبت میں گرفتار رہتی، نہ تو اس شوہر کے ساتھ سکون کی زندگی بسر کر پاتی اور نہ اس سے آزاد ہو کر کسی دوسرے سے نکاح ہی کر سکتی تھی، اسلام نے طلاق کی حد مقرر کر کے اور پابندی عائد کر کے عورت پر اس ظلم کا دروازہ بند کر دیا۔

اسلام نے طلاق کا اختیار عدالت کو نہیں دیا ہے کیوں کہ وہ نہیں چاہتا کہ میاں و بیوی کی باتیں عام ہوں اور اس سے مزید تلخی میں اضافہ ہو اور معاشرتی خامیاں پیدا ہوں۔

یہ حقیقت ہے کہ اسلام نے مرد کو طلاق کا اختیار دیا اور یہ آزادانہ اختیار عورت کے بجائے مرد کو دیا تا کہ اگر عورت سے واقعی نباہ کی کوئی شکل ممکن نہ ہو تو وہ اسے طلاق دے دے۔

لیکن عورت کو بھی اس حق سے بالکل محروم نہیں رکھا کہ وہ شوہر کے ظلم وستم سہنے ہی پر مجبور ہو جائے، بلکہ اسی طرح عورت کو بھی یہ اختیار دیا ہے کہ اگر وہ فی الواقع شوہر سے مایوس ہو چکی ہو اور نباہ کا اب کوئی امکان نہ ہو تو وہ کچھ معاوضہ دے کر طلاق لے سکتی ہے۔

معلوم ہوا کہ مرد کو یہ آزادانہ اختیار دیا تو اس کی حد مقرر کی، اور مرد پر کچھ پابندیاں عائد کیں تا کہ وہ عورت پر ظلم نہ کر سکے، اسی طرح عورت کو بھی خلع لینے کا حق دیا ہے لیکن اس وقت دیا ہے کہ وہ مایوس ہو گئی ہو اور نباہ کا امکان نہ ہو تو حاکم شرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے اور شکایات کا ثبوت فراہم کر کے نکاح فسخ کرا سکتی ہے (تفصیل کے لئے فقہ کی کتابیں ملاحظہ فرمائیں)۔

لہذا ان لوگوں کی بات اس حد تک درست ہے کہ جب عورت مایوس ہو گئی اور نباہ کی کوئی شکل نظر نہ آرہی ہو یا نافرمانی کا اندیشہ ہو جیسا کہ ثابت بن قیس کی حدیث میں مذکور ہے تو ایسی صورت میں عورت خلع لے سکتی ہے، بلا ضرورت خلع لینے والی خاتون کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سخت وعید فرمائی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من سألت زوجها الطلاق من غير ما بأس فحرام عليها رائحة الجنة (ابو داود، سنن الترمذی)۔

جو عورت بغیر کسی وجہ کے اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرے تو اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔

**۳۔ اگر عورت شوہر کی جانب سے شدید حد تک متنفر ہو لیکن شوہر طلاق دینے پر تیار نہ ہو اور عورت کے پاس شوہر کی ظلم و زیادتی کے سلسلے میں بینہ فراہم نہ ہوں تو اس کے گلو خلاصی کی کیا صورت ہوگی؟**

حضرت ثابت بن قیسؓ کی بیوی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں انہوں نے اپنے اندیشہ کا ذکر کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے شوہر کے ظلم و زیادتی کے سلسلے میں دلیل نہیں طلب کی اور شوہر سے بھی رائے نہیں طلب کی بلکہ عورت سے کہا مہر واپس کرنے پر راضی ہو جاؤ انہوں نے کہا ہاں میں راضی ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوہر سے کہا کہ ان کو ایک طلاق دیدو، اور قرآن کریم کا اسلوب و انداز بیان بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ "فإن خفتم" اگر تم سب کو اندیشہ ہو تو، اور معاملہ قاضی شرع کی عدالت میں پہونچ گیا ہے تو قاضی شرع اس بات کی تحقیق کرے گا کہ فی الواقع یہ عورت اپنے مرد سے اس حد تک متنفر ہو چکی ہے کہ اب اس سے نباہ ممکن ہی نہیں اس بارے میں اطمینان ہو جانے کے بعد حالات کے لحاظ سے قاضی جو فدیہ تجویز کریگا اس فدیہ کو قبول کر کے شوہر کو طلاق دینا ہوگا، اور اگر وہاں شرعی عدالت نہ ہو تو مسلمانوں کی پنچایت جس میں خدا ترس عالم دین ہو، وہ شوہر کو مجبور کر کے گلو خلاصی کرائے گی (تفصیل کے لئے فتاوی رحیمیہ وغیرہ دیکھیں)۔

شریعت اسلامیہ کا اپنا ایک مزاج ہے اور اس کا اصول بھی ہے" لا ضرر ولا ضرار فی الإسلام" (ابن ماجه. مؤطا امام مالك. دار قطنی)، یعنی آدمی اپنے آپ کو اور اپنے بھائی کو ضرر نقصان نہ پہنچائے۔

## ۴۔ شقاق سے کیا مراد ہے؟

شقاق کے اصل معنی عداوت، دشمنی اور مخالفت کے ہیں، اس کی اصل (ش ق ق) ہے جس کے معنی کنارہ کے ہیں گویا کہ فریقین میں سے ایک آدمی ایک سرے پر اور دوسرا دوسرے سرے پر، اس اعتبار سے مطلب یہ ہوا کہ میاں بیوی کے درمیان اختلاف اس طور پر ہوا کہ مرد ایک سرے پر ہو اور عورت

دوسرے سرے پر ہو، یعنی دونوں کے درمیان شقاق (عداوت واختلاف) نے انتہائی صورت اختیار کرلی ہو تو اس کو شقاق کہتے ہیں، ارشاد باری ہے "وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله و حكما من أهلها إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما، إن الله كان عليما خبيرا (سورہ نساء، آیت ۳۵)، اور اگر تمہیں میاں بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا ڈر ہو تو ایک حکم مرد کے خاندان سے، ایک حکم عورت کے خاندان سے مقرر کر دو، اگر دونوں کی نیت اصلاح حال کی ہوگی تو اللہ تعالی دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردے گا، بے شک اللہ بڑا ہی علم رکھنے والا ہے، ہر طرح باخبر ہے۔

**۵۔ کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے؟ اس سلسلے میں حنفیہ اور دوسرے فقہا کا کیا نقطہ نظر ہے؟**

حنفیہ کے یہاں اختلاف، جھگڑے اور شقاق کی وجہ سے قاضی خلع کا فیصلہ نہیں کرسکتا، البتہ شوہر کو بلاکر سرزنش کرسکتا ہے، اصلاح کی کوشش کرے گا لیکن امام مالکؒ کے یہاں شقاق کی وجہ سے عورت اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرسکتی ہے اور تفریق چاہتی ہو تو قاضی تفریق کرادے گا (دیکھئے الشرح الصغیر: ۲/ ۵۱۲)۔

**۶۔ جن حضرات کے نزدیک خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں ان کے یہاں کیا قاضی کی طرف سے حکمین کا مقرر کیا جانا ضروری ہے؟ کیا حکمین کی کوشش کے بعد ہی خلع معتبر ہوگا یا قاضی خود فیصلہ کرسکتا ہے اور کیا ایک حکم کا تقرر بھی کافی ہوگا؟**

جن لوگوں کے یہاں خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں، ان کے یہاں قاضی کی طرف سے حکمین کا مقرر کیا جانا بھی ضروری نہیں ہے، اور قاضی شرع حکمین کی کوشش کے بغیر خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے، جمہور کے یہاں ایک حکم کا تقرر دونوں کی طرف سے کافی ہوسکتا ہے کیوں کہ ان کے یہاں حکم کی حیثیت حاکم اور قاضی کی ہوتی ہے جب کہ امام ابوحنیفہؒ کے یہاں گواہ اور قاصد کی ہے اس لئے دو کا ہونا ضروری ہوگا۔

**۷۔ اگر حنفیہ کے یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے تو کیا اس مسئلہ میں ضرورۃً کسی اور مکتب فکر کی طرف عدول کیا جاسکتا ہے؟**

اس مسئلہ میں (یعنی کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے؟) حنفیہ کے یہاں تو گنجائش نہیں ہے، لیکن ضرورۃً کسی اور مکتب فکر کی طرف عدول کیا جاسکتا ہے جیسا کہ چند مسائل کے اندر امارت شرعیہ بہار اور اڑیسہ میں مالکیہ کی رائے پر عمل ہوتا ہے اور بعض مسائل میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی رائے پر عمل ہے، کیوں کہ ہندوستان کے حالات کے تناظر میں اسی پر عمل کرنا بہتر ہے اسی طرح فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی/ حفظہ اللہ نے باپ دادا کے نکاح کرنے کے باوجود نابالغ کو "خیار بلوغ" کا مستحق قرار دیا ہے اور اسی کو مستحسن قرار دیا ہے، انہوں نے توجیہ بھی فرمائی ہے کہ ہندوستان کے حالات کے تناظر میں قاضی شریحؒ کی رائے کو اختیار کرنا بہتر ہے (جدید فقہی مسائل: ۳/ ۱۱۵) اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ نے جن مسائل میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی رائے اختیار کی ہے اس نے بھی اس کی توجیہ یہی کی ہے کہ ہندوستان کے حالات کے تناظر میں یہی ممکن ہے۔

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ مسئلہ میں دوسرے مکتب فکر کی طرف عدول کرلیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

☆☆☆

# شقاق زوجین وخلع

حفیظ الرحمن مدنی خیرآبادی[1]

## شدید تنفر کی صورت میں علیحدگی کی شکلیں:

عورت شوہر کی جانب سے شدید حد تک متنفر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت شوہر کے متعنت ہونے کا شکوہ کرتی ہے اور اس کی مدعیہ ہے۔ اور شوہر طلاق دینے پر تیار نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ حقوق زوجیت ادا کرنے کا دعویدار ہے، اور عورت اس کی منکر ہے، اور کتاب الدعوی کے ضابطہ کے تحت مدعی اور مدعا علیہا دونوں کو جمع کیا جائے اور مدعی سے بینہ طلب کیا جائے، اگر وہ حاضر ہونے اور بینہ پیش کرنے پر راضی نہ ہو تو عورت سے قسم لیجائے ''البینة علی المدعی والیمین علی من أنکر'' کا تقاضا یہی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آیت "فابعثوا حکماً من أهله وحکماً من أهلها" کے اعتبار سے دونوں کے خاندان سے ایک ایک معتبر آدمی کو حکم بنایا جائے اور اگر اس طرح اصلاح نہ ہوسکے تو تفریق کردی جائے۔

''ولابأس بالخلع عند الحاجة إليه لوجود الشقاق والتخاصم۔ لقوله تعالىٰ وإن يتفرقا يغن الله كلا من سعته وكان الله واسعا حكما'' (الفقه الحنفی فی ثوبه الجدید. ۲.۲۲۸)۔

''ذهب الجمهور إلى جواز الخلع مطلقاً، وذهب داؤد، والزهری وابن المنذر والنخعی إلى عدم الجواز إلا فی حالة وقوع الشقاق منهما، وخصم ابن سيرين وأبو قلابة بحالة وقوع الزنا منها'' (رد المحتار مع الدر المختار ۵.۹۳. زکریا بکڈپو، سہارنپور)۔

## شقاق سے کیا مراد ہے؟

شقاق بينهما أی بينهما شقاق لأن كل المخالفين يفعل ما يشق على الآخر أو يميل إلى شق غير شق صاحبه۔ وصناف الشقاق إلى الظرف على الاتباع كقوله ياسارق الليلة، ومكر الليل والنهار أی فی الليل والنهار (حاشية على الجلالين: ۷۶)۔

''شقاق ایسی کشمکش جسے وہ باہم نہ سلجھا سکیں، امت اور افراد امت کا ساتھ چولی دامن کا ہے افراد کے باہمی اور خانگی مناقشوں سے معاشرہ اسلامی کا دامن بالکل الگ اور بے تعلق رہ ہی نہیں سکتا کہ افراد ہی کی صالحیت پر تو امت کی صالحیت کا مدار ہے۔ خوف یہاں علم یا ظن غالب کے معنی میں ہے ''والمراد فإن علمتم كما قال ابن عباس (روح المعانی) والخوف بمعنى اليقين وقيل هو بمعنى الظن'' (معالم التنزيل) (بحوالہ تفسیر ماجدی ا/۷۳۴، سورۃ النساء)۔

شقاق کے معنی زوجین کے درمیان ایسی شدید نفرت پیدا ہوجانے کے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ حدود اللہ کو قائم رکھتے ہوئے ازدواجی زندگی نہ گزار سکیں۔ ایسی صورت میں قاضی دونوں کے درمیان مصالحت کے لئے دو حکم مقرر کریں گے اگر حکم کی کوشش کے باوجود اصلاح نہ ہوسکے تو قاضی زوجین کے درمیان تفریق کردے گا (کتاب الفتاوی ۵/۱۷۰ بحوالہ مجموعہ قوانین اسلامی ۸۲)۔

''قال الإمام ابو جعفر الطحاوی وليس للحكمين فی الشقاق أن يفرقا إلا أن يجعل ذلك إليهما الزوج''

---

[1] استاذ مدرسہ منبع العلوم خیرآباد ضلع مئو (یوپی)

(مختصر الطحاوی ص: ۱۹۱)۔

قال الإمام الشافعي ''وليس له أن يأمرهما يفرقان إن رأيا إلا بأمر الزوج ولا يعطيا من مال المرأة إلا بإذنها الخ'' (کتاب الأم: ۲۰۸)۔

مراجع فقہیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، احمدؒ بن حنبل اور اہل ظاہر سب اس پر متفق ہیں کہ زوجین میں تفریق بلاعوض، یا خلع کے لئے ان کو توکیل حکمین پر مجبور کرنا یا حکمین کو ان پر جبراً مسلط کرنا جائز نہیں، حکمین نے زوجین کی رضا کے بغیر خلع کا فیصلہ کردیا یا بدون رضائے زوج تفریق بلاعوض کردی تو ان کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا، خلع میں رضائے زوجین ضروری ہے اور تفریق بلاعوض میں صرف رضائے زوج شرط ہے (احسن الفتاوی ۵/ ۳۹۹)۔

جمہور علماء کے نزدیک خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ تراضی من الجانبین ضروری ہے جس کے دلائل سوال ۲ کے جواب میں مفصل مذکور ہوئے۔

اور شوہر خلع کے لئے تیار نہ ہو اور دونوں کے درمیان شقاق پایا جاتا ہو تو آیت کریمہ وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكماً من أهله الخ (سورۃ النساء) کی روشنی میں قاضی کی طرف سے حکمین کا مقرر کیا جانا ضروری ہے، ایک شوہر کے خاندان سے دوسرا بیوی کی خاندان سے جو دونوں کو سمجھا کر اصلاح کرنے کی اور شقاق دور کرنے کی کوشش کریں، اور اگر ممکن نہ ہو تو قاضی کو فسخ نکاح کا اختیار ہوگا۔ اور ایک حکم کافی نہیں ہوگا اس لئے کہ یہ آیت کے خلاف ہے۔

## دوسرے مسلک فقہی کی طرف عدول

اگر خاوند کسی طرح نہ مانے یا بوجہ مجنون یا لاپتہ ہونے کے اس سے خلع وغیرہ ممکن نہ ہو اور عورت کو صبر کی ہمت نہ ہو تو مجبوراً مذہب مالکیہ کے مطابق دین دار مسلمانوں کی پنچایت میں معاملہ پیش کرنے کی گنجائش ہے، کیوں کہ مالکیہ کے مذہب میں قاضی وغیرہ نہ ہونے کی حالت میں یہ صورت بھی جائز ہے، کہ محلہ کے دیندار مسلمانوں کی ایک جماعت جن کا عدد کم از کم تین ہو پنچایت کرے اور واقعہ کی تحقیق کرکے شریعت کے موافق حکم کردے تو یہ بھی قضاء قاضی کے قائم مقام ہوجاتا ہے۔ صرح بذلك العلامة الصالح التونسي مفتي المالكية في المسجد النبوي بالمدينة المنورة في فتواه اور ضرورت شدیدہ اور ابتلائے عام کے وقت حنفیہ کے نزدیک دوسرے ائمہ کو اختیار کرکے اس پر فتوی دینا بھی جائز ہے، لیکن عوام کو خود اپنی رائے سے جس مسئلہ میں چاہیں، ایسا کر لینے کی اجازت نہیں، بلکہ بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، وذلك لما صرح به العلامة الشامي في رسالة شرح المنظومة ورسم المفتي (الحیلۃ الناجزۃ: ۴۶-۴۷)، مذہب غیر کو لینے کے لئے یہ شرط ہے کہ اتباع ہوی کی بنا پر نہ ہو بلکہ ضرورت داعیہ کی وجہ سے ہو اور ضرورت وہی معتبر ہے جس کو علمائے اہل بصیرت ضرورت سمجھیں اور نیز یہ ضروری ہے کہ فتوی دینے والا ایسا شخص ہو جس نے کسی ماہر استاذ سے فن کو حاصل کیا ہو، اور اہل بصیرت اس کو فقہ میں مہارت نامہ پر شہادت دیتے ہوں، اسی طرح علامہ شامی نے شفاء العلیل میں تصریح کی ہے کہ اس زمانے میں بھی تغیر زمان ضرورت جدیدہ کی وجہ سے ہوجائے تو اہل فتوی کو مذہب غیر پر فتوی دینا جائز ہے (الحیلۃ الناجزۃ ص: ۴۹)۔

وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه محمد وعلى آله وصحبه أجمعين۔



# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح؟

حافظ شیخ کلیم اللہ عمری مدنی[1]

## شقاق سے کیا مراد ہے؟

قال القرطبی فی تفسیرہ فی قولہ تعالی وان خفتم شقاق بینھما فابعثوا (النساء ۳۵) فکأن کل واحد من الزوجین یأخذ شقا غیر شق صاحبہ أی ناحیۃ غیر ناحیۃ صاحبہ ان خفتم تباعد عشرتھما وصحبتھما (۱.۲۶۴، نیز دیکھئے: مفاتیح الغیب ۱۰.۷۲، التسھیل لعلوم التنزیل ۱.۱۹۱، لباب التاویل ۱.۳۷۲، اللباب فی علوم الکتاب ۶.۳۶۷ وغیرہ)۔

آیت کریمہ کے ذیل میں مذکورہ تفاسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ شقاق سے مراد زوجین کے درمیان ایسے اختلاف کا پایا جانا ہے جس سے زوجین کا ازدواجی زندگی گذارنا دشوار ہوجائے۔

## قاضی کے اختیارات

کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے، اس سلسلہ میں حنفیہ اور دوسرے فقہاء کا کیا نقطۂ نظر ہے؟

خلع زوجین کی رضامندی کے ساتھ پورا ہوگا البتہ معاملہ رضامندی کے ساتھ حل نہ ہونے کی صورت میں قاضی وقت کو یہ حق حاصل ہوگا کہ حالات کا مکمل جائزہ لینے کے بعد شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کردے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت بن قیسؓ کی رائے اور مرضی جانے بغیر فیصلہ صادر فرمایا: ''اقبل الحدیقۃ وطلقھا تطلیقۃ'' (یعنی باغ کو قبول کرلو اور ایک طلاق دے دو) (بخاری ابوداؤد نسائی)، نیز مذکورہ صورت میں قاضی خود فیصلہ کرے یا حکمین کا تقرر کرے اور وہ فیصلہ کردیں۔

۲۔ السید سابق رقمطراز ہیں: ''الخلع یکون بتراضی الزوج والزوجۃ فاذا لم یتم التراضی منھما فللقاضی الزام الزوج بالخلع'' (فقہ السنۃ السید سابق ۲/۲۹۹)۔

۳۔ یہی رائے ابوالطیب محمد صدیق خان کی ہے (الدرر البھیۃ والروضۃ الندیۃ لأبی الطیب محمد صدیق خان ۲/۲۷۲)۔

۴۔ مولانا مفتی شفیع صاحبؒ نے لکھا ہے کہ (لیکن عورت کو بھی اس حق سے محروم نہیں رکھا کہ شوہر کے ظلم وستم سہنے ہی پر مجبور ہوجائے اس کو یہ حق دیا کہ حاکم شرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کرکے اور شکایت کا ثبوت دے کر نکاح فسخ کراسکے (۱/۵۰۲ معارف القرآن)۔

۵۔ حکموں کے حکم کے باوجود اگر کوئی طلاق نہ دے تو جہاں قاضی ہے وہاں قاضی بحیثیت وکیل طلاق دے گا۔

خلع کیا ہے؟ بیوی کی طرف سے تحریک طلاق پس اگر ناقابل برداشت زیادتی مرد کی طرف سے ہے تو حاکم طلاق دینے کا حکم دے گا اور مہر بھی اس کے سر پر آجائے گا (تفسیر محمد عبدالقدیر صدیقیؒ ۱/۳۳۸)۔

۶۔ پنچ بطور خود عدالتی اختیارات نہیں رکھتے البتہ اگر عدالت ان کو مقرر کرتے وقت انہیں اختیارات دیدے تو پھر ان کا فیصلہ ایک عدالتی فیصلہ کی طرح نافذ ہوگا (تفہیم القرآن ۱/۳۵۱)۔

۷۔ پنچوں کو طلاق وتفریق کا اختیار نہیں ہے اگر پنچ خود ایسا کرے گا تو اس کا فیصلہ تفریق نافذ نہ ہوگا (تفسیر مظہری ۳/۷۱ تا ۷۲)۔

[1] استاذ ومفتی جامعہ دار السلام عمرآباد

۸۔ خلع ہو یا طلاق بدون شوہر کی رضامندی کے کچھ نہیں ہوسکتا اور شرعاً ایسی کوئی صورت نہیں ہے کہ بدون طلاق دینے شوہر کے یا بدون خلع کرنے کے عورت اس سے خارج ہوجائے پس جس طرح ہو شوہر کو مجبور کیا جائے کہ خلع کرلے یا طلاق دیدے اگر و یسے نہ مانے تو بذریعہ حاکم کے ایسا کرایا جائے یعنی حاکم شوہر کو مجبور کرے کہ یا وہ نان ونفقہ دیوے اور زوجہ کی خبر گیری کرے ورنہ خلع کرلے یا طلاق دیدے۔ ھکذا فی کتب الفقہ (فتاوی دار العلوم مدلل ۱۷۷/۱۰)۔

## حکم کے اختیارات اور ان کی تعداد

۱۔ طلاق یا خلع سے قبل حکمین قائم کرنے کا حکم استحباب کے درجہ میں ہے نہ کہ وجوب کے درجہ میں۔

۲۔ تحکیم سے متعلق آیت کا تعلق طلاق سے ہے نیز تحکیم طلاق اور خلع کے لئے شرط کے درجہ میں نہیں ہے۔ بلکہ حالات کے اعتبار سے قاضی کی صواب دید پر منحصر ہے بعض حالات میں حاکم یا قاضی تحکیم کے بغیر بھی خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ البتہ تحکیم کی صورت میں نص قرآنی کی روشنی میں دو حکم کا مقرر کرنا ہی اولی وافضل واحوط ہے جیسا کہ شہود کے باب میں دو گواہ کا تقرر نصوص شریعت سے ثابت ہے۔

البتہ بعض علماء نے ضرورۃ ایک حکم کے فیصلہ کو معتبر مانا ہے اور حکمین کے عدد کو استحباب پر محمول کیا ہے، اس کے لئے استدلال حضرت حبیبہ بنت سہلؓ کی حدیث سے کیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نکاح کو فسخ کردیا (۲۲۲۷ سنن ابی داؤد) (نہایۃ المطلب فی درایۃ المذہب لامام الحرمین الجوینی ۲۸۵/۱۳)۔

نیز حکمین کی کوششوں سے صلح نہ ہوسکے تو جمہور علماء کے نزدیک ان منصفوں کو زوجین کے درمیان تفریق کا اختیار ہے (فتح القدیر ۳۶۳/۱ تفسیر الرازی ۷۵/۱۰)۔

۳۔ حضرت عمرؓ وعثمانؓ نے بادشاہ یا قاضی کے حکم کے بغیر خلع جائز قرار دیا ہے (بخاری ۵۲۷۳ کتاب النکاح باب الخلع)۔

یہی رائے ائمہ اربعہ امام زہری امام شریح اور امام اسحاق رحمہم اللہ کی ہے (المغنی ۲۶۷/۱۰)۔

چونکہ خلع نکاح اور بیع وشراء کے مانند ہے جس میں قاضی کی رضامندی ضروری نہیں ہے پس یہ خلع بھی بیع میں اقالہ کے مانند ہے۔

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی نے الفقہ الاسلامی وأدلتہ میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے: ''لا یفتقر الخلع الی حاکم کما أبان الحنابلة وهو رأی باقی الفقهاء لقول عمر و عثمان رضی الله عنهما'' (۹/۴۵۷)۔

حضرت حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ کی رائے یہ ہے خلع حاکم کی اجازت سے ہوگا (الشرح الکبیر علی متن المقنع لعبد الرحمن بن محمد المقدسی ۱۷۴/۸)

۴۔ تحکیم کے بغیر طلاق وخلع کا ثبوت عہد نبوت اور قرون مفضلہ میں موجود ہے جو مندرجہ ذیل دلائل سے واضح ہے۔

الف: طلاق عبد الله بن عمر رضی اللہ عنہ (صحیح البخاری ۵۲۵۱)۔

ب: طلاق فاطمه بنت قیس رضی اللہ عنہا (صحیح مسلم ۳۷۱۳ سنن ابی داؤد ۲۲۸۴)۔

ج: طلاق رکانة (سنن ابی داؤد ۲۱۹۶)

۵۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثلاث جدهن جد وهزلهن جد النكاح والطلاق والرق'' (ترمذی ۱۱۸ صححه الالبانی) (تین چیزیں ایسی ہیں ان کی سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے: اور ان کا مذاق بھی سنجیدگی ہے طلاق نکاح اور غلام کی آزادی)۔

۶۔ بخاری ۵۲۷۳ النسائی ۱۰۴/۲ صحیح الجامع ۱۱۴۰۔

اسلام نے عقد نکاح کے سلسلہ میں زوجین کی رضامندی کو ضروری قرار دیا جب کہ طلاق کی صورت میں شوہر کو مکمل اختیار دیا جس میں عورت کی رضامندی شرط نہیں ہے اسی طرح عورت کو خلع کا اختیار دیا ہے نظام اسلام میں عدل موجود ہے۔ نیز خلع کے لئے زوجین کے مابین نزاع اور شقاق کا پیدا ہونا لازم نہیں ہے۔ بلکہ جب عورت کو شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی گذارنا دشوار ہوجائے یا شوہر بیوی کے حقوق واجبہ ومفروضہ کی ادائیگی سے قاصر ہو یا اس کے ساتھ رہنے کی صورت میں عورت کا دینی نقصان لازم آتا ہو تو اس صورت میں عورت خلع کی کاروائی کرسکتی ہے۔

## ضرورۃً کسی اور مکتب فکر کی طرف عدول کیا جانا؟

تلفیق کی صورت اس وقت جائز ہوگی جب کہ اسی مکتب فکر کے علماء کرام کا اتفاق ہو نہ کہ یہ حق واختیار فریق مسئلہ کو حاصل ہوگا جیسا کہ مفقود الخبر کی بیوی کیلئے انتظار کی مدت امام مالک رحمہ اللہ کے فتوی کے مطابق ۴ سال کافی ہے (مکمل ومدلل فتاوی محمودیہ ۱۳ / ۲۱۱ تا ۲۱۳)۔

دوسری طرف علماء کرام کی ایک بڑی جماعت نے مسائل شرعیہ میں عوام الناس کا رخصتوں کی تلاش کو زندقہ سے تعبیر کیا ہے۔ امام احمد نے فسق سے تعبیر کیا ہے. جب کہ علماء احناف نے صرف قاضی کو یہ حق دیا ہے کہ وہ حق وصواب کو پانے کے لئے کسی دوسرے مذہب کی طرف رجوع کر سکتا ہے (التحبیر شرح التحریر فی اصول الفقہ: لعلاء الدین ابی الحسن علی الدمشقی الحنبلی)۔

حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی ایک سوال کے جواب میں رقمطراز ہیں: اگر مجتہد قاضی کا فیصلہ اقوال اصحاب حنفیہ کے خلاف ہو تو نافذ ہوگا؟

جواب: نافذ ہوگا سراجیہ میں ہے: ''اذا قضی بقول مرجوح أو بقول يخالف قول أصحابنا رحمهم الله جاز إذا كان القاضي من أهل الرأي والاجتهاد انتهى'' (فتاوى عبد الحی ص ۳۶۰)۔

نوٹ (زوجہ متعنت کو اول تو لازم یہ ہے کسی طرح خاوند سے خلع وغیرہ کرلے لیکن اگر باوجود سعی بلیغ کے کوئی صورت نہ بن سکے تو سخت مجبوری کی حالت میں مذہب مالکیہ پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔

اگر وہ ظالم کسی صورت پر عمل نہ کرے تو قاضی یا شرعا جو اس کے قائم مقام ہو طلاق واقع کردے اس میں کسی مدت کے انتظار ومہلت کی باتفاق مالکیہ ضرورت نہیں...... (الحیلۃ الناجزۃ ص ۷۳ زوجہ متعنت دارالاشاعت کراچی) بہ تعلیق مولانا سلیم اللہ خان صاحب حاشیہ فتاوی محمودیہ ۱۳ / ۳۴۷)۔



# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

مولانا سہیل اختر قاسمی[1]

شریعت اسلامیہ کی نگاہ میں نکاح ایک پاکیزہ رشتہ ہے، جس کو قریب قریب عبادت کا درجہ دیا گیا ہے، اس سے عفت، پاکدامنی اور نسل انسانی کے تحفظ کے علاوہ نسل انسانی کی بقاوافزائش اور قلبی وروحانی سکون بھی حاصل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالی نے میاں بیوی دونوں کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے اور ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کی تاکید کی ہے، یہی وجہ ہے کہ بلاوجہ رشتہ نکاح کو ختم کرنے اور طلاق دینے کو شریعت نے سخت ناپسند کیا ہے، لیکن اگر اس کے باوجود میاں بیوی کے درمیان زندگی کی کسی ڈگر پر باہمی تعلقات میں کچھ ایسی کڑواہٹیں آجاتی ہیں کہ جن کے ہوتے ہوئے ازدواجی رشتہ کو باقی رکھنا دشوار ہوجاتا ہے تو ایسے موقع پر اسلام میں رشتہ نکاح کو طلاق، خلع اور فسخ کے ذریعہ ختم کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ مجبوری کی صورت میں میاں بیوی ایک دوسرے سے آزاد ہوکر زندگی گزار سکیں۔

۱۔ خلع کا لغوی معنی: ..... خلع کے معنی مطلق اتارنا ہے۔ مثلاً کپڑے یا جوتے اتارنا، ارشاد ربانی ہے "فاخلع نعليك" (سورہ طٰہٰ آیت ۱۲) (اے موسیٰ! اپنے جوتے اتاردو)۔ اسی طرح کھولنا، عہد و پیمان توڑنے اور آزاد کرنے کے معانی میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے (لسان العرب ج ۵ / ۱۳۰)۔

## خلع کی اصطلاحی وفقہی تعریف:

فقہاء کرام نے خلع کی جس انداز میں تعریف کی ہے ان تمام تعریفات کا حاصل یہ ہے کہ عورت مال کے بدلہ شوہر کی رضامندی سے اپنی جان چھڑا لے اور نکاح کے بندھن سے آزاد ہوجائے بالفاظ دیگر مال کے بدلہ طلاق لینے کا نام خلع ہے۔

(۲) شریعت اسلامیہ نے شوہر کو گھر کا قوام قرار دیا ہے، مرد کی قوامیت اور حاکمیت کی رو سے اسے عورت کے مقابلہ میں ذمہ داری بھی زیادہ دی گئی ہے، مرد کی فطرت وجبلت میں اللہ رب العزت نے گہرائی وگیرائی ودیعت کی ہے، اس کے برخلاف عورت کی سرشت میں فطری عجلت وجلد بازی ہے، اس جبلی فرق کی وجہ سے مرد کو طلاق کا اختیار دیا گیا ہے جب کہ بیوی کو یہ حق نہیں دیا گیا ہے، متعدد آیتوں میں طلاق دینے کی نسبت صرف شوہر کی طرف کی گئی۔

"وإن عزموا الطلاق" (بقرہ ۲۲۷) (اور اگر ٹھہرالیا چھوڑ دینے کو)۔

"الطلاق مرتان فإمساك بمعروف أو تسريح بإحسان ولا يحل لكم أن تأخذوا مما آتيتموهن شيئا إلا أن يخافا ألا يقيما حدود الله" (بقرہ ۲۲۹)۔ (طلاق رجعی ہے دوبار تک اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا بھلی طرح اور تم کو روا نہیں کہ لے لو کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں سے مگر جب کہ خاوند وعورت دونوں ڈریں اس بات سے کہ قائم نہ رکھ سکیں گے حکم اللہ کا)۔

یہ اور ان کے علاوہ آیات میں مردوں کو حق طلاق کے باب میں فیصلہ کن اختیار دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ بڑی وضاحت وصراحت سے عورت کی علاحدگی کا طریقہ بھی بیان کردیا گیا، ان آیات کی موجودگی میں بیوی کے حق طلاق کے اثبات میں کچھ کہنا بلاشبہ غیر منصوص فکر کو فروغ دینا ہے۔

لہٰذا میاں بیوی دونوں کو طلاق وخلع کے سلسلہ میں یکساں تصور کرنا سراسر باطل ہے اور مزاج شریعت کے خلاف بھی ہے، اس وجہ سے عورت کو مجبوری کی صورت میں مطالبہ فسخ نکاح کا حق حاصل ہے، جو اس امر کی علامت ہے کہ عورت حبالہ عقد کو توڑنے اور عقد کے بندھن سے آزاد ہونے میں خود مختار نہیں ہے کہ وہ جب چاہے جس طرح چاہے، شوہر کی رضامندی وعدم رضامندی کے بغیر رشتہ نکاح سے آزاد ہوجائے، بلکہ عورت اپنے شوہر سے علاحدگی کے لیے بشکل خلع اولاً شوہر کی رضامندی کی محتاج ہے، یعنی شوہر مال لیکر اس کو طلاق دیدے۔ اور اگر شوہر طلاق دینے پر تیار نہ ہو تو قاضی کی عدالت میں مقدمہ کرکے فسخ نکاح کا مطالبہ کرے۔

[1] معاون قاضی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

اس سلسلہ میں فیصلہ کن حبیبہ بنت سہلؓ اور ثابت بن قیسؓ کا واقعہ ہے جو بہت واضح ہے۔

(۳) اگر عورت اپنے شوہر سے شدید حد تک متنفر ہو اور شوہر طلاق دینے پر نہ تیار ہو اور نہ خلع پر آمادہ ہو اور عورت کے پاس شوہر کی طرف سے ہو رہی ظلم وزیادتی کو ثابت کرنے کے لئے گواہان بھی فراہم نہ ہوں، نہ شوہر اقرار کرے تو ایسی عورت کی گلوخلاصی کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ کیا عورت کو شوہر سے شدید نفرت کے باوجود شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جائے گا اور کیا ایسا کرنے پر مقاصد نکاح حاصل ہو جائیں گے یا ایسا کرنا عورت کے لیے مزید ضرر میں مبتلا کرنے کے مترادف ہوگا؟

اس سلسلہ میں درج ذیل آیت میں ہمارے لیے بڑی رہنمائی ہے: ''وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما إن الله كان عليما خبيرا'' (نساء:۳۵)۔

(اور اگر تمہیں دونوں (زن وشو) کے درمیان کشمکش کا علم ہو تو ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک حکم عورت کے خاندان سے مقرر کردو، اگر دونوں کی نیت اصلاح حال کی ہوگی تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردے گا۔ بے شک اللہ بڑا علم رکھنے والا اور ہر طرح باخبر ہے)۔

اس آیت کے حوالہ سے ائمہ کرام ومجتہدین نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ اگر عورت ضرر رسانی کا دعوی کرے لیکن اپنے دعوی کو عند القضاء وہ ثابت نہ کر سکے اور کسی صورت میں شوہر کے ساتھ رہنے کے لیے تیار نہ ہو اور نہ شوہر طلاق دینے پر آمادہ ہو تو ایسی صورت میں اگر معاملہ قاضی کے عدالت میں ہو تو قاضی حکمین مقرر کرے گا جو زوجین کے معاملات پر غور کر کے کوئی صورت جس میں مصلحت پائیں گے اختیار کریں گے اور اصلاح حال کی کوشش کریں گے۔ اگر تحکیم کے باوجود اصلاح حال یا باہمی رضامندی سے علاحدگی کی کوئی صورت نہیں نکل سکے تو کیا قاضی بربناء شقاق، زوجہ کے مطالبہ کی صورت میں تفریق کردے گا؟

اس سلسلہ میں فقہاء حنفیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر حکم کو شوہر طلاق وخلع کا اختیار دے تو وہ طلاق دے سکتا ہے اور خلع پر بھی معاملہ حل کر سکتا ہے، ورنہ شوہر کی رضامندی کے بغیر وہ عورت کو طلاق دینے کا مجاز نہیں ہے، البتہ مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ حکم زوج کی طرف سے عورت پر طلاق بھی واقع کر سکتا ہے۔

موجودہ حالات کے پیش نظر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ معروف فقیہ کی رائے یہ ہے:

ازدواجی تعلقات انسان کے ایسے نجی معاملات ہیں جن میں ایسے بہت سے مراحل آسکتے ہیں جہاں عدالتوں میں کسی امر کو ثابت کرنا دشوار امر ہوگا، ایسے حالات میں دیگر حقوق کی طرح عدم ثبوت کی بنیاد پر مقدمہ خارج کردیا جانا کافی نہیں ہوگا، بلکہ اس طرح کی صورت میں جب کہ میاں بیوی کی زندگی ایک دوسرے سے وابستہ ہے، محض مقدمہ کی ہار جیت مسئلہ کو حل نہیں کر سکتی؛ بلکہ پیچیدگیاں بڑھ سکتی ہیں، اس لیے شارع کا منشا یہ ہے کہ ایسے مواقع پر جب بھی عدالتوں میں ثبوت دشوار ہو جائے حکمین کے ذریعہ مقدمہ کا فیصلہ کیا جائے، جن کے فیصلہ کی بنیاد ''نجی تحقیقات'' پر ہوگی، باضابطہ بحث وشہادت پر نہیں اس طرح مسئلہ حل ہوگا محض ہار جیت کا فیصلہ نہیں ہوگا۔

اب اس سلسلہ میں حضرت امام مالک کا قول جو مدونۃ الکبری (۲ر۳۶۷) میں نقل کیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ تحکیم کا محل وہ مقدمہ ہے جہاں زوجین کے باہمی معاملات اس قسم کے ہیں جنہیں شہادت کے ذریعہ ثابت کرنا نہ صرف مشکل بلکہ حقیقت حال تک پہنچنا عدالت کے بس سے باہر ہو۔

اس سلسلہ میں علامہ ابوالولید محمد بن احمد بن رشید قاضی قرطبہ کی رائے کا حاصل یہ ہے کہ حکمین کے فیصلہ کے خلاف زوجین میں سے کسی کو عذر کا اختیار نہیں رہتا؛ اس لئے حکمین کے فیصلہ کی بنیاد شہادت قاطعہ پر نہیں ہوتی؛ بلکہ طرفین کے حالات کی اس واقفیت پر ہوتی ہے جو حکمین کو نجی تحقیقات سے حاصل ہوتی ہے۔

(۴) شقاق کے معنی عداوت، دشمنی اور مخالفت کے ہیں۔

یہاں شقاق سے مراد وہ شدید نفرت اور دوری ہے کہ جس کی وجہ سے حدود اللہ پر قائم رہتے ہوئے ازدواجی زندگی گذارنا ممکن نظر نہ آئے (دیکھئے: احکام القرآن ار۱۳۸، روح المعانی ۴ر۹۳، کتاب الفسخ والتفریق/ ۱۵۲ وغیرہ)۔

واضح رہے کہ بلا وجہ شقاق تقرری حکمین یا فسخ نکاح کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ شقاق کی کوئی معقول وجہ بھی ہونی چاہئے چنانچہ اس سلسلہ میں مولانا عبد الصمد رحمانی لکھتے ہیں: ''یہ شقاق عام ہے چاہے شوہر کی بلا وجہ مار پیٹ سے باہم زن وشو میں پیدا ہوا ہو یا بیوی کی جائداد پر ناجائز تصرف کی وجہ سے پیدا ہوا ہو یا بے پردگی اور موجودہ فیشن کی عریانی اختیار کرنے پر جبر کرنے کی بنا پر پیدا ہوا ہو یا دیگر قسم کے محرمات پر اکراہ اور جبر کی وجہ سے پیدا ہوا ہو یا فرائض وواجبات کی ادائیگی سے روکنے کی بنا پر ہوا ہو یا اسی طرح کے اور دوسرے امور کی وجہ سے رونما ہوا ہو'' (کتاب الفسخ والتفریق ر ۱۵۳)۔

(۵) میاں بیوی میں جب شدید نفرت وبعد پیدا ہوجائے اور نباہ کی کوئی صورت نہ ہو اور معاملہ قاضی کی عدالت میں پہنچے تو کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے؟

اس سلسلہ میں احناف کی رائے یہ ہے کہ حکمین کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ شقاق کی صورت میں میاں بیوی کے درمیان تفریق کردیں اور شوہر کی طرف سے نائب بن کر طلاق دیدیں، ہاں اگر شوہر نے ان کو طلاق وخلع کا بھی وکیل بنایا ہے تو ایسی صورت میں وہ طلاق وخلع دے سکتا ہے ورنہ نہیں، امام طحاوی احناف کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''وليس للحكمين فى الشقاق أن يفرقا إلا أن يجعل ذلك إليهما الزوج'' (۱۹۱)۔

امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے۔ چنانچہ کتاب الام میں ہے:

''ولا يجبر الزوجان على توكيلهما إن لم يوكلا'' (۵، ۱۹۵)۔

جب کہ امام مالکؒ، ایک روایت میں امام شافعیؒ، اوزاعیؒ اور صحابہ میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی رائے یہ ہے کہ اگر قاضی شریعت یا پنچوں کے ذریعہ باہمی نفرت وشقاق دور کرنے کے لئے طلاق اور خلع کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو یا باہم میل ملاپ وصلح صفائی کی کوئی صورت نہ ہو تو ان کو طلاق وخلع دونوں کا اختیار ہے خواہ شوہر نے اس کو وہ اختیار سپرد کیا ہو یا نہ کیا ہو اور شوہر حکمین کے فیصلہ سے راضی ہو یا نہ ہو۔

مذکورہ عبارتیں تو حکمین سے متعلق ہیں مگر قاضی کے لئے بھی یہی عبارتیں دلیل بنیں گی، کیونکہ قاضی کی حیثیت اصل کی ہے اور حکمین اس کے نائب ہوتے ہیں اور جب نائب کو اختیارات وقدرت مل سکتی ہے تو اصل کو بدرجہ اولی ملے گی۔

(۶) آیت کریمہ "وان خفتم شقاق" میں "فابعثوا" جو امر کا صیغہ ہے اس کے مخاطب وہ ولاۃ وقضاۃ ہیں جو مصالح مسلمین کے تحفظ کی خاطر اپنے منصب پر مقرر کیے گئے ہیں، اس لیے میاں بیوی کے درمیان اختلاف شقاق، منافرت اور دوری کی صورت میں حکمین کا تقرر قاضی کی ذمہ داری ہے اور یہ اس کے حدود اختیار میں داخل ہے۔ حکمین قاضی مقرر کرے گا۔

فقہاء مالکیہ کی عبارتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ حکمین کی تقرری بعض اوقات ضروری نہیں ہے اور بعض اوقات واجب وضروری ہے۔

ابن رشد مالکی بدایۃ المجتہد میں لکھتے ہیں: ''اتفق العلماء على جواز بعث الحكمين إذا وقع التشاجر بين الزوجين وجهلت إحداهما فى التشاجر، أعني: المحق من الباطل لقوله تعالى وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من اهله وحكما من اهلها'' (۲۶۵)۔

اگر حکمین کی تقرری واجب ہوتی تو "جواز بعث الحكمين" کے الفاظ نہیں لکھے جاتے، معلوم ہوا کہ حکمین ہر چند کہ قاضی یا والی کی طرف سے مقرر ہوں گے مگر ایسا کرنا واجب نہیں ہے۔

اس کے برخلاف الاحوال الشخصیۃ کی عبارت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمین کی تقرری ایک امر واجب ہے۔

''ثم إن وجد حكمان من أهل الزوجين وأمكن تحكيمهما وجب تحكيمهما'' (بحوالہ کتاب الفسخ والتفریق ۱۵۶)

میرے خیال سے اگر قاضی یہ محسوس کرے کہ بغیر حکم کے بات نہیں بنے گی اور معاملہ حل نہیں ہوگا اور ایسے افراد بھی مہیا ہوں جن کو حکم بنایا جاسکتا ہو تو ایسی صورت میں حکمین کی تقرری اصلاح احوال کے لئے ضروری ہے۔ ورنہ عام حالات میں مندوب ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ کیا حکمین کی کوشش کے بعد ہی خلع معتبر ہوگا یا قاضی خود فیصلہ کرسکتا ہے؟ تو اس سلسلہ میں جاننا چاہئے کہ قاضی کسی بھی مسئلہ میں اصل ہے، وہ فیصلہ میں حکمین کی کارروائی، چھان بین اور رپورٹنگ کا محتاج نہیں ہے، قاضی خود اچھی طرح اصول قضاء کو برت کر فیصلہ کرنے کا مجاز ومختار ہے، لیکن حکمین کی تقرری کا مقصد چونکہ زوجین میں اصلاح حال ہے تاکہ وہ فریقین کے معاملہ کا گہرائی سے جائزہ لیکر دونوں کے درمیان صلح کرادیں گے یا باہمی رضا سے طے ہوجانے والے شرائط پر تفریق کی صورت نکال دیں گے اور اگر وہ کسی حل تک نہیں پہنچ سکیں تو جن حالات سے وہ اپنی تحقیقات کے دوران باخبر ہوئے ہیں، ان کی رپورٹ قاضی کو دیں گے اور بوقت ضرورت عند القضاء شاہد کی حیثیت سے پیش ہوں گے، اس لئے قاضی کے لئے مناسب ہے کہ وہ فیصلہ میں حکمین کی رپورٹ کو خاص اہمیت دے اور اس کی روشنی میں ہی فیصلہ کرے، جمہور فقہاء کی یہی رائے ہے۔

البتہ جن فقہاء کی نگاہ میں حکمین کی حیثیت حاکم کی ہے اور انہیں کلی اختیار حاصل ہے، وہ میاں بیوی کو ساتھ رہنے کا حکم دے سکتے ہیں یا دونوں کے درمیان تفریق کر سکتے ہیں، وہ اپنے فیصلہ میں خود مختار ہیں۔ خواہ فریقین اس سے راضی ہوں یا نہ ہوں، ان کے نزدیک حکمین کا کیا ہوا خلع وتفریق خود معتبر ہوگا۔ امام مالک کا یہی قول ہے، اسی طرح فقہاء مالکیہ نے حکمین کی جو شرائط لکھی ہیں اگر ان شرائط کو ملحوظ رکھ کر حکمین میسر آ جائیں تو دو حکم کی تقرری ضروری ہے۔ اگر فریقین ایک حکم پر فیصلہ کے لئے آمادہ وتیار ہوں تو ایک حکم ہی کافی ہوگا، یہ اس وقت کی بات ہے جب معاملہ عدالت میں نہ پہنچا ہو اور فریقین خود کسی کو حکم بنا کر فیصلہ کرنا چاہیں، لیکن جب معاملہ عدالت میں پہنچ جائے تو دو حکم کی تقرری ضروری ہے (دیکھئے: حاشیۃ الصاوی ۲۳۸/۸)۔

(۷) قاضی، شقاق کی وجہ سے حنفیہ کے یہاں خلع یا طلاق کا فیصلہ نہیں کر سکتا ہے، البتہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ دونوں کے درمیان ممکن حد تک صلح کی کوشش کریں گے اور اس کے باوجود بھی دونوں کی اصلاح نہ ہو اور نفرت اپنی انتہا کو پہنچ جائے تو ایسی صورت میں قاضی طرفین کے خاندان سے ایک ایک لائق اور دین دار مسلمان کو حکم مقرر کر کے بھیجے گا، وہ دونوں حکم زوجین سے جا کر گفتگو کریں گے اور دونوں کو ملانے کی سعی کریں گے اور قاضی شریعت کے پاس متفقہ طور پر دونوں حکم آ کر اپنی رائے اور شہادت پیش کریں گے، ان دونوں (حکمین) کی متفقہ رائے اور شہادت کے بعد قاضی فیصلہ کر دے گا، اگر ان کی رائے تفریق کی ہوگی تو قاضی تفریق کر دیگا اور اگر دونوں اس نتیجہ پر پہنچیں کہ زوجین کا اجتماع ممکن ہے اور دونوں اس رشتہ پر قائم رہ کر حقوق زوجیت ادا کریں گے اور شقاق رفع ہو جائے گا تو قاضی اس کو حکم دے گا۔

حنفیہ کے ترجمان علامہ ابن ہمام کی فتح القدیر ۲۴۴/۴ کی عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ حکمین، زوجین کی اجازت ومرضی کے بغیر خلع وطلاق کا فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں، البتہ اگر وہ حکمین کو خلع وطلاق کا وکیل بنا دیں تو دونوں ایسا کر سکتے ہیں، البتہ مالکیہ کے یہاں اگر عورت، شوہر کی ظلم وزیادتی کی وجہ سے تنگ آ کر قاضی کے یہاں مقدمہ کرے اور شوہر طلاق یا خلع پر آمادہ نہ ہو تو ایسی صورت میں قاضی حکمین کے ذریعہ نکاح کو ختم کرا دے، اگر کوئی حنفی قاضی ایسا کر رہا ہے تو مالکیہ کے بیان کردہ تمام شرائط کو ملحوظ رکھے اور بوقت ضرورت پورے احتیاط کے ساتھ اس مسئلہ پر عمل کرے، صرف اتباع ہویٰ اور خواہش نفس کی پیروی نہ ہو، خود فقہاء احناف کے یہاں ضرورت کے وقت دوسرے امام کے مسلک پر عمل کی گنجائش موجود ہے۔

''لا بأس بالتقليد عند الضرورة لكن يشترط أن يلتزم جميع ما هو يوجبه الإمام'' (شامی ۴۲/۲)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حنفی قاضی اگر یہ محسوس کرے کہ ازدواجی بندھن اپنے مقصد کے لحاظ سے ناکام ہو چکا ہے، زن وشو میں اتحاد واتفاق، مودت ورحمت مفقود ہو چکی ہے، گھر کا گوشہ عافیت جہنم کدہ بن چکا ہے اور زوجین کی یکجائی کی کوئی صورت موجود نہیں ہے تو مالکیہ کے مسلک کی تمام قیود وشرائط کی رعایت کرتے ہوئے دونوں میں علاحدگی کرا دے۔



# شقاق بین الزوجین

مفتی اشرف عباس قاسمی[1]

ا۔ **خلع کی فقہی و اصطلاحی تعریف:** ...... ''خُلع''۔ خَلَعَ یَخْلَعُ خَلْعًا کا اسم مصدر ہے، جس کا معنی ہے نکال دینا، ہٹا دینا، اتار دینا، کہا جاتا ہے:

''خلع الرجل ثوبه'' یعنی اس نے اپنے کپڑے اتار دیئے (لسان العرب ۲۰۹/۸)۔

## اصطلاحی تعریف:

''إزالة ملك النكاح ببدل بلفظ الخلع'' (فتح القدير لابن الهمام)۔

یعنی عوض لے کر لفظ خلع کے ذریعے ملک نکاح کو زائل کر دینے کا نام خلع ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری نے یہ تعریف کی ہے: ''یعنی خلع یا اس کے ہم معنی لفظ کے ذریعے بیوی کی رضامندی کی صورت میں ملک نکاح کو ختم کر دینا'' (البحر الرائق ۱۹/۴، الدر المختار ۸۷/۵)۔

## تعریف کی وضاحت:

''ملك النكاح'' کی قید سے نکاح فاسد میں نیز بینونت اور ردت کے بعد کیا جانے والا خلع خارج ہوگیا، اس لیے کہ وہ لغو ہے شرعاً اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

''المتوقفة على قبولها'' کی قید سے وہ صورت نکل گئی کہ کوئی شخص بہ نیت طلاق بیوی سے کہے: ''خلعتك'' اور مال کا تذکرہ نہ کرے تو اس صورت میں طلاق بائن واقع ہو جائے گی اور عورت کے حقوق ساقط نہ ہوں گے، کیونکہ مرد کا یہ قول عورت کے قبول کرنے پر موقوف نہیں ہے، جب کہ ازالۂ نکاح بدل مال کے عوض ہو یا ''خالعتك'' یا ''اختلعي'' کے لفظ سے ہو، وہ عورت کے قبول کرنے پر موقوف ہوتا ہے۔

''بلفظ الخلع'' کی قید سے طلاق علی المال کو خارج کر دیا، کیونکہ طلاق علی المال سے حقوق زوجیت ساقط نہیں ہوتے ہیں، جبکہ لفظ خلع سے عند الاحناف شوہر کے ذمہ واجب الادا حقوق ساقط ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ یہ تعریف اس خلع کے ساتھ خاص ہے جو مسقط للحقوق ہے۔

## خلع اور طلاق علی مال میں وجوہ فرق:

یہاں اس امر کی بھی وضاحت مناسب ہے کہ خلع اور طلاق علی مال، دونوں میں طلاق بالعوض ہوتی ہے، تاہم دونوں میں یہ چند وجوہ فرق ہے:

''(الف) خلع اگر ایسے عوض پر ہو جس کو شرعاً عوض قرار دینا درست نہیں ہے، مثلاً وہ مال غیر متقوم ہو تو شوہر کو کچھ نہیں ملے گا، اور طلاق بائن واقع ہو جائے گی، لیکن اگر طلاق علی مال میں عوض باطل قرار پائے تو طلاق رجعی واقع ہوگی'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵۰۳/۷)۔

''(ب) عقد زواج کی وجہ سے زوجین میں سے ایک کے دوسرے پر جو حقوق واجب ہوتے ہیں، مثلاً مہر اور نفقہ وغیرہ، خلع کی وجہ سے یہ سارے حقوق ساقط ہو جائیں گے، جب کہ طلاق علی مال کی وجہ سے یہ حقوق ساقط نہیں ہوتے ہیں'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵۰۴/۷)۔

''(ج) عقد خلع لفظ خلع سے بھی ہوتا ہے اور اس کے ہم معنی مبارأۃ جیسے کلمات کے ذریعہ بھی، جب کہ طلاق علی مال کا وقوع صرف لفظ طلاق اور اس کے ہم

[1] استاذ دار العلوم دیوبند

معنی الفاظ سے ہوتا ہے، جیسے شوہر اپنی بیوی سے کہے: ''طلقتك على ألف دينار، يا أبنتك بألف'' (أحكام الخلع في الشريعة الاسلامية. عامر سعيد الزيباري، ٢٢٥)۔

## ۲۔ خلع وطلاق کا حق کس کو ہے؟

بغیر کسی معقول وجہ کے عورت کے لیے خلع کا مطالبہ مکروہ ہے، لیکن اگر نباہ مشکل ہو اور عورت کو کفران عشیر کا اندیشہ ہو تو وہ خلع کا مطالبہ کرسکتی ہے، البتہ اکثر اہل علم جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں، اس بات کے قائل ہیں کہ عورت کی طرف سے خلع کی پیش کش کا قبول کرنا مرد کے ذمہ ضروری نہیں ہے بلکہ یہ مستحب ہے:

''قال البهوتي شيخ الحنابلة بعدما ذكر الدواعي إلى الخلع، يباح لها أن تخالعه ويسن له إجابتها'' (كشاف القناع ٥/٢١٦)۔

جبکہ قاضی شوکانی اور حافظ احمد بن تیمیہ کی رائے وجوب کی ہے۔

''المذهب الثاني وجوب إجابة الزوج بطلب الزوجة إذا أرادت الخلع، ذهب إليه الشوكاني وابن تيمية'' (أحكام الخلع في الشريعة الإسلامية ٧٨)۔

فریقین کا استدلال حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی زوجہ کی طرف سے خلع پر رضامندی کے اظہار کے بعد حضرت قیسؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے ہے: ''اقبل الحديقة'' پوری روایت اس طرح ہے:

''ثابت بن قیس کی بیوی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا، یا رسول اللہ! میں ثابت بن قیس کو دین واخلاق کے سلسلہ میں کوئی الزام نہیں دیتی ہوں، البتہ مجھے ان کی نافرمانی کا اندیشہ ہے، جس کی اسلام میں اجازت نہیں ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تم ثابت کا باغ انہیں لوٹا دوگی، انہوں نے اثبات میں جواب دیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس سے ارشاد فرمایا: تم باغ قبول کرلو اور اپنی بیوی کو ایک طلاق دے دو'' (صحیح البخاری۔ باب الخلع وکیف الطلاق فیہ۔ رقم الحدیث ۵۲۷۳)۔

اس میں جو صیغۂ امر ہے، جمہور کے نزدیک یہ امر برائے وجوب نہیں بلکہ برائے ارشاد واصلاح ہے (فتح الباری ۱۱/۳۱۹)۔

جب کہ حافظ ابن تیمیہ اور قاضی شوکانی کے مسلک پر دو طرح سے استدلال کیا گیا ہے، ایک استدلال تو صیغۂ امر کو برائے وجوب مان کر کیا گیا ہے۔

چنانچہ خود شوکانی فرماتے ہیں: ''یعنی یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کو وجوب سے پھیرنے والا کوئی قرینہ نہیں ہے، اور یہ وجوب ہی امر کی حقیقت ہے جب تک کہ قرینۂ صارفہ عن الوجوب موجود نہ ہو'' (نیل الأوطار ۶/۲۷۹)۔

دوسرا استدلال خواتین کے جذبات کی رعایت کے پس منظر میں کیا گیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر عامر سعید الزیباری کہتے ہیں:

''اگر ہم دوسرے زاویے سے دیکھیں، تو ہمیں یہ حقیقت نظر آئے گی کہ عورت بھی مرد ہی کی طرح ایک انسان ہے، اس کے بھی جذبات واحساسات ہیں جیسے مرد کے ہوتے ہیں، تو جب بیوی کو اپنے شوہر میں وہ خامی نظر آئے جس خامی کو شوہر، بیوی میں محسوس کر کے طلاق دے ڈالتا ہے تو اسلام کی سیر چشمی کا تقاضا ہے کہ وہ بیوی کو بھی اس طرح کا حق دیتا ہے، واقعۃً اسلام کس قدر عدل پرور ہے، اور عورت کے تئیں اس کا رویہ کس قدر انصاف پر مبنی ہے، ارشاد باری ہے:

''ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف'' (أحكام الخلع ٨٠)۔

پہلے استدلال کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ خلع کے ذریعے طلاق بائن ہوتی ہے، اور اسباب فسخ نہ ہونے کی صورت میں طلاق خالصۃً مرد کا حق اور اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ لہٰذا ضابطہ شرعی خود ہی اس بات کا قرینہ ہے کہ ''اقبل الحديقة'' میں امر برائے وجوب نہیں بلکہ برائے ارشاد واصلاح ہے۔

دوسرے استدلال کا جواب یہ ہے کہ یقیناً صنف نازک کے بھی جذبات واحساسات ہوتے ہیں، لیکن اس کی طبیعت کی ''انفعالیت اور دوسری بہت سی مصالح کے پیش نظر طلاق کا حق عورت کو تفویض نہیں کیا گیا ہے، اس میں خود اس کا مفاد مضمر ہے، خلع کی پیش کش کو قبول کرنے کو واجب قرار دینے کا مطلب ہے کہ جزوی طور سے سہی، عورت کو طلاق کا حق دیا جارہا ہے، جو کہ شرعاً اور عقلاً انتہائی نامناسب عمل ہوگا۔

اس لیے جمہور کے قول میں اگرچہ بہ ظاہر تنگی نظر آرہی ہے، لیکن انجام وعواقب کے اعتبار سے وہی بہتر اور زیادہ قابل عمل ہے۔ لہٰذا اگر شوہر خلع کی پیش کش

کو ٹھکرا دے تو عورت کو صبر سے کام لینا چاہیے۔

## ۳۔ عدم بینہ کی بنا پر گلوخلاصی کی کیا صورت ہوگی؟

شریعت میں معتبر وجوہ کی وجہ سے وہ شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار کرتی ہے تو یہ انکار جائز ہوگا۔ اگر وہ ان اسباب کی بنا پر تفریق چاہے تو اسباب معتبرہ کو سامنے رکھ کر قاضی اس کا نکاح فسخ کرسکتا ہے، لیکن اگر یہ اسباب معتبرہ موجود نہ ہوں اور عورت شوہر کی جانب سے شدید حد تک متنفر ہو اور شوہر طلاق پر آمادہ نہ ہو تو اس صورت کا حکم حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح تحریر فرمایا ہے:

''اور اگر یہ ظاہری اسباب موجود نہ ہوں، لیکن طبعی ناپسندیدگی کی وجہ سے وہ اس شوہر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو شوہر کا فرض ہے کہ وہ امساک بالمعروف کی صورت نکالے، اگر ممکن نہ ہو تو تسریح بالاحسان یعنی خلع کی صورت میں زوجہ کو اپنے نکاح سے الگ کردے، اور اگر زوج دونوں میں سے کوئی صورت نہیں نکالتا اور قاضی محسوس کرتا ہے کہ اب طرفین کے درمیان معروف اور بہتر تعلقات کے ساتھ نکاح کا برقرار رہنا ممکن نہیں ہے تو اس صورت میں فقہ مالکی کو سامنے رکھتے ہوئے تحکیم اور پھر خلع جبری کی صورت نکال سکتا ہے'' (فتاوی قاضی ر ۱۵۰)۔

حضرت قاضی صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بالکل آخری شکل ہے، بہ درجۂ مجبوری جب نباہ کی کوئی شکل نہ بن پائے تو یہ نہائی صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔

## ۴۔ شقاق سے کیا مراد ہے؟

"شقاق" مفاعلہ کا مصدر ہے، اس کا معنی ہے ایک دوسرے کے تئیں نفرت اور آپسی اختلاف '' الشقاق مصدر من شاق. وھو أن یأتي أحد الزوجین بأمر یشق علی الأخر'' (حاشیۃ أحکام القرآن ۱؍۴۵۱)۔

''یعنی عزت نفس پر آنچ آنے کی وجہ سے شدید آپسی جھگڑے کا نام شقاق ہے''۔

ابوجعفر النحاس نے اس کی حقیقت اس طرح واضح کی ہے: "شقاق" کا معنی ہے مخالفت دشمنی اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ جن دو میں رنجش ہوتی ہے، ان میں سے ہر ایک دوسرے کی شق مخالف یعنی جانب مخالف میں ہوجاتا ہے (روح المعانی ۵؍۲۶)۔

فقہاء کی عبارتوں سے واضح ہے کہ شقاق کا مطلب ہے کہ زوجین کے رشتے میں ایسی زبردست تلخی آجائے کہ اس کی وجہ سے موافقت اور نباہ مشکل معلوم ہونے لگے، عورت نشوز پر اتر آئے، اور اللہ پاک نے شوہر کے حوالے سے جو حقوق اس پر عائد کیے ہیں، انہیں ادا نہ کرسکے، جب کہ شوہر امساک بالمعروف یا تسریح باحسان کی اپنی ذمہ داری نہ بجالائے۔

## ۵۔ کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے؟

حنفیہ، شوافع اور حنابلہ شقاق یا ضرر کی وجہ سے تفریق کے قائل نہیں ہیں، خواہ ناچاقی اپنی انتہاء کو پہنچ جائے اور سخت ضرر ہو، اس لیے کہ بغیر طلاق کے بھی زوجہ سے دفع ضرر ممکن ہے، زوجہ قاضی کے یہاں مرافعہ کرے اور قاضی زوج کے خلاف تادیب کا فیصلہ کرے تا آنکہ وہ اپنے رویے سے باز آجائے، ان حضرات نے اس شرعی ضابطے سے استدلال کیا ہے کہ طلاق کا حق صرف مرد کو ہے یا اس شخص کو جسے مرد اپنا وکیل بنائے اور خلع میں بھی بالعوض طلاق ہی ہوتی ہے:

''اصل شرعی یہ ہے کہ طلاق کا حق صرف شوہر یا اس شخص کو ہے جسے شوہر اپنا وکیل بنائے، کیونکہ از روئے شرع طلاق مرد کا حق ہے، اور مال خرچ کرنا عورت کے ذمہ ہے، لہٰذا دونوں کی اجازت ضروری ہوگی'' (الفقہ الاسلامی ۷؍۵۲۸)۔

مالکیہ نے شقاق یا ضرر کی وجہ سے تفریق کو جائز قرار دیا ہے: ''ہمارے علماء کے مطابق مقاصد نکاح یعنی آپسی محبت اور بہترین رہن سہن میں خلل آجانے کی وجہ سے بھی تفریق ہوسکتی ہے'' (احکام القرآن لابن العربی ۱؍۴۲۵)۔

لہٰذا آپسی اختلاف حد سے گزر جائے تو قاضی حکمین کو بھیجے، بہتر ہے کہ ایک زوج کا رشتہ دار ہو اور ایک زوجہ کا۔ یہ دونوں زوجین کے سلسلے میں صحیح صورت حال کا جائزہ لے کر نکاح کے باقی رکھنے یا تفریق کا فیصلہ کرسکتے ہیں (دیکھئے: المغنی لابن قدامہ ۱۰؍۲۶۴)۔

مالکیہ کا طریقۂ استدلال یہ ہے کہ آیت بالا میں تصفیہ کرنے والوں کو حکمین قرار دیا گیا ہے، اور زوجین کی رضامندی کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ حکم کا

مطلب ہی ہوتا ہے اپنے اختیار سے فیصلہ کرنے والا، اس کے بعد اللہ پاک نے {ان یریدا اصلاحا} میں اس کا مخاطب حکمین کو بنایا ہے، ان کے علاوہ مالکیہ نے متعدد آثار صحابہ سے بھی استدلال کیا ہے۔ یہی مذہب حضرت علی، حضرت ابن عباس، سلمہ بن عبدالرحمن بن عوف، شعبی، نخعی، سعید بن جبیر، اوزاعی، اسحاق بن راہویہ اور ابن منذر وغیرہم سے منقول ہے۔

## ۶۔ قاضی اور حکمین کے اختیارات:

اس مسئلے میں حنفیہ کے یہاں بھی مرافعہ کے بعد قاضی کی طرف سے حکمین کا مقرر کیا جانا ضروری ہے، جیسا کہ جصاص رازیؒ کی آئندہ عبارت سے مترشح ہے۔ حضرت تھانویؒ نے بھی اس مسئلے کی وضاحت میں لکھا ہے "یہ فیصلہ واجب ہے اگر زوجین حکام سے رجوع کریں اور دوسروں کے لیے مستحب ہے" (تفصیل کے لئے دیکھئے: المغنی لابن قدامہ ۱۰ / ۲۶۵ - ۲۶۴)۔

اسی طرح مالکیہ وغیرہ جن کے یہاں خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں، ان کے یہاں بھی قاضی کی طرف سے حکمین کا مقرر کیا جانا ضروری ہے، تحکیم سے قبل قاضی کا فیصلہ خلع معتبر نہیں ہوگا۔

جصاص رازیؒ احکام القرآن میں فرماتے ہیں: "اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ شوہر اگر بیوی کے ساتھ بدسلوکی کا اعتراف کرلے تو بھی زوجین کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی اور نہ ہی قاضی شوہر کو طلاق دینے پر مجبور کرسکتا ہے جب تک کہ وہ حکمین مقرر نہ کردے" (۲)۔

البتہ قاضی ابن العربی مالکی کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک تحکیم کے وجوب کے لیے مرافعہ بھی شرط نہیں ہے۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "یعنی جب قاضی کو زوجین کی نااتفاقی کا علم ہوجائے تو قاضی کا فرض بنتا ہے کہ وہ ان دونوں کے پاس حکمین کو بھیج دے، ان کی طرف سے مرافعہ کا انتظار نہ کرے، اس لیے کہ مرافعہ کے انتظار کے دوران جو حقوق اللہ ضائع ہوجائیں گے، ان کی تلافی نہیں ہوسکتی ہے" (بیان القرآن ۲ / ۱۱۵)۔

کیا حکمین کا مقرر کیا جانا ضروری ہے یا ایک حکم کا بھی تقرر کافی ہوگا؟ اس سلسلہ میں مالکی علماء کی تصریحات یہ ہیں کہ ایک حکم کا تقرر بھی کافی ہوگا۔ قاضی ابن العربی مالکی نے اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے اس پر دلیل بھی فراہم کی ہے۔

وہ فرماتے ہیں: "ایک حکم کا بھیجنا کافی ہے، اس لیے کہ اللہ رب العزت نے زنا کے سلسلے میں چار گواہوں کا حکم فرمایا ہے، اس کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک زانیہ عورت کے پاس تنہا حضرت انیسؓ کو بھیجا اور ان سے فرمایا: اگر وہ اعتراف کرلے تو اسے سنگسار کردو" (احکام القرآن ۱ / ۱۵۲)۔

## ۷۔ ضرورۃً کسی اور مکتب فکر کی طرف عدول

اگر قاضی یہ محسوس کرے کہ اب طرفین کے درمیان معروف اور بہتر تعلقات کے ساتھ نکاح کا برقرار رہنا واقعۃً ممکن نہیں ہے تو اس صورت میں فقہ مالکی کو سامنے رکھتے ہوئے وہ تحکیم اور خلع جبری کی صورت نکال سکتا ہے، جیسا کہ طلاق وتفریق کے حوالے سے اس سے پہلے ہمارے اکابر علماء حنفیہ نے بعض صورتوں میں فقہ مالکی کی طرف عدول کیا ہے، جس کی تفصیلات الحیلۃ الناجزۃ میں موجود ہیں، بعض اسلامی ممالک نے باوجودیکہ وہاں کی اکثریت مالکی المسلک نہیں ہے اپنے دستور وقانون میں مالکی مذہب کو اختیار کیا ہے، چنانچہ شام اور مصر میں مالکی مسلک کے مطابق ہی قانون سازی کی گئی ہے (تفصیلات کے لیے دیکھئے: الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۷ / ۵۲۹)۔

اس لیے ضرورۃً شرائط معتبرہ کے ساتھ مالکی مسلک کی طرف عدول کی گنجائش ہونی چاہیے، بالخصوص جب کہ وہ دلائل کے اعتبار سے قوی ہے، قرآن مقدس کے اشارات اور آثار صحابہ اس کی تائید کررہے ہیں۔

والله أعلم بالصواب وعلمه أتم وأحكم

☆☆☆

# شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

مولانا عقیل الرحمن قاسمی (جامعہ اسلامیہ جلالیہ، ہوجائی، آسام)

ا۔ خلع کی فقہی واصطلاحی تعریف...... خلع کے لغوی معنی اتارنے کے ہیں اور اصطلاح میں عورت سے کچھ لے کر اس کو نکاح سے آزاد کردینے کا نام خلع ہے (دیکھئے: الدر المختار علی الرد ٥/٦٨، فتح القدیر ٤/١٨٩ طبع کتب خانہ زکریا، دیوبند)۔

## ٢۔ کیا عورت کو خلع لینے کا حق حاصل ہے؟

اللہ تعالیٰ نے جہاں مردوں کو عورتوں پر برتری بخشی ہے، ان کے حقوق کا نگہبان اور طلاق کے احکام کو بیان کرتے ہوئے بار بار فعل طلاق کی نسبت شوہر کی طرف کی گئی ہے جس کا واضح اور صاف مطلب ہوتا ہے کہ طلاق کا اختیار صرف شوہر ہی کو ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: "إذا طلقتم النساء" جب تم سب مرد عورتوں کو طلاق دو (البقرہ: ٢٣١)، "فان طلقها" تو اگر وہ شوہر عورت کو طلاق دے (البقرہ: ٢٣٠)، "وإن عزموا الطلاق" اور اگر وہ سب مرد طلاق کا پختہ ارادہ کرلیں (البقرہ: ٢٢٧)، "بیدہ عقدۃ النکاح" مرد کے ہاتھ میں نکاح کی کڑی ہے (البقرہ: ٢٣٧)۔

اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میرے آقا نے اپنی لونڈی کا نکاح مجھ سے کیا تھا۔ اب وہ مجھ سے اس کو جدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر آپ نے ایک خطبہ دیا اور فرمایا: ''یا ایھا الناس ما بال أحدکم یزوج عبدہ أمته ثم یرید أن یفرق بینھما إنما الطلاق لمن أخذ بالساق'' (ابن ماجہ ١٥١، شامی ٣/٢٤٢، کراچی) (لوگو یہ کیا بات ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی لونڈی سے اپنے غلام کا نکاح کرتا ہے اور پھر اس کو جدا کرنا چاہتا ہے، یاد رکھو طلاق کا اختیار تو صرف اس کو ہے جس نے پنڈلی یعنی بیوی کو حاصل کیا)۔

خلع بھی چوں کہ طلاق ہی کی ایک صورت ہے، اس لئے طلاق دینے کا حق جس طرح صرف شوہر کو ہے عورت طلاق نہیں دے سکتی، اسی طرح شوہر کی رضامندی کے بغیر عورت کو خلع لینے کا حق حاصل نہیں ہے بلکہ خلع کے لیے شوہر کا راضی ہونا ضروری ہے، جب تک شوہر خلع کو منظور نہ کرے خلع نہیں ہوسکتا، اور خلع کا رکن ایجاب وقبول ہے، اس لئے کہ خلع عوض کے ذریعہ عقد طلاق ہے، لہٰذا بغیر قبول کے نہ تو فرقت واقع ہوگی اور نہ شوہر عوض کا مستحق ہوگا (بدائع الصنائع ٣/٢٢٩)۔

''اور زوجین میں سے کسی کو دوسرے کی رضامندی کے بغیر اس پر خلع لازم کرنے کا اختیار نہیں ہے'' (زیلعی ٢/٢٧١، شامی ٣/٢٤١، کراچی)۔

## شوہر کے ظلم وزیادتی پر بینہ فراہم نہ ہونے کی صورت میں عورت کے گلوخلاصی کی کیا صورت ہے؟

عورتیں چونکہ ناقصات العقل ہیں اس لئے بسا اوقات بالکل معمولی سی بات پر اپنے شوہر سے متنفر ہوجاتی ہیں اور زندگی کے سارے احسانات کو بھلادیتی ہیں ارشاد نبوی ہے: ''لو احسنت إلیھا الدھر ثم رأت منك شیئاً قالت ما رأیت منك خیرا قط''۔ (اگر تم بیوی پر پوری زندگی احسان کرو پھر کبھی تمہاری طرف سے معمولی سی بات پیش آجائے تو وہ کہہ بیٹھتی ہے کہ مجھے تمہاری طرف سے کبھی کچھ ملا ہی نہیں)۔

پس اگر تنفر اور عداوت کی بنیاد اس طرح کی کوئی بات ہو تو ایسی عورتوں کا مقدمہ دار القضاء سے بالکل خارج کردینا چاہئے۔ البتہ اگر واقعتاً عورت مظلوم ہو اور نفرت کی بنیاد ایسی بات پر ہو جس کے ازالہ کے بغیر زوجین کا ایک ساتھ گزر بسر ناممکن ہو اور عورت کے پاس اس کے ثبوت پر بینہ نہ ہو تو ایسی صورت میں چاہئے کہ وہ شوہر کے خلاف دار القضاء میں اپنا مقدمہ پیش کرے پھر قاضی رفع الزام کے لیے شوہر کو دار القضاء میں طلب کرے اگر اطلاع کے باوجود وہ حاضر نہ ہو اور نہ ہی رفع الزام کے لیے کوشش کرے تو یہ اس کی طرف سے عورت کے دعوی کی تصدیق سمجھی جائے گی۔ اب قاضی شوہر کے پاس خبر بھیجے کہ یا تو تم اسباب تنفر دور کرو یا بیوی کو طلاق دے دو، ورنہ ہم دونوں میں تفریق کردیں گے، اس پر شوہر اگر کوئی پہلو اختیار کرلے تو بہتر ورنہ قاضی دونوں میں تفریق کردے (الحیلۃ الناجزۃ ٦١-٦٣، دار الاشاعت دیوبند)۔

## شقاق سے کیا مراد ہے؟

لفظ شقاق کے متعلق صاحب روح المعانی علامہ آلوسیؒ متوفی ۱۲۷۰ھ فرماتے ہیں ''والشقاق: الخلاف والعداوة واشتقاقه من الشق وهو الجانب لأن كلا من المتخالفين في شق غير شق الآخر'' (روح المعانی ۴،۹،۳۹، زکریا بک ڈپو دیوبند)۔

شقاق کے معنی اختلاف اور دشمنی ہیں، یہ لفظ کلمہ شق سے مشتق ہے جس کے معنی جانب اور کنارہ کے ہیں چوں کہ ہر فریق دوسرے فریق کے جانب مخالف میں ہوتا ہے، اس لئے شقاق کو شقاق کہا جاتا ہے۔ تقریباً یہی بات قاضی ثناء اللہ پانی پتی متوفی ۱۲۲۵ھ نے بھی فرمائی ہے ''شقاق سے مراد ہے اختلاف اور دشمنی چوں کہ ہر دشمن ایسا کام کرتا ہے جو اس کے مخالف کو شاق ہو اس لیے عداوت کو شقاق بولا جاتا ہے۔

شیخ ابو عبد اللہ القرطبیؒ متوفی ۶۷۱ھ "وان خفتم شقاق بينهما" کی تفسیر کے ضمن میں لفظ شقاق سے متعلق رقم طراز ہیں'' فكأن كل واحد من الزوجين يأخذ شقا غير شق صاحبه''، یعنی زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کے مخالف شق کو اختیار کرتا ہے اس لئے شقاق کو شقاق کہا جاتا ہے۔

لفظ شقاق سے متعلق مفسرین کے اقوال کا نچوڑ اور خلاصہ مجموعہ قوانین اسلامی میں یوں بیان کیا گیا ہے'' شقاق کے معنی زوجین کے درمیان ایسی شدید نفرت پیدا ہو جانے کے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے مقررہ حدود کو قائم رکھتے ہوئے ازدواجی زندگی نہ گزار سکیں'' (مجموعہ قوانین اسلامی، دفعہ: ۸۲)۔

## کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کر سکتا ہے؟

امام بخاریؒ نے مختلف سندوں کے ساتھ خلع کا ایک واقعہ اپنی صحیح میں یوں بیان فرمایا ہے:''حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے ثابت بن قیس کے دین و اخلاق سے کوئی شکایت نہیں لیکن مجھے یہ بات بھی ناپسند ہے کہ مسلمان ہو کر کسی کی ناشکری کروں (یعنی ایک طرف ثابت کا میرے ساتھ اچھا سلوک ہے دوسری طرف میرا ان کی طرف طبعی رجحان نہیں ہے جس کے باعث میری طرف سے ان کی ناقدری ہو رہی ہے اس لئے ہم دونوں میں علاحدگی کرادی جائے)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم اس کو اس کا باغ لوٹا دو گی؟ انہوں نے کہا ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت سے فرمایا: باغ لے لو اور اس کو طلاق دے دو (۲/ ۷۹۴، حدیث نمبر ۵۰۷۴)۔

یہ اور اس طرح کی دوسری احادیث میں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حاکم کو فسخ نکاح کا اختیار نہیں ہے۔

اسی طرح امام رازی، قرطبی اور دیگر مفسرین نے خلع کے اس واقعہ کو بھی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے کہ''حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسے ہی ایک مقدمہ میں حکم متعین کئے پھر ان سے مخاطب ہو کر ان کی ذمہ داری بتائی کہ دونوں کو اگر جمع کر سکو تو جمع کر دو اور اگر تفریق مناسب ہو تو ایک دوسرے کو علیحدہ کر دو عورت تو اس پر آمادہ ہو گئی مگر مرد نے علیحدگی پر اپنی عدم آمادگی کا اظہار کیا تو حضرت علیؓ نے مرد پر دباؤ ڈالتے ہوئے فرمایا کہ جب تک تم اس عورت کی طرح فیصلہ کی ہر دو صورت پر اپنی رضامندی کا اظہار نہ کر دو یہاں سے نہیں ہٹ سکتے ''لا تنفلت مني حتى تقر كما اقرت'' (احکام القرآن للجصاص ۲/ ۱۹۵، تفسیر القرطبی ۵/ ۱۱۴)۔

اس واقعہ میں بھی اس بات پر دلیل موجود ہے کہ شقاق کی وجہ سے محض قاضی یا حاکم خلع کا فیصلہ نہیں کر سکتا ہے بلکہ مرد کی رضامندی ضروری ہے۔ ویسے قیاس کا بھی تقاضہ یہی ہے، اس لیے کہ طلاق کا اختیار مرد کے ہاتھ میں ہے "والطلاق لمن أخذ بالساق" (ابن ماجہ ۱۵۱) اور خلع بھی مال کے عوض طلاق ہی ہے اس لئے مرد کی آمادگی بہر طور ضروری ہے۔ ان جیسی تمام دلائل کی بنیاد پر اس مسئلہ میں امام اعظم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں بدون رضائے زوجین قاضی یا حاکم کو شقاق کی وجہ سے خلع کے فیصلہ کا اختیار نہیں ہے ''فلا تقع الفرقة ولا يستحق العوض بدون القبول'' (بدائع الصنائع ۳/ ۱۴۵) ''ولا ولاية لأحدهما في إلزام صاحبه بدون رضاه'' (تبیین الحقائق ۲/ ۲۷۱)۔

امام شافعیؒ بھی اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ جیسی ہی رائے رکھتے ہیں ''وليس له (الحاكم) أن يأمرهما (الحكمين) يفرقان إن رأيا إلا بأمر الزوج''۔ (کتاب الام ۵/ ۱۹۴، ۱۹۸) پر امام شافعیؒ کا یہ قول بھی درج ہے "وعلمنا أن الخلع لم يقع إلا بإيقاع الزوج" شوہر کے واقع کئے بغیر خلع واقع نہیں ہوتا۔ مگر حنابلہ کے ترجمان حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں'' وفي تسميته ﷺ الخلع فدية دليل على أن فيه معنى المعاوضة ولهذا اعتبر فيه رضا الزوجين'' (زاد المعاد ۲/ ۲۳۸)۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلع کا نام فدیہ رکھا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں عوض کا معنی پایا جاتا ہے لہٰذا اس میں زوجین کی رضا کا اعتبار ہوگا)۔

بلکہ اس مسئلہ میں علامہ ابن حزمؒ بھی جمہور فقہاء جیسی رائے رکھتے ہیں ''قال العلامة ابن حزم رحمه الله تعالى ليس في الآية ولا في

شئی من السنن ان للحکمین ان یفرقا ولا ان ذلك للحاكم" (المحلی ۱۰،۸۸)۔

البتہ امام مالکؒ کا قول ہے کہ "حکمین تفریق کا فیصلہ کر سکتے ہیں اس سلسلہ میں نہ تو وہ زوجین کی مرضی کے پابند ہیں اور نہ خود قاضی کے حکم کے (تفسیر قرطبی ۵/۱۱۷)

"قال مالك وأصحابه يجوز قولهما في الفرقة والاجتماع بغير توكيل الزوجين ولا إذن منهما في ذلك" (بدایۃ المجتہد ۲،۹۸) (زوجین کو توکیل اور اجازت کے بغیر حکمین تفریق اور اجتماع کرنے کے مجاز ہیں)۔

## کیا حکمین کا تقرر ضروری ہے اور کیا ایک حکم کا بھی تقرر کافی ہے؟

علامہ ابن رشد مالکیؒ نے بدایۃ المجتہد میں امام مالک کا نظریہ اس مسئلہ میں اس طرح پیش کیا ہے "ومالك رحمه الله يشبه الحكمين بالسلطان والسلطان يطلق بالضرورة عند ذلك اذ تبين" (حکمین سلطان مانند ہیں اور سلطان شقاق کے ثابت ہو جانے پر ضرورتاً طلاق دے سکتا ہے)۔

گویا کہ اصل تو یہی ہے کہ شقاق بین الزوجین کی تحقیق کے لیے سلطان یا قاضی دو حکم مقرر کرے اور وہ دونوں تحقیق حال کے بعد دونوں کو جوڑنے یا دونوں میں تفریق کرنے کا فیصلہ کرے۔ لیکن اگر وہ حکم کے تقرر کے بغیر بذات خود تحقیق حال کے بعد اجتماع یا تفریق کا فیصلہ کر دے تو اس کا بھی اعتبار ہوگا۔

باقی رہا کہ کیا ایک حکم کا بھی تقرر کافی ہوگا یا نہیں تو اس کے متعلق ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی امام مالک کی طرف سے وکالت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں "یجزء ارسال الواحد" ایک حکم کو بھیجنا بھی کافی ہوگا (تفسیر القرطبی: ۱۱۶)۔

## کیا شقاق کے مسئلہ میں ضرورۃً کسی اور مکتب فکر کی طرف عدول کیا جا سکتا ہے!

اس آخری سوال کے متعلق بندہ کی رائے یہ ہے کہ جب اکثر فقہاء کے نزدیک شوہر کی رضامندی کے بغیر حکمین کے خلع کا فیصلہ معتبر نہیں ہے تو بغیر ضرورت شدیدہ کے اکثریت کو چھوڑ کر امام مالکؒ کے مسلک کی طرف عدول نہ کیا جائے، البتہ اگر حالات انتہائی بگڑ گئے ہوں نوبت یہاں تک آ پہنچی ہو کہ شوہر کے ظلم و زیادتی کو برداشت کرنا بیوی کے بس کی بات نہ ہو، شوہر بھی کسی قیمت طلاق پر راضی نہ ہو۔ اور قاضی دونوں کے شقاق کو ختم کرنے کے سلسلہ میں کسی بھی طرح صحیح نتیجہ تک نہ پہنچ پا رہے ہوں تو اولاً زوجین کو ایسے محلہ میں رہائش اختیار کرنے کا حکم دیں جہاں کے لوگ صالح اور شریف ہوں تا کہ ان کے ذریعہ نشان دہی ہو سکے کہ میاں بیوی میں سے کس کی زیادتی ہے۔ پھر اس کی روشنی میں قاضی صاحب فیصلہ کریں۔ اور اگر اس کے باوجود بھی قاضی کے یہاں کسی ایک فریق کی زیادتی ثابت نہ ہو سکے تو پھر ضرورتاً اس مسئلہ میں امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے۔ جیسا کہ مفقود الخبر کے مسئلہ میں امام موصوف کے مسلک پر فتوی دیا جاتا ہے۔ اور متاخرین احناف کی کتابوں میں اس کی بھرپور تائید بھی موجود ہے چنانچہ مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے "فتاوی عبدالحی" میں، مولانا اشرف علی تھانوی "الحیلۃ الناجزۃ" میں اور مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نے "کتاب الفسخ والتفریق" میں اس کی صراحت کی ہے۔

واضح رہے کہ حالات اور ضروریات کی بناء پر نہ کہ حرص وہوس کی بناء پر، بعض احکام میں کسی دوسری فقہ کی طرف عدول کرنا تقلید اور اصول تقلید کے منافی نہیں ہے، جیسا کہ مفقود الخبر کی بحث میں امام مالکؒ کے قول پر فتوی دیئے جانے کے سلسلہ میں صاحب جامع الرموز علامہ قہستانیؒ فرماتے ہیں "فلو افتی به فی موضع الضرورة ینبغی ان لا بأس به" (جامع الرموز ۲، ۱۴۵) (اگر ضرورت کے موقع پر امام مالک کے قول پر فتوی دیا جائے تو کوئی حرج نہیں)۔

ایسے ہی مشہور فقیہ علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں "فكثير من الأحكام يختلف باختلاف الزمان لتغير عرف أهله أو حدوث ضرورة أو فساد أهله بحيث لو بقي الحكم على ما كان عليه أولاً لتيسير ودفع الضرر والفساد لبقاء العالم على أتم نظام وأحسن أحكام" (رسائل ابن عابدین ۱، ۱۲۶) (بہت سے احکام ایسے ہیں جو زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدل جاتے ہیں، عرف کے بدلنے یا ضرورت کے پیش آنے یا لوگوں سے فساد کو دور کرنے کی وجہ اس طور پر کہ اگر حکم اسی پر باقی رکھا جائے تو ان شرعی اصول وقواعد کے خلاف ہوگا جو سہولت وآسانی اور نظام کائنات کو بہتر اور عمدہ طریقہ پر رکھنے کے لیے ضرر اور فساد کے ازالہ پر مبنی ہے)۔

متاخرین علماء میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، حافظ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ اور امام غزالیؒ کی کتابوں میں مصالح اور دلائل کی بنیاد پر مختلف احکام میں مختلف فقہ سے استفادہ کی صورتیں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ لہٰذا ضرورت اگر شدید ہو اور شقاق بین الزوجین کے ازالہ کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہ ہو تو پھر امام مالکؒ کے مسلک کی طرف عدول کرتے ہوئے حکم حضرات میاں بیوی میں خلع کرانے کے مجاز ہوں گے۔ وباللہ التوفیق۔ ☆☆☆